ترجمان السنّۃ

عربی - اُردو

جلد سوم

دورِ حاضر کی ضرورتوں کے مطابق جدید عنوانات اور قدیم مباحث کے ہمراہ

احادیثِ طیبہ کا جامع و مستند عظیم الشان مجموعہ

تالیف

زبدۃ المحدثین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہ

اُستاذ الحدیث دار العلوم دیوبند و رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۲۴۳۴۱۲، فیکس ۷۳۲۴۸۵-۴۲-۹۲

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۷۲۴۴۹۹۱ - ۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ
چوک اُردو بازار، کراچی فون ۷۷۲۲۴۰۱

انتساب

شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد انور شاہ قدس سرہٗ کی عشقِ نبوی اور خدمتِ حدیث میں ڈوبی ہوئی رُوح کے نام جن کے فیضِ صحبت سے رفقائے ندوۃ المصنفین اس خدمتِ گرامی کے لائق ہوئے۔

ندوۃ المصنفین

فہرست مضامین ترجمان السنہ جلد سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پھر جمع کر رہا ہوں جگر لخت لخت کو ٭ مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

بیشک ترجمان السنۃ کی یہ پیش کردہ جلد غیر معمولی وقفہ کے بعد آپ کے سامنے آرہی ہے لیکن جب آپ کو درمیانی واقعات اور حالات کی نامساعدت اور اس پر اس جلد کے مضامین کی اہمیت کا علم ہوگا تو یہ کہنا پڑیگا کہ یہ تاخیر بھی کوئی تاخیر نہیں۔ صرف اس ایک جلد کے لیے ہزاراں ہزار صفحات کی ورق گردانی کی گئی ہے، پھر اس کے پیچیدہ مسائل کے سلجھانے میں جو دماغی کاوش کی گئی ہے اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا، اگر اس کو بیان کیا جائے تو کون ہے جو اس کو باور کریگا۔

واقعات یہ ہیں کہ دوسری جلد کی تالیف سے جب مؤلف کا قلم فارغ ہوا تو وقت کے بعض اہم تقاضوں سے یہ خیال پیدا ہوگیا کہ تیسری جلد میں سلسلہ وار مضمون کی بجائے "اسلامی اقتصادیات" پر قلم اٹھایا جائے لیکن اس کے لیے ضرورت تھی کہ پہلے فنِ اقتصادیات پر جدید نظریہ کے تحت ہلکی سی نظر ڈال لی جائے، تاکہ عنوانات اور تشریحی نوٹ اُسی روشنی میں پیش کیے جاسکیں اور احادیث کا ذخیرہ بھی اسی نظریہ کے ماتحت مرتب کیا جاسکے۔ چنانچہ اس کا بہت سا مواد جمع بھی کر لیا گیا تھا لیکن یہ سب مواد دماغ ہی کے اندر بکھرا پڑا تھا، ہنوز اس کے ضبط و قید کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک دوسری دینی خدمت مؤلف کے سامنے آگئی جو اس تالیفی خدمت سے کہیں اہم تھی اور اس کا وقت اب اتنا آخر ہو چکا تھا کہ اگر کہیں ذرا اور تاخیر کی جاتی تو پھر اس میں سعی کرنی بعد از وقت ہو جاتی اس لیے اپنے اس محبوب ترین شغل کو چھوڑ کر ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو جانا پڑا۔ پوری کوشش کی کہ اس جدید مصروفیت کے ساتھ تصنیف و تالیف کا قلم بھی متحرک رہ سکے مگر میرے جیسے بے بضاعت انسان کے لیے بیک وقت ان دو مختلف کاموں کا جمع کرنا ناممکن ہو گیا بالآخر کچھ مدت کے لیے تالیف سے یک قلم دست کش ہو جانا پڑا۔ پورے ایک سال کے بعد جب اس جدید خدمت کی طرف سے کچھ اطمینان میسر ہوا تو قسمت سے مؤلف کو سفرِ حجاز نصیب ہوگیا۔

اب بلا شبہ مقام تو ایسا میسر تھا جہاں حدیث کی خدمت صحیح معنی میں قضیۂ زمین برسر زمین کا مصداق تھی لیکن تصنیف و تالیف کی نزاکت جن حالات کی متقاضی تھی وہ یہاں پھر سازگار نہ تھے، ادھر حسب الاتفاق مؤلف کی آنکھوں میں کچھ ایسی تکلیف پیدا ہوگئی کہ چند منٹ کتاب دیکھنا بھی مشکل ہوگیا

کہ جس کام کے لیے ہزاروں صفحات کا مطالعہ درکار ہو وہ اب چلتا تو کیونکر چلتا، اس لیے رضا بقضا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا پڑا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد جب مرض میں ذرا خفت محسوس ہوئی تو صحت کا انتظار کیے بغیر پھر قلم ہاتھ میں اُٹھا لیا، لیکن اب جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ جدید ترتیب کے لیے جو مواد جمع کیا گیا تھا اس کی سب کڑیاں بکھر چکی ہیں اگر از سر نو ان کو پھر جوڑا جاتا تو تصنیف میں اور تعویق در تعویق ہوتی ہے، اس لیے مجبوراً پہلی ترتیب کی طرف لوٹ جانا پڑا۔

ابھی رُکے ہوئے کام کو شروع کیے کچھ عرصہ گذرنے نہیں پایا تھا کہ ناگہانی طور پر احقر کا دستِ راست شدید زخمی ہو گیا حتیٰ کہ انگشتِ شہادت کا ایک حصہ قطع کرنا پڑا، اور اب ضعف بصارت کے ساتھ کتابت کا یہ دوسرا آلہ بھی معطل ہو گیا۔ والحمد للہ علیٰ کل حال واعوذ باللہ من حال اہل النار۔ مقصود مقدرات کا شکوہ کرنا نہیں ہے اور کیسے کیا جا سکتا ہے جبکہ سامانِ تعطل سب جمع تھے مگر تعطل کسی ایک جانب میں بھی نہ تھا۔ قدرت نے پھر کام کے لیے دوسرے راستے کھول دیے تھے۔ مقصد صرف اس غیر متوقع تاخیر کی معذرت ہے، الحمد للہ کہ ان معذوریوں پر بھی ترجمان السنہ کی تالیف سے کوئی مایوسی نہیں ہوئی، البتہ اب صورت تالیف بدل دینی پڑی یعنی خود کتابت کی بجائے صورت املا یعنی دوسرے شخص کی مدد سے کتابت اختیار کرنی پڑی، گو مؤلف کے دماغ اور اس کے ہاتھ کے مابین قدرت نے مضامین کی آمد میں جو کنکشن رکھا ہے اس کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے مضامین میں نقصان واقع ہونا لازمی تھا مگر جبراً وقہراً اس پر راضی ہو جانا پڑا اور اللہ تعالیٰ کی مدد وفضل سے قدیم ترتیب پر کام پھر شروع کر دیا گیا، اس لحاظ سے کتاب کا جو پہلا حصہ سامنے آیا وہ انبیاء علیہم السلام کی مقدس ہستیوں کے تذکرے کا تھا، بظاہر یہ موضوع سب سے آسان تر موضوع تھا۔ اکثر کتب احادیث میں اس پر مستقل ایک باب قائم کیا گیا ہے اور اس سلسلہ کی حدیثیں ایک ہی جگہ مرتب کر دی گئی ہیں، اس لیے اس سلسلہ کی حدیثیں جمع کرنے میں بظاہر کوئی دشواری نہ تھی اور اسی طریق پر ان کے ترجمے اور نوٹوں میں بھی کوئی دقت نہ تھی، لیکن جب اس موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا تو ترجمان السنہ کی تالیف کے مقاصد کے پیش نظر یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس باب کو بھی موجودہ ضروریات کے تقاضوں کے مناسب مرتب کیا جائے اب دیکھا تو یہی موضوع کتاب کے موضوعات میں سب سے مشکل بن گیا کیونکہ مذہب کی بنیاد اسی مقدس جماعت کے ذریعہ سے قائم ہوتی ہے اور اُن ہی کی حیثیت سمجھنے میں عقلاء اور خود اہل مذہب کو بہت غلطیاں لگی ہیں۔ خالق اور صانع کا وجود کسی نہ کسی پہلو سے سب تسلیم کرتے ہیں کم از کم ایک (Creator) کی حیثیت ہی سے سہی اور اس کے مباحث بھی درسوں اور کتابوں

---

[1] انبیاء علیہم السلام کے حالات کے متعلق "ندوۃ المصنفین" نے "قصص القرآن" مستقل ایک محققانہ تصنیف شائع کی ہے لیکن اس کا خاص موضوع وہ قصص ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، اس لیے وہ بھی ہمارے لیے کارآمد نہ ہو سکی، لہٰذا اس باب کی ترتیب میں کتب احادیث کے علاوہ "البدایۃ والنہایۃ" اور "الدر المنثور" سے ہم کو زیادہ مدد ملی ہے۔

میں ہمیشہ ذکر ہوتے رہے ہیں لیکن انبیا علیہم السلام اور مسائلِ نبوت ہمیشہ سے زیرِ بحث رہے ہیں اور متاخرین نے اس میں جو بحثیں کی ہیں وہ اور الجھاؤ کا موجب بن گئی ہیں۔ یہاں فلاسفۂ قدیم جن کو الٰہیات سے کسی حد تک روشناس کہا جاسکتا ہے جب اس مسئلہ پر گزرے تو حقیقت تک رسائی تو درکنار وہ بالکل دوسری مخالف سمت میں جانکلے، رہے ہمارے دور کے عقلاء تو وہ اس موضوع ہی سے روشناس نہ تھے۔ وہ بھلا اس موضوع میں کوئی صحیح بات لکھتے تو کیا لکھتے۔ ادھر خود اہلِ مذہب بھی اس افراط و تفریط میں پھنسے ہوئے نظر آئے کہ ایک فریق نے انبیا علیہم السلام کی پُراسرار ہستیوں اور ان کے معجزات کو دیکھا تو ان کی بشریت ہی کا صاف انکار کردیا اور اس کے بعد ان کو یہ بتانا ہی مشکل ہوگیا کہ جب وہ بشر نہ تھے تو پھر اور کس نوع میں داخل تھے، آخر اُنھوں نے توجیہ کرتے کرتے اسلام کے اس نکھرے ہوئے مسئلہ کو ٹھیک نصرانیت کی سرحد سے جاملایا۔ دوسری جماعت نے اگر ان کی محسوس بشریت کا یقین کیا تو اُن کے خصائص و کمالات کا انکار کرتے کرتے ان کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں لاکھڑا کیا، اب وہ طبقہ جو مذہب کا تو عقیدتمند تھا لیکن مذہبی تعلیم سے نابلد تھا، ان اختلافات کو دیکھ کر انبیا علیہم السلام کے صحیح مقام معلوم کرنے سے قاصر ہوگیا اور اس کے لیے ان کا اصل مقام سمجھنا ہی ایک بھول بھلیاں بن کر رہ گیا۔ اس لیے اُنھوں نے اپنی فہم اور اپنے اندازِ فکر کے مطابق جو مقام ان کے ذہن میں آیا وہ ان کے لیے تجویز کرلیا اور اس طرح یہ مسئلہ جو دین کا اساسی مسئلہ تھا تاریکی در تاریکی میں پڑگیا اس لیے مؤلف کے لیے ضروری ہوگیا کہ اس باب کو اس طرح مرتب کیا جائے جس کے مطالعہ کے بعد اس میں تمام غلط خیالات کی تصحیح ہوجائے اور ان بزرگ ہستیوں کا شرعًا جو صحیح صحیح مقام ہے وہ ان کے حالات کے ضمن میں کسی تکلف کے بغیر خود بخود واضح ہوتا چلا جائے۔ اس غور و خوض میں یہ محسوس ہوا کہ جس طرح نبوت تمام دین کی اساس ہے اسی طرح وحی نبوت کی اساس ہے اس لحاظ سے وحی[1] کی حدیثیں اور اس پر مختلف عنوانات بھی قائم کرنے اہم نظر آئے غالبًا اسی لیے امام بخاری علیہ الرحمہ نے بھی عام محدثین کی ترتیب کے خلاف اسی باب سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے، اس سے امام موصوف کی دِقّتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس عنوان کے تحت اگرچہ خود امام بخاری کی کتاب میں چند حدیثیں جمع کی گئی ہیں، لیکن "ترجمان السنۃ" کے مقاصد و عنوانات کے پیشِ نظر وہ کافی نہیں تھیں اس لیے اس کے لیے دور دور کے مختلف ابواب سے حدیثیں تلاش کرنی پڑیں۔ مثلاً کتاب الحج، کتاب الدعوات، کتاب التفسیر باب التوکل۔ اب ذرا اندازہ فرمائیے کہ ان ابواب کو وحی کے ساتھ کیا مناسبت ہے، اس لیے کس جانفشانی کے ساتھ یہ احادیث ان ابواب سے منتخب کی گئی ہونگی، پھر جب آپ "ترجمان السنۃ" ملاحظہ فرمائینگے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ

---

[1] اس موضوع پر بھی ندوۃ المصنفین کی مشہور کتاب "وحی الٰہی" مدت ہوئی شائع ہوچکی ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت وہ ہمارے سامنے نہ تھی اس لیے اس سے استفادہ نہ ہوسکا۔ مناسب ہے کہ تفصیلی مباحث کے لیے کتاب مذکور کا مطالعہ کیا جائے۔

ان عنوانات کے لیے ان احادیث کا انتخاب کتنا اہم تھا۔

انبیاء علیہم السلام کے تعارف کے سلسلہ میں ان کی بشریت اور ان کی بشریت کی خصوصیات، پھر عام بشریت سے اس کے امتیازات پر متعدد ابواب بھی قائم کیے گئے ہیں، تاکہ اگر ایک طرف ان کی بشریت ثابت ہوتی رہے تو دوسری طرف عام بشریت سے ان کی برتری بھی واضح ہوتی رہے اور اس طرح یہ مسئلہ پورے توازن اور اپنی تمام نزاکتوں کے ساتھ ذہن نشین ہوتا چلا جائے، نیز یہ بھی واضح ہو جائے کہ جن انسانوں کو اللہ تعالیٰ اپنی ہمکلامی کا شرف بخشتا ہے ان کی صفات کیا ہوتی ہیں، پھر یہ بات خود بخود سمجھ میں آجائیگی کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے صفتِ عصمت ہونا کیوں ضروری ہے۔ اس کے بعد وحی اور انبیاء علیہم السلام کی معصومیت[1] پر خاص طور پر نظر ڈالی گئی ہے کیونکہ ان کے تعارف کے لیے سب سے زیادہ اہم یہی دو صفتیں ہیں۔ اس کے بعد پھر جن انبیاء علیہم السلام کے اسماء گرامی اور ان کی حیات طیبہ کے کچھ حالات جو حدیثوں میں آچکے تھے جمع کیے گئے ہیں۔ چونکہ "ترجمان السنہ" جلد اول ص پر آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلحاظ خلقت سب سے پہلے اور بلحاظ بعثت سب سے آخری رسول ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس باب کو ہم آپ ہی کے اسم مبارک سے شروع کریں اور آپ ہی کے اسم مبارک پر ختم کردیں تاکہ آپ کی اولیت و آخریت کا نقشہ ہماری تصنیف میں بھی آنکھوں سے نظر آجائے۔

یہاں بھی حسبِ دستورِ سابق نبوت کے متعلق پہلے ایک بسیط مضمون سپردِ قلم کیا گیا ہے جس کے مطالعہ کے بغیر اس باب کے تشریحی نوٹ پورے طور پر واضح نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح عصمتِ انبیاء علیہم السلام کی حدیثوں سے پہلے اس موضوع پر بھی ایک مقالہ لکھا گیا ہے، حدیثوں کے تشریحی نوٹ دیکھنے کے لیے اس کا مطالعہ کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے۔ اس جگہ ضروری ہے کہ جلد اوّل از ص ۱۳۰ تا ص ۱۴۴ و از ص ۲۵۵ تا ص ۲۶۴ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے کیونکہ اس مسئلہ کے بہت سے اہم پہلو ان صفحات میں صاف کیے جا چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ آپ کو سب سے زیادہ طویل نظر آئیگا اور اس کا راز یہ ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں ہے جس کا تعلق اُمت محمدیہ کے ساتھ آئندہ زمانہ میں بھی ثابت ہوتا ہو صرف ایک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہستی ہی ایسی ہے جن کے متعلق حدیثوں میں باصرار و تکرار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بحیثیت ایک حکم جسٹس کے تشریف لاکر اہل کتاب اور اہل اسلام کے مابین مختلف فیہ مسائل میں فیصلہ فرمائینگے اور قیامت سے قبل اتحاد ملل کی اہم خدمت انجام دینگے، اس لیے ضروری تھا کہ وہ رسول ایسا ہی ہو جس کی شخصیت فریقین کے نزدیک مسلم ہو۔

[1] اس موضوع پر امام رازی نے اپنی مشہور تفسیر کی جلد اول و ثالث و خامس میں تقریباً دس مقامات پر کلام فرمایا ہے، ہم نے ان تمام مقامات کے علاوہ بھی تفسیر مذکور کی ورق گردانی کی مگر کوئی ایسی بات دستیاب نہ ہو سکی جو موجودہ دور کے مذاق کے مطابق ہوتی اس لئے اس باب کی ترتیب میں حافظ ابن تیمیہؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ اور دیگر کتب محققین سے مدد لی گئی ہے

ظاہر ہے کہ ہنگامہ قیامت اگر حق ہے تو ان کی تشریف آوری اس سے کچھ عجیب تر نہیں ہے۔ جس دور میں اولین و آخرین کا قبروں سے زندہ ہو کر ایک میدان میں جمع ہونا ادیان سماویہ کا متفقہ عقیدہ ہو اس کے قرب میں صرف ایک انسان کا اور وہ بھی ایسا انسان جو زندہ ہو آسمانوں سے زمین پر آجانا کیا تعجب کی بات ہے صحیح مسلم جو امام بخاری کی کتاب سے بلحاظ صحت گو دوسرے نمبر پر خیال کی گئی ہو لیکن از روئے حسن ترتیب اس کو امام موصوف کی کتاب پر بھی ترجیح دی گئی ہے، ہم نے بارہا دیکھی مگر اس مقام پر جس باریک بینی بلکہ دور بینی سے امام موصوف نے کام لیا ہے اس کی طرف کبھی ہمارا ذہن منتقل نہیں ہوا یعنی اُنھوں نے جب کتاب الایمان پر عنوانات رکھے تو عام محدثین کے مذاق کے مطابق عنوانات قائم کرتے کرتے یہاں ایک جدت بھی کر گئے کہ مسئلہ نزول عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور معراج جیسے مسائل کی اہمیت کے پیش نظر ان کو کتاب الایمان کا جزو بنا گئے حالانکہ ان کے دور میں یہ مسائل کسی اختلاف کے بغیر امت مسلمہ میں بالاتفاق ایمان کا ایک جزو ہی سمجھے جاتے تھے چنانچہ کتب عقائد میں مسئلہ نزول مسیح علیہ السلام کو بالاتفاق عقائد ہی کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے۔ جب ترجمان السنۃ کی ترتیب کا زمانہ آیا تو اس وقت ہم کو امام موصوف کی اس دور بینی کی قدر ہوئی اور امام موصوف کی وجہ سے اس مسئلہ کو کتاب الایمان کا جزو بنانے میں ہم کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اور اب ذہن اس طرف متوجہ ہو گیا کہ اس مسئلہ کی حیثیت دیگر عام پیشگوئی کی سی نہیں ہے بلکہ اُن عقائد کی سی ہے جو تواتر سے ثابت شدہ ہیں۔ ہماری خوش نصیبی سے حضرت استاذ مرحوم اس مسئلہ کی احادیث اپنی حیات میں بشکل رسالہ جمع فرما گئے تھے اس لیے ہم نے اس مجموعہ کا بقدر ضرورت انتخاب یہاں درج کر دیا ہے البتہ عنوانات اپنی جانب سے لگا دیے ہیں، مگر ان عنوانات کی وجہ سے احادیث میں صحت وحسن کی ترتیب قائم رکھی نہیں جا سکی، اگر ان عنوانات کے ساتھ آپ نبوت و رسالت پر جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں ان کو بھی شمار کر لیں تو صرف اس ایک مسئلہ پر تقریباً سو عنوانات ہونگے

ترتیب کے لحاظ سے اس کے بعد قضاء و قدر کا مسئلہ تھا لیکن چونکہ وہ مرتب کر کے پہلے ارسال کیا جا چکا تھا اس لیے اس کی کتابت پہلے ہو گئی اور اب وہ اس جلد کے شروع میں آپ کو ملیگا۔ یہ مسئلہ خود اہل سنت والجماعت کے درمیان ابھی تک کوئی آخری فیصلہ نہیں پا سکا چنانچہ آج تک اُمت مسلمہ کے دو مشہور امام شیخ ابوالحسن اشعریؒ اور امام ماتریدیؒ کا اختلاف کتب کلام میں منقول ہوتا چلا آرہا ہے اگرچہ اکثر علماء کی رائے امام ماتریدیؒ کے مسلک کی طرف ہے لیکن صرف اس رجحان سے مسئلہ کا قطعی فیصلہ نہیں ہوتا، اس لیے ہم نے یہاں دو مقالے الگ الگ اپنے مقدار علم کے مطابق پیش کر دیے ہیں، مگر دونوں مذہبوں کے مابین اختلاف کی زیادہ تشریح نہیں کی اور نہ ہر موقع پر اس کی تنبیہ ضروری سمجھی ہے۔ کیونکہ یہ ایک فنی دائرہ کی چیز تھی۔ قارئین کو اس میں الجھانا مناسب نہ تھا لیکن اہل علم حضرات اس کا بھی اندازہ فرما سکیں گے۔ افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں اردو اور فارسی کی کتب

کا کوئی ذخیرہ یہاں ہمارے پاس موجود نہ تھا اور نہ اہلِ قلم کے وہ مضامین جو اس موضوع کے متعلق منتشر طور پر شائع ہو چکے تھے پیشِ نظر تھے۔ اس لیے اُن سے استفادہ کا قطعاً موقع نہیں مل سکا حالانکہ بہت اہم تھا کہ اپنے قریبی دور کے علماء کے شائع شدہ مقالات کا مطالعہ کر لیا جاتا تاکہ جو پہلو ان میں صاف ہو چکے تھے ان کو بھی اختصار کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر دیا جاتا۔ مگر اس قسم کا ذخیرہ یہاں کلیۃً مفقود تھا، اور یہ امر توجہ ثانی کے مقدمہ میں ظاہر کیا جا چکا ہے کہ یہاں جو کاوش خود مؤلف نے پہلے ایک بار کی تھی قسمت سے وہ دورِ فتن کے نذر ہو چکی۔ اس لیے اب اس فرصت میں جو ممکن تھا وہی پیش کیا جا رہا ہے۔ بایں ہمہ اس موضوع میں جو کچھ لکھا گیا ہے اگر اس کو آپ بار بار ملاحظہ فرمائیںگے تو یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہو گی کہ یہ مسئلہ ایک پہلو سے جتنا نظری ہے دوسرے پہلو سے اتنا ہی بدیہی بھی ہے لہٰذا غالب کا یہ مشہور شعر غالباً اسی مسئلہ کے لیے زیادہ مناسب ہے ؎

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں!

ساری مشکل یہ ہے کہ انسان اپنے ناقص ادراکات کو کامل اور قلیل علم کو کثیر سمجھتا ہے اور اس لیے اپنے دائرۂ محسوسات سے خارج اشیاء کو نہ سمجھتا ہے اور نہ اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ ان کو بھی اپنے مشاہدات ہی کی حدود میں لانا چاہتا ہے۔ مسئلہ قضاء و قدر کا ایک پہلو تو خالق سے متعلق ہے جو اس کے تصور سے بھی وراء الوراء ہے اور دوسرا خود اسی کے باطن سے متعلق ہے۔ انسان نہ اتنی دوربینی کی طاقت رکھتا ہے اور نہ اتنے قریب تر دیکھنے کی۔ اس کی بصارت کے لیے بھی قرب و بُعد کے مابین ایک محدود مسافت شرط ہے کہ اگر اس چیز کو اس سے زیادہ نزدیک لے آؤ تو پھر وہ اس کو دیکھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اور اگر ذرا دور لیجاؤ تو پھر اس کے ادراک سے عاجز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی بصیرت کا معاملہ ہے۔ یہاں بھی زیادہ دور اور بہت زیادہ نزدیک شئے کے ادراک سے اس کی عقل عاجز رہتی ہے، اس لیے نہ الٰہیات کا وہ پورا ادراک کر سکتا ہے اور نہ اپنے نفس کے اختیار کی حدود کی پوری پوری تشخیص کر سکتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس عجز و قصور کو وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ تاہم ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ مسئلہ کو جتنا قریب الی الفہم کیا جا سکے کر دیا جائے۔ اس لیے قارئین سے گزارش ہے کہ وہ خالی الذہن ہو کر پہلے ان اوراق کا مطالعہ فرمالیں اور بار بار فرمائیں اور سمجھنے سے پہلے اس میں اعتراضات پیدا کرنے کی الجھن میں نہ پڑیں۔ اُمید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ سکون و اطمینان کی روشنی سے مستفیض ہو سکیںگے۔ اس سلسلہ میں منتشر کتب کے علاوہ جن کتابوں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) شرح المواقف للدوانیؒ (۲) شرح العقائد للنسفیؒ (۳) حاشیہ الکلنبوی (۴) حاشیہ الجرجانی (۵) کتاب السنۃ للامام احمدؒ (۶) شرح العقیدۃ الطحاویۃ (۷) حجۃ اللہ البالغہ (۸) الروضۃ البہیہ (۹) شفاء العلیل لابن القیمؒ (۱۰) منہاج السنۃ لابن تیمیہؒ (۱۱) شرح الفقہ الاکبر (۱۲) المسامرہ لابن الہمامؒ (۱۳) الاستبصار للکوثری

(۱۴) موقف البشر لمصطفیٰ الصبری۔

ان میں سے آخر کی دو کتابیں ہمارے ہی دور کے علماء کی تالیف کردہ ہیں جن میں علامہ کوثریؒ امام ماتریدیؒ کے مسلک کی تائید میں ہیں اور مصطفیٰ صبریؒ شیخ اشعریؒ کے مسلک کی۔ مصطفیٰ صبری کی کتاب کا ہم نے پورے غور و خوض کے ساتھ بار بار مطالعہ کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی مساعی قابل داد ہیں علامہ کوثریؒ نے اُن کے جواب کی پوری سعی کی ہے اب یہ فیصلہ ناظرین کے سپرد ہے کہ علامہ مصطفیٰ اور علامہ کوثری میں یہاں کس کا پلہ بھاری ہے۔ ہم نفس مسئلہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار تو درکنار ان علماء کے مابین فیصلہ کرنا بھی اپنی مقدار علم سے بالا تر بات سمجھتے ہیں۔ وفوق کل ذی علم علیم۔

جلد ثالث کی ترتیب میں مؤلف کے سامنے ایک جدید مشکل یہ بھی درپیش رہی کہ اب بحمدہ تعالیٰ کتاب میں احادیث کا ذخیرہ ایک ہزار سے تجاوز کر چکا ہے چونکہ احادیث بالکل جدید ترتیب سے جمع کی جا رہی ہیں اس لیے اتنے طویل ذخیرہ میں پورے طور پر یہ استحضار رہنا بہت مشکل ہے کہ کس مناسبت سے یہ حدیث کس عنوان کے تحت پہلے گزر چکی ہے۔ بسا اوقات بڑی تلاش و تتبع کے بعد تیسری جلد کے عنوان کے لیے ایک حدیث منتخب کی گئی لیکن جب زیادہ غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ حدیث ایک بار پہلے بھی گزر چکی تھی اس لیے نہ صرف یہ سعی بیکار رہی بلکہ اس کے لیے اب دوسری حدیث کا انتخاب کرنا ایک جدید محنت کا محتاج ہو گیا اب اس دور میں نہ اتنا حفظ قوی ہے نہ اتنا تیقظ کہ جو احادیث قلم سے ایک بار نکل جائیں پھر جب کہیں وہ مکرر آئیں تو یہ یاد آ جائے کہ اس مناسبت سے ایک بار پہلے وہ فلاں عنوان میں گزر چکی ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ پوری جانفشانی کے باوجود کوئی حدیث آپ کو مکرر بھی نظر پڑے، آپ اس کو مؤلف کے قصور حفظ پر محمول کریں۔ اسی کے ساتھ تا امکان ہم نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ جہاں کوئی مضمون کے مناسب حدیث گزر چکی ہے اس کا حوالہ دے دیا جائے اور اگر گزشتہ کسی مضمون کا مطالعہ اس جلد کے لیے ضروری ہو تو اس کا حوالہ بھی دے دیا جائے اب اتنی محنت قارئین کے ذمہ ہے کہ وہ اُس حوالہ کی مراجعت کر کے اس سے فائدہ حاصل کر لیں۔

"ترجمان السنۃ" نے جس خدمت کا ارادہ کیا ہے اس کی تشریح کسی حد تک جلد اول و ثانی کے مقدمہ میں کر دی گئی ہے لیکن اب اس کی جلد ثالث سامنے آ جانے کے بعد اس امر کی وضاحت کر دینے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے کہ "ترجمان السنۃ" نے حدیث کی خدمت کے ساتھ ساتھ مسائل کلامیہ کو حدیثی روشنی میں دیکھنے اور شرعی پہلو سے اُن کے سلجھانے میں بھی کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہے اور اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر اسی طرح کسی وقت علم کلام پورا کا پورا احادیث کے تحت کھینچ لیا جائے تو اس کے مستقل فن بن جانے کی وجہ سے جو موشگافیاں

پیدا ہو چکی ہیں وہ ایک حد تک ختم ہو جائیں اور یہ فن مضر ہونے کی بجائے بڑی حد تک مفید بن جائے یہ امر بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ جب یہ کام شروع کیا گیا تھا تو اس وقت یہ تصور بھی نہ تھا کہ یہ کام اتنا پھیل جائیگا۔ اور خیال یہ تھا کہ کتاب الایمان صرف پہلی جلد میں سما جائیگی اور اگر بالفرض جدید عنوانات کے پیش نظر پہلی جلد ناکافی رہی تو زیادہ سے زیادہ دوسری جلد اس کے لیے یقیناً کافی ہو جائیگی۔

لیکن جب تیسری جلد کا وقت آیا تو ایسے اہم مباحث سامنے آگئے کہ اب یہ جلد بھی اس کے لیے ناکافی ثابت ہوئی اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بحث غالباً اب چوتھی جلد میں تمام ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ جو ترتیب مؤلف کے سامنے ہے اس کے لحاظ سے پانچویں جلد تک بھی پھیل جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس طرح اضافہ صرف ابواب و عنوانات ہی میں ہو رہا ہے۔ یعنی جو احادیث کتب مدونہ میں دوسرے ابواب و عنوانات کے تحت پھیلی ہوئی تھیں وہ ہمارے یہاں کتاب الایمان میں سمٹتی آ رہی ہیں اور اس طرح اگر کتاب ایک طرف طویل ہو رہی ہے تو دوسری طرف مختصر بھی ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے کتاب کی طوالت سے اضطراب و گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

ہر چند می رود سخن دوست خوشتر است

اعتراف و اعتذار

ہم کو اس امر کا پورا اعتراف ہے کہ اس جلد میں چند حدیثیں ایسی بھی آگئی ہیں جو محدثین کے نزدیک زیادہ ضعیف ہیں۔ مگر یہ اُن ہی مقامات میں آئی ہیں جہاں نہ تو کسی عقیدہ کی بحث ہے اور نہ عمل کی۔ پھر اس موضوع میں اس سے زیادہ نکھری ہوئی حدیثیں ہماری نظر سے کسی کتاب میں نہیں گزریں۔ نیز اسی کے ساتھ اُن کے خلاف بھی کوئی حدیث خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو نظر سے نہیں گزری۔ غالباً ان ہی وجوہات کی بناء پر اخبار و فضائل کی حدیثیں جمع کرنے والے محدثین نے اس قسم کی حدیثیں بھی اپنی مؤلفات میں شامل کر لی ہیں اور اس علم کے ساتھ شامل کی ہیں کہ ان کی اسنادی حیثیت کیا ہے، اس لیے یہاں منکرین حدیث کے لیے خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

ہمیں اس جلد میں یہ مزید تنبیہ کرنی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور آپ کی سیرت کے حصے کے لیے بھی عقائد و اعمال کی حدیثوں کی طرح اعلیٰ درجہ کی اسنادوں کی شرط لگانی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ تشدّد بیجا تشدد ہے، بلکہ سیرت کے ایک بیش قیمت حصہ کا عظیم الشان نقصان ہے۔ آخر آج ہمارے سامنے

دنیا کی دیگر تاریخیں بھی موجود ہیں جن کو اعتبار ہی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، مگر کیا ان کو اسنادی لحاظ سے یہ مقام بھی حاصل ہے یا وہ محض معاصرین کے بے سند بیانات یا چند قدیم کتبوں اور محض افواہوں کی بنا پر مرتب ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اصولِ درایت کو سامنے رکھے بغیر ان کو اعتبار کا کوئی مرتبہ حاصل نہیں لسی عادت کے پیشِ نظر بعض سیرت نگاروں نے اعدار اسلام کے محض متعصبانہ اعتراضات سے خائف ہو کر یہ ضرورت محسوس کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بھی دوبارہ نظر ڈالی جائے اور مافوق العادۃ اور غیبی عجائبات سے خالی کر کے جہاں تک اس کو مادی عقول کے قریب لایا جا سکتا ہے قریب کر دیا جائے ہمیں اس سے انکار نہیں کہ جن مصنفین نے سیرت کے صرف اتنے حصہ کو جمع کیا ہے جو صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ یہ بھی ایک مستحسن سعی ہے لیکن سیرت کے اُس حصہ کو جو دوسرے یا تیسرے نمبر کی حدیثوں سے ثابت ہو بالکل نظر انداز کر دینا یہ طریقہ مستحسن نہیں ہے۔ جب یہ تشدد احکام کی حدیثوں میں قائم نہیں رکھا جا سکا اور صحیحین کی شرائط سے کمتر دوسرے اور تیسرے نمبر کی احادیث بھی جمع کی گئیں بلکہ معاجم اور مسانید میں ادھر ہلکے سے ہلکے معیار کی حدیثیں بھی لیلی گئیں تو پھر سیرت کے عام حصوں کے لیے اس معیار کو معیوب کیوں سمجھا جائے۔ جب دینی مسائل کی تفصیلات کے لیے اعلیٰ معیار سے اُترنا پڑا ہے تو پھر سیرت کے حصے کی پوری تفصیلات صرف اعلیٰ معیار کی حدیثوں سے کیونکر سامنے آسکتی ہیں ہمیں یہاں نہ تو محض حسن عقیدت سے آپ کی سیرت میں کوئی بات اضافہ کرنی چاہیے اور نہ صرف اعدار اسلام کی خاطر آپ کی سیرت میں قطع برید کرنی چاہیے۔ نیز ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس وقت ہمارے سامنے آپ کی سیرت کا کونسا حصہ ہے ظاہر ہے کہ واقعات و حالات کی نوعیت کے ساتھ اُن کے ثبوت کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے بعض واقعات کی محض قرائن سے تصدیق کر لی جاتی ہے اور ان کے لیے اسناد کا مطالبہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں گزرتا مثلاً ایک قدیم بیمار کے متعلق شہرت ہوتی ہے کہ اس کی وفات ہو گئی، یا کسی گھر میں اُمید کا حال معلوم ہوتا ہے اور خبر اُڑتی ہے کہ فلاں گھر میں ولادت ہو گئی تو فوراً اس کا یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ کون ہے جو یہاں ان خبروں پر یقین کر کے فوراً ان کے مناسب انتظامات کرنے میں مشغول نہ ہو جاتا ہو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہر خبر کے اعتماد کا دارومدار صرف اسناد پر قرار دیدینا عام دستور بلکہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ان حصوں کے لیے بھی جن کا تعلق آپ کے ابتدائی حالات زندگی کے ساتھ ہے اعلیٰ درجہ کی اسانید کا مطالبہ کرنا انصاف کا مطالبہ نہیں۔ کیا کوئی سلیم الفطرت انسان یہ حکم لگا سکتا ہے کہ ایک ایسی ہستی کے ابتدائی واقعات کے لیے جن کے متعلق کسی کے ذہن میں ابھی یہ نہ گزرا ہو کہ قدرت ان کو کل کس منصبِ جلیل سے نوازنے والی ہے شروع سے پورا پورا اہتمام کیا گیا ہو گا بالخصوص ایک اُمّی ماحول میں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ چند در چند وجوہات کی بنا پر اُن واقعات کے قانونِ روایت و درایت کے

تحت باضابطہ لانے میں کچھ امور مانع آ گئے ہوں مثلاً اُس وقت اُن کے زیرِ مشاہدہ ہونے کی وجہ سے ان کے تحفظ کی اہمیت ذہنوں میں نہ آئی ہو اور آئندہ دور میں چل کر شغلِ جہاد کی وجہ سے اُن کے اعلیٰ معیار پر جمع کرنے کا اہتمام نہ ہو سکا ہو یا اُن کے عقائد و اعمال کے مسائل ہونے کی وجہ سے ان سے عام طور پر بحث ہی نہ کی گئی ہو یا قدرت کے عجائبات کے خوگر دماغوں نے ان کو خلافِ عقول امور کی فہرست میں داخل ہی نہ کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ جہاں نبوت، ملائکہ، وحی الٰہی اور متواتر معجزات کا شب و روز سماں بندھا ہو وہاں ان چند دلفعات کی اہمیت کیا ہوگی جو اول تو نبوت سے پہلی زندگی کے ہیں پھر ان میں ایک واقعہ بھی ان واقعات سے عجیب تر نہ ہو جو روز و شب ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آ رہے تھے۔ اس قسم کے وجوہات کی بنا پر اگر ان کی اعلیٰ درجہ کی اسانید دستیاب نہ ہو سکی ہوں تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم آئندہ آنے والی نسلوں کے غور و فکر کا یہ سارا مواد ہی آپ کی سیرت سے حذف کر ڈالیں یا اپنے ثبوت کی نوعیت کے لحاظ سے ان کو سیرت کا جزء رہنے دیں۔ حافظ ابن کثیر جو باتفاق معتمد محدثین میں شمار ہوتے ہیں اسی قسم کا ایک واقعہ لکھ کر تحریر فرماتے ہیں:۔

وھذا سیاق حسنٌ علیہا البہاء والنور — اس واقعہ کی اسناد میں اگرچہ ایسے راوی موجود ہیں جن میں
وسیماء الصدق وان کان فی رجالہ — کلام کیا گیا ہے بایں ہمہ یہاں ایسے قرائن موجود ہیں جن
من ھو متکلم فیہ (البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۲ ص ۳۱۹) — کی وجہ سے اس خبر پر صدق و صفا کا نور چمک رہا ہے۔

آپ کی سیرت کے اس حصہ کے روایتی پہلو کے ساتھ اگر ہم اس پر درایتی پہلو سے نظر ڈالیں تو ہم کو پہلے یہ غور کرنا بھی ضروری ہوگا کہ یہ حالات ہیں کس ہستی کے متعلق، کیونکہ حالات کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس شخصیت کو بھی سامنے رکھا جائے جس کی نسبت یہ واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انور بے اور ہٹلر جیسے عاقل افراد کے متعلق ہر بعید سے بعید واقعہ کی تصدیق معقول سمجھی جا سکتی ہے گو اس کی نوعیتِ ثبوت کتنی ہی کمزور ہو۔ لیکن اگر ان میں سے ایک حیرت انگیز واقعہ بھی کسی دوسری عام شخصیت کی طرف منسوب کیا جائے تو قوت واہمہ اس میں سو طرح کے احتمالات نکال کھڑے کرتی ہے خواہ اس کی نوعیتِ ثبوت کتنی ہی پختہ کیوں نہ ہو۔ پس اس لحاظ سے جب ہم نظر کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ادیانِ سماویہ کے جتنے حاملین ہیں وہ سب متفقہ طور پر اپنے اپنے رسولوں کے متعلق کچھ نہ کچھ مافوق العادۃ عجائبات نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ ان میں اکثر واقعات کی نوعیت روایت و درایت ہر پہلو سے صفر کی برابر نظر آتی ہے مگر اس قدرِ مشترک اتفاق سے اتنا تو ماننا پڑتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ابتدائی زندگیوں میں کچھ امور عام انسانوں کی زندگیوں سے ضرور ممتاز تھے خواہ اس کے اسباب و وجوہات کچھ بھی ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دورِ طفولیت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حمل اور ولادت اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات خود قرآن کریم میں بھی موجود ہیں جن کا روایتی پہلو اگر اتنا مضبوط نہ ہوتا

توشاید صرف درایت کے لحاظ سے ہمارے روشن خیال مسلمانوں کے لیے ان کا باور کرنا مشکل ہو جاتا۔ لیکن یہاں تو گفتگو اس شخصیت کے متعلق ہے جس کے بارے میں دعویٰ یہ ہے کہ وہ عالم کی سب سے عظیم تر ہستیوں میں بھی عظیم تر ہستی تھی پس اگر ان کی حیات میں کچھ ایسے عجائبات کا ظہور ملتا ہے جو اس نوع کے انسانوں میں تو اتم کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے تو کیا ان کو اصولِ درایت کے خلاف کہا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہاں اس جماعت کے ساتھ بھی شدید اختلاف ہے، جنہوں نے پیغمبر اسلام کی حیات میں بعض بے سروپا موضوعات داخل کر کے ان کو بھی عقائد کی فہرست میں داخل کر لیا ہے۔ زیر بحث امر صرف یہ ہے کہ آپ کی ابتدائی زندگی کے وہ واقعات جو اسانید کے ساتھ ثابت شدہ ہیں، گو وہ ضعیف سہی مگر غیر معقول بھی نہیں بلکہ اس قسم کی شخصیاتِ بارزہ کی زندگیوں میں ہمیشہ نظر آتے رہے ہیں، کیا ان کو یکسر آپ کی سیرت سے خارج کر دیا جائے یا ان کے ثبوت کی نوعیت پر تنبیہ کے ساتھ ان کو سیرت کا جزء رہنے دیا جائے تاکہ وہ آپ کی نبوت کے مابعد حالات پر غور و خوض کرنے میں کارآمد ہوں۔

"ترجمان السنہ" کا مقصد اپنے مخاطبوں پر کسی ایک فریق کے ساتھ ساتھ چلنا نہیں ہے بلکہ اس کے پیش نظر احادیث کی روشنی میں جو بات منقح ہوتی ہو صرف اس کو واضح کر دینا ہے۔ سعید ہیں وہ جو اپنے عقائد کی روشنی میں حدیثوں کا مطالعہ نہیں فرماتے بلکہ حدیثوں کی روشنی سے اپنے عقائد کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ اس لیے ہم نے بلا خوف لومۃ لائم آپ کی زندگی کے وہ سب حالات جو محدثین کے نزدیک اس سے قبل ذکر میں آتے رہے ہیں یہاں بھی ذکر کر دیے ہیں، اگر کوئی فریق اس پر چیں بجبیں ہوتا ہو تو ہو۔ ان مشکلات و حالات کو سامنے رکھ کر اب آپ ہی غور فرمالیجیے کہ اس طرح مسائل کلامیہ کے عنوانات حدیث کی کتاب میں قائم کرنا پھر اس کے لیے بعید سے بعید مقامات سے حدیثیں تلاش کر کر کے لانا اور ساتھ ساتھ جگہ جگہ ان پر محدثانہ نظر بھی کرتے جانا اور عنوانات و احادیث میں ایسی ترتیب قائم کرنا کہ مسئلہ کے تمام پہلو روشن ہو جائیں، پھر ایسے متعدد مقالات لکھنا جو تمام تر حدیثوں کی روشنی ہی میں لکھے گئے ہوں، یہ کتنی فرصت کا محتاج ہے۔ بس یہی کچھ باتیں تھیں جو اس جلد کی تصنیف میں اتنی تاخیر کا باعث بن گئیں۔ میں نے اس تاخیر کو تو بخوشی گوارا کر لیا مگر میں یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ رسالت اور نبوت کے اتنے اہم مضامین اپنی مقدور بھر سلجھائے بغیر یوں ہی جوں کے توں ناظرین کے سامنے اٹھا کر رکھ دوں۔ اب یہ فیصلہ آپ کے سپرد ہے کہ اپنے ان مقاصد میں میں کہاں تک کامیابی حاصل کر سکا۔

مسودہ اب بھی اس حیثیت میں نہ تھا کہ بخوشی اس کو روانہ کیا جا سکتا، مگر چونکہ وہ صرف حجاج ہی کی معرفت روانہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے اگر اصلاح و ترمیم کا اور انتظار کیا جاتا تو پھر بات ایک سال پر جا پڑتی اس لیے با دل ناخواستہ اپنے قبضہ سے جدا کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس ادھوری اور پراگندہ

کوشش کو قبول فرما کر اُمت مسلمہ کے لیے نافع بنائے۔ آمین۔

نوٹ

ہر باب کے تشریحی نوٹوں کے ملاحظہ سے قبل ازبس ضروری ہے کہ اس موضوع کے متعلق جو مقالہ لکھا گیا ہے اس کو بغور اور بار بار پڑھ لیا جائے، ورنہ اگر تشریحی نوٹوں کے سمجھنے میں کوئی الجھن رہ گئی تو اس میں مؤلف کے قصور کے ساتھ تھوڑی سی کوتاہی آپ کی بھی ہوگی۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

بندہ

محمد بدر عالم

نزیل مدینہ منورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

القضاء والقدر

قال الشاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ اعلم ان اللہ تعالیٰ شمل علمہ الازلی الذاتی کل ما وجد اوسیوجد من الحوادث محال ان یختلف علیہ عن شیء او یتحقق غیرما علم فیکون جہلا لا علما، وھذا مسئلۃ شمول العلم ولیست بمسألۃ القدر ولا یخالف فیھا فرقۃ من الفرق الاسلامیۃ انما القدر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قضاء و قدر اور اس پر ایک لمحہ فکریہ

مسئلہ قضاء و قدر بیشک بہت مشکل ہے لیکن ہمارے نزدیک خالق کا وجود تسلیم کرنے کے بعد اس کا انکار کرنا اس سے زیادہ مشکل ہے. جس نے یہاں شریعت کی بیان کردہ راہِ اعتدال چھوڑی اس کو ہدایت کا انکار کرنا پڑا یعنی یا تو بندہ کو پتھر کی طرح مجبور ماننا پڑا اور یا اس کو خالقیت میں خالق کے برابر تسلیم کرنا پڑا. ہم یہاں آپ کے غور و فکر کی دعوت کے لیے چند سطور پیش کرتے ہیں. مسئلہ گو ان سے حل نہ ہو مگر ممکن ہے کہ کسی حد تک مزید انکشاف کا باعث ہو جائے وبہ نستعین۔

اسلامی جملہ فرقوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے ان سب کا حق تعالیٰ کو پہلے سے علم ہے، اور یہ بات بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ حق تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق جو کچھ ہونا ہے وہ سب کچھ قید کتابت میں بھی آچکا ہے اور اب عالم کا ایک ذرہ اس کے خلاف جنبش نہیں کر سکتا۔ اس لیے بحث یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اب انسانی افعال کی حقیقت کیا ٹھہری، کیا اس کو ان میں مجبور سمجھ لیا جائے یا مختار کہا جائے۔ اگر مختار کہا جاتا ہے تو پھر لازمی طور سے اس میں قدرت اور اختیار کی صفت بھی تسلیم کرنی ہوگی۔ ادھر قدرت اور اختیار تسلیم کر لینے کے بعد پھر قضاء و قدر کے سامنے اس کو مجبور کہنے کا مفہوم باطل ہو جاتا ہے۔ اور اگر مجبور کہہ دیا جائے تو یہ ضروری ہوگا کہ اس میں قدرت و اختیار کی صفت کا بھی انکار کر دیا جائے اس لیے قضاء و قدر کی بحث میں اصل نقطۂ غور و فکر "افعال عباد" یعنی بندوں کے افعال بن جاتے ہیں۔ اس پر غور کرنے سے قبل جب آپ عالم پر ایک نظر ڈالیں گے تو آپ کے سامنے دو قسم کی مخلوقات نظر آئیں گی، ایک وہ جو اختیار و ارادہ کے بداہۃً ایک نہیں

الذی دلت علیہ الاحادیث المستفیضۃ ومضی علیہ السلف الصالح ولم یوفق لہا الا المحققون و یتجہ علیہ السؤال بانہ متدافع مع التکلیف وانہ فیہ العمل ھو القدر الملزم الذی یوجب الحوادث قبل وجودھا فیوجد بذلک الایجاب لا یدفعہ ھرب ولا ینفع منہ حیلۃ۔ (صفحہ ۶۵ حجۃ اللہ)

الواحد منا یعلم بداھۃ انہ بمد یدہ ویناول القلم مثلاً وھو فی ذلک مرید قاصد یستوی

وہ کھلے طور پر قدرت الٰہیہ کی مسخر بنی ہوئی ہے۔ مثلاً آفتاب حرکت کرتا نظر آتا ہے یا زمین و آسمان ہیں جو بھی متحرک ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ یہ اپنے ارادہ سے متحرک نہیں، بلکہ ارادہ و قدرت الٰہیہ سے متحرک ہیں۔ دوسری قسم کی مخلوق وہ ہے جو بداہتہً ارادہ و اختیار کی مالک نظر آتی ہے۔ یہ تین قسم کی ہے، ایک وہ جو صرف خیر ہی کا ارادہ کرتی ہے، شر کا ارادہ کر ہی نہیں سکتی۔ یہ فرشتے کہلاتے ہیں، ان کی شان لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون ہے۔ یعنی جو حکم ان کو ملتا ہے وہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتے، اور صرف وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے، یہاں نفی و اثبات دونوں کو جمع کرنے سے اسی مضمون کی تاکید مقصود ہے۔ دوسری مخلوق اس کے برعکس ہے وہ شر کے سوا خیر کا ارادہ کرتی ہی نہیں، یہ شیطان ہے، تیسری قسم وہ جو ہر دو نوع کے ارادہ کی مالک ہے، اور دونوں قسم کے ارادے کرتی بھی ہے یہ حضرت انسان ہیں۔ انسانوں کی پھر تین قسمیں ہیں ایک وہ جس کا ایمان اور جس کی عقل و معرفت اس کی خواہشات نفسانی پر غالب ہوتی ہے، یہ تو ترقی کرکے فرشتوں سے جا ملتا ہے۔ دوسری اس کے برعکس ہے، یہ برادر شیطان بن جاتا ہے اور تیسری قسم وہ ہے جس کی عقل اس کی قوت شہوانیہ کی مفتوح ہو جاتی ہے، یہ بہائم اور حیوانات سے ملحق ہو جاتا ہے، جس طرح ان جملہ مخلوقات کا وجود محض حق جل وعلا کی بخشائش ہے، اسی طرح ان کا ارادہ و اختیار بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔

اب ہم پہلے اصطلاحات اور مذاہب کی تفصیلات سے علیحدہ ہو کر سادہ طور پر اس مسئلہ پر نظر کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات ہم کو ماننی پڑتی ہے کہ بندہ میں اختیار و قدرت کی صفت یقینی ہے اس کا انکار کرنا اپنے بدیہی وجدان کا انکار ہوگا۔ ایک بیوقوف سے بیوقوف شخص بھی اختیاری حرکات اور ایک رعشہ زدہ شخص کی حرکات کے مابین فرق سمجھتا ہے اور ہرگز دونوں کو یکساں کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن یہ بھی بدیہی ہے کہ جس طرح بندہ کا خود وجود اور اسی کے ساتھ اس کی دیگر صفات کمزور اور ضعیف ہیں، اسی طرح اس کی یہ قدرت اور اختیار بھی ضعیف در ضعیف ہے۔ دیکھیے انسان دیکھتا بھی ہے اور سنتا بھی ہے، اس لیے اس کو شنوا اور بینا کہا جاتا ہے، مگر چونکہ اس کی یہ صفات ضعیف ہیں اس لیے ان کی کچھ شرائط بھی ہیں، اگر وہ نہ ہوں تو وہ نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے۔ پھر ان شرائط کے ساتھ جہاں وہ سنتا

بالنسبه الیه الفعل والترک بحسب ھذا لقصد وبحسب ھذہ القوی المتشجه فی نفسه وان کان کل شئ بحسب للمصلحۃ الفوقانیه اما واجب الفعل او واجب الترک فکذلک الحال فی کل ما یستوجبه استعداد خاص فینزل من باری الصور نزول الصور(۱) علی المواد المستعدۃ لھا کالاستجابۃ عقیب الدعاء مما فیه دخل لمتجدد حادث بوجه من الوجوه ولعلک تقول

اور دیکھتا بھی ہے وہاں بھی کچھ دور چل کر اس کی شنوائی اور بینائی کی دونوں صفتیں معطل نظر آتی ہیں مثلاً ایک خاص فاصلہ کے بعد نہ وہ کچھ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے، مگر کیا اُس کی اس معذوری پر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس میں سمع وبصر کی صفت ہی نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں دو رائیں پیدا نہیں ہو سکتیں بالاتفاق یہی کہا جائیگا کہ ضرور ہیں مگر اتنی ضعیف ہیں کہ زیادہ دور چل کر کام نہیں دے سکتیں۔ اگر صفتِ اختیار بھی ایسی ہی ضعیف صفت ہو جس کا کچھ دور تک تو اثر ظاہر ہوتا رہے لیکن ذرا آگے چل کر اسکا اثر ظاہر نہ ہو تو کیا اس ضعف کی وجہ سے اس کے وجود ہی کا انکار کر دینا صحیح ہوگا یا اگر اس کا اقرار کر لیا جائے تو کیا پھر یہ بھی ضروری ہوگا کہ آخر تک اس کا اثر تسلیم کیا جائے۔ پس اگر ہم اپنے اختیار کے اثرات کچھ دور چل کر مضمحل یا معدوم دیکھتے ہیں تو اس بناء پر ہم کو اپنے بدیہی وجدان کے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اسی طرح اگر ہم اپنے بدیہی وجدان کی بناء پر اپنے نفس میں صفتِ اختیار تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ بھی کوئی لازمی امر نہیں ہو کہ پھر اس کے اثرات آخر تک بھی تسلیم کرتے چلے جائیں۔ اس لیے ہم پوری بصیرت کے ساتھ اس بات کے اقرار کرنے پر مجبور ہیں کہ ہم میں قدرت واختیار کی صفت موجود ہے مگر ہاں خود اس صفتِ اختیار پر ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے یعنی اس پر ہم قدرت نہیں رکھتے کہ اس اختیار کو جدھر چاہیں لگا دیں بلکہ ہماری یہ صفت مشیتِ الٰہیہ کے تحت اسی طرح جبری حرکت کرتی ہے جس طرح ایک سنگ انداز کے ہاتھ کا پھینکا ہوا پتھر۔ نہ اس پتھر کو یہ قدرت ہو کہ وہ اس سمت کو چھوڑ کر جدھر سنگ انداز نے اس کو پھینکا ہے کسی اور سمت چلا جائے، نہ بندہ میں یہ طاقت ہو کہ وہ اس جانب کے سوا جس جانب قدرت نے اس کے اختیار کو لگا دیا ہے کوئی ادنیٰ حرکت کر سکے۔ لہٰذا بندہ جو کرتا ہے یقیناً اپنے اختیار ہی سے کرتا ہے، مگر وہ اپنے اختیار سے کرتا وہی ہے جو مختارِ مطلق اس سے کرانا چاہتا ہے۔ پس اس لحاظ سے کہ ہم جو کرتے ہیں اپنے اختیار سے ہی کرتے ہیں مختار کہلاتے ہیں اور اس لحاظ سے کہ اختیار سے وہی کر سکتے ہیں جو مشیتِ الٰہیہ ہوتی ہے، مجبور کہلاتے ہیں یا بمنزلہ مجبور، مگر یہ ایسا جبر ہے جو جبر مطلق سے ممتاز ہے۔ کیونکہ جبر مطلق میں مجبور کو اپنے ارادہ کے ساتھ مزاحمت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کسی مومن کو کلمۂ کفر کہنے کے لیے مجبور کیا جائے تو اگرچہ وہ کلمۂ کفر زبان سے کہہ تو دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس خارجی جبر کی مزاحمت کا احساس بھی کرتا رہتا ہے یا مثلاً ایک منافق زبان سے کلمۂ ایمان ادا تو کرتا ہے مگر یہاں بھی ظاہری خوف اس کے باطنی ارادہ کے لیے مزاحم رہتا ہے

هذا جهل بوجوب الشئ بحسب المصلحة الفوقانية فكيف يكون في موطن من مواطن الحق؟
فاقول حاش لله بل هو علم وايفاء لحق هذا الموطن انما الجهل ان يقال ليس بواجب اصلا
وقد نفت الشرائع الالهية هذا الجهل حيث اثبتت الايمان بالقدر وان ما اصابك لم يكن
ليخطئك وما اخطأك لم يكن ليصيبك واما اذا قيل يصح فعله وتركه بحسب هذا الموطن فهو

لیکن جو چیز یہاں ہے اس میں ارادۂ مجبور کے ساتھ کوئی مزاحمت نہیں ہوتی۔ انسان جو افعال بھی کرتا ہے وہ اپنے احساس کے مطابق آزادانہ اور پوری خود اختیاری سے کرتا ہے، حتیٰ کہ اگر تقدیر کا جبر اس کو بتایا بھی جائے تو وہ اس کے تسلیم کرنے میں تأمل کرتا ہے۔ جس طرح یہاں بندہ کا جبر جبرِ مطلق سے ممتاز ہے اسی طرح اس کا اختیار بھی مطلق اختیار سے ممتاز ہے کیونکہ وہ جو چاہے اختیار نہیں کر سکتا بلکہ وہی اختیار کر سکتا ہے جس کا اختیار مختار مطلق نے اس کو دے دیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے مگر چاہتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اس سے کرانا چاہتا ہے۔ اب اگر اس اختیار کے ساتھ کوئی شخص اپنے نفس کو مجبور کہتا ہے تو کہے مگر وہ ایسا مجبور ہوگا جو معذور نہیں ٹھہر سکتا۔ پروردگار عالم کی خالقیت کا یہ کرشمہ بھی عجیب ہے کہ اس نے ایک مجبور محض کو کس حکمت سے ایسا مختار بنا دیا ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش میں اپنے احساس کے مطابق ادنیٰ سا جبر بھی محسوس نہیں کرتا ہے حالانکہ جبر کی گرفت اس پر اس درجہ سخت ہوتی ہے کہ وہ جنبش کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت اس لیے پیدا ہو گئی ہے کیونکہ یہاں افعال پر جبر نہیں افعال تو اپنے اختیار سے ہوتے ہیں، مگر خود اس کا اختیار حق تعالیٰ کی مشیتِ کاملہ کے تحت ہوتا ہے، اس لیے اس مختار کو اپنے جبر کا احساس نہیں ہوتا اگر جبر افعال پر ہوتا تو ضرور اس کا احساس ہوتا۔ یہ صفت صرف ربِّ قدیر کی ہے کہ وہ بندوں کے اختیار پر بھی حکومت کرتا ہے۔ قضاء و قدر کے راز ہائے سربستہ سب اسی نقطہ میں پنہاں ہیں۔ بندہ مجبور ہو کر اپنے مختار ہونے کا مدعی بھی اسی لیے رہتا ہے کہ اس کو اپنا اختیار ہی اختیار محسوس ہوتا ہے، اور چونکہ اس کو یہاں اپنے ارادہ کے ساتھ کوئی مزاحمت محسوس نہیں ہوتی اس لیے فوقانی جبر کا اس کو کوئی احساس نہیں ہوتا اور جب جبر و اختیار اس طرح مدغم ہو جائیں تو پھر اپنے افعال پر مسئول ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ کیا ایسا مختار بھی مسئول نہ ہونا چاہیے جو اپنے وجدان میں بھی خود مختار ہو۔ اس فوقانی جبر کا حال تو صرف انبیاء علیہم السلام نے بتایا ہے۔ حیرت ہے کہ یا تو انسان ایک طرف مختارِ مطلق بننا چاہتا ہے ایسا مختار کہ تقدیر کے جبر کو سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا اور مسلمان ہو کر بھی اس کی تصدیق میں ہزار حجتیں نکالنے کو بیٹھ جاتا ہے، اور دوسری طرف جب تقدیر کا جبر تسلیم کرنے پر آتا ہے تو یہاں بھی اس کی روش معاندانہ ہی نظر آتی ہے یعنی پھر جزاء و سزا میں اُلجھنے لگتا ہے، ولقد صدق اللہ عزوجل

علم حق لا محالۃ کما انک اذا رأیت النحل من البھائم یفعل افعال النحلیۃ ورأیت الانثیٰ تفعل افعال الانثویۃ فان حکمت بان ھٰذہ الافعال صادرۃ جبرًا کحرکۃ الحجر فی تدحرجہٖ کذبت وان حکمت بانھا صادرۃ من غیر علۃ موجبۃ لھا فلا المزاج النحلی یوجب ھٰذا الباب ولا المزاج الانثوی یوجب ذلک کذبت وان حکمت بان الارادۃ المتشبجۃ فی القسمہا

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (انسان فطرۃً ہے جھگڑالو) حالانکہ سوچنا تو یہ چاہیے تھا کہ کیا محکومیت کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ محکوم ہمیشہ حاکم کے زیر دست رہے پھر یہاں تو رشتہ صرف محکومیت کا ہی نہیں، بلکہ مخلوقیت کا بھی ہے کیا یہ معقول نہیں کہ یہاں ہمارا غیر مستقل اختیار بھی مختار کل کی مشیت کا محکوم بنا رہے، جب یہ معقول بات سامنے رکھی جاتی ہے تو دنیا شور برپا کر دیتی ہے کہ ہم کو مجبور بنا دیا، حالانکہ غور کی بات تو یہ تھی کہ جو سرے سے موجود ہی نہ تھا وہ مختار تھا کس دن، پھر جتنا کچھ مختار تھا تقدیر نے اس کو ختم کب کیا بلکہ آئینی طور پر اور تسلیم کر لیا ہے، پس یہاں تو یہ احسان کہ ایک معدوم محض کو شرفِ وجود بخشا پھر اپنی حکمتِ کاملہ سے ایک جمادِ محض (یعنی نطفہ) کو سمیع و بصیر اور مختار بنا دیا، اُدھر یہ احسان فراموشی کہ شکوہ یہ ہے کہ مختار کو مجبور بنا دیا۔

یہاں ایک مغالطہ یہ لگ گیا ہے کہ تقدیر اور بندہ کے اختیار کو علیحدہ علیحدہ سمجھ کر تقدیر کو بندہ کے اختیار پر حاکم مانا گیا ہے حالانکہ ہمارا اختیار بھی خود تقدیر کے دائرہ میں شامل ہوتا ہے، اسی قسم کا سوال ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے آنحضرتؐ کے سامنے پیش کیا تھا "یا رسول اللہ امراض میں دوا کا استعمال اور جنگ میں ڈھال کا کیا خدائی تقدیر کو ٹال سکتا ہے، یعنی جب نہیں ٹال سکتا تو پھر اُن کے استعمال کا فائدہ؟ آپ نے جواب کتنا مختصر مگر کیسا تشفی بخش ارشاد فرمایا: میرے صحابہ تم ان اسباب کو تقدیر سے خارج سمجھتے ہی کیوں ہو، تقدیر میں یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ دوا کرو گے تو شفایاب ہو گے، سپر استعمال کرو گے تو دشمن کے وار سے بچ جاؤ گے۔ پس ارتکاب اسباب بھی احاطۂ تقدیر میں داخل ہو چکا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ وبار شام کے قصہ میں نقل فرماتے ہیں کہ جب عمرؓ مقام سرغ کے پاس پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ شام میں تو وبا پھیل رہی ہے یہ سُن کر آپ نے لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اس پر ابو عبیدہؓ نے تعجب سے فرمایا "اچھا آپ تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ یعنی اگر موت مقدر ہو چکی ہے تو پھر اس واپسی کا فائدہ عمرؓ نے اس کا کیا حکیمانہ جواب دیا، فرمایا: ابو عبیدہؓ اگر دو وادیاں ہوں ایک سرسبز دوسری خشک بولو اپنے اونٹ کس میں چراؤ گے؟ اگر سرسبز وادی میں چراؤ اور یقیناً اسی میں چراؤ گے تو کیا یہ تقدیر سے گریز ہو گا یا یہ بھی اسی تقدیر کے تحت ہو گا، اسی طرح میری واپسی کو احاطۂ تقدیر سے باہر کیوں سمجھتے ہو۔ اگر موت کی وادی سے بچ کر

تحکی وجوبًا فوقانیاو تعتمد علیه وانها لا تفور فورانًا استقلالیا کان لیس وراء ذٰلك مرفی فقد کذبت بل الحق الیقین امر بین الامرین وهو ان الاختیار معلول لا یختلف عن علله و الفعل المراد توجبه العلل ولا یمکن ان لا یکون ولکن هٰذا الاختیار من شأنه ان یبتهج بالنظر الی نفسه ولا ینظر الی ما فوق ذٰلك فان ادیت حق هٰذا الموطن وقلت اجد فی نفسی لن

جار رہا ہوں تو یہ بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہوگا، جب ہی تو جا رہا ہوں (مؤطا مالک)

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ تقدیر و تدبیر میں جنگ نہیں ہے اور جنگ تو اُس وقت ہوتی جبکہ تدبیر تقدیر کے احاطہ سے کہیں باہر ہوتی اب تو تدبیر بھی تقدیر کا جز بنی ہوئی ہے تقدیر و تدبیر کے مراتب کو اس طرح محفوظ رکھنا یہ علوم نبوت کا فیض ہے، دیکھیے حضرت یعقوب علیہ السلام جب اپنے فرزندوں کو مصر روانہ کر رہے ہیں تو نظر گزر کے خطرہ سے تحفظ کے لیے یہ بھی فرماتے جاتے ہیں یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ "بچو! دیکھنا کہیں ایک ہی دروازہ سے سب کے سب مت داخل ہو جانا بلکہ متفرق دروازوں سے جانا (کہیں خاندان نبوت کو کسی کی نظر نہ کھا جائے) ادھر شفقت پدری نظر گزر سے تحفظ کی تدبیر بھی کرتی جاتی ہے اُدھر لسان نبوت رمز تقدیر سے بھی آگاہ کیے جاتی ہے اور فرماتی ہے" وَمَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ "یعنی میری یہ تدبیر صرف عالم اسباب کی ایک تسلی ہے، جو مقدر ہو چکا ہے کہیں اس کو میں ٹال سکتا ہوں۔

یہاں اس پر بھی ذرا غور کیجیے کہ جس کو آپ تقدیر کا جبر سمجھتے ہیں اس کی حقیقت ہے کیا۔ یہی تو کہ قدرت نے اپنے دیے ہوئے اختیار کو اپنے ہی کنٹرول میں رکھا ہے، یا یہ کہ جو اختیار عطا فرمایا تھا اس کو سلب کر لیا ہے پھر اس جبر کا اثر ہے تو کہاں ہے، کیا اُن اشیا میں ہے جہاں آپ کو تقدیر سے قبل اختیار حاصل تھا، یا اُن میں جہاں پہلے بھی آپ مجبور ہی مجبور رہتے اس لیے یوں نہ کہیے کہ تقدیر نے ہم مختاروں کو مجبور بنا دیا، بلکہ یوں کہیے کہ ہم مجبوروں کو ایک محدود پیمانہ پر مختار بنا دیا ایسا مختار کہ وہ اختیار بھی ہماری حیثیت سے کہیں زیادہ تھا، ایک مجبور میں نہیں بلکہ معدوم محض میں اختیار کا تصور کرنا ہی کب معقول ہے یہ تو مختار مطلق کا کرم تھا کہ اس نے محض اپنے کرشمہ قدرت سے ایک جماد کو اختیار بخش دیا اور اس کے اس اختیار کے سامنے اپنا جبر ایسا پس پردہ کر دیا کہ اس عالم میں اس جبر کا ادراک کرنا مشکل ہو گیا۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔

ذرا اور دقت نظر سے کام لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارا یہ ناتمام اختیار قائم ہی جب رہ سکتا ہے جبکہ قدرت کا اختیار اس کے ساتھ ساتھ لگا رہے اگر قدرت کا اختیار کہیں اس کی سرپرستی چھوڑ دے تو ہمارا

الفعل والترك كانا مستويين وانى اخترت الفعل فكان الاختيار علةً لفعله صدقت وبهذت
فاجزت الشرائع الالٰهية عن هذه الارادة المتنجة فی هٰذه الموطن، وبالجملة فقد ثبتت ارادة
يتجدد تعلقها وثبتت المجازاة فی الدنيا والاخرة وثبت ان مدبر العالم دبر العالم بايجاب
شريعة يسلكونها لينتفعوا فكان الامر شبيها بان السيد استخدم عبيده وطلب منهم ذلك

اختیار خود بخود فنا ہو جائے۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھیے کہ بچہ جب ہٹ کرتا ہے کہ چلے اور اپنے پیروں ہی چلے، اس کے والدین جانتے ہیں کہ اس غریب کے پیروں میں خود چلنے کا دم نہیں ہے اس لیے اپنی طاقت سے اس کو چلاتے ہیں اور جس طرف وہ چلنا چاہتا ہے اسی طرف چلاتے ہیں۔ اس کا ناتمام اختیار جب اس طرح والدین کے اختیار مستقل کے سہارے سہارے کام کرنے لگتا ہے تو اس بچہ کے ارمان تو یوں پورے ہو جاتے ہیں کہ جو اس کی ضد تھی وہ پوری ہو گئی اور والدین یوں خوش ہو جاتے ہیں کہ اس طرح ان کا بچہ خوش ہو گیا، اور ان کا کچھ بگڑا نہیں۔ اگر کہیں یہ بچہ اس کی ضد کر بیٹھے کہ والدین کی دستگیری کے بغیر خود اپنی ہی طاقت سے چلے تو ظاہر ہے کہ جتنا فاصلہ اپنے اس ناتمام اختیار کے ساتھ اس نے طے کر لیا تھا یہ بھی طے نہ ہو۔ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ بچہ تو اپنی مشیت بھی رکھتا ہے اور کچھ طاقت بھی ادھر اس کے والدین گو طاقت اس سے کہیں زیادہ رکھتے ہیں مگر اپنی مشیت اور اپنی طاقت کو اس بچہ کے تابع بنائے رکھتے ہیں اور اُدھر ہی اس کو صرف کرتے ہیں جدھر وہ بچہ ارادہ کرتا ہے مگر خالق کے معاملہ میں بندہ کی مشیت کی ہستی ہی نہیں ہوتی، وہ اگر کچھ قدم چل سکتی ہے تو خالق کی مشیت کے سہارے سہارے ہی چل سکتی ہے وَمَا تَشَاۤءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَاۤءَ اللّٰهُ یعنی تم ارادہ ہی وہ کر سکتے ہو جو مشیتِ الٰہیہ چاہتی ہے۔ تعجب ہے کہ اتنی محکومیت کے باوجود اگر سطحی نظر ڈالو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس عالم میں مشیت الٰہیہ ہمارے ارادہ کے تابع بنی ہوئی ہے اور جو ہم کرنا چاہتے ہیں وہی وہ پورا کرتی رہتی ہے۔ یہ تمام کرشمہ اسی حکمت کا ہے کہ ہمارے افعال پر قدرت نے جبر نہیں فرمایا بلکہ خود ہمارے اختیار ہی کو اپنے اختیار میں لے رکھا ہے، لہٰذا مجبور محض ہونے کے باوجود ہمارا احساس یہی ہوتا ہے کہ ہم مختار مطلق ہیں اور اس عالم کے لحاظ سے یہ غلط بھی نہیں، جو جبر یہاں ہے وہ عالم غیب کے لحاظ سے ہے، اور وہ ہماری دسترس سے باہر ہے۔ اب اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اس معاملہ میں صرف انبیاء علیہم السلام کے بیان پر اعتماد کیا جائے یہاں دلائل کا اگر انبار بھی لگا دیا جائے تو انسان اپنے ذاتی وجدان کے بالمقابل ان کو باور نہیں کر سکتا، اس لیے اسلام نے یہاں صرف تسلیم و رضا کی ایک راہ بتا دی ہے۔ حقیقت سے بے خبر بھی نہیں رکھا اور اس کو پورے طور پر حل کرنا چونکہ ہمارے بس سے بالاتر تھا اس لیے بحث کرنے سے بھی روک دیا۔

فاتبعوه هذا صراط مستقيم۔

ورضی عمن خدمہ وسخط علی من لم یخدمہ فنزلت الشرائع الالٰهیة بهذه العبارة لما ذکرنا أن الشرائع تنزل فی الصفات وغیرها بعبارة لیس هنالك افصح ولا ابین للحق منها أکانت حقیقةً لغویة او مجازا متعارفا ثم مکنت الشرائع الالٰهیة هذه المعرفة الغامضة من نفوسهم بثلاثة مقامات مسلمة عندهم جاریة مجری المشهورات البدیهیة بینهم، احدهم انه تعالیٰ منعم وشکر المنعم

بالفاظ دیگر اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ بعض مرتبہ شئ کا وجود ہی اتنا کمزور اور ضعیف ہوتا ہے کہ وہ خود بخود قائم نہیں رہ سکتا، اس کے وجود کی کل حقیقت ہی اتنی ہوتی ہے کہ کسی موجود حقیقی کے ساتھ اس کو کوئی صحیح نسبت لگی رہے اس لیے اس کا وجود بھی اسی وقت قائم رہتا ہے جب تک کہ یہ نسبت قائم رہتی ہے جہاں یہ نسبت ختم ہوئی اس کا وجود بھی ختم ہوا۔ دیکھو دن میں دھوپ کی تمازت وتیزی کا کیا عالم ہوتا ہے۔ موسم گرما میں فضاء عالم گویا کرۂ ناربنی ہوئی نظر آتی ہے، مگر جہاں آفتاب نے غروب ہونے کے لیے رختِ سفر باندھا اسی کے ساتھ ساتھ حرارت کے آثار بھی مضمحل اور مدھم پڑنا شروع ہوئے، ادھر آفتاب غروب ہوا اور ادھر یہ آثار بھی معدوم ہوئے، اور وہی فضا جو ابھی ابھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی ایک دم میں تیرہ وتاریک بن گئی۔ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہاں آفتاب نے کچھ ظلم کیا ہے کہ ہماری بزم کی ساری رونق اپنے ساتھ ہی لوٹ کر لے گیا، نہیں نہیں حقیقت یہ ہے کہ عالم کی فضاء پہلے سے تاریک ہی تھی جو نور اس کو عطا ہوا تھا یہ آفتاب ہی کی سخاوت تھی مگر کیا کیا جائے کہ اس میں استعداد ہی اتنی تھی کہ جب تک اس کی نسبت آفتاب کے ساتھ درست رہے وہ روشن رہے اور جب یہ نسبت ختم ہونے لگی تو اس کا وجود بھی معرضِ خطر میں نظر آنے لگا۔ یہاں اس فضاء میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اس کا بخشا ہوا نور تھوڑی سی دیر کے لیے جذب ہی کیے رہے، چاروناچار نتیجہ یہ نکل کر رہتا ہے کہ اس کی اصل مظلم وتاریک شکل پھر عود کر آتی ہے اس میں آفتاب کا ظلم کیا ہے۔ جتنی دیر فضاء منور رہی یہ اُس کا کرم تھا اور جب مکدر ومظلم ہوئی تو یہ خود اس فضا کا اپنا ہی قصور ہے۔ اسی طرح ممکنات کی حقیقت وجود سے معری اور خالی ہے جو عارضی وجود ان کو ملا ہے یہ خالقِ کل کا عطا کردہ ہے۔ اب سوچیے کہ ایسے موجود کی صفات کا حال کیا ہوگا، اسی سے اس کی صفتِ اختیار کو بھی قیاس کر لیجیے، پس اس کا اگر وجود قائم ہے تو اُسی موجود حقیقی کے انتساب سے قائم ہے اور اگر اس کا اختیار ہے تو بھی اسی کے اختیارِ مطلق کے زیرِ سایہ رہ کر ہے۔ حق تعالیٰ عالم کو پیدا فرما کر اس سے علیحدہ نہیں ہو گیا، بلکہ اسی نے پھر اس کی ہستی کو برقرار رکھ چھوڑا ہے، اگر اس کی یہ نگرانی نہ رہے تو اسی آن میں سارا عالم درہم و برہم ہو جائے۔ اسی وجہ سے اس کا نام قیوم بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ان اللّٰہ یمسكُ السمٰوٰت والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکهما من احدٍ من بعده۔

پس جب ممکنات کا نفس وجود ہی اتنا ضعیف ہو کہ موجود ہونے کے بعد آئندہ اپنی بقا کے لیے بھی سہارے کا

واجب والعبادۃ شکرًا لہ علی نعمہ ، والثانی انہ یجازی المعرضین عن التارکین لعبادتہ فی الدنیا اشد الجزاء ، والثالث انہ یجازی فی الاٰخرۃ المطیعین والعاصیین فانبسطت من ھنالک ثلاثۃ علوم ، علم التذکیر بآلاء اللہ ، وعلم التذکیر بأیام اللہ ، وعلم التذکیر بالمعاد فنزل القراٰن العظیم شرحًا لھذہ العلوم ۔ (صفحہ ۶۸ حجۃ اللہ)

محتاج رہے تو پھر کیا اس کی صفات مستقل ہو کر قائم رہ سکتی ہیں ۔ ظل کی کیا مجال کہ اپنی اصل سے مستغنی ہو سکے ناواقف اظلال کی طوفان خیز حرکات کو دیکھتا ہے تو ان حرکات کا خالق ان اظلال ہی کو سمجھنے لگتا ہے ، واقف خوب جانتا ہے کہ ان میں کیا رکھا ہے ، یہ سب بے حقیقت ہے جو کچھ ہو رہا ہے یہ حرکات اصل ہیں جو اظلال میں بطریق عکس نمایاں ہو رہی ہیں اگر یہ اظلال اپنی اصول سے استقلال کی درخواست پیش کرنے لگیں تو کیسی نادانی ہوگی ظاہر ہے کہ خیریت اسی میں ہوگی کہ یہ سب درخواستیں مسترد کر دی جائیں ، ورنہ ظاہر ہے کہ ظلال کی حقیقت ہی اتنی ضعیف ہے کہ ان کا استقلال بس یہی ان کی فنا ہے ۔ مثل مشہور ہے کہ جب چیونٹی کے پر نکلنے لگتے ہیں تو اس کے فنا کا زمانہ قریب ہوتا ہے ۔ اسی لیے بعض سلف کا مقولہ ہے :

واللہ ما احب ان یجعل امری الی و	بخدا میں اپنے معاملہ کو خدا تعالیٰ کی قدرت کے تحت
کون امری بید اللہ خیر من ان یکون	رکھنا اس سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنی قسمت
بیدی ۔ (موقف ص ۲۲۴)	میں رکھوں ۔

غالبًا اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ جبر کا سوال نہ تو تقدیر سے متعلق ہے نہ پروردگار عالم کے عدل سے بلکہ یہ ذات ممکن کا خود اپنا ہی قصور ہے اور جب یہ قصور خود اپنی حقیقت کا ہے تو پھر اس کے ازالہ کی فکر بھی عبث ہے ۔ اتنی تطویل کے بعد بھی یہ مشکل پھر جوں کی توں رکھی ہوئی ہے کہ انسان اپنے وجود کو ضعیف سمجھے کیونکر وہ اپنے نفس ہی کو موجود حقیقی سمجھتا اور جس کی خبر انبیاء علیہم السلام دیتے ہیں اس کو آنکھوں سے دیکھتا نہیں ، اگر کہیں اس کو دیکھ لیتا ہے تو مسئلۂ تقدیر اسی وقت بدیہی بن جاتا ۔ اب نہ قیامت سے قبل موجود حقیقی کا دیدار ممکن ہے اور نہ مسئلۂ تقدیر کا حل ممکن ہے بس یہاں صحیح راستہ ایک ہی ہے وہ یہ کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر خالق کا وجود مان لیا گیا ہے اسی طرح ان ہی کے اعتماد پر خالق کی تقدیر پر بھی اعتماد کر لیا جائے ۔

مسئلۂ مجازات

جزاء و سزا کے مسئلہ میں الجھنا بھی بیکار ہے ، اول تو اس لیے کہ یہ مسلمہ امر ہے کہ مالک اور خالق

افعال العباد اختیاریۃ، لکن لا اختیار لھم فی ذلک الاختیار، وانما مثلہ کمثل رجل اراد أن یرمی حجرًا، فلو انہ کان قادرًا حکیمًا خلق فی الحجر اختیار الحرکۃ ایضًا، ولا یرد علیہ ان الافعال اذا کانت مخلوقۃ اللہ تعالیٰ وکذلک الاختیار ففیم الجزاء، لان معنی الجزاء یرجع الی ترتب بعض افعال اللہ تعالیٰ علی البعض، بمعنی ان اللہ تعالیٰ خلق ھذہ الحالۃ فی العبد، فاقتضی ذلک

سے کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا بلکہ مالک کی تعریف ہی یہ ہے کہ جو ہر قسم کا تصرف کرنے کا مجاز ہو آپ ایک چیز عاریۃً لیتے ہیں، کرایہ پر بھی لیتے ہیں مگر یہاں الٹی اور اس کی حفاظت ہی آپ کے سر پڑتی ہے اور آپ صرف وقتِ مقرر تک وہ بھی بہت احتیاط کے ساتھ اس سے فائدہ اُٹھانے کے مجاز ہوتے ہیں، اس کو فروخت نہیں کر سکتے، ہبہ نہیں کر سکتے، اس میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کر سکتے اس کو توڑنا اور خراب کرنا تو در کنار لیکن جس چیز کے آپ مالک کہلاتے ہیں اس میں آپ کو ان تمام تصرفات کا حق حاصل ہوتا ہے، بلکہ ایک قیمتی چیز کے ضائع کر دینے پر بھی آپ مسئول نہیں ہو سکتے۔ جب ایک مجازی مِلک کے حقوق یہ ہیں تو حقیقی مِلک کے حقوق کیا ہونگے۔ پھر یہاں علاقہ صرف ایک مملوکیت کا ہی نہیں مخلوقیت کا بھی ہے اور چونکہ اس نے بلا شرکت غیرے پیدا فرمایا ہے اس لیے مالکیت حقیقیہ کا حق بھی صرف اسی کا رہنا چاہیے۔ ایسے مالک سے جو خالق بھی ہو جزاء و سزا کا سوال ہی کیا؟

دیکھیے حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حق تعالیٰ نے مالکیت نہیں صرف ملوکیت عطا فرمائی تھی وہ بھی بہت محدود پیمانہ پر لیکن اس ناتمام ملوکیت کے لیے بھی جو امتیازی شان عطا فرمائی وہ ان الفاظ سے ظاہر ہے:

ھذا عطاؤنا فامنن او امسک بغیر حساب۔ — یہ ہماری بخشش ہے اب آپ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں آپ سے اس کا کوئی حساب نہیں لیا جائیگا۔

حافظ ابن کثیر اپنی مشہور تاریخ البدایۃ والنہایۃ کی جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو چونکہ نبوت کے ساتھ سلطنت بھی مرحمت ہوئی تھی اس لیے یہ تنبیہ کر دی گئی کہ یہ بادشاہت ہے تو ہمارا عطیہ مگر چونکہ بادشاہ سے کوئی باز پرس نہیں ہوا کرتی اس لیے جاؤ اس بارے میں تم سے بھی کوئی حساب نہیں ہوگا"۔ اسلام میں غلامی کے مسئلہ سے ذرا سی مالکیت کا پتہ چلتا ہے، اگرچہ وہ صرف یہ جتانے کے لیے مقرر کی گئی ہے کہ جو مولائے حقیقی اور مالک حقیقی کی مالکیت پر راضی نہیں ہوتا اس کو پھر غلاموں کی مالکیت پر راضی ہونا پڑتا ہے مگر اس مالکیت کے بھی جتنے حقوق ہیں وہ اس سے ظاہر ہیں کہ جو ابھی غلامی سے قبل خود مالک بننے کی اہلیت رکھتا تھا، مملوکیت کا لفظ کسی پہلو سے اس پر عائد ہو نہیں سکتا تھا ہر تصرف اس کا نافذ اور ہر حکم اس کا ناطق تھا وہی غلامی کے بعد اس طرح مملوک بن جاتا ہے کہ مالکیت کی اس میں اہلیت ہی نہیں رہتی نہ اس کا کوئی تصرف درست ہوتا ہے

فی حکمتہ ان یخلق فیہ حالۃ اخری من النعمۃ او لالو کما انہ یخلق فی الماء حرارۃ، فیقتضی ذلک ان یکسوہ صورۃ الھواء، وانما یشترط وجود اختیار وکسب العبد فی الجزاء بالعرض لا بالذات، وذلک لان النفس الناطقۃ لا تقبل لون الاعمال التی لا تستند الیھا بل الی غیرھا من

نہ کوئی حکم نافذ ہونے کے قابل ہوتا ہے اور اس کے مالک کو اس کو بیچ ڈالنے کا بھی حق حاصل ہو جاتا ہے حتی کہ اگر وہ اس کو مار بھی ڈالے جب بھی بعض ائمہ کے نزدیک گو اس کو گناہ کتنا ہی بڑا ہو مگر دنیا میں اس سے قصاص نہیں لیا جاتا۔ باپ بیٹے میں خالقیت سے ذرا سی مشابہت پائی جاتی ہے، وہاں بھی بیٹے کے قتل کرنے کا قصاص باپ سے نہیں لیا جاتا۔ پس جبکہ مالکیت وخالقیت کی ادنیٰ سی مشابہتوں کے بعد سوال وجواب کا مرحلہ ختم ہو جاتا ہو تو جہاں یہ دونوں باتیں اپنی پوری حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہوں بھلا وہاں محاسبہ اور سوال کا حق کس کو ہو سکتا ہے اس لیے فرمایا لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون۔

دوم آپ نے کبھی اس مسئلہ پر بھی غور کیا ہے کہ آخر اس عالم کی آفرینش ہوئی کیوں؟ یہاں صرف ذات جامع صفات کا ایک اقتضاء ہی تو تھا۔ لہٰذا اب جس صورت سے بھی یہ اقتضاء پورا ہوگا وہی مناسب ہوگی۔ کمال یہ چاہتا ہے کہ مہر وقہر دونوں ہی کا ظہور ہو اس لیے ضروری ہوا کہ دونوں کے لیے اسباب بھی پیدا فرمائے جائیں اور چونکہ جزاء وسزا کا عنوان چاہتا ہے کہ جزاء میں عمل کی کچھ تاثیر بھی عیاں رہے تاکہ اچھے پر اچھی جزاء اور برے عمل پر اس کی سزا دی جا سکے اس لیے ضروری ٹھہرا کہ بندہ کو کچھ اختیار بھی دیا جائے اس تناسب کے لیے جتنا اختیار عقلاً ممکن تھا وہ عطا کر دیا گیا اور اسی پر جزاء وسزا کو دائر کر دیا گیا۔ اب جب کبھی بندہ اپنے اس عطا کردہ اختیار سے برا عمل کرتا ہے وہ دنیا میں بھی برا کہلاتا ہے اور اگر بھلا کرتا ہے بھلا کہلاتا ہے جب اس کے ان افعال پر دنیا میں تعریف ومذمت کرنا معقول ہوگئی تو آخرت میں معقول کیوں نہ سمجھی جائے ؎

چلا عدم سے میں ہستی کو بول اٹھی تقدیر　　بلا میں پھنسنے کو کچھ اختیار لیتا جا

رہ گئی یہ بات کہ جب برے افعال کرنا بری بات ہے تو اس کا پیدا کرنا کمال کیونکر سمجھا جائے تو سمجھیے کہ خلق اور کسب میں بڑا فرق ہے۔ انسان جب کوئی عمل کرتا ہے تو وہ عمل اس کے ساتھ اس طرح قائم ہوتا ہے جیسے کپڑے کے ساتھ سفیدی اور سیاہی۔ اب جب اس لحاظ سے کپڑے کو سفید اور سیاہ کہہ سکتے ہیں تو ان اعمال کے لحاظ سے بندہ کو برا اور بھلا بھی کہہ سکیں گے، مگر مخلوق خالق سے علیحدہ رہتی ہے وہ اس کے ساتھ قائم نہیں ہو جاتی، لہٰذا بری مخلوق خالق کی صفت نہیں ہو سکتی، البتہ اس کا پیدا کرنا اس کی صفت ہوتی ہے صفت خلق بہرکیف کمال ہے، اسی لیے ناقص نہ خیر پیدا کر سکتا ہے نہ شر کیونکہ خلق مطلقاً ایک کمال ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ خلق شر کمال کیوں ہے؟ تو ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ جب خلق کرنے میں ظہور قہر کی مصلحت بھی ہو تو

بجهة الكسب ولا الاعمال التي لا تستند الى اختيارها وقصدها، وليس في حكمة الله ان يجازي العبد بما لم تقبل نفسه الناطقة لونه، فاذا كان الامر على ذلك كفى هذه الاختيار غير المستقل في الشرطية اذا كان مصححا لقبول لون العمل، وهذا الكسب غير المستقل

پھر اس کو بھی مقتضائے کمال کیوں نہ کہا جائے ؎

درکارخانۂ خلق از کفر ناگزیر است　　آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

شاعر یہاں یہی مضمون کہہ رہا ہے کہ عالم میں کفر اس لیے ضروری ہے کہ اگر ابولہب جیسا کافر نہ ہو تو پھر جہنم کی پیدائش کا فائدہ؟ بادشاہی کا کمال دونوں قسم کی طاقتوں ہی سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے کافر کے حق میں کفر کتنا ہی قبیح سہی لیکن خالق کے حق میں تو مظہرِ کمال ہوتا ہے۔ دیکھیے بیت الخلاء یعنی پاخانہ خود کتنی ہی کمتر چیز ہو لیکن ایک بڑی سے بڑی کوٹھی اس وقت تک ناقص ہی سمجھی جاتی ہے جب تک کہ اس میں یہ ناقص در ناقص چیز بھی موجود نہ ہو جس طرح ایک کوٹھی کے لیے بیت الخلاء کا وجود ضروری ہے اسی طرح عالم کے کمال کے لیے بھی صدیقِ اکبرؓ جیسے مومنِ کامل کے بالمقابل ایک ابولہب جیسے کافر کی بھی ضرورت ہے، پھر جس طرح کوٹھی میں یہ سوال کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے کہ اس زمین نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو بیت الخلاء بنا دیا، اور اس ٹکڑے میں کیا کمال تھا کہ اس کو شہ نشین بنا دیا۔ اسی طرح یہاں بھی یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ ابولہب نے کیا قصور کیا تھا کہ اس کو کافر بنا دیا، اور صدیقِ اکبر میں کیا کمال تھا کہ ان کو صدیقیت سے نواز دیا یہ سب مالک کے اپنے ارادہ اور پسند کی بات ہے کسی کو اس میں دخل در معقولات کا حق نہیں ہے۔

بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا　　غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے فوائدِ قرآن کریم میں زیرِ تفسیر آیۃ ولا یظلم ربك احدًا (الكهف) مسئلۂ تقدیر کا حل اس طرح تحریر فرمایا ہے:

"رب جو کرے سو ظلم نہیں سب اسی کا مال ہے، پر ظاہر میں جو ظلم نظر آئے وہ بھی نہیں کرتا ہے" گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی ضائع نہیں کرتا، اور جو کوئی کہے (یعنی اعتراض کرے) گناہ میں ہمارا کیا اختیار ہے؟ سو (یہ) بات نہیں (رہی) اپنے دل سے پوچھ لے، جب گناہ پر ہے اپنے قصد سے دوڑتا ہے۔ اور جو کوئی کہے قصد بھی اسی نے دیا تو قصد دونوں طرف لگتا ہے، اور جو کوئی کہے اسی نے ایک طرف لگا دیا، سو بندہ کی دریافت سے باہر ہے، بندہ سے معاملہ ہوتا ہے اس کی سمجھ پر، بندہ بھی پکڑیگا اسی کو جو اس سے بدی کرے، یہ نہ کہیگا کہ اس کا کیا قصور اللہ نے کرا دیا"

ان سطور کو بار بار بغور پڑھیے مسئلۂ تقدیر کا جتنا واضح حل اور جتنی سادگی سے آپ کو یہاں ملیگا بڑی بڑی کتابوں

اذا کان مصححا لتخصیص هذا العبد بخلق الحالة المتأخرة فیه دون غیرہ، وھذا تحقیق شریف مفهوم من کلام الصحابة والتابعین فاحفظه . (صفحہ ۱۶۷۔ حجۃ اللہ)

میں نہیں ملیگا بشرطیکہ سمجھنے کا ارادہ بھی ہو۔ خاتمۂ بحث پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق حضرت الاستاذ علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کی جو نظم ہے وہ بھی ہدیہ ناظرین کردی جائے، اس میں تمام گزشتہ تفصیلات کو بہت مختصر اور عمدہ پیرایہ میں سمیٹ دیا گیا ہے، اگر آپ نے ان تفصیلات کو سمجھ کر ذہن نشین کرلیا ہے تو پھر آپ ان اشارات سے جو اس مختصر نظم میں اس مسئلہ میں اشکالات کے حل کے لیے کیے گئے ہیں پورے طور پر محظوظ ہوسکتے ہیں :-

ایا صاحبی ان الکلام بقدرتك طویل وتحریر الخلاف یطول

عزیزمن! تمہاری قدرت کی داستان بہت دراز ہے، اگر اس میں مذاہب کی تفصیلات بھی بیان کی جائیں تو افسانہ اور دراز ہوتا ہے۔

ففیك اختیار لیس منك وذلك لجبر اختیار لا یکنك ذهول

اس لیے مختصر یہ سن لو کہ تم میں اختیار کی صفت تو یقیناً پیدا فرمائی گئی ہے، مگر اس اختیار پر تمہارا اختیار نہیں ہے اس لیے یہاں جبر بھی ہے مگر افعال پر نہیں اختیار پر ہے۔

واما اختیار مستقل فانه محال فلا یسألك عنه سئول

اب رہا ایسا اختیار مطلق جس کے اوپر کسی کا جبر نہ ہو تو وہ مخلوق کے حق میں محال ہے، نہ مخلوق خالق بن سکتی ہے نہ اختیار مستقل اس کو مل سکتا ہے، لہذا اس کے متعلق تم سے کوئی حریص سوال نہ کرے۔

فافعالنا منا علی اختیارنا ولکنها نحو القدیر یئول

خلاصہ یہ ہوا کہ ہمارے افعال ہماری قدرت سے سرزد ہوتے ہیں اور ہمارے اختیار ہی سے صادر ہوتے ہیں لیکن چونکہ ہماری قدرت و اختیار قادر مطلق کی عطا فرمودہ ہیں اس لیے افعال کی نسبت اس طرف بھی رہتی ہے۔

وهذا هو الکسب الذی کلفوا به وفیه اقتصاد فلیکنك قبول

امام ماتریدی نے اس مسئلہ میں خلق و کسب کا جو فرق فرمایا ہے اس کی تفسیر بھی یہی ہے اور یہی درمیانی راہ بھی ہے اس لیے چاہیے کہ تم اس کو بسر و چشم قبول کرلو۔

ویثمر شرا شر ما ینبغی له فیزعمه الظلم الصریح جهول

رہا جزاء و سزا کا مسئلہ تو وہ واضح ہے کہ شر سے شر ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ جاہل آدمی اس کو ظلم سمجھنے لگتا ہے۔

کایرات خبث البذر خبث نباته طباعا ولا یأتیه قال یقول

دیکھو اگر خراب درخت کا تخم ہو تو کیا اس سے ویسا ہی درخت طبعًا پیدا نہیں ہوتا پھر یہاں کون سوال و جواب کرتا ہے کہ اس تخم سے یہ خراب درخت ہی کیوں پیدا ہوا؟

ولیس جزاء ذاک عین فعالنا   ولکن ستراً حال سوف یزولٗ

اگر غور کرو تو جس کو تم جزا سمجھ بیٹھے ہو یہ جزا نہیں وہی دنیا میں کیے ہوئے تمہارے اچھے بُرے اعمال ہیں جو دوزخ اور جنت میں ثواب و عذاب کی شکل میں نظر آئینگے۔ جو حجاب یہاں ہماری آنکھوں پر اس حقیقت کے دیکھنے سے مانع ہو رہا ہے قیامت میں وہ اُٹھ کر رہیگا، اس وقت یہ بات صاف صاف نظر آجائیگی۔

ولا یستوی المیزان الا بحصلۃ   تفوت بادنی میلۃ فیعولٗ

ترازو کے دونوں پلوں کے برابر رہنے کی صرف ایک ہی صورت ہوتی ہے، جہاں ایک طرف جھکاؤ پیدا ہوا اور وہ ختم ہوئی۔ اسی طرح تقدیر کے جبر و اختیار کے پلوں کو بھی برابر رکھنا چاہیے ورنہ جبریہ یا قدریہ میں شامل ہو جاؤ گے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ و خیرتہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا

مسئلہ قضاء و قدر علمی نظر میں

قضاء و قدر اور اکتشافاتِ عصریہ کا اُس پر اثر

مسئلہ قضاء و قدر اگرچہ عہدِ قدیم سے عقلاء کے درمیان معرکۂ بحث بنا ہوا ہے، مگر ہمارے دور میں جس نظریہ کے ماتحت اس پر نظر ڈالی جا رہی ہے وہ قدیم نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ عہدِ ماضی میں خالق کی زبردست ہستی تو سب کو مسلّم تھی بحث صرف اس میں تھی کہ بندوں کے افعال قدرت کی گرفت سے آزاد ہیں یا ان پر بھی اس کا فولادی شکنجہ کسا ہوا ہے، لیکن دورِ حاضر کا انسان تو یہ سمجھتا ہے کہ جب اکتشافاتِ عصریہ نے یہ ثابت کر کے دکھا دیا ہے کہ انسان اپنے افعال کی دنیا ہی نہیں بلکہ اپنی ضروریات کی جملہ مصنوعات کی تخلیق و تخریب کے لیے خود کافی ہے تو اب کسی خارجی قدرت کو بے وجہ تسلیم کیے چلے جانا محض بے معنی اور کورانہ تقلید ہے۔ گویا اب بحث یہ نہیں رہی کہ کوئی خارجی طاقت تو موجود ہے مگر ہمارے افعال پر اس کا کنٹرول کتنا ہے، بلکہ نقطۂ بحث یہ بن گیا ہے کہ انسانی قدرت کے ان مظاہروں کے بعد کیا اس پر کسی خارجی قدرت کا تسلط تسلیم کر لینا معقول بھی ہے؟ عالمِ غیب سے اس ناآشنا جماعت کو یہ خبر ہی نہیں کہ مسئلۂ تقدیر انسانی جدوجہد یا اس کی درماندگی کی وجہ سے کسی وقت بھی زیرِ بحث نہیں رہا بلکہ ہمیشہ زیرِ بحث یہ رہا ہے کہ انسانی افعال خواہ وہ معمولی سے معمولی ہوں یا مشکل سے مشکل درحقیقت ان میں انسانی قدرت کا دخل ہوتا بھی ہے یا نہیں اگر ہوتا ہے تو کتنا۔ جس جماعت کا خیال یہ ہے کہ انسان گو خود مخلوق ہے مگر اپنے افعال کی تخلیق کی اس کو پوری پوری قدرت عطا کر دی گئی ہے اس کے نزدیک اس کے محیر العقول کارنامے اور اس کے معمولی سے معمولی افعال دونوں کے دونوں اسی کی قدرت کے رہینِ منت ہیں اور جس کے نزدیک اس کو یہ قدرت عطا نہیں ہوئی اس کے نزدیک بھی انسانی افعال میں معمولی اور غیر معمولی کی کوئی تفریق نہیں خواہ وہ سائنس کی جدید ایجادات ہوں یا ادنیٰ سے ادنیٰ افعال دونوں کے دونوں اس کی قدرت سے خارج اور براہِ راست قدرتِ الٰہیہ کے زیرِ اثر ہیں۔

پس انسان کی مصنوعات کی حیرت انگیز ترقیات دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھنا گویا اب مسئلۂ تقدیر سے حجاب اُٹھ گیا ہے، صرف ایک خوش فہمی ہے۔ یاد رکھیے کارخانۂ عجائبات جتنا پھیلتا چلا جائیگا قضاء و قدر کا سوال بھی اتنا ہی اور پھیلتا چلا جائیگا، کیونکہ قضاء و قدر کا سبق ہمیں اپنی مصنوعات اور مساعی سے کہیں باہر

جاکر پڑھتا نہیں ہے بلکہ خود اپنے ان افعال ہی کے ضمن میں پڑھتا ہے اس لیے ہمارے افعال کا عمق جتنا اور بڑھتا رہیگا قضاء و قدر کا سوال بھی اتنی ہی گہرائی میں اُٹھتا رہیگا۔

قضاء و قدر اور انسانی جدوجہد سے اس کا تعلق

موجودہ مفکرین کو ایک مغالطہ یہاں یہ بھی ہے کہ مسئلۂ قضاء و قدر انسانی ترقیات میں ایک بہت بڑی رُکاوٹ کا باعث ہے، ان کے زعم میں انسانی دماغ پر کسی فوقانی طاقت کی قہرمانی کے اعتقاد کا اثر اس کے عزائم اور قوائے عملیہ پر پڑے بغیر رہ نہیں سکتا وہ تقدیر پر یقین کر کے عزم و ہمت کے ساتھ کسی معاملہ میں بھی پوری پوری جدوجہد کر نہیں سکتا بلکہ اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا اور نوشتۂ تقدیر پر اعتماد کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہتا ہے۔ یہ مغالطہ بھی محض اپنی ہی خام خیالی کا ثمرہ ہے، کیونکہ اس مسئلہ کا حاصل محض ایک غیبی حقیقت کا انکشاف ہی یعنی یہ کہ عالم اسباب میں جو کچھ بھی نظر آ رہا ہے خواہ وہ اسباب ہوں یا اُن کے نتائج یہ دونوں حالتیں اس کے وسیع احاطہ میں شامل ہوتی ہیں۔ یوں نہیں ہے کہ تقدیر تو کہیں جداگانہ لکھی ہوئی رکھی ہے اور انسانی افعال اس سے کہیں ایک طرف ہو رہے ہیں بلکہ وہ انسانوں کی ان ہی مختلف جدوجہد میں نہاں ہو اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی یہ ظاہری جدوجہد سب اسی کی مسخر اور اسی کے تابع ہے، اگر وہ اس کے خلاف کرنا چاہے بھی تو کر نہیں سکتا بلکہ اس کے دل میں اس ارادہ کا خطور بھی نہیں ہو سکتا۔

اگر تقدیر کے تحت صرف ثمرات و نتائج ہوتے اور اسباب و وسائل اس سے باہر تو اب اسباب و وسائل میں ضعف کا امکان ہوتا اور ہر انسان یہ خیال کر سکتا تھا کہ جب نتائج طے شدہ ہیں تو اب اپنی جدوجہد بے سود ہے لیکن جبکہ نتائج کی طرح اسباب بھی احاطۂ تقدیر میں شامل ہو چکے ہیں تو صرف اس عقیدہ سے ترکِ اسباب کا اثر کیسے پیدا ہو سکتا ہے، بالخصوص جبکہ ثمرات و نتائج کا کسی کو علم بھی نہیں ہوتا۔ فرض کر لو اگر ہمیں کسی معاملہ میں اپنی کامیابی یا ناکامی کا علم ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ ہماری عملی جدوجہد بھی سرد پڑ جائے، لیکن اگر نتائج کا علم ہی نہ ہو اور اسباب کے علم کے ساتھ ساتھ اُن پر قدرت بھی حاصل رہے تو کیا کوئی انسان اُن کے ارتکاب سے باز رہ سکتا ہے یا اس کے عزم میں کوئی ادنیٰ سا اضمحلال بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نتائج سے لاعلمی کی وجہ سے اسباب کے ارتکاب کرنے پر فطرۃً مجبور ہوگا اور اسے ہونا بھی چاہیے۔ بلکہ اگر نتائج کا علم بھی ہو جائے پھر بھی قضاء و قدر پر اعتقاد کسی ادنیٰ ضعف کا موجب نہیں ہو سکتا کیونکہ تقدیر یہ تعلیم نہیں دیتی کہ جب نتائج میرے احاطہ میں شامل ہو چکے ہیں تو اب وہ برآمد ہو کر ہی رہینگے خواہ تم سعی کرو یا نہ کرو۔ بلکہ یہ حکم دیتی ہے کہ تم میری طرف مت تکو تم اپنی عملی جدوجہد جاری رکھو اور اپنی حماقت سے یہ مت سمجھو کہ اسباب و وسائل کا ارتکاب کرنا میرے وسیع احاطہ

سے خارج ہے، وہ بھی ٹھیک نتائج کی طرح اس کے اندر داخل ہے، اس لیے جس طرح نتائج مقدرہ کا ظہور ضروری ہے اسی طرح اسبابِ مقدرہ کا ارتکاب کرنا بھی لازمی ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ قضاء و قدر پر ایمان رکھنے کے بعد اسباب پر وہ اعتماد نہیں رہتا جو منکرین قدر کو ہوتا ہے تو ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینے میں ذرا تامل نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک اسباب پر یہ بے اعتمادی ایمان باللہ کا لازمی ثمرہ ہے لیکن اس کے باوجود قضاء و قدر کا نتیجہ ترکِ اسباب نہیں نکلتا، مومن بالقدر بھی پوری سعی کرتا ہے مگر اس یقین پر کہ فتح و نصرت صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوگی لیکن چونکہ ارتکاب اسباب کے لیے اس کا حکم ہے اور ان ہی کے ضمن میں اس کا وعدۂ نصرت بھی ہے، اس لیے ان کا ارتکاب لازم ہے اور جو منکرِ قدر ہے سعی وہ بھی کرتا ہے مگر بندۂ اسباب بن کر۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ صرف ایک علمی اور مخفی حقیقت کا انکشاف ہے، اگر اس کو انسانی جدوجہد کے ساتھ کوئی ادنیٰ بھی اختلاف ہوتا تو اس عقیدہ پر ایمان لانے کے ساتھ شریعت ہم پر عملی جدوجہد کا بوجھ کبھی نہ ڈالتی، حالانکہ قرآن کریم کی صدہا آیات، احادیث کے دفتر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک ایک لمحہ ہم کو یہی سبق دیتا ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی عملی زندگی اگر دیکھی جائے تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قضاء و قدر پر اعتماد کا سبق انہوں نے ہمیشہ عملی جدوجہد کے ضمن ہی میں پڑھا ہے۔ فتح و شکست کے میدانوں اور خانۂ خدا کی عبادت گاہوں میں دونوں جگہ یکساں جو عملی سرگرمی ان کی نظر آتی ہے تقدیر کا انکار کرنے والے شاید اس کا کوئی شمہ اپنی زندگی میں پیش نہیں کر سکتے۔

قضاء و قدر کی حقیقت اور شرعی نظر میں اس کی اہمیت

شرعی نظر میں اس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس نے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کی طرح ایمان بالتقدیر کو بھی اسلام کا ایک رکنِ لازم قرار دیا ہے، گویا جو شخص تقدیر پر ایمان نہیں رکھتا وہ اللہ اور اس کے رسول پر بھی ایمان نہیں رکھتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کو ماننا اسی وقت صحیح طور پر ماننا کہا جا سکتا ہے جبکہ اُن کی فرمودہ تمام باتوں کو بھی تسلیم کیا جائے۔ لہٰذا صرف تقدیر ہی نہیں بلکہ اس کی تمام کتابوں کا ماننا اس کے رسولوں اور فرشتوں کا ماننا جنت و دوزخ اور اسی طرح قیامت کا ماننا بھی لازم ہوگا۔ ادیان سماویہ میں کسی دین کو بھی ان امور میں کوئی اختلاف نہیں رہا، اسی لیے ان امور کو اصولِ دین کہا جاتا ہے۔ رسولِ خدا نے تنہائی میں، محفلوں میں، کوچوں میں اور بازاروں میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں پہنچ پہنچ کر ایک بار نہیں بار بار ان کا اعلان نہ کیا ہو۔ فرمائیے کہ اس شد و مد کے اعلان کے بعد بھی اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک بات کا بھی انکار کر گذرتا ہے، کیا وہ درحقیقت رسولِ خدا کو مانتا ہے۔ اور کیا جو رسول کو نہیں

مانتا وہ صحیح طور پر خدا کو مانتا ہے؟

ایمان بالتقدیر کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے اس کی حقیقت کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لیں اس کے بعد آپ کو یہ سمجھ لینا آسان ہوگا کہ اس کو رکنِ اسلام کی حیثیت کیوں دی گئی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ تقدیر صرف اس یقین کا نام نہیں ہے کہ کائنات میں جو حرکت و سکون ہو رہا ہے ان سب کا اللہ تعالیٰ کو علم حاصل ہے، کیونکہ یہ تو قضا و قدر کی بحث نہیں ہے یہ تو صفتِ علم کا مسئلہ ہے، اس میں تو اسلامی فرقوں میں سے کسی کو بھی کلام نہیں، جو شخص اس کا منکر ہے وہ تو کھلا کافر ہے۔ تقدیر کے جس معنے کے سمجھنے کی توفیق صرف اہلِ حق کے حصہ میں آئی ہے وہ یہ ہیں کہ تقدیر کے آگے تمام عالم مجبور ہے اُس کا کوئی ذرہ اس کے خلاف جنبش نہیں کرسکتا، جس کے حق میں جنتی ہونا طے پاچکا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جنتی شخص ہی کے سے عمل کرے اور جس کے لیے اس کے خلاف طے ہوگیا ہے اس کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ کوئی دوسرا عمل کرسکے۔ اس کے باوجود انسان سے افعالِ شرعیہ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ کارخانۂ عالم تمام کا تمام اسباب و مسببات کے پورے پورے تناسب کے ساتھ قدرت نے باہم اس طرح الجھا دیا ہے کہ اس کی ظاہری سطح کو دیکھ کر یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ اپنا نظام قائم رکھنے کے لیے شاید یہی خود بخود کافی ہو۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لاکر کسی ظن و تخمین سے نہیں بلکہ پوری تحقیق سے یہ تعلیم فرماتے ہیں کہ جس طرح یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوگئی اسی طرح اس کا نظامِ عمل بھی خود بخود نہیں بن گیا بلکہ خالقِ کائنات نے اس کو شرفِ وجود بخشنے سے قبل ہی اس کا نظامِ عمل بھی بنا کر رکھ دیا تھا۔ عالم نہ خود اپنا کوئی نظامِ حیات بنا سکتا ہے نہ اس پر خود عمل کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ جس طرح سرتاسر اپنے وجود میں خالق کا محتاج ہے اسی طرح اپنے نظامِ حیات میں بھی بلکہ اس پر عمل کرنے میں بھی اسی کا محتاج ہے۔ جب انبیاء علیہم السلام کی زبانی انسان کو اپنی بے کسی و بے بسی کی یہ داستان معلوم ہوتی ہے تو پھر اس کے اعتقاد کی دنیا بھی بدل جاتی ہے اور اس میں ایک عظیم انقلاب برپا ہونے لگتا ہے۔ اسبابِ سفلیہ اس کی نظروں میں حقیر ہو جاتے ہیں، دنیا کے ہوش رُبا نظارے اس کی نظروں میں ہیچ بن جاتے ہیں، اسبابِ مجازیہ کی تاثیر کا تصور اس کے دماغ سے نکل جاتا ہے وہ ان کا ارتکاب کرتا تو ضرور ہے مگر ان کو معبود بنا کر اُن سے چپک نہیں جاتا بلکہ اس حالت میں بھی اس کی دور بین نظریں برابر مؤثرِ حقیقی کی طرف لگی رہتی ہیں اور اس طرح معبودانِ باطلہ کٹ کر معبودِ برحق سے ملنے کا راستہ صاف ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ ایمان بالقدر کی اہمیت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اس کے بغیر انسان کو اپنی خود مختاری کے گھمنڈ سے نجات حاصل نہیں ہوتی یا عالمِ غیب کی ایک ضروری حقیقت سے جہل کا داغ دور نہیں

ہوتا بلکہ اس لیے بھی ہے کہ اس کے بغیر پروردگار عالم سے عالم کا کوئی ربط ہی قائم نہیں رہتا، جو لوگ اس کے قائل نہیں وہ یا تو خالق سے مستغنی بن چکے ہیں یا اس کو ایسی حیثیت دے چکے ہیں جس کے بعد اس کا خالق ماننا نہ ماننا برابر ہو جاتا ہے۔ ہمارے اس بیان سے جہاں اس عقیدہ کی اہمیت ظاہر ہو گئی اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ماننے میں تقدیر کا ماننا بھی کیوں داخل ہے اور تقدیر کا انکار اللہ تعالیٰ کے انکار کے مرادف کیوں ہے؟ اس لیے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

ایمان بالقدر نظام التوحید فمن	یعنی نظام توحید ایمان بالقدر پر دائر ہے، جو شخص ایمان
آمن وکذب بالقدر فھو نقض	لائے اور تقدیر کا انکار کرے اُس نے توحید کو بھی
للتوحید (کتاب السنہ للامام احمدؒ ص۱۲۳)	باطل کر دیا۔

اسی طرح قیامت کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار ہی کے برابر ہے سورہ والتین میں الیس اللہ باحکم الحاکمین فرما کر اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کو مانتے ہو تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ اس کی حکومت سب پر ہے پھر لازم ہوگا کہ وہ ایک دن اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ بھی کرے ورنہ وہ احکم الحاکمین تو کیا ہوتا حاکم بھی نہ ہوا، اسی طرح جنت و دوزخ کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار ہی کے مرادف ہے تفصیل اپنے اپنے موقع پر آئیگی یہاں صرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ مذکورہ میں زمانہ قدیم کے چیدہ خیالات
اور
مذہبِ اہلِ حق کی توضیح و تحقیق

مذکورۂ[1] بالا مسئلہ میں اصولی مذاہب چار ہیں۔ جبریہ، معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ جبریہ کہتے ہیں کہ بندہ کے افعال صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے صادر ہوتے ہیں، اس میں خود کوئی قدرت نہیں۔ معتزلہ کا یہ خیال ہے کہ اس میں صفت قدرت بھی ہے اور اسی کی تاثیر سے انسانی افعال صادر ہوتے ہیں۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ بندہ

---

[1] تعجب ہے کہ مسئلہ قضاء و قدر میں اگر ہمارے دور میں کوئی اشکال پیدا ہوتا ہے تو انسان کے مجبور رکھنے میں ہوتا ہے اگر اس کو مختارِ مطلق کہہ دیا جائے تو پھر دماغوں میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی حالانکہ جن کی اتباع میں آج اسلام کی ہر بات کے اندر نکتہ چینیاں کی جا رہی ہیں ان کا ایک ایسا طبقہ جس کو مسائل فلسفیہ کا ہیرو کہنا چاہیے جبریہ ہی کی طرف مائل تھا، چنانچہ سینٹ اوغسٹن، لوتھر، کانون، جانسن نیوس سب جبریہ تھے۔ اور آخر دور میں ہوبس (Hobes) اسپینوزا (Spinoza) ڈیوڈ ہیوم، کولنس، ہیل، لائبنچ بھی جبری تھے۔ اسی طرح کانٹ (Kant) سٹوارٹ میل، دیدرو، دولباخ، لامٹری سب جبر کے قائل تھے۔ (دیکھو دائرۃ المعارف۔ الموقف البشر ص ۲۳۸)

میں صفت قدرت تو ہے مگر اس کے افعال میں اس کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی بلکہ جب کبھی بندہ کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اس کو پیدا فرما دیتا ہے، گویا اشاعرہ کا مذہب ان دونوں کے درمیان ہے ان کے نزدیک بندہ نہ تو جبریہ کی طرح مجبور محض ہے اور نہ معتزلہ کی طرح مختار مطلق۔

بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ جبریہ کے نزدیک بندہ میں نہ قدرت ہے نہ ارادہ بلکہ نہ فعل، وہ بالکل جماد محض کی طرح بے اختیار ہے اور اشاعرہ قدرت، ارادہ اور فعل تینوں کے قائل ہیں، مگر یہ کہتے ہیں کہ اس کی قدرت کو صدور افعال میں کوئی تاثیر نہیں، اس کے افعال کو اللہ تعالیٰ خود پیدا فرما دیتا ہے، اسی طرح بندہ میں صفت ارادہ بھی ہے اور اس کے افعال اس ارادہ کی طرف منسوب بھی ہوتے ہیں، مگر ارادہ و اختیار کی یہ صفت از خود انسان میں نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ نے جیسا خود انسان کو پیدا فرمایا ہے اس کی اس صفت ارادہ و اختیار بلکہ تمام صفات کو بھی اُسی نے پیدا فرمایا ہے، اسی وجہ سے انسان کو مختار کہا جاتا ہے۔ اگر اس میں اختیار کی صفت نہ ہوتی تو اس کو مختار کیسے کہا جا سکتا ہاں چونکہ یہ اختیار خود اس کے اختیار میں نہیں اس لحاظ سے اس کو مضطر اور مجبور کہنا بھی صحیح ہے، لہذا کہا جاتا ہے کہ بندہ مختار بھی ہے اور مجبور بھی یعنی اپنے افعال میں تو مختار ہے کیونکہ صفتِ اختیار اس میں پیدا کی گئی ہے اور خود اس صفت اختیار میں مجبور ہے کیونکہ یہ صفت نہ اس کی پیدا کردہ ہے اور نہ اس صفت پر اس کا اختیار ہے کہ جس طرف چاہے اس کو لگائے وہ اسی جانب لگنے پر مجبور ہے جس طرف مختار مطلق اس کو لگائے۔ اشاعرہ نے صفت قدرت کا اقرار کر کے اپنے مذہب کو جبریہ کے مذہب سے ممتاز کرنے کی کوشش تو کی مگر چونکہ قدرت غیر مؤثرہ کے اقرار اور نفس قدرت کے انکار میں بلحاظ نتیجہ کوئی فرق نہیں نکلتا اس لیے ان کا مذہب جبریہ کے مذہب سے زیادہ ممتاز نہیں ہوتا اس لیے اس فرق کی وضاحت کے لیے کسی قدر اور تفصیل کی ضرورت ہے۔

شیخ اشعریؒ کے مذہب کی توضیح کے لیے حسب ذیل امور کو صاف کر لینا ضروری ہے:۔

(۱) انسانی افعال میں جب اس کی قدرت و اختیار کی کوئی تاثیر نہیں تو پھر انسان اور اس کے افعال میں صحیح رشتہ کیا ٹھہرا اور ان کی نسبت انسان کی طرف کرنا کیونکر درست ہوئی۔

(۲) افعال انسانیہ میں جب کہ اس کی قدرت و اختیار کی تاثیر بداہۃً محسوس ہوتی ہے تو اس کا انکار کیسے کر دیا جائے

(۳) اگر افعال انسانیہ میں اس کی قدرت کی کوئی تاثیر نہیں تو پھر ان پر نہ مدح و ذم معقول ہے اور نہ جزاء و سزا۔

پہلی تنقیح کا جواب یہ ہے کہ شیخ کے نزدیک ان افعال کا علاقہ انسان کے ساتھ صرف اتنا ہوتا ہے کہ جب بندہ کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو اپنی قدرت کاملہ سے اس بندہ میں پیدا فرما دیتا ہے، بس اس کا ان افعال کے لیے محل ہونا ہی انسان اور اس کے افعال کا علاقہ سمجھنا چاہیے اسی کا نام کسب ہے گویا

اب بندوں کے افعال کا حاصل یہ ہے کہ وہ مخلوق تو اللہ تعالیٰ کی ہیں اور مکسوب بندوں کے لیکن چونکہ بندہ کا محل بنایہ ہوتا ہے اس کی صفت اختیار کے ساتھ ساتھ اس لیے سمجھ میں بھی آتا ہے کہ یہ افعال اسی کے اختیار سے ہو رہے ہیں، اس کو ایک مثال سے سمجھیے مثلاً ایک ٹرین جو لاکھوں ٹن کی ہوتی ہے اس کو حرکت دینے والا حقیقت میں تو انجن ہی ہوتا ہے لیکن اگر ایک بچہ بھی اس کو اسی جانب حرکت دے رہا ہو تو بظاہر یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید اس بچہ کی طاقت کی بھی یہاں کچھ تاثیر ہوگی، بالخصوص جبکہ اس میں بھی قدرت موجود ہے خواہ وہ کتنی ہی ضعیف سہی مگر اس کے باوجود چونکہ یہاں حقیقتِ حال روشن ہو چکی ہے اس لیے یہی کہا جاتا ہے کہ ٹرین کی حرکت میں صرف انجن کی طاقت مؤثر ہے، بچہ میں گو طاقت تو ہے مگر وہ ٹرین کی حرکت میں کچھ مؤثر نہیں صرف انجن کی طاقت کے ساتھ ساتھ اور اس کے مقارن ہو رہی ہے، اسی طرح "خلق" بھی بڑی وزنی چیز ہے، وہ ممکن کے بس کی بات نہیں یہاں انسانی قدرت کو اپنے افعال کے خلق میں بس اتنی ہی تاثیر ہوتی ہے جتنی کہ ابھی آپ نے مثال مذکور میں بچہ کی دیکھی بلکہ اتنی بھی نہیں کیونکہ وہاں پھر بھی کسی درجہ میں تو تاثیر کہی جا سکتی ہے گو وہ کتنی ہی قلیل ہو، اور یہاں تو کسی درجہ میں بھی کوئی تاثیر نہیں کہی جا سکتی۔ مگر چونکہ انسانی قدرت صرف ہونے کے ساتھ ساتھ افعال اس کے ساتھ قائم ہوتے چلے جاتے ہیں اور خالق حقیقی رہتا ہے پردۂ غیب میں اس لیے یہ حکم لگانے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ افعال خود انسان ہی کی قدرت کی پیداوار ہیں۔

اب رہا انسانی قدرت کے تاثیر کا بدیہی ہونا تو جہاں بڑے بڑے عقلاء کا اتنا اختلاف موجود ہو وہاں بداہت کا حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں بدیہی صرف اپنی قدرت کا ادراک ہے۔ آگے اس قدرت کی ان افعال میں تاثیر ہے بھی یا نہیں، اور اگر ہے تو کتنی، یہ بدیہی نہیں ہے اور کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اس میں اختلاف آراء بدیہی ہے، بس جتنی بات بدیہی تھی اس کا شیخ نے بھی اقرار کر لیا ہے، یعنی انسان میں صفت قدرت تسلیم کر لی ہے، اور جتنی بات بدیہی نہیں ہے اس کے تسلیم کرنے سے شیخ نے انکار کر دیا ہے۔

دیکھو قدرت نے بے شبہ آگ کو پیدا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ چونکہ جلانا ہمیشہ سے اس کا فعل نظر آ رہا ہے اس لیے یہاں بھی یہ حکم لگا دیا جاتا ہے کہ آگ بداہۃً جلاتی ہے، حالانکہ جلانے میں آگ کی تاثیر کا گمان کر لینا یہ اپنے ذہن کا حکم ہے، بدیہی نہیں اگر ابتداء آفرینش سے آگ جلایا نہ کرتی تو کسی کو بھی اس تاثیر کا وسوسہ نہ گزرتا لیکن اس عالم میں چونکہ سنۃ اللہ یہی ہے کہ جب آگ کہیں ہوتی ہے تو وہ اس کے ساتھ ساتھ جلانے کا فعل بھی پیدا کر دیتا ہے اس لیے یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ شاید یہ اسی کی تاثیر ہوگی۔ اسی طرح انسان اور اس کے افعال کا حال سمجھنا چاہیے، یہاں تاثیر کا گمان کرنا مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اہل عرف کی نظریں چونکہ اتنی دور رس اور باریک بیں نہیں ہوتیں اس لیے وہ صرف اس ظاہری معیت کو دیکھ کر خود انسان ہی کو اپنے افعال کا فاعل کہہ دیتے

ہیں، اور ظاہر کے لحاظ سے درست کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ افعال انسانیہ کا علاقہ انسان کے ساتھ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ ان افعال کے لیے محل ظہور ہوتا ہے اور چونکہ یہ افعال اس کے ساتھ قائم ہوتے ہیں، اس لیے اُن پر اس کی تعریف یا مذمت بھی کیجاتی ہے۔ دیکھو خوبصورتی اور بدصورتی ان پر بھی انسان کی تعریف یا مذمت ہوتی ہے، حالانکہ یہ بھی اُس کی اختیاری صفت نہیں، معلوم ہوا کہ مدح وذم کے لیے اُن صفات کا بالاختیار صدور ضروری نہیں ہے بلکہ صرف ان کا قیام کافی ہوتا ہے۔

شارح عقیدۃ الطحاویہ اس کی مزید وضاحت اس طرح فرماتے ہیں کہ یہاں فعل و مفعول اور خلق و مخلوق کے مابین خلط ہو رہا ہے اس لیے بات صاف نہیں ہوتی، یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بندہ کا جو فعل ہوتا ہے مثلاً نماز، یہ بے شبہ اسی کا فعل ہے اور حقیقۃً ہے مگر یہ اللہ کا فعل نہیں ہے ہاں اس کا مفعول اور اس کی مخلوق ہے۔ اس جگہ جو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے وہ فعل صلوٰۃ کا خلق یعنی اس کا پیدا فرمانا ہے۔ پس جس طرح بندہ کا فعل الگ ہوا اور اللہ تعالیٰ کا فعل الگ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فعل الگ ہے اور اس کی مخلوق الگ۔ دیکھو جب صلوٰۃ کو یہاں بندہ کا فعل قرار دیا گیا تو جس کا وہ فعل ہو اسی کے ساتھ وہ قائم بھی ہوتی ہے اور جو خدا کا فعل ہے یعنی اس کو پیدا فرمانا یہ خلق اُس کی صفت ہے اور وہ اس کے ساتھ قائم ہے۔ نماز اس کا فعل نہیں یہ اس کی مخلوق ہے، لہٰذا اس کے ساتھ قائم بھی نہیں ایسے فعل کو جس کا نفع و نقصان اس کے فاعل کی طرف عود کرے کسب کہتے ہیں، اس لیے کہا جاتا ہے کہ بندے اپنے افعال کے کاسب ہیں اور حق تعالیٰ ان کا خالق ہے اس کا نہ ہماری نماز سے کوئی فائدہ نہ نقصان۔ بندوں کا نماز سے فائدہ بھی ہے اور نہ پڑھنے سے نقصان بھی۔ اس سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے افعال کا علاقہ ہمارے ساتھ کیا ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ کیا۔ اسی کو علماء خلق و کسب سے ادا کرتے ہیں یعنی ہمارے افعال کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے خلق کا ہے اور بندے سے کسب کا، اس بنا پر جزاء و سزا کا حاصل یہ نہیں ہو کہ بندہ تو عمل کرتا ہے اور حق تعالیٰ اس کے نتیجہ میں اس پر اپنی جانب سے جزا یا سزا عطا فرماتا ہے بلکہ یہاں دونوں افعالِ الٰہیہ ہیں اور افعالِ انسانی پر جزاء وسزا کا حاصل خود بعض افعال باری کا بعض پر ترتب کے مرادف ہو جیسے ابھی آپ نے سُنا کہ آگ پر اللہ تعالیٰ جلانا مرتب فرما دیتا ہے، اسی طرح بدعملی پر سزا پیدا فرما دیتا ہے نہ وہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ آگ نے جلایا کیوں نہ یہاں یہ سوال ہونا چاہیے کہ بدعملی پر سزا کیوں دی گئی، بلکہ انسان کے افعال اختیاریہ میں اس کی دوسری غیر اختیاری صفات جن پر اس کی مدح و مذمت کی جاتی ہے اتنی خصوصیت اور زیادہ ہے کہ جن افعال پر صرف مدح و ذم ہوتی ہے وہ انسانی قدرت و اختیار سے مخلوق نہیں ہوتے بااینہمہ

ان پر تعریف بھی کی جاتی ہے اور مذمت بھی لیکن جن افعال پر جزاء و سزا مرتب ہوتی ہے۔ ان کی تخلیق انسانی قدرت واختیار کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے، اس لیے یہاں تعریف و ہجو اور زیادہ معقول ہے۔

شارح عقیدۃ الطحاویہ اس حقیقت کی یوں توضیح فرماتے ہیں کہ انسانوں کے افعال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو اس کی قدرت اور ارادہ سے صادر نہیں ہوتے جیسے رعشہ زدہ انسان کی حرکات ان افعال کو اگرچہ انسان کی صفت تو کہا جاتا ہے مگر ان پر انسانی افعال کا اطلاق نہیں کیا جاتا چنانچہ اگر کسی ایسے شخص کا ہاتھ غیر اختیاری طور پر متحرک ہو تو چونکہ یہ حرکت اس کی صفت ہے لہذا اس کو متحرک تو کہا جائیگا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شخص اپنا ہاتھ ہلا رہا ہے یعنی یہ حرکت اس کا فعل ہے۔ دوسرے قسم کے افعال وہ ہیں جو بظاہر اس کے اختیار و قدرت سے موجود ہوتے ہیں ان کو اس کی صفت بھی کہا جاتا ہے اور ان پر انسانی فعل کا بھی اطلاق ہوتا ہے جیسے سارے افعالِ اختیاریہ۔ ثواب و عذاب انسان کے صرف اِن افعال اختیاریہ ہی پر ہوتا ہے، غیر اختیاری افعال پر نہیں ہوتا۔ اب مسئلہ المجازات کی حقیقت یوں سمجھنی چاہیے کہ جس طرح زہر کھانے سے موت آنا ضروری ہے، اسی طرح زنا سے عذاب ہونا ضروری ہے، ظلم کا سوال نہ وہاں پیدا ہوتا ہے نہ یہاں پیدا ہونا چاہیے جس طرح یہ کہا جائیگا کہ زہر کھانا سبب ہی تھا موت کا اسی طرح یہ کہا جائیگا کہ زنا بھی سبب ہی تھا عذاب کا، گویا یہ دونوں باتیں قدرت کی اسی ترتیب سے پیدا کردہ ہیں جب کوئی شخص خدائی تقدیر سے زہر کھالیتا ہے تو اس پر وہی قدرت دوسرا فعل یعنی موت پیدا فرما دیتی ہے، ٹھیک اسی طرح جب اسی تقدیر کی بناء پر کوئی شخص زنا کرلیتا ہے تو قدرت نے جب یہ فعل پیدا کیا تھا تو اسی کے ساتھ وہ دوسرا فعل عذاب کا پیدا کر دیتی ہے اور اس طرح مسئلۂ مجازات کی حقیقت بعض افعالِ الٰہیہ کا بعض پر ترتب ہے۔

اتنی وضاحت کے بعد بھی غیر مؤثر قدرت کے اقرار اور سرے سے قدرت کے انکار میں کوئی خاص فرق واضح نہیں ہوتا اور نہ یہ بات نکھر کر صاف ہوتی ہے کہ کسب انسانی کا تعلق کس چیز کے ساتھ ٹھہرا صرف اتنا کہدینا کہ کسب بندہ کا اپنے لیے صرف محل بن جانے کا نام یہاں تشفی بخش نہیں۔ اس لیے امام ماتریدی نے کسب کی اس تفصیل کو بے مصداق سمجھا ہے اور اس سے ذرا آگے بڑھ کر اس کا مصداق بھی معین فرمایا ہے کہ بندہ جب کوئی فعل کرتا ہے تو یہاں بداہۃً دو چیزیں نظر آتی ہیں ایک اس کا فعل دوم اس فعل کی ہیأۃ پہلی چیز کو معنی مصدری اور دوسری کو حاصل بالمصدر کہتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص اپنا ہاتھ اوپر سے نیچے ہلاتا ہے تو ایک چیز تو اس کا یہ ہلانا اور یہ حرکت ہوئی یہ تو معنے مصدری ہیں اور دوسری چیز وہ نقشہ ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہاتھ کے اوپر سے نیچے آنے میں نظر آتا ہے، یہ حاصل بالمصدر کہلاتا ہے ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ یہ فعل تو ایک موجود چیز ہے اور انسان کے ہاتھ کے ساتھ قائم ہے دوسری چیز صرف

اعتباری ہے اس کا خارج میں کہیں وجود نہیں نہ وہ جوہر ہے نہ عرض، گویا معنے مصدری تو موجود ہیں گو اس کا وجود بھی خود قائم نہیں بالمحل کے ساتھ قائم ہے لیکن حاصل بالمصدر موجود ہی نہیں ہوتا، وہ صرف ایک خیالی حقیقت ہے جیسا کہ کسی تنکہ کو روشن کرکے دائرہ کی شکل پر زور سے حرکت دی جائے تو حرکت کی سرعت کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے ایک روشن دائرہ سا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس دائرہ کا بھی حقیقۃً کوئی وجود نہیں ہوتا، اسی طرح حاصل بالمصدر کو سمجھنا چاہیے۔

امام ماتریدی فرماتے ہیں کہ یہاں یہ فعل اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور حاصل بالمصدر بندہ کی۔ اور چونکہ حاصل بالمصدر کا وجود محض خیالی ہوتا ہے اس لیے اگر وہ خدا تعالیٰ کی خالقیت سے خارج رہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اشعری اس اعتباری حرکت کو بھی خدا تعالیٰ کی مخلوق قرار دیتے ہیں۔ بہرحال بندوں کے افعال میں جملہ اہلِ حق کا اس پر تو اتفاق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہیں اور بندہ ان کا صرف کاسب ہے اختلاف ہے تو کسب کی تفسیر میں ہے۔ اشعری انسان کے ساتھ ان افعال کے صرف قیام کو کسب فرماتے ہیں اور ماتریدی حاصل بالمصدر کو کسب فرماتے ہیں۔ علماء کلام نے ماتریدیہ کے نزدیک کسب کے اور معانی بھی بیان فرمائے ہیں مگر ان تمام تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔

مسئلہ تقدیر کے لاینحل ہونے کا راز

یہاں دو حقیقتیں اپنی اپنی جگہ اس طرح ثابت شدہ ہیں کہ جب انسان ان کو جدا جدا دیکھتا ہو تو ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، مگر جب دونوں کو جمع کرنے کی سعی کرتا ہے تو یکسر ناکام ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دو باتیں صحیح ہیں تو جس طرح وہ علیحدہ علیحدہ صحیح ہیں اسی طرح دونوں کو مل کر بھی صحیح رہنا چاہیے، مگر اس مسئلہ میں جب ان دو ثابت شدہ حقیقتوں پر یکجا نظر ڈالی جاتی ہے تو ان میں کھلا تضاد نظر آنے لگتا ہے۔ اس لیے نہ تو انسان بیک وقت دو متضاد باتوں پر جزم ہی کر سکتا ہے اور نہ ثابت شدہ حقیقتوں کے صاف انکار کر دینے کی جرأت کر سکتا ہے، اس لیے اس کے سامنے تفویض و تسلیم کے سوا اور کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ دیکھیے انسان جب اپنے وجدان کی طرف غور کرتا ہے تو اپنے نفس میں جبر کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی محسوس نہیں کرتا اور اس کو اتنا ہی مختار پاتا ہے جتنا کہ صفتِ اختیار کا تقاضہ ہونا چاہیے اپنے اس بدیہی وجدان کے ساتھ جب وہ مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ اس کو یہ باور کراتا ہے کہ کائناتِ ہستی کا کوئی ذرہ حتیٰ کہ خود اس کے ارادات و خطرات قلبیہ بھی اُس کی قدرت میں نہیں ہیں، بلکہ وہ سب ارادۂ الٰہیہ کے تحت گردش کرتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ قدرت کے سامنے مجبور محض ہے، اسی کے ساتھ جب

وہ اس طرف بھی نظر ڈالتا ہے کہ اس جبر کے باوجود آخرت میں وہ اپنے افعال پر مسئول بھی ہے تو اس کی حیرت اور بڑھ جاتی ہے اور یہ مسئلہ اس کے سامنے اور پُر پیچ بن جاتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ اول تو جب انسان کو اپنا مختار ہونا آفتاب کی طرح محسوس ہو تو وہ اپنے مجبور ہونے کا یقین کرے تو کیسے کرے اور اگر مجبور فرض کرلے تو ایک مجبور کو مسئول ماننے تو کیونکر مانے مگر جب کہ ایک سچا مذہب اس کو یہی تعلیم دیتا ہو تو وہ انکار کیسے کرسکتا ہے۔ اب ایک طرف تو اس کے سامنے اپنے وجدان کا یقین ہوتا ہے دوسری طرف مذہب کا یقین ہوتا ہے اور ہوتے ہیں دونوں متضاد، آخر مسئلۂ تقدیر اس کے لیے ایک معمہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہاں محض عقلی شہسوار تو آزاد ہے مشکل اُس کی ہو جس نے مذہب کی قید و بند بھی اپنے سر لے رکھی ہے۔

اس عالم سراسیمگی میں جبریہ پر تو قدرتِ الٰہیہ کا اس درجہ غلبہ ہوا کہ انہوں نے انسانی وجدان ہی کو غلط قرار دے دیا اور صاف اعلان کردیا کہ انسان میں نہ تو قدرت ہے اور نہ اختیار وہ محض ایک پتھر کی طرح مجبورِ محض ہے، قدرتِ الٰہیہ جس طرح اور جس طرف چاہتی ہے اس کو کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔ ان کے نزدیک جو قادرِ مطلق اور مالک علی الاطلاق ہو وہ مجبور محض سے بھی سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ لہٰذا اب مجبور کے مسئول ہونے میں بھی کوئی اشکال نہیں رہا۔ یہ فیصلہ تسلیم کرلینا اس فرقہ کے لیے خواہ کتنا ہی خوش کن ہو لیکن ایک خالی الذہن انسان کے لیے اپنے وجدان کے خلاف اس کو تسلیم کرلینا سخت مشکل ہے۔ اس لیے دوسری جماعت نے اس کو قطعاً غیر معقول سمجھا، اور ان پر انسان کو پتھر کی طرح مجبور سمجھ لینا پھر اس مجبور کو مسئول ٹھہرانا اتنا بار گراں ہوا کہ انہوں نے بندوں کو اپنے افعال کا خود خالق قرار دے ڈالا اور یہ تسلیم کرلیا کہ بندہ میں اپنے افعال کی تخلیق کی قدرت ہے اور اسی قدرت سے وہ افعال کرتا ہے اور جب اپنے اختیار سے کرتا ہے تو اس کو مسئول بھی ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ مسئلۂ تقدیر گو مشکل ہے مگر اس کا انکار اس سے زیادہ مشکل ہو۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ ان دونوں جماعتوں نے اپنے خیال کے مطابق اس مسئلہ کا حل تلاش تو کرلیا مگر یا بداہت کی تکذیب کی یا نصوص قرآنیہ کی تخصیص کی، یہاں اہل سنت نے معاملہ سلجھتا ہوا نہ دیکھ کر تفویض کی راہ لی اور اس اعتراف میں کوئی باک نہ سمجھا کہ اگر کوئی عقدہ ان سے حل نہ ہوسکا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حل شدہ نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کا انکار اور تاویل دونوں ہی غلط ہیں۔

اس حد پر پہنچ کر ضعیف الاعتقاد انسانوں کے دلوں میں مذہب کی جانب سے کچھ شکوک پیدا ہونے نہیں چاہئیں کیونکہ سب سے پہلے تو ان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب کبھی دنیا نے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کی حقیقت کا سراغ لگانا چاہا ہے تو وہ ہمیشہ ناکام ہی ہو کر اُٹھی ہے۔ حتیٰ کہ قدیم عقلا نے تو قاعدہ کلیہ کے طور پر کہہ دیا ہے: "التحدید الحقیقی عسیر جدًا" کسی چیز کی ٹھیک ٹھیک حقیقت کا پتہ چلانا یا تو ناممکن ہے یا اتنا مشکل ہے کہ اس کو قریب

قریب ناممکن کہہ دینا چاہیے۔ بیچارے قدیم عقلا نے تو بعض جگہ اپنے عجز کا اعتراف بھی کرلیا ہے لیکن آج کے عقلا زمانہ اس اعتراف میں بھی اپنی کسرِشان سمجھتے ہیں، دیکھو ہوا اور پانی کتنی کثیر الاستعمال چیزوں میں سے ہیں لیکن اب تک جو ان کے آخری اجزاء سمجھے گئے تھے اب ثابت ہوگیا ہے کہ وہ آخری نہیں تھے اُن کا تجزیہ بھی اور ہوسکتا ہے اور ہوگیا ہے۔ جب اتنی تگ و دو کے بعد ایسی معمولی معمولی اشیاء کی حقیقت دریافت نہیں ہوسکی تو باریک مسائل میں اگر ذرا توقف کرلیا جاتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا، اس سے بڑھ کر خود انسان ہی کو لے لیجیے، جب اس نے اپنی حقیقت دریافت کرنے کے لیے قدم اُٹھایا تو صدیوں کے بعد جس نتیجہ پر وہ پہنچا وہ یہ تھا کہ اصل میں وہ ایک بندر تھا۔ میں اس وقت یہ بحث نہیں کرنا چاہتا کہ یہ تحقیق کس حد تک صحیح تھی، لیکن صرف یہ تنبیہ کرنی چاہتا ہوں کہ بہت جلد اس خیال کی بھی تغلیط کردی گئی اور ابھی تک خود انسان کی حقیقت بھی ایک معمہ بنی ہوئی ہے، یہی حال اس جگہ بھی سمجھیے، چونکہ یہاں بھی افعالِ انسانی اور قدرتِ انسانی کی حقیقت میں گفتگو ہو رہی ہے اس لیے ضروری ہے کہ جو دشواری ہر چیز کی حقیقت تلاش کرنے میں پیش آئی ہو یہاں بھی پیش آئے، اگر یہاں شریعت اپنی جانب سے تقدیر کی حقیقت کا اعلان نہ کرچکی ہوتی تو اس مسئلہ میں بھی آپ کی بحث و تمحیص کی وہی حیثیت رہتی جو اس قسم کے دوسرے مسکوت عنہ مسائل میں ہے لیکن یہاں تو بڑی مشکل یہ ہے کہ بعض مصالح کی بناء پر شریعت یہاں خود اس کی حقیقت کا اعلان کرچکی ہے، اس لیے اب آپ پر اُسی کا تسلیم کرلینا لازم ہوگیا ہے، اتنی عقل ناقص العقل انسان میں بھی نہیں کہ وہ رازہائے قدرت کو پورا پورا پاسکتا اس لیے مذہب نے یہاں ایک ہی راستہ تعلیم کیا ہے اور وہ تفویض و تسلیم کا ہے۔ جس مذہب کی صداقت اور معقولیت اور ہزاروں مسائل میں ثابت ہوچکی ہو کچھ حرج تو نہ تھا اگر انسان صبر کرکے اس ایک مسئلہ کو اسی کے بیان پر مان لیتا، مگر وہ اتنا کم عقل ہے کہ اپنی کم عقلی کو بھی نہیں سمجھتا اور جتنا اس کو روکا جاتا ہو وہ اتنا ہی اس کی تحقیق کے اور درپے ہونے لگتا ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ قدس سرہ فرماتے تھے کہ سرِ تقدیر فہم سے بالاتر کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو بندہ کے افعال میں خود اس کی قدرت کا احساس بدیہی ہے ادھر مذہب یہ کہتا ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے اختیار و قدرت سے ہوتے ہیں لہٰذا کوئی چارہ کار نہیں کہ دونوں قدرتوں کو تسلیم کرلیا جائے۔ اب جو فعل بھی بندہ سے صادر ہوتا ہے ہر جگہ اس میں ان دو قدرتوں کا ماننا ضروری ہوجاتا ہے۔ یہاں جو باریکی پیدا ہوگئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم کتنا ہی تجزیہ کریں مگر کسی مرتبہ میں بھی جاکر بندہ کی قدرت کو اور حق تعالیٰ کی قدرت کو علیحدہ علیحدہ ممتاز نہیں کرسکتے یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس فعل میں اتنا کام تو بندہ کی قدرت سے ہوا اور اتنا قدرتِ الٰہیہ سے۔ آپ بندہ کے افعال کا تجزیہ کرتے چلے جائیے آپ کو کوئی مرتبہ بھی ایسا نہیں ملیگا جس میں قدرتِ الٰہیہ کا

اثر نہ ہو اور جب تک یہ بات صاف نہ ہو اُس وقت تک بندہ کا مختار کہنا بھی مشکل ہے، اور مجبور کہنا بھی۔ اس لیے اب اس کو نہ مختار کہے بنتی ہے نہ مجبور۔ دیکھیے ایک شہسوار گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے ارادہ و اختیار سے اس کو چلاتا ہے اور گھوڑا گو اُس کے اختیار کے ماتحت ہی چلتا ہے مگر آپ یہ بھی بداہتہً جانتے ہیں کہ چلتا ہے وہ اپنی قدرت سے اپنے مالک کی قدرت سے نہیں چلتا، مگر یہاں دو قدرتیں علیحدہ علیحدہ ہیں ایک گھوڑے کی اور دوسری اس کے مالک کی اور دونوں اتنی ممتاز ہیں کہ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھنے میں آپ کو کوئی دشواری پیش نہیں آتی لیکن یہاں قدرتِ عبد کی حقیقت یہ نہیں اس کے جس مرتبہ میں بھی غور کیجیے گا وہ قدرتِ الٰہیہ سے علیحدہ ثابت نہیں ہو سکتا اس لیے آپ تجزیہ کیے چلے جائیے مگر قدرتِ عبد کے علیحدہ اور قدرتِ الٰہیہ کے علیحدہ علیحدہ کرنے سے آخر عاجز ہو جائیں گے اور جب تک یہ امتیاز پیدا نہ کر لیں اس وقت تک جبر و اختیار کے اشکالات حل نہیں ہوتے اس لیے یہ مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ کا اشکال یوں نہیں ہے کہ یہاں کوئی غیر معقول چیز موجود ہے بلکہ یوں ہے کہ اس کی نظیر کوئی ملتی نہیں، اور حسیات میں جہاں نظائر نہیں ملتے عقل خود اپنا ہی حکم مقدم رکھتی ہے، اسی لیے شریعت نے یہ تعلیم فرمائی ہے کہ جو مجھ کو تسلیم کر چکا ہے اس کو سرِ الحکم ماننا ہوگا اور یہی ایمان بالتقدیر ہے، آخر جنت و دوزخ کو کس نے دیکھا بلکہ خدا تعالیٰ ہی کی ذات کو کس نے دیکھا یہ تمام حقائقِ غیب ہیں، یہاں جو شخص محض انبیاء علیہم السلام کے بیان پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کر چکا ہے بس وہی مومن ہے اور جس نے راہِ انحراف اختیار کی وہ دوسری طرف شمار ہو جاتا ہے۔

ناتمام اختیار کا فائدہ

اس ساری تحقیق کا حاصل اگر یہی ہے کہ انسان میں اختیار تو ہے مگر ہے ناتمام اور ناتمام بھی ایسا جو صرف انسان کے لفظی طور پر مختار کہلانے کے لیے کافی ہو اور بس تو صرف اتنے سے اختیار کے مان لینے سے تو جزاء و سزا کا مسئلہ صاف نہیں ہوتا۔ اس کا جواب پہلے تو یہ ہے کہ اگر حاکم علی الاطلاق ایسا ہی کر دیتا تو ظلم پھر بھی نہ تھا مگر اس کی حکمت نے چاہا کہ عمل اور اس کی جزاء و سزا کے مابین کچھ صوری مناسبت بھی باقی رکھے اس لیے اس نے انسان کو ایک ناتمام سا اختیار مرحمت فرما دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحؒ فرماتے ہیں کہ قدرت نے انسان کو عملی اور علمی ہر دو پہلوؤں میں دوسرے حیوانات سے امتیاز بخشا ہے۔ اس کا عملی امتیاز یہ ہے کہ اس کا نفس اپنے بُرے بھلے افعال کے اثرات کو اس طرح جذب کر لیتا ہے جیسا سیاہی کو جاذب۔ حیوانات کے نفوس میں یہ خاصیت نہیں، اُن سے بھی افعالِ اختیاریہ سرزد ہوتے ہیں، مگر ا[illegible] رصادر ہوئے اُدھر فنا ہو گئے، ان کے نفس میں ان

افعال سے کوئی رنگ پیدا نہیں ہوتا، مگر انسان جب افعال اپنے اختیار سے کرتا ہے تو اس کا نفس اسی کے مناسب اثرات سے رنگین ہوتا چلا جاتا ہے۔ افعالِ غیر اختیاریہ کا یہاں بھی کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان پر نہ مدح کی جاتی ہے نہ قدح۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جس طرح زہر مہلک ہوتا ہے مگر اس کے مہلک ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ حلق کی راہ سے پیٹ میں پہنچے، اسی طرح افعال کی تاثیر کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان کا صدور اختیار کی راہ سے ہو اور اس کی یہی وجہ ہے کہ جب تک ان افعال کا صدور اختیار سے نہیں ہوتا نفسِ انسانی میں ان کا رنگ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ حکمتِ الٰہیہ چاہتی ہے کہ جس فعل کا رنگ نفسِ انسانی میں پیدا ہو چکا ہے اس پر یا تو انعام فرمائے یا اس کا انتقام لے اور جس عمل کا اس میں کوئی اثر پیدا نہیں ہوا اس کی باز پرس نہ فرمائے اب اگر یہ اختیار صرف اسی مناسبت کے پیدا کرنے کے لیے شروع کیا گیا ہے تو اس کے لیے مستقل اختیار کی ضرورت ہی کیا ہے، ناتمام اختیار بھی کافی ہے۔ اس لیے یہ ضابطہ ہی غلط ہے کہ جزاء و سزا کے لیے مستقل اختیار ضروری ہو۔

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ یہاں دو عالم علیحدہ علیحدہ موجود ہیں ایک عالم تقدیر وہ غیب در غیب ہے دوسرا عالم تکلیف یعنی جس میں ہم کو افعالِ شرعیہ کا مکلف بنایا گیا ہے یہ مشہود ہی مشہود ہے۔ عالمِ تکلیف میں بندہ کھلا ہوا مختار رکھا گیا ہے حتیٰ کہ جب تک اس کا اختیار مستقل نظر آنے نہیں لگتا یعنی وہ بالغ نہیں ہو جاتا اس سے افعالِ شرعیہ کا مطالبہ بھی نہیں ہوتا مگر یہاں عالمِ تقدیر ظاہر نہیں ہے اور جہاں عالمِ تقدیر ظاہر ہے وہاں اس کو مجبور ہی مجبور بنایا گیا ہے مگر وہاں ہم مکلف بھی نہیں ہیں ان دونوں عالموں کے درمیان خلط کر دینے سے مفت میں اشکالات پیدا ہو گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ غیبی نظر میں ہم صرف ایک مجبور مخلوق ہیں، حکمتِ ایزدی نے اس جہان میں ہم کو بصورتِ مختار ظاہر فرما دیا ہے اب چاہو تو اس کو ناتمام اختیار سے تعبیر کر لو اور چاہو تو اس جہان کے لحاظ سے مستقل اختیار کہہ دو۔ جزاء و سزا کا مسئلہ بس اسی پر دائر ہے۔ جو اس عالم میں موجود ہے اس کو دوسرے عالم میں اپنے مجبور ہونے کا عذر کرنا نہ چاہیے اور نہ یہ معقول ہو سکتا ہے یہ مشہور ہے قصہ زمین برسرِ زمین۔ یہاں جب کبھی اپنے نفس کو دیکھو گے تو اس کو مختار ہی پاؤ گے پھر اپنے اس بدیہی وجدان کو چھوڑ کر تقدیر میں الجھنا کٹ حجتی نہیں تو اور کیا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ انسان جب کتے کے لاٹھی مارتا ہے تو کتا کبھی لاٹھی کو قصور وار نہیں سمجھتا وہ انسان ہی پر حملہ کرتا ہے یا اگر کسی پھلدار درخت سے کوئی پھل اس پر آگرتا ہے تو وہ کبھی درخت پر حملہ نہیں کرتا معلوم ہوتا ہے کہ مجبور و مختار کے فرق کو ایک کتا بھی سمجھتا ہے جس کو مختار سمجھتا ہے اس پر حملہ کرتا ہے اور جس کو مجبور سمجھتا ہے اس پر حملہ بھی نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کھلے ہوئے فرق کو نظر انداز کر کے محض تقدیر کے مسئلہ میں اُلجھنے کے لیے اپنے نفس کو مجبورِ محض کہہ دینا کتنا غیر معقول ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ و خیرتہ محمد وسلم تسلیماً کثیراً

فرقۂ قدریہ کی مختصر تاریخ
اور
ان کے کفر کی ضروری تنقیح

احادیثِ قضاء و قدر پڑھنے سے قبل ضروری ہے کہ فرقۂ قدریہ کی مختصر تاریخ معلوم کرلی جائے، تاکہ یہ بات بخوبی واضح ہوجائے کہ احادیث میں اس فرقہ کے متعلق جو تعبیری شدت اختیار کی گئی ہے وہ کیوں کی گئی ہے اور ائمہ و علماء نے اس فرقہ کی جو تکفیر کی ہے وہ کس بنیاد پر کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ خلفاء راشدین کے عہدِ مسعود میں اس فرقہ کا نام و نشان نہ تھا، صحابۂ کرام کے آخری دور میں اس کا ظہور ہوا اور جو صحابہؓ اُس وقت بقیدِ حیات تھے اُنھوں نے پوری قوت کے ساتھ اس کے استیصال میں حصہ لیا جن میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت واثلہؓ بن اسقع کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے عراق سے اس فتنہ کا آغاز ہوا اور بصرہ کے ایک یہودی النسل شخص نے اس کی بنیاد ڈالی جس کا نام سوسن یا سیسویہ تھا، پھر اس سے معبد جہنی نے اور معبد جہنی سے غیلان نے اس عقیدہ کو سیکھا۔ شدہ شدہ یہ فتنہ بصرہ سے لے کر شام و حجاز تک پھیل گیا۔ لکھتے ہیں کہ اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک مرتبہ جب خانۂ کعبہ کو آگ لگی تو کسی شخص کی زبان سے بیساختہ نکلا کہ تقدیرِ الٰہی یوں ہی ہوگی، اس پر کسی دوسرے شخص نے کہا اللہ تعالیٰ بھلا ایسا کیوں مقدر فرماتا بس اتنی بات پر قضاء و قدر کی بحث چل پڑی۔

قدریہ کا عقیدہ یہ تھا کہ "الامر انف" عربی زبان میں "روض انف" اس باغ کو کہتے ہیں جس میں سرسبزی کے باوجود کسی جانور نے منہ نہ ڈالا ہو۔ اور یہاں اس سے غرض یہ ہے کہ بندہ کی سعادت و شقاوت بھی خود اپنے ہی عمل سے پیدا ہوتی ہے، حق تعالیٰ کو پہلے سے نہ اس کا علم ہوتا ہے اور نہ کہیں اس کی کتابت ہوتی ہے۔ ہر انسان جب کسی عمل کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے وہی خود اس کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے پھر اسی کے مطابق اس کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے، اسی ذہنی نقشہ تیار کرنے کا دوسرا نام خلق ہے۔ کسی شاعر نے ذیل کے شعر میں خلق کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

ولانت تفری ما خلقت و بعـــــض الناس یخلق ثم لا یفری

یعنی یہ شان تو ایک تمہاری ہے کہ جو ذہن میں سوچ لیتے ہو اس کو خارج میں عملی جامہ بھی پہنا کر رہتے ہو اور تمہارے سواء

اور لوگ ہیں کہ وہ خیالات تو پکا لیتے ہیں مگر بسا اس کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے:
اس بنا پر قدریہ کو بندہ کے خالق کہنے میں بھی کوئی باک نہیں ہوتا۔ اس بدبخت جماعت کا یہ عقیدہ تھا کہ حق تعالیٰ کو اپنے بندوں کے لیے شریعت نازل فرماتا ہے مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون اس کی فرمانبرداری کریگا اور کون نافرمانی، کون اُن میں دوزخی ہوگا اور کون جنتی، حتیٰ کہ جب بندے خود عمل کر کے دوزخ اور جنت کے مستحق ہو جاتے ہیں تو اب اس کو بھی دوزخیوں اور جنتیوں کا علم ہو جاتا ہے۔ نعوذ باللہ من ہذا الخرافات۔ اس عقیدہ کا بطلان اظہر من الشمس ہے، قرآن کریم ان دونوں باتوں کے خلاف بھرا پڑا ہے۔ وہ تصریح کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کو جملہ اشیا کا پہلے سے علم بھی حاصل ہے اور آئندہ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اسی کے مطابق ہوتا ہے نیز وہ اپنے اس علم کو قید کتابت میں بھی لا چکا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ — بلاشبہ ہم نے ہر چیز پہلے سے ٹھیک کر کے بنائی ہے

کبھی وہ اپنے علم ازلی کا اظہار بھی فرما دیتا ہے: جیسا کہ شیطان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ (ص)	مجھ کو تجھ سے اور ان میں جو جو تیری تابعداری کریگا ان سب سے دوزخ کو بھرنا ہے۔

دوسری جگہ ایک موقعہ پر ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى۔ (طٰہٰ)	اگر آپ کے پروردگار کی جانب سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی اور عذاب کا ایک مقررہ وعدہ نہ ہو چکا ہوتا تو یقیناً عذاب الٰہی آ جاتا۔

رسولوں کے متعلق فرمایا:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (الصافات)	اور ہمارے بندوں میں جو مرسلین ہیں ان کے لیے ہمارا یہ حکم پہلے ہو چکا ہے کہ بیشک وہی منصور و فتحمند ہیں اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہو۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ۔ (ھود)	اور البتہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اگر نہیں تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے متعلق فیصلہ کر دیا جاتا۔

اسی طرح تقدیر کی کتابت کے متعلق بھی بہت سی آیات میں تصریح موجود ہے:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ (الحج) — کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ بھی آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ سب کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ آیت بالا کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا پھر جو عمل بھی وہ کرنے والی تھی ان سب کا اس کو پہلے سے علم حاصل تھا۔ اس نے اپنے اس علم کو کتاب کی شکل عنایت فرمائی، چنانچہ اب وہ کتاب کی شکل میں موجود ہے چاہو تو اس کی تصدیق کے لیے مذکورہ بالا آیت پڑھ لو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:-

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔ (الحدید) — جب کوئی مصیبت ملک میں یا تمہاری جانوں میں پیش آتی ہے تو اس سے قبل کہ ہم اس کو دنیا میں پیدا کریں وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء) — اور نصیحت کرنے کے بعد ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ آخر کار زمین کے مالک میرے نیک بندے ہی ہونگے۔

محو واثبات کے متعلق فرمایا ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ۔ (الرعد) — اللہ جو چاہتا ہے لوح محفوظ میں سے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اس میں باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔

الغرض علم ازلی اور اس کی کتابت کے متعلق قرآن کریم میں بیشمار آیات موجود ہیں یہاں ان سب کا احصار مقصود نہیں ہے، صرف بطور مشتے نمونہ از خروارے چند آیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی لیے امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے اس فرقہ کی تکفیر کی ہے۔ اور حضرت ابن عمرؓ کی حدیث سے بھی اسی فرقہ کے حق میں ہے۔

علماء اسلام نے جب اس عقیدہ کو باطل کر دکھایا اور اس کی دھجیاں اُڑا دیں تو ان کو لاچار ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا اور وہ علم الٰہی کے تو قائل ہو گئے مگر افعال عباد کا مشیتِ الٰہیہ کے تحت ہونے کا ان کو پھر بھی انکار رہا۔ اس جماعت کو کافر کہنا تو مشکل ہے، البتہ ان کو بدعتی کہنے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلق افعال عباد کا مسئلہ خود ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جس کی تحقیق میں خود اہل سنت کا قلم بھی کسی ایک رائے پر نہیں جم سکا۔ ایسے مسئلہ میں کفر کا حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جو مسائل عہد سلف میں مسلم ہوں اور قطعی ثبوت کے ساتھ ہم تک پہنچ جائیں اُن میں

تاویل یا اُن کا انکار تو ایک لمحہ کے لیے بھی قابلِ برداشت نہیں ہے جیسا مسئلہ ختم نبوت یا نزول عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام لیکن جو مسائل اس وقت زیر بحث نہیں آسکے اور بعد میں دماغی کاوشوں، عقلاء کی نکتہ سنجیوں یا زائغین کی مغالطہ آمیزیوں سے پیدا ہوگئے ہیں اگر شریعت اسلام میں اس کا کوئی واضح حکم نہیں ملتا تو اس کے انکار یا اقرار سے تکفیر نہیں کی جاسکتی۔ خلق افعال عباد کا مسئلہ بھی اُن ہی میں داخل ہے لہٰذا اس مسئلہ میں جو فرقے بھی اہل حق سے جُدا ہوگئے ہیں ان کو کافر نہیں کہا جائیگا البتہ بدعت کے حکم سے بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔ بعض متأخرین نے قدریہ کے متعلق ائمہ کی جو تکفیر نقل کردی ہے اس کو اسی تفصیل کے ماتحت سمجھنا چاہیے یعنی یہ وہ فرقہ ہے جس کا یہ عقیدہ تھا کہ حق تعالیٰ کو بندوں کے افعال کا ان کے وجود سے قبل کوئی علم نہیں ہوتا اور نہ پہلے سے لوحِ محفوظ یا کہیں ان کی کتابت ہوتی ہے۔ دیکھو کتاب الایمان ص۱۵۴ و ۱۵۵۔ ائمہ حدیث جیسے بخاری و مسلم نے اگر کہیں کسی قدری راوی کی روایت اپنی اپنی صحیح میں درج فرمائی ہیں تو وہ اسی دوسرے فرقہ کا شخص ہوا ہے کیونکہ پہلا فرقہ بالاتفاق کافر ہے اور کافر کی روایت کے مردود ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ بدعتی کی روایت کے قبول ورد میں اختلاف ہے جس کی تفصیل کا محل اصول حدیث ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے حاشیہ ابی داؤد میں قدریہ اور چند بدعتی فرقوں کے ظہور کی تاریخ اس ترتیب سے تحریر فرمائی ہے۔

واما الارجاء، والرفض، والقدر، والتجهم، والحلول وغیرها من البدع، فانما حدثت بعد انقراض عصر الصحابۃ۔

وبدعۃ القدر: ادرکت آخر عصر الصحابۃ، فانکرها من کان حیًا، کعبد اللہ بن عمر وابن عباس وامثالہما رضی اللہ عنہم. واکثر ما یجیئ من ذمہم، فانما هو موقوف علی الصحابۃ من قولہم فیہ ثم حدثت بدعۃ الارجاء بعد انقراض عصر الصحابۃ. فتکلم فیہا کبار التابعین الذین ادرکوها کما حکینا عنہم

ثم حدثت بدعۃ التجہم بعد انقراض عصر التابعین. واستفحل امرها، واستطار شرها فی زمن الائمۃ کالامام احمد وذویہ۔

ثم حدثت بعد ذلک بدعۃ الحلول، وظہر امرها فی زمن الحسین الحلاج۔

یعنی قدریہ کے انکار کی بدعت صحابہ کرام کے آخری دور میں شروع ہوئی اور عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ اور اس قسم کے اور صحابہ نے جو اس دور میں بقید حیات تھے اس کی تردید میں کافی حصہ لیا، اسی لیے اس فرقہ کی مذمت جن احادیث میں آئی ہے وہ کثرت سے صحابہؓ ہی کے اقوال ہیں۔ اس کے بعد ارجاء کی بدعت نکلی، ان کی تردید میں اکابر تابعین نے حصہ لیا، پھر جب عہد تابعین بھی ختم ہوا تو جہمیہ فرقہ پیدا ہوا اور امام احمدؒ وغیرہ جیسے ائمہ کے دور میں اس کا خوب چرچا رہا، اس کے بعد حلول کا عقیدہ ظاہر ہوا اور حسین حلاج کے زمانہ میں اُس کا زور و شور ہوا ؎

قضاء و قدر کے مسئلہ میں امام ماتریدی کے مسلک کی اہم توضیح

امام ماتریدیؒ نے اسباب میں تاثیر اور اشیاء میں طبعی خواص کا انکار کرنا آیات و احادیث کے ظاہری الفاظ کے قطعاً خلاف سمجھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں جس طرح قدرت نے مسببات میں اسباب کی تاثیر ودیعت فرمائی ہے اسی طرح بندہ کے افعال میں بھی اس کی قدرت کی تاثیر رکھی ہے۔ عالم اسباب کے طویل و عریض سلسلہ میں ہر جگہ تاثیر کا انکار کر کے یہ کہہ دینا کہ یہاں دو چیزوں کے درمیان صرف وقتی مقارنت ہے اور ان میں باہم تاثیر و تاثر کا کوئی علاقہ نہیں بداہت کے بھی خلاف ہے، عرف کے بھی خلاف ہے اور آیات و احادیث کے بھی خلاف ہے۔ ہم کو صاف آنکھوں سے نظر آتا ہے کہ آگ جلاتی ہے۔ آدمی زہر کھاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ تریاق زہر کا اثر باطل کر دیتا ہے پھر اسی عرفی نسبت کو آیات و احادیث میں بھی قائم رکھا گیا ہے لہٰذا ہم کو ان کا مفہوم وہی لینا ہوگا جو اہل عرف اس نسبت سے سمجھتے ہیں۔ ان تمام آیات میں اور اپنے حسی مشاہدات میں صرف مجازی نسبتیں مراد لے لینا کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ ان جملہ مقامات میں تاثیر کا اقرار کیا جائے، مگر یہ تاثیر ہوتی ہے اسی کے اذن سے۔ بندہ کی صفت اختیار اور اس کے افعال کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے یہاں بھی اختیار کی صفت حق سبحانہ کی پیدا فرمودہ ہے اور بندہ کے افعال میں تاثیر بھی اسی کے اذن سے ہوتی ہے پھر جس طرح دوسرے مقامات میں کسی چیز کے وجود کے لیے صرف اسباب کا وجود کافی نہیں ہوتا بلکہ موانع کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ موانع بھی قدرت ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ جہاں یہ موانع موجود ہوتے ہیں وہاں بندہ کی صفت اختیار کے باوجود پھر افعال کا صدور نہیں ہوتا (منتقیٰ ص ۱۵-۲۶ منہاج السنہ و شفاء العلیل ص ۱۵۲)

اس مسئلہ کی تقریر کرتے ہوئے حافظ موصوف ایک دوسرے مقام پر اور زیادہ زور دے کر تحریر فرماتے ہیں کہ تمام کتب سماویہ میں کسی ایک کتاب نے بھی قرآن کریم سے بڑھ کر اسباب کا اثبات نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ پھر کیونکر اسباب کی تاثیر کا انکار کر دیا گیا ہے اور کیونکر اس تاثیر کو توحید کے خلاف سمجھا گیا ہے جبکہ عقیدہ یہ ہے کہ سبب اور مسبب دونوں کا خالق وہی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے اور سبب کی اپنے مسبب میں تاثیر بھی اسی کی قدرت اور مشیت سے ہے۔ اگر وہ چاہے تو سبب کی تاثیر باطل بھی فرما سکتا ہے جیسا کہ اپنے خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں آتش نمرود کی تاثیر باطل فرما دی اور اگر چاہے تو اسباب کی تاثیر قائم رکھتے ہوئے پھر کچھ موانع ایسے فرما دے سکتا ہے جو ان کی تاثیر سے مانع ہو جائیں اور اگر ارادہ فرمائے تو ان کو اٹھا بھی دے سکتا ہے کہ پھر پہلے کی طرح وہی تاثیر کرنے لگیں۔ ایسی تاثیر کے اعتقاد سے بھلا توحید کو کیا ٹھیس لگ سکتی ہے اور شرک کا کیا وہم ہو سکتا ہے لیکن بے علم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پکی توحید یہ ہے کہ نہ آگ میں جلانے کی تاثیر ہے نہ پانی غرق کرنے کی اور نہ روٹی میں پیٹ بھرنے کی اور نہ تلوار میں قطع کرنے کی یہ اثرات سب براہ راست قدرت کا فیض ہیں یہ توحید ایسی ناقابل فہم توحید ہے کہ جس کو سن سن کر آج دشمنان اسلام اسلام ہی سے منکر ہوئے جا رہے ہیں واقعی سچی مثل ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہوتا ہے" (دیکھو شفاء العلیل ص ۱۸۹ و ۱۹۰)۔

اس لیے امام ماتریدی فرماتے ہیں کہ بندہ میں قدرت و اختیار کی صفت بھی ہے اور اس کے افعال میں اس

کے اختیار و قدرت کی تاثیر بھی ہے۔ امام کے مذہب کی بنا پر اگر بندہ کو مجبور کہا جائیگا تو صرف اس معنی سے کہ
قدرت نے اختیار کی صفت اس میں جبراً پیدا فرمائی ہے۔ اس میں بندہ کے اختیار اور پسندیدگی کا کوئی دخل نہیں
پس جس طرح ایک پتھر اپنے غیر مختار رہنے میں مجبور ہے اسی طرح بندہ اپنے مختار رہنے میں مجبور ہے۔ یہاں جبر اس معنی سے نہیں ہے
کہ اس اختیار کے استعمال کرنے پر بھی کوئی اور جبر اس پر مسلط کیا گیا ہے بلکہ ہر طرف کے راستے اس کے سامنے کشادہ
رکھے گئے ہیں۔ اب جس طرف بھی وہ چاہے اپنی صفت اختیار کو استعمال کر سکتا ہے قدرت نے ہر طرف اس کی معاونت
فرمانے کا وعدہ فرما لیا ہے اور اس کے عزم کے موافق جب بھی وہ ارادہ کرتا ہے تو قدرت اس عمل کو پیدا فرما دیتی ہے گویا
رشتۂ خالقیت ہر جگہ دست قدرت ہی کے ساتھ مربوط رہتا ہے۔ اس صفت اختیار کو کسی ایک جانب استعمال کرنے
کا نام کسب ہے اور اسی کے لحاظ سے اس کو بندہ کا فعل اور اس کو اس کا حقیقی فاعل کہا جاتا ہے اور خلق کے لحاظ سے
اس فعل کو حق سبحانہ کی مخلوق کہا جاتا ہے۔ گویا ایک ہی عمل میں بندہ کی تاثیر صرف اس کے کسب کرنے میں ہوتی ہے اور
خالق کی اس کے پیدا فرمانے میں۔ اس لحاظ سے وہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی اور مکسوب بندہ کا ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھیے کہ
مخلوق ہمیشہ اپنے خالق سے علیحدہ موجود ہوتی ہے اور فعل اپنے فاعل کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ بندہ کا فعل جو اس کے کسب سے
متعلق ہے وہ بندہ کی صفت ہے اور اسی کے ساتھ قائم ہے اور چونکہ وہ حق سبحانہ کی مخلوق ہے اس لیے ہمیشہ اس سے علیحدہ موجود
ہوتا ہے، قدرت جب بندہ کا عزم دیکھ لیتی ہے تو اس کے پیدا فرمانے کی سب شرائط موجود فرما دیتی ہے اور اس کو بندہ
میں پیدا بھی کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بُرے اور بھلے ہر قسم کے افعال سے خالق کو نہ بُرا کہہ سکتے ہیں نہ بھلا کیونکہ ان
افعال کی وجہ سے بُرا یا بھلا اسی کو کہہ سکیں گے جس کی یہ صفات ہوں اور اس کے ساتھ قائم ہوں۔ خالق کے ساتھ
بندہ کے یہ افعال چونکہ قائم نہیں ہوتے اس لیے نہ اس کی صفت بنتے ہیں اور نہ اس کو ان کے لحاظ سے بُرا یا بھلا کہا
جا سکتا ہے۔ دیکھو سیاہ یا سُرخ رنگ دینے سے اس کپڑے کو تو سیاہ یا سُرخ کہا جاتا ہے مگر جو اس کا رنگنے والا ہے اس کو نہ
سیاہ کہا جاتا ہے نہ سُرخ کیونکہ یہاں بھی سیاہی اور سرخی کپڑے کی صفت ہوتی ہے رنگنے والے کی نہیں حقیقت یہ ہے کہ
ایک ضعیف مخلوق کے اختیار کی تاثیر صرف اس حد تک ہی ہو سکتی ہے کہ جب وہ چاہے اپنے اس اختیار کو کسی ایک
جانب استعمال کر لے، رہی وہ طاقت اور قدرت جو کسی چیز کو عدم سے نکال کر لباس وجود عطا کر دے تو یہ صرف
قدرت قدیمہ کا خاصہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہی ہر جگہ اس کی مالک بنی ہوئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ایک ہی عمل دو اعتبار سے
خدا تعالیٰ اور بندہ دونوں کی طرف منسوب رہتا ہے جیسا کہ مال و املاک یہ سب خدا تعالیٰ کے پیدا فرمودہ ہیں اور
ملک بھی حقیقۃً سب اسی کی ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی نسبت حق سبحانہ کی طرف ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ان
کی نسبت بندہ کی طرف بھی ہوتی ہے۔ پس اموال کی طرح اعمال کا قصہ بھی ہے۔ یہ بھی سب اسی کے پیدا کردہ ہیں اموال
کا مالک اور اعمال کا کاسب اُسی نے بندوں کو بنایا ہے اور جس طرح کہ دنیا میں مال بندہ کے کسب سے حاصل ہوتا ہے
حالانکہ وہ پیدا کردہ حق سبحانہ کا ہوتا ہے، اسی طرح اعمال بھی بندہ کے کسب سے حاصل ہوتے ہیں اور پیدا کردہ
حق سبحانہ کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مال تو قدرت کا پہلے سے پیدا کردہ ہوتا ہے اور بندہ کے
اعمال اس کے ارادہ اور عزم کے بعد پیدا کیے جاتے ہیں اس لیے یہاں قدریہ کو مغالطہ لگ گیا ہے اور
انہوں نے ان کا خالق خود بندوں کو قرار دے ڈالا ہے۔ اسی طرح ناک، کان، زبان سب قدرت ہی نے

پیدا فرمائے ہیں اور ان میں جُدا جُدا قوتیں بھی سب قدرت ہی نے پیدا فرمائی ہیں اور ان کو اپنے اختیار سے استعمال کرنے کی طاقت بھی سب اسی نے مرحمت فرمائی ہے۔ بندہ جب چاہتا ہے اپنی ان قوتوں کا استعمال کر لیتا ہے اور جب چاہتا ہے نہیں کرتا۔ اسی طرح اس میں اختیار کی بھی ایک صفت ہے اس کو بھی وہ جب چاہتا ہے استعمال کرتا ہے اور جب چاہتا ہے استعمال نہیں کرتا۔ خالق ان سب مقامات پر وہی ذات وحدہ لاشریک لہٗ ہی ہے اور بندہ بھی ان کے ساتھ اپنا ایک اعتباری علاقہ پیدا کر کے "کسب" کی نسبت حاصل کرتا رہتا ہے کسی عمل کے بندہ کی طرف صرف منسوب ہو جانے سے یہ سمجھ لینا کہ اس میں شرک ہو گیا ہے سخت بے علمی اور ناسمجھی ہے۔ کیا ایک بچہ کی نسبت اپنی ماں کی طرف اور غلہ کی کسی خاص زمین کی طرف اور پھل کے کسی خاص درخت کی طرف نہیں کی جاتی اور کیا پھر ان سب اشیاء کی نسبت خالق کی طرف بھی نہیں کی جاتی۔ مگر ان دونوں نسبتوں کا مفہوم بالکل جدا جدا ہوتا ہے۔ کیا یہاں کسی کو شرک کا وہم گزر سکتا ہے۔ اس لیے محض اس وہم کی بناء پر جبریہ کا بندہ سے اس کے افعال کی نسبت قطع کر کے اس کو مجازی نسبت قرار دینا اور براہ راست ان کو حق سبحانہ کی طرف منسوب کر دینا کھلی ہوئی غلطی ہے[1]

مسئلہ مذکورہ پر بحث کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ نے ایک اور بہت لطیف بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جبر قدر کا مسئلہ سمجھنے کے لیے پہلے جبر کے معنی سمجھ لینے چاہییں۔ جبر کے ایک معنی تو اکراہ کے ہیں یعنی کسی کی رضامندی اور اختیار کے خلاف اس سے کام لینا۔ اس معنی سے اللہ تعالیٰ نے کسی پر جبر نہیں کیا۔ جب وہ بندوں سے کسی عمل کرانے کا ارادہ فرماتا ہے تو پہلے ان کو اختیار بخش دیتا ہے پھر ان میں اس عمل کے کرنے کی رغبت یا اس سے نفرت پیدا فرما دیتا ہے حتیٰ کہ جب وہ کسی کام کو کرتے ہیں یا نہیں کرتے تو دونوں صورتوں میں اپنی خوشی اور اختیار ہی سے کرتے ہیں۔ یہ اس کی کمال قدرت ہے کہ وہ دوسروں کے اختیار و رغبت سے وہی کرا لیتا ہے جو اس کی مشیت ہوتی ہے۔ لہٰذا اب وہ کسی پر اکراہ کرے تو کیونکر کرے۔ یہ اکراہ تو وہ شخص کرتا ہے جس کو دوسرے کو مختار بنا کر اس کی خوشی سے کام لینے کی قدرت حاصل نہ ہو لیکن جس کو یہ قدرت بھی حاصل ہو کہ وہ دوسرے کو مختار اور فاعل بالارادہ بنا کر اس میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا داعیہ فرما سکے تو اس کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ کسی سے زبردستی کام لے۔ بندہ کو چونکہ اتنی وسیع قدرت حاصل نہیں ہوتی اس لیے لازمی طور پر اس کو دوسروں کو مجبور کرنا پڑتا ہے اور اس طرح وہ اس کو مجبور کر کے اپنی منشاء کے موافق کام لے لیتا ہے۔ جبر کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ کسی میں اختیار کی صفت پیدا فرما کر پھر اس سے اپنی مرضی کے موافق کام لے لینا۔ اس لحاظ سے بیشک یہاں جبر موجود ہے اور اسی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں ایک اسم جبّار بھی ہے چنانچہ محمد بن کعب قرظی اس اسم کی تشریح میں فرماتے ہیں: "ھو الذی جبر العباد علیٰ ما اراد" یعنی جبار اس کو کہتے ہیں جو اختیار عطا

---

[1] حافظ ابن تیمیہؒ افعال عباد کے من العباد ہونے کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں:-

انہا قائمۃ بہ حاصلۃ بمشیئتہ وقدرتہ وھو المتصف بہا فانہ قد یقال لما اتصف بہ المحل وخرج ھذا منہ وان لم یکن لہ اختیار کما یقال ہذا الریح من ہذا الموضع وہذہ الثمرۃ من ہذہ الشجرۃ وہذا الزرع من ہذا الارض فلان یقال لما صدر من حیّ باختیارہ ہذا منہ بالطریق الاولیٰ۔ وہی من اللہ بمعنی انہ خلقہا قائمۃ بغیرہ وجعلہا عملاً لہ وکسبًا وھو خلقہا بمشیئۃ نفسہ وقدرۃ نفسہ بواسطۃ خلقہ بمشیئۃ العبد وقدرتہ کما تخلق المسببات باسبابہا فیخلق السحاب بالریح والمطر بالسحاب والنبات بالمطر۔ (والخلاصۃ) ان الحوادث تضاف الیٰ خالقہا باعتبار والیٰ اسبابہا باعتبار فہی من اللہ مخلوقۃ لہ فی غیرہ ..... وہی من العبد صفۃ قائمۃ بہ وبح فلا شرکۃ بین العبد وبین الرب کما اذا قلنا ہذا الولد من المرءۃ بمعنی انہا ولدتہ ومن اللہ بمعنی انہ خلقہ الخ۔ واذا کان غیر اللہ یعاقب عبدہ علیٰ ظلمہ وان کان مقرًّا بان اللہ خالق افعال العباد ولیس ذٰلک ظلمًا منہ فاللہ سبحانہ ان لایکون ظلمًا منہ ... فکون الرب خالق کل شیٔ لایمنع کون العبد ہو الملوم علیٰ ظلمہ کما ان غیرہ من المخلوقین یلوم علیٰ ظلمہ وعدوانہ مع اقرارہ بان اللہ خالق افعال العباد۔ ص ۲۶، ۲۷، ۲۸ ج ۲ منہاج السنہ

فرما کر اپنی مرضی کے مطابق کام لے۔ (دیکھو منہاج السنہ ص ۵۱ ج ۲)
حافظ ابن قیمؒ اس مضمون کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فالجبر بہذا المعنی معناہ القہر والغلبہ وانہ سبحانہ وتعالیٰ قادر علی ان یفعل لعبدہ ما شاء واذا شاء منہ شیئاً وقع ولا بد وان لم یشاء لم یکن لیس کالعاجز الذی یشاء ما لا یکون ویکون ما لا یشاء۔ (شفاء العلیل ص ۱۲۹)

یعنی جبر کے ایک معنی قہر وغلبہ کے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ایسا قاہر و غالب ہے کہ وہ ان سے جو چاہے کام لے سکتا ہے اگر وہ کسی کام کے کرانے کا ارادہ فرمائے تو وہ ہو کر رہتا ہے اور اگر ارادہ نہ فرمائے تو پھر وہ ہو نہیں سکتا اس عاجز شخص کی طرح نہیں کہ جو کسی بات کا ارادہ تو کرے اور پھر وہ ہو نہ سکے اور وہ ہوتا ہے جس کا اس نے ارادہ نہ کیا ہو۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنہ میں اس مسئلہ کی طویل تقریر کرکے آخر میں لکھا ہے کہ یہی مسلک جمہور کا مسلک ہے اور یہ ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے اس میں نہ تو قدریہ کی طرح بندوں کو اپنے افعال کا خالق تسلیم کیا گیا ہے نہ جبریہ کی طرح ان کو ایک پتھر کی طرح قدرت و اختیار سے معریٰ مانا گیا ہے۔ اشعریؒ نے اگرچہ یہاں صفتِ قدرت کو تسلیم کرکے جبریہ سے ایک قدم آگے ضرور بڑھایا لیکن افعال عباد میں اس کو غیر مؤثر ٹھہرا کر پھر نا قابل فہم بنا دیا حتیٰ کہ اب ہر نا قابل فہم بات کے لیے یہ مثل بن گئی ہے "یہ بات تو اشعری کے کسب سے بھی زیادہ باریک ہے" یعنی ناقابل فہم ہے لیکن تحقیق یہ ہے کہ شیخ اشعریؒ بھی تاثیر کے قائل تھے۔ جس کسی نے ان کی طرف محض نفی کی نسبت کردی ہے اس نے ناتمام نظر کی ہے۔ حاشیہ اسماعیل کلنبوی ص ۲۵ میں ہے قال بعضہم ان التحقیق ان مذہبہ موافق لمذہب الماتریدیۃ۔

تنبیہ: قضاء وقدر کا پہلا مقالہ حاشیۃ الجرجانی علی شرح العقائد للدوانی سے ماخوذ ہے۔ دیکھو ص ۲۵۷

قضاء وقدر کے باب میں تغیراتِ حمل کی حدیث کے متعلق ایک اہم حاشیہ

داؤد انطاکی اپنی مشہور تصنیف "التذکرہ" میں حمل کے تغیرات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اطباء کے نزدیک نطفہ میں سات قسم کے تغیرات ہوتے ہیں۔ پہلے ہفتہ میں وہ پانی کی شکل پر ہوتا ہے پھر اس کے باہر ایک جھلی بنتی ہے اور اندر منجمد نطفہ ہو جاتا ہے اور سولہ دن میں اس پر لمبے لمبے خطوط کی شکل نمودار ہو جاتی ہے اس کے بعد وہ سرخ رنگ کا خون بن جاتا ہے اس کے بعد اس کی شکل گوشت کے لوتھڑے کی ہو جاتی ہے اور سب سے پہلے اس میں قلب کی شکل نمودار ہوتی ہے پھر دماغ کی تینتیس دن میں اس میں ہڈیوں کے نشانات قائم ہوتے ہیں اور حمل کے بچہ بننے کی یہ کم سے کم مدت ہے۔ چھہتر دن کے بعد وہ اپنی غذا جذب کرنے لگتا ہے اور اس پر گوشت آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اب وہ پہلے سے بالکل علیحدہ ایک جدید مخلوق کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس میں حرارت غریزیہ پیدا ہو جاتی ہے اور اب اس میں طبعی نمو شروع ہو جاتا ہے (اسی کا نام روح طبی ہے) اور ستو دن کے بعد اس میں نباتات کی طرح نمو ہونے لگتا ہے اس کے بیس دن کے بعد وہ ایک سوتا ہوا حیوان معلوم ہونے لگتا ہے اور اب اس میں حقیقی روح پھونکی جاتی ہے۔ اس تقریر سے جو اختلاف نفخ روح کے بارے میں فلاسفہ اور اہل شرع کے مابین تھا وہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک نفخ روح کی مدت ستر دن ہے اور اہل شرع کے نزدیک چار ماہ ظاہر ہے کہ فلاسفہ روح شرعی کو نہیں پہچانتے ان کے نزدیک روح طبی ہی ایک روح ہے اسی کے ذریعہ سے انسان کا نشو ونما ہوتا ہے اہل شرع کے نزدیک انسان کی حقیقت اس کا جسم نہیں بلکہ دراصل وہ روح انسانی ہے جس میں اپنے خالق کی معرفت مرکوز ہوتی ہے وہ روح چار ماہ کے بعد پھونکی جاتی ہے اور جو روح طبی ہے وہ مذکورہ بالا تحقیق کے مطابق اہل اسلام کے نزدیک بھی چھہتر دن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے دونوں طبقوں کے درمیان روح طبی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دیکھو حاشیہ ابن عابدین الشامی ص ۲۷۸ ج ۱۔ از باب النفاس۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الایمان بالقدر رکن من ارکان الاسلام

(۸۸۵) عَنْ يَحْيَى بْنِ يَعْمَرَ فِي مُسْلِمٍ قَالَ كَانَ أَوَّلَ مَنْ قَالَ فِي الْقَدَرِ بِالْبَصْرَةِ مَعْبَدٌ الْجُهَنِيُّ فَانْطَلَقْتُ أَنَا وَ حُمَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْحِمْيَرِيُّ حَاجَّيْنِ أَوْ مُعْتَمِرَيْنِ فَقُلْنَا لَوْ لَقِيْنَا أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلْنَاهُ عَمَّا يَقُوْلُ هٰؤُلَاءِ فِي الْقَدَرِ فَوُفِّقَ لَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ دَاخِلًا الْمَسْجِدَ فَاكْتَنَفْتُهُ أَنَا وَصَاحِبِي أَحَدُنَا عَنْ يَمِيْنِهِ وَالْآخَرُ عَنْ شِمَالِهِ فَظَنَنْتُ أَنَّ صَاحِبِي سَيَكِلُ الْكَلَامَ إِلَيَّ فَقُلْتُ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ إِنَّهُ قَدْ ظَهَرَ قِبَلَنَا أُنَاسٌ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْآنَ وَ يَتَقَفَّرُوْنَ الْعِلْمَ وَذَكَرَ مِنْ شَأْنِهِمْ وَأَنَّهُمْ يَزْعُمُوْنَ أَنْ لَا قَدَرَ وَأَنَّ الْأَمْرَ أُنُفٌ قَالَ إِذَا لَقِيْتَ

قضاء وقدر پر ایمان لانا اسلام کا ایک رکن ہے

(۸۸۵) یحیٰی بن یعمرؒ بیان کرتے ہیں کہ مسئلۂ تقدیر میں جس نے سب سے پہلے کلام کیا وہ بصرہ میں ایک شخص معبد جہنی تھا۔ میں اور میرے ساتھ حُمَید بن عبدالرحمٰن حمیری رحؒ یا عمرہ کرنے کی نیت سے نکلے تو ہم نے کہا کاش! ہمیں آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی شخص مل جاتا تو ہم اس سے ان شبہات کے متعلق جو یہ لوگ تقدیر کے بارے میں نکالتے رہتے ہیں، کچھ باتیں دریافت کر لیتے۔ حسب الاتفاق ہمیں عبداللہ بن عمرؓ سے ملاقات نصیب ہو گئی اس وقت وہ اور میں مسجد میں داخل ہو رہے تھے بس میں اور میرا ساتھی ایک ان کی داہنی جانب سے اور دوسرا بائیں جانب سے اُن کو لپٹ گئے۔ میں جانتا تھا کہ میرا رفیق سلسلۂ گفتگو کا آغاز میرے ہی سپرد کریگا اس بنا پر میں نے ہی عرض کی اے ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ بن عمر کی کنیت ہے) ہمارے اطراف میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور علم میں بہت کد و کاوش بھی کرتے ہیں۔ پھر ان کی مفصل روئداد بیان کی، اُن کا عقیدہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں اور دنیا کے واقعات کسی تقدیر کے بغیر یونہی چلتے رہتے ہیں۔

(۸۸۵) قدریہ کی تاریخ میں آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی، اور یہ کہ معبد جہنی بھی اس فتنے کے بانیوں کی ابتدائی صف میں داخل تھا اور الامر انفؐ کے معنی بھی معلوم کر چکے ہیں اور یہ بھی کہ عبداللہ بن عمرؓ کے اس فرمان کا تعلق اس فرقہ کے ساتھ ہے جو علم الٰہی کا بھی منکر تھا۔ اب غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اس عقیدہ کو آخر اتنی اہمیت کیا ہے کہ اس کو دین کا ایک رکن قرار دے دیا گیا ہے۔ تو اس کے متعلق بھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر بندہ کا اللہ تعالیٰ سے کوئی رابطہ ہی قائم نہیں ہو سکتا وہ اگر اس کی خالقیت کا اقرار کر بھی لیتا ہے مگر آئندہ اس کی زندگی میں جب اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں دیکھتا بلکہ اپنی دنیا کے خود خالق ہونے کا گمان کر بیٹھتا ہے تو اس کو اس کے عالم کی خالقیت کے اعتقاد پر بھی

أُولٰئِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنِّي بَرِيْءٌ مِنْهُمْ وَإِنَّهُمْ بُرَآءُ مِنِّي وَالَّذِي يَحْلِفُ بِهِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لَوْ أَنَّ لِأَحَدِهِمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا فَأَنْفَقَهُ مَا قَبِلَ اللّٰهُ مِنْهُ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ ۔ رواہ مسلم فی کتاب الایمان وابوداؤد والامام احمدؒ فی کتاب السنۃ ص ۱۱۹۔

(۸۸۶) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ وَحَتّٰى يَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهُ وَأَنَّ مَا أَخْطَأَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَهُ ۔ رواہ الترمذی وقال غریب وفیہ عبداللہ بن میمون منکر۔

(۸۸۷) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ بِأَرْبَعٍ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ بَعَثَنِي بِالْحَقِّ وَيُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ وَيُؤْمِنُ بِالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَيُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ ۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ واخرجہ الحاکم فی المستدرک وقال علی شرط الشیخین ولم یتعقبہ الذہبی۔

اُنھوں نے فرمایا جب اُن سے تمہاری ملاقات ہو تو اُن کو مطلع کر دینا کہ نہ میرا اُن سے کوئی تعلق رہا نہ اُن کا مجھ سے۔ اس ذات کی قسم جس کے نام کی قسم عبداللہ بن عمرؓ کھاتا ہے کہ اگر ان میں سے کسی کے پاس اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا ہو اور وہ اس کو خیرات کر ڈالے جب بھی وہ اس وقت تک اس سے قبول نہیں کیا جائیگا جب تک کہ اس کا ایمان تقدیر پر نہ ہو۔ (مسلم)

(۸۸۶) جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک بندہ اس پر ایمان نہ لائے کہ بُرا، بھلا سب تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور اس کا یقین نہ کرے کہ جو خیر و شر اس کو پہنچ گیا یہ ناممکن تھا کہ اس کو نہ پہنچتا اور جو نہیں پہنچا یہ بھی ممکن نہ تھا کہ اس کو پہنچ جاتا۔ اس وقت تک اس کا ایمان کچھ نہیں۔ (ترمذی)

(۸۸۷) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تک بندہ چار باتوں کی دل سے گواہی نہ دے مومن نہیں ہوتا۔ اس بات کی کہ معبود کوئی نہیں مگر ایک اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی کہ میں کسی تردد کے بغیر اس کا رسول ہوں، اس نے سچا دین دے کر مجھ کو بھیجا ہے۔ اور مرکر قیامت میں پھر جینے کا یقین نہ کرے، اور جب تک کہ تقدیر کو نہ مانے۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

پورے طور پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سوچو کہ جب ایک شخص اپنا اور اپنے افعال کی ساری دنیا کا تعلق خالق السموات و الارضین کے ساتھ قائم نہیں رکھ سکتا تو بھلا اس کو اسلام ہی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اب اگر وہ اُحد کے برابر بھی سونا خرچ کر ڈالے تو یہ صرف ایک کافر کا صدقہ ہو گا جس کا بارگاہِ بے نیاز میں کوئی وزن نہیں ہے۔

(۸۸۷) احادیث درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان گفتگوؤں کا ایک مجموعہ ہیں جو آپ اپنی مجلسوں میں وقتاً فوقتاً فرمایا کرتے تھے اس لیے اُن کا انداز بیان کتابی شکل کا نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل جلد ثانی ص پر ملاحظہ فرمائیے۔ اس لیے یہاں بھی ایمانیات کے صرف وہی چند اجزاء بیان کر دیے گئے ہیں جو اس محفل میں کسی وقتی مناسبت سے زیادہ اہم سمجھے گئے تھے

(۸۸۸) عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِکُلِّ شَیْءٍ حَقِیْقَۃٌ وَمَا بَلَغَ عَبْدٌ حَقِیْقَۃَ الْاِیْمَانِ حَتّٰی یَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَہٗ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَہٗ وَمَا اَخْطَاَہٗ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیْبَہٗ۔ رواہ احمد والطبرانی قال الہیثمی ورجالہ ثقات

(۸۸۹) عَنِ الشَّعْبِیِّ قَالَ لَمَّا قَدِمَ عَدِیُّ بْنُ حَاتِمٍ الْکُوْفَۃَ اَتَیْنَاہُ فِیْ نَفَرٍ مِنْ فُقَہَاءِ اَھْلِ الْکُوْفَۃِ فَقُلْنَا لَہٗ حَدِّثْنَا مَا سَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا عَدِیَّ بْنَ حَاتِمٍ اَسْلِمْ تَسْلَمْ قُلْتُ وَمَا الْاِسْلَامُ فَقَالَ تَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَتُؤْمِنُ بِالْاَقْدَارِ کُلِّھَا خَیْرِھَا وَشَرِّھَا حُلْوِھَا وَمُرِّھَا۔

رواہ ابن ماجۃ وفی الزوائد ہذا اسناد ضعیف لاتفاقہم علی ضعف عبدالاعلی ولہ شاہد من حدیث جابر رواہ الترمذی۔

(۸۹۰) عَنْ اَبِیْ حَفْصَۃَ قَالَ قَالَ عُبَادَۃُ بْنُ الصَّامِتِ لِاِبْنِہٖ یَا بُنَیَّ اِنَّکَ لَنْ تَجِدَ طَعْمَ حَقِیْقَۃِ

---

(۸۸۸) ابو درداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہر چیز کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے، اسی طرح ایمان کی بھی ایک حقیقت ہے۔ بندہ اس وقت تک ایمان کی حقیقت نہیں پا سکتا جب تک اس کا یقین نہ رکھے کہ جو کچھ اس کو پہنچ گیا یہ ناممکن تھا کہ اس کو نہ پہنچتا، اور جو نہیں پہنچا یہ بھی ناممکن تھا کہ اس کو پہنچ جاتا۔ احمد، الطبرانی۔

(۸۸۹) امام شعبی روایت کرتے ہیں کہ عدی بن حاتم جب کوفہ آئے تو ہم اہل کوفہ کے کچھ سمجھ دار لوگوں کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے ان سے گزارش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو باتیں آپ نے سنی ہیں وہ ہمیں بھی سنائیے۔ انہوں نے فرمایا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: عدی! اسلام قبول کر لو تو امن وچین سے رہو گے۔ میں نے عرض کی اسلام کیا چیز ہے؟ فرمایا یہ کہ اس بات کی دل سے گواہی دو کہ معبود کوئی نہیں مگر ایک اللہ کی ذات (عزوجل) اور اس بات کی کہ میں کسی تردد کے بغیر اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور اس پر بھی یقین کر دو کہ برا بھلا اور تلخ وشیریں جو کچھ بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے وہ سب پہلے سے مقدر ہو چکا ہے۔ (ابن ماجہ)

(۸۹۰) ابو حفصہ روایت فرماتے ہیں کہ عبادہ بن صامت نے اپنے فرزند سے کہا اے میرے عزیز فرزند تم کو اس

ان امور کے علاوہ انبیاء علیہم السلام اور ملائکۃ اللہ اور اس کی سب کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ مگر چونکہ یہ جملہ امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار میں آجاتے ہیں اس لیے ان سب کی ہر جگہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ جس نے آپ کو رسول مان لیا ہو وہ ان سب باتوں کو بھی ضرور مانیگا جن کی آپ نے خبر دی ہے اور نہ ان کا انکار آپ کی رسالت ہی کا انکار ہوگا۔

(۸۸۸) انسان اس عالم میں مختار ہی مختار نظر آتا ہے اگر کہیں انبیاء علیہم السلام تشریف لا کر اس پر عالم غیب کے جبر کی اطلاع نہ دیں تو وہ مدت العمر اپنے اسی جہل میں مبتلا رہے۔ وہ نظر حقیقت میں اس کی مجبوری کو پیرایہ بہ پیرایہ سمجھاتے ہیں اور اس تاکید کے ساتھ سمجھاتے ہیں کہ اگر اس کو اپنی اس مجبوری کا یقین نہیں تو وہ اس کا بھی یقین رکھے کہ ابھی اس کو ایمان کی حقیقت بھی حاصل نہیں بس جبکہ حقیقت یہ ٹھہری کہ انسان مختار ہونے کے ساتھ مجبور بھی ہے تو پھر ان احادیث کی اہمیت بھی واضح ہو گئی مسئلہ کی تفصیل پہلے معلوم ہو چکی ہے۔

الْإِيمَانِ حَتَّى تَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَمَا أَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ تَعَالَى الْقَلَمَ وَقَالَ لَهُ اكْتُبْ فَقَالَ رَبِّ وَمَاذَا أَكْتُبُ قَالَ اكْتُبْ مَقَادِيرَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ يَا بُنَيَّ إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ مَاتَ عَلَى غَيْرِ هٰذَا فَلَيْسَ مِنِّي ۔ رواہ ابو داؤد

التَّشْدِيدُ فِيمَنْ أَنْكَرَ الْقَدَرَ

(۸۹) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقَدَرِيَّةُ مَجُوسُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِنْ مَرِضُوا فَلَا تَعُودُوهُمْ وَإِنْ مَاتُوا فَلَا تَشْهَدُوهُمْ ۔ رواہ احمد وابو داؤد وروی الطبرانی فی الاوسط عن انس الوعید فی القدریۃ والمرجئۃ کلیہما قال الہیثمی ورجالہ رجال الصحیح غیر ہارون بن موسی الفروی وہو ثقۃ وما روی عن ابن عمر

وقت تک ایمان کی حقیقت کی لذت نہیں آسکتی جب تک کہ تم اس کا یقین نہ کرو کہ جو خیر و شر تم کو پہنچ گیا وہ کبھی خطا نہیں کر سکتا تھا اور جو نہیں پہنچا اس کا پہنچنا ممکن نہ تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جو شے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے بنائی وہ قلم ہے پھر اس کو حکم دیا کہ لکھ۔ اس نے عرض کی پروردگار کیا لکھوں۔ ارشاد ہوا قیامت تک جس چیز کے لیے جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ سب لکھ۔ اے میرے فرزند عزیز میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ جو شخص اس عقیدہ کے سوا کسی دوسرے عقیدہ پر مریگا وہ مجھ سے نہ ہوگا۔ (ابو داؤد)

منکرین تقدیر کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید کلمات

(۸۹) ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تقدیر کا انکار کرنے والے اس اُمت

(۸۹) پہلی حدیث میں اسی پختہ اعتقاد کو حقیقت ایمان سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اعتقاد جب پختہ ہو جاتا ہے تو پھر قلب سے گزر کر تمام جسم کو اس کی لذت کا احساس ہونے لگتا ہے، اس لیے اعتقاد اب ذائقہ کی چیز بن جاتا ہے اسی کو اس حدیث میں طعم لذت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قضا و قدر پر اس درجہ کا اعتقاد چونکہ ہر شخص کا حصہ نہیں ہوتا اس لیے ان دونوں حدیثوں میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ یہ مقام کامل مومن کا ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ جان و دل سے اس مقام اعلیٰ پر پہنچنے کی کوشش کرے، تاکہ جو اب تک صرف مومن تھا وہ حقیقی مومن بن جائے اور جس کا ایمان آج تک صرف ایک علمی حیثیت رکھتا تھا اب وہ وجدانی اور وجدانی سے حسی بن جائے۔ یہی وہ احسان کا مرتبہ ہے جس کا تذکرہ آپ حدیث جبرئیل میں پھر ترجمان السنہ جلد اول و ثانی میں موقع بموقع دیکھتے چلے آئے ہیں۔

(۹۱) حدیث مذکور میں عیادت اور جنازہ کی شرکت کے متعلق خاص طور پر ممانعت فرمانے کا نکتہ یہ ہے کہ یہ اُن حقوق میں سے ہیں جو عام مسلمانوں کے لیے بھی واجب ہیں۔ پس جب منکرین قدر کے لیے یہ عام حقوق بھی واجب نہ رہے تو سوچو

فیہ زکریا بن منظور وثقہ احمد بن صالح وغیرہ وضعفہ جماعۃ قال السندی وقد جاء اصل ہذا المتن من حدیث ابن عمر ایضا عند ابی داؤد وقد اخرجہ الترمذی وحسنہ وقد صححہ الحاکم وقال علی شرط الشیخین ان صح سماع ابی حازم عن ابن عمر وحقق الحافظ ابن حجر انہ صحیح علی شرط مسلم فی الاکتفاء بالمعاصرۃ فلا وجہ للحکم بوضعہ کما قیل (وفی النسخۃ بوضعہ وہو غلط) یقول العبد الضعیف وقد اخرجہ السیوطی فی الدر المنثور بلفظ المکذبون بالقدر مجوس ہذہ الامۃ وفیہم انزلت ہذہ الآیۃ ان المجرمین فی ضلال وسعر الی قولہ انا کل شیء خلقنہ بقدر ص ۱۳۵

(۸۹۲) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنَّ فُلَانًا يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ فَقَالَ اِنَّهُ بَلَغَنِي اَنَّهُ قَدْ اَحْدَثَ فَاِنْ كَانَ قَدْ اَحْدَثَ فَلَا تُقْرِئْهُ مِنِّي السَّلَامَ فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ يَكُوْنُ فِي هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوْ فِي اُمَّتِي الشَّكُّ مِنْهُ خَسْفٌ اَوْ مَسْخٌ اَوْ قَذْفٌ فِي اَهْلِ الْقَدَرِ۔ رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث حسن صحیح غریب ورواہ احمد قال الہیثمی ورجالہ رجال الصحیح۔

(۸۹۳) عَنْ نَافِعٍ قَالَ كَانَ لِابْنِ عُمَرَ صَدِيْقٌ مِنْ اَهْلِ الشَّامِ يُكَاتِبُهُ فَكَتَبَ اِلَيْهِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اَنَّهُ بَلَغَنِي اَنَّكَ تَكَلَّمْتَ فِي شَيْءٍ مِنَ الْقَدَرِ فَاِيَّاكَ اَنْ تَكْتُبَ اِلَيَّ فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ

کے مجوسی ہیں۔ اگر بیمار ہوں تو ان کی عیادت بھی نہ کرنا اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازہ میں بھی شریک نہ ہونا۔ احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ۔

(۸۹۲) نافع روایت کرتے ہیں کہ ابن عمر کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا فلاں شخص آپ کو سلام کہتا ہے۔ فرمایا میں نے سنا ہے اس نے تقدیر کے متعلق کوئی نیا عقیدہ اختیار کیا ہے۔ اگر اس نے کوئی نیا عقیدہ اختیار کیا ہو تو میری جانب سے اس کو سلام مت کہنا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ اس امت میں یا میری امت میں (یہ شک راوی کی جانب سے ہے) جو لوگ تقدیر کا انکار کریں گے ان پر عذاب نازل ہوگا زمین میں دھنسا کر یا اس کی شکل بدل کر یا اوپر سے پتھر برسا کر۔ ترمذی، مسند احمد۔

(۸۹۳) نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کا ایک شامی دوست تھا، ابن عمرؓ نے اس کو اس مضمون کا ایک خط لکھا: مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے تقدیر کے بارے میں کچھ بات چیت شروع کی ہے، لہذا آئندہ سے ہرگز مجھ سے خط و

ان کا شمار کیا مسلمانوں کے زمرہ میں ہوگا۔ قدریہ چونکہ تقدیر کے منکر ہیں اور بندوں کے افعال کا خالق خود ان کو قرار دیتے ہیں اس لیے وہ بھی گویا خالق دو ہیں تقسیم کے قائل ہوگئے جس طرح کہ مجوس قائل ہیں۔ یہ خیر و شر کے خالق کو جدا جدا مانتے ہیں اور منکرین قدر بندوں کے افعال کے خالق جدا جدا مانتے ہیں اس لحاظ سے اس امت کے مجوس یہ ہوئے۔ بلکہ یہ ان سے بھی بدتر ہیں کہ مجوس تو صرف دو خالق کے قائل ہیں اور یہ بیشمار خالقوں کے قائل ہوگئے۔ نعوذ باللہ منہ

(۸۹۳) اس حدیث میں اس سے پہلی حدیث سے کچھ زیادہ تفصیل تھی اس لیے اس کو دوبارہ درج کیا گیا ہے۔ جو لوگ اسلامی تعلیمات سے دور ہو جائیں ان کے ساتھ مذاق سلف کیا تھا؟ اس حدیث سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ جہاں معمولی باتوں پر سخت گیری اسلامی معاشرت سے ناواقفی کی دلیل ہے وہاں اہم امور میں تساہل بھی اسلامی تعلیمات سے جہالت کا ثمرہ ہے۔

اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَنَّهُ سَيَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ اَقْوَامٌ يُكَذِّبُوْنَ بِالْقَدَرِ. رواه الحاکم وقال صحیح علی شرط مسلم واقرہ الذہبی۔

(۸۹۴) عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ثَلَاثَةٌ اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِي الْاِسْتِسْقَاءُ بِالْاَنْوَاءِ وَحَيْفُ السُّلْطَانِ وَتَكْذِيْبٌ بِالْقَدَرِ. رواہ احمد۔

(۸۹۵) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُجَالِسُوْا اَهْلَ الْقَدَرِ وَلَا تُفَاتِحُوْهُمْ. رواہ ابوداود۔ واخرجہ الحاکم ولم یتکلم علیہ الذہبی۔

(۸۹۶) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَكُلُّ نَبِيٍّ مُجَابٌ، الزَّائِدُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَالْمُكَذِّبُ بِقَدَرِ اللّٰهِ وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوْتِ فَيُعِزُّ بِذٰلِكَ مَنْ اَذَلَّهُ اللّٰهُ وَيُذِلُّ مَنْ اَعَزَّهُ اللّٰهُ وَالْمُسْتَحِلُّ لِحُرُمِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِيْ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَالتَّارِكُ

کتابت نہ رکھنا، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں کہ اس اُمت میں کچھ لوگ ایسے بھی ہونگے جو تقدیر کی تکذیب کرینگے۔ (مستدرک)

(۸۹۴) جابرؓ روایت فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ مجھے اپنی اُمت کے متعلق تین باتوں کا اندیشہ ہے۔ نچھتروں سے بارش طلب کرنا، بادشاہ کا ظلم کرنا اور تقدیر کا انکار کرنا۔ (احمد)

(۸۹۵) حضرت عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا منکرین تقدیر کے ساتھ نشست وبرخاست نہ رکھو اور اُن کے ساتھ سلام میں پیش قدمی کرو۔ (ابوداود) یعنی متعدی بیماری اگر ہے تو یہی ہے اس لیے اس سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ ان کی صحبت سے بھی بچا جائے۔

(۸۹۶) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے چھ شخص ایسے ہیں جن پر میں بھی لعنت کرتا ہوں اور خدا تعالیٰ بھی لعنت فرماتا ہے (اور تم جانتے ہو کہ ہر نبی کی دعا مقبول ہی ہوتی ہے لہذا میری لعنت معمولی بات نہیں) (۱) کتاب اللہ میں اپنی طرف سے زیادتی کرنے والا (۲) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا منکر (۳) ظلم و تعدی کرکے بادشاہ بن بیٹھنے والا جس کی حرکات ناشایستہ یہ ہوں کہ خدا کے نزدیک قابل عزت بندوں کو ذلیل کر ڈالے اور جو قابل ذلت ہوں ان کو عزت دے (۴) خدا تعالیٰ کے حرم میں جو باتیں ناروا ہوں ان کو حلال

---

(۸۹۴) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان باتوں کا حکم کلیۃً ایسا فنا نہیں ہوگا کہ ان کا انفرادی طور پر بھی کہیں وجود باقی نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی خطہ میں کسی نہ کسی درجہ تک یہ اعتقاد باقی رہے چلا جائیگا۔ آپ کا فرمودہ صبح صادق کی طرح پورا ہو رہا ہے۔ آج بھی لوگ گو اپنے منہ سے تقدیر کا اقرار کرتے ہیں مگر کیا اپنے باطن میں بھی اس پر صحیح اعتقاد رکھتے ہیں۔ بادشاہوں کے ظلم کا افسانہ تو کب کا کہنہ ہو چکا، بارش کا معاملہ بھی ظاہر ہے۔

(۸۹۶) حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اعتقادی یا عملی پہلوؤں میں جب کبھی اسلام کے مرکزی نقطہ سے کوئی ادنیٰ سا ٹکراؤ بھی

نسئیتی ۔ اخرجہ الترمذی والحاکم عن علیؓ واخرج نحوہ الطبرانی فی الاوسط قال الہیثمی رجالہ ثقات وقد صححہ ابن حبان۔ و ما روی عن وائلہؓ وجابرؓ وابی سعیدؓ صنفان من ہذہ الامۃ الحدیث فکلہا ضعاف ۔

کتابۃ القدر

(۸۹۷) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهٗ اُكْتُبْ قَالَ مَا اَكْتُبُ قَالَ اُكْتُبِ الْقَدَرَ فَكَتَبَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ

کر دینے والا (۵) میری اولاد کا احترام نہ رکھنے والا (۶) میرا طریقہ چھوڑ بیٹھنے والا ۔

قضا و قدر لکھی جا چکی ہے

(۸۹۷) عُبادہ بن صامت روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا وہ قلم ہے ۔ پھر اُس کو حکم دیا کہ لکھ ۔ اُس نے عرض کیا کیا لکھوں ۔ حکم ہوا

پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اس کی نظروں میں قابلِ برداشت نہیں سمجھا جاتا اور اسی مقام پر اس قسم کی تعبیرات آجاتی ہیں ۔ مذکورہ بالا جتنی باتیں ہیں اُن سب ہی میں یہ ذکر موجود ہے ۔

(۸۹۷) یہاں اس بحث میں پڑنا کہ سب سے اول قلم ہی کو پیدا کیا گیا ہے یا اُس سے پہلے کچھ اور بھی ۔ اسی طرح اس قلم کی تصویر کشی کے درپے ہونا یہ سب امور زیرِ بحث آتو چکے ہیں مگر ہمارے نزدیک ہیں غیر ضروری مشغلہ ۔ ہاں اگر کسی کو عالم کا جغرافیہ لکھنا ہو تو اس کے لیے بیشک ضروری ہوں گے ۔ ہمیں تو یہاں صرف اتنی بات بتانی ہے کہ حق تعالیٰ نے جب عالم کو بتدریج بنایا تھا اور اس میں اسباب و مسببات کا سلسلہ بھی قائم فرمایا تھا تو اس کی بنیاد سے لے کر آخر تک جملہ امور بھی اسی مناسبت سے پیدا فرمائے تھے ۔ یہاں قلم اور اس کی کتابت وغیرہ کو بھی اسی کی مناسبت سے سمجھنا چاہیے ، ورنہ جس کی شان کُنْ فیکون ہو وہ کسی شے کا محتاج نہیں ہے ۔ علاوہ ازیں کتابتِ تقدیر میں کچھ مختلف فوائد بھی ہیں :

(۱) تقدیر اس بات کی دلیل ہے کہ حق تعالیٰ کو جمیع مخلوقات کا علم پہلے سے حاصل تھا ۔ کیونکہ یہ بدیہی ہے کہ جب تک کسی کو پہلے سے علم حاصل نہ ہو ، وہ کسی مخلوق کو کسی حکیمانہ نظام کے ساتھ پیدا نہیں کر سکتا ۔ تعجب ہے کہ بعض غالی معتزلہ نے بندوں کے افعال پر حق تعالیٰ کے علمِ ازلی کا بھی انکار کر دیا ہے ۔

(۲) تقدیر میں چونکہ ہر چیز کا پورا پورا اندازہ اور اس کی مخصوص مقدار و شکل بھی لکھی ہوئی موجود ہے اس لیے یہ اس کے علم کی اور واضح دلیل ہے کیونکہ خلق اور پیدا کرنے کے لیے جہاں پہلے سے اس شے کا علم ضروری ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کا صحیح صحیح اندازہ اور اس کی پوری پوری شکل کا بھی علم ہو تاکہ اسی کے مناسب اس کو پیدا کیا جا سکے ۔ ارشاد ہے :

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۔ (طلاق) — اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا اپنے علم میں ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے ۔

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۔ (فرقان) — یعنی ہر چیز کو اس نے پیدا فرمایا پھر سب کا الگ الگ اندازہ رکھا ۔

(۳) تقدیری حالات چونکہ مخلوقات کے وجود سے بھی پیشتر مفصلاً لکھ کر رکھ دیے گیے ہیں ، جن کا بقدرِ ضرورت انکشاف انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ان کے وقوع سے قبل بھی ہوتا رہتا ہے تو یہ اس بات کا اور بدیہی ثبوت ہوگا کہ جب ان امور کا علم

إِلَى الْأَبَدِ. رواه الترمذی وقال ہذا حدیث غریب اسناداً۔

(۸۹۸) عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ إِنِّيْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ جَاءَهٗ قَوْمٌ مِنْ بَنِيْ تَمِيْمٍ فَقَالَ اقْبَلُوْا الْبُشْرٰى يَا بَنِيْ تَمِيْمٍ قَالُوْا بَشَّرْتَنَا فَأَعْطِنَا فَجَاءَ نَاسٌ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ اقْبَلُوْا الْبُشْرٰى يَا أَهْلَ الْيَمَنِ إِذْ لَمْ يَقْبَلْهَا بَنُوْ تَمِيْمٍ قَالُوْا قَبِلْنَا جِئْنَاكَ لِنَتَفَقَّهَ فِي الدِّيْنِ وَلِنَسْأَلَكَ عَنْ أَوَّلِ هٰذَا الْأَمْرِ مَا كَانَ قَالَ كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهٗ وَكَانَ

جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ سب لکھ تو اُس نے قیامت تک جو ماضی و مستقبل میں شدنی تھا سب لکھ دیا۔ ترمذی

(۸۹۸) عمران بن حُصین بیان فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھا کہ بنی تمیم قبیلہ کے کچھ لوگ آگئے آپ نے اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا اے بنی تمیم کے لوگو! لو بشارت قبول کرو، انہوں نے عرض کیا اچھا آپ بشارت دیتے ہیں تو اب دیجیے کیا دیتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ لوگ یمن والے آگئے آپؐ نے اُن سے بھی یہی فرمایا اے یمن والو! بنو تمیم نے تو اس بشارت کو قبول نہ کیا لو تم قبول کر لو وہ بولے یا رسول اللہ ہم نے بسر و چشم قبول کیا، ہم تو دین سیکھنے کے لیے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور یہ بات بھی دریافت کرنی ہے کہ اس عالم کی ابتدا کیسے ہوئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا بس اللہ تعالیٰ ہی اللہ تعالیٰ کی ذات تھی اور اس سے

بندوں کو ممکن ہے تو پھر خالق کو بھلا کیونکر نہ ہوگا۔

(۴) تقدیر کی کتابت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عالم حق تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے پیدا ہوا ہے۔ اس طرح نہیں جیسا کہ آفتاب سے دھوپ کا صدور اضطراراً ہوتا ہے۔

(۵) چونکہ تقدیر عالم کے وجود سے قبل لکھی گئی اس لیے جہاں ایک طرف یہ حق تعالیٰ کے اختیار و مشیت کی دلیل ہے، اسی طرح تمام مخلوق کے حدوث کی بھی دلیل ہے۔ حدوث کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام کی تمام مخلوق کسی زمانہ میں معدوم تھی، پھر مشیت الٰہیہ اور اس کی قدرت سے پیدا ہوئی ہے، یوں نہیں ہے کہ ہمیشہ سے اسی طرح بنی بنائی موجود تھی۔ (شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ۲۰۵ و ۲۰۶)

علامہ سید رشید رضا مرحوم تفسیر المنار میں فرماتے ہیں کہ جب صانع عالم نے عالم کو پیدا فرمایا اور اس طرح پیدا فرمایا کہ اس کے ساتھ عرش و کرسی بھی پیدا فرمائے، اس کے نظام قائم رکھنے کے لیے ابر و باد بھی بنائے اور باطنی نظام چلانے کے لیے ملائکۃ اللہ بھی مقرر فرمائے تو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ اس کا نظام بھی مقرر فرما کر لکھ دیا جاتا۔ بس یہی قضاء و قدر اور اس کی کتابت کی حکمت ہے۔ (دیکھو تفسیر مذکور ص ۷۷، ۲ ج ۷)۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن طاہر نے ایک مرتبہ حسین بن الفضل سے پوچھا کہ جب سب کچھ طے ہو کر لکھا بھی جا چکا ہے تو کیسے پھر کل یوم ھو فی شأن کا کیا مطلب ہوگا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ھی شئون یبدیھا لا شئون یبتدیھا۔ (فتح الباری ص ۱۱ ج ۲۹۱) یعنی اپنی ان نئی نئی شانوں کا وہ ہر دن اظہار فرمایا کرتا ہے اگرچہ طے پہلے کر چکا تھا، یہ نہیں کہ ان کی ابتدا ہی اب کرتا ہے۔ یہ جواب سن کر عبداللہ بن طاہر امیر خراسان اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے سر کو بوسہ دیا۔

(۸۹۸) یہاں آپ کو بنی تمیم کی یہ ادا پسند نہ آئی کہ انسان اتنا گر جائے کہ اُس کی نظر میں خوشخبری کا محور بس دنیوی منفعت کے سوا اور کچھ باقی ہی نہ رہے۔ آپؐ نے سکوت فرمایا اور یہ ناگواری کا سکوت تھا، اس پر بھی ان کو کچھ تنبہ نہ ہوا۔ اور طبائع جب گرنے لگتی ہیں تو یہ قاعدہ ہے کہ ان کا احساس بھی گرنے لگتا ہے۔ اتنے میں یمن کے کچھ عالی ہمت لوگ آنکلے وہ اس بشارت کو

عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ وَكَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلَّ شَيْءٍ ثُمَّ اَتَانِيْ رَجُلٌ فَقَالَ يَا عِمْرَانُ اَدْرِكْ نَاقَتَكَ فَقَدْ ذَهَبَتْ فَانْطَلَقْتُ اَطْلُبُهَا فَاِذَا السَّرَابُ يَنْقَطِعُ دُوْنَهَا وَاَيْمُ اللّٰهِ لَوَدِدْتُ اَنَّهَا قَدْ ذَهَبَتْ وَلَمْ اَقُمْ. (رواہ الشیخان)

متٰی کُتِبَ الْقَدَرُ

(۸۹۹) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ

پہلے کچھ نہ تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا، اس کے بعد اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے اور لوح محفوظ میں ہر چیز لکھ کر ثبت فرما دی ہے۔ اتنے میں میرے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا عمران اپنی ناقہ کو پکڑ دو وہ تو بھاگ گئی۔ میں اس کو تلاش کرنے کے لیے نکلا تو وہ اتنی دور جا چکی تھی کہ ریت کی چمک بھی نظر نہ آسکے۔ (حالانکہ وہ بہت دور سے چمکتا رہتا ہے یعنی بہت دور جا چکی تھی)، اور خدا کی قسم مجھے یہ پسند تھا کہ وہ چلی جاتی اور میں اپنی جگہ سے نہ اٹھتا۔ (متفق علیہ)

قضاء وقدر کی کتابت عالم کی پیدائش سے کتنی قبل ہوئی

(۸۹۹) عبداللہ بن عمرو روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے زمینوں

لپک لے گئے۔ اور اُن کے سوال کے جواب میں یہ بات بھی ذکر میں آگئی کہ عالم کی تقدیر لکھی جا چکی ہے۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ عالم غیب چونکہ ہم سے غائب ہی ہے اس لیے اگر وہ ہمارے سامنے بیان میں آتا بھی ہے اس وقت بھی بسا اوقات اس کے گوشوں میں ابہام ہی رہتا ہے گویا مذکور ہو جانے کے بعد بھی وہ مشہود کے درجہ میں نہیں آتا اس کے علاوہ بعض حالتوں میں ابہام فی نفسہ پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ انعام واکرام کے مواقع پر دنیا کا بھی یہی دستور ہے، یہاں بھی بشارت منظور تو ہوئی تھی مگر وہ کس کے نصیب میں ہے، یہ گوشہ مبہم چھوڑ دیا گیا تھا حتی کہ جب بانصیب جماعت آگئی تو یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کے نصیب کی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی ایک جماعت کو عالم خواب میں ایک خاص انداز کی فضیلت میں دیکھا۔ جب آپ نے اس خواب کا ذکر فرمایا تو ایک شخص عکاشہ بن محصن محفل مبارک میں حاضر تھے۔ بیساختہ بول اُٹھے یا رسول اللہ دعاء فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس جماعت میں بنا دے۔ آپ نے فرمایا جاؤ تم ان میں سے ہو گئے۔ اس پر پھر دوسرے صاحب اُٹھے اور انہوں نے بھی یہی درخواست پیش کی۔ آپ نے فرمایا "سبقک بہا عکاشہ" وہ تو عکاشہ لے اُڑے، یعنی اس وقت کسی مبہم کے حق میں اُس جماعت میں ہو ملنے پایا تھا وہ عکاشہ کے نصیب سے ان کو مل گیا، اب تیسرے اور چوتھے کی گنجائش نہیں ہے۔ جہاں ایک طرف تقدیر لکھی جا چکی تھی وہاں اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کی قبولیت بھی اہل یمن کے حصہ میں لکھی جا چکی تھی۔

(۸۹۹) حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تقدیر کے پانچ مراتب تحریر فرمائے ہیں سب سے پہلا مرتبہ ارادۂ ازلیہ ہے جو تمام کائنات کا اصل مبدأ ومنشا ہے اس کے بعد دوسرا نمبر یہ کتابت ہے جس کا یہاں ذکر ہے، تیسرا نمبر وہ ہے جبکہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ارادہ کیا کہ نوع انسانی کی ان سے بنیاد قائم ہو تو ان کی تمام اولاد کو ان سے نکالا اور ان میں مطیع وعاصی، اور مؤمن وکافر کی تقسیم فرمائی چوتھا نمبر وہ کتابت ہے جو رحم مادر میں ہوتی ہے۔ اس کا تذکرہ آئندہ حدیثوں میں آرہا ہے پانچویں

الخلائق قبل ان یخلق السموات والارض بخمسین الف سنۃ قال وکان عرشہ علی الماء

رواہ مسلم۔

(۹۰) عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال وکل اللہ بالرحم ملکا فیقول ای رب نطفۃ ای رب علقۃ ای رب مضغۃ فاذا اراد اللہ ان یقضی خلقھا قال ای

اور آسمانوں کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل تمام مخلوقات کے لیے جو بھی مقدر فرما دیا تھا وہ سب قید کتابت میں لاکر محفوظ کر دیا ہے اور اس سے پیشتر اس کا عرش پانی پر تھا۔ (مسلم)

(۹۰) انس بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے رحم مادر پر ایک فرشتہ مقرر فرما رکھا ہے، وہ یہ عرض کرتا رہتا ہے پروردگار ابھی تک یہ نطفہ ہے، پروردگار اب یہ خون بستہ کی شکل ہو گیا۔ پروردگار اب یہ گوشت کا لوتھڑا بن گیا۔ اب اگر اللہ تعالیٰ یہ ارادہ فرماتا ہے کہ اس کو پیدا فرما دے

نمبر کی تفصیل یہاں عوام بلکہ اکثر خواص کے ذہن سے بھی بالاتر ہے اس لیے اس کو ذکر نہیں کیا گیا۔ دیکھو حجۃ اللہ ص ۶۵ و ۶۶۔
عرش اور پانی کے درمیان میں جب تک آسمان و زمین کا وجود ہی نہ تھا اس وقت تک یہی کہا جائے گا کہ نیچے پانی اور اوپر عرش پھر جب درمیان میں آسمان و زمین آگئے تو اب تعبیر یہ ہو گی کہ عرش آسمانوں کے اوپر ہے۔ درحقیقت عرش جہاں پہلے تھا اب بھی وہیں ہے یہ تغیرات سب تحتانی ہوئے ہیں۔
حافظ ابن قیمؒ نے تقدیری مراتب کو ایک دوسرے پیرایہ میں لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ایک تو وہ مرتبہ ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھا گیا تھا، دوسرا وہ ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد لکھا گیا ہے، مگر ذریۂ ابن آدم کی پیدائش سے قبل۔ اس کا پتہ حدیث میثاق سے چلتا ہے تیسرا مرتبہ وہ ہے جو شکم مادر میں لکھا جاتا ہے اور چوتھا مرتبہ حولی ہے یعنی وہ سالانہ لکھا جاتا ہے، یعنی شب قدر میں اور پانچواں یومی یعنی جو روزمرہ لکھا جاتا ہے۔ کل یوم ھو فی شان۔ حق تعالیٰ کی شان ہر دن نرالی ہے کسی کو پست کرتا ہے اور کسی کو بلند۔ ان میں سے ہر مرتبہ پہلے مرتبہ کی صرف ایک تفصیل ہی ہوتی ہے۔ شفاء العلیل صفحہ ۱۶ اس کی مثال اس عالم میں بھی ہے یہاں بھی سالانہ بجٹ کی منظوری کے بعد پھر تحتانی دفاتر میں علیحدہ علیحدہ منظوریاں بھی ہوتی ہیں مگر یہ سب بجٹ میں داخل ہوتی ہیں۔
(۹۰) واضح رہے کہ اس حدیث کی اصل غرض اطوار جنین کی پوری تفصیلات بیان کرنی نہیں ہیں یہ موضوع علم تشریح کا ہے یہاں اطوار جنین یعنی حمل کے تغیرات اور بچہ کی تدریجی ترقیات کا تذکرہ صرف مسئلۂ تقدیر کے لیے ایک تمہید کے طور پر آگیا ہے تاکہ تقدیر کی کتابت کی نشان دہی ہو سکے۔ اس لیے اس کو پورے طور پر علم تشریح کے ساتھ منطبق کرنا قطعاً غیر ضروری ہے۔ نطفہ اور علقہ اور مضغہ کی تینوں حالتیں، بلاشبہ ہر جنین کے لیے ضروری ہیں، اب ان کی درمیانی ترقیات کیا کیا ہوتی ہیں نہ ان کا یہاں ذکر ہے اور نہ چالیس دن کی مدت جیسا کہ آئندہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں آرہی ہے وہ پوری تحدید ہے۔ صحیح مسلم میں اس روایت کے الفاظ میں راویوں کی جانب سے کچھ اور اختلاف بھی ملتا ہے۔ اُدھر اطباء نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی اُن کی آراء کے اختلاف کے سوا خود جنین کے اختلاف سے بھی مختلف حالتیں ہو جاتی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ جب تک نطفہ میں مکمل تغیر نہیں ہوتا اس کو یہاں نطفہ ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر جب اس میں معمولی سا انجماد ہو جاتا ہے اس کو علقہ سے ادا کیا گیا ہے، جب اس سے زیادہ انجماد ہو جاتا ہے تو اس کو مضغہ کہا گیا ہے، خواہ اس میں ہڈیاں بھی نمایاں ہو چکی ہوں پھر جس طرح کہ دنیا میں گٹھلی لگا کر باغبان جانتا ہے کہ کتنے کتنے

رَبِّ أَذَكَرٌ أَمْ أُنْثَى أَشَقِيٌّ أَمْ سَعِيدٌ فَمَا الرِّزْقُ فَمَا الْأَجَلُ فَيُكْتَبُ كَذٰلِكَ فِي بَطْنِ أُمِّهِ

رواہ البخاری۔

التحذير عن التنازع في القدر

(۱۰۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي الْقَدَرِ فَغَضِبَ حَتّٰى احْمَرَّ وَجْهُهُ حَتّٰى كَأَنَّمَا فُقِئَ فِي وَجْنَتَيْهِ الرُّمَّانُ فَقَالَ أَبِهٰذَا أُمِرْتُمْ أَمْ بِهٰذَا أُرْسِلْتُ إِلَيْكُمْ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِيْنَ تَنَازَعُوا فِي هٰذَا الْأَمْرِ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ أَلَّا تَتَنَازَعُوا فِيهِ۔ رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث غریب، واخرجہ ابن ماجہ باسناد عمرو بن شعیب عن جدہ وصحح فی الزوائد قال السندی وہو مبنی علی عدم الاعتبار بالتکلم فی روایۃ عمرو بن شعیب۔

تو وہ عرض کرتا ہے پروردگار اس کے متعلق کیا لکھوں مرد ہوگا یا عورت، بدبخت ہوگا یا نیک بخت پھر اس کا رزق فراخ ہوگا یا تنگ اور عمر کتنی ہوگی تو اس طرح یہ ساری باتیں ماں کے پیٹ کے اندر ہی اندر لکھ دی جاتی ہیں۔ (بخاری شریف)

قضاء و قدر میں بحث و مباحثہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے

(۱۰۹) ابوہریرہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر تشریف لائے اس وقت ہم تقدیر کے مسئلہ میں بحث کر رہے تھے۔ اس پر آپ کو اتنا غصہ آیا کہ آپ کا چہرۂ مبارک مارے غصہ کے سرخ ہوگیا یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپ کے رخساروں میں انار کا عرق نچوڑ دیا گیا ہے۔ فرمایا کیا تم کو اسی بات کا حکم دیا گیا؟ یا میں اسی بات کے لیے تمہارے پاس رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں خوب یاد رکھو تم سے پہلی امتوں نے جب اس بارے میں جھگڑے نکالے تو وہ برباد کر دی گئیں اس لیے میں تم کو تاکید کرتا ہوں کہ تم ہرگز اس بارے میں بحث و تمحیص نہ کرنا۔ (ترمذی شریف)

دنوں میں اس میں کیا کیا تغیرات ہوتے ہیں پھر زمین اور پانی کی موافقت کے لحاظ کہاں کہاں درخت عمدہ اور کہاں کہاں خراب پیدا ہوتا ہے اسی طریقہ پر وہ فرشتہ جو رحم مادر پر موکل و مقرر ہیں حق تعالیٰ کی جانب سے اس کا احوال کو جانتے پہچانتے ہیں۔

(۱۰۹) انسانی عاقبت نااندیشی کی بھی انتہاء ہے کہ جس مسئلہ میں گفتگو کرنے کی عاقبت معلوم ہو چکی ہو اس میں بھی ممانعت کے باوجود وہ الجھنے سے باز نہیں آتا۔ یہاں ممانعت اس لیے نہیں کہ درحقیقت یہاں کچھ پانی مرتا ہے بلکہ دریا میں جہاں پانی زیادہ گہرا اور خطرناک ہوتا ہے وہاں ہر شفیق ناآموزوں کو تیراکی سے روکا ہی کرتا ہے ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن	که جاہا سپر باید انداختن

انسانی تفتیش کی اس طبعی حرص کو ختم کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت ہی نہ تھی کہ آپ کے چہرۂ مبارک پر آثار غضب نمایاں ہوں اور بس یہ دیکھتے ہی مخاطبین کے قلوب اس بحث سے ایسے متنفر ہو جائیں کہ دلوں میں کبھی اس کا خطرہ بھی نہ گذر سکے۔ سبحان اللہ یہ غصہ بھی کیسی شان رحمت لیے ہوئے تھا۔

التكلم فی القدر

(۹۰۲) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ تَكَلَّمَ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الْقَدَرِ سُئِلَ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيْهِ لَمْ يُسْئَلْ عَنْهُ. رواہ ابن ماجہ قال الہیثمی اسنادہ ضعیف لاتفاقہم علی ضعف یحیی بن عثمان قال فیہ ابن معین والبخاری وابن حبان منکر الحدیث زاد ابن حبان لایجوز الاحتجاج بہ و یحیی بن عبداللہ بن ابی ملیکۃ قال ابن حبان فی الثقات یعتبر بحدیثہ اذا روی عنہ غیر یحیی بن عثمان۔

(۹۰۳) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُخِّرَ الْكَلَامُ فِي الْقَدَرِ لِشِرَارِ أُمَّتِيْ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ. رواہ الطبرانی والحاکم۔

(۹۰۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ أَمْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ

قضاء و قدر میں گفتگو کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے۔

(۹۰۲) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سُنا ہے کہ جس شخص نے تقدیر کے مسئلہ میں ذرا بھی زبان ہلائی قیامت میں اس کی اس سے بازپرس کی جائیگی اور جس نے کوئی گفتگو نہیں کی اس سے کوئی بازپرس بھی نہ ہوگی۔ ابن ماجہ۔

(۹۰۳) ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ تقدیر کے بارے میں جھگڑے کرنا میری اُمت کے بدترین افراد کی قسمت میں لکھا جاچکا ہے، یہ قیامت کے قرب میں ہونگے۔ طبرانی۔ حاکم

(۹۰۴) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اُمت کے معاملات

(۹۰۲) قضاء و قدر کا مسئلہ ایسا دقیق مسئلہ ہے کہ اس میں جھگڑا تو درکنار گفتگو کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے باریک مسائل میں جہاں گفتگو کی وہیں کوئی نہ کوئی پہلو بحث وجدل کا نکلا اور جہاں بحث وجدل کا پہلو نکلا بس انکار قدر کے امکانات پیدا ہوئے جس گفتگو کی انتہا یہ ہو شریعت اس کی ابتداء سے بھی روکتی ہے، لیکن اگر ہزار ممانعت کے باوجود گفتگو شروع ہو ہی جائے اور انفرادی انکار سے نکل کر معاملہ کی نوعیت اجتماعی بننے لگے تو اب اثبات قدر کے لیے گفتگو کرنا شاید مذموم گفتگو نہ رہیگی، لیکن یہ اجازت ایک دوسرے پہلو سے پیدا ہوگی۔ خطرہ کی بات بہرحال خطرہ ہی کی ہے۔ امارت اور قضاء کے بڑے فضائل ہیں اگر ان کے حقوق کی ادائیگی کی جائے مگر ہیں پھر دونوں مناصب خطرہ ہی کے۔ اس لیے سلف تا امکان ان سے بچا ہی کرتے تھے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خطرہ کی بات کرتے ہی کیوں ہو کہ جواب ہی کی نوبت آئے۔

(۹۰۴) صاحبِ شریعت یہ چاہتے ہیں کہ اُمت اپنی حدِ استطاعت تک صرف عمل کرنے کی سعی میں لگی رہے۔ دقیق امور میں بحث کرنے سے صرف دماغی انتشار پیدا ہوتا ہے اور اس دماغی انتشار سے مذہب کا شیرازہ بھی منتشر ہونے لگتا ہے۔ وحی نے ضوم دماغی مشاغل سے مستغنی ہوتے ہیں، اس لیے ان کو جتنا بتا دیا جائے بس اس پر ایمان لے آنا چاہیے اور آئندہ عملی قدم اُٹھائے چلا جانا چاہیے۔ راہِ سلامتی یہ ہے، اس کے سوا ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ پھر جن مسائل سے ہمارے عمل کا

مُوَامِرًا اَوْقَالَ مُقَارِبًا مَالَمْ يَتَكَلَّمُوْا فِى الْوِلْدَانِ وَالْقَدَرِ ۔ قال الحاکم علی شرط الشیخین واقرہ الذہبی

يجب الرضاء بالقضاء وهو علامة لسعادة الانسان

۹۰۵۔ عَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَعَادَةِ ابْنِ اٰدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ تَرْكُهُ اِسْتِخَارَةَ اللّٰهِ وَمِنْ شَقَاوَةِ ابْنِ اٰدَمَ سَخَطُهُ بِمَا قَضَى اللّٰهُ۔ رواہ الترمذی قال ہذا حدیث غریب۔

۹۰۶۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ

درست رہیں گے جب تک کہ وہ دو مسئلوں میں گفتگو نہ کریں۔ ایک وفات شدہ بچوں کی نجات و عدم نجات کے متعلق دوم تقدیر کے معاملہ میں۔ (مستدرک)

قضا و قدر کے فیصلہ پر رضامندی ضروری ہے اور یہ انسان کی بڑی سعادت کی علامت ہے

۹۰۵۔ سعد روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تقدیر کے فیصلہ پر راضی ہو جانا آدمی کی سعادت کی دلیل ہے اور اس کی بدبختی کی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ نیکی کی توفیق مانگنا چھوڑ دے، اور تقدیر کے فیصلہ پر ناراض ہونا تو اس کی انتہائی بدبختی کا ثبوت ہے۔ (ترمذی شریف)

۹۰۶۔ انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جتنی آزمائش سخت ہوتی ہے اس کا

تعلق ہے اُن کا صاف صاف فیصلہ کیا جا چکا ہے اور اگر ان میں اختلاف ہے بھی تو ہر صورت میں اجر کا وعدہ موجود ہے۔ یہ وہ معاملات جو ہمارے عمل سے متعلق نہیں ہیں ان کا تذکرہ بھی گو کافی حد تک مل جاتا ہے مگر کسی بدیہی چیز کا قبل از وقت معرضِ بحث میں لانا چونکہ کبھی بے وجہ الجھاؤ کا باعث بھی بن جاتا ہے اس لیے اُن کی اتنی تفصیلات جتنی کہ انسان کا نفس بے وجہ کرنا چاہتا ہے نہیں ملتیں، اور ان کو اپنے وقت پر چھوڑ دیا جاتا ہے قیامت میں یہ دونوں مسئلے بدیہی ہو کر آنکھوں کے سامنے آجائیں گے پھر ابھی سے اس کے درپے ہونے کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن یہ انسان کی فطرت ہے کہ جتنا اس کو منع کیجیے تحقیقات کے لیے وہ اتنا ہی اور بے چین ہوتا ہے، حالانکہ وہ نہیں سمجھتا کہ بعض مرتبہ اگر مسئلہ کی تفصیلات اس کی خاطر سب سامنے کر دی جائیں تو اس کے لیے شاید اس سے بڑھ کر کسی اور مصیبت کا باعث ہو جائے۔

۹۰۵۔ حضرت شیخ عبدالحقؒ فرماتے ہیں کہ ابتداء حدیث میں جب خدا تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر رضامندی کی تاکید آئی تو کسی کے دل میں یہ وہم گزر سکتا تھا کہ پھر اگر انسان سے معصیت ہو جائے تو اس پر بھی اس کو راضی ہونا چاہیے۔ اس لیے فرمایا کہ انسان کے لیے جہاں یہ ضروری ہے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ خیر اور اس کی مرضیات ہی کی توفیق مانگا کرے۔ اگر اس نے یہ دعا چھوڑ دی تو یہ اس کی بدبختی کی نشانی سمجھنی چاہیے۔ علماء نے لکھا ہے کہ قضاء او فیصلہ خداوندی تو اس کا حکم ہے اس لیے اس پر تو رضامندی ضروری ہے لیکن اگر وہ چیز خود قبیح ہے تو اس پر نا رضائی ضروری ہے۔ کافر کا کفر بھی ایزدی تقدیر سے ہوتا ہے پس اس کا حکم تو بر حکمت ہونے کی وجہ سے بہتر ہی کہا جائیگا گو یہ خود قبیح ہو۔ دیکھو خود بیت الخلاء کیسی گندی چیز ہے مگر کسی مکان کے لیے اس کا بنانا بھی ضروری ہے اور یہ کمال ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا اِبْتَلَاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَاءُ وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ. رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

۹۰۷۔ عَنْ عَائِشَةَ ؓ قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الطَّاعُوْنِ فَاَخْبَرَنِيْ اَنَّهُ عَذَابٌ يَبْعَثُهُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَشَاءُ وَاَنَّ اللّٰهَ جَعَلَهُ رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ لَيْسَ مِنْ اَحَدٍ يَقَعُ الطَّاعُوْنُ فَيَمْكُثُ فِيْ بَلَدِهٖ صَابِرًا مُحْتَسِبًا يَعْلَمُ اَنَّهُ لَا يُصِيْبُهُ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ اِلَّا كَانَ

بدلہ بھی اتنا ہی بڑا ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی سُنت یہ ہے کہ جب وہ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اس کو ضرور آزمائش میں بھی ڈالتا ہے، پھر جو اس پر راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتا ہے اور جو ناراض ہوا وہ بھی اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔

۹۰۷۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے متعلق پوچھا آپؐ نے بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے جس پر چاہے نازل فرمائے لیکن مومنوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے اس کو رحمت بنا دیا ہے۔ لہذا جو شخص بھی طاعون میں مبتلا ہو، اور یہ یقین رکھتا ہو کہ جو کچھ اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے اس کے سوا اس کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی، پھر صبر کے ساتھ ثواب کی اُمید میں اسی شہر میں پڑا رہے (اور

۹۰۶۔ بات یہ ہے کہ امتحان کے بغیر کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ کہیں بھی نہیں ہوتا۔ قدرت چاہتی ہے کہ روز محشر جب اپنی مخلوق کو انعام تقسیم فرمائے تو اس کا معیار صرف اپنے علم ازلی پر نہ رکھے بلکہ انصاف و عدالت کے دن ایسا معیار مقرر کرے جس کا مشاہدہ ہماری آنکھیں بھی کر سکیں وہ چاہتی ہے کہ جن شہداء کو انعام شہادت دے تو اس طرح دے کہ ان کے جسم زخموں سے چور ہوں لیکن اس خستگی میں بھی لبوں پر مسرت کی مسکراہٹ نظر آئے اور جن منافقین کو جہنم میں داخل فرمائے تو اس طرح کہ بروقت رسول سے دغابازی کا ٹیکہ ان کی پیشانی پر لگا ہوا ہو۔

۹۰۷۔ طاعون جیسا تکلیف دہ مرض دنیا میں اپنے اسباب سے ہی آتا ہے، مگر دنیا آج تک اس نکتہ سے غافل تھی کہ اس بیماری کے آنے کا مقصد کیا ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انکشاف فرمایا کہ یہ بیماری ظاہر تو ہوئی تھی ایک قوم کے عذاب کے لیے لیکن میری اُمت کے حق میں رحمت بنا دی گئی ہے۔ لیکن اس کی چند شرائط بھی رکھی گئی ہیں۔ یہ کہ جب اس کے شہر میں طاعون آئے تو ڈر کر وہاں سے بھاگ نہ جائے یہ مسلمان کی پختگی اور تقدیر پر اعتماد کے خلاف ہے یہ کہ شہر میں رہنا بھی ہو تو صابر بن کر ہو کسی مجبوری سے نہ ہو۔ یہ کہ اس میں ثواب کی نیت اور شامل کرلے اور یہ کہ اس کے اس عقیدہ میں کوئی تزلزل بھی نہ آنے پائے، بس یہ یقین رکھے کہ جو اللہ تعالیٰ میرے مقدر میں لکھ چکا ہے نہ اس کے خلاف وقوع پذیر ہو سکتا ہے اور نہ اس سے رستگاری ممکن ہے۔ اگر ان شرائط کی ادائیگی کے بعد تقدیری طور پر اس کی موت آ گئی تو اس کو ایک شہید کا ثواب ملتا ہے۔ ذیل کی روایت سے اس کی مزید تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

"حضرت عرباض بن ساریہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ عام طور پر مرنے والوں اور شہیدوں کے مابین اُن مُردوں کے معاملہ میں جھگڑا ہوتا ہے جن کا انتقال مرض طاعون میں ہوتا ہے۔ شہداء تو یہ کہتے ہیں پروردگار جیسا ہم قتل کیے گئے یہ بھی اسی طرح قتل کیے گئے ہیں، لہذا یہ ہمارے بھائی ہوئے ان کا شہیدوں میں شمار ہونا چاہیے، اور عام مردے کہیں گے کہ ان کی موت بستر پر آئی ہے جس طرح ہماری موت اس لیے یہ ہمارے بھائی ہیں۔ پروردگار کا ارشاد ہو گا اچھا ان کے زخم کی شکل دیکھو اگر وہ شہیدوں کے زخموں کے مشابہ ہوں تو ان کا شمار بھی اُن میں ہو گا اور یہ ان ہی کے ساتھ ہیں گے

لَہٗ مِثْلُ اَجْرِ شَہِیْدٍ . رواہ البخاری

۹۰۸ عَنْ اَنَسٍ قَالَ خَدَمْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا ابْنُ ثَمَانِ سِنِیْنَ خَدَمْتُہٗ عَشْرَ سِنِیْنَ فَمَا لَامَنِیْ عَلٰی شَیْءٍ قَطُّ اُتِیَ فِیْہِ عَلٰی یَدَیَّ فَاِنْ لَامَنِیْ لَائِمٌ مِنْ اَھْلِہٖ قَالَ دَعُوْہُ فَاِنَّہٗ لَوْ قُضِیَ شَیْءٌ کَانَ شَیْءٌ ھٰذا لفظ المصابیح ورواہ البیہقی فی شعب الایمان مع تغییر یسیر۔

اس کو موت آجائے) تو اس کو شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔

۹۰۸۔ انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں آٹھ سال کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت شروع کی اور دس سال تک خدمت کی ہے اس عرصہ میں جب کبھی میرے ہاتھ سے کوئی نقصان ہوگیا تو مجھے آپ نے اس پر کبھی ملامت نہیں فرمائی، اگر گھروالوں میں سے کبھی کسی نے کچھ کہا بھی تو آپ نے فرما دیا رہنے دو کچھ نہ کہو اگر مقدر یوں ہوتا (یعنی نقصان نہ ہونا) تو یونہی ہوجاتا۔ مصابیح بیہقی۔

جب اس کی تحقیق کی جائیگی تو ان کے زخم شہیدوں کے مشابہ ملینگے اس لیے فیصلہ شہداء کے حق میں ہوجائیگا (احمد نسائی) اس روایت سے اوپر کی حدیث کی پوری وضاحت ہوگئی اور شہید کے اجر ملنے کی تفصیل بھی معلوم ہوگئی، اور یہ بھی کہ اسباب ومسببات کے اثرات اس عالم سے گزر کر بھی شاید دوسرے عالم میں بھی ظاہر ہوتے چلے جاتے ہیں وہاں بھی شہادت کا ثواب دینے کے لیے اسباب وعلل کا ایک نقشہ جمایا گیا اس میں بحث وتمحیص ہوئی پھر جس جانب پلّہ بھاری دیکھا گیا اس جانب فیصلہ صادر کردیا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر شہید کا اجر لے تو پہلے شہید کا سا عمل ہونا چاہیے اگر وہ نہ ہو تو اس عمل کا کوئی اثر ہونا چاہیے شہید بھی ایسے دشوار گزار موقعہ پر صبر کر کے محض رضاء الٰہی کی خاطر جان قربان کرتا ہے، طاعون کا مریض بھی بظاہر اپنی جان کو معرض خطر میں ڈال کر صرف رضاء الٰہی کے لیے وہیں جان دیتا ہے۔ جنگ میں میدان قتال اور طاعون میں وبا زدہ علاقے موت کی گرما گرمی کے یکساں سے بازار نظر آتے ہیں رحمت بھی اس مشابہت کی رعایت کرلیتی ہے جب ایک ہی بیماری قوموں کے اختلاف سے ثواب وعذاب کی دو متضاد شکل اختیار کرسکتی ہے تو ایک ہی عمل خالق ومخلوق کے فرق سے حسن او قبیح کیوں نہیں ہوسکتا۔ یہاں تو فرق بھی واضح ہے کہ جو خدا کا فعل ہے وہ اور ہے اور جو بندہ کی صفت ہے وہ دوسری چیز ہے جس پر قبیح ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے وہ خالق کی صفت ہی نہیں ہے، اور جس کو حسن کہا جاتا ہے وہ بندہ کی صفت نہیں بلکہ ایک ہی چیز کا وہ تعلق جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے یعنی اس کا پیدا کرنا یہ حسن ہے اور وہ تعلق جو بندہ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اس کے ساتھ قائم ہوجانا یعنی جگہ قبیح کا حکم اختیار کرلیتا ہے

۹۰۸۔ دیکھنے میں تو یہ ایک معمولی سی بات ہی معلوم ہوتی ہے لیکن غور کیجیے گا تو آپ کو رضاء بقضاء کا ایک کرشمہ ہی معلوم ہوگا کہ اول تو دس سال کی طویل زندگی پھر نہ معلوم اس میں کتنی بار اس قسم کے واقعات پیش آئے ہونگے۔ ان تمام واقعات میں بلا استثناء اس طرح راضی بقضاء رہنا کیا کسی معمولی انسان کی استقامت ہوسکتی ہے، بلاشبہ یہ کمال صرف اس شخصیت ہی کا ہوسکتا تھا جس کی نظروں کے سامنے عالم غیب عالم شہادت سے پہلے مستحضر رہا کرتا ہو اور وہ تو کیا جو شخص بھی ایمان کے ساتھ اس کی محفل میں بیٹھ گیا اس کا سینہ بھی اس معرفت سے لبریز ہوگیا۔ یہاں معمولی نقصانات کا تو ذکر ہی کیا ہے آپ کے لخت جگر کا انتقال ہوتا ہے وہاں بھی عین حالتِ اضطراب میں زبان سے ایسے نپے تلے کلمات نکلتے ہیں جو ایک طرف ضعیف امت کے لیے اسوہ بن سکیں اور دوسری طرف رضاء بقضاء کا مرقع ہوں آنکھیں اشکبار ہیں مگر آپ درد بھری آواز سے جو فقرے فرماتے ہیں وہ یہ ہیں: ولا نقول الا ما یرضی بہ ربنا۔ یعنی ان صبر آزما حالات میں بھی زبان سے بجز ان کلمات کے جو رضاء الٰہی کا موجب ہوں ایک کلمہ نہیں نکل سکتا۔

۹۰۹۔ عَنْ أُسَامَةَ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ جَاءَهُ رَسُولُ إِحْدَى بَنَاتِهِ وَعِنْدَهُ سَعْدٌ وَأُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَمُعَاذٌ أَنَّ ابْنَهَا يَجُودُ بِنَفْسِهِ فَبَعَثَ إِلَيْهَا لِلّٰهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطَى كُلٌّ بِأَجَلٍ فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ ۔ رواہ البخاری۔

الإذعان بأن تعذيب المطيع ورحمة العاصي كلاهما عدل في جنابه تعالى وهو مبحث القدر

۹۱۰۔ عَنِ ابْنِ الدَّيْلَمِيِّ قَالَ أَتَيْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ لَهُ قَدْ وَقَعَ فِي نَفْسِي شَيْءٌ مِنَ الْقَدَرِ

۹۰۹۔ اسامہ بیان کرتے ہیں میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا کہ دفعۃً آپ کی کسی صاحبزادی کی طرف سے قاصد آیا، اس وقت حضرت سعدؓ اور ابی ابن کعب اور معاذ بھی آپ کی مجلس میں حاضر تھے پیغام یہ تھا کہ ان کا لخت جگر سفر آخرت کے لیے تیار ہے۔ آپؐ نے کہلا بھیجا کہ جو دیا تھا وہ بھی اسی کا تھا اور جو لیا ہے وہ اسی کی ملک ہے اور ہر چیز کی ایک مدت مقرر ہو چکی ہے۔ لہذا صبر کرنا چاہیے اور اس میں ثواب کی نیت رکھنی چاہیے۔ (بخاری شریف)

یہ اعتقاد رکھنا کہ فرمانبرداروں کو دوزخ میں ڈال دینا یا نافرمانوں کو جنت بخش دینا مختار کل کی بارگاہ میں دونوں باتیں انصاف ہیں مسئلہ قدر کی جان ہیں

۹۱۰۔ ابن دیلمی بیان کرتے ہیں کہ میں اُبی ابن کعب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے عرض کی تقدیر کے

۹۰۹۔ انتہائی اضطراب اور صبر شکن مقام میں اطمینان و سکون پیدا کرنے کے لیے ان جامع اور مختصر کلمات سے زیادہ موثر اور کلمات نہیں ہو سکتے یہاں سب سے اہم اور سب سے پہلا جو تصور ذہن نشین کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہے اور مالک کے کسی فعل پر ناراضائی کا کسی کو حق ہی نہیں۔ بس اگر کسی کی اولاد اس نے لے لی ہے تو یہ دی کس نے تھی۔ دوم یہاں اس کی بھی یاد دہانی کی گئی ہے کہ تقدیر میں ہر چیز کی ایک مدت معین کی جا چکی ہے لہذا جو چیز دی جاتی ہے اتنی ہی معین مدت کے لیے دی جاتی ہے پس اگر ایک مقرر وقت کے لیے دی ہوئی چیز اپنے وقت مقرر پر لے لی جائے تو اس میں بے صبری کی وجہ کیا۔ یہ تو ایک علمی درس ہوا۔ اب عملاً یہ ضروری ہے کہ صبر کیا جائے اور اس صبر میں ثواب کی نیت بھی کی جائے تاکہ ثواب اور زیادہ حاصل ہو۔ یہ نکتہ یاد رکھیے کہ مصیبت میں صبر کا اجر تو ملتا ہی ہے لیکن اگر اس میں ثواب کی نیت تفصیلی طور پر بھی ہو تو اس کا ثواب اور بڑھ جاتا ہے۔ احتساب کا لفظ اسی نکتہ پر تنبیہ کے لیے آتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایمان بالتقدیر انسان کے لیے کتنی قوت کا باعث ہے اور زندگی کے ہر ہر گوشہ میں کس طرح کارآمد ہے۔

۹۱۰۔ مسئلہ تقدیر میں گفتگو کی تان جس جگہ جا کر ٹوٹتی ہے وہ یہی باب مجازاۃ ہے یعنی انسانی جزا و سزا کا مسئلہ۔ اس لیے صحابی نے یہاں اسی دکھتی رگ کو پکڑ لیا ہے اور اپنے کلام کا آغاز ہی یہیں سے فرمایا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ دنیوی حوادث میں انسانوں کے مختلف حالات ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کا مالک ہے، اس کو ہر امر پر پوری پوری قدرت حاصل ہے اور وہ جو ارادہ فرماتا ہے کرتا ہے لہذا یونہی اس کی مشیت ہوگی، یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو اس کو قادر اور مالک ہونے کے ساتھ منعم اور مہربان بھی سمجھتا ہے مگر خاص اپنے اس معاملہ میں اُس کی کسی نعمت کا ادراک نہیں کرتا۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جس کا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا مہربان ہے

فَحَدِّثْنِي لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُذْهِبَهُ مِنْ قَلْبِي فَقَالَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهْلَ سَمٰوَاتِهِ وَاَهْلَ اَرْضِهِ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ اَعْمَالِهِمْ وَلَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا تَقَبَّلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَاَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ وَلَوْ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا

متعلق میرے دل میں کچھ شبہات پڑ گئے ہیں لہذا آپ کچھ فرمائیے شاید اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے قلب سے ان کا ازالہ فرما دے۔ انہوں نے فرمایا (سنو) اگر اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کی تمام مخلوق کو عذاب میں ڈال دے تو بھی اس کو ظالم نہیں کہا جا سکتا اور اگر سب پر رحم فرما دے تو اس میں کسی کا استحقاق نہیں، اس کی رحمت ان کے اعمال سے کہیں بڑھ کر ہوگی (سنو) جب تک تم تقدیر پر یقین نہ کرو اور اس کا یقین نہ رکھو کہ جو کچھ تم کو پہنچ گیا ناممکن تھا کہ نہ پہنچتا اور جو نہیں پہنچا یہ بھی غیر ممکن تھا کہ تم کو پہنچ جاتا، اس وقت تک اگر تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں اُحُد پہاڑ کے برابر سونا بھی خیرات کر ڈالو جب بھی وہ تم سے قبول نہ فرمائیگا۔ اور اگر اس عقیدہ کے سوا کسی دوسر

ر جو بھی کرتا ہے وہ مومن کے حق میں خیر ہی خیر ہوتا ہے اس لیے اس کو تلخ سے تلخ حوادث میں بھی نعمت ہی نعمت کا کیف حاصل ہوتا رہتا ہے۔ چوتھا وہ ہے جس کی نظر مرتبہ صفات سے گزر کر ذاتِ قدسی صفات پر جا پہنچی ہے وہ سمجھتا ہے کہ ذات باری خود مستحق عبادت ہے اور اس کے احسان و انعام سے قطع نظر وہ جو بھی کرے اس کو بہر کیف اس کا حق حاصل ہے وہ ہر حالت میں لائق ستائش ہی ہے کیونکہ وہ علیم ہے، رحیم ہے اور حکیم ہے، جو بھی کرتا ہے اس میں ضرور کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے پس وہی اس کا مستحق ہے کہ اسی سے محبت کی جائے، اُس کی عبادت کی جائے اور اُس کی حمد و ثنا کی جائے۔ اس شخص کی حمد و ثنا براہ راست ذات باری تعالیٰ کی ہوتی ہے گو اس کو صفات کا علم ہوتا ہے مگر وہ ان صفات کو بھی ذات باری تعالیٰ کا ایک کمال سمجھتا ہے اور اس کی حمد و ثنا ان صفات کے استحضار کے ساتھ نہیں بلکہ براہ راست ذات منبع صفات کی کرتا ہے۔

پہلا طبقہ صابرین کا ہے، دوسرا راضی بقضا کا، مگر غیر شاکر کا تیسرا راضی بقضا کا جو شاکر بھی ہے۔ اور چوتھا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کو احادیث میں "حمادون" کا لقب دیا گیا ہے اور جن کے حق میں یہ بشارت ہے کہ جنت کی طرف سب سے پہلی آواز ان ہی کو دی جائیگی۔ دوسرے اور تیسرے طبقہ کی معرفت جس نے صرف خدا تعالیٰ کی ربوبیت مشیت اور قدرت کو پہچانا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کے انعام و احسان کو بھی پہچان لیا ہے ناقص معرفت ہے۔ جہمیہ اور جبریہ تو صرف پہلی قسم کی معرفت رکھتے ہیں' قدریہ معتزلہ دوسری قسم کی اور تام المعرفۃ وہ اہل علم ہیں جو ذات باری کو صفات سے قطع نظر بھی ہر حالت میں موجب حمد و ثنا سمجھتے ہیں ان کی نظر صرف حکم حاکم کی طرف رہتی ہے نہ کسی مطیع کی اطاعت اور نہ کسی عاصی کی معصیت کی طرف لہذا اگر وہ مطیع کو دوزخ میں داخل فرما دے یا عاصی کو جنت میں، دونوں حالتوں میں وہ عادل، منصف اور حکیم ہی رہیگا۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (تفسیر سورۂ اخلاص ص۱۶۱ تا ۱۷۰ مع تہذیب و ترتیب)

حافظ ابن تیمیہؒ کی اس تفصیل کے بعد آپ اس صحابی کے جواب کی بلندی ٹھیک ٹھیک سمجھ سکتے ہیں۔ جبر و قدر کے مسئلہ میں جو شکوک پیدا ہو سکتے ہیں وہ درحقیقت اس معرفت سے محرومی کا ثمرہ ہیں، اگر انسان کو ذات باری کے کمال کا اندازہ ہو جائے تو شبہات کی ساری دنیا خود بخود نیست و نابود ہو جائے۔ جب تک اس کمالِ خداوندی کا استحضار حاصل نہ ہو شکوک ختم نہیں ہو سکتے، یہ استحضار ہر ایک کے لیے مشکل مرحلہ ہے، اس لیے صاحب شریعت نے بجائے جواب و سوال کرنے کے اس مسئلہ میں گفتگو ہی کی ممانعت فرما دی ہے۔ آپ اُس سارے بیان کو ایک بار پھر پڑھ جائیے جو اس موضوع کے متعلق ہم نے ان صفحات میں مختلف عنوانات سے پھیلایا ہے۔ آپ کو لوٹ پلٹ کر پھر اسی نقطہ پر آنا پڑیگا جس کی اس صحابی نے اپنی پہلی مختصر تقریر

لَدَخَلْتَ النَّارَ قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ قَالَ ثُمَّ اَتَيْتُ حُذَيْفَةَ الْيَمَانِ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ اَتَيْتُ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِيْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ رواہ احمد، ابوداؤد وابن ماجہ والحاکم فی صحیحہ

اَلْعِبَادُ مُخْتَارُوْنَ فِیْ اَفْعَالِهِمْ وَهُمْ مَسُوْقُوْنَ اِلَیْهَا وَمُهَیَّاؤُوْنَ بِهٖ لِلْقَدَرِ السَّابِقِ فَهُمْ مَجْبُوْرُوْنَ اَیْضًا

۹۱۱ـ عَنْ مُسْلِمِ بْنِ يَسَارٍ الْجُهَنِيِّ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سُئِلَ عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ

عقیدہ پر مرو گے تو یاد رکھو دوزخ میں جاؤ گے۔ ابن دیلمی کہتے ہیں اس کے بعد میں عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے بھی یونہی فرمایا پھر میں حذیفہ بن یمان کے پاس پہنچا تو اُنھوں نے بھی یونہی فرمایا، اور پھر زید بن ثابت کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے یہ مضمون خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نقل فرمایا۔ احمد۔ ابوداؤد۔ حاکم ابن ماجہ۔

بندے اپنے افعال میں مختار ہیں مگر اُن کے اس اختیار سے کرایا وہی جاتا ہے جو پہلے مقدر ہوچکا ہے اس لیے وہ مجبور بھی ہیں

۹۱۱ـ مسلم بن یسار جہنی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے ایک مرتبہ اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی وَاِذْ اَخَذَ

میں رہبری کی ہے۔ قضاء و قدر ایک غیبی حقیقت ہے اور جب تک کہ انسان حقائق غیبیہ تسلیم نہ کرلے اس مسئلہ میں اس سے گفتگو لاحاصل ہے۔ دیکھیے یہاں صحابی نے قضاء و قدر کے معاملہ میں جس تقریر کی تمنا ظاہر کی ہے اُس سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف دلائل سننا نہیں چاہتا بلکہ وہ طریقہ چاہتا ہے جس سے قلب کو شفا ہو جائے اور ایک ایسا باطنی نور پیدا ہو کر شبہات کی کھٹک ہی سینہ سے نکل جائے۔ اسی لیے جواب میں بھی صرف ایسا پہلو اختیار کیا گیا ہے جس کو سن کر ایک خدا پرست کے دل پر الٰہی قدرت و سطوت کا ایسا اثر پڑنا ضروری ہے کہ پھر شبہات خود بخود ختم ہو جائیں۔ اگر دل اپنی گہرائیوں میں اس عقیدت سے خالی ہے والعیاذ باللہ تو پھر اس ضعیف الایمان کے لیے یہ جواب بھلا کب شافی ہو سکتا ہے۔ یہ قصور جواب کا نہیں بلکہ خود اسی کا ہے یا مصرف القلوب صرف قلوبنا الیٰ طاعتک و معرفتک۔

اصولی بات تو اتنی تفصیل کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن پورے طور پر یہ سمجھنے کے لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ سب کو عذاب دے تو بھی اس کو ظالم کیوں نہیں کہہ سکتے۔ ضروری ہے کہ آپ عدل و ظلم کے معنی سمجھ لیں۔ تو سُنیے عدل ہر اس تصرف کو کہتے ہیں جو اپنی ملکیت میں ہوتا ہے اور ظلم کہتے ہیں کسی کے حق دبا لینے کو۔ اب سوچیے کہ زمین و آسمان میں ایسا کون ہے جس کو ثواب دینا حق تعالیٰ پر لازم اور ضروری حق ہو، پس اگر یہ حق کسی کا بھی نہیں تو اگر کسی کو بھی جنت عطا نہ فرمائے تو یہ ظلم کیوں ہو، بلکہ چونکہ یہ تصرف اپنی ہی ملک میں ہوگا اس لیے اس کو عین عدل کہا جائیگا، اور فضل یہ ہے کہ جو کسی کا حق نہ ہو اس کو محض اپنے کرم سے عطا کر دینا، لہٰذا اگر وہ سب کو ثواب عطا فرما دے تو یہ اس کا فضل ہی فضل ہوگا، فضل کے متعلق یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا کہ فلاں شخص پر کیوں کیا اور فلاں پر کیوں نہیں کیا یہ تو مالک اور حکیم کی اپنی مرضی کی بات ہوتی ہے جس پر چاہے کرے جس پر چاہے نہ کرے، پھر حکمت والا بھی یہ خوب جانتا ہے کہ کس کو اس نے فضل کا محل بنایا ہے (باقی بر ۱۵)

مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" فَقَالَ عُمَرُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْهَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَآءِ لِلْجَنَّةِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهٗ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّةً فَقَالَ خَلَقْتُ هٰؤُلَآءِ لِلنَّارِ وَبِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَفِيْمَ الْعَمَلُ؟ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ اَعْمَالِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهٗ بِهِ الْجَنَّةَ وَاِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ

رَبُّكَ ﴾ انہوں نے فرمایا اس آیت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے میں نے خود سُنا تھا، تو آپ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پشت پر ایک مرتبہ دایاں ہاتھ پھیر کر کچھ اولاد نکالی اور فرمایا کہ یہ میں نے جنت کے لیے بنائے ہیں اور جنتیوں ہی کے سے عمل کرینگے، اس کے بعد پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور پھر کچھ اولاد نکالی اور اُن کے متعلق فرمایا کہ یہ میں نے دوزخ کے لیے بنائے ہیں اور وہ دوزخیاں ہی کے سے عمل بھی کرینگے۔ اس پر ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ تو پھر اب عمل کس لیے کریں۔ آپ نے جواب دیا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو جنت کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتی شخص کے سے عمل بھی کرا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی اسی قسم کے عملوں پر ہو جاتا ہے اور آخر جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جب کسی کو دوزخ کے

(بقیہ متعلقہ ۹۱۰) اور کس کو اس کا محل نہیں بنایا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿ان الفضل بید اللہ یؤتیہ من یشاء﴾ دوسری جگہ جب مشرکین نے سوال کیا تھا قالوا ﴿أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا﴾۔ کافر کہتے ہیں اچھا ہم سب میں سے یہی مسلمان ہی رہ گئے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا ہے۔ قرآن کے جواب میں ارشاد ہوا ﴿الیس اللہ باعلم بالشاکرین﴾۔ یعنی جی ہاں یہ بات ہم ہی جانتے ہیں کہ کون ہماری نعمتوں کا قدردان اور شکرگزار رہیگا اور کون ناقدر اس لیے نہ بنجر زمین میں کوئی تخم پاشی کرتا ہے نہ ہم ناشکر پر اپنا فضل فرماتے ہیں۔ (شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ۲۷۲)

۹۱۱۔ اس حدیث میں سب سے پہلے عالم تقدیر کے فیصلہ شدہ عالم ہونے پر تنبیہ کی گئی، اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ عمومی حالات وہاں کے فیصلۂ اعمال کس نوعیت پر دائر کیے گئے ہیں پھر عمل کی نسبت بندوں کی طرف ظاہر فرما کر ان کے اختیار پر بھی تنبیہ کر دی گئی اور اس پر بھی کہ اختیاری اعمال پر جزا و سزا معقول ہے لیکن چونکہ یہ سب کچھ ہو چکا تھا انسان کے عالم وجود میں آنے سے قبل ہی قبل، اس لیے آخر کار انسان مجبور ہی ٹھہرا عجیب بات ہے کہ صحابۂ کرام کو مسئلۂ تقدیر میں جب کہیں شبہ ہوا ہے تو اپنے معاملہ میں ہوا ہے یعنی جب قضاء و قدر کا فیصلہ ہو چکا ہے تو اب ہماری عملی جدوجہد بیکار رہیگی یہ شبہ کبھی نہیں ہوا کہ جب ہم مجبور ہیں تو پھر ہم کو دوزخ میں ڈالنا ظلم ہوگا، گویا شبہ ہے تو اپنی مجبوری کی بناء پر نہ کہ مختار کل کے اختیار پر۔ حق تعالیٰ کو خالق، مالک اور مختار کل مان کر پھر تو اس پر کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے آپ کے جواب کا رُخ بھی اسی طرف رہا ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ قضاء و قدر نے تمہارا اختیار سلب نہیں کیا ہاں یہ ضروری ہوگا کہ تم وہی جانب اختیار کر سکو گے جو قضاء و قدر کے تحت ہوگی، مگر اختیار کروگے اپنے اختیار ہی سے۔ ظاہر ہے کہ انسان بیک وقت کسی عمل کی دونوں جانبوں کو تو اختیار کر نہیں سکتا ایک ہی جانب کریگا۔ اب جس جانب کو بھی وہ اختیار کریگا بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہی جانب اس کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ کہ تقدیر کا جبر تمہارے اختیار پر ہے تمہارے عمل پر نہیں اگر تم یہ کہو کہ عمل گو ہمارے اختیار سے صادر ہوتا ہے مگر ہمارا اختیار جب جبر کے تحت ہوا تو بواسطہ گویا عمل بھی جبر کے تحت آگیا تو یہ درست

أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ بِعَمَلٍ مِنْ اَعْمَالِ اَهْلِ النَّارِ فَيُدْخِلُهُ النَّارَ۔ رواہ مالک فی الموطا والترمذی وابو داؤد وقال الحاکم علیٰ شرط مسلم۔ وقال الحافظ ابن عبدالبر ہو حدیث منقطع ثم قال ہذا الحدیث وان کان علیل الاسناد فان معناہ قد روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم من وجوہ کثیرۃ عن عمر بن الخطاب وغیرہ ومن روی معناہ فی القدر علی بن ابی طالب، وابی بن کعب، وابن عباس، وابن عمر وابوہریرہ وابوسعید الخدری وابوسریحۃ الغفاری وعبداللہ بن مسعود وعبداللہ بن عمرو بن العاص وذوالحجۃ الکلابی وعمران بن الحصین وعائشہ وانس ابن مالک وسراقۃ بن جعشم وابوموسی الاشعری وعبادۃ بن الصامت وزاد غیرہ حذیفۃ الیمان وزید بن ثابت وجابر بن عبداللہ وحذیفۃ ابن اسید وابا ذر ومعاذ بن جبل وہشام بن حکیم اھ فاحادیث القدر متواتر المعنی۔ (انظر ازالۃ الخفاء العلیل ص ۱۰)

۹۱۲۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ خَرَجَ اِلَى الشَّامِ حَتّٰى اِذَا كَانَ بِسَرْغٍ لَقِيَهُ اُمَرَاءُ الْاَجْنَادِ اَبُوْعُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ وَاَصْحَابُهُ فَاَخْبَرُوْهُ اَنَّ الْوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ بِالشَّامِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ عُمَرُ اُدْعُ لِيَ الْمُهَاجِرِيْنَ الْاَوَّلِيْنَ فَدَعَاهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ وَاَخْبَرَهُمْ اَنَّ الْوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ بِالشَّامِ فَاخْتَلَفُوْا فَقَالَ بَعْضُهُمْ قَدْ خَرَجْتَ لِاَمْرٍ وَلَا نَرٰى اَنْ تَرْجِعَ عَنْهُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ مَعَكَ بَقِيَّةُ النَّاسِ وَاَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا نَرٰى اَنْ تُقْدِمَهُمْ

لیے پیدا فرماتا ہے تو اس سے عمل بھی دوزخی شخص کے کرالیتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی ان ہی اعمال پر ہوجاتا ہے جو دوزخی لوگوں کے عمل ہیں اور آخر وہ دوزخ میں داخل ہوجاتا ہے۔

۹۱۲۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ شام کی طرف تشریف لے گئے جب مقام سرغ میں پہنچے تو لشکروں کے جرنیل ابوعبیدہ اور اُن کے ہمراہیوں نے یہ اطلاع دی کہ ملک شام میں تو طاعون ہو رہا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا ان لوگوں کو ذرا بلاؤ جنھوں نے سب سے پہلے ہجرت کی تھی۔ ان کو بلا کر اس معاملہ میں ان سے مشورہ کیا اور کہا کہ شام میں تو طاعون ہو رہا ہے یہ سُن کر اُن کی رائے باہم مختلف ہوگئی، کسی نے تو یہ کہا کہ جب آپ جہاد کے ارادہ سے نکل چکے ہیں تو ہمارے خیال میں اب آپ کی واپسی مناسب معلوم نہیں ہوتی اور کسی نے یوں کہا کہ آپ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچے کچھے صحابہ ہیں ہمارے نزدیک تو مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ آپ ان کو اس طاعون زدہ علاقہ

(بقیہ حاشیہ ۹۱۱) درست ہے اس لحاظ سے یقیناً تم مجبور رہ گئے مگر ایسے مجبور نہیں جو معذور ٹھہر سکو جہاں جبری عمل پر جزا و سزا ظلم نہ ہو وہاں اختیاری عمل پر جزا و سزا بھلا کیا ظلم ہو سکتا ہے۔

۹۱۲۔ حضرت عمرؓ نے یہاں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے کہ جو افعال ہم کرتے ہیں اگرچہ وہ اپنے اختیار ہی سے کرتے ہیں لیکن اس اختیار کی وجہ سے قضا و قدر کے جبر سے خارج نہیں ہوجاتے۔ وہ رہتے ہیں پھر اسی کے نیچے نیچے لہٰذا اگر میں یہاں سے اپنے اختیار سے بھاگ رہا ہوں تو کیا ہوا، مجھ کو بھگا بھی قضا و قدر ہی رہی ہے، اگر یہاں رہتا تو بھی تقدیر کے تحت رہتا، اور

عَلٰی هٰذَا الْوَبَاءِ فَقَالَ ارْتَفِعُوْا عَنِّیْ ثُمَّ قَالَ اُدْعُ لِیَ الْاَنْصَارَ فَدَعَوْتُهُمْ فَسَلَکُوْا سَبِیْلَ الْمُهَاجِرِیْنَ
وَاخْتَلَفُوْا کَاخْتِلَافِهِمْ فَقَالَ ارْتَفِعُوْا عَنِّیْ اُدْعُ لِیْ مَنْ کَانَ هٰهُنَا مِنْ مَشْیَخَةِ قُرَیْشٍ مِنْ
مُهَاجِرَةِ الْفَتْحِ فَدَعَوْتُهُمْ فَلَمْ یَخْتَلِفْ مِنْهُمْ عَلَیْهِ رَجُلَانِ فَقَالُوْا نَرٰی اَنْ تَرْجِعَ بِالنَّاسِ وَ
لَا تُقْدِمَهُمْ عَلٰی هٰذَا الْوَبَاءِ فَنَادٰی عُمَرُ فِی النَّاسِ اِنِّیْ مُصْبِحٌ عَلٰی ظَهْرٍ فَاَصْبِحُوْا عَلَیْهِ قَالَ اَبُوْ
عُبَیْدَةَ أَفِرَارًا مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ قَالَ عُمَرُ لَوْ غَیْرُكَ قَالَهَا یَا اَبَا عُبَیْدَةَ نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ
اِلٰی قَدَرِ اللّٰهِ اَرَاَیْتَ لَوْ کَانَ لَكَ اِبِلٌ هَبَطَتْ وَادِیًا لَهٗ عُدْوَتَانِ اِحْدَاهُمَا خَصِبَةٌ وَالْاُخْرٰی
جَدْبَةٌ اَلَیْسَ اِنْ رَعَیْتَ الْخَصِبَةَ رَعَیْتَهَا بِقَدَرِ اللّٰهِ وَاِنْ رَعَیْتَ الْجَدْبَةَ رَعَیْتَهَا بِقَدَرِ اللّٰهِ
قَالَ فَجَاءَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ وَکَانَ مُتَغَیِّبًا فِیْ بَعْضِ حَاجَتِهٖ فَقَالَ اِنَّ عِنْدِیْ فِیْ هٰذَا عِلْمًا

میں لے جاکر ڈال دیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا آپ لوگ تشریف لیجائیں، اس کے بعد فرمایا اب انصار کو بلاؤ۔ میں نے ان کو بلالیا، انہوں نے بھی مہاجرین کا سا جواب دیا اور جیسے ان کی رائے مختلف ہوگئی تھی انہوں نے بھی مختلف جوابات دیے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے بھی فرمایا کہ آپ لوگ بھی تشریف لے جائیے، اس کے بعد فرمایا اچھا اُن مہاجرین قریش حضرات کو بلاؤ جو فتح مکہ میں شریک تھے۔ میں ان کو بلا کر لایا تو اُن میں سے دو شخصوں نے بھی ذرا اختلاف نہ کیا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا ایسی حالت میں ہمارے نزدیک واپس ہو جانا ہی مناسب ہے، اور ہمارے نزدیک لوگوں کو اس وبا زدہ علاقہ میں لے جانا نامناسب ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں میں اعلان کرا دیا کہ کل صبح کو سواریوں پر جانے کے لیے تیار ہو جائیں میں بھی چلونگا۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا اے عمرؓ کیا یہ واپسی کا حکم تقدیر الٰہی سے بھاگ کر دیا جا رہا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اے ابو عبیدہ یہ بات تو تمہارے شایان شان نہیں تھی کاش کہ تمہارے سوا ایسی موٹی بات تو کوئی اور شخص کہتا، جی ہاں میں تقدیر الٰہی سے بھاگ کر جا رہا ہوں مگر تقدیر الٰہی کی طرف ہی جا رہا ہوں۔ فرمائیے تو سہی اگر آپ کے پاس کچھ اونٹ ہوں اور آپ اُن کو لے کر کسی وادی میں اُتریں جس کے دو کناروں میں ایک کنارہ خشک ہو اور دوسرا سرسبز تو فرمائیے اگر آپ اپنے اونٹوں کو اس سرسبز جانب چرائینگے تو کیا یہ تقدیر الٰہی کے موافق ہی نہ ہوگا، اور اگر خشک جانب چرائینگے تو کیا یہ بھی تقدیر کے تحت ہی نہ ہوگا راوی کہتا ہے کہ اس درمیان میں عبد الرحمٰن بن عوف واپس آگئے وہ اپنی کسی ضرورت سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے، انہوں نے فرمایا کہ اس معاملہ کے متعلق میرے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا فرمودہ علم موجود ہے۔

اب جا رہا ہوں تو یہ بھی تقدیر ہی کے تحت ہے۔

حضرت عمرؓ ان صائب الفکر صحابہ میں سے تھے جن کی رائے کی موافقت بسا اوقات خود وحی نے بھی فرمائی تھی۔ آج پھر کسی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی آنکلا اور اس سے پھر معلوم ہوا کہ جو رائے اس معاملہ میں ان کی قائم ہوئی تھی وہی عین وحی الٰہی کا منشا رہا۔

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِأَرْضٍ فَلَا تَقْدِمُوْا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِنْهُ قَالَ فَحَمِدَ اللّٰهَ عُمَرُ ثُمَّ انْصَرَفَ۔ رواہ البخاری مالک فی الموطا

لَا يَسُوْغُ لِأَحَدٍ الْاِعْتِذَارُ بِالْقَدَرِ

۹۱۳۔ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ .... أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَرَقَهُ وَفَاطِمَةَ بِنْتَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً فَقَالَ أَلَا تُصَلِّيَانِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَنْفُسُنَا بِيَدِ اللّٰهِ فَإِذَا شَاءَ أَنْ يَبْعَثَنَا بَعَثَنَا فَانْصَرَفَ حِيْنَ قُلْتُ ذٰلِكَ وَلَمْ يَرْجِعْ إِلَيَّ شَيْئًا ثُمَّ سَمِعْتُهُ وَهُوَ مُوَلٍّ يَضْرِبُ فَخِذَهُ وَهُوَ يَقُوْلُ وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا۔ رواہ البخاری والبیہقی فی کتاب الاسماء والصفات۔

میں نے آپ سے خود سنا ہے کہ جب کسی خطہ میں طاعون ہو جائے تو اس میں تم جاؤ مت اور اگر طاعون اس جگہ ہو جائے جہاں تم موجود ہو تو موت کے ڈر سے وہاں سے بھاگو مت یہ سن کر حضرت عمرؓ نے خدا تعالیٰ کی حمد کی اور مدینہ طیبہ واپس ہو گئے۔ بخاری شریف۔ موطا مالک۔

حکم عدولی کے لیے تقدیر کا عذر تراشنا روا نہیں

۹۱۳۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس شب میں تشریف لے آئے اور فرمایا تم لوگ تہجد کی نماز نہیں پڑھتے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہماری جانیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں وہ جب ہمیں اٹھانا چاہیگا اٹھا دیگا۔ یہ جواب سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہو گئے اور میری بات کا کوئی جواب نہ دیا، جب آپ پشت پھیر کر تشریف لیجا رہے تھے تو میں سن رہا تھا کہ آپ اپنا دستِ مبارک اپنی ران پر مار کر یہ آیت پڑھتے ہوئے جا رہے تھے وکان الانسان اکثر شیء جدلا انسان بہت جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ (بخاری شریف)

۹۱۳۔ آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ انسان کو جب مختار بنایا گیا ہے اور اسی اختیار پر اس کو احکام شریعت کا مکلف بھی کیا گیا ہے تو اب اس اختیار پر تقدیری جبر کا عذر کرنا بے موقعہ عذر ہونا چاہیے کیونکہ یہ جبر اپنے احساس میں نہیں ہوتا لیکن یہاں چونکہ یہ عذر اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ نماز تہجد کے لیے اٹھنے سے کوئی انحراف تھا، حضرت علیؓ جو امام الاولیا ہوں ان کی عبادت و ریاضت کا حال کس سے پوشیدہ ہے لیکن بعض مرتبہ کسی عمل کا ارادہ رکھنے کے باوجود انسانی فطرت اپنی گزشتہ فروگزاشت کا وقتی عذر کر دیتی ہے۔ پوری عقیدت کے ساتھ اگر ناز کا کوئی رشتہ بھی حاصل ہو تو اس مقام میں ایسی تعبیری آزادی کے لیے کچھ وسعت بھی نکل آتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور امہات المومنین کے خانگی معاملات میں گفتگو نے اس کا پتہ چلتا ہے۔ دیکھو ترجمان السنہ ج ۱ ص ۳، ۲۔ نوٹ حدیث (۹) مگر معاملہ چونکہ یہاں نبی وقت کے سامنے کا تھا اس لیے

الالتجاء الى القدر عند المصيبة من سنة آدم عليه الصلوٰة والسلام

۹۱۴ - عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِحْتَجَّ اٰدَمُ وَمُوْسٰی عِنْدَ رَبِّهِمَا فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰی قَالَ مُوْسٰی اَنْتَ اٰدَمُ الَّذِیْ خَلَقَكَ اللّٰهُ بِيَدِهٖ وَنَفَخَ فِيْكَ مِنْ رُّوْحِهٖ وَاَسْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتَهٗ وَاَسْكَنَكَ فِيْ جَنَّتِهٖ ثُمَّ اَهْبَطْتَ النَّاسَ بِخَطِيْئَتِكَ اِلَى الْاَرْضِ قَالَ اٰدَمُ اَنْتَ مُوْسَى الَّذِي اصْطَفَاكَ اللّٰهُ بِرِسَالَاتِهٖ وَبِكَلَامِهٖ وَاَعْطَاكَ الْاَلْوَاحَ فِيْهَا تِبْيَانُ كُلِّ شَيْءٍ وَقَرَّبَكَ نَجِيًّا فَبِكَمْ وَجَدْتَ اللّٰهَ كَتَبَ التَّوْرَاةَ قَبْلَ اَنْ اُخْلَقَ قَالَ مُوْسٰی بِاَرْبَعِيْنَ عَامًا قَالَ اٰدَمُ فَهَلْ وَجَدْتَ فِيْهَا وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى

مصیبت میں تقدیر کا سہارا لینا حضرت آدم علیہ السلام کی سنت ہے

۹۱۴ - ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک مرتبہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کے مابین اپنے پروردگار کے سامنے گفتگو ہوگئی اس میں حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی آپ وہی آدم تو ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ مبارک سے پیدا فرمایا پھر آپ میں اپنی خاص روح پھونکی، آپ کو فرشتوں سے سجدہ کرایا اور آپ کو اپنی جنت میں بسایا۔ آپ نے یہ کیا کیا کہ اپنی ایک خطا کی بدولت اپنی تمام اولاد کو زمین پر نکلوا پھینکا۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا۔ اچھا تم بھی وہی موسیٰ تو ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور شرفِ ہمکلامی کے لیے منتخب کیا، تورات کی تختیاں عنایت فرمائیں جس میں ہر ہر بات کی تفصیل موجود تھی، پھر تم کو اپنی سرگوشی کے لیے قریب بلایا۔ ذرا بتاؤ تو سہی اللہ تعالیٰ نے میری پیدائش سے کتنے پہلے تورات لکھ دی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چالیس سال پہلے۔ آدم علیہ السلام نے

سے کچھ اغماض اور کچھ تنبیہ ضروری ہوگئی۔ تنبیہ تو اس لیے کہ ہر شخص سے تخاطب اس کے منصب کے مناسب ہوا کرتا ہے اور اغماض اس لیے کہ جو پیرایۂ عذر یہاں اختیار کیا گیا تھا وہ بہرحال ایک حقیقت کا حامل تھا۔ لہٰذا آپ نے ان دونوں باتوں کی رعایت فرما کر کوئی معارضہ بھی نہیں فرمایا صرف اپنی ایک ادنیٰ بے التفاتی سے یہ ظاہر فرما دیا کہ صحیح بات اگر بے موقعہ منہ سے نکل جائے تو بے مزہ ہوتی ہے اور صراحۃً ان کے اس عذر کی تصویب بھی نہیں فرمائی سا گربات صحیح ہو کر بے محل واقع ہو جائے تو وہاں یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

۹۱۴ - خلاق عالم نے عالم کو پیدا فرما کر جہاں عالم کے جملہ حوادث طے فرما کر لکھ دیے تھے اس کے ساتھ ہی نسلِ انسانی کی سبق آموزی کے لیے تقدیر کے ایک واقعہ کا ذکر بھی کر دیا ہے وہ یہ کہ ہماری ہی مشیت تھی کہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنائیں اس لیے ہم نے ہی آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ہم نے ہی ان کو گیہوں کھانے سے منع کیا اور پھر ہم نے ہی ان کو اس کی قدرت دے کر ان سے اس کا ارتکاب بھی کرایا اس کے بعد پھر ہم نے ہی آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے یہ سوال کیا: اے آدم کیا ہم نے تم کو اس درخت کے پاس پھٹکنے سے بھی منع نہیں کر دیا تھا اور کیا اس سے بھی خبردار نہیں کر دیا تھا کہ دیکھو شیطان تمہارا بڑا

قَالَ نَعَمْ قَالَ اَفَتَلُوْمُنِیْ عَلٰی اَنْ عَمِلْتُ عَمَلًا کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلَیَّ اَنْ اَعْمَلَہٗ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَنِیْ بِاَرْبَعِیْنَ سَنَۃً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰی. وفی لفظ اخرجتنا ونفسك من الجنۃ وفی لفظ خیبتنا۔ رواہ مسلم۔

فرمایا کیا تم کو اس میں یہ لکھا ہوا بھی ملا تھا وعصیٰ اٰدم ربہ فغویٰ۔ انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا پھر بھلا ایسی بات پر مجھے کیا ملامت کرتے ہو جس کا کرنا اللہ تعالیٰ میری قسمت میں میری پیدائش سے بھی چالیس سال پیشتر لکھ چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس اس بات پر آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔ (مسلم شریف)

دشمن ہے اس کے کہے میں نہ آنا، پھر تم ان سب باتوں کو فراموش کرکے گیہوں کھا بیٹھے۔

اب نسل انسانی کو خوب سن لینا چاہیے کہ اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام نے جو جواب دیا وہ صرف گریہ و زاری تھا اس کے سوا ایک حرف تک منہ سے نہیں نکالا اور کلمات استغفار بھی اس وقت کہنے کی جرأت کی جگہ پروردگار ہی کی طرف سے ان کا القا کیا گیا۔ اس واقعہ میں بھی بڑا سبق تھا کہ جو خالق اور مالک ہو اس سے سوال کرنے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا یہ حق صرف اسی کا ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے باز پرس کرے۔ یہاں ممکن تھا کہ کسی کے دل میں یہ وسوسہ گزر جاتا کہ شاید حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں اس وقت جواب نہ آسکا ہوگا اس لیے عالم غیب میں اس عقدہ کے حل کے لیے بھی ایک مستقل مکالمہ مرتب فرمائی گئی اور عالم غیب میں کشف اسرار کے لیے یہ بھی ایک طریقہ ہے اور گفتہ آید در حدیث دیگراں کی صورت سے معاملہ کی حقیقت واضح کردی گئی۔ یہاں ابوالبشر سے مکالمہ کے لیے مشیت الٰہیہ نے ان کی اولاد میں سے ایسے فرزند کو منتخب فرمایا جو فطرۃً تیز مزاج اور ناز پروردہ تھے تاکہ ان سے گفتگو کی ابتدا کرسکیں اور ان کے سامنے سوال و جواب کے لیے یہی موضوع رکھ دیا اور اس ضمن میں یہ واضح کردیا کہ ابوالبشر کے پاس جواب تو تھا اور ایسا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا اولوالعزم پیغمبر بھی اس کے جواب سے عاجز ہوگیا، مگر یہاں معاملہ مخلوق کا مخلوق کے سامنے تھا لیکن جب یہی معاملہ خالق کے سامنے پیش آیا تھا تو آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ایسے لاجواب تھے کہ گریہ و زاری کے سوا ان کے پاس کوئی اور جواب ہی نہ تھا۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ جو سوال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ آپ نے گیہوں کھایا کیوں، بلکہ یہ ہے کہ آپ نے ہم کو اس دارالتکلیف میں رہنے کی مصیبت میں کیوں ڈال دیا، مگر چونکہ یہاں آنا گیہوں کھانے کے نتیجہ میں ہوا تھا اس لیے اس کا ذکر بھی ضمناً آگیا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اپنی معصیت کے لیے تقدیر کا عذر کرنا کسی کے لیے بھی جائز نہیں ہے چہ جائیکہ نبی کے لیے ورنہ تو پھر تمام بساط شریعت ہی درہم برہم ہوئی جاتی ہے اور دنیا اپنے تمام معاصی کے لیے یہی تقدیر کا عذر پیش کرکے اپنا پیچھا چھڑا سکتی ہے۔ پس آدم علیہ السلام نے تقدیر کا عذر اپنی معصیت کے لیے نہیں کیا بلکہ دنیا میں آنے کی جو مصیبت ان کی اولاد کو پیش آگئی ہے اس کی تسلی تشفی کے لیے کیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ یہ مصیبت تمہارے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی تھی پھر جو بات پہلے سے مقدر ہو چکی تھی اس کے لیے باعث گو میں ہی ہوا لیکن اس پر مجھے ملامت کرنا درست نہیں وہ تو شدنی امر تھا ہو کر رہتا۔ مصیبت میں تقدیر کا ذکر کرنا رضا بقضاء کی علامت ہے اور گناہ پر تقدیر کی آڑ لینا انتہائی جسارت ہے۔ کچھ بھی دنیا اس قسم کے مواقع میں تقدیر ہی کا تذکرہ کرکے اپنے دل کی تسلی کا سامان کیا کرتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص تجارت کا ایک شعبہ چھوڑ کر دوسرا شعبہ اختیار کرلے اور اس میں اس کو کافی نقصان ہو جائے تو اگر لوگ اس تبدیلی پر اس کو ملامت کریں تو ان سے پیچھا چھڑانے اور اپنے نفس کو تسلی دینے کے لیے وہ تقدیر ہی کا پہلو اختیار کرتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ میرے مقدر کی بات

۹۱۵ عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ سِرْنَا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃً فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ لَوْ عَرَّسْتَ بِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ اَخَافُ اَنْ تَنَامُوْا عَنِ الصَّلٰوۃِ قَالَ بِلَالٌ اَنَا اُوْقِظُکُمْ فَاضْطَجَعُوْا وَاَسْنَدَ بِلَالٌ ظَهْرَہٗ اِلٰی رَاحِلَتِہٖ فَغَلَبَتْہُ عَیْنَاہُ فَنَامَ فَاسْتَیْقَظَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَدْ طَلَعَ حَاجِبُ الشَّمْسِ فَقَالَ یَا بِلَالُ اَیْنَ مَا قُلْتَ قَالَ مَا اُلْقِیَتْ عَلَیَّ نَوْمَۃٌ

۹۱۵۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک شب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں سفر کیا کچھ لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ کاش شب میں آرام کی اجازت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ تم صبح کی نماز سے نہ رہ جاؤ۔ بلال رضی اللہ عنہ بولے میں آپ لوگوں کو بیدار کردونگا۔ اس پر سب لوگ لیٹ رہے، ادھر بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی سواری سے ذرا کمر لگائی (اور خیال یہ تھا کہ بیٹھا صبح صادق کو دیکھتا رہونگا) وہ بھی اپنی آنکھیں کھلی نہ رکھ سکے اور سو گئے اب آپ بیدار ہوئے تو آفتاب کا کنارہ چمک رہا تھا۔ آپ نے فرمایا بلال! وہ بات جو تم کہتے تھے کہاں گئی (آخر جس کا مجھے خطرہ تھا وہ واقع ہو گیا یا نہیں) بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ

مجھ پر ایسی نیند کبھی نہیں ڈالی گئی

صوتی اس لیے نقصان ہونا تھا ہو گیا۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی مختلف تصانیف میں اس واقعہ کی بھی توجیہ فرمائی ہے اور یہی سب سے مستحسن اور بے تکلف بھی ہے گر اس کی پوری وضاحت حافظ ابن قیم نے فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور جوابات دیے گئے ہیں مگر وہ سب تکلف معلوم ہوتے ہیں۔ حافظ ابن قیم نے ان کی تردید بھی فرمائی ہے۔ دیکھو شفاء العلیل ص ۱۸ و شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ۹۷۔ البدایۃ والنہایہ ج ۱ ص ۸۵۔

۹۱۵۔ نبی کے منہ سے نکلی ہوئی بات پوری ہو کر رہتی ہے آپ کے دہن مبارک سے نماز کے قضاء ہونے کا خطرہ نکلا دیکھو آخر وہ قضاء ہو کر رہی۔ سورۂ یوسف میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے نکلا تھا "واخاف ان یاکلہ الذئب" ڈرتا ہوں کہیں میرے یوسف کو بھیڑیا نہ کھا جائے۔ آخر بھائیوں نے وہی بہانا بنایا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے نکلا "رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ" پروردگار جس کام کے لیے یہ مجھے دعوت دے رہی ہے اس سے تو مجھے جیلخانہ پیارا ہے۔ آخر وہ پورا ہوا اور جیل خانہ بھگتنا پڑا۔ یا یوں کہہ دو کہ بعض مرتبہ جو مقدرات ہوتے ہیں وہ مقربین کی زبانوں پر کبھی کبھی اپنے وقوع سے قبل غیر اختیاری طور پر آجاتے ہیں۔ اس واقعہ میں غور تو کیجیے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کس مستعدی سے پہرہ دینے کا ارادہ کیا ہے یعنی آفتاب کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے ہیں اور لیٹتے بھی نہیں، مگر کیا اس تدبیر سے قضاء مقدر ٹل گئی نہیں وہ آئی اور آخر بلال رضی اللہ عنہ کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں، نیند وہ بھی آخری شب میں پھر مسلسل سفر کے بعد آنکھ نہ کھلنے کا معقول عذر تھا مگر یہاں بلال رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں تقدیر کا عذر پیش کیا۔ اس روایت کے اور الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی اس تقصیر سے تمام صحابہ پر پریشانی اور خوف کا عجیب عالم تھا۔ لہذا اب اس کا موقع آگیا تھا کہ تقدیر ایزدی کا حوالہ دے کر اپنی بے چینی و اضطراب کو تسلی دیتے۔ دیکھیے یہ وہی الفاظ تو تھے جو ابھی ابھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کے تہجد کی نماز میں تاکید پر آپ کے جواب میں فرمائے تھے مگر وہاں یہ عذر قبل از وقت تھا، اگر کوشش کے بعد بھی آنکھ نہ کھلتی تو بیشک غم و افسوس کی تسکین کے لیے موزوں ہوتے لیکن چونکہ سعی کرنے سے قبل ہی یہ عذر پیش کیا گیا تھا اس لیے آپ کی مسرت کا باعث نہ ہوا۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ادھر تقدیر پردۂ غیب میں نافذ ہوا کرتی ہے ادھر عالم اسباب میں انسان پر ارتکاب اسباب کی ذمہ داری بھی پوری پوری عائد رہتی ہے، بلکہ اسباب کے ارتکاب کرنے کے بعد بھی تقصیر و کوتاہی کا الزام پھر عائد رہتا ہے اور اس الزام کے جواب میں کسی کو تقدیر کی آڑ لینے کی اجازت نہیں ہے، اور کیوں ہو جب ہم اس عالم میں اپنے احساس کے مطابق پورے پورے مختار ہیں تو ہم کو اسی علم کے مطابق بازپرس ہونی چاہیے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی جب ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا میں نزول کی مصیبت میں مبتلا کرنے کا

مِثْلُهَا قَطُّ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ أَرْوَاحَكُمْ حِيْنَ شَاءَ وَرَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِيْنَ شَاءَ يَا بِلَالُ قُمْ فَأَذِّنْ بِالنَّاسِ بِالصَّلٰوةِ فَتَوَضَّأَ فَلَمَّا ارْتَفَعَتِ الشَّمْسُ وَابْيَاضَّتْ قَامَ فَصَلّٰى. رواه البخاری فی اواخر مواقیت الصلوٰۃ.

لَا يَعْزُبُ عَنْ اِحَاطَةِ الْقَدَرِ شَيْءٌ

۹۱۶۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ. رواہ مسلم ومالک فی المؤطا۔

۹۱۷۔ عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ خَالِقُ كُلِّ صَانِعٍ

اتنی سخت نیند تو مجھے کبھی نہیں آئی (معذور ہوں معاف کیجیے) آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب چاہا تمہاری جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور تم سو گئے اور جس وقت چاہا اُن کو چھوڑ دیا اور تم بیدار ہو گئے۔ بلال! لو کھڑے ہو اور اذان دے کر لوگوں کو نماز کی اطلاع کر دو۔ پھر وضو فرمایا جب آفتاب اونچا ہو گیا اور طلوع کی زردی کی بجائے سفید روشن ہو گیا۔ آپ کھڑے ہوئے اور صبح کی نماز قضا فرمائی۔ (بخاری شریف)

قضاء وقدر کے احاطہ سے کوئی شئے باہر نہیں ہے

۹۱۶۔ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر سب کچھ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے یہاں تک کہ انسان کی درماندگی اور ہوشیاری بھی۔ (مسلم۔ مؤطا)

۹۱۷۔ حذیفہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنے کاریگر ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ

الزام دیا تو محض تسلی کے لیے تقدیر کا نوشتہ یاد دلایا تھا۔ وہاں بھی جو کچھ ہوا ارادۃً نہیں ہوا۔ اپنی سی کوشش ختم کر لینے کے بعد ہوا اور یہاں بھی جو کچھ تقصیر ہوئی وہ پوری جدوجہد ختم کر لینے کے بعد ہوئی مگر اس کے باوجود سوال حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ہوا اور یہاں بلالؓ سے بھی ہوا اگرچہ نتیجہ کے لحاظ سے کچھ تو واقعہ اور متکلم کی نوعیت کے اختلاف سے اختلاف بھی رہا۔

۹۱۶۔ ہشیاری اور عجز انسان کی دو صفتیں ہیں۔ حدیث کہتی ہے کہ ان کا تعلق بھی تقدیر ہی کے ساتھ ہے پس تقدیر کو صرف جنت و دوزخ تک محدود رکھنا غلط ہے وہ انسانی حیات کے ہر ہر شعبہ کو حاوی ہے خواہ وہ اس کے خلقی اوصاف ہوں یا کسبی اعمال بلکہ اس عالم سے گذر کر دوسرے عالم میں اس کے اعمال کے جو نتائج ہیں وہ بھی اس کے وسیع احاطہ میں شامل ہیں ظاہر ہے کہ جب کاتب تقدیر کا قلم قیامت تک کے جملہ احوال کی کتابت کر رہا تھا تو وہ انسان کے ان احوال کی کتابت سے کیسے چوک سکتا تھا۔ اس وسعت کے بیان سے مقصد قضا وقدر کی عظمت کا نقش قائم کرنا ہے۔

۹۱۷۔ عقلاء کو افعال عباد میں بحث ہے یعنی یہ کہ بندہ تو ضرور مخلوق ہوا لیکن آگے چل کر جو ان کے افعال ہوتے ہیں کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے مخلوق ہوتے ہیں یا وہ بندوں کے اپنے اختیار کے اثرات ہیں۔ اس بارے میں یہ حدیث بہت صریح ہے اس لیے ہم نے اس کو یہاں نقل کیا ہے۔ مسئلہ پر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بندہ کی طرح اس کے افعال

وَصَنْعَتَهٗ۔ رواہ الحاکم فی المستدرک وقال وھو الذہبی علی شرط مسلم قال الحافظ ابن القیم فی شفاء العلیل واخرجہ البخاری فی خلق افعال العباد۔

۹۱۸- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاَشَجِّ عَبْدِ الْقَیْسِ اِنَّ فِیْكَ لَخَصْلَتَیْنِ یُحِبُّھُمَا اللّٰہُ الْحِلْمُ وَالْاَنَاۃُ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ خَلَّتَیْنِ تَخَلَّقْتُ بِھِمَا اَمْ جُبِلْتُ عَلَیْھِمَا قَالَ بَلْ جُبِلْتَ عَلَیْھِمَا قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَبَلَنِیْ عَلٰی خَلَّتَیْنِ یُحِبُّھُمَا اللّٰہُ۔ (رواہ مسلم)

۹۱۹- عَنِ ابْنِ بُرْدَۃَ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی عَنْ اَبِیْ بُرْدَۃَ قَالَ اَتَیْتُ عَائِشَۃَ فَقُلْتُ یَا اُمَّاہُ حَدِّثِیْنِیْ شَیْئًا سَمِعْتِیْہِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

نے پیدا فرمایا ہے اور جان کے کام ہیں ان کو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ (مستدرک۔ خلق افعال عباد)

۹۱۸- ابن عباس رض روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبد القیس سے فرمایا (یہ اپنے وفد اور قبیلہ کے سردار تھے) تم میں دو عادتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول پسند فرماتے ہیں۔ ایک بردباری دوم بُردباری۔ اُنہوں نے دریافت کیا یہ خصلتیں مجھ میں پیدائشی طور پر رکھی گئی ہیں یا میری حاصل کردہ ہیں۔ فرمایا پیدائشی ہیں۔ یہ سُن کر اُنہوں نے کہا خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھ میں دو عادتیں ایسی پیدا فرمائیں جن کو وہ پسند فرماتا ہے۔ (مسلم شریف)

۹۱۹- ابو بُردہ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے مادرِ محترم! آج تو مجھے آپ کوئی ایسی حدیث سنا دیجیے جو آپ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہو۔ اس پر اُنہوں نے

بھی خدا تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ ہیں اب ذرا انسان اپنی ہستی اور اس کی بیچارگی پر غور کرے کہ اُس کی حقیقت ہے کیا اور وہ اس کو سمجھتا کیا ہے۔

۹۱۸- یہ حدیث ایک بار ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۲۰۷ پر مجملاً گزر چکی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح انسان کے لیے صفت کیس اور عجز مقدر ہوتی ہے اسی طرح حلم اور انارۃ جیسی صفات بھی مقدر شدہ ہیں۔ حلم غضب کے مقابل صفت کا نام ہے اور اناۃ عجلت کے مقابل صفت کا۔ یہ صفتیں اگر کسب سے حاصل ہوں تو بھی وہ تقدیر کے احاطہ سے خارج نہیں ہونگی مگر اس وقت تقدیر میں لکھا ہوا بھی یونہی ہوگا کہ یہ شخص اس صفت کے حاصل کرنے میں سعی کریگا اور اس طرح حق تعالیٰ اس کو کسی حد تک ان کا کوئی حصہ عطا فرما دیگا اگرچہ کسبی صفات پیدائشی صفات کے مرتبہ کو نہ پہنچیں مگر ایک کمال بہرحال کمال ہی ہوتا ہے۔ اشج عبد القیس نے اسی فرق کے لحاظ سے یہ سوال کیا تھا کہ یہ صفتیں مجھ میں پیدائشی ہیں یا کسبی ہیں اور اسی لیے جب ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ پیدائشی ہیں تو زیادہ مسرت ہوئی۔ عربی کا شاعر کہتا ہے لیس التکحل فی العینین کالکحل۔ سرمہ لگا کر سرگیں چشم بنا قدرتی سرگیں چشم ہونے کے برابر بھلا کب ہو سکتا ہے۔

۹۱۹- اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ پرندہ کی پرواز بھی کیا کوئی شے ہے مگر قضاء و قدر کے احاطہ میں یہ معمولی سی بات بھی آچکی ہے آگے اس کو نحوست یا برکت کا باعث سمجھنا یہ عرب کی اپنی وہم پرستی ہے دوسرے اصل بات ہے جس فال کے متعلق یہاں ذکر آیا ہے یہ بھی زمانۂ جاہلیت کی فال نہیں بلکہ اُس کی تفصیل دوسری حدیثوں میں صرف اتنی ہے کہ اگر کسی پیش آمدہ معاملہ کے وقت آپ کے سامنے کوئی اچھا نام آجاتا تو اس کو سن کر آپ خوش ہو جاتے تھے۔ گویا اس کو اس

الطَّيْرُ تَجْرِيْ بِقَدَرٍ وَكَانَ يُعْجِبُهُ الْفَالُ الْحَسَنُ ۔ رواہ الحاکم فی المستدرک وقال قد احتج بہ الشیخان برواۃ ہذا الحدیث عن آخرہم غیر یوسف بن ابی بردۃ والذی عندی انہ لم یبلاہ بجرح ولا بضعف بل نقلۃ حدیثہ فانہ غریب الحدیث جدا واقرہ الذہبی۔

۹۲۰۔ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰی قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ مِنْ قُبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيْعِ الْاَرْضِ فَجَاءَ بَنُوْ اٰدَمَ عَلٰی قَدَرِ الْاَرْضِ مِنْهُمُ الْاَحْمَرُ وَ الْاَبْيَضُ وَالْاَسْوَدُ وَبَيْنَ ذٰلِكَ وَالسَّهْلُ وَالْحَزَنُ وَالْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ ۔ رواہ احمد والترمذی وابو داؤد۔

فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ جو پرندہ اُڑ کر جاتا ہے یہ تو تقدیر کے موافق اڑکر جاتا ہے، (لیکن اس سے فال بدلینا جو عرب کا طریق ہے یہ بات بے اصل ہے اور آپ کو ناپسند تھا) ہاں نیک فال لینا آپ پسند فرماتے تھے۔ (مستدرک)

۹۲۰۔ ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی زمین میں سے ایک مٹھی بھری پھر اُس مٹھی سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا ہے اس لیے ان کی اولاد بھی زمین کے رنگوں کی طرح مختلف رنگوں کی پیدا ہوئی۔ کوئی سُرخ، کوئی گورا، کوئی کالا اور کوئی درمیانی اسی طرح کوئی نرم خو تو کوئی تند خو، کوئی خبیث طبیعت تو کوئی شریف طبیعت۔

معاملہ کی حسب دلخواہ طے ہو جانے کی ایک بشارت تصور فرماتے تھے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ مریض عیادت کرنے والوں سے اپنی شفاء کے کلمات سُن کر خوش ہو جاتا ہے اور اس کو نیک فال تصور کرتا ہے حالانکہ اُن کے کہہ دینے سے کہیں شفا ہوتی ہے، جو مقدر ہو چکا ہے ہوتا تو وہی ہے، مگر ان کلمات سے مریض کا دل ضرور خوش ہو جاتا ہے۔ اچھا نام سُن کر آپ کی مسرت بھی اسی نوع کی ایک چیز تھی۔

۹۲۰۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے رنگوں کا معمولی سا اختلاف بھی قدرت کا پیدا کردہ ہے۔ زمین کے مختلف رنگ بھی قدرت نے بنائے پھر جو مخلوق ان سے مرکب کی اس کے رنگ بھی مختلف ہوئے اگر یہ اس لیے نہیں کہ یہ ان کے مادہ کا اقتضا تھا بلکہ یہ بھی براہ راست قدرت ہی کا فیض ہے۔ فطرت پرست تو دو چیزوں کے مابین صرف ظاہری تناسب دیکھ کر ایک کو دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے فارغ ہو جاتا ہے مگر قدرت کا قائل صرف اس قدر پر جا کر ٹھہر نہیں جاتا وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ قدرت کے وسیع احاطہ میں کالے سے سفید اور سفید سے کالا بنانا بھی ہے لیکن وہ بسا اس تناسب کا نقض پسند نہیں کرتی۔ اور اس عالم کی زیبائش قائم رکھنے کے لیے کالے سے کالا اور گورے سے گورا ہی بناتی رہتی ہے پس مواد میں جو خواص ہیں وہ بھی قدرت نے رکھے ہیں اور اُن کے مناسب جو آثار ان سے رونما ہوتے ہیں وہ بھی اُسی نے پیدا فرمائے ہیں اور اس کے بعد اُن آثار کا ترتب بھی قدرت ہی کے تحت رہتا ہے اور یہ کچھ اسی ایک جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دائرۂ مخلوقات میں یہ اللہ تعالیٰ کی سُنتِ قدیمہ ہے کہ جو خواص اُس نے مادہ میں رکھے ہیں وہ ان کے مناسب ہی ان پر آثار مرتب فرماتی رہتی ہے اور اس صورت میں ایک طرف قدرت کا کمال دوسری طرف عالم کی مرتب زیبائش دونوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

(دیکھو حجۃ اللہ ص ۱۷)

۹۲۱۔ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَا يَزَالُ يُصِيْبُكَ فِيْ كُلِّ عَامٍ وَجَعٌ مِنَ الشَّاةِ الْمَسْمُوْمَةِ الَّتِيْ اَكَلْتَ قَالَ مَا اَصَابَنِيْ شَيْءٌ مِنْهَا اِلَّا وَهُوَ مَكْتُوْبٌ عَلَيَّ وَاٰدَمُ فِيْ طِيْنَتِهٖ۔ رواہ ابن ماجہ

۹۲۲۔ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ سَاَلَتْ خَدِيْجَةُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَلَدَيْنِ مَاتَا لَهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُمَا فِي النَّارِ قَالَ فَلَمَّا رَاٰى الْكَرَاهَةَ فِيْ وَجْهِهَا قَالَ لَوْ رَاَيْتِ مَكَانَهُمَا لَاَبْغَضْتِهِمَا قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَلَدِيْ مِنْكَ قَالَ فِي الْجَنَّةِ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ وَاِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ وَاَوْلَادَهُمْ

۹۲۱۔ حضرت اُم سلمہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ اُنہوں نے عرض کی یا رسول اللہ خیبر کے یہود نے زہر آلود بکری کا جو گوشت آپ کو کھلا دیا تھا (میں دیکھتی ہوں) کہ اس کی تکلیف ہر سال ہی آپ کو ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کی وجہ سے جو تکلیف بھی مجھ کو اب ہوتی ہے وہ میرے مقدر میں اس وقت لکھی جا چکی تھی جبکہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام گارے کی شکل ہی میں تھے (یعنی ان کا پتلا بھی تیار نہ ہوا تھا)

۹۲۲۔ حضرت علیؓ روایت فرماتے ہیں کہ اُم المومنین حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا میرے دو بچے جو کفر کے دور میں پیدا ہوئے تھے وہ دوزخ میں ہیں یا جنت میں فرمایا دوزخ میں۔ یہ سن کر جب آپ نے اُن کے چہرہ پر غم کے آثار دیکھے تو فرمایا اگر تم اُن کا ٹھکانا دیکھ لو تو تمہارے دل میں بھی اُن سے نفرت پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد اُنہوں نے پوچھا یا رسول اللہ اچھا جو میری اولاد آپ سے ہو اُن کا حال کیا ہے فرمایا وہ جنت میں ہے۔ اس کے بعد فرمایا مومنین اور اُن کی اولاد جنت میں جائیگی اور مشرکین اور ان کی اولاد

۹۲۱۔ یہ حدیث عقائد شرعیہ کو حقائق بنا کر ان کو استعمال کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔ ہر ہر موقعہ پر تقدیر کی یاد دہانی اس کے استحضار کا موجب ہوتی ہے اور بار بار استحضار سے انسان کو ایک فطری سا یقین میسر آجاتا ہے عالم غیب پر یقین کرنے کا راستہ بس ایک یہی ہے۔ وہ دلائل کی رسائی سے بہت بلند عالم ہے انبیاء علیہم السلام کا احسان ہے کہ وہ اس سے خبردار کرتے ہیں پھر اتنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر ہر چھوٹے بڑے شعبوں میں قدم قدم پر اس کو استعمال کر کر کے یقینی بھی بنا دیتے ہیں۔ اب دیکھیے حضرت ام سلمہ رضنے آپ کی تکلیف کا احساس کر کے محض ایک کلمۂ محبت کہا تھا جیسا کہ محبت میں ہر محبت بھرا شخص کہہ دیا کرتا ہے لیکن آپ نے فوراً اُن کو ایک ایسی حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا جس کے بعد پہلا اثر تو ہلکا ہو گیا اور اس سے کہیں بڑھ کر دوسرا اثر پیدا ہو گیا اور وہ قضاء و قدر پر اعتقاد جازم تھا، آپ کی یہ شان تعلیم دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے ؎ جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ÷ مرا با جان جاں ہمراز کردی۔

جب علوم شرعیہ مشاہدہ کی کیفیت میں بدلنا شروع ہو جائیں تو بشارت ہونی چاہیے کہ اب احسان کا میدان شروع ہو گیا ہے یہ وہی احسان ہے جس کا سوال و جواب حدیث جبرئیل علیہ السلام میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس زمانہ میں احسان کا تذکرہ چونکہ صرف کتابوں ہی میں رہ گیا ہے جن کا ذکر تعلیم و تعلم میں صرف ایک کہانی کے طور پر آجاتا ہے اور بس، اس لیے ہمارے ایمان کا حال بھی ناگفتہ بہ ہو چکا ہے۔ اگر کاش وہ موقعہ بموقعہ اسی طرح استعمال بھی ہوتے رہیں تو مذہب میں شکوک و شبہات کا یہ عالم پیدا ہی نہ ہو اور دلائل کی دردسری کے بغیر وہ نعمت یقین نصیب ہو جائے جس کو پہاڑوں کی ٹکر بھی نقصان رساں نہ ہو سکے۔

۹۲۲۔ دوزخ اور جنت کی جو تقدیر شکم مادر میں لکھ دی جاتی ہے علم الٰہی میں وہ بھی کسی ضابطہ کے تحت ہوتی ہے

فِي النَّارِ ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ۔ (رواہ احمد)

۹۲۳ - عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْغُلَامُ الَّذِيْ قَتَلَهُ الْخَضِرُ طُبِعَ يَوْمَ

دوزخ میں اس کے بعد اس کی تصدیق کے لیے آپ نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ ایمان لاچکے ہیں۔ (مسند احمد)

۹۲۳ - اُبی بن کعب روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ لڑکا جس کو خضر علیہ السلام

اُس کا ضابطہ اُسی کو معلوم ہے کہیں اُس کا مدار ظاہری عمل پر ہوتا ہے اور کہیں صرف اُس استعداد پر جو اچھے بُرے عمل کا اصلی سبب ہوتی ہے (حجۃ اللہ ص ۱۷۲) تقدیر کا یہ پہلو بھی قدرت نے صیغۂ راز میں رکھا ہے اور جس طرح قیامت کے وقت کا اخفا کیا گیا ہے کیونکہ نظام عالم اسی میں مضمر ہے اسی طرح محشر سے قبل جنتی اور دوزخی ہونے کا آخری فیصلہ بھی مستور رکھا گیا ہے۔ ہاں اجمالی طور پر اتنا پتہ دے دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی اولاد جنتی ہے اور کفار و مشرکین کی دوزخی۔ تقدیر کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ سوال بالکل بے معنی رہ جاتا ہے کہ جب بچے نے کوئی بُرا عمل ہی نہیں کیا تو پھر اس کے لیے دوزخ کیوں ہے۔ اول تو یہ اعتراض اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ جزا و سزا کا ضابطہ صرف ایک عمل ہی ہو پھر یہ تو بتائیے کہ جس نے عمل کرلیے ہیں اسی کے لیے دوزخ کیوں ہو، جبکہ دوزخ کے عمل کرا کے دوزخ میں ڈالنا بھی قابل اعتراض ہونا چاہیے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عمل اس بات کی شہادت ہوتا ہے کہ اس میں استعداد ناقص تھی۔ پھر اگر مدار استعداد پر ہو تو بچوں میں بھی قدرت نے مختلف نوع کی استعدادیں رکھی ہیں، بُری استعداد کا بچہ اسی طرح قابل رحم نہیں ہوتا جیسا سانپ اور بچھو کا بچہ یہاں کوئی بیرحمی کا سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اُن کے کاٹتے ہوئے بغیر بھی اُن کو مار ڈالنا دنیا کے حق میں بڑی رحمدلی ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کا حال اسی درجہ پر تباہ دیکھا تو آخر بددعا کے لیے ہاتھ اُٹھانے کے لیے مجبور ہو ہی گئے۔ اور اس کا یہی عذر بیان فرمایا رب انك ان تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا الا فاجرا كفارا یعنی اب یہ تخم ہی خراب ہوچکا ہے اگر کوئی باقی رہا تو اس سے جو پیدا ہوگی وہ ایسی ہی بدبخت قوم کی ہوگی۔ پس جس کو دوزخ میں ڈالنا منظور ہوگا اس کی استعداد بھی اسی کے مناسب ہوگی اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ کافر و مشرک کے یہاں پیدا ہوگا۔ یہ بھی صرف ایک علامت کے طور پر ہے پوری بات یہاں بھی ہم کو بتانا منظور نہیں کیونکہ یہ بھی تقدیر کا ایک شعبہ ہے اور اس کو بھی محشر سے قبل کھول دینا پسند نہیں ہے۔ اسی لیے حدیث ۔۔ میں بچوں کی نجات و ہلاکت کے مسئلہ میں بحث کرنے کی بھی ممانعت آئی ہے۔ اس جگہ حدیث ۸۰۲ کو بھی دیکھ لینا چاہیے۔ ملاحظہ ہو ترجمان السنہ ج ۲ ص ۴۳۰۔

۹۲۳ - آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ شقاوت و سعادت شکم مادر ہی میں لکھ دی جاتی ہے اور اس کتابت کے تحت وہ مولود ایسا مسخر ہوتا ہے کہ بڑے ہو کر وہی افعال کرتا ہے جو اُس کتابت کے مطابق ہوتے ہیں۔ گو کرتا ہے اپنے اختیار ہی سے۔ تقدیر کا سارا جغرافیہ کیسے بتایا جا سکتا ہے، اور اگر بتا دیا جائے تو کون اس کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ دیکھیے یہاں والدین مسلمان ہیں اُدھر تقدیر بچہ میں ایسی استعداد ودیعت فرما چکی ہے کہ بڑے ہو کر اس سے کفر ہی کے افعال سرزد ہوں اور ادھر مقصد یہ ہے کہ والدین اس کی محبت میں آکر کافر نہ ہوجائیں تو ان دونوں مقدرات میں جوڑ یوں لگایا جاتا ہے کہ اس نوبت سے قبل ہی قبل بچہ کو ان سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ والدین پر بڑا ظلم ہوا کیسا خوشرو بچہ اور کس طرح موت کے زبردست ہاتھوں نے اُن سے چھین لیا مگر تقدیر یہ کہتی ہے کہ بہت بہتر ہوا کیونکہ اگر اس کی حیات مقدر ہوجاتی تو اس کے ساتھ ساتھ اُن کا کفر بھی مقدر ہو جاتا بچہ کی حیات سے یہ زندگی تو بہت پُرلطف گزرتی مگر آخرت کی زندگی برباد ہو جاتی۔ اب اگر یہ راز یہیں کھول دیا جاتا ہے تو بتائیے کہ اس بچہ کی وفات پر والدین کے صبر میں کیا بات رہ جاتی۔ تقدیر کے اخفاء کے ساتھ جب وہ صبر کرتے ہیں تو پروردگار کی طرف سے ان کو رضا بقضاء کا تمغہ

طُبِعَ کَافِرًا ۔ رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث صحیح غریب واخرجہ مسلم وابو داؤد والترمذی ۔ قال الحافظ ابن القیمؒ المراد بہ
انہ کتب کذلک وقدر وختم فہو من طبع الکتاب ولفظ الطبع لما صار یستعمل کثیر من الناس الطبیعۃ التی ہی بمعنی الخلقۃ والجبلۃ
ظن الظان ان ہذا المراد الحدیث اھ ۔ شفاء العلیل ص ۲۹۵ ۔

الحوادث کلہا تحت سیطرۃ القدر

۹۲۴ ۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اَشْبَہَ بِاللَّمَمِ مِمَّا قَالَ اَبُوْ ہُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی

نے قتل کردیا تھا، وہ جب شکمِ مادر میں جما تھا اس کی تقدیر میں کافر ہی لکھا گیا تھا ۔ (ترمذی شریف)

کائنات کا ذرّہ ذرّہ قضا و قدر کے فولادی شکنجہ میں کسا ہوا ہے

۹۲۴ ۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیۃ الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم میں ’’اللمم‘‘ کی تفسیر
میں اُن باتوں سے زیادہ مناسب مجھے اور کوئی بات معلوم نہیں ہوسکی جو ابوہریرہؓ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ

بدل جاتا ہے، حالانکہ ان کا صبر بھی قضاء الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے مگر عالم اسباب میں یہ تمام باتیں مستور رہتی ہیں ظاہر میں تو یہی نظر آتا
ہے کہ ایک شخص کے بچہ کا انتقال ہوتا ہے اور وہ محض خدا تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد کرکے صبر کرلیتا ہے بس اس عالم ظاہر کے اختیار
ہی پر یہ جزاء و سزا مرتب ہو جاتی ہے، اگر عالم غیب ظاہر ہو جائے تو جزاء و سزا کے لیے اس دنیا کو اتنی تفصیل کے ساتھ
بچھانے کی ضرورت نہ تھی ۔

اور دیکھیے حضرت ابراہیم علیہ السلام فرزند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں استعداد تو وہ رکھی جاتی ہے کہ اگر عمر پائیں تو
نبوت سے سرفراز ہوں، اُدھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم نبوت کا تاج پہنایا جا چکا ہے اب اگر ان کو حیات بخشی جاتی ہے
تو اس استعداد کے ماتحت ان کا نبی ہونا مناسب ہوتا، اگر یہ استعداد نہ رکھی جاتی تو قدرت کو یہ گوارا نہ ہوتا کہ خاتم النبیین
کی اولاد ایسی ہو جس میں منصب نبوت کی استعداد بھی نہ ہو اس لیے ان دونوں باتوں میں ربط یوں قائم کیا جاتا ہے کہ اُن میں
تو نبوت کی استعداد رکھ دی گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ عمر مقدر نہ فرمائی جس میں نبوت ملا کرتی ہے تاکہ خاتم النبیین کے
بعد دوسرا نبی پیدا نہ ہو خواہ وہ آپ کا خاص فرزند ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح ختم نبوت کا کمال اپنی جگہ اور آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے فرزند کی استعداد کی بلندی اپنی جگہ درخشاں رہے ۔ اتفاق سے اس معاملہ میں بھی اس حکمت کی طرف اشارہ
کردیا گیا ہے ۔ پہلی جلد میں آپ زیر شرح حدیث ۱۶۶ پڑھ چکے ہیں، جس میں صاف موجود ہے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام
زندہ رہتے تو نبی ہوتے، اور اسی لیے جب آیۃ خاتم النبیین میں قرآن کریم نے آپ کے باپ ہونے کی نفی کی تو اس کو مردوں
کے ساتھ مقید کردیا ۔ ورنہ تو آپ کی دختری اور پسری دونوں اولادیں تھیں، لیکن پسری اولاد سن بلوغت کو کوئی نہیں پہنچی ۔

۹۲۴ ۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ قدرت نے انسان میں قوت شہوانیہ اور رغبت الی النساء طبعۃً ودیعت فرمائی ہے اور
اس میں ہاتھ، آنکھیں، زبان اور نفس بھی پیدا فرما دیے ہیں جو اس کی لذت کا مرتبہ بہ مرتبہ ادراک کرتے ہیں، اگرچہ اس فعل
کی حقیقت انسانی شرمگاہ کے ساتھ تمام ہوتی ہے، مگر شریعت میں مقدمات زنا کو بھی ایک مرتبہ کا زنا قرار دیا گیا ہے لہٰذا
بدنظری سے غیر محرم کو دیکھنے والا یہ نہ سمجھے کہ اس نے کسی مخطور لمر کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے آنکھوں
کا زنا کرلیا، اسی طرح غیر محرم کو ہاتھ لگانے والا بھی یہ نہ سمجھے کہ اُس نے کوئی بُری حرکت نہیں کی بلکہ اس کو یقین کرنا چاہیے کہ اس کے

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ اللّٰہَ کَتَبَ عَلَی ابْنِ اٰدَمَ حَظَّہٗ مِنَ الزِّنٰی اَدْرَکَ ذٰلِکَ لَا مَحَالَۃَ فَزِنَی الْعَیْنِ النَّظَرُ وَزِنَی اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنّٰی وَتَشْتَہِیْ وَالْفَرْجُ یُصَدِّقُ ذٰلِکَ وَیُکَذِّبُہٗ۔ رواہ البخاری وعند مسلم مثلہ وفی المتفق علیہ عن ابی ہریرۃ ایضًا۔

۹۲۵ - عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَہُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ

وسلم سے روایت کی ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصّہ لکھ دیا ہے وہ اس کو ضرور مل کر رہیگا۔ پس آنکھ کا زنا، تو غیر محرم کو دیکھنا ہے اور زبان کا زنا، اس قسم کی بات چیت کرنا اور نفس کا کام اس کی خواہش کرنا اور تمنا کرنا ہے۔ پھر آخر میں شرمگاہ اس کی تصدیق کر دیتا ہے یا تکذیب کر دیتا ہے۔ متفق علیہ

۹۲۵ - ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خود بیان فرمایا اور بے شبہ آپ صادق

ہاتھوں نے زنا کر لیا اور ران کا زنا یہی ہے کہ انہوں نے غیر محرم کو چھو لیا۔ مگر چونکہ یہ اقتضاء انسان میں قدرت نے رکھ دیا ہے اس لیے اگر انسان کسی غفلت کے موقعہ پر ان مقدمات میں مبتلا ہو جائے اور پھر خدا کے خوف سے اس فعل کی تکمیل سے باز رہے تو اسے پروردگار عالم کی رحمت سے امید وار رہنا چاہیے کہ جو ناجائز حرکات اس سے سرزد ہو چکیں وہ لمم یعنی صغائر میں شمار ہونگی اور ان کی مغفرت ہو جائیگی۔

تقدیر کا دائرہ بھی کتنا وسیع ہے کہ اس میں صرف حسنات اور سیئات ہی نہیں ان کے مقدمات بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ انسان سمجھتا ہے کہ جب اس نے زنا نہیں کیا تو شاید اس سے قبل جو حرکات اس سے سرزد ہو گئیں وہ نہ ہونے کی برابر ہونگی۔ اس لیے شاید وہ محاسبہ تقدیر میں داخل نہ ہوں، مگر اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ وہ بھی مقدرات میں شامل ہیں۔ پھر تقدیر کی گرفت بھی کتنی زبردست ہے کہ جو حصّہ زنا اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے اس کا ارتکاب کیے بغیر بھی اس کو چارہ کار نہیں عجیب ہے کہ جبر تو اتنا پھر جو کچھ آگے ظہور پذیر ہوتا ہے وہ ہوتا ہے اپنے ہی اختیار سے۔ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

حافظ ابن تیمیہؒ سورۂ اخلاص کی تفسیر میں اس حدیث کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی لابد للانسان من مقدمات الکبیرۃ وکثیر منہم یقع فی الکبیرۃ فیؤمر بالتوبۃ ویؤمرون ان لا یصروا علی صغیرۃ فانہ لا صغیرۃ مع اصرار ولا کبیرۃ مع استغفار۔ ص ۱۰۔ یعنی بشر آخر بشر ہے کبیرہ گناہ سے اگر بچ رہے تو بچ رہے مگر اس کے مقدمات ومبادی سے بچنا مشکل ہے کبھی کبھی نظر اٹھ ہی جاتی ہے اس سے ترقی کر کے کبھی اور اعضاء بھی اس میں ملوث ہو ہی جاتے ہیں پھر کوئی بدنصیب آخر کبیرہ گناہ میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اب جو کبیرہ سے بچ نکلا اس کو حکم یہ ہے کہ آئندہ یہ حرکت نہ کرے اور جو پھنس گیا اس کو حکم یہ ہے کہ فوراً توبہ کرے۔ پس اس طرح اگر صغائر پر اصرار نہ ہوا اور کبائر پر ہمیشہ توبہ ہوتی رہے تو اس کو سن لینا چاہیے کہ نہ صغائر صغائر رہتے ہیں اور نہ کبائر کبائر بارگاہِ رحمت میں سب پر قلم عفو کھینچ دیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ زنا کی مکمل توبہ صرف زبان سے نہیں ہوتی اس کی واضح شہادت یہ ہے کہ شرعی حکم اپنے نفس پر جاری کیجیے کیلئے اور جس جرم کی گہرائی اتنی ہو کہ اس میں اس کا عضو عضو شریک ہو چکا ہو اس کی سزا بھی اس کے ہر ہر عضو کو بھگتنی چاہیے۔ شاید جنابت میں تمام جسم کا غسل بھی اسی لیے فرض قرار دیا گیا ہو اس کی پوری بحث اپنے محل میں آئیگی ان شاء اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک آدھ واقعہ ایسا بھی ہو گیا ہے اور جب ہو گیا ہے تو اس صحابی نے اپنی جان قربان کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھا۔ ایسے صحابی کے متعلق اگر اُس وقت کے اسلامی معیار کی بلندی کی بنا پر کسی کی زبان سے کوئی کلمہ کچھ کمی کا مشعر نکل گیا ہے تو آپ نے فرمایا ہے "لقد تاب توبۃ لو قسمت علی اہل المدینۃ لوسعتہم" اس نے تو ایسی زبردست توبہ کرلی کہ اگر اس کو سارے اہل مدینہ پر تقسیم کر دیا جاتا تو ان کے گناہوں کی بخشش کے لیے بھی کافی ہو جاتی۔ زادنا کما قال

۹۲۵ - صحیح مسلم میں اس حدیث میں کچھ اضافات ہیں اس میں اس حدیث کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ ابن مسعودؓ

إِنَّ خَلْقَ أَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ
يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ إِلَيْهِ مَلَكًا بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ فَيَكْتُبُ عَمَلَهُ وَأَجَلَهُ وَ
رِزْقَهُ وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ الرُّوحُ فَوَالَّذِي لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ

تھے ایسے صادق جن کی جہان تصدیق کرتا تھا کہ تم چالیس دن تک اپنے شکم مادر میں بشکل نطفہ رہتے ہو پھر
اتنی ہی مدت بعد خون بستہ پھر اتنی ہی مدت بعد گوشت کا لوتھڑا اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے پاس
ایک فرشتہ چار باتوں کی تحریر کے لیے بھیجتا ہے وہ اس کے عمل اس کی عمر اس کا رزق اور نیک و بد
ہونا لکھ دیتا ہے، اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے اس خدا کی قسم ہے جس کے سوا معبود کوئی نہیں

نے فرمایا جو شخص شقی ہوتا ہے وہ ماں کے پیٹ ہی سے شقی پیدا ہوتا ہے، اور سعید کی شناخت یہ ہے کہ جو دوسرے کو دیکھ کر
نصیحت حاصل کرلے۔ اس پر کسی صحابی نے سوال کیا۔ عمل کیے بغیر شقاوت کیسی۔ اس پر اس شخص نے جواب دیا اس
میں تعجب کیا ہے اس کے بعد حدیث مذکورہ بالا بیان کی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سعادت و شقاوت شکم مادر ہی میں
لکھ دی جاتی ہے۔ اور اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں، ثم یخرج الملك بالصحیفة فی یدہ۔ یعنی پھر فرشتہ اپنے ہاتھ
میں جو دفتر تھا وہ نکالتا ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا
ہے کہ جن چار امور کی کتابت کا بیان ذکر ہے ان کی کتابت کسی متعلقہ دفتر میں ہوتی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے
کہ یہ امور دونوں آنکھوں کے درمیان لکھے جاتے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔ شاید یہی کتابت کا محل ہو۔ اہل عرف کو دیکھا
کہ وہ آج بھی پیشانی پر ہاتھ مار کر اسے مقدر کہا کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
کی جانب سے چار باتوں کے علاوہ پانچویں چیز مقام موت کا ذکر بھی ہے۔ مسند بزار میں ابن عمرؓ مرفوعاً روایت
فرماتے ہیں: ثم یکتب بین عینیه ما هو لاق حتی النکبة ینکبها "یعنی پھر اس کی آنکھوں کے درمیان جو جو امور پیش
آمدنی ہیں وہ سب لکھ دیے جاتے ہیں، حتیٰ کہ جو ذرا سی خراش بھی اس کو لگنی ہے وہ بھی لکھ دی جاتی ہے ابن ابی حاتمؒ نے حضرت
ابوذرؓ سے بھی اس تعمیم کو نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ایک اور مفید ٹکڑا بھی نقل
کیا ہے: فیقال اذهب الی ام الکتاب فانك تجد فیه قصة هذه النطفة (جامع العلوم) حق تعالیٰ کی جانب سے
اس فرشتہ کو جو رحم مادر پر مقرر ہے حکم ہوتا ہے۔ جا اور لوح میں جا کر دیکھ وہاں تجھ کو اس نطفہ کے متعلق پوری پوری تفصیلات
مل جائینگی۔ ان مختلف آثار کے نقل سے مقصد یہ ہے کہ ہر مقام پر سوالات تو بہت پیدا ہو جاتے ہیں جن کے جوابات
بعض مرتبہ کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں اور بعض مرتبہ نہیں ملتے۔ یہ چیزیں ان ضروریات میں شامل نہیں ہیں جن کا معلوم
ہونا امت کے لیے فرض و لازم ہو، اس لیے نہ بیان میں اس کی اہمیت رہی ہے نہ آپ کو اس کی اہمیت
چاہیے۔ جتنا بیان آ بھی چکا ہے وہ بھی اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ اب اس کا کوئی پہلو ہی تشنہ نہ رہے۔ پھر اس میں بھی راویوں
کے اختلاف سے بڑی حد تک اشتباہ لگ جاتا ہے اس کو براہ راست اسلام کے سر نہ لگانا چاہیے۔ یہاں راوی کا قصور
اس لیے نہیں ہوتا کہ ہر شخص اپنے انداز فکر کے مطابق اور اپنے ہی شرائط حفظ کے مطابق روایت کرتا ہے جس کی دوسرے
راوی کو نہ اطلاع ہوتی ہے اور نہ وہ ان امور کی پابندی کر سکتا ہے، اس طرح ایک ایک حدیث میں بیس مختلف
صحابہ سے ملک کے مختلف گوشوں سے سننے میں آتی ہے، ضروری طور پر یہاں لفظی اختلاف ہو جانا چاہیے حیرت
ہے کہ ایک طبقہ تو یہاں اسی اختلاف کو حدیث سے دست برداری کا ایک اچھا بہانہ بنا لیتا ہے اور دوسرا اسی کو حقائق

بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا۔ متفق علیه

۹۲۶۔ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ۔ متفق علیه۔ وفی لفظ عند مسلم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ان الرجل لیعمل عمل اهل الجنة فیما یبدو للناس وهو من اهل النار وان الرجل لیعمل عمل اهل النار فیما

کر (پیدائش کے بعد) تم میں کا ایک شخص (ساری عمر) جنتی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے بعد جنت کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے لیکن آخر نوشتہ تقدیر غالب آجاتا ہے اور وہ دوزخی شخص کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوجاتا ہے اور اسی طرح تم میں ایک شخص ساری عمر دوزخی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے آخر نوشتہ تقدیر غالب آتا ہے اور وہ جنتی شخص کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔ (متفق علیہ)

۹۲۶۔ سہل بن سعد روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ دوزخی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے اور ہوتا ہے وہ جنتی اور اسی طرح جنتی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے اور ہوتا ہے وہ دوزخی۔ بات یہ ہے کہ دار و مدار صرف خاتمہ پر ہے (اس وقت جیسے عمل ہوں) (متفق علیہ)

حدیث کی دلیل سمجھتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ جب ایک ہی بات ملک کے مختلف حصوں، زمانہ کے مختلف ادوار اور مختلف اشخاص سے مسلسل سنی گئی ہے تو اگر اس کے الفاظ میں تھوڑا سا اختلاف بھی پایا جائے تو بھی یہ اس کا بین ثبوت ہے کہ اصل واقعہ یقیناً اپنی جگہ ہوا ہے اور ضرور ہوا ہے لہذا ایسے مقامات پر جو بات متفقہ طور پر ثابت ہوجائے اس کو مان لینا چاہیے اور جس میں اختلاف باقی رہے اور کوئی راہ ترجیح یا توفیق بھی نہ کھل سکے تو اس کو راویوں کے اختلاف کا نتیجہ سمجھنا چاہیے نہ یہ کہ اصل بیان ہی کو ناقص سمجھ کر اس کو شریعت کے سر رکھا جائے۔

۹۲۶۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل فیصلہ وہی ہوتا ہے جو قضاء و قدر کر چکی ہے رہے اعمال ظاہری تو وہ انسان کے اچھے اور برے ہونے کی صرف ظاہری نشانیاں ہیں، اسی کے مناسب ایک حدیث ہے۔ آپ جلد ثانی میں پڑھ چکے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی راہ خدا میں جانبازی دیکھ کر بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہاں اچھے اعمال سے حسن خاتمہ کی امید اور برے اعمال سے سوء خاتمہ کا اندیشہ ضرور ہونا چاہیے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جہان میں فیصلہ جزاء عمل کے تابع رکھا گیا ہے لہذا جس کو جنت عطا فرمائیں گے اس سے عمل بھی اہل جنت کے کرائیں گے اور جس کو بخشنا منظور نہیں اس سے پہلے اعمال بھی اسی کے مناسب کرالیے جائیں گے تاکہ اعمال اور جزاء کے درمیان ظاہری تناسب بھی باقی رہے اگرچہ وہ اصل علت نہ سہی۔ حق تعالیٰ اچھے عمل والے کو دوزخ میں اور برے عمل والے کو جنت میں بھی داخل فرما سکتا ہے، مگر وہ خود یہ خبر دے چکا ہے کہ وہ ایسا کرے گا نہیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ جو دوزخی ہو اس سے عمل بھی اہل دوزخ کے سے کرالیے جائیں تاکہ عمل و جزاء کے مابین مماثلت باقی رہے۔ صحیح مسلم میں یہ لفظ ہیں، ان الرجل لیعمل عمل اهل الجنة فیما

یبدو للناس وھو من اھل الجنۃ ۔

۹۲۷ - وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ حِيْنَ خَلَقَهٗ فَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُمْنٰى فَاَخْرَجَ ذُرِّيَّةً بَيْضَاءَ كَاَنَّهُمُ الذَّرُّ وَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُسْرٰى فَاَخْرَجَ ذُرِّيَّةً سَوْدَاءَ كَاَنَّهُمُ الْحُمَمُ فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَمِيْنِهٖ اِلَى الْجَنَّةِ وَلَا اُبَالِيْ وَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ كَتِفِهِ الْيُسْرٰى اِلَى النَّارِ وَلَا اُبَالِيْ ۔ رواہ احمد۔

۹۲۸ - وَعَنْ اَبِيْ نَضْرَةَ اَنَّ رَجُلًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَالُ لَهٗ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ دَخَلَ عَلَيْهِ اَصْحَابُهٗ يَعُوْدُوْنَهٗ وَهُوَ يَبْكِيْ فَقَالُوْا لَهٗ مَا يُبْكِيْكَ اَلَمْ يَقُلْ لَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذْ مِنْ شَارِبِكَ ثُمَّ اَقِرَّهٗ حَتّٰى تَلْقَانِيْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ

۹۲۷ - ابو درداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کے دائیں بازو پر ایک ضرب لگائی تو اس سے سفید رنگ کی ایسی چھوٹی چھوٹی ذریۃ نکالی جیسی چیونٹی پھر بائیں بازو پر ضرب لگائی تو سیاہ رنگ کی ایسی ذریۃ نکالی جیسا کوئلہ پھر دائیں طرف والی کو فرمایا کہ یہ جنت میں جائینگے اور مجھے کوئی پروا نہیں اور جو بائیں جانب تھے ان کو فرمایا کہ یہ دوزخ میں جائینگے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

۹۲۸ - ابو نضرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں ایک شخص کے پاس جن کی کنیت ابو عبد اللہ تھی عیادت کے لیے آپ کے صحابہ آئے تو اس وقت وہ رو رہے تھے صحابہ نے رونے کا سبب پوچھا اور کہا کیا تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم اپنی لبیں ترشتے رہنا اور اسی طریق پر ہمیشہ قائم رہنا یہاں تک کہ مجھ سے آملو انہوں نے کہا کیوں نہیں ضرور فرمایا تھا لیکن میں نے رسول اللہ صلی

یبدو للناس ۔ یعنی ایک شخص لوگوں کو جنتی شخص کے سے عمل کرتا نظر آتا ہو گویا حقیقت کی انہیں خبر نہیں ہوتی کہ وہ دوزخی ہو پس جب مدار خاتمہ پر رہا تو اب ظاہر پر قطعی حکم کیسے لگایا جائے، اسی حدیث نے اولیاء اللہ کا خون پانی بنا رکھا ہے، کیونکہ یہ خبر کس کو ہے کہ اس کا خاتمہ کیسے اعمال پر ہوگا۔ اور اسی خوف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جلیل القدر صحابی بھی یہاں گریہ وزاری میں مبتلا رہے۔ دیکھو حدیث م

۹۲۷ - سیاہ و سفید شاید یہ عالم تقدیر میں کامیاب و ناکامیاب کے رنگ مقرر کر دیے گئے ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم میں شاید اس وقت ارواح کو کسی خاص قسم کا مختصر سا جسم بھی مرحمت کر دیا گیا تھا حتیٰ کہ بعض علماء نے اس کا نام ہی عالم ذر رکھ دیا ہے۔

۹۲۸ - تقدیر کی قربانی کا جس کسی کے دل پر ایسا تسلط ہو وہی اس کا ادراک بھی کر سکتا ہے کہ اس ہیبت کے سامنے کیا کسی کا حافظہ ساتھ دیا کرتا ہے یا سب کچھ فراموش ہو جاتا ہے اور صرف ایک دعا کے سوا کچھ بن نہیں آتی۔ جو قلوب اس خشیت سے خالی ہیں وہ اس کو کیا سمجھیں۔ یہاں انکشاف حال سے قبل اطمینان کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی۔ جب صحابی کا یہ حال ہو تو عامہ مومنین کا حال کیا ہونا چاہیے ۔ اللّٰھم اقسم لنا من خشیتک

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ قَبَضَ بِيَمِيْنِهٖ قُبْضَةً وَأُخْرٰى بِالْيَدِ الْأُخْرٰى وَقَالَ هٰذِهٖ لِهٰذِهٖ وَهٰذِهٖ لِهٰذِهٖ وَلَا أُبَالِيْ وَلَا أَدْرِيْ فِيْ أَيِّ الْقُبْضَتَيْنِ أَنَا. رواہ احمد۔ وقال الہیثمی رجالہ رجال الصحیح۔

۹۲۹۔ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ قَتَادَةَ السُّلَمِيِّ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ خَلَقَ اللهُ اٰدَمَ ثُمَّ خَلَقَ الْخَلْقَ مِنْ ظَهْرِهٖ ثُمَّ قَالَ هٰؤُلَاءِ لِلْجَنَّةِ وَلَا أُبَالِيْ وَهٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَلَا أُبَالِيْ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللهِ فَعَلٰى مَاذَا نَعْمَلُ قَالَ مُوَافَقَةَ الْقَدَرِ. رواہ الحاکم قال الذہبی علی شرطہما الی الصحابی۔

۹۳۰۔ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْ يَدَيْهِ كِتَابَانِ فَقَالَ أَتَدْرُوْنَ مَا هٰذَانِ الْكِتَابَانِ قُلْنَا لَا يَا رَسُوْلَ اللهِ إِلَّا أَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَسْمَاءُ اٰبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ

علیہ وسلم کو یہ فرماتے بھی خود سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دائیں ہاتھ سے ایک مٹھی بھری اور دوسری دوسرے ہاتھ سے پھر فرمایا کہ یہ دائیں مٹھی والے تو جنت کے لیے بنائے ہیں اور یہ بائیں والے دوزخ کے لیے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ دوستو! مجھے کیا علم ہے کہ میں اس کی کس مٹھی میں آگیا۔

۹۲۹۔ عبدالرحمٰن بن قتادہ سُلمی سے روایت ہے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اس کے بعد ان کی پشت سے بقیہ انسانوں کو نکالا اور فرمایا یہ تو جنت کے لیے بنائے ہیں اور یہ دوزخ کے لیے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ اس پر کسی نے عرض کی یا رسول اللہ معاملہ جب یوں ہے تو اب عمل کس لیے فرمایا وہ تو تقدیر میں لکھے جا چکے (اس کے موافق ہو کر رہیں گے)۔ (مستدرک)

۹۳۰۔ عبداللہ بن عمرو روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں لیے ہوئے باہر تشریف لائے اور فرمایا جانتے ہو یہ کتابیں کیسی ہیں۔ ہم نے کہا یا رسول اللہ ہمیں کیا پتہ آپ ہی بتائیں تو کچھ پتہ چلے۔ آپ نے اس کتاب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا جو آپ کے دائیں ہاتھ میں تھی، یہ وہ کتاب ہے جس میں پروردگار عالم نے تمام جنتی اشخاص کے نام اور ان کے باپ دادوں کے اور قبیلوں کے نام لکھ دیے ہیں۔

ما تحول به بيننا وبين معاصيك۔

۹۲۹۔ ان تمام احادیث کے آخر میں لفظ "لا اُبالی" (ہمیں کوئی پرواہ نہیں) حق تعالیٰ کی شان بے نیازی کے اظہار کے لیے بیان ہوتا جا رہا ہے وہاں نہ اس کی پرواہ ہے کہ جنتیوں پر اس انعام و اکرام کا انتظام کہاں سے ہوگا اور نہ اس کا غم ہے کہ یہ سارے جہنمی مل کر ہمارے خلاف کیا سازش بنائیں گے۔

۹۳۰۔ اس حدیث کے سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ کے ہاتھوں میں جو دو کتابیں تھیں وہ حقیقۃً دو کتابیں ہی تھیں۔ حدیث کے الفاظ اوّل تا آخر بار بار پڑھیے ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کو یہ خیال نہیں آسکتا کہ یہاں راوی نے کسی حقیقت

ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰی اٰخِرِهِمْ فَلَا یُزَادُ فِیْهِمْ وَلَا یُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا ثُمَّ قَالَ لِلَّذِیْ فِیْ شِمَالِهٖ هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِیْنَ فِیْهِ اَسْمَاءُ اَهْلِ النَّارِ وَاَسْمَاءُ اٰبَاءِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ ثُمَّ اُجْمِلَ عَلٰی اٰخِرِهِمْ فَلَا یُزَادُ فِیْهِمْ وَلَا یُنْقَصُ مِنْهُمْ اَبَدًا فَقَالَ اَصْحَابُهٗ فَفِیْمَ الْعَمَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنْ كَانَ اَمْرٌ قَدْ فُرِغَ مِنْهُ فَقَالَ سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا فَاِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ یُخْتَمُ لَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنْ عَمِلَ اَیَّ عَمَلٍ وَاِنَّ صَاحِبَ النَّارِ یُخْتَمُ لَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ وَاِنْ عَمِلَ اَیَّ عَمَلٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِیَدَیْهِ فَنَبَذَهُمَا ثُمَّ قَالَ فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ ۔ رواہ الترمذی۔

اور آخر میں ان کی میزان بھی لگادی ہے اب اس میں نہ کسی اور نام کا اضافہ ہوسکتا ہے نہ کمی ہوسکتی ہے پھر جو کتاب آپ کے بائیں ہاتھ میں تھی اُس کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ وہ کتاب ہے جس میں تمام دوزخی اشخاص کے نام ہیں اور ان کے باپ دادوں اور قبیلوں کے نام ہیں۔ ان کے آخر میں بھی میزان لگادی ہے اب اس میں بھی کسی نام کا اضافہ اور کمی نہیں ہوسکتی۔ یہ سُن کر آپ کے صحابہ نے فرمایا یا رسول اللہ اگر دوزخی اور جنتی ہونا پہلے سے لکھا جاچکا ہے تو پھر عمل کرنے کا کیا فائدہ؟ آپ نے فرمایا کہ بلند پروازیاں چھوڑو اور سیدھے سیدھے عمل کیے جاؤ، کیونکہ جنتی شخص کا خاتمہ ایسے ہی اعمال پر ہوگا جو جنتی شخص کے عمل ہوتے ہیں اگرچہ اس سے قبل ساری عمر میں کیسے بھی عمل کرتا رہے اور اسی طرح دوزخی شخص کا خاتمہ بھی ایسے ہی اعمال پر ہوگا جو دوزخی اشخاص کے ہوتے ہیں اگرچہ اس سے قبل کیسے ہی اچھے کام کرتا ہو۔ اس کے بعد آپ نے اشارہ کرکے دونوں کتابوں کو اپنے پیچھے کی طرف پھینک دیا اور فرمایا کہ تمہارا پروردگار سب کچھ لکھ لکھا کر فارغ ہوچکا بس اسی کے مطابق اب کچھ لوگ جنت میں چلے جائینگے اور کچھ دوزخ میں۔ (ترمذی شریف)

کو مجازی صورت سے بیان کرنے کا ارادہ کیا ہو، پھر جبکہ نبی کا تعلق خود عالم غیب سے اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو جنت کے باغوں میں سے انگور کا خوشہ توڑ لائے اور ہم کو دیدے۔ چاند کی طرف اشارہ کرے تو اس کے دو ٹکڑے کردے انگلیوں کو جھکادے تو اس سے چشمے پھوٹ نکلیں۔ اگر ایسے ہاتھوں میں آپ دو کتابوں کا ذکر سنتے ہیں تو اس پر چونکتے کیوں ہیں اور کیوں اس کی تاویل کی فکر میں پڑجاتے ہیں جو لوگ عالم غیب پر ایمان نہیں رکھتے وہ اسی ایک جگہ کیا ہر جگہ عالم تردد ہی میں پڑے رہتے ہیں ان کا غم نہ کھائیے۔ ان کے تو یہ بھی فہم سے بالاتر ہے کہ اتنی غیر متناہی مخلوق کے اسماء کے لیے اتنا مختصر دفتر کیسے ہوسکتا ہے، وہ صرف دنیا کا شارٹ ہینڈ ہی جانتے ہیں، وہ کہاں کیا جانیں کہ غیب کے اختصار و طول کا عالم کیا ہوتا ہے وان یوما عند ربك كالف سنة مما تعدون۔ نبی کی پراسرار ہستی اگر عالم غیب کی دو کتابیں اپنے ہاتھوں میں لے آتی ہے اور ایک اشارہ سے پھر انہیں عالم غیب میں پہنچادیتی ہے تو اس کو بسروچشم قبول کرلیجیے اور فکر کیجیے کہ معلوم نہیں آپ کا نام کس فہرست میں درج ہوچکا ہے۔

یہاں کمی و بیشی کے جتنے احتمال ہوسکتے تھے سب کو ذکر کرکے میزان کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ جس طرح اس صورت میں زیادتی کمی کا کوئی موقع نہیں رہتا اسی طرح اب نئے جنتی اور نئے دوزخی بننے کا بھی کسی کے متعلق کوئی احتمال باقی نہیں رہا۔ قضاء و قدر کی قہرمانی اور تسلط کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے

۹۳۱۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ رَجُلٌ شَابٌّ وَاَنَا اَخَافُ عَلٰی نَفْسِیَ الْعَنَتَ وَلَا اَجِدُ مَا اَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَاءَ فَسَكَتَ عَنِّیْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّیْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَسَكَتَ عَنِّیْ ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ فَاخْتَصِ عَلٰی ذٰلِكَ اَوْ ذَرْ ۔ رواہ البخاری ۔

۹۳۲۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ كُلَّهَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ یُصَرِّفُهٗ كَیْفَ یَشَاءُ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ

۹۳۱۔ ابوہریرۃؓ روایت فرماتے ہیں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ میں نوجوان شخص ہوں عورتوں سے نکاح کے مصارف میرے پاس نہیں مجھے اپنے نفس پر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے (اجازت ہو تو خصی ہو جاؤں) یہ سن کر آپ خاموش رہے، میں نے پھر عرض کی آپ پھر خاموش ہو رہے میں نے پھر مکرر عرض کی اور پھر بدستور خاموش رہے (ابوہریرہؓ کا منشا یہ تھا کہ آپ ان کو خصی ہونے کی اجازت دیدیں) جب میں نے چوتھی بار وہی سوال دہرایا تو آپ نے فرمایا تمہیں جس جس مصیبت میں بھی گرفتار ہونا ہے وہ تو تقدیر کا قلم لکھ لکھا کر فارغ بھی ہو چکا، اب چاہو تو خصی ہو جاؤ اور چاہے رہنے دو۔ (بخاری شریف)

۹۳۲۔ عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام انسانوں کے دل رحمن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جس طرف چاہتا ہے اُن کو پھیر سکتا ہے،

۹۳۱۔ آپ کی بار بار کی خاموشی بتا رہی تھی کہ منشاء مبارک کیا ہے مگر حاجتمند اور حکم کا منتظر چاہتا تھا کہ کسی طرح بھی ہو اگر اس کو خصی ہو جانے کی صراحۃً اجازت ملجائے تو وہ اس تکلیف کو برداشت کر کے زنا جیسی مصیبت سے بچ رہے۔ سبحان اللہ معصیت سے صحابہؓ کے تنفر کا عالم بھی کیا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی زنا سے اس درجہ نفرت گو قابل داد تھی مگر ان کے بار بار اصرار سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس تدبیر سے گویا تقدیر کو بھی پلٹ دینگے، اس لیے صاحب شریعت نے بڑے تاثر کے انداز میں فرمایا: ابوہریرہ! تقدیر کے سامنے تدبیر کی کچھ پیش نہیں جاتی، تقدیر کا قلم چل چکا ہے۔ اب اگر تمہاری قسمت میں زنا لکھا جا چکا ہے تو وہ ہو کر رہیگا اور اگر مقدر نہیں ہوا تو پھر اگر خصی نہ بھی ہو گے جب بھی نہیں ہو سکتا۔ اب چاہو تو خصی بن جاؤ اور چاہو تو رہنے دو۔ آپ کے جملوں کے بعد قضا و قدر کی گرفت کا جتنا اثر ہو سکتا تھا ظاہر ہے۔ اس لیے اس کے بعد حضرت ابوہریرہؓ کو آئندہ سوال کی نہ جرات ہوئی نہ ضرورت رہی۔ دوسری جگہ حدیثوں میں موجود ہے کہ اس قسم کی ضرورت کے وقت شریعت نے روزہ رکھنے کی تعلیم فرمائی ہے۔ روزہ اگر ہماری سی سحری و افطاری کے ساتھ نہ ہو تو اس خواہش کے قطع کرنے کا بہترین علاج ہے۔ اس کے بعد ایسے خلاف فطرت فعل کا حاصل کیا؟

۹۳۲۔ حق تعالیٰ کی علی الاطلاق قدرت اور بندہ کی انتہائی بیچارگی اور بے بسی کا نقشہ اس سے زیادہ مؤثر اور مختصر انداز میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ایک نیم مختار انسان جب کبھی اپنے اختیار کلی کے اظہار کا ارادہ کرتا ہے تو وہ مخاطب کے سامنے انگلیوں کا اشارہ کر کے ہی اس کو سمجھاتا ہے۔ یہاں اسی معہود طریقہ کو استعمال کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ اعضاء سے منزہ و مبرا ہے۔ احادیث میں بندہ کو مختار ثابت کیا گیا ہے مگر ایسا مختار جس کے اوپر قدرت کا اختیار اس طرح مسلط ہے کہ اس کے بعد اس اختیار کی

وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ ۔ رواہ مسلم۔

۹۳۳ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ اَنْ يَّقُوْلَ يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِكَ وَبِمَا جِئْتَ بِهٖ فَهَلْ تَخَافُ عَلَيْنَا قَالَ نَعَمْ اِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَاءُ ۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

۹۳۴ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْقَلْبِ كَرِيْشَةٍ بِاَرْضٍ فَلَاةٍ يُقَلِّبُهَا الرِّيَاحُ ظَهْرًا لِبَطْنٍ ۔ رواہ احمد وابن ماجۃ وفی الزوائد اسنادہ ضعیف فیہ یزید الرقاشی قد اجمعوا علی ضعفہ۔

اس کے بعد آپ نے یوں دعا فرمائی اے دلوں کے لوٹنے پلٹنے والے ہمارے دلوں کو تو اپنی تابعداری ہی کی طرف جھکائے رکھنا۔ (مسلم)

۹۳۳۔ انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات یوں دعا فرماتے اے قلوب کے پلٹنے والے میرے قلب کو اپنے دین پر جمائے رکھ، ایک مرتبہ میں نے عرض کی یا نبی اللہ ہم تو آپ پر اور آپ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لا چکے ہیں کیا آپ کو ہمارے متعلق اب بھی کوئی خطرہ باقی ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں قلوب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں اُن کو جیسے چاہے پلٹ سکتا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

۹۳۴۔ ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انسان کے قلب کی مثال اُس پر کی سی ہے جو بیاباں زمین میں پڑا ہوا ہو اور ہوائیں اس کو کبھی سیدھا اور کبھی الٹا کر رہی ہوں۔ (ابن ماجہ۔ مسند امام احمد)

ہستی فنا ہو جاتی ہے اور حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اس اعتقاد کے بعد انسان کی زبان پر جو بیساختہ درخواست آنی چاہیے وہ سب سے پہلے ایک یہی۔ پروردگار! ہمارے دلوں کو اپنی تابعداری کی طرف ہی جھکائے رکھنا۔

۹۳۳۔ یہاں صحابہ کرام کے فہم و ادب پر بیساختہ داد دینی پڑتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و سنتے ہیں آپ کے حق میں اور سمجھتے ہیں اپنے حق میں، اسی لیے سوال یہ کرتے ہیں کہ جب ہم آپ پر ایمان لا چکے تو کیا پھر بھی آپ کو ہمارے متعلق کوئی خطرہ ہے۔ آپ کا جواب یہ ہے کہ ہاں مقام صحابیت پر فائز ہو جانے کے بعد بھی کوئی شخص قضا و قدر کے قاہرانہ تصرف سے نڈر نہیں ہو سکتا۔ خوف کی بات بہرحال خوف ہی کی ہے یہی تو شان بندگی ہے کہ کسی بلند سے بلند مقام پر پہنچ جانے کے بعد بھی مختار کل کے اختیار سے ڈرتا ہے۔ اس جگہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ صحابہ کرامؓ جو بڑی حد تک ان خطرات سے مامون تھے جب اُن کے متعلق بارگاہ نبوت سے جواب یہ ملا تو پھر ما و شما کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

۹۳۴۔ ایک وسیع جنگل میں تند و تیز ہوا اور ایک ذرا سے پر کا بھلا کیا مقابلہ لیکن پھر یہ دونوں مخلوق ہی مخلوق ہیں اور دونوں کے دونوں محکوم ہی محکوم ہیں۔ قلوب بنی آدم کی جو نسبت اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے وہ تو خالق و مخلوق اور حاکم و محکوم کی ہے یہاں اس بیچارگی کا اندازہ ہی کیا لگایا جا سکتا ہے، یہاں وہ نسبت بھی نہیں ہے جو عدم کو وجود سے، لیکن احادیث میں بسا اوقات حقیقت سے ہٹ کر محاورات کے مطابق کلام اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس کا اصل مقصد تفہیم و تعلیم ہوتا ہے انسان جتنا جلد اپنے محاورات سے کسی حقیقت کو سمجھ سکتا اور متاثر ہو سکتا ہے اتنا وہ فلسفیانہ تعبیرات سے کسی حقیقت کو نہیں پا سکتا اور نہ اُن سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اسی لیے کہیں احادیث میں اصابع (انگلیوں) کا لفظ بھی آیا ہے اور کہیں مذکورہ بالا (باقی برص ۸۶)

۹۳۵۔ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَتَذَاکَرُ مَا یَکُوْنُ اِذْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَکَانِہٖ فَصَدِّقُوْہُ وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَیَّرَ عَنْ خُلُقِہٖ فَلَا تُصَدِّقُوْہُ فَاِنَّہٗ یَصِیْرُ اِلٰی مَا جُبِلَ عَلَیْہِ۔ رواہ احمد قال الہیثمی ورجالہ رجال الصحیح الا ان الزہری لم یدرک ابا الدرداء۔

۹۳۶۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ رَبِیْعَۃَ قَالَ کُنَّا عِنْدَ عَبْدِ اللّٰہِ یَعْنِیْ اِبْنَ مَسْعُوْدٍ فَذَکَرَ الْقَوْمُ رَجُلًا فَذَکَرُوْا مِنْ خُلُقِہٖ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰہِ اَرَأَیْتُمْ لَوْ قَطَعْتُمْ رَأْسَہٗ اَکُنْتُمْ تَسْتَطِیْعُوْنَ اَنْ تُعِیْدُوْہُ قَالُوْا لَا قَالَ فَیَدَہٗ قَالُوْا لَا قَالَ فَرِجْلَہٗ قَالُوْا لَا قَالَ فَاِنَّکُمْ لَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تُغَیِّرُوْا خُلُقَہٗ۔ رواہ الطبرانی قال الہیثمی ورجالہ ثقات۔

۹۳۵۔ ابو درداء سے روایت ہے کہ ہم لوگوں کے عادات و اخلاق کے متعلق کچھ ذکر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا اگر تم یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو اس کی تصدیق کر لینا اور اگر یہ سنو کہ کسی شخص کی فطری عادات بدل گئی ہیں تو اس کی تصدیق نہ کرنا۔ آخر کار ایک دن وہ پھر ان ہی خصائل کی طرف لوٹیگا جس پر کہ اس کی پیدائش ہوئی ہے۔ (احمد)

۹۳۶۔ عبداللہ بن ربیعہ روایت کرتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، لوگوں نے ایک شخص کا ذکر کیا اور اسی ضمن میں اس کے عادات و اخلاق کا ذکر بھی آگیا۔ اس پر حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: تم لوگ بتاؤ اگر تم اس کا سر کاٹ دو تو کیا اس کو پھر جوڑ سکتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ فرمایا اچھا اگر اس کا ہاتھ کاٹ ڈالو تو کیا پھر اس کو جوڑ سکتے ہو، وہ بولے نہیں۔ آخر میں فرمایا اچھا پیر۔ انہوں نے کہا یہ بھی نہیں۔ فرمایا اگر تم یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تو یاد رکھو اسی طرح اس کے عادات و اخلاق کو بھی بدل نہیں سکتے۔ (طبرانی)

(بقیہ ص) حدیث کے انداز بیان کو اختیار کیا جا رہا ہے تاکہ ان امثال سے انسان اپنی بیچارگی کا اندازہ لگا سکے اور اس کے بعد حق تعالیٰ کی بالادست قدرت و اختیار کے سامنے جتنا اسے جھکنا چاہیے جھک جائے۔

۹۳۵۔ انسان کی عادات و اخلاق بھی چونکہ کاتب تقدیر کے قلم کے نیچے آچکی ہیں اس لیے جس طرح قضاء و قدر کے دوسرے شعبوں میں تبدیلی و ترمیم نہیں ہو سکتی اسی طرح اس میں بھی نہیں ہو سکتی اسی لیے مشہور ہے "جبل گردد جبلّت نہ گردد" عقلاء کے مابین ایک مسئلہ یہ بھی زیر بحث ہے کہ اخلاق کسبی ہیں یا خلقی۔ اس حدیث سے اس پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے غرض انسانی اختیار کا افسانہ جتنا اس عالم میں گرم ہے عالم غیب میں وہ اتنا ہی سرد ہے۔ یہ قدرت کا کمال ہی کمال ہے کہ جو سراپا مجبور ہے وہ مختار ہی مختار نظر آتا ہے۔

۹۳۶۔ اس حدیث سے اوپر کی حدیث کی ذرا اور تشریح ہو جاتی ہے اس لیے اس کو یہاں نقل کیا گیا ہے۔ ابو درداء کی اوپر والی حدیث میں ایک نہایت لطیف نکتہ ہے وہ یہ کہ حدیث میں "جبل" کا لفظ استعمال کیا ہے "جبر" کا نہیں استعمال کیا گویا بندہ خیر و شر پر مجبول یعنی مخلوق تو ہوتا ہے مگر ان پر مجبور نہیں ہوتا۔ بیشک جیسا حدیث میں انسان کا انجام وہی ہوگا جس پر وہ مخلوق ہوا ہے مگر اس سے خیر و شر کا ظہور ہوگا بالاختیار ہے اس لیے اس کو مجبول تو کہا جائیگا لیکن مجبور نہیں کہا جا سکتا۔ دیکھو تفسیر

۹۳۷ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَتْ اُمُّ حَبِيْبَةَ زَوْجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اَمْتِعْنِيْ بِزَوْجِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِاَبِيْ اَبِيْ سُفْيَانَ، وَبِاَخِيْ مُعَاوِيَةَ قَالَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ سَأَلْتِ اللّٰهَ لِاٰجَالٍ مَضْرُوْبَةٍ وَاَيَّامٍ مَعْدُوْدَةٍ وَاَرْزَاقٍ مَقْسُوْمَةٍ لَنْ يُعَجِّلَ شَيْئًا قَبْلَ حِلِّهِ اَوْ يُؤَخِّرَ شَيْئًا عَنْ حِلِّهِ وَلَوْ كُنْتِ سَأَلْتِ اللّٰهَ اَنْ يُعِيْذَكِ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ اَوْ عَذَابٍ فِي الْقَبْرِ كَانَ خَيْرًا اَوْ اَفْضَلَ۔ قَالَ وَ ذُكِرَتْ عِنْدَهُ الْقِرَدَةُ قَالَ مِسْعَرٌ وَاُرَاهُ قَالَ وَالْخَنَازِيْرُ مِنْ

۹۳۷۔ عبداللہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت اُم حبیبہ زوجۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ یہ دعا مانگی کہ الٰہ العالمین میرے شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے والد ابوسفیان اور میرے بھائی معاویہ کا سایہ مدت دراز تک مجھ پر قائم رکھنا۔ یہ دعا سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے اللہ تعالیٰ سے دعا تو کی مگر ایسی مدتوں کے لیے جو پہلے سے مقرر شدہ ہیں۔ ان کی زندگی کے ایام سب شمار کیے جاچکے ہیں، اُن کے رزق بھی سب تقسیم شدہ ہیں اللہ تعالیٰ وقت سے پہلے ان میں سے نہ کسی چیز کو مقدم کریگا اور نہ وقت کے بعد اس کو مؤخر کریگا۔ کاش اگر تم دوزخ کے عذاب یا قبر کے عذاب سے پناہ مانگتیں تو اس سے بہتر رہتا (یہاں راوی کو خیر یا افضل کے لفظ میں تردد ہوگیا ہے) راوی کہتا ہے کسی شخص نے اُس وقت بندروں کا ذکر چھیڑ دیا کہ

۹۳۷۔ دیکھیے یہاں بھی حضرت اُم حبیبہؓ کی دعا کچھ ایسی دعا نہ تھی جس کو انسان کی فطرت نہ کہا جاسکے لیکن صاحب نبوت کو یہاں ایک دوسرا تأثر پیدا کرنا تھا جو انسان کی فطرت میں خود بخود موجود نہیں ہوتا، ہاں نبی جیسا معلم اس کو پیدا کردیتا ہے کسی بی بی کے پہلو میں اپنے محبوب ترین شوہر کسی لڑکی کے دل میں اپنے مکرم ترین والد اور کسی ہمشیرہ کے قلب میں اپنے عزیز ترین بھائی کی حیات کے کتنے ارمان ہوسکتے ہیں یہ ظاہر ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سارے جذبات کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کردیتے ہیں کہ یہ تو سب طے شدہ باتیں ہیں، جس کا جتنا رزق جس کی جتنی عمر اور جو وقتِ موت لکھ دیا گیا ہے اس سے ایک انچ بھر بھی اس سے تجاوز نہیں ہوسکتا۔ یہ دعا مانگنی اتنی اہم نہیں، اہم یہ ہے کہ دوزخ یا قبر کے عذاب سے نجات کی دعا مانگی جائے، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جس طرح پہلی باتیں مقدر ہوچکی ہیں عذاب و ثواب کا مسئلہ بھی مقدر ہوچکا ہے مگر انسان کو اس کا علم تو حاصل ہوتا ہے لیکن اس دعا کے لیے اس کے قلب میں وہ جذبات نہیں اُٹھتے جو شوہر یا والد کی درازی عمر کے لیے اُٹھتے ہیں آپ چاہتے ہیں کہ آخرت کا استحضار اتنا ہو کہ دعا کے موقعہ پر عزیز سے عزیز کی درازی عمر سے پہلے اپنی آخرت کا تصور آجائے اور اس طرح شریعت اس جگہ آجائے جہاں انسان کی فطرت ہوتی ہے۔ جب آخرت کا استحضار اتنا نصیب ہوجائے تو اب اُمید کرنی چاہیے کہ وہ جاں کندنی کی تکالیف میں، ملک الموت کی ہیبت شیطان کے اغواء اور منکر ونکیر کے سوال کے وقت بھی ان شاء اللہ تعالیٰ صحیح وسالم رہیگا۔ قضاء و قدر کے تسلط اور آخرت کی اہمیت ذہن نشین کرنے کا یہ بھی کیا نرالا انداز ہے۔ موت کی گھڑیاں بھی کیسی گنی چنی ہوتی ہیں کہ آپ نے جلد ثانی حدیث ۵۳ میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ دیکھیے حق تعالیٰ کو اپنے نبی کی یہاں کتنی خاطر داری بھی منظور ہے اس لیے یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ ایک بیل کی کمر پر ہاتھ رکھو جتنے بال تمہارے ہاتھ کے نیچے آجائیں گے اتنے سال تمہاری عمر اور رہے گی، مگر اس کے بعد بھی موت کا وقت مقرر نہیں ٹلتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ بات پیدا ہوجاتی ہے کہ جب اتنے سالوں کے گزرنے کے بعد بھی موت سے چارہ نہیں ہے تو پھر اس جام کو آج ہی کیوں نہ منہ سے لگا لیا جائے یہ کہہ کر وہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے سپرد کردیتے ہیں۔ پس موت کا وقت نبی کا بھی نہیں ٹلتا اور کسی کا تو ذکر کیا ہے۔

مَسْخٍ فَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَجْعَلْ لِمَسْخٍ نَسْلًا وَّلَا عَقِبًا وَقَدْ کَانَتِ الْقِرَدَۃُ وَالْخَنَازِیْرُ قَبْلَ ذٰلِکَ۔
رواہ مسلم۔

۹۳۸۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلْتُمْ عَلَی الْمَرِیْضِ فَنَفِّسُوْا لَہٗ فِیْ اَجَلِہٖ فَاِنَّ ذٰلِکَ لَا یَرُدُّ شَیْئًا وَیُطَیِّبُ بِنَفْسِہٖ۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ وقال الترمذی غریب۔

۹۳۹۔ عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَیْسٍ قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ وَلَدَ جَعْفَرٍ تُسْرِعُ اِلَیْہِمُ الْعَیْنُ اَفَاَسْتَرْقِیْ

کیا وہ مسخ شدہ قوم ہے، مسعر کہتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ سوروں کے متعلق بھی ذکر آیا اس پر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کسی مسخ شدہ قوم کی نسل جاری نہیں کی اور نہ وقت مقرر کے بعد ان میں سے کسی کو باقی رکھا ہے۔ آخر بندر اور سور ان سے پہلے بھی تو ہوا کرتے تھے۔ (مسلم شریف)

۹۳۸۔ ابو سعید روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم کسی بیمار کی عیادت کو جایا کرو تو اس کی درازی عمر کے کلمات کہا کرو کیونکہ تمہارے اس کہنے سے کچھ تقدیر تو بدلتی نہیں البتہ مریض کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ ترمذی شریف، ابن ماجہ۔

۹۳۹۔ اسماء بنت عمیس رضؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ جعفرؓ کے بچوں کو نظر بڑی جلدی

اب بھی آپ کچھ سمجھے کہ تقدیر کا جبر انسان کے اختیار پر کس طرح مسلط ہے اور وہ کتنی آسانی سے انسانی اختیار کو اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہے دیکھیے ابھی ابھی حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی موت پر کیسے ناراض تھے یا ابھی کیسے خوش نظر آرہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہاں مسخ شدہ قوموں کے متعلق تھا۔ سوال وجواب کے انداز سے یہ صاف ظاہر ہے کہ جن حضرات نے مسخ سے معنوی مسخ اور طبائع کی کجی مراد لی ہے وہ محض باطل اور غلط خیال ہے اس بنا پر نہ کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے اور نہ آپ کا جواب منطبق ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات بھی مسلم ہے کہ شکلیں اسی وقت مسخ کی جاتی ہیں جب کہ قلوب پہلے مسخ ہو جاتے ہیں پس مسخ کا تعلق صرف ظاہر شکلوں ہی کے ساتھ نہیں ہوتا باطن پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اولٰئک کالانعام بل ھم اضل میں اسی طرف اشارہ ہے انسان جب اپنے باطن بندر اور سور کے خصائل اختیار کرلے تو پھر اس کے لیے احسن تقویم کی صورت زیبا نہیں رہتی اور مشیۃ الٰہیہ کبھی کبھی ان کے ظاہر کو بھی باطن کے ہم شکل بنا دیتی ہے تاکہ آئندہ انسان اس کے ذکر سے عبرت حاصل کرے۔

۹۳۸۔ اسلام کو باہم مروت و اخلاق اور ہمدردی کی بھی کس حد تک رعایت منظور ہے کہ وہ ایک بیمار کے حق میں ایسے کلمات کہہ دینے کی بھی اجازت دے دیتا ہے جن کے متعلق اگر کہیں صریح اجازت نہ آجاتی تو شاید ممانعت کا شبہ لگ جا سکتا تھا لیکن یہ انبیاء علیہم السلام کا کمال ہے کہ وہ عام تخاطب میں بھی اس کا خیال رکھتے ہیں کہ کسی گوشہ سے بھی اسلام کے کسی اہم نقطۂ نظر کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ دیکھو یہاں کس طرح عیادت کے بیان میں تقدیر کا سبق تازہ کیا جا رہا ہے اور کس طرح تنبیہ کی جا رہی ہے کہ وہ عالم ناقابل ترمیم ہے اور اس کے فیصلے سب اٹل ہیں لیکن جب وہ ہمارے علم میں نہیں تو پھر اگر کسی تعبیری طریقہ سے ہمارے بھائی کا دل خوش ہوتا ہے تو اس سے بخل کیوں کیا جائے مگر یہ نکتہ پھر فراموش نہ ہو کہ ہوگا یہ سب کچھ لفظی جمع خرچ، جو مقدر ہے وہی ہو کر رہیگا۔

واضح رہے کہ اخلاق اس کا نام نہیں کہ محض کسی کا دل خوش کرنے کے لیے خلاف واقع کلمات کہہ دیے جائیں یہ تو کذب ہے۔ اخلاق یہ ہے کہ جہاں ہمارا علم قاصر ہو وہاں ہم اللہ تعالیٰ سے اچھی ہی اُمید رکھیں اور وہی اپنی زبانوں سے نکالیں انا عند ظن عبدی بی۔ یہ تمام وسعتیں صرف اس لیے ہیں کہ تقدیر پردۂ غیب میں رکھی گئی ہے اگر کہیں ظاہر کردی جائے تو دنیا کی ساری چہل پہل ایک آن میں ختم ہو جائے۔ اس پر بھی عاقبت نااندیش انسان تقدیر ہی کے سراغ لگانے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ اس کے حق میں اس کا اخفا اس کے اظہار سے کہیں سودمند ہے

لَهُمْ قَالَ نَعَمْ فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابِقُ الْقَدَرِ لَسَبَقَتْهُ الْعَيْنُ ۔ رواہ الترمذی واحمد وابن ماجہ وقال الترمذی حسن صحیح

۹۴۰۔ عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا وَكَادَ الْحَسَدُ أَنْ يَغْلِبَ الْقَدَرَ ۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان ۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ

۹۴۱۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهُ

لگ جاتی ہے کیا میں اُن پر یہ منتر پڑھ سکتی ہوں، فرمایا پڑھ سکتی ہو، کیونکہ اگر کوئی چیز تقدیر پر بھی غالب آسکتی تو وہ نظر ہوتی ۔ ترمذی ۔ ابن ماجہ ۔ احمد ۔

۹۴۰۔ انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے احتیاج میں کفر تک نوبت پہنچ سکتی ہے اور حسد ایسی سخت چیز ہے کہ کہیں تقدیر پر بھی غالب نہ آجائے ۔ شعب الایمان

حق تعالیٰ کے علم ازلی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی قضاء و قدر کے تحتانی مراتب میں تبدیلی بھی ہوجاتی ہے

۹۴۱۔ ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا

۹۳۹۔ نظر لگنے کی حقیقت کچھ بھی سہی لیکن یہ امر واقعہ کہ نظر ضرور لگتی ہے۔ دو چار مغلوب العقل انسانوں کے صرف مذاق اڑا دینے سے ہزاروں انسانوں کے تجربے کی تکذیب نہیں کی جا سکتی حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس کے وجوہ و اسباب اور اس کی حقیقت پر بصیرت افروز بحث کی ہے۔ پھر جس طرح نظر لگنے کی حقیقت عام طور پر نہیں سمجھی جاتی اسی طرح اس کے علاج بھی اکثر اسی طرح کے کلمات ہیں جو بیشتر معقول المعنی نہیں ہوتے اس قسم کے مقامات پر حدیث کا رویہ کتنا معتدل ہے کہ وہ نہ تو واقعات کا انکار کرتی ہے اور نہ غیر معقول امور کی حقیقت کے دریافت کے درپے ہوتی ہے بلکہ اس امر کے متعلق جو عوام کا دستور چلا آتا ہے اگر اس میں کوئی شرعی سقم نہیں ہوتا تو اس میں دست اندازی نہیں کرتی۔ اسی ضابطہ کے مطابق نظر لگنے کا معاملہ بھی ہے اہل تجربہ کے نزدیک جو کلمات یا جو طریقے اس بارے میں مفید ثابت ہو چکے ہیں اگر وہ کلمات شرکیہ پر مشتمل نہ ہوں تو یہ صرف ایک علاج کے طور پر ہوں گے اس لیے شریعت ان سے ممانعت بھی نہیں فرماتی اور نہ اُن کے استعمال کی رغبت دلاتی ہے۔ نظر اور سانپ بچھو کا کاٹنا یہ سب ایسی ہولناک چیزیں ہوتی ہیں کہ اس میں مریض طبیب کا انتظار بھی نہیں کر سکتا اور ان میں تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اکثر جھاڑ پھونک فوری فائدہ بخش ہو جاتے ہیں اس لیے ایسے مواقع پر جھاڑ پھونک سے آپ نے روکا بھی نہیں اور اجازت دیدی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرما دی کہ چونکہ نظر کی تاثیر اتنی قوی ہوتی ہے کہ اگر تقدیر بھی کسی چیز سے بدل سکتی تو نظر سے بدل جاتی۔ اس لیے اس بارے میں اپنے تجربوں پر عمل کر سکتے ہو بشرطیکہ وہ ممنوعات شرعیہ سے خالی ہوں۔

۹۴۰۔ فقر جب حد سے تجاوز کر جائے تو اس کا نتیجہ کبھی کفر کی صورت میں بھی نکل آتا ہے۔ دوسری چیز جو انتہا درجہ خطرناک ہے وہ حسد ہے اسی لیے سورۂ فلق میں حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی تعلیم کی گئی ہے اس کی تاثیر کو اس انداز میں ادا کیا گیا ہے کہ جو چیز کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتی وہ تقدیر ہے کہ سب اس کے زیر اثر ہیں اور وہ کسی کے زیر اثر نہیں اور حقیقت ہے بھی یہی کہ جو علم الٰہی ہے وہ کسی کے زیر اثر ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز تقدیری فیصلوں پر بھی اثر انداز ہو سکتی تو وہ حسد ہوتا۔ سلسلۂ اسباب و مسببات میں انسانی عزائم کو بڑا دخل ہے حاسد کا نفس جب ہر وقت پوری عزیمت کے ساتھ کسی کے درپے ہو جاتا ہے تو یہاں بھی ایسے ایسے شگوفے کھلنے لگتے ہیں جس سے شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید تقدیر ہی بدل دی گئی ہے

فَسَقَطَ عَنْ ظَهْرِهٖ كُلُّ نَسَمَةٍ هُوَ خَالِقُهَا مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَجَعَلَ بَيْنَ عَيْنَىْ كُلِّ اِنْسَانٍ مِنْهُمْ وَبِيْصًا مِنْ نُوْرٍ ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلٰى اٰدَمَ فَقَالَ اَىْ رَبِّ مَنْ هٰؤُلَاءِ قَالَ ذُرِّيَّتُكَ فَرَاٰى رَجُلًا مِنْهُمْ فَاَعْجَبَهٗ وَبِيْصُ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ قَالَ اَىْ رَبِّ مَنْ هٰذَا قَالَ دَاوٗدُ فَقَالَ اَىْ رَبِّ كَمْ جَعَلْتَ عُمْرَهٗ قَالَ سِتِّيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمْرِىْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا انْقَضٰى عُمْرُ اٰدَمَ اِلَّا اَرْبَعِيْنَ جَاءَهٗ مَلَكُ الْمَوْتِ فَقَالَ اٰدَمُ اَوَلَمْ يَبْقَ مِنْ عُمْرِىْ اَرْبَعُوْنَ سَنَةً قَالَ اَوَلَمْ تُعْطِ ابْنَكَ دَاوٗدَ فَجَحَدَ اٰدَمُ فَجَحَدَتْ ذُرِّيَّتُهٗ وَنَسِىَ اٰدَمُ

کرلیا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان کی نسل سے جتنی اولاد اُس کو تا قیامت پیدا کرنی تھی وہ سب ظاہر ہوگئی، اُن کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک چمکتا چمکتا نور پیدا فرمایا اور اس کے بعد ان سب کو آدم علیہ السلام کے سامنے حاضر کیا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی پروردگار یہ لوگ کون ہیں؟ ارشاد ہوا یہ تمہاری ہی اولاد ہے۔ آدم علیہ السلام نے اُن کو دیکھا تو ایک شخص کی آنکھوں کے درمیان چمکتا ہوا نور اُن کو بہت پیارا معلوم ہوا۔ عرض کی پروردگار یہ کون ہیں ارشاد ہوا داؤد نبی اللہ علیہ السلام، عرض کی پروردگار تو نے ان کی کتنی عمر مقرر فرمائی ہے، ارشاد ہوا ساٹھ سال۔ عرض کی پروردگار ان کی عمر میں تو میری عمر میں سے چالیس سال اور بڑھا دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب آدم علیہ السلام کی عمر پوری ہوگئی اور صرف چالیس سال باقی رہ گئے تو ملک الموت قبض روح کے لیے اُن کے پاس آگئے۔ آدم علیہ السلام نے کہا ابھی تو میری عمر میں چالیس سال باقی ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا کیا آپ وہ اپنے فرزند داؤد کو بخش نہیں چکے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کردیا۔ (باپ کے خصائل اولاد میں ظاہر ہوا کرتے ہیں) اس لیے ان کی اولاد میں بھی کہہ کر مکر جانے کی عادت ظاہر ہوئی

۱۴۹۔ تقدیر کی کتابت کے پانچ نمبروں میں سے یہ وہی دوسرا نمبر ہے جس کو ابھی آپ حدیث کی شرح میں بحوالہ حضرت شاہ ولی اللہ پڑھ چکے ہیں۔ اس سے پہلا مرتبہ علم الٰہی کا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اس مرتبہ کے لحاظ سے حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر سو سال ہی کی تھی، مگر اس حساب سے ۶۰ + ۴۰ = ۱۰۰ یعنی حق تعالیٰ جس کو عالم کا ذرہ ذرہ روشن ہے یہ جانتا تھا کہ آئندہ واقعہ اس طرح پیش آئیگا اُن کی عمر میں چالیس سال کا اضافہ ہوگا اور مجموعہ سو ہو جائیگی۔ پس اگر اس تفصیل کو دیکھو تو یوں کہہ دو کہ چالیس سال کا اضافہ ہوا اور اگر نظر ذرا اس سے اوپر کر کے دیکھو تو حق تعالیٰ کے علم کے لحاظ سے آخری بات یہی تھی کہ اُن کی عمر سو سال ہوگی، اس لیے اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا

یاد رہے کہ دوسرے مرتبہ کے اس ذرا سے ایر پھیر سے حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی میں اتنا نمایاں اثر پیدا ہوگیا کہ قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کی اتنی بڑی تعداد میں سے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد خلیفہ کا لقب صرف ان ہی کو دیا ہے۔ یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض ۔ ان کے علاوہ جتنے اور انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے ظاہر ہے کہ سب انبیاءؑ خلیفۃ اللہ ہی تھے مگر چونکہ اصل خلیفۃ اللہ کی عمر کے چالیس سال صرف داؤد علیہ السلام ہی کو ملے تھے اس لیے تقدیر کی اس حقیقت کا اثر قرآنی الفاظ میں بھی اتنا سا نمایاں ہونا ضروری ہوا عالم غیب حقیقت ہی حقیقت کا عالم ہے وہاں جو بھی ہوتا ہے اس عالم میں اس کا اثر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ رہا اس جگہ یہ سوال کرنا کہ کیا کسی اور نبی کی پیشانی کا نور اتنا پیارا نہ تھا یہ محض بے علمی کا سوال ہے۔

فَاَكَلَ مِنَ الشَّجَرَةِ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهٗ وَخَطَأَ اٰدَمُ وَخَطَأَتْ ذُرِّيَّتُهٗ ۔ رواہ ترمذی

۹۴۲ ۔ عَنْ اِبْنِ شِهَابٍ قَالَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ وَابْنُ حَزْمٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَضَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلٰى خَمْسِيْنَ صَلٰوةً فَرَجَعْتُ بِذٰلِكَ حَتّٰى اَمُرَّ بِمُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ مَا فَرَضَ رَبُّكَ عَلٰى اُمَّتِكَ قُلْتُ فَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً قَالَ مُوْسٰى فَرَاجِعْ رَبَّكَ عَزَّ وَجَلَّ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَرَاجَعْتُ رَبِّىْ عَزَّ وَجَلَّ فَوَضَعَ شَطْرَهَا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ

وہ بھول گئے تھے اور شجرہ ممنوعہ کھالیا تھا اور خطا کی تھی اس لیے اولادیں بھی بھولنے اور خطا کاری کی سرشت باقی رہی (ترمذی)

۹۴۲ ۔ ابن شہاب انس بن مالکؓ اور ابن حزم سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (شب معراج میں) اللہ تعالیٰ نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض فرمائیں جب میں اُن کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو اُنھوں نے پوچھا آپ کے پروردگار نے آپ کی اُمت پر کے نمازیں فرض کی ہیں میں نے کہا پچاس ۔ اُنھوں نے فرمایا جائیے پھر جا کر کچھ تخفیف کی درخواست کیجیے آپ کی اُمت میں ان کی ادائیگی کی سکت نہیں ہے میں واپس ہوا اور پروردگار کی خدمت میں عرض معروض کی اس نے ایک حصہ معاف فرما دیا ۔ میں پھر لوٹ کر پہنچے

عالم غیب کی ساری تفصیل نہ ہم کو بتائی گئی ہے نہ اس کی ضرورت تھی ۔ اس حدیث میں تمام انبیاء کی خصوصیات بیان کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا گیا ۔ قضاء و قدر کا یہ ایک واقعہ بھی کسی خاص مصلحت کے لیے معرض بیان میں آگیا ہے جو عالم ہم سے پوشیدہ رکھا گیا ہے اور قصداً پوشیدہ رکھا گیا ہے ، اس کی کچھ کچھ جزئیات اس لیے بھی ذکر کر دی جاتی ہیں کہ اس عالم کو اُس عالم کی باتیں سُن سُن کر یہ تنبیہ ہوتا رہے کہ اس عالم کے سوا کوئی اور دوسرا عالم بھی ہے اور اس طرح اس پر ایمان لانے میں مدد مل سکے ۔

اُس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا ۔ ترجمان السنہ جلد ثانی ص ۔ حدیث ۔ میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب موت کا فرشتہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو اس پر غصہ آگیا اور اُنھوں نے اس کے تھپڑ مارا آخر میں بات یہاں پہنچی کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ بیل کی کمر پر ہاتھ رکھ دو جتنے بال تمہارے ہاتھ کے نیچے آجائیں اتنے سال تمہاری عمر ۔ یہاں عمر کی زیادتی کا سوال ہی نہیں ہے کیونکہ جہاں یہ اختیار دیا گیا تھا اسی کے ساتھ اُن کے اختیار کو اس طرف لگا دیا گیا تھا کہ وہ موت ہی کو اختیار فرمالیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس صورت سے نبی اولو العزم کا اکرام بھی پورا ہو گیا اور جو تقدیر الٰہی تھی وہ بھی پوری ہو گئی ۔

تنبیہ :۔ مستدرک حاکم میں روایت ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے یہ لازم کر دیا گیا کہ آئندہ ملک الموت جس کی روح بھی قبض کرنے جائیں اپنی اصل صورت میں جائیں ۔ اس سے یہ بات بھی حل ہو گئی کہ فرشتے پر اس رسول اولو العزم کو غصہ آیا کیوں آیا تھا یعنی وجہ یہ تھی کہ اس وقت وہ بشری صورت پر حاضر ہو گئے تھے ۔

۹۴۲ ۔ یہ حدیث بہت مجمل ہے تفصیلی احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ہر بار پانچ پانچ نمازوں کی معافی ہوتی رہی ہے اور جب پانچ ہی رہ گئی تھیں تو چلتے وقت کچھ ایسے کلمات ارشاد ہو گئے تھے جن سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اب اس سے زیادہ تخفیف کی گنجائش نہیں رہی اس نکتہ کے سمجھ جانے کے بعد گو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ سے واپس جانے کا اصرار بھی فرمایا اور یوں بھی اُمت کے حق میں تخفیف کے لیے آپ کے قلب مبارک میں نہ معلوم کتنے ارمان ہونگے لیکن شانِ عبدیت حکم کے سامنے جھک گئی اور جو اتنی بار آمد و رفت سے نہ جھکے تھے وہ اس مرتبہ جانے میں شرم محسوس فرمانے لگے ۔ سبحان اللہ! شانِ معبودیت بھی کیسی بلند ہے اور اس کے بالمقابل شانِ عبدیت بھی کتنی کامل ہے ۔ اُدھر جب آخری فیصلہ فرما دیتے ہیں تو پھر کوئی نہیں جو اس میں ذرا سی ترمیم بھی کر اسکے اور اِدھر شانِ عبدیت کا کیا کمال ہے کہ جب آخری حکم ہونے کا احساس

رَاجِعْ رَبَّكَ فَإِنَّ أُمَّتَكَ لَا تُطِيقُ ذٰلِكَ فَرَاجَعْتُ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ فَقَالَ هِيَ خَمْسٌ وَهِيَ خَمْسُونَ لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسَى فَقَالَ رَاجِعْ رَبَّكَ فَقَالَ إِنِّي اسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ وفی لفظ انی یوم خلقت السموات والارض فرضت علیك وعلی امتك خمسین صلوٰۃ۔

علیہ السلام کے پاس واپس آیا اور سرگزشت بیان کی۔ انہوں نے کہا میں کہتا ہوں کہ پھر جائیے ابھی اور تخفیف کرائیے آپ کی اُمت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے میں پھر گیا اور پروردگار سے درخواست کی ارشاد ہوا دیکھو اب یہ پانچ ہیں مگر ہمارے یہاں وہی پچاس کی پچاس شمار ہونگی، ہمارے یہاں جو بات ایک بار طے ہو جاتی ہے پھر وہ بدلا نہیں کرتی۔ میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اُنہوں نے پھر واپس جا کر مزید تخفیف کے لیے فرمایا میں نے

بھی ہو جاتا ہے تو پھر ترمیم کی درخواست پیش کرنے کے لیے قدم ہی نہیں اُٹھتے اس لیے ایک طویل حدیث میں حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ جب ان کو جیلخانے سے نکلنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے تو یہ فرما دیا تھا کہ پہلے جا کر اُن عورتوں کے حال کی تحقیق کرو جنہوں نے مجھے متہم کیا تھا لیکن اگر یہی واقعہ مجھ کو پیش آتا تو میں تو فوراً اس بلانے والے کے ساتھ ساتھ ہو لیتا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس میں بھی آپ کی کمال عبدیت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک مشیت الٰہیہ جیل میں رکھتی جیل میں رہتا اور جب باہر نکالتی تو باہر نکل آتا نہ عذر اُس میں ہوتا نہ تاخیر اس میں ہوتی۔

عالم تقدیر میں ایک ترمیم و تبدیل کی شکل تو وہ تھی جو آپ نے ابھی پہلی حدیث میں پڑھی تھی یعنی ساٹھ سال کی عمر میں چالیس سال کا اور اضافہ ہو گیا دوسری شکل یہ ہے کہ پچاس میں ترمیم ہو کر پانچ رہ گئیں مگر اس کے باوجود ایک لحاظ سے وہ پچاس ہی رہیں۔ غور کیجیے تو پہلی جگہ بھی حکم الٰہی میں کوئی ترمیم نہیں اس کو معلوم تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر سو سالی ہوگی مگر ہوگی اس طرح کہ اس میں چالیس سال کے اضافہ کی حضرت آدم علیہ السلام درخواست فرمائیں گے اور وہ ہم منظور کرینگے یہاں یہ صورت ہوئی کہ پچاس کو پانچ تو کیا گیا مگر ایک دوسرے ضابطہ کے ماتحت پھر ان پانچ کو پچاس بنا دیا گیا وہ یہ کہ اس اُمت کی ایک نیکی کا ثواب دس گنا لکھا جائیے، اس لحاظ سے جو دنیا میں پانچ ہونگی وہ آخرت کے دفتر میں پھر پچاس رہینگی۔ اگر پہلی اُمتوں کے ضابطہ کے مطابق حساب رکھا جاتا تو ایک نیکی پر ایک ہی کا ثواب ملتا اس لیے یا تو تخفیف ہی نہ کیجاتی اور یا پھر پچاس کو پانچ ہی کر دیا جاتا۔ مگر چونکہ اُدھر طے شدہ قدر کی ترمیم منظور نہیں اِدھر خالی ہاتھ آپ کو واپس کر دینا گوارا نہیں اس لیے طے یہ پایا کہ ایک دوسرے ضابطہ کے ماتحت یہ دونوں باتیں قائم رکھی جائیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ اظہار بھی کر دیا جائے کہ تقدیر کے فیصلے ٹلا نہیں کرتے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے آپ کی خاطر داری اور اکرام میں ہوا ہے اور اسی لیے صرف پہلی بار مراجعت پر آخری فیصلے کا اعلان نہیں کیا گیا کہ آپ کی بار بار آمد ہو اور درخواست ہو اور ہر بار اس کو منظور کر کرکے آپ کے اکرام میں اور اضافہ فرمایا جائے مگر آخر میں ہر فیصلے پر قضاء و قدر کی حاکمیت کا اعلان بھی کر دیا جائے۔

یہاں ایک اور واقعہ بھی مطالعہ کر لینا مفید ہوگا۔ ترجمان السنہ جلد دوم ص۴۴۲ میں حدیث ۱۰۵۸ ملاحظہ کیجیے اس میں ثوبانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعاء کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ آپ نے پروردگار عالم سے اپنی اُمت کے حق میں دعاء فرمائی تھی پروردگار میری اُمت پر ایسا عام قحط نازل نہ فرمانا جو ان سب کی ہلاکت کا باعث بن جائے۔ اور ایک یہ کہ غیروں کو ان پر مسلط نہ کیجو ورنہ وہ ان کی جڑ نکال کر پھینک دینگے۔ حق تعالیٰ کی جانب سے ارشاد ہوا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کی یہ دونوں دعائیں تو منظور کر لیں إِنِّي إِذَا قَضَيْتُ قَضَاءً فَإِنَّهُ لَا يُرَدُّ۔ لیکن جو فیصلہ ہم ایک بار کر دیتے ہیں پھر وہ بدلا نہیں کرتا۔

دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک دعاء یہ بھی فرمائی تھی کہ اُن کو باہمی اختلاف اور آپس کی جنگ کے عذاب میں بھی گرفتار نہ کرنا، مگر یہ نامنظور رہی اور خدائی فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہا۔ عالم غیب میں ایک چیز کو پہلے مبہم رکھنا پھر رفتہ رفتہ

رواہ النسائی، والحدیث اخرجہ الشیخان وغیرہما۔

۹۴۳ ۔ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَرُدُّ الْقَدَرَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا یَزِیْدُ فِی الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ یُصِیْبُہٗ۔ رواہ ابن ماجہ۔

کہا اب تو مجھے بار بار جانے میں شرم آتی ہے۔ نسائی شریف۔ صحیحین وغیرہ

۹۴۳ ۔ ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تقدیر کو کوئی چیز پلٹ نہیں سکتی مگر صرف دعاء اور مقررہ عمر میں کوئی شے زیادتی نہیں کر سکتی مگر نیکی اور یقیناً آدمی گناہوں کی شامت سے کبھی رزق سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

اس کی تفصیل کرنا بھی ایک طریقہ رکھا گیا ہے۔ اسی باب میں اس کی چند مثالیں آپ کی نظروں سے گزر چکی ہیں۔

۹۴۳ ۔ اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر آیا ہے تقدیر، عمر اور رزق اور یہ تینوں چیزیں اسلامی عہد کے بعد ناقابل تبدیل ہونے میں ضرب المثل ہیں اگر غور کیجیے تو یہاں ایک ہی چیز ہے یعنی تقدیر۔ عمر اور رزق اسی کے اجزاء ہیں۔ ان تین کے بالمقابل آپ نے یہاں تین چیزیں اور بیان فرمائی ہیں جن کی تاثیر سے آج تک دنیا ناواقف تھی یعنی دعاء، نیکی اور گناہ۔ ان میں سے دعاء کی برکت سے کبھی نوشتہ تقدیر بھی ٹل جاتا ہے اور نیکی کی بدولت کبھی عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے حالانکہ وہ بھی مقررشدہ ہے اور گناہوں کی شامت سے وہ رزق بھی جو مقرر شدہ ہے کبھی منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ احاطۂ تقدیر میں شامل ہوتا ہے یعنی کوئی دعاء کریگا تو اللہ تعالیٰ اس کو شفاء عطا فرمادیگا، نیکی کریگا تو اتنی عمر دے دی جائیگی اور فلاں گناہ کے باعث رزق گھٹ جائیگا اور یہ بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ دعاء کریگا یا نہیں نیکی کی توفیق ملیگی یا نہیں اور اسی طرح گناہ کا صدور ہوگا یا نہیں پس اگر تقدیر کے پہلے نمبر کی طرف نظر کی جائے جس میں رد بلا دعاء کے ساتھ اور عمر کا اضافہ نیکی کے ساتھ اور رزق کا انقطاع گناہ کے ساتھ معلق ہوتا ہے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مقدرات بھی قابل تبدیل ہوتے ہیں اور جب اس سے اوپر نظر کیجائے جہاں تعلیقات کچھ نہیں صرف احکام ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مقدرات میں جو ترمیمات ہیں وہ سب تحتانی مراتب میں ہیں حقیقت میں کوئی ترمیم نہیں۔

اس جگہ مکتوبات امام ربانی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے وہ تحریر فرماتے ہیں: حضرت قبلہ گاہی ام قدس سرہ میفرمودند کہ حضرت سید محیی الدین جیلانی قدس سرہ در بعضے رسائل نوشتہ اند کہ در قضاء مبرم ہیچ کس را مجال نیست کہ تبدیل کند مگر مرا کہ اگر خواہم آنجا ہم تصرف کنم۔ پھر اس مقولہ کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ "قضاء معلق بر دوگونہ است قضائے است کہ تعلیق او را در لوح محفوظ ظاہر ساختہ اند و ملائکہ را برآں اطلاع دادہ و قضائے کہ تعلیق او نزد خدا است جل شانہ و بس و در لوح محفوظ صورت قضاء مبرم دارد و ایں قسم اخیر از قضائے معلق نیز احتمال تبدیل دارد در رنگ قسم اول ..... و قضاء کہ بحقیقت مبرم است تصرف و تبدیل دراں محال است عقلاً و شرعاً۔ مکتوبات شریفہ ۲۱۷ ص ۲۲۲ بنام ملا طاہر بدخشی۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ علم الٰہی کے لحاظ سے تو تقدیر کے سب ہی فیصلے مبرم اور اٹل ہوتے ہیں لیکن جہاں اس عالم اسباب کا نقشہ کھینچ کر رکھا گیا ہے وہاں کچھ دور تک اسباب و مسببات کا اٹھاؤ دکھانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح اس عالم میں اسباب و مسببات میں فعل و انفعال ظاہر ہے۔ اسی طرح عالم غیب میں بھی اسباب و مسببات کا جو سلسلہ دکھایا گیا ہے اس میں بھی تاثیر اور تأثر موجود ہے اب جہاں تقدیر کے احکامات کے استحکام پر زور دینا منظور ہوتا ہے وہاں پیش نظر اس کا وہ مرتبہ ہوتا ہے جس میں نہ کوئی تعلیق ہے نہ ترمیم اور جہاں کسی عمل کے اچھے یا برے ہونے پر زور دینا مقصود ہوتا ہے وہاں تقدیر کا وہ درجہ لے لیا جاتا ہے جس میں احکامات اپنے اسباب کے ساتھ معلق ہوتے ہیں۔ حدیث مذکور میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو تین باتیں ناقابل ترمیم ہیں جن میں سے مرادِ ملق کی فکر ہر انسان کے سر پر سوار رہتی ہے عالم غیب میں اگر ان میں ترمیم کا کوئی سبب نظر آتا ہے تو صرف وہ یہ تین ہی اعمال ہیں دعاء، نیکی یا نقصان رزق کے لیے معصیت

مساعی الناس الیوم ھی من عوامل القدر المکنون

۹۴۴۔ عَنْ اَبِی خِزَامَۃَ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَأَیْتَ رُقًی نَسْتَرْقِیْہَا وَدَوَاءً نَتَدَاوٰی بِہٖ وَتُقَاۃً نَتَّقِیْہَا ھَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ قَالَ ھِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ۔

۹۴۵۔ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ اَنَّ رَجُلَیْنِ مِنْ مُزَیْنَۃَ قَالَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَرَأَیْتَ مَا یَعْمَلُ النَّاسُ الْیَوْمَ وَیَکْدَحُوْنَ فِیْہِ اَشَیْءٌ قُضِیَ عَلَیْہِمْ وَمَضٰی فِیْہِمْ مِنْ قَدَرٍ سَبَقَ اَوْ فِیْمَا یَسْتَقْبِلُوْنَ بِہٖ مِمَّا اَتَاھُمْ بِہٖ نَبِیُّہُمْ وَثَبَتَتِ الْحُجَّۃُ عَلَیْہِمْ فَقَالَ لَا بَلْ شَیْءٌ قُضِیَ عَلَیْہِمْ وَمَضٰی فِیْہِمْ وَتَصْدِیْقُ

دُنیا میں لوگوں کی جو کچھ بھی جد وجہد نظر آرہی ہے درحقیقت یہ تقدیر ہی کی خفیہ کارفرمائیاں ہیں

۹۴۴۔ ابوخزامہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ فرمائیے یہ جو منتر ہم لوگ پڑھتے ہیں یا دوا کا استعمال کرتے ہیں یا ہتھیاروں سے جنگ میں اپنا بچاؤ کرتے ہیں کیا یہ چیزیں تقدیر کو بدل دیتی ہیں۔ فرمایا نہیں، یہ چیزیں خود تقدیر کے اندر لکھی ہوئی موجود ہوتی ہیں (اور یہ ظاہری جدوجہد اسی کی کارفرمائی ہوتی ہے) احمد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔

۹۴۵۔ عمران بن حصین بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ مزینہ کے دو شخصوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ فرمائیے آج دنیا اپنے اعمال میں جو کچھ بھی جدوجہد کررہی ہے کیا یہ سب کچھ ان کی تقدیر میں پہلے سے طے شدہ تھا یا جب انبیاء علیہم السلام تشریف لاکر خدائی حجت اُن پر پوری کردیتے ہیں تو اس کے بعد لوگ اپنے اعمال کا سلسلہ کسی تقدیر کے بغیر خود شروع کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یوں نہیں ہے بلکہ ان کی تمام جدوجہد طے شدہ

۹۴۴۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قضاء و قدر اسباب کی سببیت کے خلاف نہیں ہے بلکہ اسباب خود قضاء و قدر کے اندر داخل ہوتے ہیں (حجۃ اللہ ص ۷۰) صحابہ کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ جب اسباب تقدیر کو بدل نہیں سکتے تو ان کا ارتکاب کرنا ہی لاحاصل ہے آپ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ ارتکاب کرنا بھی تقدیری احاطہ میں داخل ہے لہٰذا اس کے ارتکاب کرنے نہ کرنے کا سوال ہی بے محل ہے اب چاہے تو یوں سمجھ لو کہ جو مقدر ہوچکا ہے ہم کرتے وہی اسباب ہیں اور چاہے یوں کہدو کہ جو اسباب بھی ہم اس عالم میں کرتے ہیں یہ سب اُسی خفیہ تقدیر کی کارفرمائیاں ہوتی ہیں نتیجہ دونوں باتوں کا ایک ہی نکلتا ہے۔

۹۴۵۔ اس حدیث کے بعض الفاظ میں کچھ لفظی تشویش ہے بعض الفاظ مرادمیں واضح ہیں ہم نے یہاں ان کو بھی نقل کردیا ہے اس لیے ان الفاظ کو بھی پیش نظر رکھا جائے تاکہ مطلب سمجھنے میں آسانی ہو۔ یہاں بھی آپ کے جواب کا حاصل یہی ہے کہ اس عالم میں جو کچھ نظر آرہا ہے یہ سب عالم تقدیر کی کارفرمائیاں ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ آیۃ فالھمھا فجورھا میں الہام سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نفس میں تقویٰ و فجور کی صورت پیدا فرما دیتا ہے جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ شکم مادر ہی میں سعادت و شقاوت لکھ دی جاتی ہے اس کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ الہام اصل میں اس صورت علمیہ کو کہتے ہیں جس

ذٰلِكَ فِي كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا. رواہ مسلم۔
قلت وقد اخرجہ السیوطی فی الدر المنثور فی تفسیر سورۃ والشمس وفیہ "فی قدر سبق" مکان "من قدر سبق" و "ما اتاھم بہ نبیہم" مکان "مما اتاھم" الخ و "ولتخذت علیہم بہ الحجۃ" مکان "ثبتت علیہم الحجۃ" وفیہ زیادۃ وھی قال فلم یعملون اذا قال من کان اللہ خلقہ لواحدۃ المنزلتین ھیأہ لعملہا و تصدیق ذلک الخ ص۳۵۲ واخرجہ فی سورۃ واللیل عن جابر وفیہ اسم السائل ایضا ولفظہ ان سراقۃ بن مالک قال یا رسول اللہ أفی ای شیء نعمل أفی شیء ثبتت فیہ المقادیر وجرت فیہ الاقلام ام فی شیء نستقبل فیہ العمل قال بل فی شیء ثبتت فیہ المقادیر وجرت فیہ الاقلام ص۳۵۹
واخرج نحوہ ابن ماجۃ عن سراقۃ بن جعشم وھو مالک بن جعشم قال قلت یا رسول اللہ العمل فیما جف بہ القلم وجرت بہ المقادیر ام فی امر مستقبل قال فیما جف بہ القلم وجرت بہ المقادیر وکل میسر لما خلق لہ وفی الزوائد فی اسنادہ فقال فان مجاھدا لم یسمع من سراقۃ فلزم الانقطاع وعطاء مختلف فیہ انتہی قال السندی والمتن قد ذکرہ ابو داؤد من روایۃ ابن عمر۔ وعند مسلم عن جابر قال جاء سراقۃ بن مالک بن جعشم قال یا رسول اللہ بین لنا دیننا (ای ما نعتقد من حال اعمالنا) کانا خلقنا الآن (ای انہم غیر عاملین بتلک المسئلۃ) فیما العمل الیوم ایما جفت بہ الاقلام وجرت بہ المقادیر ام فیما نستقبل الخ۔

تقدیر کے تحت ہوتی ہے چنانچہ اس کی شہادت خود قرآن شریف میں بھی موجود ہے۔ ارشاد ہے "ونفس وما سوٰھا" یعنی اور قسم ہے انسان کے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست کیا پھر اس کو بدکاری اور نیکوکاری دونوں کا الہام فرمایا یعنی دونوں کی صورت پیدا فرمادی۔

کی بنا پر کسی کو عالم کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہر وہ صورت اجمالیہ جو آئندہ ظہور آثار کے لیے مبدء و منشاء ہو الہام کے نام سے موسوم ہو جاتی ہے، خواہ اس کی بنا پر عالم کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو۔ اس جگہ الہام کے یہی معنی مراد ہیں (حجۃ اللہ ص۱۲۹)
شرح عقیدۃ الطحاویہ میں اس جگہ ایک اور لطیف بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ لفظ الہمہا (جس کا ترجمہ ہے اسی نے نفس کو الہام کیا اور سکھایا) قدر کی طرف اشارہ ہے اور فجورھا وتقوٰھا میں فجور اور تقوی کے نفس کی اضافت سے اس کے اختیار کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بندہ کا بھی کوئی فعل ضرور ہوتا ہے جس کی بنا پر اس کا نفس فاجرہ یا تقیہ بن جاتا ہے، اسی طرح آئندہ آیت میں زکٰہا اور دسّٰہا میں تزکیہ اور تدسیس کی انسان کی طرف نسبت بھی دلالت کرتی ہے کہ یہاں عبد کا بھی کچھ فعل ہوتا ہے۔ گویا تقدیر کے جبر اور بندہ کے فاعل بالاختیار رہنے میں کوئی منافات نہیں ہے۔ دیکھو ص۳۶ اس کے اختیار کے ساتھ ساتھ تقدیر کا جبر بھی لگا جا رہا ہے۔

الحوادث الكونية مع اسبابها كائنة تحت القدر

۹۴۶ - عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُرِيْتُكِ قَبْلَ اَنْ اَتَزَوَّجَكِ مَرَّتَيْنِ رَأَيْتُ الْمَلَكَ يَحْمِلُكِ فِيْ سَرَقَةٍ مِنْ حَرِيْرٍ فَقُلْتُ لَهٗ اِكْشِفْ فَاِذَا كَشَفَ فَاِذَا هِيَ اَنْتِ فَقُلْتُ اِنْ يَكُ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ يُمْضِهِ ۔ رواه البخاری فی التعبیر۔

۹۴۷ - عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِابْنِ صَيَّادٍ خَبَأْتُ لَكَ خَبِيْئًا قَالَ الدُّخُّ قَالَ اِخْسَأْ فَلَنْ تَعْدُوَ قَدْرَكَ قَالَ عُمَرُ اِئْذَنْ لِيْ فَاَضْرِبَ عُنُقَهٗ قَالَ دَعْهُ اِنْ يَكُنْ هُوَ فَلَا تُطِيْقُهٗ

دُنیا کے واقعات کے ساتھ اُن کے اسباب بھی قضاء و قدر کے تحت ہی ہوتے ہیں

۹۴۶ - حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شادی سے قبل مجھے تم کو دو مرتبہ خواب میں دکھایا گیا تھا میں نے کیا دیکھا کہ ایک فرشتہ ہے جو ایک ریشمین کپڑے میں تم کو لیے ہوئے ہے، میں نے اس سے کہا ذرا پردہ ہٹانا اُس نے پردہ ہٹایا، دیکھتا کیا ہوں کہ وہ تم ہو میں نے اپنے دل میں کہا اگر اللہ تعالیٰ نے اس خواب کو اپنی اسی ظاہری شکل پر پورا کرنا مقدر فرما دیا ہے تو وہ پورا کر کے رہیگا۔ (بخاری شریف)

۹۴۷ - ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد سے امتحاناً فرمایا میں نے تیرے امتحان کرنے کے لیے ایک بات دل میں چھپائی ہے بتا وہ کیا ہے اس نے کہا کہ وہ دُخ کا کلمہ ہے آپ نے فرمایا جا تو اپنی مقدار اوقات سے تجاوز نہیں کر سکتا اس پر عمرؓ نے فرمایا اجازت دیجیے تو میں ابھی اس کی گردن اُڑا دوں۔ آپ نے فرمایا جانے دو کیونکہ اگر یہ وہی دجال اکبر ہے تو تم چاہو بھی جب بھی اس کو قتل نہیں کر سکتے اور

۹۴۶ - انبیاء علیہم السلام کی شخصیت بھی کتنی پاکیزہ اور بلند ہوتی ہے کہ بیداری کی حالت ہو یا خواب کی اور تشریعیہ ہوں یا تکوینیہ اُن کے ذاتی معاملات ہوں یا دوسروں کے کسی وقت بھی اُن کا تعلق ملاء اعلیٰ سے علیحدہ نہیں ہوتا، اس لیے ان کی خواب کو بھی وحی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، اب ذرا دیکھیے یہ کیا چھوٹا سا معاملہ تھا بات بھی خواب کی تھی اور وہ بھی ایک ذاتی معاملہ میں جس کا کوئی ظاہری سامان بھی نہ تھا مگر یہاں بھی نبی کی ذات اس پر اسی طرح یقین رکھتی ہے جس طرح کہ اپنی بیداری کی وحی پر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اتنی بھی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ بیداری کے بعد اس ظاہری علیہ کا کوئی سراغ ہی لگاتے بلکہ پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ کر اسے، کو تقدیر کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ نے اس خواب کا اسی ظاہری شکل پر پورا ہونا مقدر فرما دیا ہے تو وہ پورا ہو کر رہیگا اور اس کے اسباب بھی ہو کر رہینگے۔

۹۴۷ - تقدیر کا قطعی فیصلہ اگر کہیں کسی کے لیے ٹل سکتا تو آج عمرؓ کو یہ کہہ کر مایوس نہ کر دیا جاتا کہ تم اس بچہ کو قتل کر ہی نہیں سکتے۔ دیکھیے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دنیا میں دوبارہ تشریف لانا اور تشریف لا کر دجال کو قتل کرنا تقدیر کے ان حتمی فیصلوں میں داخل ہو چکا ہے جو اٹل ہیں یہاں فاروق اعظمؓ جیسے کی قوت آزمائی بھی بیکار ہے۔ یہ قدرت کے مانع ہیں مگر آج وہ کسی قید و شرط کا اظہار فرما کر اپنے اس فیصلہ کو ٹال دیتی تو آج ہی اُمت محمدیہ ان تمام ہولناک مصائب سے نجات پا لیتی

وَاِنْ لَمْ يَكُنْ هُوَ فَلَا خَيْرَ لَكَ فِيْ قَتْلِهٖ . رواہ البخاری فی ابواب القدر۔

۹۴۸ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْاَلِ الْمَرْاَةُ طَلَاقَ اُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَلْتَنْكِحْ فَاِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا . رواہ البخاری عن ... وابوداؤد وغیرہما۔

اگر یہ وہ نہیں ہے تو پھر اس نابالغ بچہ کے قتل سے کیا فائدہ۔ (بخاری شریف)

۹۴۸۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کو یہ نہ چاہیے کہ وہ دوسری عورت کی طلاق کا اس نیت سے مطالبہ کرے کہ جو اس کے نصیب کا لکھا ہے وہ بھی سب یہی حاصل کر لے، اس کو نکاح کر لینا چاہیے کیونکہ جو اُس کے نصیب کا ہوگا وہ اُسی کو ملیگا (دوسری کو نہیں مل سکتا)

(بخاری شریف، ابوداؤد شریف وغیرہما)

جن کے تصور سے بھی رونگٹا کھڑا ہوتا ہے مگر ذات بے نیاز کو اس کی پرواہ نہیں ہے اس نے شیطان کی درخواست منظور کر لی اور قیامت تک کے لیے اس کو طویل حیات بخش دی۔ تقدیر کے فیصلے اسی طرح ٹلا نہیں کرتے۔ اور اگر کہیں ٹل سکتے تو ایک بار ایسا نازک موقعہ بھی آچکا تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ عالیمقام کی رُوح قبض ہو رہی تھی اور آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بندھی ہوئی تھیں گھریاں بھی یہ سب کچھ گوارا کر لیا گیا مگر ختم نبوۃ کے فیصلہ پر نظر ثانی نہیں کی گئی آخر آپ کے فرزند گرامی کی وفات ہو گئی۔ اگر اس فیصلہ میں بھی کوئی قید یا کوئی شرط مستور ہوتی تو آج سے زیادہ اس کے لیے کوئی دوسرا موقعہ نہ تھا۔ یہاں یہ بات کتنی قابل غور ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کے بعد عمرؓ کے قلب میں اب یہ وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا کہ لاؤ ذرا آزمائش تو کر کے دیکھوں کہ مجھ میں اس کے قتل کی طاقت ہے بھی یا نہیں بلکہ وہ ہاتھ جو ابھی ابھی شمشیر کے قبضہ پر اس طرح رکھا ہوا تھا کہ اب اجازت ملے تو فوراً شمشیر بے نیام کر لے، وہی ہاتھ اس حکم کے سننے کے بعد اس طرح مفلوج بن چکا تھا گویا کہ اس میں اس آزمائش کے لیے کوئی حس و حرکت ہی نہ تھی۔ جب تک قضاء و قدر پر یہ ایمان نصیب نہ ہو اس وقت تک مومن بھی کیا مومن ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تقدیر میں جس طرح دجال کا قتل مقدر ہو چکا ہے اس کا قاتل بھی مقدر ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ قتل تو ہو جائے مگر ہو کسی اور سبب سے۔ نہیں وہ ضرور ہوگا اور اُسی اپنے سبب کے ذریعہ ہوگا جو اُس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ پھر جب دونوں باتیں قضاء و قدر کے تحت داخل ہو چکی ہیں تو یہ سوال کیسے ہو سکتا ہے کہ جب تقدیر کے فیصلے اٹل ہیں تو ہمارے مساعی کی ضرورت کیا؟ جی ہاں اُن مساعی کا کرنا بھی آپ کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اُن فیصلوں کا منصۂ شہود پر آنا لہذا آپ کا سوال ہی مہمل ہے آپ ایسے فعل کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال فرما رہے ہیں جس کی ایک جانب پہلے سے آپ کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے۔ اس لیے اگر آپ بعند اگر سعی نہ کریں تو یقین رکھیے کہ یہی جانب آپ کے مقدر میں تھی لیکن چونکہ اس فعل کو اپنے اختیار ہی سے کیا ہے اس لیے جو جبر آپ کے اختیار پر مسلط تھا (یعنی آپ کے اختیار ہی کو اس طرف لگا دینا) وہ آپ کو محسوس نہیں ہوتا۔ ابن صیاد کون تھا، اس کے متعلق بحث ان شاء اللہ تعالیٰ دوسرے مقام میں کی جائیگی۔

۹۴۸۔ انسانی پست ہمتی اور خست کی یہ ایک بدترین مثال ہے کہ جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا ارادہ کرے تو پہلے وہ اس سے یہ شرط لگائے کہ جو عورت اس کے نکاح میں موجود ہے اگر وہ اس کو طلاق دیدے تو یہ اس سے نکاح کر سکتی ہے اور یہ بھی ہو صرف اس لالچ میں کہ اس صورت میں وہ شوہر کے پورے مال پر قابض رہیگی حتیٰ کہ جو اس وقت اس کی اسلامی بہن کا حصہ ہے وہ بھی اسی کے پاس آجائیگا۔ اسلام اپنے نفع کی خاطر دوسرے کو نقصان رسانی کی اس بدتر صورت کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کٹھن سبق کو یہ کہکر آسان کر دیتا ہے کہ سرے سے لالچ کا یہ تخیل ہی غلط ہے کیونکہ کسی کے مقدر کا رزق دوسرے کو مل جائے یہ ممکن ہی نہیں تو پھر مفت میں اس دنائت اور خست کے اظہار کی ضرورت۔ اب آپ نے دیکھا کہ تقدیر کا مسئلہ کتنی مشکلات کا حل ہے حیات و موت کا کوئی گوشہ جب انسان کے لیے لاینحل بن رہا ہو تو تقدیر کا سبق بڑی آسانی سے اس کو حل کر دیتا ہے۔

۹۴۹ عَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا اَتٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ لِیْ جَارِیَۃً ھِیَ خَادِمُنَا وَاَنَا اَطُوْفُ عَلَیْھَا وَاَکْرَہُ اَنْ تَحْمِلَ فَقَالَ اِعْزِلْ عَنْھَا اِنْ شِئْتَ فَاِنَّہٗ سَیَاْتِیْھَا مَا قُدِّرَ لَھَا فَلَبِثَ الرَّجُلُ ثُمَّ اَتَاہُ فَقَالَ اِنَّ الْجَارِیَۃَ قَدْ حَبِلَتْ فَقَالَ قَدْ اَخْبَرْتُکَ اِنَّہٗ سَیَاْتِیْھَا مَا قُدِّرَ لَھَا۔ رواہ مسلم

۹۵۰۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْعَزْلِ فَقَالَ مَا مِنْ کُلِّ الْمَاءِ یَکُوْنُ الْوَلَدُ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ خَلْقَ شَیْءٍ لَمْ یَمْنَعْہُ شَیْءٌ۔ رواہ مسلم۔

۹۵۱۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَھَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّذْرِ وَقَالَ اِنَّہٗ لَا یَرُدُّ شَیْئًا وَ

۹۴۹۔ جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میری ایک باندی ہے جو میرے کام کاج کرتی ہے اور میں اُس سے صحبت بھی کرتا ہوں اس لیے مجھے یہ پسند نہیں کہ وہ حاملہ ہو جائے (کیا میں عزل کر سکتا ہوں) آپ نے فرمایا اگر تم چاہو تو عزل کر لو مگر اس کے مقدر میں جو بچہ لکھا جا چکا ہے وہ اُسے جَن کر رہیگی۔ کچھ عرصہ گزرا ہو گا کہ وہی شخص پھر حاضر ہوا اور عرض کی کہ وہ تو حاملہ ہو گئی۔ آپ نے فرمایا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ جو بچہ اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے وہ اس سے ضرور پیدا ہو کر رہیگا۔ (مسلم شریف)

۹۵۰۔ ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کرنے کے متعلق دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا مرد کی ساری منی سے تو بچہ نبتا نہیں (تو پھر عزل سے فائدہ) اور اللہ تعالیٰ جب کسی بچے کے پیدا فرمانے کا ارادہ کرے تو پھر کوئی شے اس کے لیے مانع نہیں ہو سکتی۔ (مسلم شریف)

۹۵۱۔ ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منتیں ماننے سے روکا ہے اور فرمایا ہے کہ

۹۴۹۔ عزل لغت میں اس کو کہتے ہیں کہ جب مرد انزال کے قریب پہنچے تو اپنے عضو کو باہر نکال کر باہر انزال کر دے تاکہ استقرار حمل نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ اگر بات غیر پسندیدہ ہوتی تو اس کی اجازت تو دیتے مگر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرما کر۔ مشکل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا رسول اگر منع فرمائے تو حرمت کا مرتبہ آسکتا ہے اور اگر کھلی اجازت دیدے تو یہ خلاف مقصود ہوتا ہے اس لیے یہاں فقط "ان شئت" (یعنی اگر تو چاہتا ہے تو کر لے) فرما کر تنبیہ فرما دی کہ ہماری مرضی کی تو یہ بات ہے نہیں دوم اس عمل کے بیکار رہنے کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔ حدیث کی مراد یہ نہیں ہے کہ اگر تقدیر میں اولاد مقدر ہو گی تو مرد کے نطفے کے بغیر بھی ہو کر رہیگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر اولاد مقدر ہو گی تو عزل کے بعد بھی غیر شعوری حالت میں اتنا مادہ رحم میں پہنچ جائیگا جو بچہ بننے کے لیے کافی ہو گا اور اس طرح تقدیر کا نوشتہ تو پورا ہو کر رہیگا اور یہ عمل آخر کار بیکار ثابت ہو گا چنانچہ یہاں ایسا ہی ہوا اور اس وقت آپ نے پھر اس کو اپنا مقولہ یاد دلایا۔

۹۵۰۔ اس حدیث میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ تقدیر اگرچہ ہے مگر اسباب کو توڑ کر نہیں بلکہ اس طرح کہ اس کے اسباب بھی ہو کر رہتے ہیں مثلاً یہ کہ اس صورت میں عزل سے قبل نطفہ کا کوئی نہ کوئی حصہ نکل جائے اور اسی سے لڑکا پیدا ہو جائے۔ اولاد کی پیدائش کے لیے پورا مادہ تو ضروری ہے نہیں۔ پھر عزل کرنے والے کو ایسے وقت میں بھلا اس کی احتیاط کیا رہ سکتی ہے کہ وہ اس طرح عزل کرے کہ ایک قطرہ منی بھی اندر نہ نکلنے پائے۔

۹۵۱۔ انسانی بخل کی بھی حد ہو گئی کہ وہ اپنے خالق کی بارگاہ میں بھی اس وقت تک مال خرچ کرنا پسند نہیں کرتا جب تک کہ

وَاِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِہٖ مِنَ الْبَخِیْلِ۔ رواہ البخاری۔

القدر نافذ علی وجہ لا ینخرم نظام الاسباب

۹۵۲ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَرَادَ بِعَبْدٍ خَیْرًا اِسْتَعْمَلَہٗ فَقِیْلَ وَکَیْفَ یَسْتَعْمِلُہٗ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ یُوَفِّقُہٗ بِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ۔ رواہ الترمذی قال ہذا حدیث صحیح۔

۹۵۳ عَنْ اَبَانَ بْنِ عُثْمَانَ قَالَ سَمِعْتُ اَبِیْ یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ یَقُوْلُ فِیْ صَبَاحِ کُلِّ یَوْمٍ وَمَسَاءِ کُلِّ لَیْلَۃٍ بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَیَضُرَّہٗ شَیْءٌ فَکَانَ

منتیں ماننے سے تقدیر تو بدلتی نہیں ہاں اس بہانہ سے بخیل آدمی کا مال اس کے قبضہ سے زبردستی نکلوا لیا جاتا ہے۔ (بخاری شریف)

قضاء و قدر کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ نظامِ تقدیر اور نظامِ تدبیر ٹکراتے نہیں

۹۵۲۔ انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے متعلق بھلائی کا ارادہ فرما لیتے ہیں تو اُس سے نیک کام کرا لیتے ہیں۔ دریافت کیا گیا نیک کام کرانے کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا کہ موت سے قبل اس کو نیک کام کرنے کی توفیق بخش دیتے ہیں۔

۹۵۳۔ ابان بن عثمان کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد بزرگوار کو یہ بیان کرتے خود سُنا ہے کہ اگر کوئی بندہ ہر صبح و شام کو تین بار یہ کلمات پڑھ لیا کرے تو پھر کوئی چیز اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بسم اللہ الذی لا یضر الخ اس اللہ کے نام کے ساتھ جس کے نام کی برکت سے کوئی چیز نہ زمین پر نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ آسمان میں اور وہ جاننے والا ہے سننے والا ہے

اس سے بھی اس کا کوئی معاوضہ وصول کر لے اور وہ بھی پیشگی یعنی وہ نذر و نیاز ادا کرنے کا عزم بھی جب کرتا ہے جب کہ مثلاً پہلے اس کا مریض شفا یاب ہو جائے، حدیث کہتی ہے کہ کارکنانِ قضاء و قدر کے سامنے یہ مشروط نذر و نیاز بیکار اور لاحاصل بات ہے وہ طے شدہ معاملہ ہے اور اسی طرح ہو کر رہیگا۔ مشروط نذریں تقدیری فیصلوں پر ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ صدقہ کرنے سے بیشک کبھی رد بلا ہو جاتا ہے اس لیے تم اگر یہ چاہتے ہو تو خیر طلبی کے بغیر صدقہ دیتے رہو۔ اگر عالمِ تقدیر میں یہ طے پا چکا ہے کہ تم صدقہ کرو گے تو یہ بلا تم سے ٹل جائیگی تو اگر منشاء اللہ تعالیٰ تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائیگا، اور تمہارے اس عمل کا نظاہر بھی نہ ہوگا۔ حدیث میں جہاں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ امور مقدرہ کے لیے اسباب بھی مقدر ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض اسباب ایسے بھی ہیں جن کا ارتکاب عبث ہے۔ عالمِ تقدیر میں ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ ایسے اسباب نہیں ہیں جیسے عمر میں برکت کے لیے صدقہ۔ اس لیے ان کا ارتکاب کرنا اضاعت وقت کے ساتھ ساتھ حماقت بھی ہے عورت کا کسی مرد سے نکاح کرنے کے لیے دوسری بی بی کے طلاق کا مطالبہ کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔

۹۵۲۔ یعنی جنتی جنت میں یا دوزخی دوزخ میں جائیگا تو اپنے مقدر ہی سے مگر خانہ پُری کے لیے پہلے اس سے اعمال ویسے ہی کرا لیے جاتے ہیں تاکہ دوزخ یا جنت ملے تو ان کے اسباب کے ساتھ ملے اور قضاء و قدر بھی نافذ ہو تو اسی طرح نافذ ہو کہ عالمِ اسباب میں جو نظام اسباب

بقیہ بر صفحہ ۱۰۰

اَبَانُ قَدْ اَصَابَہٗ طَرَفُ فَالِجٍ فَجَعَلَ الرَّجُلُ یَنْظُرُ اِلَیْہِ فَقَالَ لَہٗ اَبَانُ مَا تَنْظُرُ اِلَیَّ اَمَا اِنَّ الْحَدِیْثَ کَمَا حَدَّثْتُکَ وَلٰکِنِّیْ لَمْ اَقُلْہُ یَوْمَئِذٍ لِیُمْضِیَ اللّٰہُ عَلَیَّ قَدَرَہٗ ۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔

ابان کو اتفاق سے فالج پڑ گیا تھا، تو جس شخص سے ابان یہ روایت بیان کر رہے تھے وہ ان کو ازراہ تعجب دیکھنے لگا۔ اس پر ابان نے فرمایا دیکھتے کیا ہو سن لو حدیث تو ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح کہ میں نے تم سے بیان کی ہے لیکن آج مجھ کو یہ کلمات پڑھنے ہی یاد نہ رہے تا کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی تقدیر جاری فرما دے۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

(بقیہ ۹۵۲) رکھا گیا ہے وہ درہم برہم نہ ہونے پائے۔ جب اسباب ظاہر یہ قضاء و قدر کے اس طرح جزء بنے ہوئے ہوں تو یہ کون کہہ سکتا ہے کہ تقدیر پر ایمان رکھنے والے اسباب کے بیکار ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

۹۵۳ دیکھیے یہ صحابی اسباب اور قضاء و قدر کا باہم ربط کتنا ٹھیک ٹھیک سمجھے ہوئے ہے۔ وہ بہت مختصر الفاظ میں یہ بتاتا ہے کہ جب کوئی امر ظہور پذیر ہونا مقدر ہوتا ہے تو وہ اسباب کو توڑ کر مقدر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے اسی کے مناسب اسباب بھی مقدر ہو جاتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ میرے لیے فالج کی بیماری مقدر ہوئی تو یوں نہیں ہوئی کہ میں اس سے حفاظت کے اسباب تو پورے کر لوں اور اس کے باوجود پھر فالج میں مبتلا ہو جاؤں بلکہ یوں مقدر ہوئی کہ آج اس کے سامان تحفظ ہی نہ کروں تا کہ نظام تقدیر اور نظام تدبیر دونوں کے دونوں قائم رہیں۔ مستدرک حاکم میں ابن عباسؓ کے جلیل القدر شاگرد عکرمہ نے اپنے استاد حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا کہ آپ تو یہ فرماتے ہیں کہ ہدہد زمین میں چونچ مار کر حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پانی کا سراغ لگا دیتا تھا۔ تعجب ہے کہ زمین کی تہ کا پانی تو اس کو نظر آ جائے لیکن جب بچے جال بچھا کر ایک مٹھی بھر خاک اس پر ڈال دیں تو وہ اس کو نظر نہ آئے اور وہ ان کے جال میں پھنس جائے۔ حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا خدا تجھے فہم دے اذا جاء القضاء ذھب البصر جب قضاء آ جاتی ہے تو اسی طرح آنکھیں بیکار ہو جایا کرتی ہیں۔ غالباً اسی لیے فارسی کی مثل ہے "چون قضا آید طبیب ابلہ شود" اس جواب کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ نفاذ قضاء کے لیے اسباب سے غفلت یہ بھی حکمت تقدیر ہے۔

یہاں یہ اہمیت کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے دنیا میں آکر مذاق سخن اور انداز غور و فکر بھی اتنا بدل دیا تھا کہ جب تک آپ اسی سانچے میں ڈھل نہ جائیں ان کے کلمات کی گہرائی کو پا نہیں سکتے۔ اگر آج یہی سوال ہمارے سامنے کیا جاتا تو ہم بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیوانات میں قدرت نے کچھ خصوصی شعور طبعاً رکھ دیے ہیں وہ صرف اسی حد تک اُن سے استفادہ کرتے رہتے ہیں جس حد تک کہ وہ اُن میں رکھے گئے ہیں۔ کسی جانور میں پانی کا کھوج لگا لینے کا خاصہ رکھا گیا ہے تو یہ اس کا کوئی ہنر نہیں بلکہ ایک طبعی شعور ہے اسی طرح کے دوسرے حیوانات میں بھی دوسرے قسم کے علیحدہ علیحدہ خواص موجود ہیں اور حیوانات ہی میں نہیں جمادات میں بھی یہ خواص نظر آتے ہیں۔ مقناطیس ایک خاص تناسب کے ساتھ لوہے جیسے بھاری چیز کو تو گھسیٹ سکتا ہے مگر کاغذ جیسی خفیف چیز کو ادنیٰ جنبش بھی نہیں دے سکتا مگر یہ جواب اور یہ مذاق سخن اسی وقت تک باقی رہ سکتا ہے جب تک کہ عالم حقیقت کا انکشاف نہیں ہوتا۔ جن کے سامنے عالم غیب عالم حقیقت ہے ان کے نزدیک یہ سارا جہان ایک تماثیر سینما سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اس لیے ہر سوال و جواب کے موقعہ پر اُن کے سامنے پہلے عالم غیب آ جاتا ہے اس لیے وہی کلمات ان کی زبان سے نکلتے ہیں جو اس کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ دنیا کے واقعات پر بھی آپ ذرا غور کریں پہلا ایک مؤرخ ایک فلسفی، پھر ان میں نفسیات کے ماہرین، علم طبقات الارض کے رمز شناس سب علیحدہ علیحدہ نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں اور اسی طبقہ کے پہلو بہ پہلو ایک کمتر سے کمتر طبقہ جوتشیوں کا بھی اپنی پوتھی لیے غور کرتا نظر آتا ہے ان درجوں سے بلند تر اسلام کا بھی یہاں ایک نقطۂ غور و فکر ہوتا ہے اور جس طرح کسی ایک واقعہ کے جواب میں ان سب کے جوابات مختلف ہوتے ہیں یہاں اسلام کا بھی ایک علیحدہ جواب ہوتا ہے۔ وہ دنیوی اسباب کا انکار نہیں کرتا بشرطیکہ وہ محض وہم پرستی نہ ہوں، مگر اسی کے ساتھ دوسرے اسباب سے خبردار کرتا ہے۔ جن سے عام عالم بے خبر ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں ابن عباسؓ نے وہی جواب دیا ہے جو اس وقت عبرت آموز اور سخن فہم طبائع کے لئے مناسب تھا۔ سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست۔

۹۵۴ عَنْ اَبِیْ عَزَّةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَضَی اللّٰہُ لِعَبْدٍ اَنْ یَّمُوْتَ بِاَرْضٍ جَعَلَ لَہٗ اِلَیْھَا حَاجَۃً اَوْقَالَ بِھَا حَاجَۃً ۔ رواہ احمد، والترمذی وقال ہذا حدیث حسن صحیح وابوعزۃ الصحبۃ اسمہ یسار بن عبد وروی الحاکم فی المستدرک عن ابن مسعودؓ وعروۃ بن مغرس ومطر بن عکامس نحوہ

۹۵۵۔ عَنْ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ اَنَّہٗ قَالَ کَانَ صَدِیْقًا لِاُمَیَّۃَ بْنِ خَلَفٍ وَکَانَ اُمَیَّۃُ اِذَا مَرَّ بِالْمَدِیْنَۃِ نَزَلَ عَلٰی سَعْدٍ وَکَانَ سَعْدٌ اِذَا مَرَّ بِمَکَّۃَ نَزَلَ عَلٰی اُمَیَّۃَ فَلَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

۹۵۴ ابوعزہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کی موت کسی جگہ مقدر فرما دیتے ہیں تو اس جگہ اس کو کوئی ضرورت پیدا فرما دیتے ہیں (جس کے پورا کرنے کے لیے وہ جاتا ہے اور اس ذریعہ سے وہ اپنی موت کی جگہ جا پہنچتا ہے)

۹۵۵۔ سعد بن معاذ روایت فرماتے ہیں کہ ان کا اور امیہ بن خلف کا باہم دوستانہ تھا جب کبھی امیہ مدینہ طیبہ آتا تو ان کا مہمان بنتا اور جب یہ مکہ مکرمہ جاتے تو اس کے مہمان ہوتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر

۹۵۴۔ ان احادیث میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عالم میں بعض واقعات محض اسباب کا بھرم قائم رکھنے کے لیے پیش آتے ہیں اگر تقدیر عالم اسباب کو توڑ کر سامنے آجائے تو اسباب کی تاثیر کا سارا راز فاش ہو جائے۔ دیکھیے آدمی سفر کرتا ہے اپنی ضرورت کی خاطر، ادھر تقدیر کھینچتی ہے موت کی خاطر۔ ظاہر میں تو یہ سمجھتا ہے کہ یہاں آنا ہوا تھا ایک ضرورت کے لیے، اس لیے یہاں موت آگئی اور تقدیر یہ کہتی ہے کہ چونکہ موت ہی یہاں کی مقدر تھی اس لیے یہاں آنا ہوا۔ پہلی صورت میں انسان کے دل میں یہ خیال رہ رہ کر آسکتا ہے کہ اگر کاش یہ شخص یہاں نہ آتا تو اس کی موت اپنے وطن ہی میں آتی اور موت غربت سے بچ جاتا لیکن دوسری صورت میں اس خیال کی بجائے دل میں یہ جزم حاصل ہوتا ہے کہ جب موت یہاں کی مقدر تھی تو یہ اپنے وطن میں رہتا کیونکر۔
منقول ہے کسی جگہ نظر سے گزرا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اجلاس میں ایک مرتبہ حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی بصورت انسان موجود تھے وہ بار بار ایک شخص کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اس درمیان میں اس شخص نے کسی بعید مقام پر پہنچا دینے کی ان سے درخواست کی، اس پر حضرت عزرائیل علیہ السلام کے چہرہ پر مسکراہٹ سی آگئی۔ دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ میں دیکھ یہ رہا تھا کہ اس شخص کے متعلق مجھ کو فلاں مقام پر اس کی روح قبض کرنے کا حکم ہوا ہے وہ مقام یہاں سے بہت طویل مسافت پر ہے اور اس کی قبض روح میں اتنے وقت کی گنجائش نہیں، پھر یہ ہوگا کیسے۔ جب اس نے یہ درخواست پیش کی تو مجھ کو اس پر ہنسی آگئی کہ اس کے وہاں پہنچنے کے سامان حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعہ مقدر تھی ادھر اب یہ وہاں پہنچتا ہے اور ادھر ٹھیک محل ٹھیک وقت پر حکم ربی نافذ ہوتا ہے۔
حضرت سلیمانؑ کی تسخیر کا تذکرہ خود قرآن عزیز میں موجود ہے اس لیے اس خاص واقعہ کو صرف اس کے برمحل ہونے کی وجہ سے ذکر کر دیا گیا ہے اسی لیے اس کے اسناد وغیرہ کی تفتیش بھی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو اس پر بھی تحقیق کر لی جاتی۔

۹۵۵۔ آپ نے دیکھا مٹی کی کشش کیسی ہوتی ہے اور یہ کہ جب کسی شخص کی موت کسی جگہ مقدر ہوتی ہے تو وہ کس طرح مجبور ہو ہو کر آخر اسی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ یہاں امیہ نے ہزار جتن کیے مگر ایک نہ چلا اپنے ارادہ کے خلاف اس کو جنگ میں شریک ہونا ہی پڑا اور وہ اونٹ جس کو جان کے ساتھ لگائے لگائے پھرتا تھا وہ بھی خاک کام نہ آسکا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو پیش گوئی تھی وہ صبح صادق کی طرح پوری ہو کر رہی۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار گو زبانوں سے آپ کی نبوت کا اقرار نہ کرتے ہوں مگر دلوں میں اس کا یقین رکھتے تھے کہ آپ کا فرمودہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے، ٹل نہیں سکتا۔ یہاں ابو صفوان کی بیوی چلتے چلتے سمجھاتی رہی مگر قضاء وقدر جہاں کی موت لکھ چکی تھی وہاں ابو صفوان کو کسی نہ کسی حیلہ بہانہ سے آنا ضروری تھا کچھ نہ

سہی تو ابوجہل کا اصرار اور قوم کی عار ہی کے سبب سہی

وسلم المدينة انطلق سعد معتمرا فنزل على امية بمكة فقال لامية انظر لي ساعة خلوة لعلي ان اطوف بالبيت فخرج به قريبا من نصف النهار فلقيهما ابو جهل فقال يا ابا صفوان من هذا معك فقال هذا سعد فقال له ابو جهل الا اراك تطوف بمكة امنا وقد اويتم الصباة وزعمتم انكم تنصرونهم وتعينونهم اما والله لولا انك مع ابي صفوان ما رجعت الى اهلك سالما فقال له سعد ورفع صوته عليه اما والله لئن منعتني هذا لامنعنك ما هو اشد عليك منه طريقك على اهل المدينة فقال له امية لا ترفع صوتك يا سعد على ابي الحكم سيد اهل الوادي فقال سعد دعنا عنك يا امية فوالله لقد سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول انهم قاتلوك قال بمكة قال لا ادري فقال امية والله لا اخرج من مكة فلما كان يوم بدر استنفر ابو جهل الناس قال ادركوا عيركم فكره امية ان يخرج فاتاه ابو جهل فقال يا ابا صفوان انك متى يراك الناس قد تخلفت وانت سيد اهل الوادي تخلفوا معك فلم يزل به ابو جهل حتى قال اما اذا غلبتني فوالله لاشترين اجود بعير بمكة ثم قال امية يا ام صفوان

مدینہ تشریف لے آئے تو ایک بار سعد عمرہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ گئے اور حسب قاعدہ امیہ کے مہمان ہوئے اور اس سے کہا ذرا دیکھنا کوئی خالی سا وقت ملے تو مجھے بیت اللہ کا طواف کرنا ہے۔ دوپہر کے قریب یہ طواف کے لیے نکلے اتفاقاً ابوجہل کی ان دونوں سے ملاقات ہوگئی اس نے پوچھا، ابوصفوان! (امیہ کی کنیت ہے) یہ تمہارے ساتھ کون آدمی ہے؟ اس نے کہا سعد بن معاذ ہیں۔ اس پر ابوجہل بولا میں دیکھ رہا ہوں، تم بڑے اطمینان سے بیت اللہ کا طواف کر رہے ہو حالانکہ تم نے اُن لوگوں کو جو یہاں سے اپنا آبائی دین چھوڑ کر چلے گئے ہیں اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے اور تمہارا گھمنڈ یہ ہے کہ جنگ میں تم ان کی مدد بھی کروگے۔ خدا کی قسم اگر اس وقت تم ابوصفوان کے ساتھ نہ ہوتے تو اپنے گھر زندہ نہیں جا سکتے تھے۔ اس پر سعد برہم ہوکر ذرا بلند آواز سے بولے خدا کی قسم اگر تو مجھ کو طواف سے روکیگا تو میں تجھ کو ایسی بات سے روکونگا جو اس سے زیادہ تجھ پر شاق ہوگی۔ یعنی اہل مدینہ کی طرف سے تیرا تجارتی راستہ بند کر دونگا۔ اُمیہ نے کہا دیکھو سعد ان سے ایسی تیزی سے گفتگو نہ کرو آخر یہ بھی اس وادی کے سردار ہیں۔ سعد نے اُمیہ سے مخاطب ہوکر کہا بس آپ بھی رہنے دیجیے خدا کی قسم میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سُنا ہے کہ وہ تم کو قتل کرینگے۔ اُمیہ بولا ارے کیا مکہ میں۔ سعد نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ امیہ نے کہا خدا کی قسم میں مکہ سے کہیں باہر نکلونگا ہی نہیں۔ اس گفتگو کے بعد جب غزوہ بدر کی نوبت آئی تو ابوجہل نے لوگوں کو جمع کرنا شروع کیا اور یہ تقریر کی۔ تمہارا تجارتی قافلہ روک لیا گیا ہے لوگو! تم اُس کی خبر لو۔ لیکن اُمیہ کو جنگ کے لیے نکلنا سخت ناگوار تھا۔ ابوجہل کو جب یہ احساس ہوا تو وہ اس کے پاس آیا اور سمجھانے لگا۔ ابوصفوان! دیکھیے آپ اس وادی کے سردار ہیں جب لوگ

أُجْهِزَنِي فَقَالَتْ لَهُ يَا أَبَا صَفْوَانَ وَقَدْ نَسِيْتَ مَا قَالَ لَكَ أَخُوكَ الْيَثْرِبِيُّ قَالَ لَا وَمَا أُرِيْدُ أَنْ أَجُوْزَ مَعَهُمْ إِلَّا قَرِيْبًا فَلَمَّا خَرَجَ أُمَيَّةُ أَخَذَ لَا يَنْزِلُ مَنْزِلًا إِلَّا عَقَلَ بَعِيْرَهُ فَلَمْ يَزَلْ بِذٰلِكَ حَتّٰى قَتَلَهُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ ۔ رواه البخاري في باب من يقتل ببدر ۔

اعتقاد القدر لا يمنع ارتكاب الاسباب بل يحث عليها

۹۵۶ عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بَيْنَ رَجُلَيْنِ فَقَالَ الْمَقْضِيُّ عَلَيْهِ لَمَّا أَدْبَرَ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَلُوْمُ عَلَى الْعَجْزِ وَلٰكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَيْسِ فَإِذَا غَلَبَكَ أَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۔ رواه ابو داؤد

آپ ہی کو دیکھینگے کہ آپ جنگ سے ہٹ رہے ہیں تو وہ بھی آپ کے ساتھ ہی رہ جائینگے۔ ابوجہل اس کو برابر سمجھاتا رہا یہاں تک کہ وہ بولا۔ اچھا بھئی جب تم میرا پیچھا چھوڑتے ہی نہیں تو دیکھو میں مکہ میں جو بڑھیا سے بڑھیا اونٹ ہوگا وہ خریدتا ہوں۔ اس کے بعد اپنی بیوی اُم صفوان سے کہا سامانِ سفر تیار کر اُس نے کہا ابوصفوان کیا وہ بات جو تمہارے یثربی بھائی نے تمہارے متعلق کہی تھی بھول گئے ہو۔ ابوصفوان نے کہا نہیں تو مگر میرا ارادہ ان کے ساتھ صرف دو ایک دن ہی رہنے کا ہے۔ یہ انتظام کرکے جب اُمیہ جنگ کے لیے نکلا تو جس پڑاؤ پر ٹھہرتا اپنا اونٹ پاس ہی باندھتا (تاکہ ذرا خطرہ ہو اور اونٹ پر بیٹھ بھاگ لے) یہ انتظامات وہ برابر کرتا رہا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں اس کو ہلاک کیا۔ (بخاری شریف)

قضاء وقدر کا اعتقاد اسباب کے ارتکاب سے نہیں روکتا بلکہ اُس کی ترغیب دیتا ہے

۹۵۶۔ عوف بن مالک روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کے ایک معاملہ میں فیصلہ فرمایا۔ جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا جب وہ پشت پھیر کر چلنے لگا تو اس نے افسوس کے ساتھ کہا حسبی اللہ ونعم الوکیل یعنی مجھے خدا تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سعی و کوشش نہ کرنے پر ملامت کرتا ہے اس لیے ہمیشہ پہلے اپنے معاملات میں دانائی سے کام لیا کر پھر اس کے بعد بھی اگر حالات خلاف ہو جائیں تو اُس وقت حسبی اللہ ونعم الوکیل پڑھا کر۔ (ابوداؤد شریف)

۹۵۶۔ سبحان اللہ تقدیر کا سبق دینے والے تو تدبیر میں ادنیٰ سے تساہل کا نام بھی عجز رکھیں، اس کو نفرت سے دیکھیں اور دانائی و ہوش سے کام لینے کی سخت تاکیدیں فرمائیں اور جب تمام کوششیں پوری کرنے کے بعد بھی گھٹنے ٹک جائیں اس کے بعد اپنی تسلی کے لیے تقدیر کو یاد کرنے کی ہدایت فرمائیں اور لوگ یہ سمجھیں کہ آپ خود گھٹنے توڑ کر بیٹھ رہنے، اسباب کو یکسر معطل کر ڈالنے کے عقیدہ کی تعلیم دے رہے ہیں۔

۹۵۷۔ عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَہٗ ھَوَاھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ

۹۵۸۔ عَنْ نَافِعٍ قَالَ کُنْتُ اُجَھِّزُ اِلَی الشَّامِ وَاِلٰی مِصْرَ فَجَھَّزْتُ اِلَی الْعِرَاقِ فَاَتَیْتُ اِلٰی اُمِّ الْمُؤْمِنِیْنَ عَائِشَۃَ فَقُلْتُ لَھَا یَا اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ کُنْتُ اُجَھِّزُ اِلَی الشَّامِ فَجَھَّزْتُ اِلَی الْعِرَاقِ فَقَالَتْ لَا تَفْعَلْ مَالَکَ وَلِمَتْجَرِکَ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِذَا سَبَّبَ اللّٰہُ لِاَحَدِکُمْ رِزْقًا مِنْ وَجْہٍ فَلَا یَدَعْہُ حَتّٰی یَتَغَیَّرَ لَہٗ اَوْ یَتَنَکَّرَ لَہٗ۔ رواہ احمد وابن ماجہ۔

۹۵۷۔ شداد بن اوس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ درحقیقت دانا شخص وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اپنا تابعدار بنا لیا اور (اپنی موت کے بعد کی زندگی کے لیے سامان کیا اور درماندہ شخص وہ ہے جس نے اپنے نفس کو تو اس کی خواہشات کے تابع رکھا اور اس پر لگا اللہ تعالیٰ سے اُمیدیں باندھے۔ (ترمذی ابن ماجہ)

۹۵۸۔ نافع بیان فرماتے ہیں کہ میں اپنا سامانِ تجارت ملک شام اور مصر کی طرف لیجایا کرتا تھا ایک مرتبہ لیجا کر عراق لے گیا (واپسی میں) حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے ام المومنین پہلے میں اپنا سامان تجارت شام لے جایا کرتا تھا۔ اس مرتبہ عراق لے گیا تھا۔ آپ نے فرمایا آئندہ ایسا مت کرنا آخر تم نے اپنی پہلی تجارت گاہ میں کیا نقصان دیکھا (جو دوسری بدلی) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کی روزی کسی حیلہ سے لگادے تو جب تک وہ صورت خود ہی نہ بدل جائے اس وقت تک اس کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ احمد (ابن ماجہ)

۹۵۷۔ یہ حدیث کہتی ہے کہ جو جدوجہد کے میدان میں سرگرمی دکھا رہا ہے اس کا نام تو دانا ہے اور جو اسباب کیے بغیر بیٹھا ہوا ہے اور اس بے عملی میں پڑا ہوا بڑی بڑی تمناؤں میں پھنسا ہوا ہے اس کا نام متبع نفس اور درماندہ انسان ہے۔ پھر مخالفین کو یہ شبہ کیسے پیدا ہو گیا کہ عقیدۂ تقدیر ہی اُمت مسلمہ کے عملی ضعف کا باعث بنا ہوا ہے اور اسی لیے یہ امت دنیوی ترقیات میں سب سے پیچھے رہ گئی ہے۔ یہاں دنیوی ترقیات میں پیچھے رہ جانا تو صحیح ہے مگر اس کا سبب ہے کیا۔ اس کے جواب میں ہر شخص کا جواب مختلف ہے۔ منکر تقدیر تو تقدیر پر اعتقاد سمجھتا ہے۔ سود خور یہ کہتا ہے کہ سود نہ لینا اس کا سبب ہے۔ کمیونسٹ کہتا ہے کہ اس کسل کا اصل راز مذہب کی افیم کھانا ہے۔ یہاں اسلام بھی کچھ کہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اصل سبب جس کے دامن سے وابستہ ہو کر بام عروج پر پہنچے تھے اسی کو چھوڑ بیٹھنا ہے۔

۹۵۸۔ اس حدیث کو بار بار پڑھنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت اُم المؤمنین نے اس کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ تیری یہ شکایت کرنا ہی غلط ہے تیری قسمت میں اس مرتبہ تھوڑا ہی رزق ہو گا اگر شام جاتا تو بھی تجھ کو تھوڑا ہی نفع ہوتا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ جن ممالک میں تجارت فائدہ بخش ہو چکی ہو اس کو ترک کرنا اسباب ظاہریہ کے بھی خلاف ہے آپ بھی جانتے ہیں کہ آمدورفت کی جگہ آدمی کی معرفت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی تجارتی منافع ہو جاتے ہیں، اجنبی جگہ میں نہ انسان کی معرفت ہوتی ہے نہ وہ تجارتی منافع تو پھر بے وجہ قضا و قدر یا آسمانی کی ضرورت جتنی بات تقدیر کے حق میں ہم پر لازم قرار دی گئی ہے وہ اس پر ایمان رکھنا ہے یعنی یہ سمجھ لینا کہ ہماری ہر نقل و حرکت سب پہلے سے لکھی جا چکی ہے مگر اس طویل دفتر میں سے ہمیں علم ایک شوشہ کا بھی نہیں ہوتا اس لیے عملی طور پر ہم کو صرف صحیح طور پر جدوجہد کرتے رہنے کا ہی مکلف بنایا گیا ہے۔

غور فرمائیے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کس طرح اسباب اور قضا و قدر دونوں کے اسرار لپیٹے ہوئے

٩٥٩۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّا كُنَّا فِيْ دَارٍ كَثُرَ فِيْهَا عَدَدُنَا وَاَمْوَالُنَا فَتَحَوَّلْنَا اِلٰى دَارٍ قَلَّ فِيْهَا عَدَدُنَا وَاَمْوَالُنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَرُوْهَا ذَمِيْمَةً۔ رواہ ابوداؤد

٩٦٠۔ عَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ بَحِيْرٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ مَنْ سَمِعَ فَرْوَةَ بْنِ مُسَيْكٍ يَقُوْلُ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰہِ عِنْدَنَا اَرْضٌ يُقَالُ لَهَا اَبْيَنُ وَهِيَ اَرْضُ رِيْفِنَا وَمِيْرَتِنَا وَاِنَّ وَبَاءَهَا شَدِيْدٌ فَقَالَ دَعْهَا عَنْكَ فَاِنَّ مِنَ الْقَرَفِ التَّلَفُ ۔ رواہ ابوداؤد

٩٥٩۔ انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلے ہم ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس میں ہماری جانوں اور ہمارے مال دونوں میں بڑی برکت ہوئی اب جو دوسرے مکان میں آئے ہیں تو وہاں جان و مال دونوں میں گھاٹا ہو رہا ہے۔ آپ نے فرمایا ایسے خراب کو چھوڑ دو۔ (ابوداؤد)

٩٦٠۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ مجھے ایک ایسے شخص نے اطلاع دی ہے جس نے فروۃ بن مسیک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرتے ہوئے خود سنا ہے کہ یا رسول اللہ ہماری ایک زمین ہے جس کا نام ابین ہے، ہمارے کھانے پینے اور کھیتی کی جگہ وہی ہے لیکن وہاں کی آب و ہوا بہت خراب ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو کیونکہ ایسی جگہ بود و باش رکھنے سے جان کا نقصان ہوتا ہے۔ (ابوداؤد)

ہیں۔ رزق کا معاملہ چونکہ مقدرات میں داخل ہے مگر ہے اپنے اسباب کے ساتھ اس لیے فرماتے ہیں کہ رزق کا سبب ہونا تو ضروری ہے مگر اس کو سبب بنانے والا بھی تو کوئی ہونا چاہیے۔ اب سبب پر تو نظر کرنا اور مسبب سے قطع نظر کرنا یہ کس درجہ ناانصافی اور احسان فراموشی کی بات ہے۔ پھر جب اس نے تمہاری روزی کا کوئی سبب پیدا فرما دیا ہے تو اب اچھی خاصی لگی لگائی روزی پر لات مارنا بھی کتنی ناشکری ہے۔ ناشکری کی جزا ہے یہی کہ دی ہوئی نعمت لے لی جائے۔ حدیث کا ہر ہر جملہ اس کا ثبوت ہے کہ آپ کو جامع الکلم مرحمت ہوئے تھے عمیق حقائق کو اس طرح سادے سادے الفاظ میں پھر اتنی بے تکلفی اور برجستگی سے کہا یہی ایک کمال آپ پر ایمان لانے کے لیے کافی نہیں ہے۔

٩٥٩۔ یہ وہ برکت و نقصان نہیں جو زمانۂ جاہلیت کے قدیم لوگ صرف کسی مکان کا اثر سمجھا کرتے تھے خواہ وہ کتنا ہی بہتر سے بہتر کیوں نہ ہو یا آج بھی جیسا بعض ضعیف الاعتقاد نحوست وغیرہ کے قائل ہو جاتے ہیں بلکہ وہ برکت و نحوست ہے جو مکان کے محل وقوع یا اس کی ناموزونیت یا اس کے تعمیری سقم سے عالم اسباب کے تحت پیدا ہونی ناگزیر ہے۔ قضا و قدر کا اعتقاد یہ تعلیم نہیں دیتا کہ رہائش کے لیے ایسا مکان انتخاب کیا جائے جس میں نہ وسعت ہو نہ ہوا کی آمد و برآمد ہو اور نہ اس کا محل وقوع ہی مناسب ہو انسان کو دنیا میں مختار بنایا گیا ہے اور احکام شرعیہ کا مطالبہ اس کے اسی اختیار کی بنا پر ہے پس جس طرح وہ اچھے اعمال کے کرنے اور برے اعمال کے نہ کرنے کا مکلف بنایا گیا ہے اسی طرح اپنی دنیوی زندگی میں بھی اس کو ان دونوں راہوں کا امتیاز لازم ہے۔

٩٦٠۔ وبائی امراض اچھی آب و ہوا کے ملکوں میں بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کا حکم ان علاقوں سے بالکل علیحدہ ہے جن کی آب و ہوا مستقلاً خراب ہو۔ اس حدیث نے یہ درمیانی راہ تعلیم دی کہ انسان کو نہ تو اتنا ضعیف الاعتقاد ہونا چاہیے کہ اگر اچھی آب و ہوا کے ملک میں اتفاقاً کوئی وبائی مرض آ جائے تو وہاں سے بھاگ پڑے اور نہ اتنا جامد ہونا چاہیے کہ بود و باش ہی ایسے ملک میں رکھے جہاں کی آب و ہوا ہلاکت کا باعث ہو۔ بندہ مختار ہے اور قضا و قدر کے تحت بھی ہے یہاں دونوں اعتقادوں کا ثبوت اس کے عمل سے ظاہر ہونا چاہیے پس خراب آب و ہوا میں بسنا اس کے قدر کے اعتقاد کی پختگی کا ثبوت ہے مگر اس عالم اسباب میں انسانی اختیار کی نفی کرتا ہے اور اچھے مقام سے (باقی بر صفحہ ١٠٦)

۹۶۱۔ عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلطَّاعُونُ رِجْزٌ أُرْسِلَ عَلَى طَائِفَةٍ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَوْ عَلَى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَإِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ فَلَا تَقْدَمُوا عَلَيْهِ وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهُ۔ متفق علیہ

۹۶۲۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيدِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ كَانَ فِي وَفْدِ ثَقِيفٍ رَجُلٌ مَجْذُومٌ فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّا قَدْ بَايَعْنَاكَ فَارْجِعْ رواہ مسلم

۹۶۳۔ عَنْ جَابِرٍ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ فَإِذَا أُصِيبَ

۹۶۱۔ اُسامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طاعون خدا تعالیٰ کا عذاب تھا جو بنی اسرائیل کے کچھ لوگوں پر نازل ہوا تھا (آپ نے یہ لفظ کہے یا) تم سے پیشتر کے لوگوں پر فرمایا لہٰذا جب تم کسی جگہ طاعون سنو تو وہاں نہ جاؤ اور اگر طاعون اس جگہ آجائے جہاں تم رہتے ہو تو طاعون کے خوف سے بھاگ کر بھی نہ جاؤ۔ (متفق علیہ)

۹۶۲۔ عمرو بن شرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وفد (جماعت) ثقیف (قبیلہ کا نام ہے) میں ایک شخص تھا جس کو جذام کا مرض تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کہلا بھیجا۔ ہم نے تجھے بیعت کرلیا ہے لہٰذا وہیں سے واپس چلا جا۔ (مسلم شریف)

۹۶۳۔ جابرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے ہر مرض کے لیے دوا ہے جب کسی

بقیہ ۹۶۰) وبائی امراض میں بھاگ پڑنا صرف اس کے مختار رہنے کا ثبوت ہے مگر قضا و قدر پر اس کے اعتقاد کی نفی کرتا ہے اس عالم اسباب میں اعتدال کی راہ درمیان کی ہے نہ خواب آب و ہوا میں بود و باش رکھو اور نہ اتفاقی وبا سے ڈر کر بھاگ نکلو۔

۹۶۱۔ اس حدیث میں "فراراً منہ" کی قید بہت زیادہ قابل لحاظ ہے۔ وبا زدہ علاقہ سے نکلنا اگر کسی اتفاقیہ ضرورت سے ہو تو وہ ممنوع نہیں جس بات سے روکا گیا ہے وہ بندہ کا ایسا عمل ہے جو قضا و قدر کی تکذیب کرتا ہو۔ طاعون کے خوف سے بھاگنے کا مطلب یہ تھا ہے کہ وہ اپنی اس تدبیر سے یا تو تقدیر الٰہی کو بدل دیگا یا اس کے نزدیک یہ معاملہ قضا و قدر کے تحت ہی نہیں ہے لیکن جس کا اعتقاد یہ ہو کہ اس کی موت و حیات سے لے کر اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت بھی کاتب تقدیر کے قلم کے تحت آچکی ہے اور اس کا اعتقاد بھی ہو کہ کسی صورت میں بھی اس کے خلاف ہو سکتا ہی نہیں وہ وبا زدہ علاقہ سے ڈر کر ہرگز ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ دین اسلام میں اعتقاد کے ساتھ ضرورت، اسباب اور انسانی ضعف کی اس حد تک خود رعایت کرلی ہے جس سے اس کے اعتقاد کی تکذیب لازم نہ آتی ہو۔

۹۶۲۔ فطرۃً کمزور انسان کو اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی اپنے آپ کو آزمائش میں نہ ڈالے۔ وبا زدہ علاقوں میں چلا جا کر نہ بیٹھے جو مریض موذی امراض میں گرفتار ہیں ان کو بلا بلا کر نہ ملائے اعتماد علی التقدیر کے ساتھ اپنی کمزور فطرت کی رعایت بھی ضروری چیز ہے۔ ہاں اگر طاعون اسی کے شہر میں آجائے یا گھر میں ہی کوئی شخص کسی موذی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اب اپنی استقامت کا ثبوت دے اور تقدیر کو یاد کرکے اپنے فطری ضعف کا مقابلہ کرتا ہے۔ چونکہ بہت سے انسانوں کے دلوں میں اختلاط تعدیہ امراض کے اعتقاد کا سبب ہو جاتا ہے اس لیے وجہ شریعت اپنی فطرت کے ساتھ زور آزمائی کی اجازت نہیں دیتی۔ اور جب ضرورت سر پر آجائے تو اب ضعف بشری کے بہانے کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی! اسلام ثبات قدمی کی دعوت دیتا ہے مگر ہوش کے ساتھ صرف جوش کے ساتھ نہیں۔ اسی لیے آپ نے فرمایا ہے لا تمنوا لقاء العدو (دشمن سے جنگ ہو یہ تمنا میں نہ کیا کرو) یہ بڑے فضیلت کی چیز گراتی ہی پر نظر بھی ہے مگر میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے تو پھر کہیں ٹھکانا بھی نہیں اس لیے اس کی تمنا نہ کرو اور جب سر پر آجائے تو پہاڑوں سے بڑھ کر

دَوَاءُ الدَّاءِ بَرَأَ بِإِذْنِ اللّٰهِ تَعَالٰى ۔ رواہ مسلم

۹۶۴ عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ قَالَتِ الْاَعْرَابُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا نَتَدَاوٰى قَالَ نَعَمْ تَدَاوَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً اِلَّا وَضَعَ لَهٗ شِفَاءً اَوْ قَالَ دَوَاءً اِلَّا دَاءً وَاحِدًا فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا هُوَ قَالَ الْهَرَمُ ۔ رواہ احمد وابو داؤد والترمذی وقال ہذا حدیث حسن صحیح

۹۶۵ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَخَوَانِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ اَحَدُهُمَا يَاْتِى النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ يَحْتَرِفُ فَشَكَى الْمُحْتَرِفُ اَخَاهُ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بیاری کے لیے ٹھیک دوا پہنچ جاتی ہے تو خدا تعالیٰ کے حکم سے شفا ہو جاتی ہے۔ (مسلم شریف)

۹۶۴ ۔ اُسامہ بن شریک روایت کرتے ہیں کہ کچھ دیہاتی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ہم بیماریوں کا علاج کیا کریں۔ فرمایا ہاں دوا کا استعمال کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کے لیے دوا پیدا کی ہے مگر صرف ایک بیماری۔ انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کونسی بیماری ہے۔ فرمایا حد سے گزرا ہوا بڑھاپا۔

احمد، ترمذی، ابوداؤد

۹۶۵ ۔ انس بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو بھائی تھے ان میں ایک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر رہا کرتا اور دوسرا تجارت کرتا جو بھائی تجارت کرتا تھا اس نے اپنے بھائی کے

---

۹۶۳ ۔ اس عالم میں بیماری اور اس کی دوا، دونوں قدرت ہی نے پیدا فرمائی ہیں، لہٰذا دوا کا استعمال کرنا تو ضروری ٹھہرا لیکن یہ غلط ہوگا کہ شفا تو شافی مطلق دے اور تم تعریف کرو دوا کی۔ سوچنا یہ چاہیے کہ اس جماد محض میں یہ اثر پیدا کس نے فرمایا۔ کہو اُس نے جس نے بیماری پیدا فرمائی۔ اس جگہ ترجمان السنہ جلد ثانی حدیث ۶۵۶ ص ۲۳۵ کو ضرور ملاحظہ فرما لیجیے۔

۹۶۴ ۔ یہاں دوا کرنے کا صریح حکم ہو رہا ہے، کیا اس کے بعد بھی یہ وسوسہ لانا چاہیے کہ قضاء و قدر اسباب سے تعطل کی تعلیم دیتا ہے مگر کہیں انسان کے قبضہ میں بڑھاپے کی دوا بھی آ جائے تو شاید وہ بڑی جرأت سے قدرت کا انکار کر دے عام بیماریوں کے معالجات پر بھی اب تک اُس نے جتنا قابو پالیا ہے وہی اس کے اعتقاد کو متزلزل بنا رہا ہے اب اگر کہیں بوڑھے بھی جوان بن سکتے کہ خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی دنیا میں ڈٹے رہتے تو خالق کا کون یقین کرتا، اس لیے ہر دروازہ پر شکست دینے کے لیے قدرت کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا لاینحل بنا دیتی ہے جہاں انسان متحیر کھڑا نظر آتا ہے۔ یہاں پہنچ کر نصیب والے کی تو آنکھیں کھل جاتی ہیں اور بدنصیب آئندہ انکشاف کی اُمید میں پھر بھی قدرت الٰہیہ کا قائل ہو کر نہیں دیتا۔

۹۶۵ ۔ تقدیر کے معلم اول نے کبھی کسی کو ایک مرتبہ بھی یہ سبق نہیں دیا کہ وہ کسب معاش چھوڑ کر صرف تقدیر کے بھروسہ پر معطل ہو کر بیٹھ جائے، البتہ جب کہیں یہ دیکھا ہے کہ کسب معاش کا خمار اتنا چڑھ چکا ہے کہ دوسروں کا رزق بھی اپنے ذمہ سمجھ لیا ہے تو اس جگہ اتنی سی تنبیہ کر دینی ضروری سمجھی ہے کہ معاملہ کہیں اس کے برعکس نہ ہو یعنی تمہارا ہی رزق اُس کی بدولت نہ مل رہا ہو۔ یہاں بھی آپ نے اس محترف کو اس کے حرفہ سے نہیں روکا لیکن جب حرفہ پر اعتماد کی یہ نوبت آ گئی کہ جو بھائی علم نبوت کی تحصیل میں مشغول تھا اور اس وجہ سے کسی حرفہ کے کرنے سے معذور تھا اس کی شکایت کی گئی تو اس وقت آپ نے ضروری سمجھا کہ اب اس کے سامنے ایک دوسرا ورق بھی کھول دیا جائے۔ اور فرمایا جیسا ماں کی چھاتیوں میں دودھ بچہ ہی کے مقدر کا اُترتا ہے ایسا ہی کبھی کبھی حرفہ کرنے والے کو بھی کسی غیر محترف کے مقدر کا رزق مل جاتا ہے اس لیے یہ سمجھنا تو صحیح ہے کہ رزق کے لیے کسب کی ضرورت ہے مگر یہ صحیح نہیں کہ جس کا رزق ہو اسی کے لیے کسب کرنا بھی ضروری ہے، بلکہ کبھی کسب کوئی کرتا ہے اور

فَقَالَ لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهٖ ۔ رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث صحیح غریب ۔

الایمان بالقدر من اعظم منابع القوۃ

۹۶۶۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ يَا غُلَامُ اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ وَاِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ

کام میں شرکت نہ کرنے کی آپ سے شکایت کی، آپ نے فرمایا شاید تجھے رزق اسی کے مقدر سے ملتا ہو (ترمذی)

قوتِ ارادیہ کے استحکام میں قضاء و قدر پر اعتقاد کا عجب اثر ہوتا ہے

۹۶۶۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، آپ نے فرمایا اللہ کو یاد رکھا کرو وہ تمہارا نگہباں رہیگا، اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو تو اس کو اس طرح پاؤ گے جیسے وہ تمہارے سامنے موجود ہے۔ جب مانگنا تو خدا تعالیٰ سے ہی مانگنا اور جب مدد طلب کرنا تو اسی سے طلب کرنا اور اس کا یقین رکھنا کہ اگر سارے لوگ مل کر بھی تم کو کچھ نفع پہنچانا چاہیں تو بس اتنا ہی پہنچا سکتے ہیں جتنا کہ وہ تمہاری تقدیر

اس میں رزق کسی کا ہوتا ہے دولت اور کسب کے مابین کیا رشتہ رہنا چاہیے اس حدیث سے اس مسئلہ پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہاں ایک خیال تو یہ ہے کہ کسب کا دولت سے کوئی تعلق ہی نہیں لہٰذا جو کماتا ہے اس کا اپنی کمائی ہوئی دولت میں کوئی حق نہیں ہوتا۔ دوسرا خیال اس کے بالمقابل ہے وہ یہ کہ کسب کا دولت سے اتنا گہرا ربط ہے کہ انسان کی کمائی ہی دولت سرتاسر کمانے والے ہی کی ملکیت ہوتی ہے ایسی ملکیت کہ اس میں کسی غیر کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اسلام کی رائے یہاں کتنی معتدل ہے وہ کہتا ہے کہ کسب سے ملکیت تو ضرور ثابت ہو جاتی ہے آخر کمائی ہوئی دولت اسی کی محنت کا ثمرہ ہے مگر غریبوں کے حقوق واجب اور غیر واجب منضبط اور منتشر اس میں رکھتے ہیں کہ پھر یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سارا کا سارا کمایا ہوا مال خالص اسی کی ملکیت تھا اس لیے اسلام نہ تو امپیریلزم کا حامی ہو سکتا ہے نہ کمیونزم کا وہ اپنا ایک مستقل مقام رکھتا ہے، اس میں یہ لچک نہیں ہے کہ کبھی اس کو اس طرف کھینچ لیا جائے کبھی اُس طرف۔

اس حدیث سے ایک اور بلند نظریہ کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کی مدد کرے تو اس کو یہ سمجھنا زیبا نہیں ہے کہ خود وہ اس کی مدد کر رہا ہے بلکہ یہ تصور کرنا مناسب ہے کہ جو رزق اُس کے پاس اس کے مقدر کا جمع تھا وہ اس نے اس کے حوالہ کر دیا ہے گویا حق بحقدار رسید کا مصداق ہے۔

۹۶۶۔ پہلی جلدوں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اسلام کا اعلیٰ مرتبہ احسان کا ہے یہاں اُسی کو پھر تازہ کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہم سے دور نہیں وہ ہم سے اتنی قریب ہے کہ اگر ہم توجہ کریں تو اس کو اپنے سامنے ہی پائینگے، جو بُعد اور دوری ہے وہ ہماری ہی طرف سے ہے بس حجاب غفلت اٹھا دو پھر قرب در قرب دیکھو گے۔ جب یہ قرب میسر آجائے تو کب مناسب ہوگا کہ ایسے داتا کو چھوڑ کر ہاتھ کسی اور کے سامنے پھیلاؤ، اور ایسے توانا کو چھوڑ کر مدد کسی اور سے مانگو، مگر انسان فطرۃً اتنا کچا ہے کہ سوال کی ذلت اُٹھائے بغیر اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا وہ ایک محتاج مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلائے بغیر باز نہیں آتا اور ذرا سی مشکل

لَكَ وَلَوِ اجْتَمَعُوا عَلٰى اَنْ يَضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ۔ رواہ احمد والترمذی۔

۹۶۷۔ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ قَالَ اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ اَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ وَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَاَ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى الاٰیۃ متفق علیہ وفی مسند عمرؓ عند احمد زاد مسدد قلت ففیم العمل قال لا ینال الا بالعمل قلت اذا نجتهد۔ وفی حدیث ابن عباس عند البزار فقال القوم بعضهم لبعض فالجد اذا وعند

میں پہلے سے لکھ چکا ہے، اور اگر سب مل کر نقصان پہنچانا چاہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر بس اتنا ہی جتنا کہ وہ تمہاری تقدیر میں پہلے لکھ چکا ہے۔ تقدیر کا قلم سب کچھ لکھ لکھا کر کاغذ سے اُٹھا لیا گیا ہے اور تقدیر کے کاغذات کی سیاہی خشک ہو چکی ہے۔ (اب کوئی جدید نوشت وخواند کا موقعہ ہی باقی نہیں) (ترمذی۔ مسند امام احمد)

۹۶۷۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کا ٹھکانا دوزخ میں یا جنت میں لکھا نہ جا چکا ہو۔ صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ تو کیا پھر اس نوشتۂ خداوندی پر بھروسہ کر کے عملی جدوجہد کو ترک نہ کر دیں۔ آپ نے فرمایا عمل کیے جاؤ کیونکہ جو شخص جن اعمال کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے اسی قسم کے اعمال سرزد ہونگے تو جو نیک ہوگا اُسے توفیق ہی نیک کام کی ملیگی اور جو بدبخت ہوگا اس سے کام بھی بدبختی کے لیے جائینگے۔ اس کے بعد آپ نے اس کے ثبوت میں قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى الآیۃ مسند امام احمد میں حضرت عمرؓ کی روایت میں اس طرح ہے کہ عمرؓ فرماتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ جب سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے تو پھر عمل کس لیے ہوا۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ عمل کیے بغیر تو جنت نہیں مل سکتی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر تو ہم عمل میں جان توڑ کوشش کرینگے۔ مسند بزار میں حضرت ابن عباسؓ

ہیں جب کبھی مدد کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو اسی کی طرف اس کی نظریں اُٹھتی ہیں، اس لیے فرمایا کہ اس فطری خامی کا علاج قضاء و قدر کا استحضار ہے بس جب یہ عقیدہ جما لوگے کہ نفع و نقصان پہنچانا جہان بھر میں کسی کے بس کی بات نہیں، اور یہ کہ یہ سارے معاملات طے شدہ ہیں تو تمہارے دل میں اتنی طاقت پیدا ہو جائیگی کہ جب کبھی تم کو کوئی ضرورت ہوگی تو تمہارے ہاتھ صرف اسی کی طرف اٹھینگے جو سارے جہان کو دیتا ہے اور جب کبھی مدد کی ضرورت ہوگی تو صرف اُسی سے مدد مانگوگے جو ہر محتاج کا فریادرس ہے پس قضاء و قدر کا عقیدہ اسباب کے ارتکاب سے بے نیازی کی تعلیم نہیں دیتا، ہاں مخلوق سے بے نیازی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی عملی جدوجہد اب اور بھی بڑھ جانی چاہیے جو انسانوں کا بھروسہ رکھتا ہے وہ بسا اوقات اسباب میں بھی تساہل کر جاتا ہے۔

۹۶۷۔ حیرت ہے کہ جس حدیث کو آج سننے والے سُن کر ترک عمل کا عہد کرتے ہیں اسی کو کل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست سننے والے صحابہ سُن کر جدوجہد کا عہد کر رہے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ حکم کے تابعدار تھے اور ہم عقل کے بندے ہیں۔ عقل نارسا بیچاری

الطبرانی فی اٰخر حدیث سراقة قال الاٰن الجد الاٰن الجد وعند الفریابی بسند صحیح الی بشیر بن کعب احد کبار التابعین قال سأل غلامان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما العمل فیما جفت بہ الاقلام وجرت بہ المقادیر ام شیٔ نستأنفہ قال بل فیما جفت بہ الاقلام قالا ففیم العمل قال اعملوا وکل میسر لما ھو عامل قال فالجد الاٰن . کذا فی فتح الباری ملخصاً منہ

۹۶۸- عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَّاَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ وَفِیْ کُلٍّ خَیْرٌ اِحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُکَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ وَلَا تَعْجِزْ وَاِنْ اَصَابَکَ شَیْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّیْ فَعَلْتُ کَانَ کَذَا وَکَذَا وَلٰکِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰہُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ

کی روایت کے آخر میں ہے کہ مذکورہ بالا سوال وجواب کے بعد صحابیؓ نے فرمایا اب تو کوشش کرنے کے سوا چارۂ کار نہیں اور طبرانی میں حضرت سراقہ کی حدیث کے آخر میں ہے اب تو کوشش کرنی ہے، کوشش کرنی ہے۔ فریابی نے صحیح سند کے ساتھ دو نوجوانوں کا واقعہ ذکر کیا ہے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہی مذکورہ بالا سوال کیا۔ آپ نے فرمایا تمہاری جتنی جد وجہد ہے یہ سب تقدیر کا قلم لکھ کر فارغ ہوچکا ہے۔ اس پر انہوں نے عرض کی پھر عمل کا فائدہ؟ آپ نے فرمایا ہر عمل کرنے والا عمل ہی وہ کرسکیگا جو اس کے لیے مقدر ہوچکا ہے یہ سُن کر انہوں نے کہا تو پھر کوشش کیے بغیر چارۂ کار نہیں۔

۹۶۸- ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مضبوط مومن کمزور سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ پیارا ہوتا ہے اور یوں ہیں دونوں ہی بہتر (یاد رکھو) جو چیز تم کو نفع رساں ہو اس کے لیے حریص بنے رہنا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے مدد مانگا کرنا اور درماندہ بن کر سعی کرنے سے بیٹھ مت رہنا اور اگر کبھی کوئی نقصان ہو جائے تو یہ مت کہنا۔ اگر میں ایسا کرتا تو ایسا ہو جاتا بلکہ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے یونہی مقدر فرمایا تھا۔ لہٰذا جیسا اس نے

دنیا کی معمولی الجھنوں کو سلجھا نہیں سکتی وہ تقدیر کے مسئلہ کو کہاں سمجھتی ہاں جب وہ بھی اسلام قبول کرلیتی ہے تو پھر مسائلِ شرعیہ میں اس کے نزدیک بھی کوئی الجھن الجھن نہیں رہتی، پھر اس میں وہ بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ جتنا اختیار اس کو مل چکا ہے اس کو وہ کام میں لے آنا اپنا فرض سمجھتی ہے اور تقدیر میں ہے کیا اس سے کوئی بحث نہیں کرتی وہ اس کے علم سے بالاتر ہے کس کو یہ خبر ہے کہ فلاں معاملہ میں ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے، جب یہ خبر نہیں تو پھر محسوس اختیار سے کام کیوں نہ لیا جائے۔

۹۶۸- حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اس کے اسماء وصفات کا مظہر بنا رہے۔ مثلاً اس کا اسم مبارک القوی ہے تو وہ یہ پسند کرتا ہے کہ مومن بھی قوی ہو۔ وہ جمیل ہے اس لیے وہ جمال کو بھی پسند فرماتا ہے، وہ علیم ہے اس لیے علماء کو پسند فرماتا ہے، اسی طرح اس کا اسم محسن اور صابر بھی ہے اس لیے وہ محسنین اور صابرین کو بھی پسند فرماتا ہے۔ جو مسئلہ یہاں ہمارے موضوع بحث سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث میں حریص بننے کا حکم دیا گیا ہے۔ حرص کے معنی یہ ہیں کہ جد وجہد کی جو طاقت بندہ میں ودیعت فرمائی گئی ہے اس کو اپنی معاش ومعاد میں ختم کر ڈالنا لیکن یہ حرص کمال اسی وقت شمار ہوگی جبکہ ہو اُن ہی چیزوں میں جو اس کے لیے نفع رساں ہوں پس مومن قوی وہی ہے جس میں حرص کا مادہ موجود ہو اور ہر نیکی میں وہ مسابقت کے لیے تیار رہے۔ وفی ذٰلک فلیتنافس المتنافسون۔ معاصی اور گناہوں پر حرص کرنا انتہائی بڑا عیب بھی ہے۔ چونکہ یہ حرص بھی انسان کے اپنے

فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ ۔ رواہ مسلم

۹۶۹۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ وَلَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ

چاہا تھا اسی کے موافق ہوگیا۔ کیونکہ اس "اگر" کے کلمہ سے آئندہ ایک شیطانی عقیدہ کا دروازہ کھلتا ہے (یعنی تدبیر کی حاکمیت۔ (مسلم شریف)

۹۶۹۔ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو! اب ایسی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہی جو تم کو جنت سے قریب کردے اور دوزخ سے دور کرے مگر ان سب کا میں تم کو حکم دے چکا ہوں اور اسی طرح نہ ایسی کوئی چیز رہ گئی ہے جو دوزخ سے تم کو قریب کردے

بس کی بات نہیں ہے اس لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس بارے میں بھی مدد طلب کرنی چاہیے۔ حدیث کہتی ہے جو شخص مفید اور نافع اعمال میں حریص نہیں وہ عاجز انسان ہے کمال عاجز بن جانے میں نہیں ہے بلکہ کامیابی کے لیے جان توڑ کوشش کرنے میں ہے اور یہ سمجھ کر کرنے میں ہے کہ جو ہمارے مقدر میں لکھا جا چکا ہے ہماری یہ کوشش سب اسی کے لیے ہے بس تدبیر کرنا تو ضروری ہے مگر اس کو حاکم بنا کر نہیں بلکہ تقدیر کا محکوم سمجھ کر۔ اب اگر تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اسباب کر لینے کے بعد بھی مقصد برآری نہ ہو سکی تو یہ کہنے لگنا اگر ہم یوں کرتے تو کامیاب ہو جاتے یہ بھی درحقیقت تقدیر کو تدبیر کا محکوم بنانے کے مرادف ہے۔ اس لیے یہ عبد مؤمن کی شان نہیں، یہ شیطان کی حرکت ہے کیونکہ اب "اگر، اگر" کہنے سے سوائے ندامت، پشیمانی اور افسوس کے ہوتا ہی کیا ہے، جو مقدر تھا وہ تو واقع ہو ہی چکا لہٰذا اب اس دروازہ کو کھولنے سے نفع! ہاں جدوجہد کے بعد بھی جب مقصد حاصل نہ ہو تو اب اس کو قضاء الٰہی کے حوالہ کر دینا یہ مؤمن کی شان ہے اور یہ اس کے لیے باعث تشفی و تسکین بھی ہے پس ظہور نتائج سے قبل تدبیر سے غفلت کا نام تو عجز ہے، اعتماد علی التقدیر نہیں اور نتائج کے خلاف ہونے کی صورت میں اپنی ضعف تدبیر کو یاد کرنا عمل شیطانی ہے اور اس کو تقدیر الٰہی کے سپرد کر دینا یہ شانِ مومن ہے۔ خلاصہ یہ کہ قضاء و قدر اپنی جگہ ہیں اور کسب و اختیار اپنی جگہ، اور شانِ مومن اسی میں ہے کہ کامیابی ہو یا ناکامیابی دونوں حالتوں میں وہ اپنی بندگی اور عبودیت کو قائم رکھے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے معاملات کے لیے پوری جدوجہد کرے پھر اگر نتیجہ موافق برآمد ہو تو اس پر اترائے نہیں اور اگر خلاف ہو جائے تو بے صبری بھی نہ دکھلائے۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا اٰتٰكُمْ (الحدید)

تاکہ اس پر تم غم نہ کھایا کرو جو تم کو حاصل نہ ہو سکا اور نہ اس پر شیخی مارا کرو جو تم کو عطا فرمایا۔

یعنی تقدیر میں ہر چیز کی نوشت موجود ہے اس پر تم کو اس لیے اطلاع بخشی ہے کہ تم خوب سمجھ لو کہ جو تمہارے لیے مقدر ہو چکا ہے وہ ضرور پہنچ کر رہیگا اور جو مقدر نہیں ہوا وہ کبھی ہاتھ نہیں آسکتا جو کچھ اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں ٹھہر چکا ہے بس ویسا ہی ہو کر رہیگا لہٰذا جب فائدہ کی چیز ہاتھ نہ لگے اس پر غمگین و مضطرب نہ ہو اور جو مقدر سے ہاتھ لگ جائے اس پر اکڑو اور اتراؤ نہیں، بلکہ مصیبت و ناکامی میں صبر و تسلیم اور راحت و کامیابی میں شکر سے کام لو۔

۹۶۹۔ اس حدیث میں عالم غیب کے چند مہم اسباق کی تعلیم دی گئی ہے۔ پہلا یہ ہے کہ انسان کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ مرنے کے بعد دفعۃً جنت یا دوزخ میں پہنچ جاتا ہے بلکہ اپنے عملی مساعی کے لحاظ سے کبھی وہ اس طرف قریب ہو جاتا ہے کبھی اس طرف پس زندگی کیا ہے وہ دوزخ و جنت کی مسافت کا نام ہے جتنا وہ ختم ہوتی ہے اتنا ہی وہ ایک طرف کا راستہ طے کر لیتا ہے ہر چند کہ اصل مدار تو خاتمہ ہی پر رکھا گیا ہے لیکن ایک مومن قانت کو اپنے اوقات و اعمال کا محاسبہ ہمہ وقت لازم ہے کہ وہ اپنی عمر میں کتنا کس طرف قریب ہو رہا ہے، جتنا وہ جس طرف بھی قریب ہو گیا بظاہر امید یہی ہوتی ہے کہ بقیہ عمر میں بھی وہ اسی سمت کی

وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَإِنَّ الرُّوحَ الْأَمِينَ وَفِي رِوَايَةٍ إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوعِي إِنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا أَلَا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ أَنْ تَطْلُبُوهُ بِمَعَاصِي اللَّهِ فَإِنَّهُ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللَّهِ إِلَّا بِطَاعَتِهِ. رواه فی شرح السنۃ والبیہقی فی شعب الایمان۔

اور جنت سے دور کریں تم کو اس سے بھی روک چکا ہوں اور حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نے ابھی میرے قلب میں یہ بات ڈالی ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنا مقدر رزق پورا نہیں کرلیتا وہ ہرگز مر نہیں سکتا۔ دیکھو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور رزق حاصل کرنے میں صاف ستھرے طریقے اختیار کرو، ایسا نہ ہو کہ رزق کی ذرا سی تاخیر تم کو خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ کردے، کیونکہ تمہارا رزق خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور جو چیز اس کے قبضہ میں ہو وہ صرف اس کی فرمانبرداری ہی کرکے حاصل کی جاسکتی ہے۔

(شرح السنۃ۔ شعب الایمان)

بقیہ مسافت طے کریگا لہٰذا زندگی کا ہر قدم بہت پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہے کسی جگہ سے قریب ہوکر پھر دفعتہً دور ہو جانا بڑا مشکل کام ہے۔ اس لیے عموماً جس حالت میں بھی عمر گزرتی ہے اسی پر خاتمہ بھی ہو جاتا ہے گو کبھی کبھی اس کے خلاف بھی پیش آجاتا ہے۔

دوسری بات اہم یہ ہے کہ انسان عبث ایسی چیز کے پیچھے لگا رہتا ہے جو خود اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے یعنی رزق۔ انسانی مقدرات میں جہاں اور باتیں لکھی جاتی ہیں اس کے مقدر کا رزق بھی لکھا جاتا ہے، پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کو پورا کیے بغیر وہ سفر آخرت کر سکے۔ تیسری بات اہم تر یہ ہے کہ انسان رزق کی ہوس میں یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ حلال ذریعہ سے رزق تھوڑا حاصل ہوتا ہے، اور حرام ذرائع سے زیادہ اس لیے حرام ذرائع اختیار کرلیتا ہے، حدیث اس کو سمجھاتی ہے کہ تمام مخلوق کا رزق رزاق کے پاس ہے۔ جب یہ ہے تو پھر جس کے ہاتھ میں رزق ہو تم اس کی مخالفت کو کیسے رزق کا ذریعہ سمجھ لیتے ہو۔ چہارم یہاں کسب حلال پر اتنا ہی زور دیا گیا ہے جتنا کہ تقویٰ کی تحصیل پر۔ حلال کے بارے میں جدوجہد کرنا اور حرام سے بچنے کی تقدیر گویا در کھنا اسلامی معیشت کے لیے سہل ترین نسخہ ہے۔

الانبیاء والرسل علیہم الصلوٰۃ والسلام

فی ضوء الاحادیث والتاریخ

حضرات انبیاء علیہم السلام کی مقدس ہستیوں کا مختصر تذکرہ احادیث و تاریخ کی روشنی میں

اس مقدس گروہ کے تذکرہ سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ کے سامنے نبوت اور رسالت کے متعلق قدیم عقلاء کے خیالات کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس مسئلہ میں جو قیاس آرائیاں آج کیجا رہی ہیں یہ زمانہ قدیم کے وہی فرسودہ خیالات ہیں کوئی جدید تحقیق نہیں ہے۔

متاخرین علماء میں سے حافظ ابن تیمیہؒ نے اس مسئلہ پر مبسوط بحثیں کی ہیں ان کی دیگر تصانیف کے سوا، شرح عقیدۃ الاصفہانیہ" اور "الجواب الصحیح" میں بھی اس پر کافی بحث ہے اور "کتاب النبوات" تو اس موضوع پر ان کی ایک مستقل تصنیف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قدیم عقلاء میں سے ارسطو اور اس کے متبعین تو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے کچھ آشنائی نہیں رکھتے تھے اس لیے اُن کے یہاں تو نبوت اور رسالت کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ملتا، البتہ فارابی نے اس پر کچھ بحث کی ہے۔ پھر ابن سینا نے آکر اس کی مزید تشریح و تفصیل کی ہے اس کے نزدیک نبی کے تین خاصے ہوتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا مقام ابن سینا کی نظر میں

(۱) نبی وہ ہوتا ہے جس کی قوت عقلیہ اتنی کامل ہو کہ کسی سے سیکھے بغیر اس کو خود بخود علم حاصل ہو جائے، اس کا نام اس نے قوت قدسیہ رکھا ہے۔

(۲) نبی اپنے علم کے مطابق خود اپنے نفس میں کچھ نورانی صورتیں دیکھتا ہے اور مختلف نوع کی آوازیں بھی سُنتا ہے مگر خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ عام انسان خواب کی حالت میں مختلف صورتیں مشاہدہ کرتے اور مختلف آوازیں سُنتے ہیں مگر یہاں بھی خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ گو نبی کو محسوس یہی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ خارجی عالم میں ہو رہا ہے، جیسا کہ خواب دیکھنے والا شخص بھی اپنے مرئیات اور مسموعات کے متعلق عقیدہ یہی رکھتا ہے کہ یہ سب کچھ وہ خارجی عالم میں دیکھ رہا ہے۔ ابن سینا کے نزدیک اسی مسموع صوت کا نام کلام اللہ ہے۔ والعیاذ باللہ۔ خلاصہ یہ کہ ابن سینا کے نزدیک نبی کے مبصرات و محسوسات کی حقیقت وہ ٹھہری جو عالم رویا کے مبصرات و محسوسات کی ہوتی ہے نہ وہ بالکل بے حقیقت ہیں نہ بے حقیقت ہیں۔ مگر خارجی عالم میں دونوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا (والعیاذ باللہ)

(۳) نبی کو عالم کے مادہ میں تصرف کرنے کی فطری طاقت حاصل ہوتی ہے اور اس فطری طاقت سے ہی وہ عجیب عجیب افعال کی قدرت رکھتا ہے، اسی کا نام معجزہ ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک اس مادی عالم میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے یہ سب انسانی قوت نفسیہ یا قوت طبعیہ یا عقل فعال کا فیض ہے۔ شیاطین اور فرشتوں کی یہ جماعت قائل ہی نہ تھی کہ عالم کے تصرفات کو اُن کی طرف منسوب کر سکتی۔ ہنود اور تُرک شیاطین و جنات کے قائل تھے، ان کے نزدیک یہ تصرفات جنات کے تصرفات تھے۔

فلاسفہ کے نزدیک نبوت کیوں کسبی چیز تھی

جب ان کے نزدیک نبوت، کلام اللہ، معجزہ اور فرشتے کی حقیقت یہ ٹھہری تو ظاہر ہے کہ یہ تمام امور کسب انسانی اور ریاضت سے بھی حاصل ہونا ممکن ہیں، اس لیے ان کے نزدیک نبوت و رسالت بھی دیگر صنعتوں کی طرح کسبی چیز تھی۔ سہروردی مقتول اور ابن سبعین اسی جد وجہد میں مصروف تھے کہ ان کو نبوت کا مقام حاصل ہو جائے۔ اسی لیے ان فلاسفہ کے نزدیک ایک فلسفی کو نبی پر فوقیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ فلسفی کی نظر بہ نسبت نبی کے بہ براہِ حقیقت ہوتی ہے۔ (والعیاذ باللہ)

اسلامی الفاظ و اصطلاحات کا صرف استعمال کرنا کافی نہیں جب تک قرآن کی اُس حقیقت کا اعتراف بھی نہ ہو جو اسلام نے بیان کی ہے

نبوت کے متعلق فلاسفہ کی اصل تحقیق تو یہ تھی لیکن جب اسلامی دور میں فلاسفہ کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات پہنچیں تو انہوں نے اُن کے اور فلاسفۂ قدیم کے علوم کے مابین پیوند لگانا چاہا اور اسلامی اصطلاحات یعنی وحی، نبوت، فرشتہ، قیامت، جنت اور دوزخ وغیرہ کو اپنے تراشیدہ معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اب جس کو اس حقیقت کا تنبہ نہ ہوا وہ تو اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا کہ شاید یہ جماعت بھی ان سب امور کی قائل تھی۔ جن کے انبیاء علیہم السلام قائل تھے۔ مثلاً جب اُنھوں نے ابن سینا کے کلام میں نبوت، معجزہ وغیرہ کے الفاظ دیکھے تو یہ خیال قائم کر لیا کہ شاید ابن سینا بھی ان سب اُمور کا قائل تھا لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ ان الفاظ کی حقیقت اس کے نزدیک وہ نہیں جو انبیاء علیہم السلام کے نزدیک تھی تو پھر محض ان الفاظ کے استعمال کر لینے سے اس کو اسلامی تعلیمات کا حامل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ یہ بھی ثابت نہ کر دیا جائے کہ ان الفاظ کی حقیقتیں بھی اس کے نزدیک وہی تھیں جو ادیانِ سماویہ کے نزدیک مسلم تھیں[1]۔

[1] مثلاً ختم نبوت اور نزول مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ ہمیشہ سے امت مسلمہ میں تواتر کے ساتھ مستعمل ہوتے چلے آئے ہیں لیکن ہمیشہ ان کا یہی ایک مفہوم سمجھا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بنفس نفیس خود آسمان سے اپنے اسی جسم عنصری کے ساتھ تشریف لانے والے ہیں اور کبھی اس کا یہ مفہوم نہیں سمجھا گیا کہ اُن کا کوئی معنوی نظیر یا مشابہ شخص اسی اُمت میں سے پیدا ہوگا۔ اسی طرح ختم نبوت کا مفہوم بھی صرف یہی سمجھا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی جدید نبوت کا کوئی امکان نہیں ہے، خواہ وہ کسی قسم اور کسی مرتبہ ہی کی کیوں نہ ہو، ظلی ہو یا بروزی اور صفحات تاریخ نے بھی ہمیشہ اسی کی تائید کی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر آج تک جب کبھی کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو آپ نے اور آپ کے بعد ہمیشہ امت مسلمہ نے اس کو کاذبین اور دجالین کی فہرست میں شمار کیا ہے جیسا کہ مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی (باقی بر صفحہ ۱۱۵

(باقی بر صفحہ ۱۱۵

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ ہمارے دَور کے عقلاء نبوت کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہتے ہیں؟ یہاں ابن سینا اور اس کے ہمنواؤں کی کل کائنات تو یہ تھی اب آپ ذرا علوم نبوت سے روشن دماغوں کی بات بھی سُنیے

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں نبوت کی حقیقت اور اس کے ارکان ثلاثہ یعنی ملوکیت و سیاست، علم و حکمت اور رشد و ہدایت کی فطری اور غیر معمولی استعداد

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم نبی اور اس کے خواص جاننا چاہتے ہو تو یوں سمجھو کہ حیات انسانی کے نظم و نسق کے لیے جن جن صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بیک وقت نبی کی ذات میں تمام انسانوں سے بڑھ کر پیدا فرمائی جاتی ہیں وہ ایک بادشاہ کی طرح ہوتا ہے جس کے نفس ناطقہ کی قوت عاقلہ اور قوت عاملہ کے سایہ کے نیچے اہل قلم بھی، بڑے بڑے جرنیل اور سیاست داں بھی، کاشتکار اور تاجر بھی غرض تمام عالم اپنی اپنی زندگی کے مطابق تربیت حاصل کرتا ہے اور ہر ہر شعبہ کا نظام اس کے اقوال و افعال کے دم سے قائم رہتا ہے۔ وہ اسی کے ساتھ ایک حکیم بھی ہوتا ہے جو علم اخلاق و تدبیر منزل اور سیاست مدن کا ماہر ہو، وہ حکیم نہیں جو صرف ان علوم کے الفاظ سے آشنا ہو بلکہ وہ حکیم جس کی یہ تمام صفات طبیعت ثانیہ بن چکی ہوں حتیٰ کہ اس کے حرکات و سکنات سے یہ علوم ٹپکتے نظر آرہے ہوں۔ وہ ایک مرشد کامل بھی ہوتا ہے جو جماعت صوفیاء میں مصدر کرامات و خوارق بنا ہوا ہو اور طاعات و عبادات کے ان تمام طریقوں سے آگاہ ہو جو تہذیب نفس کے لیے ضروری ہیں اور ان علوم حقہ کا ماہر ہو جن سے کہ انسانوں پر عالم ملک و ملکوت کے اسرار نہاں روشن ہوتے ہیں اور اسی طرح اعمال جوارح اور اذکار لسانی کے علیحدہ علیحدہ تمام خواص سے بھی پورا پورا آشنا ہو۔ وہ جس طرح کہ آسمانوں پر حضرت جبرئیل علیہ السلام تدبیر الٰہی کا جارحہ اور علوم الٰہی اخذ کرتے ہیں واسطہ ہیں اسی طرح انسانوں میں ان تمام صفات جبرئیلیہ کا مالک بھی ہو حتیٰ کہ لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون یعنی فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اس بات میں جس کا وہ ان کو حکم دیتا ہے اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے، اس کی شان بن چکی ہو اور اس

(بقیہ صفحہ ۱۱۴) کی تاریخ سے ظاہر ہے۔ اور اگر زمانہ کے دستور کے مطابق کبھی کسی قلیل جماعت نے اس کی تصدیق کی بھی ہو تو ہمیشہ تاریخ نے اس کو مسلمانوں کی عام جماعت سے علیحدہ شمار کیا ہے اور اس جماعت کا ہمیشہ ایک جداگانہ لقب کے ساتھ علیحدہ تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے اگر کوئی جماعت صرف نزول مسیح علیہ السلام اور ختم نبوت کا لفظ تو استعمال کرتی ہے مگر ان معنوں سے نہیں جن میں کہ عام مسلمان ان کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں تو محض ان الفاظ کے استعمال کر لینے سے اس کو عام مسلمانوں کی جماعت میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے جیسا کہ صرف جنت و دوزخ، نبوت اور معجزات کے الفاظ استعمال کرنے والے فلاسفہ کو صرف ان الفاظ کے استعمال کرنے سے مسلمانوں کے عقائد سے متفق نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ ان الفاظ کا استعمال ان ہی معنوں میں کرتے ہیں جن میں کہ عام مسلمان ان کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ کیا نصاریٰ اور ہنود بھی توحید کا اقرار نہیں کرتے، مگر کیا صرف لفظ توحید کے استعمال کر لینے سے ان کو اسلامی توحید کا معتقد کہا جا سکتا ہے اس لیے اس نکتہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان و اسلام کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان حقائق کو انہی معنوں میں مانا جائے جن میں کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں میں مسلم رہے ہیں، صرف اسمی الفاظ کی نقالی بے سود ہے۔

طرح اس کی فطرت کو عالم بالا سے وہ مناسبت حاصل ہو کہ علوم الٰہیہ اور یقین واطمینان کی نعمت اس کے قلب و قالب پر بسیرہی ہو اور اس کے یہ سب کمالات اس میں فطری ہوں کسی معلم اور درس گاہ کے رہین منت نہ ہوں نبی کے ان علوم، اس کی حکمت، اس کے تزکیہ اور اس کے اس نظامی لیاقت کی طرف جس سے کہ وہ ان صفات کے اثرات خدا تعالیٰ کی مخلوق میں پھیلاتا ہے، ذیل کی آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

ھوالذی بعث فی الامیین رسولا	یہ خدا ہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں ایک رسول پیدا فرمایا
منھم یتلوا علیھم اٰیٰتہ ویزکیھم	جو خود انہی میں کا ہے پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں
ویعلمھم الکتب والحکمۃ وان کانوا	اور ان کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے کتاب اور عقلمندی کی باتیں اور
من قبل لفی ضلال مبین۔ (جمعہ)	اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اب آپ آیت بالا کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کا ایک ورق ملاحظہ فرمائیے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ اہم خدمت امیوں میں کس حکمت سے شروع کی گئی اور کس تدبیر و تدبر سے پایۂ تکمیل کو پہنچی جس دور میں آپ تشریف لائے اس وقت ضلالت وظلمت کی حالت کیا تھی؟ عبادت میں شرک کرنا اُن کا دین بن چکا تھا، قیامت کا وہ انکار کرتے تھے اور ملت حنیفیہ کی صورت انہوں نے بالکل مسخ کر ڈالی تھی پھر آپ نے تشریف لا کر کیا کیا؟ عبادات میں سے شرک کی رسم مٹا دی، قیامت کا وجود ثابت کیا اور ملت حنیفیہ کو تحریفات سے پاک کر کے پھر سر نو اس کو اصل بنیادوں پر راست فرمادیا۔ اس پر جب عرب کے عوام وخواص نے آپ کی مخالفت کی تو آخر کار جہاد کی طاقت سے اس کو دبا دیا چھوٹی چھوٹی بے سروسامان جماعت کو لے کر جرار لشکروں کا مقابلہ کیا، مگر تائید ربانی سے فتح وکامرانی آپ کے حصہ میں آئی اور شکست وہزیمت کفار کا حصہ رہا۔ اور ان میں ایسے علوم کے دریا بہا دیئے جن سے کہ وہ اس سے قبل قطعاً آشنا نہ تھے یعنی علم قرآن، علم ایمان یعنی ارکان پنجگانہ اسلام وغیرہ۔ علم معاد یعنی احوال برزخ وحشر ونشر وجنت ودوزخ علم احسان جس کو آج کی اصطلاح میں حقیقت اور معرفت کہا جاتا ہے۔ علم شرائع وتدبیر منزل وسیاست مدن وطریق معاش، علم اخلاق، علم آلطب، علم فتن یعنی آئندہ واقعات وحوادث کے متعلق خبریں، علم فضائل اعمال، علم مناقب پھر ان علوم کو اس خوبی سے مشرح بیان کیا کہ تھوڑی سی مدت میں قوم کی قوم کا وہ طبعی مذاق بن گئے اور خورد وکلاں، ذکی وغبی میں کوئی ایسا نہ رہا جس کے دل ودماغ میں وہ نقش کالحجر نہ بن گئے حتیٰ کہ جو آپ کی بعثت سے قبل صحرانشین بدو تھے وہ اب مقربین بارگاہ صمدیت اور دنیا کے حکمراں نظر آنے لگے۔ نبوت جیسی نعمت کی حقیقت اور اس کی برکات کا اسی سے کچھ اندازہ کر لینا چاہیے۔ (قرۃ العینین۔ ص ۱۴۱ و ۱۴۲)

میں کہتا ہوں کہ اسلامی دور کے اس آخری فلسفی نے جو کچھ اپنی علمی زبان اور اصطلاحی الفاظ میں بیان بیان

فرمایا ہے اگر اس کا لُبِّ لباب فنی اصلاحات کی قید و بند سے آزاد ہو کر انتہائی سادگی اور مؤثر الفاظ میں آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ تقریر پڑھ لیجیے جو حضرت جعفر طیار (رضی اللہ تعالیٰ) نے شاہ حبشہ کے سامنے فرمائی تھی انہوں نے بڑی خوبی کے ساتھ نبوت کے ان تمام خواص کی طرف اشارہ فرمادیا ہے جس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے مذکورۂ بالا بیان میں فرمائی ہے۔

تعلیمات نبوت کے متعلق ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعلیمات کے متعلق کج فہموں کو ہمیشہ سے یہ مغالطہ رہا ہے کہ اُن کا تعلق صرف ایک ایسی غیر محسوس حیات کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے جس کے وجود میں بھی مادی عقول بہت سے شکوک و شبہات رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک گویا مذہبی تعلیمات کا تعلق اگر ہے تو صرف قبر، حشر و نشر اور مابعد الموت زندگی کے مسائل کی حد تک ہے دنیوی نظم و نسق کے ساتھ اس کا کوئی محکم رشتہ ثابت نہیں۔ اِدھر عالمِ غیب اور اس کے علوم سے چونکہ مادی عقول بالکل خالی ہوتی ہیں اس لیے وہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعلیمات کے لیے کوئی بلند مقام تجویز کرنے سے قاصر رہتی ہیں لیکن دوسری طرف مذہب کا رشتہ اس پر ان کو مجبور کرتا ہے کہ ان کی برتری کو چار و ناچار تسلیم کیا جائے اس کشمکش کی وجہ سے ان کو ایسی توجیہات کرنی پڑتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی صداقت و امانت اور فہم و دانائی بھی اپنی جگہ مسلّم رہے اور پھر مادی عقول کو ان کی کوئی خاص فوقیت بھی تسلیم کرنی نہ پڑے۔

اس لیے اسلامی دور کے فلاسفہ نے تو ان کی قوت عقلیہ اور قوت عملیہ کی برتری کا اعتراف کر کے یہ سمجھ لیا کہ بس اتنی بات سے انہوں نے مقام نبوت کا حق ادا کر دیا مگر اسی کے ساتھ ان کے علوم کی حیثیت ایک خوابیدہ شخص کے منامات کی برابر قرار دے کر ان کو ایسا بے وقعت بنا یا کہ حقیقت کی دنیا میں وہ از اول تا آخر لاعنی بن کر رہ گئیں۔ والعیاذ باللہ۔

تعجب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی قوت عقلیہ اور عملیہ کی عام برتری تسلیم کر لینے کے بعد ان کے مدرکات کی حقیقت اتنی بے حقیقت بنا دینا کونسی عقل اور کیا فلسفہ کی بات ہے۔ اگر آج یہی حیثیت ڈارون، ہٹلر اور لینن کے علوم کی قرار دیدی جائے تو شاید اس شخص کو مخبوط الحواس سمجھا جائے، حالانکہ اگر ان کے فلسفوں پر غور کیا جائے تو وہ بھی ابتدا میں نامعقول بات ہی سمجھے جاتے تھے ہٹلر کی ساحرانہ کرشمہ سازیاں، لینن کی اشتراکیت اور مذہب کشی اور ڈارون کا فلسفۂ ارتقاء بھلا کس شخص کے ذہن میں آنے والی باتیں تھیں لیکن کیا کچھ عرصہ بعد ہی پھر وہی ایک دنیا کا دین و مذہب نہیں بن گئیں! اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو آج پھر اس سے نا آشنا دماغوں کو بعید از عقل نظر آرہی ہیں، مگر کیا عہدِ ماضی کے عقلاء نے اس کی معقولیت کا اعتراف نہیں کیا اور کیا آج بھی مذہبی دنیا کا بڑا حصہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ اگر آپ

ان کے لائے ہوئے آئین پر کبھی نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس میں ملوکیت سے لے کر دنیا کے ادنیٰ سے ادنیٰ معاملات کے متعلق پوری پوری ہدایات موجود ہیں اس میں صرف عقائد و عبادات کا باب نہیں بلکہ بیع و شرا، ہبہ و عاریہ، رہن و شفعہ، نکاح و طلاق، وصیت و وراثت غرضکہ جملہ معاملات و تعزیرات حتیٰ کہ صلح و جنگ کے قوانین بھی پوری روشنی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس میں تہذیب اسماء اور تہذیب الفاظ کے ابواب تک بھی ہیں۔ غرض کھانے پینے، سونے جاگنے اور ہنسنے بولنے جیسی معمولی اشیاء کے متعلق بھی تمام اہم ہدایات ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ منافقوں نے طعن کے طریق پر کہا کہ تمہارا نبی تم کو سب ہی باتیں سکھاتا ہے حتیٰ کہ پیشاب و پاخانہ کا طریقہ بھی۔ اس پر صحابہؓ نے کیا اچھا جواب دیا ہے۔ جی ہاں، وہ ہمیں ان جیسی معمولی باتوں کے متعلق بھی ہدایات دیتے ہیں مگر سنو گے تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ کتنی عمیق اور ضروری ہوتی ہیں یہاں آپ کی ہدایت یہ ہے کہ اس حالت میں قبلہ کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھو، اپنی شرمگاہ کو دایاں ہاتھ نہ لگاؤ اور تین بار سے کم ڈھیلے کا استعمال نہ کرو وغیرہ اگر ہم اس کی شرح کریں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ حیات انسانی کے ہر ہر شعبہ کے متعلق اسلامی آئین میں کتنی مکمل اور کتنی ضروری ہدایات موجود ہیں۔ حدیث و تفسیر اور فقہ کا مطبوعہ ذخیرہ آج کتب خانوں کی شکل میں آپ کے سامنے ہے بلکہ اس کا کچھ حصہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہو چکا ہے۔ اگر عملی لحاظ سے دیکھنا ہو تو قرآن شریف اٹھا کر پڑھ لیجیے، آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ ملوک دنیا کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی بحث و نظر اور جنگی معرکوں کی سرگرمیوں کا نقشہ کیا تھا یعنی کیا وہ صرف ایک معلم کی حیثیت رکھتے تھے یا عمل کے ہر میدان میں سب سے پیش پیش نظر آتے تھے۔ صحیح حدیثوں میں تو آج کل کی اصطلاح کا لفظ سیاست بھی انبیاء علیہم السلام کی شان میں موجود ہے۔ کانت بنو اسرائیل تسوسہم الانبیاء الخ یعنی بنی اسرائیل کی سیاست اور نظم و نسق کیے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام چلایا کرتے تھے۔ میں چونکہ خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں اس لیے میری اُمت کا نظم و نسق خلفاء کے حوالہ ہو گیا ہے۔ (دیکھو ترجمان السنۃ ج ۱ ص)

ان واضح حقائق کے ہوتے ہوئے اس بے وجہ غلط فہمی کا کوئی موقعہ تو نہ تھا کہ نبوت کا رشتہ مادی دنیا کے ساتھ کچھ نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام صرف ایک خیالی عالم کے مالک ہوتے ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مذکورہ بالا بیان میں بڑی خوبی کے ساتھ اس خیال کی تردید کر دی گئی ہے۔ انہوں نے قرآن کریم سے انبیاء علیہم السلام کی ان صفات پر روشنی ڈالی ہے جن کے انبیاء علیہم السلام حامل ہوتے ہیں، اور تاریخ سے یہ ثابت کیا ہے کہ حقیقت کی دنیا میں ان صفات کے اثرات کیا نکل چکے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کی ذرا اور تفصیل کر دیں تاکہ پورے طور پر اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے اور انبیاء علیہم السلام کا صحیح صحیح تعارف ہو جائے۔

نبوت کے ارکان ثلاثہ کی مزید تشریح

حضرت شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں کہ دنیوی انسان تو حیات انسانی کے صرف ایک ایک شعبہ کی ہدایت کرتے ہیں اور وہ بھی ناتمام اور انبیاء علیہم السلام انسانی زندگی کے ہر ہر شعبہ کے متعلق ہدایات فرماتے ہیں اور وہ بھی انتہا درجہ مکمل گویا عالم کو اپنے نظام کے لیے جن مختلف قابلیتوں کے مختلف انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام قابلیتیں بیک وقت اعلیٰ سے اعلیٰ طریق پر تنہا ایک نبی میں موجود ہوتی ہیں یہاں سب سے پہلے بادشاہی اور ملوکیت کی صفت کو لے لیجیے اور اسی صفت میں شاہان دنیا کے ساتھ اس مقدس گروہ کا مقابلہ کر لیجیے۔

مقدمہ
ہر شے کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت گر اعتبار حقیقت کا ہے اور کمال مجموعہ میں ہے۔

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جس طرح کہ ہر چیز کے لیے اس کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت۔ مثلاً انسان اس کی ایک خاص صورت ہے اور اسی طرح انسانیت کی چند مخصوص صفات بھی ہیں جو اس کی حقیقت کہلاتی ہیں مکمل انسان وہ ہے جو ان دونوں کا جامع ہو۔ صورت بھی انسان کی رکھتا ہو اور خواص وصفات بھی اسی کی رکھتا ہو۔ بندر میں صرف انسان کی سی صورت تو ہے مگر چونکہ وہ انسانی صفات سے بالکل معریٰ ہے اس لیے کوئی اس کو انسان نہیں کہتا۔ اسی طرح اگر کسی انسان میں ہیکل انسانی تو ہو مگر انسانیت کی صفات ناقص ہوں تو فوراً اس کی انسانیت پر نقصان کا حکم لگا دیا جاتا ہے۔ ایک بیوقوف کو آپ گدھا اور لڑاکو شخص کو بھیڑیا کہہ دیتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اس کی صورت گو انسان کی نظر آتی ہے مگر اس میں کسی ایک انسانی صفت کی کمی ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ جب آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اصل اعتبار صورت کا نہیں بلکہ حقیقت کا ہے اگر کسی کی حقیقت انسان کی ہے، پھر اس کی صورت میں خواہ کتنا ہی نقص کیوں نظر نہ آئے مگر اس کا شمار انسانوں ہی کے زمرہ میں رہتا ہے، لیکن اس کے برخلاف اگر کسی میں انسان کی حقیقت ہی نہ ہو تو صرف اس کی صورت کے انسانی صورت ہونے سے کوئی اس کو انسانوں میں شمار نہیں کرتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اصل اعتبار حقیقت کا ہے۔ ہاں مکمل انسان وہی کہا جائیگا جس میں صورت اور سیرت دونوں جمع ہوں۔ اس فرق کو کسی شاعر نے کیا اچھے انداز میں ادا کیا ہے، وہ کہتا ہے:

نالۂ من صورتے بگرفت طبل ساختند لختہائے دل بیک جا جمع شد گل ساختند

یعنی دنیا جس کو بلبل شوریدہ کہتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے! میرا نالہ وفغاں قدرت نے اس حقیقت کو بلبل کی صورت عطا کر دی ہے۔ اسی طرح جس کو دنیا گل کہتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے! میرے پارہائے جگر۔ قدرت نے انہی کو گل کی صورت پہنا دی ہے۔

ملوکیت کی صورت اور اس کی حقیقت

اسی طرح آپ بادشاہی کو بھی سمجھ لیجیے۔ اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت

اُس کی حقیقت پر غور فرمائیے تو یہ صفات ہیں:۔

معاشی، معاشرتی، تمدنی انتظامات ملک کی اندرونی و بیرونی حفاظت، رعایا کی تعلیم و تربیت کے پورے نظم و نسق کی پوری استعداد و قابلیت، اولوالعزمی، بہادری و فیاضی، عدل و انصاف، دلسوزی و ہمدردی اور عام اخلاق کی برتری اور ان صفات کے ساتھ اُس کے نمایاں اوصاف یہ بھی ہیں مثلاً طبعی نخوت و تکبر، تعیش و تلذذ اور تنعم و تکلف وغیرہ۔ اس کی ظاہری صورت دیکھیے تو یہ ہے۔ جاہ و جلال، شان و شوکت، تخت و تاج، دولت و خزانہ فوج و لشکر، محل و قلعہ، داد و دہش۔ یعنی انعام میں تبذیر و اسراف اور انتقام میں ظلم و تعدی وغیرہ

پس اگر ایک انسان تاج و تخت کا تو مالک ہو مگر ملوکیت کے معنوی اوصاف میں کورا ہو تو دنیا اس کو بادشاہ نہیں کہتی وہ صرف صورت کا بادشاہ ہے حقیقت میں وہ ایک قزاق، لٹیرا اور نفس پرور انسان سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی میں یہ اوصاف مذکورہ تو ہوں مگر وہ تخت و تاج کا مالک نہ ہو تو دنیا اس کو بھی بادشاہ نہیں کہتی مگر ان دونوں میں جو سیرت ملوکیت کا مالک ہوتا ہے وہ اپنی درویشی میں بھی بادشاہ کہلاتا ہے، اس کی حکومت جسموں سے تجاوز کرکے مخلوق کی جانوں تک ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جو صرف ظاہری صورت ملوکیت رکھتا ہے اس کی حکومت صرف جسموں تک محدود رہتی ہے، لوگوں کے قلوب اس پر لعنت کرتے ہیں اور عزت کی بجائے اس کو ذلیل ترین انسان شمار کرتے ہیں۔

ملوکیت نبوت کی صورت و حقیقت

اب اس معیار سے آپ انبیاء علیہم السلام کو دیکھیں اور صرف اعتقاد کی روشنی میں نہیں بلکہ تاریخ اور واقعات کی روشنی میں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ بہترین صفاتِ ملوکیت کے حامل ہوتے ہیں اور اسی طرح اُن میں ملوکیت کی صحیح صورت بھی موجود ہوتی ہے۔ دیکھیے جب دنیا میں وہ آتے ہیں تو اُس وقت دنیا کے عام اخلاق، ان کا عام تمدن ان کی زندگی کا عام نظم و نسق، ان کی عام تعلیم و تربیت کا عالم کیا ہوتا ہے؟ رہا عالم قدس سے اُن کا تعلق تو اس جگہ ہم اس کا تذکرہ ہی نہیں کرتے۔ پہلے یہاں اس پر نظر کیجیے کہ جب اس ماحول میں رسول آئیں تو عقلاً رسولوں کو کن صفات کا ہونا چاہیے۔ پھر یہ دیکھیے کہ وہ ہوتے ہیں کن صفات کے۔ اسی کے ساتھ اس پر بھی نظر رکھیے کہ یہ صفات ان میں کسبی اور تعلیم کا ثمرہ ہوتی ہیں یا محض فطری اور قدرتی، پھر وہ بھی کس اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں۔ ان کی اولوالعزمی اور فیاضی ان کا عدل و انصاف اور اُن کی عام ہمدردی کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ وہ صدق و امانت میں کیا مقام رکھتے ہیں، اُن کا کیرکٹر کیسا ہوتا ہے؟ اگر یہ تمام صفات اُن میں بادشاہوں بلکہ شہنشاہوں جیسی موجود نظر آتی ہیں تو عقل و انصاف کی روشنی میں آپ کو یہ حکم لگانا ہوگا کہ وہ یقیناً بادشاہ سیرت ہوتے ہیں۔ اب اگر اس کے ساتھ اُن میں بادشاہی کی صورت بھی موجود ہو تو پھر اُن کے مکمل بادشاہ ہونے میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس معیار پر ہم سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا چاہتے

ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ملوکیت اور بادشاہی کے جتنے اوصاف حمیدہ عقل تصور کر سکتی ہے وہ سب آپ کی ذات ستودہ صفات میں اعلیٰ مرتبہ کے جمع تھے۔ عرب کے بگڑے ہوئے نظام میں آپ تشریف لائے جہاں تعلیم کا دور دور تک پتہ نہ تھا، قوم اتنی درشت اور جنگجو جس کی انتہا نہیں، عادات و اطوار اتنے بگڑے ہوئے کہ خدا کی پناہ، اخلاق اتنے گرے ہوئے کہ العظمۃ للہ، ملک میں وہ بدامنی کہ انسانوں کا جینا مشکل، تمدنی نظم و نسق کی اتنی ابتری کہ ہر فرد خود مختار اور بادشاہ، جہالت کی یہ نوبت کہ بھنگی شراب خواری و حرامکاری باعث ناز و افتخار اور قتل و غارت ان کی شرافت کا معیار۔

ایسے پست ماحول میں آپ کا ظہور ہوا تو آپ کن صفات کے مالک تھے، کسی سے تعلیم حاصل کی تھی یا فطرتاً ممتاز صفات رکھتے تھے، کسی شاہی خاندان سے متعلق تھے یا صرف ایک شریف گھرانے کے نونہال تھے ان سب باتوں کا جواب اگر سننا ہو تو ہرقل و ابوسفیان کی زبانی سُن لیجیے جس میں دونوں غیر مسلم ہیں۔ پھر ایک شہنشاہ ہے اور دوسرا اپنی قوم کا دانا سردار۔ تاریخ کی روشنی میں یہ بات طے شدہ ہے کہ آپ عقل و ہنر، علم و دانائی، تہذیب و اخلاق، عدل و انصاف، شجاعت و سخاوت اور جملہ ملوکیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ صفات کے مالک تھے جو ملک بھی آپ کی زیر تعلیم آگیا اس کی کایا پلٹ گئی اور وہ انسانیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر جا پہنچا۔ عرب کی تاریخ آپ کی بعثت سے قبل اور بعد کی ملا کر دیکھ لیجیے، تو آپ کو یوں معلوم ہوگا کہ وہ ایک ایسی قوم بن گئے تھے جو صفحات عالم پر گویا اب پہلی بار نمودار ہو رہی ہے ان کے اوضاع و اطوار بدل چکے ہیں وہ اب قتل و غارت کی زندگی کے بجائے امن کے شہزادے اور سارے جہان کے لیے پیغام سلامتی بن چکے ہیں، حرام و حلال کی تمیز کرنا معروف و منکر کو پہچاننا، عہد و پیمان کا پورا پابند رہنا، معاملات میں دوست و دشمن کو ایک نظر سے دیکھنا اور انسانوں کو چھوڑ کر خدا کی بے زبان مخلوق یعنی حیوانات کے ساتھ بھی بے رحمی سے اجتناب رکھنا ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے عفت و پاکبازی، حیا و غیرت، صلہ رحمی اور عام خلق اللہ کی ہمدردی ان کی فطرت کا جزو ٹھہر چکی ہے۔ وہ جس ملک میں نکل گئے ہیں وہ ملک اُن کا گرویدہ بن گیا ہے آخر وہ نوبت بھی آگئی ہے جبکہ دشمن اہل کتاب نے ان کو دیکھا تو بیساختہ بول اٹھے ہیں کہ یہ امت وہی امت ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے سے اپنی کتابوں میں پڑھتے چلے آئے ہیں اور کسی جنگ کے بغیر اپنا ملک ان کے حوالہ کر دیا ہے اتنے عظیم پھر اس سرعت کے ساتھ انقلاب اور وہ بھی اتنے پائیدار انقلاب کی تاریخ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتی کیا آپ کی شاہانہ قابلیتوں کے لیے اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور ثبوت درکار ہے۔

اب اگر ملوکیت کی ظاہری صورت پر نظر کیجیے تو یہاں بھی جاہ و جلال، شان و شوکت میں کوئی کمی نظر نہیں آتی بلکہ آپ کے رعب و ہیبت کا جو عالم یہاں نظر آتا ہے اُس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ دشمنوں کے قلوب دور دور سے ہی آپ سے سہمے ہوئے رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ نے جن مخصوص صفات سے مجھ کو نوازا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میرا رعب بے سروسامانی میں بھی ایک ماہ کی مسافت سے دشمن کے دل پر پڑتا ہے

ابوسفیان جب زمانۂ جاہلیت میں ہرقل کے دربار سے واپس آئے ہیں تو باہر آکر اُن کا جو احساس تھا وہ اُنھوں نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے" انہ یخافہ ملک بنی الاصفر" یعنی مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور غالب ہو کر رہینگے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ ان سے توشاہ روم تک خائف ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب اہل مکہ نے عروہ بن مسعود کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تو اُنھوں نے آپ کی محفل کو دیکھ کر اپنے تأثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا تھا وہ یہ تھے۔

"اے قریش میں نے شاہ حبش، شاہ قسطنطنیہ اور شاہ ایران کے دربار دیکھے لیکن کوئی بادشاہ ایسا نظر نہیں آیا جس کی عظمت اس کے درباروالوں کے دلوں میں ایسی ہو جیسی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابیوں کے دلوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھوکتے ہیں تو ان کا لعاب دہن زمین پر گرنے سے پہلے لوگ اس کو ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ پر مل لیتے ہیں۔ جب وہ کسی بات کا حکم دیتے ہیں تو سب اس کی تعمیل کےلیے دوڑ پڑتے ہیں، ان کے دل میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتنا ادب واحترام ہے کہ وہ ان کے دربار میں نظر اُٹھا کر دیکھ نہیں سکتے"

رہی آپ کی فوج ولشکر اور اس کا نظم ونسق تو وہ بھی تاریخوں میں موجود ہے، آلات حرب کی فراہمی اور ان کی حفاظت کے حالات، فوجی راشن اور اس کے تقسیم کے انتظامات بھی سب سیرت کی کتابوں میں مدون ہیں۔ آپ کے دربار میں شاہانہ داد ودہش اور انعام واکرام کا حال بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے لیکن جس طرح انبیاء علیہم السلام کی ملوکیت کی سیرت میں شاہان دنیا کے بعض اجزاء نظر نہیں آتے اسی طرح ان کی ملوکیت کی صورت میں بھی اس کے کچھ نمایاں اجزاء نہیں ملتے، ان کی شاہانہ سیرت میں نخوت وتکبر کی بجائے تواضع وانکسار تعیش وتلذذ کی بجائے جفاکشی وتعب اور تکلف وتنعم کی بجائے انتہادرجہ سادگی اور بے تکلفی ہوتی ہے، اسی طرح اس کی صورت میں بھی تخت وتاج دولت وخزانہ اور شاہانہ محل سرائے کا نام ونشان نہیں ملتا اور ان کی اس انوکھی ملوکیت کی وجہ سے ہی تاریخ نہ توان کو ملوک دنیا کی فہرست میں شمار کرسکتی ہے اور نہ اس سے پورے طور پر انکار ہی کی قدرت رکھتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی اس بلند شخصیت کا اگر آپ کو اندازہ ہو جائے تو آپ اس حقیقت کو باور کرلیں کہ وہ دنیا میں جو نظام حیات لے کر آئے ہیں اُس سے بڑھ کر کوئی دوسرا نظام ممکن ہی نہیں ہے۔ کاش ملوکیت کا جو تصور اسلام نے دنیا کے سامنے رکھا ہے اگر دنیا اس کو محفوظ رکھتی تو یقین کیجیے کہ آج امپیرلزم اور کمیونزم کی یہ عالمگیر اور بھیانک جنگ دنیا کے کسی خطہ میں آپ کو نظر نہ آتی۔ اور اگر آج بھی اس پر غور کرلیا جائے تو دنیا کو پھر اس جنگ زرگری سے نجات مل سکتی ہے۔

ملوکیت نبوت کا اہم رکن عالم غیب سے اس کا رشتہ ہے

انبیاء علیہم السلام کی ملوکیت کی حقیقت اگر صرف اسی حد تک جا کر ختم ہو جاتی تو یقیناً مادی عقول کے لیے ملوکیت کے اس تصور سے بڑھ کر کوئی دوسرا تصور نہ ہوتا لیکن یہاں ملوکیت کی

حقیقت میں جس اہم جزر کا وہ آکر اضافہ فرماتے ہیں بس وہی اُن کے لیے نقطۂ اختلاف بن جاتا ہے یعنی عالم غیب کے ساتھ اُن کا رشتہ اور وہ بھی اس شد و مد کے ساتھ کہ سطحی نظروں کو یہ متوہم ہونے لگتا ہے کہ مادی نظام کے ساتھ ان کا رشتہ گویا کٹ چکا ہے۔ وہ اپنی کسی حالت میں بھی اس رشتہ سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ وہ چلتے ہیں تو عالم غیب ان کے سامنے ہوتا ہے، نماز پڑھتے ہیں تو عالم غیب ان کے سامنے ہوتا ہے، حتیٰ کہ جب سو جاتے ہیں تو بھی بیداری کی طرح عالم غیب ان کے سامنے ہی رہتا ہے، اسی لیے اُن کے خواب کو بھی وحی کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ عالم غیب میں کبھی خود جا کر اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور کبھی خود عالم غیب ان کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ اگر چاہیں تو اس کے باغات کے پھل توڑ کر لوگوں کے حوالہ کر دیں اور اس طرح عالم شہادت میں عالم غیب کی گویا وہ ایک مجسم دلیل ہوتے ہیں۔ جس نے ان کو دیکھ لیا گویا اس نے پورے عالم غیب کو دیکھ لیا یہی سبب ہے کہ جو ان کا منکر ہو گیا وہ عالم غیب کا بھی منکر ہو گیا، اور جو اُن کا معتقد ہو گیا وہ عالم غیب کا بھی معتقد بن گیا۔ اس لیے اُن کی ملوکیت بھی تمام تر عالم غیب سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ دشمنوں کی سازشوں کی اطلاعات مخلصین صحابۂ کرام سے پہلے ان کو خدا تعالیٰ کے فرشتے بلکہ خود اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق سے ہو جاتی ہے آپ کی حیات میں دشمنوں نے کتنی سازشیں خفیہ در خفیہ کیں مگر یہاں دیکھا تو آپ کو پہلے سے ان کی اطلاع مل چکی تھی ایک بار یہود نے آپ کو کھانے میں زہر دیا، آپ نے فوراً ان کو بلا کر پوچھا بتاؤ تم نے کھانے میں زہر ملایا ہے اُنہوں نے اس کا اعتراف کیا مگر حیرت زدہ ہو کر پوچھا آپ کو یہ راز بتایا کس نے؟ آپ نے اسی کھانے میں سے بکری کا دست اُٹھا کر فرمایا۔ اس نے۔ پس یہاں گھر، باہر، دوست و دشمن کی بہت سی خبریں ظاہری انتظام سے پہلے ہی اُن کو عالم غیب سے مل جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں آپ کے ایک خانگی معاملہ کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ایک واقعہ کے متعلق آپ کی بیوی صاحبہ نے اپنی ایک رازدارانہ گفتگو پر آپ کو خبردار دیکھ کر تعجب سے پوچھا "من انباک ہذا" یا رسول اللہ بھلا یہ تو بتا دیجیے کہ اتنی پوشیدہ بات کی اطلاع آپ کو دی کس نے۔ آپ نے فرمایا" نبانی العلیم الخبیر" اس نے جس سے بڑھ کر نہ کوئی جاننے والا ہے اور نہ کوئی خبر رکھنے والا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تو قرآن کریم میں ایک معجزہ ہی یہ موجود ہے کہ تم لوگ جو اپنے گھروں میں کھاتے پیتے اور جمع کر کے رکھتے ہو وہ سب میں جانتا ہوں، اس لیے یہ کیسے ممکن ہو کہ ان کی ملوکیت کا رشتہ کسی جگہ بھی عالم غیب سے کٹ جائے۔ ان کے نزدیک ان کی ملوکیت کی حقیقت قوت تنفیذ سے ایک ذرہ آگے نہیں ہوتی، اپنی ذاتی حکومت کا وہ کوئی تصور ہی نہیں رکھتے اور جو آئین وہ لے کر آتے ہیں وہ کسی انسان کا ساختہ پرداختہ نہیں ہوتا۔ وہ یہ اعلان کر کر کے کہتے ہیں کہ جس آئین کی ہم تم کو دعوت دیتے ہیں وہ آئین خود خالق کائنات ہی کا بنایا ہوا ہے، ہم اس میں ایک شعشہ کا نہ اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ اس میں ذرا سی کمی کر سکتے ہیں۔ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ (یونس) کہہ دو کہ میرا تو یہ مقدور نہیں کہ میں

اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کا ردوبدل کروں بلکہ اس پر عمل کرنے میں خدا تعالیٰ کی دوسری تمام مخلوق کے ساتھ ہم بھی شریک ہیں وہ اپنے غیبی رشتہ کو صرف عقیدہ کی حد تک نہیں رکھتے بلکہ بدر و حنین کے میدانوں میں اس کا تجربہ بھی کرا دیتے ہیں اور علی الاعلان کہتے ہیں۔ اب بتاؤ فتح و نصرت تمہاری قلت و کثرت پر منحصر ہے؟ یا خالق کائنات کی غیبی مدد پر۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (انفال)	فتح تو اللہ کی طرف سے ہے، بیشک اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔

اور اسی غیبی رشتہ کے اعتماد پر اپنی بے سروسامان فوج لے کر دنیا کی بڑی سے بڑی حکومت سے بھڑ جاتے ہیں اور اس کا وسوسہ بھی نہیں لاتے کہ فتح ان کو نہیں ہوگی، وہ تن تنہا کھڑے ہو کر بڑی بے جگری کے ساتھ اپنے پروگرام کا اعلان کر دیتے ہیں اور یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ہم تنہا نہیں ہیں، ہماری پشت پر خالق کائنات کی غیبی مگر حقیقی طاقت موجود ہے، اس لیے تم جو بھی کر سکتے ہو کر کے دیکھ لو۔

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ	پس تم اور تمہارے شریک سب مل کر اپنی ایک بات ٹھہرا لو تمہاری وہ
اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَ	تم میں کسی پر مخفی نہ رہے (تاکہ سب اس کی تکمیل میں شریک ہو سکیں)
لَا تُنْظِرُوْنِ۔ (یونس)	پھر جو کچھ تم کو کرنا ہے، میرے ساتھ کر گزرو اور مجھ کو مہلت نہ دو۔

وہ دشمن کے مقابلہ میں جب صف آرا ہوتے ہیں تو اپنی فوج کو بینڈ کی بجائے ذکر اللہ کا ترانہ گانے کا حکم دیتے ہیں اور اُن کی نظر ظاہری سازوسامان ہونے کے باوجود دعاؤں کے بم اور ملائکۃ اللہ کی ایٹمی طاقت پر زیادہ لگی رہتی ہے اسی لیے عین حالتِ جنگ میں بھی وہ نمازوں کو اپنے اوقات سے موخر نہیں کرتے گو وہ اس حالت میں اپنی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھنا بھی لازم سمجھتے ہیں۔ ان کی جنگ کا مقصد صرف قتل و غارت اور اقتدار و ملکیت نہیں ہوتا وہ اس نازک موقعہ پر بھی مجرم اور غیر مجرم کی تمیز رکھتے ہیں اور یہ ہدایت کرتے ہیں۔ کسی بچہ کو قتل نہ کیا جائے کسی عورت پر ہاتھ نہ ڈالا جائے، جو شخص خدائی حکومت کا اقرار کرے اس سے فوراً درگزر کر دیا جائے۔ جو مال دشمن سے حاصل ہو اس کو اپنی ملکیت نہ سمجھا جائے، جو ملک قبضہ میں آئے اس کے باشندوں کے ساتھ عادلانہ سلوک کیا جائے۔ عام ملکی حقوق جان و مال کی حفاظت میں ملکی اور غیر ملکی کا کوئی امتیاز نہ رکھا جائے، کافر ذمی مسلمان پر اسی نوعیت کے ساتھ سُنا جائے جیسا مسلمان کا کافر پر اور یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ ملک دراصل اللہ تعالیٰ کا ہے، ہماری جنگ و صلح بھی اسی کے حکم کے تابع ہے، وہ خالق کائنات ہے اس لیے جو حقوق کائنات کی بقاء کا موجب ہیں اس میں مساوات رکھی جائیگی۔ دوست و دشمن، کافر و مسلم کے درمیان کھرے امتیاز کا دن فردائے قیامت ہے۔ ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔ یعنی ہماری موت و

حیات تک کا اصل مقصد بھی صرف رضاءِ الٰہی ہو۔ بس اسی نقطہ پر پہنچ کر ملوکیت اور نبوت کی راہیں علیحدہ علیحدہ پھٹ جاتی ہیں۔ ملوکیت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ مُلک اس کا ہو، مِلک اس کی ہو، آئین اُس کا ہو، دولت و خزانہ اس کا ہو، قوت اس کی ہو، اور اختیار و اقتدار تمام تر اس کا ہو۔ اس کے برعکس نبوت کا اعلان یہ ہے کہ مُلک اس کا ہے نہ مِلک اس کی نہ آئین اس کا ہے، نہ حکومت و اقتدار اس کا۔ دولت و خزانہ اور طاقت و اختیار جو کچھ بھی ہے وہ سب مالک علی الاطلاق کی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی بادشاہت کا نام حاکم اور مُلک کی بجائے خلیفہ رکھتی ہے یعنی اس کی جانب سے ایک مقرر شدہ نائب اور بس۔ ان کے سامنے بس یہی ایک پروگرام ہوتا ہے کہ وہ خدائی آئین کو اس کی پیدا کردہ مخلوق میں پوری جد و جہد کے ساتھ نافذ کردیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے طویل و عریض سلسلہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملوکیت کی ظاہری شان و شوکت کا تذکرہ خود قرآنی اوراق میں موجود ہے، مگر اس کی حقیقت بھی قدم قدم پر خلافت سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتی، وہ اس اقتدار اور حکومت کے بعد بھی ہر ہر موقعہ پر یہی اعلان کرتے رہے کہ میں ایک نائب کی حیثیت سے زیادہ کچھ نہیں ہوں۔ نصب العین میرا بھی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جو دیگر انبیاء علیہم السلام کا تھا یعنی احکام الٰہیہ کی تنفیذ۔

ملوکیت نبوت کی حقیقت خلافت ہے

مادی عقول اس غیبی رشتہ کا ادراک نہیں کرتیں، اس لیے وہ ہر موقعہ پر رسولوں کا یہ رشتہ منقطع کردیتی ہیں اور وہ خلافت کی بجائے انسان کو خود مستقل مالک و حاکم کی حیثیت دے دینا معقول بات سمجھتی ہیں حالانکہ اگر انصاف کے ساتھ غور کیا جائے تو ملوکیت کی صحیح حقیقت اگر ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہو سکتی ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام کی ذات میں نظر آتی ہے اور صرف اسی کی نظام عالم کو ضرورت بھی ہے۔ اس سے زیادہ ملوکیت کا جو تصور مادی عقول نے تراش لیا ہے نہ تو اس کی کوئی حقیقت ہے اور نہ نظامِ عالم کو اس کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کو اپنی مستقل مالکیت و حاکمیت کا دعویٰ کرنا حقیقت کی نظر میں کتنا خلاف واقعہ ہے پھر اس پر آئین سازی اور اختیارِ مطلق کے جو شاخسانے اس نے اور لگا لیے ہیں وہ اور بھی زیادہ مضحکہ خیز ہیں۔ اور ان بے حقیقت خیالات کی نظام عالم کو کوئی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ عالم میں فتنہ و فساد کی جڑ ملوکیت کا یہی مادی تخیل ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی مملکت بھی گو ظاہر میں کتنے ہی اقتدار و حکومت کی مالک ہو مگر اس کی زیر دست رعایا کے قلوب پر بھی اس کا سکہ نہیں جمتا اور اسی لیے ہمیشہ دنیوی بادشاہوں کو اپنے گرد و پیش سے خطرات لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ ایک نہ ایک دن صفحۂ ہستی سے ان کو نابود ہو جانا پڑ جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام جس ملوکیت کے حامل ہوتے ہیں اس میں چونکہ انسانی فلاح و بہبود کے سوا کوئی تخیل ہی نہیں ہوتا وہ اپنی مالکیت و حکومت کا کوئی دعویٰ ہی نہیں رکھتے اس لیے فطرتِ انسانی کو ان سے ٹکرانے کا موقعہ ہی نہیں ہوتا، اور اس لیے ان کی محبت اور محبت

کے ساتھ عقیدت بھی دلوں میں اُترتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ ان کی محفل کا نقشہ وہ بن جاتا ہے جو ابھی عروہ بن مسعود کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں اور اسی لیے ان کی عقیدت میں حیات اور بعد حیات کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قلوب جس طرح ان کی حیات میں ان کا انتہائی درجہ احترام کرتے ہیں اُن کی وفات کے بعد بھی ان کے احترام کے لیے اُتنے ہی مضطر رہتے ہیں۔ اس مقام سے یہ بات بھی حل ہوگئی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ اتنی والہانہ محبت اور عقیدت کیوں تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ محض بے سمجھے سوچے آپ پر فدا ہو گئے تھے بلکہ وہ آپ کی ذات مبارک میں جاذبیت کے جو متفرق سامان متعدد انسانوں میں جمع ہو سکتے تھے وہ یہاں بیک وقت زیادہ سے زیادہ جمع دیکھتے تھے وہ تجربہ کر کر کے دیکھ چکے تھے کہ رسول خدا کی ذات میں ان کی خیرخواہی خود ان کی اپنی جانوں سے زیادہ موجود ہے۔ اس لیے بادشاہ، والد، محسن اور ان کے علاوہ محبت کے جتنے رشتے تصور میں آسکتے ہیں وہ سب کے ساتھ آپ میں جمع ہو گئے تھے سچ پوچھیے تو اُن کی محبت وادب کا جو نقشہ عروہ بن مسعود نے اپنے الفاظ میں ادا کیا تھا وہ بھی ناتمام تھا۔

نبوت کے لیے قدرت جن نفوس کا انتخاب کرتی ہے اُن میں اعلیٰ قابلیتیں بھی ودیعت فرما دیتی ہے

اور اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ یہ شاہانہ حکومت انبیاء علیہم السلام کے یونہی حوالہ نہیں کی جاتی بلکہ اس نوع کی حکومت اور شاہی کی قابلیت جو کہ صرف اُن ہی میں پیدا کی جاتی ہے اس لیے خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق میں صرف وہی اس کے اہل ہوتے ہیں کہ خدائی حکومت کا نازک اور اہم منصب ان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اسی لیے مقام نبوت کا انتخاب انسانوں کے سپرد نہیں کیا جاتا بلکہ جو خالق کائنات ہے وہی خود ان کا انتخاب فرماتا ہے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (الحج)	اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے بعض کو اپنے احکام پہنچانے کے لیے انتخاب فرما لیتا ہے اور اسی طرح بعض کو آدمیوں میں سے بھی۔

اگر تاریخی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کا یہ جوہر استعداد دیکھنا ہو تو سورۂ یوسف اٹھا کر پڑھ لیجیے۔ کس طرح فوطی فار فرعون کی فوج کے سردار نے پہلے غلام سمجھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا پھر تجربہ کے بعد کس طرح اپنی سلطنت کا نظم ونسق سب اُن کے حوالہ کر دیا حسب بیان تورات اُن کے حسن انتظام سے فوطی فار کی آمدنی دگنی ہوگئی تھی۔ (پیدائش ۳۹: ۴)

کون باور کر سکتا ہے کہ اگر انبیاء میں یہ جوہر استعداد نہ ہوتا تو جو کل زرخرید غلام نظر آرہا تھا وہ بہت تھوڑی سی مدت میں مصر کے تاج وتخت کا مالک نظر آسکتا تھا، بالخصوص جبکہ وہ اپنے گھرانے کی جدھر ہوا تو اس کے ماحول کی زندگی بدویانہ زندگی تھی اور جہاں کہ اُس نے زمام حکومت سنبھالی وہ انتہا درجہ پر متمدن ملک تھا۔ اُسی خدا نے آخر میں پھر ایک صحرانشین ہی کو پیدا فرمایا اور فارس وروم جیسی متمدن حکومتیں سب اس کے زیر نگیں کر دیں۔ کیا اب بھی کوئی یہ شبہ کر سکتا ہے کہ انبیاء

علیہم السلام میں ملوکیت کا جوہر نہیں ہوتا۔

آدم علیہ السلام کی سرگزشت میں اسی حقیقت پر ایک اہم تنبیہ

اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آدم علیہ السلام کی خلافت اور ملائکۃ اللہ کی سرگزشت کا جگہ جگہ تذکرہ فرمایا گیا ہے اور خوب واضح کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو زمین کی خلافت صرف یونہی سپرد نہیں کر دی گئی تھی بلکہ قدرت نے پہلے سے ان میں وہ اعلیٰ جوہر بھی ودیعت فرما دیے تھے جو خدائی خلافت اور نیابت کے لیے ہونے چاہئیں۔ اور اسی لیے زیر حکومت آنے والی اشیاء کی تعلیم خاص طور پر ان ہی کو دی گئی تھی۔ تعجب کی بات ہے کہ ملائکۃ اللہ ہزار اپنی تسبیح و تقدیس کا بڑے عجز و نیاز کے ساتھ اظہار کرتے رہے مگر قدرت

آدم علیہ السلام اور ملائکۃ اللہ میں مقابلہ کا امتحان اور اس کا نتیجہ

کا فیصلہ پھر ان کے خلاف ہی رہا۔ یہ اس لیے کہ دنیا کو یہ سبق ملے کہ اسلامی حکومت یا خلافت میں سب سے پہلے صلاحیت و قابلیت کو جانچا جاتا ہے، صرف مصلیٰ اور تسبیح کی فضیلت سے ملک حوالہ نہیں کر دیا جاتا۔ اس قابلیت کے فقدان کی وجہ سے خلافت تو درکنار اشیاء کے اسماء کی بھی ان کو تعلیم نہیں دی گئی۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصب نبوت ملا اور ان کو معلوم ہوا کہ سب سے پہلے ان کو فرعون کا مقابلہ کرنا ہے۔ ایسے بد دماغ کو یہ بات سمجھانی کہ تو نہ حقیقی مالک ہو سکتا ہے، نہ حقیقی ملک۔ کتنی فصاحت لسانی کا محتاج ہے، ادھر میری زبان میں لکنت ہو تو ان کی نظر بھی اسی طرف گئی اور انہوں نے یہ درخواست پیش کی کہ اگر مجھے ایک فصیح البیان وزیر بھی مددگار کے طور پر عنایت ہو جائے تو میرے کام میں بہت سہولت پیدا ہو جائے پھر جب اس اُمت کا دور آیا تو یہاں بھی خلافت کے وقت ابوذرؓ جیسے زاہد کی طرف کسی کی نظر نہ اٹھی بلکہ اس سے بڑھ کر حضرت علیؓ کی قرابت کی طرف بھی اس وقت نظریں نہ گئیں۔ معلوم ہوا کہ دنیوی خلافت ہو یا اُخروی ہر جگہ قابلیت و صلاحیت کی رعایت انبیاء علیہم السلام نے بھی سب سے مقدم رکھی ہے، ان کے خلفاء نے بھی اور خود خالق کائنات نے بھی۔ پھر یہ خیال کس قدر سفیہانہ خیال ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت کے لیے صرف تسبیح و تہجد کی تلاش ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو زمین کی خلافت حضرت آدم علیہ السلام کی بجائے سب سے پہلے فرشتوں کے سپرد کی جاتی مگر یہاں بتانا یہی تھا کہ خلافت کے لیے تسبیح و تقدیس سے زیادہ نظامی قابلیت کا ہونا ضروری ہے۔ بھلا جو مخلوق اپنی زیر حکومت اشیاء کے ناموں تک سے ناآشنا ہو وہ ان کی ضروریات کی رعایت کیا کر سکتی ہے، اور ان کا نظم و نسق کیا چلا سکتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب کسی منصب کے لیے دنیا میں اس کی قابلیت کا ہونا ضروری ہو اور اس کے لیے مقابلہ کا امتحان بھی لازم سمجھا جائے تو جس کے قبضہ میں قابلیتوں کی آفرینش ہے وہ قابلیت اور امتحان مقابلہ کے بغیر صرف یونہی اپنی نیابت کا اہم منصب آدم علیہ السلام کے سپرد کر دیتا۔ بیشک حکومت کے لیے جہاں صرف تسبیح و تہجد کو دیکھا نہیں جائیگا وہاں یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ جو نیابت کے فرائض ہی سے ناآشنا ہو اور حکومتِ الٰہیہ کی بجائے خود اپنے تراشیدہ قوانین نافذ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ خدا تعالیٰ

کی زمین اس کے حوالہ کردی جائے۔ دنیا کی تاریخ میں جب کبھی ایسا ہوا ہے تو خدا تعالیٰ کی زمین ہمیشہ طغیان و سرکشی اور شر و فساد سے بھر گئی ہے، لہٰذا اسلامی حکومت کے لیے وہی شانِ جامعیت درکار ہے جس کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے کلام میں ذکر ہو چکا ہے۔

ہمارے مذکورۂ بالا بیان سے یہ مغالطہ بھی دور ہو جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اس غیبی رشتہ کا مطلب یہ ہے کہ مادی نظام ان کی نظروں میں بالکل معطل ہوتا ہے۔ علل و اسباب ظاہری کا قدرتی نظام سب بیکار ہوتا ہے اور اب حصول مقاصد کے لیے صرف دعاؤں اور خدا تعالیٰ کے مقدس فرشتوں کا انتظار کرنا چاہیے۔ نہیں نہیں، مادی نظام کی رعایت، مادہ پرستوں سے کم یہاں بھی نہیں ہوتی مگر یہاں اس کو صرف اسباب و علل ظاہری کی حد تک ہی سمجھا جاتا ہے، مؤثر حقیقی نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے لشکر کی صف آرائی بھی ہوگی جس سمت سے دشمن کا خطرہ ہو اس طرف پہرہ بھی مضبوط رکھا جائیگا۔ جدید آلات بھی استعمال کیے جائیںگے، خندق بھی کھودی جائیگی جنگی راشن اور اس کی تقسیم کا انتظام بھی پورا پورا کیا جائیگا غرض تمام نظام زندگی کے ہر ہر گوشہ میں مادی اسباب کی بھی پوری رعایت رہیگی یہ سب کچھ ہوگا مگر ہوگا اسی استحضار کے ساتھ کہ اصل تاثیر صرف وحدہٗ لاشریک لہٗ کے قبضہ میں ہے۔ اس لیے اگر ان کے پیچھے دشمن ہو اور سامنے سمندر اور موت کے اسباب ظاہری سب جمع نظر آئیں پھر بھی ان کو ذرا ہراس نہیں ہوتا اور بڑے اطمینان کے لہجے میں وہ یہ کہہ دیتے ہیں: ان معی ربی سیھدین۔ جب میرے رب کی حقیقی طاقت میری پشت پر موجود ہے تو مجھے غم کیا ہے۔ سیال پانی بھی مجھ کو راستہ دینے پر مجبور ہوگا۔ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور اس میں جھونک دینے پر دشمن تُلے نظر آتے ہیں مگر اُن کے بحرِ سکون میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ جس نے آگ میں جلانے کی فطری صفت پیدا کی ہے وہ اس کو بدل بھی سکتا ہے۔ بس عالمِ غیب پر ان کے اس اعتماد کو دیکھ کر ہی ناواقف عقول کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ مادی نظام ان کے یہاں معطل ہوتا ہے۔ حالانکہ مادی نظام کی غیبی نظام کے سامنے حقیقت ہی اتنی ہوتی ہے کہ مادی نظام صرف ایک صورت کی حیثیت رکھتا ہے اس کی روح وہی غیبی نظام ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ضعیف نظریں اس غیبی نظام کا ادراک ہی نہ کر سکیں۔

اب آپ دنیوی حکومت اور اسلامی خلافت کا فرق سمجھ گئے ہونگے۔ ہم آخر میں پھر اس کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام صرف جبرئیل صفت نہیں ہوتے بلکہ وہ ملوکیت اگر شرعی ملوکیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ صفات کے حامل بھی ہوتے ہیں، بیشک اُن کے پورے کے پورے آئین کا رشتہ خواہ وہ دنیوی ہو یا اُخروی ہدایت ربانی سے کٹ نہیں سکتا اور نہ ہمارے نزدیک یہ ممکن ہے۔ جب دنیا میں ہر کمزور کی سیاست یہ ہے کہ وہ کسی طاقتور کی پناہ میں آتا ہے تو انبیاء علیہم السلام جیسے حقائق آگاہ سے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے عہدِ خلافت میں خود اپنی حکومت کی اصل طاقت ہی کو

فراموش کر بیٹھیں، یہ تو اُن کی ملوکیت کی کچھ تفصیل تھی اب اسی پر ان کے علم و حکمت اور رشد و ہدایت کے معاملہ کو قیاس کر لیجیے۔ انبیاء علیہم السلام جو علوم لے کر آتے ہیں اس کی تفصیل آپ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بیان میں ملاحظہ فرما چکے ہیں یہ وہ علوم ہیں جن سے کہ نفس انسانیہ کے شرف و کمال اور تمام نظام عالم کی اصلاح کا تعلق ہوتا ہے، اگر عالم ان علوم سے غافل رہے تو انسانیت کا کمال ہی عالم سے معدوم ہو جائے۔

نبوت کا رکنِ ثانی یعنی علم و حکمت

علوم نبوت کی پہلی خصوصیت حقوق انسانیت کا تحفظ اور مصالح عالم کی رعایت ہے۔

اب مثال کے طور پر آپ صرف معاملات کے ایک شعبہ ہی کو لے لیجیے، جیسے بیع و شراء اور نکاح و طلاق یوں تو سب دنیا ہی اس پر ہمیشہ سے غور کرتی چلی آئی ہے اور اپنے اپنے زاویۂ خیال کے مطابق ان کا ایک آئین بھی مقرر کرتی رہی ہے مگر اس کی انتہا صرف بائع و مشتری اور صرف زوج و زوجہ کی بہبودی کی حد تک ہے یا اس سے اور آگے اپنے ملک کی حد تک سمجھ لیجیے لیکن بقیہ عالم پر اس کے اثرات کیا ہونگے اس بحث سے ان کو کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام کی نظر اس طرف بھی رہتی ہے کہ ان کے آئین میں ایک دفعہ بھی ایسی نہیں ہو سکتی جو عالم کے کسی خطہ کے حق میں بھی مضرت رساں ہو۔ یہ اس لیے کہ وہ حقوق انسانیت کے سب سے بڑے محافظ بنا کر بھیجے جاتے ہیں، اور در اصل خلافت الٰہیہ کا تقاضہ بھی یہی ہے اور اسی لیے ان کی ملوکیت کا بڑا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ اگر آپ انبیاء علیہم السلام کے آئین کی تلاش کرینگے تو اس میں حیوانات تک کے حقوق کے تحفظ کا بھی ایک مستقل باب دیکھینگے۔ چنانچہ اس کے متعلق بھی احادیث میں کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اس وقت اگر ہم اس پر تفصیلی کلام کریں، تو اصل موضوع سے بہت دور ہو جانے کا خطرہ ہے اس لیے ہم صرف معاملات پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں، تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی نظام میں اگر کوئی جزء اہم سمجھا گیا ہے تو وہ صرف طرفین کی رضامندی ہے، اگر طرفین کسی معاملہ پر راضی ہو جاتے ہیں تو اس معاملہ کا اثر خواہ نظام عالم پر کچھ بھی ہو اور حقوق انسانیت اس کی بدولت کتنے ہی پامال ہوتے نظر آئیں مگر مادی قانون میں وہ جائز تصور کیا جاتا ہے اسی بناء پر سود کا لین دین جائز ہی نہیں بلکہ ایک بڑے طبقہ کی نظر میں ترقی کی سب سے بڑی شاہراہ سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح

لہ کمیونسٹ بھی گو آج یہی دعوی کرتے نظر آتے ہیں مگر یہ دعوی ان کا صرف زبانی ہے۔ وہ ریاست کے نام سے وہ تمام مظالم جائز سمجھتے ہیں جو ملوک شخصی نام سے جائز سمجھتے رہے ہیں، بس ع وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی انہوں نے ملوکیت کی نفی میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ نظام عالم کو جس مہذب ملوکیت کی ضرورت تھی اس کی بھی نفی کر ڈالی ہے اور اس طرح اب گو یہ وہ ملوکیت تو نہیں رہی جس کے ظلم سے تنگ آکر دنیا چیخ اٹھی ہے لیکن اس سے بدتر وہ صورت بن گئی ہے کہ جس کے مظالم سے دنیا کے نابود ہو جانے کے خطرات آنکھوں کے سامنے نظر آرہے ہیں، جو آج نہیں تو کل ضرور آپ کے مشاہدہ میں آکر رہینگے اس وقت آپ چیخ چیخ کر کہینگے کہ رحم اللہ علی النباش الاول۔ یعنی اس سے تو پہلی ہی ملوکیت غنیمت تھی۔ درحقیقت ملوکیت کا اگر کوئی صحیح تصور ہو سکتا ہے تو وہ صرف خلافت کے لفظ سے ادا ہو سکتا ہے جس کی قدرے تفصیل آپ سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

زنا اگر طرفین کی رضامندی کے ساتھ ہو تو وہ کوئی جرم متصور نہیں ہوتا لیکن انبیاء علیہم السلام کی شریعت میں طرفین کی رضامندی بھی گو اہم جزء ہے مگر صرف اتنی بات کسی عقد کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی وہ اس پر بھی نظر رکھتے ہیں کہ اس معاملہ کا اثر بقیہ عالم اور حقوق انسانیت پر کیا پڑتا ہے، اس لیے اسلام طرفین کی رضامندی کے باوجود سود کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ سود اگرچہ ایک طبقہ کے لیے جلب زر کا ذریعہ ہو جائے مگر دوسرے طبقہ کے لیے یقیناً نقصان کا موجب ہو جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان کے آئین کی ایک دفعہ بھی ایسی ہو جس سے اصولی طور پر عالم انسانی کے کسی طبقہ کی بربادی کا خطرہ یقینی ہو جائے اس لیے ان کی نظروں میں یہاں طرفین کی رضامندی کوئی چیز نہیں ہے۔

اسی طرح زنا کا مسئلہ ہے یہاں بھی ان کے آئین میں رضامندی کوئی حقیقت نہیں رکھتی، ان کے نزدیک یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ایسے انسان کو خدا تعالیٰ کی زمین پر جینے کا کوئی حق ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے اگر شرعی ثبوت کے بغیر کسی انسان کے متعلق یہ تہمت لگائی جائے تو ہمیشہ کے لیے اس تہمت لگانے والے کی گواہی قابل قبول نہیں رہتی۔ کیونکہ یہ معاملہ صرف دو انسانوں کا معاملہ نہیں ہوتا، بلکہ تمام ماحول اور آئندہ نسل تک بھی اس کے برے اثرات متعدی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس فعل کا کسی حیوان کے ساتھ بھی مرتکب ہو تو اس حیوان کی نقل و حرکت سے چونکہ اس مخرب اخلاق فعل کی یاد تازہ ہوتی ہے اس لیے اس کے بھی معدوم کر دینے کا حکم ہے۔ یہ شدت اسی لیے رکھی گئی ہے کہ اس حیا سوز حرکت سے حقوق انسانیت کو بھی دھبہ لگتا ہے اور نظام عالم بھی درہم برہم ہوتا ہے۔

مادی دنیا کے نزدیک دولت جمع کرنے کا اصول دولت کی آمد و صرف کا صحیح علم حاصل کرنا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی معاشیات میں بھی اس نقطہ سے غفلت نہیں ہوتی ان کے یہاں بھی مالی مسئلہ صرف ان دو سوالوں ہی کے ماتحت دائر ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت میں سب سے پہلا سوال جو مالیات کے متعلق ہوگا وہ یہی ہوگا "من این اکتسبہ واین انفقہ" یعنی اس کے ذرائع آمدنی اور مواقع صرف بتاؤ۔ مگر مادی دنیا میں اس سوال کی جوابدہی صرف انسانی جوہر عقل کے سامنے ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے آئین میں اس پر بھی نظر رہتی ہے، کہ وہ جوابدہی خالق عقل کے سامنے بھی کافی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس لیے ان کے یہاں آمد و صرف کے ذرائع میں پہلی بحث یہ ہوتی ہے کہ یہ مال حلال ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے یا حرام ذرائع سے اور اسی طرح اس کا صرف | حلال وحرام کا صحیح مفہوم | بھی کس محل پر ہوا ہے۔ حلال وحرام کی تعبیر سے آپ متوحش نہ ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے آمد و صرف میں نظام عالم کی صلاح و بہبودی کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے یا نہیں یعنی کسی انسان پر ظلم تو نہیں کیا گیا، کسی ظلم کے لیے صرف تو نہیں ہوا، جو چیز مال کی تعریف میں نہیں آتی اس کو مال تو نہیں بنا لیا گیا۔ اسی قسم

کے دوسرے مصالح کی رعایت سے شریعت حلال و حرام ہونے کا حکم لگا دیتی ہے اب رہے وہ علوم جو انسان کی خارجی ضروریات سے متعلق ہیں چونکہ ان کا تعلق زندگی کے ارتقاء و انحطاط کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اس لیے وہ خود انسانی عقل کے حوالے کر دیے گئے ہیں تاکہ وہ حسب ضرورت جتنا چاہے ان کو پھیلا لے۔ یہاں صرف اتنی ہی ہدایت کی گئی ہے کہ ان میں شریعت کے اہم اصول پیش نظر رہنے چاہئیں یعنی نہ حرام طریقے پر وہ حاصل کیے جائیں اور نہ حرام مقصد سے حاصل کئے جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

علوم نبوت کی دوسری خصوصیت حقیقت کی صحیح ترجمانی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے علوم کی دوسری امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ حقیقت کی ترجمانی کے لیے پورے ضامن ہوتے ہیں اسی لیے کسی نبوت میں بھی ان کے اصول قابل ترمیم نہیں ہوتے جس طرح ایک حقیقت ہمیشہ حقیقت رہتی ہے اسی طرح ان کے اصول بھی یکساں رہتے ہیں۔ رہ گئے فروعی تغیرات تو چونکہ وہ انسانی تغیرات کے تابع ہیں اس لیے اُن میں ترمیم اور کمی بیشی ہونا ضروری ہے مگر یہ بھی ان ہی اصول کی روشنی میں ہوتی ہے جو روز ازل مقرر ہو چکے ہیں۔ دنیا کے جتنے بھی علوم ہیں وہ کسی جگہ بھی اپنے متعلق حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے، اسی لیے یہاں ہر شخص کو طبع آزمائی کا موقعہ ملتا ہے اور ہر نئے دن ایک نئی تحقیق دنیا کے سامنے آجاتی ہے اور وہ بھی تناقض سا بھی چند روز کی بات ہو کہ فلسفۂ ارتقاء کا کس زور شور سے نقارہ پیٹا جا رہا تھا، یا فوراً کچھ ہی مدت کے بعد اس کو ایک علمی جرم سمجھا جانے لگا۔ کمیونزم ابھی اپنے شباب کو بھی نہیں پہنچا کہ افراط و تفریط کی کتنی صورتیں بدل چکا ہے اور ابھی اس کا انتظار کیجیے کہ وہ جا کر ٹھہرتا کہاں ہے۔ یا پھر واپس ہو کر ادھر ہی آتا ہے جدھر اسلام نے راہنمائی کی ہے۔

علوم نبوت کی تیسری خصوصیت جزم و قطعیت ہے

انبیاء علیہم السلام کے علوم کی تیسری امتیازی صفت قطعیت ہے۔ وہ قطعیت و یقین کے اس نقطہ پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اسی صفت کو قرآن کریم میں جا بجا "لَا رَیْبَ فِیْہِ" کہہ کر ادا کیا گیا ہے۔ عجیب بات ہو کہ عالم غیب مادی عقول کے نزدیک جتنا علم و یقین سے دور ہے، انبیاء علیہم السلام کے نزدیک وہ اس سے زیادہ علم و یقین میں ہوتا ہے۔ مثلاً قیامت کا عقیدہ۔ دیکھ لیجیے ہمیشہ سے مادی عقول اس کو قابل مضحکہ سمجھتی رہی ہیں اور اس کے خلاف عقلی دلائل کا زور بھی صرف کرتی رہی ہیں۔ عقلاء کو چھوڑ کر اگر عرب کو دیکھیے وہ ہر بعید سے بعید بات کو مان لیتے تھے مگر یہاں اُن کو بھی صاف انکار تھا، مگر تمام عالم کے اس انکار اور خلاف دلائل کی بھرمار کے باوجود کیا کوئی نبی بھی ایسا گزرا ہے جس کو قیامت کے وجود میں ادنیٰ سا بھی شبہ گزرا ہو حتیٰ کہ آخر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دور مبارک آیا تو یہاں پھر جتنے زور کے ساتھ اس کا انکار کیا گیا اتنے ہی زور کے ساتھ اس کا اثبات کیا گیا، اور اس مسلسل اور مدلل انکار سے ادنیٰ شبہ بھی پیدا نہ ہو سکا۔

قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ (السبا) کہہ دو ہاں مجھ کو اپنے پروردگار کی قسم کہ قیامت تم پر ضرور آکر رہیگی۔
دنیا کے کسی علم میں اتنی قطعیت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ محض توہمات اور ظنیات کے ذخیرہ کو قطعیات سمجھ لیا جائے، یہ اپنے قصور علم اور قصور فہم کا نتیجہ ہے۔ پھر ان کے یہ سب علوم وہ ہوتے ہیں جن کے حصول کا انسانوں کے ہاتھ میں کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے آپ قرآن کریم میں جا بجا ان کا یہ اعلان پڑھینگے۔ اِنِّيْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی میرے جو علوم ہیں سب اللہ کی طرف سے ہیں تم اُن کو نہیں جانتے۔ پھر چونکہ ان علوم کی نوعیت ہی کسبی اور اصطلاحی علوم سے جداگانہ ہوتی ہے اس لیے جو کسبی اور فنی علوم کے خوگر دماغ ہیں وہ اُن کے ان علوم کو بھی اسی معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں اور جب وہ انسانی دماغ کے تراشیدہ علوم سے مطابقت نہیں رکھتے تو فوراً اس پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ معقول بات ہمیشہ معقول ہی رہتی ہے اگر وہ علوم درحقیقت معقول ہیں تو اس بناء پر کہ وہ چونکہ موجودہ کتابوں میں کہیں مدون نہیں ملتے۔ بس اس لیے ان کو تسلیم نہ کرنا کوئی معقول بات نہیں ہاں اگر آپ کے پاس چشم بینا ہو تو آپ ان کو خود اپنے صحیفۂ فطرت اور صحائف عالم میں پڑھ بھی سکتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے رشد و ہدایت اور جملہ کمالات کی نوع علیحدہ ہوتی ہے

ان کے رشد و ہدایت کا معاملہ بھی الفاظ میں کیا ادا کیا جا سکتا ہے۔ بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ جو ان کی صحبت میں ایمان کے ساتھ ایک مرتبہ آبیٹھا وہ باجماع اُمت جنیدؒ و شبلیؒ سے کہیں بڑھ کر بن کر اُٹھ گیا۔ اگر یہ ہستیاں دنیا میں نہ آتیں تو نہ کوئی جُنیدؒ بنتا نہ شبلیؒ۔ خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جملہ کمالات خواہ وہ ان کی قوت علمیہ کے ہوں یا قوت عملیہ کے سب کی نوع ہی تمام مخلوقات کے کمالات سے علیحدہ ہوتی ہے۔ اُن کی صفات کا منبع براہ راست حق تعالیٰ کی صفات کاملہ ہوتی ہیں، خدا تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں مالک الملک، علیم، حکیم، رشید بھی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے مذکورہ بالا کمالات ان اسماء حسنیٰ کے مظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی صفت ملوکیت وہ نہیں ہوتی جو قیصر و کسریٰ کی تاریخوں میں مدون ہے بلکہ خود حاکم حقیقی اور مالک علی الاطلاق کا ظل ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ گو وہ خود حکومت کا دعویٰ نہیں کرتے مگر ان کی نیابت کا احترام ارضی اور سماوی سب طاقتیں کرتی ہیں۔ سمندر دو ٹکڑے ہو کر ان کی فوج کو راستہ دیدیتے ہیں اور آسمان کے فرشتے نماز میں اور جنگوں میں حاضر ہو کر ان کے ساتھ شرکت کرنا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ ان کی حکمت اور ان کا علم بھی وہ نہیں ہوتا جس پر یونان کو یا ڈارون اور ہیگل کو ناز تھا، بلکہ وہ اس علم بیکراں اور حکمت بے پایاں سے سیراب کیے جاتے ہیں جس کے احاطہ کے لیے اگر دنیا کے اشجار قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی تو بھی ناکافی رہیں ان کی رشد و ہدایت بھی وہ ہوتی ہے کہ اگر کہیں اس کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو تمام جہان میں رشد و ہدایت کی ایک کرن بھی چمکتی نظر نہ آتی۔ اس لیے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ان بیان کردہ صفات کا اندازہ صرف اتنا ہی نہیں کرنا چاہیے

کہ نبی میں قوت علمیہ بھی ہوتی ہے اور عملیہ بھی، بلکہ یہاں تمام مخلوقات میں کسی کو ان کے ساتھ شرکت حاصل نہیں ہوتی اور جو شرکت محسوس ہوتی ہے وہ صرف اسمی شرکت ہوتی ہے، ان کی حقیقت میں کوئی شرکت نہیں ہوتی۔ اگر کچھ اجمالاً اشارہ کیا جا سکتا ہے تو صرف اتنا کہ جس طرح نبوت و رسالت کسب سے بالاتر کمال ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے رشد و ہدایت کا معاملہ بھی کسب سے بالاتر ہوتا ہے۔ ع قلم اینجا رسید و سر بشکست تفصیل دیکھنی ہو تو مکتوبات امام ربانیؒ کا مطالعہ فرمائیے۔

نبی کی عام صفات کی حقیقت بھی مخلوق کی عام صفات سے علیحدہ ہوتی ہے

یہاں ایک بات قاعدۂ کلیہ کے طور پر یاد رکھنی چاہیئے کہ انبیاء علیہم السلام کی مذکورۂ بالا صفات کے سوا ان کی جتنی اور صفات ہیں ان کی حقیقت بھی عام مخلوق کی صفات سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ مثلاً صداقت، دیانت و امانت، اخلاق کی رفعت، خلق اللہ کے ساتھ ان کی عام ہمدردی اور ان کا عدل و انصاف وغیرہ۔ جب کبھی انبیاء علیہم السلام کے تعارف کے ذیل میں آپ ان صفات کا تذکرہ پڑھتے ہیں تو آپ کا قلب اس کا ضرور اعتراف کر لیتا ہے کہ اپنے اپنے دور میں بیشک وشبہ وہ بلند کیرکٹر کے انسان تھے مگر اسی کے ساتھ آپ ہر دور میں ایسے اور انسان بھی تاریخ میں دیکھ لیتے ہیں جن میں یہ صفات موجود ہوتی ہیں مگر وہ نبوت و رسالت کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتے اس لیے آپ اپنے ذہن میں ان صفات اور نبوت و رسالت کے مابین کوئی ایسا ربط نہیں سمجھتے جس کی وجہ سے آپ کسی انسان کو ان صفات کا مالک دیکھ کر کوئی ایسا غیر مدرک بالعقول منصب دیدیں جو مادی عالم میں ممکن الحصول نہ ہو اس لیے آپ اس کو صرف فرط عقیدت اور دنیا کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثمرہ تصور کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اگر آپ غور کرینگے تو آپ کو ثابت ہو جائیگا کہ دنیا میں جب کبھی ایسی ہستیوں نے نبوت و رسالت کا دعویٰ کیا ہے تو ہمیشہ عقلاء نے ان کے متعلق ان کے اخلاق، ان کی صفات، ان کی تعلیمات اور تبلیغ جماعت ہی کی تفتیش کی ہے جیسا کہ ہرقل کی حدیث میں عنقریب آپ ملاحظہ فرمائینگے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان صفات اور اس دعوے کے درمیان عقلی لحاظ سے گو کوئی تلازم نہ ہو مگر خارجی تاریخ کے لحاظ سے کوئی ایسا ربط ضرور ہے جس کے سبب ایسا دعویٰ غور و تامل کا محتاج ہو جاتا ہے اور اگر اس وقت ایسے دعوے کا امکان ہو تو اس کی تصدیق کے لیے شاہانہ عقل بھی مضطر ہو جاتی ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ یہ صفات گو عام انسانوں میں بھی پائی جا سکتی ہیں مگر اس کی وہ خاص نوعیت نہیں ہوتی جو نوعیت کہ انبیاء علیہم السلام کی صفات کی ہوتی ہے مثلاً صدق و امانت عام انسانوں میں بھی موجود ہو سکتی ہے مگر جب آپ انبیاء علیہم السلام کے بتائے ہوئے صدق و صفا پر نظر ڈالینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں اگر کوئی والدہ اپنے بچہ کو کچھ دینے کے بہانہ سے بلائے اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز نہ ہو تو یہ بھی ایک جھوٹ شمار ہو جاتا ہے اسی طرح دو شخص اگر باتیں کر رہے ہیں اور باتیں کرتے کرتے ان میں سے کوئی دفعتاً اپنے دائیں بائیں دیکھ لیتا ہے

قائل کے نزدیک یہ بات بھی امانت میں داخل ہو جاتی ہے اور اس کو اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے سامنے کہنا روا نہیں رہتا۔ جب عام اُمت کے لیے ان معمولی اوصاف میں ان کا معیار یہ ہو تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس کی نوعیت کیا ہوگی اس کا اندازہ آپ خود فرمالیں یہی وجہ تھی کہ صدق وامانت کی صفت اگرچہ آپ کے زمانہ میں بھی بہت سے شرفا میں موجود تھی خود ابوسفیان کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ آئندہ لوگ میری نسبت دروغ گوئی کا عیب نقل کرتے رہیں گے تو ہرقل کے سامنے میں آپ کے متعلق ضرور کوئی بات جھوٹی لگا کر رہتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی کذب کی تہمت ناقابل برداشت عیب سمجھا جاتا تھا۔ اب سوچیے کہ ایسے ماحول میں پھر وہ بات کیا تھی جس کی بنا پر لوگوں نے صدوق وامین کا لقب صرف آپ ہی کی ذات گرامی کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اسی طرح تاریخ میں ایک عبداللہ بن سلام کی نہیں بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جو لوگ آپ کی صفات کا حال سن کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکے مگر جب اُنہوں نے بچشم خود ان کا نظارہ کر لیا تو پھر ان کا صرف یہی ایک فیصلہ تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ بات یہی تھی کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ آپ کی صفات کے صرف سُننے اور پڑھنے والے ان کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے اور مشاہدہ کرنے والے یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ صفات گو عام انسانوں ہی کی ہیں مگر یہاں ان کی نوعیت کچھ علیحدہ نظر آتی ہے۔

ساحرین فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا حال جب تک سُنا ہی سُنا تھا، اس وقت تک وہ ذرا مرعوب نہ تھے بلکہ خود اپنی رسیاں لے کر ان سے مقابلہ کرنے کے لیے آڈٹے تھے مگر جب آکر بچشم خود اس کا مشاہدہ کر لیا تو اپنے منہ کے بل جا پڑے اور حق کی اس قاہرانہ طاقت کو دیکھ کر بیساختہ ایمان لے آئے۔ پس انبیاء علیہم السلام کی ظاہری صفات ہوتی تو وہی ہیں جو عام انسانوں میں ہوتی ہیں مگر اُن کی حقیقت اور ان کے مراتب کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا نہ الفاظ میں وہ ادا کی جا سکتی ہے ؎

گر مصور صورتے آں دلربا خواہد کشید ۔۔۔ لیک حیرانم کہ نازش را چہ ساں خواہد کشید

اسی لیے جب ایک بار حضرت عائشہؓ سے آپ کے اخلاق کے متعلق سوال کیا گیا، وہ کیا تھے اور کیسے تھے؟ تو اس کے جواب میں وہ صرف ایک یہ جملہ کہہ کر خاموش ہو گئیں کان خلقہ القرآن۔ آپ کا اخلاق دیکھنا چاہو تو بس یہ قرآن دیکھ لو۔ اگر وہ چاہتیں تو یہاں آپ کے اخلاق حسنہ کا ایک دفتر کھول دیتیں مگر ان کے سامنے اخلاق نبوت کی حقیقت بیحجابانہ جلوہ نما تھی وہ دیکھ رہی تھیں کہ اُن کی تفصیل کرنی حیطۂ بیان سے باہر ہے اگر ادا کریں تو اس کے لیے الفاظ کہاں سے لائیں، اور اگر بیان نہ کریں تو جواب کیا دیں۔ سبحان اللہ آپ کی اس نوسالہ صحبت یافتہ زوجہ مطہرہؓ نے کیا فصاحت وبلاغت سے لبریز جواب دیا جس کو سُن کر ایک فہیم انسان کے سامنے آپ کے معجز اخلاق اور ان کی ادائگی کے لیے الفاظ کی کوتاہی کا پورا پورا فوٹو کھنچ جاتا ہے۔ فرماتی ہیں کان خلقہ القرآن

یہ سارا کا سارا قرآن آپ کا اخلاق ہی تو ہے۔ اسی طرح آپ کی تہجد کی رکعات کے متعلق جب اُن سے پوچھا گیا۔ ذرا بتائیے وہ کس کیفیت اور کس انداز کی ہوا کرتی تھیں تو یہاں بھی ان کا پورا نقشہ کھینچنے سے وہ اپنے عجز و قصور کا اعتراف کر کے خاموش ہو گئیں یصلی اربعًا فلا تسئل عن حسنهن وطولهن۔ آپ چار چار رکعتیں پڑھتے مگر وہ کتنی لمبی لمبی رکعتیں ہوا کرتی تھیں اور کیسی دلفریب ہوتی تھیں اس کا حال نہ پوچھو بس اتنا ہی سُن لو کہ وہ پڑھنے والے تھے اور میں ان کا نظارہ کرنے والی، وہ زبان میرے پاس نہیں کہ جس سے ان کا طول و حُسن ادا کر سکوں۔

جنبش فلیتے دارد سعدی آخر پایاں بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سارا عالم ہی نرالا ہوتا ہے، ان کی صورتوں کا بھی ان کی سیرتوں کا بھی۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہاں بھی صرف تاریخ کے چند الفاظ پر ہی فیصلہ کر ڈالیں۔ اور ادھر ذرا توجہ نہیں فرماتے کہ تاریخ اتنا ہی کر سکتی ہے کہ ان کی صفات اور ان کے اخلاق کو صرف الفاظ کا جامہ پہنا کر آپ کے سامنے لے آئے یہ فرض آپ کا ہونا چاہیے کہ خارجی حالات و واقعات سے ان کے مراتب اور اُن کی نوعیت کا اندازہ لگائیں مگر ان سے بھی حقیقت کا انکشاف کیا ہو سکتا ہے کیونکہ جب واقعات آپ کے سامنے آئینگے تو وہ بھی الفاظ کا نقاب ڈال کر آئینگے اس لیے حقیقت پھر مخفی کی مخفی رہ جائیگی بس یہی ذرا سی بات تھی جس سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک میں آنیوالی اُمت کے ایمان کا رتبہ بہت بلند ہو گیا تھا۔ جمال رسالت کے مشاہدہ کی دولت گو صحابہ کے نصیب میں آگئی تھی مگر اس وجہ سے ان کو ایمان لانے میں بھی بڑی سہولت بہم پہنچ گئی تھی اس لیے وہ اگر ایمان نہ لاتے تو یہ قابل تعجب ہوتا اور پچھلی اُمت گو اس نعمت سے محروم رہی لیکن ان نامساعد حالات میں بھی چونکہ وہ ایمان لے آئی اس لیے ان کا ایمان لانا قابل تعجب بن گیا۔ (تفصیل کے لیے ترجمان السنۃ جلد دوم کا پہلا باب ملاحظہ فرمائیے)

قرآن کریم اور دیگر معجزات میں ایک خاص امتیاز

بے موقعہ نہ ہوگا اگر ہم یہاں اتنا اور عرض کر دیں کہ آئندہ امت کے سامنے جس طرح رسول کی ہستی موجود نہیں تھی اگر کہیں ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی خاص معجزہ بھی اپنی اصل صورت پر موجود نہ ہوتا اور وہ بھی صرف تاریخ اور راویوں کے بیان پر رہ جاتا تو نہ معلوم ایمان لانے والوں کی راہ میں کتنے کانٹے اور پیدا ہو جاتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فلق بحر کا معجزہ دکھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بڑھ کر شق قمر کا معجزہ دکھایا مگر یہ دونوں کے دونوں قاہرانہ معجزے صرف ناظرین کے سامنے ہی سامنے ظاہر ہوئے اور ختم ہو گئے آئندہ اُمت کے سامنے صرف ان کی نقل در نقل باقی رہ گئی گو ان کی صداقت کی ذمہ داری خود قرآن کریم نے اٹھائی اور اپنی واضح اور محکم آیات میں جابجا اس کا تذکرہ بھی فرمایا مگر کیا کچھ فطرت انسانوں نے پھر ان مقدس الفاظ

کی گردن مروڑ کر نہیں رکھ دی اور کیا آفتاب کی چمکتی ہوئی روشنی اور شب کے چمکتے ہوئے چاند کے یہ دونوں معجزے پھر مخفی کے مخفی نہ رہ گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعہ کی اصل صورت دیکھنے اور صرف اس کے سن لینے یا پڑھ لینے میں کتنا فرق ہوتا ہے پس انبیاء علیہم السلام کی صفت ملوکیت، علم وحکمت اور رشد وہدایت کا تو کہنا ہی کیا ہے یہاں ان کے روزمرہ کے اخلاق وعادات کی گہرائی کا بھی اندازہ لگانا مشکل ہے۔ غریب ابن سینا تو یہ کہتا ہے کہ ان کی بیداری کے علوم کی حیثیت منامات کی برابر ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے منامات کی حیثیت بیداری کی وحی کے برابر ہوتی ہے۔ اُس کا خیال تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مدرکات کی خارج میں کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی وہ صرف ان کے نفس کے اندرونی خیالات ہوتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ خارج میں درحقیقت کوئی حقیقت ہوتی ہے تو صرف ان کے علوم ہی کی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کو دیکھو وہ تم کو بتائیگا کہ مادی عالم سارا کا سارا لہو ولعب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ یہاں جو کچھ نظر آرہا ہے سب بے حقیقت ہے، حقیقت کا عالم دوسرا ہے اور یہ عالم وہ ہے جس کا علم انبیاء علیہم السلام کو مرحمت ہوتا ہے کتنا تعجب ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے علوم سے عالم خارجی کے گوشہ گوشہ میں جو عظیم الشان انقلابات مشاہدہ میں آچکے ہیں ان کے بعد بھی عقلاء کو یہ کہنے کی جرأت کیسے ہو جاتی ہے کہ ان کو خارجی عالم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ان کے علوم کو خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو بھی عقلمندی اور دانائی کی ہر بات قابل غور ہوتی ہے۔ مگر یہاں تو جتنا گہرائی میں جائیے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جن امور کو انسانی زندگی سے جتنا زیادہ لگاؤ ہوتا ہے وہ اتنا ہی انبیاء علیہم السلام کے لیے زیادہ دلچسپی کا موجب ہوتے ہیں اور جتنا ان کا انسانی زندگی سے تعلق نہیں ہوتا اتنا ہی وہ ان کے نزدیک دلچسپی کے قابل نہیں رہتے۔ اسی لیے افلاک و نجوم کے مباحث ان کے دائرہ علوم سے بالکل خارج ہوتے ہیں، بلکہ جن علوم کا تعلق صرف خیالات کے ساتھ قائم ہو خواہ وہ کتنے بھی قابل ستائش اور ناز کے لائق شمار ہوں مگر وہ ان کے منصب سے گرے ہوئے سمجھے جاتے ہیں۔ عرب میں شاعری کا جو درجہ تھا سب کو معلوم ہے کیا یہ ممکن نہ تھا کہ قرآن کریم ایک دیوان کی شکل ہی میں نازل ہو جاتا، مگر یہ تو کیا ہوتا وہاں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت ہی کو شاعری سے اتنا بعید رکھا گیا تھا کہ اگر شاذ ونادر طور پر کسی دوسرے شاعر کا شعر کبھی آپ کی زبان مبارک پر آگیا ہے تو آپ نے قصداً اس کا وزن شعری کسی کلمہ کو مقدم مؤخر کر کے توڑ دیا ہے۔ گویا شعر گوئی تو درکنار شعر خوانی بھی نبوت کے شایان شان نہیں ہوتی پھر دنیا جانتی ہے کہ ظرافت بھی حیات انسانی کا ایک باب ہے جس میں ملوک وسلاطین بھی شریک ہوتے ہیں مگر یہاں ظرافت میں بھی کیا مجال کہ ایک کلمہ زبان سے ایسا نکل جائے جو بے حقیقت نہ ہو، اسی طرح غصہ کی حالت میں ایک ضابطہ سے ضابطہ انسان کی زبان پر بھی ایسے کلمات آجاتے ہیں جو صرف حالت غضب کا مظہر ہونے کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ مگر یہاں حالتِ غضب کا عالم بھی یہ ہے کہ جو بات اس حالت میں آپ کی زبانِ مبارک

سے نکلتی ہے وہ بھی اتنی ہی اہمیت سے قابلِ ضبط وکتابت ہوتی ہے جیساکہ عام حالات کی، پس جن شخصیتوں کی ظرافت اور غصہ کے کلمات بھی حقیقت سے سرمو تجاوز نہ کرتے ہوں اُن کے علوم کو منامات کے برابر سمجھنا کتنا ظلم عظیم ہے اسی طرح جن کے نظام زندگی کا خارجی عالم سے اتنا گہرا تعلق ہو اور عالم حقیقت کے فوز وفلاح کا اسی پر مدار ومدار ہو ان کے متعلق یہ خیال قائم کرلینا کہ خارجی عالم سے ان کو کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا کتنی بےبنیاد بدظنی ہے۔

اُمید ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اس بیان سے آپ نے نبوت کے کمالات کا کچھ اندازہ کرلیا ہوگا اور اسی طرح اس کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کی شخصیتوں کا بھی آپ کو کچھ نہ کچھ تعارف حاصل ہوگیا ہوگا، لیکن چونکہ اس کو پورے طور پر سمجھنا علم ودقّت فہم کا محتاج ہے اس لیے ہم یہاں آپ کے سامنے دوسرا وہ طریقہ بھی پیش کیے دیتے ہیں جو نہایت سادہ اور صاف ہے اور اس کا سمجھنا زیادہ غور وفکر کا محتاج بھی نہیں ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کی نظر میں انبیاء علیہم السلام کی معرفت کا طریقہ بھی دوسرے انواع انسانی کی طرح ان کے امتیازات وخواص ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی شناخت کا طریقہ وہی ہے جو دوسرے انواع انسانی کی شناخت کا ہوتا ہے، دنیا میں اس مقدس نوع کے افراد بھی اسی طرح کثرت سے گزرتے رہے ہیں جس طرح کہ اطبّاء، شعراء، ساحرین، مجنون اور کاہنوں کے۔ ان میں سے ہر ہر نوع کے ہر زمانہ میں کچھ ایسے خواص وامتیازات بھی صفحات تاریخ میں مدون ہوتے چلے آئے ہیں جن سے کہ وہ نوع کسی دور میں خالی نہیں رہی اس لیے بعد کی نسلوں نے اُن کی اُن ہی خصوصیات سے ان کو کسی تکلیف وتکلف کے بغیر پہچان لیا ہے۔ مثلاً جن اطراف میں طبیب پیدا ہوتے رہے ہیں یا کم از کم طبیبوں کی تاریخ سے ان کو پوری آگاہی حاصل ہوئی ہے ان کو اپنے دور کے کسی طبیب کی شناخت میں کبھی کوئی لاینحل دشواری پیش نہیں آئی۔ اسی طرح سحر وکہانت بھی مدت سے دنیا کی جانی پہچانی باتیں ہیں اس لیے یہاں بھی ساحر وکاہن کا حکم لگانے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی اور اگر بالفرض کچھ دشواری ہوتی بھی ہے تو اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک حالات کا صحیح علم نہیں ہوتا، پاگل اور مجنون اور صفراوی بیماروں کا حال اس سے بھی زیادہ روشن ہے کیونکہ اس نوع کا وجود پہلی انواع سے بھی زیادہ عام ہے اس لیے ان کی خصوصیات بھی اُن سے زیادہ روشن ہیں۔ اس لیے عام آدمی بھی مجنون اور غیر مجنون میں فرق کرلیتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا گروہ بھی آفرینشِ عالم سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ہوتا چلا آیا ہے۔ ان کی بھی ایک تاریخ زندگی اور اس کی خصوصیات معلوم ہیں۔ لہٰذا جس طرح انسانوں کی دوسری انواع اپنی اپنی خصوصیات سے بآسانی معلوم ہوسکتی ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی نوع کا معلوم کرنا بھی ذرا دشوار نہیں ہے۔ یہاں دشواری اگر ہے تو صرف اس کے لیے ہے جس کو اس نوع کی تاریخ ہی کا صحیح علم نہیں یا اس کا صحیح مطالعہ نہیں تو پھر ایک ان ہی پر کیا انحصار ہے طبیب اور ڈاکٹروں سے ناواقف کے لیے ان کی شناخت بھی اتنی ہی دشوار ہے۔ اب یہ بات بھی حل ہوگئی کہ یہ بدیہی مسئلہ آخر فارابی وابن سینا جیسے عقلاء کو حل کیوں نہیں ہوا اور آج بھی وہ کیوں لاینحل بنا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کو چونکہ

انبیاء علیہم السلام کے صحیح حالات نہیں پہنچے اور جن کو پہنچے انہوں نے غور کے ساتھ ان کا مطالعہ نہیں کیا اس لیے لازمی طور پر ان کو یہاں صرف اٹکل کے تیر ہی چلانے پڑے جیسا کہ ابن سینا نے صاف ہی کہہ دیا ہے کہ نبوت کی یہ تحقیق ہم نے اس وقت لکھی جبکہ ہم کو ایک جماعت کے کچھ حالات پہنچے تو ہم نے چاہا کہ دوسری اشیاء کی طرح اس کے بھی کچھ اسباب لکھ دیں۔

اس جگہ آپ کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ نبوت اور معجزات ووحی یہ سب اشیاء دین کے اہم مبادیات میں داخل ہیں۔ جب تک پہلے یہی مفہوم ومعقول نہ ہو جائیں اس وقت تک دین کے آئندہ مسائل بھلا کیسے قابل تسلیم ہو سکتے ہیں اور جب ان مبادی کی حقیقتوں کے سمجھنے سے ارسطو اور فارابی اور ہمارے موجودہ دور کے عقلاء بھی عاجز ہوں تو ایسے امور کو دین کے مبادیات میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے!

نبوت ورسالت کی حقیقت دریافت کرنی گو مشکل ہو مگر نبی کی معرفت بدیہی ہے۔

یہ اہم سوال درحقیقت ایک ذرا سا نکتہ فروگذاشت کر دینے سے پیدا ہوتا ہے اگر آپ اس پر غور کر لیں کہ بہت سی اشیاء بدیہی ہوتی ہیں لیکن جب بحث ان کی حقیقت معلوم کرنے میں آتی ہے تو وہی ہر نظری سے بڑھ کر نظری بن جاتی ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوگا بیشک نبوت، معجزہ اور وحی کی حقیقت معلوم کرنی صرف عقلاء غیر مسلمین کے لیے ہی دشوار نہیں خود اہل اسلام کے لیے بھی لاینحل مسئلہ ہے، چنانچہ آج تک کتب کلام وغیرہ میں اس کی حقیقت کی تنقیح میں مختلف اقوال موجود نظر آتے ہیں لیکن اس وقت کے باوجود پھر خود نبی، وحی اور معجزہ کی معرفت اتنی بدیہی ہے کہ اس سے بڑھ کر شاید کوئی بات بدیہی نہ ہو اہل کتاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ کو اس طرح پہچان لیا جیسے باپ اپنے بیٹے کو پہچان لیتا ہے عرب کے امی ایک دو نہیں ہزاروں ہزار کی تعداد میں آپ کی خدمت میں گئے، بہتوں نے تو آپ کو دیکھتے ہی آپ کے نبی برحق ہونے کا یقین کر لیا اور بہتوں نے کسی معجزہ کو دیکھا اور اس معجزہ کو بھی بداہۃً سمجھا اور پھر کسی دقت کے بغیر آپ کی نبوت پر بھی یقین کر لیا۔ اس کے بعد کسی کو آپ کے فیض صحبت سے کوئی خاص حصہ مل گیا وہ رمز وحی کو یہاں تک آشنا ہو گیا کہ جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو وہ فوراً پہچان لیتا کہ اب آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے اور اس سے زیادہ اگر کسی کو اور قرب نصیب ہو گیا تو نزول وحی کے وقت اس کے قلب پر وحی کا کبھی اتنا انعکاس بھی ہو گیا کہ وحی کے ظاہری شکل میں آنے سے قبل ہی اس کا کوئی کلمہ اس کی زبان پر جاری ہو گیا۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ عناصر اربعہ یعنی پانی، آگ، ہوا اور خاک یہاں بدیہیات میں داخل ہیں، جن کے سمجھنے اور شناخت کرنے میں کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا سا بچہ بھی پیاسا ہوتا ہے تو پانی کہہ کر اپنی ماں سے مانگ لیتا ہے اور اپنی تشنگی دور کر لیتا ہے لیکن اگر اسی پانی کی حقیقت اس سے دریافت کی جائے تو وہی بچہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب کالج سے باہر نکلتا ہے تو بھی اس کی پوری تشریح سے قاصر نظر آتا ہے۔ یہی حال ہوا کا ہے وہ پانی سے کہیں لطیف عنصر ہے

اتنا لطیف کہ آنکھوں سے اس کا ادراک بھی نہیں ہوسکتا لیکن اس کا بھی ایک بچہ ادراک کر لیتا ہے اور گرمی کے وقت پنکھا ہاتھ میں لے کر ہوا حاصل کر لیتا ہے لیکن کیا وہ اس کی حقیقت بتا سکتا ہے

یہ حال تو ان بدیہی محسوسات میں ہے آپ اگر اس سے ذرا قدم آگے بڑھا کر عقلیات میں قدم رکھیے تو یہاں ان کی حقیقت کے ادراک میں آپ کو اور تاریکی در تاریکی نظر آئیگی۔ اسی لیے عقلاء قدیم نے عاجز آ کر بطور قاعدۂ مسلمہ لکھ دیا کہ ان التحدید الحقیقی عسیر جدًا یعنی کسی چیز کی حقیقت کا صحیح صحیح پتہ دینا یہ بہت مشکل ہے آپ اس فیصلہ کو تسلیم کریں یا نہ کریں مگر بہر حال ہے یہ بھی ایک عقلاء کی جماعت ہی کا فیصلہ یہی وجہ تھی کہ کسی نبی نے ان اشیاء کی نہ تو حقیقت بیان کرنے کی طرف خود کوئی خاص توجہ کی اور نہ اس کا بوجھ ہماری ضعیف عقول پر ڈالا ہے اور نہ کبھی ان پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور صرف بدیہی معجزات دکھا کر اپنے نبی ہونے کی بدیہی شناخت کرائی ہے، اس کے بعد وحی کے آبِ زلال سے تشنگان راہ خدا کی پیاس بجھائی ہے پس نبوت اور معجزہ کی حقیقت کی پہچان خواہ کتنی ہی دقیق ہو لیکن خود نبی اور معجزہ کی شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہے اور یہی شناخت دین کی بنیاد ہے۔ حقیقت کے ادراک کی بحث کو ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نبوت تو درکنار ولایت والہام جو اس کے تحت کی اشیاء ہیں ان کی حقیقتوں کا ادراک بھی ناممکن ہے جب تک کہ خود اس شخص کو مقام ولایت حاصل نہ ہو۔ اسی وجہ سے مشہور ہے کہ ولی را ولی می شناسد۔ اگر اس ضرب المثل مقولہ پر بھی آپ ذرا گہری نظر ڈالینگے تو یہ بھی آپ کو محل تأمل نظر آئیگا اور واقعات شہادت دینگے کہ یہ مقولہ بھی اطلاق کے ساتھ قابل تسلیم نہیں ہے، بسا اوقات ایک ولی کو بھی دوسرے ولی کی ولایت کا پورا ادراک نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ نفس ولایت کے بارے میں خود اولیاء کرام میں بڑا اختلاف موجود ہے۔ پھر نبوت کا تو ذکر ہی کیا ہے شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں:-

فلا ینبغی ان یتکلم فی مقام الرسول الا رسول ولا فی مقام الانبیاء الا نبی ولا ذوق لنا فی مقام الانبیاء حتی نتکلم علیہ۔ الیواقیت ص۲۴۲	اس لیے رسول کے مقام میں رسول ہی کو اور انبیاء کے مقام میں صرف نبی ہی کو گفتگو کرنا مناسب ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے مقامات ہی سے جب ہم آشنا نہیں تو ان سے بحث کیا کر سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قدرت نے جس امر کا مخلوق کو مکلف بنایا ہے اس کو ہمیشہ آسان سے آسان تر رکھا ہے، اور جس حقیقت کا پورا ادراک نہیں ہوسکتا اس کا ہم کو مکلف بھی نہیں بنایا یہ شیطان کا ایک گہرا فریب ہے کہ جب وہ کسی کو راہ حق سے روکنا چاہتا ہے تو مقاصد سے ہٹا کر ہمیشہ ایک عبث مشغلہ میں الجھا دیتا ہے اور ایسا الجھاتا ہے کہ انسان اسی میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور مقاصد تک اس کو رسائی کی نوبت ہی نہیں آتی۔ والعیاذ باللہ۔ اس لیے ہم یہاں ان مباحث میں پڑنے کی بجائے خود انبیاء علیہم السلام کے تعارف اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام جب کبھی دنیا میں تشریف لائے ہیں تو اپنے کامل تعارف کے ساتھ آئے ہیں

واضح رہنا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں جب کبھی دنیا میں ظاہر ہوئی ہیں تو اپنے پورے تعارف کے ساتھ ظاہر ہوئی ہیں۔ وہ اچانک دنیا کے سامنے یونہی نہیں آگئیں بلکہ پہلے سے ان کی ذات کا تعارف، ان کے مقام کا تعارف، اور ان کی خدمات کا تعارف بھی کرا دیا جاتا رہا ہے حتیٰ کہ ان کی آمد سے قبل ایک طبقہ کو جو اس تعارف سے آشنا ہوتا ہے ان کی آمد کا اس طرح انتظار ہونے لگتا ہے جیسا کسی متعارف اولوالعزم شخصیت کی آمد کا انتظار ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر اس وقت ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تاریخ اور معتبر احادیث اس کی شاہد ہیں اور کتب سابقہ بھی اس کی گواہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل آپ کے ظہور کی علامات آپ کا آبائی وطن اور آپ کی ہجرت کا مقام، بلکہ اس کا نقشہ، آپ کا اسم مبارک اور مکمل حلیہ شریفہ، حتیٰ کہ آپ کے خاص اصحاب اور ان کے ساتھ عام اُمت کی صفات بھی اس تفصیل سے بیان ہو چکی تھیں کہ آپ کے ظہور سے قبل عام محفلوں میں بھی آپ کا تذکرہ آنے لگا تھا، دشمنوں کے مقابلہ میں آپ کے وسیلہ سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگی جاتی تھیں، قسیس اور رہبان آپ کی تلاش میں چشم براہ تھے اور سلمان فارسی جیسے عشاق گھر بار چھوڑ کر آپ کی جستجو میں صحرا بصحرا خاک چھانتے پھرتے تھے۔ جس طرح دن نکلتا ہے اور اس کے اُجالے سے قبل روشنی کے آثار افق عالم پر چمکنے لگتے ہیں، شب کی تاریکی آتی ہے اور اس کے چھانے سے پہلے افق کا اُجالا مدھم پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی دستور کے مطابق اس آفتاب ہدایت کے طلوع سے پہلے بھی آسمان کے افق اور زمین کے اطراف میں طرح طرح کے عجائبات کا ظہور ہونا لازمی امر تھا جن کے سبب سے بے علم انسانوں میں بھی کچھ کچھ شعور پیدا ہونے لگا تھا اور خفتہ طبیعتیں بیدار ہونے لگی تھیں۔ حتیٰ کہ ذی شعور انسانوں اور جنات سے گزر کر بے شعور مخلوق حجر و شجر بھی اس عظیم الشان انقلاب انگیز ہستی کی آمد آمد کے اثرات سے متاثر ہونے لگے تھے اور اس طرح ایک غیر معمولی واقعہ کے انتظار میں عالم کی آنکھیں لگ گئی تھیں۔ دوسری طرف حاسدین کی جماعت تھی جو جزم و یقین میں تو اس طبقہ کی شریک تھی لیکن اس بشر نبی کی آمد سے قبل ہی اس کا سینہ عداوت سے بھڑک رہا تھا اس نے بھی اپنی فطرتِ عداوت سے چاروں طرف آدمی دوڑا دیئے تھے۔ خدا ہی جانے کہ آپ کی آمد سے قبل آپ کا یہ تعارف کس درجہ کا تعارف ہوگا کہ کھوج لگانے والوں نے ٹھیک اس راستہ اور مقام کا بھی کھوج لگا لیا تھا جس راستہ سے آپ سفر کر رہے تھے۔ اس سے بڑھ کر بعض روایات سے یہاں تک بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض ملوک و سلاطین کے پاس تو آپ کی اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی شکل و شمائل کی تفصیلات سُن کر ہو بہو تصاویر بھی تیار کرلی گئی تھیں۔ یہاں اگر اس بیان کی جزئیات سے کسی معاند کو اختلاف ہو تو ہو مگر اس حقیقت سے ایک دشمن

سے دشمن معاند کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آپ کی آمد سے قبل اہل علم طبقہ کو ایک نبی کی آمد کا صد درجہ انتظار تھا۔ ہم اس کو ایک تاریخی حقیقت سمجھتے ہوئے اور زیادہ طول دینا نہیں چاہتے، کیونکہ اس وقت ہمارا موضوع صرف یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق صرف دماغی فلسفیانہ مباحث سے ہٹا کر آپ کو واقعات کی اس دنیا میں لے آئیں جہاں ان کی شخصیات کا سابق تعارف ان کی معرفت کے لیے دماغ سوزی سے مستغنی کر دیتا ہے۔ یہاں اُن نا منصف اور جاہل قوموں کا تذکرہ کرنا بالکل عبث ہے جنہوں نے اتنے تعارف کے بعد بھی ان کو نہیں پہچانا یا اگر پہچانا تو محض ضد کی راہ سے ان کی بات نہیں مانی۔ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام نے دنیا میں آکر جس سادہ اور واضح انداز سے اپنا تعارف امتوں کے سامنے رکھا ہے آپ اس کو خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیجیے آپ کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ اس کے بعد عدل وانصاف کی دنیا میں کسی شک و تردد کا محل ہی باقی نہیں رہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل کی حالت تو خود قرآن کریم ہی میں موجود ہے اور ملوک و سلاطین کے بیانات سے کچھ ان اوراق میں بھی آپ کے سامنے عنقریب آنے والی ہے۔ ارشاد ہے: وکانوا قبل یستفتون علی الذین کفروا یعنی ان اہل کتاب کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل تو یہ لوگ کافروں کے مقابلہ میں آپ کے توسل سے دعائیں مانگا کرتے تھے اور جب آپ تشریف لے آئے تو اب انکار کرنے لگے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو اس کو پیش نظر رکھ کر اب خود یہ فیصلہ کر لیجیے کہ سطح عالم پر اس منظم سلسلہ کے ظہور کی حقیقت کیا صرف اتنی ہی ہونی چاہیے جتنی کہ غالبی اور ابن سینا نے سمجھی یا جیسا کہ آج ہمارے فلسفیانہ دماغ اس کو سمجھ رہے ہیں؟

مشرکین عرب نے آپ کو ساحر و مجنون کیوں ٹھہرایا

مشرکین عرب اور جو اس زریں تاریخ سے جاہل تھے اُنہوں نے ازراہ جہالت کبھی تو انبیاء علیہم السلام کو بے علم و نافہم سمجھ کر مجنون قرار دے دیا اور کبھی ان کے علوم کی تاثیر دیکھی تو زیادہ سے زیادہ اُن کو ساحر کہا، مگر جس طرف اُن کا دماغ نہ چل سکا وہ یہی ایک بات تھی کہ آپ خدا تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ — تمہارا یہ رسول جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے یقیناً مجنون ہے۔

إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ يُرِيدُ أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِ ۔ (الشعراء) — یہ بہت علم والا جادوگر ہے اس کی نیت یہ ہے کہ تم لوگوں کو اپنے جادو کے زور سے اپنے ملک سے نکال دے۔

دیکھیے پہلی آیت میں خدا کے سچے رسول کو بے علم سمجھا تو دیوانہ قرار دیا، اور دوسری آیت میں اگر اُس کے علم سے مرعوب ہوئے تو اس کو جادوگر کا لقب دیا۔ کو عناد اور جہالت کی باتوں کے اسباب بیان کرنے کی کوئی ضرورت تو نہیں ہے تاہم رسولوں کے مجنون کہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جن باتوں کو کفار سود مند سمجھا کرتے تھے خدا تعالیٰ کے رسول اکثر اُن کو مضرت رساں کہتے اور جن کو وہ مضرت رساں سمجھا کرتے تھے وہ اکثر اُن کو سود مند بتاتے۔ چونکہ دنیا

بھی نفع ونقصان میں امتیاز نہیں کرتا اس لیے یہ احمق جماعت اپنے زعم باطل میں برعکس رسولوں ہی کو دیوانہ قرار دیتی تھی، پھر جب کبھی قرآن کریم پر نظر کرتے تو اس کو نظم ونثر کے درمیان ایک تیسری نوع کا کلام دیکھتے تھے جس سے وہ اب تک آشنا نہ تھے اس لیے کبھی تو مبہوت ہو کر اس کو شعر قرار دیتے اور کبھی کاہنوں کے کلام سے تشبیہ دیتے تھے۔ قرآن کریم نے ان تمام طبقوں کو اسی کی دعوت دی ہے کہ وہ ان طبقات کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات سے آپ کو جانچ لیں۔

سب سے پہلے خود نبی کی ذات پر نظر ڈالیں وہ سب میں معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، اس کے اخلاق، اس کی سلامت فطرت اور اس کی اولو العزمی ضرب المثل ہوتی ہے۔ اس کی صداقت، اس کی دیانت اور امانت اور اس کی خدا ترسی پر کسی کو حرف رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی وہ عدل وانصاف اور غمخواری وہمدردی میں خدا کے بندوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا، کبر ونخوت طمع ولالچ کا کہیں اس کے کوچہ میں بھی گزر نہیں ہوتا اور اس قسم کے جملہ اوصاف اس کی حیات میں اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے دور طفولیت ہی سے ان میں گویا ایک علیحدہ ممتاز انسان نظر آتا ہے۔ اس کی زندگی میں سب سے نمایاں عنصر اس کی راستبازی اور دیانت ہوتی ہے، وہ راستبازی اور دیانت جس کا دشمن بھی اعتراف رکھتے ہیں اور عین عداوت کی حالت میں بھی اس میں ذرا لب کشائی کی مجال نہیں رکھتے۔ اُن کے دلوں میں جذبات اُمنڈتے ہیں کہ کسی حیلہ سے اگر وہ اس پر تہمت لگا سکتے ہیں تو لگا دیں۔ مگر پھر اس کی جرأت اس لیے نہیں کر سکتے کہ اس کی دیانت وامانت کو ایک بدیہی مسئلہ دیکھتے ہیں۔ اس کا ایک راز یہ بھی ہے کہ جو نبی اللہ ہوتا ہے، اس کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے: وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا۔

اس لیے جس نبی کا دعویٰ یہ ہو کہ اس کو اللہ تعالیٰ غیب کی خبریں دیتا ہے اس میں بھی صدق وصفا کا اتنا ظہور ہونا

نبوت کے صدق وصفا کا بلند مقام

چاہیے کہ وہ اس صفت میں بھی تمام کلاموں میں ممتاز نظر آئے۔ یہاں اس کی کوئی تفریق نہیں ہوتی کہ وہ خبریں کس نوعیت کی ہیں معمولی معاملات کے متعلق ہیں یا غیر معمولی، قریبی دور سے متعلق ہیں یا بعید زمانہ سے، دوستوں کے متعلق ہیں یا دشمنوں کے وہ اس عالم کے حوادث سے تعلق رکھتی ہیں یا عالم غیب کے عجائبات سے یہاں بلا تفریق دو باتیں ان سب میں یکساں نمایاں نظر آتی ہیں ایک تو صدق وصفا دوم جزم ویقین واقعات اور اسباب کا رُخ خواہ کسی جانب کیوں نظر نہ آئے مگر نہ تو ان خبروں میں اُس کو ادنیٰ سے کذب کا احتمال ہوتا ہے اور نہ اس کے جزم ویقین میں ذرا سا تذبذب پیدا ہوتا ہے۔ ایک جنگ کا واقعہ ہے کہ آپ کا ایک جانباز صحابی اس بے جگری سے جنگ کرتا نظر آیا کہ دوسرے صحابہ کو بھی اس پر غبطہ ہونے لگا، مگر جب آپ کے سامنے اس کا تذکرہ آیا تو آپ نے فرمایا "وہ تو دوزخی ہے" دیکھیے واقعات کیا ہیں اور رسولِ اعظم کی خبر اس

کے متعلق کتنی بر خلاف ہو لیکن کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ ایک شخص آکر شہادت دیتا ہے۔ یا رسول اللہ جو خبر آپ نے دی تھی وہ مو بمو سچی نکلی۔ اس شخص نے زخمی ہو کر خودکشی کر لی (دیکھو ترجمان السنہ ص)

جنگِ حنین کے واقعہ پر نظر کیجیے جہاں دشمنوں کے شدید حملوں سے تھوڑی دیر کے لیے تو صحابہ کی صفیں بھی پھٹ گئی تھیں اور میدان کا رخ کچھ دوسری طرف نظر آنے لگا تھا حتی کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب صرف چند افراد ہی باقی رہ گئے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ جنگ جتنی خطرناک ہوتی جاتی تھی۔ خدا تعالیٰ کے رسول کا پلہ ثبات اتنا ہی اور مضبوط ہوتا جاتا تھا۔ ابو سفیانؓ کوشش کر رہے تھے کہ اس خطرناک حالت میں آپؐ کی سواری کا ایک قدم دشمن کی جانب بڑھنے نہ پائے مگر دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا رخ دونا دونا دشمن ہی کی جانب کیے جا رہے ہیں حتی کہ جب بہادروں کی آنکھوں کے سامنے بھی صرف موت کا نقشہ تھا، ادھر دیکھتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خچر سے نیچے اترے کھڑے ہیں اور بڑے جزم و یقین کے ساتھ یہ کلمات زبان پر رواں ہیں:۔

انا النبی لا کذب   انا ابن عبد المطلب

میں سچا نبی ہوں جھوٹا نہیں   اور میں ہوں وہی عبد المطلب کا بیٹا

انبیاء علیہم السلام کی صداقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر یہاں تمام زندگی کی خبروں میں ایک بھی خلاف نکل آئے تو سارا کارخانۂ نبوت ہی درہم برہم ہو جائے کیونکہ ان کو خبر دینے والا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور اس کی خبر میں ذرہ برابر بھی کذب کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات آج بھی دوست و دشمن سب کے سامنے کھلی پڑی ہے کیا اس قسم کا کوئی ایک واقعہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے جہاں دشمنوں نے بھی آپ کے متعلق ادنیٰ سی کذب بیانی کا کوئی حرف رکھا ہو، یہاں فیصلہ اکثری حالات پر نہیں ہوتا بلکہ یہاں ساری عمر کی صداقت ایک غلط بیانی سے ختم ہو جاتی ہے۔ پھر جب اس کی خبروں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ان کی نوعیت بھی عام خبروں سے بالکل جدا ہوتی ہے ان میں مختلف انواع، مختلف ادوار اور مختلف طبقات و بلاد کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی سب ہی قسم کی خبریں ہوتی ہیں مگر کیا مجال کہ کسی میں ذرا سا بھی خلاف ثابت ہو جائے۔ اس کے صدق و صفا کی یہ حالت اس کی نبوت کے بعد کے زمانہ سے مخصوص نہیں ہوتی بلکہ اس کی پہلی زندگی بھی اتنی ہی صاف ستھری ہوتی ہے۔ اسی لیے ہرقل شاہ روم نے اس معاملہ میں آپ کی پہلی زندگی کا حال دریافت کیا، اور جب اس کو اطمینان بخش جواب مل گیا تو وہ یہ معقول بات کہنے پر مجبور ہو گیا "یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ انسان جو دوسرے انسانوں کے معاملات میں کبھی جھوٹ نہ بولے وہ خدا تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ باندھنے کے لیے تیار ہو جائے"۔ یہاں ابو سفیان اپنے دورِ جاہلیت میں بڑے پیچ و تاب کھاتا ہے مگر اس کا سر نیچا ہوا اور وہ

ایک حرف بھی اس کے خلاف بولنے پر قادر نہیں ہے۔

قرآن کریم کا حریفوں کے مقابلہ میں اعلان کہ آپ ہرگز کاہن نہیں

بھلا اس مقدس جماعت کو کاہنوں یا شاعروں کے گروہ سے کیا نسبت ہوسکتی ہے لیکن چونکہ اس وقت عرب میں کثرت سے کاہن موجود تھے جو غیب کی خبریں بیان کیا کرتے تھے اس لیے عرب کو یہ تہمت لگانے کا موقعہ مل گیا تھا کہ آپ بھی ان ہی کی طرح ایک کاہن ہیں، مگر یہاں قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ تم کہتے ہو آپ کاہن ہیں۔ اچھا تو دونوں کے خصائص تمہارے سامنے ہیں، جماعتی خصوصیات ہی سے افراد کی شناخت کی جاتی ہے۔ اس معیار پر آپ کو بھی پرکھ کر دیکھ لو۔ تم جانتے ہو کہ کاہنوں کی خبریں اگر دو سچی نکلتی ہیں تو دس جھوٹی۔ پھر بھی بالکل ادھوری اور ناتمام ہوتی ہیں اور اگر خود ان کی ذات کی طرف نظر کرو تو عام طور پر جھوٹے فریبی اور لالچی اس کا راز یہ ہے کہ کاہن کو غیب کی خبریں دینے والا شیطان ہوتا ہے اور شیطان چونکہ خود کذب و زور اور فسق و فجور کا مجسمہ ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی وحی کے لیے بھی ایسی ہی جماعت کا انتخاب کرتا ہے جو اسی کی مذاق کی ہوتی ہیں مشہور ہے: کند ہمجنس با ہمجنس پرواز، کبوتر با کبوتر باز با باز۔ خداتعالیٰ کی نافرمانی اور بہتان طرازی کرکرکے عالم میں شر و فساد کی بنیادیں قائم کرنا ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ — آؤ میں تم کو بتاؤں شیطان کس قسم کے لوگوں کے پاس وحی لے کر

تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ — آتا ہے۔ ان کے پاس آتا ہے جو سخت بہتان طراز اور سخت گنہگار ہوں۔

حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "ابن صیاد" نامی شخص کے حالات سُن کر اس کی تحقیق حال کے لیے تشریف لے گئے اُس وقت آپ نے اپنے دل میں یہ آیت سوچ کر اُس سے پوچھا "بتا میرے دل میں کیا ہے؟" يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُبِينٍ۔ تو جیسا ناتمام خبریں دینا کاہنوں کا خاصہ ہوتا ہے اُس نے بھی کہا آپ کے دل میں کچھ دُخ دُخ کا لفظ سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا یہ ناتمام جواب سُن کر آپ نے فوراً اس کے کاہن ہونے کا فیصلہ فرما دیا اور کہا۔ إخسأ فلن تعدو قدرك انما انت من اخوان الكهان۔ جا دور ہو جا تو اپنی اوقات سے آگے نہیں بڑھ سکتا تو تو ٹھیک کاہنوں کی جماعت میں سے ہے اور بس۔

جس طرح کاہنوں کی ذات اپنے قبیح اوصاف میں ممتاز اور علیحدہ ہوتی ہے، اسی طرح ان کے کلام کی نوعیت بھی رسولوں کے کلام سے علیحدہ اور جُدا ہوتی ہے۔ وہ بہ تکلف اپنے کلام میں سجع بندیاں کرتے ہیں اور یہاں ان کو حق و باطل سے کوئی بحث نہیں ہوتی چنانچہ آپ کے زمانہ میں ایک شخص حمل بن مالک نے آپ کے ایک فیصلہ پر جو آپ نے ایک عورت کے حمل ضائع کردینے پر مجرم کے متعلق صادر فرمایا تھا یہ کلمات کہے: ایودی من لاشرب

ـــه حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں: وهذا الاسم ليس بذم عند اهل الكتاب بل يسمون اكثر العلماء بهذا الاسم. کتاب النبوات۔ ص ۲۴۰ یعنی اہل کتاب میں کاہن کا لقب معیوب نہ تھا، اس لیے وہ بلا کسی اعتراض کے اپنے علماء کو کاہن کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

ولا اکل، ولا نطق ولا استھل، فمثل ذلک یطل۔ یعنی بھلا ایسے حمل ضائع کرنے کی دیت بھی کہیں لازم ہوا کرتی ہے جس نے اب تک نہ کھایا ہو نہ پیا ہو بلکہ آواز تک بھی نہ نکالی ہو، وہ تو قابل معافی ہونا چاہیے یہ سن کر آپ نے فرمایا انما انت من اخوان الکھان۔ تو تو کاہنوں کی طرح فقرہ باز شخص معلوم ہوتا ہے۔ اس مسجع کلام کی مناسبت ہی سے قرآنِ کریم نے کاہن اور شاعر کو ایک سیاق میں جمع فرما دیا ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ	یہ قول ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا اور نہیں ہے یہ قول کسی
شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ . وَلَا بِقَوْلِ	شاعر کا، تم تھوڑا یقین کرتے ہو اور نہیں ہے قول کاہنوں کا
كَاهِنٍ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ . تَنْزِيْلٌ	تم بہت کم دھیان کرتے ہو۔ یہ اُتارا ہوا ہے جہان کے
مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ . (الحاقہ)	رب کا۔

قرآن کریم کا اعلان کہ آپ شاعر بھی نہیں

غرض جب آپ کی صفات اور آپ کے کلام کی صفات دونوں کاہنوں کی جماعت سے جدا جدا ہیں تو پھر آپ پر کاہن کا شبہ کرنا کیسے درست ہے۔ تم کہتے ہو آپ شاعر ہیں۔ اچھا شاعروں کو بھی تم خوب جانتے پہچانتے ہو ان کی اور آپ کی خصوصیات کا موازنہ کر لو تم کو خود معلوم ہو جائیگا یہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ارشاد ہے :۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰس)	ہم نے نہ شعر گوئی آپ کو سکھائی نہ یہ شان نبوت کے مناسب تھی
وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (الشعراء)	شاعروں کی بات مانتے ہیں بے راہ چلنے والے۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں،
اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ . (الشعراء)	اور کہتے ہیں ایسی باتیں جو کرتے نہیں۔

یعنی اس رسول اُمّی کو جو کچھ سکھایا یا پڑھایا ہے ہم ہی نے سکھایا پڑھایا ہے۔ بس پہلی بات تو یہ ہے کہ جو اس کا معلم ہے وہی خود اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہم نے شعر گوئی کی اس کو تعلیم نہیں دی تو پھر یہ شاعر ہو کیسے سکتے ہیں اور جو بات انسان کو سکھائی نہیں جاتی اگر وہ اس کو نہیں جانتا تو یہ اس کا کوئی عیب بھی نہیں اور یہاں تو برعکس اس علم کی تعلیم ہی ان کے حق میں عیب ہے، کیونکہ منصب نبوت شاعری سے کہیں بلند تر ہوتا ہے۔ شاعروں کو دیکھو تو ان کے پیچھے لگنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو صحیح اور پُر از حقیقت باتوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ شاعر محض مبالغہ آمیزی، خیال بندی اور بے حقیقت باتوں کو حقائق کے رنگ میں دکھلانے کے درپے ہوتے ہیں ان کے اشعار دیکھو تو معرفت سے لبریز، اعمال کا جائزہ لو تو رند مشرب۔ اُدھر انبیاء علیہم السلام کو دیکھو تو ان کے اقوال و اعمال میں سر مو مخالفت نہیں ہوتی، وہ جو بات زبان سے نکالتے ہیں پہلے اس پر خود عمل کرتے ہیں، ان کے کلام کو دیکھو تو اس کو مبالغہ اور خیال بندی سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا اگر کہیں وہ بھی مبالغہ آمیزی کا مزاج رکھتے تو

جنت و دوزخ ، ثواب و عذاب اور اس سے بڑھ کر ذات و صفات کا نازک اور پُر از حقیقت کارخانہ سب درہم و برہم ہو کر رہ جاتا، ان کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ حقیقت کے کانٹے پر تُلا ہوا نکلتا ہے یہاں رضا و غضب کی بے اختیاری حالت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا حتیٰ کہ ان کے کلام میں تشبیہات کا باب بھی اس معیار سے نہیں اُترتا۔ اُن کی تشبیہات میں بھی ایک حقیقت اور اُس حقیقت میں صداقت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تشبیہ و استعارات عام محاورات کے مطابق کثرت سے نہیں ملتے۔ اس کے باوجود جب اس کو بلاغت کے معیار پر پرکھا جاتا ہے تو وہ اعجاز کی سرحد سے ملا ہوا نظر آتا ہے جو تاثیر دوسرے کلاموں میں سو طرح کی مبالغہ آمیزیوں کے بعد بھی پیدا نہیں ہوتی وہ ان کے روزمرہ کے کلام میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ بس اسی تاثیر کو دیکھ کر کافر مجبور ہو جاتے تھے کہ اس کو سحر کہہ دیں یا شاعر قرار دیں۔ مگر قرآن کریم کا معقول فیصلہ یہاں بھی یہ ہے کہ آپ کی صفات کو دیکھو کیا ان میں شاعروں کی ایک صفت بھی ہے۔ پھر آپ کے کلام پر بھی غور کرو اس میں عالم غیب اور انبیاء علیہم السلام کے مقدس گروہ اور ان کے دوستوں اور دشمنوں کے عواقب کے سوا کہیں شاعرانہ مضامین کا تذکرہ ہے؟ اگر ان کی ذات شاعروں کی صفات سے منزہ و مبرا ہے اور اسی طرح اُن کا کلام بھی شعر و سخن کی خصوصیات سے بالکل ممتاز ہے تو پھر اُن کو شاعر کہنا کتنا نامعقول ہو۔

قرآن کریم کا اعلان کہ آپ کو ساحر و مجنون کہنا بھی انتہا درجہ ظلم اور سفاہت ہے

اچھا تم کہتے ہو آپ ساحر و مجنون ہیں تو لو اس جماعت کی خصوصیات پر بھی آپ کو جانچ لو۔ ساحر بد عمل صرف انسانوں میں کچھ تصرف کرنے کی مشق رکھتا ہی خواہ وہ نظر بندی کی حد تک ہو یا اس سے زیادہ مرض اور ہلاک کرنے کی حد تک بھی ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو ساحر مقابلہ کے لیے آئے تھے اُن کے قصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جادو کا اثر کچھ نہ کچھ حواس انسانی پر ضرور پڑتا ہے۔ ارشاد ہے :۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ (الاعراف)

جب انہوں نے ڈالا تو باندھ دیں لوگوں کی آنکھیں اور ان کو ڈرا دیا اور بڑا جادو کیا۔

پھر ساحر کی زندگی دیکھو تو ہمیشہ ایک پست زندگی ہوتی ہے، اُس کا نصب العین صرف چند دراہم ہوتے ہیں آخرت کی لازوال حیات ان کے دائرۂ فکر میں بھی کہیں نہیں گذرتی۔ ان کے عملیات کو دیکھو تو اپنے عملوں میں وہ ہمیشہ ارواح خبیثہ اور شیاطین سے استعانت طلب کیا کرتے ہیں اور جو امر خارق دکھاتے بھی ہیں وہ اُس اندازہ کے مطابق ہی ہوتا ہے جتنا کہ شیاطین کا مقدور ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ ساحروں کے سامنے آخرت کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى

اور وہ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ جس نے جادو اختیار کیا اُس کے لیے

الآخرة من خلاق۔ آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

اب اس کے بالمقابل انبیا علیہم السلام کی جماعت کو دیکھو تو ان کی تمام زندگی تقویٰ و طہارت، عفت و پاکیزگی اور اخلاق و مروت کا مرقع ہوتی ہے ان کا بڑا نصب العین آخرت کے فوز و فلاح اور بنی نوع انسان کے دارین کی فلاح و بہبود ہوتی ہے ذاتی منافع کا ان کے دماغوں میں کہیں گزر نہیں ہوتا، شرک و کفر اور استعانت بغیر اللہ سے بیزاری تو ان کے دین کی بنیاد ہوتی ہے۔ اُن کے معجزات کے مقابل جو بھی آتا ہے اس کو ہمیشہ شکست فاش ہوتی ہے ساحرین موسیٰ علیہ السلام کا حشر جابجا قرآن کریم میں مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قرآن کریم کے بالمقابل جو کلام پیش کیے گئے ہیں وہ آج تک اپنے قائلین کے لیے صفحات تاریخ پر قابل مضحکہ بنے ہوئے ہیں پھر ساحر تو حواس کو معطل اور بیکار کرتا ہے اور یہ جماعت معطل شدہ حواس کو اور بیدار کرتی ہے چنانچہ جب عطاء بن یسار نے عبداللہ بن عمرو سے آپ کے اُن اوصاف کے متعلق پوچھا تھا جو تورات میں مذکور تھے تو اُنہوں نے منجملہ دیگر صفات کے یہ بھی بیان کیا تھا ولن اقبضہ حتیٰ اقیم بہ الملۃ العوجاء فافتح بہا اعینا عمیا واذانا صما وقلوبا غلفا۔ یعنی وہ رسول ایسا ہوگا کہ میں اس وقت تک اس کو نہیں اٹھاؤنگا جب تک کہ اس کے ذریعہ کج شدہ ملت کو پھر سیدھا نہ کردوں اور اندھی آنکھوں کو پھر بینا اور بہرے کانوں کو پھر شنوا اور غافل دلوں کو پھر سرنو کھول نہ دوں۔

حافظ ابن تیمیہؒ کی تحقیق کہ نبی اور ساحر میں فرق بدیہی ہے

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ نبی اور ساحر و مجنون میں زمین و آسمان کا فرق ہے بلکہ ان میں کوئی اشتراک ہی نہیں۔ ان دونوں میں خبر، مخبر اور غایت ہر لحاظ سے فرق ہے۔ نبی کو خبر دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہوتی ہے اور ساحر کو شیطان۔ نبی کی وحی سرتاسر ہدایت ہی ہدایت ہوتی ہے اور شیطان کی ضلالت ہی ضلالت نبی کے کلام میں صدق ہی صدق اور حقیقت ہی حقیقت ہوتی ہے اور ساحر و مجنون کا کلام بیشتر کذب ہی کذب اور بے معنی باتوں سے مملو اور صرف خیال ہی خیال پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِندَ	یہ قرآن اُس فرشتہ کا آوردہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہو عزت والا
ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ وَ	ہو قوت والا ہو عرش کے مالک کے نزدیک بڑے درجہ والا
مَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ	ہو اور سب کا مانا ہوا ہو اور وہاں کا معتبر ہے۔ اور یہ تمہارے رفیق
الْمُبِينِ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ	کچھ دیوانے تو نہیں اور وہ اس فرشتہ کو آسمان کے صاف کنارے
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ فَأَيْنَ	پر ایک بار پہلے بھی دیکھ چکے ہیں اور نہ وہ غیب کی بات جاننے میں
تَذْهَبُونَ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ	بخیل ہیں۔ یہ قرآن کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے پھر تم کدھر

(سورۂ تکویر)

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس کا تخیل کیسے ہو سکتا ہے یہ ایک فرشتہ کا آوردہ ہے جو آپ سے منفصل اور اپنا علیحدہ وجود رکھتا ہے اور وہ بھی اپنی جانب سے خود کچھ نہیں کہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوتا ہے جو اس کو حکم ملتا ہے بس وہی کہتا ہے۔ اور نہ یہ قرآن شیطان مردود کا قول ہو سکتا ہے بھلا کہاں وہ فرشتہ جس کی صفات یہ ہوں کہ جس کی جانب سے وہ یہ قرآن لاتا ہے اس کے نزدیک وہ حرمت و عزت والا ہو اور مراتب قرب میں سب فرشتوں میں بلند پایہ ہو، آسمانوں کے سب فرشتے اس کی بات مانتے ہوں اور اس پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہوں، اور کہاں وہ شیطان لعین جس کی دنائت اور خست کے لیے صرف اس کا مردود ہونا ہی کافی ہے، وہ بھلا ایسا کلام کیسے نازل کر سکتا ہے جس میں بنی آدم کی سرتاسر بھلائی ہو اور جس میں خود جا بجا اسی کی مذمت کی گئی ہو۔ یہ فرق تو مخبر کی جہت سے تھا اب اگر رسول ملکی سے گزر کر خود اس کی ذات یعنی رسول بشری کی صفات ملاحظہ کرو تو تم چالیس سال سے برابر اس کو دیکھتے چلے آئے ہو یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ وہ تم میں عاقل سے عاقل سلم رہا ہے یا نہیں، پھر اس کو مجنوں کیسے کہا جا سکتا ہے، پھر جس کی سخاوت کا یہ عالم ہو کہ وہ آخرت کے لازوال خزانے دنیا کو مفت لٹا رہا ہو اس کو بھلا اس ساحر اور کاہن سے کیا نسبت ہو سکتی ہے جو ذرا سی بات بھی شیرینی لیے بغیر بتانا نہیں جانتا۔ اس کے بعد اگر اس پر نازل شدہ کلام کی نوعیت پر غور کرو گے تو روز روشن کی طرح واضح ہو جائیگا کہ یہ قرآن کسی خاص ملک یا کسی خاص زمانہ کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے اور تمام جہانوں کے لیے ایک مجسم نصیحت ہے۔ ایسے مفید کلام کا بھلا کاہن و ساحر اور مجنونوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ساحر و مجنون کے کلام کی غایت و غرض چند اوہام مغشوشہ جمع کرنا ہوتا ہے اور یہاں قرآن کریم دارین کی فلاح و بہبود کے لیے ایک پیغام ہے۔ پس انبیاء علیہم السلام اور ساحر و کاہن کے مابین اتنا ہی فرق سمجھنا چاہیے جتنا کہ فرشتہ اور شیطان کے درمیان ہوتا ہے۔

مجنون کا تو پوچھنا ہی کیا ہے وہ تو حق تعالیٰ کی سب سے عام نعمت یعنی نعمت عقل ہی سے محروم ہوتا ہے اس کے اقوال و افعال کسی اخلاقی معیار پر تو کیا تولے جاتے وہ سرتاپا لغویات اور بے معنی ہوتے ہیں۔ یہ الزام اس شخصیت پر لگانا جس کی ایک ایک بات دانائی و فراست، علم و عاقبت اندیشی سے لبریز ہو کیسے معقول ہو۔ ارشاد ہے:

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم) تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانہ نہیں ہو اور تمہارے لیے ثواب ہے بے انتہا اور تم تو فطرتاً بلند اخلاق ہو۔

مشرکین کے بے حقیقت اعتراض کی طرف قرآن کریم کے التفات فرمانے کی حکمت

قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب عرب تھے، ان کے دماغوں کی رسائی یہیں تک تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر ساحر و شاعر اور کاہن و مجنوں ہونے کے بدیہی البطلان الزامات تھوپ دیں۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ مگر قرآن نے ان بے معنی

الزامات کا جواب بھی بڑا مدلل، بڑی فراخدلی اور بڑے معقول انداز سے دیا ہے، اور انداز بیان ایسا انوکھا اختیار فرمایا ہے کہ اس سے جہاں ایک طرف معاند مخاطبین کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اس قسم کی آئندہ موشگافیوں کا بھی شافی جواب ہو جاتا ہے۔ نیز اس تقریب سے بہت سے حقائق بلند اور معارف ارجمند بیان میں آجاتے ہیں۔ مثلاً آیات بالا ہی کو ملاحظہ فرمائیے۔ سیاق کلام تو ایک ایسے بے سروپا الزام کے جواب میں ہے جس کا یہاں کوئی احتمال ہی نہ تھا، مگر کیا کیا جائے کہ جب اس وقت قرآنِ کریم کے مخاطبین قرآنی دعوت قبول کرنے کے لیے یہ بھی ایک بہانہ بنا رہے تھے تو مقاصد تبلیغ کے پیشِ نظر یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کا بھی جواب دے دیا جائے، مگر قرآنِ کریم نے جب ادھر توجہ فرمائی تو اس انداز سے فرمائی کہ اُن کے جواب کے ساتھ ساتھ مقام رسالت و نبوت کے بعض ایسے گوشے بھی سامنے آگئے جن کی طرف کسی کا ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے یہ تنبیہ کی کہ انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعت بہت سی صفات میں ممتاز ہوتی ہے، ان کی پرورش ابتدا ہی سے نعمت کے گہوارہ میں ہوتی ہے حتی کہ سب سے اول انعمت علیہم کا مصداق وہ ہوتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق یہاں ان کی طفیلی نظر آتی ہے۔ پھر جس ذات برتر کا تذکرہ آج تمہارے سامنے ہے وہ تو انعمت علیہم میں بھی وہ شان رکھتی ہے جس کو واتممت علیکم نعمتی میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی منعم حقیقی نے اپنے انعامات کی دولت تو بہتوں پر تقسیم کی ہے مگر ان کی ذات پر تو اپنی خاص نعمت کو پورا فرما دیا ہے۔ اب سوچو کہ جو خدا تعالیٰ کی مخلوق میں منعم علیہم کی پہلی صف میں ہو پھر ان میں بھی اتممت علیکم کا تاج اس کے سر پر نظر آ رہا ہو حتیٰ کہ رحمۃ للعالمین اس کا لقب بن چکا ہو کیا اس کو مجنون کہا جا سکتا ہے جو کہ خدا تعالیٰ کی عام نعمت جس میں سب شریک ہوتے ہیں یعنی عقل اس میں بھی حصہ دار نہیں ہوتا۔ اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کی دوسری امتیازی شان ان کا مستقبل ہے، وہ اتنا شاندار ہوتا ہے کہ بقیہ تمام مخلوق کا مستقبل گویا ان کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی تمام مخلوق کو صراط مستقیم کی ہدایت فرمانے والے وہی ہوتے ہیں اس لیے اُمت میں جو فرد بھی کوئی حسنہ کرتا ہے اس کا ثواب ان کو بھی ملتا ہے اور اس طرح اپنے اعمال کے ساتھ ساتھ تمام اُمت کے اعمال کا ثواب بھی ان کے اعمالنامہ میں درج ہو جاتا ہے پھر ان کے مستقبل کا پوچھنا کیا اور جن کا تذکرہ یہاں ہے چونکہ ان کی اُمت کے بعد کوئی دوسری اُمت نہیں اس لیے جب ان کی اُمت اور اُن کے اعمال کا ثواب لا انتہائی ہے تو پھر آپ کے ثواب کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے وہ بھی بے انتہا اور بے حساب ہے کیا ایسی ذات پر بھی مجنون کی تہمت لگائی جا سکتی ہے جس کے ایک عمل کا بھی کچھ ثواب نہیں ہوتا۔ تیسری سب سے کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ ہر نبی اپنے اپنے زمانہ میں اخلاق جمیلہ کی تصویر ہوتا ہے۔ خدا کی مخلوق میں جو بھی صحیح اخلاق سیکھتا ہے ان سے سیکھتا ہے۔ پھر جس ہستی کا تذکرہ تمہارے سامنے ہے ان کے اخلاق کے متعلق تو خود خالق کائنات خلق عظیم فرماتا ہے۔ انک لعلی خلق عظیم ایسی مجسم اخلاق ذات پر مجنون کی تہمت، کتنا عظیم ظلم ہے۔ غریب مجنون کا تو ایک

عمل بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ اخلاق کے معیار پر نہیں تولا جا سکتا۔ آپ نے دیکھا کہ یہاں جو مخاطبوں نے کہا وہ تو اُن کے ظرف کے مطابق تھا لیکن جو جواب ان کو قرآن نے دیا وہ اس کی شان رفیع کے مطابق تھا۔ اس لیے یہ دیکھنا نہیں چاہیے کہ الزامات اور اعتراضات کی حیثیت کتنی رکیک ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ جواب کی جو نوعیت قرآن نے اختیار فرمائی کتنی بلند ہے جس سے کہ نہ صرف ان جاہل معاندوں کا جواب ہو جاتا ہے بلکہ اہل علم طبقہ کے لیے ایک ایسے جدید علم کا دروازہ کھل جاتا ہے جو ابن سینا جیسے عاقل پر نہ کھل سکا۔ قرآن کریم کے اسی فیصلہ کے ماتحت اب یہاں ابن سینا جیسے عقلاء کو بھی غور کر لینا چاہیے کہ دنیا میں کیا صفراوی مریضوں کے اوصاف بھی یہی ہوئے ہیں۔ کیا کبھی تاریخ نے ان کی صفات اور ان کے متبعین کی صفات، ان کی مخالفت اور موافقت کے نتائج اسی طرح مدون کیے ہیں جس طرح کہ انبیاء علیہم السلام کے۔ کیا صفراوی مریضوں نے اسی تسلسل کے ساتھ اپنے بعد میں آنے والوں کی بشارتیں اسی طرح سُنائی ہیں۔ کیا عالم کی ہوشمند جماعتوں نے اُن کے ہذیانات کو اسی طرح اپنا نصب العین بنایا ہے۔ بس اسی ایک نقطہ پر نظر کرنے سے جہاں عرب کے جاہلوں کا جواب ہو جاتا ہے اسی طرح ابن سینا جیسے عقلاء کا جواب بھی نکل آتا ہے۔

یہاں ابن سینا اور اس کے ہم مشربوں کو غور کرنا چاہیے کہ اگر کارخانہ نبوت عالم خیال سے متعلق ہوتا تو خیالات سے تأثر کی زیادہ صلاحیت یا عورتوں میں ہوتی ہے یا پھر بچوں میں عورت بھی اپنے صنفی ضعف کی وجہ سے ان کا زیادہ اثر لیتی ہے اور اسی طرح بچہ بھی خیالات کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے، اسی لیے مسمرزم کے لیے جب کسی معمول کی تلاش ہوتی ہے تو بچہ ہی تلاش کیا جاتا ہے۔ لیکن جب آپ نبوت کی تاریخ اُٹھا کر پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں نہ عورتوں میں کوئی نبی گزرا ہے اور نہ بچپن میں نبی مبعوث ہوئے ہیں۔ نبوت کے لیے قدرت نے ابتداء ہی سے وہی صنف پسند فرمائی ہے جو تأثر سے نسبتًہ بالاتر تھی اور اُن میں بھی جن کو نبوت سے سرفراز کیا ہے ان کو جسمانی طاقتوں میں بھی دوسرے افراد پر فوقیت بخشی ہے پھر بعثت کے لیے بالعموم وہی عمر مقرر کی گئی ہے جو خیالات سے آزاد ہونے کی عمر ہے یعنی چالیس سال۔ اس کے بعد جو تعلیمات ان کو دی جاتی ہیں جب ان پر نظر کیجیے تو وہ بھی شاعرانہ مضامین کی طرح صرف نازک خیالی کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا ایک مکمل دستور العمل ہوتی ہیں اُن کی تعلیمات کا اگر ایک حصہ عالم غیب کی غیر مدرک جزئیات پر مشتمل ہوتا ہے تو دوسرا بڑا حصہ باہمی معاشرت و معاملات کے متعلق بھی ہوتا ہے اس میں جہاں بانی کے اصول بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ معیار عقل پر پرکھے جاتے رہے ہیں اُن پر عمل کر کے جو قوم بکریاں چرایا کرتی تھی وہ تخت و تاج کی مالک بن چکی ہے۔ صفحۂ عالم پر کوئی جماعت ایسی نہیں ملتی جس کے اصول میں کچھ نہ کچھ تفاوت موجود نہ ہو لیکن انبیاء علیہم السلام کی ایک لاکھ سے زیادہ کی عظیم الشان جماعت میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ملتا جس کی اصولی تعلیمات میں ایک ذرہ کا بھی فرق ثابت کیا جا سکے

ان کی عظیم الشان جماعت میں کبھی کوئی نبی دوسرے کی کاٹ پر نظر نہیں آتا، ہمیشہ ایک دوسرے کا احترام کرتا ہے اور اپنی اُمتوں کو بھی اسی کی ہدایت کرتا ہے اور اگر اس میں کوئی ذرا سی بھی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کو ایسا ہی مجرم قرار دیتا ہے جیسا اپنی اہانت کرنے والے کو ان معمولی اور کھلے ہوئے امتیازات کے بعد بھی انبیاء علیہم السلام کی جماعت اور ان کے علوم کا نہ پہچاننا یا ان کو شعبدہ بازوں اور خفتہ انسانوں سے تشبیہ دینا بداہت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تاریخ کو انصاف و غور کے ساتھ مطالعہ کرنے کی کبھی فرصت ہی تلاش نہیں کی گئی اور اگر کبھی ادھر توجہ کی گئی ہے تو صرف اسی نظریہ سے کی گئی ہے کہ ان کے انکار کو کس طرح اور مدلل و مبرہن کیا جائے اور اس طرح اس کھلے ہوئے مسئلہ کو خود بخود بھول بھلیاں بنا دیا گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کی صفات حمیدہ کے مشاہدہ کرلینے کے باوجود ابتداء میں مشرکین عرب نے آپ کو کیوں نبی نہیں مانا ؟

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عام طور پر عرب انبیاء علیہم السلام کی جنس ہی سے ناآشنا تھا۔ اس لیے ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوی نبوت بالکل ایک جدید اور اجنبی آواز تھی وہ آپ کے متعلق بعید سے بعید بات سوچ سکتے تھے مگر جو بات ان کے دماغوں میں نہیں آسکتی تھی وہ صرف آپ کی نبوت تھی۔ اسی لیے ان کے مقابلہ میں قرآن کریم نے اپنا اسلوب بیان بدل دیا ہے۔ اس نے مکی سورتوں میں جس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی جنس کی آمد کا اثبات ہے، اس نے بتایا ہے کہ تم خود ان کے حالات پڑھو پھر اہل کتاب سے بھی جو اس جنس کے قائل ہیں جا کر پوچھ لو۔ ان کے مخالفوں کا حشر دیکھو۔ ارم کے اُجڑے ہوئے سبزہ زار، قوم لوط علیہ السلام کے اُلٹے ہوئے دیار اور عاد و ثمود کی ویران بستیاں یہ سب تم کو شہادت دینگے کہ جن اقوام نے خدا تعالیٰ کے رسولوں کی مخالفت کی ہے وہ کس طرح برباد ہو کر رہ گئی ہیں۔ دریائے نیل اور کوہ جودی اس کے گواہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے رسولوں کی بات نہ ماننے والوں کا نام و نشان صفحۂ عالم سے کس طرح مٹ گیا ہے اور جنہوں نے ان کی اتباع کی ہو وہ کس طرح کامیاب اور خدا کی زمین کے وارث بن گئے ہیں۔ ان واقعات پر اگر انصاف سے نظر کرو گے تو تم کو اعتراف کرنا پڑیگا کہ بیشک یہ اولوالعزم ہستیاں اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ اور اس کی رسول تھیں۔

پس اگر ان حالات پر غور کرنے کے بعد تم اس نتیجہ پر پہنچتے ہو تو اب تمہارے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر یقین لانا ایک بدیہی مسئلہ ہوگا۔ یہاں بھی آپ کے مخالفوں کا حشر اور متبعین کی سرسبزی و کامیابی اپنے سامنے رکھو، آپ کے کمالات اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے کمالات کا موازنہ کرلو آسمانی صحائف سب ایک طرف اور دوسری طرف اکیلے قرآن کریم کو رکھ لو، تم کو روشن ہو جائیگا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ اگر آپ کے آثار و برکات کا موازنہ کرنا ہو تو آپ کی اُمت موجود ہے، اس کی جاں نثاری، اس کی بے مثال قربانی، اس کی ہمدردی اور خدا ترسی، اس کا

عدل وانصاف اور اس کے اخلاق وشمائل سب تاریخ میں مدون ہیں، تم بہت آسانی کے ساتھ فیصلہ کرلوگے کہ یہ اُمت ان اوصاف اور برکات میں جملہ امتوں سے آگے ہے یا نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اگر پہلی اُمتوں کے رسول خدا کے سچے رسول تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے سچے رسول نہوں ارشاد ہوتا ہے:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ (الفتح)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ شدید ہیں کافروں کے حق میں اور رحم دل آپس میں تم ان کو دیکھو گے رکوع میں ہیں اور سجدہ میں ہیں اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشی کے جویاں ہیں۔

آیت بالا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت پر غور کرنے کے لیے آپ کے آثار وبرکات اور خاص طور پر ان انقلابی اثرات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو عرب کی فطرت ہی کے بالکل متضاد تھے دیکھو وہ آپؐ سے قبل کس طرح باہم دشمن تھے اور آپ کے بعد کیسے فداکار دوست بن گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ عبودیت کتنا کٹ چکا تھا اور آپؐ کے بعد کتنا مستحکم اور عمیق ہوگیا تھا کہ ان کے سامنے ایک اس کی رضا کے سوا کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہا تھا۔ ان کے باطن کے تذلل وعبودیت کی کیفیات ان کے چہرہ بشرہ بلکہ جسم کے ایک ایک رونگٹے سے کس طرح ٹپکتی تھیں۔ بس جس نے ایک ایسی اُمت کی دنیا میں بنیاد ڈالی ہو اس کے آثار وبرکات کا پوچھنا کیا ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی یہاں رسولوں کی جنس کا قائل ہوگا اس کو آپ کی رسالت بھی طوعاً وکرہاً تسلیم کرنی ہوگی۔

درحقیقت گزشتہ اقوام کے حالات کی تکرار میں بڑی روح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا اثبات ہے۔ ارشاد ہے:۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ فَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۔ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ (الحج)

تو کتنی بستیاں ہم نے غارت کر ڈالیں اور وہ گنہگار تھیں وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کوئیں نکمے پڑے ہیں اور کتنے پختہ محل کیا انھوں نے سیر نہیں کی ملک کی جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے تو یہ بات نہیں ہے کہ آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں لیکن وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (الاحقاف) کہہ دو کہ میں کوئی نیا رسول نہیں آیا ہوں۔

اسی طرح کفار مکہ کی تکذیب پر آپ کے لیے جو سامانِ تسلی بیان فرمایا گیا ہے وہ بھی انبیاء علیہم السلام اور ان کی

قوموں کی تلخ سرگزشت ہے۔

وَاِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ	اور اگر وہ تم کو جھٹلائیں تو ان سے پہلے قوم نوح اقوم ثمود
قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ وَقَوْمُ اِبْرٰهِیْمَ	قوم عاد، قوم ابراہیم، قوم لوط اور مدین کے لوگ بھی جھٹلا
وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ مَدْیَنَ وَکُذِّبَ	چکے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) بھی جھٹلائے گئے پھر میں
مُوْسٰی فَاَمْلَیْتُ لِلْکٰفِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ	نے ڈھیل دی ہے منکروں کو پھران کو پکڑلیا تو دیکھا میرے
فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ۔ (الحج)	انکار کا حشر کیا ہوا۔

غرض ان حقائق کے ماتحت یہ انصاف کرلو کہ یہ مقدس گروہ خدا تعالیٰ کے سچے رسول تھے یا نہیں اس کے بعد یہ فیصلہ کرلو کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کی صف میں شامل ہو کر دنیا میں صرف کہانیاں بن کر رہنا پسند کرتے ہو یا اس کے وارث اور خدا تعالیٰ کے ملک کے مالک بن کر باقی رہنا چاہتے ہو۔ جو قوم رسولوں کی مقدس تاریخ سے واقف نہ تھی ان کے سامنے علامات نبوت اور سابق بشارات بیان کرنا بے سود ہے۔ اب آپ یہ بھی سمجھ گئے ہونگے کہ عرب کیوں آپ کی نبوت کی طرف نہیں آتا تھا اور کیوں ساحر و مجنون کے بیجا الفاظ آپ کے متعلق کہتا تھا۔

ضرورت نبوت و رسالت

مذکورہ بالا عنوان ترتیب کے لحاظ سے تو سب سے پہلا عنوان ہے گر ہم نے اپنے مخاطبوں کی رعایت سے اس کو دوئم نمبر میں رکھا ہے۔ ہمارا خطاب یہاں ان اصحاب کے ساتھ ہے جو انبیاء (علیہ السلام) پر ایمان لاچکے ہیں اور صرف اپنے اطمینان قلبی کی خاطر کسی قدر اس کی وضاحت کے متلاشی ہیں اُس جماعت سے ہمارا خطاب ہی نہیں ہے جو انبیاء علیہم السلام کی علی التواتر آمد اور اب ان کے خاتمہ کے قطعی اعلان کے بعد بھی ابھی اسی میں بحث کر رہی ہے کہ عالم انسانی کو اپنی ہدایت کے لیے کسی سماوی ہدایت اور سماوی ہادی کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ ساری یوسف زلیخا پڑھ لینے کے بعد یہ سوال کرنے والے کہ زلیخا مرد تھی یا عورت ہمارے نزدیک قابل خطاب نہیں ہیں۔

امام رازیؒ تفسیر کبیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفت حاکمیت اور ملوکیت کا یہ تقاضا ہے کہ جس طرح شاہان دنیا اپنی رعایا کے پاس اپنے ملک کا قانون خود لے کر نہیں آیا کرتے بلکہ اس کے لیے اپنے پیغمبر اور رسول مقرر کیا کرتے ہیں اور ان کے واسطہ سے اپنا ملکی قانون بھیجا کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی اپنی مخلوق کے پاس اپنے رسول بھیجے اور ان کی معرفت اپنا قانون ان کو بتائے پھر اس کی صفت حکمت یہ چاہتی

ہو کہ اس پر عمل کرنے والوں کو انعام اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا بھی دے گو اس کے علی الاطلاق خالق اور حاکم ہونے کی وجہ سے اس کے بغیر بھی جزا و سزا دینے کا اس کو حق حاصل تھا لیکن اس کی صفت حکمت نے یہ تقاضا کیا کہ جن کو سزا دے ان کو پوری تفہیم کے بعد دے تاکہ عام عدالت کے دن کسی کو اپنی لاعلمی کے عذر کا موقعہ بھی نہ رہے، ارشاد ہے۔

يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا	اے اہل کتاب جب رسولوں کا آنا مدتوں تک نہ ہوا پھر ہمارے
يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ	یہ رسول تمہارے پاس آئے جو صاف صاف احکام الٰہی بیان
أَن تَقُولُوا مَا جَآءَنَا مِنۢ بَشِيرٍ وَلَا	کرتے ہیں اور ان کو ہم نے اس لیے بھیجا ہے مبادا کل تم کہنے لگو
نَذِيرٍ فَقَدْ جَآءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ	کہ ہمارے پاس تو نہ کوئی رسول خوشخبری سنانے والا آیا اور نہ
(المائدہ رکوع ۳)	ڈرانے والا تو لو اب تمہارے پاس خوشخبری سنانے والا اور ڈرانیوالا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

وَلَوْ أَنَّآ أَهْلَكْنَٰهُم بِعَذَابٍ مِّن قَبْلِهِۦ	اگر ہم قرآن اتارنے سے قبل ہی کسی عذاب سے ان کو ہلاک کر دیتے
لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَآ أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا	تو وہ ضرور یہ عذر کرتے کہ ہمارے پروردگار تو نے ہمارے پاس
فَنَتَّبِعَ ءَايَٰتِكَ مِن قَبْلِ أَن نَّذِلَّ وَنَخْزَىٰ	کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے ہم تیرے حکموں پر چلتے
وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا	ہم عذاب نہیں دیتے جب تک کہ پہلے اپنا کوئی رسول
(بنی اسرائیل)	نہ بھیج دیں۔

امام موصوف لکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت عقلاً تمام مخلوق پر واجب ہے اور انبیاء علیہم السلام کے بغیر یہ معرفت حاصل ہونا ہی ناممکن ہے اس لیے نبوت و رسالت کا انکار درحقیقت حق تعالیٰ کی ذات پاک کا ہی انکار ہے، ارشاد ہے :۔

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦٓ إِذْ قَالُوا	انہوں نے حق تعالیٰ کے کمالات کا ٹھیک اندازہ ہی
مَآ أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ	نہیں لگایا جبکہ یہ کہا کہ اس نے کسی بشر پر کوئی کتاب ہی
(انعام)	نازل نہیں فرمائی۔

یعنی جب یہ لوگ رسولوں پر شریعت کے نزول کا انکار کرتے ہیں تو گویا خدا تعالیٰ کی جانب سے رسالت ہی کا انکار کرتے ہیں اور رسالت کا انکار اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو خدائی صفات اور اس کے کمالات کی برتری کا کوئی اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ آج دنیا کی اقوام پر نظر ڈال لیجیے آپ کو ثابت ہو جائیگا کہ جو قوم نبوت و رسالت کی منکر ہوئی ہے اس کو پھر خدائی معرفت میں بھی کوئی حصہ نصیب نہیں ہوا بلکہ جو رسولوں کی معرفت میں جتنی پیچھے رہ گئی

ہے وہ اتنی ہی خدا تعالیٰ کی معرفت میں بھی پیچھے رہ گئی ہے۔ آج نصاریٰ جو عقلاء زمان کہلاتے ہیں جب اُنہوں نے اپنے رسول کے صحیح مقام کو پہچاننے میں ٹھوکر کھائی تو پھر دیکھ لیجیے کہ خدا تعالیٰ کی معرفت میں بھی ان کا حصہ کتنا رہا حتیٰ کہ توحید فی التثلیث کا بنیادی مسئلہ بھی ان کے نزدیک تقدیر کی طرح مذہب کا ایک راز بن کر رہ گیا۔ اس کے بالمقابل اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جب وہ اپنے رسول کا صحیح مقام پہچاننے میں پیش گام رہی تو اس کو اپنے رب کی معرفت کا انعام بھی سب میں بھرپور نصیب ہوا۔ اسی لیے یہ اُمت تمام امتوں پر فوقیت لے گئی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران)

تم اُمتوں میں سب سے بہتر اُمت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر صحیح ایمان رکھتے ہو۔

آیت بالا کی روشنی میں اب یہ فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعتراف نہیں کرتے اور صرف توحید کے قائل ہیں کیا اُن کو صحیح معنی میں توحید اور ایمان باللہ نصیب ہو سکتا ہے۔ اسی لیے امام موصوف فرماتے ہیں:۔

من انکر النبوۃ والرسالۃ فھو فی الحقیقۃ ما عرف اللہ عزوجل۔ (تفسیر کبیر ص۱۲۸)

جس نے نبوت اور رسالت کا انکار کیا درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی معرفت ہی سے نہ نصیب رہا۔

پس رسالت اور ربوبیت کا رشتہ اتنا مستحکم ہے کہ اس میں تفریق کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا ہے:۔

وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ (النساء) اور اللہ میں اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (ء) جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ تعالیٰ کا۔

اب اندازہ فرمایئے کہ جن ہستیوں کی معرفت وعدم معرفت حق تعالیٰ کی معرفت وعدم معرفت کا معیار ہو۔ دنیا میں خدا تعالیٰ کے دوست و دشمن کی تفریق اور آخرت میں دوزخ وجنت کی تقسیم ان کے وجود پر دائر ہو گویا دنیا و آخرت کا کارخانہ ان کے دم کے ساتھ وابستہ ہو وہ کتنی بلند ہستیاں ہونگی۔ درحقیقت قدرت کی رافت ورحمت کا سب سے بڑا مظہر یہی ہستیاں ہوتی ہیں ان ہی کی تشریف آوری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "رحمٰن" کو اپنی مخلوق پر کتنی رحمت ہے کہ جب وہ سرکشی اور طغیانی کی حد کر دیتی ہے، اس کے دوستوں کی صف سے نکل کر دشمنوں کی صف میں جا کھڑی ہوتی ہے اور ہدایت کی روشنی چھوڑ کر گمراہی کی تاریکی اختیار کر لیتی ہے اور جنت کی لازوال نعمت سے محروم ہو کر ہلاکت کے گڑھے میں جا گرتی ہے تو وہ ان کو مٹا دینے کی بجائے پھر ان کی بقا کے سامان پیدا فرما دیتا ہے۔ دشمنوں کی صف سے نکال کر پھر دوستوں کی صف میں شامل فرما لیتا ہے، تاریکی در تاریکی میں پھنس جانے کے بعد پھر ہدایت کی چمکتی ہوئی

روشنی میں لا کھڑا کرتا ہے اور ہلاکت کے گڑھے سے نکال کر پھر جنت الفردوس کا مالک بنا دیتا ہے، مگر اس کے یہ سارے انعامات اور اس کی یہ ساری نعمتیں میسر آتی ہیں ان ہی نفوس قدسیہ کے طفیل میں سبحان اللہ رسولوں کی شخصیتیں بھی کتنی بلند اور پُراسرار ہوتی ہیں، جو اُن سے جُڑ جاتا ہے اُس کا رشتہ عالم قدس سے جُڑتا ہے اور جو اُن سے کٹ جاتا ہے اس کا رشتہ بھی عالم قدس سے کٹ جاتا ہے۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (آل عمران) — اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پہنچے پھر تم کو اس سے نجات دی۔

حافظ ابن قیمؒ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اقوال و اعمال و اخلاق کی وہ صحیح میزان ہوتے ہیں کہ جو اس پر پورا اُتر گیا وہ ہر معیار پر پورا اتر گیا اور جو یہاں سر مو او چھا رہ گیا ہے وہ ان تمام امور میں بھی ناقص رہ گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جتنی ضرورت جسم کو جان کی اور آنکھوں کو نور کی ہے اس سے زیادہ ضرورت عالم کو انبیاء علیہم السلام کی ہے، کیونکہ جسم کو جان اور آنکھ کو نور کی ضرورت صرف حیات دنیا تک محدود ہے اور حیات دنیا خود بھی محدود ہے لیکن ان نفوس قدسیہ کی ضرورت دونوں جہان کے ساتھ وابستہ ہے انسان اپنی عارضی اور دائمی دونوں حیات میں ان کا یکساں محتاج ہے۔ اسی کے ساتھ ضمناً امام موصوف انبیاء علیہم السلام کی شناخت پر بھی مختصر سا کلام کر گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح خدا تعالیٰ کی صفت ملوکیت کا یہ تقاضہ تھا کہ وہ اپنی مخلوق کے پاس اپنے رسولوں کو بھیجے اسی طرح اس کی صفت قدرت کا یہ تقاضہ تھا کہ رسولوں کے ہاتھوں پر ایسے افعال کا ظہور فرمائے جو عام انسانوں کی طاقت سے بالاتر ہوں تاکہ یہ اس کی علامت ہوں کہ درحقیقت کسی ایسی ہی ذات کی طرف سے آئے ہیں جس کی قدرت کے سامنے سب عاجز ہیں اور اس طرح رسولوں کی شخصیت کا پورا تعارف ہو جائے۔ لہذا جو شخص معجزات کا منکر ہے وہ درحقیقت خدا تعالیٰ کی صفت قدرت ہی کا منکر ہے۔ امام موصوف کا مطلب یہ ہے کہ معجزات خود انبیاء علیہم السلام کے افعال نہیں ہوتے اور اسی لیے دوسرے افعال کی طرح وہ ان کی قدرت اور اختیار سے سرزد نہیں ہوتے کہ جب چاہیں اپنے دوسرے افعال کی طرح معجزات دکھا دیا کریں جیسا کہ آئندہ معجزات کی بحث میں ان شاء اللہ تعالیٰ ہم اس کی تفصیل کریں گے۔ پس یہاں معجزات کا اندازہ دوسرے انسانی افعال سے لگانا ہی غلطی ہے یہاں اگر ان کا موازنہ کرنا چاہیے تو قدرت کے براہ راست افعال کے ساتھ کرنا چاہیے۔ زمین و آسمان میں قدرت کی خالقیت اور عجائبات کی جتنی عجیب و غریب داستان بکھری پڑی ہے کسی نبی کا کوئی معجزہ اُن سے عجیب تر نہیں ہے، قرآن کریم کے بیان کردہ معجزات اور احادیث کے تمام معجزات قدرت کے بلاواسطہ افعال کے مقابلہ میں اٹھا کر رکھ لیجیے تو آپ کو یقین ہو جائیگا کہ اگر وہ بلا واسطہ افعال معقول ہیں تو پھر اس قدرت کے سامنے یہ معجزات بھی نامعقول نہیں ہو سکتے لیکن جو شخص نبی کے واسطہ سے قدرت کے عجائبات کا انکار کرتا ہے اس کے لیے

پھر قدرت کے دیگر براہ راست افعال کے قبول کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ امام موصوف کے اس مختصر بیان سے رسالت و نبوت کی ضرورت اور ان کی شناخت کے دونوں مسئلے عقلاً و نقلاً ہر دو طریقہ پر ثابت ہو گئے۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور۔

حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مخلوق کو اپنی دین و دنیا میں جس چیز کی حاجت جتنی شدید تھی خالقِ کائنات نے اتنی ہی زیادہ سخاوت اور بہتات کے ساتھ اس کو پیدا فرمایا ہے۔ دیکھیے سانس لینے کے لیے ہوا کی ضرورت سب کو ہے اور ہر ضرورت سے زیادہ، لہٰذا اس کو پیدا بھی اس افراط کے ساتھ فرمایا ہے کہ اپنی حاجت روائی میں کسی کو کہیں بھی ذرا تکلیف نہیں ہوتی اس سے دوم نمبر میں پانی کی حاجت ہے اس کے بعد پھر کھانے اور پینے کی ہے اس لیے پانی کو بھی اسی فراوانی سے پیدا فرمایا ہے لیکن اس فراوانی سے نہیں جس سے کہ ہوا کو اسی طرح اب دینی پہلو کو لیجیے تو یہاں سب سے زیادہ حاجت ربوبیت کی معرفت کی ہے اس لیے اپنی ربوبیت کے دلائل انسان کی شش جہت میں اس کثرت کے ساتھ پھیلائے ہیں کہ ذرہ ذرہ اس کی ربوبیت کا شاہد بنا ہوا ہے ؎

ففی کل شیٔ لہ اٰیۃ تدل علیٰ انہ واحد

اس سے دوم نمبر کی حاجت نبوت کی ہے، کون نہیں جانتا کہ ایک انسان جب اپنے جیسے دوسرے انسان کی خوشی اور ناخوشی کے ذرائع و اسباب اس کے بتائے بغیر نہیں جان سکتا تو خالق کی خوشی و ناراضگی کے اسباب اس کے فرمائے بغیر بھلا کون جان سکتا ہے اس لیے اُس نے انبیاء علیہم السلام بھیجے تاکہ ان کے ذریعہ وہ اس کے تمام اسباب بتفصیل بیان فرما دے۔ اور ان کی شناخت کے دلائل بھی اتنی کثرت سے ظاہر فرمائے کہ پھر ایک اَن پڑھ سے اَن پڑھ انسان کے لیے بھی ان کی شناخت میں کوئی دشواری نہ رہے۔ اگر عقلی مناقشات کا میدان چھوڑ کر آپ خود ان کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی معرفت کے سامان قدرت نے ہر دور میں اس کثرت کے ساتھ جمع کر دیے تھے کہ اَن پڑھ جاہلوں کے لیے بھی انبیاء علیہم السلام کی شناخت میں کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ دشمنوں کے لیے ان سے انکار کرنا ایک بڑا غور طلب مسئلہ بن گیا۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون جیسے مدعی الوہیت کے مقابلہ کا واقعہ مذکور ہے دیکھیے کس طرح ساحرین حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے آکر ذرا سی دیر میں ان کی نبوت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے اور وہ بھی کس یقین کے ساتھ کہ پھر فرعون نے ہزار دھمکیاں بھی دیں مگر کیا وہ ذرا ٹس سے مس ہوئے؟ بلکہ اور صاف یہ اعلان کر دیا:۔

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغْفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَیْهِ مِنَ السِّحْرِ (طٰہٰ)

تو اب جو تو کرنیوالا ہے کر گزر تو اس دنیا کی زندگی ہی پر حکم چلا سکتا ہے (یعنی بہت سے بہت مروا ڈالے گا) بس ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لاچکے تاکہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے اور خاص کر جادو کے

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ کے گردوپیش میں جو دلائل کی بارش برسی اس کی کیفیت تو آج دنیا کی زندہ تاریخ سے ظاہر ہے کن ناسا عد حالات میں تشریف لائے اور کس قبول اور جاذبیت کے ساتھ جہان کو چند سالوں میں فتح کر ڈالا جس میں بادشاہ بھی تھے اور فقیر بھی کاہن اور ساحر بھی تھے اور سخن شناس شاعر بھی۔ پھر جن ضدی اور ہٹ دھرموں نے آپ کو نہیں مانا تو اس انکار کے لیے اُن کو کتنی سازشیں کتنے ظلم اور کتنے اور حربے استعمال کرنے پڑے اور اس پر بھی کوئی جماعت ان کے ساتھ نہ ہو سکی آخر کار شقاوت کا داغ اپنی ہی پیشانی پر لگا کر محروم اور ناکام دنیا سے گزر گئے، جیسا کہ آئندہ اوراق میں اس کا مختصر سا نمونہ آپ کے ملاحظہ سے گزریگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ فبای حدیث بعدہ تؤمنون۔ (الجواب الصحیح ص ۲۰۴ ج ۴)

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے مکتوبات شریف میں متعدد مقامات پر ضرورت نبوت پر طویل بحث فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رب کریم کی اُن عام بخشائشوں میں سے جو کسی ملک کسی خطہ اور کسی خاص جماعت کے ساتھ مخصوص نہیں رہیں سب سے بڑی بخشائش یہ ہے کہ اس نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان ہمکلامی کی راہ کھول دی۔

وان من امة الا خلا فیہا نذیر۔ یعنی ہر ہر جماعت میں ایک ایک ڈرانے والا آچکا ہے جس نے آکر وہ مادۂ گراں مایہ جس سے ایک انسان بھی رشک ملک بن سکتا تھا سب ارزاں کر دیے ہیں۔

وجود کی نعمت، ابر و باد کی نعمت، شمس و قمر کی نعمت اور ان سب سے برتر شرف انسانی کی نعمت گو یہ سب ہی ان عام نعمتوں میں داخل ہیں جو دوست و دشمن اور شاہ و گدا سب ہی میں عام رکھی گئی ہیں، لیکن ان سب میں بیش بہا نعمت نبوت کی نعمت ہے کہ اگر یہ نعمت نہ ہوتی تو ساری نعمتیں ہیچ ہو جاتیں۔ اسی نعمت کے ذریعہ پروردگار عالم نے اپنی ذات و صفات کا اشرف علم بخشا، حشر و نشر، جنت و دوزخ اور انسان کی دائمی و ابدی زندگی کی اطلاع دی اور عالم غیب کے بیش بہا حقائق سے حجاب اُٹھا دیا۔ ان ہی نفوس قدسیہ کے ذریعہ اپنی رضامندی کے راستے بتلائے۔ عقل انسانی خواہ کتنی ہی دوربین کیوں نہ ہو مگر اس کی جولانگاہ صرف عالم امکان تک ہے اور وہ بھی زیادہ تر اپنے ہی دائرہ محسوسات و مشاہدات میں محدود ہے حق تعالیٰ کی ذات پاک تک اگر کروروں عقلا میں سے کسی کی رسائی ہوئی بھی تو وہ بہت ناتمام اور ناقص در ناقص تھی، اگر یہاں دلائل کے بڑے تیر چلائے بھی گئے تو زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہو سکا کہ اس عالم کے لیے کوئی فاعل مختار ہونا ضروری ہے جس کی صناعی کی شہادت ذرہ ذرہ میں عیاں ہے لیکن اس کی توحید اور اس توحید کی نزاکتیں، اس کی صفات اور ان صفات کی دقتیں تو یہاں آکر عقل بیچاری پھر حیران و سراسیمہ رہ گئی۔ اس وادی میں جب عقلاء قدیم نے قدم رکھا اور بزور عقل خالق تک رسائی کی سعی نافرجام کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کو فاعل اور علت تو مانا مگر بالایجاب یعنی بے اختیار۔ اس کی ذات اقدس اور عالم کے درمیان

بہت سے اور قدما رگھڑ لیے، اور عالم اشرف کا وجود جس کے حوالہ کیا اس کا نام عقل عاشرہ رکھا۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔ وہ افلاک جن کے وجود کا بھی آج کوئی ثبوت نہیں ملتا قدیم مانے گئے بلکہ متحرک بالارادہ کہے گئے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ان میں خرق والتیام یعنی ٹوٹ پھوٹ کا تغیر بھی محال سمجھا گیا اور آخر کار یہاں تک نافہمی کا ثبوت دیا کہ براہ راست عالم کا صدور ہی حق تعالیٰ کی ذات سے محال قرار دے دیا۔ رہ گئیں صفات باری تعالیٰ تو ان سے بھی ان کو کوئی بہرہ نصیب نہ ہوا ملائکۃ اللہ اور دوسرے غیوب کا تو ذکر ہی کیا ہے، آپ نے دیکھا کہ جب انسان ماورار محسوسات و مشاہدات میں قدم رکھتا ہے تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے۔ پھر جب ہمارے عقلار کا دور آیا تو ان بلند پروازوں کی نظر اتنی پیچھے رہی کہ انہوں نے تو سرے سے خالق کا انکار کر دیا اور عالم کا وجود خود عالم ہی کے سپرد کر کے اپنی عقل کا سب زور، خواص مادیات کی تلاش پر صرف کر ڈالا، پھر اس ضمن میں بھی جو سوال سب سے اہم اُن کے سامنے آیا وہ ایسا سوال تھا جس کو انسانی شرافت ہمیشہ خست کی نظر سے دیکھتی رہی ہے یعنی دولت و زر کی تقسیم اور پیٹ کا مسئلہ[1]۔

کاش یہ عقلار اگر ذرا اس پر غور کر لیتے کہ قدرت نے جس طرح ان کو مختلف ذرائع علم عطا فرمائے ہیں اسی طرح ان کے معلومات کی انواع بھی مختلف بنائی ہیں، حواس خمسہ کو دیکھیے ہر حاسہ دوسرے حاسہ کے محسوسات سے کتنا بے خبر ہے مثلاً حاسۂ سمع عالم مبصرات سے اسی طرح ناآشنا ہے جس طرح کہ حاسۂ بصر عالم مسموعات سے ایک حدید البصر سے حدید البصر انسان ہزار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اگر آواز کو اپنی آنکھوں سے سننا چاہے تو نہ اس کو سُن سکتا ہے اور نہ دیکھ ہی سکتا ہے، اسی طرح اگر مبصرات کو حاسۂ سمع کے قریب سے قریب تر لے آؤ تو اس کو بھی اس کے رنگ و ہیأت کا ادنیٰ سا ادراک بھی نہیں ہو سکتا۔ بس اگر یہاں فیصلہ صرف ایک ہی حاسہ کے ادراک پر ختم کر دیا جائے تو نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ محسوسات کے ایک بڑے حصہ کا انکار کر دینا پڑیگا مگر یہاں ہر شخص اس کے انکار کے بجائے اپنے اس حاسۂ ادراک ہی کا قصور سمجھتا ہے اگر کہیں قدرت اس کے ادراک کے لیے اس کو دوسرا حاسہ عطا نہ فرمادیتی تو جاہل انسان آپ کو یہاں صاف انکار کرتا ہوا نظر آتا پھر ان حواس خمسہ سے بالاتر انسان کو ایک آلۂ ادراک اور مرحمت ہوا ہے جس کا نام عقل ہے، ان حواس خمسہ کی حقیقت عقل کے سامنے ٹھیک وہی ہے جو ایک حاسہ کی دوسرے حاسہ کے سامنے یعنی یہاں حواس خمسہ کا مجموعہ مل کر بھی مملکت عقل کے ایک چھوٹے سے چھوٹے گوشہ کے ادراک سے عاجز نظر آتے ہیں۔ اگر رحمت کی فیاضی اس کے علوم کے ادراک کے لیے اس کو دوسرا آلۂ ادراک عطا نہ فرمادیتی تو یہ مسکین صرف اپنے حواس خمسہ کے بھروسہ پر عقل کے جملہ ادراکات کا منکر ہی نظر آتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوت ادراک میں

[1] جب سے اس مسئلہ کا حل اس جدید انداز سے شروع ہوا ہے عالم جس دورِ حیات سے گذر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اب عنقریب اس مسئلہ کا حل ایٹم بم سے ہونے والا ہے اور اس کے استعمال کے بعد اُمید ہے کہ پیٹ کا مسئلہ اور دولت کی تقسیم کا قضیہ خود بخود اتنا مختصر ہو جائیگا کہ اس پر غور و خوض کی حاجت ہی نہ رہیگی اور اس وقت انبیار علیہم السلام کے علوم اور ان کے برکات اور عقلاء کے علوم اور ان کے نتائج کا موازنہ کرنا بھی آسان ہو جائیگا۔

عقل کا نمبر سب سے فائق تر ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی امر کے ادراک سے بھی وہ عاجز نہیں ہے لیکن اگر فیصلہ صرف کسی ایک ہی حاسہ کے تابع رکھا جائے تو ہر حاسہ اپنے ماحول میں اتنی ہی وسعت اور حدت رکھتا ہے مگر جب دوسرے آلات ادراک کی طرف بھی نظر کی جاتی ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی یہ ساری وسعت اپنے ہی دائرۂ احساس میں محدود تھی، اسی طرح عقل کا حال بھی سمجھنا چاہیے۔ عالم غیب جو حواس اور مشاہدہ اور اسی طرح عقل کی دسترس سے باہر ہے اس کے ادراک سے عقل بھی ٹھیک اسی طرح درماندہ ہے جیسا کہ حواس خمسہ عقل کے علوم کے ادراک سے۔ پس جس طرح وہاں راہ صواب یہی ہے کہ حواس خمسہ ہی کا قصور تسلیم کرلیا جائے اور عقل کی معلومات کا انکار نہ کیا جائے۔ اسی طرح یہاں بھی ایک بات درست ہے کہ ادراکات نبوت اور وحی کا اعتراف کرلیا جائے اور اپنی عقل کوتاہ کی نارسائی کی وجہ سے اس کا انکار نہ کیا جائے۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ وہاں آلۂ ادراک یعنی عقل سب کو ملی ہے اور یہاں وحی و نبوت صرف چند مخصوص اور چیدہ افراد کو پھر جس طرح عقلیات میں ہر انسان دوسرے کی عقل پر اعتماد کرلیتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی انبیاء علیہم السلام کی عقول اور دیگر عقلاء کے ان کی تصدیق کرنے پر اعتماد کرلینا چاہیے تھا اور ان کے علوم غیبیہ کو بے چون چرا تسلیم کرلینا چاہیے تھا مگر یہاں ہر انسان یہی مطالبہ کرتا ہے کہ جب تک براہِ راست وہ خود بھی ان علوم کا ادراک نہ کرلے محض انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر ان کو تسلیم نہیں کرسکتا۔ قتل الانسان ما اکفرہ۔ (دیکھو مکتوبات امام ربانی۔ مجلد ثالث ص۳۰)

رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک ورق

حق پسند انسانوں کے غور وفکر کے لیے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس طویل و عریض بحث کے بعد آپ کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک ورق پیش کر دیا جائے جس کو مذکورۂ بالا مضمون کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں۔

قرآنِ شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت و رسالت آخر میں حضرت ابراہیم علیہم السلام کی ذریت ہی میں محدود ہو گئی تھی۔ چنانچہ بعد میں جو نبی آیا ان ہی کی ذریت میں آیا آپ کے دو فرزند تھے اسحٰق اور اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کا تذکرہ تورات میں موجود ہے۔ حسب بیان تورات حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں صرف ایک ہی نبی کی بشارت تھی۔ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام جب بنا ربیت سے فارغ ہو چکے تو انہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جو بنا ربیت میں ان کے شریک تھے ان کی ذریت کے حق میں ایک رسول مبعوث ہونے کی دعا فرمائی تھی جو اسی بلدۂ مبارکہ میں پیدا ہوں جہاں انہوں نے خدا تعالیٰ کا بیت تعمیر فرمایا تھا، چنانچہ دعار ابراہیمی کے مطابق آپ تشریف لائے۔ نسب میں سب سے عالی، حسب میں سب سے برتر، اپنی عہد طفولیت ہی سے ہمیشہ ممتاز سیرت، ممتاز صورت، عادات و شمائل میں قوم سے علیحدہ، عبادات و رسوم میں ان سے الگ، لہو و لعب سے مجتنب، شرک و کفر سے متنفر، صدق و صفا، احسان و سلوک سے مزین، ظلم و عدوان اور جملہ فواحش سے کوسوں دور، جنگ و جدال سے نفور، مال و جاہ کی محبت سے بالاتر، عدل و انصاف کے شاہزادے۔ غرض جملہ اخلاق فاضلہ سے محلّٰی اور جملہ اخلاق رذیلہ سے معرّیٰ، جوانی میں عصمت و عفت کے فرشتے، پیری میں وقار و رُعب کا پیکر، بال بال سے حسن ٹپکتا، کلمہ کلمہ سے پھول جھڑتے، روئیں روئیں سے فہم و فراست چمکتی، غصہ و محبت، جدال و ہزل میں یکساں حق گو۔ عفو و درگزر کرنے والے، مخلوقِ خدا کے سب سے بڑے ہمدرد، عہد و پیمان کے سب سے پکے، سب سے زیادہ راست گو، سب سے بڑھ کر امانتدار، لطف یہ کہ خود اُمّی اور قوم بھی سب اُمّی۔ تورات و انجیل کو نہ آپ جانتے نہ آپ کی قوم جانتی، نہ کسی سے کوئی حرف پڑھا، نہ اہلِ علم کے پاس نشست و برخاست رکھی قسیس و رہبان آپ کے موعود نبی ہونے پر سب متفق اور مشرکین عرب سب آپ کی ان صفات کے معترف۔ اسی حالت پر چالیس سال گزارے، کبھی نبوت کا ایک حرف زبان سے نہ نکلا۔ جب عمر مبارک چالیس سال کو پہنچی تو ایک ایسا عجیب و غریب دعویٰ کیا جس سے نہ ملک آشنا نہ باپ دادے آشنا، اور ایک ایسا کلام لوگوں کے سامنے

پیش کیا جو آج تک نہ کسی نے سُنا اور نہ آئندہ اس کی نظیر ممکن صحف سماویہ سب اس کے سامنے سرنگوں نہ الٰہیات و عملیات میں کوئی اس کے ہم پلہ نہ سیاسیات و معاشیات میں کوئی اس کا ہمسر، اسرار کا مخزن، علوم کا سمندر قصص و امثال، نصائح و عبر کا دریا، طیبات کے حلال کرنے والے اور خبائث کے حرام کرنے والے، بھلائی کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے، کوئی بھلی چیز ایسی نہ تھی جس کو عقول سلیمہ بھلی سمجھیں کہ اس کا حکم نہ دیا ہو اور کوئی برائی ایسی نہ تھی جس کو عقول سلیمہ بُرا جانیں مگر اس سے روک نہ دیا ہو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جس کا آپ حکم دیں طبائع سلیمہ کی خواہش یہ ہو کہ آپ اس کا حکم نہ دیتے اور نہ کبھی ایسی بات سے روکا جس کے متعلق طبائع سلیمہ کی تمنا یہ ہو کہ آپ نہ روکتے۔ اس پر ریاست و سرداری سے بیزار، دشمنوں اور مخالفوں سے لاپرواہ، احباب وانصار سے بے نیاز، نہ ہاتھ میں کوئی دولت، نہ پشت پر کوئی طاقت، نہ قبضہ میں کوئی ملک، زن، زر کی کوئی دولت نہیں جو قدموں پر ڈال نہ دی گئی ہو اور آپ نے اس کو ٹھکرا نہ دیا ہو، حبس و قید، جلا وطنی حتیٰ کہ قتل کی کوئی تدبیر اٹھا کر نہیں رکھی گئی جس کو پورا نہ کر لیا گیا ہو، مگر آپ دشمنوں کے جھرمٹ میں اُسی طرح خدا کے دین کے بے خوف و ہراس منادی کوچوں میں بازاروں میں ایام حج میں کوئی جگہ نہ چھوڑی جہاں پہنچ کر اعلانِ حق نہ کر دیا ہو، تنہائی میں بھی اور محفلوں میں بھی، عوام میں بھی اور خواص میں بھی، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے دین قبول کرنے کے لیے کسی کو قتل کی دھمکی دی ہو یا کسی قسم کی طمع و لالچ دی ہو، تیرہ سال اسی طرح گزار دیے نہ ساز و سامان اور نہ کوئی یار و مددگار، مگر نہ دل میں کسی کا خوف نہ چہرہ پر کچھ ہراس جب اقتدار ملا تو دشمنوں سے درگزر اور ایذا رسانوں کے لیے عفو کا اعلان کسی پر نہ ظلم و تعدی ہو کیا مجال۔ تمام عمر کانٹے پر تلی ہوئی۔ امن ہو یا خوف، فراغت ہو یا تنگی، شکست ہو یا فتح، اپنے متبعین کی قلت ہو یا کثرت ہر حال میں وہ استقامت کہ ایک انچ قدم اِدھر اُدھر پڑ جائے کیا ممکن۔

خلاصہ یہ کہ جب دنیا میں تشریف لائے تو فضائے عالم تاریک نہ دنیا سے باخبر نہ ہدایت سے آشنا بت پرستی سے خدا کی زمین ناپاک، خوں ریزی اور قتل و غارت سے نالاں، نہ مبدء کی خبر نہ معاد کا علم اور جب آپ تشریف لے گئے تو وہی سب سے بڑھ کر عالم، سب سے زیادہ مہذب، سب میں ممتاز دیندار، انصاف و امن کے قائم کرنے والے اور دنیا کی نظروں میں ایسے سربلند کہ اگر ان پر بادشاہوں کی نظر پڑتی تو وہ مرعوب ہو جاتے اور اگر اہل کتاب ان کو دیکھتے تو بیساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری بھی بھلا ان سے کیا افضل ہونگے۔

اس اقتدار و قبول کے ساتھ جب آپ نے دنیا کو چھوڑا تو ترکہ میں نہ درہم و دینار نہ کوئی ملک و خزانہ صرف ایک زرہ مبارک کہ وہ بھی ایک یہودی کے ہاتھ تیس صاع جو کے عوض میں مرہون۔

جب آپ کے خلفاء پر نظر کیجیے تو ان میں اول خلیفہ وہ جو سب میں مشہور عاقل، اخلاق میں برتر، قوم میں محبوب بستی کے بزرگ، جس دن سے آپ کا دامن پکڑا پھر مرتے دم تک کسی خطرناک سے خطرناک جگہ ساتھ نہ چھوڑا ہر موقعہ پر

اپنی جان قربان کی اپنا سارا مال آپ کی حمایت میں لٹا دیا اور جب آپ کے بعد خلیفہ ہوئے تو شروع میں پھیری پھر کر اپنا اور گھر والوں کا پیٹ پالتے۔ آخر میں جب مجبوری وظیفہ قبول کیا تو وہ بھی صرف اتنا کہ بمشکل گزران کے لیے کافی ہو اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو بیت المال کے یہ محدود مصارف بھی بیباق کر گئے۔ (دیکھو فتح الباری ص ۱۴۴)

عمرؓ کا کہنا ہی کیا۔ روم و فارس کی سلطنتیں فتح کیں، پھر بیت المال سے اُدھار لے کر کھایا۔ آخر جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو بیت المال کا حبہ حبہ ادا کر گئے اور اس کے لیے ایک گھر جو اپنی ملکیت تھا اس کی فروختگی کی وصیت کر گئے۔

عثمان غنیؓ کی بات ہی کیا خود غنی مگر ان کا سب مال ہمیشہ مسلمانوں کے لیے بے حساب لٹتا رہا۔ پورے اقتدار کے ساتھ مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ بہنا گوارا نہ فرمایا آخر اپنی جان قربان کر دی۔

حضرت علیؓ اور صاحبزادگانِ اطہار کا کیا پوچھنا کس مظلومیت میں دین پر جانیں دیں اور صرف حق کی خاطر بھی قربانی کی جو مثالیں قائم کیں وہ تاریخ میں ہمیشہ کے لیے اپنی یادگار رہ گئیں۔

اُمت پر نظر کیجیے تو وہ اُمت جس کی دیانتداری بے لوثی اور بے طمعی بھی مدتوں تک ضرب المثل اپنے مذہب کے اِتنے بڑے نگراں اور اپنی سماوی کتاب کے بلکہ اپنے رسول کے حرف حرف کے بھی ایسے محافظ جس پر جہان ششدر رہ جائے۔ ان سے قبل اس کی کوئی مثال مل سکتی ہو نہ ان کے بعد ممکن حکمرانی میں اتنے ممتاز کہ صدیوں تک اطرافِ عالم پر حکمراں رعایا میں یگانہ و بیگانہ سب یکساں مداح، اور اپنی پستی میں بھی اتنے بھاری کہ عالم ان سے خائف، قوموں نے جتنا ان کو مٹایا اتنے ہی وہ اُبھرے۔ الغرض اس دور پستی میں بھی ان کی وہ دھاک کہ عالم کفر کو اگر کچھ خطرہ ہے تو صرف ایک ان سے!

گویہ کوئی طریقہ عدل و انصاف کا نہیں ہے کہ جب کسی قوم پر نظر ڈالی جائے تو صرف اس کے انحطاط ہی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کے دورِ عروج کی تاریخ دیگر اقوام کے بالمقابل کیا تھی؟

اب آپ اس رسول اعظم کے یہ اجمالی صفات اور ان کی آمد سے یہ عظیم انقلابات سامنے رکھ کر خود ہی فیصلہ فرمالیجیے کہ نبوت کیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کیا ہوتے ہیں اور ان سب میں افضل الرسل اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام رفیع کیا ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ ہماری آنکھیں نیچی ہیں اور قلم شرمندہ کہ بحث و نظر کا جو طریقہ کبھی اہل کتاب اور منکرین کے سامنے اختیار کیا گیا تھا آج بصد افسوس وہی طریقہ مسلمانوں کو ان کے عقائد کی تفہیم کے لیے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال اب تک جو سبق آپ نے تاریخ و عقل کی روشنی میں پڑھا اب ایک بار پھر اس کو حدیثوں کی روشنی میں ملاحظہ فرمالیجیے۔ وما علینا الا البلاغ۔

الذين كان لهم علم بسير الانبياء عليهم السلام ومعرفة بميزاتهم كانوا يعرفونهم بسيماهم او بنبذة من احوالهم من غير تامل

۹۷۰- عن ابن عباس رضي الله عنهما ان ابا سفيان ابن حرب اخبره ان هرقل ارسل اليه في ركب من قريش كانوا تجارا بالشام في المدة التي كان رسول الله صلى الله عليه وسلم مادّ فيها ابا سفيان وكفار قريش فاتوه وهم بايلياء فدعاهم وحوله عظماء الروم ثم دعاهم فدعا بالترجمان فقال ايكم اقرب نسبا بهذا الرجل الذي يزعم انه نبي قال ابو سفيان فقلت انا اقربهم فقال ادنوه مني وقربوا اصحابه فاجعلوهم عند ظهره ثم قال لترجمانه قل لهم اني سائل هذا عن هذا الرجل فان كذبني فكذبوه فوالله لولا الحياء ان يؤثروا علي كذبا لكذبت عنه

جن کو انبیاء علیہم السّلام کی تاریخ اور اُن کی خصوصیات کا ذرا بھی علم تھا وہ اُن کو دیکھ کر یا اُن کے مختصر حالاتِ زندگی سُن کر فوراً اُن کو پہچان لیتے تھے

۹۷۰- حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ابوسفیان بن حرب نے یہ واقعہ ان کے اسلام سے پیشتر کا ہے اُن سے بیان کیا کہ ہرقل (شاہ روم) نے ان کے بلانے کے لیے ایک آدمی بھیجا جبکہ وہ قریش کے ایک ایسے قافلہ میں شامل تھے جن کی تجارت ملک شام سے ہوتی تھی۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور دیگر کفار قریش کے ساتھ ایک معین مدت کے لیے صلح کر رکھی تھی۔ القصہ ابوسفیان مع اپنے قافلہ کے ہرقل کے دربار میں حاضر ہوگئے۔ اس وقت یہ لوگ اتفاق سے مقام ایلیاء میں تھے۔ ہرقل نے ان کو اپنے سامنے طلب کیا اس وقت اس کی مجلس میں روم کے اور بڑے بڑے لوگ بھی موجود تھے، پھر ان کو ذرا اور قریب بلایا اور ایک ترجمان طلب کیا اور قریشی لوگوں سے کہا کہ بلحاظ نسب تم میں وہ شخص کون ہے جو ان کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہو جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ ابوسفیان کہتے ہیں میں نے کہا ان کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار میں ہوں۔ یہ سُن کر ہرقل نے کہا اچھا ابوسفیان کو میرے اور قریب آؤ اور اس کے رفقاء کو اس کی پشت کی جانب پاس بٹھادو۔ اس کے بعد اپنے ترجمان سے کہا اس کے رفقاء سے کہہ دو کہ میں اُن کے متعلق اس شخص سے چند سوالات کرتا ہوں، اگر یہ ذرا بھی غلط بیانی سے کام لے تو تم لوگ فوراً اس کی تکذیب کر دینا۔ ابوسفیان کہتے ہیں

ثُمَّ كَانَ أَوَّلَ مَا سَأَلَنِي عَنْهُ أَنْ قَالَ كَيْفَ نَسَبُهُ فِيكُمْ قُلْتُ هُوَ فِينَا ذُو نَسَبٍ قَالَ فَهَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ أَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهُ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَأَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ قُلْتُ ضُعَفَاؤُهُمْ قَالَ أَيَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ قُلْتُ بَلْ يَزِيدُونَ قَالَ فَهَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ سُخْطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ تَتَّهِمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ يَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مُدَّةٍ لَا نَدْرِي مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيهَا وَلَمْ تُمْكِنِّي كَلِمَةٌ أُدْخِلُ فِيهَا شَيْئًا غَيْرَ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ قَالَ فَهَلْ قَاتَلْتُمُوهُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ إِيَّاهُ قُلْتُ الْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ سِجَالٌ يَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ قَالَ فَمَاذَا يَأْمُرُكُمْ قُلْتُ اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَحْدَهُ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَاتْرُكُوا مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ قُلْ

خدا کی قسم اگر مجھ کو اس بات کی غیرت نہ ہوتی کہ میری نسبت لوگ ہمیشہ دروغگوئی کا عیب لگاتے رہتے تو یقیناً میں آپ کے متعلق جھوٹی جھوٹی باتیں بیان کرکے رہتا۔ اس کے بعد سب سے پہلا سوال جو ہرقل نے مجھ سے کیا یہ تھا جو شخص پیغمبری کا دعوی کرتا ہے اس کا خاندان کیسا ہے؟ میں نے کہا بڑا شریف گھرانا ہے۔ پھر اُس نے پوچھا اُس کے خاندان میں سے کسی اور نے کبھی پہلے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں۔ اُس نے پوچھا کیا اس کے آبا و اجداد میں کوئی بادشاہ بھی ہوا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں۔ پھر ہرقل نے پوچھا اچھا جو لوگ اُس پر ایمان لائے ہیں وہ رئیس لوگ ہیں یا غریب؟ میں نے عرض کی جی کمزور اور غریب لوگ۔ پھر ہرقل نے پوچھا ان کی مردم شماری بڑھ رہی یا گھٹ رہی ہے؟ میں نے عرض کی بڑھ رہی ہے۔ پھر اس نے پوچھا کوئی شخص اُس کے دین سے بیزار ہو کر پھر بھی جاتا ہے؟ میں نے عرض کی جی نہیں۔ اس کے بعد ہرقل نے سوال کیا پیغمبری کے دعوے سے بھی پہلے تم لوگوں نے کبھی اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی ہے؟ میں نے عرض کی جی نہیں۔ پھر اس نے پوچھا یہ شخص کبھی عہد و پیمان کو توڑ بھی دیتے ہیں میں نے جواب دیا نہیں۔ لیکن اُن کے ساتھ اس سال جو ہمارا معاہدہ ہوا ہے دیکھنا ہے کہ اس کو وہ پورا کرتے ہیں یا نہیں۔ ابوسفیان کا بیان ہے کہ اس ایک بات کے سوا آپ کے حالات میں نکتہ چینی کا ایک حرف بھی میں داخل نہ کرسکا۔ پھر اس نے سوال کیا اچھا ان کے ساتھ کبھی تمہاری جنگ بھی ہوئی ہے؟ میں نے جواب دیا جی ہاں۔ اس نے پوچھا تو اس کا نتیجہ کیا رہا؟ میں نے عرض کی اُس کے اور ہمارے درمیان جنگ ڈول کی طرح سے رہتی ہے کبھی وہ جیت جاتے ہیں (بدر) اور کبھی ہم (اُحد) پھر اس نے پوچھا وہ تم کو کس بات کی تعلیم دیتے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ صرف ایک خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، آبا و اجداد کی بت پرستی چھوڑ دو، نماز پڑھو، سچ بولو، پاکباز بنو، رشتہ کا حق پہچانو۔ یہ تمام حالات سُن کر ہرقل

لِذَا نِّي سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهِ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ فِيكُمْ ذُو نَسَبٍ وَكَذَلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِي نَسَبِ قَوْمِهَا وَسَأَلْتُكَ هَلْ قَالَ أَحَدٌ مِنْكُمْ هَذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ، فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقُلْتُ لَوْ كَانَ أَحَدٌ قَالَ هَذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ لَقُلْتُ رَجُلٌ يَتَأَسَّى بِقَوْلٍ قِيلَ قَبْلَهُ وَسَأَلْتُكَ هَلْ كَانَ فِي آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقُلْتُ لَوْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ رَجُلٌ يَطْلُبُ مُلْكَ أَبِيهِ وَسَأَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ

نے اپنے ترجمان سے کہا ابوسفیان سے کہہ دو میں نے اُن کے خاندان کے متعلق تجھ سے تحقیق کی تو تو نے جواب دیا وہ بڑے شریف النسب ہیں اور اسی طرح نبی ہمیشہ شریف گھرانے کے ہوتے چلے آئے ہیں پھر میں نے تجھ سے پوچھا اس کے دعویٰ نبوت سے قبل تم میں سے کسی اور نے تو کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ تو تو نے جواب دیا نہیں۔ اس پر میں نے سوچا کہ اگر کوئی شخص اُن سے پہلے بھی یہ دعویٰ کر چکا ہوتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ یہ اس دعوے کی ریس کرتے ہیں۔ پھر میں نے پوچھا تھا کہ ان کے باپ دادا میں کوئی بادشاہ تو نہیں گزرا۔ تو تو نے جواب دیا نہیں اس پر میں نے خیال کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھ لیتا کہ وہ اس بہانہ سے اپنے باپ دادا کی سلطنت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر میں نے تم سے اس کی تحقیق کی کہ کیا اس دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس پر جھوٹ کی تہمت لگائی ہے۔

۹۷۔ یہ ایسے دو شخصوں کا باہم مکالمہ ہے جن میں ابھی تک دونوں غیر مسلم ہیں یعنی ہرقل شاہ روم اور ابوسفیان رئیس قافلہ پھر کیا بات تھی کہ ہرقل تو چند سوالات کے بعد ہی حقیقت تک جا پہنچا، اور ابوسفیان آپ کے چشم دید حالات کے بعد بھی جس بات کے سمجھنے سے قاصر رہا وہ صرف ایک بات یہی تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ غور کیجیے گا تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ فرق صرف یہ تھا کہ ہرقل چونکہ اہل کتاب میں سے تھا اس لیے اس کو انبیاء علیہم السلام کے خصائص و امتیازات اور ان کی تاریخ کا پورا علم حاصل تھا اور ابوسفیان ان امور سے قطعاً لاعلم تھا وہ نہ تو خود اہل کتاب میں سے تھا نہ اُن سے استفادہ کا اس کو موقعہ مل سکتا تھا، اس کے ماحول میں ساحر و شاعر اور کاہنوں کے سوا، انبیاء علیہم السلام کا کوئی تذکرہ نہ تھا اس لیے نبوت کے مسئلہ کو سمجھنا اس کے لیے ایک لاینحل مسئلہ بنا ہوا تھا عرب کے اُمیوں کے لیے ایمان لانے کا راستہ دوسرا تھا جو آئندہ خود اُن کے بیانات سے واضح ہوگا۔

ہرقل نے یہاں جتنے سوالات بھی کیے ہیں اُن سے قدم قدم پر آپ کو یہ ظاہر ہوتا چلا جائیگا کہ اس کا اصل مقصد صرف یہ تھا کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے اہم اسباق آپ کی سیرت میں بھی مطالعہ کرلے اور صرف اسی ایک بات سے آپ کے صدق و کذب کا فیصلہ کر دے۔ چنانچہ اس نے آپ کے خاندان کی تحقیق سب سے پہلے کی اور اس کا جواب سُن کر جو پہلی بات کہی تھی وہ یہی تھی کہ گزشتہ رسول بھی ہمیشہ عالی خاندان ہی ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب آپ کے متبعین کے متعلق یہ جواب سُنا کہ اس میں بڑی تعداد عوام اور کمزور طبقہ کی ہے تو اس کے بعد جو لفظ اُس نے کہے وہ بھی یہی تھے کہ یہی جماعت ہر جو پہلے بھی ہمیشہ رسولوں کی متبع ہوا کرتی تھی اسی طرح جب اس کو معلوم ہوا کہ آپ کی جماعت برابر ترقی پر ہے اور ان میں اپنے دین سے ناراض ہو کر اس کو ترک کرنے والا ایک متنفس بھی نہیں ہے تو یہاں بھی اس نے انبیاء سابقین پر ایمان لانے والوں کا حال بھی بیان کیا ہے۔ پھر جب اُس نے آپ کے صدق و کذب کا حال دریافت کیا جو کسی نبی کے لیے سب سے پہلی شرط ہوتی ہے تو جو کلمات ابوسفیان کی زبان سے نکلے وہی سب سے زیادہ زوردار

فَذَكَرْتَ اَنْ لَا فَقَدْ اَعْرِفُ اَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبَ عَلَى اللّٰهِ وَسَأَلْتُكَ اَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوْهُ اَمْ ضُعَفَاۗءُهُمْ فَذَكَرْتَ اَنَّ ضُعَفَاۗءَهُمُ اتَّبَعُوْهُ وَهُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ وَسَأَلْتُكَ اَيَزِيْدُوْنَ اَمْ يَنْقُصُوْنَ فَذَكَرْتَ اَنَّهُمْ يَزِيْدُوْنَ وَكَذٰلِكَ اَمْرُ الْاِيْمَانِ حَتّٰى يَتِمَّ وَسَأَلْتُكَ اَيَرْتَدُّ اَحَدٌ سَخْطَةً لِدِيْنِهٖ بَعْدَ اَنْ يَّدْخُلَ فِيْهِ فَذَكَرْتَ اَنْ لَا وَكَذٰلِكَ الْاِيْمَانُ حِيْنَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوْبَ وَسَأَلْتُكَ هَلْ يَغْدِرُ فَذَكَرْتَ اَنْ لَا وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ لَا تَغْدِرُ وَسَأَلْتُكَ بِمَا يَأْمُرُكُمْ فَذَكَرْتَ اَنَّهٗ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَعْبُدُوا اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ

تو تو نے بیان کیا نہیں۔ اس پر میں نے سوچا یہ نہیں ہو سکتا کہ جس شخص نے کبھی لوگوں پر جھوٹ نہیں بولا ہے وہ خدا پر جھوٹ باندھے۔ اس کے بعد میں نے سوال کیا کہ اس کو ماننے والا طبقہ غریبوں کا ہے یا رئیسوں کا تو تو نے بتایا غریب مسکینوں کا اور ہمیشہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو رسولوں کو ماننے والے ہوتے ہیں۔ پھر میں نے دریافت کیا انکی مردم شماری بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے تو تو نے بتایا بڑھتی ہے اور درحقیقت ایمان کا یہی نقشہ ہوتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے آخر حد کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر میں نے تجھ سے پوچھا کوئی شخص ان کا دین قبول کرنے کے بعد اس سے کبھی بیزار ہو کر پھر بھی جاتا ہے! تو نے جواب دیا نہیں اور لذت ایمان کی تاثیر درحقیقت یہی ہوتی ہے کہ جب وہ دلوں میں گھر کر جاتی ہے تو پھر نکلا نہیں کرتی۔ پھر میں نے تجھ سے پوچھا وہ عہد شکنی تو نہیں کرتے۔ تو نے جواب دیا نہیں۔ اور تمام نبیوں کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ کبھی عہد شکنی نہیں کرتے۔ پھر میں نے تجھ سے پوچھا تم کو تعلیم کیا دیتے ہیں تو نے

تھے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ کے صدق و صفا کا پوچھنا ہی کیا ہے، یہاں دوست تو دوست دشمن بھی آپ کو صدوق و امین کے لقب سے پکارتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ نازک مسئلہ جنگ کا ہے، یہ معاملہ قومی ہوتا ہے اور یہاں ایک راستباز سے راستباز انسان بھی لغزش کر سکتا ہے، مگر جب ہرقل کو معلوم ہوا کہ آپ کے پائے استقلال کو یہاں بھی ادنیٰ سی لغزش نہیں ہوتی اور یہاں بھی آپ ایفاء عہد میں نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر اس کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں تو یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ استقامت تو صرف انبیاء علیہم السلام ہی کا حصہ ہوتی ہے۔ صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے کہ جنگ کے نتائج کا حال سن کر ہرقل نے کہا کہ شکست و فتح میں انبیاء سابقین کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وہ ان دونوں حالتوں سے گزرتے تھے، پھر آخر کار کامیابی ان ہی کو نصیب ہوتی تھی۔ اس مسئلہ پر اگر عقلی طور سے غور فرمائیے تو شاید آپ یہ حکم لگائیں کہ صداقت کی علامت دائمی فتح ہونی چاہیے۔ مگر یہاں ہرقل اس کے برعکس گاہ گاہ شکست کو بھی صداقت کی علامت سمجھتا ہے کیونکہ وہ انبیاء سابقین کی تاریخ پڑھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ بشر ہوئے ہیں اور اس لیے اُن کی حیات میں انسانی حیات کے سب نشیب و فراز نظر آنے چاہئیں۔ آخر میں اُس نے آپ کی تعلیمات کے متعلق اہم سوال کیا ہے، اور جب خوب دیکھ لیا کہ آپ کی تاریخ نبوت کی تاریخ سے کہیں بھی سرِمو خلاف نہیں جاتی تو آپ کے رسول برحق ہونے کے اظہار پر مجبور ہو گیا یہ دوسری بات ہے کہ دنیا کی عارضی بادشاہت کی طمع نے آخرت کی لازوال بادشاہت سے اس کو محروم رکھا۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام جب کبھی صفحاتِ عالم پر نمودار ہوئے ہیں تو ان کے سامنے مختلف طبقات کے لوگ آئے ہیں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا تھا جو رسولوں کی جنس ہی سے انکار کرتے تھے جیسے قوم نوح علیہ السلام اور

شَيْئًا وَيَنْهَاكُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ وَيَأْمُرُكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ فَإِنْ كَانَ مَا تَقُولُ حَقًّا فَسَيَمْلِكُ مَوْضِعَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ وَكُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ خَارِجٌ لَمْ أَكُنْ أَظُنُّ أَنَّهُ مِنْكُمْ فَلَوْ أَعْلَمُ أَنِّي أَخْلُصُ إِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهُ وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمِهِ ثُمَّ دَعَا بِكِتَابِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِي بَعَثَ بِهِ دِحْيَةَ إِلَى عَظِيمِ بُصْرَى فَدَفَعَهُ إِلَى هِرَقْلَ فَقَرَأَهُ فَإِذَا فِيهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ

بیان کیا یہ کہ صرف ایک خدا کی پرستش کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور بتوں کی پوجا سے تم کو منع کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نماز پڑھو، سچ بولو، پاکباز بنو۔ اگر تم نے یہ سب جوابات سچ سچ دیے ہیں تو ایک دن وہ میرے ان قدموں کی جگہ یعنی شام و بیت مقدس کے مالک ہو کر رہینگے مجھے اس کا تو پہلے سے علم تھا کہ ایک نبی آنے والے ہیں مگر یہ گمان نہ تھا کہ وہ تم میں سے ہونگے۔ اگر میں ان کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تو آپ کی ملاقات کے لیے پوری سعی کرتا اے کاش کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کے قدم مبارک دھو کر پیتا۔ اس کے بعد اس نے آپ کا وہ نامۂ مبارک جو دحیہؓ نے والی بُصریٰ کی معرفت بھیجا تھا طلب کیا، انہوں نے ہرقل کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کو پڑھا تو اس کا مضمون یہ تھا:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط ہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے جو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہے

قوم عاد و ثمود علیہما السلام، اسی لیے قرآنِ کریم نے ان کا حال ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے: كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ. كَذَّبَتْ قَوْمُ عَادٍ الْمُرْسَلِينَ. كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ. دوسرا طبقہ وہ تھا جن کو رسولوں کی ضرورت اولاً کی جنس تو مسلم تھی مگر ان کو یہ بحث رہتی تھی کہ رسول وہی بشر رسول ہے یا نہیں۔ یہاں ہرقل چونکہ اہل کتاب میں تھا اس کے سامنے ضرورت نبوت و رسالت کا مسئلہ نہ تھا اس لیے اس کے سوالات بھی اس نوعیت کے نہ تھے جو رسالت کی ضرورت پر روشنی ڈالتے اس کو صرف یہ تحقیق کرنی تھی کہ جس رسول کی بشارات وہ کتب سابقہ میں پڑھتا چلا آیا ہے جس کا حلیہ، جس کی صفات، اور جس کی زندگی کی مفصل تاریخ اس نے مطالعہ کی ہے کیا یہ وہی رسولِ منتظر ہیں؟ اسی لیے حقیقت تک رسائی میں اس کو صرف ایک ہی قدم کی دیر تھی اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی آمد کی تاریخ مقرر ہو جائے تو اس مقررہ تاریخ پر ہوائی جہازوں کی آمد اور توپوں کی آوازوں کے سننے کے ساتھ ہی فوراً یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ بادشاہ کی آمد ہو گئی ہے یہاں کسی وہمی مزاج شخص کو بھی یہ خطرہ نہیں گزرتا کہ بادشاہ کی آمد کے سوا یہاں کوئی دوسرا احتمال بھی ہوگا۔ چنانچہ ہرقل نے آخر میں خود ہی اس کی تصریح کر دی کہ مجھے ان کی آمد کا تو یقین تھا مگر تحقیق طلب بات صرف یہ تھی کہ وہ رسولِ منتظر کہاں مبعوث ہوئے ہیں۔ میرے گمان میں یہ نہ تھا کہ اس رسولِ اعظم کی آمد کے لیے نظرِ ربوبیت امیوں کا انتخاب کر چکی ہے۔ ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۲۶ میں آپ یہ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ابن ناطور نے بھی جو اہل کتاب میں ہرقل ہی کے مرتبہ کا دوسرا عالم سمجھا جاتا تھا جب آپ کی تفصیلات سنیں تو آپ کے آخری رسول ہونے میں ہرقل کے ساتھ قطعی طور پر اتفاق کیا۔

اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ رسول صرف عالی نسب یا صادق القول ہونے سے رسول نہیں بن جاتے۔ رسول بننے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو رسول بنا دے۔ البتہ جس کو وہ رسول بنا دیتا ہے اس کے

إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ. سَلَامٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللَّهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْأَرِيسِيِّينَ وَيَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ. قَالَ قَالَ أَبُو سُفْيَانَ فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ وَفَرَغَ مِنْ قِرَاءَةِ الْكِتَابِ كَثُرَ عِنْدَهُ الصَّخَبُ وَارْتَفَعَتِ الْأَصْوَاتُ

ہرقل کے نام جو روم کا بڑا معزز شخص ہے۔ وہ لوگ سلامت رہیں جو سیدھی راہ چلیں ہیں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اسلام قبول کرلو دونوں جہان کی آفتوں سے محفوظ رہوگے اور تم کو اللہ تعالیٰ اس کا دوگنا ثواب دیگا اور اگر تم نے انکار کیا تو اریس کے سب تبعین کا گناہ تمہارے سر رہیگا اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جس میں ہمارے تمہارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے یعنی یہ کہ ایک اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور آپس میں کوئی کسی کے لیے خدائی کا درجہ تجویز نہ کرے۔ اگر اہل کتاب اتنی بات بھی نہ مانیں تو تم ان سے صاف کہہ دو کہ ہم تو خدا کے فرمانبردار ہوچکے۔ ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ ابوسفیان کہتے ہیں جب ہرقل کو جو کہنا تھا اس نے کہہ لیا اور آپ کا نامۂ مبارک پڑھ کر وہ فارغ ہوگیا تو اس کی محفل میں ایک چیخ پکار اور غوغا مچ گیا۔

لیے پھر یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان تمام صفات کا مالک ہو جو حدیث ہرقل میں آپ نے پڑھی ہیں۔ نیز یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جہاں چند امور کے مجموعے سے یقین حاصل ہوگیا ہو وہاں ہر ہر جزء علیحدہ بھی یقین کا فائدہ دے سکے اس لیے یہ بھی غلط ہے کہ اس مجموعے کے بعض اجزاء کو لے کر نبوت کی دلیل بنا دیا جائے۔

یہاں ایک تیسرا طبقہ امت محمدیہ کا ہے جس کے سامنے ان مسائل میں سے اب کوئی مسئلہ بھی باقی نہیں ہے، وہ نبوت کی ضرورت سمجھنے سے جس طرح مستغنی ہے اسی طرح کسی جدید نبی کی آمد کے انتظار اور اس کی تعیین کی بحث سے بھی فارغ ہو چکی ہے کتنی بدنصیبی ہوگی کہ جو امت ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کی اجمالی اور تفصیلی تاریخ پڑھ چکی ہو اس کے افراد یا تو نبوت کی ضرورت پر بحث کرنے والوں کی صف میں نظر آئیں یا پھر کسی جدید رسول کی تلاش میں سرگردان سراسیمہ ہوں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رسول جب دنیا میں آتے ہیں تو وہ پہلے سے اپنا پورا تعارف بھی رکھتے ہیں، ان کی بشارت بیان ہوجاتی ہے۔ ان کی علامات بلکہ مختصر تذکرہ بھی امت کے سامنے ذکر میں آجاتا ہے۔ اس لیے جب وہ ان تمام خصوصیات و امتیازات کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں جو اس نوع کی ہمیشہ ہوتی چلی آئی ہیں۔ تو یہاں ان کے مخالفین میں ان کو مجنون سمجھنے والی صرف وہی ایک جماعت ہوتی ہے جو تاریخ نبوت سے جاہل ہوتی ہے۔ کیا مجنون اور صغراء کے مریض اسی اہتمام اور اسی تاریخ حیات کے ساتھ آیا کرتے ہیں! لیکن ناشکر انسان جب اللہ تعالیٰ کی بڑی سے بڑی نعمت کا انکار کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو اس سے زیادہ حیاسوز کلمات سے بھی نہیں شرماتا۔ قتل الانسان ما اکفرہ۔

لفظ اریسین کی تحقیق

اس لفظ کے ضبط و تحقیق میں شارحین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ لیکن تاریخ کی روشنی میں جو بات راجح قرار پاتی ہے وہ یہ ہے کہ عبداللہ بن اریس ایک مشہور پادری تھا یہ اسکندریہ

وَاُخْرِجْنَا فَقُلْتُ لِاَصْحَابِيْ لَقَدْ اَمِرَ اَمْرُ ابْنِ اَبِيْ كَبْشَةَ اِنَّهٗ يَخَافُهٗ مَلِكُ بَنِي الْاَصْفَرِ فَمَا زِلْتُ مُوْقِنًا اَنَّهٗ سَيَظْهَرُ حَتّٰى اَدْخَلَ اللّٰهُ عَلَيَّ الْاِسْلَامَ۔ (رواه البخاری وقد مضى باقی الحديث فی ترجمان السنة ج ۳ ص ۶۶)

۱۷۰۔ قَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ فِيْ خُرُوْجِهٖ اِلَى الْمُقَوْقِسِ مَعَ بَنِيْ مَالِكٍ وَاَنَّهُمْ لَمَّا دَخَلُوْا عَلَى الْمُقَوْقِسِ قَالَ كَيْفَ خَلَصْتُمْ اِلَيَّ مِنْ طَائِفَتِكُمْ وَمُحَمَّدٌ وَاَصْحَابُهٗ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ؟ قَالُوْا اَلْصَقْنَا بِالْبَحْرِ وَقَدْ خِفْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَالَ فَكَيْفَ صَنَعْتُمْ فِيْمَا دَعَاكُمْ اِلَيْهِ قَالُوْا مَا تَبِعَهٗ مِنَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ۔ قَالَ وَلِمَ ذٰلِكَ؟ قَالُوْا جَاءَنَا بِدِيْنٍ مُجَدَّدٍ لَا تَدِيْنُ بِهِ الْاٰبَاءُ وَلَا يَدِيْنُ بِهِ الْمَلِكُ وَنَحْنُ عَلٰى مَا كَانَ عَلَيْهِ اٰبَاؤُنَا قَالَ فَكَيْفَ صَنَعَ قَوْمُهٗ قَالُوْا اتَّبَعَهٗ اَحْدَاثُهُمْ وَقَدْ لَاقَاهُ مَنْ خَالَفَهٗ مِنْ قَوْمِهٖ وَغَيْرِهِمْ مِنَ الْعَرَبِ فِيْ مَوَاطِنَ مَرَّةً تَكُوْنُ عَلَيْهِمُ الدَّائِرَةُ وَ

اور ہم لوگ باہر نکال دیے گئے تو میں نے باہر آکر اپنے رفقاء سے کہا۔ ابن ابی کبشہ (اس کنیت سے مراد آپ کی ذات تھی) کا معاملہ تو اب ایسا بڑھ گیا کہ روم کا بادشاہ تک اُن سے ڈرتا ہے اس کے بعد سے مجھے ہمیشہ اس بات کا یقین رہا کہ آپ عنقریب سب پر غالب آجائینگے یہاں تک کہ وہ روز سعید آپہنچا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مشرف باسلام فرمادیا۔ (بخاری شریف)

۱۷۰۔ مغیرہ بن شعبہؓ اپنے اسلام لانے سے قبل اپنے اُس سفر کا حال بیان کرتے ہیں جس میں وہ قبیلہ بنی مالک کے ساتھ شاہ مقوقس کے پاس گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں جب وہ پہنچے تو شاہ مقوقس نے پوچھا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے رفقاء کے ہوتے ہوئے تم یہاں میرے پاس تک بھلا کیسے پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا ہم دریا کے کنارہ کنارہ آباد ہو گئے تھے مگر ہم کو یہاں بھی اُن کا خوف لگا رہتا تھا۔ اُس نے کہا اچھا بتاؤ ان کی باتوں پر تم نے کیا عمل کیا۔ انہوں نے کہا۔ ہم میں سے تو کسی ایک نے بھی اُن کی بات نہیں مانی۔ اُس نے کہا کیوں؟ ہم نے کہا اس لیے کہ وہ ایک ایسا انوکھا دین لے کر آئے ہیں جس کو نہ ہمارے بڑوں نے مانا نہ ملک اس کو مانتا ہے اور ہم تو اپنے بزرگوں ہی کے دین پر قائم ہیں اُس نے پوچھا کہ اچھا تو اس کی قوم کے لوگوں نے کیا کیا۔ ہم نے کہا نوجوانوں نے تو اُن کو مان لیا ہے، جو لوگ مخالف تھے خواہ

میں قسیس کا منصب رکھتا تھا اور اس کا عقیدہ توحید ہی کا تھا، وہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا تعالیٰ کی مخلوق اور اُس کا بندہ ہی سمجھتا تھا اس کا زمانہ وہی تھا جس میں قسطنطین اول بانیٔ قسطنطنیہ ہوا ہے۔ شاہان روم میں سب سے پہلے نصرانی مذہب اختیار کرنے والا یہی تھا اور اسی اریس پادری کا معتقد تھا۔ اس لحاظ سے جو لوگ اس کے متبع تھے ان کو اریسین کہا جاتا تھا یہ ہرقل اور اس کی رعایا بھی چونکہ اسی کی متبع تھی اس لیے ان کو اریسی کہا جاتا تھا۔ لہٰذا آپ نے اپنے نامۂ مبارک میں اس کو یہ تنبیہ فرمائی تھی کہ اگر تو اسلام سے منحرف ہوا تو تیری اتباع میں اریس کے جتنے متبعین ہیں تیری رعایا ہونے کی وجہ سے یہ بھی منحرف ہو جائینگے اس لیے ان کے انحراف کا گناہ بھی تیری گردن پر رہیگا (دیکھو مشکل الآثار امام طحاوی۔ الملل والنحل ابن حزم ج ۱ ص ۴۸ اور الجواب الصحیح ج ۲ ص ۳۰۱) ہماری اس تحقیق سے جنہوں نے اس لفظ کے معنی رعایا لکھے ہیں ان کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی ہو گی یعنی چونکہ اریس کے متبع لوگ ہی اس کی رعایا تھی اس لیے بلحاظ مصداق رعایا کو اریسی کہنا بھی صحیح ہے گو بلحاظ لغت اس کا صحیح ترجمہ اریس والے لوگ ہی صحیح ہو۔ تاریخ میں اس کا نام اریس اور اریوس دونوں طرح نظر سے گزرا ہے

مَرَّةً تَكُونُ لَهُ فَقَالَ أَلَا تُخْبِرُونِي إِلَى مَاذَا يَدْعُوا إِلَيْهِ فَقَالَ يَدْعُونَا إِلَى أَنْ نَعْبُدَ اللهَ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ
لَهُ وَنَخْلَعَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَيَدْعُوا إِلَى الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ قَالَ وَمَا الصَّلٰوةُ وَالزَّكَاةُ أَلَهَا
وَقْتٌ يُعْرَفُ وَعَدَدٌ تَنْتَهِي إِلَيْهِ؟ قَالُوا يُصَلُّونَ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ خَمْسَ صَلَوَاتٍ كُلَّهَا
لِمَوَاقِيتَ وَعَدَدٍ سَمَّوْهُ لَهُ وَيُؤَدُّونَ مِنْ كُلِّ مَا بَلَغَ عِشْرِينَ مِثْقَالًا نِصْفَ مِثْقَالٍ وَأَخْبَرَهُ
بِصَدَقَةِ الْأَمْوَالِ كُلِّهَا قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ إِذَا أَخَذَهَا أَيْنَ يَضَعُهَا؟ قَالُوا يَرُدُّهَا عَلَى فُقَرَائِهِمْ
وَيَأْمُرُ بِصِلَةِ الرَّحِمِ وَوَفَاءِ الْعَهْدِ وَتَحْرِيمِ الزِّنَاءِ وَالْخَمْرِ وَلَا يَأْكُلُ مِمَّا ذُبِحَ لِغَيْرِ اللهِ
فَقَالَ الْمُقَوْقِسُ هٰذَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ إِلَى النَّاسِ وَلَوْ أَصَابَ الْقِبْطَ وَالرُّومَ اتَّبَعُوهُ وَقَدْ أَمَرَهُمْ
بِذٰلِكَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ وَهٰذَا الَّذِي تَصِفُونَ مِنْهُ بُعِثَ بِهِ الْأَنْبِيَاءُ مِنْ قَبْلِهِ وَسَتَكُونُ لَهُ
الْعَاقِبَةُ حَتّٰى لَا يُنَازِعَهُ أَحَدٌ وَيَظْهَرَ إِلَى مُنْتَهَى الْخُفِّ وَالْحَافِرِ وَمُنْقَطَعِ الْبُحُورِ وَيُوشِكُ قَوْمُهُ
أَنْ يُدَافِعُوهُ بِالرَّاحِ قَالُوا فَلَوْ دَخَلَ النَّاسُ كُلُّهُمْ مَعَهُ مَا دَخَلْنَاهُ قَالَ الْمُغِيرَةُ فَانْفَضَ لِلْمُقَوْقِسُ

وہ عرب تھے یا غیر عرب انہوں نے ان کے ساتھ جنگ کی نتیجہ میں کبھی ان کو شکست ہوتی رہی کبھی آپ کو پھر اس
نے پوچھا اچھا یہ تو بتاؤ کہ آخر وہ کن باتوں کی دعوت دیتا ہے۔ ہم نے کہا اس کی کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت
کریں جس کا کوئی شریک نہیں۔ اور جن بتوں کی ہمارے بزرگ عبادت کرتے آئے ہیں اُن کو یکلخت چھوڑ دیں اور
نماز اور زکوٰۃ کی بھی دعوت دیتے ہیں۔ اُس نے کہا۔ نماز اور زکوٰۃ کیا چیز ہے؟ کیا اُس کا کوئی وقت بھی مقرر ہے جس کو
لوگ جانتے ہوں اور کوئی مقرر عدد بھی ہے؟ انہوں نے کہا شب و روز میں وہ پانچ نمازیں پڑھتے ہیں (وہ پانچوں
کی پانچوں اپنے اپنے وقتوں میں پھر اس سے اُن کا عدد بھی بیان کیا نیز یہ لوگ ہر مال میں سے جس کی قیمت بیس
مثقال ہوتی ہے نصف مثقال ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد مال کے جملہ اقسام میں جو جو صدقہ واجب ہوتا تھا وہ سب
تفصیلاً بیان کیا۔ اُس نے پوچھا اچھا بتاؤ تم سے وصول کر کے پھر یہ صدقہ وہ کہاں خرچ کرتے ہیں۔ انہوں نے
جواب دیا جن کے مالداروں سے وصول کرتے ہیں ان ہی کے فقیروں پر تقسیم کر دیتے ہیں اور عزیزوں کے ساتھ حسن
سلوک اور عہد پورا کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں، زنا، اور شراب کو حرام قرار دیتے ہیں اور بجز اللہ کے نام کے کسی اور کے
نام کا ذبیحہ نہیں کھاتے۔ یہ سن کر شاہ مقوقس نے کہا۔ خوب سُن لو کہ یہ اللہ کے برحق نبی ہیں جن کو اللہ نے سب لوگوں
کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اگر وہ مصر اور روم کے پاس بھی پہنچینگے تو وہ لوگ بھی ان کی اتباع کرینگے کیونکہ
عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ان کی اتباع کا حکم دے گئے ہیں اور جو جو باتیں تم لوگ بیان کر رہے ہو ان
ہی سب باتوں کو لے کر پہلے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی مبعوث ہوئے ہیں یقین رکھو کہ نتیجہ اُن ہی کے موافق
شکل کر رہیگا۔ یہاں تک کہ ایک متنفس کو بھی یہ طاقت نہ ہو گی کہ ان کے ساتھ مقابلہ کر سکے خشکی و تری کے آخری حصوں

رأسه وقال انتم في اللعب ثم قال كيف نسبه في قومه قال هو اوسطهم نسبا قال كذلك والمسيح والانبياء تبعث في نسب قومها ثم قال فكيف صدق حديثه قال قلنا ما يسمى الا الامين من صدقه قال انظروا في امركم أترونه يصدق فيما بينكم وبينه ويكذب على الله قال فمن تبعه قلنا الاحداث قال هو والمسيح اتباع الانبياء قبله قال فما فعلت يهود يثرب فهم اهل التوراة قلنا خالفوه فأوقع بهم فقتلهم وسباهم وتفرقوا في كل ناحية قال هم قوم حسدة حسدوه اما انهم يعرفون من امره مثل ما نعرف قال المغيرة فقمنا من عنده وقد سمعنا كلاما ذللنا لمحمد صلى الله عليه وسلم وخضعنا له وملوك العجم يصدقونه

تک اُن کا غلبہ ہو جائیگا۔ عنقریب اس کی قوم اس کے ساتھ دست بدست جنگ کریگی۔ مگر یہ سب سُن سُنا کر انہوں نے کہا اگر تمام لوگ بھی اس کے ساتھی ہو جائیں پھر بھی اس کا ساتھ نہیں دینگے۔ مغیرہ کہتے ہیں یہ سُن کر شاہ مقوقس نے ناگواری سے اپنا سر ہلایا اور کہا تم بڑی غفلت میں پڑے ہوئے ہو اس کے بعد پوچھا اپنی قوم میں اس کا خاندان کیسا ہے؟ ہم نے جواب دیا۔ سب سے بہتر۔ اس نے کہا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام بھی اپنی قوم میں بہترین خاندان میں سے ہوئے ہیں۔ پھر اُس نے پوچھا اچھا اُس کی راست گوئی کی کیا کیفیت ہے؟ ہم نے جواب دیا۔ اس کی راست گوئی کی وجہ سے ہی اپنی قوم میں اس کا لقب امین مشہور ہے۔ اُس نے کہا اب تم خود ہی غور کر لو۔ کیا تم یہ خیال کر سکتے ہو جو شخص باہم اپنے معاملات میں راست باز ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ بول سکتا ہے۔ پھر اس نے پوچھا۔ کن لوگوں نے اُس کی اتباع کی ہے۔ ہم نے کہا۔ نوجوانوں نے۔ اُس نے کہا یہی لوگ ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام اور اُن سے پہلے انبیاء کے متبعین ہیں پھر اس نے کہا کہ یثرب (مدینہ) کے یہودیوں نے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، کیونکہ وہ لوگ تو توریت کے ماننے اور جاننے والے ہیں۔ ہم نے کہا اُنہوں نے تو اس کی مخالفت کی ہے اور اس وجہ سے اس نے ان کو سزا دی ہے۔ یعنی بعض کو قتل کیا ہے اور بعض کو قید کیا ہے۔ بقیہ اِدھر اُدھر اطراف میں تتر بتر ہو گئے ہیں۔ شاہ مقوقس نے کہا یہ لوگ تو ہمیشہ سے بڑے حاسد ہیں، اِنہوں نے اُن پر بھی حسد کیا ہے، ورنہ یہ لوگ آپ کی صداقت ہماری طرح پہچانتے ہیں۔ مغیرہ کہتے ہیں کہ ہم مقوقس کے دربار سے ایسی گفتگو سن کر اُٹھے جس کے بعد ہمارے حوصلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پست ہو گئے اور ہم نے اپنے دل میں کہا کیا غضب ہے کہ شاہانِ عجم تو اس کے ساتھ نسب و رشتے کا دُور کا تعلق بھی نہ رکھتے ہوئے اس کی تصدیق کریں اور اس سے خوف کھائیں اور

لہ بظاہر عبارت یہ ہے ، کذلک المسیح والانبیاء تبعث فی نسب قومہ

؂ بظاہر عبارت یہ ہونی چاہیے ، ھو اتباع المسیح والانبیاء من قبلہ

وَيَخَافُوْنَهُ فِي بُعْدِ أَرْحَامِهِمْ مِنْهُ وَنَحْنُ أَقْرِبَاؤُهُ وَجِيرَانُهُ وَلَمْ نَدْخُلْ مَعَهُ وَقَدْ جَاءَنَا دَاعِيًا إِلَى مَنَازِلِنَا قَالَ الْمُغِيرَةُ فَرَجَعْتُ إِلَى مَنْزِلِنَا فَأَقَمْتُ بِالْإِسْكَنْدَرِيَّةِ لَا أَدَعُ كَنِيسَةً إِلَّا دَخَلْتُهَا وَسَأَلْتُ أَسَاقِفَتَهَا مِنْ قِبْطِهَا وَرُومِهَا عَمَّا يَجِدُوْنَ مِنْ صِفَةِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ أُسْقُفٌ مِنَ الْقِبْطِ هُوَ رَأْسُ كَنِيسَةِ يُوحَنَّسَ كَانُوا يَأْتُونَهُ بِمَرْضَاهُمْ فَيَدْعُو لَهُمْ لَمْ أَرَ قَطُّ أَشَدَّ اجْتِهَادًا مِنْهُ فَأَتَيْتُهُ فَقُلْتُ هَلْ بَقِيَ أَحَدٌ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ قَالَ نَعَمْ هُوَ آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ عِيسَى بْنِ مَرْيَمَ أَحَدٌ وَهُوَ نَبِيٌّ مُرْسَلٌ وَأَمَرَنَا عِيسَى بِاتِّبَاعِهِ وَهُوَ النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ الْعَرَبِيُّ إِسْمُهُ أَحْمَدُ لَيْسَ بِالطَّوِيلِ وَلَا بِالْقَصِيرِ فِي عَيْنَيْهِ حُمْرَةٌ وَلَيْسَ بِالْأَبْيَضِ وَلَا بِالْآدَمِ يُعْفِي شَعْرَهُ وَيَلْبَسُ مَا غَلُظَ مِنَ الثِّيَابِ وَيَجْتَزِي بِمَا بَقِيَ مِنَ الطَّعَامِ سَيْفُهُ عَلَى عَاتِقِهِ وَلَا يُبَالِي بِمَنْ لَاقَى يُبَاشِرُ الْقِتَالَ بِنَفْسِهِ وَمَعَهُ أَصْحَابُهُ يَفْدُونَهُ

ہم اس کے عزیز و قریب اور پڑوسی ہو کر بھی اس کا دین قبول نہ کریں بالخصوص جبکہ وہ خدا تعالیٰ کا داعی بن کر ہمارے گھروں میں خود آیا ہے۔ مغیرہ کہتے ہیں اس واقعہ کے بعد میں اپنے گھر واپس آیا اور مقام اسکندریہ میں آکر ٹھہر گیا میں نے کسی گرجہ کو نہیں چھوڑا جس میں نہ گیا ہوں اور اس کے ہر ہر پادری سے خواہ وہ مصری تھا یا رومی ان علامات کی تحقیق کی جو یہ لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کتب سابقہ میں دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اس وقت ایک مصری پادری تھا جو کنیسہ یوحنّس میں سب کا سردار سمجھا جاتا تھا جس سے بڑھ کر عابد و زاہد کوئی شخص میں نے نہیں دیکھا تھا، اس کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنے مریضوں کو لے کر اُس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور وہ ان کی صحت کے لیے دعا کیا کرتا تھا میں اس کی خدمت میں پہنچا اور میں نے اس سے پوچھا کیا انبیاء علیہم السلام میں کوئی نبی ایسا رہ گیا ہے جس کی آمد ابھی باقی ہو۔ وہ بولا ہاں ایک نبی باقی ہے اور وہی آخر الانبیاء ہے۔ ان کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی اور نبی نہیں ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی اتباع کرنے کا ہم کو حکم دیا ہے وہ ایسا نبی ہے جس نے کسی درس گاہ میں تعلیم حاصل نہیں کی عرب کا رہنے والا ہے اسم مبارک اُس کا احمد ہے۔ نہ قد سے زیادہ دراز قامت اور نہ انتہا سے زیادہ کوتاہ قد اُس کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے نہ چھنے جیسا سفید رنگ نہ بالکل گندم گوں۔ زلفیں رکھنے والا۔ موٹا جھوٹا سادہ لباس پہننے والا۔ بچا کھچا کھا لینے والا۔ جہاد کے لیے تیار۔ اس کی تلوار اُس کے کاندھے پر۔ اپنے مقابل دشمن کی پروا نہ کرنے والا۔ اور جنگ میں خود شریک ہونے والا۔ اُس کے ساتھی سو جان سے اس پر قربان اپنی اولاد اور والدین سے زیادہ اُن پر

۱۷۹ - روایت بالا میں خط کشیدہ جملہ بہت اہمیت رکھنے کے قابل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب سابقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو علامات ذکر کی گئی تھیں ان میں ایک علامت یہ بھی تھی کہ آپ کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان

بِاَنفُسِهِم هُوَ لَهُ اَشَدُّ حُبًّا مِنْ اَوْلَادِهِم وَاٰبَائِهِمْ يَخْرُجُ مِنْ اَرْضِ حَرَمٍ وَيَأْتِي اِلٰى حَرَمٍ يُهَاجِرُ اِلٰى اَرْضٍ سِبَاخٍ وَنَخْلٍ بِدِيْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَقُلْتُ لَهُ زِدْنِي فِي صِفَتِهِ قَالَ يَأْتَزِرُ عَلٰى وَسْطِهِ وَيَغْسِلُ اَطْرَافَهُ وَيُخَصُّ بِمَا لَا يُخَصُّ بِهِ الْاَنْبِيَاءُ قَبْلَهُ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهِ وَيُبْعَثُ هُوَ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً وَجُعِلَتْ لَهُ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا اَيْنَمَا اَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ تَيَمَّمَ وَصَلّٰى وَمَنْ كَانَ قَبْلَهُ كَانَ مُشَدَّدًا عَلَيْهِمْ لَا يُصَلُّوْنَ اِلَّا فِي الْكَنَائِسِ وَالْبِيَعِ قَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ فَوَعَيْتُ ذٰلِكَ كُلَّهُ مِنْ قَوْلِهِ وَقَوْلِ غَيْرِهِ وَمَا سَمِعْتُ مِنْ ذٰلِكَ فَذَكَرَ الْوَاقِدِيُّ حَدِيْثًا طَوِيْلًا فِي رُجُوْعِهِ وَاِسْلَامِهِ وَمَا اَخْبَرَ بِهِ مِنْ صِفَاتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ وَكَانَ ذٰلِكَ مِمَّا يُعْجِبُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيُحِبُّ اَنْ يَسْمَعَهُ اَصْحَابُهُ قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَكُنْتُ اُحَدِّثُهُمْ بِذٰلِكَ وَهٰذَا اَمْرٌ مَعْرُوْفٌ عِنْدَ عُلَمَاءِ اَهْلِ الْكِتَابِ وَعُظَمَائِهِمْ۔ رواہ محمد بن عمر الواقدی۔ کذا فی الجواب الصحیح۔

شفیق۔ ایک حرم محترم سے نکل کر دوسرے ایسے ہی حرم محترم کی طرف ہجرت کرنیوالا جس میں زمین کا ایک حصہ شور دوسرے حصہ میں کھجور کا باغ، او حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر اس کا دین مغیرہ کہتے ہیں میں نے اُس پادری سے کہا ذرا ان کی علامات کے متعلق کچھ اور ارشاد فرمائیے۔ اُس نے کہا وہ پنڈلیوں تک تہ بند باندھنے والا اور اپنے ہاتھ پیر اور چہرے کو دھونے والا اور اس کے علاوہ ایک ایسی خصوصیت کا مالک جو اس سے قبل انبیاء علیہم السلام میں نہ تھی یعنی ہر نبی صرف اپنی ہی قوم کے لیے مبعوث ہو کر آیا اور وہ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوگا۔ تمام زمین اس کے لیے سجدہ اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنادی جائیگی یعنی جس جگہ بھی نماز کا وقت ہو جائیگا اسی جگہ وہ تیمم کر کے نماز ادا کر لیگا۔ اُس سے قبل انبیاء پر اس بارے میں تنگی تھی وہ گرجوں اور مندروں کے سوائے کسی اور جگہ نماز ادا نہیں کر سکتے تھے مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں یہ تمام باتیں میں نے اس کی زبانی اور اس کے سوا دوسروں کی زبانی بھی سُنی ہیں۔ اس کے بعد واقدی مشہور مؤرخ نے مغیرہ کی واپسی ان کے اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جن علامات کو انہوں نے بیان کیا تفصیل ذکر کیا ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو مغیرہ کی یہ حدیث بہت پسند آتی تھی اور آپ چاہتے تھے کہ آپ کے اور صحابہ بھی اس کو سُنیں۔ مغیرہ کہتے ہیں اس لیے میں اس حدیث کو صحابہ کرام کے سامنے بیان کیا کرتا تھا۔ یہ تمام واقعہ اہل کتاب اور ان کے بڑے بڑے پادریوں کے درمیان معروف و مشہور واقعہ ہے۔ (الجواب الصحیح)

کوئی اور نبی نہ ہوگا۔ اس کے بعد جن حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ "ہمارے دونوں کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے" اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ ورنہ دو نبیوں کے درمیان کسی نبی کا ہونا یا نہ ہونا کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس کے بیان کی کوئی خاص اہمیت ہو۔ اب اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ چونکہ یہ بھی آپ کی ایک علامت تھی اس لیے جس طرح آپ نے اپنی دوسری علامات کا اعلان فرمایا ہے اسی طرح اس کا بھی اعلان فرمایا ہے۔

۹۷۲۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّهٗ قَالَ خَرَجَ جَيْشٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَنَا اَمِيْرُهُمْ حَتّٰى نَزَلْنَا الْاِسْكَنْدَرِيَّةَ فَقَالَ عَظِيْمٌ مِنْ عُظَمَائِهِمْ اَخْرِجُوْا اِلَيَّ رَجُلًا يُكَلِّمُنِيْ وَاُكَلِّمُهٗ، فَقُلْتُ لَا يَخْرُجُ اِلَيْهِ غَيْرِيْ قَالَ فَخَرَجْتُ اِلَيْهِ وَمَعِيْ تَرْجُمَانِيْ وَمَعَهٗ تَرْجُمَانُهٗ فَقَالَ مَا اَنْتُمْ؟ فَقُلْتُ نَحْنُ الْعَرَبُ وَنَحْنُ اَهْلُ الشِّرْكِ وَنَحْنُ اَهْلُ بَيْتِ الْحَرَامِ كُنَّا اَضْيَقَ النَّاسِ اَرْضًا وَاَجْهَدَهُمْ عَيْشًا نَاْكُلُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَيُغِيْرُ بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ حَتّٰى خَرَجَ فِيْنَا رَجُلٌ لَيْسَ بِاَعْظَمِنَا يَوْمَئِذٍ وَلَا بِاَكْثَرِنَا مَالًا فَقَالَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ فَاَمَرَنَا بِمَا لَا نَعْرِفُ وَنَهَانَا عَمَّا كُنَّا عَلَيْهِ وَكَانَ عَلَيْهِ اٰبَاؤُنَا فَكَذَّبْنَاهُ وَرَدَدْنَا عَلَيْهِ مَقَالَتَهٗ حَتّٰى خَرَجَ اِلَيْهِ قَوْمٌ غَيْرُنَا فَقَالُوْا نَحْنُ نُصَدِّقُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَّبِعُكَ وَنُقَاتِلُ مَنْ قَاتَلَكَ فَخَرَجَ اِلَيْهِمْ وَخَرَجْنَا اِلَيْهِ فَقَاتَلْنَاهُ فَقَتَلَنَا وَظَهَرَ عَلَيْنَا وَغَلَبَنَا وَتَنَاوَلَ مَنْ يَلِيْهِ مِنَ الْعَرَبِ فَقَاتَلَهُمْ حَتّٰى ظَهَرَ عَلَيْهِمْ وَلَوْ يَعْلَمُ مَنْ وَرَائِيْ مِنَ الْعَرَبِ مَا اَنْتُمْ فِيْهِ مِنَ الْعَيْشِ لَمْ يَبْقَ اَحَدٌ اِلَّا جَاءَكُمْ يُشْرِكُكُمْ فِيْمَا اَنْتُمْ فِيْهِ مِنَ الْعَيْشِ فَضَحِكَ ثُمَّ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمْ قَدْ صَدَقَ قَدْ جَاءَتْنَا رُسُلُنَا

۹۷۲۔ عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ مسلمانوں کا ایک لشکر باہر نکلا جس کا میں امیر تھا۔ یہاں تک کہ ہم مقام اسکندریہ میں جاکر اترے، وہاں کے بڑے پادریوں میں سے ایک بڑے پادری نے کہا کہ میرے پاس کسی ایسے شخص کو بھیجو جس سے میں کچھ گفتگو کروں اور وہ مجھے جواب دے سکے میں نے سوچا کہ میرے سوائے اُس کے پاس بھلا اور کون جائیگا۔ یہ کہتے ہیں کہ میں اس کے پاس گیا میرے ساتھ میرا ترجمان اور اُس کے ساتھ اُس کا ترجمان تھا۔ اُس نے پوچھا تم کون لوگ ہو۔ میں نے کہا عرب ہم شرک کیا کرتے تھے درانحالیکہ ہم بیت اللہ الحرام کے باشندے تھے۔ ہمارے پاس رہنے کے لیے زمین بہت تنگ تھی، ہمارا گزران بہت عسرت کی حالت میں تھا۔ مردار اور خون کھایا کرتے تھے ہمارا ایک قبیلہ دوسرے پر لوٹ مار مچایا کرتا تھا ہم اسی عسرت اور جہل کے عالم میں تھے کہ ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جو اس وقت ہم میں نہ سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا نہ سب سے زیادہ مالدار تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس رسول ہو کر آیا ہوں، اس نے ہم کو ایسی باتوں کا حکم دیا جن سے ہم آشنا نہ تھے اور اُن تمام باتوں سے روکا جن کے ہم اور ہمارے باپ دادے ہمیشہ سے خوگر تھے۔ اس لیے ہم نے اس کی تکذیب کی اور اس کی بات ٹھکرا دی تا آنکہ ہمارے علاوہ کچھ اور لوگ اس کے ساتھ ہو کر ہم سے جنگ کے لیے نکلے اور ہم کو قتل کیا اور ہم پر غالب آگئے۔ اس کے بعد اُنہوں نے عرب کے گرد ونواح کا قصد کیا اور اُن پر بھی غالب آگئے۔ اور ہندگ من! اگر عرب اس پُرعیش زندگی کو جان لیں جو اس وقت آپ کی ہے تو اُن میں ایک متنفس بھی ایسا نہ رہے جو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے عیش وعشرت میں حصہ دار نہ بن جائے۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑے اور بولے کہ تمہارا رسول سچا ہے ہمارے پاس بھی اللہ تعالیٰ

بِمِثْلِ الَّذِیْ جَاءَ بِہٖ رَسُوْلُکُمْ فَاِنْ اَنْتُمْ اَخَذْتُمْ بِاَمْرِ نَبِیِّکُمْ لَمْ یُقَاتِلْکُمْ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبْتُمُوْہُ وَ لَنْ یُّشَادَّکُمْ اَحَدٌ اِلَّا ظَھَرْتُمْ عَلَیْہِ وَاِنْ فَعَلْتُمْ مِثْلَ الَّذِیْ فَعَلْنَا وَتَرَکْتُمْ اَمْرَ نَبِیِّکُمْ لَمْ تَکُوْنُوْا اَکْثَرَ عَدَدًا مِنَّا وَلَا اَشَدَّ مِنَّا قُوَّۃً ۔ اخرجہ ابو حاتم فی صحیحہ ۔

۹۷۳۔ عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ فِیْ قِصَّۃِ الْھِجْرَۃِ وَسُؤَالِ النَّجَاشِیِّ عَنْ سَبَبِ مُفَارَقَتِھِمْ مِنْ دِیْنِھِمْ قَالَتْ فَکَانَ الَّذِیْ کَلَّمَہٗ جَعْفَرُ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَالَ اَیُّھَا الْمَلِکُ کُنَّا قَوْمًا اَھْلَ جَاھِلِیَّۃٍ نَعْبُدُ الْاَصْنَامَ وَنَاْکُلُ الْمَیْتَۃَ وَنَاْتِی الْفَوَاحِشَ وَنَقْطَعُ الْاَرْحَامَ وَنُسِیْءُ الْجِوَارَ وَیَاْکُلُ الْقَوِیُّ مِنَّا الضَّعِیْفَ فَکُنَّا عَلٰی ذٰلِکَ حَتّٰی بَعَثَ اللّٰہُ اِلَیْنَا رَسُوْلًا مِنَّا نَعْرِفُ نَسَبَہٗ وَصِدْقَہٗ وَاَمَانَتَہٗ وَعَفَافَہٗ فَدَعَانَا اِلَی اللّٰہِ لِنُوَحِّدَہٗ وَنَعْبُدَہٗ وَنَخْلَعَ مَاکُنَّا نَعْبُدُ نَحْنُ وَاٰبَاءُنَا مِنْ

کے رسول اسی قسم کی باتیں لے کر آئے تھے جیسی تمہارے رسول تمہارے پاس لے کر آئے ہیں۔ اب اگر تم اپنے نبی کے حکم پر کاربند ہوگے تو جو قوم بھی تم سے جنگ کریگی اُس پر تم غالب ہی رہوگے اور جو بھی تم سے برسرپیکار ہوگا وہ مغلوب ہوکر رہیگا۔ اور اگر کہیں تم نے وہی حرکت کی جو ہم نے کی تھی اور اپنے نبی کا حکم نہ مانا تو یاد رکھو کہ تم نہ تو مردم شماری میں ہم سے زائد ہو اور نہ قوت وطاقت میں بڑھ کر۔ (صحیح ابو حاتم)

۹۷۳۔ حضرت اُم سلمہؓ حبشہ کی طرف اپنی ہجرت اور نجاشی کے صحابہ سے اس سوال کے جواب میں کہ اُنہوں نے اپنا قدیم دین کیوں چھوڑا بیان فرماتی ہیں کہ ہماری طرف سے جنہوں نے گفتگو کی وہ جعفر بن ابی طالب تھے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا۔ اے بادشاہ ہم لوگ جاہلیت کی ایک قوم تھے، بتوں کی پوجا کرتے مردار کھاتے، بےحیائیوں میں مبتلا رہتے، آپس کے رشتے کاٹتے، اپنے پڑوسی سے بُرا سلوک کرتے اور جو شخص ہم میں مضبوط اور با اقتدار ہوتا وہ کمزور کو کھالیا کرتا تھا، ہم اسی تاریکی میں بسر کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہی اندر سے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا کہ جس کا نسب جس کی راست گوئی جس کی امانتداری اور جس کی پاک دامنی ہم اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے اس نے ہم کو ایک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی کہ ہم اس کو ایک جانیں اور اسی کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے باپ دادے جن پتھروں اور بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے

۹۷۳۔ یہاں سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ حضرت جعفرؓ نے اپنے اسلام لانے کا جو بڑا سبب ذکر فرمایا ہے وہ ایک تاریک ماحول میں آپ کی درخشاں تعلیمات ہیں جن سے یک لخت ان کی کایا پلٹ گئی تھی یا تو وہ ابھی ابھی عباد و شان میں داخل تھے یا دوسری ہی ساعت میں عباد الرحمن میں شامل تھے، جن کے متعلق قرآن کریم نے الذین یمشون علی الارض ہونا کی صفت بیان فرمائی ہے۔ اس کے بعد اپنی ہجرت کا سبب یہ بتایا ہے کہ ہماری قوم ہمارے اور ہمارے دین میں حائل بن گئی ہے۔ گویا اب اس مقدس دین کی محبت ان پر اتنی غالب ہو چکی تھی کہ اس کے مقابلہ میں مال ومتاع اور احباب ووطن کا چھوڑنا سب آسان تھا۔ سوچیے کہ یہ حالات سُن کر شاہ حبشہ آخر سوچ میں کیوں پڑ گیا۔ اگر اسی قسم کا واقعہ آج بھی فرض کر لیا جائے تو اس قسم کی گری ہوئی قوم کی ایسی غیر مانوس باتیں کیا بادشاہوں کے لیے کچھ درخورِ اعتنا ہو سکتی ہیں مگر یہاں شاہ حبشہ

دُونِهٖ مِنَ الْحِجَارَةِ وَالْاَوْثَانِ وَاَمَرَنَا بِصِدْقِ الْحَدِيْثِ وَاَدَاءِ الْاَمَانَةِ وَصِلَةِ الرَّحِمِ وَحُسْنِ الْجِوَارِ وَالْكَفِّ عَنِ الْمَحَارِمِ وَالدِّمَاءِ وَنَهَانَا عَنِ الْفَوَاحِشِ وَقَوْلِ الزُّوْرِ وَاَكْلِ مَالِ الْيَتِيْمِ وَقَذْفِ الْمُحْصَنٰتِ وَاَمَرَنَا اَنْ نَعْبُدَ اللّٰهَ لَا نُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَاَمَرَنَا بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَالصِّيَامِ قَالَتْ فَعَدَّدَ عَلَيْهِ اُمُوْرَ الْاِسْلَامِ. قَالَ فَصَدَّقْنَاهُ وَاٰمَنَّا بِهٖ وَاتَّبَعْنَاهُ عَلٰى مَا جَاءَ بِهٖ فَعَبَدْنَا اللّٰهَ فَلَمْ نُشْرِكْ بِهٖ شَيْئًا وَحَرَّمْنَا مَا حَرَّمَ عَلَيْنَا وَاَحْلَلْنَا مَا اَحَلَّ لَنَا فَعَدٰى عَلَيْنَا قَوْمُنَا فَعَذَّبُوْنَا وَفَتَنُوْنَا عَنْ دِيْنِنَا لِيَرُدُّوْنَا اِلٰى عِبَادَةِ الْاَوْثَانِ عَنْ عِبَادَةِ اللّٰهِ وَاَنْ نَسْتَحِلَّ مَا كُنَّا نَسْتَحِلُّ مِنَ الْخَبَائِثِ فَلَمَّا قَهَرُوْنَا وَظَلَمُوْنَا وَشَقُّوْا عَلَيْنَا وَحَالُوْا بَيْنَنَا وَبَيْنَ دِيْنِنَا خَرَجْنَا اِلٰى

اُن کو یکسر چھوڑ دیں اور اس کا حکم دیا کہ سچ بولیں، امانت کو ادا کریں اور رشتہ داری کا لحاظ رکھیں۔ پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور حرام اور خوں ریزی سے اجتناب کریں اور ہم کو بےحیائیوں سے اور جھوٹ بات منہ سے نکالنے، یتیم کا مال کھانے اور پاکدامن عورت پر تہمت لگانے کی سخت ممانعت فرمائی اور اس کا حکم دیا کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور ہم کو نماز، زکوٰۃ، روزے کا بھی حکم دیا حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ جعفرؓ نے اسلام کے اور بقیہ احکام بھی گنوائے۔ اس پر ہم نے آپ کو خدا تعالیٰ کا پیغمبر مانا اور آپ پر ایمان لے آئے اور جو دین آپ لے کر آئے تھے اُس کی پیروی کی چنانچہ اب ہم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور ذرہ برابر بھی کسی کو اس کا شریک نہیں کرتے جو چیزیں اس نے ہمارے لیے حرام کر دیں بس ان کو حرام سمجھتے ہیں اور جو حلال فرما دیں اُن کو حلال جانتے ہیں۔ بس اسی بات پر ہماری قوم ہم سے بگڑ گئی ہے اور ہم کو دین سے ہٹانے کے لیے طرح طرح کی تکلیفیں دی ہیں تاکہ ہم خدا تعالیٰ کی عبادت کی بجائے پھر بتوں کی پوجا کرنے لگیں اور جو خبیث چیزیں ہم نے پہلے حلال بنا رکھی تھیں ان کو پھر حلال سمجھنے لگیں جب انہوں نے ہم پر بہت زور ڈالا اور ہم پر ظلم کیا اور ہماری مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور ہم کو اپنے دین پر عمل کرنے سے

غور کر رہا ہے اور پھر یہ سوال کرتا ہے کہ اچھا اس کلام کا کچھ حصہ پڑھ کر مجھ کو بھی سناؤ جو اُن پر نازل ہوتا ہے۔ اور جب اس کا ذرا سا حصہ سنتا ہے تو اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے تمام اہل محفل سب آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ غور کیجیے کہ یہ کلام کیسا ہوگا اور جن پر یہ کلام اترا ہے اُن کی ذات کن عالی صفات کی مالک ہوگی، پھر جو کلمات اس کی زبان سے یہاں نکلے ہیں وہ اس کی شاہانہ فہم اور عالمانہ دقت نظر کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کی چند آیات ہی سن کر کس طرح یہ دریافت کر لیتا ہے کہ قرآن کریم اور تورات دونوں ایک ہی سرچشمہ سے نکلی ہوئی کتابیں ہیں، اور وہ ان میں ایک دوسرے کے ساتھ اس یکسانیت کو بھی پا لیتا ہے جس کے بعد اس کو یہ حکم لگا دینا آسان ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی مصدر کا فیضان ہیں اگر شاہ حبشہ کو تاریخ انبیاء اور ان پر نازل شدہ کلاموں کا پورا پورا ذوق نہ ہوتا تو وہ ذرا سی خبر سے چند بادیہ نشینوں کو لے کر نہ بیٹھتا اور نہ اتنی جلد یہ حکم لگا سکتا کہ قرآن کریم جو عربی زبان میں ہے اور وہ انجیل جو عبرانی یا سریانی زبان میں تھی ان کی متکلم ایک ہی ذات معلوم ہوتی ہے۔
انجیل و قرآن کریم کی اس اندرونی یک رنگی سمجھنے کے لیے پہلے ذرا اس پر غور کر لیجیے کہ ہر اہل کمال اپنی مصنوعات میں اس طرح

بَلَدِكَ وَاخْتَرْنَاكَ عَلٰى مَنْ سِوَاكَ وَرَغِبْنَا فِيْ جِوَارِكَ وَرَجَوْنَا أَنْ لَا نُظْلَمَ عِنْدَكَ أَيُّهَا الْمَلِكُ
قَالَتْ فَقَالَ لَهُ النَّجَاشِيُّ هَلْ مَعَكَ مِمَّا جَاءَ بِهِ عَنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ قَالَتْ فَقَالَ لَهُ جَعْفَرُ نَعَمْ
فَقَالَ لَهُ النَّجَاشِيُّ فَاقْرَأْهُ عَلَيَّ فَقَرَأَ عَلَيْهِ صَدْرًا مِنْ سُوْرَةِ مَرْيَمَ كٓهٰيٰعٓصٓ ذِكْرُ رَحْمَةِ رَبِّكَ
عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا إِلٰى قَوْلِهٖ إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ قَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ
فَبَكٰى وَاللّٰهِ النَّجَاشِيُّ حَتّٰى اخْضَلَّ لِحْيَتُهٗ وَبَكَتْ أَسَاقِفَتُهٗ حَتّٰى اخْضَلُّوْا مَصَاحِفَهُمْ حِيْنَ سَمِعُوْا

روکنے لگے تو ہم نے آپ کے شہر کا رخ کیا ہے اور سب کو چھوڑ کر آپ کو اور آپ کے پڑوس کو پسند کیا ہے اے بادشاہ ہم کو آپ سے اُمید ہے کہ اب یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا حضرت اُم سلمہ رضؓ بیان فرماتی ہیں یہ سُن کر نجاشی بادشاہ نے پوچھا جو کلام وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس لے کر آئے ہیں کیا اس کا کوئی حصہ تم کو یاد ہے؟ جعفر بولے جی ہاں اس پر نجاشی نے کہا اچھا اس کو میرے سامنے بھی پڑھو انہوں نے سورۂ مریم کی شروع کی آیتیں پڑھیں (جس کی ابتدا یہ ہے) کٓھٰیٰعٓصٓ....

حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں یہ سُن کر بخدا نجاشی ایسا زار و قطار رویا کہ اس کی داڑھی تر ہوگئی اور اس کے اردگرد

صاف پہچان لیا جاتا ہے کہ جس کو اس صنعت کا ذرا سا بھی ذوق ہو اس کو فوراً پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ فلاں شخص ہی کی صنعت ہو سکتی ہے، مثلاً ایک مشہور معمار اگر دس عمارتیں تعمیر کرتا ہے تو وہ سب عمارتیں اس کی دستکاری کی اس طرح شہادت دیا کرتی ہیں کہ جس کو ذرا بھی سلیقہ ہو وہ فوراً شناخت کر لیتا ہے کہ یہ ایک ہی معمار کی بنائی ہوئی ہیں۔ دہلی کی عمارات کی سیر کر جائیے شاہجہاں کو اس سلسلہ میں جو ذوق تھا اس کے دور کی بنی ہوئی عمارات آپ کو الگ بتا دیں گی کہ یہ شاہجہاں کی تعمیر کردہ ہیں حالانکہ شاہجہاں نے ان کو ہاتھ تک بھی نہیں لگایا۔ اسی طرح ایک خیاط کا حال ہے کسی جگہ، کسی دکان پر آپ کسی مشہور خیاط کا سلا ہوا کپڑا دیکھ لیتے ہیں تو فوراً حکم لگا دیتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ فلاں خیاط کا سلا ہوا ہے۔ اس سے اوپر اگر نظر اٹھائیے تو شعر و سخن کا حال بھی یہاں ایک ایک شعر اور اس کی ہر ہر بندش میں شاعر اس طرح نظر آیا کرتا ہے کہ اہل ذوق سامعین ہزار اشعار میں سے اس ذوق کا شعر الگ پہچان لیتے ہیں ۔ درسخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ٭ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اگر اس حقیقت سے ان موٹی موٹی مثالوں میں آپ روشناس ہو چکے ہیں تو پھر یہیں سے قرآن کریم کے طرز استدلال کو بھی سمجھ لیجیے وہ آسمان کی بلندی اور زمین کی پستی دونوں کی طرف آپ کو متوجہ کر کے کہتا ہے کہ دونوں پر اپنی اپنی جگہ غور کرو گے تو تم کو دونوں میں ایک ہی کامل کا کمال نظر آئیگا۔ آسمان کی شفقت، بارش کا نزول اور اس سے رونق کے پیدا شدہ باغوں پر نظر کرو تم کو یقین ہو جائیگا کہ یہ سب نیرنگیاں ایک ہی کامل کا کمال ہیں۔ اس کے بعد زمین کی طرف نظر بڑھاؤ، اس میں پہاڑوں کو دیکھو اور بڑے بڑے سمندروں کو بھی دیکھو کس طرح ایک دوسرے سے ملنے نہیں پاتے۔ تم کو منکشف ہو جائیگا کہ جس کی صنعت کا کمال آسمانوں میں نظر آ رہا ہے اسی کی صناعی کا مظاہرہ زمین کی اس بے مثال صنعت میں ہے۔ آسمان اور ملک سماوی کے کمالات اگرچہ زمین اور ارضی انقلابات سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر اس اختلاف میں پھر ایک ایسی یکرنگی نمایاں ہے کہ اس کے بعد یہ جزم حاصل ہونا ضروری ہے کہ ان سب کمالات کا سرچشمہ ایک ہی ذات پاک ہے ۔

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا ٭ تری ہی سی رنگت تری ہی سی بو ہے

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ بھلا کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور اتارا تمہارے لیے

مَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ثُمَّ قَالَ النَّجَاشِيُّ إِنَّ هٰذَا وَالَّذِيْ جَاءَ بِهٖ مُوْسٰى لَيَخْرُجُ مِنْ مِشْكٰوةٍ وَّاحِدَةٍ۔

رواہ احمد وابن سعد وابو نعیم فی الحلیۃ وغیرہم قال الحافظ ابن تیمیۃ ؒ وذکرہا اہل التفسیر والحدیث والفقہ وہی متواترۃ عند العلماء ومقدوی جمل ہذہ القصۃ ابو داؤد فی سننہ من حدیث ابی موسیٰ وفی الصحیحین ایضاً کما فی الجواب الصحیح ملتقطاً

۹۷۴ - عَنْ ابْنِ إِسْحَاقَ قَالَ ثُمَّ قَدِمَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِشْرُوْنَ رَجُلًا وَهُوَ بِمَكَّةَ أَوْ قَرِيْبٌ مِنْ ذٰلِكَ مِنَ النَّصَارٰى حِيْنَ ظَهَرَ خَبَرُهٗ فِي الْحَبَشَةِ فَوَجَدُوْهُ فِي الْمَجْلِسِ فَكَلَّمُوْهُ وَسَاَلُوْهُ وَرِجَالٌ مِنْ قُرَيْشٍ فِيْ أَنْدِيَتِهِمْ حَوْلَ الْكَعْبَةِ فَلَمَّا فَرَغُوْا مِنْ مَسْأَلَتِهِمْ

پادری لوگ بھی اتنے روئے کہ ان کے سامنے جو صحیفے تھے وہ بھی تر ہو گئے۔ اس کے بعد نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور وہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے بلاشبہ ایک ہی چشمہ سے نکلے ہوئے ہیں۔ (احمد۔ ابونعیم وغیرہا)

۹۷۴ - محمد بن اسحاق سے روایت ہے کہ اس واقعہ کے بعد جب آپ کی خبر حبشہ میں پھیلی تو آپ کی خدمت میں بیس یا اس سے کچھ کم و بیش اور نصرانی حاضر ہوئے اس وقت آپ مکہ کرمہ ہی میں تھے انہوں نے آپ کو ایک مجلس میں تشریف فرما پایا تو آپ سے کچھ گفتگو کی اور کچھ سوالات بھی کیے۔ قریش کے چند لوگ بھی

مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا أَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ۔

آسمان سے پانی پھر ہم نے اگائے اس سے باغ رونق والے تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ تم اگاتے ان کے درختوں کو کیا کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ، کوئی نہیں، وہ لوگ کجروی کرتے ہیں۔

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَا أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا أَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

بھلا کس نے بنایا زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور پیدا کر دیں اس کے بیچ میں نہریں اور بنا دیئے اس کے لیے پہاڑ اور رکھی دو سمندروں میں اوٹ کیا کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ۔ کوئی نہیں۔ بہتیرے ان میں سمجھ نہیں رکھتے۔

أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ أَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔

بھلا کون پہنچتا ہے بیقرار کی فریاد کو جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اٹھا دیتا ہے سختی کو اور تم کو بناتا ہے نائب زمین میں کیا کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ کوئی نہیں، تم بہت کم غور کرتے ہو۔

أَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ أَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

بھلا کون تم کو راہ دکھاتا ہے جنگل اور سمندر کے اندھیروں میں اور کون بھیجتا ہے ہوائیں خوشخبری دینے والی اپنی رحمت بارش کے آگے آگے کیا کوئی اور معبود ہے اللہ کے ساتھ، کوئی نہیں، اللہ اس سے بہت بلند ہے جو یہ لوگ شریک کرتے ہیں۔

اس اندرونی یک رنگی ہی کو قرآن کریم نے لفظ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ سے تعبیر کیا ہے عام لوگ اس کے معنی صرف نقلی تصدیق تک ہی محدود سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لفظ اسی بلند حقیقت کا حامل ہے اور اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ قرآن کریم اور انجیل و توریت میں گو باہمی اور بہت سے احکام کا اختلاف بھی سہی لیکن اپنی اپنی جگہ ان کے کمالات میں ایک ایسی یک رنگی بھی ہے کہ ان کو سامنے رکھ کر ایک سلیقہ شعار یہ حکم لگانے پر مجبور ہوگا کہ یہ دونوں کلام ایک ہی سرچشمہ کا فیض ہیں جیسا آپ نے پڑھا۔ شاہ نجاشی کا حال دیکھا اسی کے قریب ورقہ بن نوفل کی شہادت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عما ارادوا ودعاهم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتلی علیهم القرآن فلما سمعوا فاضت اعینهم من الدمع ثم استجابوا له وآمنوا به وصدقوه وعرفوا منه ما کان یوصف لهم فی کتابهم من امره فلما قاموا من عنده اعترضهم ابو جهل فی نفر من قریش فقال خیبکم اللہ من رکب بعثکم من وراءکم من اهل دینکم ترتادون لهم فتأتونهم بخبر الرجل فلم تطمئن مجالسکم عنده حتی فارقتم دینکم وصدقتموه بما قال لکم ما نعلم رکبا احمق منکم او کما قال لهم فقالوا سلام علیکم لا نجاهلکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم لا نألوا انفسنا الا خیرا. کما فی جلب السیم . (محمد ابن اسحاق)

۹۷۵۔ عن عائشة ام المؤمنین رضی اللہ عنها قالت اول ما بدئ به صلی اللہ علیہ وسلم الرؤیا الصالحة فی النوم فکان لا یری رؤیا الا جاءت مثل فلق الصبح ثم حبب الیه الخلاء فکان یخلو بغار حراء فیتحنث فیه وهو التعبد اللیالی ذوات العدد قبل ان ینزع الی اهله ویتزود

کعبہ شریف کے اردگرد اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے (یہ ماجرا دیکھ رہے تھے) جب ان لوگوں کو جو سوالات آپ سے کرنے تھے کر چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے سامنے قرآن کریم کی کچھ آیتیں تلاوت فرمائیں۔ انہوں نے سنیں تو اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اُنہوں نے آپ کی دعوت قبول کرلی، آپ کی تصدیق کی اور وہ سب علامتیں جو آپ کے متعلق ان کی کتاب میں بیان کی گئی تھیں آپ میں دیکھ لیں۔ جب یہ لوگ آپ کی مجلس سے اُٹھ کر چلنے لگے تو راستہ میں ابوجہل چند اور قریشی لوگوں کو لے کر سامنے آیا اور بولا تمہاری جماعت کو خدا ناکام کرے تمہارے ہم عقیدہ لوگوں نے تم کو بھیجا تو اس لیے تھا کہ تم تلاش کر کے اس شخص کے متعلق ذرا تحقیق حال کرنا اور اس کی اطلاع جا کر اپنی قوم کو دینا مگر تم اس کے پاس آکر ابھی اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے یہاں تک کہ تم خود ہی اپنا دین چھوڑ بیٹھے اور جو بات اس نے کہی بس اس کی تصدیق کرلی، ہم نے کوئی جماعت تم سے زیادہ احمق نہیں دیکھی یا اسی قسم کے اور سخت و سست کلمات کہے اُنہوں نے اس کے جواب میں بس اتنا ہی کہا آپ صاحبان کو ہمارا اسلام ہم آپ سے اُلجھنا نہیں چاہتے۔ ہم کو ہمارا دین مبارک اور آپ کو آپ کا دین مبارک۔ اپنی جانوں کی خیر خواہی کرنے میں خود ہم کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر سکتے۔

(سیرت محمد بن ا[illegible])

۹۷۵۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں سب سے پہلی وحی جو رسول خدا [illegible] علیہ وسلم پر آئی وہ اچھے خواب تھے، چنانچہ جو خواب آپ دیکھتے وہ صبح صادق کی روشنی کی طرح صاف صاف ظاہر ہو جاتا اس کے بعد آپ کو تنہائی اور خلوت گزینی پسند ہو گئی۔ چنانچہ آپ غارِ حرا میں آکر تنہا رہا کرتے اور وہاں کئی کئی شب

لِذٰلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلٰى خَدِيْجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتّٰى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِيْ غَارِ حِرَاءٍ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ
فَقَالَ اِقْرَأْ قَالَ مَا اَنَا بِقَارِئٍ قَالَ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّى الْجَهْدَ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ
اِقْرَأْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّى الْجَهْدَ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ
اِقْرَأْ فَقُلْتُ مَا اَنَا بِقَارِئٍ فَاَخَذَنِيْ فَغَطَّنِيْ الثَّالِثَةَ ثُمَّ اَرْسَلَنِيْ فَقَالَ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ
الَّذِىْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ فَرَجَعَ بِهَا
رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُفُ فُؤَادُهُ فَدَخَلَ عَلٰى خَدِيْجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ
فَقَالَ زَمِّلُوْنِيْ زَمِّلُوْنِيْ فَزَمَّلُوْهُ حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ لِخَدِيْجَةَ وَاَخْبَرَهَا الْخَبَرَ

تحنث کیا کرتے تھے۔ راوی تحنث کی تفسیر عبادت کرنا کرتا ہے یعنی عبادت کیا کرتے تھے بغیر اس کے کہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر آتے۔ اور اس مدت کے لیے زاد راہ اپنے ساتھ لیجاتے پھر جب یہ زاد راہ ختم ہو جاتا تو اتنی ہی مدت کے لیے اور زاد راہ لیجاتے یہاں تک کہ آپ کے پاس حق کا پیغام غار حرا میں آپہنچا۔ چنانچہ خدا کا فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا پڑھو۔ آپ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ فرشتہ نے مجھ کو پکڑا اور اتنی زور سے دبایا کہ مجھ کو تکلیف ہوئی پھر چھوڑ کر مجھ سے کہا پڑھو۔ تو میں نے وہی کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اس پر فرشتہ نے پھر مجھے پکڑ کر زور سے دبایا یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی، پھر چھوڑ کر کہا پڑھو تو میں نے پھر کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں تیسری بار اس نے مجھے پکڑ کر زور سے دبایا پھر مجھے چھوڑ کر کہا اقرأ باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق اقرأ وربك الاکرم الذی علم بالقلم ؛ یعنی اپنے پروردگار کے نام کی برکت سے پڑھو جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا۔ پڑھو تمہارا پروردگار بہت بڑا کریم ہے جس نے قلم سے سکھایا۔ آپ ان آیات کو لے کر واپس آئے اور اس واقعہ سے آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ آپ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے اور فرمایا مجھے کمبل اڑھا دو مجھے کمبل اڑھا دو گھر والوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا۔ یہاں تک کہ جب آپ کے قلب مبارک سے خوف کا وہ عالم جاتا رہا تو آپ نے حضرت خدیجہؓ

۵، ۹۔ ابن ہشام اپنی سیرت میں صدیقہ عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جب صدیق اکبرؓ نے کفار کی ایذا رسانی سے تنگ آکر ترک وطن کا قصد کیا تو ابن الدغنہ نے ان سے پوچھا آپ کہاں جاتے ہیں! صدیق اکبرؓ نے کفار کی ایذا رسانی کا سارا ماجرا بیان کیا، اس پر جو کلمات اس نے صدیق اکبرؓ کی شان میں کہے وہ ان الفاظ سے بہت ہی ملتے جلتے ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے یہاں آپ کی شان مبارک میں فرمائے ہیں وہ کہتا ہے واللّٰہ انك لتزین العشیرہ، وتعین علی النوائب، وتفعل المعروف، وتکسب للمعدوم، ارجع وانت فی جواری (ص ۱۳۰ ج ۱ مطبوعہ بر حاشیہ روض الانف)
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ اوصاف خیر لوگوں میں عام طور پر مشہور تھے اور کسی انسان کی بلندی کا سب سے اعلیٰ معیار سمجھے جاتے تھے اسی بنا پر حضرت خدیجہؓ نے بے ساختہ یہاں ان کا تذکرہ کیا ہے۔
یہ حدیث نزول قرآن کے سلسلہ میں سب سے پہلی ہے اور اتصال کلی وبشری ـ بہت سے رموز کی حامل ہے ابتدائی

لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِي فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ كَلَّا وَاللهِ مَا يُخْزِيْكَ اللهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ فَانْطَلَقَتْ بِهٖ خَدِيْجَةُ حَتّٰى أَتَتْ بِهٖ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰى بْنِ عَمِّ خَدِيْجَةَ وَكَانَ امْرَأً قَدْ تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ فَيَكْتُبُ مِنَ الْإِنْجِيْلِ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَكْتُبَ وَكَانَ شَيْخًا كَبِيْرًا قَدْ عَمِيَ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ يَا ابْنَ عَمِّ اسْمَعْ مِنِ ابْنِ أَخِيْكَ فَقَالَ لَهٗ وَرَقَةُ يَا ابْنَ أَخِي مَاذَا تَرٰى فَأَخْبَرَهٗ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَبَرَ مَا رَأٰى فَقَالَ لَهٗ وَرَقَةُ هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِي

سے سارا واقعہ بیان فرمایا اور فرمایا خدا کی قسم مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہوگیا تھا حضرت خدیجہؓ بولیں ہرگز نہیں خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی شرمندہ نہیں کریگا آپ تو صلہ رحمی فرماتے ہیں، بے وسیلہ شخص کا بوجھ اُٹھاتے ہیں اور محتاج کو مال کما کر دیدیتے ہیں، مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور راہ حق کے حادثوں میں لوگوں کی امداد کرتے ہیں (پھر آپ ناکام کیسے رہ سکتے ہیں) پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ کے پاس لے کر آئیں، یہ زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے اور عبرانی لکھا کرتے تھے، اس لیے انجیل جس قدر اللہ کو منظور ہوتی عبرانی میں لکھا کرتے تھے اور اس وقت بڑھاپے کی وجہ سے نابینا ہو چکے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے فرمایا اے ابن عم! ذرا اپنے بھتیجے سے اُن کا حال تو سُنیے۔ ورقہ نے آپ سے کہا بھتیجے تم نے کیا واقعہ دیکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا ان سے بیان کر دیا۔ یہ سُن کر ورقہ نے آپؐ سے کہا یہ تو وہی فرشتہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ

واقعہ میں وحی کا ثقل، آپ کا اضطراب اور حضرت خدیجہؓ کے تسلی آمیز کلمات سب بالکل قرینِ قیاس اور معقول باتیں ہیں اور آپ کی صداقت کی سب سے واضح دلیل ہیں۔ دیکھیے ورقہ بن نوفل ذرا سا واقعہ سُن کر کس طرح یہ سمجھ گئے کہ یہ فرشتہ جو آپ پر وحی لے کر آیا ہے وہی فرشتہ ہے جو آپ سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تھا۔ اس سے جہاں آپ کی بے لوث صداقت کا ثبوت ملتا ہے اسی کے ساتھ وحی اور نبوت کی حقیقت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے مگر کیا تاریخ نبوت کے علم کے بغیر محض عقلی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے جو یہاں چند جملوں سے ورقہ نے اخذ کر لیا اور وہ بھی کس جزم اور یقین کے ساتھ۔

یہ بات بھی قابلِ یادداشت ہے کہ جب نزولِ وحی شروع ہوتا ہے تو ایسے حال میں شروع ہوتا ہے جبکہ آپ اس سے قطعاً لاعلم تھے۔ اور جب آپ وحی سے آشنا ہو چکے تھے تو ایک مدت کے لیے نزول وحی ایسا بند ہو جاتا ہے کہ اس کے اشتیاق میں بارہا آپ کے قلب مبارک میں یہ خیال گزرتا ہے کہ کسی پہاڑ پر جا کر اپنے آپ کو گرا دیں مگر وحی کا ایک حرف بھی نازل نہیں ہوتا۔ وحی کی اس ابتداء اور اس انقطاع سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالم نبوت پرواز خیال سے کتنا بالاتر عالم ہے۔ کیونکہ خیالی معاملات تمام تر انسان کے خیال کرنے نہ کرنے پر موقوف ہوا کرتے ہیں۔ اور یہاں نبوت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب وحی کا خیال بھی نہ تھا تو وحی نازل ہوئی اور جب انتہائی شوق و ذوق موجود تھا تو مدت تک وحی کا ایک حرف بھی سُننے میں نہیں آیا۔

نیز حضرت خدیجہؓ جو خود بڑی عاقلہ تھیں اور مدت دراز تک آپ کے روز و شب حالات کا جائزہ لے چکی تھیں وہ اس واقعہ کو سُن کر ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شبہ میں نہیں پڑتیں اور قسم کھا کر پورے جزم و وثوق کے ساتھ کہتی ہیں

نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰى مُوْسٰى يَا لَيْتَنِيْ فِيْهَا جَذَعًا يَا لَيْتَنِيْ حَيًّا اِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ قَالَ نَعَمْ لَمْ يَاْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهٖ اِلَّا عُوْدِيَ وَاِنْ يُدْرِكْنِيْ يَوْمُكَ اَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ اَنْ تُوُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ. رواه البخاري

۹۷۶۔ عَنْ خَدِيْجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ اَنَّهَا قَالَتْ قُلْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا ابْنَ الْعَمِّ اَتَسْتَطِيْعُ اِذَا جَاءَكَ هٰذَا الَّذِيْ يَاْتِيْكَ اَنْ تُخْبِرَنِيْ بِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ قَالَتْ خَدِيْجَةُ فَجَاءَ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ذَاتَ يَوْمٍ وَاَنَا عِنْدَهٗ فَقَالَ يَا خَدِيْجَةُ هٰذَا صَاحِبِيَ الَّذِيْ يَاْتِيْنِيْ قَدْ جَاءَ فَقُلْتُ لَهٗ قُمْ فَاجْلِسْ عَلٰى فَخِذِيْ فَجَلَسَ عَلَيْهَا فَقُلْتُ

نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس بھیجا تھا، اے کاش کہ میں آپ کے زمانۂ نبوت میں توانا جوان ہوتا، اے کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا جبکہ آپ کی قوم آپ کو مکہ مکرمہ سے نکالیگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعجب سے فرمایا اچھا کیا میری قوم مجھ کو نکالیگی ورقہ نے کہا جی ہاں، ہمیشہ جب کوئی رسول وہ دین لے کر آیا ہے جیسا تم لے کر آئے ہو تو ضرور اس کے ساتھ دشمنی کی گئی ہے اور اگر مجھ کو آپ کی نبوت کا زمانہ مل گیا تو میں آپ کی بہت زوردار مدد کرونگا۔ مگر ایسا ہوا کہ چند ہی روز بعد ورقہ کی وفات ہوگئی اور ادھر وحی کی آمد کچھ مدت کے لیے بند ہوگئی۔ (بخاری شریف)

۹۷۶۔ حضرت خدیجہؓ بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے میرے چچا زاد بھائی! کیا یہ ممکن ہے کہ یہ شخص جو آپ کے پاس آتے ہیں اب کی بار آئیں تو آپ مجھ کو بھی بتا دیں۔ آپ نے فرمایا ہو سکتا ہے۔ حضرت خدیجہ کہتی ہیں ایک دن ایسا ہوا کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور میں اتفاق سے اس وقت آپ کے پاس ہی بیٹھی تھی تو آپ نے فرمایا لو میرے رفیق جو میرے پاس آیا کرتے ہیں وہ اس وقت تشریف لائے ہیں۔ یہ سن کر میں نے کہا اچھا آپ اٹھ کر ذرا میری دائیں ران پر بیٹھیے آپ ادھر آکر بیٹھ گئے

کہ آپ کا معاملہ ہر ایسے تصور سے جو آپ کے شایانِ شان نہ ہو بالاتر ہے اور یہ اس لیے کہ آپ کے اوصاف خود اس کے شاہد عدل ہیں کہ خدا ایسے نیک طینت اور بلند فطرت انسان کو ناکام نہیں کر سکتا، اس کے بعد جب یہ واقعہ ورقہ کے سامنے آتا ہے تو وہ صرف اس کا اجمالی حال سن کر آنے والے فرشتے، آپ کی وحی، آپ کی نبوت اور آئندہ آپ کے حالات کا اس طرح اندازہ کر لیتے ہیں گویا یہ سب پہلے سے مسلم باتیں ہیں۔ حدیث مذکور میں آپ کے قبل از نبوت دور کے مجاہدات کا کچھ نقشہ بھی ملتا ہے صوفیاء کرام نے غار حرا کے اس قیام کو چلہ کی اصل قرار دیا ہے۔

۹۷۶۔ حضرت خدیجہؓ گو اہل کتاب میں سے نہ تھیں مگر اپنی فطری دانشمندی سے اتنا ضرور جانتی تھیں کہ جس طرح نبی اور ساحر اور کاہنوں کی شخصیتوں میں پاکیزگی و بلندی کا بڑا فرق ہوتا ہے اسی طرح جو ان کے پاس غیبی خبریں لانیوالا ہوتا ہے ان میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہونا چاہیے اس امتحان کے لیے جو فوری اور آسان صورت ان کے ذہن میں آئی اس پر انہوں نے صورتِ حال کو پرکھا اور اس کے بعد جو عقیدہ ان کا پہلے قائم ہو چکا تھا وہ اور مستحکم ہو گیا۔ یہ بات تو اس وقت

هَلْ تَرَاهُ قَالَ نَعَمْ فَقُلْتُ تَحَوَّلْ فَاجْلِسْ عَلٰى فَخِذِيَ الْيُسْرٰى فَجَلَسَ فَقُلْتُ هَلْ تَرَاهُ قَالَ نَعَمْ قَالَتْ خَدِيْجَةُ فَتَحَسَّرَتْ فَطَرَحَتْ خِمَارِيْ فَقُلْتُ هَلْ تَرَاهُ قَالَ لَا فَقُلْتُ هٰذَا وَاللّٰهِ مَلَكٌ كَرِيْمٌ لَا وَاللّٰهِ مَا هٰذَا شَيْطَانٌ ثُمَّ ذَكَرَتْ لِوَرَقَةَ مَا اَخْبَرَهَا صلی اللہ علیہ وسلم وفی روایۃ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ جَالِسًا مَعَ خَدِيْجَةَ يَوْمًا مِنَ الْاَيَّامِ اِذْ رَاٰى شَخْصًا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَا يَزُوْلُ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ اُدْنُ مِنِّيْ فَدَنَا مِنْهَا فَقَالَتْ لَهٗ اَتَرَاهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ قَالَتْ خَدِيْجَةُ اَدْخِلْ رَاْسَكَ تَحْتَ دِرْعِيْ فَفَعَلَ

میں نے پوچھا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر میں نے کہا اچھا اب آپ میری بائیں ران پر آجایئے آپ ادھر آکر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا ہاں۔ حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں پھر میں نے اپنی اوڑھنی اُتار کر (سر ننگا کرکے) پوچھا اچھا کیا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا نہیں۔ میں نے کہا خدا کی قسم یہ تو خدا تعالیٰ کا بزرگ فرشتہ ہی ہے، خدا کی قسم یہ شیطان نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد آپ کا سارا واقعہ نوفل سے بیان کیا (جو پہلے مذکور ہو چکا ہے)

دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ حضرت خدیجہؓ بیان فرماتی ہیں۔ ایک دن آپ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے دیکھا کہ ایک شخص زمین و آسمان کے درمیان نظر آرہا ہے جو نہ اوپر جاتا ہے نہ نیچا اترتا ہے (میں نے آپؐ کے فرمانے پر کہا) آپ ذرا میرے قریب آجائیں، آپ قریب آگئے۔ انہوں نے پوچھا کیا اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ نے فرمایا اچھا اب آپ میرے گریبان میں منہ ڈال لیجیے۔ آپؐ نے منہ ڈال لیا۔ پھر پوچھا کیسے کیا

کی تھی جبکہ آپ نبوت سے سرفراز ہو چکے تھے لیکن آپ کے حالات تو کچھ ابتدا ہی سے اس قسم کے تھے کہ جب حلیمہ سعدیہ شق صدر کے واقعہ سے خائف ہو کر آپ کو آپ کی والدہ کی خدمت میں پہنچانے کے لیے آئیں تو انہوں نے متحیر ہو کر پوچھا تم تو اصرار پر اصرار کرکے ان کو مجھ سے اپنے گھر لے گئی تھیں کچھ بات بتاؤ آخر آج کیوں از خود ان کو لے کر آرہی ہو انہوں مجبور ہو کر سارا واقعہ بیان فرما دیا اس پر آپ کی والدہ کے جو کلمات ابن ہشام نے اپنی سیرت میں نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں

قالت اَفتخوفت علیہ الشیطان قالت قلت نعم قالت کلا واللہ ما للشیطان علیہ من سبیل و ان لبنی لشاناً (فذکرت ما رأت فی حملہ وعند ولادتہ من کرامتہ تعالٰی علیہ صلی اللہ علیہ وسلم)

آپ کی والدہ ماجدہ نے حلیمہ سعدیہؓ سے کہا کیا ان کے متعلق تم کو کسی شیطانی دخل کا خیال ہے۔ انہوں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا خدا کی قسم ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ فرزند بہت بڑی شان والا ہے شیطان کو ان پر ذرا بھی دسترس نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے حالت حمل اور آپ کی ولادت کے وقت کے سارے مشاہدات بیان فرمائے۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذات شروع سے ہی ایسے صفات و حالات کی حامل رہی ہے کہ مخالفین نے بھی گو آپ کو رسول

ذٰلِكَ فَقَالَتْ خَدِيْجَةُ لَهُ أَتَرَاهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا قَدْ أَعْرَضَ عَنِّي قَالَتْ خَدِيْجَةُ أَبْشِرْ فَإِنَّهُ مَلَكٌ كَرِيْمٌ لَوْ كَانَ شَيْطَانٌ مَا اسْتَحْيٰى. ثم ذكرت اسلامها۔ رواه ابو نعيم في دلائل النبوة والطبراني في الاوسط قال الحافظ الهيثمي واسناده حسن ۔ وذكره ابن هشام في سيرته۔

۹۷۷۔ عَنْ أَبِي مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ خَرَجَ أَبُوْ طَالِبٍ إِلَى الشَّامِ وَخَرَجَ مَعَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَشْيَاخٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَلَمَّا أَشْرَفُوْا عَلَى الرَّاهِبِ هَبَطُوْا فَحَلُّوْا رِحَالَهُمْ فَخَرَجَ إِلَيْهِمُ الرَّاهِبُ وَكَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ يَمُرُّوْنَ بِهِ فَلَا يَخْرُجُ إِلَيْهِمْ وَلَا يَلْتَفِتُ قَالَ فَهُمْ يَحُلُّوْنَ رِحَالَهُمْ

اب بھی آپ ان کو دیکھ رہے ہیں آپ نے فرمایا نہیں۔ اب انہوں نے اِدھر سے اپنا رُخ پھیر لیا ہے حضرت خدیجہؓ نے فرمایا۔ آپ کو بشارت ہو یہ خدا تعالیٰ کا بزرگ فرشتہ ہے اگر شیطان ہوتا تو بھلا یہ شرم کہاں کرتا۔

(دلائل النبوۃ)

۹۷۷۔ ابو موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابو طالب ملک شام کے ارادہ سے نکلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سفر میں اُن کے ہمراہ تھے اور قریش کے کچھ اور بڑے لوگ بھی تھے جب یہ قافلہ بحیرا کے پاس پہنچا جو اُس وقت نصرانیوں کا بڑا درویش تھا تو یہاں آکر اُنہوں نے اپنے کجاوے کھول دیے، اور اس سے قبل جب کبھی ان کا اس طرف سے گزر ہوتا تو یہ درویش کبھی ان کے پاس نہ آتا اور نہ ان کی طرف کوئی توجہ کرتا، اس مرتبہ خلافِ معمول وہ نکل کر اُن کے پاس آیا، لوگ ابھی اپنے کجاوے

نہ مانا ہو مگر نبوت کے معاملہ کے سوا، ہر موقعہ پر آپ کے غیر معمولی انسان ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اگر فطری سعادت امداد نہ کرے تو جنہوں نے نہ تو کسی نبی کی تاریخ کبھی دیکھی ہو اور نہ سُنی ہو بلکہ اس کے برعکس ضد اور جہل نے اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہو وہ اس کھلی ہوئی صداقت سے کیا فائدہ اُٹھاتے۔

آپ نے دیکھا کہ تاریخ نبوت کے جاننے والے یا آپ کی شخصیت کے مشاہدہ کرنے والوں میں سے کسی کے دل میں کبھی یہ وسوسہ نہیں گزرا کہ جو کچھ آپ دیکھتے یا سنتے ہیں یہ صرف آپ کے نفس ہی کے خیالات ہیں ان کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے۔

۹۷۷۔ تاریخ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کل دو سفر ایسے معلوم ہوتے ہیں جن میں اہل کتاب کے علماء کے ساتھ آپ کا اجتماع ہوا ہے ایک بحیرا راہب اور دوسرے نسطورا۔ پہلا سفر آپ کا بالکل صغر سنی میں ہوا ہے۔ البتہ دوسرا سفر آپ کے عہدِ شباب کا ہے لیکن ان ہر دو سفروں میں کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے ان راہبوں سے کہیں تنہائی میں ملاقات کی ہو چہ جائیکہ اُن سے کوئی تعلیم حاصل کی ہو اس کے علاوہ آپ کا مفصل لایا ہوا دین آج بھی سب کے سامنے موجود ہے جس میں بہت سے مقامات پر نصاریٰ کے دین سے صراحۃً اختلاف موجود ہے۔ سب سے بنیادی مسئلہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات کا ہے۔ قرآن کریم نے اُس کا جا بجا رد کیا ہے اور ان کے معاملہ میں اہل کتاب میں جو جو غلط یا بے تحقیق باتیں مشہور تھیں ان کی تردید کی ہے، پھر کیسے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قرآن اس ملاقات کا نتیجہ ہے۔ رہا فروع اور عملی احکام کا معاملہ تو پہلے تو انجیل میں یہ حصہ ہی بہت کم ہے اور نصاریٰ کے اپنے خیال کے

فَجَعَلَ يَتَخَلَّلُهُمُ الرَّاهِبُ حَتّٰى جَاءَ فَاَخَذَ بِيَدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ هٰذَا سَيِّدُ الْعَالَمِيْنَ هٰذَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ يَبْعَثُهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ فَقَالَ لَهٗ اَشْيَاخٌ مِّنْ قُرَيْشٍ مَا عِلْمُكَ فَقَالَ اِنَّكُمْ حِيْنَ اَشْرَفْتُمْ مِنَ الْعَقَبَةِ لَمْ يَبْقَ شَجَرٌ وَّلَا حَجَرٌ اِلَّا خَرَّ سَاجِدًا وَّلَا يَسْجُدُوْنَ اِلَّا لِنَبِيٍّ وَّاِنِّيْ اَعْرِفُهٗ بِخَاتَمِ النُّبُوَّةِ اَسْفَلَ مِنْ غُضْرُوْفِ كَتِفِهٖ مِثْلَ التُّفَّاحَةِ

کھولنے ہی میں مشغول تھے یہ قافلہ کے درمیان گھس کر کچھ ٹٹولنے لگا یہاں تک کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا کہ یہ شخص ہیں جو تمام جہانوں کے سردار ہیں، یہ وہ ہیں جو سارے جہانوں کے پروردگار کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اس پر قریش کے مشائخ نے پوچھا تم کو یہ کیسے معلوم ہوا۔ اُس نے کہا جب تم لوگ اس گھاٹی کے قریب پہنچے تو نہ کوئی درخت ایسا رہا اور نہ کوئی پتھر جو سرنگوں نہ ہو گیا اور جمادات و نباتات نبی کے علاوہ کسی اور کے لیے اس طرح سرنگوں نہیں ہوا کرتے اور ان کو تو میں ایک اور خاص علامت سے بھی پہچانتا ہوں یعنی مہرِ نبوت جو آپ کے شانہ کی باریک ہڈی

مطابق تو ان کے یہاں حلال و حرام کا کوئی منظم باب ہی نہیں اس کے برخلاف ہماری شریعت میں جس تفصیل کے ساتھ یہ ابواب موجود ہیں وہ کسی شخص پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ پھر فتح مکہ کے بعد کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ اسلام میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ عملی احکام میں اختلاف ایک بنیادی سا مسئلہ بن گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیتِ مقدس کا سولہ سترہ ماہ استقبال فرما کر پھر کعبۃ اللہ کا استقبال فرمایا، کیا ان لوگوں کے ساتھ یہ معمولی اختلاف تھا۔ اگر آپ شروع سے ہی بیت مقدس کا استقبال نہ فرماتے تو بھی ایک بات تھی لیکن اس کی طرف استقبال کر کے پھر قبلہ بدلنا کتنے طعن اور ناگواریوں کا موجب بنا۔ اس کا تذکرہ خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ پھر شریعتِ اسلام کچھ دو چار کلمات کی شریعت نہیں۔ رہ گئے قرآنی قصص تو وہ کچھ افواہ کا مجموعہ نہیں۔ اس تفصیل اور اس تحقیق اور اس شرح و بسط کے ساتھ واقعات کا بیان فرمانا بلکہ اُن واقعات کا بھی بیان کر دینا جن کے متعلق تورات خاموش نظر آتی ہے کیا چند لمحات کی صحبت کے تعلم سے حاصل ہو سکتا ہے، پھر عجیب تر حکمتِ ایزدی یہ ہے کہ قرآنِ کریم تورات کی طرح لکھا لکھایا نہیں اُترا۔ آپ کی تیئیس سالہ زندگی میں ہر ضرورت کے مناسب اُترتا رہا ہے۔ مگر نزول کی ترتیب اور تالیف کی ترتیب پھر مخالف رہی ہے آپ کی ہدایت کے بموجب آیتوں کو اپنی اپنی سورتوں میں علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا تھا ایک ہی زمانہ میں کئی کئی سورتیں جداگانہ جداگانہ اترتی رہتی تھیں پھر علیحدہ علیحدہ ہی ان کی ترتیب دی جاتی تھی کیا کوئی شخص ہر سوال کا مناسب جواب اور ہر مصلحت پر مناسب مناسب احکام کا نزول دیکھ کر یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ یہ کتاب تقریباً چالیس سال قبل کسی کی تعلیم سے مرتب ہو چکی تھی اور سب سے بڑھ کر حیرت یہ کہ جن کو اس راز کا بانی کہا جائے اُن سے اس کی کوئی شہادت بھی نہ ملے۔ کیا اس موقعہ پر صرف مابعد کے لوگوں کی غلط اور غیر معقول قیاس آرائیوں پر فیصلہ کر دینا بھی کوئی عقل کا فیصلہ کہا جا سکتا ہے۔ مدعی سست اور گواہ چست اسی کو کہتے ہیں۔ اس بارے میں اگر مذکورہ بالا روایت سے آپ کی بحیرا راہب سے ملاقات ثابت ہوتی ہے تو اُسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بحیرا کے نزدیک جس آنے والے نبی کی پیشگوئی گزشتہ کتابوں میں کی گئی تھی وہ آپ ہی کی ذات ہے۔ چلیے اگر خود ان راہبوں سے اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے دین کے حرف کا کوئی کلمہ آپ کو بتایا ہے تو پھر دوسرے نمبر کی شہادت

ثُمَّ رَجَعَ فَصَنَعَ لَهُمْ طَعَامًا فَلَمَّا أَتَاهُمْ بِهِ وَكَانَ هُوَ فِي رِعْيَةِ الْإِبِلِ فَقَالَ أَرْسِلُوا إِلَيْهِ فَأَقْبَلَ وَعَلَيْهِ غَمَامَةٌ تُظِلُّهُ، فَلَمَّا دَنَى مِنَ الْقَوْمِ وَجَدَهُمْ قَدْ سَبَقُوهُ إِلَى فَيْئِ الشَّجَرَةِ فَلَمَّا جَلَسَ مَالَ فَيْئُ الشَّجَرَةِ عَلَيْهِ فَقَالَ أُنْظُرُوا إِلَى فَيْئِ الشَّجَرَةِ مَالَ عَلَيْهِ. قَالَ فَبَيْنَمَا هُوَ قَائِمٌ عَلَيْهِمْ يُنَاشِدُهُمْ أَنْ لَا يَذْهَبُوا بِهِ إِلَى الرُّوْمِ فَإِنَّ الرُّوْمَ إِنْ رَأَوْهُ عَرَفُوْهُ بِالصِّفَةِ فَيَقْتُلُوْنَهُ،

کے نیچے سیب کے سے انداز کی ہے۔ اس کے بعد وہ واپس ہوگیا اور اس نے اُن کے لیے کھانے کا انتظام کیا جب وہ کھانا لے کر آیا تو آپ اس وقت اونٹ چرانے نکل گئے تھے اُس نے کہا کسی کو آپ کے پاس بھیج دو۔ آپ تشریف لائے تو آپ کے اوپر ایک بادل سایہ کیے ہوئے تھا۔ جب آپ لوگوں کے بالکل پاس تشریف لے آئے تو سب لوگ آپ سے پہلے درخت کے سایہ میں جا چکے تھے، جب آپ آکر بیٹھے تو درخت کا سایہ آپ کی طرف جُھک گیا۔ اس درویش نے کہا دیکھو ذرا درخت کے سایہ کو دیکھو کیسا آپ کی طرف جُھک گیا ہے۔ ابھی یہ درویش ان سے کھڑے یہ اصرار ہی کر رہے تھے کہ آپ کو وہ اپنے ہمراہ روم نہ لے جائیں کیونکہ وہ لوگ اگر آپ کو دیکھ پائینگے تو آپ کی خاص علامت کی وجہ سے آپ کو پہچان جائینگے اور آپ کے قتل

آپ کے رفقاء سفر کی ہے کم از کم ان میں سے کسی کا یہ بیان ہونا چاہیے اور اگر یہ بھی اس کی شہادت نہیں دے سکتے تو سب سے مزور شہادت آپ کے زمانہ کے اہل کتاب کی ہے کم از کم وہی یہ شہادت دیں کہ آپ نے اُن راہبوں سے دین یا غیر دین کی کوئی تعلیم تھوڑی یا بہت حاصل کی تھی لیکن اگر یہ شہادت نہ خود اُن راہبوں کی ہے جن کو اس افسانہ کا بانی قرار دیا جاتا ہے اور نہ اُن رفقاء کے جو واقعہ کے مشاہدہ کرنے والے اور آپ کے ہم سفر تھے اور نہ اس زمانہ کے اہل کتاب ہی یہ دعویٰ رکھتے ہیں تو پھر بعد کی قیاس آرائیوں کی کیا وقعت کی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بعد کے اہل کتاب نے ایک رسول اُمّی کی زبان سے علوم و معارف کا وہ سمندر موجیں مارتا دیکھا جس کے سامنے انجیل و توراۃ سرنگوں کھڑی تھیں تو فطرۃً میزانِ مستوفی ملانے کے لیے یہی ایک عذر گناہ بدتر از گناہ تراش سکے کہ یہ علوم درحقیقت ان ہی کے گھر کا فیض ہیں مگر کیا آپ کے عہد کے کسی ایک شخص کی شہادت بھی وہ اپنے اس دعوے کے لیے پیش کر سکتے ہیں ان بیچاروں کو اتنی فہم بھی نہ آئی کہ اُن نے راہبوں کا تو ذکر کیا ہے قرآن کے علوم کا براہ راست انجیل و توریت سے موازنہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ ان میں کون معلم کی حیثیت میں ہے اور کون متعلم کی حیثیت میں نظر آ رہا ہے۔ باادب نجاشی کے کانوں نے جب یہاں سورۂ مریم کی چند آیتیں ہی سُنیں تو اُس نے معلم اور متعلم کی بحث کیا چھیڑی وہ ادب سے لبریز کلمات کہے کہ جو کلام موسیٰ پر اترا تھا وہ اور یہ ایک ہی چشمہ سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

پھر اگر صرف ان دو راہبوں کی ملاقات سے آپ کی تعلیمات پر کوئی حرف آ سکتا ہے تو صحیح بخاری میں ورقہ بن نوفل سے بھی آپ کی ملاقات ثابت ہے اور یہ تو اُس وقت کی بات ہے جبکہ آپ کو خلعتِ نبوت پہنایا جا چکا تھا اور ان راہبوں کے سوا بھی بہت سے نصرانی آپ سے ملتے رہے ہیں اُن کے ساتھ آپ کی بڑی بڑی دیر تک گرم مجلسیں بھی رہی ہیں یہاں تو اس قیاس کا اور بھی بہت اچھا موقعہ تھا پس محض دشمنوں کے بے سروپا اعتراضات سے ثابت شدہ حدیثوں کو آپ کے تذکرہ سے نکال ڈالنا نہ علم کی بات ہے نہ دانشمندی کی۔

اب ذرا اس پر بھی غور کیجیے کہ اگر اس اعتراض کا کوئی بھی محل ہوتا تو کیا قرآن اس سے سکوت اختیار کرتا آخر

فَالْتَفَتَ فَإِذَا بِسَبْعَةٍ قَدْ اَقْبَلُوْا مِنَ الرُّوْمِ فَاسْتَقْبَلَهُمُ الرَّاهِبُ فَقَالَ مَاجَاءَ بِكُمْ، قَالُوْا جِئْنَا
لِاَنَّ هٰذَا النَّبِيَّ خَارِجٌ فِيْ هٰذَا الشَّهْرِ فَلَمْ يَبْقَ طَرِيْقٌ اِلَّا بُعِثَ اِلَيْهِ بِاُنَاسٍ وَاِنَّا قَدْ اُخْبِرْنَا
خَبَرَهٗ بِطَرِيْقِكَ هٰذِهٖ. فَقَالَ اَرَاَيْتُمْ اَمْرًا اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّقْضِيَهٗ، هَلْ يَسْتَطِيْعُ اَحَدٌ مِّنَ النَّاسِ
رَدَّهٗ؛ قَالُوْا فَبَايَعُوْهُ وَاَقَامُوْا مَعَهٗ، قَالَ اُنْشِدُكُمْ يَا مَعْشَرَ الْعَرَبِ اَيُّكُمْ وَلِيُّهٗ، فَقَالَ اَبُوْطَالِبٍ

کے درپے ہوجائینگے۔ اس نے جو رُخ بدلا کیا دیکھتا ہے کہ سات آدمی روم سے آرہے ہیں۔ درویش صاحب نے
ان کا استقبال کیا اور پوچھا آپ لوگ کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے کہا اس لیے کہ وہ نبی اسی مہینہ میں
اپنے وطن سے باہر نکلنے والا ہے، کوئی راستہ ایسا نہیں رہا جس پر لوگ نہ بھیجے گئے ہوں اور ہم کو اطلاع ملی ہے
کہ وہ آپ کے اسی راستہ پر ہیں۔ درویش صاحب نے کہا ذرا بتاؤ تو سہی جس بات کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرما چکا
ہو کہ وہ پوری کرے، پھر لوگوں میں وہ کون ہے جو اس کو ٹال سکتا ہو۔ یہ سُن کر وہ لوگ اس کی بات مان گئے
اور کچھ دن اس کے یہاں قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد ان درویش صاحب نے کہا اے عرب کے لوگو
قسم کھا کر بتاؤ تم میں سے اس کا ولی کون ہے۔ ابوطالب بولے

مشرکین عرب نے بھی آپ پر یہی تہمت تو لگی تھی کہ مکہ میں یہ جو ایک عجمی آدمی ہے یہی آپ کو سب کچھ سکھاتا پڑھاتا ہے۔
لیکن اس محض بے اصل بکواس کو قرآن نے نقل بھی کیا ہے اور اس کے بعد اس کا مُسکت جواب بھی دیا ہے۔

ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر
لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھٰذا
لسان عربی مبین . ( )

قدرت کے عجب رموز ہیں کہ مشرکین عرب کی زبانوں سے اگر کوئی اعتراض نکلا بھی تو یہ کہ فلاں شخص قریشی کا فلاں غلام آپ
کو یہ قرآن سکھاتا ہے۔ کتنی بے جوڑ بات تھی کہ اس دریائے علوم کا منبع کس کو قرار دیا جائے اس کو جو خود غلام ہے اور پھر
عجمی ہے نہ وہ عربی سے آشنا ہے اور نہ آپ عجمی زبان سے واقف ہیں۔ اگر یہ تہمت لگائی تھی تو یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ یہ
باتیں آپ علماءِ اہلِ کتاب سے سیکھ کر آتے ہیں، مگر وہ اتنے احمق نہ تھے کہ جس بات کے لیے کوئی بھی قرینہ موجود نہ ہو
اس کو اپنے منہ سے نکال کر مفت میں رسوا ہوتے۔ یہ غلام گو عجمی تھا مگر اس کے ساتھ ہم شہر ہونے کی وجہ سے آپ کا
اختلاط بعید از قیاس نہ تھا مگر اہلِ کتاب کے علماء کے ایسے مشتبہ اختلاط کا چونکہ کوئی وجود ہی نہ تھا اس لیے ان سے
تعلیم حاصل کرنا بالکل بیرون از قیاس بات تھی۔ معلوم ہوا کہ انتہائی دشمنوں کے نزدیک بھی آپ پر علماءِ اہلِ کتاب سے
تعلیم حاصل کرنے کی تہمت رکھنے کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:-

ولم ینقل احد منھم ما یمکن ان یکون شبھۃ
فی تعلمہ انباء الغیب من علماء اھل الکتاب
ونحو ذلک وانما قالوا ما ظھر بطلانہ لکل احد
ولو ینقل عن احد منھم انہ قال قولا یخفی
بطلانہ بل ما یظھر کذبہ لکل احد فتبین

مشرکین عرب میں سے جب کسی نے ایک بات بھی ایسی بات
نہیں کہی جس سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا کہ آپ غیب کی یہ خبریں
اہل کتاب کے علماء سے سیکھ لیتے ہیں اور کسی بھی تو وہ بات
کہی جو بدیہی البطلان تھی تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی
ہے کہ ان کے نزدیک بھی آپ کے ان علوم کو کسی کی

اَنَا فَلَمْ يَزَلْ يُنَاشِدُهُ حَتّٰى رَدَّهُ اَبُوْطَالِبٍ وَزَوَّدَهُ الرَّاهِبُ مِنَ الْكَعْكِ وَالزَّيْتِ وَبَعَثَ مَعَهُ اَبُوْبَكْرٍ بِلَالًا۔ قال الترمذی هذا حدیث حسن غریب لا نعرفه الا من هذا الوجه. ورواه البیهقی فی کتاب دلائل النبوة من حدیث العباس بن محمد عن قراد بن نوح. وقال العباس لم یحدث به یعنی بهذا الاسناد غیر قراد وسمعه یحیی واحمد بن قراد قال البیهقی اراد انه لم یحدث بهذا الاسناد سوی هؤلاء فاما القصة فهی عند اهل المغازی مشهورة. واخرجه ابن سعد فی الطبقات ایضا وابن الجوزی کما ذکره الحافظ ابن تیمیة فی الجواب الصحیح ص۲۰ ج ۱

میں۔ اس پر وہ آپ کی واپسی پر برابر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ ابو طالب نے آپ کو مکہ مکرمہ واپس کر دیا۔ اور رخصت کے وقت درویش صاحب نے آپ کے سات زادِ راہ کے لیے کچھ زیتون کا تیل اور چپاتیاں پیش کیں اور ابو بکرؓ نے بلالؓ کو آپ کے ساتھ بھیج دیا (ترمذی وغیرہ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند اچھی ہے اگرچہ اس کا راوی تنہا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں اور اس میں آخری جملہ کے سوا کوئی بات منکر نہیں ہے۔ بظاہر ابو بکرؓ کا بلالؓ کو آپ کے ہمراہ بھیجنا کسی اور سفر کا واقعہ تھا کسی راوی کو وہم ہو گیا ہے اور اس نے اس کو اس قصہ کے ساتھ لگا دیا ہے۔

انه لم یمکنهم ان یقولوا انه تعلم اخبار الغیوب من احد — تعلیم کا نتیجہ قرار دینا غیر ممکن تھا۔
(الجواب الصحیح ص۲۴۷)

یہ بحث ابھی نہیں ہے کہ قرآنی نظم اور اس کا اسلوب بیان آپ کی چالیس سالہ عمر اور آپ کی بے لوث صداقت کی زندگی میں بھی کیا اس شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے، اسی لیے آپ نے اہل فکر و انصاف کو اپنی ماسبق زندگی پر غور کرنے کی دعوت دی اور فرمایا:۔

لقد لبثت فیکم عمرًا من قبله افلا تعقلون — میں اس سے قبل ایک بڑی مدت سے تم ہی میں رہا ہوں تو کیا تم اتنی بات سمجھتے نہیں۔

بہر حال اگر صحیح طریقوں سے ایک نہیں ایک ہزار راہبوں کی ملاقات بھی آپ کے ساتھ ثابت ہو تو ہم نصاریٰ کے محض بے بنیاد اعتراضوں کی خاطر ہرگز اس سے اغماض نہیں کر سکتے اور نہ ہم کو کرنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس ہم کو یہ تلاش کرنا چاہیے کہ کس کس راہب سے آپ کی ملاقات ثابت ہوئی ہے اور اس نے ظلم یا انصاف کی راہ سے آپ کے متعلق کیا کیا رائے ظاہر کی ہے، کیونکہ توراۃ و انجیل کے وہی حامل تھے اور اگر آپ کے بارے میں ان ہی کی جانب سے ہم کو کوئی مفید شہادت ملتی ہے تو یہ بڑی مضبوط شہادت ہوگی۔ اور اگر وہ آپ کے خلاف شہادت دیتے ہیں تو اس سے مرعوب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ ان کے خلاف ہمارے پاس خود اس کتاب کی شہادت موجود ہے جس پر وہ ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ذیل کی آیتوں میں اسی لیے مشرکین کے سامنے اہل کتاب کی شہادت رکھی ہے

اَوَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (الشعراء) — کیا ان کے لیے یہ بات نشانی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء اس کی خبر رکھتے ہیں۔

قُلْ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَ — کہہ دو اللہ تمہارے اور میرے درمیان گواہ کافی ہے اور جس کو

وفیہ وتابعوہ بدل بایعوہ ومعناہ کما فی السیرۃ الحلبیۃ ای علی عدم التعرض منہ کما یدل علیہ لفظ تابعوہ ثم قال الحافظ ابن تیمیۃؒ فی المجلد الرابع منہ عند ذکر ما ینقلہ کثیر من اہل الجہل من معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم مثل قول کثیر من العامۃ ان الغمامۃ کانت تظلہ دائما فہذا لا یوجد فی شیء من کتب المسلمین المعروفۃ عند علمائہم ولا نقلہ عالم من علمائہم بل ہو کذب عندہم وان کان کثیر من الناس ینقلہ . وانما نقل ان الغمامۃ اظلتہ لما کان صغیرا فقدم مع عمہ الی الشام تاجرا وراٰہ بحیرا الراہب ومع ہذا فہذا لا یجزم بصحتہ (الجواب الصحیح صفحہ ۲۳۰ و ۲۳۱ - ج ۴) واخرجہ الحافظ ابن کثیر فی البدایۃ والنہایۃ وقال ہکذا رواہ الترمذی و الحاکم والبیہقی وابن عساکر وغیر واحد من الحفاظ ومع ہذا فی حدیثہ غرابۃ ثم عدہا فقال

وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ (الرعد)
کتاب کی خبر ہے۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ (السبا)
اور دیکھ لیں جن کو ملی ہے سمجھ کہ جو تجھ پر اترا تیرے رب سے وہی ٹھیک ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْا اٰمَنَّا بِهٖ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَا اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ (القصص)
جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی ہے وہ اس پر یقین کرتے ہیں اور جب وہ ان کو سنائی جائے تو کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے یہی ٹھیک ہے ہم تو اس سے پہلے کے حکمبردار ہیں

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (انعام)
اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ یقیناً تیرے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرہ)
جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان کو پہچانتے ہیں جیسا پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ . (المائدہ)
اور جب اس کو سنتے ہیں جو نازل ہوا ہے رسول پر ان کی آنکھیں دیکھو تو ابلتی ہیں آنسوؤں سے اس لیے کہ انہوں نے پہچان لیا ہے حق بات کو وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے تو تو ہم کو ماننے والوں کے ساتھ لکھ اور ہم کو کیا ہوا کہ ہم اس پر یقین نہ لائیں اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم کو حق سے پہنچی اور توقع رکھیں اس کی کہ ہمارا رب ہم کو نیک بختوں کے ساتھ داخل فرمائے

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (بنی اسرائیل)
جن لوگوں کو اس سے پہلے علم ملا ہے جب ان کے سامنے اس کو پڑھا جائے تو جھک جاتے ہیں ٹھوڑیوں سے سجدہ میں۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (اعراف)
وہ لوگ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو نبی امی ہیں جن کو وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ (یونس)
تو اگر تم کو اس کتاب میں کچھ شک ہو جو ہم نے اتاری ہے تو تم ان لوگوں سے پوچھ دیکھو جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں (یعنی اہل کتاب)

انہ من مرسلات الصحابۃ فان ابا موسیٰ الاشعری انما قدم فی سنۃ خیبر سنۃ سبع من الهجرۃ ... ولعلہ تلقاہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیکون ابلغ او من بعض کبار الصحابۃ او کان ھٰذا مشھورًا مذکورًا اخذہ من طریق الاستفاضۃ. الثانی ان الغمامۃ لم تذکر فی حدیث اصح من ھٰذا والثالث قولہ و بعث معہ ابو بکر بلالاً. ثم ذکر سیاق الواقدی وابن سعد وقال عند ذکرہ قصۃ بحیرا الراھب وقد اورد لہ الحافظ ابن عساکر شواھد وسائغات فی ترجمۃ بحیرا و لم یورد ما رواہ الترمذی وھٰذا عجب. قال الحافظ ابن حجر فی الاصابۃ الحدیث رجالہ ثقات و لیس فیہ منکر سوی ھٰذا اللفظ "و بعث معہ ابو بکر بلالاً" فیحمل علی انھا مدرجۃ فیہ مقتطعۃ من

اس روایت کا ایک رُخ تو یہ تھا۔ لئے اب ہم آپ کو اس روایت کا دوسرا رُخ بھی دکھائیں اور وہ اُس کا افادی رُخ ہے۔ اس روایت میں دوسرے اہلِ دین کی زبان سے آپ کی نبوت کی شہادت ہے جبکہ ابھی آپ کی عمر دس بارہ سال ہی کی ہے اور وہ بھی محض ظن و تخمین سے نہیں بلکہ اُن علامات کی بنا پر ہے جو اہلِ کتاب کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی دوسرے شخص میں پائی نہیں جاتیں۔ اسی کے ساتھ اس میں وہ خاص علامت بھی ہے جو کتبِ سابقہ میں خاص سید العالمین اور رحمۃ للعالمین کے لیے بیان کی گئی تھی یعنی مہرِ نبوت۔ اس کے بعد اس واقعہ میں چند ایسی وقتی علامات اور خصوصی خارجی قرائن کا بھی تذکرہ ہے جو آسمانی شخصیات بارزہ کے ساتھ ہمیشہ نظر آیا کرتی ہیں یعنی درختوں اور پتھروں کا سجدہ کرنا۔ ظاہر ہے کہ جس نبی کے معجزات میں حیوانات کا سجدہ، پتھروں کا سلام کرنا، اس کے دستِ مبارک میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنا اور جس کے حکم سے کھجور کے درخت کے خوشہ کا آجانا اور جس کے حکم سے دو درختوں کا آکر باہم مل جانا اور پھر اس کے حکم سے جدا جدا اپنی جگہ جا کر کھڑے ہو جانا مستند طریقوں سے ثابت ہو وہاں اتنی بات پر کیا تعجب کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ درخت کی شاخوں کا جھک جانا یا بادل کا امرِ ایزدی کے ماتحت صرف ایک واقعہ میں آپ کے ساتھ حرکت کرنا ان امور میں سے نہیں جو انبیاء علیہم السلام کے معاملوں میں موجبِ حیرت ہوں آخر اسی نبی اولو العزم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صدقہ میں ابو طالب نے بارش مانگی تو کیا بادل نہ آگئے اور نہ برسے پھر کیا اسی رسول کی دعا پر بارہا بادلوں نے اپنی بارش کے دہانے نہیں کھول دیے اور کیا پھر اسی رسول کی انگلی کے اشارہ پر بادلوں نے مدینہ طیبہ کی بستی کو چھوڑ کر ٹیلوں اور پہاڑوں کا رُخ نہیں کر لیا۔ جی ہاں جس کے اشارہ پر چاند دو ٹکڑے ہو سکتا ہے اس کے اشارہ پر بادلوں کی اتنی حرکت کیا بعید ہونی چاہیے۔ پھر جبکہ میدانِ تیہ میں بنی اسرائیل پر بادلوں کا سایہ فگن رہنا قرآن کریم میں موجود ہو اس کے بعد بادل کے ایک ٹکڑے کا آپ پر سایہ کر لینا کونسی بیرون از قیاس بات ہونی چاہیے۔ مگر جو نفوس یہاں متردد ہیں وہ کچھ اسی ایک واقعہ میں نہیں معجزات اور خوارق کا سارا باب ہی ان کی مادی عقول کے لیے ایک پہاڑ بنا ہوا ہے ومن لم یجعل اللہ لہ نورًا فما لہ من نور

اب رہا اس حدیث کا اسنادی پہلو تو اس پر بھی ہم عربی کے حاشیہ میں مختصر سا کلام کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک امام ترمذی، بیہقی اور آخر میں حافظ ابن حجرؒ جیسے متفق علیہ محدثین نے جب اس حدیث کو مستند مان لیا ہے اور حافظ ابن تیمیہؒ جیسے شخص نے نصاریٰ کے مقابلہ پر اس کو بطور حجت پیش کیا ہے تو اب اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نکالنا بہت نا موزوں ہے۔ صرف کتبِ رجال سے اُٹھا اُٹھا کر خاص ضعفین کے اقوال نقل کرنا اور موثقین کا ذکر تک نہ کرنا انصاف نہیں ہے کون نہیں جانتا کہ اوہام سے صحیحین کی حدیثیں بھی خالی نہیں رہیں۔ ان کے رجال پر بھی کہیں کہیں کلام کیا گیا ہے بعض

حدیث اٰخر وھما من احد رواتہ کذا فی الخصائص (ص۸۴ ج ۱) وذکرہ ابن الاثیر فی تجرید الصحابۃ وقال رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل البعث وآمن بہ ذکرہ ابن مندہ وابونعیم فی الصحابۃ وھکذا فی تاریخ الخمیس ایضا ص۲۵۸ ج ۱۔ وحقق ابن حجر فی الاصابۃ تحت تذکرۃ ورقۃ ما حاصلہ انہ ینبغی ان یکون حال ورقۃ و بحیراء سواء واما الذھبی فقد ضعف الحدیث لکن قال الحافظ الحلبی فی سیرتہ ولاجل ھذا الوھم (ای لما فیہ من ذکر ابی بکرؓ وبلالؓ) قال الذھبی فی الحدیث اظنہ موضوعًا ثم نقل عن الحافظ الدمیاطی وھمین واجاب عن کل منھما وھناک قصۃ اخری فی سفرہ الی الشام ثانیًا مع میسرۃ وفیھا ملاقاتہ مع نسطورا الراھب بمثل بحیراء وقد بسطھا صاحب السیرۃ الحلبیۃ بما لھا وما علیھا۔ واعلم ان بحیراء مکبرًا لا مصغر کما ضبطہ صاحب القاموس وغیرہ

۹۷۸۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ سَلْمَانُ الْفَارِسِیُّ فِیْ قِصَّۃِ اِسْلَامِہٖ مِنْ فِیْہِ قَالَ

۹۷۸۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں میں نے یہ واقعہ خود سلمان فارسی کی زبان سے سُنا ہے وہ بیان کرتے تھے کہ میں اصفہان کے ایک گاؤں میں ایک پارسی مذہب کا آدمی تھا اور میرے والد اپنے گاؤں کے سردار تھے میں ان کو بہت پیارا تھا، اس لیے اُنہوں نے لڑکیوں کی طرح گھر کے اندر رکھ کر میری پرورش کی تھی میں مجوسیت کی عبادت میں ہر وقت لگا رہا کرتا، یہاں تک کہ آگ کے اس نگراں کی طرح بن گیا تھا جو ہر وقت اس کو روشن رکھتا ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی گُل ہونے نہیں دیتا۔ میرے والد کی بڑی زمین تھی ایسا ہوا کہ وہ ایک دن کسی تعمیری کام میں لگ گئے اور مجھ سے فرمایا فرزند عزیز میں آج اس کام میں لگ گیا ہوں اس لیے آج زمین پر نہیں جاسکتا تم ذرا جاکر اس کو دیکھ لو اور جو کام کرنے کا وہاں اُن کا نیا تھا وہ مجھ کو بتادیا اور تاکید سے کہہ دیا کہ میرے پاس آنے میں دیر نہ لگانا، اگر تم نے دیر کی تو یاد رکھنا مجھ کو زمین سے زیادہ تمہاری فکر ہو جائیگی اور میں یہاں کسی کام کا بھی نہ رہونگا۔ یہ کہتے ہیں گھر سے نکلتے وقت تو میرا ارادہ اسی زمین پر جانے کا تھا جس کے لیے اُنہوں نے مجھ کو بھیجا تھا لیکن درمیان میں نصاریٰ کے گرجوں میں سے ایک گرجے سے میرا گزر ہوا میں نے وہاں ان کی کچھ آوازیں سنیں وہ نمازیں ادا کر رہے تھے۔ چونکہ والد نے مجھے

رواۃ کا حال تو یہ ہے کہ کسی خاص واقعہ کی بنا پر امام مالکؒ جیسے شخص نے اس کو دجّال تک کا لفظ کہہ دیا ہے مگر جو لوگ اس فن کا کچھ بھی مطالعہ رکھتے ہیں اُن کے نزدیک اس کا بھی ایک معیار ہے۔ ہم یہاں مناظرہ کا اکھاڑہ قائم کرنا نہیں چاہتے اس لیے ان تفصیلات کے درپے ہونا نہیں چاہتے اور مذکورۂ بالا اکابر محدثین کی رائے کی متابعت میں اس حدیث کو یہاں درج کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔

۹۷۸۔ سلمانؓ فارسی کی شخصیت ایک عظیم تاریخی شخصیت ہے مذہبِ حق کی تلاش کی جو تڑپ اللہ تعالیٰ نے ان کے

لَحِقْتُ بِصَاحِبِ عَمُّورِيَّةَ فَأَخْبَرْتُهُ خَبَرِيْ فَقَالَ أَقِمْ عِنْدِيْ فَأَقَمْتُ عِنْدَ خَيْرِ رَجُلٍ عَلٰى هُدَى أَصْحَابِهِ

گھر میں بند کر رکھا تھا۔ اس لیے مجھے اس کا پتہ ہی نہ تھا کہ لوگ کس جہان میں بستے ہیں ان کی آوازیں سن کر میں اندر چلا گیا اور جاکر یہ دیکھنے لگا کہ وہ کرتے کیا ہیں جب میں نے ان کو دیکھا تو مجھے ان کی نماز پسند آئی اور میں نے اُن میں شامل ہونے کی کوشش کی اور دل میں کہا خدا کی قسم جس دین پر ہم ہیں اس وقت ہوں اس سے یہ دین بہتر معلوم ہوتا ہے یہ سوچ کر میں ان ہی کے ساتھ رہا یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوگیا اور اپنے والد کی زمین تک نہ جا سکا پھر میں نے کہا آپ لوگ اس دین کی اصل جگہ بتلائیے۔ اُنہوں نے کہا ملک شام۔ میں اپنے والد کے پاس واپس آگیا۔ ادھر اُنہوں نے میری تلاش کے لیے آدمی بھیج رکھے تھے اور سب اپنے کاروبار سے معطل پڑے تھے۔ جب میں حاضر ہوا تو اُنہوں نے فرمایا عزیز فرزند تم کہاں تھے تم کو جو بات ضروری تھی کیا وہ بتا نہ دی تھی کہ دیر نہ لگانا میں نے عرض کیا پدر بزرگوار بات یہ ہوئی کہ چند لوگوں کے پاس سے میرا گزر ہوا جو اپنے گرجوں میں نمازیں پڑھ رہے تھے مجھے ان کا دین پسند آیا اور اس لیے خدا کی قسم شام تک میں وہاں ہی رہا۔ والد نے فرمایا فرزند عزیز اس دین میں تو کوئی بھی خوبی نہیں تیرا اور تیرے بزرگوں کا دین اس سے کہیں بہتر ہے میں نے عرض کیا خدا کی قسم ہرگز نہیں وہ دین ہمارے دین سے بہت بہتر ہے۔ یہ کہتے ہیں والد نے مجھے بہت ڈرایا دھمکایا اور میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں اور گھر میں بند کر لیا۔ یہ کہتے ہیں میں نے نصاریٰ کے پاس کہلا بھیجا کہ جب کبھی شام کا کوئی قافلہ تمہارے پاس آئے تو مجھے بھی خبر کرنا یہ کہتے ہیں جب شام جانے والا ایک قافلہ اُن کے پاس آیا تو وہ میرے پاس آئے اور مجھے اس کی خبر کی۔ میں نے کہا جب وہ اپنی ضروریات سے فارغ ہولیں اور پھر شام واپسی کا ارادہ کریں تو اس وقت مجھے خبر کرنا چنانچہ جب وہ اپنے کام پورے کر چکے تو انہوں نے مجھے اس کی اطلاع دی یہ کہتے ہیں میں نے زنجیریں اپنے پیروں سے نکال پھینکیں اور ان کے ساتھ روانہ ہولیا یہاں تک کہ شام جا پہنچا۔ وہاں جاکر میں نے پوچھا اس دین کا یہاں سب سے بڑا عالم کون ہے اُنہوں نے کہا کہ اس گرجے کا پادری۔ یہ کہتے ہیں کہ میں اس کے پاس گیا اور میں نے کہا مجھے یہ دین پسند ہے اور میری تمنا ہے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں اور اس گرجے میں آپ کی خدمت کیا کروں اور آپ سے نماز سیکھوں اور پھر آپ کے ساتھ نماز پڑھوں اس نے کہا اچھا آجاؤ میں اس کے ساتھ گرجے میں داخل ہوگیا یہ شخص بدنیت آدمی تھا لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دیتا اور جب لوگ صدقہ لاتے تو اس کو اپنی ذات کے لیے جمع کرتا اور مسکینوں کو تقسیم نہ کرتا یہاں تک کہ اس تدبیر سے اس نے سات مٹکے چاندی اور سونے کے جمع کر لیے۔ یہ کہتے ہیں مجھے اُس سے سخت بغض ہوگیا، ان حرکات کی وجہ سے جو میں نے اس کو کرتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے دفن کے لیے نصاریٰ جمع ہوئے تو میں نے اُن سے کہا یہ بڑا خراب انسان تھا، تم کو صدقہ کی ترغیب دیا کرتا تھا اور جب تم اس کے پاس صدقے لاتے تو اس کو اپنی ذات

سینہ میں ودیعت فرمائی تھی، اس کا اندازہ آپ کو ان چند سطور سے ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہاں جس چیز پر تنبیہ کرنی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کے قدم

دَامُوهِمْ. قَالَ وَاكْتَسَبْتُ حَتّٰى كَانَتْ لِي بَقَرَاتٌ وَغُنَيْمَةٌ قَالَ ثُمَّ نَزَلَ بِهِ اَمْرُ اللّٰهِ فَلَمَّا حَضَرَ قُلْتُ لَهٗ يَا

کے لیے جمع کرلیتا تھا اور مسکینوں کو کچھ نہ دیتا تھا۔ انہوں نے کہا تم کو یہ کیسے معلوم ہوا۔ میں نے کہا میں تم کو اس کے خزانہ کا پتہ بتاتا ہوں۔ انہوں نے کہا اچھا بتاؤ۔ چنانچہ وہ جگہ میں نے ان کو دکھائی۔ انہوں نے سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے سات مٹکے وہاں سے برآمد کیے۔ جب اُنہوں نے یہ ماجرا دیکھا تو کہا ہم ایسے شخص کو ہرگز دفن نہیں کرینگے۔ اس کو سولی پر لٹکایا اور پتھروں سے سنگسار کیا، اور دوسرا آدمی بلا کر اس کی جگہ بٹھلا دیا سلمان رضؓ کہتے ہیں میں نے اس آدمی سے بڑھ کر کوئی شخص جو پنجوقتہ نماز کا پابند، دنیا سے بے رغبت اور آخرت کا طالب اور روز و شب عبادت میں مشغول ہو نہیں دیکھا، لہذا مجھے اس سے اتنی محبت ہوگئی کہ اس سے پہلے دنیا کی کسی چیز سے نہ تھی میں اس کے پاس ایک مدت تک مقیم رہا پھر جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو میں نے اُن سے عرض کیا میں اتنی مدت آپ کی خدمت میں رہا اور آپ سے اتنی محبت رکھتا ہوں کہ اس سے قبل دنیا کی کسی چیز سے مجھ کو اتنی محبت نہیں ہوئی۔ اب آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے پاس پیغام اجل آپہنچا ہے تو آپ مجھے کس کے سپرد کر کے جاتے ہیں اور میرے لیے آئندہ اب کیا حکم ہے۔ انہوں نے فرمایا، فرزند عزیز! خدا کی قسم میرے علم میں اب کوئی شخص نہیں ہے جو صحیح طور پر اُس دین پر قائم رہا ہو جس پر کہ میں تھا، لوگ تباہ و برباد ہو چکے ہیں اور جس دین پر پہلے تھے اس کو اکثر بدل سدل کر چکے ہیں ہاں موصل میں ایک شخص ہے جس کا نام فلاں ہے، وہ شخص اسی دین پہ ہے جس پہ میں ہوں اس کے پاس چلے جانا۔ یہ کہتے ہیں جب ان کی وفات ہوگئی اور دفن ہو چکے تو میں اُن موصل والے پادری کے پاس چلا گیا۔ میں نے ان سے کہا اے فلاں مجھ کو فلاں پادری نے مرتے وقت یہ وصیت کی تھی کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور یہ بتایا تھا کہ آپ ان ہی کے دین پر پورے قائم ہیں۔ انہوں نے فرمایا اچھا تو میرے پاس قیام کرو میں نے ان کے پاس قیام کیا، اور میں نے ان کو بھی بہت نیک شخص پایا جس دین پر ان کے پہلے رفیق تھے یہ بھی اسی پر تھے۔ ابھی کچھ مدت نہ ہوئی تھی ان کی بھی وفات کا وقت آگیا تو میں نے ان سے عرض کیا۔ اے فلاں مجھ کو فلاں پادری نے آپ کے لیے وصیت کی تھی اور یہ حکم دیا تھا کہ آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں اب جیسا آپ دیکھ رہے ہیں آپ کے پاس بھی حکم ربی آچکا ہے تو آپ مجھے کس کی وصیت فرماتے ہیں اور میرے لیے کیا حکم دیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا بخدا میں اس دین پر جس پر کہ خود قائم ہوں آج ایک شخص کے سوا کسی اور کو نہیں جانتا وہ شخص نصیبین میں ہیں ان کا نام فلاں ہے تم اُن کے پاس چلے جانا۔ جب ان کا انتقال ہوگیا اور دفن ہو چکے تو میں اُن نصیبین والے شخص کے پاس چلا گیا اور اپنا قصہ عرض کیا اور دو میرے بزرگ جو پہلے حکم دے چکے تھے وہ سب بیان کیا۔ انہوں نے کہا اچھا میرے پاس ٹھہرو

سے آپ یہ اندازہ فرمائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا معاملہ اہل کتاب علماء کے درمیان کس درجہ شہرت اور

فُلَانٍ إِنِّي كُنْتُ مَعَ فُلَانٍ فَأَوْصَى بِي إِلَى فُلَانٍ ثُمَّ أَوْصَى بِي فُلَانٌ إِلَى فُلَانٍ ثُمَّ أَوْصَى بِي فُلَانٌ إِلَى فُلَانٍ ثُمَّ أَوْصَى بِي فُلَانٌ إِلَيْكَ فَإِلَى مَنْ تُوصِي بِي وَبِمَ تَأْمُرُنِي قَالَ أَيْ بُنَيَّ وَاللهِ مَا أَعْلَمُ أَصْبَحَ أَحَدٌ عَلَى مِثْلِ مَا كُنَّا عَلَيْهِ مِنَ النَّاسِ آمُرُكَ أَنْ تَأْتِيَهُ وَلٰكِنَّهُ قَدْ أَظَلَّ زَمَانُ نَبِيٍّ مَبْعُوثٌ بِدِينِ إِبْرَاهِيمَ يَخْرُجُ بِأَرْضِ الْعَرَبِ مُهَاجَرُهُ إِلَى الْأَرْضِ بَيْنَ حَرَّتَيْنِ بَيْنَهُمَا نَخْلٌ بِهِ عَلَامَاتٌ لَا تَخْفَى يَأْكُلُ الْهَدِيَّةَ وَلَا يَأْكُلُ الصَّدَقَةَ بَيْنَ كَتِفَيْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَلْحَقَ بِتِلْكَ الْبِلَادِ فَافْعَلْ. قَالَ ثُمَّ مَاتَ وَغُيِّبَ وَمَكَثْتُ بِعَمُّورِيَّةَ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ أَمْكُثَ

میں نے ان کو بھی پہلے دو بزرگوں جیسا پایا اور میں اس مرد صالح کی خدمت میں رہا۔ خدا کی قسم ابھی ان کو بھی کچھ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ ان کی بھی وفات کا وقت آ گیا۔ اسی طرح میں متعدد بزرگوں کی خدمت میں گزرتا ہوا عموریہ والے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے ان سے بھی اپنا سارا واقعہ عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا اچھا میرے پاس ٹھہرو۔ اب میں ایک ایسے بزرگ کی خدمت میں قیام پذیر تھا جو نہایت نیک اور اپنے پیشرو بزرگوں ہی کے قدم بقدم تھے۔ اس اثناء میں میں نے تھوڑا مال بھی کما لیا تھا اور میرے پاس کچھ گائے اور تھوڑی سی بکریاں ہو گئی تھیں آخر کار اُن کے پاس بھی فرمان الٰہی آ پہنچا۔ جب ان کی نزعِ روح کا وقت ہوا تو میں نے عرض کی کہ فلاں فلاں بزرگوں نے مجھ کو ایک دوسرے کی وصیت فرمائی تھی تا آنکہ میں آپ تک آ پہنچا اب آپ مجھے کس کی وصیت فرماتے ہیں اور کس بات کا حکم دیتے ہیں انہوں نے فرمایا بخدا میرے علم میں اب کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس دین پر قائم رہا ہو جس پر کہ ہم لوگ تھے تاکہ میں تم کو ان کی خدمت میں حاضری کے لیے کہہ سکوں لیکن ایک نبی کے مبعوث ہونے کا وقت بالکل سر پر آ چکا ہے جو دین ابراہیمی لے کر آئینگے، سرزمین عرب میں ان کا ظہور ہوگا، اور وہ ایسی سرزمین کی طرف ہجرت فرمائینگے جس کے دو طرف سنگستان ہوگا اس میں کھجوروں کے باغات ہونگے اس نبی میں ایسی کھلی علامتیں بھی موجود ہونگی جو کسی پر پوشیدہ نہ ہونگی، وہ ہدیہ کھا لینگے اور صدقہ نہیں کھائینگے اُن کے دونوں شانوں کے درمیان "مہرِ نبوت" ہوگی اگر تم ان مقامات تک پہنچ سکتے ہو تو پہنچ جانا اس کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا اور دفن کر دیے گئے۔ ان کے بعد جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا میں مقام عموریہ میں قیام پذیر رہا۔

وضاحت کے ساتھ مشہور و معروف تھا اور یہ کہ آپ کی چند علامات معلوم کر لینے کے بعد آپ کے شناخت کر لینے میں کیا سلمانؓ کو کوئی ادنیٰ سی دشواری بھی پیش آئی۔ اگر ان علامتوں پر محض عقلی لحاظ سے بحث کی جاتی اور نبوت و رسالت کے مفہوم محض عقلی اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی تو جس آسانی سے سلمانؓ کو ساحل مقصود دکھائی دیا کیا یہ ممکن تھا حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا کی ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں اس لیے قدرت نے ان کی شناخت بھی آسان سے آسان تر رکھی ہے اور ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت کے دلائل تو اور بھی زیادہ روشن رکھے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ کتب سابقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بشارات تمام مقامات سے بھی زیادہ

ثُمَّ مَرَّ بِي نَفَرٌ كَلْبٍ تُجَّارًا فَقُلْتُ لَهُمْ احْمِلُونِي إِلَى أَرْضِ الْعَرَبِ وَأُعْطِيكُمْ بَقَرَاتِي هَذِهِ وَغُنَيْمَتِي هَذِهِ قَالُوا نَعَمْ فَأَعْطَيْتُهُمُوهَا وَحَمَلُونِي مَعَهُمْ حَتَّى إِذَا بَلَغُوا وَادِي الْقُرَى ظَلَمُونِي فَبَاعُونِي مِنْ رَجُلٍ يَهُودِيٍّ عَبْدًا فَكُنْتُ عِنْدَهُ وَرَأَيْتُ النَّخْلَ فَرَجَوْتُ أَنْ يَكُونَ الْبَلَدَ الَّذِي وَصَفَ لِي صَاحِبِي وَلَمْ يَحِقْ فِي نَفْسِي فَبَيْنَا أَنَا عِنْدَهُ إِذْ قَدِمَ ابْنُ عَمٍّ لَهُ مِنْ بَنِي قُرَيْظَةَ مِنَ الْمَدِينَةِ فَابْتَاعَنِي مِنْهُ فَاحْتَمَلَنِي إِلَى الْمَدِينَةِ فَوَاللهِ مَا هُوَ إِنْ رَأَيْتُهَا فَعَرَفْتُهَا بِصِفَةِ صَاحِبِي لَهَا فَأَقَمْتُ بِهَا وَبُعِثَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَقَامَ بِمَكَّةَ مَا أَقَامَ وَلَا أَسْمَعُ لَهُ بِذِكْرٍ مِمَّا أَنَا فِيهِ مِنْ شُغْلِ الرِّقِّ ثُمَّ هَاجَرَ إِلَى الْمَدِينَةِ فَوَاللهِ إِنِّي لَفِي رَأْسِ عِذْقٍ لِسَيِّدِي أَعْمَلُ فِيهِ بَعْضَ الْعَمَلِ وَسَيِّدِي جَالِسٌ تَحْتِي إِذْ أَقْبَلَ ابْنُ عَمٍّ لَهُ حَتَّى وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ يَا فُلَانُ قَاتَلَ اللهُ بَنِي قَيْلَةَ وَاللهِ إِنَّهُمْ لَمُجْتَمِعُونَ الْآنَ بِقُبَاءٍ عَلَى رَجُلٍ قَدِمَ مِنْ مَكَّةَ الْيَوْمَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُ نَبِيٌّ قَالَ سَلْمَانُ فَلَمَّا سَمِعْتُهَا أَخَذَتْنِي الرِّعْدَةُ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنِّي سَاقِطٌ عَلَى سَيِّدِي فَنَزَلْتُ

پھر قبیلہ کلب کے کچھ تاجروں کا میری طرف سے گزر ہوا میں نے اُن سے کہا مجھے بھی سرزمین عرب میں لے چلو اور میں اپنی یہ گائیں اور بکریاں (اس کے عوض میں) سب تم کو دیتا ہوں انہوں نے کہا اچھا۔ چنانچہ میں نے وہ سب ان کو دیدیں۔ انہوں نے مجھ کو اپنے ساتھ لے لیا لیکن جب مقام "وادی القریٰ" میں پہنچے تو انہوں نے مجھ پر بڑا ظلم کیا اور ایک یہودی کے ہاتھ مجھ کو غلام بنا کر فروخت کر ڈالا میں اس کے پاس رہا کیا اور جب میں نے یہاں کھجور کے درخت دیکھے تب مجھے کچھ اُمید ہوئی کہ شاید یہ وہی مقام ہوگا جس کے متعلق عموریہ والے بزرگ نے مجھ کو ہدایت کی تھی لیکن میرے دل میں اس کا پورا پورا یقین نہ ہوا ابھی میں اس کے گھر ہی میں تھا کہ اس کا ایک چچازاد بھائی مدینہ (شریف) سے آیا جو بنو قریظہ کے خاندان سے تھا اس یہودی نے مجھ کو اپنے چچازاد بھائی کے ہاتھ فروخت کر دیا وہ مجھ کو مدینہ لے آیا۔ خدا کی قسم جوں ہی کہ میں نے مدینہ کو دیکھا تو میں نے اپنے ان بزرگوں کے بیان کردہ علامات سے اس کو فوراً پہچان لیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو چکی تھی لیکن اس وقت آپ کا قیام مکہ ہی میں تھا اور چونکہ غلامی کے فرائض ادا کرنے میں پڑا رہا کرتا اس لیے مجھ کو آپ کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی کچھ عرصہ بعد ایسا اتفاق ہوا کہ آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ بخدا میں اس وقت ایک کھجور کے درخت کے اوپر اپنے آقا کے کسی کام میں مشغول تھا اور میرا آقا نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اس کا چچازاد بھائی اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور بولا اے فلاں خدا تعالیٰ بنو قیلہ کو موت دے یہ سب کے سب ایک شخص کے ساتھ جمع ہو گئے

مذکور ہیں (الجواب الصحیح ص۲۳۲) اسی لیے یہود مدینہ کی حالت تو یہ تھی کہ آپ کے ظہور سے قبل وہ اوس و خزرج کے مقابلہ میں ہمیشہ آپ کے وسیلہ سے دعاء فتح و نصرت مانگا کرتے تھے لیکن جب آپ کا ظہور ہوا تو پھر سب سے بڑھ کر آپ کے دشمن یہی تھے چنانچہ معاذ بن جبل، بشر بن براء اور داؤد بن سلمہ نے یہود کو یہی طعنہ دیا کہ ہم مشرک تھے اور تم اہل کتاب ہمارے مقابلہ میں جب جنگ ہوتی تو تم لوگ آپ کے وسیلہ سے

عَنِ النَّخْلَةِ فَجَعَلْتُ أَقُولُ لِابْنِ عَمِّهِ مَاذَا تَقُولُ مَاذَا تَقُولُ قَالَ فَغَضِبَ سَيِّدِي فَلَكَمَنِي لَكْمَةً شَدِيدَةً ثُمَّ قَالَ مَا لَكَ وَلِهَذَا أَقْبِلْ عَلَى عَمَلِكَ قَالَ فَقُلْتُ لَا شَيْءَ إِنَّمَا أَرَدْتُ أَنْ أَسْتَثْبِتَهُ عَمَّا قَالَ - قَالَ وَقَدْ كَانَ عِنْدِي شَيْءٌ قَدْ جَمَعْتُهُ فَلَمَّا أَمْسَيْتُ أَخَذْتُهُ ثُمَّ ذَهَبْتُ بِهِ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ بِقُبَاءٍ فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ فَقُلْتُ لَهُ إِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِي أَنَّكَ رَجُلٌ صَالِحٌ وَمَعَكَ أَصْحَابٌ لَكَ غُرَبَاءُ ذُو حَاجَةٍ وَهَذَا شَيْءٌ كَانَ عِنْدِي لِلصَّدَقَةِ فَرَأَيْتُكُمْ أَحَقَّ بِهِ مِنْ غَيْرِكُمْ قَالَ فَقَرَّبْتُهُ إِلَيْهِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِأَصْحَابِهِ كُلُوا وَأَمْسَكَ يَدَهُ فَلَمْ يَأْكُلْ قُلْتُ فِي نَفْسِي هَذِهِ وَاحِدَةٌ ثُمَّ انْصَرَفْتُ عَنْهُ فَجَمَعْتُ شَيْئًا وَتَحَوَّلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى الْمَدِينَةِ ثُمَّ جِئْتُهُ فَقُلْتُ إِنِّي رَأَيْتُكَ لَا تَأْكُلُ الصَّدَقَةَ وَهَذِهِ هَدِيَّةٌ أَكْرَمْتُكَ بِهَا - قَالَ فَأَكَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْهَا وَأَمَرَ أَصْحَابَهُ فَأَكَلُوا مَعَهُ قَالَ فَقُلْتُ فِي نَفْسِي هَاتَانِ ثِنْتَانِ قَالَ ثُمَّ جِئْتُ رَسُولَ اللهِ

ہیں جو آج ہی مکہ سے آیا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نبی ہے سلمانؓ کہتے ہیں بس یہ سُننا تھا کہ میرے جسم پر رعشہ پڑ گیا اور مجھے یقین ہوا کہ میں اپنے آقا پر جا گرونگا اس لیے درخت کے اوپر سے اُتر آیا اور اُس کے چچا زاد بھائی سے پوچھنے لگا۔ میں کیا کہتے ہو، کیا کہتے ہو۔ اس پر میرا آقا بھڑک اُٹھا اور مجھے ایک سخت لات ماری اور بولا تجھ کو اس کی کیا پڑی تو اپنے کام میں لگ۔ میں نے کہا کچھ نہیں میں تو صرف وہ بات سمجھنی چاہتا تھا جو انہوں نے کہی تھی میں نے کچھ تھوڑا سا مال جمع کر لیا تھا جب شام کا وقت ہوا تو میں اس کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا پہنچا۔ ابھی آپ قبا ہی میں رونق افروز تھے، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپؐ سے عرض کی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نیک شخص ہیں اور آپ کے ساتھ کچھ بے وطن غریب لوگ بھی ہیں۔ میرے پاس یہ کچھ صدقہ کا مال تھا میں نے دوسروں کی بجائے آپ لوگوں کو اس کا زیادہ حقدار سمجھا ہے۔ چنانچہ میں نے وہ مال آپؐ کے سامنے پیش کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء سے مخاطب ہو کر فرمایا اس کو تم لوگ کھا لو اور آپؐ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور خود تناول نہ فرمایا۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ ایک علامت تو پوری ہو گئی۔ پھر میں واپس آیا اور میں نے کچھ مال جمع کیا، اب آپ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور میں نے حاضر ہو کر عرض کی۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ صدقہ کا مال نہیں کھاتے ہیں لہذا یہ ہدیہ ہے آپ کی خدمت میں اکراماً حاضر ہے۔ سلمان کہتے ہیں اس کو آپؐ نے بھی تناول فرما لیا اور اپنے رفقاء سے بھی فرمایا تو انہوں نے بھی آپ کے ساتھ کھایا۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ دو

دعا رفتح مانگتے اور ہمارے سامنے آپ کی علامتیں اور آپ کی صفات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا کرتے اب تم کو کیا ہو گیا ہے کہ اسلام قبول نہیں کرتے بلکہ اور اُلٹے برسرِ پیکار نظر آتے ہو۔

حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ آپ کی تشریف آوری سے قبل یہود مدینہ میں آپ کا بڑا چرچا رہا کرتا تھا اور یہی باعث تھا کہ انصار کسی پس و پیش کے بغیر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔ ایک یہود مدینہ پر کیا منحصر تھا شاہ ہرقل، مقوقس اور شاہ حبشہ جیسے

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ بِبَقِيْعِ الْغَرْقَدِ قَدْ تَبِعَ جَنَازَةَ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِهِ وَعَلَيْهِ شَمْلَتَانِ وَهُوَ جَالِسٌ فِيْ اَصْحَابِهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ ثُمَّ اسْتَدْبَرْتُهُ اَنْظُرُ اِلٰى ظَهْرِهِ هَلْ اَرَى الْخَاتَمَ الَّذِيْ وَصَفَ لِيْ صَاحِبِيْ فَلَمَّا رَاٰنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَدْبَرْتُهُ عَرَفَ اَنِّيْ اَسْتَثْبِتُ فِيْ شَيْءٍ وُصِفَ لِيْ فَاَلْقٰى رِدَاءَهُ عَنْ ظَهْرِهِ فَنَظَرْتُ اِلَى الْخَاتَمِ فَعَرَفْتُهُ فَاَكْبَبْتُ عَلَيْهِ اُقَبِّلُهُ وَاَبْكِيْ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحَوَّلْ فَتَحَوَّلْتُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَقَصَصْتُ عَلَيْهِ حَدِيْثِيْ كَمَا حَدَّثْتُكَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ فَاَعْجَبَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَسْمَعَ ذَاكَ اَصْحَابُهُ ثُمَّ شَغَلَ سَلْمَانَ الرِّقُّ حَتّٰى فَاتَهُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَدْرٌ وَاُحُدٌ قَالَ سَلْمَانُ ثُمَّ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاتِبْ يَا سَلْمَانُ فَكَاتَبْتُ صَاحِبِيْ عَلٰى ثَلَاثِمِائَةِ نَخْلَةٍ اُحْيِيْهَا لَهُ بِالْفَقِيْرِ وَاَرْبَعِيْنَ اُوْقِيَةً۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَصْحَابِهِ اَعِيْنُوْا اَخَاكُمْ

علامتیں پوری ہوئیں اس کے بعد پھر ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ اپنے کسی صحابی کے جنازہ کے ساتھ بقیع غرقد میں آئے ہوئے تھے اور اس وقت آپ دو چادریں اوڑھے ہوئے اپنے رفقا میں رونق افروز تھے۔ میں نے آپ کو سلام کیا پھر میں آپ کے پیچھے کی جانب گھوما تاکہ پشت والی علامت بھی دیکھوں کہ مہر نبوت جو علامت میرے بزرگ نے مجھ سے بیان کی تھی وہ بھی ہے یا نہیں۔ جب آپ نے دیکھا کہ میں آپ کی پشت کی جانب گھوما ہوں تو آپ پہچان گئے کہ کوئی علامت مجھے بتائی گئی ہے میں اُس کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنی پشت کے اوپر سے اپنی چادر اُتار دی۔ میں نے مہر نبوت دیکھ لی اور اس کو خوب پہچان لیا اور یہ دیکھتے ہی میں اُس کے اوپر گر پڑا، بس اُس کو چومتا تھا اور روتا تھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا ادھر آؤ۔ میں سامنے حاضر ہو گیا اور میں نے اے ابن عباس جس طرح اپنا قصہ آپ کے سامنے پورا بیان کیا ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی کہہ سنایا۔ آپ کو یہ پسند ہوا کہ اس قصہ کو آپ کے اور صحابہ بھی سنیں۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ سلمان اپنی غلامی کے دھندوں میں پھنسے رہے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جنگ بدر و احد میں شریک نہ ہو سکے۔ سلمانؓ بیان کرتے ہیں مجھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلمان دیکھو تم اپنے آقا سے عقد کتابت کر لو (یعنی کچھ مقرر رقم دے کر آزاد ہو جاؤ) چنانچہ میں نے اپنے آقا سے عقد کتابت کر لیا اس معاوضہ میں کہ میں اس کو تین سو کھجور کے درخت لگا کر دونگا یہاں تک کہ وہ پھل لے آئیں اور اُن کے نصب کرنے کے لیے گڑھے کھودنے بھی میرے ہی ذمہ ہونگے اور چالیس اوقیہ سونا نقد بھی دونگا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ

بڑے بڑے بادشاہوں نے آپ کی تصدیق کی اور اہل کتاب کا بڑا طبقہ آپ کی بشارات دیکھ دیکھ کر ہی اسلام میں داخل ہوا اور جو ان میں داخل نہیں ہوا اس کو بھی آپ کے معاملہ میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی بلکہ محض عناد، عداوت اور اپنی ریاست کی خاطر داخل نہ ہوا۔ یہ بیان اہل اسلام کا نہیں بلکہ خود اُن کا ہے جنہوں نے اسلام لانے کے بعد اپنی زبانوں سے ان سب امور کا

فَاَعَانُوْنِیْ فِی النَّخْلِ الرَّجُلُ بِثَلَاثِیْنَ وَدِیَّۃً وَالرَّجُلُ بِعِشْرِیْنَ وَدِیَّۃً وَالرَّجُلُ بِخَمْسَ عَشْرَۃَ وَدِیَّۃً وَالرَّجُلُ بِعَشْرٍ یَعْنِیْ الرَّجُلُ بِقَدْرِ مَا عِنْدَہٗ حَتّٰی اِجْتَمَعَتْ لِیْ ثَلٰثُمِائَۃِ وَدِیَّۃٍ فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذْھَبْ یَا سَلْمَانُ فَفَقِّرْ لَھَا فَاِذَا فَرَغْتَ فَأْتِنِیْ اَکُوْنُ اَنَا اَضَعُھَا بِیَدِیْ قَالَ فَفَقَّرْتُ وَاَعَانَنِیْ اَصْحَابِیْ حَتّٰی اِذَا فَرَغْتُ جِئْتُہٗ فَاَخْبَرْتُہٗ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَعِیْ اِلَیْھَا فَجَعَلْنَا نُقَرِّبُ اِلَیْھَا الْوَدِیَّ وَیَضَعُہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِیَدِہٖ حَتّٰی اِذَا فَرَغْنَا فَوَالَّذِیْ نَفْسُ سَلْمَانَ بِیَدِہٖ مَا مَاتَتْ مِنْھَا وَدِیَّۃٌ وَاحِدَۃٌ فَاَدَّیْتُ النَّخْلَ وَبَقِیَ عَلَیَّ الْمَالُ فَاُتِیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمِثْلِ بَیْضَۃِ الدَّجَاجَۃِ مِنْ ذَھَبٍ مِنْ بَعْضِ الْمَعَادِنِ فَقَالَ مَا فَعَلَ الْفَارِسِیُّ الْمُکَاتَبُ قَالَ فَدُعِیْتُ لَہٗ قَالَ خُذْ ھٰذِہٖ فَاَدِّ بِھَا مَا عَلَیْکَ یَا سَلْمَانُ قَالَ قُلْتُ وَاَیْنَ تَقَعُ ھٰذِہٖ مِمَّا عَلَیَّ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ خُذْھَا فَاِنَّ اللّٰہَ یُؤَدِّیْ بِھَا عَنْکَ وَقَالَ

علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو ترغیب دی کہ تم لوگ اپنے بھائی سلمان کی امداد کرو۔ چنانچہ انھوں نے میری مدد کی کسی شخص نے تیس پودے کھجوروں کے دیے اور کسی نے بیس کسی نے پندرہ اور کسی نے دس غرض ہر شخص نے اپنی اپنی وسعت کے مطابق میری امداد کی یہاں تک کہ میرے پاس تین سو پودے جمع ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے مجھ سے فرمایا جاؤ سلمان اب جا کر اُن گڑھوں کا انتظام کرو اور جب اُس سے فارغ ہو جاؤ تو میرے پاس آنا تاکہ میں خود اپنے ہاتھ سے پودے نصب کروں۔ چنانچہ میں گیا اور گڑھے خود بھی کھودے اور میرے اصحاب نے بھی ان میں میری امداد کی یہاں تک کہ جب میں کھود کر فارغ ہو گیا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو اطلاع دی، آپ میرے ساتھ وہاں تشریف لے آئے۔ ہم آپ کے سامنے ایک ایک پودہ پیش کرتے جاتے اور آپ اس کو اپنے دست مبارک سے نصب کرتے جاتے یہاں تک کہ ہم سب کو نصب کر کے فارغ ہو گئے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں سلمان کی جان ہے کہ ان پودوں میں ایک پودا بھی ایسا نہ تھا جو مرا ہو (اس کے بعد وہ باغ اگلے ہی سال پھل لے آیا) اور میں نے اس کو اپنے مالک کے حوالہ کر دیا۔ اب میرے ذمہ صرف نقد کی قسط باقی رہ گئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کسی کان میں سے آپ کے پاس مرغی کے انڈے کے برابر کچھ سونا آیا تو آپ نے فرمایا وہ فارسی مکاتب کدھر گیا۔ اس پر میں بلایا گیا۔ آپ نے فرمایا سلمان! لو اس کو لے لو اور جو قرض تم پر ہے اس کو ادا کر دو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ میرے قرض کے مقابلہ میں اتنا سا سونا بھلا کیا کافی ہوگا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اس کو لے لو اور اللہ تعالیٰ اسی سے تمہارا سب قرض ادا

اقرار کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف صفات ہی نہیں بلکہ بعض علماء اہل کتاب اور بادشاہوں کے پاس تو ان علامات کے مطابق آپ کی تصویریں تک بھی موجود تھیں چنانچہ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت جبیرؓ سے نقل کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ

فَاَخَذْتُهَا فَوَزَنْتُ لَهُمْ مِنْهَا وَالَّذِیْ نَفْسُ سَلْمَانَ بِیَدِهٖ اَرْبَعِیْنَ اُوْقِیَّةً فَاَوْفَیْتُهُمْ حَقَّهُمْ وَعَتَقَ سَلْمَانُ فَشَهِدْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْخَنْدَقَ حُرًّا ثُمَّ لَمْ یَفُتْنِیْ مَعَهٗ مَشْهَدٌ

رواه محمد ابن اسحٰق والحاکم والبیهقی فی کتاب دلائل النبوة قال الحافظ ابن کثیر وطریق محمد ابن اسحاق اقوی اسنادًا واحسن اقتصاصًا الی ما رواه البخاری فی صحیحه عن سلمان انه تداوله بضعة عشر من رب الی رب ای معلم ومرب الی مثله والله تعالیٰ اعلم قال السهیلی تداوله ثلاثون سیدًا من سید الی سید فالله اعلم. وکذلک استقصی قصة اسلامه الحافظ ابو نعیم فی الدلائل واورد لها اسانید والفاظًا کثیرة. وقد حذفنا صدر القصة رومًا للاختصار فتنبه.

۹۷۹- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حَضَرَتْ عِصَابَةٌ مِنَ الْیَهُوْدِ یَوْمًا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَدِّثْنَا عَنْ خِلَالٍ نَسْأَلُكَ عَنْهَا لَا یَعْلَمُهَا اِلَّا نَبِیٌّ فَقَالَ سَلُوْنِیْ عَمَّا شِئْتُمْ وَلٰکِنْ

کرادیگا۔ میں نے اُس کو لے لیا اور وزن کرکے چالیس اوقیہ ادا کردیے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں سلمان کی جان ہے، میں نے اسی سونے سے اُس کا سب حق ادا کردیا اور یہ سلمان آزاد ہوگیا۔ اور میں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ خندق میں شریک ہوا، اور پھر کوئی غزوہ ایسا نہ تھا جس میں میں شریک نہ رہا ہوں۔ (دلائل النبوۃ از بیہقی، حاکم وغیرہما)

۹۷۹- ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن یہود کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بولی یا رسول اللہ! ہم کو چند باتوں کا جواب دیجیے جو ہم آپ سے ابھی پوچھنے والے ہیں، ان کو نبی کے سوا اور کوئی شخص نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا جو دل چاہے شوق سے پوچھو۔

شام کے ارادہ سے نکلا، بصریٰ پہنچ کر چند اہل کتاب علماء سے میری ملاقات ہوئی اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کیا تم حرم کے باشندہ ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ یہ سُن کر مجھ کو وہ ایک بڑے گرجا میں لے گئے جہاں متعدد تصویریں موجود تھیں انہوں نے مجھ سے کہا پہچان سکتے ہو ان میں تمہارے صاحب کون ہیں؟ میں نے ایک تصویر کو دیکھا تو وہ ٹھیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی اس کے بعد دیکھا تو آپ کے قریب ہی ایک دوسرے بزرگ نظر آئے جو آپ کے پیر کی ایڑی پکڑے بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے پوچھا ان کو بھی پہچانتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ اس نے کہا یاد رکھو یہی شخص ہیں جو ان کے بعد ان کے خلیفہ ہونگے۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ جتنے اور انبیاء علیہم السلام ہوئے ہیں سب کے بعد کوئی نہ کوئی نبی ہوتا رہا ہے صرف یہ ایک ایسے نبی ہیں جن کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس واقعہ کو ابو نعیم نے بھی دلائل النبوۃ میں ذکر کیا ہے۔

اسی طرح موسیٰ بن عقبہ ذکر کرتے ہیں کہ صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں ہشام بن العاص، نعیم بن عبد اللہ اور تیسرے ایک شخص اقدشاہ روم کے پاس بھیجے گئے تھے یہ کہتے ہیں کہ ہم جبلہ بن ایہم سے ملے اس وقت یہ مقام غوطہ میں تھے وہ ہم کو لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے ہم کو چند تصویریں دکھائیں پھر ایک تصویر کے متعلق کہا کہ یہ سب سے آخری تصویر تھی لیکن میں نے تم کو پہلی اس لیے دکھائی ہے کہ ان کے متعلق تمہارا خیال معلوم کروں۔ یہ تصویر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی اس کے بعد اس نے دیگر سب انبیاء سابقین علیہم السلام کی تصاویر بھی دکھائیں۔ مغیرہ بن شعبہ نے شاہ مقوقس کا واقعہ بھی اسی کے قریب قریب نقل کیا ہے ان تاریخی شہادتوں سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ اہل کتاب میں آنحضرت کا تعارف کس حد تک تھا اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی نہیں بلکہ جملہ انبیاء علیہم السلام کا تعارف کس درجہ تھا

بجعلوا لي ذمة الله وما اخذ يعقوب على بنيه ان انا حدثتكم شيء تعرفونه صدقتم لتتابعوني على الاسلام. قالوا لك ذلك قال فسلوني مما شئتم قالوا اخبرنا عن اربع خلال اخبرنا عن الطعام الذي حرم اسرائيل على نفسه من قبل ان تنزل التوراة واخبرنا عن ماء الرجل كيف يكون الذكر منه حتى يكون ذكرا وكيف يكون انثى حتى يكون انثى واخبرنا كيف هذا النبي الامي في التورات ومن وليه من الملائكة قال فعليكم عهد الله وميثاقه لئن انا حدثتكم لتتابعوني فاعطوه ما شاء من عهد وميثاق قال انشدكم بالله الذي انزل التوراة على موسى هل تعلمون ان اسرائيل مرض مرضا شديدا طال سقمه فيه فنذر لله نذرا لئن شفاه الله من سقمه ليحرمن احب الشراب اليه واحب الطعام اليه وكان احب الشراب اليه البان الابل واحب الطعام اليه لحوم الابل. قالوا اللهم نعم. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم

لیکن اگر میں ایسا جواب دیدوں جس کی صداقت کا تم بھی اعتراف کرلو تو مجھ سے اس بات کا عہد کرو کہ تم اسلام قبول کرلوگے اور اُس بات کا بھی عہد کرو جس کا عہد یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے لیا تھا یعنی خدا تعالےٰ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائینگے۔ اُنہوں نے کہا منظور ہے اس کے بعد آپ نے فرمایا اب جو تمہاری مرضی ہو آئے مجھ سے پوچھو وہ بولے ہم کو آپ چار باتیں بتا دیجیے۔ پہلی یہ کہ تورات کے نزول سے قبل وہ کھانا کیا تھا جو اسرائیل علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ دوم یہ بتائیے کہ مرد کی منی سے جب لڑکا بنتا ہے تو کیسے بنتا ہے اور عورت کی منی سے جب لڑکی بنتی ہے تو کیسے بنتی ہے۔ تیسرے یہ بات بتلائیے کہ تورات میں اس نبی امی کی کیا علامت بیان کی گئی ہے۔ چوتھی یہ کہ فرشتوں میں سے کون فرشتہ ان کا رفیق کار مقرر کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا مجھ سے اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ عہد کرو کہ اگر میں ان کا جواب دیدوں تو تم لوگ اسلام قبول کرنے میں میرا کہا مان لوگے۔ اس پر انہوں نے خوب لمبے چوڑے عہد کیے اس کے بعد آپ نے فرمایا اچھا میں اس خدا تعالیٰ کی تم کو قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی تھی بتاؤ کیا تم نہیں جانتے کہ اسرائیل جب سخت بیمار پڑے اور ان کی علالت بہت طویل ہو گئی تو انہوں نے یہ منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے مجھے بیماری سے صحت بخشی تو جو مجھے کھانے پینے کی چیزوں میں سب سے زیادہ پسند ہوگی میں اس کو چھوڑ دونگا اور واقعہ یہ تھا کہ پینے کی اشیاء میں اونٹ کا دودھ اور کھانے کی چیزوں میں اونٹ کا گوشت ان کو بہت پسند تھا لہذا صحت کے بعد انہوں نے اپنی منت کے مطابق ان کا استعمال ترک فرما دیا تھا) انہوں نے یہ جواب سُن کر کہا اے اللہ بیشک یہی بات ہے۔ آپ نے

۹۷۹۔ یہاں یہ بحث کرنی کہ ان امور کا علم خصائص نبوت سے ہو سکتا ہے یا نہیں بالکل غیر متعلق بحث ہے ہمارا مقصد

اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ عَلَيْهِمْ فَقَالَ فَاَنْشُدُكُمْ بِاللّٰهِ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الَّذِىْ اَنْزَلَ التَّوْرَاةَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ مَاءَ الرَّجُلِ غَلِيْظٌ اَبْيَضُ وَاَنَّ مَاءَ الْمَرْاَةِ رَقِيْقٌ اَصْفَرُ فَاَيُّهُمَا عَلَا كَانَ الْوَلَدُ وَالشَّبَهُ لَهٗ بِاِذْنِ اللّٰهِ قَالُوْا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ قَالَ اَنْشُدُكُمْ بِاللّٰهِ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَنْزَلَ التَّوْرَاةَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ هٰذَا النَّبِىَّ تَنَامُ عَيْنَاهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهٗ قَالُوْا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ قَالُوْا اَنْتَ الْاٰنَ حَدِّثْنَا مَنْ وَلِيُّكَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ فَعِنْدَهَا نُجَامِعُكَ اَوْ نُفَارِقُكَ قَالَ وَلِيِّىْ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَلَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ نَبِيًّا قَطُّ اِلَّا وَهُوَ وَلِيُّهٗ قَالُوْا فَعِنْدَهَا نُفَارِقُكَ وَلَوْ كَانَ غَيْرُهٗ لَاتَّبَعْنَاكَ وَصَدَّقْنَاكَ قَالَ فَمَا يَمْنَعُكُمْ اَنْ تُصَدِّقُوْا بِهٖ قَالُوْا اِنَّهٗ عَدُوُّنَا مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ "قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

فرمایا الٰہی تو بھی اس پر گواہ رہ۔ پھر آپ نے فرمایا میں تم کو اس خدا کی ذات کی قسم دیتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل فرمائی۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ مرد کی منی سفید رنگ اور گاڑھی ہوتی ہے اور عورت کی زرد اور پتلی اور ان میں جو غالب رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بچہ اسی کے مشابہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ بولے اے اللہ بیشک یہی بات ہے۔ آپ نے فرمایا اے اللہ تو بھی اس پر گواہ رہ پھر آپ نے فرمایا تم کو اس خدا تعالیٰ کی ذات کی قسم جس کے سوا معبود کوئی نہیں اور جس نے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ نازل فرمائی، کیا تم نہیں جانتے کہ اس نبی کی ایک علامت یہ ہے کہ نیند صرف اس کی آنکھوں پر طاری ہوگی اس کے دل پر نہیں وہ اس حالت میں بھی بیدار رہیگا وہ بولے اے اللہ بیشک یہی بات ہے آپ نے فرمایا الٰہی تو بھی گواہ رہ اس کے بعد انھوں نے کہا آپ ایک آخری بات اور بتا دیجیے بس اس کے بعد یا تو ہم آپ کے ساتھ ہو جائینگے یا آپ سے علیحدہ ہو جائینگے اور وہ یہ کہ فرشتوں میں کون فرشتہ آپ کا رفیق کار ہے۔ آپ نے فرمایا میرے ولی اور رفیق کار جبرئیل ہیں اور مجھ سے پہلے جو نبی بھی ہوا ہے یہی اس کے رفیق کار ہوئے ہیں۔ یہ سُن کر وہ بولے بس اسی بات پر ہم آپ سے علیحدہ ہوتے ہیں اگر ان کے سوا آپ کا رفیق کار کوئی اور فرشتہ ہوتا تو ہم آپ کی اتباع کر لیتے اور آپ کی تصدیق کرتے۔ آپ نے پوچھا ان کی تصدیق کرنے سے تمھیں کیا بات مانع ہے انھوں نے کہا کہ تمام فرشتوں میں یہ ہمارا دشمن ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1] "کہدو کہ جو جبرئیل کا دشمن ہو (وہ ہو) کسی شک کے بغیر انھوں نے ہی اللہ تعالیٰ کے حکم سے قرآن پاک آپ کے قلب پر

[1] یہاں صرف اتنا ہے کہ جس امر کو اہل کتاب نبوت کی نشانی سمجھتے چلے آتے تھے اور جو اشیاء ان کے بیان کے مطابق علوم نبوت میں شمار تھیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات میں سب موجود تھیں۔ آپ کے جواب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے پوری دیانتداری کے ساتھ ہر امر کا صاف صاف اعلان کر دیا تھا اور ان کے ایمان کی خاطر اپنے بیان کے کسی

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ الى قوله فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ" رواه ابوداؤد الطيالسی

۹۸۰۔ عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ كُنْتُ قَائِمًا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ حِبْرٌ مِّنْ اَحْبَارِ الْيَهُوْدِ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُحَمَّدُ فَدَفَعْتُهُ دَفْعَةً كَادَ اَنْ يُصْرَعَ مِنْهَا فَقَالَ لِمَ تَدْفَعُنِيْ قَالَ قُلْتُ اَلَا تَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّمَا سَمَّيْتُهُ بِاسْمِهِ الَّذِيْ سَمَّاهُ بِهٖ اَهْلُهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اِسْمِيَ الَّذِيْ سَمَّانِيْ بِهٖ اَهْلِيْ مُحَمَّدٌ فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ جِئْتُ اَسْأَلُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْفَعُكَ شَيْءٌ اِنْ حَدَّثْتُكَ قَالَ اَسْمَعُ بِاُذُنِيْ فَنَكَتَ بِعُوْدٍ فِيْ يَدِهٖ فَقَالَ لَهٗ سَلْ فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ اَيْنَ النَّاسُ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوَاتُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الظُّلْمَةِ دُوْنَ الْجِسْرِ. قَالَ فَمَنْ اَوَّلُ النَّاسِ اِجَازَةً قَالَ فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِيْنَ. فَقَالَ الْيَهُوْدِيُّ فَمَا تُحْفَتُهُمْ حِيْنَ يَدْخُلُوْنَ قَالَ زِيَادَةُ كَبِدِ حُوْتٍ قَالَ فَمَا غَدَاؤُهُمْ

نازل کیا ہے جو اس تورات کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے۔ (ابوداؤد و طیالسی)

۹۸۰۔ ثوبان بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھڑا ہوا تھا کہ یہود کا ایک عالم آیا اور بولا السلام علیک یا محمد۔ یہ سُن کر میں نے اس کو ایسا دھکا دیا کہ وہ گرنے کے قریب ہوگیا۔ اُس نے کہا تم نے مجھے کیوں دھکا دیا۔ میں نے کہا اس لیے کہ تو نے یا رسول اللہ کیوں نہیں کہا۔ وہ بولا میں نے آپ کا وہی نام تو لیا ہے جو آپ کے گھر والوں نے آپ کا رکھا ہے۔ یہ سُن کر آپ نے فرمایا میرے گھر والوں نے میرا نام محمد ہی رکھا ہے اس کے بعد اس یہودی نے کہا میں آپ سے کچھ باتیں دریافت کرنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا اگر میں تجھ کو وہ باتیں بتادوں تو تجھ کو کچھ فائدہ ہوگا؟ اُس نے کہا میں اپنے کانوں سے سن لونگا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی آپ اُس سے زمین کریدنے لگے (جیسا کچھ سوچ رہے ہیں) اور فرمایا اچھا پوچھو۔ یہودی نے کہا جس دن زمین دوسری صورت میں بدل دی جائیگی اور آسمان الخ اس دن بھلا لوگ کہاں ہونگے۔ آپ نے جواب دیا۔ ایک تاریکی میں ہونگے جو پل صراط سے پہلے ہوگی۔ اس نے پوچھا اچھا بتلائیے سب سے پہلے پل صراط سے گزرنے والے کون لوگ ہیں۔ آپ نے جواب دیا مہاجرین کے فقیر۔ یہودی نے پوچھا جب جنت میں داخل ہو جائینگے تو ان کا پہلا ناشتہ کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا۔ مچھلی کے جگر کا جو حصہ بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا اس کے بعد پھر ان

پہلوبھی نرا سی ایک پیدا نہیں کی۔ حضرت جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معاملہ میں جب اُنھوں نے اپنی عداوت کا اظہار کیا تو آپ بہت صفائی کے ساتھ یہاں ان سے الگ ہوگئے اور خدا تعالیٰ کے دوست و دشمن میں بے وجہ سازگاری پیدا کرنے کی کوئی سعی نہیں کی۔ آپ کے اس بے لاگ اور واضح طرزِ عمل میں اہلِ فہم و انصاف کے لیے انبیاء علیہم السلام کی شناخت کے لیے ایک بڑی شاہراہ کھلتی ہے۔

عَلَى آثْرِهِ قَالَ يَنْحَرُ لَهُمْ ثَوْرُ الْجَنَّةِ الَّذِي كَانَ يَأْكُلُ مِنْ أَطْرَافِهَا قَالَ فَمَا شَرَابُهُمْ عَلَيْهِ. قَالَ مِنْ عَيْنٍ
فِيهَا تُسَمَّى سَلْسَبِيلًا قَالَ صَدَقْتَ قَالَ وَجِئْتُ أَسْأَلُكَ عَنْ شَيْءٍ لَا يَعْلَمُهُ أَحَدٌ مِنْ أَهْلِ
الْأَرْضِ إِلَّا نَبِيٌّ أَوْ رَجُلٌ أَوْ رَجُلَانِ قَالَ يَنْفَعُكَ إِنْ حَدَّثْتُكَ قَالَ أَسْمَعُ بِأُذُنِي قَالَ جِئْتُ
أَسْأَلُكَ عَنِ الْوَلَدِ قَالَ مَاءُ الرَّجُلِ أَبْيَضُ وَمَاءُ الْمَرْأَةِ أَصْفَرُ فَإِذَا اجْتَمَعَا فَعَلَا مَنِيُّ الرَّجُلِ
مَنِيَّ الْمَرْأَةِ ذَكَرَا بِإِذْنِ اللهِ وَإِذَا عَلَا مَنِيُّ الْمَرْأَةِ مَنِيَّ الرَّجُلِ أَنَّثَا بِإِذْنِ اللهِ فَقَالَ الْيَهُودِيُّ
صَدَقْتَ وَإِنَّكَ لَنَبِيٌّ ثُمَّ انْصَرَفَ. فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ إِنَّهُ سَأَلَنِي هٰذَا الَّذِي سَأَلَنِي
عَنْهُ وَمَا أَعْلَمُ شَيْئًا مِنْهُ حَتَّى آتَانِيَ بِهِ اللهُ تَعَالَى. رواه مسلم ورواه عبد بن حميد في تفسيره۔

۹۸۱ - عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَوْبَانِ قِطْرِيَّانِ غَلِيظَانِ وَكَانَ
إِذَا قَعَدَ فَعَرِقَ ثَقُلَا عَلَيْهِ فَقَدِمَ بَزٌّ مِنَ الشَّامِ لِفُلَانٍ الْيَهُودِيِّ فَقُلْتُ لَوْ بَعَثْتَ إِلَيْهِ فَاشْتَرَيْتَ
مِنْهُ ثَوْبَيْنِ إِلَى الْمَيْسَرَةِ فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُ مَا تُرِيدُ إِنَّمَا يُرِيدُ أَنْ تَذْهَبَ

ان کو کیا کھانا ملیگا۔ آپ نے جواب دیا۔ ایک بیل ذبح کیا جائیگا جو جنت کے کناروں میں چرا ہوا ہوگا اس نے
پوچھا اچھا اس کے بعد ان کا پانی کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا اس چشمہ کا پانی ہوگا جس کا نام سلسبیل ہے اس کے
بعد اس نے کہا بس ایک بات اور پوچھتا ہوں جس کو نبی کے سوا زمین پر بسنے والوں میں کوئی انسان نہیں
جانتا یا ایک دو شخص اور۔ آپ نے فرمایا اگر میں بتا دوں تو تجھ کو کچھ فائدہ بھی ہوگا! اُس نے کہا میں اپنے
کان سے سن تو لونگا۔ اس کے بعد اس نے کہا فرمائیے لڑکا کیسے بنتا ہے آپ نے فرمایا یہ بات تو معلوم ہے
کہ مرد کی منی سفید رنگ کی اور عورت کی زرد رنگ کی۔ جب دونوں جمع ہو جاتی ہیں تو اگر مرد کی منی غالب
رہی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے لڑکا ہوتا ہے اور اگر عورت کی منی غالب ہوئی تو اس کے حکم سے لڑکی ہوتی ہے۔ یہودی
بولا آپ نے ٹھیک بتایا اور یقیناً آپ سچے نبی ہیں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ آپ نے فرمایا جو باتیں اُس نے مجھ سے دریافت
کی تھیں اُس کے پوچھنے سے پہلے ان میں کسی ایک بات کا بھی مجھ کو علم نہ تھا یہاں تک کہ جب اس نے پوچھا تو
اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ان کا علم عطا فرما دیا۔ (مسلم شریف)

۹۸۱۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر دو موٹے موٹے کپڑے تھے جب
آپ بیٹھتے اور آپ کو پسینہ آتا تو وہ پسینہ میں بھیگ کر اور بھاری ہو جاتے۔ سب اتفاق شام سے فلاں یہودی
کا کچھ کپڑا آیا تو میں نے عرض کی کاش آپ اس یہودی کے پاس کسی کو بھیج کر دو ہلکے ہلکے کپڑے خرید لیتے اس
شرط سے کہ جب آپ کو گنجائش ہوگی تو اس کی قیمت ادا فرما دینگے۔ آپ نے اس یہودی کے پاس کہلا بھیجا اُس نے
یہ سن کر کہا اچھا میں آپ کا مطلب سمجھ گیا، آپ کا مقصد اس بہانہ سے صرف میرا مال مار لینا ہے۔ آپ نے یہ

بِمَا لِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَبَ قَدْ عَلِمَ اِنِّيْ مِنْ اَتْقَاهُمْ وَاٰدَاهُمْ لِلْاَمَانَةِ
رواہ الترمذی والنسائی ۔

۹۸۲ ۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَعَثَتْ قُرَيْشٌ النَّضْرَ بْنَ الْحَارِثِ وَعُقْبَةَ بْنَ اَبِيْ مُعَيْطٍ اِلٰى اَحْبَارِ يَهُوْدَ بِالْمَدِيْنَةِ فَقَالُوْا لَهُمْ اِسْأَلُوْهُمْ عَنْ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم، وَصِفُوْا لَهُمْ صِفَتَهٗ وَاَخْبِرُوْهُمْ بِقَوْلِهٖ فَاِنَّهُمْ اَهْلُ الْكِتَابِ الْاَوَّلِ وَعِنْدَهُمْ عِلْمٌ مَا لَيْسَ عِنْدَنَا مِنْ عِلْمِ الْاَنْبِيَاءِ فَخَرَجَا حَتّٰى قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَسَأَلُوا اَحْبَارَ يَهُوْدَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

سُن کر فرمایا یہ جھوٹ کہتا ہے، یہ خوب جانتا ہے کہ میں ان سب سے زیادہ متقی ہوں اور سب سے بڑھ کر امانت کا ادا کرنے والا ہوں (ترمذی۔ نسائی)

۹۸۲ ۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ قریش مکہ نے نضر بن الحارث اور عقبہ کو مدینہ کے یہودی علماء کے پاس بھیجا اور ان سے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ کی ذرا ان سے تحقیق کریں اور ان کے سامنے ان کی شکل وشمائل بھی بیان کریں اور جو قرآن یہ ہم کو سناتے ہیں اس کی بھی ان کو خبر کر دیں کیونکہ وہ لوگ پہلی کتابوں کے جاننے والے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق جو معلومات ان کو ہیں وہ ہم کو نہیں ہیں۔ یہ دونوں روانہ ہوئے یہاں تک کہ مدینہ پہنچ گئے اور یہود کے علماء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق

۹۸۱ ۔ یہود کی ناہموار فطرت کا تجربہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے ہوتا چلا آرہا تھا اس یہودی سے بھلا کیا بعید تھا کہ وہ آپ پر بھی اس قسم کی بہتان طرازی سے کام لیتا لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کن بلند اخلاق کے مالک تھے کہ پورے اقتدار کے باوجود اس یہودی پر کوئی دفعہ جرم نہیں لگاتے اور صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ میری صفت کتب سابقہ میں موجود ہے جس کو یہ بھی خوب جانتا ہے اس لیے میرے متعلق اس کا یہ بیان کسی غلط فہمی سے نہیں ہے بلکہ صریح کذب پر مبنی ہے۔ جہاں نبوت اور دلائل نبوت پر کسی نے کوئی حملہ کیا ہے آپ نے وہاں کھلے طور اس کی تردید کی ہے۔ اخلاق و رواداری اور اعلان حق اور کسی نصب العین کے تحفظ کے حدود اس ایک واقعہ سے سمجھ لینے چاہئیں۔

۹۸۲ ۔ حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ایمان کے تین ارکان ہیں ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالقیامۃ۔ اصحاب کہف کے اس قصہ میں ایمان کے ان ہر سہ اصول کی دلیلیں موجود ہیں حسب بیان قرآن چونکہ اصحاب کہف تین سو سال کی مدت سے زیادہ عالم خواب میں پڑے رہے اس کے باوجود ان کے جسم بدستور صحیح وسالم تھے ان پر تغیر کا ذرا کہیں نام نہ آیا تھا اس سے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ثبوت ملتا ہے پھر جب اتنی طویل مدت کے بعد وہ بیدار ہوئے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت میں مردوں کا جی اٹھنا بھی حق ہے وہ بھی اسی طرح پھر زندہ ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے اس واقعہ کو بیان فرما کر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا — اور اسی طرح ہم نے ان کو خبر ظاہر کر دی کہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے

اور چونکہ اس عجیب وغریب قصہ کی اطلاع آپ نے کسی سے حاصل کیے بغیر یہود کو دیدی اس لیے آپ کی نبوت بھی ثابت ہوگئی کیونکہ یہود کو یہ معلوم تھا کہ اس قصہ کی اطلاع یا تو نبی کو ہو سکتی ہے یا اس کو ہو سکتی ہے جس کو نبی اطلاع دے یہ بات تو

وَسَلَّمَ وَوَصَفُوْا لَهُمْ اَمْرَهٗ وَبَعْضَ قَوْلِهٖ وَقَالَا اِنَّكُمْ اَهْلُ التَّوْرَاةِ وَقَدْ جِئْنَاكُمْ لِتُخْبِرُوْنَا عَنْ صَاحِبِنَا هٰذَا. قَالَ فَقَالَتْ لَهُمْ اَحْبَارُ يَهُوْدَ سَلُوْهُ عَنْ ثَلَاثٍ نَاْمُرُكُمْ بِهِنَّ فَاِنْ اَخْبَرَكُمْ بِهِنَّ فَهُوَ نَبِيٌّ مُرْسَلٌ وَاِنْ لَمْ يَفْعَلْ فَالرَّجُلُ مُتَقَوِّلٌ فَرَوْا فِيْهِ رَاْيَكُمْ سَلُوْهُ عَنْ فِتْيَةٍ ذَهَبُوْا فِي الدَّهْرِ الْاَوَّلِ مَا كَانَ مِنْ اَمْرِهِمْ فَاِنَّهٗ قَدْ كَانَ لَهُمْ حَدِيْثٌ عَجِيْبٌ وَسَلُوْهُ عَنْ رَجُلٍ طَوَّافٍ بَلَغَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا مَا كَانَ نَبَاُهٗ وَسَلُوْهُ عَنِ الرُّوْحِ مَا هُوَ فَاِنْ

تحقیق کرنے لگے اُن سے کچھ آپ کے حالات بھی بیان کیے اور کلام پاک کا کچھ حصہ بھی سُنایا اور کہنے لگے کہ آپ لوگ توراۃ کے عالم ہیں ہم اس لیے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ ہمارے اس ہموطن کے متعلق آپ ہم کو صحیح صحیح بات بتادیں۔ وہ بولے اس شخص سے جاکر تین باتیں پوچھنا اگر وہ تم کو بتادیں تو وہ یقینی خدا کی طرف سے نبی اور رسول ہیں اور اگر نہ بتائیں تو سمجھنا کہ افترا پرداز آدمی ہے اور پھر جو سلوک تمہاری رائے میں آئے وہ کرنا پہلی بات تو یہ پوچھنا کہ گزشتہ زمانہ میں نوجوانوں کی جو جماعت اپنے شہر سے باہر چلی گئی تھی ان کا قصہ کیا ہے۔ کیونکہ ان کا قصہ ایک عجیب قصہ ہے۔ دوسری بات یہ دریافت کرنا کہ جس شخص نے مشرق و مغرب کی سیاحت کی تھی اس کا قصہ کیا ہے اور روح کے متعلق بھی دریافت کرنا اس کی حقیقت کیا ہے اگر وہ

ظاہر تھی کہ آپ کو کسی نو تشخص نے اس کی اطلاع نہیں دی۔ اب رہا کسی نبی کا براہ راست آپ کو اطلاع دینا تو اس کا یہاں کوئی امکان ہی نہ تھا۔ لہٰذا ایک صورت اب بھی باقی رہ گئی تھی کہ وحی الٰہی نے آپ کو اس کی اطلاع دی ہو۔ اسی اُنہوں نے اس کو آپ کی نبوت کا معیار قرار دے دیا تھا۔

حافظ سہیلیؒ اصحاب کہف پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان واقعات کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کردینا گویا یہ سب آپ کے چشم دید حالات تھے حتیٰ کہ ان کے کتے کی نشست کی صورت بھی بالخصوص جبکہ احول ایسا ہو کہ ایک بہادر انسان بھی اس کو غور کے ساتھ دیکھ نہ سکتا ہو اس کی صریح دلیل ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں (الروض الانف ص ۱۹۲ ج ۱)

اس تاریخی اور اہم واقعہ کے متعلق بعض آزاد خیال مصنفین اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دعوت مسیحی کی ابتدائی صدیوں ہی میں رہبانیت کی بنیاد پڑ چکی تھی اور کچھ لوگ عبادت کے شوق میں پہاڑوں میں چھپ چھپ کر اپنی عمریں اسی طرح ختم کردینے کے عادی ہو چکے تھے کچھ عرصہ کے بعد مختلف شکلوں سے جو عبادتیں وہ کرتے اسی حالت میں ان کا انتقال ہوجاتا اور آخر سوکھ سوکھ کر ان کے ڈھانچے اسی شکل پر رہ جاتے۔ یہ لکھ کر انہوں نے اس واقعہ کا سرا بھی محض اپنی قیاس آرائی سے اس مسیحی رہبانیت سے جا ملایا ہے اور پھر اسی مفروضہ صورت پر قرآنی آیات کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ واقعہ اتنا اہم تھا کہ اس کو پورے طور پر تاریخی روشنی میں پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ یہاں صاحب معجم کا بیان تو یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے بھی چار سو سال قبل کا واقعہ ہے۔ حافظ ابن کثیر کا میلان بھی اسی طرف ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب اس قصہ کا چرچا یہود کے درمیان بھی تھا تو یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے یقیناً قبل کا ہے۔ لہٰذا بعض مفسرین کا اس کو عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا واقعہ کہنا درست نہیں ہو سکتا۔ البدایۃ والنہایۃ ص ۱۱۴ ج ۲۔ اسی کے ساتھ انہوں نے عبادۃ بن صامتؓ سے ایک روایت پیش کی ہے کہ

أَخْبَرَكُمْ بِذَٰلِكَ فَإِنَّهُ نَبِيٌّ فَاتَّبِعُوهُ وَإِنْ هُوَ لَمْ يَفْعَلْ فَهُوَ رَجُلٌ مُتَقَوِّلٌ فَاصْنَعُوا فِي أَمْرِهِ
مَا بَدَا لَكُمْ فَأَقْبَلَ النَّضْرُ وَعُقْبَةُ حَتَّى قَدِمَا مَكَّةَ عَلَى قُرَيْشٍ فَقَالَا يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ قَدْ
جِئْنَاكُمْ بِفَصْلِ مَا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) قَدْ أَمَرَنَا أَحْبَارُ يَهُودَ أَنْ نَسْأَلَهُ
عَنْ أُمُورٍ فَأَخْبَرُوهُمْ بِهَا فَجَاؤُوا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ أَخْبِرْنَا فَسَأَلُوهُ

ان سب باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دیدیں تو یقیناً وہ سچے نبی ہیں، ان کی پیروی کرنا اور اگر نہ بتا سکیں تو وہ کوئی افترا پرداز آدمی ہے پھر اس کے ساتھ جو سلوک چاہو کرنا نضر اور عقبہ یہ باتیں سن کر مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے اور جب یہاں پہنچے تو قریش سے کہا۔ اے قریش ہم تمہارے پاس ایک ایسی بات لے کر آئے ہیں جو تمہارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ میں فیصلہ کن ہے۔ ہم سے یہود کے علماء نے یہ کہا ہے کہ ہم ان سے چند باتیں دریافت کریں اور وہ سب باتیں بیان کیں۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے یا محمدؐ

صدیق اکبرؓ کی خلافت میں جب ان کو شاہ روم کے پاس دعوت اسلام کے لیے بھیجا گیا تو قسطنطنیہ کے ایک پہاڑ میں جا کر انہوں نے بچشم خود اصحاب کہف کو دیکھا تھا، پھر ان کا عدد و شمار ان کی صورتیں اور ان کے لباس کی پوری تفصیل بھی بیان کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک بھی ان کے جسم پورے طور پر محفوظ تھے یہ سب کچھ تحریر فرما کر صاحب معجم لکھتے ہیں،
"ہذا ما نقلتہ من کتب الثقات واللہ اعلم بصحتہ" معجم البلدان ص ۳۷۴ ج ۴۔
حافظ سہیلیؒ نے ان کے جسموں کی بقاء اور عدم بقاء کے متعلق صرف ابن عباسؓ سے اتنا نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہ باقی نہیں رہے تھے۔ ان حالات میں اس کو مسیحی رہبانیت کا نتیجہ قرار دینا اور اصحاب کہف کے اجسام کا عام انسانوں کی طرح سڑ گل کر برابر ہو جانا تاریخی بیان کے سراسر خلاف ہے، رہا یہ کہ قرآنی آیات میں اس کے لیے کتنی گنجائش ہے تو اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ پھر عجائبات قدرت کا صرف اصحاب کہف ہی ایک نمونہ نہ تھے بلکہ اس کی اور بہت مثالیں قرآن پاک میں موجود ہیں:۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا۔ (البقرہ)

خیال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جن کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی وہ بولے بھلا ایسی برباد شدہ بستی کو اللہ تعالیٰ پھر کہاں زندہ کریگا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دیدی۔ اور وہ سو سال تک اسی طرح مردہ رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندگی بخشی اور ان سے پوچھا بتاؤ تم اس حالت میں کتنی مدت سے ہو انہوں نے عرض کی دن بھر یا صرف چند گھنٹے گزرے ہونگے۔ فرمایا نہیں تم پر سو سال اسی حالت میں گزر چکے ہیں، اب ذرا اپنے کھانے اور پینے کو دیکھو اس میں ذرا تغیر نہیں ہوا، دوسری طرف اپنے گدھے کو دیکھو کہ اس کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہیں) یہ سب اس لیے ہوا کہ ہم نے چاہا کہ تم کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں اب ان ہڈیوں کو دیکھو کس طرح ہم ان کو ابھار کر جوڑ دیتے ہیں اور پھر کس طرح ان پر گوشت پوست چڑھاتے ہیں۔

ان دونوں واقعات کو سامنے رکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اصحاب کہف ... حضر میں بھی اپنی نیند کی مدت کے متعلق

عمّا اَمَرُوْهُمْ بِهٖ. فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُخْبِرُكُمْ وَجَاءَ جِبْرَئِيْلُ مِنَ اللّٰهِ بِسُوْرَةِ الْكَهْفِ فِيْهَا خَبَرُ مَا سَاَلُوْهُ عَنْهُ مِنْ اَمْرِ الْفِتْيَةِ وَالرَّجُلِ الطَّوَّافِ وَقَوْلِ اللّٰهِ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ الخ" ذکرہ محمد ابن اسحٰق کما فی الجواب الصحیح۔

۹۸۳۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَّا اَرَادَ هُدٰى زَيْدِ ابْنِ سَعْنَةَ قَالَ زَيْدٌ لَمْ يَبْقَ شَيْءٌ مِنْ عَلَامَاتِ النُّبُوَّةِ اِلَّا وَقَدْ عَرَفْتُهَا فِيْ وَجْهِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ

آپ ہم کو ان سوالوں کا جواب بتائیے اور وہ سوالات ذکر کیے جو یہود نے ان کو بتائے تھے۔ آپ نے فرمایا میں ان کا جواب دیتا ہوں۔ اس پر جبرئیل علیہ السلام سورۂ کہف لے کر تشریف لائے جس میں اُن نوجوانوں کا اور اس سیاح شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے، اور یہ آیت بھی نازل ہوئی "یسئلونك عن الروح" یہ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ایک حکم ہے۔ (الجواب الصحیح)

۹۸۳۔ عبداللہ بن سلام کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے زید بن سعنہ کو ہدایت دینے کا ارادہ فرمایا تو یوں ہوا کہ زید نے اپنے دل میں کہا کہ نبوت کی جتنی علامتیں تھیں وہ سب کی سب تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں پہچان چکا ہوں

باہم سوال ہوا تھا "قال قائل منھم کم لبثتم" تم لوگ کتنی مدت اس حالت پر رہے۔ پھر ان کا جواب یہ تھا قالوا لبثنا یومًا او بعض یوم۔ اور یہاں خدا تعالیٰ کے یہ برگزیدہ نبی جب دوبارہ جی اُٹھے تو ان سے بھی سوال یہی ہوا "کم لبثت" جواب ان کا بھی یہی تھا، لبثت یومًا او بعض یوم" (ایک دن یا ایک دن سے بھی کم) فرق یہ ہے کہ اس برگزیدہ رسول کو ان کی موت کی مدت بتادی گئی اور اصحاب کہف کے متعلق صرف اتنی بات پر اکتفا کی گئی "ربکم اعلم بما لبثتم"۔ اسی طرح اصحاب کہف کے ساتھ بھی ایک جانور تھا، اور یہاں بھی ایک جانور تھا۔ فرق یہ ہے کہ اصحاب کہف کا کتا صحیح و سلامت موجود تھا لیکن یہاں نبی کا کھانا تو بدستور تھا مگر ان کا گدھا گل سڑ کر برابر ہو گیا تھا۔ دونوں واقعات میں اللہ تعالیٰ کی زبردست نشانیاں موجود ہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ جتنا مردہ انسان کا اتنی طویل مدت کے بعد پھر زندہ ہو جانا عجیب ہے چند افراد کا چند صدیاں حالتِ خواب میں رہ کر بیدار ہو جانا اتنا عجیب نہیں۔ اسی طرح ایک کتے کا اتنی طویل مدت تک صحیح و سالم رہنا اتنا بعید نہیں جتنا بعید کہ کھانے جیسے سریع الفساد چیز کا نہ سڑنا اور گدھے کا آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جانا عجیب ہے۔ اس لیے فرمایا "ام حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من اٰیاتنا عجبا"۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ اصحاب کہف اور رقیم ہماری نشانیوں میں عجیب تھے یعنی ہماری نشانیاں اور ہماری قدرت کے کرشمے اس سے بھی زیادہ عجیب در عجیب موجود ہیں۔ پس اگر ایک اصحاب کہف کے عجیب قصہ کو دنیا کے واقعات کے عام سطح پر سمجھ لیا جائے تو بھی فائدہ کیا ہے جب تک کہ سارے قرآن کریم ہی کو از اول تا آخر بدلا نہ جائے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے انحطاط کے ہر دور میں دماغ اس کے درپے رہے ہیں کہ اس قسم کی تمام آیات پر بھی ہاتھ صاف کریں اور گویا اس طرح اپنے زعم باطل میں اسلام کو مادی عقول کے فہم کے لیے زیادہ سے زیادہ قریب لے آئیں مگر اس قسم کے واقعات قرآن کریم میں اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ اب تک یہ سعی ناتمام پوری نہیں ہو سکی۔ اسلام کی اس مزعوم خیر خواہی کے ساتھ ساتھ اس کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالنی بھی ضرور تھی کہ اگر قرآن کریم کے اوراق سے ان سب آیات کو اس طرح مسخ کر دیا گیا تو پھر اس میں دلائل ربوبیت کا حصہ کتنا باقی رہ جاتا ہے، اگر دنیا میں احیاء موتیٰ کی ایک مثال بھی باقی نہیں رہتی تو پھر قیامت کے یقین لوعدہ تعالیٰ کے "اِنّہٗ یحیی" کا ثبوت کیا ہوگا!

نَظَرْتُ اِلَیْہِ اِلَّا اثْنَتَیْنِ لَمْ اُخْبَرْهُمَا مِنْهُ یَسْبِقُ حِلْمُهٗ جَهْلَهٗ، وَلَا یَزِیْدُهٗ شِدَّةُ الْجَهْلِ عَلَیْهِ اِلَّا حِلْمًا قَالَ فَکُنْتُ أَتَلَطَّفُ لَهٗ لِاَنْ اُخَالِطَهٗ فَاَعْرِفَ حِلْمَهٗ، وَجَهْلَهٗ فَذَکَرَ قِصَّةَ اِسْلَافِهِ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَالًا فِیْ ثَمَرَةٍ قَالَ فَلَمَّا حَلَّ الْاَجَلُ اَتَیْتُ فَاَخَذْتُ بِمَجَامِعِ قَمِیْصِهٖ وَرِدَائِهٖ وَهُوَ فِیْ جَنَازَةٍ مَعَ اَصْحَابِهٖ وَنَظَرْتُ اِلَیْهِ بِوَجْهٍ غَلِیْظٍ وَقُلْتُ یَا مُحَمَّدُ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، اَلَا تَقْضِیْنِیْ حَقِّیْ؛ فَوَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُکُمْ بَنِیْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَمُطْلٌ قَالَ فَنَظَرَ اِلَیَّ عُمَرُ وَعَیْنَاهُ یَدُوْرَانِ فِیْ وَجْهِهٖ کَالْفَلَکِ الْمُسْتَدِیْرِ. ثُمَّ قَالَ یَا عَدُوَّ اللّٰهِ اَتَقُوْلُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا اَسْمَعُ وَتَفْعَلُ مَا اَرٰی فَوَالَّذِیْ بَعَثَهٗ بِالْحَقِّ لَوْلَا اُحَاذِرُ لَوْمَهٗ لَضَرَبْتُ بِسَیْفِیْ رَاْسَکَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَنْظُرُ اِلٰی عُمَرَ فِیْ سُکُوْنٍ وَتُؤَدَةٍ وَتَبَسُّمٍ. ثُمَّ قَالَ اَنَا وَهُوَ کُنَّا اَحْوَجَ اِلٰی

بجز دو علامتوں کے جن کے متعلق مجھ کو رہنون کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ کہ ان کی بردباری ان کی ترش مزاجی سے بہت بڑھی ہوئی ہوگی دوم یہ کہ جتنا ان کے ساتھ تمرد کئے اتنا ہی ان کی شان بردباری اور زیادہ ہوتی جائیگی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اس تدبیر میں لگا رہا کہ ذرا ان سے بے تکلفی پیدا کرلوں تو ان کی بردباری اور ترش مزاجی کا بھی کچھ اندازہ لگالوں۔ اس کے بعد انہوں نے پھلوں کے معاملہ میں آپ کو کچھ مال قرض دینے کا قصہ ذکر کیا یہ بیان کرتے ہیں کہ جب قرض کی مدت پوری ہوگئی تو میں آپ کے پاس آیا اور میں نے آپ کے قمیص اور چادر کے کنارے پکڑ لیے اس وقت آپ اپنے کسی صحابی کے جنازہ میں جا رہے تھے اور میں نے خوب غصہ کا منہ بنا کر آپ کو دیکھا اور کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا حق کیوں ادا نہیں کرتے خدا کی قسم جہاں تک میرا تجربہ ہے تم سب عبد المطلب والوں کی عادت قرض کے معاملہ میں یونہی ٹال مٹول کرنے کی ہے۔ یہ بیان کرتے ہیں یہ بات سن کر عمرؓ نے غضبناک صورت میں میری طرف دیکھا اور مارے غصہ کے اس وقت اُن کی آنکھیں چرخ دوار کی طرح تیزی کے ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ اس کے بعد بولے او خدا کے دشمن تو آپ کی خدمت میں یہ بکواس کر رہا ہے اور میں سن رہا ہوں اور آپ کے ساتھ ایسی گستاخانہ حرکات بھی کر رہا ہے اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اس ذات کی قسم جس نے آپ کو دین حق دے کر بھیجا ہے اگر مجھے آپ کی ناراضی کا خوف نہ ہوتا تو میں اپنی تلوار ابھی تیرے سر پر رسید کرتا۔ ادھر عمرؓ یہ فرما رہے تھے، اُدھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑے سکون و وقار کے ساتھ ان کو دیکھتے جاتے تھے اور مسکراتے جاتے تھے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا

۸۳۹ — یہ نگر زید یہاں ایک معیاری آزمائش کرنے کے لیے آئے تھے اس لیے انہوں نے آتے ہی ایسی ناشایستہ حرکات اور ایسے نازیبا کلمات منہ سے نکالنے شروع کردیئے جن کو سن کر ایک مرتبہ تو ٹھنڈے سے ٹھنڈے انسان کی رگ حمیت بھی پھڑک اٹھے۔ اول تو آتے ہی مجرم کی طرح آپ کو لپٹ گئے پھر کسی گفتگو کے بغیر نہ صرف آپ کی ذات بلکہ آپ کے سارے خاندان پر ایسی بات کا بٹہ لگانے لگے جس کا کوئی وجود ہی نہ تھا، مگر جو ذات ہر کسوٹی پر کھری اور ہر امتحان میں پوری اتری تھی وہ یہاں بھی اپنا جوہر

غَيْرَ هٰذَا مِنْكَ يَا عُمَرُ أَنْ تَأْمُرَنِي بِحُسْنِ الْأَدَاءِ وَتَأْمُرَهُ بِحُسْنِ التِّبَاعَةِ اِذْهَبْ بِهِ يَا عُمَرُ فَاقْضِهِ حَقَّهُ وَزِدْهُ عِشْرِيْنَ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ وَأَسْلَمَ زَيْدُ بْنُ سَعْنَةَ وَشَهِدَ بَقِيَّةَ الْمَشَاهِدِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتُوُفِّيَ عَامَ تَبُوْكَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى - رواہ ابن کثیر فی البدایۃ ص۳۱۰ ج ۲ وابو نعیم فی الدلائل ابسط منہ۔

۹۸۴- عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَجْنِي الْكَبَاثَ وَأَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عَلَيْكُمْ بِالْأَسْوَدِ مِنْهُ فَإِنَّهُ أَطْيَبُهُ قَالُوْا أَكُنْتَ تَرْعَى الْغَنَمَ قَالَ وَهَلْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا وَقَدْ رَعَاهَا - رواہ البخاری

۹۸۵- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا بَعَثَ اللّٰهُ إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ فَقَالَ

تم مجھ کو اور اس کو ان باتوں کی بجائے کچھ اور سمجھاتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ مجھ سے یہ کہتے کہ اس کا قرض تاخیر کے بغیر پورا پورا ادا کر دو، اور اس سے یہ کہتے کہ خوبصورتی کے ساتھ تقاضہ کر۔ اے عمر جاؤ اور اس کا قرض ادا کر دو اور کھجور کے بیس صاع اس کو اور دے دینا۔ آپ کی بردباری کا یہ نقشہ دیکھ کر زید اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور بقیہ جنگوں میں پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہی رہے اور جس سال تبوک کی جنگ ہوئی تھی اس سال میں ان کی وفات ہو گئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (دلائل النبوۃ لابی نعیم)

۹۸۴- ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے روایت ہے کہ جابر بن عبد اللہ نے بیان کیا کہ ایک موقع پر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیلو کے درخت کے پھل توڑ رہے تھے آپ نے فرمایا دیکھو ان میں سے جو سیاہ سیاہ ہوں وہ توڑنا کیونکہ وہی بہتر ہوتے ہیں۔ اس ذیل میں صحابہؓ نے آپ سے پوچھا کیا آپ نے کبھی بکریاں چرائی ہیں (کیونکہ جنگل کے اس قسم کے پھلوں کا تجربہ بیشتر ایسے ہی لوگوں کو ہوتا تھا جن کو اس سلسلے سے جنگل میں رہنے کا زیادہ اتفاق ہو) آپ نے فرمایا ایسا کون نبی گزرا ہے جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ (بخاری شریف)

۹۸۵- ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی مبعوث

دکھلائے بغیر نہ رہی یعنی اس سب کے بعد بھی یوں معلوم ہو رہا تھا گویا آپ کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ عمرؓ کی ایمانی غیرت ہزار جوش مارہی تھی مگر حلم نبوی کے سامنے کیا تاب و طاقت تھی چہرہ پر بل پڑ بل پڑ رہے تھے مگر نہ ایک قدم اپنی جگہ سے آگے ہلا سکے اور نہ کچھ سخت و سست کہہ کر ہی دل کی بھڑاس نکال سکے۔ فداکاروں کی حالت تو یہ تھی اور جن کی خاطر یہ سارا غصہ تھا ان کی شانِ حلم یہ تھی کہ چہرہ مسکرا رہا تھا اور اسی حالت میں جو موتی دہن مبارک سے بکھرے وہ آپ کے خزانۂ نبوت کے سچے گواہ بن کر بکھرے۔ سبحان اللہ وہ جماعت کدھر ہے جو کہتی ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کے سامنے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کچھ بھی رہی ہے اس کو آپ کی تصدیق میں کبھی ذرا پس و پیش نہیں ہوا۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور۔

۹۸۵- بکریاں چرانی ایک بہت ہی معمولی چیز ہے لیکن تاریخ نبوت میں چونکہ اس کو بھی ایک اہمیت حاصل تھی۔

أَصْحَابُهُ وَأَنْتَ فَقَالَ نَعَمْ كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلَى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ . رواه البخاری

۹۸۶ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ أَبُوْ ذَرٍّ خَرَجْنَا مِنْ قَوْمِنَا غِفَارٍ وَكَانُوْا يُحِلُّوْنَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ فَخَرَجْتُ أَنَا وَأَخِيْ أُنَيْسٌ . فَنَزَلْنَا عَلَى خَالٍ لَنَا فَأَكْرَمَنَا وَأَحْسَنَ إِلَيْنَا . . . . . فَقَالَ أُنَيْسٌ إِنَّ لِيْ حَاجَةً بِمَكَّةَ فَانْطَلَقَ أُنَيْسٌ حَتّٰى أَتٰى مَكَّةَ . . . . . فَقُلْتُ مَا صَنَعْتَ قَالَ لَقِيْتُ رَجُلًا بِمَكَّةَ يَزْعُمُ أَنَّ اللّٰهَ أَرْسَلَهُ قُلْتُ فَمَا يَقُوْلُ النَّاسُ قَالَ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ كَاهِنٌ سَاحِرٌ

فرمایا ہے اُس نے بکریاں ضرور چرائی ہیں صحابہؓ نے عرض کی کیا آپ نے بھی، آپ نے فرمایا جی ہاں میں بھی چند قیراط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ (بخاری شریف)

۹۸۶- عبداللہ بن صامت روایت فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ذرؓ نے بیان کیا میں اور میری بھائی اُنیس اپنی قوم غفار کے ساتھ ایک مرتبہ سفر کے لیے نکلے اور اپنے ماموں کے یہاں جاکر میمان ہوئے، اُنھوں نے ہمارا بڑا اعزاز واکرام کیا۔ اُنیس نے کہا مجھے مکہ میں کچھ کام ہے یہ کہہ کر انیس چل پڑے یہاں تک کہ مکہ پہنچ گئے (واپسی پر) میں نے کہا آپ نے وہاں کیا کام کیا۔ انھوں نے کہا وہاں میں نے ایک شخص سے ملاقات کی جس کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو رسول بناکر بھیجا ہے میں نے کہا اچھا تو ان کے متعلق لوگوں کا

امر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں اس کا ثبوت بھی ملنا ضروری تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بکریاں چرانا نبوت کے ایسے لوازم میں سے ہے کہ ہر چرواہا نبوت کا دعویٰ کرسکتا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو نبی ہوتا ہے اس کی زندگی میں یہ جزئی ضرور پیش آئی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بکریاں چرانا خود قرآن کریم کے اشارات سے ثابت ہے اب رہی یہ بحث کہ بکریاں چرانے کی اتنی اہمیت کیا ہے یہ ایک جداگانہ مسئلہ ہے۔ اس پر علماء نے علیحدہ بحث کی ہے۔ اتنا سب جانتے ہیں کہ طبیعت کو غم کا خوگر بنانے کے لیے مشکل سے شاید کوئی دوسری ٹرینگ اس سے زیادہ موثر ہو حتی کہ فارسی زبان میں یہ ایک مثل ہی بن گئی ہے کہ "غم نداری بز بخر" پھر انجیل میں ابھی تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے بنی اسرائیل کو جگہ جگہ بھیڑوں کے لفظ سے خطاب کیا گیا ہے گویا ایک گمراہ امت کا نقشہ سمجھنے کے لیے جو کسی لق ودق میدان میں نکل گئی ہو جہاں کھانے پینے کا کوئی سامان نہ ہو اور پھر چاروں طرف سے ڈاکوؤں اور قزاقوں میں گھر گئی ہو بکریوں کے اس گلہ سے زیادہ کوئی اور دوسرا صحیح نقشہ نہیں ہوسکتا جو ایک بے آب وگیاہ میدان میں بھیڑیوں کے بیچ میں جا پھنسا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک طرف ان کی نا سمجھی، دوسری طرف بھیڑیوں سے ان کی حفاظت کی ذمہ داری اس پر ان کے بقاء حیات کے لیے بے محل میں خورد ونوش کا انتظام کرنا کیسی دردسری، کتنی دردمندی اور کتنے نظم وہوشیاری کا محتاج ہوگا اس لیے انبیاء علیہم السلام کو انسانوں کے حوالے کرنے سے قبل تھوڑی سی ٹرینگ حیوانات سے شروع کی جاتی ہے تاکہ وہ ان ذمہ داریوں کا بار اُٹھانے کے پہلے سے خوگر ہو جائیں۔ وہ اپنی اُمت کو محرمات کی چراگاہوں سے بچا بچا کر حلال کے میدانوں میں لیجائیں اور جو ان سے بھاگ کر محرمات میں منہ ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہو اس کو پکڑ پکڑ کر کھینچ لیں۔ اس جگہ حدیث ۶۶ اور اس کا نوٹ جلد اول ترجمان السنۃ میں ضرور ملاحظہ فرمالیں۔ اس میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی اُمتوں کا حال سمجھنے کے لیے چراغ میں جلنے والے پروانوں اور ان کے بچانے والوں کا نقشہ بیان فرمایا گیا ہے اور قابل ملاحظہ ہے۔

وَكَانَ اُنَيْسٌ اَحَدَ الشُّعَرَاءِ قَالَ اُنَيْسٌ لَقَدْ سَمِعْتُ قَوْلَ الْكَهَنَةِ فَمَا هُوَ بِقَوْلِهِمْ وَلَقَدْ وَضَعْتُ قَوْلَهٗ عَلٰى اَقْرَاءِ الشُّعَرَاءِ فَمَا يَلْتَئِمُ عَلٰى لِسَانِ اَحَدٍ يَقْرِیْ بَعْدِیْ اَنَّهٗ شِعْرٌ وَاللّٰهِ اِنَّهٗ لَصَادِقٌ وَاِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ و ذکر القصۃ وصفۃ اسلامہ ۔ رواہ الشیخان ۔

۹۸۷ ۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ الْمَلَأُ وَاَبُوْ جَهْلٍ لَقَدْ غَلَبَنَا اَمْرُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم فَلَوِ الْتَمَسْتُمْ رَجُلًا عَالِمًا بِالشِّعْرِ وَالْكَهَانَةِ وَالسِّحْرِ فَاَتَاهُ فَكَلَّمَهٗ فَاَتَانَا بِبَيَانٍ مِّنْ اَمْرِهٖ قَالَ عُتْبَةُ بْنُ رَبِيْعَةَ وَاللّٰهِ لَقَدْ سَمِعْتُ الشِّعْرَ وَالْكَهَانَةَ وَالسِّحْرَ وَعَلِمْتُ مِنْ ذٰلِكَ عِلْمًا فَمَا يَخْفٰى عَلَیَّ اِنْ كَانَ ذٰلِكَ فَاَتَاهُ فَخَرَجَ اِلَيْهِ ... فَلَمَّا فَرَغَ قَرَاَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ " بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ حٰمٓ تنزیل من الرحمٰن الرحیم کتاب فصلت اٰیتہ الیٰ قولہ فقال انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد وثمود " فَاَمْسَكَ عُتْبَةُ عَلٰى فِيْهِ وَنَاشَدَهٗ بِالرَّحِمِ اَنْ يَكُفَّ وَرَجَعَ اِلٰى اَهْلِهٖ فَلَمْ يَخْرُجْ اِلٰى قُرَيْشٍ فَاحْتَبَسَ عَنْهُمْ عُتْبَةُ فَقَالَ اَبُوْ جَهْلٍ يَا مَعْشَرَ

خیال کیا ہے ۔ انہوں نے کہا یہ کہتے ہیں کہ شاعر ہے ، کاہن ہے ، جادوگر ہے ، یہ انیس خود بھی شاعر تھے ۔ انیس کہنے لگے میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے یہ ان کا سا کلام نہیں ہے اور میں نے اس کو شعراء کے اوزان پر بھی کر دیکھا تو کسی ایک وزن کے رنگ سے میل نہیں کھاتا ۔ خدا کی قسم وہ یقیناً سچے ہیں جو لوگ یہ باتیں بناتے ہیں وہ سب جھوٹ کہتے ہیں ۔ اس کے بعد اپنے مشرف باسلام ہوجانے کا سب قصہ بیان کیا ۔ (شیخین)

۹۸۷ ۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ابوجہل اور اس کے سب اہلِ محفل نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ نے تو ہم کو اب عاجز کر دیا ہے ۔ کوئی آدمی ایسا تلاش کرو جو شعر و سخن ، کہانت اور جادو کا ماہر ہو وہ اس کے پاس جائے اور پھر ہم سے آکر حقیقت حال بیان کرے ۔ اس پر عتبہ نے کہا خدا کی قسم میں نے شعر ، کہانت اور سحر سب سنے ہیں اور مجھے ان کا اچھا علم حاصل ہے اگر ان میں سے کوئی بات بھی ہوگی تو وہ مجھ سے چھپ نہ سکیگی ۔ عتبہ یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا (اور آپ سے طرح طرح کی لالچ کی باتیں کرنے لگا ۔ آپ سب خاموش سنتے رہے) جب وہ سب کہہ چکا تو اس کے جواب میں آپ نے سورۂ حم سجدہ کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں یہاں تک کہ جب پڑھتے پڑھتے آپ ان آیتوں پر پہنچے فَقَدْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ (جس میں یہ جتایا گیا تھا کہ اگر باز نہ آؤ گے تو پھر عاد و ثمود کی طرح برباد ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ) تو عتبہ کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ عذاب اب آیا چاہتا ہے ، اس نے آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنی قرابت اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہا آپ اور آگے نہ پڑھیں وہ اپنے گھر آکر بیٹھ رہا اور قریش کے پاس ہی نہ گیا اور مدت تک ان سے ملاقات نہیں کی ۔ اس پر ابوجہل نے کہا خدا کی قسم

قُرَيْشٍ وَاللّٰهِ مَا نَرٰى عُتْبَةَ اِلَّا قَدْ صَبٰى اِلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَاهُ اَبُوْ جَهْلٍ فَقَالَ يَا عُتْبَةُ مَا حَبَسَكَ عَنَّا اِلَّا اَنَّكَ صَبَوْتَ اِلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَغَضِبَ وَاَقْسَمَ اَنْ لَا يُكَلِّمَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبَدًا وَقَالَ لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّيْ مِنْ اَكْثَرِ قُرَيْشٍ مَالًا وَلٰكِنِّيْ وَقَصَصْتُ عَلَيْهِ الْقِصَّةَ فَاَجَابَنِيْ بِشَيْءٍ وَاللّٰهِ مَا هُوَ بِشِعْرٍ وَلَا كَهَانَةٍ وَلَا سِحْرٍ۔ رواہ ابن مردویہ فی کتاب التفسیر ویحیی بن معین وابو یعلی فی مسندہ ورواہ عبد بن حمید عن شیخ ابی یعلی کما فی الجواب الصحیح ص ۲۹ ج ۴۔ وراجع قصۃ ضماد من ترجمان السنۃ ص ۱۶۳ ج ۲۔

۹۸۸۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَامَ النَّضْرُ بْنُ الْحَارِثِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ وَاللّٰهِ لَقَدْ نَزَلَ بِكُمْ اَمْرٌ مَا ابْتُلِيْتُمْ بِمِثْلِهِ لَقَدْ كَانَ مُحَمَّدٌ فِيْكُمْ غُلَامًا حَدَثًا اَرْضَاكُمْ فِيْكُمْ وَاَصْدَقَكُمْ حَدِيْثًا وَاَعْظَمَكُمْ اَمَانَةً حَتّٰى اِذَا رَاَيْتُمْ فِيْ صُدْغِهِ الشَّيْبَ وَجَاءَكُمْ بِمَا جَاءَكُمْ بِهٖ قُلْتُمْ سَاحِرٌ لَا وَاللّٰهِ مَا هُوَ بِسَاحِرٍ

ہمارا خیال ہے ضرور عتبہ بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف مائل ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ابو جہل اس کے پاس گیا اور کہا۔ عتبہ! کہو ہم سے کیوں نہیں ملتے، یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ تم بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب ڈھل گئے ہو۔ اگر کچھ ضرورت ہو تو ہم تم کو مال جمع کر کے دیدیں تاکہ تم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کھانے سے بے نیازی ہو جائے۔ یہ سن کر وہ غصہ میں بھر گیا اور قسم کھائی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے آئندہ کبھی بات چیت بھی نہ کریگا۔ اور کہا تم جانتے ہو کہ میں قریش میں سب سے زیادہ مالدار آدمی ہوں لیکن بات یہ ہوئی کہ جب میں ان کے پاس گیا۔ اس کے بعد پورا واقعہ بیان کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھ کو ایسا کلام سنایا جو نہ شعر تھا نہ کہانت اور نہ جادو (اور سورہ حم سجدہ کی آیتیں مجھے سنائیں جب اس میں پہلی قوموں کے عذاب کا ذکر آیا تو میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ان کو اپنی قرابت کا واسطہ دیا کہ بس آگے نہ پڑھیں۔ تم سب جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کوئی بات منہ سے نکالتے ہیں تو اس میں ذرا جھوٹ نہیں ہوتا۔ مجھے یہ ڈر ہو گیا تھا کہیں تم پر بھی عذاب نہ آجائے (تفسیر ابن مردویہ) کذا فی الجواب الصحیح)

۹۸۸۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں ایک مرتبہ نضر بن الحارث کھڑا ہو کر بولا! اے جماعت قریش خدا کی قسم تم اس وقت ایک ایسی آزمائش میں پھنس گئے ہو کہ اس سے پہلے کبھی نہ پھنسے تھے۔ تم جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم ہی میں کے ایک نوجوان شخص تھے جو تم میں سب سے زیادہ محبوب سب سے زیادہ راست گو اور سب سے بڑھ کر امانت دار شخص تھے یہاں تک کہ جب ان کی عمر پختہ ہو گئی اور ان کی کنپٹیوں میں تم نے بڑھاپے کی سفیدی

قَدْ رَاَیْنَا السَّحَرَةَ وَنَفْثَهُمْ وَعُقَدَهُمْ وَقُلْتُمْ كَاهِنٌ لَا وَاللّٰهِ مَا هُوَ بِكَاهِنٍ قَدْ رَاَیْنَا الْكَهَنَةَ وَسَمِعْنَا سَجْعَهُمْ وَقُلْتُمْ شَاعِرٌ لَا وَاللّٰهِ مَا هُوَ بِشَاعِرٍ لَقَدْ رُوِّیْنَا الشِّعْرَ وَسَمِعْنَا اَصْنَافَهٗ كُلَّهَا هَزَجَهٗ وَرَجَزَهٗ وَقَرِیْضَهٗ وَقُلْتُمْ مَجْنُوْنٌ وَلَا وَاللّٰهِ مَا هُوَ بِمَجْنُوْنٍ لَقَدْ رَاَیْنَا الْمَجْنُوْنَ فَمَا هُوَ بِخَنْقِهٖ وَلَا تَخْلِیْطِهٖ یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ اُنْظُرُوْا فِیْ شَاْنِكُمْ فَاِنَّهٗ وَاللّٰهِ لَقَدْ نَزَلَ بِكُمْ اَمْرٌ عَظِیْمٌ وَكَانَ النَّضْرُ بْنُ الْحَارِثِ مِنْ شَیَاطِیْنِ قُرَیْشٍ وَمِمَّنْ یُؤْذِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَیَنْصِبُ لَهُ الْعَدَاوَةَ ۔ رواہ ابن اسحاق کما فی الجواب الصحیح

۹۸۹۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ الْوَلِیْدَ بْنَ الْمُغِیْرَةِ اجْتَمَعَ وَنَفَرٌ مِنْ قُرَیْشٍ وَكَانَ ذَا سِنٍّ فِیْهِمْ وَقَدْ حَضَرَ الْمَوْسِمُ فَقَالَ اِنَّ وُفُوْدَ الْعَرَبِ سَتَقْدَمُ عَلَیْكُمْ فِیْهِ وَقَدْ سَمِعُوْا بِاَمْرِ صَاحِبِكُمْ هٰذَا فَاَجْمِعُوْا فِیْهِ رَاْیًا وَاحِدًا وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَیُكَذِّبُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَیَرُدُّ بَعْضُكُمْ قَوْلَ بَعْضٍ

دیکھی ہیں اور تمہارے پاس یہ بن سے کر وہ آئے تو اب تم نے ان کو جادوگر کہہ دیا۔ خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں ہو سکتے، ہم نے جادوگروں کو دیکھا ہے نہ تو ان کی طرح سے وہ منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتے ہیں اور نہ اُن کی طرح گنڈے بناتے ہیں اور کبھی تم نے ان کو کاہن ٹھہرایا خدا کی قسم وہ کاہن بھی نہیں، ہم نے کاہن بھی بہت دیکھے ہیں اور ان کی تک بندیاں بھی سنی ہیں اور کبھی تم نے ان کو شاعر کہا خدا کی قسم وہ شاعر بھی نہیں ہمارے سامنے شعر کی روایات بھی ہیں اور ہم نے ان کی سب اقسام سنی ہیں اُن کا کلام نہ تو کاہنوں کے سجع بندیوں سے ملتا ہے نہ شاعروں کے شعروں سے، تم میں کسی نے ان کو مجنون بھی قرار دیا۔ خدا کی قسم وہ مجنون بھی نہیں ہم نے دیوانے بہت دیکھے ہیں، دیوانوں کی ایک علامت بھی ان میں نہیں۔ نہ ان کی سی بیہوشی ان پر طاری ہوتی ہے نہ یہ ان کی سی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ اے قریش کی جماعت اپنے معاملہ میں ذرا پورے غور سے کام لو، بخدا تم بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہو۔ راوی بیان کرتا ہے یہ نضر بن حارث قریش بھر میں پرلے درجہ کا شیطان شخص تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی تکالیف دیتا اور آپ کی دشمنی کے سامان تیار کیا کرتا تھا (محمد ابن اسحٰق)

۹۸۹۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ولید بن المغیرۃ اور قریش کے چند افراد ایک جگہ جمع ہوئے حج کا موسم سر پر آ چکا تھا۔ چونکہ یہ ولید بن مغیرہ عمر میں ان سب سے بڑا تھا اس لیے بولا کہ ابھی اب عرب کے لوگ تمہارے پاس ان ایام میں آئیں گے اور یقیناً ان کو تمہارے اس ہموطن شخص کی خبریں پہنچ گئی ہوں گی تو آؤ سب مل کر ایک بات طے کر لو ایسا نہ ہو کہ اُن کے جواب میں کہیں باہم اختلاف پھیلاؤ اور خود ایک دوسرے ہی کی تکذیب کرنے لگو

۹۸۹۔ بادشاہ، راہب اور اہل کتاب علماء کی چند آراء آپ نے ملاحظہ کر لیں۔ اب یہ عرب کے چند ہوشمندوں کے واقعات ہیں جن سے آپ یہ اندازہ فرمائیں گے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت میں کوئی دشواری پیش آئی تھی یا کچھ شکوک تھیں تو آپ کے انکار کرنے میں تھیں۔ اگر واقعات سے یہی ایک بات ثابت ہو کہ انبیاء علیہم السلام کی صداقت اس درجہ

فَقَالُوْا فَاَنْتَ يَا اَبَا عَبْدِ شَمْسٍ فَقُلْ وَاَقِمْ لَنَا رَأْيًا نَقُوْمُ بِهٖ فَقَالَ بَلْ اَنْتُمْ فَقُوْلُوْا وَاَنَا اَسْمَعُ فَقَالُوْا نَقُوْلُ كَاهِنٌ فَقَالَ مَا هُوَ بِكَاهِنٍ لَقَدْ رَاَيْتُ الْكُهَّانَ فَمَا هُوَ بِزَمْزَمَةِ الْكُهَّانِ فَقَالُوْا نَقُوْلُ مَجْنُوْنٌ فَقَالَ مَا هُوَ بِمَجْنُوْنٍ لَقَدْ رَاَيْنَا الْجُنُوْنَ وَعَرَفْنَاهُ فَمَا هُوَ بِخَنْقِهٖ وَلَا تَخَالُجِهٖ وَلَا وَسْوَسَتِهٖ قَالُوْا فَنَقُوْلُ شَاعِرٌ فَقَالَ مَا هُوَ بِشَاعِرٍ قَدْ عَرَفْنَا الشِّعْرَ بِرَجَزِهٖ وَهَزَجِهٖ وَقَرِيْضِهٖ وَمَقْبُوْضِهٖ وَمَبْسُوْطِهٖ فَمَا هُوَ بِالشِّعْرِ قَالُوْا فَنَقُوْلُ سَاحِرٌ قَالَ فَمَا هُوَ بِسَاحِرٍ قَدْ رَاَيْنَا السُّحَّارَ وَسِحْرَهُمْ فَمَا هُوَ بِنَفْثِهٖ وَ عُقَدِهٖ فَقَالُوْا مَا نَقُوْلُ يَا اَبَا عَبْدِ شَمْسٍ قَالَ وَاللّٰهِ اِنَّ لِقَوْلِهٖ حَلَاوَةً وَاِنَّ اَصْلَهٗ لَعَذْقٌ وَاِنَّ فَرْعَهٗ لَجَنِيٌّ فَمَا اَنْتُمْ بِقَائِلِيْنَ مِنْ هٰذَا شَيْئًا اِلَّا عُرِفَ اَنَّهٗ بَاطِلٌ وَفِيْ لَفْظٍ اِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَهٗ لَمُغْدِقٌ وَمَا يَقُوْلُ هٰذَا

انہوں نے کہا اے ابو عبد شمس (ولید کی کنیت تھی) پھر آپ ہی ایک آخری رائے بتلا دیں ہم سب اسی پر متفق ہو جائینگے اُس نے کہا نہیں پہلے تم ہی بولو اور میں سنونگا وہ بولے ہم یہ کہینگے کہ یہ شخص کاہن ہے، وہ بولا کاہن تو نہیں ہے میں نے کاہنوں کو دیکھا ہے ان کا کلام کاہنوں کے منتروں کی طرح نہیں ہے جو یہ لوگ گنگنا گنگنا کر پڑھا کرتے ہیں۔ وہ بولے اچھا تو ہم کہینگے وہ دیوانہ ہے اس نے کہا دیوانہ بھی نہیں۔ ہم نے دیوانوں کو بھی دیکھا ہے اور ہم ان کو خوب جانتے پہچانتے ہیں نہ تو دیوانوں کی طرح ان کا دم بند ہوتا ہے نہ یہ اُن کی سی بہکی بہکی بے ربط باتیں کرتے ہیں نہ دیوانوں کی طرح ان کے مزاج میں وسواس ہے' وہ بولے اچھا تو ہم کہینگے یہ شاعر ہے۔ اس نے کہا یہ شاعر بھی نہیں۔ ہم نے شعر کے جتنے اقسام ہیں سب دیکھے ہیں، ان کا کلام شعر کے وزنوں میں سے کسی وزن کے ساتھ نہیں ملتا۔ وہ بولے اچھا تو ہم کہینگے یہ جادوگر ہیں۔ اُس نے کہا میں نے بہت سے جادوگر بھی دیکھے ہیں اور ان کے جادو بھی دیکھے ہیں نہ تو ان کی طرح یہ منتر پڑھتے ہیں نہ گنڈے بناتے ہیں۔ وہ بولے اے ابو عبد شمس تو اب آپ ہی فرمائیے ہم کہیں تو کیا کہیں اس نے کہا خدا کی قسم ان کے کلام میں غضب کی شیرینی ہے، اس کا باطن دیکھو تو چشمہ کی طرح ابل رہا ہے اور ظاہر دیکھو تو پھلدار درخت کی طرح بار آور ہے۔ ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کہوگے وہ فوراً معلوم ہو جائیگی کہ بالکل غلط ہے، یہ کلام

بدیہی ہوتی ہے کہ اُن کے انکار کرنے کے لیے کوئی حیلہ بہانہ بنانا بھی آسان نہیں ہے تا تو پھر آپ بھی یہاں عقلی بحث اور خیالی پرواز کو چھوڑ کر تاریخ نبوت کے مطالعہ پر وقت کیوں صرف نہیں فرماتے دیکھیے یہاں مکہ کے مشرک کس صفائی سے کہہ رہے ہیں کہ کاہن اور ساحر کی نوع دنیا میں ہمیشہ ہوتی چلی آئی ہے ہم ان کو خوب جانتے پہچانتے ہیں اور شاعر بھی ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں، ہم ان کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ یہ شخص ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر ہم ان میں سے کوئی بات بھی کہینگے تو وہ اپنے کذب پر خود شاہد ہوگی کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نبوت کا معاملہ کس درجہ واضح اور صاف ہوتا ہے یہاں اگر آپ ان سے سحر کی حقیقت اور کہانت کی ماہیت پر بحث شروع کر دیں تو ان غریبوں کو شاید اس کی ابتدائی معلومات تک بھی مشکل ہو جائیں لیکن ساحر اور کاہنوں کو وہ آپ سے زیادہ جانتے پہچانتے تھے۔ کیونکہ یہ انواع

الْبَشَرِ وَفِي لَفْظٍ إِنَّهُ لَيَعْلُو وَمَا يُعْلَى وَإِنَّهُ لَيَحْطِمُ مَا تَحْتَهُ. رواه عبد الرزاق وروى ابن اسحاق قصة النضر بن الحارث نحوه كما سيجيء۔

۹۹۰- عَنْ رُكَانَةَ بْنِ عَبْدِ يَزِيْدَ وَكَانَ مِنْ اَشَدِّ النَّاسِ قَالَ كُنْتُ اَنَا وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي غُنَيْمَةٍ لِاَبِي طَالِبٍ نَرْعَاهَا فِي اَوَّلِ مَا رَاٰى اِذْ قَالَ لِي ذَاتَ يَوْمٍ هَلْ لَكَ اَنْ تُصَارِعَنِي قُلْتُ لَهُ اَنْتَ قَالَ اَنَا فَقُلْتُ عَلٰى مَاذَا قَالَ عَلٰى شَاةٍ مِنَ الْغَنَمِ فَصَارَعْتُهُ فَصَرَعَنِي فَاَخَذَ مِنِّي شَاةً ثُمَّ قَالَ لِي هَلْ لَكَ فِي الثَّانِيَةِ قُلْتُ نَعَمْ فَصَارَعْتُهُ فَصَرَعَنِي فَاَخَذَ مِنِّي شَاةً فَجَعَلْتُ اَلْتَفِتُ هَلْ يَرَانِي اِنْسَانٌ فَقَالَ مَا لَكَ قُلْتُ لَا يَرَانِي بَعْضُ الرُّعَاةِ فَيَجْتَرِؤُوْنَ عَلَيَّ وَاَنَا مِنْ اَشَدِّهِمْ قَالَ هَلْ لَكَ فِي الصِّرَاعِ الثَّالِثَةِ وَلَكَ شَاةٌ قُلْتُ نَعَمْ فَصَارَعْتُهُ فَصَرَعَنِي وَاَخَذَ مِنِّي شَاةً فَقَعَدْتُ كَئِيْبًا حَزِيْنًا فَقَالَ مَا لَكَ قُلْتُ اِنِّي اَرْجِعُ

جنرکا ہے ہی نہیں، وہ سب پر غالب آجاتا ہے اور کسی سے مغلوب نہیں ہوتا، یوں معلوم ہوتا ہے کہ تہ تک اس کے سب تختے پھلے ہوئے ہیں کہ اس کی تہ کا پتہ ہی نہیں لگتا۔

۹۹۰- رُکانہ سے روایت ہے اور یہ لوگوں میں سب سے قوی مشہور تھے کہ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کی چند بکریوں کو چرا رہے تھے۔ یہ بات آپ کی نبوت کے شروع شروع کی ہے ایک دن آپ نے فرمایا کیا مجھ سے کشتی لڑتے ہو میں نے کہا اچھا کیا آپ سے؟ آپ نے فرمایا جی ہاں مجھ سے۔ میں بولا اچھا کیا دو گے آپ نے فرمایا جو جیتے اس کی ایک بکری۔ میں نے آپ سے کشتی کی آپ نے مجھے زیر کر دیا اور مجھ سے ایک بکری لے لی۔ پھر مجھ سے فرمایا کیا دوبارہ پھر کشتی لڑو گے۔ میں بولا بہت اچھا میں نے پھر آپ سے کشتی کی۔ آپ نے پھر مجھ کو زیر کر دیا اور ایک بکری مجھ سے اور لے لی۔ اس مرتبہ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا کہیں مجھ کو پچھڑتے ہوئے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ آپ نے فرمایا کیا دیکھ رہے ہو۔ میں نے کہا یہ دیکھ رہا ہوں کہ مجھ کو کہیں کوئی اور بکری چرانے والا دیکھ نہ رہا ہو اور میرے مقابلہ کی اس کو بھی ہمت ہو جائے کیونکہ میں سب سے زوردار آدمی مشہور ہوں۔ آپ نے فرمایا اچھا تیسری بار پھر لڑتے ہو اور جیتو گے تو ایک بکری ملے گی میں بولا بہت اچھا میں نے پھر کشتی کی اور آپ نے پھر مجھ کو زیر کر دیا، اب تو میں غمگین ہو کر بیٹھ گیا۔ آپ نے پوچھا غمگین کیوں ہو۔ میں نے کہا:

ان کے درمیان ہمیشہ سے چلتی رہی ہیں اور ان کے ساتھ ان کا قدیم سے تعارف رہا ہے اس لیے نبی اور ساحر کے درمیان ان کو کوئی التباس نہیں ہوا اور ان چند جملوں ہی میں جس سادگی کے ساتھ انہوں نے مجنون، ساحر اور کاہنوں کی خصوصیات ادا کر دی ہیں محض عقلی اعتبار سے ان پر بحث کرنے والے شاید طویل دفتروں میں بھی ان کو ادا نہ کر سکیں۔

۹۹۰- جب ماہر صاحب ہنر اپنے ہنر پر نازاں ہوتا ہے اور پھر جتنا اس ہنر میں اس کی فوقیت مسلّم ہوتی جاتی ہے اتنا ہی اس پر اس کا ناز بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ آخر کار مثل مشہور کے مطابق ہمچو ما دیگرے نیست اس کے دماغ میں اپنی یکتائی کا غرور پیدا

إِلَى عَبْدِ يَزِيْدَ وَقَدْ أَخْطَيْتُ ثَلَاثًا مِنْ غَنَمِهِ وَالثَّانِيَةُ إِنِّي كُنْتُ أَظُنُّ أَنِّي أَشَدُّ قُرَيْشٍ فَقَالَ هَلْ لَكَ فِي الرَّابِعَةِ فَقُلْتُ بَعْدَ ثَلَاثٍ فَقَالَ أَمَّا قَوْلُكَ فِي الْغَنَمِ فَإِنِّي أَرُدُّهَا عَلَيْكَ فَرَدَّهَا عَلَيَّ فَلَمْ يَلْبَثْ أَنْ ظَهَرَ أَمْرُهُ فَأَتَيْتُهُ فَأَسْلَمْتُ فَكَانَ مِمَّا هَدَانِي اللهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنِّي عَلِمْتُ أَنَّهُ لَمْ يَصْرَعْنِي يَوْمَئِذٍ بِقُوَّتِهِ وَلَمْ يَصْرَعْنِي يَوْمَئِذٍ إِلَّا بِقُوَّةِ غَيْرِهِ. رواہ البیہقی وقد اخرجه من طریق ابن اسحاق عن ابیه وابی امامة ایضا واخرجه ابو نعیم ایضا کذا فی الخصائص ص۱۶۹ ج ۱

قال ابن کثیر اخرجه ابو داؤد والترمذی ثم اخرجه من روایة ابی بکر الشافعی عن ابن عباسؓ بنحوه وقال اسناده جید۔ البدایة والنهایة ص۱۰۳ ج ۳۔

۹۹۱۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ سَلَمَةَ قَالَ كُنَّا بِمَاءٍ مَمَرَّ النَّاسِ يَمُرُّ بِنَا الرُّكْبَانُ نَسْأَلُهُمْ مَا لِلنَّاسِ مَا هٰذَا الرَّجُلُ فَيَقُولُونَ إِنَّ اللهَ أَرْسَلَهُ أَوْحَى إِلَيْهِ أَوْحَى إِلَيْهِ كَذَا فَكُنْتُ أَحْفَظُ ذٰلِكَ الْكَلَامَ

سب سے پہلے تو اس بات پر کہ جب میں عبد یزید کی بکریاں لے کر واپس ہونگا تو ان میں تین بکریاں جو میں آپ کو دے چکا ہوں (وہ کم ہونگی) دوسری بات یہ ہے کہ مجھ کو یہ بڑا گھمنڈ تھا کہ قریش میں سب سے زیادہ مضبوط آدمی میں ہوں (مگر آج اس کے خلاف نکلا) آپ نے فرمایا اچھا چوتھی بار پھر کشتی کرتے ہو؟ میں نے کہا کیا اب تین بار پٹ جانے کے بعد بھی؟ آپ نے فرمایا اچھا لو بکریوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ میں تم کو سب واپس کیے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے وہ سب واپس کر دیں پھر اس کے متصل ہی آپ کی نبوت کا شہرہ ہو گیا اُس وقت میں آپ کی خدمت میں آیا اور مشرف باسلام ہو گیا۔ اور میرے اسلام کا باعث یہی بات تھی کہ میں یقین کر چکا تھا کہ آپ نے مجھ کو اپنی طاقت سے زیر نہیں کیا بلکہ ضرور کسی اور دوسری (الٰہی) طاقت سے زیر کیا ہے۔ (بیہقی وغیرہ)

۹۹۱۔ عمرو بن سلمہ کہتے ہیں۔ ہم ایک ایسے پانی پر ٹھہرے ہوئے تھے جو لوگوں کی گزرگاہ پر واقع تھا ان کے قافلے ہماری طرف سے گزرتے تو ہم ان سے دریافت حال کے لیے پوچھا کرتے کہو لوگوں کا اب کیا رنگ ہے اور اس شخص کی کیا خیر خبر ہے۔ لوگ کہتے اُن کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے وہ اُن پر وحی نازل فرماتا ہے

ہو جاتا ہے اب سوچیے کہ جس ماحول میں تعلیم و تعلم کا حرف نہ ہو کسی کو متاثر کرنے کے لیے کیا اس سے زیادہ بھی کوئی اور بات مؤثر ہو سکتی تھی اسی لیے اس کے قلب پر اس کا سکہ اس طرح جم چکا تھا کہ آپ کے دعوئ نبوت کی شہرت کے بعد اس کے دل پر یہی چوٹ اس کے زخم دل کا مرہم بن گئی۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اس تمام معاملے سے آپ کا اصل مقصد کیا تھا اور جب آپ نے سب سے پہلے اس کی بکریاں اس کے حوالہ کر دیں تو یہ بات پورے طور پر صاف ہو گئی کہ اس ہار جیت کا راز کچھ اور ہی تھا نہ آپ کو اپنی طاقت کا اظہار مقصود تھا اور نہ چند بکریوں کے حاصل کرنے کی طرف کوئی توجہ تھی۔ اس قصہ سے عرب کی بلند فطرت کا بھی اندازہ لگانا چاہیے کہ رکانہ کو سب سے زیادہ غم یہ تھا کہ مالک کو اس کی بکریوں کی بابت اپنی اس خیانت کا جواب کیا دونگا یہ قصہ حضرت عباسؓ سے باسناد جید بھی مروی ہے اس میں اس طرح ہے کہ جب تین بار وہ زیر ہو گیا تو اس نے فوراً آپ کی نبوت کا یقین کر لیا تھا۔ علماء نے آنحضرتؐ کی مصارعت کے چند واقعات اور بھی نقل کیے ہیں۔ ابو رکانہ، ابو الاسود جمحی جیسا کہ سہیلی اور بیہقی اور ابو داؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے (حاشیہ شفا ص۶۹)

فَكَأَنَّمَا يُغْرٰى فِيْ صَدْرِيْ وَكَانَتِ الْعَرَبُ تَلَوَّمُ بِإِسْلَامِهِمُ الْفَتْحَ فَيَقُوْلُوْنَ اُتْرُكُوْهُ وَقَوْمَهٗ فَإِنَّهٗ إِنْ ظَهَرَ عَلَيْهِمْ فَهُوَ نَبِيٌّ صَادِقٌ فَلَمَّا كَانَتْ وَقْعَةُ الْفَتْحِ بَادَرَ كُلُّ قَوْمٍ بِإِسْلَامِهِمْ وَبَدَرَ أَبِيْ قَوْمِيْ بِإِسْلَامِهِمْ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ جِئْتُكُمْ وَاللّٰهِ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ حَقًّا فَقَالَ صَلُّوْا صَلٰوةَ كَذَا فِيْ حِيْنِ كَذَا وَصَلٰوةَ كَذَا فِيْ حِيْنِ كَذَا فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ فَلْيُؤَذِّنْ أَحَدُكُمْ فَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْثَرُكُمْ قُرْاٰنًا فَنَظَرُوْا فَلَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَكْثَرَ قُرْاٰنًا مِنِّيْ لِمَا كُنْتُ أَتَلَقّٰى مِنَ الرُّكْبَانِ فَقَدَّمُوْنِيْ بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَأَنَا ابْنُ سِتٍّ أَوْ سَبْعِ سِنِيْنَ وَكَانَتْ عَلَيَّ بُرْدَةٌ كُنْتُ إِذَا سَجَدْتُ تَقَلَّصَتْ عَنِّيْ فَقَالَتِ امْرَأَةٌ مِنَ الْحَيِّ أَلَا تُغَطُّوْنَ عَنَّا

چنانچہ اب ان پر یہ آیتیں تازہ اتری ہیں۔ میں ان آیتوں کو سُنتا اور جھٹ سے یاد کر لیتا۔ اور وہ مجھ کو اس طرح یاد ہو جاتیں جیسے میرے سینہ میں نقش ہو گئی ہیں۔ ادھر عرب کے لوگ اسلام قبول کرنے میں فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ کہتے تھے ابھی ان کو اور ان کی قوم کو نپٹ لینے دو اگر وہ اپنی قوم پر غالب آگئے تو بس جان لو کہ وہ سچے نبی ہیں۔ جب یوں ہوا کہ مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو اب مسلمان ہونے کے لیے لوگ دوڑ پڑے۔ میرے والد اپنی قوم سے پہلے لپک کر مشرف باسلام ہو گئے اور اپنی قوم سے آکر کہا بخدا میں تمہارے پاس ایک سچے نبی کے دربار سے آرہا ہوں اُن کا حکم یہ ہے کہ فلاں نماز اس وقت میں اور فلاں اس وقت میں پڑھا کرو اور جب نماز کا وقت آجائے تم میں سے کسی کو اذان دینی چاہیے اس کے بعد پھر جس کو سب سے زیادہ قرآن محفوظ ہو اس کو امام بننا چاہیے۔ چونکہ اُن میں مجھ سے زیادہ قرآن کسی اور شخص کو یاد نہ تھا اور اس کا سبب یہی تھا کہ میں پہلے سے قافلہ والوں سے سُن کر قرآن شریف یاد کر لیا کرتا تھا اس لیے اُنہوں نے مجھ کو ہی اپنے آگے بڑھا دیا۔ اس وقت میری عمر کل چھ سات سال کی ہو گی اور میرے جسم پر اس وقت صرف ایک مختصر سی چادر تھی۔ جب سجدہ کرتا تو پیچھے کی جانب سے سکڑ کر جسم کے اوپر کے حصہ پر آجاتی۔ ہماری قوم کی

۹۹۱۔ غیر تعلیم یافتہ اشخاص اکثر بھیڑ چال ہوا کرتے ہیں۔ ان کا معیار تصدیق بھی کیا۔ اس لیے عرب کے عام لوگوں نے اپنے نزدیک آپ کی نبوت کے لیے یہی ایک معیار بنا رکھا تھا کہ اگر آپ اپنی قوم پر غالب آگئے تو بس یہی آپ کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہو گی۔ اس کے برخلاف آپ شاہ روم کا حال پڑھ چکے ہیں وہ جب یہ سنتا ہے کہ آپ کو اپنی قوم پر کبھی فتح ہوتی ہے اور کبھی شکست تو وہ اس کے برعکس آپ کی شکست ہی کو حقانیت کی دلیل قرار دیتا ہے۔
یہاں عمرو بن سلمہ کا گو بچپن ہی میں خصوصی میں امام ہونا ثابت ہوتا ہے مگر اسی کے ساتھ انہی کے بیان سے اُس کی وجہ بھی ظاہر ہو چکی ہے کہ اسلام کے بعد یہ ایک ابتدائی واقعہ تھا تفصیلی مسائل رفتہ رفتہ ہی سیکھے جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے جب یہ سُنا کہ جس کو قرآن شریف کا زیادہ حصہ یاد ہو امامت حق اسی کا ہے اور یہاں پہنچ کر جب دیکھا تو اس معیار پر عمرو بن سلمہ ہی کو اترتے دیکھا اس لیے ان کے لیے لازم ہو گیا کہ ان کو ہی اپنا امام مقرر کریں۔ حدیثوں میں اس طرح کے بہت سے واقعات ملتے ہیں جو ابتدائی حالات میں صرف اجمالی تعلیم کے تحت ہو گئے۔ پھر بعد میں تفصیلی ہدایات کے مطابق ان کو ادا

اِسْتَقَارِئِكُمْ فَاشْتَرَوْا لِيْ قَمِيْصًا فَمَا فَرِحْتُ بِشَيْءٍ فَرَحِيْ بِذٰلِكَ الْقَمِيْصِ. رواہ البخاری

۹۹۲ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَنَمًا بَيْنَ جَبَلَيْنِ فَاَعْطَاهُ اِيَّاهُ فَاَتٰى قَوْمَهٗ فَقَالَ اَيْ قَوْمِ اَسْلِمُوْا فَوَاللّٰهِ اِنَّ مُحَمَّدًا لَيُعْطِيْ عَطَاءً مَا يَخَافُ الْفَقْرَ. رواہ مسلم وراجع ترجمان السنہ ص ۱۶۷ ج ۲۔

ایک عورت یہ دیکھ کر بولی اپنے قاری صاحب کے سرین تو ذرا ہمارے سامنے سے ڈھانک لیا کرو۔ یہ سن کر لوگوں نے میرے لیے ایک قمیص خریدلی مجھے اس وقت اس قمیص سے اتنی خوشی حاصل ہوئی کہ کسی چیز سے نہ ہوئی تھی۔

(بخاری شریف)

۹۹۲۔ انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ سب بکریاں مانگیں جو اس وقت دو پہاڑوں کے درمیان چررہی تھیں آپ نے اس کو وہ سب کی سب دیدیں (یہ دیکھ کر) وہ اپنی قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا اے میری قوم بس اسلام قبول کرلو خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے سخی اور عالی ہمت شخص ہیں کہ بے دریغ مال لٹاتے ہیں اور فقر کا ذرا خطرہ نہیں رکھتے۔ (مسلم شریف)

یہ قصہ اسی کے قریب قریب الفاظ کے ساتھ ترجمان السنہ ص ۱۶۷ ج ۲ پر گزر چکا ہے۔

کیا گیا۔ دیکھیے کہ اس امام کے پاس اتنی چادر بھی نہ تھی جو جسم کے مختلف حرکات کے ساتھ ساتھ اس کے ستر کی حفاظت کرسکتی مگر یہ بھی ایک بات تھی جو ابتداء میں ہوگئی پھر جب ستر کے مسائل معلوم ہوگئے تو آئندہ انہی کی روشنی میں امت کا عمل بھی ہوتا رہا فقہی تفصیلات کا محل نہیں ہے۔

۹۹۲۔ ہر شخص کے فہم میں بلند انسانیت کا ایک جدا معیار ہوتا ہے کسی کے مزاج پر عالی ہمتی اور سخاوت کا اثر پڑتا ہے تو کسی کے مزاج پر ضبط و تحمل کا اثر ہوتا ہے ترجمان ص ۲۳۴ میں آپ حضرت علیؓ کی ایک روایت پڑھ چکے ہیں جس میں ایک یہودی نے اپنے قرض کے تقاضے میں آپ کے ساتھ ناروا درشتی سے کام لیا تھا لیکن اس پر بھی جب اس نے دیکھا کہ آپ کے ضبط و تحمل میں ذرا فرق نہیں آتا، تو بول اٹھا کہ میرا مقصد آپ کو ایذا رسانی نہ تھا بلکہ صرف آپ کے تحمل کا امتحان کرنا تھا اور جب اس نے اپنے معیار کے مطابق آپ کے بے پناہ تحمل کا تجربہ کرلیا تو دوسری ساعت ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔ اسی طرح کسی کا معیار اس درجہ گرا ہوا تھا کہ اس میں دشمنی کی حقیقت کے سوا فہم کی ذرا سی بھی نہیں آتی جیسا بعض یہود نے آپ کو کھانے میں زہر دیدیا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی اطلاع دیدی تو آپ کے استفسار پر ان کو اس کا اقرار کرنا پڑا اور انہوں نے کہا ہمارا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ سچے رسول ہوںگے تو زہر بھلا آپ کا کیا بگاڑ سکیگا ورنہ آپ سے ہماری جان چھوٹ جائیگی اس بیجا کجروی کا بھی کوئی علاج ہے۔ کسی کی طبیعت پر اعجوبہ پرستی غالب ہوتی ہے تو وہ ایسی ہی بات رسول کی ذات میں دیکھنی چاہتا ہے جو اس کے نزدیک کسی انسان سے ممکن نہ ہو خواہ اس بات کا کرنا نبی کے لیے لازم ہو یا نہ ہو۔ مثلاً ایک اعرابی آیا اس کی اعجوبہ پسند فطرت کی رغبت اس طرف معلوم ہوئی کہ کھجور کا ایک خوشہ یا کیکر کا درخت آکر آپ کی نبوت کی شہادت دے یہاں ترجمان السنہ از ص ۱۵۳ تا ص ۱۶۶ ج ۲ اور حدیث ۳۴۴ ص ۱۶۰ ج ۲ کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ ہاں کوئی ایسا بھی نکل آتا ہے جس کو دلائل پر غور و خوض کے بغیر ایک ہی نظر میں کھرا کھوٹا صاف نظر آجاتا ہے جیسا کہ عبداللہ بن سلام جب مدینہ گئے، بس آپ کے رخ انور پر نظر پڑی اور بے ساختہ بول اٹھے یہ چہرہ تو کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔ دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۶۹ ج ۲۔ کسی کی فطرت میں اپنا ذاتی کوئی کمال ہوتا ہے اور وہ اپنی موٹی عقل کے مطابق اسی کو معیار بنالیتا ہے کہ جو اس کمال میں اس کو شکست دیدے بس یہی اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔ جیسا رکانہ پہلوان کا واقعہ ابھی آپ نے پڑھا۔ یہاں اب یہ بحث کرنی کہ نبوت کے لیے یہ معیار بھی کوئی معیار بن سکتا ہے یا نہیں۔ مخاطب کی فطرت پر قبل از وقت ایسا بار ڈالنا ہے جس کو وہ اس حالت میں اٹھا نہیں سکتا اس لیے رحمت (باقی برص ۲۳)

۹۹۳- عَنْ اَبِیْ جُرَیٍّ جَابِرِ بْنِ سُلَیْمٍ قَالَ اَتَیْتُ الْمَدِیْنَۃَ فَرَاَیْتُ رَجُلًا یَصْدُرُ النَّاسُ عَنْ رَاْیِہٖ لَا یَقُوْلُ شَیْئًا اِلَّا صَدَرُوْا عَنْہُ قُلْتُ مَنْ ھٰذَا قَالُوْا رَسُوْلُ اللّٰہِ قَالَ قُلْتُ عَلَیْکَ السَّلَامُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَرَّتَیْنِ قَالَ لَا تَقُلْ عَلَیْکَ السَّلَامُ عَلَیْکَ السَّلَامُ تَحِیَّۃُ الْمَیِّتِ قُلِ السَّلَامُ عَلَیْکَ قُلْتُ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ فَقَالَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ الَّذِیْ اِنْ اَصَابَکَ ضُرٌّ فَدَعَوْتَہٗ کَشَفَہٗ

۹۹۳- جابر بن سُلیم بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو یہاں میں نے ایک شخص دیکھے جن کی ہر بات لوگ غور سے سنتے اور جو بات بھی وہ فرما دیتے بس لوگ اسی کو قبول کر لیتے تھے میں نے پوچھا یہ کون صاحب ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ میں نے یہ سُن کر آپ کو دو بار سلام کیا (اور یوں کہا) علیک السلام یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا علیک السلام علیک السلام مت کہا کرو۔ یہ طریقہ (زندوں کے سلام کرنے کا نہیں یہ تو) مُردوں کو سلام کرنے کا ہے۔ لہٰذا السلام علیک کہا کرو میں نے عرض کی آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا میں اسی خدا کا رسول ہوں جو اگر تم کو کوئی تکلیف ہو اور تم اُس سے دعا مانگو

(بقیہ متعلقہ ۹۹۲) جس کے لیے سبقت کر چکی ہے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ گوارا کر لیا جاتا ہے اور ان کی ہر معقول اور نامعقول ضد کو پورا کر کے ان کو آغوشِ اسلام میں زبردستی کھینچ لیا جاتا ہے

۹۹۳- آپ کی اس ایک ہی گفتگو میں الٰہیات، معاشیات اور معیشت کے جتنے شعبے تھے سب کے متعلق ایک ایسی مختصر فہرست بیان میں آگئی ہے کہ اگر آپ کی یہی ایک گفتگو سامنے رکھ کر اس پر غور کیا جائے تو ایک اُمّی زبان سے نکلے ہوئے یہ بیش قیمت علوم ہی آپ کی نبوت کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔ آپ حدیث کے الفاظ پر ایک بار پھر غور کر کے نظر ڈالیں اور اپنے دماغ میں خود ان کو پھیلائیں کہ آپ نے ان مختصر جملوں میں کس طرح خدا تعالیٰ کی اُن صفات کا تذکرہ فرمایا ہے جو عرب کی فطرت پر خدا تعالیٰ کی ذات کے تعارف کے لیے سب سے زیادہ اثر انداز ہو سکتی تھیں اس کے بعد آدابِ سلام، آدابِ گفتگو، آدابِ لباس اور علم الاخلاق کے کتنے اہم اسباق کی طرف اشارات فرمائے ہیں۔

جابر بن سلیمؓ کی فطرت کو جس امر نے یہاں سب سے پہلے بیدار کیا تھا وہ آپ کی محفل کا نقشہ تھا، اور درحقیقت رسولوں کی صداقت کی ایک دلیل یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کی محفل مادیت کے ساز و سامان سے یکسر خالی ہونے کے باوجود اتنی جاذبیت رکھتی ہے کہ سعید نفوس اس کو ایک نظر دیکھتے ہی ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ عالم میں قدرت نے انسانوں کے مختلف طبقات پیدا فرمائے ہیں ان میں بادشاہ بھی ہیں اور گدا بھی، عالم دقیق النظر بھی ہیں اور ان پڑھ نادان بھی، سلیم الفطرت بھی ہیں اور درشت فطرت بھی لیکن جس کو اللہ تعالیٰ نے بلا تفریق شاہ و گدا اور عالم و جاہل سب ہی کے لیے رسول بنا کر بھیجا تھا، اس کی ذات میں ہر طبقے کی تصدیق کے لیے قابلِ اطمینان اور تشفی بخش دلائل سب ہی جمع کر دیے گئے۔ آپ نے ان اوراق میں ہر طبقہ کا بیان نمونۃً پڑھا ہے۔ بادشاہوں نے اپنے شاہانہ مزاج کے موافق آپ کو جانچا، علماء و اہلِ کتاب نے اپنی کتابوں کے بیان کردہ نقشوں سے بلا بلا کر آپ کو دیکھا راہبوں نے اپنی فطری رہبانیت سے آپ کی طرف نظر کی قیافہ شناسوں نے اپنے قیافے دوڑائے، کاہنوں نے اپنے علوم کے سب زور صرف کر ڈالے اور سخن شناسوں نے آپ کے قرآن کو اپنے مذاق پر خوب تولا مگر ہر طبقے کے منصف مزاج جس نتیجہ پر پہنچے وہ صرف ایک ہی بات تھی کہ آپ بے شبہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

بہار عالم حسنش جہاں را تازہ می دارد بہ رنگ اصحاب صورت را بہ بو ارباب معنی را

عَنْكَ وَاِنْ اَصَابَكَ عَامُ سَنَةٍ فَدَعَوْتَهُ اَنْبَتَهَا لَكَ وَاِذَا كُنْتَ بِاَرْضٍ قَفْرٍ اَوْ فَلَاةٍ فَضَلَّتْ رَاحِلَتُكَ فَدَعَوْتَهُ رَدَّهَا عَلَيْكَ قُلْتُ اِعْهَدْ اِلَيَّ قَالَ لَا تَسُبَّنَّ اَحَدًا قَالَ فَمَا سَبَبْتُ بَعْدَهُ حُرًّا وَلَا عَبْدًا وَلَا بَعِيْرًا وَلَا شَاةً قَالَ وَلَا تَحْقِرَنَّ شَيْئًا مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَاَنْ تُكَلِّمَ اَخَاكَ وَاَنْتَ مُنْبَسِطٌ اِلَيْهِ وَجْهُكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنَ الْمَعْرُوْفِ وَارْفَعْ اِزَارَكَ اِلٰى نِصْفِ السَّاقِ فَاِنْ اَبَيْتَ فَاِلَى الْكَعْبَيْنِ

تو وہ اس کو دور فرما دے اور اگر تم قحط سالی میں مبتلا ہو اور اس سے دعا مانگو تو وہ تمہارے واسطے اس کو سبزہ زار کر دے اور اگر تم کسی بیابان جنگل میں ہو اور تمہاری سواری گم ہو جائے پھر تم اُس سے دعاء مانگو تو وہ تمہاری سواری تم کو عطا فرما دے۔ میں نے عرض کی اچھا تو مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا دیکھو! کسی کو بُرا بھلا نہ کہنا۔ یہ کہتے ہیں آپ کے اس فرمان کے بعد میں نے نہ تو کسی آزاد انسان کو بُرا کہا اور نہ غلام کو بلکہ کسی بکری اور اونٹ کو بھی بُرا لفظ نہیں کہا۔ آپ نے فرمایا اور دیکھنا! کسی اچھی بات کو ہرگز حقیر مت سمجھنا اور اپنے مسلمان بھائی سے کشادہ روئی سے گفتگو کرنا کیونکہ یہ بھی ایک نیک کام ہے۔ اور دیکھنا! ٹخنوں سے کپڑا نیچے لٹکانے سے بہت احتراز کرنا کیونکہ یہ خصلت تکبر کی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تکبر بہت ناپسند ہے اور اگر

حیرت ہے کہ ان میں سے کسی ایک طبقہ کا ہم کو یہ بیان نہیں ملا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو بزور شمشیر بھی مسلمان بنایا تھا۔ پھر معلوم نہیں کہ متاخر مفکرین نے اسلام میں جہاد کے مسئلہ کو ایک ہوا کیوں سمجھ رکھا ہے۔ جہاد خواہ جارحانہ ہو یا مدافعانہ لیکن اس کا مقصد اِشاعت اسلام سمجھنا ہی محل بحث ہے۔ فرض کر لیجیے کہ اگر اسلام میں جہاد جارحانہ بھی ہوا ہے تو کیا یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد زبردستی مسلمان بنانا تھا۔ اگر یہی مقصد ہوتا تو قانونِ اسلام میں جزیہ کی ایک مستقل دفعہ کیوں رکھی جاتی۔ بہرحال آج مخالفین اسلام کچھ بھی کہیں لیکن جن لوگوں کے سروں پر اسلام کی تلوار چمکی اور جن کے خاندان کے خون بہے ان میں مشرف باسلام ہونے والے بھی ہیں اور اپنے کفر پر قائم رہنے والے بھی مگر کوئی یہ بیان نہیں کرتا کہ اسلام نے یہ جہاد ان کو جبراً مسلمان بنانے کے لیے کیا تھا۔ یہ موضوع اس وقت ہمارا نہیں ہے۔ ہمیں تو یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ان جملہ طبقات کا یہ نتاب کھانا اسی وقت تک ثابت ہوتا ہے جب تک کہ انہوں نے آپ کو منصفانہ نظر سے نہیں دیکھا لیکن جس ساعت بھی تقدیر نے یہ موقعہ ان کو دے دیا تو پھر وہ اہل کتاب تھے یا مشرکین مکہ کسی کو آپ کی نبوت میں تردد نہیں ہوا اور کیسے ہو سکتا تھا جبکہ دنیا میں خدا تعالیٰ کے دو چار رسول تو نہیں آئے تھے بلکہ اتنی بڑی تعداد آ چکی تھی کہ ان کے حالات زندگی مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک ان کو پہچاننا سب سے واضح مسئلہ بن گیا تھا۔ مشرکین عرب گو رسولوں سے آشنا نہ تھے مگر دعویٰ ان کا بھی یہی تھا کہ ہم ملت حنیفیہ رکھتے ہیں اور اپنی جبلی جہالت پر اتنے معقول پسند وہ بھی تھے کہ اس بارے میں اہل کتاب کی رائے اپنی رائے پر مقدم سمجھتے تھے اور یہ اسی بنیاد پر کہ ان کے نزدیک اہل فن کی رائے کے مطابق نبیوں کو پہچاننا یہ ان کا ہی فن تھا مگر یہ وسوسہ ان کو بھی نہیں گزرا کہ نبوہ کی حقیقت صفراء کے مرض یا خواب سے کچھ ملتی جلتی ہے۔ یہ بحث ان ہی کے دماغ میں پیدا ہوئی جن کو انبیاء کی تاریخ کے مطالعہ کا کوئی موقع نہیں ملا بلکہ انہوں نے محض عقلی طور پر اس مسئلہ کو سامنے رکھا اور صرف عقل کی روشنی میں اس کو حل کرنے کی کوشش کی حالانکہ وجدانیات وحسیات اور مشاہدات بلکہ جملہ محسوسات کا تعلق جتنا کہ ذوق صحیح کے ساتھ ہے اتنا دلائل کے ساتھ نہیں۔ آخر عبد اللہ بن سلام اپنی یہودیت کے زمانہ میں آپ کے چہرہ پر نظر کرتے ہی بیساختہ کس دلیل سے بول اُٹھے کہ "ہذا الوجہ لیس بوجہ کذاب" دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۶۱ ج ۲ یہ چہرہ تو جھوٹے کا چہرہ نہیں۔

وَاِيَّاكَ وَاِسْبَالَ الْاِزَارِ فَاِنَّهَا مِنَ الْمَخِيْلَةِ وَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمَخِيْلَةَ وَاِنِ امْرُءٌ شَتَمَكَ وَعَيَّرَكَ بِمَا يَعْلَمُ فِيْكَ فَلَا تُعَيِّرْهُ بِمَا تَعْلَمُ فِيْهِ فَاِنَّمَا وَبَالُ ذٰلِكَ عَلَيْهِ رواه ابو داؤد وروى الترمذى منه حديث السلام وفى رواية فيكون لك اجر ذلك ووباله عليه

الانبياء عليهم السلام بينهم اخوة النبوة يعظم اولهم اخرهم و اخرهم اولهم ولا يوجد بينهم اختلاف

۹۹۴ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوْلَى النَّاسِ

بالفرض کوئی شخص تم کو برا بھلا کہے اور تم کو ایسے عیب کی عار دلائے جو تمہارے اندر موجود ہو تو تم یہ حرکت مت کرنا کہ جو عیب تم اس میں دیکھو تم بھی اس کو اس کی عار دلانے لگو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں تو اس کا ثواب ملیگا اور اس کی اس حرکت کا وبال اُسی پر پڑیگا۔ ابوداؤد

انبیاء علیہم السّلام میں وہ اخوت نبوت ہوتی ہے کہ ان میں ہر ایک دوسرے کے لیے ہمہ تن احترام ہوتا ہے اور اُن میں کہیں اختلاف کا نام ونشان نہیں ملتا

۹۹۴۔ ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں

ہمارے دور میں نبی کی بلند شخصیت سامنے رہی نہیں، اور اس پر حسرت یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی تاریخ کا مطالعہ بھی نہیں، جو کچھ مطالعہ ہے بھی تو وہ صرف یا تو عیسائی نقطۂ نظر سے ہے اور یا عیسائی مزاج مصنفین کی مولفات سے یا اس سے اور آگے بڑھے تو کمیونسٹ نظریہ سے پھر نبوت ورسالت کا مسئلہ سمجھ میں آئے تو کیونکر آئے۔

۹۹۴۔ دنیا میں اخوت کی مختلف قسمیں ہیں انسانی اخوت، ملک ووطن کی اخوۃ، کسی حرفہ وپیشہ کی اخوت، نسلی اخوت نسبی اخوت اور عرب میں تو ان کے علاوہ ایک اور اخوت کا بھی رواج تھا جو باہم معاہدہ سے پیدا ہو جاتی تھی ان کے عرف میں اس کا نام مواخات تھا ہمارے لفظوں میں اس کو منہ بولا بھائی کہنا چاہیے مگر اس کے حقوق ان کے ہاں مثل نسبی اخوت کے سمجھے جاتے تھے۔ ان تمام اخوتوں کا حاصل درجہ بدرجہ انس ومحبت اور تعاون وتناصر ہے۔ ایک مشرق کے باشندہ کو اگر مغرب کے باشندہ کی مصیبت پر کسی درجہ کا غم ہوتا ہے تو کیوں؟ صرف اسی انسانی اخوت کی بناء پر اس سے بڑھ کر وطنی اخوت ہے۔ جب کبھی دو غیر متعارف انسانوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی ملک ووطن کے باشندے ہیں تو یہ سنتے ہی ان کے دلوں میں محبت وانس کے جذبات فوراً اُمنڈنے لگتے ہیں۔ نسل ونسب کی اخوت اس سے بھی بالاتر ہے، اس کے مقابلہ میں تمام اخوتیں ماند پڑ جاتی ہیں، یہاں ایک انسان بعض مرتبہ حق وناحق کی بحث سے بھی علیحدہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ تمام اخوتیں ذرا ذرا سے عوارض سے بہت جلد ختم بھی ہو جاتی ہیں اور معمولی معمولی باتوں کے حسد ورقابت کے جذبات سے تبدیل ہو جاتی ہے جس کی شہادت کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی سرگزشت کافی ہے، لیکن ان سب اخوتوں سے الگ ایک اخوت اور بھی ہے جو خاص انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں نظر آتی ہے جس کا نام اخوت نبوت ہے، یہ تمام اخوتوں سے بالاتر اخوت ہے یہاں کسی حالت میں بھی نہ دے اختلاف

بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِي الْأُوْلٰى وَالْآخِرَةِ اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ مِّنْ عَلَّاتٍ وَاُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَ

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ساتھ سب سے قریب تر میں ہوں۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سب انبیاء علیہم السلام باہم علاتی (سوتیلے) بھائیوں کی طرح ہوتے ہیں جن کا والد ایک ہوتا ہے اور مائیں مختلف

کی گنجائش نہیں ہو سکتی ان میں محبت و انس کے وہ جذبات نظر آتے ہیں کہ اگر بڑے اور چھوٹے کا تفاوت معلوم نہ ہو تو یہ محسوس کرنا ہی مشکل ہو کہ ان میں باہم ایک دوسرے پر کسی کو فوقیت بھی ہے یا نہیں، ہر ایک کے جذبات دوسرے کی تعظیم و تکریم کے لیے وقف ہوتے ہیں پھر یہاں وہ روحانی تناسب موجود ہوتا ہے کہ ہر نبی کو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایسی الفت و محبت ہوتی ہے گویا کہ وہ اب اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ موجود ہیں ایک سعید لڑکا بھی کچھ وقفہ کے بعد اپنے والد کی یاد اس طرح تازہ نہیں رکھ سکتا جس طرح کہ ایک نبی دوسرے گزشتہ نبی کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے، گویا ان کے صرف قالب مختلف ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وہ سب یک جان ہوتے ہیں اسی لیے کوئی نبی دوسرے نبی کے احترام کے خلاف ایک کلمہ بھی برداشت نہیں کر سکتا بلکہ ہر نبی کی شریعت کی ایک دفعہ ہی یہ ہوتی ہے کہ جو کسی ایک نبی کا منکر ہو وہ خود اس کا بھی منکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو اپنی امتوں میں ایک ایسی اخوت پیدا فرماتے ہیں جو ان کے مابین اخوت سے مشابہ ہوتی ہے اس کا نام اخوت ایمانی ہے۔ اس اخوت کے مقابلہ میں عام انسانوں کی تمام قسم کی اخوتیں ہیچ ہو جاتی ہیں حتی کہ آپ نے فرما دیا کہ اخوت ایمانی کے بعد اب عقد مواخات کرنا اصولاً غلط ہے کیونکہ محبت و انس کے جتنے جذبات ہو سکتے ہیں وہ سب "اخوت ایمانی" میں پنہاں ہیں۔ اس لیے آئندہ اب "مواخات" کا دستور منسوخ ہو واذکروا اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا یعنی اس دور کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے انہوں نے آ کر تمہارے درمیان وہ الفت پیدا کر دی کہ تم سب بھائی بھائی بن گئے اور اب ایک دوسرے کی خاطر جان نثاری کے لیے تیار ہو گئے۔ آیت بالا میں اسی "اخوت ایمانی" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں سب مسلمانوں کو ایک عمارت سے تشبیہ دے کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح ایک مکان کی اینٹ دوسری اینٹ کے لیے باعث استحکام ہوتی ہے اسی لیے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے ہونا چاہیے۔ اب مثال کے طور پر آپ یہاں حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ملاحظہ فرمائیے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے کر آپ کو یہ خطاب فرمایا تھا فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ یعنی جیسا اولوا العزم رسول ہمیشہ صبر کرتے رہے ہیں، تم بھی اسی طرح صبر سے کام لو اور صاحب حوت (یعنی یونس علیہ السلام) کی طرح نہ بنو۔ اس طرز خطاب سے شاید خطابات ربانی سے کسی ناآشنا شخص کو ایک نبی کے حق میں کسی کوتاہی کا وہم گزر سکتا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اس کا ازالہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا "مجھ کو یونس نبی پر فضیلت مت دو" (دیکھو ترجمان السنۃ ص ۵، ۳ ج ۲)۔ مدتوں اس حدیث کی مراد سمجھ میں نہ آ سکی حتی کہ ترجمان السنۃ میں بھی اس کی وہی مراد درج کر دی گئی جو اب تک شارحین کے کلام سے سمجھی تھی۔ جب اس تیسری جلد کا وقت آیا تو اس طرف ذہن متوجہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ انبیاء علیہم السلام میں یہاں خاص حضرت یونس علیہ السلام کا نام لینا ضرور کسی حکمت پر مبنی ہو گا اسی وقت خیال قرآن کریم کی طرف گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی خاص طور پر ان ہی کا نام لے کر آپ سے کہا گیا تھا کہ تم ان کی طرح بے صبری کا کوئی قدم نہ اٹھانا سبحان اللہ اخوت نبوت بھی کتنی بلند اخوت ہوتی ہے آپ نے فوراً ان ہی کا نام لے کر فرمایا "تم مجھ کو ان پر فضیلت مت دو" امت کے جذبات اس قسم کے مواقع پر حدود سے تجاوز کر جایا کرتے ہیں اس لیے بہت اہمیت کے ساتھ ان کو

دِيْنُهُمْ وَاحِدٌ وَلَيْسَ بَيْنَنَا نَبِيٌّ . متفق عليہ

اسی طرح ان سب کا دین یعنی اصولی عقائد ایک ہوتے ہیں اور شریعتیں مختلف مختلف اور میرے اور عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے ۔ متفق علیہ

ہدایت فرمادی کہ اس خدائی طرز خطاب سے اُمت کا کوئی فرد بھی ان کے حق میں ادنیٰ سا کسر شان کا کلمہ منہ سے نہ نکلنے پائے یہ خالق کا اپنے رسول سے خطاب ہے یہاں کسی اُمتی کو مداخلت کرنا خطرناک ہے حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہؓ کے حق میں ایک موقعہ پر عمرؓ اور صدیق اکبرؓ سے جو تنبیہی حرکات صادر ہوئی تھیں کس کی مجال ہے کہ ان کی نقل آتار سکے یا اُمہات المومنین کی شانِ عالی میں نصف کلمہ بھی زبان پر لاسکے پس جب بندوں کے درمیان مراتب اور حقوق کے لحاظ سے فرق پڑتا ہے تو خالق اور مخلوق کے درمیان جتنا فرق ہونا چاہیے اس کو قیاس کر لیجیے بالخصوص جبکہ مخاطب رسول کی ذات ہو جہاں ادنیٰ سے ادنیٰ لغزش پر سخت سے سخت باز پرس ہوتی ہو۔ اس کے بعد قلب مطمئن ہو گیا اور معلوم ہوا کہ اس حدیث کو جب آیت بالا کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو یہاں کسی سوال و جواب کی ضرورت ہی نہیں رہتی یہ عقیدہ کا باب نہ تھا بلکہ اخوت نبوت کا کرشمہ تھا ۔اسی قسم کا دوسرا واقعہ ترجمان السنہ ص ۴۷ ج ۲ میں گزر چکا ہے وہاں بھی تھیک اسی کے انداز میں آپ نے فرمایا تھا تم لوگ مجھ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت مت دو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دنیا سے کچھ عرصہ کے لیے رخصت ہو رہے تھے تو اس وقت اپنی امت کے سامنے تسلی کے جو کلمات انہوں نے فرمائے تھے وہ حسب بیان انجیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی عظمت شان ظاہر کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ماضی اور آئندہ آنے والے رسولوں کا اس درجہ احترام انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کہیں نہیں ملتا یہاں ایک لاکھ سے زیادہ کی بڑی جماعت سب میں یہی صفت نظر آتی ہے ۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح خود ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہوتا اسی طرح ان کے اصولی علوم میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوتا فروع اور جزئیات میں گو یہاں بھی اختلاف ہو جاتا ہے مگر ایک شریعت نے دوسری شریعت کی کبھی تکذیب و تغلیط نہیں کی بلکہ ہمیشہ پہلی شریعت کا پورا پورا احترام محفوظ رکھا ہے ۔ ہاں اتنا ضرور کہہ دیا ہے کہ بعض احکام وقتی ہوتے ہیں اور وہ کسی خاص دور کے ساتھ مخصوص بھی ہو سکتے ہیں اس لیے مثلاً فلاں فلاں احکام جو گزشتہ دور کے مناسب تھے اب جدید آئین سے خارج کیے جاتے ہیں اور فلاں فلاں احکام کا جدید اضافہ کیا جاتا ہے ۔ اس تغیر و تبدل کو تغلیط نہیں کہا جا سکتا اس کا نام نسخ ہے۔ یہ رسول کا اپنا فعل ہی نہیں ہوتا یہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے ۔ وہ جو احکام چاہتا ہے نسخ فرما دیتا ہے اور جو چاہتا ہے جدید احکامات نازل فرما دیتا ہے ، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ رسولوں کے علوم میں مطلقاً کوئی اختلاف نہیں ہوتا نہ اصول میں اور نہ فروع میں ۔ اسی کے ساتھ اگر اس پر بھی غور کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کے علوم میں الٰہیات ، اور عالم غیب کا ایک بڑا باب ایسا بھی ہوتا ہے جس میں عقل انسانی قطعاً ماندہ اور عاجز ہے اس کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مسعود تک اس میں کہیں ایک نقطہ کا اختلاف نہیں ملتا تو اس سے بداہۃً یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم کا سرچشمہ یقیناً ایک ہی تھا اور یقیناً یہاں جو حضرت آدم علیہ السلام کا معلم تھا وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی معلم تھا یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانے ، ان کی زبانیں اور ان کے بعثت کے مقامات گو کتنے ہی مختلف تھے مگر علوم میں ایک شوشہ کا کہیں اختلاف نہ تھا۔ ان عمیق مسائل پر اگر صرف چند عقل غور کیا جائے تو کیا اتنے کثیر التعداد انسانوں میں جو عالم کے اتنے مختلف خطوں میں اتنے مختلف مختلف زمانوں میں ظاہر ہوئے ہوں اتنا اتحاد عقلاً ممکن ہے؟! پھر خود ان کے درمیان اتنی محبت ، اتنی ایک دوسرے کی عظمت اور ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط نظر آسکتا ہے جس کی مثال دو حقیقی بھائیوں میں بھی نہ مل سکے۔

(باقی بر صفحہ ۲۲۵)

۹۹۵ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ عِفْرِیْتًا مِنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ عَلَیَّ الْبَارِحَۃَ اَوْ کَلِمَۃً نَحْوَھَا لِیَقْطَعَ عَلَیَّ الصَّلٰوۃَ فَاَمْکَنَنِیَ اللّٰہُ مِنْہُ وَاَرَدْتُّ اَنْ اَرْبِطَہٗ

۹۹۵- ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا آج کی شب ایک سرکش جن میری ایذا رسانی کے لیے چھوٹ نکلا تھا تاکہ کسی طرح میری نماز قطع کرا دے مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر مجھ کو قدرت عنایت فرما دی، اور میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اس کو مسجد کے ستونوں میں سے

(بقیہ صفحہ ۲۲۴) یہاں حدیث کے الفاظ "فی الدنیا والآخرۃ" خاص طور پر قابل لحاظ ہیں شاید یہ اسی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری بہ حیثیت آپ کے امتی ہونے کے ابھی باقی ہے اور آپ کی یہ حیثیت لازمی طور پر آخرت میں بھی ظاہر ہوگی ورنہ آپ کی نسبت سب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابر ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اولویت کی نسبت کی۔ اس کے سوا کوئی وجہ حدیث کی روشنی میں ثابت نہیں ہوتی۔ اس روایت میں ایک فقرہ اور بہت زیادہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے "لیس بیننا نبی" یعنی ہمارے درمیان کوئی اور نبی نہیں۔ مدت دراز تک اس کی صحیح مراد حل نہ ہو سکی اور یہ منکشف نہ ہو سکا کہ اس امر کے بیان فرمانے کی اہمیت کیا ہے۔ اس کے بعد نظر سے گزرا کہ کتب سابقہ میں آپ کی علامات میں یہ بھی ذکر کیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اس رسول کے درمیان کوئی اور نبی نہ ہوگا، اس کے بعد سے پھر اس جملہ کی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ہونے لگا۔ دیکھو حدیث نمبر ۸۸۶ جس میں مغیرہؓ کا شاہ مقوقس کے دربار میں جانے کا واقعہ مذکور ہے۔

۹۹۵- حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ہر نبی جس طرح دوسرے نبی کی نبوت کا مصدق ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اس کے معجزات کا بھی مصدق ہوتا ہے اور ان کا بھی پورا پورا احترام کرتا ہے۔ یہ کبھی ثابت نہیں ہوا کہ کسی نبی نے دوسرے نبی کے مقابلہ پر کوئی معجزہ دکھلایا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو معجزہ ایک نبی کا ہو وہ دوسرے کا نہیں ہو سکتا بلکہ ایک ہی جنس کا معجزہ متعدد نبیوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ احیاء موتیٰ کو مشہور یہ ہے کہ یہ معجزہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تھا۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ یہی معجزہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی ظاہر ہوا ہے۔ (دیکھو کتاب النبوات ص ۲۱۱) لیکن یہاں ہر ایک کا معجزہ جس طرح خود اس کی نبوت کی دلیل ہوتا ہے اسی طرح گزشتہ نبی کی صداقت کی بھی دلیل ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف کاہنوں اور ساحروں کی جماعت ہے یہاں ہمیشہ ایک ساحر دوسرے ساحر کی کاٹ پر نظر آتا ہے اور اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ دوسرے کا عمل باطل کر دے۔

سبحان اللہ اب آپ حدیث مذکور میں ذرا اخوت نبوت کی اس پاسداری کو بھی ملاحظہ کیجیے کہ جس خاص تسخیر کے متعلق ایک پیغمبر کی زبان سے یہ دعا نکل چکی تھی "پروردگار مجھے وہ بادشاہت دے جو میرے بعد کسی دوسرے کو نہ ملے" دوسرا پیغمبر اس کا کتنا احترام ملحوظ رکھتا ہے کہ مذکورۂ بالا واقعہ میں اقتدار حاصل ہو جانے کے باوجود اس کو صرف اس لیے نافذ نہیں کرتا کہ کہیں اس میں دوسرے پیغمبر کی دعاء کے خلاف کا ادنیٰ سا شائبہ پیدا نہ ہو جائے حریفانہ ہمسری سے اتنا احتراز اور اخوت نبوت کا اس درجہ احترام، بس نبوت کا ایک اعجاز سمجھنا چاہیے۔ کیا اتنی بڑی جماعت میں بلا استثناء اس احترام کی مثال دنیا کی کسی دوسری جماعت میں مل سکتی ہے

حافظ ابن تیمیہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسخیر جنات سے بڑھ کر ایک اور نعمت عطا فرمائی تھی اور وہ جنات کے لیے آپ کی بعثت تھی۔ اس لیے آپ کا عام پیغمبرانہ سلوک ان کے ساتھ بھی وہی تھا جو نوع انسانی کے ساتھ تھا، دونوں مخلوق کو آپ نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی دعوت دی ہے اور مالکانہ تصرف سے ہر جگہ احتراز فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ مالکانہ تسخیر سے [illegible] لی الحق کہیں افضل ہے (کتاب النبوات ص ۱۵۰)

إِلَى سَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ حَتّٰى تُصْبِحُوا أَوْ تَنْظُرُوا إِلَيْهِ كُلُّكُمْ فَذَكَرْتُ قَوْلَ أَخِي سُلَيْمَانَ رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي قَالَ رَوْحٌ فَرَدَّهُ خَاسِئًا۔ رواہ البخاری

کسی ستون کے ساتھ باندھ دوں یہاں تک کہ صبح کو تم سب کے سب اس کو آنکھوں سے دیکھ لو لیکن پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان (علیہ السلام) کی یہ دعا یاد آگئی "پروردگار مجھے ایسی بادشاہت عنایت فرما جو میرے بعد کسی اور کو زیبا نہ ہو۔ رَوح (حدیث کا ایک راوی) بیان کرتا ہے کہ (اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارادہ کو ترک کر دیا) اور اس کے مقصد میں اس کو ناکام واپس کر دیا۔ (بخاری شریف)

حافظ سیوطی نے بھی الخصائص الکبریٰ میں اس کو ذکر کیا ہے۔ ہمارے نزدیک جس رسول اعظم نے اپنی پسند سے شانِ عبدیت اختیار فرمائی تھی اس کی فطرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اب کوئی عمل بھی اس سے ایسا سرزد ہو جو عہد سلیمانی کے دورِ شاہانہ سے ملتا جلتا رہے۔ یہ نکتہ بھی سمجھنے کا ہے۔ (دیکھو ترجمان السنہ ص ۳۷۵ ج ۲ حدیث ۷۱)

شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کہ شیطان چونکہ یہ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں وہ وسوسہ اندازی سے تو عاجز ہے اس لیے اس نے یہ سعی کی کہ کسی صورت آپ کی نماز ہی میں خلل انداز ہو جائے اور آپ کو عمل کثیر کے لیے مجبور کر دے مگر حق تعالیٰ کے فضل نے اس کو اس پر بھی قدرت نہ ہو سکی آخر کار مایوس ہو کر پھٹکارا ہوا واپس ہو گیا۔ (دیکھو الیواقیت والجواہر ص ۳۲۔ ج ۲)

مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ یہ شیطان بلی کی شکل پر آیا تھا۔ عالم روحانیات میں صورت کی تبدیلی ممکن ہے اگر کہیں انسان میں اس کی ٹھوس مادیت حائل نہ ہو جاتی تو وہ بھی اپنی صورت بدل سکتا۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ و السلام کی شکل کی تبدیلی کا ذکر بہت سے مواقع میں آیا ہے غالباً یہ بھی اُن کے "روح اللہ" لقب کے اثرات میں سے ہو گا بہر حال اسی بنا پر آپ کا اس کو پکڑ کر ستون سے باندھنا اور بچوں کا اس کو دیکھنا وغیرہ سب معقول ہے۔ روحانیات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب ہمت اپنی قوت ہمت سے کسی روح کو کسی جسم میں قبضہ کرلے تو پھر اس کو بدل نہیں سکتا اور اسی میں محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ ترجمان السنہ ص جلد دوم حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرشتہ کے تھپڑ مارنا اور اس کی آنکھ پھوٹ جانا بھی اسی کی نظیر سمجھنا چاہیے اگر وہاں بھی فرشتہ اپنی اصل صورت میں آتا تو خدا تعالیٰ کا مقدس رسول نہ اُس کے تھپڑ مارتا اور نہ اس کی آنکھ ہی پھوٹتی یہ سب بشری صورت میں آنے کے کرشمے تھے۔

حضرت شاہ اہل اللہؒ کا تاریخی واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ دہلی میں مسجد کے اندر بیٹھے ہوئے کچھ تحریر فرما رہے تھے پاس قلمدان رکھا ہوا تھا ایک بار نظر اٹھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ چھوٹا سا سانپ سامنے موجود ہے۔ آپ نے اپنے اُسی انہماک کی حالت میں قلمدان سے چاقو نکال کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے اور پھر بدستور لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں نظر اٹھی تو اس سانپ کو وہاں نہ پایا اور ایک سپاہی مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا نظر پڑا۔ اس نے کہا بادشاہ سلامت آپ کو بلاتے ہیں۔ یہ خالی الذہن اس کے ساتھ ہو لیے۔ جب اُس نے جنگل کا رخ کیا تو اُن کو کچھ شبہ گزرا یہاں تک کہ اس نے ایک غار میں داخل ہونے کے لیے ان سے کہا۔ اب یہ سمجھ گئے کہ معاملہ کچھ اور ہے کچھ دور چل کر ان کو شاہی عدالت نظر آئی جہاں ایک شخص مقتول پڑا تھا۔ مدعی نے دعویٰ کیا کہ اس کا قاتل یہ انسان ہے۔ انہوں نے انکار فرمایا۔ بالآخر بادشاہ نے جو دو سفید ریش شخص اس کی دائیں بائیں طرف بیٹھے تھے ان کو دیکھا تو ان میں سے ایک صاحب نے ایک حدیث پڑھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سُنا ہے کہ آپ نے فرمایا ہے جو اپنی صورت بدلے اس کو قتل کر دو۔ اس جن نے چونکہ اپنی صورت بدل کر سانپ کی شکل اختیار کرلی تھی۔ لہٰذا بموجب حدیث مذکور اس کے قاتل پر قصاص واجب نہیں ہوتا۔ شاہ اہل اللہؒ نے ان کی زبانی یہ کلمات سن کر پوچھا۔ آپ نے آنحضرت (باقی بر ص ۲۳۷)

۹۹۶۔ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ مِنْ دُعَاءِ دَاوٗدَ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ یُبَلِّغُنِیْ حُبَّکَ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَمَالِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ قَالَ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا ذَکَرَ دَاوٗدَ یُحَدِّثُ عَنْہُ یَقُوْلُ کَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ۔ رواہ

۹۹۶۔ ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت داؤد علیہ السلام ایک دعاء یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ الٰہی میں تیری محبت مانگتا ہوں اور اس شخص کی محبت جو تجھ سے محبت رکھے اور وہ نیک عمل جو تیری محبت پیدا کردے۔ الٰہی میرے دل میں اپنی محبت میری جان و مال میرے گھربار اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ پیدا فرمادے۔ اور یہ بھی بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی حضرت داؤد علیہ السلام کا تذکرہ فرماتے تو یہ بھی فرمایا کرتے تھے "وہ

(بقیہ صفحہ ۲۲۶) صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پایا۔ انہوں نے جواب دیا ہم جن ہیں اور ہماری عمریں اتنی طویل ہو سکتی ہیں۔ بہر حال جب جن سانپ کی شکل میں آکر مقتول ہو سکتا ہے اور فرشتہ کی آنکھ انسانی قالب میں آکر پھوٹ سکتی ہے تو پھر کوئی جن بلی کی شکل میں آنے کے بعد باندھا ہوا بھی آسکتا ہے۔ اپنی لاعلمی میں حقائق کا صرف استہزاء کرنا علم نہیں

۹۹۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلمات سے کچھ یہ اندازہ لگانا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کے قلوب میں حُبِّ خداوندی کی آگ کس درجہ بھڑکی ہوئی ہوتی ہے گر محبت کا کمال یہی ہے کہ اگر اس کے شرارے سر فلک بھی پہنچ رہے ہوں جب بھی ایک محبت کی تمنا یہی ہو کہ کاش یہ آتش محبت اور زیادہ بھڑکتی۔

بشری محبت یہ ہو کہ اس کا قدم جتنا محبت الٰہی کی طرف اٹھتا چلا جائے اُتنا ہی وہ اس کی عبادت میں تیز گام ہوتا چلا جائے۔ اس لیے ابوالدرداء یہاں وہ کلمات بھی نقل فرماتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے برادر نبوت حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت کی شان میں فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ خود عبدیت کا سب سے کامل مظہر تھے اس لیے آپ کی نظروں میں اپنے بھائی داؤد علیہ السلام کی جو ادا سب سے زیادہ پیاری معلوم ہوئی وہ ان کی عبادت ہی تھی پھر آپ کی عبدیت کا دوسرا کمال یہ تھا کہ جب ان کی عبادت کا ذکر فرماتے تو اس طرح فرماتے گویا وہ اپنی نظیر خود ہی تھے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں اپنی شکر گزاری کے لیے حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے خاص طور پر خطاب فرمایا تھا اس لیے انہوں نے بھی عبادت الٰہی کا ایک ایسا نظام قائم فرمایا تھا کہ شب و روز میں کوئی ساعت بھی ایسی نہ تھی جس میں کہ اُن کے گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد اُن کے عبادت خانہ میں عبادت کرتا ہوا نہ ملتا ہو۔ ارشاد ہے۔ اعملوا آل داؤد شکرا۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کبھی اپنے ان برادر نبوت کا تذکرہ آجاتا تو آپ ان کی شانِ عبادت کی توصیف میں بیساختہ رطب اللسان ہو جاتے یہ کون ہیں؟ وہ کہ جن کی عبادت کی فرشتوں میں بھی دھوم مچی ہوئی تھی، حتی کہ خود معبود حقیقی نے جو لقب چھانٹ کر ان کو عطا فرمایا تھا وہ بھی عبداللہ کا لقب تھا۔ سورۂ اسراء میں جب آپ کا تذکرہ فرمایا تو اسی لقب سے "سبحان الذی اسری بعبدہ لیلاً" اور سورۂ والنجم میں جب آسمانوں پر آپ کے ساتھ راز و نیاز کا ذکر کیا تو بھی اسی لقب سے فاوحی الی عبدہ ما اوحی یہ ہو اخوت نبوت کہ عبدیت کے اس کمال تک پہنچنے کے بعد بھی اپنی عبادت کا ایک حرف زبان پر نہیں آتا اور جتنی مدح و ثناء زبان پر آتی ہے وہ اپنے ایک برادر نبوت کی ہو۔

الترمذی وقال ھٰذا حدیث حسن غریب۔

۹۹۷۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِیْمَ

بہت بڑے عبادت گزار بشر تھے"۔ (ترمذی شریف)

۹۹۷۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے مستحق ہم ہوتے (اگر یہ سوال انہوں نے از راہِ شک کیا ہوتا)

۹۹۷۔ حدیث مذکور میں یکجائی طور پر تین نبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کو پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نبیانہ اخوۃ دوسرے نبیوں کے عزت و احترام بیان کرنے اور اپنی فروتنی کے اظہار کے لیے گویا بہانہ کی متلاشی رہا کرتی تھی۔ اگر کہیں اپنے جدِ بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذرا ذکر آگیا تو عظمت و برتری کے جتنے زوردار کلمات ہو سکتے تھے وہ ان کے حق میں اور عجز و نیاز کے جتنے کلمات ممکن تھے وہ سب اپنے حق میں ادا ہونے لگے اور جب کہیں اپنے دوسرے علاتی بھائیوں کی یاد تازہ ہوگئی تو فوراً آپ کے تلطف و ترحم کے سمندر موجزن ہو گئے اور رحمت و رافت سے لبریز دعائیں ان کے لیے زبان سے نکلنے لگیں۔ پھر یہ سب کچھ محض شاعرانہ اور مبالغہ آمیزی کے طور پر نہیں بلکہ ٹھیک ٹھیک حقیقت پر مبنی۔

دیکھیے یہاں جو کلمات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آپ کی زبانِ مبارک سے نکلے وہ کتنی عمیق حقیقت کے حامل تھے یقیناً اگر کہیں فطرت ابراہیمی شک و تردد سے پاک و صاف نہ ہوتی تو ان کے بعد جو حنیفیت بھی آتا اس میں شک و تردد کے جراثیم ضرور سرایت کر کے رہتے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے سہو و نسیان سے ایک غلطی ہوگئی مگر آخر کار پھر وہ ان کی ذریت کی سرشت میں داخل ہو کر رہی۔ اور اسی طرح ہر مونس کے نقصان و کمالات اس کے متبعین کے آئینوں میں چمکا کرتے ہیں پس اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اگر رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی کا کلمہ حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ مبارک سے کہیں از راہ شک ادا ہوتا تو پھر شک و تردد ملت حنیفہ کی بنیاد ہی میں داخل ہو جاتا۔ اس کی بقیہ شرح ترجمان السنۃ ص ، ا ج ۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔

حدیث کا دوسرا جملہ ذرا شرح طلب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت لوطؑ علیہ السلام کی قوم نے جب انکار و تمرد کی حد کر دی اور معاصی و فواحش میں خلاف وضع فطرت عمل کا ایک ایسا باب کھول دیا جس سے دنیا اس سے قبل آشنا نہ تھی تو آخر ان کی ہلاکت کی ساعت سر پر آ پہنچی اور خدا تعالیٰ کے مقدس ملائکہ خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آ پہنچے صورت یہ ہوئی کہ پہلے وہ حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان بن گئے، ان کو ابھی کچھ علم نہ تھا کہ اصل ماجرا ہے کیا، انہوں نے حسب دستور انبیاء علیہم السلام اپنے مہمانوں کو احترام سے لیا، ادھر ان کی قوم کو اس کی خبر لگی تو نشۂ معصیت میں مخمور ان کے مکان پر آ چڑھے اور ان کے معزز مہمانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا۔ اندازہ فرمائیے کہ قوم کے سارے ناہنجار افراد ایک طرف اور حضرت لوط علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی آبرو کا معاملہ ایک طرف، نہ خود اپنے دست و بازو میں ان کی مدافعت کی طاقت نہ قبیلہ ہی اتنا زوردار کہ اس موقع پر ان کی مدد کر سکے۔ اس حیرت اور مجبوری کے عالم میں ان جاہلوں کو بڑی فہمائش کی اور جو ایک بلند حوصلہ اور با مروت انسان اپنے مہمانوں کی خاطر بڑے سے بڑا ایثار کر سکتا ہے وہ بھی کر گزرے یعنی ابھی تک کفار اور مسلمانوں کے درمیان نکاح درست تھا خود حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی بھی کافرہ تھیں اور ہماری شریعت کے ابتدا میں بھی یہ نکاح درست سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے خدائی حدود کے تحفظ اور اپنے مہمانوں کے ناموس کی خاطر وہ بات بھی برداشت کر لی جس کو جوانمرد کے باوجود وہ باختیار برداشت نہ فرماتے اور یہ بات کہی کہ تم میری لڑکیوں سے نکاح کر سکتے ہو یہ ایک شرعی راستہ ہے لیکن ایک حرام فعل کا ارتکاب اور وہ بھی میرے گھر پر پھر وہ بھی اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ یہ میں

إِذْ قَالَ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَىٰ

جبکہ عرض کیا تھا۔ میرے پروردگار مجھے دکھلا دے تو مردہ کیسے زندہ کرتا ہے؟

برداشت نہیں کرسکتا[1]۔ اس پران کی جاہل قوم نے جو فواحش کے خوگر انسانوں کا جواب ہوا کرتا ہے وہی جواب دے دیا اب حضرت لوط علیہ السلام کی اس بیچارگی اور قوم کی اس سرکشی اور فاسد ارادوں کا نقشہ سامنے رکھیے اور اندازہ لگائیے کہ یہاں دیکھ کر ایک باعصمت نبی کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی آپ کے دل کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبیانہ اخوت کے سامنے جب یہ نقشہ آیا تو آپ پر اس گزشتہ مصیبت کی ایک تازہ واقعہ کی طرح چوٹ لگی اور بڑے درد کے انداز میں فرمایا، الہٰی میرے بھائی لوط پر بڑی رحمتیں نازل فرما کہ قوم کی نالائقیوں اور ایذاؤں سے تنگ آ آکر انہیں ان کلمات کے کہنے کی نوبت آگئی جو فطرت بشری سے بدرجہ مجبوری نکلا کرتے ہیں یعنی کاش اس معصیت و فضیحت کا نقشہ بدلنے کی طاقت خود میرے دست و بازو میں ہوتی یا میرا کوئی زوردار قبیلہ ہوتا تو ان ناہنجاروں کو مناسب سزا دی جاسکتی۔ انبیاء علیہم السّلام کے فیصلہ کن اور عاجزانہ کلمات کبھی خالی نہیں جاتے لہٰذا ان کی یہ آواز بھی آسمانوں پر سُنی گئی اور اسی دن کے بعد سے سنۃ الہیہ یہی ٹھہر گئی کہ جب کوئی نبی آتا تو ہمیشہ مضبوط

[1] اگر یہاں لفظ بنات سے مراد بنات قوم لی جائے تو بے شبہ اس مجازی معنے کا استعمال خلاف محاورہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر پہلے یہ غور کرلینا ضروری ہوگا کہ نبی کی معنوی ابوت کے لحاظ سے عرف قرآن میں کہیں امت کی لڑکیوں پر نبی کی زبان سے "بناتی" کا اطلاق ہوا ہے؟ اس وقت ہمارے ذہن میں تو کوئی ایسی آیت نہیں آتی۔ دوم جب اخوت اسلامی کے لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زوجہ کو "ھذہ اختی" کہنا ایک کذب کی برابر سمجھا ہو تو پھر بالکل اجنبی عورتوں کو کسی معنوی رشتے سے بنات کہہ کر پکارنا انبیاء علیہم السلام کے عرف میں کہاں تک قرین قیاس ہوسکتا ہے۔ سوم "بناتی" میں خاص اپنی طرف نسبت کرنے سے جس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے اس کا کوئی نکتہ بھی بیان کرنا ضروری ہوگا بالخصوص جبکہ وہ عورتیں کافر تھیں۔ چہارم یہ کہ قرآن کریم نے کفر کے ساتھ جب اپنے نسبی عزیز کو "ان ابنی من اھلی" کہنے کی اجازت نہیں دی بلکہ صاف "انہ لیس من اھلک" فرمادیا تو پھر جن کافر عورتوں کے ساتھ نسبی کوئی رشتہ بھی نہ ہو ان کو "بناتی" کا پیارا کلمہ کہنا کہاں تک جائز ہوگا۔ کیا ان کافروں کی اولاد پر جو نبی کی فضیحت کے لیے چڑھ آئے تھے اپنے اس معنوی رشتے کے اظہار کا یہی محل رہ گیا تھا۔ پنجم اگر ان مجبور کن حالات میں بھی اپنی حقیقی بنات کی جائز پیشکش قابل اعتراض ہوسکتی تھی تو کیا دوسروں کی لڑکیوں کی پیشکش بیہودہ ہو، اسی قابل اعتراض عنوان سے کچھ کم قابل اعتراض ہے کیا نبی کی شان کے یہ مناسب ہوگا کہ وہ اپنی بلا ٹالنے کے لیے اپنی امت کی لڑکیوں کی پیشکش کرے اور صرف "بناتی" کے ایک محبت آمیز کلمہ کی آڑ لے کر یہی بلا ان کے سر ڈالنے کا ارادہ کرلے۔ ہمارے نزدیک تو یہ پہلے سے بھی زیادہ ناموزوں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام پر اپنے مہمانوں کی اس فضیحت سے اخلاقی طور پر جو ناقابل برداشت دباؤ پڑ رہا تھا اس کا کچھ اندازہ ہی نہیں لگایا گیا کہ کن حالات میں یہ جائز کلمہ ان کی زبان سے نکلا تھا۔ ایک بےحیا، بدمعاش اور مضبوط ٹولی کے ہجوم کے سامنے تہذیب و آداب اور مروت کی تجاویز پیش کرنے کا وقت تھا یا کسی بھی صورت سے اپنے معزز مہمانوں کی آبرو بچا لینے کا مرحلہ تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ لفظ "بنات" کے مجازی معنے اختیار کرنے کے لیے اگر صرف یہی عقلی اعتراض داعی ہوا ہے تو اس کی کوئی معقول وجہ اب تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکی۔ مفسرین میں سے جن بعض حضرات نے اس مجاز کو استعمال کیا ہے اس کی وجہ ادب ہے، یہ عقلی شبہ نہیں ہے۔ زیادہ تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

[2] جن صاحبان نے "رکن شدید" سے یہاں اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لی ہے انہوں نے قرآنی آیت "او آوی الی رکن شدید" میں او حرف تردید پر غور نہیں کیا اور صحیح بخاری کے ایک لفظ کی مراد بھی خود اسی معنے کی موید سمجھ لی ہے حالانکہ اس روایت کا مطلب بھی دوسرا ہے۔ ابن حزم نے ملل و نحل میں لکھا ہے کہ اس سے مراد ملائکۃ اللہ ہیں۔

وَيَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا لَقَدْ كَانَ يَأْوِيْ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ

خداتعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحمت نازل فرمائے وہ کسی

قبیلہ کا آنا۔

انسان کا خاصہ ہے کہ جب وہ طرح طرح کی ایذاؤں اور مصائب کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے صبر کے لیے اس قسم کے گزشتہ واقعات کا تصور بڑا تسلی بخش ہوتا ہے اس لیے جب آپ بھی مصائب و آلام کے اسی دور سے گزر رہے تھے تو ایک مرتبہ آپ کو اپنے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یاد بیساختہ آگئی پھر کیا تھا ان کی عظمتِ شان بیان کرنے کا گویا پھر ایک بہانہ مل گیا اس لیے فرمایا رحم اللہ موسیٰ لقد اوذی اکثر من ذلک فصبر۔ خداتعالیٰ میرے بھائی موسیٰ پر رحمتیں نازل فرما بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں اور ان مصائب سے بھی زیادہ شدید مصیبتیں جھیلیں مگر انہوں نے صبر ہی کیا۔

آپ نے دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب بھی اپنے بھائیوں کے شدائد کا نقشہ آیا تو ہمیشہ ان کے حق میں بزرگی اور دعا کے کلمات ہی نکلے اور ہر ہر موقعہ پر اپنی فروتنی اور تواضع کا ہی اظہار ہوتا رہا اور کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ سالوں ایک گھاٹی میں بے آب و گیاہ قید رہنے کی حالت میں یا طائف کے میدانوں میں خون سے رنگین ہو جانے یا سر کے زخمی اور دندان مبارک کے شہید ہو جانے کے بعد بھی دوسرے انبیاء علیہم السلام کے بالمقابل کبھی یہ کلمہ زبان پر آیا ہو کہ ان مصائب پر جس طرح میں نے صبر کیا مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں کیا۔

تیسرا جملہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ تھا آپ کو معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان بڑی ہوتی ہے مگر ان کی باز پرس بھی بڑی ہوتی ہے، ان سے مواخذہ بھی بڑا ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ایک بار یہ کلمہ نکل گیا "انا اعلم" اس وقت سب سے زیادہ علم مجھ کو ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی وقت سے زیادہ علم اور کس کو ہو سکتا ہے مگر ان کا یہ کلمہ بھی گرفت میں آگیا حتیٰ کہ اس کی سرگزشت سورۃ الکھف میں مستقلاً بیان کی گئی جو تا قیامت تلاوت کرنے والوں کی زبانوں پر تازہ ہوتی رہیگی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے اپنی بی بی کے متعلق ایک نازک سے نازک وقت میں "ہذہ اختی" کا کلمہ نکل گیا مگر وہ ہمیشہ اس پر اتنے نادم رہے کہ محشر تک بھی زبان سے اس کی تلخی نہ گئی آخر جب اہل محشر ان سے شفاعت کے لیے عرض کرینگے تو اپنے اسی قسم کے کلمات یاد کر کے فرط ندامت سے اپنا سر جھکا لینگے اور فرمائینگے کہ میں اس بلند مقام کا اہل نہیں پس اس طرح لفظی گرفت اور اپنی ذرا سی بات پر اس طرح ندامت صرف اسی مقدس گروہ کا خاصہ ہے انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کا مقام گو کتنا ہی بلند ہو مگر بشریت پھر ان سے الگ نہیں ہوتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی جب زنانِ مصر کی دعوت کا ہوش رُبا منظر آیا اور زلیخا کی سخت دھمکی بھی ان کے کانوں نے سنی اور ان کو یقین دلایا گیا کہ اب تمہارے لیے صرف دو ہی راستے ہیں یا ان کی دعوت کو قبول کر دیا پھر جیلخانہ کے لیے تیار ہو جاؤ تب انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا اندازہ آپ یہاں سے فرمایئے کہ نوجوانی کے عالم میں سامنے سے حسن اپنی پوری شوکت و طاقت کے ساتھ خود دعوت دے رہا ہے مگر نبیانہ عصمت ہے کہ پہاڑ کی طرح ذرا متزلزل نہیں ہوتی اور جواب صرف یہ ہے کہ اگر میرے لیے راہیں صرف یہی دو ہیں تو مجھ کو اپنی عصمت کے مقابلہ میں جیل خانہ اختیار کر لینا بخوشی پسند ہے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ جواب زنان مصر کے سامنے تو ایک نبی کا نہیں فرشتہ کا جواب تھا لیکن چونکہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی نظر اپنے رب کی طرف اٹھی ہوئی تھی جس نے ان کی تربیت نبیانہ تربیت فرمائی تھی اس لیے یہ بلند جواب بھی گرفت میں آگیا رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ (پروردگار! جس بات کی دعوت یہ عورتیں مجھ کو دے رہی ہیں اس کے مقابلہ میں قید میں جانا میرے نزدیک قابل ترجیح ہے۔ ان مفسرین کا خیال یہ ہے کہ جب عالم پروردگار کے سامنے آگیا

وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ طُوْلَ مَا لَبِثَ يُوْسُفُ

اور اگر کہیں میں حضرت یوسف کی برابر مدت تک جیل خانہ میں قید رہتا

تھا تو اب یہاں ایک تیسرا راستہ اور بھی تھا اور وہ پوری عافیت تھی یعنی زنان کی دعوت کو لبیک کہنا پڑے اور نہ جیلخانہ کی مصیبت سہنی پڑے۔ رب کے سامنے نہ یہ مشکل ہے نہ وہ مشکل ہو۔ اس قسم کی گرفتیں صرف انبیاء علیہم السلام ہی کے ساتھ ہوتی ہیں اور ان کا مقصد ان کے منصب کی بلندی اور نزاکت کا اظہار اور عام انسانوں کو یہ سبق دینا ہے کہ ضعیف انسان کو کسی موقعہ پر بھی ایسا کلمہ منہ سے نہ نکالنا چاہیے جو اس کے ضعف بشری کے مناسب نہ ہو بلکہ اپنے پروردگار سے ہر حالت میں عافیت ہی عافیت طلب کرنی چاہیے انسان کی استقامت کتنی ہی مضبوط ہو مگر اس کو آزمائش میں ڈالنا کیا ضرور۔ یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کی شان ہے کہ جتنی آزمائشوں میں وہ پھنستے ہیں اتنے ہی اور کھرے ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کلمہ کو بھی جس صداقت کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے منہ سے نکالا تھا پھر آخر دم تک اسی مضبوطی کے ساتھ اس کو نباہا بھی حتی کہ جب ان کو رہائی کی خبر ملی تو جلدی سے فوراً اس طرح باہر نہیں آ گئے کہ پہلے جذبات ان کے منہ سے نکل گئی تھی گویا وہ بے سوچے سمجھے نکل گئی تھی یا صرف وقتی جذبات تھے جس پر بعد میں ان کو ندامت ہو سکتی تھی بلکہ بڑی استقامت کے ساتھ فرمایا کہ تم رہائی کا حکم لے کر آئے ہو مگر جس نے اپنی خوشی سے جیلخانہ پسند کیا تھا وہ اس وقت تک اپنی رہائی پسند نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے سر تہمت رکھنے والی عورتیں خود بھی اس کی بے گناہی کا اعتراف نہ کرلیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ نبی کی زبان سے جو کلمہ نکل گیا تھا وہ اس کے قلب کی کس گہرائی سے نکلا تھا اور آخر تک کس شان کے ساتھ اس کو نباہا گیا۔ یہ شان انبیاء علیہم السلام ہے، اگر سنۃ اللہ یہاں بھی پوری ہو کر رہی۔ آخوان کے الفاظ سے جو آثار ہونے تھے وہ نمایاں ہو کر رہے، یہ شانِ الٰہی تھی یہ دونوں شانیں اپنی اپنی جگہ قابل داد ہیں اور عام انسانوں کی زندگی کے لیے اہم اسباق ہیں۔ اس کے پڑھنے کے لیے ان کے اوراق زندگی متحمل نہیں یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کے صحیفۂ حیات میں پڑھے جا سکتے ہیں۔

اس عمیق اور نازک پہلو کو بعض مفکرین نے نہیں سمجھا اور صرف یہ کہہ کر ان مفسرین پر رد کرنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قید کا معاملہ ان مفسرین کے نزدیک گویا صرف ان کی اپنی بدشگونی اور بدفالی کا نتیجہ تھا حالانکہ ان مفسرین کے سامنے اس قسم کی گرفتوں کا ایک پورا باب ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ایک بات جو دو انسانوں کے مابین کتنی ہی معقول سے معقول سمجھی جائے لیکن جب وہی بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان آ جائے تو پھر ضروری نہیں کہ اسی درجہ میں معقول ثابت ہو، حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر سوال و جواب کیے تو حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو اتنا معقول جواب دیا کہ آخر ان کو خاموش ہو جانا پڑا لیکن جب یہی سوال ان سے پروردگار نے فرمایا تو حضرت آدم علیہ السلام جواب کا ایک حرف زبان پر نہ لا سکے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب اپنے بھائی یوسف کی اس مصیبت کا نقشہ آیا تو آپ ان کی داد دینے کے لیے یہاں بھی فوراً بیتاب ہو گئے اور صرف اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ ان کی عزت و احترام کی خاطر تواضع کے جو کلمات اپنے حق میں استعمال فرما سکتے تھے وہ استعمال فرما لیے۔ یہ ہے اخوت نبوت کہ سر پر سرداری کا تاج رکھا ہوا ہے مگر یوں نظر آتا ہے کہ آپ اپنے بھائیوں پر فوقیت کے جذبات سے اتنے خالی ہیں گویا ادھر التفات ہی نہیں ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ ساری داستان صرف ایک ایسے خواب ہی کی بدولت تو پھیلی تھی جس سے ان کی برتری

لَاَجَبْتُ الدَّاعِيَ. متفق علیہ ورلجم ترجمان السنۃ م۲

اس کے بعد بادشاہ کی طرف سے میرے بلانے کے لیے کوئی شخص آتا تو میں اس کے ساتھ ہو لیتا۔ (متفق علیہ)

ظاہر ہوتی تھی مگر آپ کی شان یہاں بالکل جدا تھی حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کامل کا کمال جتنا بڑھتا جاتا ہے اُس کی شان تواضع اتنی ہی اور بڑھتی چلی جاتی ہے اس کے انکسار و تواضع کے کلمات اس کے نقص کا موجب نہیں ہوتے بلکہ اور اس کے کمال کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے مصائب کا نقشہ بار بار آپ کے سامنے آنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوگی کہ قرآن کریم نے خاص طور پر آپ سے خطاب فرمایا تھا فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل یعنی جس طرح سب اولوا العزم رسول ہمیشہ صبر کرتے چلے آئے ہیں اسی طرح تم بھی صبر پر قائم رہنا۔ پس چونکہ قرآن کریم ہی نے آپ کے صبر کے لیے انبیاء سابقین کا تصور آپ کے سامنے رکھا تھا اس لیے ہر ہر صبر آزما موقعہ پر آپ صبر فرماتے اور سابق انبیاء علیہم السلام کا اسوۂ صبر سامنے رکھتے جاتے اور جب یہ صورت حال حسب الاتفاق بیان میں آجاتی تو ہر جگہ یوں معلوم ہوتا گویا آپ کی نظروں میں صبر کا پلہ ان ہی کا بھاری ہے۔

آپ کی اس شان تواضع و انکسار میں بڑا دخل اس کا بھی تھا کہ آپ کی فطرت میں عبدیت اس طرح گوندھی گئی تھی کہ آپ کی رفتار و گفتار، نشست و برخاست، غصہ و رضا، مقہوری او راقتدار کی ہر ہر ادا میں وہ بے اختیار ٹپکتی نظر آتی تھی، انبیاء علیہم السلام اپنی زبان سے جو نکالتے ہیں وہ صرف ان کے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ان کی فطرۃ کے ترجمان ہوتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ابھی آپ پڑھ چکے اور آنحضرت کی شان عبدیت کا تذکرہ عنقریب آپ اسی جلد میں پڑھنے والے ہیں پس ایک موقعہ پر آپ نے چونکہ عبدیت کو ملوکیت پر از خود ترجیح دے کر اپنے حق میں عبدیت ہی کو پسند فرما لیا تھا اور اس لیے پسند فرمایا تھا کہ یہ جوہر روز ازل ہی سے آپ کی فطرت میں ودیعت فرما دیا گیا تھا اس لیے عمد و نسیان کے ہر ہر موقعہ پر اختیار و بے اختیار جو کلمات بھی آپ کی زبان مبارک سے نکلتے وہ آپ کی عبدیت کے سچے گواہ ہوتے۔ اس لیے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ کے یہ کلمات ہر موقع پر کسی خاص ارادہ یا خاص مصلحت ہی سے نکلا کرتے تھے بلکہ عربی کے محاورہ کا مصداق تھے (الاناء یترشح بما فیہ) یعنی برتن سے وہی ٹپک ٹپک کر نکلتا ہے جو اس میں بھرا ہوا ہوتا ہے۔

اب آپ اس خاص صفت عبدیت کے پیش نظر سوچیے کہ ایک عبد کا نقشہ یہاں کیا ہونا چاہیے کیا یہی نہیں کہ جب اس کا آقا اس کو جیلخانہ میں بھیجے تو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ وہ جیل خانہ میں داخل ہو جائے اور جب اس کو باہر آنے کا حکم دے تو اسی طرح خوشی خوشی باہر نکل آئے۔ گویا قید و رہائی کے دونوں معاملے اپنے آقا کے حکم بھاری کے سامنے اس کے لیے برابر ہوں۔ اگر آپ کا جواب آپ اس روشنی میں پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو فروتنی کے جملے یہاں آپ کے دہن مبارک سے نکل رہے تھے وہی آپ کی برتری کے سب سے کھلی دلیل تھے۔

آپ نے اس حدیث میں اور اس سے پہلی حدیث میں پانچ مشہور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آپ کی اخوۃ نبوت ملاحظہ فرمائی۔ اب چند اور واقعات بھی ترجمان السنہ کے ان صفحات پر ضرور ملاحظہ فرما لیجیے (ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۲۰۱، ۳۰۳، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷)۔ اُمید ہے کہ اخوۃ نبوت کا مفہوم اور اس کی اہمیت ذہن نشیں کرنے کے لیے یہ واقعات آپ کے لیے کافی ہونگے۔ اور اس کے بعد ان احادیث میں جو سوال و جواب کیے گئے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی کوئی ضرورت بھی نہ رہیگی۔ اگر ان احادیث پر نظر کرنے کے وقت اس طرف بھی خیال کر لیا جاتا کہ یہ الفاظ کن تاثرات کے ماتحت تھے تو ان کی تاویل کی بجائے یہ روشن ہو جاتا کہ اخوت نبوت کے ہوتے ہوئے ان الفاظ کے ادا کیے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا،

الانبیاء والرسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کلھم بشر و کلھم عباد اللہ تجری علیھم سنۃ اللہ ما تجری فی سائر عبادہ

۹۹۸۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الظُّهْرَ

انبیاء علیہم السلام سب بشر تھے اور سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے اور اللہ تعالیٰ کی جو سنت نوع بشری کے لیے ٹھہر چکی ہے وہ ہمیشہ ان پر بھی جاری ہوتی چلی آئی ہے

۹۹۸۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہواً ظہر کی پانچ رکعتیں

۹۹۸۔ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بشریت کا مسئلہ کوئی حدیثی مسئلہ نہیں بلکہ قرآنی مسئلہ ہے، اس نے ان کی بشریت کو جابجا مسلمات اور بدیہیات کی طرح پیش کیا ہے۔ قاضی عیاض مالکیؒ نے جو توقیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بڑا بلند مذاق رکھتے ہیں اپنی تصنیف "الشفاء" میں مسئلہ عصمت پر بحث کرتے ہوئے اخیر میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ رسول یقیناً معصوم ہوتے ہیں مگر بشریت سے معصوم نہیں ہوتے وہ بشر کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور انسانی زندگی کے جملہ ادوار طفلی، شباب اور شیخوخت سب سے عبور کرتے ہوئے آخر میں ہمیشہ کے لیے اسی طرح زمین میں جاکر مدفون ہو جاتے ہیں جیسا جنس بشری ہمیشہ سے مدفون ہوتی چلی آئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت عام انسانوں کے برخلاف صرف ایک صنف حضرت سے ہوئی تھی بس اتنی ہی بات سے نصاریٰ نے ان کا رشتہ عالم بشر سے کاٹ کر خالق بشر کے ساتھ جا جوڑا۔ مگر یہاں قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ آدم علیہ السلام کے لیے تو نہ والد تھے نہ والدہ جب وہ بشر ہی رہے بلکہ ابو البشر تو یہاں عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تو تھیں۔ تعجب ہے کہ جن کی والدہ ماجدہ بھی تھیں اور والد ماجد بھی پھر ان کی بشریت سے انکار کی جرأت کیونکر ہو جاتی ہے۔ لیکن انسان کی عقل پر جب اہواء و خواہشات کے حجابات پڑ جاتے ہیں تو وہ اپنے مشاہدات اور محسوسات کا بھی انکار کرنے لگتا ہے اور اتنا بھی نہیں سوچتا کہ جب تمام مخلوقات میں بشر ہی سب سے افضل اور سب سے اشرف مخلوق ہے تو پھر رسولوں کی بشریت کا انکار کرکے وہ ان کو آخر اور کس مخلوق میں شامل کریگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خالق کی جانب میں تو کسی امر میں بھی شرکت کی گنجائش نہیں نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں۔ پھر خالق سے ہٹ کر مخلوق ہی کا دائرہ ہے۔ اس میں سب سے افضل و اشرف یہی نوع انسانی ہے، اسی کو قدرت نے اپنی خلافت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔

اگر انبیاء علیہم السلام اس اشرف نوع سے خارج کر دیے جائیں تو پھر اور نوع ہے کونسی جس میں ان کو داخل کیا جائیگا اس لیے انبیاء علیہم السلام کی بشریت سے انکار صرف قرآن و حدیث کا انکار نہیں اپنے مشاہدہ کا بھی انکار ہے۔ بلکہ اس مقدس گروہ کی سب سے بڑی فضیلت کا انکار ہے۔ تعجب ہے کہ انسان نے مسجود ملائک ہونے کے بعد بھی اپنی شرافت کو نہیں سمجھا اور تاج خلافت کے بعد بھی اپنی قدر نہیں پہچانی اگر وہ اس کی حقیقت سمجھتا تو رسولوں کو بشر کہنا اس کو ہرگز بار نہ گزرتا۔ اس کے برعکس یہاں دوسرا طبقہ وہ ہے کہ جب وہ بشریت کا قائل ہوا تو اس نے رسولوں کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں اس طرح سمجھ لیا کہ پھر ان کے حق میں کسی امتیاز

خمسًا فقیل لہٗ أزید فی الصلوٰۃ فقال وما ذاک قالوا صلیت خمسًا فسجد سجدتین

ادا فرمائیں اس پر آپ سے عرض کیا گیا ظہر کی نمازوں کی رکعتیں کیا بڑھا دی گئی ہیں؟ آپ نے فرمایا کیا ہوا؟ انہوں نے عرض کیا، آج آپ نے پانچ رکعتیں ادا فرمائی ہیں۔ یہ سن کر آپ نے سلام کے بعد سہو کے لیے دو سجدے

کا قائل ہونا اُن کے نزدیک گویا ان کی بشریت ہی کے انکار کے مرادف بن گیا اس لیے اس بدیہی مسئلہ کی تفہیم کے لیے مجبورًا ہمیں یہ لکھنا پڑتا ہے کہ عالم میں قدرت نے مختلف انواع اور انواع میں مختلف اصناف پھر اصناف میں مختلف استعداد کے افراد پیدا فرمائے ہیں دیکھیے جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان۔ یہ مختلف انواع ہیں اور ہر عاقل جانتا ہے کہ ان انواع میں کتنا فرق ہے جمادات بالکل بے حس وشعور نظر آتے ہیں نباتات یہاں کچھ ان سے پیش گام ہیں اور حیوانات کچھ کچھ ادراک وعلم سے بھی فیضیاب معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ جب آخری نوع کا نمبر آتا ہے تو اس کے شعور وحس، علم وادراک کے سامنے دوسری انواع ایک ذرۂ بے مقدار نظر آتی ہیں مگر کیا اس کی اس برتری کی وجہ سے دوسری انواع کے ساتھ اس کی مخلوقیت میں شرکت سے کوئی شخص انکار کرسکتا ہے؟ اسی طرح اب اگر اصناف پر غور کرو تو معمولی پتھر بھی ایک پتھر ہے اور لعل وجواہرات بھی پتھری ہیں، گھاس بھی ایک نبات ہے اور گیہوں بھی، اسی طرح گدھا بھی ایک جانور ہے اور گھوڑا بھی مگر کیا اس اشتراک کی وجہ سے یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ سب اصناف برابر ہیں ان میں باہم کوئی تفاضل نہیں۔ اسی طرح اب اگر ہر صنف کے افراد پر غور کرو تو ہر صنف کے افراد میں بھی فضل وقیمت کا اتنا بڑا تفاوت نظر آئیگا کہ اس کا ضبط واحصار مشکل ہے لعل وجواہرات کی قیمتوں کے تفاوت پر غور کرو۔ اسی طرح حیوانات میں گھوڑے کی صنف کے افراد کی قیمتوں پر غور کرو تو تم کو یہاں فضیلت کے اتنے درجات نظر آئینگے کہ صنفی اشتراک کے بعد بھی ان میں گویا کوئی اشتراک ہی نہیں ہے۔ اسی طرح نوع انسانی کا حال ہے بلکہ یہ نوع جتنی شریف تر ہے اس کے افراد میں تفاوت بھی اتنا ہی بے اندازہ ہے۔ کافر بھی انسان ہی کا فرد ہے اور مسلم بھی، پھر مقبولین کے افراد کو اگر مجملاً ضبط کرو تو قرآن کریم کے الفاظ میں وہ چار طائفہ ہیں انبیاء، صدیقین شہداء اور صالحین۔ ان کے مابین فضائل وکمالات میں بے اندازہ تفاوت ہے، پھر یہی حال ان میں سے ہر طائفہ کا ہے اس لیے کسی صنف یا نوع کے افراد میں ان کے باہم تفاضل کا انکار کرنا نہ تو حقیقت پر مبنی ہے اور نہ ان کے تفاضل کا اقرار کرکے ان کے صنفی یا نوعی اشتراک کا انکار کرنا علم کی بات ہے۔

واضح رہے کہ بشر گو اضعف المخلوقات ہے مگر اس میں ترقی وعروج کی اتنی عظیم صلاحیت موجود ہے کہ ایک انسان ترقی کرتے کرتے ایسے عالی سے عالی مقام تک بھی رسائی حاصل کرلیتا ہے جہاں مقرب سے مقرب ملک بھی جانے کی طاقت نہیں رکھتا شبِ معراج کے سارے سفر میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے لیکن ایک موقعہ ایسا بھی آیا جہاں سے آگے تجاوز کرنے کی ہمت نہ کرسکے اور جب اُن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفاقت ترک کرنے کی وجہ دریافت فرمائی تو بڑے خوف کے انداز میں اتنا ہی عرض کرسکے ؎ اگر یک سرِ مُو برتر پرم ٭ فروغِ تجلی بسوزد پرم۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سب کے لیے بس اپنا ایک ایک مقام مقرر ہے اس لیے اگر میں یہاں سے ایک بال بھر بھی آگے پرواز کروں تو تجلی ربانی میرے بال وپر سب سوخت کردے۔ اُس تجلی کی تاب وطاقت تھی تو ایک بشر ہی میں تھی آخر وہی آگے بڑھا اور صرف آگے ہی نہیں بلکہ منازل قرب طے کرتے کرتے وہاں جا پہنچا جہاں کا نقشہ اگر الفاظ میں کچھ ادا ہوسکتا ہے تو فکان قاب قوسین ہے اور ابھی اسی پر بس نہیں ہوئی بلکہ اس میں "او ادنیٰ" کی گنجائش اور نکل آئی پھر اس کی حد کیا تھی۔ یہاں پہنچ کر قرآن کریم نے بھی سکوت اختیار کرلیا ہے۔ پھر کس کی مجال ہے کہ اس کے بعد لب کشائی کرسکے ؏ قلم اینجا رسید وسر بشکست۔ مگر کیا ان مدارج ترقی کے بعد بشر مخلوقیت کے دائرہ سے ایک قدم بھی باہر نکال سکا نعوذ باللہ من ذلک چنانچہ وہی بشر جو قرب کے اتنے منازل طے کرچکا تھا جب پھر واپس

بَعْدَ مَا سَلَّمَ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلٰوتِهٖ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ ثُمَّ لِيُسَلِّمْ ثُمَّ لِيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ ۔ (متفق علیہ)

کیے اور ایک روایت میں ہے کہ یہ فرمایا میں بھی ایک بشر ہوں جیسے تم بشر ہو اور بھول بھی جاتا ہوں جیسے تم بھول جاتے ہو اس لیے جب میں بھولا کروں تو مجھے یاد دلا دیا کرو اور ایک مسئلہ یاد رکھو کہ جب تم کو نماز میں شک پیش آجائے تو پہلے کسی ٹھیک بات پر اپنی رائے جمانے کی کوشش کرو پھر اسی کے مطابق اپنی نماز پوری کر لو، پھر سلام پھیر کر سہو کے دو سجدے کر لیا کرو۔ متفق علیہ

ہوا تو اس پر بشریت کی قبا پہلے سے زیادہ مزین تھی اور اس عظیم الشان قرب کے بعد جو انعام ساتھ لایا وہ عبادت کا خاص طریقہ اور عبدیت کی ایک نرالی شان تھی۔ ہجرت سے پہلے پہلے ان سارے کمالات سے اس کو نوازا گیا اور ہجرت کے بعد تا وفات اپنی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں جس امر کا اس نے مظاہرہ کیا وہ سراپا عبدیت ہی عبدیت تھی۔ شیخ اکبرؒ لکھتے ہیں کہ مقام عبدیت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص مقام ہے ایک مرتبہ مجھ پر سوئی کے ناکہ کی برابر منکشف ہوا تھا تو میں اس کی بھی تاب نہ لا سکا اور قریب تھا کہ جل گیا ہوتا۔ سبحان اللہ جہاں جبرئیل علیہ السلام قدم نہ اٹھا سکے وہاں شیخ اکبرؒ کے قدم کیا سنبھلتے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں عبداللہ بطور لقب صرف دو نبیوں کی شان میں آیا ہے ایک عیسٰی علیہ الصلوٰۃ و السلام کے اور دوسرے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ولادت کے بعد پہلا کلمہ زبان کو نکالا وہ یہ تھا انی عبداللہ کسی شبہ وتردد کے بغیر میں اللہ تعالٰی کا ایک بندہ ہوں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حق تعالٰی نے ارشاد فرمایا فلما قام عبداللہ یدعوہ کادوا یکونون علیہ لبدا ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں عبداللہ کا لقب اپنے حق میں خود حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے استعمال کیا ہے اور یہاں اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں خود حق تعالٰی نے استعمال فرمایا ہے چنانچہ اسراء کا ذکر شروع فرماتے ہوئے سبحان الذی اسری بعبدہٖ میں آپ کی اسی صفت عبدیت کو ذکر کیا ہے بلکہ اس کو خاص طور پر اپنی طرف منسوب کر کے اور مشرف و مکرم بنا دیا ہے پس معراج کا ثمرہ یہ نہیں تھا کہ آپ کی بشریت کی قبا اتار کر آپ کو کوئی دوسری قبا پہنا دی گئی تھی بلکہ اسی کی اور تکمیل کی گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مولیٰ کی نوازش جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے عبد کی عبدیت میں اتنا ہی اور اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے جس فریق نے انبیاء علیہم السلام کے امتیازات اور فضائل کا باب پڑھ کر ان کے بشر ہونے کا ہی انکار کر ڈالا وہ بھی تاریکی میں ہے اور جس نے ان کی بشریت کا اقرار کر کے ان کو ٹھیک عام انسانوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ وہ بھی مقام رسالت سے بڑا بے بہرہ رہا۔ انبیاء علیہم السلام کا ٹھیک مقام یہ ہے کہ وہ بشر ہوتے ہیں، بلکہ سید البشر ہوتے ہیں۔ اگر خدا تعالٰی کے رسول بشر نہ ہوتے تو نوع بشری کے لیے کوئی فضیلت ہی نہ ہوتی بلکہ وہ اسفل السافلین میں پڑی ہوئی نظر آتی۔ سورۂ والتین کے شروع میں چار بڑی نبوتوں کا تذکرہ فرما کر انسان کا احسن تقویم پر ہونا اس لیے بیان فرمایا گیا ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی انسان کی اس فضیلت کا ثبوت ملتا ہے ورنہ عام انسان جو نہ تو ایمان سے آشنا ہیں نہ عمل صالح سے ان کا رتبہ خس و خاشاک سے بھی بدتر ہے۔ ان کو دیکھ کر کون باور کر سکتا ہے کہ انسان سب سے اشرف مخلوق ہو سکتی ہے جس کو زندگی کے باہم تعلقات میں محارم وغیر محارم۔ حلال وحرام، دغا وفریب، قتل و غارت، عریانی وستر حتی کہ بول وبراز تک کی تمیز نہ ہو کیا وہ انسان ہے جس کو دیکھ کر اشرف المخلوقات کہا جا سکے ہے۔ معیشت و معاشرت کی یہ سب اصلاحیں صنف بشری میں صرف ان بشر کے ذریعہ ہوتی ہیں جو رسول کہلاتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ترجمان السنہ جلد اول میں "اسلام میں رسول کا تصور" کا مضمون دیکھیے۔

۹۹۹۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْصِفُ نَعْلَهٗ وَيَخِيْطُ ثَوْبَهٗ وَيَعْمَلُ كَمَا يَعْمَلُ اَحَدُكُمْ فِيْ بَيْتِهٖ وَقَالَتْ كَانَ بَشَرًا مِّنَ الْبَشَرِ يَفْلِيْ ثَوْبَهٗ وَيَحْلُبُ شَاتَهٗ وَيَخْدِمُ نَفْسَهٗ۔ رواہ الترمذی۔

۱۰۰۰۔ عَنْ خَارِجَةَ بْنِ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ دَخَلَ نَفَرٌ عَلٰى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَقَالُوْا لَهٗ حَدِّثْنَا اَحَادِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُنْتُ جَارَهٗ فَكَانَ اِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ

۹۹۹۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چپل کو خود درست فرمالیا کرتے، اپنے کپڑے خود سی لیتے اور اپنے گھر میں اسی طرح سب کام کاج کرلیا کرتے تھے جیسا تم سب لوگ کرلیتے ہو اور فرماتی تھیں آپ بھی ایک بشر ہی تھے اپنے کپڑوں کی جوئیں تلاش کرلیتے۔ اپنی بکری کا دودھ نکال لیتے اور اپنی ضروریات کو خود انجام دے لیتے۔ (ترمذی شریف)

۱۰۰۰۔ خارجہ روایت کرتے ہیں کہ چند لوگ ان کے والد حضرت زید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ باتیں سنا دیجیے۔ انہوں نے فرمایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوسی تھا جب آپ پر وحی آتی

۹۹۹۔ یہ بات بڑی اہمیت کے ساتھ یاد رکھنی چاہیے کہ ہر انسان کی بیرونی اور اندرونی زندگی میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بلند انسان کیوں نہ ہو بلکہ اس کی اندرونی زندگی میں ایک نہ ایک گوشہ ضرور ایسا ہوتا ہے جو خود اس کی نظروں میں بھی اس کی کمزوری کا ثبوت ہوتا ہے اسی لیے وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اسکی اندرونی زندگی کا ہر ہر گوشہ باہر آجائے لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان بشریت بھی عجیب درعجیب ہوتی ہے ان کی ان دونوں حالتوں میں ذرا فرق نہیں ہوتا بلکہ ان کی اندرونی زندگی بھی اسی طرح شریعت کا ایک جزء ہوتی ہے جیسا کہ بیرونی زندگی اور اسی مقصد کے پیش نظر ازدواج کی کثرت ان کے حق میں نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہوتی ہے انسانی معیشت کی خوبی یہ ہے کہ اس کو اپنے گھر کے کسی کام سے بھی عار نہ ہو وہ ایک طرف گھر کا آقا بھی ہو اور دوسری طرف اپنی ہر ضرورت کو بے تکلف خود بھی انجام دے لیتا ہو۔ جو تین کام یہاں حدیث میں مذکور ہیں گو یہ بہت معمولی سے ہیں مگر انسان کی نفسی بشریت کے ثبوت کے لیے بہت اہم ہیں صرف صورت کے بشر تو بہت ہوتے ہیں لیکن جو سیرت میں بھی بشر ہوں وہ کم ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ معمولی اعمال آپ کی بشریت کی تکمیل کے لیے نہ تھے بلکہ جس کامل بشریت کے آپ مالک تھے اُن کے طبعی آثار تھے۔

حدیث مذکور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسولوں کا کمال یہ نہیں ہوتا کہ وہ راہبوں کی طرح ایک راہب بن جائیں، بلکہ ان کے دنیوی مشاغل بھی ان کی عبادت ہی کی ایک دوسری شکل ہوتے ہیں۔ اگر رسول بشر نہ ہوتے تو ان کی عبادت بھی فرشتوں کی طرح صرف تسبیح و تقدیس میں منحصر ہو کر رہ جاتی لیکن چونکہ وہ بشر ہوتے ہیں اس لیے ان کی عبادت کی ایک مستقل نوع وہ ہے جس سے خدا تعالیٰ کے مقدس فرشتے یکسر ناآشنا ہیں یعنی خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوق سے تمتع حاصل کرنا مگر شرعی حدود میں رہ کر۔ پیٹ بھر لینا اور اسی طرح جملہ طبعی حاجات پوری کرلینا تو ایک عام بات ہے لیکن کس طریق پر ان کو پورا کرنا اور کس حد تک پورا کرنا حرام طریقوں سے اعراض کرنا اور اپنی حدود سے تجاوز نہ کرنا یہ ضعیف اور محتاج بشر کی وہ عبادت ہے جس کا مقابلہ فرشتوں کی تسبیح و تقدیس نہیں کرسکتی۔ حدیث مذکور کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ صرف صورت کے بشر نہ تھے بلکہ سیرت کے بھی بشر تھے۔

۱۰۰۰۔ اوپر کے نوٹ میں یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ دنیا کی معمولی باتوں میں شرکت کرنا بھی رسولوں کا ایک کمال ہے

بَعَثَ إِلَيَّ فَكَتَبْتُهُ لَهُ فَكَانَ إِذَا ذَكَرْنَا الدُّنْيَا ذَكَرَهَا مَعَنَا وَإِذَا ذَكَرْنَا الْآخِرَةَ ذَكَرَهَا مَعَنَا وَإِذَا ذَكَرْنَا الطَّعَامَ ذَكَرَهُ مَعَنَا فَكُلُّ هٰذَا أُحَدِّثُكُمْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(رواہ الترمذی)

۱۰۰۱۔ عَنِ الْأَسْوَدِ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ مَا كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصْنَعُ فِي بَيْتِهِ قَالَتْ كَانَ يَكُوْنُ فِي مِهْنَةِ أَهْلِهِ يَعْنِي خِدْمَةَ أَهْلِهِ فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلٰوةُ خَرَجَ إِلَى الصَّلٰوةِ۔ رواہ البخاری۔ وفی مصنف عبد الرزاق كان يخصف نعله ويخيط ثوبه ويعمل فی بيته كما يعمل احدكم فی بيته۔

۱۰۰۲۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ دُعِيْتُ إِلٰى كُرَاعٍ لَأَجَبْتُ

تو آپ مجھے بلا بھیجتے میں جا کر لکھ دیتا تھا اور جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو جاتے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ آخرت کا ذکر فرمانے لگتے۔ پھر جب ہم کھانے پینے کا تذکرہ کرتے تو آپ اس میں بھی شریک رہتے۔ یہ ساری باتیں ہیں تم سے آپ ہی کی باتیں بیان کر رہا ہوں۔ (ترمذی شریف)

۱۰۰۱۔ اسودؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں آ کر کیا کیا کرتے تھے فرمایا اپنے اہلخانہ کی ضروریات پوری فرماتے تھے، مگر جہاں نماز کا وقت آتا بس اسی وقت نماز کے لیے تشریف لیجاتے۔ (بخاری شریف)

۱۰۰۲۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ مجھ کو اگر ذرا سے گوشت

اور ایسا کمال ہے جس کی ہر بشر کو ضرورت ہے زید بن ثابت نے اس سارے بیان میں یہ بتا دیا کہ رسول اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی باتیں سننے کے لیے تم کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تم اگر چاہو تو اپنے روز مرہ کے معمولی امور میں رسول اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یاد تازہ کر سکتے ہو۔ اگر حضرت زیدؓ چاہتے تو یہاں آپ کی عبادت کا دفتر کھول کر رکھ دیتے مگر ان کو اسی نکتہ پر تنبیہ کرنا تھا کہ رسالت کی شان ترک دنیا نہیں ہوتی وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ ان کی دنیا میں بھی شریک ہوتے ہیں اور اسی ضمن میں دنیا کو دین بنا دینے کی خوبی پیدا کر دیتے ہیں ان کی دنیا ان کی آخرت سے کسی جگہ بھی علیحدہ نہیں ہوتی اور جب کسی کی دنیا آخرت سے علیحدہ ہونے لگتی ہے تو وہ سختی کے ساتھ ٹوک دیتے ہیں۔

۱۰۰۱۔ بس بشر کی یہی وہ دنیا ہے جس کو عبادت بھی کہا جاتا ہے۔ گھر کا کاروبار نہ کرنا کچھ مشکل نہیں مگر اس کاروبار کو چھوڑ کر خدائی امانت کے لیے طبعی حاجات کی طرح بے تکلف چل پڑنا بہت مشکل ہے۔ عبد کامل وہ ہے جو بندوں کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے مولیٰ کے حقوق بھی اور جب دونوں میں معارضہ آ پڑے تو مولیٰ حقیقی کا حکم اس طرح بجا لائے گویا اب اس کے سامنے کوئی دوسرا کام ہی نہ تھا۔ جس رسول اعظم کی تمام زندگی میں دنیا کے حقوق کی اس طرح ادائیگی اور آخرت کے فرائض کی یہ ترجیح یکساں غیر متبدل دستور العمل نظر آتا ہو کیا اس کے کمال میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے۔

وَلَوْ أُهْدِيَ إِلَيَّ ذِرَاعٌ لَقَبِلْتُ ۔ رواہ البخاری راجع ترجمان السنہ ص ۵،۳ ج ۲ ولابد

۱۰۰۳۔ عَنْ أَبِي حَازِمٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّمَ رَجُلًا فَأُرْعِدَ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَوِّنْ عَلَيْكَ فَإِنِّي لَسْتُ بِمَلِكٍ إِنَّمَا أَنَا ابْنُ امْرَأَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ كَانَتْ تَأْكُلُ الْقَدِيدَ ۔ رواہ ابن الجوزی من طرق بعضہا متصلا عن ابن مسعود وجریر قال ابن الجوزی وروی متصلا والصواب ارسالہ۔

۱۰۰۴۔ عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْكَبُ الْحِمَارَ وَيَلْبَسُ الصُّوفَ وَيُجِيبُ دَعْوَةَ الْمَمْلُوكِ وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَوْمَ خَيْبَرَ

پر دعوت دی جائے تو میں اس کو بھی قبول کرونگا اور اگر میرے سامنے بکری کی ایک دست کا بھی ہدیہ پیش کیا جائے تو میں اس کو بھی قبول کرونگا۔ رواہ البخاری

۱۰۰۳۔ ابو حازم روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کچھ بات کی تو وہ مارے خوف کے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا۔ میاں گھبراؤ مت میں کوئی بادشاہ تو نہیں ہوں میں تو ایک قریشی عورت کا لڑکا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت بھی کھا لیا کرتی تھی۔ (ابن جوزی)

۱۰۰۴۔ انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر بھی سوار ہو جاتے صوف کا بنا ہوا کپڑا بھی پہن لیتے اور غلام کی دعوت بھی قبول فرما لیتے۔ جنگ خیبر میں میں نے آپ کو ایک گدھے

۱۰۰۲۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے وادی میں بھری ہوئی بکریاں لوگوں کو تقسیم کر دی ہیں اور خود دوسروں کے ذرا سے گوشت کی دعوت یا معمولی گوشت کے ٹکڑے کا ہدیہ قبول کرنے میں ذرا عار نہیں رکھتے۔ عبدیت معمولی دعویٰ نہیں اس کا امتحان زندگی کے ہر ہر گوشہ میں ہوتا ہے۔ انسانی ضعف کے نازک مقامات اس کی حیات کے شاندار واقعات نہیں بلکہ روز مرہ کے معمولی واقعات ہیں جہاں اس کو یہ وسوسہ بھی نہیں گزرتا کہ میرے امتحان کے یہ بھی کوئی محل ہو سکتے ہیں۔ یہاں آپ ترجمان السنہ ص ۵،۳ ج ۲ خاص طور پر ملاحظہ فرمائیے۔

۱۰۰۳۔ بادشاہوں کے درباروں میں مخاطبوں پر جو رعب پڑتا ہے وہ ان کی شاہانہ سطوت و شوکت کا اثر ہوتا ہے اور یہاں اس کمال سادگی میں جو رعب تھا وہ آپ کی کمال عبدیت کا اثر تھا۔ جب عبدیت کامل ہو جاتی ہے تو اس کا رعب صرف عام انسانوں ہی تک محدود نہیں رہتا وہ بادشاہوں پر بھی پڑتا ہے بلکہ حیوانات پر بھی اس کا اثر پہنچتا ہے۔

۱۰۰۴۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کی بشریت میں کمال عطا فرما دیتا ہے تو اس کی نظر لباس اور سواری جیسی معمولی اشیاء سے بلند فرما دیتا ہے، وہ وقت و حاجت اور اپنے ملک کے رسم و رواج کے مطابق ہر جائز چیز کے استعمال میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا، وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ اگر بشریت کا کمال حاصل ہو تو لباس یا سواری کی کمتری سے وہ کمتر نہیں ہو سکتا اور اگر وہ بشریت کے کمال سے محروم ہے تو صرف لباس یا سواری کی برتری سے برتر نہیں ہو سکتا۔ صدر ہر جا کہ نشیند صدر است۔ نہ ملک کی مروج اشیاء کے استعمال سے پرہیز کرنا کمال ہے اور نہ زمانہ کی ترقیات سے فائدہ نہ اٹھانا کمال ہے۔ بشر ہا ضرور ایک کمال ہے مگر بشر کا سارا کمال عبدیت کے ساتھ ہے۔

عَلٰی حِمَارٍ خِطَامُہٗ لِیفٌ ۔ رواہ ابوداؤد الطیالسی ۔

۱۰۰۵۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ کَانَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَصْعَۃٌ یَحْمِلُھَا اَرْبَعَۃُ رِجَالٍ یُقَالُ لَھَا الْغَرَّاءُ فَلَمَّا اَضْحَوْا وَسَجَدُوا الضُّحٰی اُتِیَ بِتِلْکَ الْقَصْعَۃِ وَقَدْ ثُرِدَ فِیْھَا فَالْتَفُّوْا عَلَیْھَا فَلَمَّا کَثُرُوْا جَثَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعْرَابِیٌّ مَا ھٰذِہِ الْجِلْسَۃُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَنِیْ عَبْدًا کَرِیْمًا وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا عَنِیْدًا ثُمَّ قَالَ کُلُوْا مِنْ جَوَانِبِھَا وَدَعُوْا ذِرْوَتَھَا یُبَارَکْ فِیْھَا ۔ رواہ ابوداؤد ۔

۱۰۰۶۔ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰی رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَمَعَہٗ صَاحِبٌ

پر سوار دیکھا جس کی باگ کھجور کی چھال کی بنی ہوئی تھی ۔ ابوداؤد الطیالسی ۔

۱۰۰۵۔ عبداللہ بن بسرؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک اتنا بڑا پیالہ تھا جس کو چار آدمی اُٹھا کر لاتے تھے اس کا نام غرار تھا ۔ ایک مرتبہ جب لوگ چاشت کی نماز ادا کرکے حاضر ہوئے تو یہ پیالہ سامنے لایا گیا ۔ اس میں روٹی کے ٹکڑے گوشت کے شوربے میں پکے ہوئے تھے ۔ لوگ اس کے اردگرد بیٹھ گئے ، جب مجمع زیادہ ہوگیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (جگہ کی تنگی کی وجہ) اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اس پر ایک بادیہ نشین شخص نے کہا نشست کا یہ کیا طریقہ ہے ۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک شریف بندہ بنایا ہے متکبر اور سرکش نہیں بنایا ۔ اس کے بعد فرمایا ۔ کنارہ کنارہ سے کھاؤ اور درمیان سے نہ کھاؤ ۔ کھانے میں برکت ہوگی ۔ (ابوداؤد)

۱۰۰۶۔ جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری صحابی کے یہاں

جس بشر میں عبدیت کے بجائے فرعونیت ہو وہ صرف صورت کا بشر ہے بلکہ یہ بھی نہیں ۔ اولئک کالانعام بل ھم اضل

۱۰۰۵۔ پہلے زمانہ میں بڑے بڑے برتنوں کا عام رواج تھا اور اس زمانہ کی صنعت کے لحاظ سے وسیع اور بھاری برتن عمدہ سمجھے جاتے تھے ۔ بالخصوص عرب علیحدہ علیحدہ کھانے کے عادی نہ تھے اس لیے اُن کے یہاں مہمانی کے موقعہ پر لکڑی وغیرہ کے بڑے برتن استعمال ہوتے تھے ۔ ثرید عرب میں عمدہ کھانوں میں شمار ہوتا تھا اور طبی لحاظ سے بھی وہ نہایت زود ہضم ہوتا ہے پھر ایسی نوبت شاذ و نادر آتی تھی کہ کبھی اس قسم کا موقعہ مل جائے ، اس لیے جب ایسا موقعہ مل جاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کو جمع کرلیتے ان میں شہری اور دیہاتی ہر شخص ہوتا ۔ یہ کوئی بادشاہ کا دسترخوان نہ تھا جہاں کسی بے ڈھنگے دیہاتی کو تاب لب کشائی نہ ہوتی جس کے دل میں جو آتا وہ اپنی زبان سے کہہ گزرتا یہاں بھی ایک دیہاتی نے آپ کی اس نشست کو جب خلاف معمول دیکھا تو ٹوکا مگر اس اخلاق پر قربان جائیے کہ آپ کو ذرا ناگوار نہ گزرا بلکہ یہاں بھی دہن مبارک سے جیسے تلے وہ کلمات نکلے جو قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہدایت کا ایک سبق بن گئے یعنی انسانی بندگی اور مزاج کی شرافت یہی ہے کہ ان موقعوں پر دوسروں کا خیال مقدم رکھے تو اس وقت میں میزبان ہوں جگہ کی تنگی میں بھی اپنی راحت کا خیال رکھتا اور ذرا جنبش نہ کرتا یہ تکبر اور سرکشی ہے ۔ یہ ساشا جملہ فرما کر دوسری بات دہن مبارک سے نکلی وہ کھانے کے متعلق ایک عام ہدایت تھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ قلب مبارک پر اس کا ادنیٰ سا میل بھی نہ تھا ۔ سوچ کہ اگر اس زمانہ میں ایسا واقعہ پیش آجائے تو محفل اسی گفت و شنید میں تمام ہوجائے ۔ کیا انسانوں میں کوئی اور بندہ جو اس منصب و اقتدار کے ساتھ اس بندگی کا مالک ہو اور اپنی اس اعلیٰ بندگی کا مجلس میں اس طرح ثبوت دے سکے ۔

لَہٗ فَسَلَّمَ فَرَدَّ الرَّجُلُ وَھُوَ یُحَوِّلُ الْمَاءَ فِیْ حَائِطٍ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنْ کَانَ عِنْدَکَ مَاءٌ بَاتَ فِیْ شَنَّۃٍ وَاِلَّا کَرَعْنَا فَقَالَ عِنْدِیْ مَاءٌ بَاتَ فِیْ شَنٍّ فَانْطَلَقَ اِلَی الْعَرِیْشِ فَسَکَبَ فِیْ قَدَحٍ مَاءً ثُمَّ حَلَبَ عَلَیْہِ مِنْ دَاجِنٍ فَشَرِبَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اَعَادَ فَشَرِبَ الرَّجُلُ الَّذِیْ جَاءَ مَعَہٗ۔ رواہ البخاری۔

الرَّسُوْلُ الْعَظِیْمُ کَانَ یَبْتَلِیْ بِالْجُوْعِ کَمَا یَبْتَلِیْ سَائِرُ الْبَشَرِ

۱۰۰۷۔ عَنْ اَبِیْ طَلْحَۃَ قَالَ شَکَوْنَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْجُوْعَ فَرَفَعْنَا عَنْ بُطُوْنِنَا عَنْ حَجَرٍ حَجَرٍ فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ بَطْنِہٖ عَنْ حَجَرَیْنِ۔ رواہ

تشریف لے گئے، آپ کے ہمراہ ایک صحابی اور تھے۔ آپ نے سلام کیا۔ اس انصاری نے جواب دیا اس وقت وہ اپنے باغ کو پانی دے رہا تھا۔ آپ نے فرمایا میاں اگر کسی پرانی مشک میں باسی پانی موجود ہو تو لے آؤ ورنہ ہم منہ لگا کر ہی پانی پی لینگے۔ اس نے عرض کیا میرے گھر میں پرانی مشک کا باسی پانی موجود ہے یہ کہہ کر وہ اپنے مکان میں گیا اور ایک پیالہ میں پانی نکال کر اس پر گھر کی پلی ہوئی بکری کا تھوڑا سا دودھ دوہا گویا لسی تیار کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نوش فرمایا۔ اس کے بعد وہ پھر گیا اور پھر لسی بنا کر لایا اور جو شخص آپ کے ہمراہ آئے تھے وہ انہوں نے پی۔ (بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک کی شدت اسی طرح پیش آئی جیسا عام بشر کو کبھی پیش آجاتی ہے

۱۰۰۷۔ ابو طلحہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غزوۂ خندق میں شدت بھوک کی شکایت کی اور اپنے اپنے پیٹ کھول کر دکھائے کہ اُن پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

۱۰۰۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تواضع اور اظہار عبدیت کا یہ نقشہ بھی قابل یادداشت ہے کہ اتنی نزاکت و نفاست مزاج کے باوجود جب آپ ایک کسان کے کھیت پر تشریف لے جاتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ بھی شاید اُن ہی جیسے ایک عام انسان ہیں جنہوں نے پانی پینے کے آداب کا ایک باب سکھایا ہو۔ لیکن وہ اس کسان پر بار یک آداب کا بوجھ نہیں ڈالتے بلکہ بڑی سادگی سے فرماتے ہیں کہ میاں اگر باسی پانی نہ مل سکے تو ہم تازہ ہی پی لینگے اور اگر تمہارے پاس برتن نہ ہو تو ہمیں عام عرب کے دستور کے مطابق منہ لگا کر پانی پی لینے میں بھی کوئی عار نہیں ہے۔ مگر جس کے قلب میں حلاوت ایمان رچ چکی تھی وہ اپنے اس سارے جہان سے معزز مہمان کے لیے وہ تکلف کر کے لایا جو ایک مہذب سے مہذب انسان اس موقعہ پر کر کے لا سکتا تھا۔ ادھر یہاں چونکہ دوسرے کی میہمانی تھی اس لیے پہلے آپ نے خود پانی نوش فرمایا پھر اپنے رفیق کو دیا لیکن جہاں آپ خود میزبان کی حیثیت میں ہوتے وہاں پہلے دوسروں کی خاطر فرماتے اور اپنے نفس کو سب کے آخر میں رکھتے کہاں تو یہ شان عبدیت اور کہاں لوگوں کے خیالات خام۔

۱۰۰۷۔ شکم سیری اور بھوک بھی انسان کی ضعیف زندگی کا ایک جزء ہیں۔ رسول اس سنت سے بھی مستثنیٰ نہیں ہوتے

الترمذی وقال هذا حدیث غریب والحدیث مروی فی البخاری فی غزوة الخندق مع تغیر یسیر۔ وراجع ترجمان السنۃ ص ۴۴۹ ج ۱

الرسول العظیم لدغتہ عقرب فاسترقی منہ کما یسترقی منہ سائر البشر

۱۰۰۸۔ عن علی قال بینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات لیلۃ یصلی فوضع یدہ علی الارض فلدغتہ عقرب فناولھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنعلہ فقتلھا فلما انصرف قال لعن اللہ العقرب ما تدع مصلیا ولا غیرہ او نبیا وغیرہ ثم دعا بملح وماء فجعلہ فی اناء ثم جعل یصبہ علی اصبعہ حیث لدغتہ ویمسحھا و

اپنا پیٹ جو کھولا تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ (بخاری شریف و ترمذی شریف)
(یہاں ترجمان السنۃ ص ۴۴۹ جلد اول ضرور ملاحظہ فرمائی جائے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچھو نے ایک بار کاٹا اور آپ نے اس پر اسی طرح دم فرمایا جیسا بشر کو دم کرنا چاہیے

۱۰۰۸۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرما رہے تھے۔ آپ نے اپنا دست مبارک زمین پر رکھا تو کسی بچھو نے آپ کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چپل لے کر اس کو مار دیا جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا خدا تعالیٰ بچھو پر لعنت کرے نہ نمازی کو بخشے نہ غیر نمازی کو یا یہ کہا کہ نہ نبی کو بخشے اور نہ غیر نبی کو اس کے بعد ذرا سا نمک اور پانی منگا کر ایک برتن میں ڈالا اور جس جگہ پر کہ بچھو نے کاٹا تھا اس جگہ اس کو ڈالتے رہے اور معوذتین پڑھ پڑھ کر انگلی پر ہاتھ

بلکہ جس طرح ان کی بیماری دوسروں سے شدید تر ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی وہ دوسروں سے پیش پیش نظر آتے ہیں بھوک میں عام طور پر پیٹ میں ایک خاص قسم کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے، پتھر باندھنے سے کچھ تو اس کی خنکی سے سکون مل جاتا ہے اور کچھ پیٹ کا خلا پُر ہو جاتا ہے اور اس طرح بھوک میں کچھ فائدہ مند ہوتا ہے۔ بہر حال بھوک میں پیٹ سے پتھر باندھنے کا محاورہ اردو میں بھی مستعمل ہے۔ اس شدت کی حالت میں جب صحابہؓ نے مضطرب ہو کر اپنی تکلیف اپنے سب سے شفیق و مہربان رسول کے سامنے پیش کی تو معلوم ہوا کہ ان کا رسول دوہری تکلیف میں ان کا شریک تھا۔
۱۰۰۸۔ اگر ایک طرف حیوانات نے آپ کو سجدہ کیا اور پتھروں نے سلام کیا ہے تو دوسری طرف بچھو نے آپ کو کاٹا بھی ہے پہلی صورت اگر آپ کی نبوت کی علامت تھی تو دوسری آپ کی بشریت کی دلیل تھی۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مبارک و ملعون کی تقسیم حیوانات میں بھی ہے جو حیوانات جبلی طور پر موذی ہیں ان کی ایذا کے لیے شعور شرط نہیں یہ ان کی فطرت ہے۔ نیش عقرب نہ از پے کین است ہ مقتضائے طبیعتش این است۔ پس جب ایک بے شعور بچھو اپنی فطرت کی وجہ سے ملعون ہو سکتا ہے تو ایک ذی شعور انسان کا اپنے اختیاری فعل پر ملعون ہونے میں کیا اشکال ہے۔

يُعَوِّذُهَا بِالْمُعَوِّذَتَيْنِ رواه البيهقي في شعب الإيمان۔

الرسول العظيم سحر مرة فمرض منه كما يمرض سائر البشر

۱۰۰۹۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُحِرَ حَتّٰى كَانَ يَرٰى اَنَّهُ يَأْتِي النِّسَاءَ وَلَا يَأْتِيهِنَّ (قال سفيان وهذا اشد ما يكون من السحر اذا كان كذا) قَالَ فَانْتَبَهَ مِنْ نَوْمِهِ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ يَا عَائِشَةُ أَعَلِمْتِ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَفْتَانِي فِيْمَا اسْتَفْتَيْتُهُ فِيْهِ اَتَانِي رَجُلَانِ فَقَعَدَ اَحَدُهُمَا عِنْدَ رَأْسِي وَالْآخَرُ عِنْدَ رِجْلَيَّ فَقَالَ

پھیرتے اور دم کرتے رہے۔ (بیہقی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو چلایا گیا اور آپ پر بھی اسی طرح چل گیا جیسا عام بشر پر چل جاتا ہے

۱۰۰۹۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو چلایا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے اثر سے آپ کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسا آپ اپنی بیبیوں کے پاس گئے ہیں مگر آپ کو اس کی قدرت نہ ہوتی تھی (سفیان کہتے ہیں کہ جادو کی یہ سب سے سخت تر قسم تھی) یہ کہتی ہیں ایک دن آپ نیند سے بیدار ہوئے اور فرمایا۔ عائشہؓ جانتی ہو آج اللہ تعالیٰ نے جس بات کو میں نے اس سے پوچھا تھا اس کا پتہ دے دیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ دو فرشتے میرے پاس آئے ایک میرے سرہانے بیٹھا اور دوسرا میرے پیروں

۱۰۰۹۔ جادو کی تاثیر اتنی قوی ہوتی ہے کہ اس سے کسی کا بچنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے سورۂ فلق میں جادو کے شر سے استعاذہ کی تعلیم فرمائی گئی ہے گمان ہو سکتا تھا کہ شاید رسول اس سے مستثنیٰ ہوں لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے اثبات کے لیے آپ کی حیات طیبہ میں ایک واقعہ آپ پر جادو چل جانے کا بھی دکھلا دے تاکہ خوب معلوم ہو جائے کہ جن چیزوں سے عام انسان متاثر ہوتے ہیں رسول بھی ان سے متاثر ہو سکتے ہیں پھر ان کے رسول ہونے کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ وہ اس کے ازالہ کے لیے خود جادو چلانے کے بجائے ایسے کلمات استعمال فرماتے ہیں جو قدرت اُن پر نازل فرماتی ہے۔ وہ سحر سے اتنے ممتاز ہوتے ہیں کہ نہ اس میں کہیں ارواح خبیثہ سے استمداد کا حرف ملتا ہے اور نہ کلمات کفریہ کا کوئی لفظ اور اس طرح یہ بدیہی ہو جاتا ہے کہ یہ دوسروں پر تو جادو چلانا کیا جانتے یہ تو اپنے نفس کو بھی جادو سے بچانا نہیں جانتے حافظ ابن قیمؒ سورۂ فلق کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ آپ اس تکلیف میں چھ ماہ تک مبتلا رہے۔ جن میں تین دن تو اس کی تکلیف کی شدت رہی اس طویل مدت میں دشمن یوں خوش رہے کہ ان کا جادو چل گیا اور قدرت نے یہ ثابت کر دیا کہ ساحروں کی نوع سے آپ کو کوئی علاقہ نہ تھا اور جب اس کے ازالہ کا وقت مقدر آ گیا تو اپنے رسول کی شفا کے لیے عالم غیب سے فرشتے نازل فرمائے جنہوں نے مرض کی تشخیص، ساحر کا اتہ پتہ اور شفا کے سب راستے مفصل بیان کر دیے۔ اس کے بعد آپ نے اس جادو کو نکلوا دیا اور جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا عطا فرمائی تو جادوگروں کی طرح آپ کو اس کا وسوسہ بھی نہ آیا کہ اُو اب ان پر جادو چلایا جائے یا کسی اور تدبیر سے ان کو اس کا بدلہ دے دیا جائے بلکہ خاموش ہو گئے اور عام طور پر لوگوں کے سامنے جادو کی

الَّذِیْ عِنْدَ رَأْسِیْ لِلْآخَرِ مَا بَالُ الرَّجُلِ قَالَ مَطْبُوْبٌ قَالَ وَمَنْ طَبَّهٗ قَالَ لَبِیْدُ بْنُ الْاَعْصَمِ رَجُلٌ مِّنْ بَنِیْ زُرَیْقٍ حَلِیْفٌ لِیَهُوْدَ کَانَ مُنَافِقًا قَالَ وَفِیْمَ قَالَ فِیْ مُشْطٍ وَّمُشَاقَۃٍ قَالَ فَاَیْنَ قَالَ فِیْ جُفِّ طَلْعَۃٍ ذَکَرٍ تَحْتَ رَعُوْفَۃٍ فِیْ بِئْرِ ذِیْ اَرْوَانَ قَالَ فَاَتَی الْبِئْرَ حَتّٰی اسْتَخْرَجَہٗ فَقَالَ ھٰذِہِ الْبِئْرُ الَّتِیْ اُرِیْتُھَا وَکَاَنَّ مَاءَھَا نُقَاعَۃُ الْحِنَّاءِ وَکَاَنَّ نَخْلَھَا رُؤُوْسُ الشَّیَاطِیْنِ قَالَ فَاسْتَخْرَجَ قَالَتْ فَقُلْتُ اَفَلَا تَنَشَّرْتَ فَقَالَ اَمَّا اللہُ فَقَدْ شَفَانِیْ وَاَکْرَہُ اَنْ اُثِیْرَ عَلٰی اَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ شَرًّا۔ رواہ البخاری

الرسول الطعیم سُمّ مرۃ فتألم کما یتألم سائر البشر

۱۰۱۰۔ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ یَهُوْدِیَّۃً مِّنْ اَھْلِ خَیْبَرَ سَمَّتْ شَاۃً مَّصْلِیَّۃً ثُمَّ اَھْدَتْھَا لِرَسُوْلِ

کی طرف بیٹھ گیا۔ جو میرے سرہانے بیٹھا تھا اُس نے دوسرے سے کہا ان کو کیا تکلیف ہے۔ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو کیا گیا ہے۔ اس نے کہا کس نے جادو کیا ہے، اس نے کہا لبید بن اعصم نے جو قبیلہ بنی زریق کا ایک آدمی ہے اور یہود کا حلیف ہے۔ یہ شخص منافق تھا اُس نے پوچھا اچھا یہ جادو کس چیز پر کیا ہے۔ اس نے کہا ایک کنگھی اور کنگھی کشیدہ بالوں میں اُس نے پوچھا۔ اچھا تو وہ ٹونا کہاں ہے اُس نے کہا وہ ایک نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں کھ کر ذی اروان کوئیں کے اندر کے پتھر کے نیچے ہے چنانچہ آپ اس کنوے پر تشریف لائے اور اس جادو کو نکالا اور فرمایا یہی کنواں تھا جو مجھ کو دکھایا گیا تھا اس کا پانی ایسا تھا جیسا مہندی کا پانی سُرخ ہوتا ہے اور اس کے ارد گرد درختوں پر ایسی وحشت برستی تھی گویا وہ شیطانوں کے سر ہیں۔ یہ کہتے ہیں آپ نے وہ جادو نکال لیا حضرت عائشہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ نے اس کو کھول کیوں نہیں دیا آپ نے فرمایا۔ مجھ کو تو اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرما دی اور اب مجھ کو یہ بات گوارا نہیں کہ میں کسی کو بھی کسی شر میں مبتلا کروں۔ (بخاری شریف)

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کھلایا گیا اور اس کے اثر سے آپ کو بھی اسی طرح تکلیف ہوئی جیسی بشر کو ہونی چاہیے

۱۰۱۰۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ خیبر کی ایک یہودی عورت نے ایک بھنی ہوئی بکری زہر ملا کر آپ کے سامنے

ان اشیاء کو نکال کر دکھانا بھی پسند نہیں فرمایا مبادا مسلمانوں کو ناگواری ہو اور کوئی نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہو کیا پھر کوئی بندہ جو ایسی شان بندگی دکھا سکے۔

واضح رہے کہ حدیث مذکور میں صاف موجود ہے کہ اس سحر کی تاثیر صرف آپ کی ازدواجی حیات تک محدود تھی اور اس قسم کو سب سے زیادہ سخت جادو مانا گیا تھا۔ انبیاء علیہم السلام نہ امراض سے مستثنیٰ ہوتے ہیں نہ ایسے کلمات کے اثر سے جو

اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الذِّرَاعَ فَاَکَلَ مِنْھَا وَاَکَلَ رَھْطٌ مِّنْ اَصْحَابِہٖ مَعَہٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِرْفَعُوْا اَیْدِیَکُمْ وَاَرْسَلَ اِلَی الْیَھُوْدِیَّۃِ فَدَعَاھَا فَقَالَ سَمَمْتِ ھٰذِہِ الشَّاۃَ فَقَالَتْ مَنْ اَخْبَرَکَ قَالَ اَخْبَرَتْنِیْ ھٰذِہٖ فِیْ یَدِیْ لِلذِّرَاعِ قَالَتْ نَعَمْ قُلْتُ اِنْ کَانَ نَبِیًّا فَلَنْ تَضُرَّہٗ وَاِنْ لَّمْ یَکُنْ نَبِیًّا اِسْتَرَحْنَا مِنْہُ فَعَفَا عَنْھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَمْ یُعَاقِبْھَا وَتُوُفِّیَ اَصْحَابُہُ الَّذِیْنَ اَکَلُوْا مِنَ الشَّاۃِ وَاحْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی کَاھِلِہٖ مِنْ اَجْلِ الَّذِیْ اَکَلَ مِنَ الشَّاۃِ حَجَمَہٗ اَبُوْھِنْدٍ بِالْقَرْنِ وَالشَّفْرَۃِ وَھُوَ مَوْلًی لِبَنِیْ بَیَاضَۃَ مِنَ الْاَنْصَارِ۔ رواہ ابوداؤد والدارمی۔

۱۰۱۱۔ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ مَرَضِہِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْہِ یَا عَائِشَۃُ مَا اَزَالُ اَجِدُ اَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِیْ اَکَلْتُ بِخَیْبَرَ وَھٰذَا اَوَانُ

بطور ہدیہ پیش کی آپ نے اس میں سے کچھ کھایا اور آپ کے بعض صحابہؓ نے بھی کھالیا۔ آپ نے فرمایا کھانے سے ہاتھ اٹھالو اور اس یہودی عورت کے بلانے کے لیے آدمی بھیجا اور اس سے پوچھا تو نے اس بکری میں زہر ملایا ہے۔ اُس نے کہا آپ کو کس نے بتایا۔ آپ نے دست کے اُس ٹکڑے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا جو آپ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ سن کر وہ بولی جی ہاں میں نے اپنے دل میں کہا تھا اگر یہ نبی ہونگے تو ان کو زہر کیا نقصان دیگا اور اگر نبی نہ ہونگے تو ان سے ہماری جان چھوٹ جائیگی۔ آپ نے اس یہودن کو معاف فرمادیا اور اس کو کوئی سزا نہیں دی اور آپ کے جن بعض صحابہ نے وہ گوشت کھالیا تھا اُن کا تو انتقال ہوگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس زہر آلود بکری کے اثر سے ہمیشہ اپنے شانوں کے درمیان سینگی لگوالیا کرتے تھے۔ سینگی لگانیوالا ابوہند انصار کے قبیلہ بنو بیاضہ کا ایک آزاد کردہ غلام تھا اس نے سینگ اور نشتر سے آپ کے سینگی لگائی تھی۔ (ابوداؤد۔ دارمی)

۱۰۱۱۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس بیماری میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا ہے اس میں آپ فرماتے تھے۔ عائشہ! جو زہر آلود کھانا میں نے خیبر میں کھالیا تھا اُس کی تکلیف مجھے ہمیشہ ہی

(بقیہ صفحہ ۲۴۳) کسی مرض کا سبب بن جائیں۔ سحر کی تاثیر کے متعلق آج لوگ منکر ہیں مگر یہ ان کی کوئی جدید تحقیق نہیں ہے معتزلہ کی جماعت پہلے سے اس کی منکر ہے لیکن جس امر کا ثبوت تواتر کے ساتھ آنکھیں مشاہدہ کر چکی ہوں دلائل سے اس کی نفی کرنا محض خام خیالی ہے۔ اس خاص قسم کے سحر کے لیے عرب میں ایک علاج بھی تھا جس کو نشرہ کہتے تھے۔ حدیث میں علاجاً ان کلمات کی اجازت بھی آئی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے اس علاج کا تذکرہ فرمایا۔ مگر آپ نے فرمادیا کہ میرے پروردگار نے مجھ کو سورۂ فلق اور سورۂ والناس کے ذریعے شفاء عطاء فرمادی ہے اس لیے میں علاج نہیں کرتا۔

۱۰۱۱۔ عالم تقدیر نے اس طرح اس یہودی عورت کا عذر بھی زائل کردیا اور اس کے اس جبلّہ کو ناکام بنانے کے لیے ایک مدت تک آپ کو بقید حیات رکھا اور آخر میں جس نوع کی شہادت ختم نبوت کے ساتھ جمع ہوسکتی تھی اس سے

وَجَدْتُ اِنْقِطَاعَ اَبْهَرِیْ مِنْ ذٰلِكَ السَّمِّ۔ رواہ البخاری

الرسول العظیم جرح مرۃ حتی کسرت رباعیتہ فتداوی منہ کما یتداوی سائر البشر

۱۰۱۲۔ عَنْ اَبِیْ حَازِمٍ اَنَّہٗ سَمِعَ سَهْلَ بْنَ سَعْدٍ وَهُوَ يُسْئَلُ عَنْ جُرْحِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَعْرِفُ مَنْ كَانَ يَغْسِلُ جُرْحَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ كَانَ يَسْكُبُ الْمَاءَ وَبِمَا دُوْوِیَ قَالَ كَانَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَغْسِلُهٗ وَعَلِیٌّ يَسْكُبُ الْمَاءَ بِالْمِجَنِّ فَلَمَّا رَأَتْ فَاطِمَةُ اَنَّ الْمَاءَ لَا يَزِيْدُ الدَّمَ اِلَّا كَثْرَةً اَخَذَتْ قِطْعَةً مِنْ حَصِيْرٍ فَاَحْرَقَتْهَا فَاَلْصَقَتْهَا فَاسْتَمْسَكَ الدَّمُ وَكُسِرَتْ

محسوس ہوتی رہی لیکن اب اسی کے زہریلے اثر سے مجھ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ (میرا آخر وقت آگیا ہے) اور میری شہ رگ کٹ گئی ہے۔ (بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار زخمی ہوئے حتی کہ آپ کے دندانِ مبارک شہید ہوگئے آپ نے اس کا علاج اسی طرح کیا جیسا اور بشر کرتے ہیں

۱۰۱۲۔ ابوحازم روایت کرتے ہیں کہ سہل بن سعد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زخم کے متعلق دریافت کیا گیا جو جنگ اُحد میں آپ کو لگا تھا۔ تو انہوں نے سہل بن سعد کا یہ جواب خود سُنا تھا وہ فرماتے تھے میں خوب جانتا ہوں کہ آپ کے زخم کا دھلانے والا اور اس پر پانی ڈالنے والا کون کون تھا اور وہ دوا بھی کیا تھی جو آپ کے زخم پر استعمال کی گئی تھی۔ یہ کہتے تھے کہ حضرت فاطمہؓ آپ کی صاحبزادی تو زخم دھوتی جا رہی تھیں اور حضرت علیؓ ایک ڈھال سے پانی لے کر اس پر ڈالتے جاتے تھے لیکن جب حضرت فاطمہؓ نے دیکھا کہ پانی سے تو خون کسی طرح بند ہوتا نہیں بلکہ دونا دونا اور زیادہ ہی ہوتا جا رہا ہے تو چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور اس کی راکھ لے کر زخم پر لگائی جب کہیں جا کر خون بند ہوا۔ اس جنگ میں آپ کے

نوازنے کی یہ صورت اختیار فرمائی کہ پھر اسی زہر کا اثر ابھرا اور عالم اسباب میں وہی آپ کی وفات کا سبب بن گیا اور اس طرح آپ کو موت شہادت کی فضیلت بھی میسر آگئی۔

۱۰۱۲۔ شکست و فتح کے حالات بھی ایسے ہیں جو مسلم و کافر عام انسانوں میں یکساں رکھے گئے ہیں ہرقل نے جب ابو سفیان سے آپ کے متعلق طویل سوالات کیے ہیں تو ان میں ایک سوال آپ کی فتح و شکست کے متعلق بھی تھا۔ پھر جب اس کو یہ معلوم ہوگیا کہ آپ کو کبھی شکست بھی ہوتی ہے تو وہ بیاختہ بول اٹھا کہ رسولوں کی شان یہی ہے۔ وہ شکست بھی کھاتے ہیں مگر آخر کار بول بالا انہی کا ہوتا ہے سو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اُحد کے میدان میں یہ سنت بھی پوری ہوگئی اور اس درد انگیز نظر کے ساتھ پوری ہوئی کہ رخسارے انور زخمی ہے۔ دانت شہید ہو چکے ہیں اور سر مبارک کا خود چکنا چور ہوگیا ہے

رُبَاعِيَتَهُ يَوْمَئِذٍ وَجُرِحَ وَجْهُهُ وَكُسِرَتِ الْبَيْضَةُ عَلَى رَأْسِهِ۔ رواه البخاری فی المغازی ۵۸۴

الرسول العظیم کان یھمہ کما یھم سائر البشر

۱۰۱۳۔ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ لِنِسَائِهِ اِنَّ اَمْرَكُنَّ مِمَّا يُهِمُّنِيْ مِنْ بَعْدِيْ وَلَنْ يَّصْبِرَ عَلَيْكُنَّ اِلَّا الصَّابِرُوْنَ الصِّدِّيْقُوْنَ قَالَتْ عَائِشَةُ يَعْنِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ثُمَّ قَالَتْ عَائِشَةُ لِاَبِيْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ سَقَى اللهُ اَبَاكَ مِنْ سَلْسَبِيْلِ الْجَنَّةِ وَكَانَ ابْنُ عَوْفٍ قَدْ تَصَدَّقَ عَلٰى اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِحَدِيْقَةٍ بِيْعَتْ بِاَرْبَعِيْنَ

سامنے کے چار دانت شہید ہوئے، روئے انور زخمی ہوا اور آپ کے سر مبارک پر جو خود تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ (بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان امور کی فکر لاحق ہوتی تھی جن کی فکر بشر کو فطرۃً لاحق ہونی چاہیے

۱۰۱۳۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیبیوں سے فرمایا کرتے تھے۔ تمہارا معاملہ بھی ایسا ہے جس کی مجھ کو اپنے بعد فکر ہے اور تمہاری نگرانی میں حصہ لینے والے صرف وہی لوگ ہونگے جو بڑے ضبط و ہمت والے ہونگے۔ یہ حدیث بیان فرما کر حضرت عائشہؓ ابو سلمہؓ کے لیے دعائیہ کلمات فرمایا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے والد کو جنت کے اس چشمہ کے پانی سے سیراب کرے جس کا نام سلسبیل ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد عبدالرحمٰن بن عوف نے امہات المومنین کی خدمت میں ایک باغ پیش کیا

کیا اب بھی اس شبہ کا کوئی موقعہ ہے کہ رسول بشر نہیں ہوتے۔ رسولوں کی جو سنت نہیں جانتے یہاں ان کو اگر تردد ہو تو ہو مگر جو اس سے واقف تھے ان میں شاہ ہرقل جیسے دانا نے تو آپ کی شکست ہی کو صداقت کی علامات میں شمار کیا تھا

۱۰۱۳۔ یہ پہلے بار بار گذر چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی فطرت ان تمام چیزوں سے متاثر ہوتی ہے جن سے کہ بشری فطرت کو متاثر ہونا چاہیے وہ جس طرح بھوک پیاس اور سرد و گرم کے احساس میں عام بشر کے شریک ہوتے ہیں اسی طرح مسرت و غم میں بھی ان کے شریک ہوتے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا انتقال ہوا تو آپ غمگین ہوئے اور آپ کی چشم مبارک سے آنسو بہ نکلے۔ اسی طرح بیبیوں کا بھی معاملہ ہے ان کے متعلق بھی آپ کو اس حد تک فکر تھی جس حد تک بشر کو ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ آپ نے ان کے لیے خاص طور پر مال و اسباب کا کوئی ذخیرہ نہیں چھوڑا تھا، مگر جس امر میں یہاں بھی انبیاء علیہم السلام کا امتیاز ہوتا ہے وہ ان کے ان صبر آزما حالات میں ان کے استقامت اور شرعی حدود کا پورا پورا تحفظ ہے۔ وہ بھی جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ بڑی خندہ پیشانی اور فراخدلی سے۔ ان کے قلب پر اس کا وسوسہ بھی نہیں گزرتا کہ ان حالات میں ان کا قدم حدود شریعت سے سر مو ادھر اُدھر جائے۔ یہاں جس طرح ان کا احساس غم ان کی فطرت ہوتی ہے اس سے بڑھ کر اپنی شریعت کی حدود کا تحفظ بھی ان کی فطرت ہوتی ہے پھر یہ فطری احساسات بھی قدرت ان میں اس لیے ودیعت فرماتی ہے تاکہ وہ عام بشر کے لیے ان حالات کی سنت کا عملی نمونہ پیش کر سکیں۔ گزشتہ صفحات میں انسانی حیات کے معمولی سے معمولی حوادث آپ نے ملاحظہ فرمائے اور حدیثوں میں اس قسم کے علاوہ بھی اور بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن ان تمام مقامات میں آپ اسی سنت اللہ کے ماتحت نظر آئے جو نوع انسانی کے لیے روز اول سے مقدر ہو چکی ہے کیا یہ آپ کی بشریت کا قطعی ثبوت نہیں۔

الفًا۔ رواہ الترمذی

الرسول العظیم لحق بالرفیق الاعلٰی علٰی سنۃ سائر البشر

۱۰۱۴۔ عَنْ اَبِیْ سَلَمَۃَ اَنَّ عَائِشَۃَ زَوْجَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَتْہُ قَالَتْ اَقْبَلَ اَبُوْبَکْرٍ عَلٰی فَرَسِہٖ مِنْ مَسْکَنِہٖ بِالسُّنْحِ حَتّٰی نَزَلَ فَدَخَلَ الْمَسْجِدَ فَلَمْ یُکَلِّمِ النَّاسَ حَتّٰی دَخَلَ عَلٰی عَائِشَۃَ فَتَیَمَّمَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ مُسَجًّی بِبُرْدِ حِبَرَۃٍ فَکَشَفَ عَنْ وَجْھِہٖ ثُمَّ اَکَبَّ عَلَیْہِ فَقَبَّلَہٗ ثُمَّ بَکٰی فَقَالَ بِاَبِیْ اَنْتَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ لَا یَجْمَعُ اللّٰہُ عَلَیْکَ مَوْتَتَیْنِ اَمَّا الْمَوْتَۃُ الَّتِیْ کُتِبَ اللّٰہُ عَلَیْکَ فَقَدْ مُتَّھَا قَالَ اَبُوْ سَلَمَۃَ فَاَخْبَرَنِی ابْنُ عَبَّاسٍ اَنَّ اَبَابَکْرٍ خَرَجَ وَعُمَرُ

تھا جو چالیس ہزار درہم میں فروخت ہوا تھا۔ (ترمذی شریف)

بشری سنت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر آخرت

۱۰۱۴۔ ابوسلمہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بی بی صاحبہ یعنی حضرت عائشہؓ نے ان سے بیان کیا کہ ابوبکرؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات سن کر) اپنی قیام گاہ مقام سنح سے گھوڑے پر سوار ہو کر تشریف لائے اور یہاں آکر مسجد میں داخل ہوئے اور کسی سے بات کیے بغیر حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف لے گیے اور سیدھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا پہنچے۔ آپ پر اس وقت ایک یمنی چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ انھوں نے آپ کے چہرۂ مبارک سے چادر اٹھائی اور جھک کر آپ کو بوسہ دیا اور رو پڑے اور فرمایا یا نبی اللہ آپ پر میرے باپ قربان اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں کبھی جمع نہیں کریگا، جو موت اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مقدر فرمائی تھی وہ تو آپ کو آچکی ہے۔ ابوسلمہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ اس کے بعد ابوبکرؓ باہر تشریف لائے تو عمرؓ

روایت مذکورہ بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امہات المومنین کا مقام حضرت رسالت میں کیا تھا اسی لیے ائمہ حدیث نے حدیث مذکور کو مناقب کے باب میں ذکر فرمایا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ جن نفوس طاہرہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول کی دمسازی کے لیے انتخاب فرمایا تھا ان سے رسول کی ذات اقدس کا تعلق بھی اسی دلسوزی کا ہونا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات تلطف امہات المومنین کی بزرگی و عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱۰۱۴۔ موت انسان کی بشریت کا آخری ثبوت ہے۔ جو شخص ولادت اور موت جیسے واضح عوارض کو بھی بشریت کی دلیل نہیں سمجھتا وہ پھر خدا تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی فرق نہیں سمجھ سکتا۔ اس حدیث سے یہ احکام ثابت ہوتے ہیں۔ وفات کے بعد آپ پر چادر ڈھانکنا۔ آپ کے روئے انور کو بوسہ دینا۔ وفات کے بعد آپ کو یا نبی اللہ سے خطاب کرنا۔ آپ کی وفات کا منبر پر اعلان کرنا اور یہ خطبہ دینا کہ عبادت کے قابل صرف وہی ایک ذات ہے جس کو

يُكَلِّمُ النَّاسَ فَقَالَ اِجْلِسْ فَاَبٰى فَقَالَ اِجْلِسْ فَاَبٰى فَتَشَهَّدَ اَبُوْبَكْرٍ فَمَالَ اِلَيْهِ النَّاسُ وَتَرَكُوْا عُمَرَ فَقَالَ اَمَّا بَعْدُ فَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اِلَى الشَّاكِرِيْنَ. وَاللّٰهِ لَكَاَنَّ النَّاسَ لَمْ يَكُوْنُوْا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اَنْزَلَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ حَتّٰى تَلَاهَا اَبُوْبَكْرٍ فَتَلَقَّاهَا مِنْهُ النَّاسُ فَمَا يَسْمَعُ بَشَرٌ اِلَّا يَتْلُوْهَا۔ (رواہ البخاری)

الانبياء عليهم السلام لهم مميزات وفرز ايا يمتازون بها عن سائر البشر

۱۰۱۵۔ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ فِى الصَّوْمِ

لوگوں سے کچھ فرما رہے تھے۔ صدیق اکبرؓ نے اُن سے فرمایا آپ بیٹھ جائیں لیکن وہ نہ مانے آپ نے اُن سے پھر کہا آپ بیٹھ جائیں، مگر انہوں نے پھر انکار کیا۔ اس پر صدیق اکبرؓ نے خود خطبہ دینا شروع کر دیا لوگ عمرؓ کو چھوڑ کر فوراً ان کی جانب متوجہ ہو گئے انہوں نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا ہو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تو انتقال ہو گیا۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے، اس کو موت کبھی نہیں آئیگی۔ اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ الشاکرین تک۔ یہ خطبہ سن کر لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ صدیق اکبرؓ کے تلاوت فرمانے سے قبل یہ آیت اللہ تعالیٰ نے گویا نازل ہی نہیں فرمائی تھی (اور آج ہی نازل ہوئی ہے) اس کے بعد جس نے بھی اس آیت کو سنا وہی اس کو تلاوت کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ (بخاری شریف)

حضرات انبیاء علیہم السلام میں بہت سی خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ تمام نوعِ بشر سے ممتاز بھی ہوتے ہیں

۱۰۱۵۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ممانعت فرمائی کہ دو روزے

کبھی فنا نہیں وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگا۔

عربی میں نداء کے بہت سے اقسام ہیں۔ نثر و نظم میں غائب و حاضر اسی طرح حی و میت بلکہ جمادات کو ندائیہ کلمہ سے یاد کرنا ان کا عام دستور تھا بعض اس لفظ سے عقائد بگاڑ لینے اور کفر کے فتوے لگا دینے دونوں علم سے ناواقفیت اور مبالغہ کی باتیں ہیں، جس کو اپنے ایمان کی قدر ہو اس کو شرکیہ عقائد سے دور دور رہنا چاہیے اور اسی طرح بات بات پر کفر کے فتوے لگانے سے بھی احتراز رکھنا چاہیے۔

فَقَالَ رَجُلٌ إِنَّكَ تُوَاصِلُ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ وَأَيُّكُمْ مِثْلِي إِنِّي أَبِيتُ يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِ (متفق عليه)

۱۰۱۶۔ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ حُدِّثْتُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلٰوةُ الرَّجُلِ قَاعِدًا نِصْفُ الصَّلٰوةِ قَالَ فَأَتَيْتُهُ فَوَجَدْتُهُ يُصَلِّي جَالِسًا فَوَضَعْتُ يَدِي عَلٰى رَأْسِهِ فَقَالَ مَا لَكَ يَا عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرٍو قُلْتُ حُدِّثْتُ يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّكَ قُلْتَ صَلٰوةُ

درمیان میں افطار کیے بغیر ایک ساتھ رکھے جائیں۔ اس پر ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ آپ تو ایسا بھی کر لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جی ہاں مگر کیا تم میں کوئی میری طرح ہے؟ میں شب بسر کرتا ہوں اس حالت میں کہ میرا رب مجھ کو کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ (متفق علیہ)

۱۰۱۶۔ عبداللہ بن عمرو نقل کرتے ہیں کہ مجھ سے یہ بیان کیا گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آدمی کے نوافل کا ثواب جو بیٹھ کر پڑھے جائیں نصف نماز کا ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہیں اتفاق ایسا ہوا کہ میں جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت آپ کو بیٹھ کر ہی نوافل پڑھتے پایا۔ میں نے آپ کے سر مبارک پر اپنا ہاتھ رکھا آپ نے پوچھا عبداللہ بن عمرو! کہو کیا بات ہے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ آپ نے یہ فرمایا تھا

۱۰۱۵۔ انبیاء علیہم السلام بشر ضرور ہوتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ بالکل ایسے ہی بشر ہوتے ہیں جیسے کہ عام بشر ہوا کرتے ہیں بلکہ وہ ان سے اتنے ممتاز بھی ہوتے ہیں کہ اگر یک وقت دونوں پر نظر ڈالی جائے تو یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا وہ علیحدہ علیحدہ دو صنفوں کے افراد ہیں۔ متنبی مشہور شاعر نے ایک ہی صنف میں اشتراک کے باوجود ان کے افراد میں امتیاز کی معقولیت کو کیا خوب انداز سے ادا کیا ہے وہ کہتا ہے:

وان تفق الانام وانت منهم ❊ فان المسك بعض دم الغزال

اے ممدوح اگر تو مخلوق میں شامل ہو کر پھر ان سب پر فوقیت رکھتا ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے آخر مشک بھی تو اسی ہرن کے خون کا ایک حصہ ہوتا ہے لیکن پھر ان دونوں میں کیا نسبت وہ متعفن اور یہ معطر وہ ناپاک و یہ پاک پس اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی نفس بشریت میں گو سب انسانوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں لیکن پھر ان سے مشک کی طرح ممتاز بھی ہوتے ہیں، صرف اپنی سیرت ہی میں نہیں بلکہ اپنے جسم و جوارح میں بھی اور ان کے خواص میں بھی انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع تو بہت بلند ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ ان کی بیبیاں بھی عام عورتوں سے کچھ علیحدہ شان کی ہوتی ہیں۔ یانساء النبی لستن کاحد من النساء اے نبی کی بیبیو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو تمہاری بات ان سے بالکل الگ ہے۔ پس جس طرح کہ امہات المومنین صنف نساء میں شامل ہونے کے بعد پھر احکام میں ان سے ممتاز بھی تھیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام بشر ہو کر ان سے ممتاز بھی ہوتے ہیں۔ دیکھو اس حدیث میں کس صفائی کے ساتھ آپ نے فرمایا کہ میری بشریت کے سب خواص وہی نہیں ہیں جو تمہاری بشریت کے ہیں، میری بشریت آب و غذا میں بھی تم سے مختلف ہے۔ پھر یہاں آب و غذا کی نوعیت جو بھی ہو مگر عبارت کا کتنا حسن ہے کہ آپ نے اس کو بھی شب کے ساتھ مقید فرما دیا ہے، اگر "ابیت" کی بجائے "انی اصبح" فرما دیتے۔ یعنی میں صبح کرتا ہوں اس حالت پر الخ تو عام انسانوں کے لیے آب و غذا کے ساتھ روزہ کی حقیقت کا قائم رکھنا کتنا بھاری ہو جاتا۔ یہ علیحدہ بحث تھی کہ جو غذا آپ کو ملتی تھی روزہ اس سے افطار ہو سکتا بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال اگر ایک طرف انبیاء علیہم السلام میں بشریت کی وہ عام صفات موجود ہوتی ہیں جو ان کی بشریت کا بدیہی ثبوت ہوتی ہیں تو اسی کے ساتھ دوسری

(بقیہ بر صفحہ ۲۵۰)

الرَّجُلِ قَاعِدًا عَلٰى نِصْفِ الصَّلٰوةِ وَاَنْتَ تُصَلِّيْ قَاعِدًا قَالَ اَجَلْ وَلٰكِنِّيْ لَسْتُ كَاَحَدٍ مِنْكُمْ (رواہ مسلم)

مِنْهَا مَا يَتَعَلَّقُ بِيَدِهِ الْكَرِيْمَةِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

۱۰۱۷۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَكٰى نَفَثَ عَلٰى نَفْسِهِ وَمَسَحَ عَنْهُ بِيَدِهِ فَلَمَّا اشْتَكٰى وَجَعَهُ الَّذِيْ تُوُفِّيَ فِيْهِ كُنْتُ اَنْفُثُ عَلَيْهِ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَ

کہ آدمی جو نماز بیٹھ کر پڑھتا ہے اس کا ثواب اس کو نصف ملتا ہے۔ اور آپ تو بیٹھ کر ہی نماز ادا فرما رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا جی ہاں میں نے یہ ضرور کہا ہے لیکن میری بات اور ہے مجھے اپنے اوپر قیاس نہ کرو، میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ (مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی امتیازی خصوصیت

۱۰۱۷۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب بیمار ہوتے تو پہلے اپنے ہاتھوں پر آپ معوذات پڑھ کر دم کرتے اس کے بعد ان کو اپنے سارے جسم پر پھیر لیتے۔ جب ایسا ہوا کہ آپ کی آخری بیماری ہوئی تو میں یوں کرتی کہ معوذات پڑھ کر دم تو خود کرتی لیکن جب ہاتھ پھیرنے کا نمبر آتا تو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴۹) طرف ان میں وہ صفات بھی موجود ہوتی ہیں جو عام بشریت سے ان کی فوقیت کا اس سے زیادہ بدیہی ثبوت ہوتی ہیں۔

۱۰۱۶۔ جو بات عام طور پر صحابہؓ کے ذہن نشین تھی وہ یہی تھی کہ شرعی احکام میں خدا کے رسول بھی عام بشر کے شریک رہتے ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو صاف کر دیا کہ اس کی شرکت کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اب کسی جہت سے کوئی امتیاز ہی نہیں رکھتے وہ عبادت کی شدت اور اس کی خفت دونوں میں عام بشر سے ممتاز ہوتے ہیں۔ صوم وصال یعنی افطار کیے بغیر دو یا زیادہ روزے مسلسل رکھنا جس طرح ان ہی کی شان ہوتی ہے، اسی طرح بیٹھ کر نوافل کا پورا ثواب ملنا بھی ان ہی کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ ثواب کا دار ومدار صرف مشقت ہی پر نہیں اس کا انحصار نظر ربوبیت کی پسندیدگی پر ہے۔ نیز انبیاء علیہم السلام کے عمل سے ہی چونکہ جواز و عدم جواز کا ثبوت ملتا ہے اس لیے جائزات پر عمل کرنے میں بھی ان کو واجبات کا ثواب ملتا ہے۔

۱۰۱۷۔ یوں تو آپ کے دست مبارک کے اعجازی کرشمے بہت سی حدیثوں میں آتے ہیں۔ انگشتان مبارک سے چشمے بھی جاری ہوئے، ایک اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے بھی ہو گئے اور ایک اشارہ سے مدینہ طیبہ سے ہٹ کر بادلوں نے اطراف کا رخ کر لیا وغیرہ وغیرہ۔ ترجمان ص ۲۷۰ ج ۲ و ص ۲۱ ج ۲ ملاحظہ فرمائیے آپ کو ثابت ہوگا کہ آپ کے دست مبارک کی ایک ضرب سے یقین کی وہ کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ عالم قدس گویا آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ لیکن حدیث مذکور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ شفاء میں شفاء کی خاصیت عام معجزات کی طرح وقتی اور غیر اختیاری نہ تھی بلکہ اس کا طبعی اثر تھا۔ یہاں حضرت عائشہؓ کی فہم کتنی قابلِ داد ہے کہ وہ اس رمز کو جانتی تھیں اور اس لیے آپ کی بیماری کے معمول کو اس طرح پورا کرتی تھیں کہ جہاں تک معوذات پڑھنے کا تعلق تھا وہ تو خود پڑھ

أَمَسُّ بِيَدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. متفق علیہ

خود آپ ہی کا دست مبارک لے کر آپ کے جسم اطہر پر پھیرتی۔ (متفق علیہ)

لیتیں اور بیماری میں آپ کو اس کی تکلیف نہ دیتیں لیکن جہاں دیکھتیں کہ اب یہاں وہ نیابت سے قاصر ہیں وہاں مجبور ہو کر آپ ہی کے دست مبارک کو استعمال کرتیں۔ معلوم ہوا کہ نبی کے ہاتھ میں کوئی امتیازی خاصیت ہوتی ہے جس میں عام بشر تو کیا امہات المؤمنین بھی شرکت نہیں رکھتیں۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جس طرح عام بشر سے اپنی روحانی قوتوں میں ممتاز ہوتے ہیں اسی طرح جسمانی طاقتوں میں بھی ممتاز ہوتے ہیں۔ اپنی سامعہ، باصرہ، شامہ اور ذائقہ سب ہی طاقتوں میں۔ دیکھو تفسیر کبیر ص ۲۵۵ ج ۲۔

حافظ سیوطیؒ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک سے پتھروں کے نرم ہو جانے کے متعلق سوال و جواب کی شکل میں تحریر فرماتے ہیں:۔

هل ورد فی کتب الحدیث ان سیدنا ابراهیم علی نبینا وعلیه افضل الصلوٰة اثرت قدماه فی الحجر الذی کان یبنی علیه البیت وهو المقام .... نعم. ورد ذلك. اخرجه الازرقی فی تاریخ مكة من طریق ابی سعید الخدری رضی اللّٰه تعالیٰ عنه عن عبد اللّٰه بن سلام رضی اللّٰه تعالیٰ عنه موقوفاً علیه بسند صحیح واخرجه عبد بن حمید فی تفسیره عن قتادة. اما الان الصخرة للنبی صلی اللّٰه علیه وسلم فثبت فی حفر الخندق ولم یکتب غیر هذا۔ الحاوی ج ۲ ص ۱۰۱

کیا کتب حدیث میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ جس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر بیت اللہ کی تعمیر فرمائی تھی اس پر آپ کے قدم مبارک کا نشان پڑ گیا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک عبداللہ بن سلامؓ سے ازرقی کی تاریخ مکہ میں اس پر ایک روایت بسند صحیح موجود ہے مگر وہ موقوف ہے اور عبد بن حمید نے بھی حضرت قتادہؓ سے اس کو نقل کیا ہے۔ رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پتھر کا نرم ہونا تو وہ صرف غزوہ خندق میں تو ثابت ہے اس کے سوا ثابت نہیں۔

حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کی تاثیر کا کرشمہ تو حافظ سیوطی نے تسلیم کیا ہے گو وہ موقوف ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کے متعلق جو عام حکایات مشہور ہیں اس کے بسند صحیح ثبوت کا قطعی انکار کر دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ اس جگہ ان ناحق پسندوں کو غور کر لینا چاہیے جو محدثین کو مورخین کے درجہ میں بھی رکھنا نہیں چاہتے کہ ان کا جو متوسط مزاج طبقہ تھا نقد حدیث میں ان کا ذوق بھی کتنا بلند اور منصفانہ تھا۔ شیخ جلال الدین سیوطیؒ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فضائل کے باب میں خاص طور پر نقد کا معیار سخت نہیں رکھا اس کے باوجود جو فضیلت ان کے علم میں کسی ادنیٰ معیار پر بھی اتر نہیں سکی خواہ وہ کتنی ہی شہرت رکھتی تھی مگر انہوں نے اس کا ثبوت تسلیم نہیں کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں اگر اس کو تسلیم بھی کیا ہے تو اس کے مرفوع ہونے کا اقرار نہیں کیا اور صاف تحریر فرما دیا ہے کہ یہ صرف عبداللہ بن سلامؓ اور حضرت قتادہؓ کا بیان ہے۔ پھر یہ کتنا ظلم ہے کہ اتنے محتاط حضرات کو بھی غیر محتاط کہہ دیا جائے اور اپنے خیالات کو ان لوگوں کے اوپر بھی فوقیت دے دی جائے جن کے سامنے حدیثوں کے دفتر ہمہ وقت کف دست رہا کرتے تھے۔ ہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی ایک ضرب سے پتھر کا ریزہ ریزہ ہو جانا چونکہ غزوۂ خندق میں بسند صحیح ثابت تھا اس لیے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ کو انبیاء علیہم السلام کے دست مبارک یا قدم مبارک کے اثر سے ایک پتھر کا نرم ہونا قابل تعجب معلوم ہوتا ہے اور وہاں قرآن کریم حضرت داؤد علیہ السلام کے حق میں لوہے کا نرم ہو جانا نقل کرتا ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ آپ کے نزدیک قرآنی بیان اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کی حقیقت بھی صرف ایک عام محاورہ کے برابر ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ اگر قرآن کریم صرف اس دور کے لیے محدود ہوتا جبکہ لوہے کی زرہ بنانے میں طرح طرح کی مشکلات حائل تھیں جب بھی اِلانۃ حدید کو صرف ایک محاورہ سمجھ لینا اس کے سیاق و سباق کے بالکل (باقی برصفحہ ۲۵۲)

منها ما يتعلق بحاسة الذوق

۱۰۱۸۔ عَنْ عَاصِمِ بْنِ كُلَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جَنَازَةٍ فَرَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ عَلَى الْقَبْرِ يُوصِي الْحَافِرَ يَقُولُ أَوْسِعْ مِنْ قِبَلِ رِجْلَيْهِ أَوْسِعْ مِنْ قِبَلِ رَأْسِهِ فَلَمَّا رَجَعَ اسْتَقْبَلَ دَاعِيَ امْرَأَتِهِ فَأَجَابَ وَنَحْنُ مَعَهُ فَجِيءَ بِالطَّعَامِ فَوَضَعَ يَدَهُ ثُمَّ وَضَعَ الْقَوْمُ فَأَكَلُوا فَنَظَرْنَا إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلُوكُ لُقْمَةً فِي فِيهِ ثُمَّ قَالَ أَجِدُ لَحْمَ شَاةٍ أُخِذَتْ بِغَيْرِ إِذْنِ أَهْلِهَا فَأَرْسَلَتِ الْمَرْأَةُ تَقُولُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنِّي أَرْسَلْتُ إِلَى النَّقِيعِ وَهُوَ مَوْضِعٌ يُبَاعُ فِيهِ الْغَنَمُ لِيَشْتَرِيَ لِي شَاةً فَلَمْ تُوجَدْ فَأَرْسَلْتُ إِلَى جَارٍ لِي قَدِ اشْتَرَى شَاةً أَنْ يُرْسِلَ بِهَا إِلَيَّ بِثَمَنِهَا فَلَمْ يُوجَدْ فَأَرْسَلْتُ إِلَى امْرَأَتِهِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت ذائقہ کی امتیازی خصوصیت

۱۰۱۸۔ ایک انصاری صحابی کہتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازہ کی شرکت کے لیے نکلے میں نے دیکھا کہ آپ قبر کے اوپر سے گورکن کو یہ ہدایت فرماتے جاتے تھے دیکھنا ذرا پائنتی کی جانب سے اور کشادہ کرنا ذرا سرہانے کی جانب سے اور کشادہ کرنا۔ جب اس کو دفن کرکے آپ واپس ہوئے تو سامنے سے اس کی بیوی کی جانب سے ایک شخص آپ کو بلانے کے لیے آیا۔ آپ اس کے ہمراہ ہولیے اس وقت ہم بھی آپ کے ساتھ تھے آپ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا حسب دستور کھانے کے لیے پہلے آپ نے ہاتھ بڑھایا اس کے بعد صحابہ نے ہاتھ بڑھائے اور کھانا شروع ہوگیا۔ ہم نے دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لقمہ چبا رہے ہیں مگر نگلتے نہیں۔ اس کے بعد فرمایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گوشت کسی ایسی بکری کا ہے جو مالک کی اجازت کے بغیر حاصل کی گئی ہے۔ میت کی بیوی نے جواباً کہلا بھیجا یا رسول اللہ! واقعہ یہ ہے کہ میں نے مقام نقیع کے بازار میں جہاں بکریاں فروخت ہوتی تھیں ایک آدمی بھیجا تھا کہ وہ میرے لیے ایک بکری خرید لائے جب وہاں بکری نہ ملی تو میں نے اپنے ایک پڑوسی کے پاس آدمی بھیجا۔ اس نے ایک بکری خریدی تھی کہ جس قیمت میں اس نے وہ خریدی ہو اسی قیمت میں وہ مجھے بھیج دے۔ اتفاقاً وہ نہ ملا پھر میں نے اس کی بیوی کے پاس

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۵۱) خلاف تھا مگر جبکہ عقیدہ یہ ہو کہ قرآن عظیم قیامت تک کے لیے حکمت و موعظت کی کتاب ہے تو انصاف کیجیے کہ آج کی روشنی میں داؤد علیہ السلام کے اس معجزہ کو اگر صرف آپ کے مزعومہ خیال پر رکھا جائے تو اس کے پڑھنے والوں کا نظروں میں اس معجزہ کی حقیقت کتنی مضحکہ خیز ہو کر رہ جائے گی۔

فَاَرْسَلَتْ اِلَیَّ بِهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَطْعِمِیْ هٰذَا الطَّعَامَ الْاُسَارٰی. رواہ ابوداؤد والبیھقی فی دلائل النبوۃ۔

مِنْهَا مَا يَتَعَلَّقُ بِصَوْتِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

۱۰۱۹۔ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَلَسَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ لِلنَّاسِ اِجْلِسُوْا فَسَمِعَهٗ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ رَوَاحَةَ وَهُوَ فِیْ غَنَمٍ فَجَلَسَ فِیْ مَكَانِهٖ رواہ البیھقی وابونعیم کما فی الخصائص۔ ص ٦٦ ج ١۔

۱۰۲۰۔ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ مُعَاذِ التَّيْمِیِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِنًی فَفُتِحَتْ اَسْمَاعُنَا وَفِیْ لَفْظٍ فَفَتَحَ اللّٰهُ اَسْمَاعَنَا حَتّٰی اِنْ كُنَّا لَنَسْمَعُ

آدمی بھیجا اس نے مجھ کو یہ بکری بھیج دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر اس کھانے کو قیدیوں کو کھلادو۔ (ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کا ایک کرشمہ

۱۰۱۹۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن جب ممبر پر خطبہ کے لیے بیٹھے تو آپ نے لوگوں سے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ آپ کی یہ آواز عبداللہ بن رواحہ کے کان میں بھی پہنچ گئی اس وقت وہ بکریوں میں تھے آپ کی آواز کا سُننا تھا کہ وہ فوراً وہیں بیٹھ گئے۔ (الخصائص)

۱۰۲۰۔ عبدالرحمن بن معاذؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں ہمارے سامنے خطبہ دیا تو اس کو سُننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمارے کان اس طرح کھول دیے تھے کہ ہم تمام حجاج جہاں جہاں تھے

۱۰۱۸۔ اس تلخ و شیریں کا احساس تو عام بشر کی زبانیں بھی کر لیتی ہیں، مگر نبی و رسول وہ ہوتے ہیں جن کی زبان حلال و حرام کا بھی احساس کرتی ہے۔ سبحان اللہ۔ اسلام کتنا نازک اور کتنا پاکیزہ مذہب ہے کہ اس کے نزدیک ضیافت کا کھانا قیدی (مسوارا) اجازت کے بعد بھی کھانے کے قابل نہیں ہوتا وہ لیسے ہی مصرف میں آسکتا ہے جہاں زیادہ چھان بین کا محل نہ ہو۔ جو لوگ میت کے مال میں قرض اور تقسیم وراثت سے قبل ہی کھانے پکا پکا کر خود کھا لیتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ اس قسم کے کھانے اور اس قسم کے کھانے والوں سے میت کو ثواب ملتا ہے وہ ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر بھی غور کریں۔

۱۰۲۰۔ ہوا کی مخالفت و موافقت سے اور آواز کی قدرۃً بلندی و پستی کی وجہ سے دور تک آواز کے پہنچنے نہ پہنچنے کا فرق تو عام بشر میں بھی ہوجاتا ہے مگر ایک ہی انسان میں اس کے معمول کے برخلاف اس کی آواز ہر خیمہ میں اس طرح جا پہنچی جیسے وہ یہاں کھڑا بات کر رہا ہے کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام ہی میں ثابت ہوتا ہے۔ صحابہ بھی کتنے فہیم، کتنے باایمان اور مستحکم عقیدہ کے لوگ تھے کہ نہ تو انہوں نے آپ کی اس غیر معمولی آواز کو ہوا کی موافقت کا کرشمہ سمجھا اور نہ اس کو غیر معقول

مَا يَقُولُ وَنَحْنُ فِي مَنَازِلِنَا۔ رواہ ابن سعد کما فی الخصائص۔

منها ما يتعلق بحاسة البصر

۱۰۲۱۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ اُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَاَقْبَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ وَتَرَاصُّوْا فَاِنِّيْ اَرَاكُمْ مِنْ وَّرَاءِ ظَهْرِيْ۔ رواہ البخاری۔ وراجع ترجمان السنۃ ص ۴۳۶ ج ۱۔

۱۰۲۲۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِسْتَوُوْا اِسْتَوُوْا فَوَالَّذِيْ

بیٹھے ہوئے آپ کی آواز سب وہیں سُن رہے تھے (خصائص)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک کی امتیازی خصوصیت

۱۰۲۱۔ انسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ جماعت کھڑی ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف اپنا رُخ پھیر کر فرمایا۔ اپنی صفیں سیدھی کرو اور خوب مل مل کر کھڑے ہو، کیونکہ میں تم کو اپنی پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں۔ بخاری شریف

۱۰۲۲۔ انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسولؐ فرمایا کرتے تھے (جماعت میں) سیدھے سیدھے کھڑے ہو جاؤ، اُس

تصور کی بلکہ ریڈیو آسانی کے ساتھ یہی حل کر لیا کہ جس قدرت نے ہم کو ایک محدود فاصلہ پر شنوائی کی قوت عطا فرمائی ہے۔ اُسی نے آج اس سے کچھ زیادہ فاصلہ پر شنوائی کی قوت بخش دی ہے۔ انبیاء علیہم السلام تو اپنے جسمانی خواص میں ممتاز ہوتے ہی تھے۔ مگر حق یہ ہے کہ ان کے مخاطب بھی ساری مخلوق میں ممتاز صفت ہوتے تھے۔ آواز کی وسعت کا یہ کرشمہ کچھ آپ ہی کے عہد پر ختم نہیں ہو گیا تھا، بلکہ اُن کمالات میں سے تھا جس میں آپ کی امت کو بھی حصہ ملا تھا، اس لیے ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں عمرؓ کی آواز نہاوند کی فوج میں بھی سنی جا چکی ہے۔ جیسا کہ کرامات کے باب میں آپ کی نظر سے گزریگا۔ غنیمت ہے کہ ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر نے اب روشن خیالوں کے لیے بھی اس کی وجہ جواز پیدا کر دی ہے۔

۱۰۲۲۔ اپنے سامنے کی چیز دیکھ لینا تو ہر انسان کا خاصہ ہے لیکن رسول وہ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سامنے اور پیچھے دیکھنے کی یکساں طاقت عنایت فرما دیتا ہے۔ اگر آنکھ میں اپنے سامنے دیکھنے کی طاقت عام طور پر نہ ہوتی تو کیا کوئی انسان صرف عقل سے یہ حکم لگا سکتا تھا کہ اس عضو میں دیکھنے کی طاقت ہونی چاہیے پس جس نے اس میں صرف ایک سمت دیکھنے کی طاقت عام طور پر رکھ دی ہے کیا اس کو قدرت نہیں کہ وہ کسی کے حق میں مخالف سمت میں دیکھنے کی طاقت بھی پیدا فرما دے۔ قرآن کریم میں روز محشر انسانی جوارح کی بات چیت کرنا ثابت ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ جب انسان اپنے خلاف ان کی شہادت سُن کر اُن سے تعجب سے کہیگا "لم شہدتم علینا" تو اس کے جواب میں وہ یہی کہینگے "جس نے ہر چیزوں کو قوت گویائی عطا فرمائی تھی اس نے آج ہم کو بھی یہ طاقت عطا فرما دی ہے۔ صحابہ کرامؓ کا بیان ہے کہ ہم اپنے سامنے رکھے ہوئے کھانے کی تسبیح خود سنتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کھانے میں سے بکری کی دست اُٹھا کر یہود سے فرمایا تھا کہ کھانے میں زہر ملانے کی خبر مجھکو اس نے دی ہے۔ جب ان اعضاء میں نطق کی طاقت پیدا ہو جانا ممکن

نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنِّیْ لَاَرَاكُمْ مِنْ خَلْفِیْ كَمَا اَرَاكُمْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ۔ رواہ ابو داؤد۔

۱۰۲۳۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الظُّھْرَ وَفِیْ مُؤَخَّرِ الصُّفُوْفِ رَجُلٌ فَاَسَاءَ الصَّلٰوۃَ فَلَمَّا سَلَّمَ نَادَاہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا فُلَانُ اَلَا تَتَّقِی اللّٰہَ اَلَا تَرٰی كَیْفَ تُصَلِّیْ اِنَّكُمْ تَرَوْنَ اَنَّہٗ یَخْفٰی عَلَیَّ شَیْءٌ مِّمَّا تَصْنَعُوْنَ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَرٰی مِنْ خَلْفِیْ كَمَا اَرٰی مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ۔ رواہ احمد۔

مِنْھَا مَا یَتَعَلَّقُ بِحَاسَّۃِ السَّمْعِ

۱۰۲۴۔ عَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ بَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حَائِطٍ لِبَنِی النَّجَّارِ عَلٰی بَغْلَۃٍ لَہٗ وَنَحْنُ مَعَہٗ اِذْ حَادَتْ بِہٖ دَابَّتُہٗ فَكَادَتْ تُلْقِیْہِ وَاِذَا اَقْبُرٌ سِتَّۃٌ اَوْ خَمْسَۃٌ

ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تم کو اپنی پشت کی جانب سے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جیسا کہ اپنے سامنے کی جانب سے۔ (ابوداؤد)

۱۰۲۳۔ ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ظہر کی نماز پڑھائی۔ اس میں ایک شخص نے جو آخری صف میں شامل تھا نماز میں کچھ کوتاہی کی آپ نے جب سلام پھیرا تو اس کو آواز دے کر فرمایا اے فلاں اللہ سے ڈرتا نہیں؟ دیکھتا نہیں کیسی نماز پڑھتا ہے۔ تم لوگوں کا خیال شاید یہ ہوگا کہ جو حرکتیں تم کرتے ہو وہ مجھ سے پوشیدہ رہتی ہیں، بخدا جیسا میں اپنے سامنے سے دیکھتا ہوں اسی طرح پشت کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں۔ (احمد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ سامعہ کی امتیازی خصوصیت

۱۰۲۴۔ زید بن ثابتؓ بیان فرماتے ہیں ایسا اتفاق ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بنوالنجار کے کسی باغ میں ایک خچر پر سوار تھے اس وقت ہم لوگ بھی آپ کے ہمراہ حاضر تھے کہ دفعۃً آپ کی سواری اس زور سے بدکی

ہوا تو آنکھیں صرف بینائی کی طاقت کا اور ترقی کر جانا ناممکن کیوں سمجھا جائے۔ یہاں آپ کے قسم کھانے کے بعد بھی اگر کسی کو یقین نہ آئے تو اس کے لیے اب اور کوئی راستہ نہیں ہے ومن لم یجعل اللہ نورا فما لہ من نور۔ یہاں ترجمان السنۃ ج۳ نوٹ حدیث ... ضرور ملاحظہ فرما لیجیے۔

۱۰۲۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک کی یہ صفت بھی مختلف صحابہ سے مختلف طور پر روایت کی گئی ہے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ظہر کی نماز کا تھا۔ جو شخص اس ارشاد کا باعث بنا وہ سب سے آخر صف میں شامل تھا یہاں اتنی بات اور زیادہ ہے کہ نمازوں میں تمہاری ہر ہر حرکت کا مجھے علم ہو جاتا ہے وہ بھی کسی اور ذریعہ سے نہیں بلکہ خاص دیکھ کر۔ اسی لیے آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ جس طرح میں اپنے سامنے سے دیکھتا ہوں اسی طرح پشت کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں۔ مسلک اعتدال یہ ہے کہ حدیثوں میں جو صفات جس حد تک ثابت ہوں ان کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے نہ ان میں تاویلات کی جائیں اور نہ ان میں اپنی جانب سے مبالغے کیے جائیں۔

فَقَالَ مَنْ يَعْرِفُ أَصْحَابَ هٰذِهِ الْأَقْبُرِ قَالَ رَجُلٌ أَنَا قَالَ فَمَتٰى مَاتُوْا قَالَ فِي الشِّرْكِ فَقَالَ إِنَّ هٰذِهِ الْأُمَّةَ تُبْتَلٰى فِي قُبُوْرِهَا فَلَوْلَا أَنْ لَا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِيْ أَسْمَعُ مِنْهُ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ قَالَ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ۔ رواہ مسلم

منها ما يتعلق بريقه صلى الله عليه وسلم

۱۰۲۵۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ إِذَا اشْتَكَى الْإِنْسَانُ الشَّيْءَ مِنْهُ أَوْ كَانَتْ بِهِ قَرْحَةٌ

قریب تھا کہ آپ گر جاتے۔ دیکھا تو وہاں پانچ یا چھ قبریں تھیں۔ آپ نے پوچھا کوئی ہے جو ان مدفون شخصوں کو پہچانتا ہو ایک شخص بولا میں پہچانتا ہوں۔ آپ نے پوچھا یہ مرے کس زمانہ کے ہیں۔ اس نے جواب دیا شرک کے زمانہ میں اس پر آپ نے فرمایا اس اُمت کا قبر میں امتحان ہوتا ہے۔ اگر کہیں یہ خطرہ نہ ہوتا کہ مارے دہشت کے تم دفن کرنا ہی بھول نہ جاؤ گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ جو عذاب قبر میں سنتا ہوں وہ تم کو بھی سنا دے پھر آپ نے ہماری طرف رُخ بدل کر فرمایا اللہ تعالیٰ کے سامنے عذاب دوزخ سے پناہ مانگو۔ لوگوں نے فوراً کہا ہم اللہ کے سامنے عذاب دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں۔ پھر فرمایا عذاب قبر سے بھی پناہ مانگو ہم نے فوراً اللہ تعالیٰ سے عذاب قبر سے پناہ مانگی اس کے بعد آپ نے فرمایا اچھا تمام فتنوں سے بھی پناہ مانگو ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ ہم نے فوراً کہا ہم اللہ تعالیٰ سے تمام قسم کے فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ ہوں آخر میں آپ نے فرمایا کہ دجال کے فتنے سے بھی پناہ مانگو ہم نے فوراً دعا مانگی۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دجال کے فتنے سے بھی پناہ مانگتے ہیں)۔ (مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لعابِ دہن کی امتیازی خصوصیت

۱۰۲۵۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں جب کوئی شخص بیمار پڑتا یا اس کے جسم میں کہیں زخم ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ

۱۰۲۴۔ بیمار اور غم رسیدہ انسانوں کی آہ و بکا تو ہر بشر سنتا ہی ہے لیکن رسول وہ ہوتے ہیں جو مردہ انسانوں کے نالہ و فریاد بھی سن لیتے ہیں چونکہ ان کے یقین کے عالم میں عقیدہ اور چشم دید حالت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوتا اس لیے جو باتیں وہ جانتے ہیں اس کو سننے کی طاقت بھی رکھتے ہیں عام انسانوں میں یہ بات نہیں ہوتی اس لیے بعض شنیدہ واقعات کے سننے کی ان میں طاقت نہیں ہوتی۔ یہاں آپ نے مستقبل ہولناک حوادث میں سے سب سے پہلے عذاب دوزخ کی یاد دلائی اور سب سے آخر میں ایک ایسے فتنہ کی یاد تازہ کی جو امت میں سب سے زیادہ ہولناک ہوگا بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کے ہولناک فتنہ کا اثر بعض اہل قبور پر بھی ہوگا۔ اس لیے اس موقعہ پر اس سے بھی تعوذ کی تعلیم (باقی بر صفحہ ۲۵۷)

اَوْ جُرْحٌ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِإِصْبَعِهِ بِسْمِ اللّٰهِ تُرْبَةُ أَرْضِنَا بِرِيْقَةِ بَعْضِنَا لِيُشْفَىٰ سَقِيْمُنَا بِإِذْنِ رَبِّنَا۔ متفق علیہ

مِنْهَا مَا يَتَعَلَّقُ بِالنَّوْمِ

۱۰۲۶۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوْتِرَ فَقَالَ يَا عَائِشَةُ إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ۔ رواہ الشیخان راجع ترجمان السنۃ ص ۳۴۲ ج ۱۔

علیہ وسلم مٹی میں ذرا سا اپنا لعاب مبارک ڈال کر انگلی سے ملاتے جاتے اور یہ کلمات پڑھتے جاتے بسم اللہ یعنی یہ ہماری زمین کی مٹی اور ہمارا لعاب دہن ہے ہم اس کو ملا کر اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لگاتے ہیں تاکہ ہمارے رب کے حکم سے ہمارا بیمار شفایاب ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کی خصوصیت

۱۰۲۶۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ کیا نماز وتر پڑھنے سے قبل آپ سو سکتے ہیں آپ نے فرمایا عائشہ! صرف میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا وہ بیدار رہتا ہے۔ (شیخین)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۵۶) فرمائی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس کس طرح ہر ہر موقعہ پر جن فتنوں کی یاد دہانی فرمائی تھی اُمت کے ناخلف افراد آج یا تو ان کا صاف انکار کر رہے ہیں، ورنہ تاویل پر آمادہ ہیں۔

۱۰۲۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات میں یہاں آپ کے لعاب دہن کا تذکرہ ہے اس کے معجزانہ کرشمے تو آپ کے سامنے معجزات کی بحث میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ کسی کی آنکھ کا آشوب اس طرح صاف ہو گیا جیسے کبھی کوئی تکلیف ہی نہ تھی، کسی کی شکستہ ہڈی اس طرح جڑ گئی جیسے کبھی اس میں کوئی نقصان ہی نہ ہوا تھا۔ یہاں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کے سامنے مرہم شفاء کا یہ ایک عام نسخہ بھی تھا۔ سبحان اللہ کیا کمال تھا، پھر اس کمال کے ساتھ کتنی فروتنی بھی اور اس فروتنی میں کتنی حقیقت تھی کہ اس مرہم کی ساری شفاء کا تصور آپ اسی کے نام کی برکت کے ساتھ وابستہ فرماتے ہیں جو رب محمد ہے اللھم صل وسلم وبارک علیہ کما تحب وترضی۔ غور فرمائیے کہ رسول کس طرح ہر ہر موقعہ پر انسانی نفع و ضرر کا رشتہ اکیلا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں۔ کون تھا جس کو شفاء تو اس کیمیاوی نسخہ سے ہوتی مگر اس کے سامنے تصور یہ رہتا کہ یہ ساری شفاء بر سبب حکم ربانی کے تحت۔ اس لیے انسان کی کمزور فطرت کے لیے اس جملہ کا ہر ہر کلمہ میں اس حقیقت پر تنبیہ ضروری تھی گئی آپ کا یہ مختصر جملہ کیا تھا گویا شفاء کا تعویذ بھی تھا اور رسالت و توحید کا ہدایت نامہ بھی۔ آج اصول طب کے لحاظ سے بھی مٹی میں بہت سے امراض کے لیے شفاء مسلم ہو چکی ہے۔

۱۰۲۶۔ حضرت عائشہؓ کو یہ مسئلہ معلوم تھا کہ سونے سے وضو، جاتا رہتا ہے۔ اس لیے جو شخص سو کر اُٹھے اور نماز کا ارادہ ہو تو اس کو وضو کرنا لازم ہے مگر جب یہاں انہوں نے دیکھا کہ آپ سو جاتے ہیں اور پھر وضو کیے بغیر وتر پڑھ لیتے ہیں۔ تو آپ کی فہم پر قربان کہ یہ نہیں فرمایا کہ آپ نے وضو کیوں نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کیا آپ نماز سے قبل سو جاتے ہیں یعنی پھر اٹھ کر وضو کیے بغیر نماز ادا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اب تک گو آپ کی نیند کی خصوصیت نہ جانتی ہوں مگر اتنا جانتی تھیں کہ نبی اپنی بہت سی باتوں میں عام بشر سے ممتاز ہوتا ہے یہ صورت بھی ضرور کسی امتیاز ہی پر مبنی ہوگی۔

۱۰۲۷۔ عَنْ عَطَاءٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّا مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ تَنَامُ اَعْيُنُنَا وَلَا تَنَامُ قُلُوْبُنَا۔ اخرجہ ابن سعد کذا فی الخصائص۔

۱۰۲۷۔ عطاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہم لوگ جو انبیاء ہوتے ہیں ہماری صرف آنکھیں ہی آنکھیں سوتی ہیں۔ ہمارے دل نہیں سوتے۔ (خصائص الکبریٰ)

۱۰۲۷۔ بیداری کی حالت میں تو عام بشر کے قلوب بھی بیدار رہتے ہیں اگر رسول وہ ہوتے ہیں جن کے قلوب سونے میں بھی بیدار رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ وہ بیداری نہیں ہے جس کا آپ ادراک کر لیں۔ یہ وہ بیداری ہے جس کے سامنے عالم غیب سب کھلا ہوا ہوتا ہے۔ عام بشر جس طرح بیداری میں عالم شہادت کا ادراک کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام حالت خواب میں بھی اس سے بڑھ کر عالم غیب کا ادراک فرما لیتے ہیں گویا عام بشر پر جن حالات میں پوری غفلت طاری ہوتی ہے وہ ان حالات میں بھی پورے ہشیار رہتے ہیں پھر اُن کے ادراک کی نوعیت بھی ہمارے ادراک سے بالکل مختلف ہوتی ہے جس کی حقیقت سمجھنے سے بھی ہم قاصر ہیں صرف اتنا ادا کیا جا سکتا ہے کہ ان کی اس حالت کے ادراکات کو بھی وحی کا مقام حاصل ہوتا ہے بلکہ اس کو بھی وحی کی ایک قسم شمار کیا گیا ہے ایک واقعہ میں جو لیلۃ التعریس کے نام سے مشہور ہے حضرت عمران بن حصین فرماتے ہیں وکنا لا نوقظ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من منامہ اذا نام حتی یستیقظ (مسلم شریف ص ۲۴۰) یعنی صحابہ کا دستور یہ تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواب استراحت میں ہوتے تو ہم آپ کو اس وقت تک بیدار نہ کرتے جب تک کہ آپ از خود بیدار نہ ہو جائیں۔ معلوم نہیں اس حالت میں آپ پر کیا کیا اسرار نہاں منکشف ہو رہے ہوں اور آپ کو بیدار کر کے وہ اس میں حارج ہو جائیں۔ بخاری شریف ص ۱۰۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی یہی طریقہ تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چلتے چلتے ٹھیک مقصود پر پہنچ گئے تو ان کی آنکھ لگ گئی مگر حضرت یوشع نے جو ان کے رفیق سفر تھے فرمایا "لا اوقظہ" میں آپ کو بیدار نہیں کروں گا اس کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام خود بیدار ہوئے تو وہ مچھلی کے عجیب واقعہ کا ذکر کرنا ان سے بھول گئے اور آگے چل پڑے الیٰ آخر القصۃ۔

پھر جب ان کی نیند صرف آنکھوں تک محدود ہوتی ہے تو اسی سے ان کی موت کا بھی کچھ اندازہ کر لینا چاہیے، کیونکہ "النوم اخ الموت" مشہور ہے وہ بھی نیند کی طرح ان پر طاری ضرور ہوتی ہے مگر عام بشر کی موت کی طرح نہیں یہاں بھی ان کو بڑا امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر زندہ کا اطلاق آیا ہے۔

قرآن جب شہداء کی موت کے متعلق صرف اس پر کفایت نہیں کرتا کہ تم ان کو مردہ مت سمجھو بلکہ یہ کہتا ہے کہ ان کو مردہ کہو بھی مت اور اس کی تشریح یوں کرتا ہے کہ ان کو رزق بھی ملتا ہے، گویا جس کو رزق تک ملے وہ مردہ کہاں ہیں۔ تو اب انبیاء علیہم السلام جو شہداء سے کہیں اونچا مقام رکھتے ہیں ان کی موت کو عام انسانوں کی طرح کہہ دینا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، مگر یہ ظلم بھی کتنا بڑا ظلم ہے کہ صرف اس امتیاز کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کو جنس بشری ہی سے خارج سمجھ لیا جائے۔

خوب یاد رکھو رب العالمین کی بارگاہ بلند وہ ہے جس کے متعلق ارشاد ہے لا تأخذہ سنۃ ولا نوم وہ ایسا منزہ ہے جس کو نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ آتی ہے۔ پھر جس کو نیند بھی آتی ہو اور جو موت سے بھی مستثنیٰ نہ ہو اس کو خدا تعالیٰ کی کسی صفت میں شریک کر دینا کتنا بڑا شرک ہوگا۔ بشر کو خالق سے ممتاز کرنے کے لیے صرف اس کی مخلوقیت کی بیچارگی ہی بہت کافی ہے۔ اس جگہ ترجمان السنہ ص ۳۴۳ ج ۱ کا نوٹ ضرور ملاحظہ فرما لیا جائے۔

مِنْهَا تَخْيِيْرُهُمْ قَبْلَ الْوَفَاةِ

۱۰۲۸ - عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَلَسَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ اِنَّ عَبْدًا خَیَّرَہُ اللّٰہُ بَیْنَ اَنْ یُّؤْتِیَہٗ مِنْ زَھْرَۃِ الدُّنْیَا مَا شَاءَ وَبَیْنَ مَا عِنْدَہٗ فَاخْتَارَ مَا عِنْدَہٗ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ فَدَیْنَاکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ بِاٰبَائِنَا وَاُمَّھَاتِنَا قَالَ فَعَجِبْنَا فَقَالَ النَّاسُ اُنْظُرُوْا اِلٰی ھٰذَا الشَّیْخِ یُخْبِرُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ عَبْدٍ خَیَّرَہُ اللّٰہُ اَنْ یُّؤْتِیَہٗ مِنْ زَھْرَۃِ الدُّنْیَا مَا شَاءَ وَبَیْنَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ وَھُوَ یَقُوْلُ فَدَیْنَاکَ بِاٰبَائِنَا وَاُمَّھَاتِنَا فَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھُوَ الْمُخَیَّرَ وَکَانَ اَبُوْبَکْرٍ ھُوَ اَعْلَمَنَا بِہٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَمَنِّ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِہٖ وَمَالِہٖ اَبُوْبَکْرٍ وَلَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا

وفات سے قبل انبیاء علیہم السلام کو اپنی حیات و موت میں اختیار ملنے کی خصوصیت

۱۰۲۸ - ابو سعید خدریؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر بیٹھے اور فرمایا اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیدیا ہے اگر وہ چاہے تو دنیا کے مال و دولت کی رونق جیسی وہ چاہتا ہے اس کو عطا فرمادے اور اگر چاہے تو جو انعامات و اکرام حق تعالیٰ کے یہاں اس کے لیے تیار ہیں ان کو اختیار کرلے اللہ تعالیٰ کے اس بندہ نے ان دونوں میں سے ان انعامات ہی کو پسند کرلیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہیں۔ یہ سن کر ابوبکرؓ بے ساختہ بول اٹھے یا رسول اللہ آپ پر ہم اپنے ماں باپ سمیت قربان ہوں۔ ابوبکرؓ کے اس فرمانے پر ہم کو تعجب ہوا اور لوگوں نے کہا ان بزرگ کو دیکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بندہ کا حال نقل فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اختیار دیدیا ہے اگر وہ چاہے تو جتنی وہ چاہے اس کو دنیا کی زیبائش و آرائش مرحمت فرمادے اور اگر چاہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں کے انعامات و اکرام پسند کرلے اس پر یہ بزرگ کیا فرما رہے ہیں کہ آپ پر ہم اپنے ماں باپ سمیت قربان ہوں۔ پھر بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ جس بندہ کو اختیار دیا گیا تھا وہ تو خود آپ ہی کی ذات گرامی تھی حقیقت یہ ہے کہ ہم سب میں اس راز کو زیادہ سمجھنے والے ابوبکرؓ ہی تھے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کی رفاقت اور جس کے مال کا احسان مجھ پر سب سے زیادہ ہے وہ ابوبکرؓ کی ذات ہے۔ اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو صرف ابوبکرؓ ہی کو بناتا لیکن میرا یہ تعلق صرف ایک ذات الٰہی

۱۰۲۸ - حدیث مذکور میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص امتیازی صفت کا ذکر آیا ہے، اسی کے ساتھ صدیق اکبرؓ کے متعلق بھی ایک خاص امتیازی نوازش کا ذکر آگیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سرداری تو امت کے سامنے ایک بدیہی مسئلہ تھا پھر آپ کی شان عبدیت نے نام لے کر اس کو صاف صاف بیان کرنا پسند نہ کیا مگر اپنی وفات کے ساتھ ساتھ جس طرح وضاحت کے ساتھ ذکر فرمانا احکام و مسائل کی طرح امت کے سامنے ضروری سمجھا

لاتخذت ابابکر خلیلا ولکن اخوۃ الاسلام لا تبقین فی المسجد خوخۃ الا خوخۃ ابی بکر۔ رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث صحیح۔

منہا ما یتعلق بتخییرھم عند الوفاۃ

۱۰۲۹ عن عائشۃ قالت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول وھو صحیح انہ لن یقبض نبی حتی یری مقعدہ من الجنۃ ثم یخیر قالت عائشۃ فلما نزل بہ ورأسہ علی فخذی غشی علیہ ثم افاق فاشخص بصرہ الی سقف ثم قال اللھم الرفیق الاعلیٰ قلت

کے ساتھ وابستہ ہوچکا ہے) اب ایک اخوت اسلامی باقی ہے لہٰذا مسجد کی جانب کی جتنی کھڑکیاں ہیں ان میں سے کوئی کھلی نہ رہے بس صرف ایک کھڑکی ابوبکرؓ کے گھر کی کھلی رہے (کہ میرے بعد خلافت کی ذمہ داری کی وجہ سے ان کو آمدو شد کی ضرورت زیادہ ہوگی) ترمذی شریف

وفات کے وقت انبیاء علیہم السّلام کو پھر اختیار ملنے کی خصوصیت

۱۰۲۹ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بالکل تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کسی نبی کی وفات نہیں ہوتی جب تک کہ جنت میں اس کا مقام اس کو دکھا نہیں دیا جاتا اس کے بعد پھر اس کو یہ اختیار بھی دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے پسند کرلے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت آیا اس وقت آپ کا سر مبارک میری ران پر رکھا ہوا تھا تو آپ کے اوپر بیہوشی طاری ہوگئی اس کے بعد جب آپ کو ذرا ہوش آیا تو آپ نے اپنی نظر چھت کی طرف اٹھا کر فرمایا۔ الٰہی میں سب سے بڑے رفیق کو اختیار کرتا

ابوبکر صدیقؓ کی ایک امتیازی شان تھی۔ اس پر بحث کرنا بہت نامناسب ہے کہ خلت کی حقیقت کیا ہے جس میں کسی کے لیے بھی شرکت کی گنجائش نہیں نکل سکتی مگر اتنا آپ کی زبان مبارک سے پھر نکل گیا کہ اگر اس میں شرکت کا کوئی امکان ہوتا تو اس کے حقدار بھی سب سے پہلے صدیق اکبرؓ ہوتے اور اس کی بنیاد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسلام کے لیے جان و مال کی جو قربانی اور جتنی برمحل انہوں نے پیش کی اس میں دوسرا کوئی ان کا شریک نہیں تھا آپ کے بیان میں ان کے حق میں جو بلند سے بلند کلمات آسکتے تھے وہ بھی آگئے اور اسی کے ساتھ عملی لحاظ سے فتح خوخہ یعنی مسجد کی جانب صرف ایک ان کا دروازہ کھلا رکھنے کی اجازت اور دوسروں کے تمام دروازوں کے بند ہونے کا حکم بھی صادر ہوگیا۔ ادھر آپ کے عمر بھر کے صحبت یافتہ صحابہ کی زبانوں سے ضمنی طور پر جو کلمہ یہاں نکل گیا اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس رفیق غار کے علم و فہم میں برتری کا مسئلہ ان کے درمیان ایک مسلم مسئلہ تھا پھر اس کا بھی جس طرح عملی ظہور ہوا وہ صدیق اکبرؓ کے خطبہ سے ظاہر ہے اب جس کے متعلق صحابہ کی شہادت یہ ہو اور خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز و تکریم کے کلمات یہ ہوں ان کے متعلق اب امت کا عقیدہ کیا رہنا چاہیے۔
۱۰۲۹ ترجمان السنۃ ص ۳۰۸ ج ۲ میں آپ ملاحظہ فرماچکے ہیں کہ اسی ضابطہ کے ماتحت حضرت موسیٰ علیہ السلام

إِذَنْ لَا يَخْتَارُنَا قَالَتْ وَعَرَفْتُ أَنَّهُ الْحَدِيثُ الَّذِي كَانَ يُحَدِّثُنَا بِهِ وَهُوَ صَحِيحٌ فِي قَوْلِهِ إِنَّهُ لَنْ يُقْبَضَ نَبِيٌّ قَطُّ حَتَّى يَرَى مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ ثُمَّ يُخَيَّرُ قَالَتْ عَائِشَةُ فَكَانَ آخِرُ كَلِمَةٍ تَكَلَّمَ بِهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْلَهُ اَللّٰهُمَّ الرَّفِيقَ الْأَعْلَى. متفق علیہ.

۱۰۳۰۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُبِضَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ سَحْرِي وَنَحْرِي فَلَمَّا خَرَجَتْ نَفْسُهُ لَمْ أَجِدْ رِيحًا قَطُّ أَطْيَبَ مِنْهُ. اخرجہ البزار والبیہقی بسند صحیح

میں اسی وقت سمجھ گئی کہ اب آپ ہم کو اختیار نہیں کریں گے اور اب یہ وہی وقت ہے جس کو آپ صحت کی حالت میں ہم سے بیان فرمایا کرتے تھے اور بیشک آپ اپنے بیان میں بالکل سچے تھے۔ جب تک نبی کو اس کا جنت کا مقام دکھایا نہیں جاتا اس کی وفات بھی نہیں ہوتی اس کے بعد پھر اس کو اختیار دے دیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کی زبانِ مبارک سے جو آخری کلمہ نکلا تھا وہ یہ حرف تھے۔ الٰہی میں سب سے بڑے رفیق کو اختیار کرچکا۔ متفق علیہ

۱۰۳۰۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال میری ٹھوڑی اور سینہ کے درمیانی حصہ میں ہوا ہے۔ جب آپ کی روح عالمِ قدس کی طرف پرواز کرنے لگی تو میں نے ایک ایسی خوشبو محسوس کی جو پھر کبھی محسوس نہ کی۔ (بزار)

کو بھی اختیار دیا گیا تھا۔ اگر وہ ابھی دنیا میں اور جینا پسند کرتے ہیں تو جتنا چاہیں اور جی سکتے ہیں لیکن اس اختیار کا منشا چونکہ صرف ان کی تشریف وتکریم تھا اس لیے ان کا دل اُسی طرف مائل ہوگیا جو عالم تقدیر میں اُن کے لیے مقرر ہوچکا تھا۔ پس موت انبیاء علیہم السلام کو بھی آتی ہے مگر عام بشر کی طرح اچانک نہیں بلکہ اطلاع کے بعد اور روح ان کی بھی قبض کی جاتی ہے مگر ان کی بلا اجازت نہیں بلکہ اجازت کے بعد۔ پھر جس طرح با نصیب امتی اپنے انبیاء کے کمالات میں حصہ رسد شریک ہوجاتے ہیں اسی طرح یہاں بھی ان کو اتنا حصہ ملتا ہے کہ جبر واکراہ سے ان کو بھی موت نہیں آتی بلکہ عالمِ تکوین میں قدرت کچھ ایسے سامان پیدا فرما دیتی ہے کہ وہ موت سے پہلے دنیا کو بخوشی چھوڑنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۲۵ ج ۱۔ مذکورہ بالا حدیث کو ترجمان السنہ کی ان دونوں حدیثوں کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو آپ کو یقین ہوجائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی وحی انسانی خیالات سے کتنی بلند ہوتی ہے جس میں کہیں اختلاف واختیار کا نام نظر نہیں آتا۔ ان کے کسی کلام کو کسی محل اور کسی حالت کے کلام کو ملا لیا جائے اُن میں کہیں سرمو اختلاف نہیں ملتا ہر جگہ وہ ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا اس تخییر کے مسئلہ پر ہی غور کرلیجیے۔ جو بات کبھی صحت میں آپ کی زبان مبارک سے نکلی تھی جب اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک بالکل جداگانہ واقعہ کے سلسلہ میں دیکھا گیا تو اس کی وہی حقیقت نکلی اور جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو اس غیر اختیاری حالت میں بھی وہی حقیقت ثابت ہوئی اس لیے اختیاری اور غیر اختیاری حالتوں میں وحی کی یہ تعجب انگیز حقیقت دیکھ کر حضرت عائشہؓ کی زبان سے بے ساختہ آپ کی صداقت کی داد نکل گئی۔

اس جگہ انبیاء علیہم السلام کی خلوت وجلوت کا کچھ اندازہ بھی کرنا چاہیے کہ جو ابھی ابھی تمام تر امت کی طرف مخاطب تھے اور اپنی کرب وبےچینی کی حالت میں بھی ان کی نصیحت وخیر خواہی کے لیے گھلے جا رہے تھے جب رفیق اعلیٰ کی جانب سے ان کو دعوت نامہ پہنچ گیا تو اتنے یکسو ہوکر سب سے بیگانہ بن گئے کہ سب سے محبوب بی بی بھی مایوس ہوکر بصد حسرت کے لہجہ میں کہتی ہیں میں سمجھ گئی اب آپ ہم کو اختیار نہیں فرمائیں گے۔

۱۰۳۱۔ عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ وَضَعْتُ یَدِیْ عَلٰی صَدْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ مَاتَ فَمَرَّ بِیْ جُمَعٌ اٰکُلُ وَاَتَوَضَّأُ مَا یَذْھَبُ رِیْحُ الْمِسْکِ مِنْ یَدِیْ۔ اخرجہ البیھقی کما فی الخصائص ص۲۷۴ ج ۲۔

مِنْھَا مَا تَعَلَّقَ بِتَجْرِیْدِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ ثِیَابٍ عِنْدَ غُسْلِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

۱۰۳۲۔ عَنْ عَائِشَۃَ لَمَّا اَرَادُوْا غُسْلَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالُوْا وَاللّٰہِ مَا نَدْرِیْ اَنُجَرِّدُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ ثِیَابِہٖ کَمَا نُجَرِّدُ مَوْتَانَا اَمْ نَغْسِلُہٗ وَعَلَیْہِ ثِیَابُہٗ فَلَمَّا اخْتَلَفُوْا اَلْقَی اللّٰہُ عَلَیْھِمُ النَّوْمَ حَتّٰی مَا مِنْھُمْ رَجُلٌ اِلَّا وَذَقْنُہٗ فِیْ صَدْرِہٖ ثُمَّ کَلَّمَھُمْ مُکَلِّمٌ مِنْ نَاحِیَۃِ الْبَیْتِ لَا یَدْرُوْنَ مَنْ ھُوَ اَنْ اِغْسِلُوا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْہِ ثِیَابُہٗ اخرجہ ابن سعد و ابوداؤد والحاکم والبیھقی وصححاہ وابونعیم کما فی الخصائص ص۲۷۵ ج ۲۔ واخرج ابن ماجۃ عن بریدۃ وابن بریدۃ وابن سعد والطبرانی عن ابن عباس نحوہ

۱۰۳۱۔ حضرت ام سلمہؓ روایت فرماتی ہیں جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا میں نے اپنا ہاتھ آپ کے سینہ پر رکھ کر آپ کو دیکھا تھا۔ بس کیا کہوں کئی جمعے گزر چکے ہیں۔ کھاتی بھی ہوں اور وضو بھی کرتی ہوں مگر وہ مشک کی سی خوشبو میرے ہاتھوں سے نہیں جاتی۔

بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی خصوصیت

۱۰۳۲۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو باہم گفتگو ہونے لگی بخدا ہم کو اس کا علم نہیں کہ جس طرح ہم اپنے مُردوں کے جسم کے کپڑے اتار لیتے ہیں کیا آپ کے جسم مبارک سے کپڑے بھی اتارلیں یا آپ کو ان کپڑوں ہی میں غسل دیدیں۔ جب اختلاف زیادہ ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی نیند غالب کی کہ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہ بچا جس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے جا نہ لگی ہو پھر گھر کے ایک گوشہ سے کسی کہنے والے نے کہا معلوم نہیں وہ تھا کون "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے کپڑوں ہی میں غسل دیدو۔

۱۰۳۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غسل کی سنت میں یہاں عام بشر کے شریک بھی ہیں مگر اتنے ممتاز بھی ہیں کہ صحابہؓ آپ کے غسل میں متحیر ہو رہے تھے اور یہ جرأت نہیں کرسکتے ۔ کہ جس طرح عام انسانوں کے کپڑے اتار لیے جاتے ہیں اسی طرح آپ کے کپڑے بھی اتار لیے جائیں پھر یہاں ندائے غیبی سے اس صورت پر عمل کر لیا جاتا ہے جو خود بھی قرین قیاس نظر آ رہی تھی۔ خدا تعالیٰ کی اس حکمت کے قربان کہ دین کامل بھی ہوا مگر پھر بہت سے معاملات میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہا اور اس طرح جس امت میں اب کوئی جدید رسول آنے والا نہ رہا تھا اس کے لیے بڑی سہولت اور وسعت پیدا ہو گئی

منها ما تعلق بالصلوٰة صلی اللہ علیہ وسلم

۳۳۰۱۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَمَّا ثَقُلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُلْنَا مَنْ یُغَسِّلُکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ رِجَالٌ مِنْ اَھْلِ بَیْتِیَ الْاَدْنٰی فَالْاَدْنٰی مَعَ مَلَائِکَۃٍ کَثِیْرِیْنَ یَرَوْنَکُمْ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ قُلْنَا مَنْ یُصَلِّیْ عَلَیْکَ قَالَ اِذَا اغْتَسَلْتُمُوْنِیْ وَحَنَّطْتُمُوْنِیْ وَکَفَّنْتُمُوْنِیْ فَضَعُوْنِیْ عَلٰی سَرِیْرِیْ ھٰذَا عَلٰی شَفِیْرِ قَبْرِیْ ثُمَّ اخْرُجُوْا عَنِّیْ سَاعَۃً فَاِنَّ اَوَّلَ مَنْ یُصَلِّیْ عَلَیَّ جِبْرَئِیْلُ ثُمَّ مِیْکَائِیْلُ ثُمَّ اِسْرَافِیْلُ ثُمَّ مَلَکُ الْمَوْتِ مَعَ جُنُوْدٍ مِنَ الْمَلَائِکَۃِ ثُمَّ لِیُصَلِّ عَلَیَّ اَھْلُ بَیْتِیْ ثُمَّ ادْخُلُوْا عَلَیَّ اَفْوَاجًا وَفُرَادٰی قُلْنَا فَمَنْ یُدْخِلُ قَبْرَکَ قَالَ اَھْلِیْ مَعَ مَلَائِکَۃٍ کَثِیْرِیْنَ یَرَوْنَکُمْ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ اخرجہ ابن سعد و ابن منیع والحاکم والبیہقی والطبرانی فی الاوسط قال البیہقی تفرد بہ سلام الطویل عن عبد الملک بن عبد الرحمن وتعقبہ ابن حجر فی المطالب العالیہ بان ابن منیع اخرجہ من طریق مسلمۃ بن صالح عن عبد الملک بہ فھذہ متابعۃ لسلام الطویل واخرجہ البزار من وجہ اٰخر عن ابن مسعود واخرج البیہقی وغیرہ عن ابن عباس ان الناس صلوا علیہ بغیر امام ارسالا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز جنازہ کی ایک امتیازی خصوصیت

۳۳۰۱۔ حضرت ابن مسعودؓ روایت فرماتے ہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت زیادہ ہو گئی تو ہم لوگوں نے آپ سے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ کو غسل کون دے۔ آپ نے فرمایا میرے گھر کے وہ آدمی جو نسب میں مجھ سے زیادہ سے زیادہ قریب تر ہوں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اور فرشتے بھی شامل ہوں گے جو تم کو دیکھتے ہیں اور تم ان کو نہیں دیکھتے۔ پھر ہم نے عرض کی اچھا آپ کی نماز کون پڑھائے۔ فرمایا جب تم مجھے غسل دے کر خوشبو لگا کر اور کفن پہنا کر فارغ ہو جاؤ تو مجھ کو میری اس چارپائی پر رکھنا اور اس کو میری قبر کے کنارہ رکھ دینا۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے تم سب باہر ہو جانا کیونکہ سب سے پہلے جو مجھ پر نماز پڑھینگے وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں اس کے بعد پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر ملک الموت اور ان کے ساتھ اور بہت سے فرشتے ہونگے اس کے بعد میرے اہل بیت مجھ پر نماز پڑھیں

۳۳۰۱۔ اساسًا اکرانبیاء علیہم السلام کی ہر ہر بشری عوارض میں شرکت بھی اور قدم قدم پر ان کے امتیازات بھی کس طرح ثابت ہوتے چلے جاتے ہیں مگر اس کے باوجود بعض نادان ان کا صحیح مقام سمجھنے میں پھر مغالطہ کرتے ہیں حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ جیسا وہ بشر ہوتے ہیں بلکہ افضل البشر ہوتے ہیں اور ابوالبشر کی

كذا في الخصائص ص ۲۷۶ ج ۲ وقد تكلم في اسناده الحافظ ابن كثيرؒ في البداية والنهاية ص ۲۷۴ ج ۵ وذكر في ص ۲۶۵ ج ۵ ان في صحته نظرا و مع هذا قال ان صلاتهم عليه فرادى لم يؤمهم احد عليه امر مجمع عليه لا اختلاف فيه

مِنْهَا مَا تَعَلَّقَ بِتَعْزِيَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

۱۰۳۴۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَزَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَسْمَعُوْنَ الْحِسَّ وَلَا يَرَوْنَ الشَّخْصَ فَقَالَتِ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ اِنَّ فِي اللّٰهِ عَزَاءً مِنْ كُلِّ مُصِيْبَةٍ وَخَلَفًا

اس کے بعد تم لوگ جماعتیں جماعتیں اور علیحدہ علیحدہ داخل ہونا ہم نے پوچھا اچھا تو آپ کو قبر میں کون اتارے آپ نے فرمایا میرے گھر کے مرد اور ان کے ساتھ اور بہت سے فرشتے ہونگے جو تم کو دیکھتے ہیں اور تم ان کو نہیں دیکھتے۔ خصائص الکبریٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلخانہ کی غیبی تعزیت کی خصوصیت

۱۰۳۴۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تو آپ کے اہل بیت کی تعزیت ملائکہ نے بھی کی صرف ایک آواز آتی تھی مگر کوئی شخص نظر نہ آتا تھا اور تعزیت کے الفاظ یہ تھے اے اہل بیت السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہر مصیبت میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک صبر کا سبب ہے اور ہر چیز کا جو ہاتھوں سے نکل جائے

ذریت کو بھی اگر بشر نہ کہا جائے تو بولو اور کیا کہا جائے ان کے امتیازی صفات میں ایک صفت بھی ایسی نہیں ہوتی جو بشریت کی صفت نہ ہو ان صفات سے جتنا ان میں اور عام بشر میں امتیاز ہو جاتا ہے اس سے زیادہ امتیاز ان میں اور رب العالمین میں بدیہی بن جاتا ہے۔ خود قرآن کریم نے اپنے سب سے مقرب اور محبوب رسول کے ساتھ جو خاص خاص مواقع پر انداز خطاب اختیار فرمایا ہے وہ اس لیے ہے کہ ہر ہر جگہ یہ واضح ہوتا رہے کہ قرب و بلندی کے سارے مقامات طے ہو جانے کے بعد بھی رب العالمین کے سامنے کسی کی ہستی بندگی سے آگے نہیں جاتی۔ سبحانہ وحدہ لا شریک لہ ثم الذین کفروا بربهم یعدلون۔

۱۰۳۴۔ جن اہل بیت کی شان میں اور جن کے گھروں میں کبھی وحی ربانی اترا کرتی ہو ان کے گھروں میں صرف ایک غیبی آواز پر تعجب کیا ہے۔ عام بشر کی تعزیت عام بشر کر لیتے ہیں مگر رسول وہ ہیں جن کے گھر والوں کی تعزیت میں خدا کے مقدس فرشتے بھی شریک رہتے ہیں

واضح رہے کہ اس حدیث کے بعض طریقوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ غائب شخص خضر علیہ السلام تھے مگر حافظ ابن کثیرؒ نے ان سب روایتوں کی سخت تضعیف کی ہے دیکھو البدایۃ والنہایۃ ص ۲۹۹ و ۳۳۱ و ۳۳۲۔ ج ۱ اس کے بعد کتاب مذکور کے ص ۳۳۶ ج ۱ پر حافظ سہیلیؒ کی مندرجہ ذیل رائے نقل کی ہے۔

ورجح السهيليؒ بقاءه وحكاه عن الاكثرين قال واما اجتماعه مع — حافظ سہیلیؒ نے خضر علیہ السلام کی حیات اور ان کی بقاء کو ترجیح دی ہے اور اکثر علماء کا یہی قول نقل کیا ہے۔ اور فرمایا کہ آنحضرت

مِنْ كُلِّ فَائِتٍ فَبِاللهِ فَثِقُوْا وَإِيَّاهُ فَارْجُوْا فَإِنَّمَا الْمَحْرُوْمُ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابَ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ. اخرجه الحاکم وصححه والبیهقی ورویاه عن انس واخرجه ابن ابی حاتم وابو نعیم عن علی وسیف بن عمر عن ابن عمر نحوه کذا فی الخصائص ص ۲۷۹، ج ۲۔ وفی مشکوٰۃ المصابیح نحوه۔ وذکر البیهقی له اسناداً آخر وقال وهذان وان کانا ضعیفین فاحدهما یتأکد بالآخر ویدل علی ان له اصلاً۔ البدایة والنهایة ص ۲۷۷، ج ۵۔

مِنْهَا مَا يَتَعَلَّقُ بِالدَّفْنِ

۱۰۳۵۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُبِضَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اخْتَلَفُوْا فِيْ دَفْنِهِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ سَمِعْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا قَالَ مَا قَبَضَ اللهُ نَبِيًّا اِلَّا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِيْ يُحِبُّ اَنْ يُّدْفَنَ

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک بہتر جانشین ہے (اس کا بدل دے دیتا ہے) لہٰذا صرف اسی کی ذات پر بھروسہ رکھو اور اسی سے امید لگائے رکھو کیونکہ محروم صرف وہ کہا جاتا ہے جو ثواب سے بھی محروم ہو جائے (تم کو صبر کا ثواب ملیگا تم محروم نہیں) السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ (خصائص الکبریٰ)

انبیاء علیہم السلام کے دفن میں امتیازی خصوصیت

۱۰۳۵۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوگئی تو آپ کے دفن کے متعلق لوگوں کی رائیں مختلف تھیں، اس پر صدیق اکبرؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات خود سنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو وفات نہیں دی مگر اسی مقام پر جہاں

النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتعزیته لاهل البیت بعده فمروی من طرق صحاح ثم ذکر ما تقدم مما ضعفناه ولم یورد اسانیدها واللہ واعلم۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی ملاقات اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے اہل خانہ کی ان کی تعزیت کرنا صحیح طریقوں سے مروی ہے۔ اس کے بعد وہ روایتیں نقل کی ہیں جن کو ہم ضعیف قرار دے چکے ہیں۔ حافظ سہیلیؒ نے ان کی اسانید نقل نہیں کیں۔

۱۰۳۵۔ خدا تعالیٰ کے رسول بھی دفن ہوتے ہیں مگر جس طرح ان کی ولادت اور موت کے حالات میں امتیاز ہوتا ہے۔ اسی طرح اُن کے دفن کے حالات میں بھی امتیاز ہوتا ہے وہ عام دستور کے مطابق ہر جگہ دفن نہیں ہوتے بلکہ وہیں دفن ہوتے ہیں جہاں اُن کی تمنا ہوتی ہو چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حضرت عائشہؓ کے گھر میں ہوئی اس لیے یہ اس کی دلیل تھی کہ اسی جگہ دفن ہونے کی آپ کی تمنا تھی لہٰذا آپ وہیں دفن کیے گئے۔ گویا جو آپؐ کی قیام گاہ تھی وہی آپ کا مدفن رہا۔ اب غور فرمایئے وہ بشر کیسے

فِيْهِ إِذْ فِنُوْهُ فِيْ مَوْضِعِ فِرَاشِهٖ ۔ رواہ الترمذی

۱۰۳۶۔ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ لَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الَّذِيْ دَخَلَ فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ اَضَاءَ مِنْهَا كُلُّ شَيْءٍ فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ اَظْلَمَ مِنْهَا كُلُّ شَيْءٍ وَمَا نَفَضْنَا اَيْدِيَنَا عَنِ التُّرَابِ وَاِنَّا لَفِيْ دَفْنِهٖ حَتّٰى اَنْكَرْنَا قُلُوْبَنَا ۔ رواہ الترمذی وقال هٰذَا حَدِيْثٌ صحیح غریب وقد صححہ ابن کثیر کما فی البدایۃ والنہایۃ ص ۲۷۴ ج ۵۔

منہا انہم لا یورثون

۱۰۳۷۔ عَنْ اَبِيْ بَكْرٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

وہ چاہتا ہے کہ اس کو دفن کیا جائے لہذا آپ کو وہیں دفن کرو جہاں آپ کا بچھونا تھا۔ (ترمذی)

۱۰۳۶۔ انسؓ روایت کرتے ہیں جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے تو تمام مدینہ جگمگا اٹھا اور جس دن آپ کی وفات ہوئی تو تمام مدینہ تاریک تھا، اور ہم آپ کو مٹی دے کر ابھی اپنے ہاتھ جھاڑنے بھی نہ پائے تھے کہ اپنے قلوب کی حالت دیکھی تو دگرگوں تھی۔ (ترمذی)

انبیاء علیہم السلام کی وراثت میں امتیازی خصوصیت

۱۰۳۷۔ حضرت ابوبکرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہم جو انبیاء علیہم

بشر ہونگے جن کی وفات کے بعد محل رہائش کا بھی فرق نہیں پڑا صرف اس کی صورت ذرا بدل گئی اور جب ذرا ایک قدم اور آگے بڑھائیے تو حدیثیں پتہ دیتی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے جسم زندوں کی طرح زمین کے تخریبی اثرات سے محفوظ رہتے ہیں اور اگر اس سے ذرا اور آگے قدم اٹھائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبروں میں نمازیں بھی پڑھتے ہیں مگر پھر ان سب تفاصیل سے ان کی بشریت اور عبدیت ہی کا ثبوت ملتا ہے۔ جب دنیا میں ایک محسوس حیات کے مالک ہو کر وہ بشری رہے تو وفات کے بعد ان کی غیر محسوس حیات سے آپ اپنا عقیدہ کیوں خراب کرتے ہیں۔

۱۰۳۶۔ جس ذات کو مجسم نور بنایا گیا اور جن کا لقب قمر منیر رکھا گیا تھا اگر حقیقت میں نظروں کے سامنے ان کی آمد سے نور اور ان کے دفن کے بعد تاریکی چھا گئی تو کیا تعجب ہے۔ حضرت حنظلہؓ کی روایت گزر چکی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم آپ کی صحبت سے ذرا الگ ہوتے تھے تو ہماری قلبی کیفیت بدل جاتی تھی پھر جبکہ عالم کا تفاوت ہو گیا ہو تو بولو قلبی کیفیات کیوں نہ بدل گئی ہونگی۔ یہ عقیدت نہیں حقیقت تھی مگر جو انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع کو نہیں پہچانتے وہ ان حقائق کو سمجھ نہیں سکتے۔ مثل مشہور ہے، من لم یذق لم یدر۔ ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی۔

۱۰۳۷۔ عام بشر جب مر جاتے ہیں تو ان کا ترکہ ان کے عزیزوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی شان یہاں بھی مختلف نظر آتی ہے ان کی میراث کسی کو نہیں ملتی وہ سب راہ خدا میں صرف کی جاتی ہے سبحان اللہ جو ہستیاں اپنی حیات میں دنیوی طمع کا کوئی داغ اپنے دامن پر لگنا گوارا نہیں کرتیں، ان کے لیے یہی مناسب نہیں سمجھا گیا کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر اس داغ کے لگنے کی کوئی دشمن جرات کر سکے اسی لیے ان کی تمام میت

لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ . متفق علیہ

منہا مناجاتہم مع الملائکۃ

۱۰۳۸ - عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَکَلَ ثُوْمًا اَوْ بَصَلًا فَلْیَعْتَزِلْنَا اَوْ لِیَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا وَلْیَقْعُدْ فِیْ بَیْتِہٖ وَاَنَّہٗ اُتِیَ بِبَدْرٍ قَالَ ابْنُ وَھْبٍ

اسلام کی جماعت ہوتے ہیں ہمارا وارث کوئی نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ سب راہ خدا میں صدقہ ہوتا ہے۔ متفق علیہ

فرشتوں کے ساتھ آپ کی ہمکلامی کی خصوصیت

۱۰۳۸ - جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جو کچا لہسن یا کچی پیاز کھائے وہ ہم سے علیحدہ رہے یا یہ لفظ فرمائے کہ ہماری مسجد سے علیحدہ رہے (راوی کو ان الفاظ میں شک ہے) اس کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر بیٹھا رہے۔ ایسا اتفاق ہوا کہ آپ کے سامنے ایک طشت پیش کیا گیا جس

کے حق میں زکوٰۃ کا مال حرام قرار دے دیا گیا ہے۔ اب اندازہ کرلینا چاہیے کہ ان کی موت عام بشر تو درکنار شہداء سے بھی کتنی ممتاز ہوتی ہے شہداء کے حق میں قرآن کریم نے حیات کا لفظ تو استعمال فرمایا ہے اور ان کو بھی رزق ملنے کی بشارت دی ہے مگر ان کا ترکہ پھر عام انسانوں کی طرح ان کے عزیزوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ یہاں اس کی بھی اجازت نہیں بلکہ آپ کی ازواج کو آئندہ ہمیشہ کے لیے نکاح کرنے کی بھی ممانعت کردی گئی ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ شہداء میں بڑے سے بڑا بزرگ کسی کی ازواج کو بھی شوہروں کی وفات کے بعد نکاح کرنے سے روکا نہیں گیا مگر نبی کے حق میں اس کو اتنا اہم سمجھا گیا ہو کہ اس دفعہ کا خود قرآن کریم نے اعلان فرمایا ہو، مگر ان کے حق میں یہ سخت دفعہ ان کی مرضی کے بغیر لگائی نہیں گئی۔ بلکہ آپ کی حیات طیبہ میں ان کو یہ اختیار دیدیا گیا تھا وہ چاہیں تو دنیا کو اختیار کرلیں اور چاہیں تو اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کو اختیار کرلیں گویا اس میں اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اگر انہوں نے دوسری صورت کو ترجیح دی تو پھر آئندہ نکاح کا ان کو کوئی حق نہیں رہیگا، یہی وجہ تھی کہ آپ نے اس کی بڑی اہمیت محسوس کی اور سب بیویوں کو خود جا جا کر پیغام سنایا اور جب ان میں سب سے پہلے حضرت عائشہؓ نے یہ جواب دیا کہ یہ بات نہ استخارہ کی محتاج ہے نہ کسی سے مشورہ کرنے کی، ہم ایک طرف ہوکر آخرت اختیار کرتے ہیں تو گویا یہ بات برضاء و رغبت خود اختیار کرلی گئی تھی (دیکھو ترجمان السنہ ص ۹۰، ۱۹ ج ۲)۔ اس میں رسول کا احترام بھی ملحوظ تھا۔ باپ کی منکوحہ جو اپنی والدہ نہ ہو وہ بھی اولاد پر حرام ہے زمانۂ جاہلیت میں وہ سب سے بڑی اولاد کے نکاح میں آسکتی تھی مگر اسلام نے اس کو والد کے احترام کے خلاف سمجھا اور ہمیشہ کے لیے اس کو اولاد پر حرام کردیا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ابوت چونکہ ساری امت کے ساتھ تھی اس لیے یہاں تمام امت کے حق میں اس احترام اور حرمت کو باقی رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جب ان کی حیات کا مسئلہ سب سے ممتاز رکھا گیا تھا تو وفات کے بعد اس صفت میں بھی ان کو عام بشر سے ممتاز رکھا گیا

۱۰۳۸ - اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک چیز حلال ہوتی ہے مگر کبھی مخاطب کی خاطر اس کا استعمال ترک کیا جاتا ہے فرشتے چونکہ نورانی مخلوق ہیں ادیت سے اُن کو کوئی واسطہ نہیں اس لیے جس طرح ان کو کفر و شرک بلکہ ہر معصیت سے نفرت

يَعْنِي طَبَقًا فِيهِ خَضِرَاتٌ مِنْ بُقُوْلٍ فَوَجَدَ لَهَا رِيحًا فَسَأَلَ عَنْهَا فَأُخْبِرَ بِمَا فِيهَا مِنَ الْبُقُوْلِ فَقَالَ قَرِّبُوْهَا إِلَى بَعْضِ أَصْحَابِهِ كَانَ مَعَهُ فَلَمَّا رَآهُ كَرِهَ أَكْلَهَا قَالَ كُلْ فَإِنِّي أُنَاجِي مَنْ لَا تُنَاجِي۔ رواہ البخاری۔

ہیں کچھ سبزی تھی آپ نے ان کی بو محسوس کی تو پوچھا یہ کیا ہے۔ فوراً عرض کیا گیا کہ اس میں لہسن یا پیاز ہے آپ نے جو صحابی آپ کے ہمراہ تھے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ ان کے سامنے رکھ دو مگر جب آپ نے دیکھا (کہ آپ کے انکار کی وجہ سے) وہ بھی اس کا کھانا پسند نہیں کرتے تو فرمایا تم کھالو میں تو اس لیے نہیں کھاتا کہ میں اس مخلوق کے ساتھ ہمکلام ہوتا ہوں جن سے تم نہیں ہوتے۔ (بخاری شریف)

ہو اسی طرح بدبو اور نجاست وغیرہ سے بھی نفرت ہو۔ خدا تعالیٰ کی یہ مقدس مخلوق انبیاء علیہم السلام کی محفل کی ہر وقت حاضر باش ہوتی ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام اپنے اہل محفل کی خاطر خود بھی اس قسم کی اشیاء سے احتراز کر لیتے ہیں۔ اسی طرح مسجدیں بھی خاص طور پر ان کا محل ہیں۔ یہاں بھی ان کی رعایت کی گئی ہے۔ چونکہ عام انسانوں کو یہاں صرف کچھ وقت کے لیے دعوت دی جاتی ہے۔ اس لیے ان کو یہ ہدایت بھی کردی گئی ہے کہ جب وہ کسی کی خاص رہائش کی جگہ جائیں تو ان کو چاہیے کہ یہاں وہ تھوڑے ضبط نفس سے کام لیں اور ایسی اشیاء سے پرہیز رکھیں جو اس مقدس مقام کے اکابر کے لیے موجب اذیت ہو۔ اگر مسجدوں میں فرشتوں کا یہ احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے تو وہ بھی اپنے ان بشری مہمانوں کی دعاء خیر سے خوب تواضع کرتے ہیں اور اس طرح عام بشر کے مسجد میں بلانے کا جو اہم مقصد تھا وہ اچھی طرح پورا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گناہگاری جس مخلوق کے ضمیر کا جزو ہو اس کے لیے اس مخلوق کی صحبت کتنی ضروری ہوگی جو حرف معصیت سے بھی آشنا نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث ایک بڑی عمیق حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے یعنی بشر کے ملکوتی صفات سے انصباغ تکوینی نظم و نسق کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ اس انعکاس و انصباغ کی صورت صحبت سے زیادہ مؤثر اور کوئی نہیں ہو سکتی اس لیے کبھی تو فرشتوں کو مومنوں کے گھروں میں بھیجا جاتا ہے تاکہ ان کی صحبت سے ان میں معصومیت کی صفت پیدا ہوتی چلی جائے اور اس صورت میں ہم کو یہ ہدایت کردی گئی ہے کہ کوئی حرکت ہم ایسی نہ کریں جو ان کے آمد و شد کے لیے مانع ہو۔ مثلاً کتا گھروں میں نہ رکھیں، نجاست نہ رکھیں اور اسی طرح تصاویر نہ لٹکائیں کیونکہ یہ سب باتیں ان کے آنے سے مانع ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح کبھی ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم خود ان کے مستقر پر جا کر ان کی شرف صحبت سے مستفید ہوں اور ان کا سب سے بڑا مستقر مساجد ہیں اس صورت میں ہم کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہاں جا کر جو چیز ان کے لیے طبعاً قابل نفرت ہے اس کا استعمال نہ کریں اور شب و روز کی ان صحبتوں سے معصیت سے نفرت اور عبادت کی رغبت کا جو اہم مقصد ہے وہ عاصی انسانوں میں بھی فرشتوں کی طرح پیدا ہو جائے جو شریعت کے ان اسرار کو پیش نظر نہیں رکھتے ان کی عبادتیں بھی صرف عبادت کا ایک بے روح خاکہ بن کر رہ جاتی ہیں صفت احسان میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ اب آپ ہی اندازہ فرمائیے کہ عام بشر کو انبیاء علیہم سے کیا نسبت یہ اگر کچھ دیر کے لیے ان کی ہمنشینی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو خود ان کے مقام پر جا کر وہ بھی طفیل ہوتا ہے انبیاء علیہم السلام ہی کا اور رسول وہ ہوتے ہیں جن کی محفل میں خود ملائکۃ اللہ حاضر ہو کر ان کے شرف صحبت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ اہل جنت کو جس نوعیت کا مکالمہ اور صحبت فرشتوں کے ساتھ جنت میں جا کر نصیب ہوگی انبیاء علیہم السلام کو وہ اسی عالم میں میسر ہوتی ہے، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر۔

۱۰۳۹۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُوْنَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصْبَحَ يَوْمًا وَاجِمًا وَقَالَ اِنَّ جِبْرَئِيْلَ كَانَ وَعَدَنِيْ اَنْ يَلْقَانِيَ اللَّيْلَةَ فَلَمْ يَلْقَنِيْ اَمَ وَاللّٰهِ مَا اَخْلَفَنِيْ ثُمَّ وَقَعَ فِيْ نَفْسِهٖ جِرْوُ كَلْبٍ تَحْتَ فُسْطَاطٍ لَهٗ فَاَمَرَ بِهٖ فَاُخْرِجَ ثُمَّ اَخَذَ بِيَدِهٖ مَاءً فَنَضَحَ مَكَانَهٗ فَلَمَّا اَمْسٰى لَقِيَهٗ جِبْرَئِيْلُ فَقَالَ لَقَدْ كُنْتَ وَعَدْتَنِيْ اَنْ تَلْقَانِيَ الْبَارِحَةَ قَالَ اَجَلْ وَلٰكِنَّا لَا نَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا صُوْرَةٌ فَاَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَئِذٍ فَاَمَرَ بِقَتْلِ الْكِلَابِ حَتّٰى اَنَّهٗ يَاْمُرُ بِقَتْلِ كَلْبِ الْحَائِطِ الصَّغِيْرِ وَيَتْرُكُ كَلْبَ الْحَائِطِ الْكَبِيْرِ۔ رواہ مسلم۔

۱۰۳۹۔ ابن عباس حضرت میمونہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ مغموم تھے اور فرماتے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام نے آج کی شب مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا مگر آئے نہیں خدا کی قسم وہ مجھ سے وعدہ خلافی تو نہیں کر سکتے۔ پھر آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ آپ کے تخت کے نیچے کتے کا پلہ ہے آپ نے حکم دیا وہ فوراً نکال دیا گیا۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے پانی لے کر اس جگہ پر چھڑکا۔ جب شام ہوئی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے آپ نے فرمایا۔ آپ نے تو گزشتہ شب میں مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا جی ہاں لیکن جس گھر میں کتا یا تصویر ہوتی ہے ہم جو فرشتوں کی جماعت ہیں اس گھر میں داخل نہیں ہوا کرتے۔ اسی دن صبح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ کتے مار دیے جائیں اور اس تاکید سے حکم دیا کہ اگر کسی کا باغ چھوٹا ہو اور وہ خود اس کی حفاظت کر سکتا ہو تو جو کتا اس کی نگرانی کے لیے ہو وہ بھی مار دیا جائے، ہاں اگر باغ بڑا ہو تو اس کی نگرانی کا کتا چھوڑ دیا جائے۔ (مسلم شریف)

۱۰۳۹۔ کتا ایک ایسا جانور ہے جس کی فطرت کو شیاطین سے مناسبت ہے اور تصویر خالق حقیقی کی نقالی کا بدترین مظاہرہ ہے اس لیے فرشتے ان دونوں سے بیزار رہتے ہیں۔ نبی و رسول کا گھر گو ان کے لیے مرکز شغل کی سی کشش رکھتا ہے مگر جس طرح آب و آتش کا اجتماع فطرۃً ناممکن ہے اسی طرح ملائکۃ اللہ اور خبائث کا اجتماع بھی ان کی فطرۃ کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جلیل القدر فرشتے کی آمد کے لیے جو امر مانع بن گیا ہو وہ وقتی طور پر آپ کو بھی کتنا شاق گزرا ہوگا۔ کتا باغات کی حفاظت کے لیے اس وقت بہت ضروری چیز سمجھا جاتا تھا اس لیے ضرورت تھی کہ اس کی مضرت ذہن نشین کرنے کے لیے کچھ مدت کے لیے ایسا حکم نافذ کر دیا جائے کہ پھر اس کا استعمال مجبوری کے درجہ ہی میں محدود ہو جائے۔ افسوس ہے کہ جو چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک گھر میں فرشتوں کی آمد کی مانع ہو گئیں آج وہی ہمارے گھروں کی سب سے بڑی زینت بنی ہوئی ہیں۔ اب یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ جب فرشتوں کی آمد کے لیے لاعلمی میں بھی صرف ایک کتے کا وجود مانع بن سکتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی ان کی آمد کے لیے مانع نہ ہوگی۔ خوب یاد رکھیے کہ فرشتوں کو جس طرح نجاسات اور خباثت سے بالطبع نفرت ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے بھی ان کو شدید نفرت ہوتی ہے ترجمان السنۃ ص ۲۸۴ ج ۲ میں آپ ملاحظہ فرما چکے کہ جھوٹ کی بدبو سے فرشتے ایک میل دور نکل جاتے ہیں۔ جاندار کی تصویر دیکھنا وہ برداشت نہیں کرتے لہسن و پیاز کی بدبو سے ان کو سخت ایذا ہوتی ہے۔ اگر العیاذ باللہ انبیاء علیہم السلام معصوم نہ ہوں تو کیا فرشتوں کی حضوری اور ہر مقامات میں ان کی بلکہ ان کی امتوں کی اعانت وہ اپنی سعادت تصور کر سکتے ہیں۔

منها صلوٰة النبي صلى الله عليه وسلم على الجنائز فانها كانت نورا لاهل القبور

۱۰۴۰۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ اِمْرَءَةً سَوْدَاءَ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ اَوْ شَابٌّ فَفَقَدَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَ عَنْهَا اَوْ عَنْهُ فَقَالُوْا مَاتَ قَالَ اَفَلَا كُنْتُمْ اٰذَنْتُمُوْنِیْ قَالَ فَكَاَنَّهُمْ صَغَّرُوْا اَمْرَهَا اَوْ اَمْرَهٗ فَقَالَ دُلُّوْنِیْ عَلٰى قَبْرِهٖ فَدَلُّوْهُ فَصَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ قَالَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰى اَهْلِهَا وَاِنَّ اللّٰهَ يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلٰوتِیْ عَلَيْهِمْ ۔ متفق علیہ واللفظ لمسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صلوٰۃ جنازہ کی ایک خصوصیت

۱۰۴۰۔ ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک سیاہ فام عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی یا وہ کوئی نوجوان مرد تھا (راوی کو اس میں شک ہے) ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نہ دیکھا تو اس کے متعلق دریافت فرمایا۔ لوگوں نے کہا اس کا تو انتقال بھی ہو گیا۔ آپ نے فرمایا تم نے مجھ کو اس کی خبر کیوں نہیں کی۔ راوی کہتا ہے گویا لوگوں نے ایسی عورت کی موت کا معاملہ بہت معمولی سمجھا۔ اس پر آپ نے فرمایا مجھے بتاؤ اس کی قبر کہاں ہے۔ چنانچہ آپ کو قبر بتائی گئی۔ آپ نے اس پر نماز ادا کی اس کے بعد ارشاد فرمایا یہ جو مردوں کی قبریں ہیں یہ تاریکی در تاریکی سے بھری ہوئی ہیں میری نماز کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو روشن اور منور فرما دیتا ہے۔ متفق علیہ

۱۰۴۰۔ نبی کی نماز، اس کی امامت اور اس کی اقتدار کے مسائل بھی سب سے ممتاز ہوتے ہیں فضائل کے یہ سب گوشے چونکہ صرف آپ کی ذات سے متعلق تھے اس لیے وہ کسی تقریب سے بیان میں آ گئے ہیں۔ دنیا میں مسلمانوں پر ہمیشہ جنازہ کی نمازیں پڑھی جائینگی مگر کیا ہے کوئی جس کی نماز تاریک قبروں کو منور کرنے کے لیے قطعیت کے ساتھ ضامن ہو سکے۔

ایک واقعہ ایسا بھی ہوا کہ صدیق اکبرؓ آپ کی غیر حاضری میں امام بن گئے تھے اتفاق سے آپ عین نماز کی حالت میں تشریف لے آئے۔ ابوبکرؓ نے یہ محسوس کرنے کے ساتھ ہی امامت کے مصلے سے فوراً اپنے قدم پیچھے ہٹا لیے آپ نے اشارہ سے فرمایا بھی کہ نماز پوری کرو مگر حضرت ابوبکرؓ سے نہ ہو سکا اور بعد میں یہ عذر بیان کیا یا رسول اللہ ابو قحافہ (ان کے والد کی کنیت ہے) کے بیٹے کی کیا مجال کہ جہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہوں وہاں اس کا قدم آگے نظر آئے۔ علماء نے لکھا ہے کہ نبی کی امامت اس کے اذن کے بغیر جائز نہیں غالباً آپ کی وفات کے بعد آپ کے جنازے کی نماز امام کے بغیر اسی نکتہ کی بنا پر ادا کی گئی تھی اور اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد امام مہدی نماز کے مصلے سے پیچھے ہٹ آئیں گے اور آئندہ کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی مستقل امام ہونگے۔

منها تمثل الجنة والنار صلی الله علیه وسلم

۱۴۱۰۔ عَنْ عَبْدِ اللہِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰی عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّی اللہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰی قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللہِ رَأَیْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَیْئًا فِیْ مَقَامِكَ ثُمَّ رَأَیْنَاكَ تَكَعْكَعْتَ فَقَالَ اِنِّیْ رَأَیْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُوْدًا وَلَوْ اَخَذْتُهٗ لَاَكَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِیَتِ الدُّنْیَا۔ رواہ البخاری فی باب رفع البصر الی الامام فی الصلوۃ راجع ص۳۲۴ ترجمان السنۃ وفیہ قصۃ رؤیۃ امرأۃ فی النار دخلتھا فی ھرۃ کما فی البخاری ص۱۰۳ قالت عائشۃؓ ان المرأۃ کانت کافرۃ الخ کما فی المجمع ۔

۱۴۲۰۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ صَلّٰی لَنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ رَقِیَ الْمِنْبَرَ فَاَشَارَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنت و دوزخ کے تمثل کی خصوصیت

۱۴۱۰۔ ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ایک بار سورج گہن ہوا تو آپؐ نے صلوٰۃ الکسوف ادا فرمائی ۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ ہم نے دیکھا تھا جب آپؐ نماز کے لیے کھڑے تھے تو آپؐ کوئی چیز سامنے سے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا، اس کے کچھ بعد ہم نے دیکھا تھا کہ آپؐ اپنے پیچھے کی جانب ہٹے تھے دیکیا بات تھی؟ آپؐ نے فرمایا جب میں سامنے کی جانب بڑھا تھا تو اس وقت میں نے جنت دیکھی تھی میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں اس میں سے ایک خوشہ لے لوں اور اگر کہیں میں لے لیتا تو تم اس کو کھاتے رہتے جب تک دنیا باقی رہتی (اور وہ ختم نہ ہوتا) اور جب پیچھے کی جانب ہٹا تھا تو اُس وقت دوزخ دیکھی تھی۔ (بخاری شریف)

۱۴۲۰۔ انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ظہر کی نماز پڑھائی پھر

۱۴۱۰۔ انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں اولیاء کرام کو بھی کبھی کبھی جنت و دوزخ کا مشاہدہ ہو جاتا ہے مگر یہ مشاہدہ صرف اسی حد تک ہوتا ہے کہ ان کو یہ وسوسہ بھی نہیں گزرتا کہ وہ جنت کی کوئی چیز اٹھالیں مگر آپ کا یہ مشاہدہ اس درجہ ممتاز حقیقت تھا کہ اس کے اظہار کے لیے سب سے مناسب تعبیر وہی ہو سکتی تھی جو حدیث مذکور میں آپ نے اختیار فرمائی۔ یہ ظاہر ہے کہ خود جنت بھی غیر فانی ہے اس لیے اس کی جو چیز ہو وہ بھی غیر فانی ہونی چاہیے ۔ یقیناً اگر آپ اس کے باغات کا کوئی خوشہ لے لیتے تو رہتی دنیا تک وہ بھی فنا نہ ہوتا۔ آپ نے اس حقیقت کو واضح کر کے یہ سمجھا دیا کہ آپ نے بعینہ جنت ہی کو دیکھا تھا اور اسی لیے ایک قدم آگے بڑھایا تھا مگر چونکہ دار فانی غیر فانی لذتوں سے موت سے قبل متمتع نہیں ہو سکتا اس لیے صرف ایک قدم اٹھا کر آپ رک گئے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص انبیاء علیہم السلام کے مشاہدات کی حقیقت خواب و خیال کی برابر سمجھے تو اس کی کج فہمی کا کیا علاج ۔ اسی واقعہ میں آپ نے ایک عورت کو دوزخ میں دیکھا جس نے ایک بلی کو باندھ کر پھر اس کے آب و دانہ کی خبر دلی تھی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ عورت کافرہ تھی یہ عذاب اس کو اسی لیے ہوا تھا۔ کما فی مجمع الزوائد۔

۱۴۲۰۔ عام عبادت کی حالت میں بھی اور بالخصوص نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع خدا ہی جانے کتنی بلند

بَيْدَيْهِ قِبَلَ قِبْلَةِ الْمَسْجِدِ ثُمَّ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُ الْآنَ مُنْذُ صَلَّيْتُ لَكُمُ الصَّلٰوةَ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ مُمَثَّلَتَيْنِ فِيْ قِبْلَةِ هٰذَا الْجِدَارِ فَلَمْ اَرَ كَالْيَوْمِ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ ثَلَاثًا۔ رواہ البخاری قلت وھذا فی واقعۃ الظھر کما یعلم مما عند البخاری فی باب وقت الظھر عند الزوال ص۷۷ وفیہ واقعۃ سوال حذافۃ من ابی۔

ممبر پر تشریف لا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے قبلہ کی جانب اشارہ کر کے فرمایا میں نے ابھی ابھی جب تم کو نماز پڑھا رہا تھا تو جنت اور دوزخ کو اس قبلہ والی دیوار کی طرف دیکھا تھا کہ وہ متمثل ہو کر میرے سامنے ہیں کیا پوچھتے ہو کہ خوف و خوشی کا جیسا منظر آج میں نے دیکھا تھا ایسا عمر بھر کبھی نہیں دیکھا۔ (بخاری شریف)

ہو جاتی تھی گویا اس جہان میں بس آپ کا جسم ہی جسم رہ جاتا تھا روح مبارک عالم بالا سے جا ملتی تھی حضوری بھی وہ حضوری میسر آتی تھی کہ ملکوت و جبروت کے عجائبات طرح طرح لیے سب کھلے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ رسول اعظم کی یہ شان بھی کتنی نرالی تھی کہ کبھی عالم غیب خود ایک صورت بن کر یعنی عالم مثال میں ان کے سامنے آجاتا تھا اور کبھی وہ خود بنفس نفیس عالم غیب میں جا کر اس کی سیر کر آتے تھے ان کے لیے نہ یہ مشکل تھا نہ وہ مشکل تھا۔

اس حدیث میں جنت و دوزخ کے عینی مشاہدہ کی حقیقت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر چیز کے لیے دو وجود ہیں ایک خارجی دوم مثالی یعنی جیسا خارج کا عالم ایک عالم ہے اسی طرح عالم مثال بھی مستقل ایک عالم ہے خارجی عالم میں اس شے کا مادہ اور اس کی مقدار و کیفیت دونوں موجود ہوتی ہیں۔ عالم مثال میں صرف اس کی مقدار اور کیفیت ہی محفوظ رہتی ہے اس کا مادہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے عالم مثال خارجی عالم سے زیادہ قوی مانا گیا ہے۔ عالم مثال خواب کے عالم سے بالکل مختلف ہے لیکن بطور نظیر کے اس کے سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ ایک خوابیدہ شخص بحالت خواب آسمان و زمین کا کتنا وسیع احاطہ دیکھ لیتا ہے جو اپنی وسعت میں عالم خارجی کے آسمان و زمین سے کسی طرح کم نہیں ہوتا مگر اتنا وسیع عالم پھر اس کے عالم خیال میں سمٹ کر اس طرح آجاتا ہے کہ اس سارے عالم کی سمائی کے بعد بھی خیالی وسعت میں پھر گنجائش رہتی ہے۔ اسی طرح جنت و دوزخ کی وسعت اتنی ہے کہ سبع سماوات معہ زمینوں کے اس کے ایک گوشہ میں ہیں لیکن عالم مثال دوسرا عالم ہے اس کی یہ ساری وسعت بآسانی اس عالم کے کسی گوشہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اس عالم کا اس عالم سے علاقہ نہ ظرف و مظروف کا ہے نہ داخل و خارج کا اس لیے وہاں یہ سوالات ہی پیدا نہیں ہو سکتے جو اس عالم کے اشیاء کے متعلق پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ حقیقت قرآن کریم تک بھی سرایت کر گئی ہے۔ حضرت مریمؑ کے قصہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔

اب سوچیے کہ جبرئیل علیہ السلام کی یہ آمد کتنی پُر راز حقیقت تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا سارا واقعہ اسی آمد کے ساتھ مربوط ہے لیکن جبرئیل علیہ السلام کی اس آمد کو بھی بلفظ تمثل ہی ادا فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ بشری صورت میں متمثل ہو کر نہ آتے تو ان کے دیکھنے کی تاب حضرت مریم علیہا السلام میں کہاں تھی پھر خدا تعالیٰ کا اتنا عظیم فرشتہ جب متمثل ہو کر آیا تو وہ اتنا ہی مختصر نظر آرہا تھا جیسا عام انسان ہوا کرتے ہیں۔ لہذا اگر جنت و دوزخ اپنی وسعت کے باوجود صرف قبلہ کی دیوار میں سمٹ کر آپ کو نظر آگئی تو اس کو ایک کشف یا خیال تصور کرنا قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا عالم غیب کے ساتھ علاقہ کتنا قوی ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اس کا تصور ہو جائے تو پھر ان امور کے یقین کرنے میں کوئی دیر نہیں۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں اس لیے جو معاملات اہل جنت کے حق میں فرمائے قیامت کے بعد قابل تصدیق ہیں وہ اس مقدس گروہ کے حق میں آج بھی لائق ایمان ہیں (باقی ص۲۷۳)

منها رؤیتہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الجنۃ والنار بعینیہما

۳۴۳۰۱- عَنْ بُرَیْدَۃَ قَالَ اَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَدَعَا بِلَالًا فَقَالَ بِمَا سَبَقْتَنِیْ اِلَی الْجَنَّۃِ مَا دَخَلْتُ الْجَنَّۃَ قَطُّ اِلَّا سَمِعْتُ خَشْخَشَتَکَ اَمَامِیْ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا اَذَّنْتُ قَطُّ اِلَّا صَلَّیْتُ رَکْعَتَیْنِ وَمَا اَصَابَنِیْ حَدَثٌ قَطُّ اِلَّا تَوَضَّأْتُ عِنْدَہٗ وَرَأَیْتُ اَنَّ لِلّٰہِ عَلَیَّ رَکْعَتَیْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِہِمَا۔ رواہ الترمذی وعند البخاری نحوہ فی باب فضل الطہور باللیل والنہار وفضل الصلوۃ بعد الوضوء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جنت و دوزخ مشاہدہ فرمانے کی خصوصیت

۳۴۳۰۱- بریدہؓ روایت کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ صبح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کو بلایا اور پوچھا تم کس عمل کی وجہ سے مجھ سے بھی پہلے جنت میں جا پہنچے۔ میں جب بھی جنت میں داخل ہوتا ہوں تمہارے پیروں کی آہٹ اپنے آگے آگے سنتا ہوں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ میں جب اذان دیتا ہوں تو دو رکعتیں نفل ضرور پڑھ لیتا ہوں اور جب وضو کی ضرورت ہو جاتی ہے تو فوراً وضو ضرور کرتا ہوں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی یہ دو رکعتیں میں نے اپنے لیے فرض سمجھ لی ہیں۔ آپ نے فرمایا یہی بات ہے۔ ترمذی شریف

۳۴۳۰۱- مذکورہ بالا روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں داخل ہونے کا اکثر اتفاق ہوا کرتا تھا اور بلالؓ کی یہ خوش نصیبی تھی کہ آج ان کا تذکرہ بیان میں بھی آگیا تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر انسان اپنے نوافل کا پابند ہے تو بعض مرتبہ اس کے خیال میں جو معمولی اعمال ہوتے ہیں وہ اس کے حق میں کسی بلند مرتبہ کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہاں تحیۃ الوضوء کی فضیلت تو ثابت ہوتی ہی ہے مگر اصولاً نوافل ادا کرنے کا فائدہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہاں آپ نے صرف اپنا مشاہدہ نقل نہیں فرمایا بلکہ جنت میں داخل ہونے کے بعد اس مشاہدہ کا ذکر کیا ہے اب اس دخول کی نوعیت کیا تھی اس پر بحث کرنا ہمارے دائرہ علم سے باہر بات ہے اس قسم کے کئی واقعات حدیثوں میں آتے ہیں اور قیاس نہیں کہتا کہ وہ سب کے سب خواب کی حالت کے واقعات ہونگے اور جب تک حدیث میں اس کی تصریح نہ آجائے اس وقت تک کسی کو اپنی جانب سے اس کا حق بھی نہیں ہے بالخصوص اُن کے حق میں جن کا اسی جسم کے ساتھ ایک مرتبہ آسمانوں اور جنت کی سیر کرنا بلکہ دیدار الٰہی سے مشرف ہونا بھی امت کے نزدیک مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے۔ یہاں ترجمان السنۃ صفحہ ۲۹۱ ج ۱ حدیث (۱۷) ملاحظہ فرمالیجیے۔ غالباً یہ خواب اور شب معراج کے علاوہ کوئی اور صورت ہوگی واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۷۲) شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی جسم کے ساتھ تشریف لے گئے تھے اور حضرت آدم علیہ السلام اسی جنتی جسم کو لے کر اس زمین پر آئے تھے بس ثابت یہی ہوتا ہے کہ ان کے جسم دنیا میں بھی اہل جنت کے سے خواص رکھتے ہیں ان کے حق میں یہاں بھی وہ گھر اپنا ہی گھر ہوتا ہے۔

۱۰۴۴۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَخَلْتُ الْجَنَّۃَ فَاِذَا اَنَا بِالرُّمَیْصَاءِ اِمْرَءَۃِ اَبِیْ طَلْحَۃَ وَسَمِعْتُ خَشْفَۃً فَقُلْتُ مَنْ ھٰذَا فَقَالَ ھٰذَا بِلَالٌ وَرَاَیْتُ قَصْرًا بِفِنَائِہٖ جَارِیَۃٌ فَقُلْتُ لِمَنْ ھٰذَا فَقَالُوْا لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَاَرَدْتُ اَنْ اَدْخُلَہٗ فَاَنْظُرَ اِلَیْہِ فَذَکَرْتُ غَیْرَتَکَ فَقَالَ بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَعَلَیْکَ اَغَارُ۔ متفق علیہ

من أجلّ ميزات الانبياء عليهم السلام وحي النبوة وقد انقطع بعد نبينا وسيدنا محمد صلى الله عليه وسلم

۱۰۴۵۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ لِعُمَرَ بَعْدَ وَفَاۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنْطَلِقْ بِنَا

۱۰۴۴۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں جنت میں داخل ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ابو طلحہؓ کی بیوی رمیصاء موجود ہیں (یہ انسؓ کی والدہ ام سلیم کا نام تھا) پھر میں نے پیروں کی آہٹ سنی تو پوچھا یہ کون؟ کسی نے کہا کہ یہ بلالؓ ہیں۔ اس کے بعد میں نے ایک محل دیکھا اس کے آنگن میں ایک جاریہ نظر آئی میں نے پوچھا یہ محل کس کا ہے؟ انہوں نے بتایا عمرؓ کا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اندر داخل ہو کر بھی ذرا اس کو دیکھوں فوراً مجھے تمہاری طبعی غیرت کا خیال آگیا۔ یہ سن کر عمرؓ بے اختیار بول اٹھے میرے ماں باپ آپ پر قربان یا رسول اللہ کیا میں آپ کے داخل ہونے پر بھی غیرت کرتا۔ متفق علیہ

انبیاء علیہم السلام کی سب سے ممتاز خصوصیت وحی نبوت ہے اور اب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے

۱۰۴۵۔ انسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبرؓ نے عمر فاروقؓ

۱۰۴۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو یہ سارے نظارے اب ہو رہے تھے لیکن جن کے حق میں یہ نظارے ہو رہے تھے ان کے لیے اس کے ظہور کا وقت فردائے قیامت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم دور بین نے تو سب اہم واقعات جو آنے والے تھے وہ بھی بہت پہلے دیکھ لیے تھے۔ جنت تو آپ کے نظارہ کی مخصوص جگہ تھی اس کے نہ معلوم کتنے عجائبات آپ نے ملاحظہ فرمائے ہونگے جو بیان میں نہیں آئے یہاں تین مقدس ہستیوں کا نصیب تھا کہ ان کے حتمی طور پر جنتی ہونے کی بشارت اس زبان سے نکل گئی جو سب سے بڑھ کر راست گو تھی۔ پھر بشارت بھی وہ جو چشم دید تھی۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی غیرت دیکھیے کہ وہاں بھی اپنے جاں نثار کی خاطر کو قلبی تقاضہ تو رہا کہ ان کے جنت کی زیب و زینت اندر جا کر تفصیلاً بھی دیکھ آتے مگر پھر ان کی غیور طبیعت کا خیال اس سے مانع آگیا۔ ادھر اس جاں نثار کا جذبہ دیکھیے کہ جو شرف آپ کے اندر جانے سے اس کو نصیب ہوتا اس کی محرومی پر وہ ایک حسرت بھرا کلمہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

۱۰۴۵۔ وحی کیا ہے؟ خدا تعالیٰ سے قطعی ہمکلامی کا ایک شرف ہے جو نوع بشری میں خاص قسم کے افراد کے ساتھ مخصوص

إِلَى أُمِّ أَيْمَنَ نَزُوْرُهَا كَمَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَزُوْرُهَا فَلَمَّا انْتَهَيَا إِلَيْهَا بَكَتْ فَقَالَا لَهَا مَا يُبْكِيْكِ أَمَا تَعْلَمِيْنَ أَنَّ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ إِنِّيْ لَا أَبْكِيْ إِنِّيْ لَا أَعْلَمُ أَنَّ مَا عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى خَيْرٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ أَبْكِيْ أَنَّ الْوَحْيَ قَدِ انْقَطَعَ مِنَ السَّمَاءِ فَهَيَّجَتْهُمَا عَلَى الْبُكَاءِ فَجَعَلَا يَبْكِيَانِ مَعَهَا

رواہ مُسلم وَاَخرجَہٗ صاحب مشکوٰۃ فی باب وفاۃ النبی صلی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

سے کہا آؤ ہم بھی جس طرح کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ام ایمن کی ملاقات کے لیے تشریف لیجایا کرتے تھے ہم بھی ان کی ملاقات کے لیے چلیں جب یہ دونوں حضرات ان کے گھر پہنچے تو ان کو دیکھ کر بے ساختہ ان پر گریہ طاری ہوگیا۔ انہوں نے فرمایا آپ روتی کیوں ہیں کیا آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ عیش و آرام کے سامان موجود ہیں۔ انہوں نے فرمایا میں اس پر تو نہیں روتی کہ اتنا بھی نہیں جانتی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کے لیے بہتر سے بہتر راحتیں مہیا ہیں۔ رونا اس پر ہے کہ اب آسمان سے وحی کی آمد کا سلسلہ ختم ہوگیا یہ کہہ کر ام ایمن نے ان دونوں حضرات کو بھی خوب رُلایا اور یہ بھی اُن کے ساتھ مل کر رونے لگے۔ (مسلم)

ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے آپ کی شان بشریت کے ساتھ آپ کی اسی امتیازی صفت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ یعنی میں بھی یقیناً ایک بشر ہوں مگر میرا امتیاز یہ ہے کہ مجھ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے اور اس کا سب سے اہم سبق توحید الٰہی ہے۔ ہر بشر میں اس کی اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خالق کے ساتھ بلا واسطہ ہمکلامی سے مشرف ہو سکے اس لیے قدرت اپنی جانب سے اس صلاحیت کے چند افراد منتخب فرما لیتی ہے پھر ان کے ذریعے عام بشر تک اپنے احکام پہنچا دیتی ہے اگر وہ چاہتی تو عام بشر میں بھی یہ استعداد پیدا فرما دیتی مگر یہ اس کی حکمت کا تقاضہ تھا اس کو عالم میں کافر و مسلم، مطیع و عاصی کی تقسیم پیدا فرما کر اپنے قہر و مہر کے کمالات کا اظہار بھی منظور تھا اس لیے اگر وہ سب افراد میں صلاحیت کے پیدا فرما دیتی تو انکار و نافرمانی کا تخم دنیا سے نیست و نابود ہو جاتا پھر اس کی طاعت کے لیے فرشتوں کی مخلوق ہی کیا کم تھی۔ دنیوی بادشاہوں کا دستور بھی یہی ہے کہ وہ اپنی رسالت کے لیے مخصوص صفات کے افراد ہی کا انتخاب فرماتے ہیں اور اپنی رعایا میں ہر ہر شخص سے خود ہمکلام ہونا نہ اپنی ہی شان ملوکیت کے مناسب سمجھتے ہیں اور نہ ان کی شان رعیت کے لائق سبحانہ اعلیٰ و اجل۔

یہ ام ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مولات یعنی آزاد کردہ باندی تھیں۔ محمد علان شافعی ریاض الصالحین کی شرح میں نقل کرتے ہیں کہ یہ ام ایمن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد ماجد کے ترکہ میں ملی تھیں اور ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت آیا کی طرح انجام دیا کرتی تھیں اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماں کی طرح ان کا اکرام فرماتے تھے اور ان کی ملاقات کے لیے بھی تشریف لیجاتے تھے (دلیل الفالحین ص۲۵ ج ۳) کتنی خوش نصیب تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ملاقات کو تشریف لیجاتے تھے کتنی فہیم تھیں کہ خالق اور اس کی مخلوق کے مابین سلسلۂ گفت و شنید کی اہمیت کو پورا پورا سمجھ چکی تھیں اور کتنی باایمان بی بی تھیں کہ اس نعمت عظمیٰ کے گم ہو جانے کے غم میں کس طرح گھلی جا رہی تھیں صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بھی کسی کی یاد تازہ کرنے کے لیے جا رہے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں جب ام ایمن کا دل پارہ پارہ ہو تو یہ حضرات اس غم سے کب خالی رہ سکتے تھے گو بڑے بہادر اور بڑے متحمل تھے لیکن

۱۰۴۶۔ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ اِبْنَ عُمَرَ قَالَ لِعُثْمَانَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَا اَقْضِيْ بَيْنَ رَجُلَيْنِ قَالَ فَاِنَّ اَبَاكَ كَانَ يَقْضِيْ فَقَالَ اِنَّ اَبِيْ لَوْ اَشْكَلَ عَلَيْهِ سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَوْ اَشْكَلَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْءٌ سَاَلَ جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاِنِّيْ لَا اَجِدُ مَنْ اَسْاَلُهُ وَسَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَقَدْ عَاذَ بِعَظِيْمٍ

۱۰۴۶۔ نافعؓ سے روایت ہے کہ ابن عمرؓ نے حضرت عثمانؓ (کے فرمان پر اُن) سے (معذرت کی اور) کہا کہ میں دو شخصوں کے معاملہ کا فیصلہ کرنا بھی پسند نہیں کرتا انہوں نے فرمایا آخر کیوں تمہارے والد ماجد تو فیصلے کیا کرتے تھے۔ انہوں نے عرض کی میرے والد کو اگر مشکل پیش آتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر اس کو حل کر لیتے تھے اور اگر آپؐ کو کوئی مشکل پیش آجاتی تو آپ جبرئیل علیہ السلام سے معلوم کر لیتے تھے میرے پاس کون ہے جس سے دریافت کر کے میں اپنی مشکلات حل کر سکونگا اب عرض یہ ہے کہ) میں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سُنا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی پناہ لی اس نے سب سے بڑے کی پناہ لے لی اور میں نے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۷۵) دُکھے ہوئے دلوں کا چھیڑ دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ ام ایمن کی زبان سے ایک فقرہ سُننا تھا کہ ان کا پیمانۂ صبر بھی چھلک پڑا اور بے اختیار اشکہائے غم ان کی آنکھوں سے بھی بہ نکلے ابھی ابھی یہ محفل یا تو مسرت و ملاقات کی ایک محفل تھی یا ذرا سی دیر میں بے ارادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں گریہ وزاری کی ایک مجلس بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کو ہر طرح مکمل ہو چکی تھی مگر اپنے خالق کے ساتھ ہمکلامی گو بالواسطہ سہی ایسا شرف نہ تھا جس سے محرومی ارباب قلوب کے لیے غم کا پہاڑ نہ بن جاتی۔

دیکھیے صحابہ کرامؓ کی ہر ہر گفتگو میں جہاں ذرا بھی موقعہ ہوتا ہے یہ بات کس طرح نکلتی چلی آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے نزدیک نبوت کا انقطاع کیسا متفقہ اور یقینی عقیدہ تھا یہاں کسی کے دل میں وحی کی کسی قسم کے بقا کا وسوسہ بھی نہ تھا خواہ وہ تشریعی ہو یا غیر تشریعی۔ اس حدیث کے فوائد میں ایک یہ ہے کہ خالق و مخلوق کے مابین ہمکلامی گو بالواسطہ ہو انسانیت کا بڑا شرف ہے اور یہ کہ جب دنیا کی عمر آخر ہوئی تو یہ شرف بھی ختم ہو گیا اور یہ کہ باہم مسلمانوں کی ملاقات سنت انبیاء علیہم السلام ہے اور یہ کہ بڑا بھی چھوٹے کی ملاقات کے لیے جا سکتا ہے اور یہ کہ بڑوں کی یاد تازہ کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اُن کے بعد اُن کے مراسم مودت و محبت کو نبھایا جائے۔ اس ایک حدیث میں اخلاقیات و معاشرت زندگی کے کتنے اہم اسباق ہیں۔

۱۰۴۶۔ دیکھیے یہاں ابن عمرؓ بھی اسی حقیقت کا پتہ دے رہے ہیں کہ جزم و یقین اور حقیقت رسی کی راہ صرف وحی کی راہ ہے اور اب وہ بند ہو چکی ہے فہم انسانی خواہ کتنی بھی عالی ہو اور اس کے ذرائع تحقیق و تفتیش خواہ کتنے بھی وسیع ہوں مگر اس کے باوجود حقیقت رسی اور جزم و یقین کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنے جہل کی بناء پر ظن کو یقین اور کجروی کو صراط مستقیم سمجھ بیٹھے یہی وجہ ہے کہ عقلاء ہمیشہ باہم اختلاف و نزاع کے گرداب میں غوطہ زن نظر آتے ہیں۔ اگر عقل انسانی حقیقت تک رسائی کی ضامن بن جاتی تو بھلا حقیقت میں اختلاف کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے مشہور ہے ۔ چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ پس کسی جد و جہد کے بغیر حقیقت تک رسائی کا یہ انعام قدرت کا سب سے بڑا انعام تھا، کاش انسان اس کی قدر کرتا۔ یہاں ابن عمرؓ خدا تعالیٰ کی اس نعمت اور اپنے اسی نقصان پر تنبیہ فرما رہے ہیں کہ میرے پاس نہ تو خود حقیقت تک رسائی کا کوئی ذریعہ ہے نہ دوسرے کسی واسطہ سے اس کے حصول کا اب

وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ عَاذَ بِاللّٰهِ فَاَعِيْذُوْهُ وَاِنِّيْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ تَجْعَلَنِيْ قَاضِيًا فَاَعْفَاهُ وَقَالَ لَا تُخْبِرْ اَحَدًا۔ رواه رزين وروى الترمذى نحوه

آپ کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر پناہ مانگے اس کو پناہ دیدو لہذا میں اللہ تعالیٰ کے نام کی پناہ لیتا ہوں اس بات سے کہ آپ مجھے قاضی بنائیں۔ یہ سن کر عثمان غنیؓ نے ان سے پھر اصرار نہیں کیا اور یہ بھی فرما دیا دیکھو اس معاملہ کی خبر کسی کو بھی نہ کرنا۔ (رزین۔ ترمذی)

کوئی امکان ہی نہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت تک رسائی اول تو بلا واسطہ تھی اور اگر کوئی واسطہ تھا تو جبرئیل امین کا تھا جن کی حقیقت تک رسائی بلا واسطہ تھی اسی لیے آپ کے علوم سب حقیقت ہی حقیقت کے ترجمان تھے اور ان میں کوئی شک و تردد بھی نہ تھا۔ قرآن پاک نے جو اپنی پہلی صفت بیان فرمائی ہے وہ یہی ہے "ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" پس علوم کا کمال یہی ہے کہ ان میں شک و تردد نہ ہو اور یہ صفت وحی کے بغیر پیدا ہونی مشکل ہے۔ رہا عالم غیب وہ تو عقل کی دسترس ہی سے بالاتر ہے، اس میں تو عقل انسانی کا غور و خوض کرنا ہی سرتاسر ظلم ہے۔ ابن عمرؓ نے اپنی فطری شدت پسندی کی بنا پر اس کو یہاں ایسے محل پر گلو خلاصی کا بہانہ بنایا جہاں انسان صرف ظن ہی کی تحصیل کا مکلف ہے لیکن جب انسان پر خوف و خشیت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ اس قسم کے امور کو اپنی جان بچانے کا آلہ بنا لیا کرتا ہے۔ شرعیات میں شدت پسندی کا ذوق بھی عجیب ذوق ہے ۔ ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی! حضرت عثمانؓ چونکہ ان کے فطری تاثرات پہچان چکے تھے اس لیے انہوں نے اب زیادہ اصرار کرنا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ زبردستی کسی پر اس ذمہ دار عہدہ کا بار ڈالنا بھی غیر ذمہ دارانہ فعل تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ فہمائش بھی کر دی کہ آئندہ کسی سے اس کا تذکرہ نہ ہو ورنہ ہر شخص یہی بہانہ کر کے اپنی جان بچا لیگا اور مسلمانوں کے لیے یہ اہم عہدہ آخر خالی ہی پڑا رہیگا۔ اب آپ ہی ذرا انصاف کے ساتھ اندازہ لگا لیجیے کہ جس دور میں مسلمانوں کے صرف ایک قاضی بننے کے متعلق احساسات یہ ہوں وہاں امیر یا خلیفہ بننے کے جذبات بھلا کیا ہونگے۔ اگر تاریخ میں اس قسم کے نزاعات کا کہیں اثر ملتا ہے تو اس کو ٹھیک ایسا ہی سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ فرشتوں نے اپنی بالاتفاق معصومیت کے باوجود اپنی خلافت کے سلسلہ میں کچھ کلمات کہہ دیے تھے۔ کیا ان کے ان کلمات کی بنا پر جو قرآن کریم میں ان کی جانب سے مذکور ہیں ان کو ادنیٰ سا بھی متہم کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ خلافت ارضی امارت ملکی سے کہیں بالاتر مقام تھا، ہرگز نہیں۔

اسی طرح اگر کسی دور میں صحابہؓ کے مابین بھی اس قسم کا کوئی نزاع نظر پڑتا ہے تو محض جلدبازی کی بنا پر ان کی پاک نفسی کو متہم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے وہاں بھی تاریخ صحیح صحیح حالات کا پتہ دیتی رہی ہے بشرطیکہ کسی جماعت سے خواہ مخواہ کی بدظنی عقیدہ کا جزء نہ بن چکی ہو۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ جو عوام میں مشہور ہو گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب جبرئیل علیہ السلام کا نزول بھی منقطع ہو گیا ہے یہ بالکل بے اصل بات ہے۔ حافظ سیوطی نے اپنے فتاوی میں اس کی تصریح کی ہے۔ چونکہ صاحب وحی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی ہیں اس لیے وحی نبوت کے انقطاع سے ان کے نفس نزول کی شہرت بے وجہ بڑھ گئی ہے۔ اس لیے اگر جبرئیل علیہ السلام خدا کی رحمتوں کی بارشیں لے کر شب قدر اور اس کے سوا دوسرے اوقات میں جب بھی نازل ہوں یہ سب ممکن ہے، ہاں چونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے اس لیے وحی نبوت کا بند ہونا بھی لازمی ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک جلیل القدر فرشتہ ہیں اور نبوت کے ختم ہونے سے فرشتوں کے نزول کا انقطاع سمجھ لینا یہ صرف وہم کا فیصلہ ہے۔

بدء تعارف النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم مع عالم الغیب

۱۰۴۷۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ أَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَكَّةَ خَمْسَ عَشْرَةَ سَنَةً يَسْمَعُ الصَّوْتَ وَيَرَى الضَّوْءَ سَبْعَ سِنِيْنَ وَلَا يَرَى شَيْئًا وَثَمَانَ سِنِيْنَ يُوْحٰى إِلَيْهِ وَأَقَامَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرًا وَتُوُفِّيَ وَهُوَ ابْنُ خَمْسٍ وَسِتِّيْنَ سَنَةً۔ (متفق علیہ)

۱۰۴۸۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّيْ لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ إِنِّيْ لَأَعْرِفُهُ الْآنَ۔ رواہ مسلم۔ قال ابو شامۃ وقد کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یری عجائب قبل بعثتہ کذا فی البدایۃ

۱۰۴۹۔ عَنِ الشَّعْبِيِّ أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ النُّبُوَّةُ وَهُوَ ابْنُ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً فَقُرِنَ بِنُبُوَّتِهِ إِسْرَافِيْلُ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم غیب سے تعارف کی ابتداء

۱۰۴۷۔ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں پندرہ سال قیام پذیر رہے جن میں سات سال تک آپ صرف روشنی دیکھا کرتے اس کے علاوہ فرشتہ وغیرہ کچھ نہ دیکھتے اور آٹھ سال آپ پر وحی نازل ہوتی رہی اس کے بعد آپ نے دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور پینسٹھ سال کی عمر میں وفات فرمائی۔ متفق علیہ

۱۰۴۸۔ جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں مکہ مکرمہ میں اس پتھر کو خوب پہچانتا ہوں جو میری بعثت سے قبل مجھ کو سلام کیا کرتا تھا میں اب بھی اس کو خوب پہچانتا ہوں۔ مسلم شریف

۱۰۴۹۔ شعبی روایت کرتے ہیں کہ چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت ملی ابتداء نبوت میں تین سال

۱۰۴۷۔ یہاں عالم غیب سے آپ کے تعارف کی پہلی صورت "نور" سے معلوم ہوتی ہے اور ایک نورانی عالم کا تعارف نور سے شروع ہونا ہی مناسب بھی تھا۔ اس حدیث میں راوی نے آپ کی عمر پینسٹھ سال بیان کی ہے اور کسی روایت میں تریسٹھ سال بھی ہے۔ اگر وفات و ولادت کے ناتمام سالوں کو شمار کر لیا جائے تو پینسٹھ ورنہ تریسٹھ سال ہوتے ہیں اس لیے ان دونوں باتوں میں چنداں اختلاف نہیں ہے۔

۱۰۴۸۔ جس طرح عام دستور کے خلاف روشنی کا دیکھنا عالم غیب سے تعارف کا ذریعہ بنا اسی طرح پتھر جیسی غیر ذی شعور چیز سے سلام کی آواز بھی اس کا ایک ذریعہ بن گئی اور اس پیرایہ سے آپ کو اس عالم کا رفتہ رفتہ تعارف پیدا ہوتا گیا جو عالم اسباب سے بالاتر ہے۔ انبیاء علیہم السلام گو عالم غیب سے تعارف پیدا کرانے کے لیے ہی مبعوث ہوتے ہیں مگر چونکہ ان کا جسم عنصری عام انسانوں کی طرح عالم شہادت میں پیدا ہوتا ہے اس لیے ان کو عالم غیب کا فرد بنا لینے کے لیے قدرت ان کی بھی تدریجی تربیت کرتی ہے اور اس تربیت کے بعد یہ عالم غیب بھی ان کے لیے اسی طرح قطعی ہو جاتا ہے جیسا عالم شہادت بلکہ ان کی بعثت ہی یہ ہوتی ہے کہ صدق و یقین سے اس کا قلب بھی ایسا بن جائے کہ اس کو بھی عالم غیب گویا عالم شہادت کی طرح سامنے (باقی بر صفحہ ۲۸۹)

ثَلَاثَ سِنِيْنَ فَكَانَ يُعَلِّمُهُ الْكَلِمَةَ وَالشَّيْءَ وَلَمْ يَنْزِلِ الْقُرْاٰنُ فَلَمَّا مَضَتْ ثَلَاثُ سِنِيْنَ قُرِنَ بِنُبُوَّتِهِ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَنَزَلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰى لِسَانِهِ عِشْرِيْنَ سَنَةً عَشْرًا بِمَكَّةَ وَعَشْرًا بِالْمَدِيْنَةِ فَمَاتَ وَهُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَّسِتِّيْنَ سَنَةً. رواہ احمد بإسناد صحيح قلت وقد وقع في نقله سهوا من النساخ في بعض نسخ فتح الباري فليتنبه. وراجع البداية والنهاية ص ۳۰۴ ج ۳۔

انواع الوحي وفيها كان اشد على النبي صلى الله عليه وسلم وكيف كان صوت الوحي

۱۰۵۰۔ عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ

تک اسرافیل علیہ السلام آپ کے ہمراہ رہے اور کبھی ایک کلمہ کبھی کوئی بات آپ پر القاء فرماتے رہتے مگر قرآن ہنوز نہیں اترا تھا۔ جب تین سال کی مدت گزر گئی تو اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام آپ کے ہمراہ رہنے لگے پھر ان کی معرفت بیس سال تک آپ پر قرآن شریف اترتا رہا، دس سال مکہ مکرمہ میں اور دس سال مدینہ طیبہ میں اس حساب سے آپ کی وفات ترسیٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ (مسند احمد)

وحی کے اقسام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شدید تر وحی اور وحی کی آواز

۱۰۵۰۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا

(بقیہ نوٹ ۱۰۴۹) نظر آنے لگتا ہے جب تک عالم غیب پر یقین نصیب نہ ہو اس کی برکات سے پورا استفادہ نہیں ہو سکتا حضرت حنظلہ کی حدیث آپ ترجمان السنۃ جلد دوم میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور حدیث جبرئیل (علیہ السلام) میں اسی کا نام احسان رکھا گیا ہے۔

۱۰۴۹۔ کہتے ہیں کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کو ارواح کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے۔ اسی وجہ سے نفخ صور کی خدمت ان کے سپرد کی گئی ہے۔ اس مدت میں قدرت کو منظور تھا کہ آپ کی روحانیت اور بلند سے بلند مراتب طے کر لے اور آئندہ آپ میں اس قرآن کریم کے نزول کے تحمل کی صلاحیت اور مکمل ہو جائے جس کے تحمل کی طاقت پہاڑوں میں نہیں ہے۔ سبحان اللہ کلام الٰہی بھی کیا پر عظمت کلام ہے جس کے نزول کے لیے کتنی تمہیدیں ہو رہی ہیں کبھی جمادات سلام کرتے ہیں، کبھی صرف غیبی آواز آتی ہے، ایک مدت مسلسل سچے خواب دکھائے جا رہے ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ ایک فرشتہ بھی ایک ایک کلمہ القاء کر کے اس صلاحیت میں اضافہ کر رہا ہے لیکن اتنی تمہیدات کے بعد بھی جب قرآن کریم کے نزول کے لیے اصل مقرر فرشتہ ظہور فرماتا ہے تو آپ کی بشریت کاملہ کی بنیاد پھر متزلزل ہونے لگتی ہے۔ یہاں سے ان دو کلاموں کی حقیقت پر غور کرو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کان میں ڈالا گیا تھا اور جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل فرمایا گیا۔ کیا وحی کی اتنی عظیم الشان حقیقت کو بھی خواب و خیال کے برابر کہا جا سکتا ہے اگر انبیاء علیہم السلام کی سیرت کے مطالعہ کے بعد بھی خواب و خیال اور نبوت کے درمیان فرق واضح نہیں ہوتا تو پھر ہمارے نزدیک دنیا میں کوئی حقیقت ایسی نہیں ہو گی جس پر ہم پورا اعتماد کر سکیں ہر گھڑی ہر حقیقت کے متعلق یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ شاید وہ بھی صرف ایک خواب و خیال ہے جو ہم کو سونے والے کے خواب کی طرح بیدار حقیقت نظر آ رہی ہے۔

يَارَسُوْلَ اللهِ كَيْفَ يَأْتِيْكَ الْوَحْيُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْيَانًا يَأْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّهُ عَلَيَّ فَيُفْصِمُ عَنِّيْ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَاَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِيْ فَاَعِيْ مَا يَقُوْلُ قَالَتْ عَائِشَةُ وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَاِنَّ جَبِيْنَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا۔ متفق علیہ

یارسول اللہ! آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ آپ نے فرمایا کبھی تو یہ صورت ہوتی ہے کہ مجھے ایک گھنٹی کی سی آواز آتی ہے اور یہ قسم مجھ پر سب سے دشوار تر ہوتی ہے اس کے بعد جب وہ کیفیت دور ہو جاتی ہے تو جو وحی میں ارشاد ہوا تھا وہ مجھ کو محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ فرشتہ خود کسی شخص (دحیہ کلبی) کی صورت بن کر میرے سامنے آجاتا ہے اور مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے۔ پھر جو کچھ وہ کہتا ہے میں اس کو یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے سخت جاڑوں کے موسم میں آپ کو بچشم خود دیکھا ہے کہ جب آپ پر وحی آکر تمام ہو جاتی تو آپ کی پیشانی مبارک پسینہ پسینہ ہو جاتی تھی۔ (متفق علیہ)

۱۰۵۰- حافظ ابن تیمیہؒ نے کتاب الایمان میں ایک ضروری تنبیہ فرمائی ہے اور وہ یہ کہ بعض الفاظ جب شریعت کی اصطلاح میں کسی خاص معنی کے لیے مخصوص ہو جائیں تو اب قرآن و حدیث میں ان کے لغوی یا عام معنی مراد لینا صحیح نہیں مثلاً صلوٰۃ، ایمان اور اسلام کے الفاظ۔ یہ سب الفاظ شریعت کی اصطلاح میں خاص خاص معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں اس لیے اب قرآن و حدیث میں عام طور پر اس کے وہی معنے مراد ہونگے جو شرعی استعمال سے ایک مرتبہ متعین ہو چکے ہیں مثلاً لفظ ایمان لغت میں گو مطلقاً تصدیق کے معنی میں آتا ہے لیکن اصطلاح شریعت میں اس کا عام استعمال صرف عالم غیب کی تصدیق میں آیا ہے اس لیے اس کے جو معنے اب شرعی اصطلاح قرار پا چکے ہیں قرآن و حدیث میں وہی معنی مراد لیے جائینگے۔ اسی طرح وحی کا لفظ ہے۔ لغت میں وہ کس معنے کے لیے ہے اب اس پر بحث کرنی غیر ضروری ہے کیونکہ قرآن کریم میں جب اس لفظ کا استعمال انبیاء علیہم السلام کے دائرہ میں ہوا ہے تو اس کے معنے بندہ اور حق تعالیٰ کے مابین ہمکلامی کے ہوئے ہیں اس لیے اب جب کہیں وحی کا لفظ انبیاء و رسل کے بارے میں مستعمل ہوگا تو اس کے یہی معنے مراد لیے جائینگے۔

حافظ ابن تیمیہؒ کی اس تحقیق کا حاصل یہ نہیں ہے کہ شرعی استعمال لغت کے برخلاف ہوتا ہے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص استعمال میں جب کسی لفظ میں کوئی تخصیص پیدا ہو جائے تو اب لغت میں عموم کی وجہ سے اس کی یہ خصوصیت نظرانداز نہیں کی جائیگی۔ اب دیکھیے کہ لغت میں وحی کا لفظ خفیہ اشاروں میں بات چیت کے لیے آیا ہے ۔ یرمون بالخطب الطوال وتارۃ وحی الملاحظ خیفۃ الرقباء کبھی تو یہ لمبی لمبی تقریریں۔ اور کبھی رقیبوں کے ڈر سے چپکے چپکے صرف آنکھوں کے اشارے اس لحاظ سے ہر خفیہ اشارہ اور خفیہ بات چیت پر وحی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے اور اسی معنے کے لحاظ سے اس لفظ کا استعمال حیوانات اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ بھی ہوا ہے لیکن جب اس کا استعمال خاص رسولوں میں ہوا ہے تو پھر شریعت کی اصطلاح میں صرف اس کلام کو وحی کہا گیا ہے جو رسول اور حق تعالیٰ کے درمیان ہوتا ہے اس تخصیص کے بعد بھی لغت کے اصل معنی یہاں ملحوظ رہتے ہیں کیونکہ یہاں بھی متکلم اور اس کا کلام دونوں اتنے خفیہ ہوتے ہیں کہ اس کی اطلاع سوائے رسول کے اس کے پاس بیٹھنے والوں کو بھی نہیں ہوتی خلاصہ یہ ہے کہ اب وحی کے مختصر معنے یہ ہیں کہ وہ رسول اور خدا تعالیٰ کے مابین کلام کا نام ہے اب اس کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ وحی کے اقسام اور اس کی کیفیات کے معلوم کرنے سے جتنا اجمالاً حل ہو سکتا ہے بس اسی حد تک اس کو حل شدہ سمجھنا چاہیے اس سے زیادہ بحث کرنا اپنی حد سے تجاوز کرنا ہے اور ہمارے سبب غیر ضروری بھی ہے۔

۱۰۵۱-عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ سُمِعَ عِنْدَ وَجْهِهٖ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ فَأُنْزِلَ عَلَيْهِ يَوْمًا فَمَكَثْنَا سَاعَةً فَسُرِّيَ عَنْهُ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَأَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَأَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَآثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَارْضِنَا عَنْكَ وَارْضَ عَنَّا ثُمَّ قَالَ أُنْزِلَ عَلَيَّ عَشْرُ آيَاتٍ مَنْ أَقَامَهُنَّ دَخَلَ الْجَنَّةَ ثُمَّ قَرَأَ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى خَتَمَ عَشْرَ آيَاتٍ. رواه احمد والترمذی فی تفسیر سورة المؤمنین وتکلم فی اسنادہ فلیراجع ورواہ النسائی ثم قال النسائی منکر لا نعرف احدًا رواہ غیر یونس بن سلیم ولا نعرفہ- کذا فی البدایہ والنہایہ ص۲

۱۰۵۱- حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تو آپ کے روئے انور کے پاس ایک ایسی آواز محسوس ہوا کرتی تھی جیسی شہد کی مکھیوں کے گنگنانے کی ہوتی ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ آپ پر وحی آئی تو ہم تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے جب وحی کے آنے کی کیفیت آپ پر سے جاتی رہی تو آپ نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور یہ دعا فرمائی اے اللہ ہمیں اور زیادہ کر اور گھٹا مت، ہمیں اور شرف عطا فرما اور ذلیل نہ فرما ہمیں اور زیادہ دے اور محروم نہ رکھ، ہمیں دوسروں پر ترجیح دے اور دوسروں کو ہم پر ترجیح نہ دے اور ہم کو اپنے سے راضی رہنے کی توفیق بخش اور تو ہم سے راضی ہو جا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا مجھ پر دس آیتیں اتری ہیں جو شخص ان پر پورا پورا عمل پیرا ہو گا وہ ضرور جنت میں داخل ہو گا۔ پھر آپ نے وہ دس آیتیں آخر تک پڑھیں قد افلح المؤمنون الخ یقیناً وہ مومن کامیاب ہو گئے الخ۔ (احمد۔ ترمذی)

۱۰۵۱- اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی کسی قسم میں کبھی ایسی آواز بھی ہوتی تھی جس کو کبھی کوئی بلند فطرت صحابی بھی سن لیا کرتا تھا۔ مگر پھر بھی اس کا ادراک صرف ایک غیبی صوت کے سوا کچھ نہ ہوتا تو اس کے حروف مسموع ہوتے نہ معنے مفہوم ہوتے بلکہ صرف ایک بسیط آواز ہوتی عجیب بات ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس آواز کو تشبیہ دی تو گھنٹے کی آواز سے تشبیہ دی اور یہاں جب حضرت عمرؓ نے اس کو تشبیہ دی تو دوی نحل یعنی شہد کی مکھی کی آواز سے تشبیہ دی ہے علماء نے لکھا ہے کہ گھنٹے کی آواز گو شرعاً ناپسندیدہ ہے مگر وحی کو اس کے ساتھ اس لحاظ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ بھی ایک بسیط آواز ہوتی ہے اور بے جہت مسموع ہوتی ہے مکھیوں کی مسلسل بھنبھناہٹ سے بھی اسی قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے یعنی اس کا مبدا و منقطع بھی معلوم نہیں ہوتا صرف گھنٹے کی طرح ایک بسیط آواز معلوم ہوتی ہے ان دونوں تشبیہوں پر اگر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ وہ ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہیں فرق ہو تو شاید صرف اتنا ہی ہو کہ صاحب وحی کو وہ آواز کچھ زیادہ تیز محسوس ہوتی ہو اس لیے آپ نے اس کو صلصلہ یعنی گھنٹے کی آواز سے تشبیہ دی ہو اور سامعین میں جس کو اس غیبی صوت کا سننا نصیب ہوتا ہو اس کو خفیف اور ہلکی محسوس ہوتی ہو اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی حقیقت خواب و خیال سے بالکل بالاتر ہے۔ عالم رؤیا کا سارا تماشہ صرف سونے والے کے سامنے ہوتا ہے اور یہاں آثار وحی بقیہ سامعین پر بھی درجہ بدرجہ نمودار ہوتے تھے حتی کہ بعض اوقات وحی کی بے کیف آواز کا ادراک بھی ہوتا تھا یہی آپ کے سامنے آنے والا ہے کہ نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو متاثر ہوتے ہی تھے لیکن

(باقی بر صفحہ ۲۸۲)

۱۰۵۲- عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ یَبْلُغُ بِهِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا قَضَی اللّٰهُ الْاَمْرَ فِی السَّمَاءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِاَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَاَنَّهُ سِلْسِلَةٌ عَلٰی صَفْوَانٍ وَقَالَ غَیْرُهُ صَفْوَانٍ یَنْفُذُهُمْ

۱۰۵۲- ابوہریرہؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب آسمان پر کسی بات کا فیصلہ فرماتے ہیں تو فرشتے اُس فرمان کی عظمت و دہشت سے اپنے پر اس طرح مارتے ہیں جیسے پتھر پر زنجیر لگتی ہو اور اس سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہاں بعض راویوں نے یہ اور اضافہ کیا ہے کہ وہ آواز اُن کے آر پار ہو جاتی ہے۔ جب خوف و دہشت کی یہ

(بقیہ نوٹ ص ۲۸۱) اس حالت میں اگر آپ کا جسم اطہر کسی دوسرے کے جسم کے ساتھ ذرا متصل ہو جاتا تو وہ بھی وحی کی عظمت سے پس پس جاتا تھا۔ اب مختلف صحابہؓ کے ان مختلف احساسات کے بعد بھی کیا وحی کو محض ایک دماغی تخیل کہا جا سکتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

۱۰۵۲- اس حدیث میں وحی کے وقت ایک تیسری قسم کی آواز کا بھی ذکر ہے لیکن ان تینوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اصل غرض سب جگہ ایک ہی ہے۔ پتھر پر زنجیر کی آواز بھی گھنٹہ کی آواز کی طرح ایک گونج رکھتی ہو اس میں بھی سننے والے کو کسی خاص جہت کا ادراک نہیں ہوتا اور یہاں بھی انسانی کلام کے برخلاف مبدأ و مقطع یعنی شروع اور خاتمہ علیحدہ علیحدہ ممتاز محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک بسیط اور مسلسل آواز محسوس ہوتی ہے اور بس۔ شارحین حدیث میں اس آواز کے متعلق اختلاف ہو کوئی کہتا ہو کہ یہ خود اس وحی کی آواز ہوتی ہو اور کسی کا خیال ہے کہ یہ فرشتے کے پروں کی آواز ہوتی ہے۔ ہم اس قسم کی بحثوں کا فیصلہ کرنا غیر ضروری سمجھتے ہیں اور غیر مفید بھی۔ فلاسفۂ قدیم کو عام انسانی آواز کی سماع کی حقیقت میں اختلاف رہا ہو پھر ہمارا کیا حوصلہ ہو کہ ہم وحی کی آواز کی حقیقت میں لب کشائی کر سکیں۔ غائبات یعنی عالم غیب کے متعلق سب سے صحیح اور آسان راستہ یہی ہے کہ اس پر یقین رکھا جائے اور اُس کا اعتراف کر لیا جائے اور بس۔ اگر وہ ہمارے دائرہ ادراک کی چیز ہوتی تو پھر اس کو عالم غیب کہنا ہی کیونکر درست ہوتا۔ عالم غیب ہے وہی جو ہمارے حواس و ادراکات کے دسترس سے باہر ہو۔ اسی لیے اس کی اطلاع کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے ہیں اور ان ہی کے اعتماد پر اس پر یقین کرنے کے لیے ہم مکلف بنائے گئے ہیں۔ لیکن صرف ایک نظیر کے طور پر ٹیلیگراف یعنی تار کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ یہاں بھی عام سامعین کو صرف ایک کھٹکے کی بے معنی آواز آتی ہے لیکن جو اس کا رمز شناس ہوتا ہے وہ اس آواز کو اسی طرح سمجھ لیتا ہو جس طرح کہ آپ عام بات چیت کو سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح آپ بھی وحی کی آواز صلصلۃ الجرس کی طرح سنتے اور اس کا مطلب پورا پورا سمجھ لیتے یا دوسری مثال ٹیلیفون کی ہے جس میں خود متکلم باتیں کرتا ہے مگر یہاں بھی مخاطب کے سوا کوئی دوسرا شخص اس آواز کو نہیں سنتا لیکن جو نہیں سنتا وہ سننے والے کے اعتماد پر ٹیلیفون کی تمام خبروں کا پورا یقین کر لیتا ہے اور اپنے دل میں دروغ بیانی یا اس کے وہم و خیال ہونے کا کوئی احتمال بھی نہیں لاتا۔ فرق ہو تو بس اتنا ہے کہ یہاں اس کو یہ اعتماد حاصل ہوتا ہو کہ اس آواز کو ہر انسان سُن سکتا ہے اور اگر چاہے تو وہ خود بھی سُن سکتا ہو، مگر وحی نہ ہر انسان پر آتی ہے اور نہ ہر انسان اس کی آواز سُن سکتا ہے مگر کسی بات پر یقین کرنے کے لیے کیا یہی کوئی اصول ہو کہ جب تک خود اس بات کو بلا واسطہ معلوم نہ کر لیا جائے اس کا یقین نہ کیا جائے۔ پھر کیا بنی اسرائیل کی ضدی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہی فرمائش نہیں کی تھی کہ جب تک ہم رب العزت کا کلام خود بلا واسطہ سُن نہیں اس وقت تک محض آپ کے بیان پر یقین نہیں لاسکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خاطر آخر ان کی یہ ہٹ بھی پوری کی گئی لیکن جن کو نہیں ماننا تھا وہ اس پر بھی نہ مانے اور ایک یہ حیلہ اور نکال کھڑا کیا کہ جب تک متکلم خود ہمارے سامنے آکر بالمشافہ ہم سے سامنے گفتگو نہ کرے ہمیں اس پس پردہ گفتگو پر کوئی اعتماد نہیں ہو سکتا گویا اس قوم کا مطالبہ یہ تھا

ذٰلِكَ فَإِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا لِلَّذِي قَالَ الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔

رواہ البخاری ص ۱۱۲۳

کیفیت ان کے قلوب سے دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں "پروردگار نے کیا حکم دیا" تو جو ان میں مقرب ہیں وہ جواب دیتے ہیں۔ وہی حکم دیا جو درست و مناسب تھا اور وہ بڑا عالیشان اور سب سے بڑا ہے۔ (بخاری شریف)

کہ جہات خود ان کے نبی کے لیے ممکن نہ تھی وہ ان کے لیے ممکن ہو جائے، اور اگر بالفرض یہ بھی ہو جاتا تو یقیناً وہ کوئی اور تیسرا راستہ نکال لیتے۔ پس نبوت، وحی اور عالم غیب کے ہر ہر جزئی کے لیے علیحدہ علیحدہ دلائل کی فکر میں نہ پڑیے اور انبیاء علیہم السلام پر ایمان لے آنے کے بعد جو بات وہ کہتے ہیں ان کے اعتماد پر آپ اس کو مان لیجیے۔ وحی کے باب کی حدیثیں اس کی کیفیات اور دوست و دشمن کے سامنے اس کے نزول کے متعدد حالات آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو بار بار خالی الذہن ہو کر پڑھیے تو آپ اس فیصلہ پر مجبور ہونگے کہ ضرور یہ کوئی قطعی حقیقت ہے، خیالی افسانہ نہیں والعیاذ باللہ۔ جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس کا اثر نہ صرف آپ ہی کی ذات تک محدود رہتا بلکہ سعید اہل مجلس پر بھی ہوتا اور پڑھے ہوئے اور ان پڑھ جو بھی اس وقت وہاں موجود ہوتے وہ وحی کا نزول اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور یہ یقین کر لیتے کہ ضرور یہ کوئی ایسی بلند حقیقت ہے جس سے ہر بشر آشنا نہیں ہو سکتا۔ یہاں نزول وحی کی دوسری ساعت بعد ہی خفیہ سازشیں سب عریاں ہو جاتی تھیں۔ ہر سائل اپنے مشکل سے مشکل سوال کا جواب پا لیتا تھا، تشنگان ہدایت کے لیے وہ وہ ہدایات نصیب ہو جاتی تھیں جن سے صحف سماویہ اب تک خالی تھیں اور عقل انسانی آج تک اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہے۔

اگر آپ کو یہاں علمی مباحث کا شوق ہو تو تفسیر رازی ص ۷۰، ج ۳۔ التفسیر القیم سورۂ فاتحہ کی تفسیر زیر لفظ ہدایت، اور الروض الانف اور شروح حدیث ملاحظہ فرمایئے۔

پھر جب وحی کی حقیقت ہی ایک غیبی حقیقت ہے تو اس کے اقسام میں بھی یقیناً یہی صفت ہونی چاہیے۔ اس لیے ہم اس پر بھی کچھ زیادہ کلام کرنا نہیں چاہتے۔ جتنا قرآن کریم کے ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وحی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ خود نبی کے باطن میں کوئی بات القاء فرما دے نہ کوئی آواز مسموع ہو اور نہ فرشتہ کا واسطہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی پر کچھ القاء فرمائے مگر پس پردہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوہ طور پر۔ تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ آئے اور اس کے ذریعہ سے وحی نازل ہو اس کی پھر دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ فرشتہ خود انسانی صورت میں متمثل ہو کر آئے دوم یہ کہ نبی کے باطن میں تصرف کر کے اس کو ملکوتیۃ کے قریب کر دیا جائے۔ اس دوسری صورت میں چونکہ خود آپ کی ذات قدسی صفات میں تصرف کیا جاتا تھا۔ اس لیے وحی کی یہ قسم آپ پر شدید ہوتی تھی یوں تو وحی کی جو قسم بھی تھی وہ شدید ہی تھی۔ مگر اس قسم میں اس تصرف کی وجہ سے اس کی شدت میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وحی کی جتنی قسمیں ہیں وہ سب ان ہی میں سے کسی نہ کسی قسم میں داخل ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ	اور کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے باتیں کرے
وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهٖ	مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کوئی پیغام لانے والا فرشتہ
مَا يَشَاءُ۔ (الزخرف)	بھیجے پھر پہنچا دے اس کے حکم سے جو وہ چاہے۔

حضرت عائشہؓ کی حدیث میں جو اس باب میں سب سے پہلے ذکر کی گئی ہے تیسری قسم ہے دوسری قسم کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ اس کا وجود بہت نادر تھا۔ وحی کی یہ صورت یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر پیش آئی تھی یا (باقی بر صفحہ ۲۸۵)

النَّفثُ فِي الرُّوعِ

۱۰۵۴- عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ وَلَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَإِنَّ الرُّوحَ الْأَمِينَ وَفِي رِوَايَةٍ وَإِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوعِي أَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا أَلَا فَاتَّقُوا

فرشتہ کا غیبی طور پر قلب میں کوئی بات ڈالنا

۱۰۵۴- ابن مسعود روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ لوگو! جو بات بھی تم کو جنت سے قریب کرنے والی اور آتشِ دوزخ سے دور کر دینے والی تھی میں تم کو اس کا حکم دے چکا ہوں اور جو بات بھی تم کو آتشِ دوزخ سے قریب اور جنت سے دور کر دینے والی تھی اُس کے کرنے سے میں تم کو روک چکا ہوں۔ اس سلسلہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے میرے قلب میں یہ بات بھی القا فرمائی ہے کہ کوئی نفس جب تک کہ وہ اپنے مقدر کا رزق پورا نہ کر لے ہرگز

(بقیہ نوٹ ص ۲۸۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شبِ معراج میں پیش آئی۔ حضرت اُستاذ مولانا محمد انور شاہ قدس سرہ کا مختار یہ تھا کہ شب معراج میں نوازش کی ابتدا مکالمہ اور وحی سے شروع ہوئی تھی اور رویۃ پر جا کر منتہی ہو گئی تھی۔ یعنی شروع میں مکالمہ ہوتا رہا مگر اس وقت تک رویت نہ ہوئی اور جب مکالمہ ختم ہو گیا تو رب السموات والارضین نے اپنے دیدار سے آپ کو مشرف فرمایا۔ فسبحان من منعم مفضال۔

۱۰۵۴- حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتہ کا براہ راست نبی کے قلب میں کوئی بات ڈال دینا بھی وحی کی ایک قسم ہے لیکن وحی کی جو قسم بھی ہو خواہ فرشتہ اس میں نظر آئے یا نہ آئے وہ سب قطعی ہے حتی کہ جو وحی خواب کی صورت میں ہو وہ بھی قطعی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وحی ربانی شک و تردد سے کتنی پاک صاف ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کی ہر نوع صاحب نبوت کے لیے روشن ہوتی ہے اور امت کے لیے اس پر ایمان لانا پہلا فرض ہوتا ہے۔ سیرت کے پڑھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ حالات کی پوری ناساعدت کے باوجود خدا کے رسولوں کو خدائی وعدہ میں کبھی ذرا تردد پیش نہیں آیا۔ صلح حدیبیہ کی صلح کتنی دب کر کی گئی تھی جس کی ہر ہر دفعہ مسلمانوں کے ضعف و کمزوری کی گویا ایک دلیل تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کسی مخلص نے سوال کیا تو آپ نے کسی تردد کے بغیر اسی صلحنامہ کو مسلمانوں کی فتح سے تعبیر کیا چنانچہ بہت ہی قلیل مدت کے بعد واقعات نے اس کی تصدیق کی اور مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔ یہاں رزق کا معاملہ بھی جس جزم و یقین کے ساتھ ادا کیا گیا ہے وہ لفظ "لن" سے ظاہر ہے۔ عربی میں یہ لفظ تاکید کے لیے آتا ہے۔ کیا خواب اور صفرا کے تخیلات اور وحی میں اب بھی کوئی التباس ہو سکتا ہے۔

انسان کی کمزور فطرت رزق کو انسانی جد وجہد کے تابع سمجھتی ہے، مگر وحی کہتی ہے کہ یہ معاملہ صرف تقدیر کے تابع ہے اور وہ مشکوک نہیں یقینی ہے اور اتنا یقینی ہے کہ موت جیسی یقینی چیز بھی اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ انسان اپنے

اللهَ وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَلَا یَحْمِلَنَّکُمْ اِسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْہُ بِمَعَاصِی اللهِ فَاِنَّہٗ لَا یُدْرَکُ مَا عِنْدَ اللهِ اِلَّا بِطَاعَتِہٖ۔ رواہ فی شرح السنۃ والبیہقی فی شعب الایمان۔

الرُّؤْیَا

۱۰۵۴۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ عِنْدَ خَالَتِیْ مَیْمُوْنَۃَ لَیْلَۃً فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا کَانَ فِیْ بَعْضِ اللَّیْلِ قَامَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَتَوَضَّأَ مِنْ شَنٍّ مُعَلَّقٍ وُضُوْءًا خَفِیْفًا یُخَفِّفُہٗ عَمْرٌو وَیُقَلِّلُہٗ جِدًّا ثُمَّ قَامَ یُصَلِّیْ فَقُمْتُ فَتَوَضَّأْتُ نَحْوًا مِمَّا تَوَضَّأَ

ہو نہیں سکتا۔ لہذا خبردار اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور ذرا صبر کے ساتھ رزق طلب کرو اور اگر مقدر کا رزق ملنے میں کچھ تاخیر ہو تو اس کو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کے ذریعے سے حاصل کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو جایا کرو۔ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو رزق دستِ قدرت میں ہے وہ صرف اس کی حکمبرداری سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ (شرح السنۃ بیہقی)

خواب

۱۰۵۴۔ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شب میں اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے گھر رہا جب کچھ شب گزر گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور ایک مشک سے جو لٹکی ہوئی تھی وضوء فرمایا حدیث کا راوی عمرو کہتا ہے کہ اس میں آپؐ نے بہت کم پانی صرف کیا اس کے بعد نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ جب آپؐ نماز میں مشغول ہو گئے تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور جیسا وضوء آپؐ نے فرمایا تھا اسی طرح میں نے بھی کیا پھر آکر آپؐ کی بائیں

مقدر کا رزق پورا پورا حاصل نہ کرے۔ انسان سمجھتا ہے کہ رزق آزاد ذرائع سے بآسانی اور وسعت سے حاصل ہوتا ہے حدیث یہ سمجھاتی ہے کہ یہ خیال غلط ہے رزق صرف خدا تعالیٰ کی حکم برداری سے مل سکتا ہے اور اس کو یوں آسان طریقہ سے ذہن نشین کرتی ہے کہ رزق خدا تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور جب یہ ہے تو پھر بھلا اس کی نافرمانی کر کے رزق کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس سے آپ یہ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ حدیث میں کسب واکتساب کی ممانعت نہیں بلکہ حرام ذرائع کی ممانعت ہے انسان یہ سوچتا ہے کہ سود، لوٹ مار، دغا و فریب اور اسی قسم کے دوسرے ناجائز ذرائع سے اس کو مال حاصل کرنا کچھ عیب نہیں۔ حدیث کہتی ہے یہ صرف اس کی ایمانی کمزوری ہے اس کو حلال ذرائع سے جد و جہد کرنی چاہیے اور یقین رکھنا چاہیے کہ جو رزق اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے وہ اس ذریعہ سے بھی پہنچ کر رہیگا۔ رزق کو مقصد زندگانی بنانا بلند خیالی نہیں ہے۔ انسانی خلقت کا اصل مقصد خلافت کے فرائض کی انجام دہی ہے۔ لہذا یہ ضروریات ضمنی ہی رہنی چاہییں۔

۱۰۵۴۔ عالم نبوت سے ناآشنا یہ کہتے ہیں کہ نبوت کی حقیقت عالم خواب کی طرح بے حقیقت ہوتی ہے اور جو اس سے آشنا ہیں وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے عالم خواب کے اوقات دوسروں کی بیداری کے اوقات سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتے

ثُمَّ جِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ فَحَوَّلَنِي فَجَعَلَنِي عَنْ يَمِينِهِ ثُمَّ صَلَّى مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتّٰى نَفَخَ فَأَتَاهُ الْمُنَادِي يُؤْذِنُهُ بِالصَّلٰوةِ فَقَامَ مَعَهُ إِلَى الصَّلٰوةِ فَصَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ قُلْنَا لِعَمْرٍو إِنَّ نَاسًا يَقُوْلُوْنَ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَنَامُ عَيْنُهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ قَالَ عَمْرٌو سَمِعْتُ عُبَيْدَ بْنَ عُمَيْرٍ يَقُوْلُ إِنَّ رُؤْيَا الْأَنْبِيَاءِ وَحْيٌ ثُمَّ قَرَأَ إِنِّي أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ . رواه البخاری فی باب التخفيف فی الوضوء ص۲۵ وفی باب وضوء الصبیان ص۱۱۹ ج ا وعند الترمذی فی مناقب عمر

طرف گھما ہو گیا۔ آپ نے مجھ کو بدل کر اپنی دائیں جانب گھما کر لیا اس کے بعد جتنی رکعتیں اللہ تعالیٰ کو منظور تھیں وہ آپ نے ادا فرمائیں پھر آپ آکر لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ آپ کے سونے کی آواز آنے لگی مؤذن حاضر ہوا اور اس نے آپ کو نماز کی اطلاع دی آپ اٹھ کر یوں ہی اس کے ساتھ نماز کو تشریف لے گئے اور نماز ادا فرمائی اور وضو نہیں کیا۔ ہم نے عمرو راوی حدیث سے پوچھا لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف آنکھیں ہی آنکھیں سوتی تھیں آپ کا قلب اس حالت میں بھی بیدار رہتا تھا عمرو کہتے ہیں میں نے عبید بن عمیر کو یہ کہتے خود سُنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ اس پر قرآن کریم کی یہ آیت دلیل کے طور پر پڑھی اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ الخ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسمٰعیل

حقیقت اور قطعی ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ بھی وحی ربانی کی ایک قسم شمار ہوتے ہیں۔ دیکھیے بیٹے کے ذبح کرنے کا معاملہ کتنا اہم معاملہ تھا جس کی اجازت نہ شرعاً ہے نہ عقلاً مگر جب خدا تعالیٰ کا برگزیدہ نبی اپنے خواب میں یہ دیکھ لیتا ہے تو اس کو پورا کرنے میں ذرا تردد نہیں کرتا اور فوراً اس کی تیاری شروع کر دیتا ہے، پھر جو بیٹا نبی اولوالعزم ہونے والا تھا اس کی فطری استقامت بھی کتنی حیرت انگیز ہے کہ حکم رب کے سامنے جس مسرت اور رضامندی کے ساتھ وہ سر جھکا رہا ہے اس کی مثال نوع بشر میں ملنی مشکل ہے عام انسانوں کے خواب کے ادراکات چونکہ حواس کے تعطل اور قوت واہمہ کے غلبہ کی حالت میں ہوتے ہیں اس لیے ان کی کوئی حیثیت نہیں سمجھی جاتی انبیاء علیہم السلام کی نیند ان دونوں علتوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ عین خواب میں بھی اپنی بیداری کی طرح عالم غیب سے خبردار رہتے ہیں اس لیے ان کی نیند کے عوارض صرف وہی ہوتے ہیں جن کا تعلق اس آنکھ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی وہ انسانوں کی آوازیں نہیں سنتے ان کی صورتیں نہیں دیکھتے اور اسی طرح دوسرے امور جن کا تعلق صرف ظاہری حواس کے ساتھ ہوتا ہے ان سے معطل ہو سکتے ہیں مگر عالم غیب جس کا تعلق دراصل ان حواس ظاہری کے ساتھ نہیں رہتا اس سے وہ کسی حالت میں بھی غافل نہیں ہوتے اس لیے ان کے خواب کے ادراکات کی حیثیت وہی رہتی ہے جو ان کی بیداری کے ادراکات کی ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت ابن عباسؓ اپنی اس نو عمری میں بھی کتنے فہیم تھے اسی غرض کے لیے یہاں ایک شب گذارنے آئے کہ آپ کی شب کی عبادت کا نقشہ خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں ابھی بچپن کی عمر ہے مگر معلوم نہیں کہ اس شوق میں کیا تمام شب جاگ کر ہی کاٹ دی تھی کہ ادھر آپ کے اٹھنے کی آہٹ ہوئی ادھر جھٹ ان کی آنکھیں اپنے مقصد پر جا لگیں کتنے باادب تھے کہ سب کچھ دیکھتے رہے مگر اس طرح خاموش پڑے رہے گویا بے خبر سو رہے ہیں۔ جب دیکھ لیا کہ آپ عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے تو اب خود بھی اٹھے اور ہو بہو اسی طرح نقل کرنے کی کوشش کی جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا تھا۔ ابھی ذرا سی عمر تھی مسئلہ معلوم نہ تھا اس لیے بائیں طرف آکر آپ کی نماز میں شامل ہو گئے لیکن جس کو اللہ تعالیٰ نے لیل و نہار میں صغیر و کبیر سب کے لیے معلم بنا کر بھیجا تھا اس نے ذرا توقف نہ کیا اور نماز ہی کی حالت

ویرٰی عن ابن عباس انہ قال رؤیا الانبیاء وحی ۔ص ۲۰۹ ج ۲

الرسول الاعظم فی مشہدہ عند نزول الوحی

۱۰۵۵۔ ان صفوان بن یعلی اخبرہ ان یعلی اخبرہ قال لعمر ارنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین یوحی الیہ قال فبینما النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالجعرانۃ ومعہ نفر من اصحابہ جاءہ رجل فقال یا رسول اللہ کیف تری فی رجل احرم بعمرۃ وھو متضمخ بطیب فسکت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ساعۃ فجاءہ الوحی فاشار عمر الی یعلی فجاء یعلی و علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثوب قد اظل بہ فادخل راسہ فاذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محمر الوجہ وھو یغط ثم سری عنہ فقال این الذی سأل عن العمرۃ فاتی برجل فقال

علیہ السلام سے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ (بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کا ایک منظر

۱۰۵۵۔ صفوان بن یعلی بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد یعلی نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آئے تو اس وقت آپ کو ذرا مجھے بھی دکھائیگا۔ راوی کہتا ہے ایسا اتفاق ہوا کہ آپ مقام جعرانہ میں تھے اور صحابہ کی ایک جماعت آپ کے ساتھ تھی کہ ایک شخص آیا اور اس نے یہ مسئلہ پوچھا یا رسول اللہ ایک شخص خوشبو میں لت پت ہو رہا تھا اور اسی حالت میں اس نے عمرہ کا احرام باندھ لیا اب وہ کیا کرے آپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور آپ پر وحی کا نزول شروع ہوا (حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرۂ مبارک پر ایک کپڑا ڈھانک دیا) اور یعلی کو اشارہ کیا آگے آؤ وہ آگئے اس وقت آپ کے چہرۂ مبارک پر کپڑا پڑا ہوا تھا انہوں نے اپنا سر اس کے اندر داخل کیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا ہے اور وحی کی شدت سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کا دم گھٹ رہا ہو اس کے بعد جب وہ کیفیت جاتی رہی تو آپ نے فرمایا وہ عمرہ کا مسئلہ دریافت کرنے والا شخص کدھر گیا۔ اسی وقت اس کو آپ کی خدمت میں حاضر کیا گیا

میں ان کو اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا جو درحقیقت تنہا مقتدی کا صحیح موقف تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر نماز کی حالت میں کوئی مکروہ فعل پیش آجائے تو اسی وقت اس کی اصلاح کر لینی چاہیے۔ اس کے بعد جو عجیب بات انہوں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ آپ اچھی طرح سو گئے تھے لیکن اس کے باوجود جب نماز کا وقت آیا تو اپنے پہلے وضو سے ہی نماز ادا فرمائی گویا آپ کی نیند ناقض وضو نہ تھی۔ خدا ہی جانے اس بیداری کا عالم کیا ہوگا جس میں اپنی طہارت اور غیر طہارت کا ادراک آپ کو عالم خواب میں بھی رہتا تھا۔

اِغْسِلِ الطِّيْبَ الَّذِيْ بِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَانْزِعْ عَنْكَ الْجُبَّةَ وَاصْنَعْ فِيْ عُمْرَتِكَ كَمَا تَصْنَعُ فِيْ حَجِّكَ فَقُلْتُ لِعَطَاءٍ اَرَادَ الْاِنْقَاءَ حِيْنَ اَمَرَهُ اَنْ يَغْسِلَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَقَالَ نَعَمْ۔ رواہ البخاری فی باب غسل الخلوق ثلاث مرات ص ۲۰۸ ج ۱۔ وفی باب یفعل بالعمرۃ ما یفعل فی الحج فانزل الله على النبي صلى الله عليه وسلم فستر بثوب۔

۱۰۵۶۔ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ يَتَحَدَّثُ يُكْثِرُ اَنْ يَّرْفَعَ طَرْفَهُ اِلَى السَّمَاءِ۔ رواہ ابوداؤد۔

۱۰۵۷۔ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ كُرِبَ لِذٰلِكَ وَتَرَبَّدَ وَجْهُهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ نَكَسَ رَأْسَهُ وَنَكَسَ اَصْحَابُهُ رُءُوْسَهُمْ فَلَمَّا اُتْلِيَ عَنْهُ رَفَعَ رَأْسَهُ۔ رواہ مسلم

۱۰۵۸۔ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ

آپ نے اس سے فرمایا جو خوشبو تیرے جسم پر لگی ہوئی ہے اس کو تین بار دھو ڈال اور اپنا جبہ اتار دے اور پھر جیسے اپنا حج کرتا تھا اسی طرح عمرہ ادا کر لے میں نے عطار راوی سے پوچھا تین مرتبہ خوشبو کے دھونے سے آپ کی غرض یہی ہوگی کہ وہ خوب صاف ہو جائے۔ انہوں نے کہا جی ہاں۔ بخاری شریف۔

۱۰۵۶۔ عبداللہ بن سلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیٹھے ہوئے باتیں کرتے تو اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھا اٹھا کر دیکھا کرتے تھے۔ ابوداؤد۔

۱۰۵۷۔ عبادۃ بن صامت فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تو اس کی شدت سے آپ کو اتنی تکلیف ہوتی کہ چہرۂ مبارک تک متغیر ہو جاتا ایک روایت میں اتنا اضافہ اور ہے کہ آپ اپنا سر مبارک جھکا لیتے اور آپ کے صحابہ بھی اپنے سروں کو جھکا لیتے پھر جب وحی کا نزول ختم ہو جاتا تو آپ اپنا سر اٹھا لیتے۔ (مسلم شریف)

۱۰۵۸۔ عبداللہ بن عمرو روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ

۱۰۵۶۔ یعنی وحی کا انتظار میں ہوتا تھا جیسا کہ تحویل قبلہ کے وقت بھی آپ کا نظریں اٹھا اٹھا کر وحی کا انتظار کرنا قرآن شریف میں مذکور ہے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا۔

۱۰۵۸۔ تعجب ہے کہ جب سب سے پہلی بار آپ پر قرآن کریم کا نزول شروع ہوا تھا تو اس وقت بھی حضرت خدیجہؓ کے پاس آکر جو الفاظ آپ نے فرمائے تھے وہ بھی یہی تھے "لقد خشیت علی نفسی" مجھے اپنی جان کا خطرہ ہو گیا تھا اہل اہوا نے آپ کے اس فقرہ کے کیوں پر اتنا طومار باندھا کہ استغفر اللہ اگر کاش ان کو وحی کی حقیقت کا علم ہوتا پھر قرآن کریم کی عظمت کا کچھ اندازہ ہوتا۔ اس کے بعد آپ کی آخر عمر تک نزول وحی کے وقت آپ کے حالات دیکھنے کی فرصت ہوتی تو جو بات ان کی عقول کے لیے پہاڑ بن گئی تھی وہی بات سب سے آسان بن جاتی۔ اس باب کی پہلی حدیث جنازہ کا واقعہ ہے کہ اگر آپ پر وحی کی شدت کا عالم قریب قریب وہی نظر

هَلْ تُحِسُّ بِالْوَحْيِ فَقَالَ أَسْمَعُ صَلَاصِلَ ثُمَّ أَسْكُتُ عِنْدَ ذٰلِكَ فَمَا مِنْ مَرَّةٍ يُوحٰى إِلَيَّ إِلَّا ظَنَنْتُ أَنَّ نَفْسِي تُقْبَضُ۔ رواہ احمد

۱۰۵۹۔ عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي قَوْلِهِ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا نَزَلَ جِبْرَئِيلُ بِالْوَحْيِ وَكَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَهُ وَشَفَتَيْهِ فَيَشْتَدُّ عَلَيْهِ وَكَانَ يُعْرَفُ مِنْهُ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ الْآيَةَ الَّتِي فِي لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ قَالَ عَلَيْنَا أَنْ نَجْمَعَهُ فِي صَدْرِكَ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ فَإِذَا أَنْزَلْنَاهُ فَاسْتَمِعْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ عَلَيْنَا أَنْ نُبَيِّنَهُ بِلِسَانِكَ قَالَ فَكَانَ

جب آپ پر وحی آتی ہے تو آپ کو وہ محسوس ہوتی ہے؟ فرمایا پہلے میں گھنٹیوں کی سی آواز سنتا ہوں پھر اس وقت بالکل خاموش ہو جاتا ہوں۔ اور جب کبھی مجھ پر وحی آتی ہے تو مجھ کو یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ میری جان اب نکلی۔ (مسند احمد)

۱۰۵۹۔ سعید بن جبیرؓ آیۂ لا تحرک بہ لسانک کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل فرماتے ہیں کہ پہلے یوں ہوتا تھا کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آتے تو آپ اس کے یاد کرنے کی فکر میں وحی کے ساتھ ساتھ اپنے ہونٹ اور زبان ہلاتے جاتے۔ اس کی وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف ہوتی کہ سب کو اس کا احساس ہوتا اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ لا اُقسم کی یہ آیت نازل فرمادی کہ جلدی سے یاد کرنے کی فکر میں آپ نزول وحی کے ساتھ ساتھ اپنی زبان نہ ہلایا کریں' قرآن کا جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے تھے مطلب یہ تھا کہ آپ کے سینۂ مبارک میں اس کا محفوظ کر دینا پھر اس کا پڑھوانا یہ دونوں باتیں ہمارے ذمہ ہیں اس کے بعد آئندہ آپ یوں کیا کیجیے کہ جب ہم آپ پر قرآن نازل فرما چکیں تو نزول کے وقت تو آپ صرف سنا ہی کیجیے اس کے بعد خود پڑھ لیا کیجیے اس کے بعد اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس کے بعد جب جبرئیل

آ رہا تھا جو روز اول تھا اس کے بعد حضرت عبادہؓ بن صامت اور عبداللہ بن عمروؓ کی حدیثیں آپ کے سامنے ہیں۔ ان تمام حدیثوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ نزول وحی کی شدت آپ ہمیشہ ہی محسوس فرمایا کرتے تھے تو پھر اس وقت جبکہ آپ کو اس سے قبل نزول وحی سے کوئی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا، اگر اس شدت کا احساس ہوا اور آپ کی زبان مبارک سے خوف کے وہی کلمات نکلے جو اس پرشوکت کلام کے نزول سے نکلنے چاہئیں تھے تو یہ آپ کی اور زیادہ تصدیق کا سبب ہونے چاہئیں تھے نہ کہ برعکس تکذیب کا چنانچہ جب حضرت خدیجہؓ نے ان کو سنا تو فوری طور پر گو وہ کوئی قطعی فیصلہ تو نہیں دے سکیں مگر یہ اندازہ انہوں نے بھی اچھی طرح لگا لیا کہ یہ ضرور یہ کوئی ربانی معاملہ طرب نبوت اور وحی کی صفات سے کو سوں دور کا معاملہ ہوا تھا لہٰذا فوراً آپ کو لے کر ورقہ کے پاس پہنچیں انہوں نے واقعہ کا علم موسی سنتے ہی حقیقت حال معلوم کرلی اور آپ کی رسالت کی تصدیق کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے واقعہ کی تفصیلات اسی جلد میں پہلے آپ کے لاحظہ [illegible] گزر چکی ہیں۔

إِذَا أَتَاهُ جِبْرَئِيلُ أَطْرَقَ فَإِذَا ذَهَبَ قَرَأَهُ كَمَا وَعَدَهُ اللّٰهُ ۔ اللفظ للبخاری۔

۱۰۶۰۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْيِ فَبَيْنَا أَنَا أَمْشِي إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِي قِبَلَ السَّمَاءِ فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءٍ قَاعِدٌ عَلَى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَجُئِثْتُ مِنْهُ حَتّٰى هَوَيْتُ إِلَى الْأَرْضِ فَجِئْتُ أَهْلِي فَقُلْتُ زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي فَأَنْزَلَ اللّٰهُ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ إِلَى قَوْلِهِ فَاهْجُرْ قَالَ أَبُو سَلَمَةَ فَاهْجُرِ الْأَوْثَانَ ثُمَّ حَمِيَ الْوَحْيُ وَتَتَابَعَ ۔ واللفظ للبخاری۔

اَلْوَحْيُ وَثِقْلُهُ عَلٰى بَعْضِ أَصْحَابِهِ

۱۰۶۱۔ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ السَّاعِدِيِّ أَنَّهُ رَأَى مَرْوَانَ بْنَ الْحَكَمِ فِي الْمَسْجِدِ فَأَقْبَلْتُ حَتّٰى

علیہ السلام تشریف لاتے تو آپ اپنا سر مبارک جھکا لیتے۔ جب وہ تشریف لیجاتے تو حسب وعدہ الٰہی جیسا قرآن شریف اترتا اسی کے موافق پڑھتے۔ (بخاری شریف)

۱۰۶۰۔ جابرؓ بیان فرماتے ہیں کہ انھوں نے اس زمانہ کا تذکرہ جس میں آپ پر وحی کی آمد کچھ مدت کے لیے بند ہو گئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی خود سُنی ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ میں جا رہا تھا اچانک آسمان کی جانب سے مجھے ایک آواز آئی میں نے فوراً آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس حراء میں آیا تھا بڑی ہیبت وجلال کے ساتھ آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر معلق بیٹھا ہوا ہے اس حالت کو دیکھ کر مجھ پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ میں زمین پر گر پڑا اور اپنی اہلیہ کے پاس آیا اور میں نے کہا مجھے کمبل اُڑھاؤ مجھے کمبل اُڑھاؤ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ سے فَاهْجُرْ تک ابو سلمہ کہتے ہیں کہ فاهجر کا مطلب یہ تھا کہ بتوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو اس کے بعد پھر وحی گرما گرمی کے ساتھ پے در پے نازل ہونے لگی۔ (بخاری شریف)

وحی اور اس کا وزن آپؐ کے بعض صحابہ پر

۱۰۶۱۔ سہل بن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ انھوں نے مروان بن حکم کو مسجد میں دیکھا تو میں ان کے پاس

۱۰۵۹۔ اس جگہ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر میں راوی نے جو الفاظ نقل کیے ہیں اس سے زیادہ واضح الفاظ وہ ہیں جو کتب التفسیر میں موجود ہیں اس لیے علماء کو چاہیے کہ یہاں اُن الفاظ پر ہی اعتماد کریں۔

ان احادیث کے پیش نظر آپ یہ فیصلہ فرمائیے کہ وحی کا نزول جب اس جلالت وعظمت کے ساتھ ہوتا تھا تو آپ کا معاملہ بھی وحی کے ساتھ وہ نہ تھا جو انسان کے اپنے خیالات اور مدرکات کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ وحی کے ذریعہ جو انکشافات ہوتے وہ موجودات کے مطابق اور انسانی علوم سے مختلف ہوتے تو کیوں اس کو ادراک کا ایک علٰحدہ سبب تسلیم نہ کیا جائے۔

جَلَسْتُ إِلَى جَنْبِهِ فَأَخْبَرَنَا أَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمْلَى عَلَيْهِ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَجَاءَهُ ابْنُ أُمِّ مَكْتُوْمٍ وَهُوَ يُمِلُّهَا عَلَيَّ قَالَ وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ أَسْتَطِيْعُ الْجِهَادَ لَجَاهَدْتُ وَكَانَ أَعْمٰى فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَى رَسُوْلِهِ وَفَخِذُهُ عَلَى فَخِذِيْ فَثَقُلَتْ عَلَيَّ حَتّٰى خِفْتُ أَنْ تَرُضَّ فَخِذِيْ ثُمَّ سُرِّيَ عَنْهُ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ غَيْرَ أُولِي الضَّرَرِ. رواہ البخاری

۱۰۶۲ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أُوْحِيَ إِلَيْهِ لَمْ يَسْتَطِعْ أَحَدٌ مِّنَّا يَرْفَعُ طَرْفَهُ إِلَيْهِ حَتّٰى يَنْقَضِيَ الْوَحْيُ. (اخرجہ مسلم، والحاکم وصححہ)

آیا اور ان کے پہلو میں آکر بیٹھ گیا انہوں نے ہم سے کہا کہ زید بن ثابت نے ان سے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لا یستوی القاعدون من المؤمنین والمجاهدون فی سبیل اللہ الخ (مومنوں میں جو لوگ جہاد سے بیٹھ رہے اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا برابر نہیں ہو سکتے) زید بن ثابت سے قلمبند کرائی ابھی آپ اس کو قلمبند کرا ہی رہے تھے کہ آپ کی خدمت میں ابن ام مکتوم آگئے انہوں نے کہا یا رسول اللہ بخدا اگر میں جہاد کر سکتا تو ضرور جہاد کرتا۔ بات یہ تھی کہ یہ نابینا تھے ان کے عذر کرنے پہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر وحی نازل فرمائی، اس وقت آپ کی ران میری ران کے اوپر رکھی ہوئی تھی (یعنی بے تکلفی کے ساتھ گھٹنے کے ساتھ گھٹنا ملائے بیٹھے تھے) تو میری ران پر اتنا وزن پڑا یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب چورا چورا ہوئی۔ اس کے بعد جب وحی کی کیفیت آپ سے دور ہوگئی تو جو کلمہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا وہ صرف یہ تھا غیر اولی الضرر (یعنی یہ حکم ان کا ہے جو معذور نہ ہوں) بخاری شریف۔

۱۰۶۲۔ ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اُترتی تو جس وقت تک تمام نہ ہو لیتی کس کی مجال تھی کہ وہ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکتا۔ (مسلم، حاکم)

۱۰۶۰۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ اس مرتبہ آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو کسی خاص ہیئت پر دیکھا تھا اب وحی کی عظمت ایک طرف اور فرشتے کی ہیبت ایک طرف عام بشر کی کیا مجال کہ اس عظمت و ہیبت کا تحمل کر سکے۔ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت قدسیہ تھی کہ ان کو سنبھالا اور اس مرتبہ بھی گو آپ پر اثر تو ضرور ہوا مگر اتنا نہیں، اسی لیے آئندہ تسلسل کے ساتھ وحی کا نزول شروع ہوگیا۔

۱۰۶۱۔ سبحان اللہ صرف ایک کلمہ کا وزن جب زید بن ثابت کو اتنا محسوس ہوا تو جن پر یہ کلمہ نازل ہوا تھا ان کو اس کا وزن کتنا محسوس ہوا ہوگا۔ اب اندازہ کر لینا چاہیے کہ جن پر قرآن کریم پورا کا پورا نازل ہوا تھا عام بشر سے ان کو کتنا امتیاز ہوگا۔

الوحی وثقلہ علی الناقۃ

۶۳. ۱. عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اوحی الیہ وھو علی ناقتہ وضعت جرانھا فما تستطیع ان تتحرک حتی یسری عنہ وتلت انا سنلقی علیک قولا ثقیلا۔ رواہ احمد وعبد بن حمید وابن جریر وابن نصر والحاکم وصححہ وقال الھیثمی رجالہ رجال الصحیح۔

۶۴. ۱. عن ابی اروی الدوسی قال رایت الوحی ینزل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وانہ علی راحلتہ فترغو وتفتل یدیھا حتی اظن ان ذراعیھا تنفصم فربما برکت وربما قامت مؤتدۃ یدیھا حتی یسری عنہ من ثقل الوحی وانہ لیتحدر منہ مثل الجمان۔ رواہ ابن سعد کما فی الخصائص۔ ص ۱۱۹۔ ج ۱۔

الرسول العظیم کان یتغیر عند نزول الوحی

۶۵. ۱. عن ابن مسعود قال بینما انا امشی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض حرث

نزول وحی کے وقت آپ کی اونٹنی کی بے چینی

۶۳. ۱. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اترتی اور آپ اپنی اونٹنی پر ہوتے تو وحی کے وزن سے وہ بھی اپنی گردن نیچے ڈال دیتی تھی اور جب تک وحی کی آمد ختم نہ ہولیتی اپنی جگہ سے گردن ہلا نہ سکتی تھی اس کے بعد اس مضمون کی تصدیق میں آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ انا سنلقی علیک الخ ہم آپ پر ایک بہت وزنی کلام اتارنے والے ہیں۔ (احمد۔ عبد بن حمید ابن جریر۔ ابن نصر۔ حاکم کذا فی الدر المنثور)

۶۴. ۱. ابو اروی دوسی کہتے ہیں میں نے آنحضرت پر وحی آتے اس وقت دیکھا جب آپ اپنی سواری کے اوپر تھے کہ وحی کے وزن سے آپ کی اونٹنی آواز کرتی تھی اور اپنے دونوں پیر اس طرح لوٹتی بدلتی تھی کہ مجھ کو یہ گمان ہوتا تھا گویا اس کے بازو ٹوٹے جاتے ہیں کبھی بیٹھتی اور کبھی اپنے پیروں پر سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی۔ وحی کے وزن سے اس کی یہی کیفیت رہتی تھی یہاں تک کہ وحی کی آمد ختم نہ ہو جاتی ادھر آپ کی پیشانی مبارک سے موتی کی طرح پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ (خصائص الکبری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی آتی تو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ پر وحی آرہی ہے

۶۵. ۱. ابن مسعود روایت فرماتے ہیں کہ ایک بار میں آپ کی ہمراہی میں مدینہ کے کھیت یا کسی ویرانہ میں تھا

۶۳. ۱. اس روایت سے معلوم ہوا کہ وحی کے بار کا احساس صرف انسانوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ حیوانات کو بھی ہوتا تھا۔

اَذْخَرِبِ الْمَدِیْنَۃِ وَھُوَ یَتَوَکَّأُ عَلٰی عَسِیْبٍ مَّعَہٗ فَمَرَرْنَا عَلٰی نَفَرٍ مِّنَ الْیَھُوْدِ فَقَالَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ سَلُوْہُ عَنِ الرُّوْحِ فَقَالَ بَعْضُھُمْ لَا تَسْأَلُوْہُ اَنْ یَّجِیْئَ فِیْہِ بِشَیْئٍ تَکْرَھُوْنَہٗ فَقَالَ بَعْضُھُمْ وَلَنَسْأَلَنَّہٗ فَقَامَ اِلَیْہِ رَجُلٌ مِّنْھُمْ فَقَالَ یَا اَبَا الْقَاسِمِ مَا الرُّوْحُ فَسَکَتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَعَلِمْتُ اَنَّہٗ یُوْحٰی اِلَیْہِ فَقَالَ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَا اُوْتُوْا مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا قَالَ الْاَعْمَشُ ھٰکَذَا فِیْ قِرَائَتِنَا۔ والبخاری ومسلم ورواہ الترمذی فی سورۃ بنی اسرائیل وفیہ لفظ حتی صعد الوحی

ومن میزات الانبیاء علیھم السلام ان لھم فی الدنیا خواص اھل الجنۃ ومن تلک الخواص ان اجسادھم لا تبلی ولا تفنی

۱۰۶۶۔ عَنْ اَوْسِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَفْضَلِ اَیَّامِکُمْ

آپ اس وقت ایک شاخ پر سہارا لے کر کھڑے ہوئے تھے اتنے میں ہمارا گزر یہود کی ایک جماعت پر ہوا انھوں نے باہم ایک دوسرے سے کہا اس شخص سے روح کے متعلق دریافت کرکے دیکھو اس پر کسی نے یہ مشورہ دیا کہ نہ پوچھو کہیں وہ ایسا جواب نہ دے دیں جو تمہارے لیے اور کوفت کا سبب ہو۔ اس پر دوسرے لوگ بولے واہ ہم ضرور پوچھیں گے چنانچہ ان میں ایک شخص کھڑا ہوگیا اور اس نے کہا اے ابوالقاسم (آپ کی کنیت تھی) روح کے متعلق کچھ فرمایئے؟ یہ سن کر آپ خاموش ہوگئے۔ میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے چنانچہ ان کے جواب میں آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی یسئلونک عن الروح۔ یہ لوگ آپ سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ ان سے کہہ دیجیے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ایک حکم ہے اور جتنا حصہ علم کا ان کو دیا گیا ہے وہ بہت ہی قلیل ہے (گرچہ وہ نادانی سے اس کو بہت سمجھیں) اعمش کہتے ہیں کہ ہماری قرأۃ میں اس آیۃ میں اوتیتم کی بجائے اوتوا کا ہی لفظ ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنی صفات میں اہل جنت کے ساتھ مشابہت تھی یہ ان کے جسم تغیر سے محفوظ رہتے ہیں

۱۰۶۶۔ اوس بن اوس روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے سب دنوں میں سب سے

۱۰۶۵۔ خلاصہ یہ کہ وحی کی حقیقت خواہ کتنی ہی دقیق کیوں نہ ہو لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول دیکھنے والے اتنی واضح ہوچکی تھی کہ جو آپ کے رفقاء تھے وہ اس کو فوراً پہچان لیتے تھے مشکل جو کچھ بھی ہے وہ ان کے لیے ہے جنہوں نے وحی کا نزول خود نہ دیکھا انہیں اور بدقسمتی یہ کہ جنہوں نے دیکھا تھا ان کے بیان پر ان کو اعتماد نہیں آتا۔

اس روایت میں امام ترمذی نے ایک خاص لفظ روایت کیا ہے اور وہ حتی صعد الوحی یعنی میں سمجھ لیتا تھا کہ اب آپ پر وحی آرہی ہے یہاں تک کہ وحی چڑھ جاتی۔ وحی کے بارے میں نزول کا لفظ تو عام روایات میں آتا ہے لیکن اس روایت میں صعود کا لفظ بھی آگیا ہے اور بظاہر اس سے مراد صاحب وحی یعنی فرشتہ کا صعود ہے۔

يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِيهِ قُبِضَ وَفِيهِ النَّفْخَةُ وَفِيهِ الصَّعْقَةُ فَأَكْثِرُوا عَلَيَّ مِنَ الصَّلٰوةِ

افضل دن جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے۔ اسی میں ان کی وفات ہوئی، اسی میں صور پھونکا جائیگا اور اسی میں صور کی آواز سے لوگوں پر بیہوشی طاری ہوگی تو اس دن میں تم لوگ مجھ پر بکثرت درود

۱۰۶۶ - حدیث مذکور الصدر میں انبیا علیہم السلام کے ایک جسمانی امتیاز کا تذکرہ ہے یعنی یہ کہ عام انسانوں کے جسم میں تو صرف ایک جزء ایسا ہوتا ہے جو تمام جسم کے فنا ہو جانے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتا جیسا ابھی آپ کے ملاحظہ سے گزریگا لیکن انبیا علیہم السلام کے پورے کے پورے عنصری اجسام کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ زمین کے تخریبی اثرات سے بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ یوں تو ادویات کے ذریعہ سے اجسام کا محفوظ رکھنا مصر کی عام صنعت تھی اور اسی صنعت کی بدولت آج عجائب گھروں میں ہزاروں سال کی لاشیں آپ کو موجود نظر آتی ہیں اور آج کی ایجادات میں بھی ایسے آلات موجود ہیں جن کے ذریعہ پانی اور آگ کے اثرات سے کافی حفاظت ہو جاتی ہے۔ واٹر پروف، فائر پروف کا استعمال عام طور پر ہمارے زمانہ میں سب جانتے ہیں۔ تھرماس میں برف جیسی جلد گھل جانے والی چیز بے تامل چوبیس چوبیس گھنٹے تک محفوظ رہ سکتی ہے، اس لیے انبیا علیہم السلام کے اجسام کا محفوظ رہنا بھی کوئی بہت بعید از قیاس بات تو نہ تھی بالخصوص جبکہ تاریخی واقعات سے بعض صحابہ کے اجسام کا محفوظ رہنا بھی صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہو لیکن ہم صرف آپ کی تسکین خاطر کی خاطر کچھ مزید وضاحت بھی کیے دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جس طرح عناصر کی تلطیف و تکثیف سے کون و فساد ہو سکتا ہے اسی طرح مرکبات عناصر میں بھی تلطیف و تکثیف سے مادیت و روحانیت کا تغیر ہو سکتا ہے دیکھیے پانی کو اگر آگ پر رکھا جائے تو وہ ایک دوسرے لطیف تر عنصر کی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی ہوا بن جاتا ہے پھر اس کے خواص بھی بدل جاتے ہیں، اسی طرح بھاپ کو اگر ٹھنڈا کر دیا جائے تو پھر وہ پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو اس سے کثیف عنصر ہے۔ یہاں بھی اب اس کے خواص میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی جسم جو عناصر اربعہ کا مرکب ہے اس میں بھی ریاضت و معصیت کے اثرات سے لطافت و کثافت کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے مسلمانوں میں طبقہ صوفیاء، انصاری میں راہبین اور ہندوؤں میں جوگیوں کی تاریخ پڑھنے سے یہ حد یقین تک پہنچ جاتا ہے کہ ان کے ظاہری اجسام ریاضات کے اثرات سے اتنے لطیف ہو جاتے تھے کہ عام جسمانی انقلابات ان پر کم اثر انداز ہوتے تھے اس کے برعکس بر ہماعت تن پروری کی ریاضت میں منہمک ہے ان کے اجسام بھی اسی قدر کثیف ہو جاتے ہیں آج کل کی اصطلاح میں اس مسئلہ کا نام تجسد ارواح اور تروح الاجساد ہے۔ یعنی روحوں میں یہ طاقت ہو جاتی ہے کہ وہ کسی جسم کی صورت اختیار کر لیں اور جسم لطیف ہو کر روح کے خواص پیدا کرلے۔ انبیا علیہم السلام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش چونکہ عام دستور کے خلاف صرف نفخ جبرئیلی سے ہوئی تھی اس لیے ان کے جسم عنصری میں بھی روح کے خواص اتنے نمایاں تھے کہ موجودہ انجیل کے بیان کے مطابق بعض مرتبہ بات کرتے کرتے ان کی شکل مبارک تبدیل ہو جایا کرتی تھی اور ہماری شریعت میں بھی ان کا لقب "روح اللہ" رکھا گیا ہے۔ ان کا آسمانوں پر جانا اور پھر اترنا بھی اسی کے اثرات میں سے ہے اسی طرح ان کے معجزات میں احیاء موتیٰ کا ایک معجزہ ہونا بھی ان کے "روح اللہ" ہونے کے مناسبات میں سے تھا۔

احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ معصیت کا اثر مادیت میں ترقی ہے اور طاعات کا اثر روحانیت میں اضافہ، اس لیے اہل جہنم پر مادیت غالب کردی جائیگی اور ان کی جسامت دنیوی جسامت سے سیکڑوں گنا بڑھا دی جائیگی تاکہ ایک طرف ان کے عذاب میں شدت ہو اور دوسری طرف جہنم کے بھرنے کا جو وعدہ گزر چکا ہے وہ تکثیر افراد کی بجائے ایک ایک فرد کی جسامت میں اضافہ کر کے پورا کر دیا جائے۔ اس کے برخلاف اہل جنت پر روحانیت غالب ہو جائیگی اور اس وجہ سے جنت کی نعمتوں سے لطف اندوزی اور پروردگار عالم کی رویت جو عالم محسوسات سے بھی ورا الورا ہے ان کے لیے آسان ہو جائیگی

نِيْ فَاِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوْضَةٌ عَلَيَّ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ تُعْرَضُ صَلَاتُنَا عَلَيْكَ . وَ

بھیجا کرو کیونکہ تمہاری درود میرے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ راوی کہتا ہے صحابہ نے تعجب سے دریافت کیا
یا رسول اللہ ہماری درود بھلا آپ کے سامنے کس طرح پیش ہوگی اور

بیشک جو اجسام اپنی ساری عمر ریاضت و عبادت میں صرف کر کے یہاں بھی روح کے کچھ خواص حاصل کر چکے تھے جنت میں پہنچ کر ان کی اس صفت میں اور ترقی ہو جانی چاہیے۔ حیرت ہے کہ جب اس دنیا میں بھی موسم، زمین کے مخمور ہونے نہ ہونے اور خود جسم کے طبعی غیر طبعی ہونے کے اختلاف سے لاش کے بگڑنے اور نہ بگڑنے میں فرق آسکتا ہے تو معصیت و طاعت کے اثرات سے بھی اگر یہ اختلاف رونما ہو تو اس کا انکار کیوں کیا جائے۔ اگر مشاہدہ اور کچھ واقعات وہاں تصدیق کے لیے مجبور کرتے ہیں تو یہاں بھی اس سے زیادہ قوی ثبوت کے ساتھ مشاہدہ موجود ہے جیسا ابھی آپ کے ملاحظہ سے گزریگا۔

اب تک جو ہم نے بیان کیا یہ تو کسب و اکتساب کے اثرات و نتائج تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی جماعت چونکہ صفت اصطفاء و اجتباء کے ماتحت ہوتی ہے اس لیے ان کے اجسام کی ابتدائی نہاد ہی ان کمالات سے بالاتر ہوتی ہے جو کسب و اکتساب کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ قالب انسانی ان کو بھی ملتا ہے مگر وہ قالب جو منور ہو، روح بشری ان میں بھی ہوتی ہے مگر وہ روح جو نشہ عبودیت میں سرشار ہو اور اس طرح وہ ظاہر و باطن منور ہستیاں جب عالم میں ظاہر ہوتی ہیں تو کفر کا تیرہ و تاریک عالم ان کے وجود سے منور ہو جاتا ہے۔ پسینہ ان کو بھی آتا ہے مگر وہ پسینہ نہیں جو دماغ کو متعفن کر دے بلکہ وہ جو مشام جان کو معطر کر دے، سوتے وہ بھی ہیں مگر وہ نیند نہیں جو دل کو غافل کر دے، کھاتے وہ بھی ہیں مگر وہ کھانا نہیں جس کی احتیاج عام انسانوں کی طرح ہو بلکہ عین نیند کی حالت میں ان کے دل دوسرے تمام بیداروں سے زیادہ بیدار ہوتے ہیں حتی کہ ان کا خواب وحی ہوتا ہے اور ان کی نیند ناقض وضو نہیں ہوتی۔ وہ روزہ رکھتے ہیں تو کئی کئی دن کھانے کے قریب نہیں جاتے پھر اس وجہ سے ان کو کوئی ضعف بھی لاحق نہیں ہوتا۔ اس پر جب آپ کے فداکار آپ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ بڑی شفقت کے انداز میں اُن سے یہ فرماتے ہیں کہ تم میری طرح نہیں ہو۔ میں اگر جسمانی غذا ترک کرتا ہوں تو میرا پروردگار مجھے روحانی غذا سے سرفراز فرماتا ہے۔ تم لہسن، پیاز سب کھا سکتے ہو مگر میں نہیں کھا سکتا کہ میرے اصحاب محفل ہمارے علاوہ نوع ملائکہ بھی ہے، نکاح وہ بھی کرتے ہیں مگر وہ نکاح نہیں جس سے مقصود کسی درجہ میں بھی تلذذ ہو بلکہ وہ نکاح جس کا مقصد صرف عبادت و تقرب ہو۔ قوت باصرہ، سامعہ، ذائقہ وہ بھی رکھتے ہیں مگر وہ قوت نہیں جو صرف عالم مادیت تک محدود ہو بلکہ وہ جو ماوراء مادیت کو بھی نفوذ کر جائے۔ زبانیں اگر صرف خوش مزہ اور بدمزہ کا ادراک کرتی ہیں تو ان کی زبان حرام و حلال غذا کا بھی ادراک کر لیتی ہے۔ حتی کہ بول و براز میں وہ بھی عام انسانوں کے شریک نظر آئیں مگر یہاں اس کے متعلق جذب کر لینا بھی منقول ہو اور سب سے آخر میں موت کا فرشتہ ان کے پاس بھی آئے مگر اجازت کے بغیر جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ اذن و اجازت سے اور دفن اگرچہ وہ بھی ہوں مگر یہاں بھی اپنی جائے وفات میں مدفون ہونے کا امتیاز باقی رہے۔ اب سوچیے کہ اگر ان کے جسم عنصری ہی میں کوئی امتیاز و خصوصیت نہیں ہوتی تو جس غذا کے اثر سے دوسرے جسموں کو متعفن پسینہ آتا ہے وہ ان کو کیوں نہیں آتا، وہ عام انسانوں کی طرح غذا کے محتاج کیوں نہیں ہوتے، اُن کے حواس کے ادراک کا دائرہ عام انسانوں سے بالاتر کیوں ہوتا ہے اور کیوں ان کی نیند عام انسانوں کی سی نیند نہیں ہوتی۔ دنیا میں غفلت کی نیند محنت کی علامت ہو اور ان کے یہاں تیقظ کی نیند موجب کمال ہو کیا اس سے یہ صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کے اجسام عنصریہ کی نہاد ہی کچھ عام اجسام سے نرالی ہوتی ہے۔ بعض ضعیف حدیثوں میں آتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل جنت کی غذا کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ معطر پسینہ بن کر ختم ہو جائیگی اس سے فضلہ نہیں بنیگا۔ اگر کہیں غذا کی مادیت

قد ارمت یقولون بلیت فقال ان اللہ عزوجل حرم علی الارض

آپ کا جسم اطہر تو اس وقت تک مٹی میں مل چکا ہوگا۔ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کردیا ہے

حائل نہ ہو جاتی تو شاید انبیاء علیہم السلام کا فضلہ اس عالم میں بھی پسینہ بن کر رہ جاتا گویا فرق اگر کچھ رہا تو وہ صرف غذاء کی نوعیت کے فرق سے رہا اور نہ لطافت خواص جسم کا جو خاصہ اہل جنت کے جسم میں تھا وہی یہاں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں رہ کے جب حظ اٹھائی تو وہی جسم جو فضلہ کا محتاج نہ تھا اب فضلہ دفع کرنے کے لیے مجبور ہوگیا۔ بس جسم ایک ہی تھا فرق جو ہوا وہ غذاء کی نوعیت سے پیدا ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام جنتی جسم لے کر اس جہان کی آبادی کے لیے تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا یہی جسم عنصری لے کر خدا تعالیٰ کے دیدار کے لیے تشریف لے گئے اور اسی جسم اطہر کے ساتھ جنت کو شرف قدوم سے نوازا۔ پس کیا شبہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں۔ اگر ان کا قالب عنصری بھی اہل جنت کی طرح کون و فساد کے اثرات سے آزاد ہو تو بعید کیا ہے۔ پھر اس پر بھی ذرا غور کرنا چاہیے کہ انسانی زندگی میں عام انسانوں کے اجسام کے بگڑنے سے کیا چیز مانع ہے تو ظاہر ہوگا کہ وہ علاقہ روح یعنی حیات ہے۔ ادھر روح نے جسم سے پرواز کی ادھر جسم کے اندر تغیر شروع ہوا۔ اگر انبیاء علیہم السلام کی ارواح کا ان کے جسموں کے ساتھ علاقہ شہداء سے کچھ زیادہ تسلیم کر لیا جائے تو کیا پھر بھی ان کے جسموں کے محفوظ رہنے میں کوئی وجہ اشکال ہو سکتی ہے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:۔

واعلم ان تمام الکلام فی ہذا الباب ان النفس القدسیۃ النبویۃ مخالفۃ بماہیتہا لسائر النفوس ومن لوازم تلک النفوس الکمال فی الذکاء والفطنۃ والحریۃ والاستعلاء والترفع عن الجسمانیات والشہوات فاذا کانت الروح فی غایۃ الصفاء والشرف کان البدن فی غایۃ النقاء والطہارۃ کانت ہذہ القوی المحرکۃ والمدرکۃ فی غایۃ الکمال لانہا جاریۃ مجری الانوار فائضۃ من جوہر الروح واصلۃ الی البدن ۔ متی کان الفاعل والقابل فی غایۃ الکمال کانت الآثار فی غایۃ القوۃ والشرف والصفاء۔

تفسیر کبیر ص ۱۲۱ ۔ ج ۲۵

یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کے نفوس قدسیہ عام انسانوں سے اپنی ماہیت میں بھی مختلف ہوتے ہیں ان نفوس میں فہم و فراست اور جسمانیات و شہوات سے ایک عجیب قسم کی برتری ہوتی ہے جب ایک طرف روح کی پاکیزگی و شرف کا یہ عالم ہو دوسری طرف جسم بھی غایت درجہ پاک و صاف ہو تو لازمی طور پر ان کے قویٰ محرکہ اور مدرکہ بھی انتہائی درجہ کامل ہوں گے کیونکہ جب فاعل اور قابل دونوں کامل ہوں تو پھر اس کے آثار قوت و شرف و پاکیزگی میں کیوں کامل نہ ہوں۔

(تفسیر کبیر)

مگر ان تمام کمالات کے بعد بھی کیا انبیاء علیہم السلام کا قدم سر مو بھی بشریت سے باہر گیا۔ ہرگز نہیں جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے منکر ہیں ان کو دراصل بشریت کے کمالات سے آگاہی ہے نہ خدائی صفات کا اندازہ ہے ان جملہ کمالات میں سے ایک کمال بھی ایسا نہیں جو بشر کو خدا تعالیٰ کی کسی ایک صفت میں بھی شریک و سہیم بنا سکے۔ انسانی سلسلے کمالات کے بعد بھی قبار بشریت پر حدوث و امکان کا ایک ہی داغ اس کو خالق بشر سے ممتاز کر دینے کے لیے کافی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے اجسام میں خواہ کتنی بھی خصوصیات ہوں مگر وہ پھر جسم کی خصوصیات ہوں گی جارا کے عام اجسام سے بالاتر ہونے کی دلیل تو بن سکتی ہیں مگر جو ذات کہ جسم و جسمانیات سے ہی بالاتر ہو بھلا اس کے ساتھ کوئی ادنیٰ سا اشتراک کیسے پیدا کر سکتی ہے انصاف کیجیے کہ جسم کی پیدائش خواہ کتنی بھی نرالی ہو، پسینہ خواہ کتنا ہی معطر اور معطر ہو، بول و براز کی خصوصیات خواہ کتنی ہی عجیب و غریب ہوں، موت و دفن کے واقعات اور سلامتی جسم کی حقیقت خواہ کتنی ہی حیرت انگیز ہو مگر کیا ان عوارض یا ان سے بھی برتر عوارض کے ساتھ کسی انسان کو اس ذات اقدس کے ساتھ کوئی اشتراک پیدا ہو سکتا ہے جو ان صفات کی خالق ہو اور ان میں سے ہر

اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ. رواه ابوداؤد والنسائی والدارمی والبیہقی فی الدعوات الکبیر واحمد وابن حبان والحاکم. قال الحاکم ھذا حدیث صحیح علی شرط البخاری ولم یخرجاہ وکذا صححہ النووی فی الاذکار وقال الحافظ عبدالغنی النابلسی انہ حسن صحیح وقال المنذری انہ حسن وقال ابن دحیۃ انہ صحیح محفوظ واجاب الحافظ ابن القیم مما ذکر فیہ من العلۃ فراجع جلاء الافہام ص۳۴ وص۳۵ ورواہ ابن ماجہ عن ابی الدرداء قال الحافظ المنذری اسنادہ جید

۱۰۶۷۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کُلُّ بَنِیْ اٰدَمَ تَاْکُلُہُ الْاَرْضُ اِلَّا عَجْبُ الذَّنَبِ. مِنْہُ خُلِقَ وَفِیْہِ یُرَکَّبُ۔ رواہ مالک والحاکم فی مستدرکہ وصححہ واقرہ الذھبی والحدیث مروی عند الشیخین لکنہ جزء من الحدیث الذی جاء فی المدۃ بین النفختین۔

۱۰۶۸۔ مَالِکٌ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ صَعْصَعَۃَ اَنَّہٗ بَلَغَہٗ اَنَّ عَمْرَو بْنَ الْجَمُوْحِ وَعَبْدَ اللّٰہِ بْنَ عَمْرٍو الْاَنْصَارِیَّیْنِ ثُمَّ السُّلَمِیَّیْنِ کَانَا قَدْ حَفَرَ السَّیْلُ مِنْ قَبْرِھِمَا وَکَانَ قَبْرُھُمَا یَلِی السَّیْلَ وَکَانَا فِیْ قَبْرٍ وَّاحِدٍ وَّھُمَا مِمَّنِ اسْتُشْھِدَ یَوْمَ اُحُدٍ فَحُفِرَ عَنْھُمَا لِیُغَیَّرَا مِنْ

کہ وہ انبیاء کے اجسام پر کوئی اثر کرسکے۔ (ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ دارمی۔ بیہقی)

۱۰۶۷۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ابن آدم کا سب جسم زمین کھا لیتی ہے صرف اس کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک حصہ نہیں کھاتی۔ اسی سے اس کی پیدائش کی ابتدا ہوئی تھی اور اسی سے وہ پھر بنایا جائیگا۔ مالک۔ حاکم۔

۱۰۶۸۔ مالک عبدالرحمٰن سے نقل کرتے ہیں کہ ان کو یہ بات معلوم ہوئی کہ عمرو بن الجموح اور عبداللہ بن عمرو جو انصار میں سے تھے ان کی قبریں سیل (رَو) کے متصل واقع ہوئی تھیں ایسا اتفاق ہوا کہ سیل آئی اور اس نے ان کی قبریں کھود ڈالیں۔ یہ دونوں انصاری غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تھے اور ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کردیا گیا تھا جب دوسری جگہ دفن کرنے کے لیے ان کی قبروں کو کھودا گیا۔

صفت جس کے لیے نقص و نقص اور عیب درعیب ہے پس نہ تو آپ کے کمالات بشریت کے اقرار سے خدائی توحید کو مکدر کرنا چاہیے اور نہ خدائی توحید کا کمال آپ کے کمالات بشریت کے انکار میں مضمر سمجھنا چاہیے۔

۱۰۶۷۔ جدید تحقیق کے بموجب انسانی پیدائش کی ابتدا سیلس (Sells) قرار دی گئی ہے جو قدرت الٰہی سے نہیں بلکہ اپنی فطرت سے ارتقاء کرتے کرتے انسانی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ یہاں حدیث یہ کہتی ہے کہ انسانی جسم کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوتا ہے جو دم علقہ و مضغہ کی جملہ ارتقائی صورتوں میں محفوظ رہتا ہے حتی کہ جب جسم کے سب اجزاء فنا ہو جاتے ہیں وہ اس وقت بھی فنا نہیں ہوتا گویہ تمام سلسلہ ہوتا ہے سب قدرت کے ماتحت جس نے ایک بار پہلے اس ارتقائی سلسلہ سے اس کو بنایا تھا دوسری بار پھر اس ارتقاء کے بغیر وہی اس کو بنا کر کھڑا کردیگی۔

؎ جس حدیث کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

مَكَانِهِمَا فَوُجِدَا لَمْ يَتَغَيَّرَا كَأَنَّهُمَا مَاتَا بِالْأَمْسِ وَكَانَ أَحَدُهُمَا قَدْ جُرِحَ فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَى جُرْحِهِ فَدُفِنَ وَهُوَ كَذٰلِكَ فَأُمِيطَتْ يَدُهُ عَنْ جُرْحِهِ ثُمَّ أُرْسِلَتْ فَرَجَعَتْ كَمَا كَانَتْ وَكَانَ بَيْنَ أُحُدٍ وَبَيْنَ يَوْمِ حُفِرَ عَنْهُمَا سِتٌّ وَأَرْبَعُونَ سَنَةً. رواه مالك فی الموطا من اواخر ابواب الجهاد۔

۱۰۶۹۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا حَضَرَ أُحُدٌ دَعَانِي أَبِي مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ مَا أُرَانِي إِلَّا مَقْتُولًا فِي أَوَّلِ مَنْ يُقْتَلُ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنِّي لَا أَتْرُكُ بَعْدِي أَعَزَّ عَلَيَّ مِنْكَ غَيْرَ نَفْسِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِنَّ عَلَيَّ دَيْنًا فَاقْضِ وَاسْتَوْصِ بِأَخَوَاتِكَ خَيْرًا فَأَصْبَحْنَا فَكَانَ أَوَّلَ قَتِيلٍ وَدُفِنَ مَعَهُ آخَرُ فِي قَبْرِهِ ثُمَّ لَمْ تَطِبْ نَفْسِي أَنْ أَتْرُكَهُ مَعَ الْآخَرِ

دیکھا تو اُن میں ذرا بھی تغیر نہ تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کل دفن کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب جب زخمی ہوئے تھے تو انہوں نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھ لیا تھا اور اتفاق سے اسی طرح ان کو دفن کر دیا گیا تھا۔ قبر سے نکالنے کے بعد ان کا ہاتھ جب زخم سے علیحدہ کر کے چھوڑا جاتا تو پھر اسی طرح زخم پر جا چمٹتا حالانکہ غزوۂ احد اور جس دن ان کی قبریں کھودی گئی تھیں ان کے درمیان چھیالیس سال کی مدت گزر چکی تھی۔ (مالک)

۱۰۶۹۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب غزوۂ احد سامنے آیا تو میرے والد ماجد نے مجھے شب کے وقت بلا کر فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں جو شہید ہونے والے ہیں ان سب میں پہلے میں مقتول ہونگا اور دیکھو میرے بعد ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مستثنیٰ کر کے تم سے بڑھ کر مجھ کو کوئی اور پیارا نہیں ہے۔ دیکھو میرے اوپر قرض ہے اس کو ادا کر دینا اور اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھنا۔ جب صبح ہوئی تو سب سے پہلے میرے والد ماجد ہی شہید ہوئے اور (شہداء کی کثرت کی وجہ سے) ایک صحابی اور ان ہی کے ساتھ دفن کر دیے گئے مگر میرے دل کو یہ گوارا نہ ہوسکا کہ ان کے

۱۰۶۹۔ یہ چند واقعات تو خود اسی امت کے ہیں اور بسند صحیح ثابت ہیں۔ ان کے علاوہ اس اُمت کے کچھ اور واقعات اور پہلی اُمت کا ایک واقعہ ابھی آئندہ حدیث کے ذیل میں آپ کے سامنے آنے والا ہے اس لیے یہ ناگزیر طور پر تسلیم کرنا پڑیگا کہ موت اور دفن کے بعد بھی جسم انسانی تغیرات سے محفوظ رہ سکتا ہے لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں جو بیان حدیث مذکورہ بالا میں آپ پڑھ چکے ہیں اس میں ذرا بھی تردد کیا جا سکے۔ پھر جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ اتنی طویل مدت کے بعد بھی مردہ جسم سے خون کیونکر برآمد ہوا تو شہداء کی حیات کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے گو وہ ایسی حیات نہ ہو جس کی جملہ کیفیات کا ہم ادراک کر سکیں مگر یہ تو ماننا پڑیگا کہ عام مُردوں سے ان کو امتیاز ضرور ہوتا ہے کہ ان کی مردہ نعشوں میں سالوں کے بعد بھی خون کا اثر موجود ہو سکتا ہے اب ایسا کیوں ہوتا ہے تو اس کا جواب ہم صرف یہی دے سکتے ہیں کہ یہ اس لیے کہ وہ کسی درجہ میں حیات رکھتے ہیں۔ رہا یہ کہ اس کی تفصیلات کیا ہیں تو ہم بیان اپنے جہل کا اعتراف کرتے ہیں ہم تو ابھی یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ بیداری اور سونے کی حالتوں میں ہماری روح اور جسم کے تعلق میں پورا فرق کیا ہے حالانکہ یہ

فَاسْتَخْرَجْتُهُ بَعْدَ سِتَّةِ اَشْهُرٍ فَاِذَا هُوَ كَيَوْمِ وَضَعْتُهُ هُنَيَّةً غَيْرَ اُذُنِهِ ۔ رواہ البخاری وذکر الحافظ ابن حجرؒ من فوائد الحدیث کرامۃ بکون الارض لم تبل جسدہ مع لبثہ فیھا۔ وقد ذکر السہیلی فی الروض الانف ص۱۳ وملوجد فی صدر ھذہ الامۃ من الشہداء احد و غیرہم علی ھذہ الصورۃ لم یتغیر وابعد الدھور الطویلۃ کحمزۃ بن عبدالمطلب فانہ وجد حین حفر معاویۃ العین صحیحا لم یتغیر واصابت الفاس اصبعہ فدمیت وکذلک ابو جابر عبداللہ بن حرام (وعمرو بن الجموح) و طلحۃ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم استخرجتہ بنتہ عائشۃ من قبرہ) حین رأتہ فی المنام فامرھا ان تنقلہ من موضعہ فاستخرجتہ من موضعہ بعد ثلاثین سنۃ لم یتغیر ذکرہ ابن قتیبۃ فی المعارف والاخبار بذلک صحیحۃ ثم ذکر قصۃ الغلام واصحاب الاخدود وذکر انہ اخرج فی زمن عمر بن الخطاب واصبعہ علی صدغہ کما وضعہا حین قتل کما رواہ الترمذی قلت نعم وللارض من کاس الکرام نصیب

۱۰۷۰۔ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ اَبِيْ بَكْرٍ اَنَّ خَرْبَةً اُحْتُفِرَتْ فِيْ زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَوَجَدُوْا عَبْدَاللّٰهِ بْنَ تَامِرٍ وَاضِعًا يَدَهٗ عَلٰى ضَرْبَةٍ بِرَأْسِهٖ اِذَا اُمِيْطَتْ يَدُهٗ عَنْهَا انْبَعَثَتْ دَمًا وَاِذَا تُرِكَتْ اِرْتَدَّتْ

اس لیے چھ ماہ کی مدت کے بعد میں نے ان کو نکالا تو یوں معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ان کو دفن کیا تھا صرف ان کے کان پر ذرا سا اثر آیا تھا۔ (بخاری شریف)

۱۰۷۰۔ عبداللہ بن ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک اُجاڑ زمین کھودی گئی تو اُس میں عبداللہ بن تامر کی لاش نکلی کہ اپنے سر کے زخم پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں جب اس زخم سے ان کا ہاتھ جدا کر لیا جاتا ہے تو خون بہنے لگتا ہے اور جب اس کو چھوڑ دیتے ہیں تو پھر اپنی جگہ جا چمٹتا ہے۔ ان کے ہاتھ میں

دونوں حالتیں ہر شخص پر اس کی حیات کی حالتیں ہیں اور سالہا سال اس پر گزرتی ہیں لہٰذا اگر اس حالت کا ہم پتہ نہ دے سکیں جو موت کے بعد کی ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے۔

جب شہداء کے حیات کی کیفیات یہ ہیں تو انبیاء علیہم السلام جن کے رتبے ان سے کہیں بالاتر ہیں ان کی حیات کی نوعیت کیا ہوگی اس سے اس کا کچھ اندازہ کر لینا چاہیے۔ یہاں ان مشاہدات کے بعد محض اپنے خیالات سے نہ تو اس کا انکار کر ڈالنا مناسب ہے اور نہ اس پر ہزار خرافات کا اور اضافہ کر کے اصل حقیقت کا بھی گم کر دینا عقل کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بشر دنیا میں ایک مشابہ حیات کے مالک رہ چکے ہیں اگر وفات کے بعد کسی غیر مشاہد حیات کے مالک بن گئے ہیں تو اس سے ان کی بشریت میں کیا فرق پڑ سکتا ہے اور کیوں۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام اور شہداء کرام کی حیات تسلیم کر لینے کے بعد بھی ان کے بارے میں کسی ایک بات کا اضافہ کر دینا جو انہوں نے اپنی حسی حیات میں نہیں فرمائی بلکہ اس سے منع کیا ہے۔ جہاں دین پر افتراء ہے اسی طرح خود ان کی ذاتوں پر بھی افتراء ہوگا۔

۱۰۷۰۔ امام قرطبی نے اصحاب اخدود کے قصہ کے ساتھ بعض اور واقعات بھی ذکر فرمائے ہیں:۔

وقال الامام القرطبی وکان اصحاب الاخدود ... الخ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ حسب بیان صاحب مسلم اصحاب اخدود

مَكَانَهَا وَفِي يَدِهٖ خَاتَمُ حَدِيْدٍ فِيْهِ مَكْتُوْبٌ رَبِّيَ اللّٰهُ فَبَلَغَ ذٰلِكَ عُمَرَ فَكَتَبَ اَنْ اَعِيْدُوْا عَلَيْهِ الَّذِيْ وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ. رواه محمد بن اسحاق فی تفسیر الخازن ۔ ومحمد بن اسحاق موثوق به فی الاخبار وان تکلم فیه فی باب الاحادیث ومع ذلک فقد روی عنه الائمة فی باب الاحکام ایضا

مِنْهَا حَيَاتُهُمْ وَشُغْلُهُمْ بِالْعِبَادَاتِ

۱۰۷۱۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ

لوہے کی ایک انگوٹھی تھی اس پر "ربی اللہ" کا نقش کندہ تھا جب یہ اطلاع حضرت عمرؓ کو ملی تو آپ نے لکھ بھیجا تم نے جس حال پر ان کو پایا ہے ان کو اسی حالت پر دفن کر دو (تفسیر خازن)

اہل جنت سے دوسری مشابہت ان کی دائمی حیات اور دائمی عبادت ہے

۱۰۷۱ انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں

ایام الفترة بین عیسی ومحمد صلی اللہ علیہ وسلم کما فی صحیح مسلم وروی ثقلة الاخبار ان معاویةؓ لما اجری العین التی استنبطها بالمدینة وسط المقبرة وامر الناس بتحول موتاهم وذلک فی ایام خلافته وبعد اُحد من نحو خمسین سنة فوجدوا علی حالهم حتی ان الناس رؤا المسحاة اصابت قدم حمزةؓ بن المطلب فسال الدم منها۔۔

۔۔ وروی کافة اهل المدینة ان جدار قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما انهدم ایام خلافة الولید بن عبدالملک بن مروان وولایة عمر بن عبدالعزیز علی المدینة بدت لهم قدم فخافوا ان تکون قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فجزع الناس حتی روی لهم سعید بن المسیب ان جثة الانبیاء علیهم السلام لا تقیم فی الارض اکثر من اربعین یوما ثم ترفع وجاء سالمؒ بن عبداللہؓ بن عمرؓ بن الخطاب وعرف الناس انها قدم جده عمرؓ بن الخطاب۔

مختصر تذکرة القرطبی ۔ ص ۴۰۔

کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی درمیانی مدت کا تھا اس سلسلہ میں مورخین سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے عہد خلافت میں مدینہ طیبہ میں نہر نکالنے کا ارادہ فرمایا تو اس کی گزرگاہ حسن اتفاق قبرستان احد کے درمیان تھی لہذا انہوں نے اعلان کر دیا کہ لوگ اپنے اپنے مردے یہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ دفن کر دیں جب مردے اس غرض کے لیے نکالے گئے تو بالکل اپنی اصلی حالت پر تر و تازہ معلوم ہوتے تھے حتیٰ کہ کھودنے میں کدال حضرت حمزہؓ کے پیر میں جا لگی تو اسی وقت اس سے خون جاری ہو گیا۔ یہ واقعہ احد سے پچاس سال بعد کا ہے۔

اس کے علاوہ عام اہل مدینہ اس واقعہ کے ناقل ہیں کہ ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی جانب والی دیوار خشکی کی وجہ سے گر گئی تو ایک قدم نظر آیا جس کے متعلق لوگ پریشان ہوئے مبادا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم ہو یہاں تک کہ سالم بن عبداللہؓ نے آ کر اس کو پہچانا اور کہا یہ تو میرے دادا حضرت عمرؓ کا قدم ہے

مختصر تذکرہ قرطبی ۔ ص ۴۰۔

فِی قُبُوْرِہِمْ یُصَلُّوْنَ رواہ ابو یعلی والبزار قال الھیثمی ورجال ابی یعلی ثقات کما فی المجمع وعزاہ السھیلی فی المسند کما فی الروض وقال انفرد بہ ثابت البنانی عن انس وقد روی ان ثابتا القبر فی قبرہ بعد ما دفن فلم یوجد فذکر ذلک لبنتہ فقالت کان یصلی فلم تروہ لان کنت اسمعہ اذا تہجد باللیل یقول اللھم اجعلنی ممن یصلی فی قبرہ بعد الموت۔ وقد صنف البیھقی فی حیاۃ الانبیاء رسالۃ مستقلۃ۔

۱۰۷۲۔ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکْثِرُوْا عَلَیَّ الصَّلٰوۃَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فَاِنَّہٗ یَوْمٌ مَشْہُوْدٌ تَشْہَدُہُ الْمَلَائِکَۃُ وَاِنَّ اَحَدًا لَا یُصَلِّیْ عَلَیَّ اِلَّا عُرِضَتْ عَلَیَّ صَلٰوتُہٗ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْہَا قَالَ قُلْتُ وَبَعْدَ الْمَوْتِ؟ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ فَنَبِیُّ اللّٰہِ حَیٌّ یُرْزَقُ۔ رواہ ابن ماجۃ قال السخاوی رجالہ ثقات لکنہ منقطع

۱۰۷۳۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ یُسَلِّمُ

قبروں میں نمازیں پڑھتے ہیں۔ ابو یعلی

۱۰۷۲۔ ابو الدرداء روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جمعہ کے دن مجھ پر کثرت کے ساتھ درود بھیجا کرو کیونکہ اس دن کا لقب مشہود ہے کیونکہ اس میں فرشتوں کی کثرت آمد ہوتی ہے اور جو شخص اس دن مجھ پر درود بھیجتا ہے اس کی درود جب تک وہ اس میں مشغول رہتا ہے میرے سامنے پیش ہوتی رہتی ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا موت کے بعد بھی؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالٰی نے زمین پر یہ بات حرام کردی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو گلا سڑا دے۔ لہذا خدا تعالٰی کا نبی زندہ ہی رہتا ہے اور اس کو رزق بھی دیا جاتا ہے۔ (ابن ماجہ)

۱۰۷۳۔ ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جب کوئی شخص مجھ

۱۰۷۲۔ اہل جنت کی حیات اور دائمی عبادات ذکر حدیث سے ثابت ہے۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی وفات کے بعد بھی عبادات اور نیک اعمال سے معطل نہیں رہتے بلکہ دوسروں کی درود بھی ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے ان کے جسموں کو زمین نقصان نہیں پہنچاتی اور ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ یہ جملہ صفات حیات کی صفات ہیں۔ اس لیے ان کی حیات اور عبادت اس عالم میں بھی اہل جنت کی حیات اور عبادت کی شان رکھتی ہے۔ لہذا جب اس مسئلہ پر غور کرنا ہو تو احادیث کی روشنی میں کرنا چاہیے یہاں صرف اتنی ہی باتوں کو سامنے رکھنا حیات کی حقیقت سمجھنے کے لیے کافی ہے اس سے زیادہ اپنی جانب سے محض قیاس آرائیاں کرنا بے وجہ عقائد کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ اور ان کی موت کو بالکل عام انسانوں جیسی موت سمجھنا بھی محققین علماء کے خلاف ہے جبکہ حدیث میں ان کے غسل، ان کے دفن، ان کی نماز، ان کے ترکہ اور ان کی بیویوں سے حرمت نکاح کے مسائل صاف صاف موجود ہیں تو ان کے حق میں بالکل عام موت کا عقیدہ رکھنا بھی کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

۱۰۷۳۔ اس مقام پر حافظ سیوطی نے اپنے فتاوی میں بڑی طویل بحث کی ہے اور لفظ "رد علی روحی" کے جملہ کی بہت مفصل

عَلَیَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰہُ عَلَیَّ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْہِ السَّلَامَ رواہ ابوداؤد

۴۰۷ا۔ عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ لِلّٰہِ مَلَائِکَۃً سَیَّاحِیْنَ فِی

کو سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور میری روح کو اس طرف متوجہ کر دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو جواب بھی دیتا ہوں (ابوداؤد)

۴۰۷ا۔ ابن مسعودؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے کچھ

شرح فرمائی ہے اور اس کی تقریر فرماتے ہوئے لکھا ہے:

ان قولہ ردّ اللہ علیّ روحی جملۃ حالیۃ وقاعدۃ العربیۃ ان جملۃ الحال اذا وقعت فعلاً ماضیاً قدّرت فیہ قد کقولہ تعالیٰ او جاؤکم حصرت صدورہم ای قد حصرت.... ولو اخذ بمعنی الحال اوالاستقبال لزم تکررہ عند تکرر سلام المسلمین.... ثم بعد ذٰلک رأیت الحدیث المسئول عنہ مخرجاً فی کتاب حیاۃ الانبیاء للبیہقی بلفظ الا وقد ردّ اللہ علیّ روحی فہو اقوی الاجوبۃ عندی ومراد الحدیث علیہا الاخبار بان اللہ ردّ الیہ روحہ بعد الموت فصیر حیاً علی الدوام حتی لو سلّم علیہ احد ردّ علیہ السلام لوجود الحیات ص ۱۴۳ ج ۲ من الفتاوی وقال حیاۃ النبی فی قبرہ وسائر الانبیاء معلومۃ عندنا علماً قطعیاً لما قام عندنا من الادلۃ فی ذٰلک وتواترت بہ الاخبار وقد الف البیہقی جزء فی حیاۃ الانبیاء فی قبورہم.... ونقل ومن کتاب الاعتقاد الانبیاء علیہم السلام بعدما قبضوا ردت الیہم ارواحہم فہم احیاء عند ربہم کالشہداء وقد افردنا لاثبات حیاتہم کتاباً وقد نقل عن القرطبی من تذکرتہ فی حیاتہم ان موتہم انما ہو راجع الی ان غیبوا عنا بحیث لا ندرکہم .... کالحال فی الملائکۃ۔ ص ۱۴۷، ج ۲۔

آپ کا فرمان "ردّ اللہ علیّ روحی" یہ جملہ حالیہ ہے اور عربی قاعدہ ہے کہ جملہ حالیہ جب فعل ماضی ہو تو وہاں لفظ "قد" مقدر رہتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول اَوْ جَاؤُکُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُہُمْ میں لفظ قد مقدر ہے اور مطلب یہ ہے کہ "قد حصرت" اگر یہاں آپ کے قول کے معنے ماضی کے بجائے حال یا استقبال کے لیے جائیں تو لازم آئیگا کہ ہر بار جب کوئی شخص آپ کو سلام کرے تو آپ کی روح کا بدن سے تعلق ہو اور ہر بار یہ تعلق پھر بدن سے جدا ہو کیے اس کے کچھ زمانہ کے بعد میں نے بیہقی کی کتاب حیات الانبیاء میں دیکھا انہوں نے ایک روایت ہی صراحۃً لفظ "قد" کے ساتھ پیش کی ہے اس لیے اب میرے نزدیک سب جوابوں سے یہی جواب زیادہ قوی ہے اور اس بناء پر حدیث کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وفات دینے کے بعد آپ کو پھر حیات دائمی عطا فرما دی ہے اس لیے جو شخص آپ کو اگر سلام کرتا ہے آپ خود اس کا جواب دیتے ہیں۔ غرض آپ کی اور جملہ انبیاء علیہم السلام کی قبر میں حیات کا دلائل کے ساتھ ہم کو قطعی علم ہے اور اس بارے میں تواتر کے درجہ کو حدیثیں پہنچ چکی ہیں امام بیہقی نے اس پر ایک مستقل تصنیف لکھی ہے اور اس میں یہ تصریح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح قبض کرنے کے بعد پھر واپس کردی جاتی ہیں اس لیے وہ شہداء کی طرح اپنے پروردگار کی حضوری میں زندہ رہتے ہیں۔ نیز امام قرطبی سے نقل کیا ہے کہ ان کی موت کا حاصل اتنا سمجھو کہ وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ کردیے گئے ہیں اور ان کا حال ایسا ہو گیا ہے جیسا فرشتوں کا ہم زندہ کا ادراک رکھتے ہیں نہ ان کا۔

۴۰۷ا۔ جو لوگ خود حاضر ہو کر آپ پر درود و سلام پیش کرتے ہیں وہ تو آپ بنفس نفیس خود سنتے ہیں اور جو دور سے درود و سلام پڑھتے ہیں اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے معین فرما دیے ہیں وہ اس کو آپ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہی طریقہ دنیا میں ہے اپنی موجودگی میں سلام کی سنت آپ خود ادا کرتے ہیں اور غائب ہو کر کسی دوسرے شخص کی معرفت اپنا سلام بھیجتے ہیں۔ چونکہ وفات کے بعد یہ طریقہ قائم نہیں رہ سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے اس خدمت کے لیے یہاں ملائکۃ اللہ مقرر فرما دیے ہیں جو اس خدمت کو انجام دیتے ہیں۔ اگر انبیاء علیہم السلام میں آثار حیات نہیں تو پھر

أَلَا رْضِ يُبَلِّغُوْنِي عَنْ أُمَّتِي السَّلَامَ ۔ اخرجہ احمد والنسائی والحاکم وصححہ والبیہقی فی الشعب والبزار واخرج ابن عدی عن ابن عباس مثلہ ۔ راجع ترجمان السنۃ ج ۳ حدیث

۱۰۷۵۔ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سِرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ فَمَرَرْنَا بِوَادٍ فَقَالَ اَيُّ وَادٍ هٰذَا قَالُوْا وَادِي الْاَزْرَقِ قَالَ كَاَنِّي اَنْظُرُ اِلٰى مُوْسٰى فَذَكَرَ مِنْ لَوْنِهٖ وَشَعْرِهٖ شَيْئًا وَاضِعًا اِصْبَعَيْهِ فِي اُذُنَيْهِ لَهٗ جُؤَارٌ اِلَى اللّٰهِ بِالتَّلْبِيَةِ مَارًّا بِهٰذَا الْوَادِي قَالَ ثُمَّ سِرْنَا حَتّٰى اَتَيْنَا عَلٰى ثَنِيَّةٍ قَالَ اَيُّ ثَنِيَّةٍ هٰذِهٖ قَالُوْا هَرْشٰى اَوْ لِفْتٌ فَقَالَ كَاَنِّي اَنْظُرُ اِلٰى يُوْنُسَ عَلٰى نَاقَةٍ حَمْرَاءَ عَلَيْهِ جُبَّةُ صُوْفٍ خِطَامُ نَاقَتِهٖ خُلْبَةٌ مَارًّا بِهٰذَا الْوَادِي مُلَبِّيًا ۔ رواہ مسلم

فرشتے مقرر فرما دیے ہیں جو زمین پر گشت لگاتے رہتے ہیں اور میری امت کا سلام میرے پاس پہنچاتے ہیں۔ (احمد، نسائی، مستدرک حاکم، بیہقی۔ ابن عدی)

۱۰۷۵۔ ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم مکہ اور مدینہ کے درمیان سفر کر رہے تھے۔ اس وقت آپ نے پوچھا اس وادی کا کیا نام ہے۔ لوگوں نے عرض کیا "وادی ازرق" ہے۔ آپ نے فرمایا گویا میں اپنی آنکھوں سے یہاں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ فرما کر آپ نے ان کا رنگ اور بالوں کا کچھ نقشہ بیان فرمایا کہ وہ اپنی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کانوں میں دیے ہوئے ہیں اور اپنے رب کے نام کا تلبیہ زور زور سے پڑھتے ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں۔ راوی بیان کرتا ہے پھر ہم چلتے رہے یہاں تک کہ ایک گھاٹی اور آئی آپ نے پوچھا اس گھاٹی کا کیا نام ہے لوگوں نے عرض کیا "ہرشیٰ یا لفت" کہا۔ آپ نے فرمایا گویا میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ یونس علیہ السلام ایک سرخ اونٹنی پر ہیں ان کا جبہ اون کا ہے اور اس اونٹنی کی مہار درخت کی چھال کی ہے وہ تلبیہ پڑھتے ہوئے اس وادی سے گذر رہے ہیں۔ (مسلم شریف)

یہ کس لیے ہوتا ہے۔ اور اگر یہاں حضور و غیبت کا کچھ فرق نہیں تو پھر فرشتوں کا یہ تقرر کس لیے ہے۔ اس لیے نہ یہ صحیح ہے کہ ان کی حیات کو عام لوگوں کی حیات کے برابر سمجھا جائے اور نہ اس کو بڑھاتے بڑھاتے اتنے مبالغہ کی ضرورت ہے کہ العیاذ باللہ حاضر و ناظر کی صفت ان کے لیے ثابت کر دی جائے۔ دین میں افراط و تفریط کی گنجائش کہیں نہیں اعتدال کا راستہ یہی صراط مستقیم ہے۔ فاتبعوہ۔ اس جگہ ترجمان السنۃ ج ۲ حدیث کا تشریحی نوٹ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۰۷۵۔ ان احادیث صحیحہ سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع کیا ہوتی ہے۔ ان کی موت کیا عام بشری کی موت کی طرح ہے یا جس طرح وہ بحالت حیات حج و نماز میں مشغول رہا کرتے تھے اسی طرح وہ اپنی وفات کے بعد بھی ان میں مشغول رہتے ہیں پھر یہ ظاہر ہے کہ یہ بالکل بیداری کا ایک مشاہدہ تھا اور اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مبارک ہستیوں کو دیکھا تھا۔ لہذا یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کا بحالت بیداری بھی مشاہدہ ہو سکتا ہے اس بنا پر اگر اولیا کرام اپنی بیداری کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ نقل کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس کا انکار کر دیں۔ جن علماء نے بحالت بیداری آپ کے مشاہدہ کا انکار کر دیا ہے ہماری رائے یہاں ان کے ساتھ متفق نہیں ہے۔ اس سے زیادہ تفصیل آئندہ مذکور ہوگی۔

۱۰۷۶۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ حَجَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اَتٰی وَادِیْ عُسْفَانَ قَالَ یَا اَبَا بَکْرٍ اَیُّ وَادٍ ھٰذَا قَالَ ھٰذَا وَادِیْ عُسْفَانَ قَالَ لَقَدْ مَرَّ بِھٰذَا الْوَادِیْ نُوْحٌ وَھُوْدٌ وَاِبْرَاھِیْمُ عَلٰی بَکَرَاتٍ لَھُمْ حُمْرٍ خُطُمُھُمُ اللِّیْفُ اُزُرُھُمُ الْعَبَاءُ وَاَرْدِیَتُھُمُ النِّمَارُ یَحُجُّوْنَ الْبَیْتَ الْعَتِیْقَ (رواہ الحافظ ابویعلی) قال الحافظ ابن کثیر فی البدایۃ فیہ غرابۃ ص۱۱۹ ج۱ واخرجہ عن مسند الامام احمد عن ابن عباس بنحوہ وفیہ ذکر ھود وصالح علیھما السلام ولیس فیہ ذکر نوح وابراھیم علیھما السلام وقال ھذا اسناد حسن کما فی البدایۃ ص۱۳۸

۱۰۷۷۔ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ قَالَ لَمَّا کَانَ اَیَّامَ الْحَرَّۃِ لَمْ یُؤَذَّنْ فِیْ مَسْجِدِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثًا وَلَمْ یُقَمْ وَلَمْ یَبْرَحْ سَعِیْدُ بْنُ الْمُسَیَّبِ الْمَسْجِدَ وَکَانَ لَا یَعْرِفُ وَقْتَ الصَّلٰوۃِ اِلَّا بِھَمْھَمَۃٍ یَسْمَعُھَا مِنْ قَبْرِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ رواہ الدارمی۔

۱۰۷۸۔ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ قَالَ لَمْ اَزَلْ اَسْمَعُ الْاَذَانَ وَالْاِقَامَۃَ فِیْ قَبْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیَّامَ الْحَرَّۃِ حَتّٰی عَادَ النَّاسُ۔ کذا فی الخصائص ص۲۸۱ ج۲

۱۰۷۹۔ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ قَالَ لَقَدْ رَاَیْتُنِیْ لَیَالِیَ الْحَرَّۃِ وَمَا فِیْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ

۱۰۷۶۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا جب آپ وادی عسفان میں پہنچے تو فرمایا ابوبکر! اس وادی کا کیا نام ہے؟ انہوں نے عرض کی اس کا نام وادی عسفان ہے آپ نے فرمایا اس وادی سے حضرت نوح ہود اور حضرت ابراہیم علیہم السلام گزرے جو سرخ اونٹوں پر سوار تھے ان کی مہاریں کھجور کی چھال کی ان کی لنگیاں عبا اور ان کی چادریں اون کی تھیں، خدا تعالیٰ کے قدیم بیت کا طواف کرنے جا رہے تھے۔ (ابویعلی، والطبرانی و مسند امام احمد)

۱۰۷۷۔ سعید بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ جب حرہ کا واقعہ پیش آیا ہے تو تین دن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں اذان نہیں دی گئی اور سعید بن مسیب ان ایام میں بھی مسجد سے نہیں نکلے اور نماز کے اوقات صرف ایک گنگناہٹ کی آواز سے پہچانا کرتے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے سنا کرتے تھے۔

۱۰۷۸۔ سعید بن المسیب بیان کرتے ہیں کہ جنگ حرہ کے زمانہ میں اذان اور اقامت ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے سنا کرتا تھا یہاں تک کہ لوگ پھر مسجد میں آنے لگے تھے (خصائص الکبریٰ)

۱۰۷۹۔ سعید بن المسیب فرماتے ہیں کہ جنگ حرہ کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد شریف

۱۰۷۹۔ جنگ حرہ کا واقعہ تاریخی واقعہ ہے۔ حدیثوں میں اس کے متعلق پہلے پیشگوئی موجود تھی جس طرح اس کی ہولناکی کا نقشہ حدیثوں میں کھینچا گیا تھا اپنے وقت پر ٹھیک وہ اسی طرح نکلا۔ جہاں مخلوق خدا کا خون پانی کی طرح بہا پھر رہا ہو وہاں مسجد شریف میں حاضری کی ہمت کسے تھی مگر سعید بن المسیب خود بھی اور سعید بن عبدالعزیز بھی ان کے متعلق

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرِي وَمَا يَأْتِي وَقْتُ صَلٰوةٍ إِلَّا سَمِعْتُ الْأَذَانَ مِنَ الْقَبْرِ. رواه ابونعيم كذا في الخصائص - ص ۲۸۰ - ج ۲ -

۱۰۸۰ - عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهِ. رواه مسلم -

مِنْهَا مَا يَتَعَلَّقُ بِفُضَلَاتِهِمْ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

۱۰۸۱ - عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنِّي أَرَاكَ تَدْخُلُ الْخَلَاءَ ثُمَّ يَجِيءُ الَّذِي

میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا جب نماز کا وقت آتا تو میں ہر نماز کے لیے قبر مبارک سے اذان کی آواز سنا کرتا۔ (ابونعیم)

۱۰۸۰ - حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے بیٹھتے ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ (مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمانی فضلات میں اہلِ جنت سے مشابہت

۱۰۸۱ - حضرت عائشہؓ سے - بیان فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں دیکھا کرتی ہوں کہ آپ

بیان کرتے ہیں کہ یہ مرد خدا اس حالت میں بھی مسجد شریف سے جدا نہ رہے۔ اور برابر نمازیں اپنے وقت پر وہیں ادا کرتے رہے۔ یہاں یہ سوال طبعاً پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں نماز کے اوقات کے معلوم ہونے کا ذریعہ کیا تھا۔ یہ صاحب واقعہ کا خود اپنا بیان ہے کہ وہ قبر مبارک سے اذان سنا کرتے تھے اور اسی پر اپنی نماز ادا کر لیتے تھے۔ کئی دن تک مسلسل ٹھیک اوقات پر اذان کی آواز سننا اور ان کے بعد پھر فوراً اس آواز کا منقطع ہو جانا کسی وہم و خیال پر مبنی نہیں ہو سکتا۔

۱۰۸۰ - اس حدیث کی شرح میں مختلف اقوال ہیں لیکن سب سے صحیح بات وہ ہوگی جس کی واقعات بھی شہادت دیں۔ کتاب الدعوات اور کتاب الاذکار کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیل و نہار میں جتنے مختلف حالات پیش آتے تھے آپ ہر جدید حالت پر حق تعالیٰ کی جدید طور پر یاد تازہ فرمایا کرتے تھے مثلاً صبح ہوتی تو آپ کے کلمات جدا ہوتے شام ہوتی تو جدا ہوتے، قضاء حاجت کے لیے تشریف لیجاتے تو تعوذ کے خاص کلمات پڑھتے اور جب فارغ ہو کر باہر تشریف لاتے تو خاص انداز کا شکر ادا فرماتے۔ اسی طرح کھانے پینے، سونے جاگنے، گھر میں داخل ہونے اور گھر سے نکلنے غرضکہ انسانی زندگی کے جتنے مختلف شعبے ہیں سب کے متعلق آپ کے مقدس کلمات حدیثوں میں مدوّن موجود ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی شریعت میں ایک باب ایسا بھی ملتا ہے کہ اگر انسان اس پر مداومت کے ساتھ عمل پیرا رہے تو اس کی نیند بھی عبادت میں شمار ہو جاتی ہے پھر کچھ کلمات ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کو پڑھ لیا جائے تو اگر مخصوص اوقات کے اذکار کی ادائیگی میں غفلت ہو جائے تو ان کے پڑھنے سے اس کی بھی تلافی ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان کی تمام زندگی گویا ذکر اللہ ہی میں شمار ہونے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک حالت میں بھی گو آپ کی زبان مبارک سے مختلف اذکار ثابت ہوتے ہیں مگر بظاہر حدیث کی مراد وہی مختلف حالات ہیں جو انسانی زندگی میں مختلف طور پر پیش آتے ہیں۔ اہل جنت کی جنت میں یہی صفت ہوگی۔ وہ بھی ہمہ وقت خدا تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مشغول رہیں گے۔ انبیاء علیہم السلام میں دوام ذکر کی یہ صفت اسی عالم میں موجود ہوتی ہے۔ پھر وہ اپنی امت کو بھی اس صفت کے پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ فاذکروا اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبکم میں انسان کے ان ہی مختلف احوال کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ حدیث مذکور اسی قسم کی آیتوں کی شرح سمجھنی چاہیے۔

بَعْدَكَ فَلَا يَرىٰ لِمَا يَخْرُجُ مِنْكَ اَثَرًا فَقَالَ يَا عَائِشَةُ

بیت الخلاء میں تشریف لیجاتے ہیں پھر وہاں سے واپس آتے ہیں اس کے بعد جو شخص آپ کے بعد جاتا ہے وہ آپ کے

۱۰۸۱- انسانی فضلات میں اس کے بول و براز کا درجہ سب سے گرا ہوا ہے مگر اس میں بھی انسانی غذا اور اس کی جسمانی صحت کے فرق سے کیفیات کا بلکہ مقدار کا بھی بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام بھی اس بشری صنف سے مستثنیٰ نہیں ہوتے مگر چونکہ ان کے جسمانی خواص عام انسانوں سے کہیں بالاتر ہوتے ہیں، چنانچہ ان کے جسم اور جسم کا پسینہ خوشبودار ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ ان کے یہ فضلات بھی بعض احکام میں عام انسانوں سے ممتاز ہوں۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فضلات کو زمین فوراً جذب کر لیتی تھی۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں اس لیے اگر کہیں غذا کی مادیت حائل نہ ہو جاتی تو یہ بھی ممکن تھا کہ اہل جنت کی طرح آپ کی غذاؤں کا فضلہ بھی محض پسینہ کی راہ سے خارج ہو جاتا۔ شیخ بدر الدین عینی نے صحیح بخاری کی شرح میں حنفیہ کی طرف اور شیخ جلال الدین سیوطی ؒ نے بعض کبار علماء کی طرف آپ کے فضلات کے متعلق طہارت کا قول بھی نقل کیا ہے۔

حدیث مذکور کا روایتی پہلو گو کمزور ہے مگر یہ مسئلہ کوئی عقائد یا عمل کا مسئلہ تو نہیں جس کے متعلق اعلیٰ درجہ کی صحت درکار ہو صرف ایک فضیلت کا باب ہے اور وہ بھی زندگی کے ایک ایسے شعبہ سے متعلق ہے جس کی عوام کو اطلاع نہیں ہو سکتی۔ نیز ان امور تبلیغیہ میں داخل بھی نہیں ہے جن کا تعلق امت کے ساتھ وابستہ ہو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ذاتی خصوصیت ہے جس پر ایمان لانے کی کسی کو دعوت بھی نہیں دی گئی ہے۔ پس اگر آپ کی مخصوص حیات کا کوئی مستور گوشہ ضعیف اسناد کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے تو اسی درجہ میں اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، ظاہر ہے کہ یہاں اگرچہ ثبوت ضعیف ہے مگر اس کے خلاف کوئی ضعیف سے ضعیف دلیل بھی موجود نہیں ہے نہ اس امر کے تسلیم کر لینے میں کسی عقیدہ پر کوئی زد پڑتی ہے پھر وہ علماء اور محدثین کے درمیان ہمیشہ نقل بھی ہوتا چلا آیا ہے حتیٰ کہ بعض ائمہ اس کے طہارت کے بھی قائل ہو چکے ہیں ان وجوہات کی بناء پر یہاں قطعیت کے ساتھ اس کا انکار کر ڈالنا قطعاً بے احتیاطی ہے۔

جامع ترمذی میں بہت سے ابواب کے تحت ایسی حدیثیں ذکر کی گئی ہیں جن پر امام موصوف نے خود ضعف کا حکم لگایا ہے اگرچہ وہ دوسری کتب حدیث میں اچھی اسانید کے ساتھ بھی مل جاتی ہیں لیکن امام موصوف نے اسی ضعیف اسناد کو ذکر فرما کر اس پر عمل کرنے والے صحابہ و تابعین کے اسماء گرامی کی ایک ایک فہرست پیش کر دی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ بعض مرتبہ حدیث کا اسنادی پہلو کسی خاص سبب کی بناء پر گو ضعیف ہوتا ہے مگر وہاں خارجی قرائن اور متواتر عمل یا دوسری وجوہات کی بناء پر اس کی اصلیت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اعلیٰ درجہ کی اسنادی ثبوت نہ ملنے کے باوجود پھر وہ کسی مرتبہ میں معمول بہ رہتی ہے، حتیٰ کہ شیخ ابن ہمام ؒ نے باب الصلوٰۃ علی المیت کے آخر میں تحریر فرمایا ہے کہ الاستحباب یثبت بالحدیث الضعیف غیر الموضوع (ص ۴۶۳ ج ۲ فتح القدیر) یعنی اگر حدیث موضوع نہ ہو تو کبھی ضعیف حدیث سے بھی استحباب ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ دلیل اگر ضعیف ہوتی ہے تو اس کا اثر بھی ضعیف ہی رہتا ہے، فرائض اور واجبات اس سے ثابت نہیں ہو سکتے یہ بھی اس وقت۔ جبکہ خارجی قرائن اس کی تائید میں ہوں، لیکن اگر خارجی قرائن ساتھ نہ دیں اور ضعف بھی شدید ہو تو پھر وہ حدیث معطل ہو جاتی ہے، یعنی اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا، اور اگر اس کے خلاف ثبوت موجود ہے تو پھر اس کو رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ حافظ ابن القیم ؒ نے امام احمد ؒ کے نزدیک ایک اصل ہی حدیث ضعیف پر عمل کرنا قرار دی ہے، بشرطیکہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری حدیث نہ ہو اور امام ابوحنیفہ ؒ اور امام شافعی ؒ کا مسلک بھی یہی قرار دیا ہے۔ دیکھو اعلام الموقعین۔ ص ۲۵ ج ۱ [1]

[1] (حاشیہ بر صفحہ ۳۰۰ ملاحظہ فرمائیے)

أَمَا عَلِمْتِ أَنَّ اللّٰهَ أَمَرَ الْأَرْضَ أَنْ تَبْتَلِعَ مَا خَرَجَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ

فضلہ کا کوئی نشان تک نہیں پاتا۔ آپ نے فرمایا عائشہ! کیا تم نہیں جانتیں اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے خارج شدہ فضلہ کو جذب کرلے۔

مزید وضاحت کے لیے ہم آپ کے سامنے بعض مسائل پیش کرتے ہیں جن میں نقل کی بہت قلت نظر آتی ہے مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے مسائل چونکہ یہ مسائل بھی وقتی اور خاص آپ کی ذات سے متعلق تھے ادھر جہاد کے معرکے ہر وقت گرم رہا کرتے تھے ان سے فرصت ملی تو تازہ تازہ احکام اتر رہے تھے اس لیے عام صحابہ کے افکار اس طرف متوجہ نہ ہوسکے جب یہ حادثہ جانکاہ رونما ہوا تو اب آپ کے غسل، صلوٰۃ جنازہ، اور دفن کے خصوصی مسائل سامنے آگئے آخر رفیق غار صدیق اکبرؓ نے اس طرف راہبری کی اور فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دفن کے لیے سب سے پسندیدہ مقام وہی ہوتا ہے جہاں اُن کی وفات ہوتی ہے کسی بحث کے بغیر سب نے فوراً اسی وقت اس پر عمل کرلیا اور کسی نے خلاف کی ایک آواز بھی نہیں نکالی۔ اسی طرح ایک غیبی آواز پر غسل کے وقت آپ کی قمیص جسم اطہر سے نہیں اُتاری گئی اور قبر کی نوعیت کا فیصلہ بھی قدرت کے فیصلہ پر چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ جب لحد کھودنے والا شخص پہلے آگیا تو سب کی رائے بھی قائم ہوگئی کہ آپ کے حق میں قدرت کو لحد ہی پسند ہے۔ اس کے برخلاف وہ مسائل تھے جن کا تعلق عام اُمت کے ساتھ تھا وہاں خوب گرم و نرم بحثیں ہوئیں اور جب کوئی فیصلہ نہ ہوسکا تو ہر شخص اپنی رائے پر مختار چھوڑ دیا جاتا یہی راز تھا کہ مسائل صلوٰۃ اس قدر تبصرہ کے باوجود بعض جگہ مختلف فیہا باقی چلے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فضلات کا مسئلہ تو آپ کی ان خصوصیات میں سے تھا جس کا امت کے ساتھ کسی لحاظ سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر حضرت عائشہؓ اپنی فطری ذہانت اور دانائی کی بنا پر اس طرف توجہ نہ فرماتیں تو شاید آپ کی اس خصوصیت کا تذکرہ کسی ضعیف حدیث میں بھی آپ کے سامنے نہ آتا۔ آپ کے سایہ نہ ہونے کا مسئلہ اس سے ذرا مختلف ہے کیونکہ یہ ہمہ وقت سب کی آنکھوں کے سامنے تھا عقل یہ باور نہیں کرتی کہ اگر صحابۂ کرامؓ نے آپ کی اس فضیلت کو ہمہ وقت اپنی آنکھوں کے سامنے درخشاں دیکھا ہوتا تو وہ اس کے بیان سے سکوت اختیار کرسکتے تھے یقیناً وہ بھی آپ کے جسم اور آپ کے پسینہ کی خوشبو کی طرح روایات و حکایات میں مہک اٹھتا۔ آپ کے قد و قامت کی غیر معمولی صفت بھی چونکہ سب کی آنکھوں کے سامنے تھی اس لیے عام طور پر یہ چرچا رہا کرتا تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت بھی کتنی عجیب ہے کہ جب تنہا ہوتے ہیں تو نہایت میانہ قد نظر آتے ہیں اور جہاں مجمع میں آگئے تو یوں معلوم ہونے لگا کہ سب سے دراز قامت آپ ہی ہیں۔ آپ کے ہول و جواز کا معاملہ ایسا نہیں ہے اس لیے اگر محدثین اس کو نقل کرتے ہیں تو اس کو مان لینا آپ کی محبت کا تقاضا ہونا چاہیے۔ اس کا بلند آہنگی سے انکار آپ کی محبت کا ثبوت تو نہیں مگر آپ کی بے علمی کا ثبوت ضرور ہے۔

اس جگہ حافظ ابن تیمیہؒ نے ایک بہت مفید تنبیہ فرمائی ہے جو اس قسم کے مواضع میں محدثین کا نظریہ سمجھنے کے لیے

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) الاصل الرابع الاخذ بالمرسل والحدیث الضعیف اذا لم یکن فی الباب شیء یدفعہ وھو الذی رجحہ علی القیاس ولیس المراد بالضعیف الباطل ولا المنکر ولا فی روایۃ من ھو متہم بحیث لا یسوغ الذھاب الیہ ولیس احد من الائمۃ الا وھو موافقہ علی ھذا الاصل۔ اعلام الموقعین (اعلام الموافقین) ص۲۵ و ص۲۶ یہاں حافظ ابن تیمیہؒ نے اور ان کی اتباع میں بعض علماء نے جو تاویل کی ہے اس کی تصدیق خود امام احمدؒ کے مسند سے نہیں ہوتی اس لیے ہمارے نزدیک امام کے مختار کی وہ تاویل قرار نہیں دی جاسکتی ہاں خود ان کا اپنا مسلک وہ ہو تو ہو۔

رواہ السیوطی فی الخصائص الکبریٰ من سبع طرق وقال ھذا من اقویہا ونقل عن ابن دحیۃ انہ سند ثابت وفی طرقہ انا معاشر الانبیاء تنبت اجسادنا علی ارواح اھل الجنۃ واعلم

نہایت اہم ہے :-

الخبران قام دلیل علی صدقہ او کذبہ والابقی مالم نصدقہ ولم نکذبہ واہل العلم بالحدیث اذ قالوا ہذا الحدیث رواہ فلان وہو مجروح او ضعیف او سیئ الحفظ او ممن لا تقبل روایتہ ونحو ذلک فہو کقول القائل ہذا الشاہد مجروح او سیئ الحفظ او ممالم تقبل شہادتہ وہذا یفید انہ لا یحکم بہ ولا یفید الحکم بانہ کاذب بل قد یمکن انہ صادق فلا یقال انہ کاذب لا بحجۃ وان قالوا فی الحدیث انہ ضعیف فہذا مرادہم انہ لم یثبت ولا یحتج بہ ولا یجوز الحکم بصدقہ لیس مرادہم انہ بمجرد ذلک یحکم بکذب الناقل وینفی ما نقلہ ویقول ان ہذا لم یکن من غیر علم منا بہذا المنفی بل ان قام دلیل علی انتفاء ما اخبر بہ حکمنا بذلک والا سکتنا لم ننفہ ولم نثبتہ فہذا اصل یجب معرفتہ فان کثیرا من الناس لا یمیز بین ما ینفیہ لقیام الدلیل علی نفیہ وبین مالم یثبتہ لعدم دلیل اثباتہ بل تراہم ینفون ما لم یعلموا اثباتہ فیکونون قد قفوا مالیس لہم بہ علم وقالوا بافواھہم مالیس لہم بہ علم۔

(الجواب الصحیح ص ۲۹۶ ج ۴)

کسی خبر کے صدق و کذب کا اگر ثبوت مل جائے جب تو اس پر صادق یا کاذب ہونے کا حکم لگا دینا صحیح ہے ورنہ ہم اس کی نہ تصدیق کرینگے نہ تکذیب۔ محدثین جب کسی حدیث کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس کو فلاں شخص نے روایت کیا ہے اور وہ مجروح یا ضعیف ہے تو اس کا مطلب ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کوئی شخص یہ کہے کہ یہ شاہد مجروح یا ضعیف ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس جرح کی وجہ سے اس پر کاذب ہونے کا حکم لگا دیا گیا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ نفس الامر میں صادق ہو۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس کو صادق نہیں کہا جائیگا اور بس اب رہا یہ کہ اس کو کاذب بھی کہہ دیا جائے تو یہ حکم کسی دلیل کے بغیر لگانا صحیح نہیں ہے ایسا ہی جب کسی حدیث کے متعلق محدثین کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے تو ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ اس پر صدق کا حکم نہیں لگایا جا سکتا اس کی یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ بس صرف اتنی بات سے اس کے راوی پر کذب کا حکم لگا دیا جائے یا جو مضمون اس نے نقل کیا ہے اس کی نفی کر دی جائے اگرچہ اس کی نفی کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل بھی نہ ہو لہٰذا اس قسم کے مقامات پر ہم سکوت کرینگے نہ اس کا اثبات کرینگے اور نہ نفی۔ اس قاعدہ کو یاد رکھنا اور اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کیونکہ بہت سے لوگ کسی بات کی مطلقاً نفی کرتے ہیں اور بے دلیل بات پر ثبوت کا حکم نہ لگانے میں کوئی فرق ہی نہیں کرتے اور ہر ایسی بات کی نفی کر ڈالتے ہیں جس کا ثبوت ان کے علم میں نہیں ہوتا اور لا تقف مالیس لک بہ علم کا خلاف کرتے ہیں۔

ثم قال وما کان من الامور مستلزما لوازم لو کان موجودا فانہ یستدل بانتفاء اللازم علی انتفاء الملزوم کالامور التی لو کانت موجودۃ لوجب ان ینقل نقلاً متواتراً شائعاً کما لو قال قائل انہ بنی بین العراق والشام مدینۃ اعظم من بغداد والموصل ..... ونحو ذلک فانہ یعلم کذبہ فان ہذا مما تتوفر ہمم

اس کے بعد لکھتے فرماتے ہیں کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ موجود ہوں تو یقینی طور پر ان کے یہ لوازم ہونگے اس قسم کے مقام پر اگر یہ لوازم موجود نظر نہ آئیں تو ملزوم کے نہ ہونے کا بھی حکم لگانا صحیح ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ عراق اور شام کے درمیان بغداد اور موصل سے بھی بڑا ایک اور شہر ہے اب ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً لوگ اس کو نقل کرتے۔ اس کے

ان الحديث الضعيف اذا لم يكن مخالفا لنص او حديث صحيح او عقيدة مجمعة عليها ولم يكن يتعلق بامر كثير الوقوع ويكون من خصوص الاحوال التي لا يطلع عليها احد فانه لا حيلة لرده سيما

الناس على نقله لو كان موجودا۔

الجواب الصحيح ص ۲۹۷ ج ۴

ثم قال.. ثم هذه اللوازم منها جلي ومنها خفي بعزه المصنعة فلهذا كان اهل العلم باحوال الرسول يقطعون بكذب احاديث لا يقطع غيرهم بكذبها لعلمهم بلوازم تلك الاحاديث وانتفاء لوازمها..... وكذا يعلمون ان فلانا اخطأ في هذا الحديث على فلان لانهم قد علموا من وجوه ثابتة ان ذلك الحديث انما رواه على صورة معينة فاذا روى غير الثقة ما يناقض ذلك علموا بطلان ذلك وانه اخطأ او تعمد الكذب (ص ۲۹۸، ۲۹۹ ج ۴)

فالصدق له دلائل مستلزمة له تدل على الصدق والكذب له دلائل مستلزمة له تدل على الكذب ..... وما لم يعلم صدقه ولا كذبه ولا ثبوته ولا انتفاؤه فانه يجب الامساك عنه فيقول القائل هذا لم اعلمه ولم يثبت عندي ولا اجزم به ولا احكم به ولا استدل به ولا احتج به ولا ابني عليه مذهبي واعتقادي وعملي ونحو ذلك۔ لا يقول هذا اقطع بكذبه وانتفائه... فالقطع بجهل شبهة المتقدمة غير القطع بانتفائه فمن قطع بشئ بلا دليل يوجب القطع قطعنا بجهله وضلاله وخطأه۔ (الجواب الصحيح ص ۳۰۰ ج ۴)

باوجود جب ایک شخص بھی ان دونوں شہروں کے درمیان اتنی بڑی بستی کا وجود بیان نہیں کرتا تو اس کے غلط ہونے کا حکم لگا دینا بالکل صحیح ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ یہ لوازم کبھی تو بالکل واضح ہوتے ہیں اور کبھی دقیق ہوتے ہیں جن کو خاص خاص لوگ ہی جانتے ہیں ہر شخص ان کو نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حدیثوں پر محدثین تو قطعی طور پر کذب کا حکم لگا دیتے ہیں مگر جو ان دقیق لوازم کو نہیں پہچانتا وہ یہ قطعی حکم نہیں لگاتا.... اسی طرح محدثین یہ بھی جانتے ہیں کہ اس حدیث میں فلاں شخص نے فلاں موقعہ میں غلطی کی ہے کیونکہ ان کو مستند طریقوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حدیث دراصل اس خاص صورت پر روایت کی گئی ہے لہذا جب کوئی غیر ثقہ راوی اس کے خلاف روایت کرتا ہے تو وہ اس کے بطلان کا حکم لگا دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس بات کے صدق یا کذب کی دلیل معلوم نہ ہو اس کے متعلق بس اتنا ہی کہنا مناسب ہے کہ میں اس کو نہیں جانتا یا میرے علم میں یہ بات ثابت نہیں ہوئی یا مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہنا کہ مجھے اس کے ثبوت کا یقین حاصل نہیں ہو سکا اور بات ہے اور یہ کہنا کہ اس کے نہ ہونے کا مجھ کو یقین حاصل ہے بالکل اور بات ہے۔ لہذا جو شخص دلیل کے بغیر کسی ایک بات کا حکم بھی قطعیت کے ساتھ لگائیگا ہم بھی اس پر قطعیت کے ساتھ جہل کا حکم لگا دینگے۔

لا يجوز للانسان ان ينفي علم غيره وقطع غيره من غير علم منه بالاسباب التي يعلم بها ذلك فانه كثيرا ما يكون للانسان دلائل كثيرة تدل على صدق شخص معين وثبوت امر معين وان كان غيره لا يعرف شيئا من تلك الدلائل وهذا ايضا مما يغلط فيه كثير من الناس ينظرون في انفسهم ومبلغ علمهم فاذا لم يجدوا عندهم ما يوجب العلم بذلك الامر جعلوا غيرهم كذلك من غير علم منه

اسی طرح یہ بات بھی کسی شخص کے لیے درست نہیں کہ جب تک اس کو ان اسباب کا علم حاصل نہ ہو جائے جن سے کہ وہ خبر معلوم ہوئی ہو تو وہ دوسرے شخص کے علم کی نفی کر ڈالے۔ کیونکہ بسا اوقات کسی بات کے ثبوت کے لیے ایک شخص کے پاس بہت سے دلائل موجود ہوتے ہیں جن کو دوسرا شخص نہیں جانتا یہاں بھی یہی مصیبت ہے کہ بہت سے لوگوں کو جب خود ان اسباب کا علم نہیں ہوتا تو جس کو ان اسباب کا علم ہوتا ہے وہ اس کو بھی اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں اور اتنی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اتنی بات معلوم کر لیں کہ

اذا کان من باب الفضائل والمزایا اللازمۃ

بانتفاء اسباب العلم عند ذلک الغیر وقد یقیمون حججاً ضعیفۃ علی ان غیرہم لا یعلم ذلک. مثل ما یفعلہ کثیر من الناس بالنظر والاستدلال والاعتبار ومن لم یساویہم فی نظرہم وادلتہم وقوۃ اذہانہم لا یعلم ما علموہ، وکثیر من الناس یعلم بالاخبار والنقل والاستدلال بذلک امورا کثیرۃ ومن لم یشارکہم فیما سمعوہ وفیما عرفوہ من احوال المخبرین والمخبر بہ وکمال معرفتہم بذلک لا یعلم ما علموہ فلہذا کان لاہل النظر العقلی طرق لا یعرفہا اہل الاخبار ولاہل الاخبار السمعیۃ طرق لا تعرف بمجرد العقول ولہذا کان لہؤلاء من الطرق الدالۃ علی صدق الرسول ونبوتہ والاستدلال علی ذلک امور کثیرۃ لا یعرفہا اہل الحدیث والآثار وعند ہؤلاء من الاحادیث المتواترۃ عندہم والآثار المستفیضۃ عندہم ما یعلمون بہا صدق الرسول وان کان اولئک لا یعرفونہا بل طرق معرفۃ الصانع وتصدیق رسولہ قد یکون لکل قوم منہا طریق او طرق لا یعلمہا الآخرون وہم مشترکون فی الاقرار باللہ ورسولہ ..... بل ما تواتر عندہم من احوال الرسول قد یکون المخبرون لہؤلاء الذین تواتر عندہم ما اخبروہم بہ من آیاتہ وشرائعہ غیر المخبرین لاولئک کما کان الصحابۃ المخبرون لاہل الشام بآیات الرسول وبالقرآن وشرائع الاسلام غیر الصحابۃ المخبرین لاہل العراق ولکن خبر ہؤلاء یصدق خبر ہؤلاء وان کان کل من الطائفتین لا یعلم اعیان اولئک الذین اخبروا اولئک وعامۃ ما یعلمہ الناس بالحس ہو من ہذا الباب فان الانسان یحس باحوال نفسہ من جوعہ وعطشہ وشبعہ وریہ وحبہ وبغضہ وشہوتہ ونفرتہ والمہ ولذتہ بل یحس باعضائہ کبطنہ وفرجہ ولا یحس باحوال غیرہ ولکن یشترکان فی الجنس العام فیشترکان فی جنس الاحساس بجوعہم وشبعہم (ص ۳۰۲ و ۳۰۳، الجواب الصحیح جلد ۲)

اس خبر کے معلوم ہونے کے جو ذرائع اور اسباب ہیں وہ اس شخص کو معلوم ہیں یا نہیں۔ اگر معلوم ہیں تو اس کو لا علم کہنا کیونکر صحیح ہے چنانچہ بہت سے لوگوں کو دنیا کے واقعات اور اس کے بیان کرنے والوں کے وہ حالات معلوم نہیں ہوتے جو مورخین کو معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان واقعات کے علم کے جو اسباب ہیں ان کو مورخ تو جانتا ہے اور یہ نہیں جانتے اور جب ان اسباب ہی کو نہیں جانتے تو پھر ان کو ان واقعات کا علم کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل نظر و عقل کے بہت سے دلائل ایسے ہوتے ہیں جن کو مورخ نہیں جانتا اور محدثین کے بہت سے دلائل ایسے ہوتے ہیں جن کا علم صرف عقل سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہذا صداقت رسول کے بہت سے وہ دلائل جو اہل نظر کو معلوم ہوتے ہیں ان کا اہل حدیث کو کوئی علم نہیں ہوتا بہت سے ایسے واقعات جو اہل حدیث کے نزدیک تواتر کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں جن سے کہ صداقت رسول ثابت ہوتی ہے اُن کا اہل نظر کو کوئی علم نہیں ہوتا، یہاں کسی فریق کے لیے بھی یہ صحیح نہیں ہے کہ ان دلائل اور اسباب کے علم کے بغیر وہ اس خبر کا انکار کر ڈالے گا۔ گاہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ رسول کے ان احوال متواترہ کے بیان کرنے والے مختلف جماعتوں کے سامنے مختلف لوگ ہوتے ہیں، جیسا کہ وہ صحابہ جو اہل الشام کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے معجزات اور قرآن کریم اور دینی احکام کے ناقل تھے اور تھے اور وہ جو اہل عراق کے سامنے ناقل تھے اور تھے لیکن پھر ان دونوں جماعتوں کے بیانات ملتے جلتے تھے اور ایک دوسرے کے لیے مصدق تھے اگرچہ ان میں ایک جماعت کو دوسری جماعت کا کوئی علم نہ تھا۔ یہاں ان راویوں کا صرف کسی خبر میں مشترک ہو جانا کافی سمجھا جاتا ہے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس خبر کا بیان کرنے والا ایک ہی گروہ ہو تمام حسیات و وجدانیات کا حال یہی ہے ایک انسان اپنے حالات مثلاً بھوک، پیاس، محبت، عداوت اور تکلیف و لذت وغیرہ کا خود تو احساس رکھتا ہے مگر دوسروں کے ان حالات کا احساس نہیں رکھتا لیکن چونکہ وہ جنس علم میں ان کا شریک ہوتا ہے لہذا وہ دوسروں کے متعلق بھی یہ حکم لگا دیتا ہے کہ ان کو بھی ہماری طرح ان حالات کا احساس ہوتا ہے۔

۱۰۸۲- عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كُنْتُ أَسِيرُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اُدْنُ مِنِّيْ فَدَنَوْتُ مِنْهُ فَمَا شَمَمْتُ مِسْكًا وَّلَا عَنْبَرًا أَطْيَبَ مِنْ رِيْحِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رواه البزار كما في الخصائص۔ واخرج الشيخان نحوه۔

۱۰۸۳- عَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَسْلُكْ طَرِيْقًا فَيَتْبَعُهُ أَحَدٌ إِلَّا عَرَفَ أَنَّهُ قَدْ سَلَكَهُ مِنْ طِيْبِ عَرْفِهِ أَوْ قَالَ مِنْ رِيْحِ عَرَقِهِ۔ رواه الدارمي

۱۰۸۴- عَنْ أَنَسٍ قَالَ دَخَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِنْدَنَا فَعَرِقَ وَجَاءَتْ أُمِّيْ بِقَارُوْرَةٍ فَجَعَلَتْ تَسْلِتُ الْعَرَقَ فَاسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا أُمَّ سُلَيْمٍ مَا هٰذَا الَّذِيْ تَصْنَعِيْنَ قَالَتْ هٰذَا عَرَقُكَ نَجْعَلُهُ لِطِيْبِنَا وَهُوَ أَطْيَبُ

۱۰۸۲- معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا آپ نے فرمایا ذرا میرے قریب آنا میں قریب گیا تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سی خوشبو نہ تو مشک میں دیکھی نہ عنبر میں۔ (بزار)

۱۰۸۳- جابرؓ بیان کرتے ہیں جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی راستہ پر جاتے پھر آپ کے بعد کوئی دوسرا شخص اسی راستہ پر جاتا تو وہ ضرور پہچان لیتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر اس طرف سے ہوا ہے کیونکہ آپ کی خوشبو سے راستہ مہکا ہوا ہوتا تھا۔ (دارمی)

۱۰۸۴- انسؓ بیان فرماتے ہیں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے اور ایسا ہوا کہ دوپہر میں آپ نے ہمارے ہی گھر استراحت فرمائی آپ کو پسینہ آیا تو میری ماں ایک شیشی لائیں اور آپ کا پسینہ پونچھ پونچھ کر اس میں ڈالنے لگیں آپ بیدار ہو گئے اور پوچھا اے ام سلیم یہ کیا کر رہی ہو۔ انہوں نے عرض کیا یہ آپ کا پسینہ ہے ہم اپنے عطروں میں اس کو ملا لیتے ہیں اور یہ عطر ہمارے یہاں سب سے زیادہ خوشبودار

۱۰۸۲- حضرت معاذ بن جبلؓ یہاں آپ کے پسینہ کی ایک خصوصیت بیان فرماتے ہیں اور اس کو جس انداز سے نقل فرما رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف ان کی حسن عقیدت کی بات نہ تھی بلکہ سرتاسر حقیقت تھی آپ کے اس عطر پسینہ کا راوی ایک صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے اور صحابہ بھی ہیں پھر ہر ایک نے اس کو مختلف صورتوں اور مختلف محل پر اس طرح نقل کیا ہے جس سے آپ کے فضلات کی برتری کا اعتراف کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے اس کی چند مثالیں ذیل کی احادیث میں آپ کے سامنے ہیں۔

۱۰۸۳- دیکھیے یہاں راوی معاذؓ کی بجائے حضرت جابرؓ ہیں اور وہ آپ کی اس خوشبو کا حال استدلالی رنگ میں بیان فرماتے ہیں اور وہ بھی اس تاکید کے ساتھ کہ اس میں کسی خاص یا عام شخص کی کوئی بحث نہیں ہے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ آپ کے راستے سے جو شخص بھی گزرتا وہ آپ کی خوشبو کی وجہ سے یہ پہچان لیتا تھا کہ یہ آپ ہی کی مہک ہے۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ❖ کہے دیتی ہے خوشبو جسم و جان کی

۱۰۸۴- یہ آپ کی خوشبو کے بیان کا تیسرا انداز ہے اور اس سے بہت روشن طریق پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی یہ خوشبو اس کے

الطِّيبِ. رواه مسلم. وَفِي رِوَايَةٍ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ نَرْجُوْ بَرَكَتَهُ لِصِبْيَانِنَا قَالَ اَصَبْتِ وروى البخاري نحوه

۱۰۸۵۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الْاُوْلٰى ثُمَّ خَرَجَ اِلٰى اَهْلِهٖ وَخَرَجْتُ مَعَهٗ فَاسْتَقْبَلَهٗ وِلْدَانٌ فَجَعَلَ يَمْسَحُ خَدَّىْ اَحَدِهِمْ وَاحِدًا وَاحِدًا

ہو جاتا ہے۔ (مسلم شریف) ایک روایت میں اتنا اور ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا ہمیں امید ہے کہ اس کی برکت ہمارے بچوں کو بھی لگ جائے۔ آپ نے فرمایا تم نے درست کہا۔

۱۰۸۵۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی پھر آپ اپنے گھر کی طرف چلے تو میں بھی آپ کے ساتھ ہو لیا سامنے سے کچھ بچے آنکلے آپ نے ازراہ محبت ان سب کے

نہ تھی کہ آپ خوشبو کا استعمال زیادہ فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ یہ آپ کے ان فضلات کی ہی خوشبو تھی۔ ظاہر ہے کہ عرب میں جو خوشبوئیں مستعمل تھیں وہ بھی یقیناً بہتری ہوتی ہونگی مگر ان میں آپ کے پسینہ کے قطروں کو اس جانفشانی سے جمع کر کے ڈالنا اور یہ تصریح کرنا کہ ہمارے جس عطر میں آپ کا یہ عطر بیز پسینہ شامل ہو جاتا ہے وہ سب سے مہکدار اور عمدہ سمجھا جاتا ہے اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ راویوں کا یہ بیان صرف حقیقت ہی حقیقت تھا۔ خلاصہ یہ کہ پسینہ جسم کے اُن فضلات میں سے ہے جس میں کہ عام طور پر بدبو ہوتی ہے مگر یہ وہ رسول اعظم تھے جن کا پسینہ بھی عرب کے عطروں کو شرمندہ کرتا تھا۔

۱۰۸۵۔ آپ کے پسینہ کی بجائے اس حدیث میں آپ کے جسد اطہر کی خوشبو کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک آپ کا جسم مبارک معطر نہ ہو اس کا پسینہ کیسے معطر ہو سکتا ہے ان سب راویوں کے ان سب مختلف بیانوں کو سامنے رکھ کر انصاف کیجیے کہ کیا یہاں کسی شاعرانہ مبالغہ آمیزی کا احتمال ہو سکتا ہے یا بات یہ ہے کہ نبی اپنے جسم اور اس کے فضلات میں بھی عام بشر سے ممتاز ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنتی کھائینگے بھی اور پئینگے بھی مگر نہ تھوکینگے اور نہ اُن کو پیشاب پاخانہ کی حاجت ہوگی اور نہ وہ ناک صاف کرینگے صحابہ نے عرض کی پھر ان کا، کھانا پینا کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ خوشبودار ڈکار اور مشک بیز پسینہ کی راہ سے خارج ہو جائیگا اور خدا کی تسبیح و تحمید ان کے لیے اس طرح غیر اختیاری ہو جائیگی جیسا کہ سانس لینا غیر اختیاری فعل ہوتا ہے۔

اس حدیث میں یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ اسلامی جنت صرف روحانی اور خیالی نہیں ہے اس میں کھانا پینا بھی ہے مگر مادیت کے جو کثیف اور فانی اجزاء دنیا میں ہیں وہ ان میں نہیں۔ مثلاً تھوک، سنک اور دوسرے گندے اجزاء یہ سب کے سب چونکہ اس کثیف مادہ کے خصائص میں سے ہیں اس لیے وہ جنت میں نہ ہونگے اور نہ ہونے چاہییں۔ اس پر صحابہ نے نہایت معقول سوال کیا کہ پھر یہ غذائی اجزا جسم سے کس طرح خارج ہونگے۔ معلوم ہوا کہ معقول سوال ان کے دماغوں میں بھی پیدا ہوتے تھے اور ان کا کبھی کبھی وہ حل بھی دریافت کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو جواب ان کو ملا وہ کتنا معقول تھا کہ جنت کی مزار کا تو پوچھنا ہی کیا ہے جب دنیوی غذاؤں کے فرق سے انسانی فضلات کی کثافت سے انسانی فضلات کی کثافت اور لطافت بلکہ ان کی کمیت اور مقدار میں بھی فرق ہو سکتا ہے تو آخرت میں اگر فرق ہو تو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ ان کی غذا معطر پسینہ کی شکل سے خارج ہو جایا کریگی، دوم یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی عبادت دائمی ہوگی اور سانس کی طرح غیر اختیاری بھی ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام میں یہ دونوں صفتیں اسی جہان میں نظر آتی ہیں یعنی ان کے فضلات

وَاَمَّا اَنَا فَمَسَحَ خَدِّیْ فَوَجَدْتُ لِیَدِہٖ بَرْدًا اَوْ رِیْحًا کَاَنَّمَا اَخْرَجَھَا مِنْ جُوْنَۃِ عَطَّارٍ رواہ مسلم

ایک ایک رخسار پر ہاتھ پھیرا جب میرا نمبر آیا تو آپ نے میرے دونوں رخساروں پر ہاتھ پھیرا، اس وقت میں نے آپ کے دست مبارک کی خنکی محسوس کی اور اس کی خوشبو سونگھی ایسا مہک رہا تھا جیسا ابھی عطر فروش کے ڈبہ سے نکلا ہے۔ (مسلم)

کا خوشبودار ہونا اور سونے کی حالت میں بھی ان کی آنکھیں بیداری اور بیداری کے تمام حالات میں ذکر اللہ اور وفات کے بعد بھی عبادات میں مشغولی یہ سب ان کی دائمی صفات ہوتی ہیں علماء حقائق کا خیال ہے کہ مرکز حیات ذکر اللہ ہے چونکہ جنتیوں کی حیات دائمی ہوگی اس لیے ان کا ذکر بھی دائمی ہونا چاہیے مشائخ چشتیہ میں جس ذکر کا نام "پاس انفاس" ہے یعنی سانس کے ساتھ اسم اللہ کے ذکر کا تصور کرنا غالباً وہ اہل جنت کے اسی ذکر سے ماخوذ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا ذکر چونکہ اسی عالم میں دائمی ہوتا ہے اس لیے ان کو اس معنی سے موت نہیں آتی جس سے کہ عام بشر کو آتی ہے۔ دوام ذکر کے ساتھ موت یعنی عبادتِ الٰہی سے تعطل کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے حدیثوں میں انبیاء علیہم السلام کو زندہ کہا گیا ہے اور اس کے حقیقی حیات ہونے کی طرف زندگی کی دو اہم خصوصیات بتا کر تنبیہ کی گئی ہے ایک عبادت اور دوم رزق یعنی وفات کے بعد وہ عبادت بھی کرتے رہتے ہیں اور ان کو رزق بھی ملتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رزق روح کی صفت نہیں اس کے لیے جسم کی ضرورت ہے۔ پس جب کہ ان کو رزق بھی ملتا ہے تو یقیناً جسم کے ساتھ بھی ان کا کوئی نہ کوئی رشتہ قائم ہونا چاہیے۔ مگر جب اس جہان کے رزق کی کیفیت بھی مختلف ہے تو اس کی حیات کی کیفیات بھی ضرور مختلف ہونگی۔ اس کو اسی جہان کی کیفیات پر قیاس کرنا غلط ہے اس سے زیادہ اس مسئلہ پر گفتگو کرنی اپنی مقدار علم نہ جاننے کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کی حیات تسلیم کرلی جائے تو اس سے ان کی بشریت کے خلاف ذرہ برابر بھی کوئی بات نہیں نکلتی کیونکہ جب وہ اس دنیا میں ایک محسوس اور مشاہد حیات کے مالک ہو کر بھی بشر ہی تھے تو وفات کے بعد اگر ان میں آثار حیات ثابت ہوں تو اس غیر محسوس حیات سے اور کیا نئی بات ثابت ہو سکتی ہے جس جماعت نے انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات کو توحید کے خلاف سمجھ کر ان کو مضمحل بنانے کی سعی کی ہے یہ محض عبث سعی ہے اگر کسی انسان میں عام بشریت کے خلاف ایک ہزار خصوصیات بھی موجود ہوں تو بھی اس کا مخلوق ہونا ہی ایک ایسا بڑا داغ ہے جو تنہا بارگاہ الوہیت سے اس کو ممتاز کرنے کے لیے کافی ہے۔ عیسائیوں نے جب خدائی توحید میں شرک کی آمیزش شروع کی تو قرآن کریم نے ایک ہی کلمہ سے ان کا رد کردیا یعنی بل لہ ما فی السموات والارض یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابنیت کا عقیدہ اس لیے باطل ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب اس کی مملوک ہے اور مملوک ہونے کا ایک ہی عیب ایسا ہے جو ابنیت کی تردید کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے ہمارے فقہاء نے یہاں سے اس مسئلہ کا استنباط فرمایا ہے کہ اگر والد اپنی اولاد کو کسی سے خرید لے تو وہ لڑکا والد کے اختیار کے بغیر خود بخود آزاد ہو جائیگا کیونکہ بیٹا باپ کا مملوک نہیں ہو سکتا پس جب عیسیٰ علیہ السلام اس کے مملوک ہیں تو ان کو بیٹا کیسے کہا جاسکتا ہے۔ لہذا جبکہ صرف ملکیت کا ایک علاقہ ہی توحید کو نکھارنے کے لیے کافی ہے تو مخلوقیت کا داغ تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے اس لیے اگر انبیاء علیہم السلام کی حیات محدثین کے نزدیک بھی ثابت شدہ حقیقت ہے تو اس کو توحید کے خلاف سمجھنا کسی طرح درست نہیں۔ اسی طرح اس حقیقت کو پرورش کرتے کرتے ہو طرح کے اور برگ و بار اپنی طرف سے اس پر لگا دینا بھی خطرناک راستہ ہے یہی وجہ ہے کہ سلف اس بحث میں نہیں پڑے۔ نہ اس کے اثبات میں انہوں نے غلو کیا نہ اس کی نفی کا کوئی اہتمام محسوس کیا اس قسم کی مباحث ارباب حقائق نے شروع کیں پھر علماء شریعت نے ان کو نکھارا پھر شدہ شدہ وہ نااہلوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر خطرناک مسائل بن گئے۔ ہم نے بھی گو جا بجا اس پر تنبیہ کی ہے مگر ان کے زیر بحث آجانے کے بعد اور وہ بھی

(باقی بر صفحہ ۳۱۴)

منها جواز مكثهم في المسجد جنبًا

١٠٨٦۔ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ لَا يَحِلُّ لِأَحَدٍ أَنْ يُجْنِبَ فِي هٰذَا الْمَسْجِدِ غَيْرِي وَغَيْرَكَ ۔ اخرجہ الترمذی والبیہقی والبزار عن سعد وابویعلی عن عمر بن الخطاب والبیہقی عن ام سلمۃ

١٠٨٧۔ عَنْ أَبِي حَازِمٍ الْأَشْجَعِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللهَ أَمَرَ مُوسٰى أَنْ يَبْنِيَ مَسْجِدًا طَاهِرًا لَا يَسْكُنُهُ إِلَّا هُوَ وَهَارُونُ وَإِنَّهُ أَمَرَنِي أَنْ أَبْنِيَ مَسْجِدًا طَاهِرًا

بحالتِ جنابت آپ کے لیے مسجد میں قیام کی اجازت اور اس میں اہل جنت سے ایک مشابہت

١٠٨٦۔ ابو سعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ اس مسجد میں میرے اور تمہارے سوا کسی کو جنابت کی حالت میں رہنا درست نہیں ہے۔ (ترمذی ۔ بیہقی ۔ ابویعلی ۔ بزار)

١٠٨٧۔ ابو حازم اشجعی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک پاک وصاف مسجد بنائیں جس میں ان کے اور حضرت ہارون علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص کو سکونت کا حق نہیں ہوگا اور مجھ کو بھی اس کا حکم دیا ہے کہ میں بھی ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۳) بدرجہ مجبوری ۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان مسائل میں جس حد تک حدیث نے تفصیل فرمادی ہے اسی پر قناعت کرلینی چاہیے ۔ واللہ الموفق ۔

حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے اس موضوع پر "آب حیات" ایک مستقل ضخیم رسالہ لکھا ہے ۔ ہم نے اپنی استعداد کے موافق اس کا مطالعہ بھی کیا ہے اور کچھ سمجھا بھی ہے مگر اس کا اقتباس نقل کرنا بھی عوام کے فہم سے بالاتر معلوم ہوا اس لیے اس کا خلاصہ نقل کرنے سے بھی ہم نے عنانِ قلم کو روک لیا ہے ۔ صحیح بخاری میں حضرت علیؓ سے مروی ہے "حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللہ ورسولہ (آخر کتاب العلم) یعنی لوگوں کے سامنے بس وہی باتیں بیان کیا کرو جو ان کے اندازۂ فہم کے مناسب ہوں ورنہ نتیجہ یہ نکلیگا کہ وہ ان باتوں کو سمجھینگے نہیں اور اپنے جہل کی بنا پر اس کی تکذیب کرینگے اور اس طرح خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے بلند علوم کی تکذیب کا باعث تم ہوگے ۔ امام بخاریؒ نے اس کی اتنی اہمیت محسوس فرمائی ہے کہ اس پر مستقل ایک عنوان ہی قائم کر دیا ہے ۔ اس زمانہ میں مصنفؒ کی اس احتیاط کی قدر ہوتی ہے ۔

١٠٨٦۔ اس استثنا کی ایک ظاہری وجہ تو یہ ہے کہ چونکہ مسجد شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سکونت کا مقام بھی تھا ہر وقت آپ کی وہاں آمد و رفت رہتی تھی اس لیے آپ کے حق میں بحالت جنابت اس میں گزر جانے اور قیام کرنے کی گنجائش بھی دیدی گئی تھی مگر اس گنجائش سے آپ نے کتنا فائدہ اٹھایا یہ مشکل سے کوئی واقعہ مل سکتا ہے ۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مساجد چونکہ عرف شریعت میں ریاض جنت کہلاتی ہیں اور غالباً یہ سب ٹکڑے محشر میں جنت ہی میں لے لیے جائینگے ۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام اس عالم میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں اس لیے جس طرح اہل جنت اپنی ہر حالت میں جنت ہی میں رہینگے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عالم میں بھی اس کی اجازت حاصل تھی ۔ (باقی بر صفحہ ۳۱۵)

اَوْ یَسْکُنَہٗ اِلَّا اَنَا وَعَلِیٌّ وَابْنَا عَلِیٍّ۔ واخرج ابن عساکر نحوہ عن جابرؓ وابن عساکر عن ام سلمۃ والبیھقی عن عائشۃ کما فی الخصائص۔

ومن خواص اھل الجنۃ کثرۃ الازواج

۱۰۸۸۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَدُوْرُ عَلٰی نِسَائِہٖ فِی السَّاعَۃِ

پاک وصاف مسجد بناؤں اور اس میں بھی میرے اور حضرت علیؓ اور ان کے فرزندان کے علاوہ کوئی اور شخص سکونت کا حق نہیں رکھیگا۔ (ابن عساکر بیہقی)

کثرت ازواج میں انبیاء علیہم السلام کو اہل جنت سے مشابہت

۱۰۸۸۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب و روز میں کبھی بیک وقت بھی

(بقیہ صفحہ ۳۱۴) نہ عام بشر کی دنیا میں یہ صفت ہے نہ ان کو اس حالت میں مسجد میں رہنے کی اجازت ہے۔ رہا حضرت علیؓ کا استثناء تو چونکہ ان کا راستہ بھی اسی طرف سے تھا اس لیے ان کو بھی اس اجازت میں تبعاً داخل کرلیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ وضاحت آئندہ حدیث کے نوٹ میں آتی ہے۔

۱۰۸۷۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی جائے عبادت اور جائے سکونت ایک ہو سکتی ہے جب فقہاء نے قرآن شریف پڑھنے والے بچوں کو وضوء کیے بغیر قرآن شریف چھونے کی اجازت دیدی تو پھر رسولوں کی ہمہ وقت آمدورفت کی وجہ سے اگر مسجد کو ان کا بیت سکونت بھی قرار دیدیا جائے تو اس میں اشکال کیا ہے اور کیوں۔ ادھر ترجمان السنۃ ص ۱۰۶ میں آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بحق حضرت علیؓ ملاحظہ فرماچکے ہیں کہ تمہاری اور میری وہ نسبت ہے جو حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کے مابین تھی۔ اس نسبت کی حقیقت صرف اسی پر ختم نہیں ہوگئی کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت میں حضرت ہارون علیہ السلام نے جانشینی کے فرائض انجام دیئے تھے اسی طرح حضرت علیؓ نے ایک جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی جانشینی کی خدمت انجام دی تھی بلکہ اس کا اثر یہاں تک بھی پھیلا کہ ایک روز مزید خصوصیت جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاصل تھی وہ بھی ان کو نصیب ہوگئی اور اس بناء پر ان کے استثناء میں ایک بڑی حقیقت پنہاں منکشف ہوگئی۔ سبحان اللہ! انبیاء علیہم السلام کے دہن مبارک سے جو تشبیہات بھی نکلتی ہیں وہ حقیقت سے کتنی لبریز ہوتی ہیں۔

یہ واضح رہے کہ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ایک جزئی واقعہ پر حضرت علیؓ کی دلشکنی کی تسلی کے لیے ارشاد ہوا ہے مگر یہاں بھی آپ نے یہ بات صاف کردی تھی کہ اس نسبت سے نبوت کا کوئی تعلق نہیں یہ منصب میرے بعد ختم ہوچکا ہے اس لیے نبی تو تم ہو نہ کوئی اور اس کے بعد بھی اگر دنیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پھر کسی کو نبی بنالے تو شقاوت ازلیہ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ پھر جب اس حدیث کی رو سے خود حضرت علیؓ نے دعوٰئ نبوت نہ کیا تو بعد میں کس کو اس دعوے کا حق ہو سکتا ہے۔ نیز حضرت ہارون علیہ السلام چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات ہی میں وفات پاچکے تھے لہذا اس حدیث کو مسئلہ خلافت سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ یہ صرف ایک خاص موقعہ پر ایک مسلسل نیابت تھی جس میں دوسرے مواقع پر آپ کے دوسرے صحابہؓ کو بھی شرکت کا شرف کسی حد تک حاصل ہوا ہے لہذا اس حدیث کو آپ کے بعد خلافت کے مسئلہ میں کھینچنا غلط ہے۔

بِالنِّوَاحِدَةٍ مِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُنَّ اِحْدٰى عَشَرَةَ قُلْتُ لِاَنَسٍ اَوَكَانَ يُطِيْقُهٗ قَالَ كُنَّا نَتَحَدَّثُ

سب بیبیوں کے ساتھ شب باشی کی ہے، حالانکہ آپ کی گیارہ بیبیاں تھیں۔ میں نے انسؓ سے پوچھا کیا آپؐ میں اتنی طاقت تھی۔ اُنھوں نے جواب دیا ہمارے درمیان تو یہاں تک

۱۰۸۸۔ شریعت میں عام طور پر ایک مرد کو چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے اس لیے تسلیم کرنا پڑیگا کہ ایک مرد میں یقیناً اتنی طاقت بھی ضرور ودیعت فرمائی گئی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا معاملہ جسمانی اور روحانی طاقتوں میں عوام سے کہیں اونچا ہوتا ہے اگر ان کی جسمانی طاقتیں بھی ان کے منصب کے بقدر زیادہ نہ ہوں تو ان کو اُمت کی جفاکاریوں پر صبر اور دوسری طرف بارِ وحی کا تحمل کرنا ناممکن ہو جائے، اس لیے حکمت ایزدی نے ان کی جسمانی قوتیں بھی عام انسانوں سے کہیں زیادہ قوی بنائی ہیں، اسی لیے نکاح میں بھی اُن کے لیے عوام سے زیادہ وسعت دی گئی ہے لیکن اس کمال طاقت و قوت کے باوجود انبیاء علیہم السلام کی ساری طاقتیں صرف تبلیغ دین اور خدا تعالیٰ کی راہ میں مصائب و آلام کے جھیلنے میں ہی صرف ہو گئی ہیں۔ سیرت پڑھنے والے حضرات خوب جانتے ہیں کہ ان کی طاقت و قوت کی یہ بہتات کسی ایک ہی جانب میں نہ تھی بلکہ غزوۂ خندق میں جب ایک موقعہ پر ایک سخت پتھر کسی کی کدال سے ٹوٹ نہ سکا تو اُس وقت جس کی کدال نے اس کو ریزہ ریزہ کر ڈالا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی قوتِ بازو کا کرشمہ تھا۔ یہ آپ کی طبعی طاقت تھی یا معجزہ تھا مگر جس کا تعلق تھا تو آپ کی قوت جسمانی ہی کے ساتھ۔ رکانہ جیسے مشہور پہلوان سے کشتی لڑی اور اس کو تین بار زیر کیا یہ کرشمہ بھی آپ کی قوت جسمانی کا تھا (کما فی الخصائص) ایک مرتبہ جب صحابہ کرامؓ نے اپنی بھوک کی بیتابی اپنے پیٹوں سے پتھر بندھے ہوئے دکھا کر ظاہر کی تو اس وقت معلوم ہوا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے پیٹ سے دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ ایک موقعہ پر سواریوں کی قلت کی وجہ سے ایک ایک سواری دو دو شخصوں میں تقسیم کی گئی ہر شخص کچھ دور پیادہ پا چلتا اور پھر اپنی باری میں کچھ دور سوار ہو جاتا۔ اس عام ضابطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا استثناء گوارا نہ فرمایا اور اس لیے آپ کے حصہ میں بھی ایک مشترک سواری آئی۔ آپ کے جاں نثار شریک نے ہزار سر پٹکا کہ آپ سوار رہیں اور وہ آپ کے عوض بھی پیادہ پا چل لیگا لیکن اس کے جواب میں اس خلق عظیم والے رسول کا جواب یہ تھا "ما انت باقوی منی وما انا باغنی عن الاجر منک" (او کما قال) تو مجھ سے زیادہ قوی نہیں اور میں تجھ سے زیادہ ثواب آخرت سے بے نیاز نہیں یعنی اس کی ضرورت مجھ کو بھی ہے۔ یہاں آپ کے پہلے جملوں پر غور کیجیے۔

دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک شعبہ صحابہ کرامؓ کے سامنے آتا تھا اور کیونکر نہ آتا جس کی ذات کو مجسم "اسوہ حسنہ" اور نمونہ بنا کر بھیجا گیا تھا ضرور تھا کہ اس کی زندگی کا ہر ہر گوشہ اندرونی بھی اور بیرونی بھی سب کا سب سامنے آجاتا اس لیے حسب الاتفاق یہ ایک واقعہ بھی معمول کے مطابق ضمنی طور پر ذکر میں آگیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر چونکہ اب ایک مدت کے لیے احرام و حج کے مشاغل درپیش تھے اس لیے آپ نے مناسب سمجھا کہ ایک بار جملہ ازواج کے یہاں شب باش ہو جائیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری عمر کی سنت ہمیشہ شب باشی میں تقسیم ہی رہی ہے پس چونکہ یہ ایک ہی واقعہ تھا جو آپ کے عام طریق کے خلاف پیش آیا تھا اس لیے صحابہ کرامؓ کے مابین اس کا تذکرہ بھی آگیا اور اس ضمن میں آپ کی جسمانی طاقت کا تذکرہ بھی ہو گیا، ورنہ احادیث کے دفتر آپ کے سامنے کھلے پڑے ہیں جس میں ہر رطب و یابس بھی جمع کر دیا گیا ہے آپ اس پر ایک بار گزر جائیے اور پوری تنقید کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے کہ کیا اس رسول عظیم کی جسمانی طاقتیں صرف جہاد، مصائب و آلام کے تحمل اور تبلیغ دین میں دشمنوں کی جفائیں سہنے کے سوا کسی اور جانب کبھی صرف ہوئی ہیں۔ آپ کی سب سے مقرب بی بی حضرت عائشہؓ کو ایسی نوبت بھی آئی ہے کہ وہ آپ کو بستر پر نہ دیکھ کر جوش غیرت میں آپ کی تلاش کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہیں لیکن جب دیکھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

أَنَّهُ أُعْطِيَ قُوَّةَ ثَلَاثِيْنَ. اخرجه البخاری من طریق عبادة کذا فی الخصائص۔

۱۰۸۹۔ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سُلَيْمَانُ لَأَطُوْفَنَّ اللَّيْلَةَ

تذکرہ ہوتا ہے کہ آپ کو تیس مردوں کے برابر طاقت دی گئی تھی۔ (بخاری)

۱۰۸۹۔ ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا

اپنے رب کے سامنے سربسجود پڑے ہیں تو متحیر ہو کر بول اٹھیں۔ یا رسول اللہ میں کس خیال میں تھی اور آپ کس جہان میں ہیں۔ اس عمر بھر میں ایک واقعہ پر نظر کرنے والے تریسٹھ سال کی اس زندگی سے کیسے چشم پوشی کر لیتے ہیں جس میں آپ کی عبادت و زہادت صحراؤں اور غاروں میں طویل طویل مدتوں کی اقامت اور ساری عمر روزہ کی وہ کثرت جس کا مادی عقول کو تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ سب اس کثرت اور تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ معتدل مزاج دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں اگر محض اپنی ہوس رائی کے مذاق کی بنا پر صحیح احادیث کا انکار کر دینا معیار تحقیق ہے تو بس دین کا اللہ تعالیٰ ہی حافظ و محافظ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس صحیح حدیث پر تنقید کرنے والے کیا دشمنوں کی طرح آپ کے تعدد ازدواج پر بھی اعتراض کر دینگے یا اس واقعہ کا بھی انکار کر جائینگے۔ خوب یاد رکھو کہ اگر اپنی ذہنیت صاف ہے تو نہ اس ایک واقعہ میں کوئی اشکال ہے اور نہ ان جیسے دوسرے واقعات میں یہی وجہ ہے کہ یہی واقعات صحابہ کرام کے مابین بھی تذکرہ میں آئے تو ان کے قلوب مطہر میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی ادنیٰ شبہ نہیں گذرا اور یہی واقعات جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو اگرچہ ان کی اسانید کتنی بھی صحیح ہوں مگر ہماری ذہنی ظلمت و کثافت ان کو جس نظریہ سے دیکھتی ہے پھر وہ اس کو انکار یا تاویل کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جیسا آپ پڑھ چکے ہیں انبیاء علیہم السلام کے جسم دنیا میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں آخرت میں پہنچ کر ان کے مراتب کے مناسب ان میں بھی اسی طرح اور اضافہ ہو جائیگا جیسا کہ عوام امت کے لیے اپنے اپنے اعمال کے مطابق ان میں اضافہ ہوگا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام اہل جنت کی طرح کون و فساد سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ان کے فضلات اہل جنت کی طرح معطر ہوتے ہیں۔ ان کا سونا اہل جنت کی طرح غفلت کی نیند نہیں ہوتا، اسی طرح ان کی دوسری طاقتیں بھی اس جہان میں اہل جنت کی طرح ہوتی ہیں، اگر طبیعت میں گنجائش ہو تو تعدد ازدواج کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھ لیجیے۔ پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ حسب بیان قرآن کریم امت کے حق میں چار بیبیوں کی قید اس لیے ہے کہ ان سے ان کے حقوق کی ادائیگی بھی مشکل ہے جہاں حق تلفی کا کوئی احتمال نہیں وہاں اس تحدید کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں میرا مقصد یہ ہے کہ ان کی حیات طیبہ اہل جنت کی حیات کا ایک نمونہ ہوتی ہے وہ اسی حیات میں اپنے رب سے ہمکلام ہوتے ہیں، خدا تعالیٰ کے مقدس فرشتے ان کی مجلسوں میں آتے جاتے ہیں۔ جنت و دوزخ کا ان کو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور کسی کو تو دیدار الٰہی جیسی عظیم الشان نعمت سے بھی نواز دیا جاتا ہے تو کیا اب بھی اس پاکباز ہستی کے متعلق اس ایک واقعہ میں آپ کو کوئی شبہ ہو سکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ یہ بیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے خود نہیں ہے بلکہ آپ کے ایک واقعہ پر صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا باہم تذکرہ ہے گو وہ کتنی ہی حقیقت پر مبنی ہو لیکن پھر آپ کے اپنے بیان اور صحابہ کے باہم تذکروں میں مسئلہ کی اہمیت اور غیر اہمیت کا بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ اب یہ نکتہ چینی ان پر کیجیے کہ انہوں نے آپ کے متعلق ایسا خیال کیوں قائم کر لیا۔ اگر یہاں عرب کے اس عام ماحول کا بھی لحاظ کر لیا جاتا جو اس وقت کی عام تاریخوں سے ثابت ہے تو جبر و مقابلہ کے بے وجہ حسابات جو یہاں شروع کر دیے گئے ہیں وہ شروع نہ کیے جاتے۔ اسی کے ساتھ جس بشر کا تعلق تمام امت کے ساتھ ہو اس کے لیے نسوانی احکام کی تعلیم و تفہیم کے لیے ازدواج کی کثرت کتنی اہم ہوگی یہ سوال بھی قابل غور ضرور ہے۔ (تنبیہ۔ یہ یاد رہے کہ صرف قواعد پر چلنے والے یہاں لفظ "کانَ" میں ضرور کچھ الجھینگے مگر حقیقت شناس اور واقعات پر نظر رکھنے والے کسی راوی کے ایک لفظ سے تاریخ کے اوراق پر کبھی پانی نہیں پھیر سکتے۔

عَلٰی تِسْعِیْنَ اِمْرَءَۃٍ وَفِیْ رِوَایَۃٍ بِمِأَۃِ اِمْرَءَۃٍ کُلُّھُنَّ تَأْتِیْ بِفَارِسٍ یُجَاھِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَقَالَ لَہُ الْمَلَکُ قُلْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ فَلَمْ یَقُلْ وَنَسِیَ فَطَافَ عَلَیْھِنَّ فَلَمْ تَحْمِلْ مِنْھُنَّ اِلَّا اِمْرَءَۃٌ

آج کی شب میں اپنی حرم سرائے میں نوّے اور ایک روایت میں سو بیبیوں کے پاس جاؤنگا اور سب کی سب کے یہاں ایک ایک بچا ایسا پیدا ہوگا جو راہِ خدا میں جہاد کریگا اس پر فرشتے نے کہا ان شاء اللہ تو کہئے لیکن تقدیری بات کہ وہ یہ کلمہ کہنا بھول گئے جب زنان خانہ تشریف لے گئے تو صرف ایک بی بی حاملہ ہوئیں اور ان کے

۱۰۸۹۔ سہو و نسیان کے واقعات خال خال انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں میں بھی نظر آتے ہیں اور یہ بڑی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں ان میں صرف اُن محیر العقول ہستیوں کی بشریت کی طرف اشارہ ہی نہیں ہوتا بلکہ انبیاء علیہم السلام کے مقام کی بلندی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ گویا یہ ہستیاں وہ ہیں جن کا سہو و نسیان بھی دوسرے انسانوں کی ارادی خطاؤں کی طرح قابل گرفت ہوتا ہے اب یہ اندازہ فرمائیے کہ انبیاء علیہم السلام بشر ہی نہیں ہوتے یا ایسے کامل بشر ہوتے ہیں جن کے مواخذہ کے شرائط عام انسانوں سے کہیں شدید تر ہیں۔ جب اس واقعہ کو سامنے رکھ کر آپ یہ آیت پڑھینگے تو اس کی پوری تفصیل آپ پر کھل جائیگی۔

ولا تقولن لشای انی فاعل ذٰلک غدا

الا ان یشاء اللہ۔

سرسری نظر میں آیت بالا کو آپ صرف ایک علمی اصلاح اور عقیدہ کا مسئلہ سمجھتے ہونگے اب آپ کو اس واقعہ کی روشنی میں اس کی اہمیت کا علم بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے واقعات کے دوہرانے سے قرآن کریم کا مقصد کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ جب تک نقصانات کے باریک سے باریک پہلو ایک ایک کر کے سامنے نہ آجائیں کسی کمال کی معراج حاصل ہونا ممکن نہیں لیکن ان باریکیوں کا میدان عام انسانوں کی زندگی بنائی نہیں جا سکتی۔ اس لیے تقدیر نے کچھ ہستیاں اتنی بلند پیدا فرمائی ہیں جن کی درخشاں زندگی میں سہو و نسیان کے اثرات کا نمایاں ہونا بھی ان کے رتبہ سے بعید ہوتا ہے۔ اس لیے پھر اس پر اُن سے مواخذہ فرمانا بھی بالکل موزوں نظر آتا ہے جس امت کو خیر امت بنانا منظور تھا اس کے سامنے یہ تمام سرد و گرم سرگزشتیں اس لیے رکھ دی گئی ہیں کہ ان کے معراج کمال تک پہنچنے کے اسباق یہی ہیں۔ یہ واقعہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی حیات میں ایک ہی واقعہ ہے اور جب ان کو شاہی بھی وہ شاہی عطا ہوئی تھی جو پھر دنیا تک کسی کو نصیب نہ ہو سکے یعنی جن و ملک حتی کہ ہوا پر بھی ان کی قاہرانہ حکومت قائم تھی۔ تو اس شان و شکوہ کے ساتھ کثرت ازواج جو اس دور میں ظاہری ملوکیت کے لیے لازم تھی اگر مرحمت فرما دی گئی تو اس پر اعتراض کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس ایک واقعہ میں ان کی تمنا کیا تھی وہ محدود حدیث میں موجود ہے پھر اس پاکیزہ مقصد میں ذرا سے نسیان کا نتیجہ کیا نکلا وہ بھی آپ کے سامنے ہے فرشتہ کی یاد دہانی کے باوجود پھر نسیان ہونا اس کی دلیل ہے کہ جو بات تقدیر میں طے ہو جاتی ہے وہ اپنے اسباب کے ساتھ طے ہوتی ہے پس جس طرح ان کا ظہور قطعی اور یقینی ہوتا ہے اسی طرح ان اسباب کا پیش آنا بھی قطعی و ضروری ہوتا ہے۔

کثرت ازواج کے متعلق ایک بدیہی مگر اہم تنبیہ جن اعداء اسلام کی نظروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی کثرت باعث اعتراض بنی ہوئی ہے اُن کی نظریں کبھی اس طرف نہیں اٹھیں کہ ازواج کی کثرت کن حالات میں سامان عیش و عشرت ہو سکتی ہے۔ آج اور آج سے پہلے دنیا کی تاریخ پر نظر ڈال لیجیے آپ کو معلوم ہوگا کہ جس طبقہ کا نصب العین تعیش بن گیا ہے پھر اس کا ماحول کیا تھا، نیز اس کے اثرات اس کی زندگی، اس کے ہم جلیسوں اس کی محکوم رعایا بلکہ بعد کے دور تک بھی کتنی دُور تک پھیل گئے ہیں۔ اس جگہ ہمیں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن بتانا صرف یہ ہے کہ صورت حال یہاں کیا تھی۔ یہاں اگر گھر کا جائزہ لیجیے تو اس کی بے سرو سامانی کا نقشہ دیکھ کر غور کیجیے

وَاحِدَةٌ جَاءَتْ بِشِقِّ رَجُلٍ وَايْمُ الَّذِىْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْقَالَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَاهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فُرْسَانًا اَجْمَعُوْنَ . متفق علیه

بَعْضُ الْاَسْرَارِ فِىْ نِكَاحِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

۱۰۹۰ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْاَسْوَدِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَتْ عَائِشَةُ مَا تَزَوَّجَنِىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ

بھی ایک ناتمام بچہ پیدا ہوا، اس کے بعد آپ نے فرمایا اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اگر وہ ان شاء اللہ کہہ دیتے تو سب کے بچے ہوتے اور سب گھوڑوں پر سوار ہو کر راہ خدا میں جہاد کرتے۔ متفق علیہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں قدرت کے بعض تکوینی اسرار

۱۰۹۰ عبدالرحمٰن بن الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ

شخص کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آتے ہیں آخر جب ان سے رہا نہ گیا تو یہ درخواست کر ہی بیٹھے یا رسول اللہ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت پر وسعت فرما دے یہ ہمت تو کہاں تھی کہ خود آپ ہی کے متعلق یہ درخواست کرتے کیونکہ جب نظر اٹھا کے دیکھا کہ ایک خشک چٹائی جو آپ کے جسم نازک میں گھسی جا رہی تھی، آپ کا بچھونا تھی اور ایک آدھا خشک مشکیزہ لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا یہ پانی کا سامان تھا اور بس۔ کھانے کے تکلفات کا ذکر ہی کیا ہے مہینوں گھر میں آگ جلنے کی نوبت نہ آتی۔ لباس کی یہ حالت کہ عائشہؓ نے آپ کی وفات کے بعد وہ پیوند لگی ہوئی موٹی چادریں نکال کر دکھائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ان کپڑوں میں ہوئی ہے۔ گھر اتنا سادہ کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے منقش چادر آپ کی زینت کے خیال سے لٹکا دی تو آپ گھر میں داخل نہ ہوئے جب تک کہ اس کو پھاڑ کر اس کے تکیے نہ بنا دیے گئے کہ زمین پر پڑے رہیں۔ بیبیوں کے درمیان وہ انصاف کہ مجال کیا کسی کا دل ذرا میلا ہو جائے۔ شب باشی میں تقسیم آپ پر واجب نہ تھی مگر پھر اس کی اتنی رعایت کہ ہر بی بی کے ہاں رہنے کا دن مقرر تھی کہ سفر بھی قرعہ اندازی کے بعد ہوتا۔ پھر جب آپ کے شب کے حالات کے کھوج لگائیے تو خود حضرت عائشہؓ کا بیان یہ ہے کہ ایک شب اپنی باری میں جب میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ دیکھا تو طرح طرح کے وہموں نے مجھ کو گھیر لیا جب تلاش میں نکلی تو آپ کو سر بسجود دعا میں مشغول دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئی۔ آپ کی صلوٰۃ لیل اور صیام کی بہت سی حدیثوں کا ذخیرہ ان ہی امہات المؤمنین کے ذریعہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ اگر آپ کے ہم جلیسوں کا حال دیکھنا ہو تو جس جماعت میں آپ مبعوث ہوئے تھے تو ان کا تعیش ضرب المثل تھا اور جب وہ کچھ مدت آپ کی صحبت سے مستفیض ہو چکے تو ان کا زہد ضرب المثل تھا۔ پھر کون نہیں جانتا کہ جہاد کی زندگی تعیش کی زندگی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ پھر جہاں ہمہ وقت جہاد سامنے ہو وہاں تعیش کا تصور کیسے آ سکتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ اس لیے نہیں تھا کہ سامان تعیش جمع نہ ہو سکتے تھے۔ نہیں نہیں فتوحات پر فتوحات ہو چکی تھیں، لیکن جو کچھ ہاتھ آتا وہ سب غرباء، مساکین اور دوسرے مسلمانوں پر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اپنے گھر میں جمع کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ عسرت در عسرت میں کثرت ازواج امتحان و ابتلاء کی منزل تھی یا سامان تعیش آج بھی اگر عسرت میں

(باقی بر صفحہ ۳۲۰)

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَتَاهُ جِبْرَئِيْلُ بِصُوْرَتِيْ وَقَالَ هٰذِهٖ زَوْجَتُكَ وَتَزَوَّجَنِيْ وَاِنِّيْ لَجَارِيَةٌ عَلٰى حَرْفٍ فَلَمَّا تَزَوَّجَنِيْ اَلْقَى اللّٰهُ عَلَيَّ حَيَاءً وَّاَنَا صَغِيْرَةٌ. رواه الحاكم فی المستدرک وصححه الذهبی۔

۱۰۹۱ ۔ قَالَ قَالَتْ جُوَيْرِيَةُ بِنْتُ الْحَارِثِ رَأَيْتُ قَبْلَ قُدُوْمِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِثَلَاثِ لَيَالٍ كَاَنَّ الْقَمَرَ اَقْبَلَ يَسِيْرُ مِنْ يَثْرِبَ حَتّٰى وَقَعَ فِيْ حِجْرِيْ فَكَرِهْتُ اَنْ اُخْبِرَ بِهَا اَحَدًا مِّنَ النَّاسِ حَتّٰى قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا سُبِيْنَا رَجَوْتُ الرُّؤْيَا فَلَمَّا اَعْتَقَنِيْ وَتَزَوَّجَنِيْ

صلی اللہ علیہ وسلم کے مجھ سے نکاح فرمانے سے قبل ہی حضرت جبرئیلؑ نے میری صورت لاکر آپ کو دکھادی تھی اور فرمایا تھا یہ آپ کی بی بی ہیں۔ مجھ سے جب آپ نے نکاح فرمایا ہے تو اس وقت میں بالکل لڑکی تھی۔ پھر جب آپ نے عقد فرمالیا تو نو عمری ہی میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر حیا و شرم غالب فرمادی تھی۔ (مستدرک)

۱۰۹۱ ۔ حضرت جویریہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے تین شب قبل میں نے خواب میں ایسا دیکھا تھا کہ چاند یثرب کی جانب چلتا آرہا ہے یہاں تک کہ میری گود میں آگیا ہے میں نے کسی شخص کے سامنے اس خواب کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا، یہاں تک کہ آپ تشریف لے آئے تو اتفاق ایسا ہوا کہ ہم لوگ قید کرلیے گئے تو مجھے اب اپنے خواب کی تعبیر پوری ہونے کی اُمید ہوئی اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ

(بقیہ صفحہ ۳۱۹) اولاد کی کثرت شروع ہوجاتی ہے تو ان لخت جگر کے لیے بھی زیادتی کے بجائے انسان موت کی تمنا کرنے لگتا ہے پس اعتراض کرنے والے صرف ایک ہی پہلو کو دیکھتے ہیں کاش اگر آپ کی پوری زندگی سامنے رکھ لیں تو ان کو معلوم ہوجائے کہ نبی کے مجاہدات میں سے ایک بڑا مجاہدہ کثرتِ ازواج بھی تھا۔ عام مسلمانوں کو چار ازواج کی گنجائش دی گئی مگر اس تنبیہ کے ساتھ کہ ان کے درمیان عدل و انصاف پورا پورا کرنا ہوگا۔ اور یہ منزل اتنی کٹھن ہے کہ تم شاید مشکل ہی اس سے عبور کرسکو گے لیکن جن کو تمام جہان میں عدل و انصاف قائم کرنا کچھ دشوار نہ تھا ان کو چند ازواج کے درمیان انصاف قائم رکھنا کیا مشکل ہوتا۔

۱۰۹۰ ۔ جس ذات قدسی صفات کو رسولوں میں بھی منتخب رسول فرمایا گیا تھا جس کا محل ولادت، مقام ہجرت، جس کے جلیس صحابہ اور جس کے خلفاء بھی پہلے سے سب منتخب ہوچکے تھے یہ کیسے ممکن تھا کہ عالم تقدیر میں اس کی زوجیت کے لیے عورتوں کا انتخاب پہلے نہ ہوچکا ہوتا۔ جب قرآن کریم اپنا عام اعلان یہ کرتا ہے الطیبات للطیبین والطیبون للطیبات۔ تو یہ کیونکر ہوتا کہ سارے جہان میں جو سب سے زیادہ طیب تھے ان کے لیے تمام جہاں سے بڑھ کر طیبات انتخاب نہ کی جاتیں۔ اس لیے قدرت نے آپ کی خاص زوجیت کے لیے نبیوں کے بعد سب سے اشرف انسان یعنی صدیق اکبرؓ کی سب سے اشرف صاحبزادی کو منتخب کیا اور عالم رؤیا میں یہ راز کھول بھی دیا کہ ہم نے ان کو شروع سے آپ کی زوجیت کے لیے منتخب کرلیا تھا مقصد یہ ہے کہ نکاح انبیاء علیہم السلام بھی کرتے ہیں مگر صرف اُن سے کرتے ہیں جو ان کے حق میں پہلے سے منتخب شدہ بیبیاں ہوتی ہیں۔ اگر یہاں صرف صورت اور ظاہری عادات ہی دیکھی جاتیں تو ممکن تھا کہ بعض دوسری عورتیں بھی ان اوصاف میں مشترک مل جاتیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عام صفات کے سوا آپ کی دائمی رفاقت کے لیے اندرونی طور پر کچھ اور خصوصی شرائط بھی ضرور مرعی تھیں۔ سبحان اللہ انبیاء علیہم السلام بھی کیسے کامل بشر ہوئے ہیں۔

وَاللّٰهِ مَا كَلَّمْتُهُ فِي قَوْمِي حَتّٰى كَانَ الْمُسْلِمُوْنَ هُمُ الَّذِيْنَ اَرْسَلُوْهُمْ وَمَا شَعَرْتُ اِلَّا بِجَارِيَةٍ مِّنْ بَنَاتِ عَمِّيْ تُخْبِرُنِي الْخَبَرَ فَحَمِدْتُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ. رواہ الحاکم فی المستدرک ۳۹/۴ والحاکم فی الاکلیل کما فی العمدۃ ص ۱۰۲ ج ۵۔

۱۰۹۲۔ عَنْ زَيْنَبَ اَنَّهَا كَانَتْ عِنْدَ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ فَفَارَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْهَا نَزَلَتْ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا قَالَ فَكَانَتْ تَفْخَرُ عَلٰى

وسلم نے مجھ کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں قبول فرمالیا تو بجائے میں نے اپنی قوم کی رہائی کے معاملہ میں آپ سے ایک حرف بھی نہیں کہا بلکہ خود مسلمانوں نے ہی (آپ کے اس رشتہ کی خاطر) ان سب کو رہا کر دیا اور مجھ کو تو اس واقعہ کی خبر بھی جب ملی ہے جبکہ میری ایک چچا زاد بہن نے آکر مجھ کو اس کی اطلاع دی۔ میں نے اس احسان پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ (مستدرک)

۱۰۹۲۔ حضرت زینبؓ بیان فرماتی ہیں کہ وہ حضرت زید کے نکاح میں تھیں (ان کے طلاق کے واقعہ کے بعد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عقد فرمالیا تھا۔ قرآن کریم کی یہ آیت فلما قضی زید منها وطرًا الخ ان ہی کی شان میں نازل ہوئی تھی راوی کہتا ہے کہ حضرت زینبؓ دوسری بیبیوں

۱۰۹۱۔ حضرت جویریہؓ کا یہ نکاح کتنے کثیر التعداد نفوس کی آزادی کا سبب بنا یہ اپنی جگہ خود ایک بڑی حکمت ہے لیکن ہمیں تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کس طرح پہلے سے عالم تقدیر میں منتخب ہو چکی تھیں یہ بیان کسی غیر کا نہیں ہے بلکہ خود ان ہی کا ہے جو آپ کے شرف زوجیت سے مشرف ہوئیں۔ ان کی خودداری دیکھیے کہ وہ اپنی قومی آزادی کا بار بھی اپنی گردن پر لینا نہیں چاہتیں اور بڑی صفائی کے ساتھ یہ فرمادیتی ہیں کہ میں نے اس معاملہ میں زمانہ کے عام دستور کے مطابق آپ سے سفارش کا ایک کلمہ تک منہ سے نہیں نکالا لیکن یہ میری قوم کا نصیب تھا اور مسلمانوں کی اولوالعزمی اور اپنے رسول کا احترام کہ انہوں نے اس رشتہ کے بعد خود یہ ایثار کیا۔

۱۰۹۲۔ حضرت زینبؓ کے نکاح پر تو خود قرآن کریم ہی نے روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر متبنیٰ کا مسئلہ خود رسول کی زندگی میں اس طرح عملاً نہ دکھا دیا جاتا تو قلوب میں اس کی طرف سے پوری صفائی کی کوئی شکل ہی نہ تھی ورنہ حضرت زینبؓ وہی تھیں جن کو آپ ہمیشہ سے جانتے پہچانتے تھے، آپ ہی نے حضرت زید کے ساتھ ان کا عقد کیا تھا اور جب آپ کو ان کی باہم ناچاقی کا علم ہوا تو آپ نے حضرت زید کو بہت سمجھایا بھی مگر جو امر کہ عالم تقدیر میں طے پا چکا تھا آخر کار اس کے لیے ایسے ہی اسباب بن گئے کہ حضرت زینبؓ آپ کے نکاح میں آکر رہیں۔ پھر تاریخ سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان حضرت زینبؓ کی طرف کچھ غیر معمولی تھا، بلکہ اس سے قبل جس طرح حضرت عائشہؓ آپ کی خاص مقرب تھیں اسی طرح وہی اس کے بعد بھی مقرب رہیں۔ یہاں دشمنان دین کی بے وجہ رنگ آمیزیاں ان حقائق کی روشنی میں کیا قابل التفات ہو سکتی ہیں۔

حق تعالیٰ کی رحمت و رافت کا یہ نقشہ بھی محو ہونے کے قابل نہیں ہے کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ عقد کرنے کا بار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہیں ڈالا گیا بلکہ وہ خود ہی اس کا متکفل ہو گیا اور معاملہ کی نزاکت کی ایک بڑی مشکل خود اس نے حل فرما دی۔

أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَقُوْلُ زَوَّجَنِي اللهُ مِنْ رَسُوْلِهِ وَزَوَّجَكُنَّ آبَاؤُكُنَّ وَأَقَارِبُكُنَّ رواه الحاكم في المستدرك۔

۱۰۹۳۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ وَقَعَتْ جُوَيْرِيَةُ بِنْتُ الْحَارِثِ بْنِ الْمُصْطَلِقِ فِيْ سَهْمِ ثَابِتِ بْنِ قَيْسِ بْنِ شَمَّاسٍ أَوِ ابْنِ عَمٍّ لَهُ فَكَاتَبَتْ عَلَى نَفْسِهَا وَكَانَتْ امْرَأَةً مُلَاحَةً تَأْخُذُهَا الْعَيْنُ قَالَتْ عَائِشَةُ فَجَاءَتْ تَسْأَلُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ كِتَابَتِهَا فَلَمَّا قَامَتْ عَلَى الْبَابِ فَرَأَيْتُهَا كَرِهْتُ مَكَانَهَا وَعَرَفْتُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيَرَى مِنْهَا مِثْلَ الَّذِيْ رَأَيْتُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ أَنَا جُوَيْرِيَةُ بِنْتُ الْحَارِثِ وَإِنَّمَا كَانَ مِنْ أَمْرِيْ مَا لَا يَخْفَى عَلَيْكَ وَإِنِّيْ وَقَعْتُ فِيْ سَهْمِ ثَابِتِ بْنِ قَيْسِ بْنِ شَمَّاسٍ وَإِنِّيْ كَاتَبْتُ عَلَى نَفْسِيْ فَجِئْتُكَ أَسْأَلُكَ فِيْ كِتَابَتِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهَلْ لَكِ إِلَى مَا هُوَ خَيْرٌ مِنْهُ قَالَتْ

کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ یہ بیان فرمایا کرتی تھیں کہ میرا نکاح تو اپنے رسول کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ نے پڑھایا ہے اور تمہارا نکاح تمہارے باپ اور دوسرے عزیزوں نے پڑھایا ہے۔ (مستدرک)

۱۰۹۳۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت جویریہؓ ثابت بن قیس کے حصۂ جنگ میں آگئی تھیں اور انہوں نے ثابت بن قیس سے عقد کتابت کر لیا تھا یعنی اتنی رقم آپ کو ادا کرکے میں آزاد ہوں۔ یہ بڑی حسین اور جاذب نظر تھیں۔ عقد کتابت کی رقم حاصل کرنے کے لیے یہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں جب میں نے ان کو دروازہ پر کھڑا دیکھا تو ان کا آنا مجھ کو پسند نہ آیا اور میں نے سمجھا کہ جو جاذبیت میں نے ان میں دیکھی ہے وہی آپ کے ملاحظہ میں آئیگی۔ بہرحال انہوں نے آکر عرض کی یا رسول اللہ میرا نام جویریہ ہے اور میں حارث کی دختر ہوں، میری جو سرگزشت ہے وہ سب آپ کو معلوم ہے کہ قیدی ہو کر ثابت بن قیس کے حصہ میں آگئی ہوں میں نے ان کے ساتھ اپنی آزادی کی غرض سے کتابت کا عقد کر لیا ہے، اب آپؐ کی خدمت میں زر کتابت کی درخواست لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ آپ نے فرمایا اچھا اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے سامنے اس سے ایک اعلیٰ

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس اہم تشریع کے لیے بھی یہ صورت اختیار نہیں کی گئی کہ پہلے نکاح کے قائم رہتے ہوئے ان کو آپ کی زوجیت میں منتقل کر دیا جاتا، اور نہ حضرت زیدؓ کے خلاف اُن پر اس کا زور ڈالا گیا کہ وہ اپنی زوجہ کو طلاق دیدیں بلکہ جب خود بخود واقعات اس قسم کے رونما ہو گئے کہ اب باہم نباہ کی کوئی دوسری صورت بھی باقی نہ رہی اور قانونی طور پر متارکت عمل میں آگئی اور قانونی طور پر ہی نکاح کے لیے وجہ جواز پیدا ہو گئی تو خود رب العالمین نے اس عقد کا تکفل فرمایا تھا جس پر حضرت زینبؓ عمر بھر فخر کیا کریں۔

اس واقعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی بزرگی اور عظمت شان کا پتہ ملتا ہے جن کی بشری زندگی میں کبھی کبھی خالق کائنات براہ راست خود بھی مداخلت فرما دیتا ہے۔ کجا بشر اور کجا وہ بشر۔

۱۰۹۳۔ حضرت جویریہؓ اس سے قبل اپنا امہات المومنین میں شامل ہونا خواب میں دیکھ چکی تھیں اور جب بیان خود اس

وَمَا هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ أُؤَدِّيْ عَنْكِ كِتَابَتَكِ وَاَتَزَوَّجُكِ قَالَتْ قَدْ فَعَلْتُ. قَالَتْ فَتَسَامَعَ تَعْنِي النَّاسُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ تَزَوَّجَ جُوَيْرِيَةَ فَاَرْسَلُوْا مَا فِيْ اَيْدِيْهِمْ مِنَ السَّبْيِ فَاَعْتَقُوْهُمْ وَقَالُوْا اَصْهَارُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا رَاَيْنَا امْرَاَةً كَانَتْ اَعْظَمَ بَرَكَةً عَلٰى قَوْمِهَا مِنْهَا اُعْتِقَ فِيْ سَبَبِهَا مِائَةُ اَهْلِ بَيْتٍ مِنْ بَنِي الْمُصْطَلِقِ. رواه ابوداؤد فی باب بیع المکاتب اذا فسخت الکتابة. قال ابن کثیر فی تاریخہ تفرد به ابوداؤد۔

۱۰۹۴- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ سَوْدَةُ بِنْتُ زَمْعَةَ عِنْدَ السَّكْرَانِ بْنِ عَمْرٍو اَخِيْ سُهَيْلِ بْنِ عَمْرٍو فَرَاَتْ فِي الْمَنَامِ كَاَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقْبَلَ يَمْشِيْ حَتّٰى وَطِئَ عَلٰى عُنُقِهَا فَاَخْبَرَتْ زَوْجَهَا بِذٰلِكَ فَقَالَ لَئِنْ صَدَقَتْ رُؤْيَاكِ لَاَمُوْتَنَّ وَلَيَتَزَوَّجَنَّكِ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ رَاَتْ فِي الْمَنَامِ لَيْلَةً اُخْرٰى اَنَّ قَمَرًا انْقَضَّ عَلَيْهَا مِنَ السَّمَاءِ وَهِيَ مُضْطَجِعَةٌ

بہتر بات رکھتا ہوں۔ وہ بولیں یا رسول اللہ وہ کیا؟ آپ نے فرمایا تمہارا زر کتابت تو میں اپنی جانب سے ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں۔ انہوں نے فوراً کہا مجھے بخوشی منظور ہے۔ یہ فرماتی ہیں لوگوں نے جیسے ہی یہ خبر سنی کہ آپ نے حضرت جویریہؓ سے نکاح کر لیا ہے اسی وقت ان کی قوم کے جتنے قیدی تھے سب نے آزاد کر ڈالے اور کہا یہ تو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال کا خاندان ہو گیا۔ صحابہ کا بیان ہے کہ ہم نے کوئی عورت جو اپنے خاندان بھر کے لیے حضرت جویریہؓ سے زیادہ باعث برکت ہو نہیں دیکھی۔ ان کی وجہ سے قبیلہ بنو مصطلق کے سو گھر آزاد ہو گئے۔

(ابوداؤد)

۱۰۹۴- ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت سودہؓ پہلے سکران نکاح میں تھیں جو سہیل بن عمرو کے بھائی تھے یہ خواب میں کیا دیکھتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سامنے سے تشریف لا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ نے ان کی گردن پر قدم مبارک رکھ دیا ہے۔ یہ خواب انہوں نے اپنے شوہر سے نقل کیا اس نے یہ تعبیر دی کہ اگر تیرا خواب سچا ہے تو میں عنقریب مرنے والا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تجھ کو اپنی زوجیت میں قبول فرمائیں گے۔ دوسری شب پھر کیا دیکھتی ہیں کہ وہ لیٹی ہوئی ہیں اور آسمان سے چاند ٹوٹ کر ان پر آ پڑا ہے اس خواب

انتظار میں لگ رہی تھیں کہ اس کی تعبیر کب پوری ہوتی ہے۔ واقعات سب خلاف جا رہے تھے یعنی اسیر ہو چکی تھیں اور پھر ثابت بن قیسؓ کے حصہ میں آ کر بظاہر اس مقام عالی تک رسائی کی اب کوئی امید نہ رہی تھی مگر جس کی قدرت نے حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان سے نکال کر تاج شاہی بخشا تھا اس کو اپنی قدرت کا نمونہ یہاں پھر دکھانا تھا یعنی عقد کتابت ایک بہانہ بن گیا اور اس طرح تقدیر کشاں کشاں ان کو در مقصود پر خود لے آئی حضرت صفیہؓ کا معاملہ بھی ان کے معاملہ سے بہت ہی ملتا جلتا ہے اور ابھی آپ کے سامنے آنے والا ہے۔ رہا ان کے حسن و جمال کا معاملہ تو وہ جب ثابت بن قیس ہی کی نظروں میں قابل اعتنا نہ تھا حتی کہ انہوں نے عقد کتابت منظور فرما لیا تو بجلا خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظروں میں بھلا کیا قابل التفات ہوتا۔ یوں کہیے کہ اس کا تذکرہ صرف ایک شدنی بات کے لیے پیرایۂ بیان بن گیا تھا۔ اس کی زیادہ تفصیل حضرت حفصہؓ کی حدیث کے تشریحی نوٹ میں عنقریب آپ کے ملاحظہ سے گزرے گی۔

فَاَخْبَرَتْ زَوْجَهَا فَقَالَ لَئِنْ صَدَقَتْ رُؤْيَاكِ لَمْ اَلْبَثْ اِلَّا يَسِيْرًا حَتّٰى اَمُوْتَ وَتَتَزَوَّجِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ فَاشْتَكَى السَّكْرَانُ مِنْ يَوْمِهِ ذٰلِكَ فَلَمْ يَلْبَثْ اِلَّا قَلِيْلًا حَتّٰى مَاتَ وَتَزَوَّجَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. كذا فى الخصائص ص۱۸۱ ج۱ عن ابن سعد كذا فى العمدة ص۶۰۳ ج۵۔

۱۰۹۵ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ بِعَيْنَيْ صَفِيَّةَ خُضْرَةٌ فَقَالَ لَهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا هٰذِهِ الْخُضْرَةُ بِعَيْنَيْكِ قَالَتْ قُلْتُ لِزَوْجِيْ اِنِّيْ رَأَيْتُ فِيْمَا يَرَى النَّائِمُ كَاَنَّ قَمَرًا وَقَعَ فِيْ حَجْرِيْ فَلَطَمَنِيْ وَقَالَ اَتُرِيْدِيْنَ مَلِكَ يَثْرِبَ قَالَتْ وَمَا كَانَ اَبْغَضَ اِلَيَّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَتَلَ اَبِيْ وَزَوْجِيْ فَمَا زَالَ يَعْتَذِرُ اِلَيَّ وَقَالَ يَا صَفِيَّةُ اِنَّ اَبَاكِ اَلَّبَ عَلَيَّ الْعَرَبَ وَفَعَلَ مَا فَعَلَ حَتّٰى ذَهَبَ ذٰلِكَ مِنْ نَفْسِيْ ۔ رواه الطبرانى ورجاله رجال الصحيح ۔كذا فى المجمع ص۲۵۱ ج۹۔

کو بھی انہوں نے اپنے شوہر سے ذکر کیا تو اس کی بھی اس نے یہی تعبیر دی کہ اگر تیرا خواب سچا ہے تو میں اب بہت کم زندہ رہونگا اور مر جاؤنگا اور تم میرے بعد نکاح کر لوگی پھر ایسا ہوا کہ اسی دن سکران بیمار پڑا اور کچھ مدت نہ گزری تھی کہ اس کی وفات ہوگئی اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرمالیا۔ (خصائص الکبریٰ)

۱۰۹۵ ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ کی آنکھ پر کچھ نیلا سا نشان تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تمہاری آنکھوں پر یہ سبز نشان کیسا ہے۔ انہوں نے کہا میں نے اپنے شوہر سے ایک بار کہا کہ جیسا لوگ خواب دیکھا کرتے ہیں میں نے بھی ایک خواب دیکھا ہے گویا چاند میری گود میں آگیا ہے۔ یہ سنتے ہی فوراً انہوں نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور تیرا ارادہ اس شاہ یثرب سے نکاح کرنے کا ہے۔ وہ کہتی ہیں (بھلا میرا ارادہ کیسے ہو سکتا تھا) میرے والد اور میرے شوہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتل کیے گئے تھے اس لیے مجھے تو آپ کی طرف سے اس کی سخت ناگواری تھی لیکن جب آپ نے مجھ کو یہ سمجھایا کہ تمہارے والد ہی تمام عرب کو میرے مقابلہ کے لیے چڑھا کر لائے تھے اور میرے ساتھ یہ یہ عداوتیں کی تھیں تو پھر میرے دل سے یہ بات نکل گئی۔ (الطبرانی)

۱۰۹۵ اسو الداد شوہر کے قتل کی تلخی کا احساس ہر ذی حس طبیعت کو طبعی اور غیر اختیاری طور پر ہوتا ہے حضرت صفیہؓ نے کس صفائی کے ساتھ کہہ دیا کہ اس سے میں بھی خالی نہ تھی لیکن جب ایمان کی حقیقی حلاوت دل کی تہ میں اتر جاتی ہے تو طبعی تلخی کا اثر بھی سب کافور ہو جاتا ہے حضرت صفیہؓ بھی کتنی بانصیب تھیں بھلا یہ کون تصور کر سکتا تھا کہ ایک یہودی سردار کی بی بی کل امہات المومنین کے زمرہ میں شامل ہونے والی ہیں۔ مگر چونکہ وہ عالم تقدیر کی نظر انتخاب میں آچکی تھیں لہذا کچھ دن قبل یہ راز سب سے پہلے خود ان ہی پر افشا کر دیا گیا۔ یہاں دیکھنا یہ بھی ہے کہ اس کا شوہر یہودی ہے مگر وہ اس خواب کو سنتے ہی کس طرح یہ تعبیر دیتا ہے کہ اس چاند کا مصداق عالم میں بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی بشر ہو نہیں سکتا۔ یہ بات بہت زیادہ قابل لحاظ ہے کہ آپ کی ازواج میں اس قسم کی بیبیاں ہونے کے باوجود جن کے باپ اور شوہر آپ کے حکم سے مقتول ہوئے ہوں تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کی پاکیزگی اور برتری کے خلاف مدت العمر کبھی ان کے منہ سے ایک کلمہ بھی نکلا تھا یہ آپ کی سچائی کا کتنا بدیہی ثبوت ہے عجب نہیں کہ اس قسم کے نکاحوں میں قدرت کا یہ بھی ایک راز ہو

۱۰۹۶- عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَدِمْنَا خَيْبَرَ فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ الْحِصْنَ ذُكِرَ لَهٗ جَمَالُ صَفِيَّةَ بِنْتِ حُيَيِّ بْنِ اَخْطَبَ وَقَدْ قُتِلَ زَوْجُهَا وَكَانَتْ عَرُوْسًا فَاصْطَفَاهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهٖ فَخَرَجَ بِهَا حَتّٰى بَلَغْنَا سَدَّ الصَّهْبَاءِ حَلَّتْ فَبَنٰى بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ صَنَعَ حَيْسًا فِيْ نِطَعٍ صَغِيْرٍ ثُمَّ قَالَ لِيْ اٰذِنْ مَنْ حَوْلَكَ فَكَانَتْ تِلْكَ وَلِيْمَةً عَلٰى صَفِيَّةَ ثُمَّ خَرَجْنَا

۱۰۹۶- انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم خیبر میں داخل ہوئے اور جب اللہ تعالیٰ نے خیبر کا قلعہ فتح کرا دیا (اور حسب ضابطہ دشمنوں کی اسارت اور قید کا معاملہ شروع ہو گیا تو اس میں صفیہؓ بھی قید کر لی گئیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُن کے جمال کا ذکر کیا گیا، ان کے شوہر جنگ میں مقتول ہو چکے تھے، تازہ تازہ ان کی شادی ہوئی تھی اور ابھی وہ دلھن ہی شمار ہوتی تھیں۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہؓ کی فرمائش پر پہلے ان کو دیدیا تھا۔ پھر کسی نے آپ سے عرض کی یا نبی اللہ وہ تو قبیلہ قریظہ و نضیر کی سردار عورت ہیں آپ کے سوا ان کو کسی اور کو دینا مصلحت نہیں ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بحق نبوت خود لے لیا اور ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں قبول فرما لیا۔ چلتے چلتے جب ہم لوگ مقام سد صہبا میں پہنچے تو اب صفیہؓ اپنے نسوانی عذر سے فارغ ہو چکی تھیں یہاں آپ نے اپنا ولیمہ کیا یعنی ایک مختصر سے دسترخوان پر تھوڑا سا حلوہ تیار کرا کے رکھا اور فرمایا کہ آس پاس جو لوگ ہوں ان کو بھی بلا لو حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ کا ولیمہ بس صرف یہ تھا۔ اس کے بعد جب ہم

۱۰۹۶- حضرت صفیہؓ کا یہ دوسرا نکاح تھا اور اب تیسری بار تقدیر الٰہی ان کو آپ کی زوجیت میں لانے والی تھی اس لیے ایک خواب کے ذریعہ پہلے ہی خود حضرت صفیہؓ کو اس کی بشارت دیدی گئی تھی۔ اب ذرا دیکھیے تقدیر کیا ہے اور واقعات کتنے خلاف ہیں یعنی وہ خود یہودی ہیں اور ایک یہودی کے نکاح میں ہیں پھر قلعہ خیبر سر ہو جانے کے بعد دحیہؓ کی درخواست پر ان کے نامزد بھی ہو چکی ہیں، لیکن اچانک تقدیر غالب آتی ہے اور واقعات کا رُخ کتنی دور جا کر پھر کدھر پلٹا ہے کسی کے منہ پر ان کے حُسن کا تذکرہ آتا ہے اور کسی کی زبان پر ان کی سرداری کا ذکر آجاتا ہے اور خود صحابہ کی جانب سے یہ مشورہ پیش ہو جاتا ہے کہ ان حالات میں مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر آپ ان کو بحق نبوت قبول فرما لیں تو پھر یہ سارے خیالات دلوں سے یکسر نکل سکتے ہیں۔ عرب میں باندیوں کا عام دستور تھا اس سے قبل اور اس کے بعد ہمیشہ ہر قسم کی باندیاں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں، حسین سے حسین بھی تھیں اور شریف سے شریف بھی مگر کبھی کسی کے دل میں یہ وسوسہ بھی نہ گذرا کہ فلاں باندی کو صرف آپ ہی کی ملک ہونا چاہیے مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوا بھی اور پھر دل ہی میں ختم ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ آپ کے روبرو بھی اس کا تذکرہ آگیا۔ اس کے بعد بھی قیاس یہی کہہ سکتا تھا کہ اب یہ بجائے دحیہؓ کے آپ کی باندی رہیں گی لیکن تقدیر میں طے شدہ یہ تھا کہ ان کو ام المؤمنین بننا ہے اس لیے آپ نے اس معاملہ کو قبول بھی کیا اور پھر ان کو آزاد کر کے اُن سے عقد فرمایا اور اس طرح حضرت صفیہؓ کا خواب پورا تو ہوا مگر ہوا اسباب کے پردہ میں۔ اس واقعہ کی اس وقت کچھ بھی اہمیت نہ ہوئی اور ان کا ولیمہ بھی جس انداز کا ولیمہ بحالت سفر ہو سکتا تھا ہو گیا اور ان کے سردار ہو کر دحیہؓ کی ملک میں آنے کی جو ناموزونیت کا خیال پیدا ہو کر کسی اختلاف کا موجب بن سکتا تھا اس طرح وہ بھی سب ختم ہو گیا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر نکاح میں خدا جانے کیا کیا اسرار ربانی ہوں گے جو ہم کو معلوم نہیں ہو سکے اگر اتفاق سے کسی روایت کی بدولت اُن کے رُخ سے کہیں ذرا سا نقاب اٹھ گیا ہے تو اس کی ابتدائی

إِلَى الْمَدِينَةِ فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحَوِّي لَهَا وَرَاءَهُ بِعَبَاءَةٍ ثُمَّ يَجْلِسُ عِنْدَ بَعِيرِهِ فَيَضَعُ رُكْبَتَهُ وَتَضَعُ صَفِيَّةُ رِجْلَهَا عَلَى رُكْبَتِهِ حَتَّى تَرْكَبَ رواه البخاری فی غزوة خیبر ص۶۰۶ ج۲ وفی باب ما یذکر فی الفخذ عنده فجاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا نبی اللّٰہ اعطیت دحیۃ صفیۃ بنت حیی سیدۃ قریظۃ والنضیر لا تصلح الا لک. ص۵۴

۱۰۹۷۔ عَنْ أُمِّ حَبِيبَةَ أَنَّهَا رَأَتْ فِي النَّوْمِ كَأَنَّ آتِيًا يَقُولُ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ فَفَزِعَتْ وَأَوَّلَتْهَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَزَوَّجُنِي ذکرہ ابن سعد کذا فی العمدۃ ص۵۰۹ ورواہ الحاکم فی المستدرک مفصلاً۔

مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پیچھے بیٹھنے کے لیے اپنی سواری پر پردہ کا انتظام فرما رہے ہیں (اس سے اب خوب معلوم ہو گیا کہ وہ باندی کی حیثیت سے نکل کر امہات المومنین کے شرف سے مشرف ہو چکی ہیں) آپ اپنے اونٹ کے قریب بیٹھ کر اپنا زانو ٹیک دیتے ہیں تاکہ حضرت صفیہؓ اس پر اپنا پیر رکھ کر بآسانی اونٹ پر سوار ہو سکیں۔ (بخاری شریف)

۱۰۹۷۔ حضرت ام حبیبہؓ بیان فرماتی ہیں کہ انہوں نے آپ کی زوجیت میں آنے سے قبل خواب میں دیکھا تھا کہ کوئی شخص ان کو یا ام المومنین کہہ کر پکار رہا ہے اس خواب سے یہ ذرا متحیر سی ہو گئیں اور انہوں نے اس کی یہی تعبیر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنی زوجیت میں قبول فرمائیں گے۔ (مستدرک)

چمک بھی نظر آ گئی ہو۔ ابوداؤد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بدلہ دحیہؓ کو آپ نے اپنی جانب سے سات راسیں عطا فرمائی تھیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت خضرؑ کی پوری پوری سرگزشتیں الٰہی حکمت اور واقعات کی سطحوں کی بے ارتباطی اور ان کے اندرونی ارتباط کی واضح مثالیں ہیں یعنی مثلاً مقصد تو یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کی نظروں میں اونچے سے اونچا ثابت کیا جائے۔ مگر واقعات کی سطح میں مسلسل ذلتیں ہی ذلتیں نظر آ رہی ہیں، موت کے کوئیں میں گرنا، غلام بن کر مصر کے بازار میں فروخت ہونا اور مجرم کی حیثیت میں قید میں پڑ جانا ایک سے ایک بڑی ذلت تھی کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا نتیجہ جو آخر میں ظاہر ہوگا وہی ان کے خواب کی تعبیر ہوگی۔ پھر جب آخر کار اس کی تعبیر کا دن آیا تو ظاہر ہو گیا کہ یہی ذلتوں کے گڑھے درحقیقت عزت و احترام کی سیڑھیاں تھیں۔

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کا مقصد تو اپنے محسن ملاحوں پر احسان کرنا تھا مگر اس کی صورت کیا ہی کہ ان غریبوں کے رزق کا جو چھوٹا سا سہارا تھا اس کو بھی توڑ دیا۔ ان کا مقصود ایک بچہ کے والدین کی خیر خواہی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان کی ہزاروں آرزوؤں کے پھول کو مسل ڈالا۔ کون باور کر سکتا تھا کہ ان واقعات کی تہ میں کوئی معقول حکمت بھی ہو سکتی ہے لیکن جب حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے چہروں سے ذرا نقاب اٹھایا تو معلوم ہو گیا کہ یہ تمام واقعات بڑی حکمتوں پر مبنی تھے۔

پس اسی طرح آپ انبیاء علیہم السلام کے حالات زندگی پر جلدی سے تنقید کرنے کی عادت نہ ڈالیں اور ان کی حکمتوں کے دریافت کے درپے بھی نہ ہوں۔ ایمان کا راستہ یہ ہے کہ اگر کہیں آپ کو شبہ گزرتا بھی ہو تو اس کو اپنی عقل کی کوتاہی سمجھیں۔ یہی بات دانشمندی کی بھی ہے اور دیانت کی بھی۔ اگر اس کا کچھ شوق دامنگیر ہو تو آپ بھی کسی خضر راہ کی تلاش رکھیے ممکن ہے کہ حکیم علی الاطلاق کی حکمتوں کا کوئی شمہ آپ کے علم میں آ جائے۔ (باقی بر صفحہ ۳۲۷)

۱۰۹۸ - عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ تُصِيْبُهُ مُصِيْبَةٌ فَيَقُوْلُ مَا اَمَرَهُ اللّٰهُ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِىْ فِىْ مُصِيْبَتِىْ وَاخْلُفْ لِىْ خَيْرًا مِّنْهَا اِلَّا اَخْلَفَ اللّٰهُ لَهٗ خَيْرًا مِّنْهَا فَلَمَّا مَاتَ اَبُوْ سَلَمَةَ قُلْتُ اَىُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ مِّنْ اَبِىْ سَلَمَةَ اَوَّلُ بَيْتٍ هَاجَرَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اِنِّىْ قُلْتُهَا فَاَخْلَفَ اللّٰهُ لِىْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ رواه مسلم

۱۰۹۸ - حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ وہی کلمات پڑھ لے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا ہے یعنی انا للّٰہ وانا الیہ راجعون اللھم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خیرا منھا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں ضرور اس سے بہتر اس کو اور عنایت فرما دیگا۔ جب ابو سلمہؓ میرے شوہر کا انتقال ہوا تو میں نے اپنے دل میں سوچا کہ بھلا ان سے کون سا مسلمان افضل ہو سکتا ہے جنہوں نے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے ان کلمات کو پڑھ ہی لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف بخشا۔ (مسلم شریف)

(بقیہ صفحہ ۳۲۶) اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقوق شناسی کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ اگر باندیوں کو آزاد کر کے ان سے نکاح کرنے کی ترغیب آپ نے اپنی امت کو دی ہے تو اس سے اپنے نفس کو بھی عملاً مستثنیٰ نہیں رکھا اور اس طرح باندیوں کی آزادی کا سامان اپنے قول و عمل سے مہیا فرما دیا ہے۔ اگر اسلام کا مقصد کسی کو دائمی غلامی میں رکھنا ہوتا تو ہرگز اس سخاوت کے ساتھ باندیاں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں صدیق اکبرؓ کی صاحبزادی کے برابر بن کر نظر نہ آسکتیں۔

۱۰۹۸ - دیکھیے یہاں بھی حضرت ام سلمہؓ کو کہیں دور دور تک اس کا وسوسہ نہیں گزرتا تھا کہ ایک دن ان کو ام المومنین کے خطاب سے سرفراز ہونا ہے لیکن اس کے باوجود وہ آپ کے فرمان پر پورے یقین کے ساتھ عمل کر لیتی ہیں۔ اس کا صلہ پھر جو ملت وہ پاتی ہیں وہ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ ہمارا مقصد یہاں نہ تو تعدد ازدواج کی حکمتوں پر بحث کرنا ہے اور نہ خاص ان برکات کا تذکرہ کرنا ہے جو آپ کے نکاحوں میں ظاہر ہوئی تھیں بلکہ صرف ان احادیث کو پیش کرنا تھا جو چند ازواج مطہرات کے فضائل کی شکل میں ہمارے سامنے آگئی تھیں۔ علماء کو چاہیے کہ بقیہ ازواج مطہرات کے لیے بھی وہ اس قسم کی احادیث کی تلاش کریں اور ان کو بھی ان حدیثوں کے ساتھ اضافہ کر لیں

ومن خص خواص اہل الجنۃ فیہم عصمتہم من الذنوب صغائرہا وکبائرہا

انبیاء علیہم السلام میں اہل جنت کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ تمام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں

عنوان مذکور درحقیقت علمِ کلام کا موضوع تھا لیکن اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر علم اصول فقہ میں بھی اس پر بحث کی گئی ہے اور محدثین و مفسرین نے بھی اس میں کافی حصہ لیا ہے۔ اس لیے ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ اس موضوع کے متعلق تھوڑا سا اظہار خیال کر دیا جائے۔ مگر ہمارا اہم مقصد ان جزئی واقعات کی توجیہ یا ان آیتوں کی تفسیر کرنی نہیں ہے جو یہاں ملحدین کی نظروں میں ہمیشہ سے کھٹکتی چلی آرہی ہیں، بلکہ اس پر حدیثی روشنی میں مختصر اصولی حیثیت سے بحث کرنی ہے۔ آیتوں کی تفسیر پر کتب تفسیر اور کتب کلام میں سیر حاصل بحثیں کی جا چکی ہیں وہاں دیکھ لی جائیں۔

مسئلہ عصمت میں اختلاف کا سبب

کتب کلام وغیرہ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس مسئلہ پر غور و خوض کی ابتدائی بنیاد ہی ان آیات پر قائم کی گئی ہے جو بظاہر عصمت کے خلاف نظر آتی ہیں، اس لیے لامحالہ مسئلہ کا رُخ شروع ہی سے بدل گیا ہے، پھر متکلمین کی بحث و نظر کا میدان چونکہ زیادہ تر عقلی ٹھہر چکا تھا اس لیے ان کے نزدیک کسی قطعی مسئلہ کے زیر تردد آجانے کے لیے صرف عقلی احتمالات کا وجود بھی کافی ہو جاتا ہے چہ جائے کہ وہ مسئلہ جہاں قرآنی آیات بظاہر خلاف نظر آرہی ہوں بھلا ان کے ذوق پر وہ کیسے قطعی مسئلہ بن سکتا تھا۔ اس کے برخلاف فقہاء کی جماعت ہے وہ ہمیشہ اپنے فیصلے واقعات کی روشنی میں کرتے ہیں اور کسی جگہ صرف عقلی احتمالات سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس لیے یہاں بھی فقہاء حنفیہ تو تقریباً یک زبان ہو کر انبیاء علیہم السلام کے مطلقاً عصمت کے قائل ہیں۔ اگر ان اصولی نظریات کے اختلاف کو سامنے رکھا جائے تو قیاس کہتا ہے کہ شاید اس مسئلہ میں درحقیقت کوئی اختلاف ہی نہ ہوگا۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف لفظی اختلاف کے قریب ہے، جو جماعت یہاں اختلاف رکھتی ہے وہ درحقیقت یا تو اس کی قطعیت میں اختلاف رکھتی ہے یا صرف معصیت کے امکان و جواز میں کلام کر رہی ہے اور اگر ان کے وقوع کی بھی قائل ہے تو اس کی نظر ان آیات پر ہے جو بظاہر اس کے خلاف نظر آتی ہیں۔ اور جس جماعت نے فیصلہ کی بنیاد خارجی واقعات پر رکھی ہے وہ بلا اختلاف عصمت کی قائل ہو گئی ہے۔

ہم یہاں علمی مباحث پھیلانا نہیں چاہتے بلکہ حقائق کی دنیا میں اس پر نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے

ضروری ہے کہ عصمت کا مفہوم معلوم کرلیا جائے اس میں بھی علماء کے کلمات بہت منتشر ہیں۔

عصمت کی حقیقت امام ماتریدی کی نظر میں

امام ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ عصمت حق تعالیٰ کی اس خاص عنایت و مہربانی کا نام ہے جو انبیاء علیہم السلام کو ہر وقت خدا تعالیٰ کی حکم برداری پر مستعد رکھتی ہے اور اس کی لوئی سی معصیت کے ارتکاب کرنے سے بھی دور رکھتی ہے مگر اس طریقہ پر نہیں کہ یہ طاقت و قوت ہی ان کی ذات سے سلب کرلی جائے کیونکہ جس کو مکلف بنایا گیا ہے ضرور رہے کہ اس میں صفت اختیار باقی رکھی جائے تاکہ جزاء و ثواب کا مسئلہ معقول رہے اور جس مخلوق میں یہ صفت پیدا نہیں فرمائی گئی اس کو مکلف بھی نہیں بنایا گیا پھر اس کے اعمال سے جزاء و سزا کا تعلق بھی نہیں رکھا گیا۔ (نسیم الریاض ص ۴۴/۴)

امام ماتریدیؒ کے ان الفاظ کی تشریح حضرت شاہ اسمٰعیلؒ نے اپنے سادہ الفاظ میں اس طرح فرمائی ہے۔

ومعنی عصمت آنست کہ آنچہ بایشاں تعلق میدارد از اقوال و افعال و عبادات و عادات و معاملات و مقامات و اخلاق و احوال آں ہمہ را حق جل وعلا از مداخلت نفس و شیطان و خطاء و نسیان بقدرت کاملہ خود محفوظ می دارد و ملائکہ حافظین را بر ایشاں می گمارد تا غبار بشریت دامن پاک ایشاں را نہ آلاید (تنبیہ ثانی در حقیقت ولایت از منصب امامت ص[illegible])

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے معنے یہ ہیں کہ ان کے اقوال ہوں یا افعال و عبادات ہوں یا عادات، معاملات و مقامات ہوں یا اخلاق و احوال ان سب کو حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے نفس و شیطان کی دخل اندازی سے محفوظ فرماتا ہے خواہ خطاء و نسیان کی صورت ہی سے کیوں نہ ہوں اور اپنے حفاظت و نگرانی کرنے والے فرشتے ان کے ساتھ لگا رکھتا ہے تاکہ غبار بشریت بھی ان کے دامن پاک پر ذرا سا دھبہ لگا سکے۔

مؤلف کے نزدیک مسئلہ عصمت میں غور و خوض کے لیے سب سے اہم نقطہ انبیاء علیہم السلام کی صفات و ملکات سے بحث ہے

ہمارے نزدیک یہ مسئلہ چونکہ خود ان کی ذات اور ان ہی کے کار و کردار سے متعلق ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہاں سب سے پہلے ان کے جوہر فطرت، ان کی تربیت، ان کی صفات و ملکات، ان کی بعثت کی غایت و غرض، ان کے منصب کی اہمیت سے پھر ان کے طریق تعلیم سے اور جو اس کے اثرات خود ان کی ذات، ان کے ہم جلیسوں اور ان کے تمام ماحول پر پھر ان کی تمام امت پر نمایاں ہوتے چلے آئے ہیں ان سب سے بحث کی جائے۔ اگر یہ تمام امور ان کے حق میں طے ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی معصومیت کا عقیدہ واقعات کی روشنی میں ایک بدیہی مسئلہ ہو جانا چاہیے۔ اس تفصیلی نظر کے بعد جب آپ ان آیات کی طرف نظر اٹھائیں گے تو یقیناً آپ کا فیصلہ بدل جائیگا اور جو آیات پہلے آپ کو اس مسئلہ کے خلاف نظر آرہی تھیں اب وہی اس مسئلہ کا سب سے بڑا ثبوت نظر آنے لگیں گی۔ یہاں براہ راست صرف ان خطابات الٰہیہ پر فیصلہ کر ڈالنا جن کے لب و لہجہ میں حالات و مخاطب کی رعایت سے گرمی و نرمی پیدا ہو جاتی فصاحت و بلاغت کا ایک عام باب ہے مناسب نہیں ہے۔ یہاں نہ تو صرف عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں صرف "روح اللہ" اور "کلمۃ اللہ" کی نسبت سے کوئی نیا مقام تراش لینا درست

ہے، اور اسی طرح نہ حق تعالیٰ کے اپنے مخصوص بندوں کے ساتھ کسی عتاب آمیز لہجہ سے ان کے خلاف کوئی اصولی نتیجہ نکال لینا صحیح ہے۔

اس حقیقت کے اصولاً تسلیم کر لینے کے بعد اگر اوراق نقل میں کوئی جزئی واقعہ ایسا ملتا بھی ہو جو ایک ثابت شدہ حقیقت کے خلاف نظر آئے تو کسی عاقل کے لیے بھی محض ایک مشتبہ یا مجمل اور شاذ واقعہ کی بنیاد پر اس قطعی فیصلہ کو رد کر دینا جائز نہیں ہو سکتا آج بھی تاریخ کے اصولی فیصلے جزئی واقعات کی بنار پر کبھی قابل ترمیم تصور نہیں کیے جاتے بلکہ ان واقعات ہی کے لیے وجوہ و اسباب تلاش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کو اصولی تحقیق کی کوئی ٹکراؤ باقی نہ رہے اس لیے ہمارے نزدیک یہاں بھی بحث و نظر کا یہی طریقہ قائم رکھنا چاہیے۔

لہٰذا اگر مفسرین و محدثین نے اس جگہ کچھ جزئی واقعات کی توجیہات بیان فرمائی ہیں تو ان کو صرف ان کے حسن ظن کا نتیجہ سمجھ لینا صحیح نہیں بلکہ وہ بھی اسی اصولی حقیقت پر مبنی ہیں۔ پھر جیسا اس قسم کے مقامات میں گفتگو کرتے کرتے قریب و بعید ہر قسم کے احتمالات زیر بحث آجاتے ہیں وہ یہاں بھی زیر بحث آگئے ہیں سا د مر جب علمار اسلام کو اعدار اسلام کے ساتھ بحثوں کی نوبتیں آئیں تو بحث و جدل کے میدان میں پڑ کر ایک معقول سی معقول بات بھی جس طرح محل بحث بن جایا کرتی ہے یہ مسئلہ بھی نظری اور محل بحث مسئلہ بن گیا ہے۔

افسوس ہے کہ گزشتہ اقوام و امم نے اپنی نااہلیت کی بدولت اپنے اپنے انبیار علیہم السلام کی کوئی ایسی مستند تاریخ ہمارے سامنے نہیں چھوڑی جو کسی بنیادی مسئلہ کے فیصلے کے لیے قابل اعتماد سند بنتی سان کی سیرت کے جو گنے چنے واقعات ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں ان میں قابل اعتماد حصہ صرف اتنا ہی ہے جو کسی تقریب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا ہے اور بس۔ اس لیے اب ہمیں صرف آپ ہی کی حیات طیبہ پر غور کرنا ہے۔ کیونکہ بلحاظ نبوت و رسالت یہ تمام جماعت ایک ہی جماعت تھی نبوت کے لوازم سب میں یکساں تھے فرق جو کچھ تھا وہ فضائل و کمالات میں تھا۔ قرآن کریم نے بھی آپ کے معاملہ میں جا بجا بیان کا یہی نہج اختیار کیا ہے اور جب کبھی کفار نے آپ کی دعوت پر اعتراض کیا یا آپ کی ذات پر حملے کیے یا آپ سے ناجائز فرمائشیں شروع کیں یا ایک موقع پر خود مسلمانوں کی جماعت آپ کی وفات کی خبر سے ضرورت سے زیادہ دل شکستہ ہونے لگی تو اُن سے یہی ایک بات کہی گئی ہے کہ یہ سنت سب رسولوں کی سنت ہے جو پہلے بھی سب پر جاری ہوتی چلی آئی ہے لہٰذا اگر آپ کے اوپر بھی جاری ہوتی ہے تو تعجب کیوں ہے؟ چنانچہ ارشاد ہے۔

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ۔ تم سے بھی وہی باتیں کہی جاتی ہیں جو تم سے پہلے پیغمبروں کو کہی گئی ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کی تسلی کے لیے بھی یہی فرمایا وما محمد الا رسول۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی رسولوں کی طرح ایک

رسول ہی ہیں اور جس طرح دنیا سے گذرنے کی سنت ان پر جاری ہوتی رہی ہے، اگر آپ پر بھی جاری ہو جائے تو گھبرانے کی اور اس کو نئی بات سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کے اس طرز سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں نفس نبوت و رسالت کے جو لوازم تھے وہ سب میں یکساں تھے[1]۔ اس لیے اگر ہمیں آپ کی حیات طیبہ سے آپ کی پوری پوری معصومیت کا ثبوت ملتا ہے تو پھر جملہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں بھی یہی ناطق فیصلہ سمجھا جائیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ نبوت اور عصمت ایک ہی حقیقت کے دو اعتبارات سے دو نام ہیں یعنی جو معصوم ہے وہ صرف نبی ہی کی ایک ذات ہے اور جو نبی ہے وہ یقیناً معصوم بھی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ نبوت کسب و ریاضات سے بتدریج حاصل ہونے والی نعمتوں میں سے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ نقص سے کمال تک کی راہ طے کرنے میں معصیتوں کی ٹھوکریں لگ جائیں لیکن جہاں کسب و اکتساب کا دخل نہ ہو اور معاملہ براہِ راست خدا تعالیٰ کے اجتباء و اصطفاء کا آجائے۔ پھر وہاں کسی ٹھوکر کا احتمال کیا ممکن۔ حضرت مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں "از فتن تا بردن فرق ظاہر است" یعنی خود چلنے میں اور کسی دوسرے کے لے چلنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ صفت اجتباء و اصطفاء کے تحت پروردہ خود نہیں چلتے کہ بشری ضعف ان کے لیے ٹھوکر کا باعث بن جائے۔ یہاں ان کو بچا بچا کر خود قدرت لے چلتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلاً و من الناس (الحج) — یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو نوع ملکی اور نوع بشری میں سے اپنی رسالت کے لیے انتخاب براہِ راست خود ہی فرماتی ہے۔

واصبر لحکم ربک فانک باعیننا۔ (الطور) — آپ اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کیجیے۔ آپ تو ہماری نگرانی میں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

ولولا ان ثبتنٰک لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلاً (بنی اسرائیل) — اگر ہم آپ کو تھام نہ لیتے تو قریب تھا کہ کچھ نہ کچھ آپ ان کی طرف جھک جاتے۔

ترجمان السنۃ ص۳۱۲ ج۱ و ص۳۱۳ میں ایک صحیح حدیث آپ کے ملاحظہ سے گزر چکی ہے کہ بندہ عبادات نافلہ کرتے کرتے آخر اس بلند مقام تک جا پہنچتا ہے جہاں رضاء الٰہی میں وہ اس طرح گم ہو کر رہ جاتا ہے کہ پھر نہ خود اس کی کوئی ہستی باقی رہتی ہے اور نہ اس کے اعمال کی بلکہ وہ سب براہِ راست حضرت حق سبحانہ کی طرف منسوب ہونے لگتے ہیں۔ وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے تو صرف وہی جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدہ ہو

[1] امام قرطبیؒ ایک موقعہ پر لکھتے ہیں: ان المنع من التفضیل انما ہو من جہۃ النبوۃ التی ہی خصلۃ واحدۃ لا تفاضل فیہا و انما التفاضل فی الاحوال والخصوص والکرامات ... تفسیر قرطبی ص۲۶۳ ج۲

اور ہاتھ بڑھاتا اور قدم اٹھاتا ہے تو صرف اسی طرف جدھر حق جل وعلا کی مرضی ہوتی ہے اب سوچیے کہ اس کی اس طرح گم شدگی کے بعد اس کے اعضاء و جوارح میں کیا کسی معصیت کے لیے حرکت کرنے کی مجال باقی رہ سکتی ہے اور جب اس کے اعضاء مرضیات ایزدی کے اس طرح منقاد و مطیع بن جائیں تو اس کے اعمال میں کیا کسی ادنیٰ سی معصیت وہ بھی ارادی معصیت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے جب ان افراد کا حال یہ ہو جن کے کمالات کسب و اکتساب کا ثمرہ ہوتے ہیں تو پھر ان اولوالعزم ہستیوں کی عصمت کا پوچھنا کیا ہے جن کو یہ نعمت صفت اجتباء و اصطفاء کی بدولت روز اول ہی سے میسر ہو۔ جن کی عصمت کے اندازہ کرنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ جو ان کے نقش قدم پر چل پڑا اس کے اعضاء بھی خدائی معصیت کے لیے شل ہو گئے۔ انبیاء علیہم السلام کی اس اجتبائی صفت کا نظارہ کرنے کے لیے صوفیاء کرام اور ان سے پہلے صحابہ عظام کے اعمال پر نظر ڈال لینا چاہیے۔ یہاں حدیث ۲۱ ترجمان السنۃ ص۳۱ کے نوٹ پر نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ اس جگہ ترجمان السنۃ کا مقدمہ از ص۱۳۵ تا ص۱۴۳ ملاحظہ فرمائیے

انبیاء علیہم السلام اور رسولوں کی خلقت ہی عام انسانوں سے الگ ہوتی ہے، ان کی تربیت کا طریقہ بھی سب سے الگ ہوتا ہے۔ ان کی طفولیت اور ان کا شباب بھی الگ، ان کا تجرد اور ان کی حیات ازدواجی بھی الگ، ان کا رضاء و غضب اور جد و ہزل بھی سب سے الگ، ان کی عبادت بھی سب سے الگ ہوتی ہے اور ان کا استغفار و توبہ بھی سب سے الگ، ان کا ثواب بھی سب سے الگ ہوتا ہے اور ان سے مواخذہ بھی سب سے الگ۔ اور یہ سب کچھ اس لیے کہ نظر ربوبیت شروع ہی سے خود ایک الگ نوع کی طرح ان کو پیدا فرماتی ہے اور پھر اپنی رسالت کے لیے خود ہی ان کا انتخاب فرماتی ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ یعنی پیدا کرنا اور پھر پیدا کر کے جس کو چاہیں اس کو چھانٹ لینا یہ دونوں صفتیں

مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (القصص) تیرے پروردگار کے ساتھ مخصوص ہیں اس میں کسی کا حصہ نہیں لگتا۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ یعنی کہتے ہیں کہ یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے شخص کے اوپر

رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (الزخرف) کیوں نہ اتارا گیا؟

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ (〃) اچھا کیا تیرے پروردگار کی رحمت یہ تقسیم کرتے ہیں۔

اور یہ انتخاب وہ خود اس لیے کرتی ہے کہ اس منصب جلیل کی صلاحیتوں کو اس کے سوا کوئی دوسرا پا ہی نہیں سکتا۔

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (الانعام) اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ رسالت کا کونسا محل ہے اور وہ اپنی پیغمبری کس کو عنایت فرمائے

انبیاء علیہم السلام کا جوہر فطرت

ان کی خلقت اور ان کے اختیار و انتخاب کی یہ اہمیت کیوں ہوتی ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ بھی مشرکوں میں ایک مشرک، کاہنوں میں ایک کاہن اور شاعروں میں ایک شاعر بن کر پیدا ہوں

والعیاذ باللہ یا اس لیے کہ شرک وکفر کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں توحید وعبودیت کی شمع فروزاں بن کر چمکیں۔ اسی لیے اور یقیناً اسی لیے ان کا خاکی قالب گو وہی ہوتا ہے جو عام انسانوں کا مگر ان کا جوہرِ فطرت خلقۃً ایسا پاکیزہ اور منور بنایا جاتاہے کہ اس کو حرفِ معصیت سے ذرا آشنائی نہیں ہوتی پھر اس کو طرح طرح سے اور مجلیٰ کیا جاتاہے یہاں تک کہ ان کے خواب اور بیداری کی دونوں حالتیں یکساں ہوتی ہیں وہ اپنی حالت خواب میں بھی عام انسانوں کی بیداری سے زیادہ بیدار رہتے ہیں محبت وبغض کے طوفان خیز جذبات ان کے بحرِ اعتدال میں ذراسی جنبش بھی پیدا نہیں کرسکتے وہ ہر حالت میں انصاف پسند، حق گو اور بے لاگ انسان ہوتے ہیں خلق اللہ کی ہمدردی سے ان کے سینے اس درجہ لبریز ہوتے ہیں کہ ان کی غمخواری میں ان کی جان گھلی جاتی ہے۔ لعلك باخع نفسك الا یکونوا مؤمنین ان کے سینے حق جلّ علا کے احکام رضا وغضب کے لیے آئینہ ہوتے ہیں اور ان کی ان ہی کامل صلاحیتوں کی وجہ سے خالقِ کائنات براہ راست خود ان کو اپنی شرفِ ہمکلامی سے نوازدیتا ہے ولما بلغ اشدہٗ واستوٰی اٰتیناہ حکما وعلما۔ یہ شرف یا صرف اُس نوعِ ملکی کو میسر ہے جو فطرۃً معصوم پیدا کی گئی ہے ایسی معصوم کہ اس کو حق تعالیٰ کی معصیت کرنے کی قدرت ہی نہیں دی گئی یا پھر نوعِ بشری میں اُن مخصوص افراد کو میسر ہے جن میں اختیار کی صفت گو موجود ہو مگر ان کی معصومیت پر فرشتوں کی معصومیت بھی رشک کرتی ہے اس لیے ارشاد ہوا ہے اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلاً ومن الناس (الحج) آیت بالا میں بعض انسان اور فرشتوں کو غالباً اسی نکتہ کے پیش نظر جمع کیا گیا ہے کہ نظر اصطفا جب اپنی رسالت کے لیے کسی کا انتخاب کرنا چاہتی تو اسی کا انتخاب کرتی ہے جس میں اس کی نافرمانی کرنے کا کوئی احتمال نہ ہو اس لیے یا وہ اس نوع کے افراد کا انتخاب کرتی ہے جس میں معصیت کرنے کا اختیار ہی نہیں اور اگر دوسری نوع میں کسی کا انتخاب کرتی ہے تو اُن افراد کا کرتی ہے جن سے معصیت کے صدور کا کوئی احتمال نہیں۔ ملوک دنیا بھی انتخاب میں کسی ایسے شخص کا انتخاب نہیں کرتے جس میں ان کے نزدیک ایک فیصدی بھی ان کے خلاف جانے کا احتمال ممکن ہو لیکن چونکہ ان کا علم ناقص در ناقص ہوتا ہے اس لیے اس میں ان کو غلطیاں لگتی ہیں اور بعض مرتبہ ان کے تباہ کن نتائج بھی دیکھنے پڑ جاتے ہیں۔ پروردگارِ عالم کے علم میں یہ امکان نہیں اس لیے اپنی رسالت کے انتخاب فرمانے کا حق اس نے خود اپنا رکھا ہے اور اس کو نہ تو کسی انسان کے مجاہدہ وریاضت پر موقوف رکھا ہے اور نہ کسی کی دعا وسفارش پر

منصب نبوت کی اہمیت

خداتعالیٰ کی رسالت وسفارت کا کام اتنا نازک ہے کہ اگر اس میں ذراسی اونچ نیچ ہوجائے تو کارخانۂ رسالت سارا کا سارا درہم وبرہم ہوجائے۔

انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے لیے اسوۂ حسنہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔

خداتعالیٰ کے مقدس رسول دنیا میں آکر نظام مدارس کی طرح صرف زبانی تعلیم نہیں دیتے بلکہ ان کی تعلیم کا نقشہ وہ ہوتا ہے جو ماں باپ کا اپنی اولاد

کے بے ہوا کرتا ہے یعنی جس طرح بچہ والدین کی فصیح یا غیر فصیح زبان سُن سُن کر اسی طرح کی زبان سیکھتا چلا جاتا ہے
اور جس طرح کہ ان کے مہذب یا غیر مہذب افعال دیکھ دیکھ کر اسی کی نقل اُتارنے لگتا ہے۔ اسی طرح رسول کی
مجسم ذات تمام امت کے لیے نمونہ بنا کر بھیج دی جاتی ہے اور مخلوق خدا کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جس طرح وہ اس
کے مقدس کلمات سن کر علم دین حاصل کرتے ہیں اسی طرح اس کی ہر ہر نقل و حرکت کو سامنے رکھ کر دین کا دوسرا
حصہ سیکھیں یہاں قول و فعل کی تخصیص کے بغیر رسول کی ذات تمام کی تمام دین کا مکمل نقشہ ہوتی ہے اسی لیے
ہر ہر امر میں ان کی اتباع کا حکم دیا جاتا ہے اگر یہاں کچھ احکام مستثنیٰ ہو سکتے ہیں تو صرف وہ کہ جن کے متعلق خود ہی
کسی خصوصیت کا اعلان فرمادے۔ ان کو اس کا بھی اختیار حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو کسی مصلحت کے پیش نظر
عام قانون سے کسی کو مستثنیٰ بھی فرمادیں کیونکہ رسولوں کے عواطف و میلانات بھی اللہ تعالیٰ ہی کے زیر نگرانی
رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی عام تشریع اور اس سے استثناء یہ دونوں باتیں اسی کی مشیت کا ظل ہوتی ہیں
ان کا سکوت اختیار کر لینا بلکہ کسی جانب سے منہ موڑ لینا یا ہاتھ کا ذرا اشارہ کر دینا جیسے امور بھی دین کے باب میں
حجت شرعیہ شمار ہوتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام پیدائشی طور پر نفس مطمئنہ رکھتے ہیں، اور ضلالت کی تمام طاقتیں ان کے سامنے سرنگوں رہتی ہیں

انسان میں شر کی طاقتیں صرف دو ہیں ایک نفس یہ اندرونی طاقت ہے۔ دوسری شیطان یہ بیرونی طاقت ہے یہاں ان کو پیدائشی
طور پر وہ نفس مرحمت ہوتا ہے جو فطرۃً ہر معصیت سے نفور اور نشۂ عبودیت سے چور ہوتا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کی زبان مبارک سے ولادت کے بعد ہی جو کلمہ نکلا تھا وہ یہی تھا۔ اِنّی عبد اللہ۔

اب اس سے اندازہ لگالینا چاہیے کہ وہ اپنے غیر شعوری دور حیات میں بھی توحید و عبودیت کا کتنا شعور
رکھتے ہیں اگر اس دار الابتلاء میں اپنی ابتدائی حیات میں اپنی شانِ عبودیت کا عام طور پر اس طرح اظہار کر دینا
کہیں خلاف مصلحت نہ ہوتا تو شاید خدا تعالیٰ کا ہر ہر نبی اپنی ولادت کے ساتھ ان ہی کلمات سے مترنم نظر آتا مگر
حکیم مطلق کی حکمت نے اس قسم کی کھلی ہوئی شہادت صرف اسی رسول کے ساتھ خاص فرمادی تھی جن پر
خدائی کی تہمت لگائی جانے والی تھی تاکہ الوہیت کی اس بہتان طرازی میں کسی کے لیے بھی عذر و معذرت کا
موقعہ باقی نہ رہے۔ انبیاء علیہم السلام کے نفوس میں تزکیہ کی یہ صفت اتنی کامل ہو جاتی ہے کہ آزمائش کے
کسی نازک سے نازک موقعہ پر ان سے ذرا سی کمزوری کا احتمال نہیں ہوتا۔ یہاں زنانِ مصر اور حضرت یوسف
علیہ السلام کے نفس مطمئنہ کی استقامت کا نقشہ سامنے رکھیے تو آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ ان کی آزمائش کا
میدان جتنا خطرناک ہوتا چلا گیا ان کی عفتِ نفس کا جوہر اتنا ہی اور زیادہ کھلتا چلا گیا۔ انبیاء علیہم السلام خود
تو کسی خلاف ورزی کا تصور کیا لاسکتے ہیں دوسروں کی خلاف ورزی بھی ان کے آئینۂ فطرت کو مکدر کرنے

کے لیے کافی ہوتی ہے اس لیے نہ وہ احکام الٰہیہ کے خلاف خود کوئی قدم اٹھاتے ہیں اور نہ کسی کا قدم ان کے خلاف اٹھتا ہوا دیکھنا برداشت کر سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی سرگزشت قرآن کریم کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے کتنی مشقتوں اور تمناؤں کے بعد تو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس پہنچے تھے پھر کتنے عہد و پیمان کرنے کے بعد بھی صرف اپنی نبیانہ فطرت کی بدولت چند قدم بھی ان کے ساتھ نہ چل سکے۔ حتیٰ کہ جب اُنھوں نے دیکھ لیا کہ اب ان کے لیے صرف دو ہی راہیں باقی رہ گئی ہیں رفاقت قائم رکھنی ہے تو ہر معاملہ میں سکوت کرنا ہوگا اور اگر ٹوکنا ہے تو فراق۔ تو بڑی خوشی کے ساتھ انھوں نے دوسری صورت کو پسند فرما لیا مگر اس کا اقرار نہ کیا کہ اپنی شریعت کے خلاف ایک قدم بھی اٹھتا ہوا دیکھ کر وہ سکوت کر سکیں گے۔ حضرت خضر علیہ السلام کو ان کی اس نبیانہ فطرت کا پورا اندازہ تھا اس لیے اُنھوں نے پورے وثوق کے ساتھ سفر شروع کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرے ساتھ رہنا اور ہر معاملہ پر سکوت کرنا یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے آپ اس کا تجربہ نہ کریں، چنانچہ وہی ہوا۔ قرآن کریم نے اس سرگزشت کی اتنی اہمیت محسوس کی کہ ایک سورت میں مستقل طور پر اس کی پوری پوری تفصیلات بیان فرما دیں تاکہ منجملہ اور رموز کے یہ بھی اندازہ ہو جائے کہ نبی کی معصومانہ فطرت کس درجہ بلند ہوتی ہے۔ خود معصیت کرنا تو درکنار کسی دوسرے کا قدم معصیت کی طرف اٹھتا ہوا دیکھ کر بھی وہ سکوت کی قدرت نہیں رکھتے اس جگہ اگر ہم حضرت خضر علیہ السلام کے افعال اور ہر عمل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بے چینی اور بعد میں حقیقت کے تسلی بخش انکشاف اور ظاہری افعال کی ناموزونیت اور باطنی مصالح کی خوشنمائی کی تفصیل کریں تو ہمارا مضمون بہت طویل ہو جائیگا۔ ہم نے اپنے محل پر اس کی طرف صرف چند اشارات کر دیے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیان میں ان پر غور کر لیا جائے۔

یہ تو انسان کی اندرونی شر کی طاقت تھی اور اسی کا نام نفس امارہ ہے۔ شریعتوں کا سب سے اہم مقصد اسی نفس امارہ کی شائستگی اور تہذیب ہے۔ جب کوئی رسول دنیا میں آیا تو اس نے اپنی فیض صحبت اور اتباع شریعت کے ذریعہ عام مخلوق کے نفوس کی اصلاح کی جدوجہد کی ہے۔ پھر جتنے انسانوں کے نصیب میں سعادت لکھی جا چکی تھی انھوں نے خواہشات واہوا کا راستہ چھوڑ کر رسولوں کی پیروی کی یہاں تک کہ ان کے نفوس کی سرشت بدل گئی اور شریعت کے خلاف امور میں ان کے لیے کوئی لذت باقی نہ رہی پھر کسی صاحب نصیب کا مقدر اور جاگا تو اس کے نفس کو اتباع شریعت میں وہی طبعی راحت محسوس ہونے لگی جو پہلے کبھی شریعت کے خلاف امور میں محسوس ہوا کرتی تھی اب اس کا نام امارہ کی بجائے بدل کر نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو ترجمان السنۃ ص ۔۔ انبیاء علیہم السلام تو اُن کے نفوس پیدائشی طور پر مطمئنہ

ہوتے ہیں وہ اپنے کسی دو جہات میں بھی کسی خفیف نا شایاں حرکت کی طرف میلان نہیں رکھتے۔ دیکھیے حضرت یوسف علیہ السلام نے حبِ حسن کے دلربا منظر کے مقابلہ پر اپنے ملکوتی نفس کے اطمینان کا اظہار فرمایا تو اس کو بھی بڑی بلند آہنگی سے نہیں بلکہ بڑے نرم لہجہ میں ادا فرمایا اور یہ ان کے اطمینان نفس کا پہلے سے بڑھ کر مظاہرہ تھا اگر ان کی جگہ یہاں کوئی اور انسان ہوتا تو نہ معلوم اس زبردست آزمائش اور اس کے مقابلہ میں اپنی اس روش کامیابی پر نہ معلوم تعریف و تزکیہ کی کتنی لن ترانیاں ہانکتا مگر جو فقرہ یہاں ان کی زبان سے نکلا وہ صرف یہ تھا وما ابرء نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء یعنی میرے اس استقلال، میری اس پاکبازی و عفت اور میرے اس شان استغنا کا حاصل دعوی تقدس کرنا نہیں ہے اور یہ دعویٰ میں کیونکر کرسکتا ہوں جبکہ نفس کی بالعموم خصلت صرف برائی پر برانگیختہ کرنا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ رحمت ایزدی نے یہاں اپنے کسی خاص بندہ کے نفس کی سرشت بدل دی ہو مگر سانپ کے زہر کی پوٹلی اگر توڑ بھی دی جائے پھر بھی سانپ ڈرنے ہی کی چیز ہوتا ہے۔ غور فرمائیے کہ جب اپنے نفس کے متعلق دعویٔ تقدس کی نفی فرمائی تو یہاں "نفسی" (میرا نفس) کا لفظ فرمایا۔ پھر جب اس کا سبب بیان فرمایا تو وہاں "نفسی" کی بجائے "ان النفس" کا لفظ فرمایا ہے۔ یعنی میرے اس دعوے تقدس سے انکار کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میرے نفس میں بھی امارگی کی صفت موجود ہے بلکہ بات یہ ہے کہ اگر کسی ناشائستہ جنس کا کوئی فرد شاذ و نادر طور پر شائستہ سے شائستہ بھی نکل آئے تو بھی اس جنس کی مذمت اپنی جگہ بحال ہی رہتی ہے۔ یہاں ان کا پہلا جملہ تو ان کی شان تواضع کا مظہر ہے اور "ان النفس لامارۃ بالسوء" فرمانا یہ ایک حقیقت کا بیان ہے عام انسانوں کے ایک ہی کلام میں یہ توازن نہیں مل سکتا جب وہ تواضع پر اترتے ہیں تو حقیقت کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے اور جب حقیقت کے بیان کرنے پر آتے ہیں تو ان کی تواضع کا پلہ ہلکا نظر آنے لگتا ہے انبیاء علیہم السلام کی نہ تو تواضع کسی تصنع سے ہوتی ہے اور نہ اظہار حقیقت کسی تکلف سے اس لیے وہ ہر موقعہ پر بے ارادہ ان دونوں باتوں کو نبھائے چلے جاتے ہیں۔

یہاں ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس واقعہ کو سامنے رکھ کر آپ انبیاء علیہم السلام کے نفس کا کچھ اندازہ لگائیں ان کے عمل سے بھی اور خود ان کے بیان سے بھی جب ان کے عمل سے یہی ثابت ہو کہ کسی موقعہ پر ان کی استقامت میں ذرا سی لغزش نہیں ہوسکی اور ان کی تواضع کے پرزور کلمات میں بھی ایک حرف ایسا نہ مل سکا جس میں ان کے نفس کے خلاف ادنیٰ سا اشارہ بھی ہو تو پھر ان کی عصمت کے خلاف ہم کو کوئی کلمہ اپنی زبان سے نکالنا کتنی بڑی بے احتیاطی ہوگی

انبیاء علیہم السلام کی برکات صحابہ اور ماحول پر	اب رہی بیرونی طاقت یعنی شیطان تو ان کے تقدس کے سامنے وہ

بھی اس طرح بیچارہ اور سرنگوں ہوجاتی ہے کہ کسی برائی کی دعوت دینے کا اس میں کوئی حوصلہ ہی باقی نہیں رہتا بلکہ جس طرح ایک مقہور دشمن کے لیے سپر ڈالنے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہتا اسی طرح یہاں شیطان کو بھی طوعاً و کرہاً ان کی ملکی طاقت کے ہم آہنگ ہوئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہتا۔ پھر ان کی اس قہرمانی کا اثر صرف ان کی ذات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ حسب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مناسبت ان کے ہم جلیس اور رفقاء سے تجاوز کرکے اس تمام خطہ کو بھی محیط ہوجاتا ہے جو ان کی بعثت کا میدان ہوتا ہے۔ ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کے شیاطین بھی دن بدن کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ بھی ہر میدان میں شکست کھاتے کھاتے اتنے مایوس ہوجاتے ہیں کہ اگر ہزار کوشش کے بعد کسی سے کوئی معصیت سرزد ہوگئی تو اسی کو اپنی بڑی کامیابی تصور کرنے لگتے ہیں اور جس طرح ہر ضعیف اپنے سے قوی تر سے ڈرا کرتا ہے اسی طرح شیاطین بھی توحید کے ان علمبرداروں سے ہمہ وقت ترساں و لرزاں نظر آنے لگتے ہیں، اور کسی کسی کی دینی شدت سے تو اتنے مرعوب ہوجاتے ہیں کہ جس طرف اس کا گزر ہوجائے وہ اس راستہ ہی سے کترا کر نکل جاتے ہیں ایک طرف تو ضلالت کی طاقتوں یعنی نفس و شیطان کی پسپائی اور زبونی کا عالم یہ ہوتا ہے، دوسری طرف ملکوتی طاقتیں اپنے پورے عروج پر آجاتی ہیں اور ان کے اثرات بھی اسی طرح متعدی ہوکر عالم کے گوشہ گوشہ میں پھیلنے لگتے ہیں اسی لیے مقابلہ کے ہر میدان میں مستقل فتح و کامرانی ان کا حصہ ہوجاتی ہے اور دائمی ذلت و ناکامی نصیب اعدا بن جاتی ہے۔

اعتقادات و عادات کی دنیا آباء و اجداد کی رسومات اور فطری خو بو اتنی تیزی کے ساتھ بدلنے لگتی ہے کہ منکرین کو یہ گمان کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ ضرور یہ جادو یا سحر کا اثر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ جہاں فرش سے عرش تک عصمت و تقدس ہی کا سماں بندھا ہوا ہو ضلالت کی قوتیں دن بدن مضمحل ہو ہو کر فنا ہو رہی ہوں وہاں حق کی فتح و ظفر اور اسباب ہدایت میں نمو اسی طرح فطری بن جاتا ہے جیسا کہ موسم خزاں میں زمین کا خشک ہوجانا اور موسم بہار میں چپہ چپہ کا سبزہ زار ہوجانا فطری ہوجاتا ہے جس طرح موسم بہار کے چند قطرے صحراؤں کا رنگ بدل دیتے ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی آمد کے بعد قلب و دماغ کا رنگ و بو بھی بدلنے لگتا ہے۔ وہ سینے جو کبھی ظلمات کفر سے تیرہ و تاریک تھے ان کی فیض صحبت سے ایسے جگمگا اٹھتے ہیں گویا عالم قدس کی وہ سب سے بلند جلوہ گاہیں۔ حضور و یقین کی بیش بہا نعمت ان کو بآسانی اس درجہ پر ہاتھ آجاتی ہے جیسا عالم آخرت ان کے سامنے کھلا ہوا رکھا ہے۔ اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے کوئی کوئی فرشتوں کی جماعت میں اس طرح بھی گھل مل جاتا ہے کہ وہ اس کو سلام کرتے ہیں اور یہ اس کو سنتا ہے۔ یہ تمام کرشمے اس مرکز نور کے ہوتے ہیں جو ان کے درمیان آفتاب درخشاں کی طرح موجود ہوتا ہے اور اسی کے قلب مبارک کے انسلاک کے ساتھ دوسروں کے قلوب میں بھی حسب استعداد یہ نور اس طرح تقسیم ہوتا رہتا

ہے جس طرح کہ مختلف نوتوں کے بلبوں میں پاور ہاؤس سے روشنی تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ اس فیضان بصیرت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے رفقاء کی نظروں میں بھی متاع دنیا کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ دل فریب نظاروں کی فریب کاری ان پر بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے اور آخرت کا جزم و یقین ان کے دلوں میں اس طرح راسخ ہو جاتا ہے کہ معصیت کی جرأت کرنا تو درکنار ناموزوں خطرات اور وساوس کا دل میں گزر بھی ان کے لیے اتنا شاق ہو جاتا ہے کہ اپنا جل کر خاک ہو جانا ان کو اس سے بدرجہا بہتر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دیکھو ترجمان السنہ ص۲۵ اور اگر کسی سے شاذ و نادر حالات میں معصیت کا صدور ہو جاتا ہے تو وہ آخرت کی گرفت کے مقابلہ میں شریعت کی سخت سے سخت سزا کے نفاذ پر اس طرح بےچین و مضطر ہو جاتا ہے گویا اس کی ساری راحت اور کامل سرور اس سزا کے نفاذ ہی میں ہے۔ اب ان کے اس پاکیزہ ماحول اور اس قدسی صفت جماعت کو سامنے رکھیے پھر ان کی بلند صفات پر بھی نظر ڈالیے تو آپ کو یقین ہو جائیگا کہ جن کی ذاتی صفات یہ ہوں اور جن کے اثرات سے ماحول اتنا پاکیزہ بن جاتا ہو کیا ان سے کسی معصیت کا صدور ہو سکتا ہے۔

یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح استاد کے خصائل اس کے شاگردوں میں اور والدین کے ان کی اولاد میں منتقل ہونے	انبیاء علیہم السلام کے خصائل و عادات کا اثر ان کی امتوں پر اسی طرح ہوتا ہے جیسا والد کا اس کی اولاد پر بلکہ اس سے بڑھ کر

ضروری ہوتے ہیں، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے کمالات و نقائص کا ظہور بھی ان کی امتوں میں لازمی ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے خطاء و نسیان کا ایک قدم اٹھ گیا تو یہی ان کی اولاد کی سرشت بن گئی، یہ بات دوسری ہے کہ جو مؤاخذہ اس پر ہونا تھا وہ ان سے ہی ہو لیا اور جب رحمت ایزدی نے اصل انسانی سے اس کو درگزر فرما دیا تو اب وہ نسل انسانی کے لیے بھی قابل چشم پوشی بن گیا۔ اگر کہیں معصیت کرنی انبیاء علیہم السلام کی سرشت میں داخل ہو جائے (والعیاذ باللہ) تو عاصی انسانوں کا بیڑا بحر عصیان میں غرق ہو کر رہ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شب معراج میں دو جام پیش کیے گئے ایک دودھ کا دوسرا شراب کا۔ نبی کی معصوم فطرت نے فوراً آگے بڑھ کر دودھ کا جام لے لیا۔ آپ سے کہا گیا کہ اس تخیر انتخاب کو معمولی بات نہ سمجھنا اگر کہیں آپ مے کا جام لے لیتے تو معاملہ صرف اسی پر ختم نہ تھا بلکہ آپ کی ساری امت گرداب ضلالت میں غرق ہو کر رہ جاتی سبحان اللہ! عین تعظیم و اکرام کی شب میں ایسے ایسے نازک اور خطرناک امتحان بھی گزر رہے تھے مگر جب قدرت کو اپنے انعامات و اکرام کی تکمیل منظور تھی تو آپ کو اس انعام کی بشارت سے کیسے محروم رکھا جا سکتا تھا جس کے لیے نبی کا قلب سب سے زیادہ بےچین ہوتا ہے یعنی امت کی بہبودی بےشک امتحان بہت خطرناک تھا لیکن جب تک معاملہ کی ہولناکی معلوم نہ ہو اس وقت تک اس سے نجات کی نعمت کا بھی پورا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ان سطور میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحابہؓ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ایک حصہ تو ترجمان السنہ

کی حدیثوں کے ضمن میں پہلے آپ کے ملاحظہ سے گزر چکا ہے اور جو باقی رہ گیا ہے وہ ان شاء اللہ تعالیٰ احادیث ہی کی روشنی میں ایک ایک کرکے آپ کے سامنے آنے والا ہے۔ ان کو بیک وقت سامنے رکھ کر یہ فیصلہ فرما لیجیے کہ ان نفوس قدسیہ سے کیا عمداً کسی معصیت کا ارتکاب کرنا ممکن ہو؟ یہ واضح رہے کہ معصیت کی جو قسم بھی ہو اس میں قصد و ارادہ ہونا ضروری ہے۔ انسان کے وہ افعال جو اس کے قصد و اختیار سے نہ ہوں وہ معصیت کی تعریف میں نہیں آتے۔ پس جب نافرمانی اور قصداً نافرمانی کا تصور عام انسانوں کے تقدس پر بدنما داغ سمجھا جاتا ہو تو پھر کیا وہ انبیاء علیہم السلام کے لیے شایانِ شان سمجھا جا سکتا ہے؟

ہمارے نزدیک اس مسئلہ کی ایک ذوقی اور وجدانی دلیل یہ بھی ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام پیدائشی طور پر اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں جس کی شہادت گزشتہ اوراق میں آپ کے سامنے گزر چکی ہے تو پھر اہل جنت کے صفات میں سے اگر معصومیت کی صفت بھی ان میں موجود ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔ لہٰذا نہ جنتی جنت میں خدا تعالیٰ کی معصیت کریں گے نہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں معصیت کرتے ہیں اسی لیے اپنی اُخروی فلاح و بہبود کا ان کو جزم حاصل ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شان تواضع اور انتہائی کمال خوف و خشیت کے باوجود مرض الوفات میں حضرت فاطمہؓ سے پورے وثوق کے ساتھ فرمایا۔ "لا کرب علی ابیك بعد الیوم" آج کے بعد تیرے والد پر بےچینی کا نام و نشان نہ ہوگا۔ سب چین ہی چین ہوگا اور جبکہ یہ مقررہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب اپنی اُمتوں کے لیے شافع ہوں گے تو کیا جو خود مجرم ہوں وہ شفاعت کے مستحق ہو سکتے ہیں شفاعت کبریٰ کے لیے جو کلمات انبیاء علیہم السلام نے استعمال فرمائے وہ اس لیے تھے کہ یہ مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پہلے سے رزرو ہو چکا تھا۔ تمام جہان کے حق میں سفارش وہی کر سکتا ہو جس کی ساری عمر کے متعلق مغفرت و عفو کا حتمی اعلان ہو چکا ہو۔ اگر آپ کے حق میں یہ اعلان نہ ہو چکا ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ آپ بھی رب العزت کی بارگاہ بلند میں پیش ہونے سے شاید معذرت کا کوئی پیرایہ اختیار فرما لیتے لیکن چونکہ رحمت حق نے اس عقدہ کشائی کے لیے آپ کو منتخب فرما لیا تھا اس لیے آپ اہل محشر سے بڑے تسلی کے انداز میں فرمائیں گے "انا لھا انا لھا" "بےشک آج شفاعت کرنے کا حق میرا ہی ہے"۔ اس کے بعد جب باب شفاعت کھل جائیگا تو پھر ہر ہر نبی اپنی امت کی شفاعت کریگا۔ اس مسئلہ پر بحث و نظر کا ایک طریقہ تو یہ تھا۔ بعض علماء نے یہاں دوسرا طریقہ استدلالی اختیار کیا ہو انہوں نے لکھا ہو کہ عصمت کے ظاہری اسباب چار ہیں۔ عدالت و ثقاہت
عصمت کے ارکان اربعہ | خیر و شر کے عواقب کا قطعی علم۔ پھر وحی الٰہی سے ان علوم کی مزید تائید و تاکید۔ نسیان اور ترک اولیٰ پر بھی مواخذہ کا خطرہ (الروضۃ البہیہ ص ۵۹) چونکہ انبیاء علیہم السلام میں یہ چاروں صفتیں کامل طور پر موجود ہوتی ہیں اس لیے ان میں عصمت کی صفت بھی کامل طور پر موجود ہونی ضروری ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام میں ان صفات کے علاوہ دائمی حضوری کی ایک صفت ہی ایسی ہوتی ہے کہ تنہا یہ صفت ہی ان کی عصمت کے لیے کافی ہے۔ اسی کے ساتھ عصمت کے جتنے موانع ہو سکتے ہیں وہ بھی ان میں موجود نہیں ہوتے یعنی ان کی اندرونی اور بیرونی طاقتیں سب کی سب اپنے رب کی حکمبرداری کے نشہ میں اس طرح ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں کہ اس کی نافرمانی کا ان کو کبھی تصور ہی نہیں آتا۔ دوسرے انسانوں میں اس حضوری میں کچھ نہ کچھ فرق پڑ سکتا ہے لہذا ان کی قوم کی غلطی کا امکان بھی ہوتا ہے۔ یہاں دائمی حضوری میں ادنیٰ سے فرق کا کوئی امکان نہیں ہوتا وہ بظاہر جتنی غفلت میں نظر آتے ہیں اتنے ہی اور ہشیار ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نیند کے علوم بھی بیداری کے علوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر غفلت و تکلیف کا وقت انسان کی نزع روح کا وقت ہوتا ہے وہ اس نازک وقت میں اور لتنے مستغرق ہو جاتے ہیں کہ رفقاء دنیا سے ان کی نظر یکسر منقطع ہو کر صرف "الرفیق الاعلیٰ" کی طرف لگ جاتی ہے پھر بھوک و پیاس، مسرت و غم اور شکست و فتح کے حالات کا تو ذکر ہی کیا ہے یہ تو غفلت کی بجائے برعکس ان کی گرمی محفل کے سامان ہوتے ہیں۔ عین جنگ کی گرم بازاری کے موقع پر آپ کی توجہ اور انابت الی اللہ کا جو نقشہ رہا ہے وہ احادیث اور کتب سیر میں موجود ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ خود انبیا علیہم السلام کا اپنی عصمتوں کے متعلق نظریہ کیا تھا

انبیا علیہم السلام کی پاک نفسی، ان کی اندرونی و بیرونی طاقتوں کی شائستگی و تہذیب، ان کی بعثت کی غایت و غرض، ان کے منصب کی اہمیت، ملائکۃ اللہ کے ساتھ ہمہ اوقات ان کی صحبت اور ان سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ ان کی شرف ہمکلامی کے بعد یہ سوال بھی اہم ہے کہ خود ان کا عقیدہ اس مسئلہ میں اپنے متعلق کیا تھا کیا وہ اپنے نفس کا معاصی کے ساتھ ملوث ہونا تسلیم کرتے تھے، کیا اپنے متعلق عدل و انصاف کے خلاف ذرا سا تصور کرنا یا اپنے کسی فیصلہ کو کسی طبعی رجحان کا اثر سمجھ لینا یا ان کے کسی عمل کو خلاف اولیٰ پر حمل کرنا کسی کے لیے جائز سمجھتے تھے۔ یا اس کے برعکس جہاں ان کے متعلق کسی ادنیٰ سے وسوسہ کا احتمال بھی پیدا ہو سکے اس کے ازالہ کا پورا پورا اہتمام فرماتے تھے۔ جہاں تک حدیثوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شان عبدیت و تواضع کے باوجود اپنے حق میں اس قسم کے تعدی کی کسی کے لیے کبھی کوئی گنجائش نہیں دی بلکہ اگر کسی نے آپ کے عمل کو آپ کی رفعت شان اور اپنی کمتری کی وجہ سے بھی ناقابل اتباع سمجھا ہے تو اس پر بھی آپ کو سخت ناگواری گزری ہے۔ دیکھو ترجمان السنۃ ص ۴۳ و ص ۴۳ و ص ۴۳ و ص ۴۳

یہ بات دوسری ہے کہ جب کبھی مخلوقات کے دائرہ سے نکل کر معاملہ بارگاہ صمدیت کے سامنے آگیا ہے تو پھر وہ عجز و نیاز اور انابت و استغفار کا ایک پیکر بن گئے ہیں اور یہی شان انبیا علیہم السلام ہونی چاہیے۔

مسئلہ عصمت کی بحث میں ایک فرو گزاشت

درحقیقت اسی دقیق فرق کے ذہول سے ان کی عصمت کے خلاف بے رحم

ایک تعبیر کھڑی کرلی گئی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس رُخ پر بھی اصولی طور پر قدرے روشنی ڈال دی جائے
سب سے پہلے یہاں دو باتیں سامنے رکھنی چاہییں ایک یہ کہ لغت عرب میں خطاءٗ، ذنب، زلّت، اسراف اور معصیت سب مترادف الفاظ نہیں ہیں۔ ہم یہاں صرف ان کے اُردو ترجموں پر کفایت کرتے ہیں۔ اردو میں بھی غیرارادی غلطی۔ ناشایاں کام۔ لغزش۔ زیادتی۔ اور نافرمانی کا مفہوم الگ الگ ہے یہاں سب کا ترجمہ گناہ کردینا صحیح نہیں ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے کسی عمل پر بھی معصیت کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ صرف ایک آدم علیہ السلام کے معاملہ میں یہ لفظ ضرور استعمال ہوا ہے مگر اس کی تشریح ابھی آپ کے سامنے آتی ہے۔

دوم یہاں بڑی اہمیت کے ساتھ اس پر بھی توجہ کرنی چاہیے کہ جن آیات کو ان کی عصمت کے خلاف سمجھا گیا ہے۔ کیا وہ عمل ان کی نظروں میں بھی ان کی عصمت کے خلاف تھے! اس کے فیصلہ کے لئے سب سے واضح حدیث شفاعت کی حدیث ہے جہاں ہر نبی نے شفاعت کے لیے قدم نہ اٹھانے کا سبب اپنی اپنی زبانوں سے خود بیان کیا ہے یہاں ہم کو کسی حدیث سے ثابت نہیں ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے متعلق شرک فی التسمیہ کا ایک حرف بھی کہا ہو یا حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے رب ارنی کیف تحی الموتی کی فرمائش پر اپنی ندامت کا ایک کلمہ بھی نکلا ہو بلکہ یہاں جو فہرست ہمارے سامنے آتی ہے اس میں حضرت آدم علیہ السلام کا شجرۂ ممنوعہ کھالینا، حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے ایک عزیز کے حق میں طوفان سے حفاظت کے لیے نادانستہ طور پر سفارش کرنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی زبان سے دین کی حمایت میں تین مختلف مقامات پر توریہ کے کلمات کہہ گزرنا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک عمل ہے جو نبوت سے پہلی زندگی میں ان کے دشمن کی موت کا باعث بن گیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت کا ان کو خدا تعالیٰ کا شریک ٹھہرالینا معلوم ہوتا ہے اور بس۔

حضرت آدم علیہ السلام کی زلت قرآن کریم کی نظر میں

جب قرآن کریم کی روشنی میں اس پر نظر کی جاتی ہے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ نظر ربوبیت میں سب سے اہم سمجھا گیا تھا مگر خود قرآنی تفصیلات جو ان کے اس اقدام کے متعلق نظر آتی ہیں وہ یہ ہیں:۔

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (طٰہٰ) — (شیطان نے ان سے کہا تھا کہ کیا میں تم کو بتاؤں صدا زندہ رہنے کا درخت اور لازوال بادشاہت۔

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (اعراف) — اور ان کے آگے قسم کھائی کہ یقین کرو میں تمہارا خیرخواہ دوست ہوں اور اس طرح فریب سے ان کو مائل کرلیا تھا۔

فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا آدم بھول گئے تھے اور اس میں ہم نے ان کا ارادہ ذرا بھی نہ پایا تھا۔

ان آیات کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو بات ان کے سامنے ان کی فریب دہی کے لیے رکھی گئی وہ خدا تعالیٰ کی جنت میں ان کی دائمی زندگی تھی اور اس کی توثیق و تصدیق کے لیے خدا تعالیٰ کا نام لے کر ان کے سامنے قسم کھائی گئی پھر جس طرح ہر انسان اپنی کسی انتہائی کامیابی اور بے نہایت فوز و فلاح کے تصورات و تمناؤں میں پڑکر دوسری جانب سے ذہول میں پڑ جایا کرتا ہے۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی اور حضرت آدم علیہ السلام کو قرب ایزدی کی تمناؤں پھر شیطان کی قسموں کے سامنے یہ خیال بھی نہ رہا کہ مجھ سے کہا کیا گیا تھا بس اس فریب میں آکر پوری فراموشی کے عالم میں ان سے اس خلاف ورزی کا ارتکاب ہو گیا[1] قرآن کریم نے ضرور اس کو معصیت کہا ہے، لیکن اس کی تشریح بھی جو خود اس نے بیان کی ہے اس کے بعد کسی انسان کو ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر معصیت کا لفظ اطلاق کرنے کا حق نہیں رہتا یعنی یہاں معاملہ کی نوعیت ہی اتنی نازک ہو گئی تھی کہ اس کے سامنے کسی فرد سے تحمل و صبر کرنا مشکل تھا ادھر ان کے نسیان کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے درحقیقت وہی ان کی عصمت اور بے گناہی کا بڑا ثبوت ہے۔ پھر غور فرمائیے کہ صرف ان کی فراموشی کے ذکر پر کفایت نہیں کی گئی بلکہ پورے مبالغہ کے ساتھ اس کا منفی پہلو بھی صاف کر دیا گیا ہے اور اس کو بھی لفظ "ولم نجد لہ عزما" سے ادا نہیں کیا گیا جس کا ترجمہ یہ ہوتا کہ انہوں نے پختہ ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ یوں فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں ان کے ارادہ کا ذرا بھی دخل نہ تھا پس اگر قرآن کریم سے ان کے اس عمل کا معصیت ہونا ثابت ہوتا ہے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف نسیان کا ایک قدم تھا

مقام عصمت کی نزاکت کا تقاضہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی شان رفیع میں کسی ناشایاں عمل کی صورت بھی حقیقت کی برابر شمار ہو

اب اگر ان دونوں باتوں کو جمع کر لو تو نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا غیر ارادی عمل بھی دوسروں کے ارادی عمل کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں معصیت کی حقیقت گو نہیں ہوتی مگر جس عمل کی صورت نافرمانی کی صورت ہو وہ بھی ان کے حق میں اس عمل کے مشابہ سمجھا جاتا ہے جو حقیقت میں بھی معصیت ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے سمجھنے کے لیے دو باتیں سامنے رکھنی چاہییں مقام عصمت کی نزاکت۔ دوم بارگاہ الوہیت کی شان عظمت

[1] کتاب الانبیاء صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک شخص نے چوری کی جب عیسیٰ علیہ السلام نے اس کو سرزنش کی تو اس نے قسم کھا کر کہا میں نے چوری نہیں کی اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے صرف دو راستے تھے یا وہ اس قسم کھانے والے کو متہم کرتے یا اپنی نظر کو متہم کرتے۔ انہوں نے سنت آدم علیہ السلام پر عمل کیا اور اپنی نظر کا قصور قرار دینا اس سے آسان تر سمجھا کہ وہ کسی شخص پر اللہ تعالیٰ کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی تہمت لگائیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن القیم سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ابلیس کے قسم کھانے کے بعد تصدیق کر لینے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس چور کی تصدیق کرنے کی صفت نبوت یکساں نظر آتی ہے۔ (دیکھو ترجمان السنہ ص۲۳۶ ج ۲ حضرت عمر کی شان میں منقول ہے "وکان وقافا عند سماع آیۃ من القرآن" وہ بھی اسی جنس کی ایک صفت تھی۔

مقامِ عصمت کی نزاکت چاہتی ہے کہ جب ایک طرف عصمت ہے تو دوسری طرف نسیان بھی کیوں ہو اور اگر کسی مصلحت کے پیشِ نظر ایسا ہو جائے تو اس پر مواخذہ کیوں کیا جائے۔ ترجمان السنہ جلد دوم کے اوائل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے یہ سوال کیا بتاؤ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے تو اپنے اندازۂ فہم کے موافق جو جواب انہوں نے دیا وہ یہی تھا کہ فرشتوں کا اور انبیاء علیہم السلام کا مگر آپ نے اس پر یہ فرمایا اُن کے سامنے تو عالم قدس سب کھلا ہوا موجود ہوتا ہے وہ کیوں ایمان نہ لائیں (پوری حدیث اور اس کی تشریح وہاں دیکھ لی جائے) اس سے معلوم ہوا کہ جو بات عام لوگوں کے حق میں کمال شمار ہوتی ہے، اگر یہاں وہ موجود ہو تو کچھ قابلِ تعجب نہیں ہوتی۔ آفتاب سے اگر روشنی نکلتی ہے تو نکلنی چاہیے تعجب کی بات کیا ہے کامل سے کمالات ہی کا صدور ہوا کرتا ہے۔ یہاں تعجب ہوتا ہے تو اس پر کہ اس کمال پر ان کے منصب کے خلاف کوئی بات سرزد ہوتی ہے تو کیوں عام انسان اگر بھولتے ہیں تو رحمت اس کو درگزر کرنے کے لیے تلی ہوئی نظر آتی ہے لیکن جن کے قالب بھی اس جہان میں اہل جنت کے مشابہ ہوں ان سے کسی ادنیٰ سی بات کا ذہول ہوتا ہے تو اس پر فوراً مؤاخذہ ہونے لگتا ہے قدرت نے اگر ایک طرف ان کو معصوم پیدا کیا ہے تو دوسری طرف ان کی گرفت بھی سخت کر دی ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب عصمت ہے تو پھر یہ فردگزاشت کیوں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول بھی ہو گئی اور ان کو خلعت خلافت سے نواز بھی دیا گیا مگر اپنے اس نسیان کا انفعال پھر محشر تک ان کے قلب سے محو نہ ہو سکا یہ اس لیے نہیں کہ یہاں معصیت کی حقیقت کا کوئی وجود تھا بلکہ یہ صرف ان کی عصمت کا اقتضاء تھا کہ جب عصمت تھی تو نسیان سے بھی ایسا عمل کیوں ہوا۔ بعض روایات میں ہے کہ جب اہل محشر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں سفارش کے لیے آئینگے تو وہ بڑے انفعال کے ساتھ یہ عذر فرمائیں گے کہ مجھ کو تو میری قوم نے خدا تعالیٰ کے سوا معبود بنا لیا تھا۔ اب سوچیے کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جرم کیا تھا۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی فطرت اتنی پاکیزہ ہوتی ہے کہ ان کی امتوں کی معصیتوں کی چھینٹیں بھی ان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ دیکھیے یہاں صرف معصیت کا گو کوئی شائبہ نہ تھا مگر پھر مقام عصمت اپنوں کی معصیت سے منفعل تھا۔ پس جہاں دوسروں کی معصیت سے تاثر کا یہ عالم ہو وہاں بھلا خود کسی معصیت کا تصور کیا ہو سکتا ہے۔

یہ تو مقام عصمت کی نزاکت کا مختصر سا حال تھا اب خدائے قدوس کی رفعت و بلندی کا ہلکا سا نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے متعلق بھلا کیا لب کشائی کی جاسکتی ہے بس اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہے کہ جو مخلوق علیہ معصوم مخلوق ہے جب اس کا معاملہ بھی خالق کائنات کے سامنے آگیا تو وہ بھی سرتاسر قصور نظر آنے لگی۔ اسی معاملہ میں فرشتوں کی سرگزشت ذرا سامنے رکھ لیجیے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حرف معصیت سے یہ مسلوب الاختیار

مخلوق بھی شاید انسانوں کی صف میں کھڑی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کے سلسلہ میں فرشتوں کا ایک ہی واقعہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ اگر کہیں دو چار واقعات اسی طرح کے اور سامنے آجاتے تو شاید ہمارے علماء کلام کو یہاں بھی تردد پیدا ہو جاتا مگر چونکہ اس طرف ان کا ایک ہی واقعہ سامنے تھا دوسری طرف ان کی عصمت کا عقیدہ حاصل تھا۔ اس لیے اس واقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی، حالانکہ حقیقت واضح ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ یہاں حقیقتِ معصیت کا صدور ہوتا ہے لیکن جب کبھی مخلوق کا معاملہ خالقِ کائنات کے سامنے آجائے تو ایک طرف قادرِ مطلق دوسری طرف مجسم بیچارگی موجود ہوتی ہے اس لیے ہزار عصمت کے باوجود یہاں معاملہ قصور در قصور ہی کا نظر آتا ہے اسی لیے جب اسی معاملہ کو خالقِ کائنات کے دربار سے الگ کر کے صرف ایک معاملہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے تو اس میں ایک حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ مقدمہ جب حق تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوا تو اس میں معصیت کا لفظ تک بھی استعمال ہوا اور یہاں تک بھی اس نے طول پکڑا کہ عالم کے ایک بہت بڑے انقلاب کی یہی ایک لغزش بنیاد بن گئی لیکن جب اسی واقعہ کو خالق کائنات کے حضور سے اٹھا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے مابین رکھا گیا تو حسب بیان حدیث شریف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لاجواب ہو جانا پڑا یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا "والد بزرگوار! آپ نے ذرا سی لغزش کر کے اپنی ساری اولاد کو جنت سے باہر نکلوا دیا" تو اس پر حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا "اے موسیٰ تم کو تورات ملی ہے جو میرے وجود سے بھی سالوں پہلے علمِ الٰہی میں موجود تھی کیا اس میں میری اس لغزش کا ذکر نہیں؟ پھر والد پر اس عمل کے ارتکاب سے کیا اعتراض جو اس کے وجود سے بھی بہت پہلے اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا" یہ وہی آدم ہیں کہ جب ان کا مقدمہ خالق کائنات کے سامنے پیش تھا اور سوال بعینہ یہی تھا تو بجز اعتراف و توبہ کے جواب کا ایک حرف نہ تھا۔ پس جب مخلوق کا کوئی معاملہ خالقِ کائنات کے سامنے آجائے بس سمجھ لو کہ اب اس کی صفائی مشکل ہے یہاں اعترافِ خطا ہی ایک صحیح راستہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب محشر میں تمام مخلوق کے حساب کا کٹھن مرحلہ سامنے آئیگا تو وہ رحمت جو اہل دنیا میں صرف ایک حصہ نازل فرمائی گئی ہے پورے سو حصوں کے ساتھ مخلوق کا حساب لینے کے لیے آجائیگی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل محشر میں ایسا کون تھا جو محض اپنے عمل کے بل بوتہ پر فردوس بریں کا مستحق بن سکتا۔

افسوس ہے کہ لغزشوں کو چُن چُن کر اس طرح بیان فرمانے کی روح تھی تو کیا اور اس کو سمجھا گیا کیا۔ مقصد تو یہ ظاہر کرنا تھا کہ کن حالات میں کیا قدم اٹھایا گیا تھا پھر وہ بھی عمر بھر میں گنتی کے کتنے واقعات تھے مگر ان کو بھی ان کی شان سے کتنا بعید سمجھا گیا۔ اس سے نتیجہ تو یہ نکالنا چاہیے تھا کہ جن کی اتنی سی فروگذاشت پر بھی اتنی گرفت ہو

وہ کس درجہ معصوم ہوتے ہیں مگر یہاں جو نتیجہ نکالا گیا وہ بالکل اس کے برعکس تھا، والعیاذ باللہ اگر مقامِ عصمت کی نزاکت اور بارگاہِ الوہیت کی بلندی کو سامنے رکھ کر یہ واقعات پڑھے جاتے تو یہی ان کی معصومیت کا سب سے بڑا ثبوت نظر آنے لگتے۔

الحاصل اگر فیصلہ صرف قرآن کریم کے طرزِ خطاب پر ہی دائر کر دیا جائے اور متکلم و مخاطب کی ان خصوصیات کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے تو پھر یہاں کبائر و صغائر کی بحث تو درکنار بلکہ شاید کفر و اسلام میں بھی بحث پیدا ہو سکتی ہو والعیاذ باللہ بلکہ اگر بحث و نظر کا یہی طریقہ ملائکۃ اللہ کے معاملہ میں بھی قائم رکھا جائے تو پھر ان کی متفق علیہ عصمت سے بھی شاید ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی تحریر فرماتے ہیں:۔

فعلم ان الانبیاء علیهم السلام لا یشارکون غیرهم فی ارتکاب حرام ولا مکروہ الا لبیان الجواز ولکن لما شرف مقامهم سمی الله تعالیٰ وقوعهم فی خلاف الاولیٰ معصیة وخطیئة۔ (الیواقیت والجواهر ص۳۴)

ہمارے بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام ارتکاب حرام یا مکروہ میں دوسرے انسانوں کے شریک نہیں ہوتے مگر کسی مکروہ تنزیہی فعل کا وہ ارتکاب کرتے ہیں تو وہ بھی فقط اس کے جواز کا پہلو بتانے کے لیے کرتے ہیں ان کا قدم اگر اتفاق سے کہیں خلافِ اولیٰ میں جا پڑتا ہے تو ان کے مقام کی نزاکت کی وجہ سے اسی کا نام معصیت و خطا رکھا جاتا ہے۔

والقاعدۃ ان کل من عظمت مرتبته عظمت صغیرته۔ ص۳۴ ،،

یہاں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس کا مرتبہ جتنا بلند ہوتا ہے اس کی معمولی باتوں پر گرفت بھی اتنی ہی سخت ہوتی جاتی ہے۔

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے چند جزئی واقعات کے علاوہ کچھ آیتیں ایسی بھی ملتی ہیں جن کو ان کی عصمت کے خلاف سمجھا گیا ہے۔ مثلاً معاصی، رذائل، اور دیگر نوع کے قبیح افعال سے اجتناب کے خطابات۔ ہمارے نزدیک یہ بھی کلام کی فصاحت و بلاغت کے اسلوب سے ناآشنائی کا ثمرہ ہے کون نہیں جانتا کہ دنیا میں کلام کا ایک طریقہ "گفتہ آید در حدیث دیگراں" بھی ہے۔

شیخ شعرانیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

فالخطاب له والمراد غیرہ۔ ان الحق من شأنه ان یؤدب الکبیر بالصغیر وکما ادب الله الامة بتادیب رسولها

ان مقامات پر خطاب گو آپ کو ہے مگر مراد دوسرے لوگ ہیں حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ کبھی چھوٹوں کی تنبیہ کے ذریعہ بڑوں کو ادب سکھاتا ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ خطاب رسول کو ہوتا ہے اور مقصود ان کی امت کو ادب سکھانا ہوتا ہے۔

بعض آیتوں میں شرک وکفر اور اس قسم کے دوسرے افعال سے اجتناب رکھنے کی بھی ان کو ہدایت کی گئی ہے۔ شیخ رح لکھتے ہیں کہ یہاں بھی ان کی ذات مقصود نہیں ہوتی بلکہ کفار مراد ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ کو یہ اظہار منظور ہوتا ہے کہ ان کو اپنا مخاطب بنانا بھی اس کو پسند نہیں ہے۔ اگر وہ ہمارے رسول سے ہمارے کلام کا بغور سننا پسند نہیں کرتے تو ہم بھی ان کو اپنا مخاطب پسند نہیں کرتے۔

والحکمة فی هذا الخطاب مقابلة لاعراض الکفار	اس طرز خطاب میں یہ بھی حکمت ہوتی ہے کہ چونکہ وہ ہمارے
عن استماع ما جاء به الرسول صلی الله علیه وسلم	رسول سے ہمارے کلام کے سننے سے اعراض کرتے ہیں
فلذلك اعرض الحق عنهم مقابلة اعراض باعراض	اس لیے اس کی جزا یہ ہے کہ ہم بھی ان کو نا قابل
مم کونهم هم للمراد بذلك الخطاب فاسمعهم فی	التفات سمجھ کر ان سے خطاب نہ کریں اگرچہ مراد
غیرهم عقوبة لهم واستهانة بامرهم ۔	وہی ہوں۔

ہمارے نزدیک شیخ موصوف رح کی یہ رائے بہت صحیح ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بعض آیتوں میں آپ کو ان امور سے بھی خطاب کیا گیا ہے جن کا عقلاً کوئی امکان ہی نہ تھا مثلاً والدین کے ادب و احترام کے سلسلہ میں آپ کو اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ ان کے سامنے اُف کا کلمہ بھی نہ نکالا جائے ولا تقل لهما اف و لا تنهرهما۔ اب کون نہیں جانتا کہ اس وقت آپ کے والدین موجود ہی کہاں تھے اس لیے مخاطب گو یہاں آپ نظر آئیں مگر یقیناً مراد آپ کی اُمت ہے۔ اس کے علاوہ اس طرز خطاب میں ایک بڑی حکمت ان امور کی اہمیت پر تنبیہ کرنی ہوتی ہے یعنی مثلاً شرک وکفر جب ایسے خطرناک عمل ہیں کہ اگر بالفرض رسول کے حق میں بھی ان کا تصور کیا جائے تو اس کے اعمال کے لیے بھی تباہ کن ہونگے تو بھلا دوسروں کے اعمال کے لیے تباہ کن کیونکر نہ ہونگے۔

یہی وجہ تھی کہ یہ سب آیتیں دشمنوں کے سامنے تلاوت کی جاتی تھیں اور وہ ان پر غیر معقول سے غیر معقول اعتراضات بھی کرتے تھے مگر یہ کبھی ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کے کیرکٹر اور اس کے ذاتی کاموں کو دیکھ کر بھی کبھی ان کو کوئی اعتراض ہوا ہے یا ان آیات کو انہوں نے خود رسول کے برخلاف شہادت سمجھا ہو کیونکہ وہ ذوق سخن سے خوب واقف تھے اور اس قسم کے خطابات کا مقصد بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔

انبیاء علیہم السلام کی شانِ استغفار عصمت کے خلاف نہیں

اسی طرح رسولوں کی شانِ استغفار و توبہ کا مسئلہ بھی واضح ہے۔ یہ بھی اس بنا پر نہیں ہوتا کہ وہ درحقیقت کسی ادنیٰ سی معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ مقامِ عصمت کی نزاکت اور بارگاہِ صمدیت کی بے نیازی کا استحضار اپنے نفسوں کی برأت اور تزکیہ کا ان کو تصور کرنے نہیں دیتا اس لیے وہ اس بارگاہ میں جہاں بے قصوری کا دعویٰ کرنا ہی سب سے بڑا قصور ہے اپنے

لیے توبہ و استغفار کرتے رہتے ہیں اور مقصود یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے مقبول احاطہ میں ان کی امتیں بھی شامل ہو جائیں۔ کیونکہ نظر رحمت اگر مجرموں کی طرف نظر کرتی ہو تو ان ہی کے واسطہ سے کرتی ہے اور ہماری استغفار کی اُس دربار عالی تک کوئی رسائی ہو سکتی ہے تو ان نفوس قدسیہ ہی کے واسطہ سے ہو سکتی ہے۔ اب آیات ذیل پر توجہ کے ساتھ ذرا غور فرمایئے کہ درحقیقت ان کا مصداق ہے کون۔ پھر رسولؐ کی ذات کو یہاں پہلے نمبر میں رکھا گیا ہے تو کیوں؟

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَ	اور اللہ تعالیٰ مہربان ہوا نبی پر اور ان مہاجرین و انصار پر جو
الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ	ساتھ رہے نبی کے مشکل کی گھڑی میں۔ اس کے بعد کہ
مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ	قریب تھا کہ ان میں سے بعضوں کے دل پھر جائیں پھر مہربان
ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝	ہوا ان پر بیشک وہ ان پر مہربان اور رحم کرنے والا ہے اور
وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا (توبہ)	ان تین شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا۔
يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کریگا نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان
مَعَهٗ (التحریم)	لائے ان کے ساتھ۔
قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ	انہوں نے عرض کی اے رب اگر تو چاہتا تو ان کو پہلے ہی
وَاِيَّايَ (الاعراف)	ہلاک کر دیتا اور مجھ کو بھی
وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (محمد)	اور استغفار کرو اپنے گناہ کے لیے اور مومنوں کے گناہ کے لیے

پہلی آیت میں غزوۂ تبوک کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں تین صحابہ سے کچھ تساہل ہو گیا تھا لیکن جب ان کی توبہ کی قبولیت کا وقت آیا تو یہاں سب سے پہلے اپنے معصوم رسول کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری آیت قیامت کے دن کا واقعہ ہے جہاں نبی کی ذات کے لیے رسوا ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں تیسری آیت بنی اسرائیل کی اس خودسری کے متعلق ہو جبکہ اُنہوں نے کوہ طور پر جاکر خود اپنے کانوں سے کلام الٰہی سن لیا تھا، مگر اس پر بھی وہ ایمان نہ لائے اور ایک دوسری گستاخی یعنی رویت باری تعالیٰ کی ناممکن بات کی فرمائش کر بیٹھے آخر اس گستاخی کی ان کو سزا ملی اور سب ہلاک کر دیے گئے اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے ترحم کی درخواست میں یہ کلمات نکل گئے تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے فوائد سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس قسم کے مواضع پر سب سے پہلے اپنے نفسوں کو اس لیے شامل فرما لیتے ہیں کہ ان کے معصوم نفوس کی شمولیت کی برکت سے مجرموں کے لیے بھی یہ درخواستیں قابل توجہ بن جائیں۔ رحمت ان کے نام پر جھک پڑتی ہے پھر اس کی وسعت مجرموں سے کترانا گوارا نہیں

کرتی اور اس طرح مجرموں کی بخشش کا یہ ایک یقینی ذریعہ بن جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی استغفار و توبہ میں اس حکمت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ہماری اس تفصیل کے بعد اب آپ کو عصمت انبیاء علیہم السلام کا مفہوم خوب واضح ہو گیا ہوگا اور یہ بات بھی صاف ہو گئی ہوگی کہ عصمت کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ان میں معصیت کا داعیہ تو پیدا ہوتا ہے مگر پھر قدرت ایزدی ان کو اس کے ارتکاب کرنے سے روک لیتی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی نہاد ہی میں جو بشری قوتیں رکھی جاتی ہیں وہ فطرۃً اتنی شائستہ اور مہذب رکھی جاتی ہیں کہ ان میں کسی معصیت کی طرف ادنیٰ سا رجحان ہی نہیں ہوتا جس طرح کہ ایک لطیف مزاج انسان کو نجاست اور گندگی سے طبعی نفرت ہوتی ہے اسی طرح ان نفوس قدسیہ کو معصیت کی ہر نوع سے طبعی نفرت ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ان کو وہ طبعی راحت[1] محسوس ہوتی ہے جو مچھلی کو پانی میں اس لیے وہ اپنے قصد و ارادہ سے کسی ادنیٰ سی معصیت کا تصور بھی نہیں لا سکتے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان میں بھوک، پیاس، غضب، محبت اور اسی قسم کی دوسری بشری قوتیں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں۔ اگر ان میں یہ قوتیں موجود نہ ہوں تو پھر ان کی عصمت اتنا بڑا کمال ہی کیوں ہو اور ملائکۃ اللہ کی عصمت سے ان کو امتیاز ہی کیا رہے۔ یہاں فرق ہے تو یہی ہے کہ ملائکۃ اللہ اگر معصوم ہیں تو اس لیے کہ ان میں سرے سے یہ قوتیں ہی موجود نہیں وہ اگر معصیت کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ اسی لیے ان کی شان میں ارشاد فرمایا گیا ہے

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (تحریم)

وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اس میں جس کا ان کو حکم ہوتا ہے اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور ملائکۃ اللہ کی عصمتوں میں فرق

آیت بالا کا مقصد ملائکہ کی صرف عصمت بتانی نہیں ہے بلکہ الگ اپنی ایک ایسی مخلوق بتانی ہے جس میں خیر کے سوا شر کی طاقت ہی نہیں اس لیے وہ معصیت کر ہی نہیں سکتے بلکہ نیکی بھی صرف وہی کر سکتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے اسی لیے نہ اُن میں ترقی کا کوئی احتمال ہوتا ہے نہ تنزل کا۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (الصافات)

اور ہم میں جو بھی ہے اس کا ایک معلوم مقام ہے (اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا)

اور اسی لیے قرآن کریم میں کسی جگہ اپنے حق میں توبہ و استغفار کی نسبت ان کی طرف نہیں کی گئی وہ اگر استغفار

---

[1] ایک موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا اَرِحْنِیْ یا بلال پھر ایک حدیث میں فرمایا جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ۔

کرتے ہیں تو بنی آدم کے لیے، ان کے حق میں توبہ و استغفار کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں اس لیے وہ حق تعالیٰ کی صفات میں سے صفت غفار و قہار، رزاق کا ذوق بھی نہیں رکھتے۔

وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَن فِي الْأَرْضِ (الشوریٰ) اور فرشتے تسبیح کرتے ہیں اپنے رب کی اور زمین والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں۔

یعنی فرشتوں کا وظیفہ اپنے لیے صرف تسبیح و تحمید ہے اور اہل زمین کے حق میں استغفار اور ان کے لیے بخشش مانگنا۔ وظائف کی یہ تقسیم اتفاقی نہیں بلکہ انسانی اور ملکی خلقت کی تقسیم پر مبنی ہے۔ فرشتے چونکہ معصیت سے منزہ بنائے گئے ہیں اس لیے ان کا وظیفہ صرف خدائی تنزیہ و پاکی کا ترانہ گانا ہوا اور بشر کو چونکہ جامعیت کی شان عطا کی گئی ہے اس لیے ملکوتی وظیفے یعنی تسبیح و تقدیس کے ساتھ استغفار بھی اس کے وظیفہ میں شامل ہے پھر چونکہ بشریت اس کی جوہر ذات ہے اور ملکیت اس کی صفت اس لیے اس کا خاص وظیفہ استغفار ہے۔

اب یہ غور کر لینا چاہیے کہ ان دو عصمتوں میں سے بلند عصمت کونسی ہے کیا وہ عصمت جو جبری ہو؟ یا وہ عصمت جو اختیاری ہو؟ کمال یہ ہے کہ قوتیں سب ہوں مگر سب شائستہ اور مہذب ہوں یا کمال یہ ہے کہ سرے سے وہ قوتیں ہی مفقود ہوں؟ ملک اور فرشتہ ہونا بھی بیشک ایک کمال ہے مگر اس کمال میں تمام تر کمال صانع ہی کا ظاہر ہوتا ہے خود فرشتوں کی اس میں تعریف کیا ہے لیکن بشر ہو کر اگر پھر وہ فرشتہ صفت ہو تو یہ اس کی بھی تعریف ہے اور اس سے بڑا کمال ہے۔ زنان مصر ایک طرف تو اس کا یقین رکھتی تھیں کہ جس کے حسن و جمال کا وہ نظارہ کر رہی ہیں وہ بے شبہ ایک بشری صورت ہے مگر جب وہ اس کی عفت و عصمت کا نقشہ دیکھتی تھیں تو ان کو اپنے اس چشم دید یقین میں بھی شبہ گزرنے لگتا تھا۔ ذیل کی آیت میں ان کی اس حیرت کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ یہ شخص آدمی نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔

گویا کھلے طور پر بشر ہو کر یہ پاکبازی ایسی ہے جیسی فرشتوں میں بھی کسی بڑے فرشتہ کی ہو سکتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں اس قسم کی گویا کوئی طاقت ہی نہیں ہے پس اسباب و دواعی موجود ہونے کے باوجود معصیت سے نفور رہنا جتنا قابل تعجب ہے ان اسباب کے نہ ہونے کی صورت میں معصیت سے نفور ہونا اتنا قابل تعجب نہیں۔ ملک اگر پاکبازی دکھلائے تو یہ اس کی فطرت ہے مگر تعجب تو اس پر ہے جو ہے تو بشر مگر اس کی پاکبازی کا نقشہ پھر وہ ہے جو ملک کا ہونا چاہیے۔

اچھا جب ان کی صفت عصمت کا عالم یہ ہونا ہے تو پھر ان کی حفاظت الٰہی اور فرشتوں کی اعانت کا

مطلب کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ انسان خلقۃً ضعیف بنایا گیا ہے جیسا کہ وَخُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا سے ظاہر ہے اس لیے بعض مرتبہ وہ مقابل طاقتوں کا پورا پورا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس کا امکان نظر آنے لگتا ہے کہ اپنے قصد و ارادہ کے بغیر اس کا قدم لغزش کر جائے۔ انبیاء علیہم السلام کا معاملہ صرف ایک انفرادی معاملہ نہیں ہوتا، پھر ان کی آزمائش بھی معمولی انسانوں کی آزمائش کی طرح نہیں ہوتی۔ ایک طرف تن تنہا وہ ہوتے ہیں دوسری طرف کفر کا پورا جتھا سامنے ہوتا ہے جو ان کے مقابلہ پر ایسی ایسی تدابیر اختیار کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ پہاڑ بھی ہو تو وہ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائے

وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِندَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِن كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ — انہوں نے اپنی سب تدابیر کر ڈالی تھیں اور ان کی یہ سب تدبیر اللہ تعالیٰ کے سامنے تھیں۔ اگرچہ ان کی تدابیر ایسی تھیں کہ پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا دیں۔ (ابراہیم)

اس لیے قرآن کریم نے ان کی اس پاک نفسی کو بھی ذکر کیا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے ماحول کی اس نزاکت پر بھی تنبیہ فرمائی ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ان حالات میں اگر کسی میں غلط قدم اٹھانے کے دواعی و اسباب نہ بھی ہوں تو بھی اگر کسی خارجی باعث سے انسان کا قدم اس طرف اٹھ جائے تو کچھ بعید نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کے نگراں ہم ہوتے ہیں اس لیے وہ ان نازک مواضع میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں اور ان موانع کے باوجود ان کی عصمت میں ذرا فرق نہیں پڑتا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں دیکھیے حالات کتنی نزاکت اختیار کر چکے تھے یعنی جس طرف سے انکار کا خطرہ ہو سکتا تھا اب اسی جانب سے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت دی جا رہی تھی۔ سو اور فحشاء کی بھیانک صورت سے وہ خود خواہ کتنے ہی دور کیوں نہ ہوں مگر وہ از خود ان کے اتنا قریب آ چکا تھا کہ اگر کوئی طاقت اس کو دھکا نہ دیدیتی تو اگر یہ از خود اس میں نہ گرتے تو یقیناً وہ خود آ کر ان کو گھیر چکے تھے جب صورت حالات اتنی نزاکت اختیار کر گئی تو دیکھو پروردگار کی حفاظت کس طرح مدافعت کے لیے سامنے آ گئی اور کس طرح حضرت یوسف علیہ السلام پر اس کا ذرا سا داغ بھی نہ لگ سکا۔ صورت حالات کی اسی نزاکت کو اس آیت میں ادا کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ۔ — عورت نے تو یوسف کا ارادہ کر لیا تھا اور اگر یوسف اپنے پروردگار کی حجت اور برہان نہ دیکھتے تو وہ بھی عورت کا ارادہ کر لیتے۔

---

[1] اس جگہ یہ بحث کرنی کہ وہ برہان رب تھی کیا غیر ضروری بحث ہے جس کے بیان سے سکوت کر لیا گیا اس کی تحقیق ہم پہنچانے کے لیے بھی مناسب نہیں۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ضرور وہ کوئی ایسی بات ہو گی جو عین اس وقت ان کے ربانی (بقیہ صفحہ ۳۵۱)

یعنی ایک جانب تو ارادہ ہو ہی چکا تھا اور اس بنا پر دوسری جانب ہیں عصمت کے خلاف جتنے اسباب ہوسکتے تھے وہ سب موجود ہوگئے تھے اور نقشہ کچھ ایسا بن گیا تھا کہ اگر کہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے برہان رب نہ آجائے تو اس طرف سے بھی قصد پیدا ہو جانا کچھ بعید نہ تھا مگر ان حالات کے باوجود پھر یہ ارادہ بھی کیوں نہ ہوسکا! اس لیے کہ ان کے رب کی برہان ان کے سامنے تھی پھر جب اس طرف ارادہ کا بھی وجود نہ تھا تو عصمت کے اس بلند مقام کو ادا کرنے کے لیے جو تعبیر یہاں اختیار کی گئی ہے وہ بھی کتنی بلند ہے۔

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۔ یہ برہان دکھانا اور اس طرح ثابت قدم رکھنا اس لیے تھا کہ ہم ہٹائیں اس سے برائی اور بےحیائی کو بیشک وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں ہے۔

یہاں لنصرفہ عن السوء والفحشاء نہیں فرمایا گیا یعنی صرف کا تعلق جو کچھ بھی رہا وہ سوء اور فحشاء کے ساتھ رہا اس کا تعلق حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کچھ نہ تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سوء اور فحشاء چونکہ خود بڑھ کر ان کی طرف آرہا تھا اس لیے فعل صرف کا تعلق اسی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام چونکہ اپنی جگہ بدستور ثابت قدم رہے اس لیے یوں نہیں فرمایا کہ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سوء اور فحشاء سے باز رکھا یہ تعبیر اس وقت مناسب تھی جبکہ یہاں ان کا ادنیٰ سا قدم بھی اٹھانا ثابت ہوتا۔ پس اندازہ لگائیے کہ قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی عصمت بیان کرنے میں کتنی احتیاط سے کام لیتا ہے اور اس کے لیے تعبیر بھی وہ اختیار فرماتا ہے جو ان کی شان عصمت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرسکے۔ اسی طرح ایک موقع پر آپ کے سامنے منافقین نے ایک مسلمان پر جھوٹی تہمت لگائی اور اس کے لیے اس قسم کے قرائن اور شہادتیں مہیا کردیں کہ ایک خالی الذہن انسان کے لیے ان کے موافق فیصلہ دیے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ اس لیے اگر یہاں آپ مسلمان کے خلاف فیصلہ فرما دیتے تو بالکل قرین قیاس ہوتا۔ مگر خدائی عصمت نے آپ کو ایسے فیصلہ سے بچالیا اور وحی الٰہی نے تمام حقیقت کھول کر رکھ دی۔ دیکھیے واقعہ کی اس نزاکت پھر آپ کی غیبی عصمت کو قرآن کریم نے کس انداز سے ادا کیا ہے

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـــًٔا قَلِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل) اور اگر ہم تم کو سنبھالے نہ رکھتے تو تم ان کی طرف تھوڑا سا جھک جاتے۔

یہاں بھی آپ کے حق میں احتیاط کے جتنے پہلو ممکن تھے ان سب کی رعایت کرلیگئی ہے یعنی جس بات کا خطرہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۴۹) سامنے آئی اس سے قبل اس کا ظہور نہ تھا، دوم یہ کہ وہ کوئی ایسی چیز تھی جس سے رؤیت متعلق ہوئی تھی۔ یعنی نظر آنے کی چیز تھی۔ یہاں اس کا مصداق صرف نفس کی پاکی قرار دینا ظاہر کے خلاف ہے اور یوں باطل کو قلم کے زور سے حق ثابت کردینا علیحدہ بات ہے وان من البیان لسحراً کی ایک شرح یہ بھی کی گئی ہے

ظاہر کیا گیا ہے وہ آپ کا کوئی عملی قدم نہ تھا بلکہ صرف میلان طبع تھا، پھر اس پر لفظ کدت اضافہ فرما کر یہ بتا دیا گیا کہ آپ کا یہ میلان بھی ہوا تو نہ تھا مگر حالات اس کے قریب آ لگے تھے کہ اگر ہم نہ سنبھال لیتے تو ایسا ہو جاتا۔ اسی پر بس نہیں کی گئی بلکہ شیئاً کے ساتھ قلیلاً کی صفت بڑھا کر یاد دہانیہ کی گئی کہ اگر آپ کا رجحان ہوتا تو وہ بھی بہت خفیف ہوتا۔ اس معاملہ میں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں یوں معلوم ہوتا ہے گویا بہت سنبھال سنبھال کر الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ادھر ان کی عصمت کی یہ رعایت ہے دوسری طرف اس کا امتنان بھی منظور ہے کہ اتنی عصمت پر بھی ان میدانوں میں ایسی صاف گلو خلاصی صرف ہماری حفاظت کا ثمرہ ہے۔ اگر ہماری دستگیری نہ ہو تو یہ ممکن نہیں۔ پھر جہاں کسی تکوینی مصلحت سے قدرت یہ دستگیری نہیں فرماتی بس وہیں قدم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ دیکھیے حضرت آدم علیہ السلام کے معاملہ میں جب مشیت الٰہی نے ان کی ایک ذراسی لغزش میں عالم کی آبادی کا راز پنہاں فرما دیا تھا تو بھی نازک مراحل ان کے سامنے آ گئے۔ شیطان نے اگر جو بات ان کے سامنے رکھی وہ خدا تعالیٰ کے دارالرضوان میں دائمی حیات کی دولت تھی جس کے لیے نبی تو نبی ایک عام مسلمان کا دل بھی بےچین ہوتا ہے۔ پھر اس پر جھوٹی قسمیں کھا کر کچھ ایسا سماں باندھا کہ جو بات ان سے کہی گئی تھی وہ اس وقت ان کے دماغ سے بالکل نکل گئی مگر چونکہ تکوینی طور پر قدرت ہی کو یہ لغزش منظور تھی اس لیے یہاں ان کو سنبھالا نہیں گیا۔ آخر کار ان کا قدم پھسلا اور یہ آواز آئی

وَنَادٰهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ	اور ان کے رب نے ان کو پکارا کیا میں نے اس درخت
وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (اعراف)	سے تم کو منع نہیں کیا تھا اور نہ کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

مگر آدم علیہ السلام نے گریہ وزاری کے علاوہ عذر و معذرت کا ایک کلمہ تک منہ سے نہ نکالا کیونکہ جانتے تھے کہ اگر نسیان کا عذر کرتا ہوں تو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اچھا یہ نسیان بھی کیوں ہوا؟ پھر جب انہوں نے یہ شان عبودیت دکھلائی تو ادھر سے شان معبودیت اس طرح ظاہر ہوئی کہ عفو و درگزر کے ساتھ اب خود اس کا عذر بھی بیان فرما دیا گیا۔ سبحان اللہ! انبیاء علیہم السلام بھی کتنے ادب شناس ہوتے ہیں۔ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ) یعنی جو لغزش بھی ان سے ہو گئی وہ صرف نسیان کی بنا پر ہوئی۔ عزم و ارادہ کا تو یہاں نام و نشان بھی نہ تھا، ابھی ابھی یا تو یہ باز پرس تھی مگر جب اعتراف جرم ہے تو ابھی یہ نوازش ہے گویا جرم کچھ بھی نہ تھا انبیاء علیہم السلام کی لغزش بھی تمام جہان سے نرالی ہوتی ہے پھر ان کی بخشش بھی سب سے نرالی ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام پر نسیان بھی قدرت ہی کی طرف سے ڈالا جاتا ہے اسی لیے وہ بہت سے انعامات اور جدید احکام الٰہی کا منشا بن جاتا ہے۔ دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کتنے اہم مقصد کے لیے تو سفر کیا پھر ان

کے رفیق کو ٹھیک مقصود پر پہنچ کر کیا نسیان ہوا اور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے لیے جو علامت ان کو بتائی گئی تھی وہ بچشم خود دیکھنے کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کا تذکرہ کرنا بھول گئے اور آگے چل پڑے مگر چونکہ یہ نسیان[1] قدرتی طور پر ڈالا گیا تھا اس لیے اس کی یاد دہانی کی شکل بھی قدرت ہی نے پیدا فرمائی وہ یہ کہ اس تمام سفر میں ایک دن بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکان محسوس نہ ہوا تھا مگر آج ذرا دور چل کر ہی ان کو تکان محسوس ہونے لگا اور وہ ذرا دم لینے کے لیے یہ کہہ کر بیٹھ گئے۔ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا۔ آج کے سفر میں تو ہم کو تکان ہو گیا۔ آخر بیٹھ کر جب ناشتہ دان کھولا گیا دیکھا تو مچھلی ندارد تھی، اسی وقت ان کے رفیق کو پچھلی منزل کی بات یاد آگئی اور انہوں نے کہا کہ مچھلی تو میرے سامنے زندہ ہو کر پانی میں گھس گئی تھی، ادھر قدرت نے یہ سامان کر رکھا تھا کہ جس جگہ مچھلی گھسی تھی اس جگہ پانی منجمد ہو کر رہ گیا تھا اور وہ جگہ طاق کی شکل میں کھلی کی کھلی باقی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہی تو وہ جگہ تھی جس کی ہم کو تلاش تھی آخر وہ لوٹے اور وہیں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی۔ انبیاء علیہم السلام کے حالات زندگی اور ان کے سہو و نسیان کے واقعات میں اس پر بھی نظر رکھی جاتی کہ ان میں کیا کیا اسرار اور موعظت و عبر کے کتنے سبق پنہاں ہوتے ہیں تو قرآن کے تکرار قصص کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام   نے ایک شب اپنی حرم سرائے میں جانے کا اس لیے ارادہ کیا کہ ہر ہر بی بی سے ایک ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہو۔ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ نبی تھے اس پر فرشتے نے بھی یاد دلایا کہ ان شاء اللہ کہہ لیجیے مگر ان کو یہ مبارک کلمہ کہنا پھر یاد نہ رہا آخر اس کا جو کچھ نتیجہ ظاہر ہوا وہ اسی جلد میں آپ کے سامنے ہے۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام کے نسیان کا قدم بھی گرفت میں آجاتا ہے۔ اگر کہیں قدرت ان کو سنبھالے نہ رہے تو اپنی گوناگوں ذمہ داریوں میں نہ معلوم ان کے کتنے قدم نسیان کے اٹھ جائیں عام انسانوں کو معمولی پریشانیوں میں اہم سے اہم باتیں بھول جاتی ہیں پھر ان نفوس کا تو حال کیا ہوگا جن کے سر پوری نوع انسانی کے بننے اور بگڑنے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

لہٰذا اس قسم کی جتنی آیتیں ہیں ان کو بھی عصمت کے خلاف سمجھنے کے بجائے براہین عصمت سمجھنا چاہیے ہم پہلے ترجمان السنہ میں   میں لکھ چکے ہیں کہ نبی کے قول و عمل کا تو کہنا ہی کیا اس کی رائے کو بھی عصمت حاصل ہوتی ہے اور اگر کہیں اس پر ٹوکا گیا ہے تو یہ ان کی عصمت ہی کی بنا پر ٹوکا گیا ہے کیونکہ یہی اس کی دلیل ہے کہ ان کی ہر ہر نقل و حرکت بلکہ ان کی رائے بھی سب پروردگار کے زیر نگرانی ہوتی ہے اور اسی باطنی حفاظت کے اظہار کے لیے شاذ و نادر صورتوں میں کہیں ان کو ٹوک بھی دیا جاتا ہے اس کے برخلاف ان کی امتوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے

[1] اس جگہ ترجمان السنہ جلد دوم ص۴۳ حدیث نمبر ۶۰۰ کا تشریحی نوٹ ملاحظہ فرما لیں۔

اگر اجتہاد و کوشش کے بعد اُن سے خطا واقع ہو جائے تو اس پر بھی ان کے لیے ایک اجر کا وعدہ ہو۔

ان تمام تفصیلات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ لگائیے کہ مقام نبوت کی نزاکت اور اس کا حسن کیا کسی ادنیٰ سی معصیت کے داغ کا بھی متحمل ہے۔ حاشا وکلّا۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔

چونکہ اس موضوع کے متعلق مجھ کو قدیم سے شغف رہا ہے اس لیے اس مضمون کی تصانیف مطالعہ کرنے کا مجھ کو ہمیشہ موقعہ ملتا رہا ہے حسن اتفاق سے آج سے تیس سال پہلے اسی مضمون پر ایک مطبوعہ فارسی مکتوب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کا تحریر کردہ میرے ہاتھ آگیا تھا اور مجھ کو اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے اسی وقت اس کی ایک نقل لے کر اپنے پاس رکھ لی تھی اور الحمد للہ کہ آج بھی یہاں وہ میرے دم کے ساتھ موجود ہو۔ اس کے بعد جب قسمت نے متقدمین و متأخرین کی چند کتب کے مطالعہ کا موقع بخشا تو اندازہ یہ ہوا کہ جو کچھ ان متفرق اوراق میں بکھرا پڑا تھا وہ اس مکتوب میں یکجا جمع شدہ موجود ہے۔ پھر حضرت مولاناؒ کی فطری جدت پسندی نے طرز استدلال کا اس پر ایک اور ایسا نیا روغن چڑھا دیا ہے کہ وہی استدلال جس کو ملّانہ کہا جا سکتا تھا اب فلسفیانہ بن گیا ہے۔ مجھ کو اس کا تصور بھی نہ تھا کہ میں کسی مناسب صورت میں اپنے قدردانوں کے سامنے کبھی اس کو پیش کر سکونگا مگر الحمد للہ کہ آج قدرت نے مجھ کو اس کا موقعہ عنایت فرما دیا اور بڑی مسرت کے ساتھ میں اس کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ یہ آپ کو معلوم ہو کہ پہلے فارسی زبان ہی علمی زبان تھی، اسلامی معلومات کا بڑا ذخیرہ اسی زبان میں منتقل ہوا ہے۔ حضرت مولانا قدس سرہ اس میں بھی تمام علماء سے جداگانہ اپنی ایک امتیازی شان رکھتے تھے۔ ہمارے زمانہ میں فارسی زبان تو بالکل متروک ہی ہو چکی ہے اور اُردو بھی ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔ پھر اتنی طویل مدت گزر جانے کی وجہ سے میری نقل کردہ تحریر جگہ جگہ سے مشکوک بھی ہو چکی ہے۔ میں نے اس پر بھی تھوڑا سا وقت خرچ تو کیا ہو کہ حتی المقدور اس کی تصحیح کردوں پھر اس کا ترجمہ بھی کسی حد تک قابل فہم کردوں۔ اس فکر میں زیادہ میں اس لیے نہیں پڑا کہ کہیں مصنفؒ کا اصل مقصود ہی فوت نہ ہو جائے۔ اب آپ پورے غور کے ساتھ میرے تحریر کردہ مقالہ کو پڑھیں جو اسی مکتوب کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد اس سے زیادہ غور کے ساتھ مکتوب مذکور کا بسم اللہ کے ترجمہ دیکھیں۔ واللہ المیسّر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکتوب حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

در معصومیت انبیاء علیہم السلام و ہم تحقیق حقیقۃ کلی طبعی

مکتوب اصل بزبان فارسی

بزعم احقر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام از صغائر و کبائر قبل النبوۃ و بعد النبوۃ بہر طور کہ باشد معصوم اند۔ و ایں رائے جدید ہر چند کہ بظاہر مخالف اقوال اکابر است اما ہر کرا بہرہ از فہم دادہ اند ان شاء اللہ بعد تنقیح اصل مُراد موافق اقوال اکابر خواہند یافت چوں ہر دعویٰ را دلیل بکار است نہ فقط لانسلم و انکار۔ می باید کہ ایں دعویٰ را اولاً موجہ نمایم۔ برادر من در کلام اللہ می فرمایند "قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله" و ہمچنیں لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ فرمودہ اند ایں دو آیت باتباع مطلق ہدایت می فرمایند و ایں طرف آیت "وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون" "وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین"

ترجمہ اُردو

احقر کے نزدیک انبیاء علیہم السلام صغائر و کبائر ہر دو قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں اپنی نبوت سے قبل بھی اور بعد بھی۔ میری یہ رائے اگرچہ بظاہر اقوال اکابر کے خلاف نظر آتی ہے لیکن مسئلہ کی پوری تقریر کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ موافق نظر آئیگی۔ چونکہ ہر دعوے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے صرف کسی بات کا انکار کر دینا کافی نہیں، اس لیے پہلے ہم اپنے دعویٰ کی دلیل قرآن کریم سے پیش کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (ترجمہ) کہہ دیجیے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ یعنی تمہارے لیے رسول اللہ میں بہترین نمونہ ہے۔ ان ہر دو آیات میں جب ہر معاملہ میں آپ کی اتباع اور ہر بارہ میں آپ کی ہستی کو نمونہ فرمایا گیا ہے اب اگر آپ کے افعال و اقوال میں معصیت کا احتمال ہو تو لازم ہوگا کہ معصیت میں بھی آپ کی اتباع ضروری ہو حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ ترجمہ: ہم نے جنات اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کیا کریں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے "وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین"۔ ترجمہ: اُن کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کریں۔

باہم پیوستہ بایں جانب مشیراند کہ مقصود از انسان ہمانست کہ مامور بآنست و آں جز عبادت ہیچ نیست۔ مگر می دانی کہ ہر چیز را از لوازم ذات خود ناگزیر است چہ الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ و ایں ظرف در تعریف ملائکہ و شیطان می خوانی کہ

"کان الشیطان لربہ کفورا"

"ولا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون"

ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد صرف عبادت ہے نہ کہ معصیت! اور اس کو صرف اسی کا حکم دیا گیا ہے تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ معصیت میں بھی اس کو اتباع کا حکم دیا جا سکے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کے لیے اس کی ذات کے کچھ لوازم ہوتے ہیں جس جگہ وہ ذات موجود ہوتی ہے وہاں اُس کے یہ لوازم بھی ضرور موجود ہوتے ہیں اسی لیے ان کو اس ذات کے لوازم کہا جاتا ہے جیسے آگ اس کے لیے جلانا لازم ہے جہاں آگ ہوگی ضرور جلائیگی۔ اس قاعدہ کے موافق ہمارے سامنے دو قسم کی مخلوق ہیں۔ ملائکہ و شیاطین۔ ان کی ذات کے لیے بھی کچھ لوازم ضروری ہیں۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی ذات کے لیے کفر لازم ہے کَانَ الشَّیْطَانُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۔ اور ملائکہ کے لیے فرمانبرداری لازم ہے وہ فرمانبرداری جس میں سرتابی و نافرمانی کی مطلق گنجائش نہ ہو وَلَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔

پس شیطان را عصیان و ملائکہ را اذعان فرمان لازم آمد و چون ایں قدر پیشتر گوش خوردہ آں عزیز است کہ لازم ذات از ملزوم خود عام نمی باشد لازم ذات او بجائے دیگر نمی رود و چگونہ تواں شد الواحد لا یصدر الا عن الواحد لازم آمد کہ در مصداق خلطوا عملا صالحا و آخر سیئا از ہر دو نوع پارہ در خمیر نہادہ باشند نہ بلکہ ہر گرا خیال خیر و خطرۂ شر بہ دل می رود از ہر دو نوع چیزے در آغوش مادہ اندواز ہر قسم قدرے در بر نہادہ اند ورنہ

چونکہ یہ امر بھی مسلم ہے کہ جو ذات کے لوازم ہوتے ہیں وہ اس ذات کے علاوہ دوسری جگہ نہیں پائے جا سکتے۔ اس لیے ملائکہ اللہ کے علاوہ اذعان و فرمانبرداری اور شیطان کے علاوہ کفر و سرکشی کسی دوسری جگہ پائی نہیں جا سکتی۔ لیکن ان دو مخلوق کے سوا یہاں ایک تیسری مخلوق اور نظر آتی ہے یعنی حضرت انسان جس میں یہ دونوں باتیں جمع نظر آتی ہیں ارشاد ہے خلطوا عملا صالحا و آخر سیئا یعنی انہوں نے نیک عمل کے ساتھ کچھ برے عمل بھی کیے ہیں لہذا حسب بیان سابق ضروری ہے کہ انسان میں ہر دو قسم کا مادہ موجود ہو۔ مادۂ شیطانی بھی اور مادۂ ملکی بھی ورنہ برائی اور بھلائی جو دراصل ان دو قوتوں کے ذات کے لوازم تھے عام بن جائینگے۔ ان اجزاء سے انسان کی ترکیب پر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسا کہ عناصر

لازم آید کہ لازم ذات عام باشد اندریں صورت مثال ترکیب ارواح انسانی ازیں دو قسم مادہ چناں باشد کہ در ہر مادہ ترکیب انواع مرکبات از

اربعہ سے اس کی ترکیب ہو ظاہر ہے کہ انسان کے لیے عناصر اربعہ کے اجزاء ترکیبی

اربع عناصر شنیدہ بلکہ چنانکہ از خواص اربعہ
یبوست و رطوبت و برودت و حرارت کہ در
اجسام مرکبہ یافتہ میشوند و لوازم ذات
خاک و آب و باد و آتش اند ترکیب اجسام
مرکبہ ازیں اجسام چنانکہ نیے بردہ اند ورنہ
کیست کہ وقت آفرینش نگریستہ ہمچنیں
ترکیب ارواح انسان ما و شما از دو عنصر ملکی
و شیطانی نیے تواں برد گو ما ولے ایں دو
چیزہائے دیگر باشند۔ اندریں صورت لازم
افتاد کہ ذات با برکات حضرت خلاصۂ
موجودات سرور کائنات علیہ وعلی آلہ افضل
الصلوٰت واکمل التسلیمات از شائبۂ
شیطانی مبرا باشد ورنہ اتباع مطلق چگونہ
صورت بندد، ہاں اگر از لوازم ذات امید
مفارقت بودے می تواں گفت کہ ہر چند کہ
در ذات شریف حضرت حبیب رب العالمین
جزوی از نوع شیطانی است اما عصیان
کہ لازم آن بود دریں مادہ مفارقت نمود با جملہ
الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ ما گر نعوذ باللہ
مادہ شیطانی در خمیر حضرت سرور انبیا صلی اللہ
علیہ وسلم بودے اتباع مطلق را نشائستے
آخر کم از کم کیفیتے از آں عارض حال وشان

ہونے کا ثبوت بھی ہمارے پاس بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے
کہ جو ان عناصر کے لوازم ہیں مثلاً رطوبت، یبوست، برودت
اور حرارت یہ سب انسان میں موجود نظر آتے ہیں۔ رطوبت کو
دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ آب جس کے لیے رطوبت لازم ہے
انسان میں موجود ہے۔ اسی طرح بقیہ اثرات کو دیکھ کر بھی تسلیم
کرنا ضروری ہوگا کہ اس میں باد و آتش و خاک کے عناصر بھی موجود
ہیں ورنہ ایسا کوئی شخص ہے جس نے انسانی آفرینش کے وقت ان
اجزاء کا مشاہدہ کیا ہو۔ پس جس طرح ہم نے یہاں صرف لوازم
کے وجود سے اُن عناصر کے وجود پر استدلال کیا ہے اسی طرح
عام انسانوں میں اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ کے اثرات کو دیکھ
کر یہ تسلیم کرنا بھی لازم ہوگا کہ اس میں وہ دونوں قوتیں بھی ضرور
ہیں جس کے یہ دو لوازم ہیں یعنی مادہ ملکی مادہ شیطانی۔ اس تمہید
کے بعد اب یہ ضروری ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مادہ شیطانی
سے مبرا ہوں۔ ورنہ اگر آپ کی ذات اقدس میں بھی یہ مادہ موجود
ہو تو یہ لازم آئیگا کہ جو اس کے لوازم ہیں یعنی معصیت وہ بھی آپ
کی ذات میں موجود ہو العیاذ باللہ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو جب
قرآن کریم ہر معاملہ میں آپ کی اتباع کا حکم دیتا ہے تو یہ بھی لازم ہوگا
کہ اس معصیت میں بھی آپ کی اتباع ضروری ہو۔ حالانکہ وَمَا اُمِرُوْا
اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ میں حصر کے ساتھ فرما دیا گیا
ہے کہ تم کو صرف عبادت کرنے کا ہی حکم دیا گیا ہے معصیت کا نہیں۔ یہاں
اب اگر معصیت میں بھی آپ کی اتباع تسلیم کی جائے تو یہ حصر باطل
ہو جائیگا لہٰذا ماننا پڑیگا کہ آپ میں مادہ شیطانی جو منشاء گناہ ہے

شدے و رنگ از عصیان پدید آمدے پس اگر ہر گونہ اتباع اوشاں فرمودہ شود بعصیاں نیز ارشاد کردہ شود واندریں
صورت تصحیح ایں حصر وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ چگونہ تواں شد وچوں منشاء گناہ صغیرہ
باشد یا کبیرہ ہماں مادہ شیطانی است لازم آمد کہ حضرت سرور انبیا صلی اللہ علیہ وسلم معصوماں از اندیشۂ

گناہ معصوم باشند باز باید شنید کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم را ارشاد میفرمایند فبھداھم اقتدہ و ایں ارشاد نیز با قتداء مطلق شدہ است تخصیص نوعے از افعال و تقلید قسمے از اخلاق و اقوال نیست و ہم مقرر است کہ چوں صلہ را بے قرینہ حذف میکنند چنانکہ در اللہ اکبر صلہ اکبر را حذف فرمودہ اند۔ ایں حذف بتعمیم میباشد لہذا اکبریت اللہ تعالیٰ بخصوص امرے نیست پس لازم آمد کہ حضرت و دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نیز از ہیں عیب مبرا باشند۔ علاوہ بریں در آیۃ عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدًا الا من ارتضی من رسول فاعل ارتضی ضمیر است راجع بسوئے خدا تعالیٰ و ضمیر مفعول کہ راجع بسوئے من است محذوف بازار تضی را مطلق داشتہ اند یعنی ایں نفرمودہ اند کہ ارتضی فی الاعمال او الاخلاق او فی ھذا الامر و بعد ایں ہمہ من رسول گفتہ اند و پیدا است کہ من در من رسول بیانیہ است نہ غیر آں۔ لہذا ضروری افتاد کہ ہمہ عناصر سوا ئی رسل محبوب و مرضی خداوندی باشند

موجود نہیں، اور چونکہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ دونوں کے صدور کا منشاء مادۂ شیطانی ہے۔ لہذا جب آپ میں یہ مادہ شیطانی نہیں تو آپ کا ہر قسم کی معصیت سے معصوم ہونا بھی ضروری ہے۔ اب رہی یہ بحث کہ اس بیان سے صرف آپ کی ذات کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے جمیع انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے، تو قرآن کریم میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ فبھداھم اقتدہ آپ انبیاء سابقین علیہم السلام کے طریقے کی پیروی کیجیے۔ یہاں بھی آپ کو ان کے طریقے کی پیروی کرنے کا مطلقاً حکم دیا گیا ہے کسی خاص قول و فعل کی تخصیص نہیں کی گئی۔ اور یہ نحو کا قاعدہ ہے کہ جب صلہ حذف کرتے ہیں تو وہاں مراد عموم ہوتا ہے جیسا اللہ اکبر میں دیکھو یہاں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کس سے بڑا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر چیز سے بڑا ہے۔ اسی طرح جب یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ کس بات میں ان کی پیروی کیجیے تو ثابت ہوا کہ مراد یہ ہے کہ ہر بات میں۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح جملہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت بھی ثابت ہو گئی۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک اور عام دلیل بھی ہے جس سے جملہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت ثابت ہوتی ہے۔ عالم الغیب الخ فعل ارتضی میں ارتضی کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے۔ یہاں بھی فعل کو مطلق رکھا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس کو بھی اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ اور اس کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی کہ حق تعالیٰ کی اس رضاء کا تعلق ان کے کسی خاص عمل کے یا کسی خاص قول کے ساتھ ہے۔ تو ماننا پڑیگا کہ یہاں بھی عموم و اطلاق ہی مراد ہے اور "من رسول" میں من چونکہ بیانیہ ہے اس لیے ثابت ہوا کہ من ارتضی یعنی جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ رسول ہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ رسول جتنے بھی ہیں سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مرتضی ہیں اور وہ بلا تخصیص ہر بات اور ہر ادا میں محبوب و مرتضی ہوتے ہیں۔ اب اگر ان سے معصیت کا صدور ممکن ہو تو وہ علی العموم محبوب و مرتضی کیسے ہو سکتے ہیں

وجہش ایں است کہ چنانکہ زر و نقرہ را بر معیار
سودہ میکنند تا غش از خالص معلوم شود ہمچنیں
امتحان عناصر روحانی اعنی اخلاق و ملکات
و قوی باعمال میکنند تا نیک از بد متمیز شود
چنانچہ خود میفرمایند۔ لیبلوکم ایکم احسن
عملا و ظاہر است کہ فعل داد و دہش از
آثار ملکۂ سخاوت و معرکہ آرائی از آثار شجاعت
در دہنہ ہمچنیں جملہ افعال از آثار ملکات و قوی
و اخلاق کامن می باشند و ایں آثار و افعال
را با آں اخلاق و ملکات ہماں نسبت است
کہ خطوط معیار را با زر و نقرہ پس چناں کہ در
زر و نقرہ قدر و قیمت ہماں زر و نقرہ را باشد
نہ آں خطوط را و مقصود اصلی و محبوب زر و
نقرہ بود نہ آں خطوط بلکہ آں خطوط فقط مظہر
حُسن و قبح زر و نقرہ باشند نہ اصل مقصود و
محبوب و مبیع و مرغوب ہمیں ساں قصہ دین
است اصل محبوب و مقصود و مطلوب اخلاق
مرضیہ اند نہ اعمال و در بازار آخرت در اصل قدر و قیمت
ہماں اخلاق را باشد نہ ایں اعمال را ایں اعمال
مظہر آں اخلاق و ملکات اند نہ بذات خود محبوب
و مرضی اندریں صورت ضرور است کہ ہمہ
اخلاق و ملکات و قوی در رسولاں محبوب و
مرضی خدا تعالیٰ باشند ایں نتواں شد کہ بعض
از آنہا منجملہ مرضیات باشند و بعض ازاں
خلاف مرضی ورنہ اطلاق "ارتضیٰ" باطل گردد

اس کے بعد یہ سمجھیے کہ جس طرح چاندی اور سونے کو کسوٹی پر اس لیے
گھستے ہیں تاکہ اس کا کھرا اور کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے۔ یہاں کسوٹی
پر گھسنے سے جو لکیریں پیدا ہو جاتی ہیں وہ خود مقصود نہیں ہوتیں بلکہ
وہ چاندی اور سونے کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا صرف ایک معیار
ہوتی ہیں۔ اصل قدر و قیمت اسی چاندی اور سونے کی ہوتی ہے۔
اسی طرح عناصر روحانی یعنی اخلاق و ملکات اور انسانی افعال و کردار
کی مثال ہے۔ یہاں بھی اعمال کی تشریع کا اصل مقصد اخلاق حسنہ
و اخلاق سیئہ کا امتحان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے خلق الموت والحیات
لیبلوکم ایکم احسن عملا زندگی اور موت کو ہم نے اس لیے پیدا
کیا ہے تاکہ تمہاری آزمائش کریں کہ تم میں بلحاظ عمل کون بہتر رہتا
ہے۔ دیکھیے انسان کی داد و دہش کا عمل اس کا شاہد ہوتا ہے کہ
اس میں ملکہ سخاوت موجود ہے، اسی طرح اس کی معرکہ آرائی
اس کی دلیل ہوتی ہے کہ اس میں شجاعت کی صفت پنہاں
ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انسان کے جتنے اعمال بھی ہیں وہ سب در
حقیقت اس کے ان اخلاق کی دلیل ہوتے ہیں جو اس میں پوشیدہ
موجود ہیں۔ یہاں بھی کسوٹی کے خطوط کی طرح خود یہ اعمال مقاصد
نہیں ہوتے بلکہ اصل مقصود وہ مخفی اخلاق و ملکات ہوتے ہیں اور
یہ اعمال اس پر دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بازار آخرت میں تمام تر
قیمت انسان کے ان مخفی اخلاق ہی کی ہے۔ اس بنا پر ضروری ہوا
کہ انبیاء علیہم السلام کے یہ عناصر روحانی یعنی اخلاق و ملکات جو کہ
مبدأ اعمال ہیں سب کے سب حسنہ اور رب العزت کی نظر میں
پسندیدہ ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض پسندیدہ اور بعض غیر
پسندیدہ ہوں ورنہ ارتضیٰ من رسول میں رسولوں کو بلا کسی استثنار
کے پسندیدہ فرمانا کیونکر مستقیم ہو سکتا ہے۔ لہذا جب ان کے جملہ
اخلاق و ملکات پسندیدہ حق ہو گئے تو ان کے جملہ اعمال کا بھی حسنہ ہونا

نگردانی کہ اندریں صورت معصومیت انبیاء از صغائر
وکبائر ضروری است وازانجا کہ بعد ارتضیٰ بایراد
من رسول کہ در آں من بیانیہ آوردہ اند بیان
ایں معنی فرمودہ اند کہ ہرکہ مصداق من ارتضیٰ
باشد رسول شدنش ضروری است ہم فہمیدہ
باشند کہ سوا انبیاء کسے را بمعصومیت اعنی امتناع
صدور عصیاں صغیرہ باشد یا کبیرہ صفت نتواں
کرد مگر غرضم از صدور این است کہ مصدر معصیت
اعنی قوتیکہ مقتضائش عصیان باشد در خمیر بود
نہ اینکہ مثل آب گرم کہ از ذات خود میتواں شد
معروض عصیاں از خارج ہم نمی تواں بعروض
حرارت خارجیا از ذات خود میتواں شد معروض
عصیان از خارج ہم نمی تواں شد آری باوجود
امکان عروض عصیاں انبیاء را از عروض آن
نگاہ میدارند چنانچہ فرمودہ اند کذٰلک لنصرف
عنہ السوء والفحشاء انہ من عبادنا المخلصین
مگر آنکہ بعض اقسام معصیت از سوء وفحشاء ہم خارج
باشد بالجملہ ایں آیت بر امکان عروض ہم دلالت
دارد ورنہ "صرف" بچہ کار آمدے در محفوظ ماندن
انبیاء ہم شاہد است ورنہ بیکار رفتے بہر حال
معصومیت بمعنی مذکور مخصوص با انبیاء است
اولیاء را ہم شریک ایشاں بدیں صفت نتواں گفت

ثابت ہوگیا اور ان کی معصومیت بھی ثابت ہوگئی من ارتضیٰ
کے بعد من رسول میں اسی نکتہ پر تنبیہ کے لیے من بیانیہ
لائے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ من رسول یہ من ارتضیٰ
کا بیان ہے یعنی جو شخص اس عموم کے ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ
کی نظر میں پسندیدہ ہو وہ صرف ایک رسول ہی ہوسکتا ہے،
اسی لیے انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کو اس معنی سے
معصوم نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے گناہ کا صدور نا
ممکن ہو۔ یہ واضح رہے کہ گناہ صادر نہ ہونے سے یہاں ہماری
مراد یہ ہے کہ اس کی ذات میں وہ قوت ہی موجود نہ ہو جو
صدور عصیان کی مقتضی ہو، یہ مطلب نہیں ہے کہ جس
طرح اس کی ذات میں نافرمانی کرنے کا منشاء موجود نہ ہو
اسی طرح کسی عارضی اور خارجی سبب سے بھی اس سے
کوئی عمل ایسا نہ ہوسکے جس پر عصیان کا شبہ ہو۔ دیکھو گرم
پانی میں گرمی پانی کی ذات سے نہیں ہے، مگر خارج سے
پیدا ہوسکتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام پر عصیان گو خارجی
عوارض کی وجہ سے طاری ہوسکتا ہے مگر قدرت ان کی
نگہبان رہتی ہے۔ اور اس خارجی سبب کی وجہ سے بھی نافرمانی
سے بچا لیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کذٰلک لنصرف عنہ السوء و
الفحشاء انہ من عبادنا المخلصین آیۃ بالا سے چند فائدے معلوم
ہوئے۔ اوّل یہ کہ جو نوع سوء اور فحشاء کی تعریف میں نہ آتی ہو
اس کا صدور کسی عارضی وجہ سے مستثنیٰ ہوسکتا ہے۔ دوم یہ کہ
سوء اور فحشاء کا تحقق خارجی اسباب سے یہاں بھی ہوسکتا ہے
سوم یہ کہ اس امکان کے باوجود قدرت ان کے صدور سے
بھی نگہبان رہتی ہے اگر خارجی اسباب سے معصیت کا صدور ناممکن ہوتا تو پھر آیت بالا لنصرف عنہ السوء یعنی صرف
کا کوئی فائدہ ہی نہ رہتا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ معصومیت بایں معنی کہ اس کی ذات میں صدور معاصی کا منشاء ہو صرف

إِنْ أَوْلِيَاءُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ کہ بہ تعریف اولیار
فرمودہ اند بہ این معنی اشارہ دارد تفصیل این اجمال
اینکہ متقون صیغہ اسم فاعل است وضمیرش راجع
سو اولیار و مفعولش ہرچہ باشد محذوف لیکن حاصل
اتقار ہمیں اجتناب از معاصی و غیر مرضیات بود زیں
بعد بشنو کہ حاصل متقی ایں است کہ موصوف بوصف
اتقار مبنی للفاعل باشد بر تعدی الی المفعول ضرور
نیست وایں بداں ماند کہ در ایام برشگال مثلاً
وقت رفتار خود را از افتادن باز میدارند و با اینہمہ
گاہے پائے روندہ می لغزد و از پائے افتد و بریں بنار
بدیگراں میگویند کہ من ہرچند خود را از افتادن نگاہ
بداشتم مگر نتوانستم غرض ازیں تعریف کہ در کلام اللہ
مذکور شد عدم امکان صدور معاصی نمی برآید آرے
بشہادت ہمچو آیۃ یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول
الثابت فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الآخرۃ محفوظ
ماندن اوشان از معاصی می برآید زیرا کہ اطلاق آمنوا
اشارہ بکمال ایمان می کند۔ فرمودہ اند۔ المطلق یراد بہ
الفرد الکامل و پیداست کہ کمال ایمان با ولایت
رسانا است باز باستعانت درب بالقول الثابت
براین امر دلالت دارد کہ انچہ براں ثابت میدارد آں
چیز دیگر است لیکن پیداست کہ انچہ در تحقیقش قول ثابت
یعنی لا الٰہ الا اللہ را دخل است ہمی طاعت و
تقوی است نظر بر ایں اگر گویند کہ مومنان کامل را
بہ برکت لا الٰہ الا اللہ بر طاعت و تقوی ثابت می
دارند بجا است و ظاہر است کہ ایں وقت محفوظیت از

انبیار علیہم السلام کا خاصہ ہے اس معنی میں اولیار اللہ
بھی ان کے شریک نہیں ہیں۔ اولیار اللہ کی شان میں
ارشاد ہے إن أولياؤه إلا المتقون یہاں اولیار کی
شان میں متقی ہونا فرمایا گیا ہے۔ یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے
اس کے معنی ہیں بچنے والا۔ یہاں بھی مفعول محذوف ہے
جس کا مطلب وہی عموم ہے یعنی ہر قسم کی معصیت سے
بچنے والا، مگر جو خود بچنے والا ہو اُس کے لیے یہ لازم نہیں
ہے کہ بچ بھی جائے۔ برسات کے موسم میں جب راستے
کچے ہوتے ہیں، آدمی کوشش کرتا ہے کہ سنبھلے مگر پھر کبھی
پھسل جاتا ہے اور گر جاتا ہے اس لیے کہا کرتے ہیں کہ میں
نے بہت کوشش کی مگر آخر پھسل گیا اور بچ نہ سکا پس
آیت بالا سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے
جو اولیار ہیں وہ گناہوں سے بچتے ہیں مگر یہ کہ صدور معصیت
کا اُن سے امکان نہیں ہوتا یہ ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں
ایک اور آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ
کی رحمت امکان عصیان کے باوجود ان کو بھی گناہ کے
ارتکاب سے بچا لیتی ہے ارشاد ہے یثبت اللہ الذین
آمنوا بالقول الثابت فی الحیوٰۃ الدنیا۔ یہاں الذین
آمنوا یعنی مومنین سے مراد وہی اولیار اللہ ہیں چونکہ یہاں
بھی یہ صفت مطلق رکھی گئی ہے، اور چونکہ مطلق سے فرد کامل
ہی مراد ہوتا ہے، اس لیے یہاں مومنین سے مراد ان کے
فرد کامل ہونگے وہ اولیار اللہ ہیں۔ اگرچہ آیت بالا میں جس
امر پر ثابت وقائم رکھنے کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہ حسب تصریح
آیت القول الثابت ہے یعنی کلمہ طیبہ مگر یہ ظاہر ہے کہ کلمہ طیبہ
پر ثبات قدمی نتیجہ اسی تقوی اور ان کی اطاعت شعاری کا ہے

معاصی ضرورست. باقی وجہ تخصیص معصومیت بہرِ انبیاء و محفوظیت بہر اولیاء با آنکہ ہر دو متحد المفہوم می نماید در خور ایں عجالہ نیست و رزمان شاء اللہ دریں بارہ ہم چیزے رقم میزدم باقی ماند اینکہ ایں جرائم مسلم الثبوت از کجا خاستند اگر مادہ مذکور نبود صدور جرائم محال بود جوابش ایں است کہ افعال را دو جہت است یکے نیت و مبادی آنکہ آنرا مصدر افعال تواں گفت دوم ہیکر و ہیئات آنکہ مظہر آں تواں خواند لیکن پیداست کہ مصدر و مظہر را بیک وتیرہ نداشتہ اند یک فعل بیک مظہر میباشد و انواع نیات بلکہ مدارج یک نوع ہم ازاں متفاوت اندریں صورت میتواں شد کہ ہیکرے و مظہرے دریوزہ گر مصادر شتی باشد ہاں ازیں قدر انکار نتواں کرد کہ بعض مظاہر ارتباط طبعی با بعض مصادر دارند و ازیں جہت در صورت صدور آں از مصدر دیگر بینندہ را بغلط اندازد و خود با مصدر دیگر سازد مثلاً ہیکر صلوٰۃ اعنی ایں صورت خاصہ از رکوع و سجود علاقہ طبعی با مصدر خاص کہ اخلاص است

اس بنا پر اولیاء کی معصومیت بھی ثابت ہو گئی لیکن علماء نے اولیاء کے حق میں معصومیت کی بجائے محفوظیۃ کا لفظ استعمال کرنا مناسب سمجھا ہے۔ اس وقت اس عجلت میں ان دونوں کے فرق پر روشنی ڈالی نہیں جا سکتی فرصت ہوتی تو اس کے متعلق بھی کچھ تحریر کرتا۔ اب رہا یہ سوال کہ جب انبیاء علیہم السلام میں معاصی کا منشا ہی موجود نہ تھا تو پھر اُن سے اُن افعال کا صدور کیسے ہوا جن کی نسبت قرآن کریم کی تصریحات موجود ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ افعال کی دو جہتیں ہوتی ہیں ایک ان کی نیت و مبادی جن کو مصادر افعال کہنا مناسب ہے۔ دوم ان کے قوالب اور اشکال جن کو مظاہر سے تعبیر کرنا موزوں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مصادر و مظاہر افعال دونوں ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی فعل کا مظہر یعنی شکل اپنے مبادی یعنی نیات کے اختلاف سے مختلف ہو سکتا ہے بلکہ ایک ہی نوع کی نیت میں بھی بیشمار مراتب پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس بنا پر یہ ہو سکتا ہے کہ فعل کی صورت و مظہر تو بظاہر یکساں نظر آئے مگر اس کے مبادی یعنی نیتوں اور مصادر میں زمین و آسمان کا فرق ہے اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ بعض افعال کی صورتوں کو بعض مصادر و نیات کے ساتھ طبعی ربط ہوتا ہے اس بنا پر اگر اسی فعل کا صدور کسی دوسرے مصدر اور کسی دوسری نیت سے ہو جس کے ساتھ اس کو وہ طبعی ربط حاصل نہ ہو تو دیکھنے والے کو یہاں مغالطہ لگ جاتا ہے اور وہ اس طبعی ربط کی وجہ سے یہاں بھی مصادر کے اتحاد کا حکم لگا دینے پر مجبور ہو جاتا ہے مثلاً نماز کی خاص ہیأت جو رکوع و سجود سے مرکب ہے اس کو اخلاص کے

لہ حضرت مولانا مرحوم کی اس تحقیق سے جو فرق فہم ناقص میں آتا ہے اس کی طرف ترجمہ میں اشارہ کر دیا گیا ہے یعنی معصوم اور محفوظ اگرچہ ہر دو گناہوں سے معصوم ہونے میں گو دونوں شریک ہوں لیکن معصوم میں مبدأ عصیان ہی نہیں ہوتا اس لیے اس سے معصیت کا صدور ممکن ہی نہیں۔ اور محفوظ کی فطرت تقدس کے اس مرتبہ میں نہیں ہوتی اس سے معصیت کا صدور ممکن ہے گویا انبیاء علیہ السلام میں یہ صفت ذاتی ہوتی ہے اور اولیاء میں خارجی اور عارضی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میدارد باینہمہ با مصادر دیگر اعنی نیات فاسدہ نیز
گاہے خود رامی سپارد و زیر پردہ نیات دیگر مثل ریا و
سمعہ سر می برآمد لیکن بوجہ ہماں علاقۂ طبعی کہ مذکور
شد در بادی النظر بر اخلاص کہ عین تعبدست محمول
میشود و ہمیں است کہ در حق منافقان سرمایۂ اطمینان
و امن شد ورنہ در کفر او شاں چہ کمی بود کہ آب صیح
جُند اللہ بخشیدند ہمیں طور بعض پیکر دہیا کل بعض
افعال را مثل سب و شتم و نقصان مال و جان و دست
و گریباں شدن یکے بدیگرے و دروغ و امثال آں
علاقۂ خاص با عصیان ست گوگاہ بگاہ مصدر آنہا
چیزے دیگر شدہ باشد۔ مقاتلۂ جہاد و کشت و خون
فساد و عناد ہر چند ہم رنگ یک دیگر اند لیکن بوجہ آنکہ
ایں قصد را عناد و فساد اتحادی است طبعی گودر شانے
بغض فی اللہ و مظہر طاعت نیز میتواں شد ہمیں
است کہ بسیارے از انسان صورت آں جہاد را
ظلم و ستم انگاشتہ دل از حقیقت دین اسلام بر داشتہ
اند چوں ایں مقدمہ ممہد شد سخن دیگر کہ ہم ازاں
سر میزند باید شنید بحکم انما الاعمال بالنیات
وان اللہ لا ینظر الیٰ صورکم واعمالکم ولکن
اللہ ینظر الیٰ قلوبکم و نیاتکم او کما قال
مدار اعتبار کاروبار بنی آدم بر مصادر اعنی نیات و
مبادی آں خواہد بود حسنے یا قبحے کہ در ذات افعال
ودیعت نہادہ اند ازاں حساب نخواہند فرمود اندرے
صورت نوعے از حسن و قبح از طرف مصادر بسوئے
مظاہر خواہد آمد و لاجرم آں حسن و قبح در حق مصادر

ساتھ ایک ایسا ربط حاصل ہے جس کی وجہ سے نماز مصلی کے
اخلاص کے لیے برہان بن جاتی ہے۔ بایں ہمہ کبھی نماز مصادر
فاسدہ سے بھی ادا کی جا سکتی ہے یعنی اس میں فاسد نیت
بھی ہو سکتی ہے لیکن اسی طبعی علاقہ کی وجہ سے نمازی پر گمان
غالب یہی ہوتا ہے کہ وہ مخلص ہے اور یہی وجہ تھی کہ منافقین
کے حق میں بھی یہ نماز سرمایۂ اطمینان بنی ہوئی تھی اور ان
کے جان و مال دونوں محفوظ تھے ورنہ ان کے کفر میں شبہ کیا
تھا۔ اس کے برعکس بعض اشکال و صور کو بھی بعض معاصی کے
ساتھ طبعی ربط ہوتا ہے جیسے سب و شتم، جنگ و جدل اور قتل و
غارت وغیرہ یہاں بھی نیات کے تفاوت کی وجہ سے ان افعال
کے معصیت اور طاعت ہونے میں اختلاف ہو سکتا ہے اور
اسی طبعی ربط کی وجہ سے مغالطہ لگ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
جہاد کی صورت چونکہ ناحق کشت و خون کے ساتھ مشابہت
رکھتی ہے اور کشت و خون کو عناد و فساد کے ساتھ طبعی ربط
حاصل ہے اس لیے جہاد پر کشت و خون کا مغالطہ لگ جاتا ہے
حالانکہ یہ بغض فی اللہ کا مظہر اور طاعت ربانی کا مرقع ہے
ان کا قالب گو یکساں نظر آئے مگر ان کا مصدر قطعاً مختلف
ہے، اسی اشتباہ کی وجہ سے بعض کوتاہ فہموں کے لیے تو جہاد
کی مشروعیت حقانیت اسلام کے سمجھنے میں شبہ کا موجب
بن گئی ہے۔ اسی مقدمہ کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ
بمقتضائے انما الاعمال بالنیات اصل محاسبہ کا مدار مصادر
افعال رہینگے نہ ان کے مظاہر و اشکال لہٰذا محاسبہ صرف
افعال کے مظاہر حسنہ اور قبیحہ پر نہ ہوگا بلکہ اصل حسن و قبح کا
مدار ان کے مصادر یعنی نیتوں پر رہیگا اور ان نیتوں کے اختلاف
کی وجہ سے ہی ان کے مظاہر و اشکال پر بھی حسن و قبح کا حکم

لازم ذات و در حق مظاہر عارضی خواہد بود پس
اگر مصادر آں قبیح بالذات و مذموم حضرت رفیع
الدرجات است مثل جحود و عناد و تکبر و ہوا و
ہوس آنرا گناہ باید پنداشت و ہر چہ مصادر
آں حسن بالذات و محمود خالق کائنات است
اگر قسمے است کہ آنرا علاقہ طبعی با مصادر
قبیحہ و ذمیمہ است بدو حال متصور است
یکے آں کہ غلط فہمی باعث تحرک اخلاق حمیدہ
گشتہ کہ ایں پیکر بداں وابستہ است، آں را
خطائے اجتہادی باید گفت دوم آنکہ غلط
فہمی را دریں سلسلہ مداخلتے نباشد ایں قسم
را از زلات باید خواند مثال اول مناقشہ
حضرت موسیٰ علیہ السلام با حضرت ہارون
علیہ السلام و حضرت خضر علیہ السلام است
و مثال ثانی معاملہ برادران حضرت یوسف
علیہ السلام با وشان و قصہ گریختن حضرت
یونس علیہ السلام نباید چہ مصدر ایں حرکات
و باعث صدور آں از اخوان یوسف علیہ
السلام محبت دنیا نبود جملہ لیوسف واخوہ
احب الی ابینا منا خود بر ایں قدر گواہ است
کہ باعث ایں حرکات عنایات حضرت
یعقوب علیہ السلام بود۔ ظاہر است کہ یعقوب
علیہ السلام از ملوک روزگار و امرا وقت و
سردار نبود کہ عنایات اوشان بحال یوسف
علیہ السلام موجب حصول مناصب دنیوی

لگایا جاسکیگا یہ حسن و قبح ان مصادر کے حق میں تو ذاتی اور اصلی ہوگا
اور مظاہر کے لیے عارضی لہذا اگر مصادر افعال بالذات قبیح ہوں
اور حق تعالیٰ کے نزدیک قابل مذمت و نفرت ہوں جیسے توحید
کا انکار، عناد و تکبر، ہوا و ہوس، یہ افعال ہر حالت میں معاصی
شمار ہونگے۔ کیونکہ یہ افعال ایسے ہیں جن کا قبح بالذات اور اصلی
ہے عارضی نہیں اور جن افعال کے مصادر حسن بالذات ہوں اور
خالق کائنات کے نزدیک عمدہ ہوں تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا
کہ ان کو مصادر قبیحہ کے ساتھ کوئی طبعی علاقہ تو نہیں ہے اگر ہے
تو اس کی پھر دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے
اخلاق حمیدہ ان مظاہر کے ارتکاب کا محرک بن سکتے ہیں دوم
یہ کہ کسی غلط فہمی کا محل ہی نہ ہو، پہلی صورت کو خطاء اجتہادی
کہا جاتا ہے اور دوسری کا نام زلت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام
کا معاملہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ پہلی قسم میں
داخل ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو سلوک ان کے ساتھ
کیا تھا وہ صرف اس غلط فہمی پر تھا کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں
ان سے کچھ نہ کچھ تساہل ہوا ہے۔ اس کے برخلاف برادران یوسف
اور حضرت یونس علیہ السلام کا معاملہ دوسری قسم یعنی زلت میں
داخل ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام سے
جو فعل سرزد ہوا اس کی بنیاد دنیا کی محبت نہ تھی بلکہ حضرت یعقوب
علیہ السلام کا ان کی جانب غیر معمولی میلان تھا جیسا کہ واخوہ
احب الی ابینا منا اس پر شاہد ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب
علیہ السلام کوئی ظاہری بادشاہ تو نہ تھے کہ اُن کے میلان میں
کسی ظاہری نفع کا خیال پیدا ہو سکتا ہو بلکہ ایک نبی تھے جن کی
محبت پر صرف آخرت ہی کا نفع باعث حسد بن سکتا تھا اور یہ
بھی ظاہر ہے کہ حسد لوازم محبت میں سے ہے خواہ وہ دنیوی محبت ہو

می شد وازیں باعث عرق حسد برادران بجوش می
آمدنے بلکہ توجہ حضرت یعقوب علیہ السلام مورثِ
برکات دینی بود و موجب حصول مقاصد یقینی نیں
باعث برادران اوشاں را حسد از دل سرزد و می
دانی کہ حسد از لوازم محبت و آثار آنست ہر قسم محبت
کہ باشد پس اگر محبت دنیوی است حسد نیز لازم
و در حکم و اعتبار تابع آن خواہد بود اگر محبت خداوندی
ست ہمچنان حسد آں بہماں حساب شمردہ خواہد
شد باالجملہ ایں رشک اوشاں از آثار محبت خداوندی
می نماید آرے پیکرِ نا زیبا در بر گرفتہ بود ظاہر بیناں
ایں را جریمہ خوانند و مرتکبان را گناہگار دانند
و بندۂ گمنام ایں را از قسم زلات می شمارد وہمیں
است کہ مغفور شدند ورنہ فساد ذات البین را
حالقہ فرمودہ اند وازیں جا معنی لاحسد الا فی
اثنتین پیدا شدہ باشد وہم ہویدا شدہ باشد کہ
دریں حدیث حسد بمعنی خود است حاجت آں
نیست کہ بمعنی غبط گیرند مگر غرضم نہ آنست کہ
کاربند ایں قسم حسد ہم باید شد و بزد و کوب و ایذار
رسانی باید پرداخت نے بلکہ مرادم آنست کہ
ایں قسم حسد کہ از آثار محبت خداوندی است در
عروضش بر طبع کسے را اختیار نیست بذات خود جرم
نیست ازیں جا دریافت کردہ باشی کہ جرم چیزے
دیگر ست و زلہ و خطار اجتہاد چیزے دیگر بلحاظ

یا اُخروی لہذا جیسی محبت ہوگی اس کے حسد کا حکم بھی اسی کے
تابع رہیگا چونکہ برادران یوسف علیہ السلام کے حسد کا باعث
خداوندی محبت تھی اس لیے ان کے حسد کا باعث بھی محبت
خداوندی کے آثار میں شمار ہوگا ہاں یہ ضرور ہے کہ جو اس کا
قالب اختیار کیا گیا وہ یقینًا نا زیبا تھا۔ یہاں ایک ظاہر
ہیں جو صرف افعال کی ظاہری صورت پر نظر رکھتا ہے اس
کو معصیت اور گناہ ہی شمار کریگا لیکن ہمارے نزدیک وہ
زلت میں داخل ہے یہی وجہ تھی کہ یہ ذات البین جس
کے حق میں حالقہ کا لفظ وارد ہے حضرت یعقوب علیہ
السلام کی سفارش پر بارگاہ رب العزت میں معاف
ہوگئی۔ اس تقریر سے حدیث لاحسد فی الاثنتین
کے معنی میں کسی تاویل کی ضرورت نہ رہی (کیونکہ نیات
کے تفاوت سے بعض مواقع میں حسد کی گنجائش نکل
آئی) اس بیان سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اس قسم کا
حسد کرنا اپنے اختیار سے بھی درست ہے اور کسی مسلم کی
ایذا رسانی خواہ کتنی ہی اچھی نیت سے ہو حلال ہوسکتی ہے۔
بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس حسد کا باعث خداوندی محبت ہو وہ
غیر اختیاری ہوتی ہے، اس لیے قابل درگزر ہوسکتی ہے
برخلاف اس حسد کے جس کی بنیاد حُبِ دنیا ہو اس تقریر
سے جرم، زلت اور خطائے اجتہادی میں فرق واضح ہوگیا
یہاں سب کی صورت گو ایک ہی نظر آتی ہے مگر معنی اور
احکام کے لحاظ سے اُن میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جرم قصدًا
معصیت کرنے کا نام ہے اور خطار اجتہادی اُس غلطی کو
کہتے ہیں جہاں غلط فہمی کا کوئی منشا پیدا ہوسکتا ہو اس
کے برخلاف زلت ہو جہاں غلط فہمی کا کوئی منشا تو نہیں ہوتا مگر اس میں احتیاط کے باوجود غیر اختیاری طور پر

پیکر یکے را از قسم دیگر شمردن نشاید وہم دریافتہ باشی کہ کذب وغیرہ کہ منشا رآں ہمیں حسد متفرع بر محبت خداوندی شدہ باشد در حکم واعتبار رو شمار ہماں حسد خواہد بود اندریں صورت کذبات اخوان یوسف علیہ السلام را جرم نباید گفت زلت باید خواند باقی وجہ تسمیہ ہم ازیں بیان خواہد یافت لیکن ایں قدر باید نوشت کہ در صورتے کہ مصدرِ گناہ صغیرہ باشد یا کبیرہ ہماں مادۂ شیطانی شد چہ پیش آمد کہ اکابر دین امتناع کبائر پس وپیش نبوت برابر شمرند وصغائر را مخصوص بزمانۂ پس نبوت دانستند مقتضائے اتحاد منشا رآں بود کہ ہر دو یکساں می بودند در جوابش آنچہ بفہم احقر می آید اینست کہ کبائر بذات خود مقصود می باشند وصغائر ذرائع کبائر می بودند۔ قبح کبائر بہ نسبت صغائر ذاتی میباشد وقبح آں عرضی چہ کبائر را بجز یک مصدر معین مصدرے دیگر نمی باشد وذرائع را مصادر کثیرہ می بود وآنہم بسا اوقات متبدل میشود ہمیں ست کہ زنا، با ہر کہ باشد ممنوع وبوس وکنار با اولاد خود محمود ودانی کہ اندریں صورت کبائر موصوف بالذات وصغائر بالعرض وقابل عروض خواہند بود قبل عروض اطلاع قابلیت بغایت عسیر مثل اطلاع موصوف بالذات سہل وآشکار نیست مع ہذا تحدید حدود کار خداوند معبود نبی راہم اگر ایں علم میسر می آید بذریعہ وحی میسر آید

انسان مبتلا ہو جاتا ہے (جیسا کہ خود زلت کا لفظ جس کے معنی لغزش اور پھسلنے کے ہیں اس پر دلالت کرتا ہے)

اب رہا یہ سوال کہ جب مصدر گناہ خواہ وہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ایک ہی ٹھہرا یعنی مادۂ شیطانی تو پھر علماء نے ان دونوں کے صدور میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں تفریق کیوں کی ہے اگر ان میں مادۂ شیطانی نہیں ہے تو پھر اُن سے ہر دو نوع کا صدور ممنوع ہونا چاہیے، اور قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی کوئی تفصیل بھی نہ ہونی چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبائر وہ گناہ ہیں جو بذات خود مقصود ہوتے ہیں اور صغائر وہ ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ کسی کبیرہ کے لیے ذریعہ اور تمہید ہوتے ہیں اس لیے کبائر کا قبح صغائر کی نسبت سے ذاتی اور صغائر کا عرضی ہوتا ہے، کیونکہ کبائر میں نیت فاسدہ کے سوائے کوئی اور دوسری نیت ہی نہیں ہوتی اور اُن کے ذرائع یعنی صغائر میں مختلف نیات بھی ہو سکتی ہیں اور ان نیتوں کے اختلاف سے اُن افعال کا حکم بھی مختلف ہو سکتا ہے دیکھو زنا جو کبائر میں ہے مطلقاً حرام ہے خواہ وہ کسی کے ساتھ ہو اور بوس وکنار جو صغائر میں شمار ہے اگر اجنبی عورت کے ساتھ ہو تو حرام ہے مگر اپنی بیوی کے ساتھ حرام نہیں بلکہ مطلوب ومحمود ہے پس جب صغائر میں قبح عارضی ہوا یعنی کہیں ہوا اور کہیں نہ ہوا تو ان کا قبح بھی کبائر کی طرح کھلا ہوا واضح اور ظاہر نہیں ہوگا اس لیے یہاں وحی کی اطلاع کے بغیر یہ حکم لگانا مشکل ہوگا کہ قبح کہاں عرضی ہے اور کہاں اصلی ان حدود کی تحدید صرف ایک احکم الحاکمین کا حق ہے نبی کو بھی اگر اس حقیقت کی اطلاع ہوتی ہے تو بذریعہ وحی ہوتی ہے۔

وغالباً ووجدك ضالاً فهدیٰ ہمیں معنی داشته باشد مگر علم حدود کبائر بایں وجه که بوجه مقصود بودن آں و اشتهار مذمت آں قرناً بعد قرنٍ باتفاق انبیاء دراں روشن تر است چنداں محتاج وحی نیست بایں وجه لازم آمد که هم پیش از نبوة و هم بعد از نبوة ممتنع باشد باقی ماند صغائر چوں آنها دراں مرتبه اشتهار نمی باشند و نه چناں مقصود و بر روے کار گونه اختفا درآں راه یافت که بے نزول وحی علم بسیارے ازاں در حکم ممتنع باشد آخر کیست که نمی داند که ممانعت ذرائع زنا، که از حدیث و کلام الله می برآید هرگز بخیال احدے نمی آید هاں بعضے ازاں مثل کذب که علم بطلان آں طبعی ست درباره امتناع او نتها را انبیاء ازاں محتاج وحی نیست مگر اینهمه تا هماں دم است که جرمیه باشد و اگر از قسم زلت بود امتناعش در حق اوشاں ممتنع نمی نماید هاں ایں قدر صحیح که قوت علمیه و قوت عملیه از کمالات ذاتیه بلکه اصل آنست۔

و کذب بظاهر دلالت بر فساد اول دارد که اشرف ست بعد اطلاع تعمد کذب در اخبار دنیوی رافع اعتماد مطلق ست پس خدا را چه امید که وحی بجنسه خواهد رسانید و بنی نوع را چه یقیں که هر چه از خدا آورده بے کم و کاست آورده باین وجه کسیکه کذب مقتضاء طبعش بود نبوت را نشاید لیکن از پاک نهاداں بوقت غلبۂ مصدر چنانچه صدور کبائر ممکن است و جمله لولا ان رأى برهان ربه شاهد برآں کذب را نیز بطور زلت بدرجه اولی ممکن باشد البته کبیره بوجه تعین مصدر بطور زلت صادر نتواں شد زیں وجه عصمت لازم افتاد

غالباً ووجدك ضالاً فهدیٰ کے ایک معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں اس کے برخلاف کبائر کا معاملہ ہے وہ شرائع سابقہ سے لے کر آج تک اتنا روشن ہوتا چلا آیا ہے کہ اُن کے قبح پر وحی الٰہی کو تنبیہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی اس لیے انبیاء علیہم السلام سے ان کا صدور نہ قبل از نبوت ہوسکتا ہے نہ بعد از نبوت صغائر کا قبح اس درجہ شہرت پذیر نہیں ہوتا اس لیے ان کا معاملہ اتنا دقیق ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کی شناخت وحی کے بغیر ناممکن ہوتی ہے کون نہیں جانتا کہ جس طرح زنا ہر شخص کے نزدیک معصیت ہے اس طرح اُس کے مقدمات کھلی ہوئی معصیت نہیں اگر قرآن و حدیث اُن کی ممانعت نہ فرماتے تو کسی کے ذہن میں بھی اُن کی اتنی مذمت نہ آسکتی ہاں بعض معاصی ایسی ہیں کہ اُن کے مذموم ہونے کی شہرت بھی کبائر کی طرح ہے جیسے کذب یہاں بھی اس کے قبح کے لیے وحی کی تنبیہ کی احتیاج نہیں ہے مگر یہ بھی اُسی وقت ہوگا کہ اس کا صدور قصداً ہو نہ کہ زلت کے طور پر غیر اختیاری۔ انسان کے کمالات کی دو قسمیں ہیں کمالات علمیہ اور کمالات عملیہ کذب انسان کے کمالات علمیہ کے فساد پر ضرور دلالت کرتا ہے اس لیے اگر کوئی شخص قصداً جھوٹ بولے تو نہ وہ خدا تعالیٰ کی نظر میں قابل اعتماد ہوسکتا ہے نہ انسانوں کی نظروں میں کیا معلوم جب اس کی عادت کذب کی ٹھہری تو وہ وحی الٰہی کو بجنسہ پہنچائیگا یا نہیں۔ ہر بنی نوع انسان کو کیا اطمینان کہ جو وحی اس تک آئی تھی وہی اس نے بعینہ پہنچائی ہے۔ اس لیے جس کی فطرت میں دروغ گوئی کی صفت ثابت ہوجائے وہ منصب نبوت کے قابل نہیں ہوسکتا ہاں اگر کذب کا صدور غیر اختیاری طور پر ہوجائے تو اس کا امکان ہوسکتا ہے مگر کبائر میں چونکہ مصادر متعین ہوتے ہیں یعنی ان میں فاسد نیت کے سوا کوئی دوسری نیت ممکن ہی نہیں اس لیے بطور زلت بھی انکا صدور ناممکن ہے۔

١٠٩٩۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اسْتُخْلِفَ خَلِیْفَۃٌ اِلَّا لَہٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَۃٌ تَاْمُرُہٗ بِالْخَیْرِ وَتَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَبِطَانَۃٌ تَاْمُرُہٗ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَالْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَ اللّٰہُ۔ رواہ البخاری فی کتاب القدر۔

الرَّسُوْلُ الْعَظِیْمُ فِیْ عِصْمَتِہٖ فِیْ عَہْدِ طُفُوْلِیَّتِہٖ

١١٠٠۔ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتَاہُ جِبْرَئِیْلُ وَھُوَ یَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ فَاَخَذَہٗ فَصَرَعَہٗ فَشَقَّ عَنْ قَلْبِہٖ فَاسْتَخْرَجَ مِنْہُ عَلَقَۃً فَقَالَ ھٰذَا حَظُّ

١٠٩٩۔ ابوسعید خدری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ جو خلیفہ بھی ہوتا ہے اس کے لیے دو قسم کے مشیر ضرور ہوتے ہیں ایک مشیر وہ جو اس کو نیکی کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور اسی کی رغبت دلایا کرتا ہے، دوسرا وہ جو برائی کا مشورہ دیتا ہے اور بری باتوں پر اُبھارتا رہتا ہے پھر برائی سے محفوظ تو صرف وہی رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ (بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہدِ طفولیت

١١٠٠۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اس وقت آپ بچوں کے ساتھ کھیل تماشہ دیکھنے میں مشغول تھے۔ اُنہوں نے آپ کو پکڑ کر لٹا دیا اور قلب مبارک چیر کر اس میں سے خونِ بستہ کا ایک ٹکڑا نکال دیا اور کہا کہ آپ میں یہ تھا شیطان کا حصہ جس کو میں نے نکال کر

١٠٩٩۔ حدیث مذکور پر امام بخاریؒ نے "بطانۃ الامام واہل مشورتہ" کا عنوان قائم کرکے غالباً اس طرف اشارہ فرمادیا ہے کہ یہاں مشیر سے وہ مشیر مراد ہیں جو ہر خلیفہ و حاکم کے ساتھ عام طور پر ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت حدیث مذکور کا تعلق فرشتہ اور شیطان کی خیر و شر کی ان دو طاقتوں سے مخصوص نہ ہوگا جو عام انسانوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جب انسانی فطرت ظاہری مشیروں سے متاثر ہوسکتی ہے تو خیر و شر کی ان دو مرکزی طاقتوں سے بھلا کیونکر متاثر نہ ہوگی اس بنا پر اگر حدیث کو عام رکھا جائے تو اس میں بھی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا۔ حدیث کا آخری جملہ یہ پتہ دیتا ہے کہ مقام عصمت یعنی وہ مقام کہ انسان شیطان یا غلط مشیر کا کوئی اثر قبول نہ کرسکے یہ اپنے بس کی بات نہیں جس کو خدا تعالیٰ محفوظ رکھے بس وہی محفوظ رہ سکتا ہے یہ شان صرف انبیاء علیہم السلام کی ہے چونکہ ان کو خود اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے انتخاب فرماتا ہے اس لیے وہی ہر قسم کی غلطی سے ان کو بچایا بھی ہے، ان کے علاوہ جتنے انسان ہیں ان کا معاملہ خطرہ میں ہے۔

١١٠٠۔ نور محمدی قرناً قرن سے قوالب انسانیہ سے گزرتا ہوا آرہا تھا اور اب وہ وقت آچکا تھا جبکہ بطن آمنہ سے براہ راست پیکر انسانی میں وہ جلوہ گر ہو جائے۔ اس لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ قالب انسانی کے خواص سے یکسر خالی ہوتا۔ مگر قدرت چاہتی ہے کہ آپ کا قالب بھی تمام دوسرے بشر سے علیحدہ اور ممتاز رہے۔ اس لیے اس کام کے لیے وہ اپنا سب سے مقدس فرشتہ بھیجتی ہے وہ آکر سب سے مقدس پانی سے اس کو صاف کرتا ہے پھر ایمان کے آب زلال میں اس کو غوطہ دیتا ہے

الشَّيْطَانِ مِنْكَ ثُمَّ غَسَلَهُ فِي طَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ لَأَمَهُ وَأَعَادَهُ فِي مَكَانِهِ وَجَاءَ الْغِلْمَانُ يَسْعَوْنَ إِلَى أُمِّهِ يَعْنِي ظِئْرَهُ فَقَالُوا إِنَّ مُحَمَّدًا قُتِلَ فَاسْتَقْبَلُوهُ وَهُوَ مُنْتَقِعُ اللَّوْنِ

پھینک دیا ہے۔ پھر آپ کے قلب مبارک کو زمزم کے پانی سے ایک سونے کے طشت میں ڈال کر دھویا پھر اس کو سی دیا اور اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ بچے آپ کی دودھ پلائی کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور اطلاع دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو قتل کر دیے گئے۔ لوگ آپ کو دیکھنے کے لیے نکلے تو آپ کا رنگ فق پڑا تھا۔

یہ تو ہو سکتا تھا کہ آپ کے جسد اطہر میں پیدائشی طور پر ہی یہ حصہ نہ رکھا جاتا مگر عالم اسباب کے تحت جب یہ قالب مبارک اسی صورت سے منتقل ہوتا چلا آرہا تھا جیسا کہ عام انسانی قالبوں کا انتقال ہوتا ہے تو ان خواص سے علیحدہ رہنا کیسے ممکن تھا، ادھر یہ بھی منظور تھا کہ اپنی خصوصی نہج تربیت کا اظہار کیا جائے۔ تربیت کا ترجمہ پرورش ہے یہ تدریج کی متقاضی ہے اس لیے رب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چاہتا تھا کہ اپنی خصوصی پرورش کا اظہار فرمائے اور قدم قدم پر یہ روشن فرمائے کہ یہ ذات قدسی صفات کسی دوسرے کی نگرانی میں پرورش پا رہی ہے۔ دیکھو والد کا سایہ، والدہ مبارکہ کا سایہ اور آخر میں عم بزرگوار کا سایہ یہ سب سایے اٹھتے گئے رفتہ رفتہ اور آخر میں صرف ایک اسی ذات پاک کا سایہ رہ گیا جس نے شروع سے آپ کو براہ راست اپنی تربیت میں لے رکھا تھا۔ حافظ سہیلیؒ نے یہاں ایک عجیب نکتہ تحریر فرمایا ہے۔ اس کے لیے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قالب انسانی کی تخلیق کی اصل نطفہ ہے جس کا ظہور شہوت سے ہوتا ہے۔ یہی نطفہ تدریجی طور پر بستہ خون، پھر لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی بستہ خون مغز شیطان کہلاتا ہے۔ چونکہ شہوات کے تمام مقامات پر شیاطین دلچسپی کے ساتھ نظر رکھتے ہیں اس لیے قالب انسانی کے اس جز پر بھی خاص طور پر ان کی نظر رہتی ہے اور اسی کو وہ ہر جدید مولود میں تلاش کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش چونکہ اس معہود طریقہ کے برخلاف صرف نفخۂ جبرئیل سے ظہور پذیر ہوئی تھی اس لیے اس میں یہ حصہ ابتداء سے شامل نہ تھا۔ اسی وجہ سے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ولادت کے بعد ہر بچہ کو شیطان آکر انگلی سے چھیڑتا ہے سوائے ایک عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے (دیکھو ترجمان السنہ ص ۳۰۲ ج ۲)۔ ان کی پیدائش چونکہ نطفہ کی بجائے نفخہ سے ہوئی تھی اس لیے اس میں مغز شیطان ہی نہ تھا۔ اس لیے یہاں آکر وہ غمز کرتا تو کس چیز کو کرتا۔

اس کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت چونکہ نوع انسانی کے دستور کے مطابق ہوئی تھی اس لیے اس میں اس مغز کا ہونا لازمی تھا، مگر یہ ظاہر ہے کہ اس مغز کا جو تعلق بھی تھا وہ تمام تر والد کی طرف سے تھا مولود مبارک کی حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر جیسا کچھ بھی تھا مگر عہد طفولیت ہی میں اس مغز کو نکال کر پھینک دیا گیا تھا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایمان و حکمت سے بھرا ہوا ایک طشت لاکر آپ کے قلب مبارک میں ڈال دیا گیا تھا، وہ بھی آب زمزم سے دھو کر پھر روح القدس جیسے مقدس فرشتے کے ہاتھوں سے (الروض الانف ص ۱۱۰ ج ۱)

ہمارے نزدیک قدرت کی یہ حکمت بہت زیادہ قابل غور ہے کہ ان دونوں مسعود ولادتوں میں جس فرشتہ کا تعلق ثابت ہوتا ہے وہ ایک ہی فرشتہ یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں فرق ہے تو یہ کہ اسرائیلی سلسلہ کے آخری رسول کی تخلیق ہی نفخی تھی۔ اور سب سے آخری رسول کی تخلیق گو بشری تھی مگر تطہیر نفخی تھی، دونوں مقامات میں صنع اللہ الذی اتقن کل شیء کا نقشہ ایک سے ایک بڑھ کر تھا لیکن یہ بحث کہ عالم بشری کی تکمیل کی صورت ان دونوں میں کونسی کامل تر تھی اس کا کچھ فیصلہ ہر دو رسولوں کی بعثت کے آثار کی طرف نظر کرنے سے ہو سکتا ہے۔ نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع اول میں گو ملکیت کے عجیب در عجیب نظارے دنیا نے دیکھے مگر رسولوں کے لیے بشریت کا مظاہرہ بھی کتنا ضروری ہوتا ہے یہ اس سے ظاہر ہے کہ نزول کے بعد ان کی بشریت کے نظارے بھی جب تک دنیا اسی شد و مد کے ساتھ دیکھ نہ لے اس وقت تک ان کی وفات نہ ہوگی۔ آخر وہ بھی اسی جگہ آکر مدفون ہو جائیں گے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پہلے مدفون ہو چکے ہیں اس

قَالَ اَنَسٌ فَكُنْتُ اَرٰى اَثَرَ الْمَخِيطِ فِي صَدْرِهٖ۔ رواہ مسلم

اَلرَّسُوْلُ الْعَظِيْمُ وَعِصْمَتُهٗ فِي اَبَانِ شَبَابِهٖ

۱۱۰۱۔ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا هَمَمْتُ بِقَبِيْحٍ مِمَّا كَانَ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يَهُمُّوْنَ بِهٖ اِلَّا مَرَّتَيْنِ مِنَ الدَّهْرِ كِلْتَاهُمَا يَعْصِمُنِي اللّٰهُ مِنْهُمَا قُلْتُ لِفَتًى كَانَ مَعِيْ مِنْ قُرَيْشٍ بِاَعْلٰى مَكَّةَ فِيْ اَغْنَامٍ لَهٗ اَتَرْعٰى اَبْصِرْ لِيْ غَنَمِيْ حَتّٰى اَسْمُرَ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ بِمَكَّةَ كَمَا يَسْمُرُ الْفِتْيَانُ قَالَ نَعَمْ فَلَمَّا خَرَجْتُ فَجِئْتُ اَدْنٰى دَارٍ مِنْ دُوْرِ مَكَّةَ

انسؓ کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ اس سلائی کا نشان آپ کے سینہ مبارک میں دیکھا کرتا تھا۔ (مسلم شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معصوم عہدِ شباب

۱۱۰۱۔ حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سُنا ہے کہ جن ناشائستہ حرکات کا جاہلیت کے لوگ عام طور پر ارادہ کیا کرتے تھے بجز دو مرتبہ کے میرے دل میں کبھی ان کا خطرہ بھی نہیں گزرا، اور ان دونوں مرتبہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ان میں شرکت کرنے سے بچالیا۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ ایک قریشی نوجوان جو مکہ مکرمہ کی بالائی جانب میں اپنی بکریاں چرایا کرتا تھا وہ میرے ساتھ تھا میں نے اس سے کہا تم ذرا میری بکریوں کی بھی دیکھ بھال رکھنا میں بھی اور نوجوانوں کی طرح آج مکہ مکرمہ جاکر افسانہ گوئی کے شغل کا ارادہ کر رہا ہوں اس نے کہا اچھی بات ہے جب میں چلا اور مکہ مکرمہ کی آبادی کے قریب ایک

سے زیادہ اس نازک مرحلہ میں پڑنا موزوں نہیں۔ حق تعالیٰ چاہتا ہے کہ ابوالبشر کی خلافت کا مقصد ایک بشری کے عہد مسعود میں آکر پورا ہو۔ مگر جو قدرت کے اس راز کو نہیں سمجھتے وہ چاہتے ہیں کہ یہ اہم مقصد جس رسول کے دور میں پورا ہو وہ ملکی خلقت کا رسول ہو۔ یاد رکھیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت یہ نہیں کہ آپ کی بشریت ہی سے انکار کر دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ آپ کی بشریت کی وجہ سے جنس بشری کی افضلیت کا یقین پیدا کر لیا جائے۔

برزمیں کہ نشانِ کفِ پائے تو بود　　سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

اس تفصیل سے آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ دنیا میں بچے سب ہی معصوم ہوتے ہیں مگر ان کی عصمت کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ گناہ نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھی وہ جھوٹ بھی بولتے ہیں اور کوئی کوئی ان میں بدا طوار بھی ہوتا ہے پھر ان کی عصمت کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ قانون تیسیر کے ماتحت قدرت ان کے ان افعال پر قلم عفو کھینچ دیتی ہے اور مواخذہ نہیں فرماتی مگر یہ وہ معصوم ہیں جن کی معصوم فطرت کو اور طرح طرح سے معصوم بنایا جا رہا ہے تاکہ گناہ کا صدور تو در کنار اس میں کسی ادنیٰ سی معصیت کی طرف میلان بھی نہ رہے اس لیے یہ وہ معصوم ہیں جو گناہ کرنا جانتے ہی نہیں اب اندازہ فرمائیے کہ جس تعمیر کی اساس میں اس طرح عصمت کوٹ کوٹ کر بھری جائے تو اس تعمیر کی عصمت کا عالم کیا ہوگا۔

۱۱۰۱۔ ملکی اور وطنی عادات انسان میں خلقی عادات کی طرح راسخ ہوتی ہیں۔ اگر نزول وحی سے قبل آپ کے قلب میں ان کا خطرہ

سَمِعْتُ غِنَاءً وَصَوْتَ دُفُوْفٍ وَ زَمِيْرٍ فَقُلْتُ مَا هٰذَا قَالُوْا فُلَانٌ تَزَوَّجَ فُلَانَةَ لِرَجُلٍ مِنْ قُرَيْشٍ فَلَهَوْتُ بِذٰلِكَ الْغِنَاءِ وَ بِذٰلِكَ الصَّوْتِ حَتّٰى غَلَبَتْنِيْ عَيْنِيْ فَمَا اَيْقَظَنِيْ اِلَّا مَسُّ الشَّمْسِ فَرَجَعْتُ اِلٰى صَاحِبِيْ فَقَالَ لِيْ مَا فَعَلْتَ فَاَخْبَرْتُهٗ ثُمَّ قُلْتُ لَهٗ لَيْلَةً اُخْرٰى مِثْلَ ذٰلِكَ فَفَعَلَ فَخَرَجْتُ فَسَمِعْتُ مِثْلَ ذٰلِكَ فَقِيْلَ لِيْ مِثْلَ مَا قِيْلَ لِيْ فَلَهَوْتُ بِمَا سَمِعْتُ حَتّٰى غَلَبَتْنِيْ عَيْنِيْ فَمَا اَيْقَظَنِيْ اِلَّا مَسُّ الشَّمْسِ ثُمَّ رَجَعْتُ اِلٰى صَاحِبِيْ فَقَالَ لِيْ مَا فَعَلْتَ قُلْتُ مَا فَعَلْتُ شَيْئًا فَوَاللّٰهِ مَا هَمَمْتُ بَعْدَهَا بِسُوْءٍ مِمَّا يَعْمَلُ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ حَتّٰى اَكْرَمَنِيَ اللّٰهُ بِنُبُوَّتِهٖ۔ رواہ ابن راھویہ فی مسندہ وابن اسحاق والبزار والبیھقی وابو نعیم وابن عساکر۔ قال ابن حجر اسنادہ حسن متصل ورجالہ ثقات۔ کذا فی الخصائص۔

گھر کے نزدیک پہنچا تو میں نے گانے دف اور باجہ بجانے کی آوازیں سنیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے لوگوں نے کہا فلاں قریشی شخص کا فلاں عورت سے نکاح ہو رہا ہے میں اس گانے بجانے کے قصہ میں پڑ کر قصہ گوئی کی محفل کی شرکت سے غافل ہو گیا اور اس زور کی نیند آئی کہ پھر دھوپ کی تیزی سے ہی میری آنکھ کھلی۔ میں اپنے رفیق کے پاس لوٹ آیا اُس نے پوچھا کہو یہاں سے جا کر تم نے کیا کیا۔ میں نے از اول تا آخر سارا ماجرا اس کو سنا دیا۔ ایک شب پھر میں نے اُس سے ایسا ہی کہا وہ راضی ہو گیا اور پھر میں قصہ گوئی کے لیے نکلا پھر مجھے گانے کی آواز آئی اور جیسا شادی کا قصہ مجھ سے پہلے کہا گیا تھا اس مرتبہ پھر وہی مجھ سے کہا گیا۔ اس قصہ میں لگ کر میں پھر ایسا غافل ہوا کہ مجھ کو نیند آگئی حتیٰ کہ دھوپ کی تیزی سے میری آنکھ کھلی۔ جب میں لوٹ کر اپنے رفیق کے پاس آیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہو یہاں سے جا کر تم نے کیا کیا۔ میں نے کہا میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ خدا کی قسم اس کے بعد پھر کبھی میں نے کسی ایسی حرکت کا ارادہ نہیں کیا جس کے جاہلیت کے لوگ عادی تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے شرف نبوت سے مجھ کو نواز دیا (مسند بیہقی خصائص)

خطرہ بھی دگرگزرتا تو یہ قانون فطرت کے خلاف ہوتا لیکن اگر آپ کی اس میں اس طرح قدرت کی تکوینی حفاظت ثابت نہ ہوتی تو یہ صفت عصمت کے مناسب نہ ہوتا اس لیے آپ کا ارادہ ہونا بھی ضروری تھا۔ پھر ایسے اسباب بھی سامنے آنے ضروری تھے کہ آپ اس میں شرکت نہ فرما سکیں۔ اچھا اگر فرض کر لو ایک بار ایسے موانع پیش آ بھی گئے تھے تو دوبارہ پھر ایسا ہی کیوں ہوا؟! اور اس کے بعد پھر آپ کا قلب مبارک اس خیال سے خالی کیوں ہو گیا؟ جب آپ ان سوالات پر غور کریں گے تو جواب صرف یہ ہوگا کہ صفت عصمت کا تقاضہ یہی تھا۔ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ جس بات کا یہاں ارادہ ہوا تھا اس کی حیثیت تھی کتنی؟! صرف ایک افسانہ گوئی کی شرکت۔ یہ کوئی اتنا بڑا جرم نہ تھا کہ اس زمانہ کے لحاظ سے اس کو بداخلاقی کی فہرست ہی میں شمار کیا جا سکتا۔ مگر چونکہ نبوت کے پُر از صدق و صفا فطرت کو صدق و صفا ہی کے ماحول میں رکھنا منظور تھا اس لیے فرضی افسانوں سے بھی اس کو دور رکھا گیا اور اس طرح عصمت کے اسباق قدرت خفیہ در خفیہ آپ کو واقعات کے ضمن ہی میں پڑھاتی رہی

۱۱۰۲۔ حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ دِيْنَارٍ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْقُلُ مَعَهُمُ الْحِجَارَةَ لِلْكَعْبَةِ وَعَلَيْهِ اِزَارُهٗ فَقَالَ لَهُ الْعَبَّاسُ عَمُّهٗ يَا ابْنَ اَخِيْ لَوْ حَلَلْتَ اِزَارَكَ فَجَعَلْتَهٗ عَلٰى مَنْكِبَيْكَ دُوْنَ الْحِجَارَةِ قَالَ فَحَلَّهٗ فَجَعَلَهٗ عَلٰى مَنْكِبَيْهِ فَسَقَطَ مَغْشِيًّا عَلَيْهِ فَمَا رُئِيَ بَعْدَ ذٰلِكَ عُرْيَانًا۔ رواہ البخاری فی باب کراھیۃ

۱۱۰۲۔ عمرو بن دینار روایت کرتے ہیں کہ میں نے جابرؓ کو یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے خود سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی تعمیر کے لیے دوسرے لوگوں کے ساتھ پتھر لا رہے تھے اور آپ نے اپنا تہبند باندھ رکھا تھا آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے فرمایا عزیز بھتیجے! اگر تم اپنا تہبند کھول کر اپنے کاندھوں پر پتھر کے نیچے رکھ لیتے تو آسانی ہو جاتی۔ ان کے فرمانے پر آپ نے تہبند کھول کر کاندھوں پر ڈال تو لیا مگر اسی وقت آپ بیہوش ہو کر گر گئے۔ دوسرے الفاظ میں یوں ہے کہ

۱۱۰۲۔ اس واقعہ کے وقت آپ کے سن مبارک میں مورخین کا اختلاف ہے۔ تاہم یہ متفق علیہ ہے کہ یہ واقعہ نبوت سے قبل کا ہے۔ دیکھیے کیا یہاں یہ ممکن نہ تھا کہ تہبند کھولنے سے قبل ہی آپ کو عریانی سے بچا لیا جاتا۔ مگر پھر یہ کیسے ثابت ہوتا کہ یہ وہ ہستی ہے جن کی برہنگی ایک مرتبہ بھی قابل برداشت ہو۔ اس لیے نظر تربیت چاہتی ہے کہ ایک واقعہ نادانستگی میں ایسا بھی پیش آ جائے اور اس پر گرفت بھی ہو اور اس طرح یہ ظاہر کر دیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی ہستی عام انسانوں سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔ معیاری اخلاق کے خلاف قدرت کو ان کا کوئی عمل گوارا نہیں ہوتا۔ آخر قدم قدم پر قدرت کی یہ روک ٹوک قوم کی نظروں میں ان کو ممتاز کرتی چلی جاتی ہے تا آنکہ نبوت سے قبل ہی قبل یہ بات ذہنوں میں بیٹھ جاتی ہے کہ یہ ہمارے طبقہ سے کوئی الگ اور بلند انسان ہیں۔ اتنی بات کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ان سے کوئی ایسا فعل ہی سرزد ہو جو معصیت کی تعریف میں آتا ہو خواہ وہ صغیرہ ہی سہی بلکہ ہر وہ کام جو کسی اعلیٰ معیار سے ذرا سا بھی گرا ہوا ہو اس کا صدور وہ بھی ایک دو مرتبہ بس اتنا ہی کافی ہے کہتے ہیں کہ شریعت موسویہ میں ستر کا مسئلہ اتنا مکمل نہ تھا جتنا کہ ہماری شریعت میں ہے اس لحاظ سے اس وقت تک عریانی میں چنداں مضائقہ بھی نہ تھا ادھر اس وقت آپ کا سن مبارک بھی زیر اختلاف ہے۔ نیز اس وقت عرب میں کوئی شریعت ہی نہیں تھی وہ لوگ اپنے نفس کو گو حنیف کہتے تھے مگر ملت حنیفہ کا حکم بھی کچھ معلوم نہ تھے۔ پھر اس ایک واقعہ پر اتنی بڑی تنبیہ اس کا لازمی ثمرہ یہ ہوتا تھا کہ لوگوں کی نظریں آپ کی طرف اٹھنے لگیں اور ان میں یہ شعور پیدا ہونے لگے کہ ضرور جس کا اول یہ ہے ان کا آخر کچھ ہو کر رہیگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک تو بہت بلند ہے۔ آپ کے رفیق غار صدیق اکبرؓ کے متعلق جب کسی نے شیخ ابوالحسن اشعریؒ سے پوچھا کہ زمانۂ جاہلیت میں ان کا حال کیا تھا تو شیخ موصوف نے کیا عجیب جملہ فرمایا ہے "انہ ما زال بعین الرضا من اللّٰہ عز وجل" یعنی وہ تو ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی چشم رضا کے تحت رہے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو اس طرح کا پروردہ ہو وہ کسی شرک و کفر میں کب مبتلا ہو سکتا ہے۔ جب آپ کے ایک امتی کا حال یہ ہو تو خود بارگاہ رسالت کا حال کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ اسی ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ دیکھو الیواقیت والجواہر۔ ص ۳، ج ۲۔ المبحث الثالث والاربعون فی بیان ان افضل الاولیاء المحمدیین الخ۔ آپ کی حیات طیبہ میں یہ کل ایک واقعہ ہے وہ بھی نبوت سے قبل کا اس میں بھی تصریح ہے کہ یہ عم بزرگوار کی تعمیل ارشاد پر ہوا اپنی فطرت سے نہیں۔ اور اسی پر اس شدت کے ساتھ غیبی گرفت موجود ہے سوچیے جس دور میں ابھی نزول ملک بھی شروع نہ ہوا ہو جس میں شریعت کا کوئی تصور نہ ہو، پہلی شریعت موجود نہ ہو ایسے دور میں کشف ستر کی حیثیت کیا رہنی چاہیے اور کیا اس ایک واقعہ

التعری وفی باب بنیان الکعبۃ وطمحت عیناہ الی السماء وفی حدیث ابی الطفیل فنودی یا محمد عظ عورتک فذلک اول ما نودی فما رأیت لہ عورۃ قبل ولا بعد

۱۱۰۳۔ عَنْ زَیْدِ بْنِ حَارِثَۃَ قَالَ کَانَ صَنَمٌ مِنْ نُحَاسٍ یُقَالُ لَہٗ إِسَافٌ وَنَائِلَۃُ یَتَمَسَّحُ بِہِ الْمُشْرِکُوْنَ إِذَا طَافُوْا فَطَافَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَطُفْتُ مَعَہٗ فَلَمَّا مَرَرْتُ بِہٖ مَسَحْتُ بِہٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَمَسَّہُ قَالَ زَیْدٌ فَطُفْنَا فَقُلْتُ فِیْ نَفْسِیْ لَأَمَسَّنَّہٗ

کہ آپ کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں اور غیب سے ایک آواز آئی اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ستر ڈھکو۔ وہ دن ہے کہ پھر کبھی آپ کو برہنہ نہیں دیکھا گیا۔ اور یہ پہلی آواز تھی جو غیبی طور پر آپ کو دی گئی۔ (بخاری شریف)

۱۱۰۳۔ زید بن حارثہ بیان کرتے ہیں کہ (مکہ مکرمہ میں) تانبے کا ایک بت تھا جس کو لوگ (اساف و نائلہ) کہتے تھے مشرک جب طواف کرتے تو تبرکًا اس کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا میں نے بھی آپ کے ساتھ طواف کیا۔ جب میں اس بت کے پاس سے گزرا تو حسب دستور میں نے بھی اس کو ہاتھ لگایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو ہاتھ نہ لگانا۔ زید کہتے ہیں میں نے اپنے

کی وجہ سے جو اس طرح زیر تنبیہ آ چکا ہو انبیاء علیہم السلام کی نبوت سے قبل کی زندگی میں صغائر کے لیے اصولی طور پر کوئی گنجائش تسلیم کرلینی چاہیے یا اس کے برعکس ان کی عصمت کا سبق لینا چاہیے۔ ابن ہشام بحیرا راہب کا قصہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

فشبّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ تعالٰی یکلؤہ ویحفظہ ویحوطہ من اقذار الجاہلیۃ لما یرید بہ من کرامتہ ورسالتہ حتی بلغ ان کان رجلا افضل قومہ مروۃ واحسنہم خلقا واحسنہم جوارا واعظمہم حلما واصدقہم حدیثا واعظمہم امانۃ وابعدہم من الفحش والاخلاق التی تدنس الرجال تنزہا وتکرما حتی ما اسمہ فی قومہ الا الامین لما جمع اللہ فیہ من الامور الصالحۃ۔

آپ جوان ہوئے تو اس طرح کہ اللہ تعالیٰ آپ کی نگرانی فرماتا آپ کی حفاظت رکھتا اور جاہلیت کی تمام ناشایاں حرکتوں سے آپ کو دور دور رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ اپنے عین دور شباب میں بلحاظ مروت سب سے افضل، اخلاق میں سب سے بہتر، پڑوس کی رعایت سب سے زیادہ رکھنے والے حلم و بردباری میں سب سے بڑھ کر گفتگو میں سب سے زیادہ راستباز، امانتداری میں سب سے زیادہ امانتدار، تمام فحش باتوں اور ان تمام بداخلاقیوں سے جو انسان کے لیے بدنما داغ ہوں کوسوں دور تھے اور ان ہی اوصاف حسنہ کی وجہ سے آپ کی قوم میں آپ کا لقب امین تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ کو رسالت کے منصب جلیل سے نوازنا منظور تھا۔

۱۱۰۳۔ شرک وکفر سے انبیاء علیہم السلام کا مجتنب رہنا تو کسی کے نزدیک بھی زیر بحث نہیں ہے۔ اس لیے یہاں غور صرف اس پر کرنا چاہیے کہ جب شرک وکفر سے صرف قدرت ہی ان کی نگراں ہوتی ہے تو پھر اس کی نگرانی صرف اسی حد پر کیوں ختم سمجھی جائے اور کیوں یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ اس کی نگرانی کا دائرہ فسوق وعصیان تک بھی وسیع ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی نظر میں یہ تینوں قسمیں مکروہ تر ہیں گو ان کے مراتب میں فرق ہو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مکروہ سے تو ان کی حفاظت کی جائے اور دوسرے مکروہ سے ان کی حفاظت نہ کی جائے۔ قرآن کریم کا ارشاد تو یہاں عام مومنوں کے حق میں یہ ہے۔

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ إِلَیْکُمُ الْإِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ — یہ خدا تعالیٰ کا انعام ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں ایمان کی

حتی انظر ما یکون فمسحتہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الم تنہ قال البیہقی زاد غیرہ عن محمد بن عمرو باسنادہ قال زید فو الذی اکرمہ وانزل علیہ الکتاب ما استلم صنما قط حتی اکرمہ اللہ تعالیٰ بالذی اکرمہ وانزل علیہ۔

دل میں کہا میں ضرور ہاتھ لگا کر رہوں گا، دیکھوں تو کیا ہوتا ہے چنانچہ میں نے اس کو ہاتھ لگا دیا۔ آپ نے فرمایا باز نہیں آؤ گے بیہقی کہتے ہیں بعض راویوں نے اس روایت میں اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ زید کہتے ہیں اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبوت سے سرفراز کیا اور آپ پر قرآن نازل فرمایا، آپ نے کبھی کسی بت کو نبوت سے قبل بھی ہاتھ نہیں لگایا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے نوازا اور آپ پر قرآن کریم نازل فرمایا (بیہقی)، کذا فی البدایۃ والنہایۃ۔

فِی قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ محبت ڈال دی ہے اور اس کو خوشنما بنا دیا ہے اور یہ بھی اس کا انعام ہے)
الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ کہ اس نے کفر، گناہ اور نافرمانی کی نفرت پیدا کردی ہے۔

پھر جن کے طفیل میں خدا تعالیٰ کا یہ انعام تقسیم ہوتا ہو خود اُن کے حق میں بھی کسی ادنیٰ سی معصیت کا تصور کیسے معقول ہو سکتا ہے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایمان و کفر دو ضدیں ہیں اس لیے ایک کی محبت کے لیے دوسری جانب کی کراہت لازم ہے چونکہ آیت بالا میں ایمان کا مقابل صرف کفر کو نہیں رکھا گیا بلکہ عصیان بھی اس میں داخل ہے اس لیے محبت ایمانی اسی وقت کامل شمار ہوگی جبکہ کفر و عصیان سے نفرت بھی کامل ہو۔ اس لیے اگر انبیاء علیہم السلام میں محبت ایمانی کامل تسلیم کی جائے تو ان ہر سہ انواع سے کراہت تسلیم کر لینی بھی لازم ہوگی اور اگر ان ہر سہ انواع میں کسی سے کراہت میں کوئی نقصان تسلیم کیا گیا تو دوسری طرف محبت ایمانی میں بھی اتنا ہی نقصان تسلیم کرنا لازم ہوگا والعیاذ باللہ۔

انبیاء علیہم السلام میں یہ ایمانی محبت ذاتی اور فطری ہوتی ہے اور کفر و معصیت سے نفرت بھی فطری اور ذاتی ہوتی ہے۔ اس ذاتی محبت و نفرت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی خلقت میں ایسی کوئی شے نہیں ہوتی جو ان کو کسی ادنیٰ سی برائی کی طرف مائل کر سکے پھر شیطان جو شر کی خارجی طاقت ہے وہ بھی ان کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے اس لیے داخل اور خارج کسی جانب سے بھی ان میں شر کا داعیہ نہیں ابھرتا۔ دوسرے انسانوں میں مغز شیطانی بھی موجود ہوتا ہے ان کی اندرونی طاقتیں بھی انبیاء علیہم السلام کی طرح فطرۃً شائستہ اور مہذب نہیں ہوتیں، ان کا شیطان بھی شروع سے شکست خوردہ نہیں ہوتا اس لیے داخلی یا خارجی عوارض کی وجہ سے ان میں فسوق و عصیان کی کراہت کے باوجود پھر ان کی طرف میلان ہو جانا ممکن ہے قرآن کریم کے لفظ کَرَّہَ میں اسی کی طرف اشارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں کفر و عصیان کی یہ کراہت پہلے موجود نہ تھی مگر حق تعالیٰ نے پیدا فرما دی ہے اور یہ اس کا انعام ہے کہ جو چیز پہلے تم کو محبوب بھی اللہ تعالیٰ نے اب اس کو تمہارے لیے مکروہ بنا دیا ہے پھر شریعت مطہرہ پر عمل کرتے کرتے اور حب ایمان اور کراہت کفر غالب آتے آتے وہ وقت بھی آجاتا ہے جبکہ ایک مسلمان کے اعضاء مرضیات الٰہیہ کے اس طرح منقاد و مطیع بن کر رہ جاتے ہیں کہ ان میں خلاف حرکت کرنے کی طاقت ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر ان کی شان ان عبادی لیس لک علیہم سلطان ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے ساتھ ذرا سی دشمنی خدا تعالیٰ کے اعلان جنگ کا موجب بن جاتی ہے۔ ترجمان السنہ ص ۳۱۲ حدیث ۱۲۱ اور اس کا تشریحی نوٹ یہاں ضرور ملاحظہ فرمایئے انبیاء علیہم السلام کی شان یہاں ابتداء ہی سے اتنی بلند ہوتی ہے کہ کسی طرف سے ان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا اس لیے وہ معصوم کہلاتے ہیں اور دوسرے انسان گو معصوم نہ ہوں مگر ان کی اتباع سے معصیت سے محفوظ کیے جا سکتے ہیں۔

اَلرَّسُوْلُ الْعَظِيْمُ وَسَيْطَرَةُ عِصْمَتِهٖ وَانْقِيَادُ قُوَى الضَّلَالَةِ لَهٗ

۱۱۰۴- عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ اللّٰهُ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِيْنُهٗ مِنَ الْمَلَائِكَةِ قَالُوْا وَاِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عصمت کا رعب و دبدبہ اور گمراہی کی طاقتوں کا اس کے سامنے سپر ڈال دینا

۱۱۰۴- ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں سے ہر شخص پر اللہ تعالیٰ نے دو قوتیں مقرر فرمائی ہیں جو اُس کے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک جن دوسرا فرشتہ۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیا یہ دونوں قوتیں آپ کے ساتھ بھی ہیں۔ فرمایا

۱۱۰۴- حدیث مذکور میں لفظ فَاَسْلَمُ کو کسی نے بصیغۂ متکلم پڑھا ہے اور اسی کے مطابق ہم نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ بعض علماء نے اس کو بصیغۂ غائب سمجھا ہے اس بناء پر اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ میرا شیطان اسلام قبول کر چکا ہے اس لیے وہ بجز بھلائی کا مشورہ دیتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے یہاں ایک تیسری شرح فرمائی ہے۔ اور ان ہر دو شرحوں کو ناپسند فرمایا ہے

والمراد فی اصح القولین استسلم وانقاد لی — جس شخص نے یہاں حدیث کے لفظ کو بصیغۂ متکلم پڑھا ہے اُس نے تو اس کے
ومن قال حتی اسلم انا فقد حرف معناہ — معنی میں تحریف کی ہے اور جس نے اس کو بصیغۂ ماضی پڑھ کر یہ سمجھا ہے کہ
ومن قال الشیطان صار مومنا فقد — آپ کا شیطان اسلام قبول کر چکا تھا اُس نے لفظی تحریف کی ہے صحیح مراد یہ ہے
حرف لفظہ — کہ اسلم بمعنی انقاد ہے یعنی وہ میرا مطیع و تابعدار بن گیا۔

دارمی کی روایت مذکور کے بعد لکھتے ہیں ومن الناس من یقول اسلم استسلم یقول ذل (ص ۳۰۶ ج ۲) اس سے بھی اسی مذکورہ شرح کی تائید ہوتی ہے۔ سبحان اللہ! معصومیت کا مقام بھی کیا بلند مقام ہے جہاں سامان ضلالت بھی اسباب ہدایت بن کر رہ جاتا ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ جہاں منبع شر بھی گردن تسلیم خم کر دے وہاں پھر شر کی گنجائش کس راستہ سے نکل سکتی ہے۔ جس کی معصومیت کی قوت کا اثر معصیت کی قوتوں پر بھی اتنا گہرا پڑتا ہو کہ وہ بھی مؤثر ہونے کے بجائے خود اس سے متاثر ہو کر رہ جائیں اور اس لیے اس کی معصومیت کے سامنے انقیاد و تسلیم کے سوا ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ رہے ان کی عصمت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ — جو میرے خاص بندے ہیں ان پر تیرا مقابلہ پر تجھ کو ذرا بھی غلبہ نہیں ہو سکتا ہے۔

اس سے کچھ یہی شرح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے سامنے وہ بے بس ہو جاتا ہے پھر انبیاء علیہم السلام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ اس لیے خود بڑی خود سری کے موقعہ پر بھی اس کو الا عبادک منھم المخلصین (مگر جو تیرے خاص بندے ہیں ان کو میں گمراہ نہ کر سکوں گا) کا استثناء کرنا پڑا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:۔

ان المؤمن لینضی شیاطینہ کما ینضی احدکم بعیرہ فی السفر (رواہ احمد بسند فیہ ابن لہیعۃ کما فی الجمع) — بندۂ مومن اپنے شیطانوں کو خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے کرتے اس طرح لاغر کر دیتا ہے جس طرح ایک شخص سفر کرتے کرتے اپنا اونٹ لاغر کر دیتا ہے۔

إِيَّايَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا يَاْمُرُنِيْ اِلَّا بِخَيْرٍ. رواہ مسلم

۱۱۰۵- عَنْ جَابِرٍ قَالَ وَرُبَّمَا سَاَلْتُ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوْا عَلَى الْمُغِيْبَاتِ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ وَرُبَّمَا قَالَ يَسْلُكُ الشَّيْطَانُ مِنِ ابْنِ اٰدَمَ مَجْرَى الدَّمِ قَالُوْا وَمِنْكَ قَالَ نَعَمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ رواہ الدارمی۔ راجع ترجمان السنۃ ص ۳۷۷ ج ۲

۱۱۰۶- عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهُ قِيْلَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّا نَتَخَوَّفُ اَنْ يَّكُوْنَ بِكَ ذَاتُ الْجَنْبِ

جی ہاں میرے ساتھ بھی ہیں لیکن شر کی قوت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی ہے۔ اس لیے میں اس کے فریب سے محفوظ رہتا ہوں مجھ کو وہ بھی بھلائی ہی کا مشورہ دیتی ہے۔ (مسلم شریف)

۱۱۰۵- جابرؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جن عورتوں کے شوہر گھر میں نہ ہوں کہیں باہر سفر میں چلے گئے ہوں ان کے پاس نہ جایا کرو کیونکہ شیطان انسان میں اس طرح گھوم جاتا ہے جیسا خون رگوں میں۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ کے لیے بھی شیطان ہے۔ فرمایا جی ہاں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی ہے تو وہ میرے سامنے جھک چکا ہے۔ (دارمی) اسی مضمون کی دوسری حدیث ترجمان السنۃ ص ۳۷۷ ج ۲ میں بھی گزر چکی ہے۔

۱۱۰۶- حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت میں کسی نے آپ سے کہا ہمیں

اب ظاہر ہے کہ جب ایسے مومن کی شیطانی طاقت کمزور ہوگی تو اس کی ملکی طاقت ضرور مسرور ہوگی، اور جتنی وہ مسرور ہوگی اتنی ہی ہر کام میں اس کی معین و مددگار رہیگی حتیٰ کہ اس کی شیطانی طاقت میں برائی پر برانگیختہ کرنے کا کوئی حوصلہ ہی نہ رہیگا۔ اور اس وقت اس آیت کے معنے اس کے سامنے منکشف ہو جائینگے۔

ان کید الشیطان کان ضعیفا

جب انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے والوں کی شان یہ ہو تو اب انبیاء علیہم السلام کا اندازہ کر لینا چاہیے۔ اگر وہ العیاذ باللہ خود اس کے فریب میں آسکتے ہیں تو پھر ان پر ایمان لانے والے اس سے بچ کر بھلا کہاں نکل سکتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ شریعت میں فرشتے اور شیطان کا وجود تواتر کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے اس لیے یہاں حدیث میں تاویل کرنا اور ان سے نفس انسانی میں صرف خیر و شر کا رجحان مراد لے لینا قطعاً غلط ہوگا۔ جامع ترمذی میں عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک روایت ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ شیطان اور فرشتہ ابن آدم کے قلب میں دونوں باتیں القا کرتے ہیں القاء شیطانی کی علامت یہ ہے کہ اس میں شر اور حق کی تکذیب کا مضمون ہو اور فرشتہ کی جانب سے ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس میں خیر اور حق کی تصدیق کا مضمون ہو لہذا جس کے دل میں اس قسم کی بات آئے اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ فرشتہ کی جانب سے ہے اور اگر اس کے خلاف قسم کی بات آئے تو شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لینی چاہیے۔ اس کی شہادت میں آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی الشیطان یعدکم الفقر و یامرکم بالفحشاء (تفسیر سورۂ بقرہ) علماء کہتے ہیں کہ لمۂ شیطانی کا نام وسوسہ اور لمۂ ملکی کا نام الہام ہے۔

۱۱۰۶- حدیثوں میں بیماریوں کے ظاہری اسباب کے ساتھ کچھ باطنی اسباب بھی مذکور ہو جاتے ہیں مثلاً استحاضہ کے متعلق آپ نے

قَالَ اِنَّمَا مِنَ الشَّيْطَانِ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُسَلِّطَهٗ عَلَيَّ۔ رواہ ابن اسحاق وابن سعد والبیہقی کذا فی الخصائص ص ۷۰ ج ۲ وعن ام سلمۃ وابن عباس نحوہ۔

۱۱۰۷۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا احْتَلَمَ نَبِيٌّ قَطُّ وَاِنَّمَا الْاِحْتِلَامُ مِنَ الشَّيْطَانِ۔ رواہ الطبرانی کما فی الخصائص۔

اندیشہ ہے آپ کو کہیں ذات الجنب کی بیماری نہ ہو آپ نے فرمایا یہ بیماری شیطانی اثر ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ میرے اوپر مسلط فرما دے (خصائص)

۱۱۰۷۔ ابن عباس رضؓ روایت فرماتے ہیں کہ کسی نبی کو کبھی احتلام نہیں ہوا کیونکہ اس کا منشا شیطانی خواب ہوتا ہے۔ (طبرانی)

فرمایا تلک رکضۃ من الشیطان۔ یہ شیطان کی ایذا رسانی کا اثر ہے۔ جمائی کے متعلق فرمایا۔ یہ بھی شیطان کا اثر ہوتی ہے طاعون کے متعلق فرمایا کہ یہ جنات کے نیزہ کا نتیجہ ہے وغیرہ۔ اس زمانہ میں چونکہ شیطان اور فرشتہ دونوں کا سرے سے انکار ہی انکار ہو رہا ہے اس لیے اس قسم کی حدیثوں کی صرف تاویل ہی کی طرف ذہن جاتا ہے لیکن اگر ان ہر دو مخلوق کا یقین حاصل ہو پھر انسانوں کے ساتھ ان کی عداوت یا دوستی کا حال بھی معلوم ہو تو اس قسم کے مواضع پر تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے شیطان اور اصل انسانی سے عداوت کا تذکرہ کر کے یہی بتانا چاہا ہے کہ اس پشتہا پشت کی عداوت کو ختم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ اب ان دونوں میں قیامت تک کے لیے جنگ رہیگی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی کوئی حالت کھانے پینے، سونے جاگنے، حتیٰ کہ اس کی ازدواجی زندگی بھی اور عبادات کے ہر ہر شعبہ میں بھی کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں اس کی مداخلت نہ ہو ترجمان السنہ ص ۱۹۱ ج ۲ میں عبداللہ بن مسعودؓ کی بی بی کی آنکھ دکھنے کا قصہ آپ پڑھ ہی چکے ہیں اور آئندہ اپنے باب میں آپ اس کی مزید تفصیلات بھی پڑھینگے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ لہذا کسی حقیقت کے علم کے بغیر اس کی نفی میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ ذات الجنب کے جو اسباب اطباء اور ڈاکٹروں نے بتلائے ہیں ان کا انکار نہیں ہے لیکن وہ اسباب کیونکر پیدا ہو جاتے ہیں گفتگو اس میں ہے۔ اسباب ظاہری کا جتنا نظم ونسق ہے وہ سب باطنی اسباب کا مسخر ہے اب جو ان کو نہیں جانتا اس کے لیے مسخر کے سوا اور راستہ کیا ہے۔ الناس اعداء ما جہلوا۔ پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ بہت سی بیماریوں کے اسباب میں بلکہ معالجہ میں بھی ڈاکٹروں اور طبیبوں کے درمیان کتنا بڑا اختلاف ہوتا ہے لیکن علاج کی کامیابی اور ناکامیابی کے نتیجہ میں اوسطاً دونوں برابر رہتے ہیں اب اگر ان کے ساتھ تعویذات کا فن بھی اور شامل کر لیا جائے تو یہاں بہت سے مواقع پر جہاں اطباء عاجز ہوں سو فیصدی کامیابی تجربہ میں آچکی ہے پس اگر انکار کی بنیاد صرف علاجی تجربہ ہے تو تعویذات سے شفاء کا تجربہ یہاں بھی ہے۔ بلکہ زہریلے جانور جیسے سانپ وبچھو یا جس کو نظر لگ جاتی ہے ان میں جتنی مفید اس کے لیے جھاڑ پھونک ہوتا ہے اتنا مفید اور سریع التاثیر علاج نہیں۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ آپ کا ایک اجمالی بیان ہے۔ ذات الجنب کے جملہ اقسام اور ان کے معالجات بیان کرنا آپ کا وظیفہ نہیں۔

۱۱۰۷۔ احتلام کی عام صورت قوت شہوانیہ کا انعاش ہی ہوا کرتا ہے اسی لیے اس قسم کے اسباب کی قلت وکثرت سے احتلام میں بھی قلت وکثرت پیدا ہو جاتی ہے لیکن کبھی اوعیہ منی کے پر ہو جانے سے بھی احتلام ہو جاتا ہے جب اوعیہ منی پر ہو جاتا ہے تو طبعی طور پر وہ خارج ہو جاتا ہے۔ بظاہر اس قسم کے احتلام کی صورت یہاں بھی ممکن ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔ بہرحال ابن عباسؓ کی اس تعلیل سے آپ کو اس کا تو کچھ نہ کچھ اندازہ ہوا ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کی فطرت کو شیاطین سے کتنا بعد ہوتا ہے کہ طبعی عوارض جیسے احتلام و مرض وغیرہ میں بھی شیطان کے اثرات سے کتنے دور ہوتے ہیں۔ سونے کی حالت میں عام بشر کے حواس معطل ہوتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام اس حالت میں اتنے بیدار رہتے ہیں کہ اس حالت میں بھی ان کے باطنی احساسات معطل نہیں ہوتے۔

۱۱۰۸۔ قَالَتْ عَائِشَةُ لَدَدْنَاهُ فِيْ مَرَضِهِ فَجَعَلَ يُشِيْرُ إِلَيْنَا أَنْ لَا تَلُدُّوْنِيْ فَقُلْنَا كَرَاهِيَةُ الْمَرِيْضِ لِلدَّوَاءِ فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ أَلَمْ أَنْهَكُمْ أَنْ تَلُدُّوْنِيْ قُلْنَا كَرَاهِيَةُ الْمَرِيْضِ بِالدَّوَاءِ فَقَالَ لَا يَبْقَى أَحَدٌ فِي الْبَيْتِ إِلَّا لُدَّ وَأَنَا أَنْظُرُ إِلَّا الْعَبَّاسَ فَإِنَّهُ لَمْ يَشْهَدْكُمْ. رواہ البخاری وفی لفظ ابن سعد، فلما افاق قال کنتم ترون ان اللہ یسلط علیّ ذات الجنب ما کان اللہ لیجعل لها علیّ سلطانا۔

۱۱۰۸۔ حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے مرض الموت میں دوا، لدود استعمال کرانے کا ارادہ کیا تو آپؐ نے اشارہ سے منع فرمادیا۔ مجھ کو یہ دوا، نہ دینا ہم نے اپنے دل میں کہا کہ مریض تو دوا کے استعمال سے گھبرایا ہی کرتا ہے جب آپ کو غفلت سے ذرا ہوش آیا تو آپؐ نے فرمایا۔ کیا میں نے تم کو لدود کے استعمال سے منع نہیں کیا تھا۔ ہم نے عذر کیا کہ غلطی سے ہم نے یہ سوچا کہ مریض دوا، کا استعمال پسند نہیں کرتے۔ اس پر آپؐ نے حکم دیا کہ گھر والوں میں جو جو اس میں شریک ہو سب کو یہ دوا، استعمال کرائی جائے بجز عباسؓ کے کیونکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ (بخاری شریف)

۱۱۰۸۔ لدود" اس دوا، کو کہتے ہیں جو مریض کے منہ میں ڈالی جائے جیسا کہ "سعوط" وہ دوا ہے جو ناک میں ڈالی جائے انبیاء علیہم السلام جو حکم دیدیں وہ سب واجب التعمیل ہوتا ہے خواہ وہ غصہ کی حالت میں ہوں یا رضا کی، مرض کی حالت میں ہوں یا صحت کی ان کی بے عذر حکم عدولی بھی بلا عذر حکم عدولی کی طرح قابل مؤاخذہ ہوتی ہے اس میں ذرا سا پس و پیش کرنا بھی غلطی ہے اور اس کی حکمت کے درپے ہونا بھی اپنے حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ مذکورہٗ بالا واقعہ میں اہمیت یوں پیدا ہوگئی تھی کہ آپ کی اتنی طویل مدت افہام و تفہیم کے بعد بالخصوص آپ کے آخری لمحات حیات میں اس قسم کی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے تھی۔ عام انسانوں میں بھی آخر وقت کا مرحلہ نازک سمجھا جاتا ہے اور نبی کے معاملہ میں تو نزاکت کا ایک خطرناک پہلو اور بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ صریح حکم کے بعد اس کی حکم عدولی کبھی کبھی انتقام الٰہی کا سبب بن جاتی ہے اس لیے آپ کی شفقت نے تقاضہ کیا کہ اس کے انتقام کا تکفل خود فرمالیں تاکہ آئندہ غیرت خداوندی خود اس کا انتقام نہ لے۔ کوئی شبہ نہیں کہ صریح ممانعت کے بعد "لدود" کا استعمال کرنا بڑی فروگذاشت تھی۔ مگر یہ اسی قسم کی فروگذاشت تھی جیسا کہ ابو البشر سے ایک بار ہوچکی تھی وہ بھی ممانعت کے باوجود شجرۂ ممنوعہ استعمال کر بیٹھے اور صحابہ نے بھی لدود کے استعمال میں غلط قدم اٹھایا۔ شان عفو نے گو ہر دو مقامات میں درگزر کردیا مگر دونوں جگہ اس کا کچھ نہ کچھ خمیازہ پھر بھگتنا ہی پڑا۔

ابن سعد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات الجنب میں گو عام طور پر "لدود" مفید سمجھا جاتا تھا مگر اس کی ایک قسم وہ بھی ہے جو شیطان کی ایذا سے پیدا ہوتی ہے۔ اب کسی نبی کے آخری لمحات میں کوئی حرکت ایسی کرنا جس سے کسی کو یہ وہم گزرنے کا موقعہ پیدا ہو سکے کہ خدا کا رسول بھی سطوت شیطانی کے زیر اثر آسکتا ہے یقیناً ایک بڑی مہلک غلطی تھی اس لیے آپ کی نظر میں اس کی اہمیت اور بڑھ گئی تھی اور اس لیے آپ نے چاہا کہ جس طرح حالت مرض میں بے وجہ آپ کو "لدود" استعمال کرادیا گیا اسی طرح ان کو بھی بے وجہ "لدود" استعمال کرا کے ان کے جرم کو ہلکا کردیا جائے۔ سبحان اللہ خدا کے رسول کی عظمت اور اس کے عفو کی دونوں شانیں کیسی نرالی ہوتی ہیں۔ اب اندازہ فرمالیجیے کہ جن کے متعلق شیطان کے اثر سے دخل کا تصور بھی جرم ہو ان کے حق میں کیا معصیت کا تصور کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔

الرسول العظیم وعصمته من تمثل الشیطان فی صورته صلی اللہ علیہ وسلم

۱۱۰۹۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَمُّوا بِاسْمِي وَلَا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم شکل بننے سے شیطانوں کا عاجز رہنا

۱۱۰۹۔ ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ہے میرا نام شوق سے رکھا کرو

۱۱۰۹۔ سبحان اللہ آپ کا مقام بھی کیا بلند مقام تھا اور آپ کی شکل مبارک بھی کتنی مطہر شکل تھی کہ شیطان میں تمثل بشری کی طاقت کے باوجود یہ طاقت نہ تھی کہ وہ آپ کی صورت میں متمثل ہو سکے۔ بیشک جو ابدالآباد کے لیے ملعون ہو اس کی کیا مجال کہ وہ ان کی صورت اختیار کر سکے جو کونین کے حق میں مجسم رحمت ہوں۔ نہ خدا کی لعنت اس کی رحمت کی صورت بن سکتی ہے نہ شیطان کی یہ طاقت ہو سکتی ہے کہ وہ آپ کی صورت اختیار کر سکے۔ سبحان اللہ جس کی صورت اتنی مبارک ہو اس کی سیرت کا بھلا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک پر تو کوئی دسترس کیا ہوتی اس کو یہ قدرت بھی نہیں کہ وہ خارجی طور پر اپنی شکل آپ کی شکل بنا سکے۔ پھر جب وہ عالم خواب میں آپ کی شکل بنانے پر قادر نہیں تو یقیناً بیداری میں بھی کسی کے سامنے آپ کی صورت بنانے پر قادر نہ ہوگا۔ لہذا جس طرح خواب کی زیارت میں شیطانی رؤیت کا شبہ نہیں ہو سکتا اسی طرح عالم بیداری کی زیارت میں بھی یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ عام طور پر خواب کی صرف دو قسمیں ہی مذکور ہوتی ہیں۔ بشری من اللہ یعنی خدا کی طرف سے بشارت دوم تحزین من الشیطان یعنی شیطان کی طرف سے مومن کا جی برا کرنے کی بات۔ لیکن بعض مقامات سے ایک تیسری قسم بھی ثابت ہوتی ہے یعنی تحدیث النفس یعنی نفس کے اپنے خیالات۔

اس تقسیم کی بنا پر حدیث مذکور میں خواب کی حالت کی زیارت میں صرف شیطانی مداخلت کی نفی ہوگی مگر تیسری قسم کا احتمال پھر باقی رہیگا کیونکہ وہاں نفی صرف شیطانی تمثل کی فرمائی گئی ہے معلوم ہوا کہ بعض مرتبہ نفسی محبت کی وجہ سے خیالی بھی ہوتی ہے۔ لہذا خواب کی ہر زیارت پر قطعیت کے ساتھ حقیقی زیارت کا حکم لگایا نہیں جا سکتا۔ اس میں خیالی زیارت کا احتمال ہو سکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ زیارت میں کوئی بات ظاہر شریعت کے مخالف بھی نظر آئے۔

ان جماعة من ائمة الشریعة نصوا علی ان من کرامة الولی انه یری النبی صلی اللہ علیه وسلم ویجتمع به فی الیقظة ویأخذ عنه ما قسم له من معارف ومواهب وممن نص علی ذلک من ائمة الشافعیة الغزالی والبارزی والتاج ابن السبکی والعفیف الیافعی ومن ائمة المالکیة القرطبی وابن ابی جمرة وابن الحاج فی المدخل وقد حکی عن بعض الاولیاء انه حضر مجلس فقیه فروی ذلک الفقیه حدیثا فقال له الولی هذا

ائمہ شریعت کی ایک جماعت نے اس کی تصریح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ولی بندہ کرامت کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالت بیداری بھی کر سکتا ہے اور آپ کی محفل میں حاضر بھی ہو سکتا ہے بلکہ اپنی استعداد کے مناسب کچھ علوم و معارف کا استفادہ بھی کر سکتا ہے اس کی تصریح کرنے والے ائمہ شافعیہ میں غزالی، بارزی، ابن السبکی اور یافعی جیسے حضرات ہیں اور ائمہ مالکیہ میں سے امام قرطبی، حافظ ابن ابی جمرہ، ابن الحاج وغیرہ حضرات ہیں۔ انہوں نے بعض اولیاء کے حالات میں نقل کیا ہے کہ وہ کسی فقیہ

تَكْتَنُوا بِكُنْيَتِي وَمَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي

مگر میری کنیت نہ رکھا کرو جس شخص نے مجھ کو خواب کی حالت میں دیکھا بلا شبہ اس نے مجھ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بن سکتا

الحدیث باطل فقال الفقیہ ومن این لک ہذا فقال ہذا النبی صلی اللہ علیہ وسلم واقف علیٰ رأسک یقول انی لم اقل ہذا الحدیث وکشف للفقیہ فراٰہ۔ وقال الشیخ ابو الحسن الشاذلی لو حجبت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم طرفۃ عین ما عددت نفسی من المسلمین۔

الحاوی ص ۲۶۳۔ ج ۲۔

کی مجلس میں تشریف لے گئے تو اس فقیہ نے کوئی روایت بیان کی یہ ولی بولے یہ حدیث تو باطل ہے اس فقیہ نے کہا تم نے یہ حکم کیسے لگا دیا اس ولی اللہ نے کہا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرے سامنے کھڑے ہوئے فرما رہے ہیں کہ یہ حدیث میں نے بیان نہیں کی۔ اس فقیہ کو بھی اس کا انکشاف ہوگیا اور اس نے بھی آپ کو دیکھ لیا شیخ ابو الحسن شاذلیؒ کا مقولہ تو یہ ہے کہ اگر میرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک پلک جھپکنے کے برابر بھی حجاب پڑ جائے تو میں اپنے آپ کو زمرہ مسلمین میں شمار نہ کروں۔

ثم قال ابن العربی من عندہ ورؤیۃ الانبیاء والملائکۃ وسماع کلامہم ممکن للمؤمن کرامۃ وللکافر عقوبۃ اھ

اس کے بعد ابن العربی اپنی رائے بیان کرتے ہیں کہ میرے نزدیک انبیاء علیہم السلام اور فرشتوں کی زیارت اور ان کے کلام کا سننا بھی ممکن ہے مؤمن اور کافر دونوں کے لیے مگر مؤمن کے لیے کرامت کے طور پر اور کافر کے لیے عقوبت کے طور پر۔

وقال الشیخ عز الدین بن عبد السلام فی القواعد الکبریٰ وقال ابن الحاج فی المدخل رؤیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الیقظۃ باب ضیق ... مع اننا لا ننکر من یقع لہ ہذا من الاکابر الذین حفظہم اللہ فی ظواہرہم وبواطنہم قال وقد انکر بعض علماء الظاہر رؤیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الیقظۃ (الحاوی ص ۲۵۸۔ ج ۲)

شیخ عز الدین بن عبد السلام قواعد کبریٰ میں لکھتے ہیں کہ ابن الحاج نے "المدخل" میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بحالت بیداری زیارت کا مسئلہ بہت دقیق ہے با ایں ہمہ جو اکابر اس رتبہ کے ہوں ان کے حق میں ہم اس کے منکر نہیں ہیں لیکن بعض علماء ظاہر نے اس کا انکار کیا ہے

وقال القاضی شرف الدین ہبۃ اللہ بن عبد الرحیم البارزی وقد سمع من جماعۃ من الاولیاء فی زماننا وقبلہ انہم رأوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الیقظۃ حیا بعد وفاتہ۔

قاضی شرف الدین فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے زمانہ کے اولیاء اور گزشتہ دور کے اولیاء کے متعلق بھی سنا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زیارت کی ہے

ثم نقل السیوطی عن الشیخ ابی عبد اللہ القرشی انہ رأی الخلیل علیہ السلام وعن الشیخ سراج الدین بن الملقن فی طبقات الاولیاء رقال الشیخ عبد القادر الکیلانیؒ رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبل الظہر الخ وفی ترجمۃ الشیخ خلیفۃ بن موسیٰ وکان کثیر الرؤیۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقظۃ ومناما وفی ترجمۃ الصفی ابی عبد اللہ محمد بن یحییٰ الاسوانی کتب عنہ ابن دقیق العید والقطب القسطلانی وکان یذکر انہ یری النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکان الشیخ عبد الغفار یری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی کل ساعۃ وکان للشیخ ابی العباس المرسی وصلۃ بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم

پھر علامہ سیوطیؒ نے ان حضرات کی ایک فہرست پیش کی ہے جن کو یہ سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی ہے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ ابو عبد اللہ قرشیؒ۔ سراج الدین بن الملقنؒ۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ۔ شیخ خلیفہ بن موسیٰؒ۔ الشیخ محمد بن یحییٰ۔ الشیخ عبد الغفار یہ صاحب ہر وقت آپ کی زیارت سے مشرف رہا کرتے تھے۔ شیخ ابو العباس یہ صاحب وہی ہیں جن کا مقولہ آپ نے پڑھا کہ اگر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف زیارت

وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ رواہ البخاری فی کتاب العلم

اور جس نے جان کر مجھ پر جھوٹ باندھا اس کو چاہیے کہ اپنی جگہ دوزخ میں تیار کرلے۔ (بخاری شریف)

اذا سلم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رد علیہ السلام ویجاوبہ اذا تحدث معہ۔ وذکر عنہ (کما فی لطائف المنن) لو حجب عنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طرفۃ عین ما عددت نفسی من المسلمین۔ ثم ذکر السیوطی رؤیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقظۃ عن عدۃ من اولیاء منہم الشیخ عبد اللہ الدلاصی والشیخ ابو العباس الحرار والسید احمد الرفاعی والسید نور الدین الایجی وابی نصر الکرخی ویوسف بن علی الزناتی ومحمد بن سمعون وابن ثابت وذکر قصصہم الحاوی ص ۲۶۱ و ۲۶۲ - ج ۲۔

سے ایک لمحہ کے لیے بھی محروم رہوں تو میں مسلمین میں اپنا شمار نہ کروں۔ الشیخ عبد اللہ الدلاصی۔ الشیخ ابو العباس الحرار۔ سید احمد رفاعی۔ سید نور الدین۔ ابو نصر کرخی۔ یوسف بن علی۔ محمد بن سمعون۔ ابن ثابت رحمہم اللہ تعالیٰ۔

شیخ عبد الوہاب الشعرانیؒ نے علامہ سیوطیؒ سے نقل کیا ہے کہ خود علامہ موصوف کو بھی یہ شرف حاصل تھا۔

قال الشیخ جلال الدین السیوطیؒ رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الیقظۃ بضعا وسبعین مرۃ وقلت لہ فی مرۃ منہا ہل انا من اہل الجنۃ یا رسول اللہ فقال نعم فقلت من غیر عذاب یسبق فقال لک ذلک۔ قال الشیخ عطیہ وسألت الشیخ جلال الدین مرۃ ان یجتمع بالسلطان الغوری فی ضرورۃ وقعت لی فقال لی یا عطیۃ انا اجتمع بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم یقظۃ واخشی ان اجتمعت بالغوری ان یحتجب صلی اللہ علیہ وسلم عنی۔ ثم قال ان فلانا من الصحابۃ کانت الملائکۃ تسلم علیہ فاکتوی فی جسدہ لضرورۃ فلم یر الملائکۃ بعد ذلک عقوبۃ لعلۃ الکتوانہ۔

الیواقیت والجواہر ص ۳۳ ج ۱

شیخ عبد الوہاب شعرانی حافظ سیوطیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالت بیداری ستر مرتبہ سے بھی زیادہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا میں جنتی ہوں۔ فرمایا ہاں۔ میں نے کہا کیا عذاب کے بغیر فرمایا جاؤ تمہارے لیے یہ بھی سہی۔ شیخ عطیہ کہتے ہیں میں نے شیخ سیوطیؒ سے ایک مرتبہ یہ درخواست کی کہ میری ایک ضرورت کے متعلق آپ سلطان غوری کے پاس جا کر سفارش فرما دیں تو انہوں نے جواب دیا عطیہ میں بحالت بیداری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں حاضر ہوتا ہوں مجھے خطرہ ہے اگر میں سلطان غوری کی محفل میں جاؤں تو کہیں اس سعادت سے محروم نہ ہو جاؤں۔ اس کے بعد فرمایا بعض صحابہ کو ملائکہ سلام کیا کرتے تھے انہوں نے ایک مرض کی وجہ سے اپنے جسم پر لوہے کا داغ دے کر علاج کیا تو وہ اس سعادت سے محروم ہو گئے۔

ثم قال الشعرانیؒ ان ما ذکرناہ عن الشیخ جلال الدینؒ ذکرہ الاشیاخ الثلاثۃ العدول الذین لا یتہمون فی مثل ذلک یعنی الشیخ الصالح عطیہ والشیخ الصالح قاسم المغربی والقاضی زکریا۔ فعی۔

شیخ عبد الوہاب شعرانیؒ لکھتے ہیں کہ شیخ سیوطیؒ سے اس واقعہ کو نقل کرنے والے تین بڑے بڑے مشائخ ہیں جن کی نسبت غلط بیانی کا تصور نہیں کیا جا سکتا بالخصوص ایسے نازک معاملہ میں (ہو سکتا ہے کہ شیخ سیوطیؒ نے جب اس قسم کے اشخاص کی فہرست شمار کرائی ہو تو اولیاء کے دستور کے موافق اپنے نام کے اظہار سے قصداً سکوت فرما لیا ہو)

قال السیوطیؒ فی فتاواہ ان اکثر ما تقع رؤیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الیقظۃ بالقلب ثم یترقی الی ان یری بالبصر... لکن لیست الرؤیۃ البصریۃ کالرؤیۃ المتعارفۃ عند الناس من رؤیۃ بعضہم لبعض وانما ہی جمعیۃ حالیۃ وحالۃ برزخیۃ وامر وجدانی لا یدرک حقیقتہ الا من باشرہ وقد تقدم عن الشیخ عبد اللہ الدلاصی لما احرم الامام واحرمت اخذتنی اخذۃ فرأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاشار بقولہ اخذۃ الی ہذہ الحالۃ (الحاوی ص ۲۶۳-۲۶ ج ۲)

اس زیارت کی حقیقت ٹھیک وہ نہیں سمجھنی چاہیے جو لوگوں کے درمیان متعارف ہے بلکہ اس زیارت کا اولاً پہلے قلب سے شروع ہوتا ہے پھر وہ حاسہ بصر تک بھی سرایت کر جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک برزخی کیفیت ہوتی ہے اور ایک نوع کا وجدان ہوتا ہے جس کا صحیح اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو یہ کیفیت حاصل ہو

الرسول العظیم وخوف الشیاطین من بعض اصحابہ

۱۱۱۰- عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا فَسَمِعْنَا لَغَطًا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ کا شیطانوں پر خوف اور ڈر

۱۱۱۰- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ دفعۃً ہم نے کچھ شور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۸۱)

قال الشیخ اکمل الدین البابرتی الحنفی فی شرح المشارق فی حدیث من رأنی "الاجتماع بالشخصین یقظۃ ومناما لحصول ما بہ الاتحاد وله خمسة اصول کلیة الاشتراک فی الذات او فی صفة فصاعدًا او فی الافعال او فی المراتب وکل ما یتعقل من المناسبة بین شیئین او اشیاء لایخرج عن ہذہ الخمسة وحسب قوتہ علی ما بہ الاختلاف وضعفہ یکثر الاجتماع ویقل وقد یقوی علی ضدہ فتقوی المحبة بحیث یکاد الشخصان لایفترقان وقد یکون بالعکس ومن حصل الاصول الخمسة وثبتت المناسبة بینہ وبین ارواح الکمل الماضیین اجتمع بہم متی شاء اھ (الحاوی ص ۲۵۰ ج ۲)

شیخ اکمل الدینؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اس قسم کی زیارت کا مدار انسان کی اندرونی مناسبت ہوتی ہے جس شخص میں یہ مناسبت جتنی زیادہ ہوتی ہے اسی کے مناسب اس کو یہ زیارت بھی میسر آتی ہے حتی کہ بعض لوگوں کو گزشتہ بزرگوں کی ارواح کے ساتھ اتنی مناسبت ہوتی ہے کہ وہ جب ارادہ کرتے ہیں ان سے روحانی ملاقات کر لیتے ہیں۔ (الحاوی ص ۲۶۳، ۲۵۸، ۲۶۱، ۲۶۱ و ۲۶۲ ج ۲)

حافظ ابن تیمیہؒ نے بیداری میں رؤیۃ کا اپنی حسب عادت بڑی شدومد کے ساتھ انکار فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

وکثیر منہم رأی من ظن انہ نبی او صالح او الخضر وکان شیطانًا وقد ثبت فی الصحیح من رآنی فی المنام فقد رآنی حقا فان الشیطان لایتمثل فی صورتی۔ فہذا فی رؤیۃ المنام تکون حقا وتکون من الشیطان فمنعہ اللّٰہ ان یتمثل بہ فی المنام واما فی الیقظۃ فلا یراہ احد بعینہ فی الدنیا فمن ظن ان المرئی ہو المیت فانما اتی من جہلہ (التوسل والوسیلہ ص ۲۵)

ایسا بہت ہوا ہے کہ بیداری کی حالت میں دیکھنے والے شخص کو یہ گمان ہوا ہے کہ جس کو اس نے دیکھا تھا، نبی یا کوئی بزرگ یا حضرت خضر علیہ السلام تھے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ شیطان ہوتا تھا۔ بیشک یہ صحیح حدیث ہے کہ جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا اس نے ٹھیک مجھ کو ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ خواب میں کسی کی رؤیۃ دونوں صورتیں ممکن تھیں یہ بھی کہ وہ اسی انسان کی ہو اور یہ بھی کہ شیطان نے اس کی صورت اختیار کرلی ہو اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت کے متعلق شیطان سے یہ قدرت سلب فرمالی ہے کہ وہ کسی کو خواب میں آپ کی صورت میں نظر آسکے مگر یہ بات صرف خواب ہی کے معاملہ تک محدود ہے۔ اب رہا بیداری کا معاملہ تو جس شخص کو بھی یہ گمان ہو کہ اس نے مثلاً فلاں مردہ شخص کو دیکھا ہے تو یہ صرف اس کا جہل ہے۔

۱۱۱۰- ایک سیاہ فام حبشی عورت کا اس وقت عرب کے عام دستور کے مطابق اتفاقاً آنکلنا اور بچوں کا اس کے اردگرد جمع ہوجانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خلق کریم کہ ایک نوعمر بی بی کی خاطر جن کی فطرت کو بچپن کی دلچسپیوں سے بھی پوری طرح آزادی حاصل نہ ہوئی تھی خود بلا کر پورا کرنا کتنی غیر معمولی بات تھی پھر اس نوعمری میں فیض نبوت سے منور بی بی کی اولوالعزمی بھی کتنی قابل داد تھی کہ اس ماحول میں ان کو ادھر ذرا

وَصَوْتَ صِبْيَانٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَإِذَا حَبَشِیَّۃٌ تَزْفِنُ وَالصِّبْیَانُ حَوْلَھَا فَقَالَ یَا عَائِشَۃُ تَعَالَیْ فَانْظُرِیْ فَجِئْتُ فَوَضَعْتُ لَحْیَیَّ عَلٰی مَنْکِبِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجَعَلْتُ أَنْظُرُ إِلَیْھَا مَا بَیْنَ الْمَنْکِبِ إِلٰی رَأْسِہٖ فَقَالَ لِیْ أَمَا شَبِعْتِ أَمَا شَبِعْتِ

اور بچوں کے غل مچانے کی آواز سنی آپ آواز سن کر اُٹھے کیا دیکھتے ہیں ایک حبشی عورت ہے جو اچھل کود رہی ہے اور بچے ہیں کہ اس کے ارد گرد جمع ہیں۔ آپ نے فرمایا عائشہ! آؤ تم بھی دیکھ لو میں گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھے اور سر مبارک کے درمیان اپنا چہرہ رکھ کر اس کو دیکھنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے فرمایا۔ ابھی تمہارا دل نہیں بھرا، ابھی تمہارا دل نہیں بھرا!

التفات نہ تھا ساری فکر تھی تو یہ کہ سردار دو جہاں کے دل میں ان کے لیے جگہ کتنی ہے۔

یہاں جو بات زیادہ تر قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن اقدس سے وابستہ ہو جانے کے بعد عمرؓ کی فطرت میں کمالات نبوت کا کیسا انعکاس ہوا تھا کہ ان کے سایہ سے بھی شیطان ترساں و لرزاں رہنے لگے تھے۔ یہ وہی عمرؓ ہیں جن سے کبھی شیاطین کھیلا کرتے تھے اور آپ کے زیر سایہ آجانے کے بعد اب یہ وہی ہیں جن سے شیطان اس طرح دبکتے پھرتے ہیں کہ جس راستہ سے عمرؓ نکل جائیں شیاطین وہ راستہ ہی چلنا چھوڑ دیا کرتے تھے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ مباحات کا آخری درجہ محرمات کی ابتدائی سرحد کے پاس لگا ہوا ہوتا ہے اس لیے ایک حدیث میں تشبیہ دے کر اس کی تفہیم یوں کی گئی ہے کہ محرمات سے بچنے کا راستہ صرف یہ ہے کہ اُس کے خطرے سے کچھ ایسی مباحات بھی جو محرمات کی سرحد سے لگتے ہوں ترک کر دیے جائیں۔ جیسا ایک چرواہے کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو خاص شاہی چراگاہوں سے دور دور چرائے ورنہ ایک دن اس کے جانور یقیناً شاہی جنگل میں بھی مُنہ ڈال کر رہیں گے۔ اسی طرح ایک حبشیہ عورت کا جو غالباً مسلمان نہ تھی آنکلنا اور ایسی حرکات کرنا جو اگر ذرا بڑھ جائیں تو حرام کی زد میں بھی آسکتی تھیں۔ ان مباحات میں داخل تھا جو حرام کی سرحد سے بالکل متصل ہوتے ہیں۔ یہ شیاطین کے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا محل ہوتا ہے ان کی سعی ہوتی ہے کہ کسی طرح ضعیف انسان کا قدم یہاں ذرا لغزش کھا جائے تو اس کو حرام میں گھسیٹ لیں۔ یہ منظر عوام کی نظروں میں تو ضرور دلچسپی کا منظر ہوتا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کی نظروں میں انسان کے لیے ابتلا و آزمائش کا نازک مقام ہوتا ہے، ان کی شان دوسری ہوتی ہے اگر وہ یہاں ممانعت کا لفظ زبان سے نکالتے ہیں تو اسی وقت وہ مباح اپنے درجہ سے نکل کر حرام کی فہرست میں داخل ہو جاتا ہے مگر یہاں یہ منظور نہیں ہوتا۔ جو رسول ہر قسم کی طبیعت اور جمیع نوع بشری کے لیے رسول بن کر آئے ہوں وہ چاہتے تھے کہ اُمت کے کمزور ر ، لیے مباحات کا دائرہ جس حد تک بھی وسیع رہ سکتا ہے وسیع رہے تنبیہ و ترہیب کے ذریعہ ان کو اس کے ارتکاب سے روک بھی دیا جائے۔ چنانچہ طلاق ایک ایسی چیز ہے جس کی ضرورت کسی ناگزیر موقعہ پر یقینی ہو جاتی ہے اس لیے اس کی اجازت دیے بغیر بھی چارہ نہیں تھا۔ مگر یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ناپسندیدہ ہونے کا اظہار بھی کر دیا جائے اس لیے یوں ارشاد فرمایا گیا "ابغض المباحات عند اللہ الطلاق" مباحات کی فہرست میں جو بات نظر ربوبیت میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے وہ طلاق ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں عورت کا کوئی مقام ہی نہیں ہے یا طلاق کوئی منصفانہ آئین نہیں وہ ذرا آنکھ کھول کر ان باتوں کو بھی سامنے رکھیں۔ پس ایک حبشیہ عورت کو روکنا تو مناسب نہ تھا مگر یہ ممانعت بذریعہ عمرؓ ہی مناسب تھی۔ آخر عمرؓ میں یہ جذبات کہاں سے پیدا ہوئے اور اس فعل کے مذموم ہونے کی خبر بچوں تک کو کس نے دی جو عمرؓ کو دیکھتے ہی بھاگ پڑے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ فیض نبوت ہی تھا، گر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

فَجَعَلَتْ اَقُوْلُ لَا لَا نُظُرُ مَنْزِلَتِي عِنْدَهُ اِذْ طَلَعَ عُمَرُ فَارْفَضَّ النَّاسُ عَنْهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّي لَاَنْظُرُ اِلَى شَيَاطِيْنِ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ قَدْ فَرُّوْا مِنْ عُمَرَ قَالَ فَرَجَعْتُ. رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب صحيح۔

١١١١۔ عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَتْ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ مَغَازِيْهِ فَلَمَّا انْصَرَفَ جَاءَتْ جَارِيَةٌ سَوْدَاءُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي كُنْتُ نَذَرْتُ اِنْ رَدَّكَ اللّٰهُ صَالِحًا اَنْ اَضْرِبَ بَيْنَ يَدَيْكَ بِالدُّفِّ وَاَتَغَنَّى فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كُنْتِ نَذَرْتِ فَاضْرِبِي وَاِلَّا فَلَا فَجَعَلَتْ تَضْرِبُ فَدَخَلَ اَبُوْ بَكْرٍ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عَلِيٌّ وَهِيَ تَضْرِبُ

میں ہر بار کہہ دیتی۔ ابھی نہیں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ آپ کے قلب میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ لگاؤں (کہ میری خاطر کب تک تکلیف گوارا فرماتے ہیں) اتنے میں حضرت عمرؓ آ نکلے۔ اُن کا آنا تھا کہ جتنے لوگ وہاں تھے سب اس کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ عمرؓ کے خوف سے شیطانی فطرت کے انسان اور جنات سب بھاگ گئے اس کے بعد میں وہاں سے لوٹ کر اپنے گھر میں آگئی۔ (ترمذی شریف)

١١١١۔ بریدہ روایت فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ کے لیے باہر تشریف لے گئے تھے جب صحیح و سلامت واپس تشریف لے آئے تو ایک سیاہ فام باندی حاضر ہوئی اور کہنے لگی یا رسول اللہ میں نے یہ منّت مان رکھی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو صحیح و سالم واپس لے آیا تو میں اس کی خوشی میں آپ کے سامنے دف بجاؤں گی۔ آپ نے اس سے فرمایا۔ اگر تو نے یہ منّت مانی تھی تو خیر اس کو پورا کر لے ورنہ نہیں۔ اس پر وہ دف بجانے لگی۔ اتنے میں ابوبکرؓ آ گئے وہ دف بجاتی رہی پھر علیؓ آئے وہ اسی طرح دف بجاتی رہی۔ پھر عثمانؓ آئے تو بھی

اگر کہیں براہ راست اس کی ممانعت فرما دیتے تو پھر یہ ممانعت صرف ایک مصلحت نہ رہتی بلکہ مسئلہ بن جاتا اور مباحات کی فہرست سے نکل کر محرمات میں داخل ہو جاتا۔ آئندہ عنقریب ایک دوسرا واقعہ بھی آپ کے سامنے آنے والا ہے جس میں عید کے دن کچھ لڑکیوں نے جنگی اشعار وہ بھی اپنے گھر کے اندر پڑھے تھے تو صدیق اکبرؓ نے اس کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ان کو جھڑک کر منع بھی فرما دیا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ وہ اس موقع پر خاموش تھے تفصیل تشریحی نوٹ میں آتی ہے اس جگہ ترجمان السنہ ص ۴، ۳ ج۔ بھی ملاحظہ فرمائیے جس میں شان عمری کا یہ کرشمہ مذکور ہے کہ جس راستہ کو وہ چلتے ہیں شیاطین وہ راستہ ہی چلنا چھوڑ دیتے ہیں۔

١١١١۔ قدیم زمانہ میں مسرت اور خوشی کے موقعہ پر دف بجانے کا بڑا اہتمام تھا۔ دف لکڑی کا بنا ہوا ایک گول دائرہ ہوتا ہے جس کے صرف ایک طرف چمڑا چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ آواز تو ضرور ہوتی ہے مگر بالکل بے کیف۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں

ان مریم اخت موسیٰ وہارون ضربت بالدف یوم نجا اللہ موسیٰ وقومہ واغرق فرعون وملاہ

حضرت مریم نے جو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی ہمشیرہ تھیں اس دن خوشی میں دف بجایا تھا جس دن کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام

ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَأَلْقَتِ الدُّفَّ تَحْتَ اِسْتِهَا ثُمَّ قَعَدَتْ عَلَيْهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَخَافُ مِنْكَ يَا عُمَرُ إِنِّي كُنْتُ جَالِسًا وَهِيَ تَضْرِبُ فَدَخَلَ أَبُو بَكْرٍ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عَلِيٌّ وَهِيَ تَضْرِبُ ثُمَّ دَخَلَ عُثْمَانُ وَهِيَ تَضْرِبُ فَلَمَّا دَخَلْتَ أَنْتَ يَا عُمَرُ أَلْقَتِ الدُّفَّ ۔ رواہ الترمذی وقال هٰذا حدیث حسن صحیح غریب ۔ وراجع ترجمان السنۃ ص ۱ج۳۷۴ ۔

الرسول العظیم ویأس الشیطان من عبادة الأصنام فی جزیرة العرب

۱۱۱۲ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ مِنْ

وہ اسی طرح دف بجاتی رہی اس کے بعد عمرؓ آئے تو فوراً دف نیچے ڈال اس پر بیٹھ گئی یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمرؓ تم سے شیطان بھی ڈرتا ہے میں بیٹھا ہوا تھا تو بھی یہ لونڈی دف بجاتی رہی جب ابوبکرؓ آئے تو بھی یہ بجاتی رہی پھر علیؓ آئے تو بھی بجاتی رہی پھر عثمانؓ آئے تو بھی یہ بجاتی رہی پھر جب اے عمرؓ تم آئے تو تم کو دیکھ کر اس نے دف ڈال دیا۔ (ترمذی شریف)

آپ کے خاص محل بعثت میں شیطان کی مایوسی

۱۱۱۲۔ جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے شیطان اس بات سے تو بالکل مایوس

البدایۃ والنہایۃ ص ۶۷ ج ۲ اور انکی قوم کو نجات عطا فرمائی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا تھا۔ غالباً اسی سنت کے مطابق اس جاریہ نے بھی آپ کی بعافیت واپسی پر یہ خوشی منائی ہوگی۔ چونکہ آپ کی بحفاظت واپسی کی خوشی منانا ایک شرعی خوشی تھی اس لیے اس کی نذر ماننی بھی درست تھی۔ آپ نے اس کی اجازت دے تو دی مگر یہ دل ناخواستہ اور صاف واضح کر دیا کہ اگر یہ نذر نہ کی گئی ہوتی تو پھر اس کی بھی اجازت نہ دی جاتی۔ اب رہے ڈھول اور دیگر مزامیر تو شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں۔ کفار کے یہاں باجوں کو عبادات کی حیثیت حاصل ہو تو ہو مگر ہمارے علم میں اسلام میں اس کا کوئی وجہ نہیں۔ جہاں آپ کے بعض اصحاب سے شیطان کے خوف و خشیت کا عالم یہ ہو وہاں براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کی مقہوریت کا عالم کیا ہوگا۔ پھر جب ماحول ہی شیطانی اثرات سے پاک و صاف ہو جائے تو اس میں معصیتوں کا وجود بھی شاذ و نادر ہو نا ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام صرف اپنی ذات ہی میں معصوم نہیں ہوتے بلکہ جس ماحول میں وہ ہوتے ہیں اُس میں بھی ان کی عصمت کے اثرات پھیلنے لگتے ہیں اور اگر اس ماحول میں اصلاح یا تأثر کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی تو پھر اس کا نتیجہ ہلاکت اور قوم کی تباہی کی صورت میں نظر آجاتا ہے۔

۱۱۱۲۔ حدیثوں میں مستقبل کے متعلق جو خبریں دی جاتی ہیں ان میں جو جو قیدیں مذکور ہوں وہ نظر انداز نہیں کرنی چاہئیں یہاں حدیث میں سب سے پہلے تو جزیرۂ عرب کی تخصیص ہے کیونکہ یہی جزیرہ آپ کی بعثت کا سب سے پہلا مقام تھا پھر اس میں بھی جس طبقہ کے متعلق خبر دی گئی ہے وہ نمازی لوگوں کا طبقہ ہے۔ پھر جس بات سے مایوسی کی خبر دی گئی ہے وہ نمازی طبقہ کی باہمی تحریشا

اَنۡ یَعۡبُدَہُ الۡمُصَلُّوۡنَ فِیۡ جَزِیۡرَۃِ الۡعَرَبِ وَلٰکِنۡ فِی التَّحۡرِیۡشِ بَیۡنَہُمۡ ۔ رواہ مسلم وصاحب المشکوٰۃ فی باب الوسوسۃ ۔

الرسول العظیم ولطافۃ فطرتہ السلیمۃ

۱۱۱۳۔ عَنۡ شَبِیۡبِ بۡنِ اَبِیۡ رَوۡحٍ عَنۡ رَجُلٍ مِّنۡ اَصۡحَابِ رَسُوۡلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ صَلّٰی صَلٰوۃَ الصُّبۡحِ فَقَرَأَ الرُّوۡمَ فَالۡتَبَسَ عَلَیۡہِ فَلَمَّا صَلّٰی قَالَ مَا بَالُ اَقۡوَامٍ یُصَلُّوۡنَ مَعَنَا لَا یُحۡسِنُوۡنَ الطُّہُوۡرَ وَاِنَّمَا یُلَبِّسُ عَلَیۡنَا الۡقُرۡاٰنَ اُولٰٓئِکَ رواہ النسائی ۔

ہو چکا ہے کہ نمازی لوگ کبھی آئندہ جزیرۃ العرب میں اس کی عبادت کرینگے ۔ اس لیے اب وہ صرف ایک دوسرے کو ابھارنے پر ہی راضی ہو گیا ہے ۔ (مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت سلیمہ کی پاکیزگی

۱۱۱۳۔ شبیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے ناقل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھائی اور اس میں سورۂ روم پڑھی آپ اُس میں کہیں اٹکے جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا ۔ لوگوں کا بھی کیا حال ہے کہ نماز تو ہمارے ساتھ پڑھتے ہیں اور پھر وضو ٹھیک طور سے کرتے نہیں ۔ یہی لوگ ہیں جو ہمارے قرآن پڑھنے میں رُکاوٹ کا باعث بن جاتے ہیں ۔ (نسائی شریف)

ہے ۔ اور یہ خبر بھی ان الفاظ سے نہیں دی گئی کہ ان میں کوئی بت پرستی نہیں کریگا بلکہ صرف شیطان کی اپنی مایوسی کا ذکر ہے ۔ اس بنا پر اب حدیث کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع تو بہت بلند ہے ۔ آپ کی عصمت کا اثر آپ کے خاص مقام بعثت پر بھی اتنا گہرا پڑ چکا تھا کہ شیطان بھی وہاں کے خاص بندوں پر اپنی کامیابی سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو چکا تھا ۔ الحمد للہ العزیز کہ آپ کی پیش گوئی حرف بحرف آج تک آفتاب درخشاں کی طرح روشن ہے عرب کے ناخواندہ لوگ جو پشتہا پشت سے بت پرستی کے عادی تھے اسلام کے بعد آج تک بت پرستی سے اتنے متنفر ہیں کہ دوسرے مقامات کے خواندہ بھی اتنے متنفر نہ ہونگے ۔ ان کے تعلیم یافتہ پھر نمازیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ۔

۱۱۱۳۔ حدیث مذکور میں جس امر کی شکایت کی جا رہی ہے وہ بے وضو نماز ادا کرنے کی نہیں بلکہ ناتمام وضو کرنے کی شکایت ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کا تقدس تو دیکھیے کہ دوسروں کا قصور بھی آپ پر کس درجہ بار عظیم بن رہا ہے حتی کہ آپ کی قرأت قرآن کیں بھی خلل کا باعث بن گیا ہے ۔ پس جب دوسروں کا قصور آپ کی فطرت کے لیے اتنا بار ہو تو سوچیے کہ کیا براہ راست قصور کی یہاں کوئی گنجائش نکل سکتی ہے معصیت کا تو ذکر کیا ہے ۔

۱۱۱۴۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَمِيْصَةٍ لَهَا اَعْلَامٌ فَنَظَرَ اِلٰى اَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ اِذْهَبُوْا بِخَمِيْصَتِيْ هٰذِهٖ اِلٰى اَبِيْ جَهْمٍ وَأْتُوْنِيْ بِاَنْبِجَانِيَّةِ اَبِيْ جَهْمٍ فَاِنَّهَا اَلْهَتْنِيْ اٰنِفًا عَنْ صَلٰوتِيْ. متفق علیہ وفی روایۃ للبخاری قال کنت انظر الی علمها وانا فی الصلوۃ فاخاف ان یفتننی۔

۱۱۱۵۔ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ اُهْدِيَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرُّوْجُ حَرِيْرٍ فَلَبِسَهٗ ثُمَّ صَلّٰى فِيْهِ ثُمَّ انْصَرَفَ فَنَزَعَهٗ نَزْعًا شَدِيْدًا كَالْكَارِهِ لَهٗ ثُمَّ قَالَ لَا يَنْبَغِيْ هٰذَا لِلْمُتَّقِيْنَ. متفق علیہ۔

۱۱۱۴۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نقشین کمبلی میں نماز ادا کی۔ نماز کی حالت میں آپ کی نظر ذرا اس کے پھولوں پر جا پڑی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا اس کمبلی کو تو ابوجہم (ایک صحابی کی کنیت ہے) کو جا کر دیدو اور ان کی وہی موٹی کمبلی مجھے لا دو۔ اس نے تو مجھے ابھی میری نماز سے بھی غافل کر دیا ہوتا۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ میں نے اس کے پھولوں کو دیکھا تو قریب تھا کہ میری نماز کی حضوری میں فرق پڑ جاتا۔ (بخاری شریف)

۱۱۱۵۔ عقبہ بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ریشمین عبا ہدیۃً پیش کیا گیا۔ آپ نے اس کو پہنا اور اس کو پہنے ہوئے نماز ادا فرمائی۔ جب نماز سے فارغ ہو گئے تو بڑی نفرت کے انداز میں اس کو اتار پھینکا اور فرمایا۔ یہ لباس متقیوں کے شایانِ شان نہیں (متفق علیہ)

۱۱۱۴۔ پھولدار کمبلی کوئی ناجائز لباس نہیں پھر معمولی سے پھول کی حیثیت ہی کیا تھی مگر اللہ رے نبی کی فطرت جہاں حضوری میں کسی ادنی سی چیز کے حائل ہونے کا خطرہ بھی پیدا ہو سکتا ہے وہ بھی اس کو برداشت نہیں۔ سوچو کہ ایسی بلند فطرت سے کیا کسی ادنی سی معصیت کا صدور ممکن ہے۔ علماء کو یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ جب یہ چادر آپ نے اپنے لیے ناموزوں سمجھ کر اتار دی تو پھر اس کو ابوجہم کے لیے کیسے پسند فرمایا جو جواب ان حضرات نے دیے ہیں وہ تو اپنی جگہ دیکھ لیے جائیں۔ ہمارے نزدیک تو نبی کی شان وہ ہے کہ جس کو وہ غفلت کے اندیشہ سے تعبیر کرتا ہے اگر وہ دوسروں کو میسر آ جائے تو ان کی ہزاروں حضوریوں سے بھی بلند تر ہو گی۔ پس ابوجہم اس کو پہن کر شوق سے نماز پڑھیں۔ بلکہ اس سے بھی بیش قیمت چادر پہن لیں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ان کے مرتبہ کی حضوری پھر قائم رہ سکتی ہے۔ مگر نبی کی حضوری کا اندازہ کس کو ہو سکتا ہے جس کو معمولی ایک پھول سے بھی اپنی حضوری میں خلل کا خطرہ ہو جاتا ہے سچ ہے ؏ جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔

یاد رکھیے حدیث میں اندیشہ کا لفظ تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اس نے کوئی اثر پیدا بھی کر دیا تھا۔ اگر انبیاء علیہم السلام ادنی لغزش کے خطرہ سے بھی اتنے خائف نہ رہیں تو ان کی عصمت کا ثبوت ہمارے سامنے اس درجہ بدیہی کیسے ہو یہی خوف و خشیت ان کی عصمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

۱۱۱۵۔ ریشم کا استعمال اس وقت تک درست تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم فطرت پر جو لباس حرام ہونے والا تھا وہ اس سے پہلے ہی بار بن رہا تھا۔

الرسول العظیم و خشیتہ من ربہ عزوجل

۱۱۱۶- عَنْ مُطَرِّفِ بْنِ الشِّخِّيرِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّي وَلِجَوْفِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْجَلِ يَعْنِيْ يَبْكِيْ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ وَفِيْ صَدْرِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الرَّحٰى مِنَ الْبُكَاءِ رواہ احمد وروی النسائی الاولی وابوداؤد الثانیہ

۱۱۱۷- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَدْ شِبْتَ قَالَ شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَالْوَاقِعَةُ وَالْمُرْسَلَاتُ وَعَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ وَاِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۔ رواہ الترمذی ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر الٰہی سطوت وجبروت کا استیلاء

۱۱۱۶- مطرف بن شخیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینہ مبارک سے گریہ وزاری کی آواز اس طرح گونج رہی تھی جیسا ہانڈی کے جوش مارنے کی آواز۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں نے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور رونے کی وجہ سے آپ کے سینہ مبارک میں چکی کی سی آواز آرہی تھی۔ (احمد، نسائی)

۱۱۱۷- حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا یارسول اللہ آپ تو بوڑھے ہوگئے فرمایا مجھ کو سورۂ ہود، سورۃ الواقعہ، سورۃ المرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت کے ہولناک مناظر نے بوڑھا کردیا ہے۔ (ترمذی شریف)

۱۱۱۶- جن قلوب پر خوف الٰہی کا عالم یہ ہو کیسے ممکن ہو کہ ان سے کسی ادنیٰ سی معصیت کا صدور بھی ہوجائے۔

۱۱۱۷- انبیاء علیہم السلام کے علوم چونکہ کسب واکتساب کا ثمرہ نہیں ہوتے اس لیے وہ صرف دماغی خیالات یا ذاتی تحقیقات کی طرح نہیں ہوتے بلکہ نفسیات اور طبیعیات کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں یقین واذعان کی وہ کیفیت ہوتی ہے جو مشاہدہ میں ہوا کرتی ہے اس لیے ان پر اس کے اثرات بھی وہی ہوتے ہیں جو مشاہدہ کے ہوسکتے ہیں۔ ہم اگر قیامت کا یقین رکھتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ اتنا جتنا کہ مثلاً کلکتہ شہر کا مگر ظاہر ہے کہ جس نے کلکتہ کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہو اس کی نظروں میں اس شان وشوکت اور وسعت کا جو نقشہ ہوگا وہ ہماری نظروں میں صرف سُن کر قائم نہیں ہوسکتا۔ ان کے جزم ویقین کا اندازہ بس اسی سے فرمالیجیے کہ ان کی شریعت میں امتیوں کے حصہ میں بھی "احسان" کا ایک مستقل باب آگیا ہے۔ آپ پہلی جلد کے آخر میں پڑھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سائل کے جواب میں ایمان واسلام کی تشریح فرماکر آخر میں احسان کی جو تشریح فرمائی وہ یہ تھی کہ خدا تعالیٰ کی عبادت اس کیفیت سے کرنے لگنا جیسا آنکھوں سے دیکھ کر ہوتی ہے۔ اس کے بعد جلد ثانی میں اسی باب کی متعدد حدیثیں آپ کے ملاحظہ سے گزر چکی ہیں جن میں اس مشاہدہ کی کیفیت خود صحابہ کی زبانوں سے منقول ہے۔ دیکھو ترجمان السنہ ص۱ حدیث ۲۶۷ وص۲ وص۵۶۵ مع تشریحی نوٹ وص۳ وص۲ وغیرہ۔

الرسول العظيم و قوته في الدين و صفاء اليقين

۱۱۱۸۔ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ أَنْعَمُ وَصَاحِبُ الصُّورِ قَدِ الْتَقَمَهُ وَأَصْغَى سَمْعَهُ وَحَنَى جَبْهَتَهُ مَتَى يُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا تَأْمُرُنَا قَالَ قُولُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ۔ رواہ الترمذی

۱۱۱۹۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُهَرِيقُ الْمَاءَ فَيَتَيَمَّمُ بِالتُّرَابِ فَأَقُولُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ الْمَاءَ مِنْكَ قَرِيبٌ يَقُولُ مَا يُدْرِينِي لَعَلِّي لَا أَبْلُغُهُ رواہ فی شرح السنۃ وابن الجوزی فی کتاب الوفاء

۱۱۲۰۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ مَرَّ بِنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا وَأُمِّي نُطَيِّنُ شَيْئًا فَقَالَ مَا هٰذَا يَا عَبْدَ اللّٰهِ قُلْتُ شَيْءٌ نُصْلِحُهُ قَالَ الْأَمْرُ أَسْرَعُ مِنْ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم آخرت کا استحضار اور اس کا یقین

۱۱۱۸۔ ابوسعید خدری روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں دنیوی لذتوں سے بھلا کیونکر لطف اندوز ہوں جبکہ دیکھ رہا ہوں کہ صور پھونکنے والے فرشتے نے (نفخ صور کی تیاری میں) صور اپنے منہ میں لے لیا ہے، اپنی پیشانی جھکالی ہے اور کان لگا رکھے ہیں کب ان کو نفخ صور کا حکم ملتا ہے لوگوں نے عرض کی فرمائیے اس حالت میں ہمیں کیا حکم ہے۔ ارشاد ہوا بس حسبنا اللہ ونعم الوکیل پڑھتے رہو۔ خدا تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہی ہمارا بہترین کارساز ہے۔ ترمذی شریف

۱۱۱۹۔ ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب سے فارغ ہوتے اور مٹی سے تیمم فرمالیتے میں کہتا یا رسول اللہ پانی تو آپ سے یہاں قریب ہی موجود ہے تو آپ فرمادیتے کیا خبر ہے شاید میں پانی تک پہنچ نہ سکوں (اور اس سے قبل ہی موت آجائے) (شرح السنۃ)

۱۱۲۰۔ عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمارے گھر سے گزر ہوا اس وقت میں اور میری والدہ گھر کی لیپ پوت اور مرمت کرنے میں مشغول تھے۔ آپ نے فرمایا عبداللہ یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے عرض کی کچھ مرمت کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہیں حکم ربی اس سے پہلے تیزی کے ساتھ

۱۱۲۰۔ یہ تینوں حدیثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے عالم آخرت کا استحضار اور دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی انسان کے سامنے یہ نقشہ ہمہ وقت مستحضر رہے تو کیا اس کی توجہ معصیت کی طرف ہوسکتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی شان اپنی مقدس فطرت، اپنی قلبی کیفیات، ملائکۃ اللہ کی ہمہ وقت مصاحبت، اور سب سے بڑھ کر

ذٰلِكَ. رواه احمد والترمذی وقال هٰذا حديث غريب۔

الرسول العظيم وكون الدنيا أهون عنده من جناح بعوضة

١١٢١- عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِجَدْيٍ أَسَكَّ مَيِّتٍ قَالَ اَيُّكُمْ يُحِبُّ اَنَّ هٰذَا لَهٗ بِدِرْهَمٍ فَقَالُوْا مَا نُحِبُّ اَنَّهٗ لَنَا بِشَيْءٍ قَالَ فَوَاللّٰهِ لَلدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ. رواه مسلم

١١٢٢- عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً. رواه احمد والترمذی وابن ماجة

نہ آجائے۔ (احمد۔ ترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک نظر میں متاعِ دُنیا کی حقیقت

١١٢١- جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مردار بکری کے بچہ کے پاس سے گزرے جس کے ناک وکان بھی کٹے ہوئے تھے آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی جو اس کو ایک درہم میں لینا قبول کرے۔ لوگوں نے کہا ہمیں تو یہ مفت لینا بھی پسند نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ بخدا جتنا یہ مردار بچہ تم کو ذلیل نظر آرہا ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے ساری دنیا اس سے زیادہ ذلیل ہے۔ (مسلم)

١١٢٢- سہل بن سعد کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں دنیا کی قدر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو وہ اس کا ایک گھونٹ بھی نہ چکھاتا۔ (ترمذی وغیرہ)

حق تعالیٰ کے ساتھ شرفِ مکالمہ اور تجلیات ربانیہ کی وجہ اس قسم کے تمام نقائص سے برتر و بالا ہوتی ہے جن کے لیے غفلت و کدورت کا ہونا لازم ہے جہاں غافل آکر ہشیار ہو جائیں وہاں بھلا اس قسم کے تصورات کیا ممکن۔

١١٢١- ہمارے دور کے مفکرین کی مرعوبیت کا عالم بھی ترس کھانے کے قابل ہے کہ وہ بیچارے ہر اس بات کے اظہار کرنے سے خائف رہتے ہیں جو موجودہ زمانہ کے ذرا بھی مذاق کے خلاف ہو خواہ وہ کتنی ہی سچی سے سچی بات ہو بیشک متاعِ دنیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں انتہا درجہ ذلیل تھی اور دنیا کی حقیقت بھی یہی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جب انسان خود اسی دنیا میں موجود ہے تو وہ اس دنیا سے بالکل مستغنی ہے نہیں نہیں وہ اس کے طلب کا مامور ہے مگر حرام ذرائع سے نہیں حلال ذرائع سے دارِ آخرت پر ترجیح دے کر نہیں بلکہ متاع کاسد سمجھ کر۔ اس سبق کا حاصل دنیوی ترقیات سے روکنا نہیں بلکہ ایک لازوال ملک سے غفلت کو روکنا ہے۔

١١٢٢- کافروں پر دنیا کی وسعت دیکھ کر آپ تو خدا تعالیٰ کی نظر میں ان کے قرب کا وسوسہ لاتے ہیں۔ اور حدیث یہ کہتی ہے کہ اس وسعت کا سبب کافر کی قدر و منزلت نہیں بلکہ خود متاعِ دنیا کی بے قدری و ذلت ہے۔

انسان کمزور ہے اور بیک وقت وہ دو کی محبت نباہ نہیں سکتا۔ تجربہ کر لیجیے جو دنیا کے پیچھے لگ گئے آخرت میں (باقی برصفحہ ۳۹۱)

۱۱۲۳- عَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ وَاللّٰہِ مَا الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا مِثْلُ مَا یَجْعَلُ اَحَدُکُمْ اِصْبَعَہٗ فِی الْیَمِّ فَلْیَنْظُرْ بِمَ یَرْجِعُ (رواہ مسلم)

۱۱۲۴- عَنْ عَائِشَۃَ اَنَّھَا قَالَتْ کَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عِنْدِیْ فِیْ مَرَضِہٖ سِتَّۃُ دَنَانِیْرَ اَوْ سَبْعَۃٌ فَاَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ اُفَرِّقَھَا فَشَغَلَنِیْ وَجَعُ نَبِیِّ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ سَاَلَنِیْ عَنْھَا مَا فَعَلَتِ السِّتَّۃُ اَوِ السَّبْعَۃُ قُلْتُ لَا وَاللّٰہِ لَقَدْ کَانَ شَغَلَنِیْ وَجَعُکَ فَدَعَا بِھَا ثُمَّ وَضَعَھَا فِیْ کَفِّہٖ فَقَالَ مَا ظَنُّ نَبِیِّ اللّٰہِ لَوْ لَقِیَ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ وَھٰذِہٖ عِنْدَہٗ. رواہ احمد

۱۱۲۳- مستورد بن شداد بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے بخدا دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں اتنی بھی نہیں جتنا کہ تم اگر سمندر میں انگلی ڈالو پھر دیکھو کہ اس میں کتنا پانی لگا ہے۔ (مسلم)

۱۱۲۴- حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کے مرض الوفات میں میرے پاس آپ کے چھ یا سات دینار امانت کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ میں ان کو تقسیم کردوں، مگر آپ کی بیماری میں مجھ کو اس کا خیال نہ رہا۔ آپ نے ایک بار پھر پوچھا وہ چھ یا سات دینار تقسیم ہوگئے یا نہیں۔ میں نے عرض کی، خدا کی قسم تقسیم نہیں ہوسکے اور صرف آپ کی علالت کی فکر کی وجہ سے مجھ سے یہ غفلت ہوگئی۔ آپ نے ان دیناروں کو منگا کر اپنے ہاتھ پر رکھا اور فرمایا۔ اللہ کے اس نبی کے متعلق کیا گمان ہو جس کی اپنے رب سے ملاقات کا اگر وقت آگیا ہو تو وہ اس حالت میں جائے کہ یہ دینار اس کے پاس موجود ہوں۔

(احمد)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۹۰) ان کی جد و جہد کیا رہ گئی اور جو آخرت کے طالب بن گئے دنیا کے لیے ان کی مساعی کتنی سست پڑ گئیں شانِ جامعیت علیحدہ چیز ہے لیکن اگر ان دو میں کسی ایک ہی کو اختیار کرنا ہے تو پھر آپ ہی فیصلہ فرمالیجئے بہتر کیا ہوگا؟

۱۱۲۴- ان جملہ احادیث کا منشأ یہ ہے کہ جس دنیا میں انسان خود پیدا ہوتا ہے، جس کے تمام علائق اسی کے ساتھ وابستہ ہیں، اس کے نقصانات و منافع اور تکالیف و لذتوں سے وہ ہر وقت آشنا ہے اور اس کی ضرورت اپنی زندگی کے گوشہ گوشہ میں محسوس کررہا ہے وہاں احساسات میں پڑ کر کہیں اس آخرت کو بھول نہ جائے جس میں اس کو ہمیشہ رہنا ہے مگر اس کے نفع نقصان سے وہ ابھی تک آشنا نہیں اور نہ ابھی تک اس کی ضرورت اپنی زندگی کے کسی گوشہ میں محسوس کرتا ہو بس ایک محسوس مگر عارضی زندگی اور ایک غیر محسوس مگر دائمی زندگی پر تنبیہ کے لیے یہ مختلف تعبیریں ہیں اور اسی کے لیے مختلف پیرایۂ بیان ہیں۔ دنیا کے متعلق جن کا عقیدہ یہ تھا وہ تو دنیا کے فاتح بن چکے اور جن کا عقیدہ اس کے برعکس ہو وہ آج خود دنیا کے مفتوح ہیں۔ اس پر ان کو گمان یہ ہے کہ وہ دنیا کے فاتح ہیں۔ اکبر مرحوم کہتے ہیں:۔

فخر کیا ہے جو بدلا ہے زمانہ نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں!

۱۱۲۵۔ عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَرَضَ عَلَیَّ رَبِّیْ لِیَجْعَلَ لِیْ بَطْحَاءَ مَکَّۃَ ذَھَبًا فَقُلْتُ لَا یَا رَبِّ وَلٰکِنْ اَشْبَعُ یَوْمًا وَّاَجُوْعُ یَوْمًا فَاِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ اِلَیْکَ وَذَکَرْتُکَ وَاِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُکَ وَشَکَرْتُکَ۔ رواہ احمد والترمذی

۱۱۲۶۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ کَانَ لِیْ مِثْلُ اُحُدٍ ذَھَبًا لَسَرَّنِیْ اَنْ لَّا یَمُرَّ عَلَیَّ ثَلَاثُ لَیَالٍ وَّعِنْدِیْ مِنْہُ شَیْءٌ اِلَّا شَیْءٌ اُرْصِدُہٗ لِدَیْنٍ۔ رواہ البخاری وعند الدارمی نحوہ عن ابی ذر۔

۱۱۲۷۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَامَ عَلٰی حَصِیْرٍ فَقَامَ وَقَدْ اَثَّرَ فِیْ جَسَدِہٖ فَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ اَمَرْتَنَا اَنْ نَّبْسُطَ لَکَ وَنَعْمَلَ فَقَالَ مَالِیْ وَلِلدُّنْیَا

۱۱۲۵۔ ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حق تعالیٰ نے مکہ کرمہ کے اس پتھریلے میدان کو میرے سامنے کرکے مجھ کو یہ اختیار دیا تھا اگر میں پسند کروں تو وہ اپنی قدرت سے اس کو سونا بنا دے میں نے عرض کی پروردگار! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن شکم سیر رہوں تو ایک دن بھوکا بھی رہوں۔ جب بھوکا ہوں تو تیرے سامنے گریہ وزاری کروں اور تیری یاد کروں اور جب شکم سیر ہوں تو تیری حمد وثنا کروں اور تیرا شکر بجالاؤں۔ (احمد وترمذی)

۱۱۲۶۔ ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کی برابر بھی سونا ہوتا تو بھی میری خوشی اسی میں ہوتی کہ تین راتیں بھی نہ گزرنے پائیں کہ اس میں سے کچھ بھی میرے پاس باقی رہ جائے۔ ہاں صرف اتنی مقدار جتنی کہ میں اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے رکھ لوں۔ (بخاری شریف)

۱۱۲۷۔ ابن مسعودؓ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار چٹائی پر سوئے، جب آپ اُٹھے تو آپؐ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات پڑ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر ابن مسعودؓ بولے یا رسول اللہ اجازت ہو تو ہم آپ کے لیے ایک بچھونا تیار کر لیں۔ آپؐ نے فرمایا مجھے دنیا سے کیا کام

۱۱۲۵۔ انبیاء علیہم السلام کی بلند نظریں دنیا کی متاعِ خسیس کی طرف کبھی نہیں اُٹھتیں۔ ان کے نزدیک ساری دنیا کی قدر وقیمت ایک مچھر کے پر کی برابر بھی نہیں ہوتی اُن کے یہاں قیمت کل تضرع اور ذکر اللہ کی ہے اس کی حمد وثنا اور اس کے شکر کی ہے وہ انسان کی ضعیف خلقت سے پورے خبردار ہوتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ بھوک کی برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہمیشہ شکم سیری کے خطرناک عواقب سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس لیے ایک طرف بھوکوں کے ساتھ بھوکا رہنے کی دعا تو کرتے ہیں مگر وہ بھوکا نہیں جو بھوک میں اپنے مالک کی یاد اور اس کے سامنے تضرع والحاح کو فراموش کر بیٹھے اور دوسری طرف شکم سیروں میں شکم سیر ہونے کی دعا بھی فرماتے ہیں، مگر وہ شکم سیر نہیں جو پیٹ بھر جانے کے بعد بھی اپنے مالک کی حمد وثنا اور اس کے شکر سے غافل ہو جائے۔ اس طرح کی بھوک اگر ہو تو وہ بھی نبوت کی وراثت ہے اور اس طرح کی شکم سیری اگر ہو تو وہ بھی اسوۂ نبوت ہے۔ جب تک انسان ساری دنیا سے بے نیاز نہ ہو جائے وہ افراط وتفریط کے ان حالات میں خدا کی یاد کبھی قائم نہیں رکھ سکتا۔

وَمَا أَنَا وَالدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ ورواہ الطیالسی باسناد صحیح۔

۱۱۲۸۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ أَخَذَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَعْضِ جَسَدِي فَقَالَ كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ وَعُدَّ نَفْسَكَ فِي أَهْلِ الْقُبُوْرِ۔ رواہ البخاری

الرسول العظیم وابتعادہ عن الآثام

۱۱۲۹۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا فَإِنْ كَانَ إِثْمًا كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهٖ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا أَنْ يُنْتَهَكَ حُرْمَةُ اللّٰهِ فَيَنْتَقِمُ لِلّٰهِ بِهَا۔ متفق علیہ

۱۱۳۰۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا ضَرَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهٖ شَيْئًا قَطُّ بِيَدِهٖ

میری اور دنیا کی مثال بس اس مسافر سوار کی سی ہے جو درخت کے سایہ کے نیچے ذرا سی دیر بیٹھے پھر اس کو چھوڑ کر چل دیئے۔ (احمد، ترمذی۔ ابن ماجہ۔ ابو داؤد، طیالسی)

۱۱۲۸۔ ابن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم کا بعض حصہ (شفقت کے انداز میں) پکڑ کر فرمایا دنیا میں اس طرح بسر کرو جیسے تم ایک مسافر ہو اور مسافر بھی وہ جو منزل طے کر رہا ہو اور اپنے نفس کو ایسا سمجھو جیسے قبر کا مردہ (بخاری شریف)

خوفِ گناہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی نفرت و بیزاری

۱۱۲۹۔ حضرت عائشہ محترمہ فرماتی ہیں کہ جب کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا اختیار دیا گیا ہے تو امت کی سہولت کی خاطر آپ اسی کو اختیار فرماتے جو دونوں میں آسان تر ہوتی مگر جب کہیں گناہ کا معاملہ آجاتا تو پھر آپ سے بڑھ کر کوئی شخص نہ تھا جو اس سے دور دور رہنے والا ہوتا۔ آپ نے اپنے نفس کی خاطر کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، بجز اس صورت کے کہ جس میں خدائی احترام پر کوئی زد پڑتی ہو۔ پھر تو اللہ تعالیٰ کے احترام کی خاطر آپ اس کا انتقام لے کر رہتے تھے۔ (متفق علیہ)

۱۱۳۰۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی غرض کے لیے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو

۱۱۲۸۔ ان واقعات سے یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ جن کے قلوب میں خشیت الٰہی اس درجہ ہو جس کا نقشہ احادیث مذکورہ میں آپ نے ملاحظہ فرمایا اور جن کے قلوب میں دنیا کی بے ثباتی اس درجہ ہو جو آپ کے سامنے ہے کہ ان میں معصیت کا داعیہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

وَلَا امْرَأَةً وَلَا خَادِمًا اِلَّا اَنْ یُّجَاهِدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَا نِیْلَ مِنْہُ شَیْءٌ قَطُّ فَیَنْتَقِمُ مِنْ صَاحِبِہٖ اِلَّا اَنْ یُّنْتَہَکَ شَیْءٌ مِّنْ مَحَارِمِ اللّٰہِ فَیَنْتَقِمُ لِلّٰہِ۔ رواہ مسلم

۱۳۱۱۔ عَنْ سَعْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ لَمَّا کَانَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ اٰمَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ النَّاسَ اِلَّا اَرْبَعَۃَ نَفَرٍ وَامْرَأَتَیْنِ وَقَالَ اُقْتُلُوْھُمْ وَاِنْ وَجَدْتُّمُوْھُمْ مُتَعَلِّقِیْنَ بِاَسْتَارِ الْکَعْبَۃِ مِنْھُمْ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ سَرْحٍ فَاخْتَبَأَ عِنْدَ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ فَلَمَّا دَعَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ النَّاسَ اِلَی الْبَیْعَۃِ جَاءَ بِہٖ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ بَایِعْ عَبْدَ اللّٰہِ فَرَفَعَ رَأْسَہٗ فَنَظَرَ اِلَیْہِ ثَلٰثًا کُلُّ ذٰلِکَ یَاْبٰی فَبَایَعَہٗ ثُمَّ بَایَعَہٗ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلٰی اَصْحَابِہٖ فَقَالَ اَمَا کَانَ فِیْکُمْ رَجُلٌ رَشِیْدٌ یَّقُوْمُ اِلٰی ھٰذَا حِیْنَ رَاٰنِیْ کَفَفْتُ یَدِیْ عَنْ بَیْعَتِہٖ فَیَقْتُلُہٗ،

تنبیہ نہیں فرمائی نہ کبھی کسی عورت کو اپنے ہاتھ سے مارا اور نہ کسی خادم کو مگر ہاں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو جہاد کیے ہیں وہ بات الگ ہے۔ اسی طرح ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ آپ کو ایذا دی گئی ہو پھر آپ نے اس ایذا دینے والے شخص سے اس کا بدلہ لیا ہو۔ بجز اس صورت کے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کے خلاف کوئی بات ہو تو پھر آپ ناموس حدود اللہ کی خاطر اس کا انتقام لیتے۔ (مسلم شریف)

۱۳۱۱۔ سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجز چار شخصوں اور دو عورتوں کے سب کے لیے امن عام کا اعلان فرما دیا تھا اور صرف چند لوگوں کے متعلق یہ حکم دیا تھا کہ ان کو تو قتل ہی کرنا اگرچہ وہ تم کو کعبہ کے پردے پکڑے ہوئے بھی ملیں۔ ان میں سے ایک شخص عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح تھا۔ حضرت عثمان کے پاس آکر چھپ گیا تھا۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کرنے کے لیے بلایا تو حضرت عثمانؓ خود اس کو لے کر آئے اور عرض کی یا رسول اللہ عبد اللہ کو بھی بیعت فرما لیجیے۔ آپ نے اپنا سر مبارک اوپر اٹھا کر اس کو تین بار دیکھا ہر بار بیعت کے لیے انکار ہی فرماتے رہے اس کے بعد اس کو بھی بیعت فرما لیا پھر اپنے صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا تم میں کوئی ایسا سمجھدار شخص نہ تھا کہ جب اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں اس کے بیعت کرنے سے اپنا ہاتھ کھینچ رہا ہوں تو اٹھتا اور اس کو

۱۳۱۱۔ فتح مکہ میں دشمن سے دشمن کی بھی بخشش ہو گئی لیکن صرف ان معدودے چند اشخاص کی جن کی پیہم ایذا رسانیوں ذہانت اور خست طبع سے اس کی کوئی امید نہ تھی کہ آئندہ وہ اسلام کے ساتھ آشتی کا ادنیٰ سا برتاؤ بھی کر سکیں گے۔ ان میں ایک شخص عبد اللہ بن ابی السرح بھی تھا جس کا کام ہجو اور خبیث افعال و حرکات کے آپ کی ہجو کرنا بھی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ آج کہیں مفر کی صورت نہیں ہے تو حضرت عثمان غنیؓ کی آ کر پناہ لی۔ یہ قدیم سے مجسمہ اخلاق تھے اپنے گھر میں پناہ لینے والے کو کیسے نکال باہر کرتے، اس پر یہ ان کا رضاعی بھائی بھی تھا اس لیے اس کی سفارش پر مجبور ہو گئے۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کو عثمان غنیؓ جیسے شخص سفارش کے لیے کر آئیں اور آپ ان کو صاف جواب دیدیں۔ لہذا آپ نے تو صاف انکار کرنا

فقالوا ما یدرینا یا رسول اللہ ما فی نفسک ھلا اومأت الینا بعینک قال انہ لا ینبغی لنبی ان یکون لہ خائنۃ الاعین. قال الحافظ ابن تیمیۃؒ رواہ ابو داؤد باسناد صحیح والنسائی کذلک وکان ابن ابی السرح اخا عثمان من الرضاعۃ کذا فی الصارم المسلول ص۱۰۸

الرسول العظیم وحجبہ بانہ لا یکون علیہ مظلمۃ لاحد یوم القیامۃ وانہ لا کرب علیہ بعد وفاتہ

۱۱۳۲- عن انس قال غلا السعر علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالوا یا رسول اللہ سعر لنا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ ھو المسعر القابض الباسط الرازق و

قتل کر دیا۔ صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ہمیں کیا علم تھا، آپ کی مرضی کیا ہے آپ نے اپنی آنکھ کا ذرا سا اشارہ کر دیا ہوتا۔ آپ نے فرمایا کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ اس کی آنکھ بھی خیانت کرنے والی ہو (ابو داؤد، نسائی، ابن مردویہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جزم ویقین کہ آخرت میں آپ سے کوئی مؤاخذہ نہیں

۱۱۳۲- انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک بار اشیاء کے نرخ بہت چڑھ گئے۔ اس پر لوگوں نے آپ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی یا رسول اللہ آپ اپنی جانب سے نرخ مقرر فرما دیجیے۔ آپ نے فرمایا نرخ کا چڑھنا اُترنا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے وہی رازق ہے اور

پسند فرماتے تھے اور نہ اپنی زبان سے امن کا لفظ نکال کر پھر اس کے قتل کا حکم دے سکتے تھے اس لیے کچھ دیر توقف سے کام لیتے رہے تاکہ اگر کوئی شخص سابق حکم کے ماتحت اس کو قتل کر دے تو آپ کو حضرت عثمانؓ کی سفارش رد کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ لیکن اس میں آپ اور زیادہ توقف نہ فرما سکے۔ آخر اس کو بیعت فرما لیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کاش تم لوگ میرے اس توقف سے کچھ فائدہ اٹھا لیتے صحابہؓ کا جواب آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اب اندازہ فرمائیے کہ ایک واجب القتل شخص کے قتل کے متعلق اگر آپ صرف ذرا سا اشارہ فرما دیتے تو کیا یہ کسی معصیت کی تعریف میں آتا مگر جب آپ نے اتنی سی بات بھی گوارا نہ فرمائی اور وہ بھی اس عنوان سے کہ یہ نبی کی شان نہیں کہ وہ آنکھ کا بھی کوئی ایسا اشارہ کر سکے جو صورۃً بھی خیانت شمار ہو تو کیا پھر کھلی معصیت کرنی خواہ صغیرہ ہی کیوں نہ ہو نبی کی شان ہوگی (العیاذ باللہ)

۱۱۳۲- پہلے زمانہ میں نرخ کا اتار چڑھاؤ تاجروں کے ہتھکنڈوں سے نہ ہوتا تھا بلکہ اشیاء کی باہر سے آمد اور پیداوار کی قلت و کثرت سے ہوا کرتا تھا۔ ادھر شریعت مطہرہ نے اس کا بندوبست پہلے سے خود فرما رکھا تھا کہ بے وجہ اشیاء کے نرخ نہ چڑھیں تاجروں کو باہر سے باہر اشیاء خرید کر لینے کی ممانعت تھی۔ کھانے کی اشیاء اکٹھی خرید کر دبا لینی پھر ان کو گراں قیمت پر فروخت کرنے پر سخت وعید فرما دی گئی تھی اسی طرح ان جملہ صورتوں کا سدباب کر دیا گیا تھا جن سے اہل شہر پر کسی تجارتی چکر سے گرانی کا خطرہ ہو سکتا تھا اب اگر قدرتی گرانی پر بھی قیمت پر کوئی سرکاری کنٹرول کر دیا جاتا تو یقینی اس میں ایک طبقہ کی حق تلفی کا اندیشہ تھا۔ اس لیے آپ نے اس کو پسند نہیں فرمایا کیونکہ بظاہر اس میں گو عوام کی بہبودی معلوم ہوتی تھی لیکن ایک فرقہ کے لیے یہ مضرت رسانی کا

إِنِّي لَأَرْجُوْ أَنْ أَلْقَى رَبِّي وَلَيْسَ أَحَدٌ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلَمَةٍ بِدَمٍ وَلَا مَالٍ رواه ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والدارمی۔

۱۳۳۱۔ عَنْ أَنَسٍ قَالَ لَمَّا ثَقُلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَعَلَ يَتَغَشَّاهُ الْكَرْبُ فَقَالَتْ فَاطِمَةُ وَاكَرْبَ أَبَاهُ فَقَالَ لَهَا لَيْسَ عَلَى أَبِيْكِ كَرْبٌ بَعْدَ الْيَوْمِ فَلَمَّا مَاتَ قَالَتْ يَا أَبَتَاهُ أَجَابَ رَبًّا دَعَاهُ يَا أَبَتَاهُ مَنْ جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ مَأْوَاهُ يَا أَبَتَاهُ إِلَى جِبْرَئِيْلَ نَنْعَاهُ فَلَمَّا دُفِنَ قَالَتْ فَاطِمَةُ يَا أَنَسُ أَطَابَتْ أَنْفُسُكُمْ أَنْ تَحْثُوْا عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ التُّرَابَ۔ رواہ البخاری۔

رزق کا تنگ، فراخ کرنے والا بھی وہی ہے مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے پوری اُمید ہے کہ میں اپنے پروردگار کے روبرو اس شان سے حاضر ہونگا کہ تم میں ایک شخص بھی اپنے خون یا مال کے ادنیٰ سے معاملہ کا بھی مجھ سے مطالبہ کرنے والا نہ ہوگا۔ (ابوداؤد وغیرہ)

۱۳۳۱۔ انسؓ بیان کرتے ہیں کہ آخر میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرض کی شدت اور بےچینی بہت بڑھ گئی تو حضرت فاطمہؓ نے فرمایا میرے والد کو کیسی تکلیف ہے آپ نے فرمایا تمہارے والد کو جو تکلیف بھی ہے وہ صرف آج کے دن تک ہے اس کے بعد پھر کوئی تکلیف نہیں۔ اور جب آپ کی وفات ہوگئی تو شدت غم میں ان کی زبان سے یہ کلمات نکلے اے والد بزرگوار وہ کہ جنہوں نے اپنے رب کی دعوت قبول فرمالی وہ کہ جن کا مقام جنت الفردوس بن چکا اے والد بزرگوار آپ کا یہ المناک حادثہ ہم جبرئیل علیہ السلام کو سُناتے ہیں پھر جب آپ دفن ہو چکے تو حضرت فاطمہؓ نے شدت غم سے فرمایا۔ انس تمہارے دلوں نے یہ کس طرح گوارا کرلیا کہ تم نے اپنے ہاتھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو مٹی دی۔ (بخاری شریف)

مر جب بھی ہوسکتا تھا اور نبی کی عصمت اس کو گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کی ذات سے کسی نفس کا بال برابر بھی کوئی نقصان ہو اس تنبیہ کے بعد آپ کی پوری شان تواضع کے ساتھ آپ کا یہ جملہ کتنا پر از عظمت جملہ تھا کہ مجھ کو یقین ہے کہ قیامت میں میرے ذمہ کسی کا کوئی حق نہ ہوگا یہ کون ہیں وہ جن کا تعلق ہر ہر فرد اُمت کے ساتھ وابستہ ہے پھر کس عموم و اطلاق کے ساتھ حقوق العباد سے اپنی عصمت کا اعلان فرما رہے ہیں۔ جہاں حقوق العباد اتنے صاف ہوں وہاں حقوق اللہ کی صفائی کا پوچھنا ہی کیا ہے عصمت کے بغیر کیا یہ جملے زبان سے ادا ہوسکتے ہیں۔

۱۳۳۱۔ اس حدیث میں بھی آپ نے پورے جزم و وثوق کے ساتھ فرمایا ہے کہ آخرت میں آپ سے کسی امر میں کوئی گرفت نہ ہوگی۔ کیا علی الاطلاق عصمت کے بغیر یہ ممکن ہے اب اگر اس پر بھی عصمت کے خلاف منطقی احتمالات نکالنے ہیں تو لوگوں نے دلائل توحید کے خلاف احتمالات نکالنے میں بھی کیا کوتاہی کی ہے آپ کی ازل سے آخر تک زندگی پر نظر ڈالیے آپ کی صفات و ملکات پر نظر ڈالیے آپ کی خدا ترسی اور دنیا سے بے رغبتی پر نظر ڈالیے اس کے بعد آپ کے ان جملوں پر بھی نظر ڈالیے جو اس عالم کے متعلق ہیں جہاں کسی کو اپنے متعلق اطمینان بخش ایک حرف نکالنا بھی مشکل ہے تو صرف یہی نتیجہ نکلیگا کہ آپ معصوم ہیں۔ آپ معصوم ہیں۔

۱۱۳۴۔ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا تَعْنِي قَصِيْرَةً فَقَالَ لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ۔ رواہ احمد والترمذی وابو داؤد

۱۱۳۵۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اُحِبُّ اَنِّيْ حَكَيْتُ اَحَدًا وَاَنَّ لِيْ كَذَا وَكَذَا۔ رواہ الترمذی وصححہ

۱۱۳۶۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ بَلَغَ صَفِيَّةَ قَالَتْ بِنْتُ يَهُوْدِيٍّ فَبَكَتْ فَدَخَلَ عَلَيْهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهِيَ تَبْكِيْ فَقَالَ مَا يُبْكِيْكِ فَقَالَتْ قَالَتْ لِيْ حَفْصَةُ اِنِّيْ اِبْنَةُ يَهُوْدِيٍّ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكِ لَابْنَةُ نَبِيٍّ وَاِنَّ عَمَّكِ لَنَبِيٌّ وَاِنَّكِ لَتَحْتَ نَبِيٍّ فَفِيْمَ تَفْخَرُ

۱۱۳۴۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک موقعہ پر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ کا اشارہ کرکے کہا آپ کو بس بس وہی صفیہ کافی ہیں یعنی جو پستہ قد ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا تم نے ایسا کلمہ منہ سے نکالا ہے اگر اس کو سمندر میں ملا دیا جائے تو باوجودیکہ اس کا پانی سخت بدمزہ ہوتا ہے مگر وہ اس کا مزہ بھی بدل دے۔ احمد۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔

۱۱۳۵۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے کسی کی نقل اُتارنا پسند نہیں اگرچہ اس کے مقابلہ میں میرے لیے بڑی سے بڑی بھی کوئی چیز ہو۔ (ترمذی)

۱۱۳۶۔ انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت صفیہؓ کو خبر پہنچی کہ حضرت حفصہؓ ان کے متعلق "دختر یہودی" کا لفظ کہتی ہیں۔ اس پر وہ رونے لگیں حسب الاتفاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے تو اس وقت وہ رو رہی تھیں۔ فرمایا کیوں روتی ہو؟ اُنھوں نے عرض کی اس لیے کہ حفصہؓ مجھے یہودی کی لڑکی کہتی ہیں۔ آپ نے فرمایا تم تو نبی کی اولاد میں ہو اور تمہارے چچا بھی ایک نبی تھے اور اب تم ایک نبی کی بی بی ہو۔ پھر حفصہ اگر تمہارے

۱۱۳۶۔ کسی شخص کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا سب سے سچا معیار اس کی اندرونی زندگی ہوتی ہے اور اس میں بھی بیبیوں کا معاملہ بھی سب سے اہم ہے یہاں بشری فطرت اپنی طبعی مناسبت کی وجہ سے کبھی کسی کی طرف زیادہ میلان بھی رکھ سکتی ہے اور اتنی بات پر اس کو ملامت بھی نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ یہ بات انسان کے اختیار کی نہیں ہوتی پھر اس میلان کے اثرات باہم معاملات میں بھی نظر آنے ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ بس یہاں پہنچ کر ہی عام بشر کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں لیکن جب کسی نبی کی اندرونی زندگی دیکھی جائے تو ان معاملات میں بھی وہ اتنی ہی صاف نظر آتی ہے جتنی کہ اس کے بیرونی معاملات میں۔ حضرت عائشہؓ بیشک ازواج مطہرات میں سب سے بلند مقام رکھتی تھیں مگر جب حضرت صفیہؓ کے متعلق ان کی زبان سے ذرا سا ایک کلمہ وہ بھی طبعی غیرت میں مُنہ سے نکلا تو آپ نے فوراً اس پر تنبیہ فرمائی اسی طرح حضرت حفصہؓ اگرچہ عمر فاروقؓ جیسے رفیق کی صاحبزادی سہی لیکن ان کے ایک صحیح کلمہ کو بھی آپ نے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا کیونکہ اس کی غایت وغرض بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ پھر اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ اسی مکروہ کلمہ کی ایسی اصلاح فرمادی کہ جو کلمہ پہلے حقارت کا باعث تھا اب وہی قابل فخر نظر آنے لگا۔ اس کے بعد نہ تحقیر کرنے والا اس کو دُہرا سکتا تھا اور نہ سُننے والا

عَلَيْكِ ثُمَّ قَالَ اِتَّقِي اللّٰهَ يَا حَفْصَةُ. (رواه الترمذي والنسائي)

۱۱۳۷ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا غِرْتُ عَلٰى اَحَدٍ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا غِرْتُ عَلٰى خَدِيْجَةَ وَمَا رَأَيْتُهَا وَلٰكِنْ كَانَ يُكْثِرُ ذِكْرَهَا وَرُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ ثُمَّ يُقَطِّعُهَا اَعْضَاءً ثُمَّ يَبْعَثُهَا فِي صَدَائِقِ خَدِيْجَةَ فَرُبَّمَا قُلْتُ لَهٗ كَاَنَّهٗ لَمْ تَكُنْ فِي الدُّنْيَا امْرَأَةٌ اِلَّا خَدِيْجَةُ فَيَقُوْلُ اِنَّهَا

مقابلہ پر فخر کرتی ہیں تو آخر کس بات پر؟ اس کے بعد حضرت حفصہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا حفصہ! اللہ سے ڈرو۔ (ترمذی۔ نسائی)

۱۱۳۷۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جتنی غیرت مجھ کو حضرت خدیجہؓ پر آیا کرتی تھی اتنی آپ کی بیبیوں میں کسی پر بھی نہ آتی تھی حالانکہ مجھے ان کے دیکھنے کی نوبت کہاں آئی تھی (ان کا تو مجھ سے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا) بات یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور جب کبھی بکری ذبح کرنے کی نوبت آتی تو اس کی بوٹیاں بنوا کر ان کی سہیلیوں کے پاس بھی بھیجا کرتے تھے۔ میں اس وقت کبھی شدت غیرت سے یہ کہہ بیٹھتی کہ آپ تو ان کا ذکر ہر وقت اس طرح رکھتے ہیں جیسے دنیا میں (حضرت) خدیجہؓ کے علاوہ کوئی اور عورت ہی نہیں تو آپ یہ

اس کا برا مان سکتا تھا یہ ہے نبی کی اندرونی زندگی۔ آپ کی ازواج میں ام حبیبہؓ بھی شامل تھیں جن کے والد اس وقت تک آپ کے دشمنوں کی صف میں تھے اور حضرت صفیہؓ بھی اس شرف سے مشرف ہو چکی تھیں اور وہ بھی اپنے والد، چچا اور شوہر کے قتل کا زخم کھائے بیٹھی تھیں لیکن اس کے باوجود کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ آپ کی اندرونی زندگی کے متعلق ان شریف اور غیور عورتوں کی زبانوں سے کبھی ادنیٰ سے نقص کا ایک کلمہ بھی نکلا تھا۔ بلکہ ام حبیبہؓ سے تو یہاں تک منقول ہے کہ ایک مرتبہ ان کے والد اپنے زمانۂ شرک میں آپ کے گھر تشریف لائے تو ایک بچھونا جو سامنے بچھا ہوا تھا انہوں نے فوراً ایک طرف لپیٹ کر رکھ دیا۔ ان کے والد ابوسفیان نے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا۔ کیا میں بستر کے لائق نہیں۔ فرمایا کہ یہ بستر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور آپ مشرک ہیں (مشرک کو قرآن کریم نے ناپاک کہا ہے) اب اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی ازواج پر بھی آپ کی عصمت اور آپ کے تقدس کا سکہ کس درجہ جما ہوا ہوگا۔ کثرت ازواج اسلامی تعلیمات کی اشاعت و تفہیم کے لیے کتنی اہم تھی۔ یہ بات تو جداگانہ ہے مگر یہاں اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب مختلف مزاج، مختلف حالات اور مختلف خاندانوں کی بیبیاں بھی آپ کی اندرونی پاکبازی کی سب سے بڑی شاہد ہوں تو پھر آپ کی عصمت و پاکبازی کا مسئلہ بدیہی ہونا یقینی ہے

۱۱۳۷۔ حضرت خدیجہؓ آپ کی نبوت کے ابتدائی حالات میں آپ کی پوری پوری دمسازرہ چکی تھیں اس لیے ان کی خدمات اور ان کی وفاشعاری آپ کو کبھی فراموش نہ ہوتی تھی، زندگی تک تو ہر انسان اپنے مخلصوں کی قدردانی کیا کرتا ہے لیکن جو موت کے بعد بھی یاد تازہ رکھے ایسے انسان کم ہیں۔ یہاں حضرت عائشہؓ بڑی صفائی کے ساتھ اظہار فرما رہی ہیں کہ میری زبان سے جو کلمات بھی حضرت خدیجہؓ کی شان میں نکل گئے یہ صرف ایک سوت کی طبعی غیرت تھی اس کو حسد سمجھنا غلط ہے کیونکہ میں نے تو ان کو دیکھا بھی نہیں تھا مگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے طور طریق سے چونکہ ان کے ساتھ محبت و تعلق کے کلمات برابر سنتی بس وہی میری غیرت کو برانگیختہ کر دیتے تھے۔ مگر دیکھیے کیا حضرت عائشہؓ کی خاطر آپ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر سکوت فرما سکے۔ اور کیا یہاں بھی ایک ایسی بات نہ فرما دی جس کے بعد حضرت عائشہؓ دوسری بار اس کا ذکر نکال ہی نہیں سکتی تھیں، یعنی ان کا صاحب اولاد ہونا۔ عورتوں میں لاولد ہونا آج بھی موجب نقص گنا جاتا ہے۔ طبعی حالات چونکہ ایک صد

كَانَتْ وَكَانَتْ وَكَانَ لِيْ مِنْهَا وَلَدٌ. متفق عَلَيْهِ وَرَاجِعْ حديث الصحفة وحديث التخيير من ترجمان السنة ص

۱۱۳۸- عَنْ أُسَيْدِ بْنِ حُضَيْرٍ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ قَالَ بَيْنَمَا هُوَ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ وَكَانَ فِيْهِ مُزَاحٌ بَيْنَا يُضْحِكُهُمْ فَطَعَنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خَاصِرَتِهِ بِعُوْدٍ فَقَالَ اَصْبِرْنِيْ قَالَ اِصْطَبِرْ قَالَ اِنَّ عَلَيْكَ قَمِيْصًا وَلَيْسَ عَلَيَّ قَمِيْصٌ فَرَفَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَمِيْصِهٖ فَاحْتَضَنَهُ وَجَعَلَ

فرما دیتے جی ہاں بس وہ تھیں جیسی تھیں اس کو میں جانتا ہوں اور بڑی بات یہ ہے کہ میری اولاد بھی اُن سے ہی تھی۔ (متفق علیہ)

۱۱۳۸- اسید بن حضیر سے روایت ہے کہ ایک انصاری صحابی نے جن کے مزاج میں ظرافت تھی اپنے سلسلۂ گفتگو میں بیان کیا کہ اس اثنار میں جبکہ وہ لوگوں کو ہنسا رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لکڑی ان کی کوکھ میں ذرا چھو دی اُنھوں نے کہا میں تو اس کا بدلہ لونگا۔ آپ نے فوراً فرمایا اچھا لے لو۔ اُنھوں نے کہا آپ کے جسم پر تو قمیص ہے اور میرے جسم پر قمیص نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت اپنی قمیص اُٹھا دی۔ پھر کیا تھا وہ آپ کو لپٹ گئے

تک غیر اختیاری سے ہوا کرتے ہیں اس لیے جب تک اس کے خلاف بھی ایسے ہی طبعی حالات پیدا نہ ہو جائیں پورے طور پر اُن سے علیحدگی اختیار کر لینا ایک دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کے مواقع پر ایسے دوسرے حالات بھی پیدا کر دیتے تھے جن کے بعد ان کے اعادہ کرنے کی ہمت ہی نہ ہو سکے۔ یہاں دو واقعات اور بھی ملاحظہ فرما لیجیے جو ترجمان السنۃ ص $\frac{۱۹۴}{۲}$ اور ص $\frac{۹}{۲}$ و ص $\frac{۹۱}{۲}$ پر مذکور ہیں۔ تاکہ آپ کو اور روشن ہو جائے کہ روز مرہ کے بیویوں کے معاملات میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کتنی بے لاگ رہی ہے حالانکہ یہی محل جذبات کے امتحان کا سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ یہاں دس تاویل کر کے انسان کا رُخ ادھر ہی پھر جاتا ہے جس طرف کہ اس کے قلب کا رُخ ہوتا ہے مگر اس نازک امتحان میں بھی جب رسول کی فطرت کہیں ذرا نہیں ڈگمگاتی تو اندازہ فرما لیجیے کہ پھر حق تعالیٰ کی ادنیٰ سے ادنیٰ نافرمانی بھلا وہ کیا کر سکتی ہے۔

۱۱۳۸- حدیث مذکور کو ملاحظہ فرمائیے آپ کو معلوم ہو گا کہ اس اقتدار اعلیٰ پر یہ انداز بے تکلفی اور اس انداز بے تکلفی پر ایک زبردست صحابی کے طلب انتقام پر یہ انداز رضامندی یہ آپ کے عصمت نفس کی کتنی بڑی شہادت ہے ہم بارہا تنبیہ کر چکے ہیں کہ اہم مواقع پر انسان کی آزمائش بھی گو ایک بڑی آزمائش ہوتی ہے مگر یہاں فطرۃً ہر انسان اس کی کچھ نہ کچھ تیاری کر لیتا ہے مگر روزمرہ کے وہ واقعات جن کی نظروں میں نہ اس جانب کوئی اہمیت ہوتی ہے نہ اُس جانب اُن میں لغزشوں سے اس طرح محفوظ رہنا گویا نفس کی افتاد طبیعت یہی ہے، یہ انسان کی پاک نفسی کا سب سے بڑا ثبوت ہوتا ہے۔ انسان کی لغزش کا سب سے بڑا مقام حقوق العباد ہی کی گھاٹیاں ہوتی ہیں۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر گھاٹی سے اس طرح صاف نکل گئے ہیں گویا ان میں کہیں ایک کانٹا بھی نہ تھا۔ ازواج مطہرات کے خانگی معاملات آپ نے پڑھے۔ اہل ذمہ اور یہود کی سخت کلامی اور ناروا کلمات آپ نے سُنے اور پھر اب آپ کے فدا کاروں کے اس قسم کے واقعات بھی دیکھیے۔ یہ بات تو بعد میں کھلی کہ اس جاں نثار کا جذبۂ محبت کس موقعہ کا متلاشی تھا لیکن اس سے قبل صورت

يُقَبِّلُ كَشْحَهُ فَقَالَ إِنَّمَا أَرَدْتُ هٰذَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ. رواه ابوداؤد۔

الرَّسُولُ الْعَظِيمُ كَانَ أُسْوَةً حَسَنَةً لِلنَّاسِ كَافَّةً مِنَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ

۱۱۳۹۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ دِينَارٍ قَالَ سَأَلْنَا ابْنَ عُمَرَ عَنْ رَجُلٍ طَافَ بِالْبَيْتِ فِي عُمْرَةٍ وَلَمْ يَطُفْ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ سَبْعًا أَيَأْتِي امْرَأَتَهُ فَقَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَطَافَ بِالْبَيْتِ سَبْعًا وَصَلَّى خَلْفَ الْمَقَامِ رَكْعَتَيْنِ وَطَافَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ سَبْعًا وَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ

اور آپ کے پہلو کو بوسہ دیتے جاتے اور یہ کہتے جاتے یا رسول اللہ میری دیرینہ تمنا تو بس یہ تھی۔ (ابوداؤد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ نمونہ تھے

۱۱۳۹۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ ہم نے ابن عمرؓ سے ایک شخص کے متعلق فتویٰ پوچھا جس نے عمرہ کا احرام باندھ کر بیت اللہ کا طواف تو کر لیا تھا مگر ابھی صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر نہ لگائے تھے، کیا وہ اپنی بیبی کے ساتھ صحبت کر سکتا ہے۔ اس پر انہوں نے یہ جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تھے تو آپ نے بیت اللہ کے گرد سات چکر کیے اس کے بعد مقامِ ابراہیم پر آکر دو رکعتیں طواف کی ادا فرمائیں، پھر صفا و مروہ کے سات چکر لگائے اور تمہارے واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی بہترین

حال جتنی ناموزوں نظر آرہی تھی وہ ظاہر ہے مگر اول سے لے کر آخر تک کیا ممکن کہ کسی ایک مقام پر بھی آپ کا قدم جادۂ اعتدال سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہٹا ہو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ذات پاک کیا تھی بحر سکون کا ایک بے پایاں سمندر تھا جس میں کنکر پتھر تو کیا اگر پہاڑ بھی اُٹھا کر ڈال دو تو بھی اس میں ذرا جنبش نہیں ہو سکتی۔ حضرت انسؓ آپ کے دیرینہ خادم بیان کرتے ہیں کہ اس طویل مدت میں مجھے کبھی یاد نہیں آتا کہ آپ نے کسی نقصان کرنے پر کبھی مجھ کو ٹوکا ہو بلکہ اگر کسی اور شخص نے کبھی کچھ کہا ہے تو اس کو بھی یہ کہہ کر منع فرما دیا ہے۔ شدنی معاملات ہو کر رہتے ہیں انس کو کچھ نہ کہو۔

۱۱۳۹۔ اسلام میں رسول کی شخصیت کے متعلق ایک اصولی اور سب سے مقدس تصور یہ ہے کہ اس کی ذات اور اس کی ایک ایک ادا اس کی اُمت کے لیے مرضیات الٰہیہ کا نمونہ اور "اسوۂ حسنہ" بنا کر بھیجی جاتی ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خالق کی نظر میں جتنی پسندیدہ صفات ہیں وہ سب کی سب اس کی ذات میں جمع کر دی جاتی ہیں اور جتنی صفات ناپسندیدہ ہیں وہ ایک ایک کر کے اس کی ذات سے علیحدہ کر دی جاتی ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کے نمونہ کہنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ صاحب نمونہ کی پسندیدگی کا معیار رہے۔

حق تعالیٰ نے اس اُمت کو جہاں اپنی جانب سے اپنی کتاب دے کر سرفراز فرمایا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کتاب کا ایک عملی نمونہ بھی عنایت فرمایا تھا لہٰذا جس طرح اس کی کتاب ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ تھی اسی طرح اس کا نمونہ بھی ہر عیب و نقص سے مبرا ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی ذات کو کسی تفصیل کے بغیر "اسوۂ حسنہ" فرمایا اور صحابہ نے کسی حجت کے بغیر اس کو اپنا "اسوہ" بنا لیا۔ پھر جس طرح کہ اُس نے تبلیغ احکام کے لیے آپ کو اپنا رسول بنا کر خود بھیجا تھا

أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ وَقَالَ عَمْرُو بْنُ دِينَارٍ سَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ فَقَالَ لَا يَقْرَبَنَّهَا حَتّٰى يَطُوفَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ . رواه البخاري .

۲۴۰۱ - عَنْ نَافِعٍ قَالَ أَرَادَ ابْنُ عُمَرَ الْحَجَّ عَامَ حَجَّةِ الْحَرُورِيَّةِ فِي عَهْدِ ابْنِ الزُّبَيْرِ فَقِيلَ لَهُ إِنَّ النَّاسَ كَائِنٌ بَيْنَهُمْ قِتَالٌ وَنَخَافُ أَنْ يَصُدُّوكَ فَقَالَ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ إِذَنْ أَصْنَعُ كَمَا صَنَعَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُشْهِدُكُمْ أَنِّي قَدْ أَوْجَبْتُ عُمْرَةً حَتّٰى كَانَ بِظَاهِرِ الْبَيْدَاءِ قَالَ مَا شَأْنُ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ إِلَّا وَاحِدٌ أُشْهِدُ أَنِّي قَدْ جَمَعْتُ حَجَّةً مَعَ عُمْرَةٍ وَأَهْدٰى هَدْيًا مُقَلَّدًا اِشْتَرَاهُ حِينَ قَدِمَ فَطَافَ بِالْبَيْتِ وَبِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَلَمْ يَزِدْ عَلٰى ذٰلِكَ وَلَمْ يَحِلَّ عَنْ شَيْءٍ حَرُمَ مِنْهُ حَتّٰى يَوْمَ النَّحْرِ فَحَلَقَ وَنَحَرَ وَرَأَى

نمونہ ہے۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ ہم نے جابرؓ سے بھی یہی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا جب تک صفا و مروٰ کے درمیان پوری سعی سے فارغ نہ ہولے بی بی کے قریب نہ پھٹکے۔ (بخاری شریف)

۲۴۰۱ - نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ جس سال خوارج کے ساتھ جنگ تھی حضرت ابن عمرؓ نے حج کا ارادہ فرمایا یہ عبداللہ بن زبیرؓ کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ سامنے جنگ کھڑی ہے ہمیں اندیشہ ہے کہ دشمن کہیں آپ کو جانے نہ دیں۔ انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات میں تمہارے لیے بہتر نمونہ موجود ہے اگر ایسا ہوگا تو میں بھی وہی کرونگا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقعہ پر کیا تھا۔ یہ فرما کر ابن عمرؓ نے فرمایا گواہ رہو میں عمرہ کی نیت کر چکا۔ اس کے بعد جب مقام بیداء پر پہنچے تو فرمایا کہ حج اور عمرہ کا معاملہ یکساں ہی ہے لہذا میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ عمرہ کے ساتھ میں حج کی بھی نیت کیے لیتا ہوں اور جب دی آتے وقت مقام قدید سے خرید کی تھی اس کو قلادہ پہنا کر ساتھ لے چلے۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر انہوں نے بیت اللہ اور صفا و مروٰ کا طواف کیا اس کے سوا اور کچھ نہ کیا اور عید قرباں کے دن تک بدستور محرم رہے جب دسویں تاریخ ہوئی تو اب سر منڈایا اور ہدی کا جانور ذبح کیا اور ان کا

اسی طرح آپ کی ذات کو نمونہ اور "اسوۂ حسنہ" بھی خود ہی بنا کر بھیجا تھا لہذا جس طرح آپ کے علوم کی قدرت ضامن تھی اسی طرح آپ کے اعمال و افعال کی بھی قدرت ہی خود نگراں تھی اور عصمت رسول کا مفہوم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ لہذا اسوۂ حسنہ کو رسول کی عصمت کا دوسرا مدلل عنوان سمجھنا چاہیے اب اگر رسول کے کسی قول و عمل میں معصیت کی گنجایش تسلیم کر لی جائے تو دو باتوں میں سے ایک بات ماننی لازم ہوگی یا رسول کی ذات اسوہ نہ رہے یا معصیت بھی اسوہ کا جزو بن جائے اور امتوں کے حق میں معصیت کا یہ عمل بھی مذموم نہ رہے۔ کیونکہ جب وہ معصیت خود قدرت کے نمونہ میں موجود ہے تو پھر اس کی اتباع پر امت سے بازپرس کیوں ہو۔ یہ دونوں باتیں ایک لمحہ کے لیے بھی قابل تسلیم نہیں اس لیے یہی بات تسلیم کرنی ہوگی کہ رسول چونکہ معصوم ہوتا ہے اس لیے اس کے کسی عمل پر معصیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اس کا ہر ہر عمل نظر ربوبیت میں حسنہ اور نیکی شمار ہوتا ہے اور نیکی بھی وہ جس کو نمونہ کہا جا سکے۔

أَنْ قَدْ قَضَى طَوَافَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ بِطَوَافِهِ الْأَوَّلِ ثُمَّ قَالَ كَذٰلِكَ صَنَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. رواہ البخاری۔

۱۱۴۱۔ حَدَّثَنَا حَكِيمٌ أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ عَنْ رَجُلٍ نَذَرَ أَلَّا يَأْتِيَ عَلَيْهِ يَوْمٌ إِلَّا صَامَ فَوَافَقَ يَوْمَ أَضْحَى أَوْ فِطْرٍ فَقَالَ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لَمْ يَكُنْ يَصُومُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَلَا الْأَضْحَى وَلَا يَرَى صِيَامَهُمَا. رواہ البخاری۔

۱۱۴۲۔ عَنْ سَعِيدِ بْنِ جُبَيْرٍ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ فِي الْحَرَامِ يُكَفِّرُ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. رواہ البخاری۔

۱۱۴۳۔ عَنْ زِيَادِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ أَتَى عَلَى رَجُلٍ قَدْ أَنَاخَ بَدَنَتَهُ يَنْحَرُهَا قَالَ

خیال یہ تھا کہ حج وعمرہ کے لیے جو طواف ان کے ذمہ ضروری تھا وہ پہلا طواف کرکے اُنہوں نے ادا کر دیا۔ پھر اس کے بعد اُنہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ (بخاری شریف)

۱۱۴۱۔ حکیم کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ سے ایک شخص کے متعلق مسئلہ پوچھا گیا جس نے یہ نذر کرلی تھی کہ جب تک وہ زندہ رہیگا ہر سہ شنبہ یا چہارشنبہ کو روزہ رکھا کریگا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس دن عید الفطر یا عید قربان آگئی اب وہ کیا کرے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں تمہارے لیے بہتر نمونہ موجود ہے آپ نہ عید الفطر میں روزہ رکھتے تھے نہ عید قربان میں اور نہ ان دونوں دنوں میں روزہ رکھنا درست سمجھتے تھے۔ (بخاری شریف)

۱۱۴۲۔ سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے تھے اگر کوئی شخص اپنی بی بی سے "انت علی حرام" کے لفظ کہدے تو اس کو کفارہ یمین ادا کرنا چاہیے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں تمہارے لیے بہتر نمونہ ہے (بخاری شریف)

۱۱۴۳۔ زیاد بن جبیر بیان کرتے ہیں میں نے دیکھا کہ ابن عمرؓ کا گزر ایک شخص پر ہوا جو اپنے اونٹ کو بٹھا کر کر

۱۱۴۱۔ صحیح بخاری میں اس روایت کے بعد ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ کنت مع ابن عمر فسألہ رجل قال نذرت ان اصوم کل یوم ثلثاء او اربعاء۔ ہم نے اوپر کی روایت کا ترجمہ اسی روایت کی روشنی میں کیا ہے۔ اگر یہاں شارحین نے اس کو علیحدہ علیحدہ دو واقعات قرار دیے ہوں تو پھر اس روایت کا ترجمہ بدل جائیگا۔

۱۱۴۲۔ حضرت ابن عباسؓ کا مطلب یہ تھا کہ یہ الفاظ کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ صرف کفارہ یمین ادا کر دینا کافی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک واقعہ میں آپ نے شہد کے متعلق فرما دیا تھا کہ آئندہ میں شہد استعمال نہیں کرونگا تو اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذمہ کفارہ ادا کرنا ہی لازم فرمایا تھا۔

اِتِّبَعَهَا فِيمَا مُقَيَّدَةٌ سُنَّةُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ رواہ البخاری

۱۱۴۴۔ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَرَأَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا أُمِرَ وَسَكَتَ فِيمَا أُمِرَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ رواہ البخاری

۱۱۴۵۔ عَنْ اِبْنِ عُمَرَ قَالَ صَحِبْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ أَرَهُ يُسَبِّحُ فِي السَّفَرِ وَقَالَ اللهُ تَعَالَى لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ رواہ البخاری

۱۱۴۶۔ عَنْ رَجُلٍ أَنَّهُ سَأَلَ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ فَقَالَ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ إِنَّا نَجِدُ صَلٰوةَ الْخَوْفِ وَصَلٰوةَ الْحَضَرِ فِي الْقُرْاٰنِ وَلَا نَجِدُ صَلٰوةَ السَّفَرِ فَقَالَ يَا ابْنَ أَخِي إِنَّ اللهَ بَعَثَ إِلَيْنَا مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا نَعْلَمُ شَيْئًا فَإِنَّمَا نَفْعَلُ كَمَا رَأَيْنَاهُ يَفْعَلُ۔ رواہ مالک فی الموطا۔

۱۱۴۷۔ عَنْ سَعِيدِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ فِي سَفَرٍ فَتَخَلَّفْتُ عَنْهُ فَقَالَ أَيْنَ كُنْتَ

کر رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس کا گھٹنا باندھ کر کھڑا کر۔ یہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ (بخاری شریف)

۱۱۴۴۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس بات کا حکم ہوا وہ آپ نے پڑھ کر سنا دی اور جہاں خاموش رہنے کا حکم ہوا وہاں آپ خاموش رہے (اس لیے آپ کا نطق وسکوت دونوں حکم الٰہی کے ماتحت تھا) وماکان ربك نسیا (مریم)، اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی میں بہترین نمونہ ہے (لہذا بے وجہ کھود کرید مت کیا کرو) (بخاری شریف)

۱۱۴۵۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ میں سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا ہوں میں نے سفر میں آپ کو نوافل پڑھتے نہیں دیکھا اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات ہی میں بہتر نمونہ ہے۔

۱۱۴۶۔ ایک شخص نے عبداللہ بن عمر سے پوچھا اے ابوعبدالرحمن (ان کی کنیت ہے) قرآن کریم میں ہم کو صلوٰۃ الخوف کا بھی ذکر ملتا ہے اور اقامت کی حالت کا بھی ذکر ملتا ہے مگر سفر کی نماز کا ذکر نہیں ملتا۔ انہوں نے فرمایا میرے بھتیجے! اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے زمانہ میں بھیجا تھا کہ ہم کچھ بھی نہ جانتے تھے بس جیسا آپ کو کرتے دیکھا ایسا ہی ہم کر لیتے تھے۔ (مالک)

۱۱۴۷۔ سعید بن یسار کہتے ہیں کہ میں ایک سفر میں ابن عمرؓ کے ساتھ تھا۔ ایک جگہ میں ان سے ذرا پیچھے رہ گیا۔

۱۱۴۷۔ ان تمام واقعات میں صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف عمل کا ذکر کیا ہے اور ہر عمل کی اتباع کرنے کی دعوت اسی بنا پر دی ہے کہ آپ کی ذات بابرکات امت کے لیے اسوۂ حسنہ تھی۔ اس لیے اگر اس میں کچھ ایام میں روزہ جیسی عبادت کا ترک نظر آتا ہے تو پھر وہی سب سے بڑی عبادت ہے اگر کسی نماز کا سواری کے اوپر پڑھنا ثابت ہوتا ہے تو یہ کمال ہے۔ اگر حالت سفر میں پابندی کے ساتھ نوافل نظر نہیں آتے تو نوافل کا اسی طرح ادا کرنا ہی افضل ہے حتی کہ اگر حج وعمرہ جیسی قدیم عبادت کا کسی عذر سے ناتمام چھوڑ دینا منقول ہے تو کسی تردد کے بغیر یہی مستحب ہے پس صرف عبادات ہی میں آپ کی

نَقُلْتُ اَوْتَرْتُ فَقَالَ اَلَيْسَ لَكَ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ عَلٰى رَاحِلَتِهِ۔ رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح

الرسول العظيم وجوب الاتباع بافعاله صلى الله عليه وسلم كلها

۱۴۸۱۔ اَخْبَرَنِيْ عَطَاءٌ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ فِيْ اُنَاسٍ مَعَهُ قَالَ اَهْلَلْنَا اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْحَجِّ خَالِصًا لَيْسَ مَعَهُ عُمْرَةٌ قَالَ عَطَاءٌ قَالَ جَابِرٌ فَقَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صُبْحَ رَابِعَةٍ مَضَتْ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ فَلَمَّا قَدِمْنَا اَمَرَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَحِلَّ وَقَالَ اَحِلُّوْا وَاَصِيْبُوْا مِنَ النِّسَاءِ قَالَ عَطَاءٌ قَالَ جَابِرٌ وَلَمْ يَعْزِمْ عَلَيْهِمْ وَلٰكِنْ اَحَلَّهُنَّ لَهُمْ فَبَلَغَهُ اَنَّا نَقُوْلُ لَمَّا لَمْ يَكُنْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ عَرَفَةَ اِلَّا خَمْسٌ اَمَرَنَا

اُنہوں نے پوچھا کہاں رہ گئے تھے میں نے عرض کی پیچھے اتر کر وتر پڑھنے لگا تھا اس پر اُنہوں نے فرمایا کیا تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی میں بہتر نمونہ موجود نہ تھا۔ میں نے آپ کو اپنی سواری ہی پر وتر پڑھتے دیکھا ہے۔ (ترمذی شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہر ہر عمل میں لازم ہے

۱۴۸۱۔ عطا کہتے ہیں میں نے چند اور اشخاص کے ساتھ جابرؓ کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ ہم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت تھے ہم نے صرف حج کا احرام باندھا تھا اور اس کے ساتھ عمرہ کا احرام نہ باندھا تھا۔ عطا ذکر کرتے ہیں کہ جابرؓ نے بیان فرمایا ذی الحجہ کی چار تاریخ ہو چکی تھی۔ چوتھی کی صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ جب ہم حاضر ہوئے تو آپ نے ہم کو حلال ہونے کا حکم دیا اور فرمایا احرام سے نکل جاؤ اور عورتوں کے ساتھ صحبت کرو۔ عطا کہتے ہیں کہ جابرؓ نے فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حکم سے مقصد صرف یہ تھا کہ اب یہ فعل بھی تمہارے لیے حلال ہو گیا ہے کوئی تاکیدی حکم نہ تھا حج قریب تھا ادھر آپ حالت احرام میں تھے اس لیے قبل از وقت حلال ہو جانا ہم کو بہت شاق گزرا۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پہنچ گئی کہ ہم لوگ کہتے ہیں کہ حج میں تو صرف پانچ دن ہی باقی رہ گئے اور اب آپ نے

ذات اسوہ نہ تھی ترک عبادات میں بھی اسوہ حسنہ تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ جہاں آپ سے ترک عبادت ثابت ہے وہاں عبادت کرنا بعض اوقات معصیت تھا۔ جیسے عیدین کا روزہ۔ صحابی یہاں اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیتا ہے اور اس کے لیے سب سے محکم اور آخری دلیل یہی بیان کرتا ہے کہ ان ایام کا روزہ اسوۂ حسنہ میں ہم کو نظر نہیں آتا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ صحابہ کرام کے درمیان قرآن کریم کے اس عنوان اور خاص آپ کے اس لقب کی کتنی اہمیت تھی۔

اَنْ نَحِلَّ اِلٰی نِسَائِنَا فَنَاْتِیَ عَرَفَةَ تَقْطُرُ مَذَاکِیْرُنَا الْمَنِیَّ قَالَ وَیَقُوْلُ جَابِرٌ بِیَدِهٖ هٰکَذَا وَ حَرَّکَهَا فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّیْ اَتْقَاکُمْ لِلّٰهِ وَاَصْدَقُکُمْ وَاَبَرُّکُمْ وَلَوْلَا هَدْیِیْ لَحَلَلْتُ کَمَا تَحِلُّوْنَ فَحِلُّوْا فَلَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا اَهْدَیْتُ فَحَلَلْنَا وَسَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۔ رواہ البخاری صـ ۱۰۹۵ وراجع ترجمان السنۃ صـ ۴۳۹ حدیث ۵۱۲

۱۱۴۹۔ عَنْ کَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ اَنَّهٗ دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اُمِّ الْحَکَمِ یَخْطُبُ قَاعِدًا فَقَالَ اُنْظُرُوْا اِلٰی هٰذَا الْخَبِیْثِ یَخْطُبُ قَاعِدًا وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْا اِلَیْهَا وَتَرَکُوْكَ قَائِمًا ۔ رواہ مسلم ۔

۱۱۵۰۔ عَنْ عُمَارَةَ بْنِ رُوَیْبَةَ اَنَّهٗ رَاٰی بِشْرَ بْنَ مَرْوَانَ عَلَی الْمِنْبَرِ رَافِعًا یَدَیْهِ فَقَالَ قَبَّحَ

ہم کو حلال ہونے کا حکم دیا ہے اگر ہم اب حلال ہوں اور عورتوں کے ساتھ صحبت کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب پھر دوسرا احرام باندھ کر عرفہ میں اس طرح حاضر ہوں گویا اب صحبت سے فارغ ہو کر آ رہے ہیں۔ عطاء کہتے ہیں کہ جابرؓ نے اس طبعی کراہت کا اپنے ہاتھ سے نقشہ کھینچ کر بھی بتایا۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا تم سب جانتے ہو کہ سب میں زیادہ متقی، سب سے زیادہ راست گو اور سب سے بڑھ کر نیک عمل کرنے والا میں ہوں۔ اگر میرے ساتھ ہدی کے جانور موجود نہ ہوتے تو جس طرح تم حلال ہوئے ہو میں بھی حلال ہو جاتا کاش اگر مجھ کو آغاز سفر میں اس انجام کی خبر ہوتی تو میں اپنے ساتھ قربانی کے جانور ہی نہ لاتا آپ کا خطبہ سُن کر ہم سب نے آپ کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دیا اور سب حلال ہو گئے۔ (بخاری شریف) یہی روایت مختصر صورت سے ترجمان السنۃ صـ ۴۳۹ میں گزر چکی ہے۔

۱۱۴۹۔ کعب بن عجرہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے تو اس وقت عبدالرحمٰن بن ام الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا انہوں نے فرمایا ذرا اس خبیث کو دیکھو تو کیسا بیٹھا بیٹھا خطبہ دے رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً الخ یعنی جب کسی تجارت کو یا کسی کھیل تماشہ کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑتے ہیں اور تجھے کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ (مسلم)

۱۱۵۰۔ عمارہ بن رویبہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے بشر بن مروان کو دیکھا کہ وہ ممبر پر خطبہ میں اپنے دونوں ہاتھ

۱۱۴۹ شیخ جلال الدینؒ نے تفسیر اتقان میں اس پر روایت بھی نقل کی ہے کہ پہلے جمعہ کے دن خطبہ نماز کے بعد ہوا کرتا تھا۔ یہ آیت اسی زمانہ کی ہے۔ وہ عسرت اور تنگی کا زمانہ تھا جب لوگ نماز ادا کر لیتے تو اب صرف ایک خطبہ رہ جاتا جس کی حیثیت بھی ابتداءً صرف ایک تقریر، وعظ کی سی سمجھی گئی تھی ایک بار ایسا ہوا کہ باہر سے کوئی قافلہ کھانے پینے کی اشیاء لے کر آیا سامعین خطبہ اُدھر اُٹھ کر چل دیے۔ یہ حرکت ناپسند ہوئی اور اس کے بعد ہی خطبہ کو مقدم کر دیا گیا۔ قرآن کریم نہایت موثر انداز میں اسی کا شکوہ کر رہا ہے اور لوگوں میں بڑی سے بڑی ضرورت میں بھی آخرت ہی کی طرف متوجہ رہنے کی خدا بالی بصفحہ ۴۰۴

اللهم هاتين اليدين لقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم ما يزيد على أن يقول بيده هكذا وأشار بإصبعه المسبحة. رواه مسلم

۱۱۵۱- عن جابر قال لما استوى رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الجمعة على المنبر قال اجلسوا فسمع ذلك ابن مسعود فجلس على باب المسجد فرآه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال تعال يا عبد الله بن مسعود. رواه مسلم

اُٹھائے ہوئے ہے۔ یہ دیکھ کر اُنہوں نے فرمایا خدا تعالیٰ ان دو ہاتھوں کا ناس کرے۔ کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا آپ تو اپنے ہاتھ کی صرف شہادت کی انگلی اُٹھاتے تھے اس کو عمارہؓ نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کرکے بتایا۔ (مسلم)

۱۱۵۱- جابرؓ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خطبہ کے لئے ممبر پر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے تو لوگوں کو خطاب کرکے فرمایا سب بیٹھ جائیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے آپ کا یہ فرمان مسجد کے دروازہ پر سُنا اور فوراً وہیں بیٹھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ لیا اور فرمایا عبداللہ بن مسعود! آگے آجاؤ۔ (مسلم)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۰۴) بیان کیا جاتا ہے کہ کعب بن عجرہ جب مسجد میں تشریف لے گئے تو عبدالرحمٰن کو دیکھا کہ سنت کے خلاف بیٹھے بیٹھے خطبہ دے رہے ہیں آخر ضبط نہ کرسکے اور ان کی اس زشت اعمالی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر یہ حرکت دیکھ کر یہ کلمات کہنے پر بے اختیار مجبور ہوگئے۔

۱۱۵۰- بشر بن مروان حاکم وقت ہے لیکن ایک صحابی سے سنت کے خلاف اس کو دونوں ہاتھ اُٹھاتے دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا۔ اب یہاں اندازہ فرمائیے کہ مخالفت کتنی سی بات میں تھی اور ان کے غصہ کا عالم کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ جن کے سامنے اتباع سنت کی بحث تھی ان کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ اس مسئلہ کی حیثیت فرض کی ہے یا مستحب کی۔ اس اشارہ میں علماء کا اختلاف ہے کس غرض سے ہوتا تھا کسی نے سمجھا ہے کہ دعا کے لیے تھا اور کسی کا ذہن اس طرف بھی گیا ہے کہ تفہیم کے لیے تھا۔

۱۱۵۱- واضح رہنا چاہیے کہ اتباع رسول ایمان بالرسول کی روح ہے اس باب کی اہمیت حسب ذیل آیت سے ظاہر ہے قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم کو میری پیروی کرنی چاہیے (اگر تم نے ایسا کیا) تو اللہ تم سے محبت کرنے لگیگا اور تمہاری خطائیں بخش دیگا۔

اس باب کو خود قرآن کریم نے قائم کیا ہوا اور اپنی محبت کا اسی کو معیار مقرر فرمایا ہے انسان کی یہ بڑی خود سری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی محبت کا تو دم بھرتا ہے مگر کسی دوسرے انسان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے کتراتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی سرگزشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے سامنے سر جھکانے سے تو شیطان کو بھی انحراف نہ تھا لیکن جب انسان کے سامنے سر جھکانے کا وقت آیا تو حکم ربانی کے باوجود انحراف ہی انحراف تھا۔ یہود و نصاریٰ کا حال بھی یہی تھا وہ بھی نحن ابناء الله واحباءه کی لن ترانیاں گایا کرتے تھے مگر قرآن کریم نے انگلی رکھ کر بتادیا کہ میری محبت کا معیار یہ ہے جو ان کی اتباع نہیں کرتا وہ میری محبت میں جھوٹا ہے پھر عجیب بات ہے کہ آیت مذکورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بجائے اتباع کا لفظ رکھا گیا ہے معلوم ہوا کہ جس طرح آپ کی اتباع کے بغیر اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ غلط ہے اسی طرح آپ کی اتباع کے بغیر آپ کی محبت کا دعویٰ بھی غلط ہے۔

(باقی بر صفحہ ۴۰۷)

۱۱۵۲- حَدَّثَنَا اَبُوْحَازِمٍ اَنَّ رِجَالًا اَتَوْا سَهْلَ بْنَ سَاعِدِ السَّاعِدِیَّ وَقَدِ امْتَرَوْا فِی الْمِنْبَرِ مِمَّ عُوْدُهٗ فَسَأَلُوْهُ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَعْرِفُ مِمَّا هُوَ وَلَقَدْ رَاَیْتُهٗ اَوَّلَ یَوْمٍ وُضِعَ وَاَوَّلَ یَوْمٍ جَلَسَ عَلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلٰی فُلَانَةَ امْرَاَةٍ مِنَ الْاَنْصَارِ قَدْ سَمَّاهَا سَهْلٌ مُرِیْ غُلَامَكِ النَّجَّارَ اَنْ یَّعْمَلَ لِیْ اَعْوَادًا اَجْلِسُ عَلَیْهِنَّ اِذَا كَلَّمْتُ النَّاسَ فَاَمَرَتْهُ فَعَمِلَهَا مِنْ طَرْفَاءِ الْغَابَةِ ثُمَّ جَاءَ بِهَا فَاَرْسَلَتْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَ بِهَا فَوُضِعَتْ هٰهُنَا ثُمَّ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

۱۱۵۲- ابوحازم بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان آپ کے ممبر کی لکڑی کے متعلق کچھ اختلاف ہوا وہ کس لکڑی کا تھا۔ اس لیے وہ سہل بن ساعد کے پاس آئے اور اُن سے اس کی تحقیق کرنی چاہی۔ انھوں نے فرمایا بخدا میں خوب جانتا ہوں منبر کس لکڑی کا تھا۔ میں نے تو اس کو اس دن دیکھا تھا جبکہ وہ پہلے پہل رکھا گیا تھا اور جبکہ آپ اس پر سب سے پہلے رونق افروز ہوئے تھے۔ بات یوں ہوئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری شخص کی بی بی کے پاس یہ کہلا کر بھیجا تھا (جن کا نام بھی سہل نے بیان کیا تھا) کہ اپنے غلام سے جو نجاری کا کام جانتا ہے کہہ دو کہ جب میں لوگوں کے سامنے خطبہ دینا چاہوں تو میرے بیٹھنے کے لیے وہ لکڑیوں کا ایک منبر بنا دے۔ انھوں نے اسی وقت اپنے غلام کو حکم دیا۔ اُس نے مقام غابہ کے جھاؤ کے درخت کا منبر تیار کر کے حاضر کر دیا۔ ان بی بی صاحبہ نے وہ آپ کی خدمت میں بھیج دیا۔ پھر آپ کے حکم کے مطابق وہ وہاں رکھ دیا گیا (یعنی جو منبر کی جگہ تھی) اس کے بعد پھر ایک موقعہ پر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۰۶) یہ اتباع "اسوۂ حسنہ" کے لوازم میں سے ہے۔ جب آپ نمونہ ہیں تو پھر نمونہ کی اتباع کیوں نہ ہو پھر جب نمونہ صاحب نمونہ کی پسندیدگی کا معیار ہے تو جو اس نمونہ کی نقل اتارے وہ اس کی نظر میں پسندیدہ کیوں نہ ہو اس لیے فرمایا کہ آپ ہمارا محبوب نمونہ ہیں اس لیے جو آپ کی اتباع کریگا وہ بھی ہماری نظر میں محبوب بن جائیگا پھر جتنا وہ ہمارے نمونہ سے ملتا جلتا چلا جائیگا اتنا ہی شان محبوبیت میں بھی اونچا ہوتا چلا جائیگا۔ العیاذ باللہ اگر کہیں رسول معصوم نہ ہوتے تو کیا اصل اطلاق کے ساتھ اُن کے اتباع کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ حدیث مذکور میں آپ نے حضرت ابن مسعودؓ کی شانِ اتباع ملاحظہ کی کہ انھوں نے آپ کی زبان سے "بیٹھ جاؤ" کا کلمہ جیسے ہی سنا بس اسی جگہ بیٹھ گئے اور ایک قدم آگے نہ اٹھا سکے حالانکہ خطاب سامنے کے حاضرین کو تھا اُن کو جو ابھی مسجد کے دروازے ہی میں تھے اور خطبہ سننے کے لیے آرہے ہیں مگر یہاں جذبۂ اتباع نے ہی نہیں سکھ نکالنے کی مہلت نہ دی جہاں آپ کی آواز کان میں

۱۱۵۲- حدیث مذکور میں اتباع کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ نماز جیسی چیز کو آج منبر پر صرف اس لیے ادا کیا جا رہا ہے کہ مقتدیوں کا ہر ہر فرد آپ کی نماز کو بچشم خود ملاحظہ کر لے اور پھر ہو بہو اس کی نقل کرنے کی سعی کر لے۔ حالانکہ جو لوگ ہمیشہ آپ ہی کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے ان کو ایک حد تک آپ کی نماز کا مشاہدہ حاصل ہی تھا مگر نہ معلوم آپ کی اتباع کی نظر ربوبیت میں اہمیت کتنی تھی کہ آپ نے یہ بھی پسند نہ فرمایا کہ صف اول وثانی کے فرق سے آپ کے ارکان صلوٰۃ کے مشاہدے میں جو فرق آسکتا ہے وہ بھی باقی رہے، اس لیے اس کا یہ اہتمام فرمایا کہ ایک وقت آپ کی نماز کا جتنا حصہ زیادہ سے زیادہ مشاہدہ میں آسکتا ہے وہ بلا واسطہ سب کے ہی مشاہدہ میں آجائے۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر آپ کے اس ارشاد سے کہ آج میں نے منبر پر

صَلّٰی عَلَیْهَا وَکَبَّرَ وَهُوَ عَلَیْهَا ثُمَّ نَزَلَ الْقَهْقَرٰی فَسَجَدَ فِیْ اَصْلِ الْمِنْبَرِ ثُمَّ عَادَ فَلَمَّا فَرَغَ اَقْبَلَ عَلَی النَّاسِ فَقَالَ اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا صَنَعْتُ هٰذَا لِتَأْتَمُّوْا بِیْ وَلِتَعَلَّمُوْا صَلَاتِیْ ۔ رواه البخاری فی باب الخطبة علی المنبر

الرسول العظیم واباءه علی من تنزه عن الاتباع بافعاله بای تاویل کان

۱۱۵۳ عَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ ثَلٰثَةُ رَهْطٍ اِلٰی اَزْوَاجِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا اُخْبِرُوْا بِهَا كَاَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا فَقَالُوْا اَیْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَاَخَّرَ فَقَالَ اَحَدُهُمْ اَمَّا

صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر نماز ادا فرمائی اس طرح پر کہ جب تکبیر کہی تو آپ اس کے اوپر ہی تھے، پھر جب سجدہ کا وقت آیا تو پچھلے پیروں اُتر گئے اور اُتر کر منبر کی جڑ میں سجدہ کیا پھر لوٹ کر منبر پر تشریف لے گئے جب نماز سے فارغ ہو گئے تو لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ لوگو! (دیکھو آج) میں نے اس طرح نماز اتر کر اور چڑھ کر اس لیے ادا کی ہے تاکہ تم سب کے سب دیکھ کر میری نماز سیکھ سکو اور دیکھ کر میری اقتدا کر سکو (بخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل میں اتباع کرنے میں پس و پیش کرنا آپ کے غصہ کا موجب ہے

۱۱۵۳ انس بیان فرماتے ہیں کہ تین شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج طیبات میں آپ کی عبادت کا حال دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ جب اُن سے اس کی تفصیل بیان کی گئی تو ایسا انداز ہوا گویا وہ اپنے حق میں اس کو کم سمجھے۔ انہوں نے کہا بھلا ہمارا حال خستہ کہاں اور آپ کی شان رفیع کہاں آپ کے تو گزشتہ اور آئندہ سب معاملات کی مغفرت ہو چکی ہے۔ اس لیے ان میں ایک بولا میں تو ہمیشہ تمام

نماز اس لیے ادا کی ہے" ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا آج کا عمل نماز کی مستقل سنت نہ تھا۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ہر عمل قابل اتباع تھا حتیٰ کہ اگر کہیں آپ یہ تنبیہ نہ فرما دیتے تو اس طرح نماز ادا کرنے کو بھی ایک سنت سمجھا جا سکتا تھا۔ تعجب ہے کہ اپنے جس عمل کی وجہ آپ نے خود بیان فرما دی ہو اُس پر آئندہ بحثوں کی ضرورت ہی کیا تھی یہ عمل قلیل تھا یا فعل کثیر مگر بہر حال نہ آپ کے سوا کوئی ایسا ہے جس کی ایک ایک حرکت اُمت کے سامنے آنے کی ضرورت ہو اور اس لیے نہ آئندہ کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ منبر پر اس طرح نماز ادا کر سکے اس لیے اس عمل کو عہد رسالت پر ہی ختم کر دینا چاہیے۔

۱۱۵۳ - مذکورہ بالا حدیث پر غور فرمائیے کہ صحابۂ کرام نے یہ کلمات فرمائے کیوں؟ صرف آپ کی شان کی برتری اور اپنے احساس کمتری کی بنا پر مگر اس پر بھی ان کو تنبیہ کی گئی۔ بات یہ تھی کہ جس طرح جذبات کے دباؤ میں انسان کو بعض اہم گوشوں سے ذہول ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح ان کو بھی یہاں ذرا سا ذہول ہو گیا اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی تعلیم امت

أَنَا فَأُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ الْآخَرُ أَنَا أَصُومُ النَّهَارَ أَبَدًا وَلَا أُفْطِرُ وَقَالَ الْآخَرُ أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا فَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ أَنْتُمُ الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا أَمَا وَاللّٰهِ إِنِّي أَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ لٰكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي. متفق علیہ

۱۱۵۴۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صَنَعَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا تَرَخَّصَ فِيهِ فَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ فَبَلَغَ ذٰلِكَ فَخَطَبَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُونَ عَنِ الشَّيْءِ أَصْنَعُهُ فَوَاللّٰهِ إِنِّي لَأَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَأَشَدُّهُمْ لَهُ خَشْيَةً. اخرجہ الشیخان۔

شب نماز پڑھا کرونگا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھا کرونگا اور کبھی افطار نہ کرونگا تیسرے نے کہا میں ہمیشہ عورتوں سے الگ رہونگا اور کبھی نکاح نہ کرونگا۔ اسی اثنا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے آپ نے فرمایا اچھا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں سُن لو! تم سب میں اللہ تعالٰی سے زیادہ ڈرنے والا میں ہوں اور تم سب سے بڑھ کر متقی میں ہوں۔ میں تو روزہ بھی رکھونگا اور افطار بھی کرونگا۔ شب میں نماز بھی پڑھونگا اور سوؤنگا بھی اور عورتوں سے نکاح بھی کرونگا۔ اب جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کریگا وہ مجھ سے نہ ہوگا۔ (متفق علیہ)

۱۱۵۴۔ حضرت عائشہ رض روایت فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) کوئی ایسا کام کیا جس میں آپ نے رخصت پر عمل فرمایا (یعنی دین کا وہ پہلو جو دوسرے پہلو کی نسبت آسان ہو) بعض لوگوں نے اس کی اتباع کرنے سے کنارہ کشی کی یہ بات آپ کو بھی پہنچ گئی اس پر آپ نے تقریر فرمائی اور خدا تعالٰی کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی بات کرنے سے بھی احتراز کرتے ہیں جو خود میں کرتا ہوں۔ خدا کی قسم ان سب میں اللہ تعالٰی کی ذات و صفات کا سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں اور ان سب سے زیادہ ڈرنے والا میں ہوں۔ (شیخین)

ہے۔ اس لیے جب تک وہ خود تصریح نہ فرما دیں ان کے کسی عمل کو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص سمجھ لینا خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت تاویل کے ساتھ کیوں نہ ہو مستحسن نہیں ہے۔ نبی کا حق یہ ہے کہ اس کی اتباع کی جائے اور اتباع کی حقیقت قدم بہ قدم چلنا ہے یہاں جس طرح ایک قدم اگر پیچھے رہ گیا تو اتباع نہیں رہی اسی طرح اگر ایک قدم آگے پڑ گیا تو بھی اتباع نہ رہی اس لیے صرف کثرت عبادت کچھ کمال نہیں ہے۔ وقت میں دو صفتیں اپنی تمام امت سے کامل ہوتی ہیں علم باللہ اور تقوٰی۔ پھر ان صفات میں ان کا رتبہ خود قیاس کر لو جن کا دامن قیامت کے انسانوں تک پھیلا ہوا ہے پھر ان کے کسی عمل کو بھی اپنے لیے باعث کمال نہ سمجھنا کتنا بڑا نقص ہوگا۔ عملی کوتاہی کے صرف دو سبب ہوتے ہیں یا علمی نقصان یا جذبۂ عمل کا فقدان۔ جہاں یہ دونوں سبب موجود نہیں وہاں کسی عمل کے متعلق بھی یہ تصور کرنا کہ وہ کسی ادنٰی سے ادنٰی انسان کے حق میں بھی اعلٰی سے اعلٰی نہ ہوگا، یہی بڑی کج فہمی

۱۱۵۵ - عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ وَاقِفٌ عَلَی الْبَابِ وَاَنَا اَسْمَعُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ اُصْبِحُ جُنُبًا وَاَنَا اُرِیْدُ الصِّیَامَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اُصْبِحُ جُنُبًا وَاَنَا اُرِیْدُ الصِّیَامَ فَاَغْتَسِلُ وَاَصُوْمُ فَقَالَ لَہُ الرَّجُلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّکَ لَسْتَ مِثْلَنَا قَدْ غَفَرَ اللّٰہُ لَکَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقَالَ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ اَکُوْنَ اَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَعْلَمَکُمْ بِمَا اَتَّقِیْ. رواہ مالک

۱۱۵۶ - عَنْ عَطَاءِ بْنِ یَسَارٍ اَنَّ رَجُلًا قَبَّلَ اِمْرَءَتَہٗ وَھُوَ صَائِمٌ فِیْ رَمَضَانَ فَوَجَدَ مِنْ ذٰلِکَ وَجْدًا شَدِیْدًا فَاَرْسَلَ اِمْرَاَتَہٗ تَسْئَلُ لَہٗ عَنْ ذٰلِکَ فَدَخَلَتْ عَلٰی اُمِّ سَلَمَۃَ زَوْجِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَتْ ذٰلِکَ لَھَا فَاَخْبَرَتْھَا اُمُّ سَلَمَۃَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَبِّلُ وَھُوَ صَائِمٌ فَرَجَعَتْ اِلٰی زَوْجِھَا فَاَخْبَرَتْہُ فَزَادَہٗ ذٰلِکَ شَرًّا وَقَالَ لَسْنَا مِثْلَ

۱۱۵۵ - حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہوئے تھے اس وقت ایک شخص نے آپ سے یہ مسئلہ پوچھا اور میں سن رہی تھی یا رسول اللہ اگر صبح کو میں ناپاک اٹھوں اور میرا ارادہ روزہ رکھنے کا ہو تو کیا میں جنابت کی حالت میں روزہ کی نیت کر سکتا ہوں آپ نے جواب دیا اگر صبح کو میں جنابت کی حالت میں ہوتا ہوں اور میرا ارادہ روزہ رکھنے کا ہوتا ہے تو میں پہلے غسل کرتا ہوں پھر اس کے بعد روزہ کی نیت کر لیتا ہوں اور بس اس پر وہ شخص بولا۔ بھلا آپ کی شان عالی کہاں آپ کے تو اگلے پچھلے سب معاملات بخشے جا چکے ہیں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ آپ کو سخت ناگواری ہوئی اور آپ نے فرمایا خدا کی قسم مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ تقویٰ کی راہ کا علم رکھنے والا ہونگا۔ (مالک)

۱۱۵۶ - عطاء بن یسار بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے روزہ کی حالت میں اپنی بی بی کا بوسہ لے لیا پھر اس حرکت پر اس کو سخت غم ہوا۔ اس نے مسئلہ دریافت کرنے کے لیے اپنی بیبی کو بھیجا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سب واقعہ ان سے ذکر کیا انہوں نے فرمایا کہ روزہ کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کر لیتے تھے۔ انہوں نے لوٹ کر یہ جواب اپنے شوہر کو سنا دیا۔ اس پر ان کا غم اور دونا ہو گیا وہ بولے ہم بھلا

۱۱۵۵ - اس روایت کے مختلف سیاق ہیں آپ کی زبان مبارک سے "انا اعلمکم" کا لفظ نکلا ہے۔ مگر جب یہی لفظ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلا تھا تو گرفت میں آ گیا تھا اس لیے سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ کسی معمولی فروگزاشت پر گرفت کا معاملہ مالک کی مرضی پر دائر ہوتا ہے اگر وہ چاہے تو درگزر فرما دے اگر چاہے تو اس پر گرفت فرمائے مگر یہاں کچھ اور فرق بھی ہے ایک تو یہ کہ ان تمام مقامات پر آپ نے اپنے نفس کو مطلقاً اعلم نہیں فرمایا بلکہ کہیں "اعلم باللہ" کہیں "اعلم بحدودہ" اور کہیں "اعلم

رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُ يُحِلُّ لِرَسُوْلِهٖ مَا يَشَاءُ ثُمَّ رَجَعَتْ اِمْرَأَتُهٗ اِلٰى اُمِّ سَلَمَةَ فَوَجَدَتْ عِنْدَهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لِهٰذِهِ الْمَرْأَةِ فَاَخْبَرَتْهُ اُمُّ سَلَمَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا اَخْبَرْتِيْهَا اَنِّيْ اَفْعَلُ ذٰلِكَ فَقَالَتْ قَدْ اَخْبَرْتُهَا فَذَهَبَتْ اِلٰى زَوْجِهَا فَاَخْبَرَتْهُ فَزَادَهٗ ذٰلِكَ شَرًّا وَقَالَ لَسْنَا مِثْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحِلُّ اللّٰهُ لِرَسُوْلِهٖ مَا شَاءَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَتْقَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَعْلَمُكُمْ بِحُدُوْدِهٖ ۔ رواہ مالک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کہاں ہیں (کہ آپ کی نقل کر سکیں) اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے حق میں جو چاہے حلال فرما دے سکتا ہے۔ ان کی بی بی پھر ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اس مرتبہ وہ آئیں تو انہوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں رونق افروز تھے۔ آپ نے پوچھا یہ عورت کیسے آئی ہیں حضرت ام سلمہؓ نے ان کا واقعہ بیان کیا آپ نے فرمایا تم نے اس سے کہہ دیا ہوتا کہ میں بھی ایسا کر لیتا ہوں انہوں نے عرض کی میں نے کہہ تو دیا تھا مگر جب انہوں نے اپنے شوہر کو جا کر اس کی اطلاع دی تو ان کو اور زیادہ غم ہوا اور انہوں نے یہ کہا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کہاں ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے حق میں جو چاہے حلال فرما دے سکتا ہے یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگواری ہوئی اور آپ نے فرمایا بخدا میں تم سب سے زیادہ اللہ کا تقویٰ رکھتا ہوں اور اس کے حلال و حرام کی حدود کا سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ (مالک)

جا لفظی کے الفاظ فرمائے ہیں۔ یہ تمام الفاظ مقید تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جو کلمات نکلے اگرچہ بے شبہ مقصد ان کا بھی یہی تھا مگر ان کے لفظوں میں پھر اطلاق تھا دوم یہ کہ آپ کے ان الفاظ کا اصل مقصد اپنا اظہار علم نہ تھا بلکہ ہر امر میں اپنی اتباع کی تاکید فرمانا تھی۔ ہاں اس کی دلیل میں آپ نے اپنی اعلمیت ضرور بیان فرمائی ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہی یہ کیا گیا تھا "ای الناس اعلم" یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ علم کس کو ہے اس پر موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ یہ تھا "انا اعلم" میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ صحیح بخاری میں ہے "فعتب اللہ عزوجل علیہ اذ لم یرد العلم الیہ فاوحی اللہ الیہ ان عبدا من عبادی بمجمع البحرین ہو اعلم منک" یعنی اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو عتاب ہوا کہ انہوں نے اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالہ کیوں نہیں کیا اور ان پر یہ وحی آئی کہ مجمع بحرین میں ہمارے بندوں میں ایک بندہ ایسا ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ علم کی صفت اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ میں سے ایک بہت بڑی صفت ہے اس میں کسی درجہ کی بھی کسی کو شرکت حاصل نہیں ہو سکتی ہاں صرف اتنی جتنی کہ خود مشیت الٰہیہ کسی کے حق میں مقدر فرما دے۔ اسی لیے یہاں لفظی اطلاقات اور غیر ارادی عموم پر بھی گرفت کر لی جاتی ہے گو یہ گرفت ہوتی ہے ان ہی کے ساتھ جن کی شان سے اتنی سی فرو گزاشت بھی بعید سمجھی جائے۔ بہر حال ان دو مقامات میں جس طرح خود نفس کلمات میں بھی اطلاق و تقیید کا فرق ہے اسی طرح سیاق و سباق کے لحاظ سے مقاصد میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ ہم نے یہاں ان سب واقعات کو وقت کی فرصت کے لحاظ سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ جہاں صحابہ کرام کی جانب سے آپ کے کسی عمل میں اتباع کرنے سے ذرا سا بھی پس و پیش ہوا ہے اور آپ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا ہے ان تمام واقعات کو بیک نظر پیش نظر رکھیے اور پھر یہ فیصلہ فرمائیے کہ جہاں والعیاذ باللہ کسی ادنیٰ سی معصیت کا بھی امکان ہو ان کی (باقی برصفحہ ۴۱۲)

۱۱۵۷۔ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ اِلٰی مَکَّۃَ فِیْ رَمَضَانَ فَصَامَ حَتّٰی بَلَغَ کُرَاعَ الْغَمِیْمِ فَصَامَ النَّاسُ ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ فَرَفَعَہٗ حَتّٰی نَظَرَ النَّاسُ اِلَیْہِ ثُمَّ شَرِبَ فَقِیْلَ لَہٗ بَعْدَ ذٰلِکَ اِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ فَقَالَ اُولٰٓئِکَ الْعُصَاۃُ اُولٰٓئِکَ الْعُصَاۃُ۔ رواہ مسلم

۱۱۵۷۔ جابرؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سال جس میں کہ مکہ مکرمہ فتح ہوا رمضان المبارک میں سفر کے لیے نکلے اور آپ نے روزہ رکھا اور لوگوں نے بھی روزہ رکھ لیا۔ جب مقام کراع الغمیم پر پہنچے تو آپ نے ایک پیالہ میں پانی منگایا اور اپنے ہاتھ میں اس کو اتنا اونچا اٹھایا کہ سب لوگوں نے دیکھ لیا، اس کے بعد (افطار کرنے کی غرض سے) اس کو پی لیا، اس کے بعد آپ کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ بعض لوگ تو اب بھی روزہ دار ہیں اس پر آپؐ نے فرمایا یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں، یہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔ (مسلم)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۱۳) زبان مبارک سے کیا انداز خطاب یہی ہونا چاہیے۔ پھر کسی ایک مقام پر بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کے نزدیک اس احتراز و تنزہ کا سبب آپ کے عمل میں اس قسم کے امکان کا کوئی احتمال تھا حاشا وکلا اس روایت میں صاف تصریح موجود ہے۔ "اللہ یحل لرسولہ ما یشاء" یعنی آپ کا عمل اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خاص آپ کے حق میں حلال ہو۔ اس کے علاوہ ان کے داعنوں میں کوئی دوسرا تصور نہ تھا۔ پھر جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اور ان کے صحابہ کی جانب سے یہ احتمال نہیں نکالا گیا تو کیا یہ اس کا ثبوت نہیں ہے کہ رسول کی ذات ان کا محل ہی نہیں ہوتی۔

۱۱۵۷۔ اب غور فرمائیے کہ یہاں معاملہ ایک عبادت یعنی روزہ کا تھا اور روزہ بھی رمضان کا، پھر اگر لوگوں نے اس کو نہ توڑا تو کیا وہ شاد باش کے مستحق نہ تھے مگر چونکہ آپ کے اس علی الاعلان عمل کے بعد بھی روزہ نہ توڑنا یہ آپ کی اتباع میں کوتاہی تھی اس لیے اب وہی اہم عبادت معصیت بن گئی معلوم ہوا کہ رسول کی ہستی وہ ہے کہ اگر وہ عبادت کرے تو جس طرح عبادت میں اس کی اتباع کرنا عبادت ہے اسی طرح اگر وہ عبادت شروع کر کے توڑ دے تو پھر اس کا توڑ دینا بھی عبادت ہے۔ گویا عبادت کی حقیقت کیا ہے؟ اتباع رسول اور معصیت کی حقیقت کیا ہے؟ رسول کی نافرمانی۔ اسی لیے قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کی اطاعت پر جتنا زور دیا ہے ان کی معصیت سے ممانعت پر بھی اتنا ہی زور دیا ہے۔ گویا جس طرح اطاعت ایزدی اور رسول کی اطاعت میں کوئی تفریق نہیں ہے اسی طرح اس کی معصیت اور رسول کی معصیت میں کوئی تفریق نہیں۔ اگر انبیاء علیہم السلام کے کسی نفس میں بھی معصیت ہونے کا احتمال ہو والعیاذ باللہ تو ان کی ہر خلاف ورزی کو معصیت کیسے کہا جا سکتا ہے اور ان کی نافرمانی سے علی الاطلاق ممانعت کیسے درست ہے۔

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا وَلَہٗ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (آل عمران)	اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور اس کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر نکل گیا تو وہ آگ کے عذاب میں ڈالا جائیگا اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیگا اور اس کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب ہوگا۔
یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰی بِھِمُ الْاَرْضُ وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰہَ حَدِیْثًا (النساء)	اس دن وہ (حسرت و ندامت سے) تمنا کریں گے کاش زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اس دن یہ اللہ سے اپنی کوئی بات بھی چھپا نہیں سکیں گے
وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا	اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں جا پڑا۔

الرسول الاعظم وكون تقريره صلى الله عليه وسلم حجة قطعية في الدين

۱۱۵۸ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ اُمَّ حُفَيْدٍ بِنْتَ الْحَارِثِ بْنِ حَزْنٍ اَهْدَتْ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمْنًا وَاَقِطًا وَاَضُبًّا فَدَعَا بِهِنَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاُكِلْنَ عَلٰى مَائِدَتِهٖ فَتَرَكَهُنَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَالْمُتَقَذِّرِ لَهٗ وَلَوْ كُنَّ حَرَامًا مَا اُكِلْنَ عَلٰى مَائِدَتِهٖ وَلَا اَمَرَ بِاَكْلِهِنَّ. رواہ البخاری۔

۱۱۵۹ عَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا نَعْزِلُ وَالْقُرْاٰنُ يَنْزِلُ (متفق علیہ) وزاد مسلم فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَنْهَنَا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات پر خاموشی بھی شریعت میں اس کے جواز کی قطعی دلیل ہے

۱۱۵۸۔ ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ام حفیدؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھوڑا سا گھی، کچھ پنیر اور چند گوہ (ایک جانور ہوتا ہے) بطور ہدیہ پیش کیں آپ نے اُن کو منگوایا اور آپ کے دسترخوان پر دوسرے لوگوں نے ان کو کھایا لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرح نفرت سے چھوڑ دیا جیسے گھن کی چیز چھوڑی جاتی ہے اور ان کے کھانے کے لیے بھی کسی کو نہ فرمایا۔ اگر گوہ حرام ہوتی تو آپ کے دسترخواں پر لوگوں کے کھانے میں نہ آسکتی۔ (بخاری شریف)

۱۱۵۹۔ جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم عزل کیا کرتے تھے اور اس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا (متفق علیہ) مسلم کی روایت میں یہ بات اور زیادہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے اس عمل کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کو منع نہیں فرمایا۔ (عزل کا مطلب یہ ہے کہ انزال کے وقت عضو باہر کر لیا جائے تاکہ عورت حاملہ نہ ہو)

۱۱۵۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امر و نہی کا رتبہ تو بہت بلند ہے۔ جو چیز آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش آئے اور اُس پر آپ سکوت فرمالیں تو آپ کا یہ سکوت بھی جواز کی قطعی حجت سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ آپ کے سامنے کوئی ناجائز فعل ہو اور آپ اُس پر سکوت اختیار فرمائیں۔ اب اندازہ فرمالیجیے کہ دین کے باب میں کسی ناجائز بات پر جہاں سکوت کا امکان بھی نہ ہو وہاں خود کسی معصیت کے ارتکاب کرنے کا بھلا کیا امکان ہو سکتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی سرگزشت کا ایک اہم سبق یہی ہے تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

۱۱۵۹۔ صحابہؓ کے اس استدلال کا حاصل یہی ہے کہ اگر یہ بات نادرست ہوتی تو اس کے علم میں آجانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کیسے سکوت فرما سکتے تھے پس جس طرح آپ کا نطق دین کے باب میں حجت تھا اسی طرح آپ کا سکوت بھی حجت تھا بلکہ اس سے زیادہ سکوت و نطق کی ایک ایک ادا بھی دین میں حجت سمجھی جاتی تھی۔

۱۱۶۰۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ وَعِنْدِيْ جَارِيَتَانِ مِنْ جَوَارِي الْاَنْصَارِ تُغَنِّيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتِ الْاَنْصَارُ يَوْمَ بُعَاثٍ قَالَتْ وَلَيْسَتَا بِمُغَنِّيَتَيْنِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَبِمَزَامِيْرِ الشَّيْطَانِ فِيْ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذٰلِكَ فِيْ يَوْمِ عِيْدٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا بَكْرٍ اِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيْدًا وَهٰذَا عِيْدُنَا. رواه البخاری وفی روایۃ عنده فَاضْطَجَعَ (رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم) عَلَى الْفِرَاشِ وَحَوَّلَ وَجْهَهٗ وفی روایۃ عندہ (النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهٖ فَانْتَهَرَهُمَا اَبُوْبَكْرٍ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ وَجْهِهٖ فَقَالَ دَعْهُمَا يَا اَبَا بَكْرٍ.

۱۱۶۰۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ والد بزرگوار ابوبکرؓ تشریف لائے اور اس وقت میرے گھر میں قبیلہ انصار کی دو لڑکیاں وہ اشعار پڑھ رہی تھیں جو انصار نے جنگ بعاث کے موقعہ پر حسب دستور فخریہ طور پر کہے تھے یہ لڑکیاں ڈومنیاں نہ تھیں (یعنی پیشہ ور گانے والی نہ تھیں) صدیق اکبرؓ نے ازراہ سرزنش فرمایا شیطانی آوازیں اور پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں۔ یہ قصہ عید کے دن کا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوبکر! ہر قوم عید مناتی ہے اور یہ ہمارے عید منانے کا دن ہے (بخاری شریف) دوسری روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر اس طرف سے اپنا چہرۂ مبارک پھیر لیا تھا۔ ایک روایت میں اس طرح سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کپڑے سے اپنا چہرۂ مبارک ڈھانکے ہوئے تھے سان لڑکیوں کو ابوبکرؓ نے جھڑکا تو آپ نے اپنے رُخِ انور سے کپڑا اتار کر فرمایا۔ ابوبکر! رہنے دو، (یہ عید کا دن ہے)۔

۱۱۶۰۔ روایت مذکورہ میں دو لڑکیوں کے اشعار پڑھنے کا تذکرہ ضرور ہے مگر وہ لڑکیاں جو نغمہ سے ناواقف تھیں اور نہ پیشہ کرتی تھیں، اشعار بھی وہ جو جنگی ترانے کے تھے اور دن بھی عید کا دن جس میں خوشی منانا عام عادت بھی، ادھر زمانہ وہ تھا جو تقدس و پاکیزگی کا سب سے زرین دور تھا۔ ان قیود کے بعد بھی ابوبکرؓ کی نظروں میں اس کی حقیقت کیا تھی۔ یہ کہ وہ مزامیر شیطان ہے اور یہ کہ آپ کے گھر میں وہ اور زیادہ مکروہ ہے۔ یہ فہم ابوبکرؓ میں کہاں سے پیدا ہوئی تھی اس کا خود اندازہ فرمالیجیے۔ ابوبکرؓ ان کو جھڑکا اور ان کو جھڑکنا لائق تر تھا مگر کیا ابوبکرؓ کے فرمان یا ممانعت کرنے سے شریعت بن سکتی تھی لہٰذا اگر بطور مسئلہ نہ سہی تو بطور مصلحت سہی جو کچھ انہوں نے کیا وہ مناسب کیا مگر یہاں صورت حال کیا ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ضرور ہیں مگر اس جانب سے اپنا رُخ بدلے ہوئے ہیں کپڑا منہ پر ڈھکا ہوا ہے۔ یوں معلوم ہو رہا ہے کہ گویا عالم خواب میں ہیں یا بیدار ہیں تو اس طرف ذرہ برابر کوئی التفات نہیں ہے اب اگر آپ منہ کھول لیتے تو ایک حد تک اس میں آپ کی بھی شرکت ثابت ہوتی اور اگر صریح منع فرما دیتے تو چند گھر کی بچیوں کا خوشی اور عید کے مواقع میں جنگی اشعار پڑھنا بھی حرام کی فہرست میں آجاتا اس لیے منہ بھی نہیں کھولتے اور زبان بھی بند رکھتے ہیں۔ یہ شان شارع کی ہے جن کے نطق و سکوت تو کیا ذرا سی شرکت اور ادنیٰ سے اغماض سے بھی مسائل بن جاتے تھے۔

۱۔ یہ آپ رسول کی عصمت اور اس کی عظمت شان کا اندازہ فرمالیجیے اگر اُن میں معصیت کا ادنیٰ سا بھی شائبہ موجود ہو تو کیا ان کے طبعی رجحانات اور صرف سکوت و اغماض شریعت بن سکتے ہیں

۱۱۶۱۔ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُتِيَ بِشَرَابٍ فَشَرِبَ وَعَنْ يَمِيْنِهٖ غُلَامٌ وَعَنْ يَسَارِهِ الْاَشْيَاخُ فَقَالَ لِلْغُلَامِ اِنْ اَذِنْتَ لِيْ اَعْطَيْتُ هٰؤُلَاءِ فَقَالَ مَا كُنْتُ لِاُوْثِرَ بِنَصِيْبِيْ مِنْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَحَدًا فَتَلَّهٗ فِيْ يَدِهٖ۔ رواہ البخاری۔

الرسول ان لم يكن معصوما فكيف يامنه الله على اهل الارض

۱۱۶۲۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمُ حُنَيْنٍ اٰثَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْقِسْمَةِ

۱۱۶۱۔ سہل ابن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پانی پیش کیا گیا آپ نے اس کو پیا اس وقت آپ کے دائیں جانب ایک نوجوان اور بائیں جانب معمر اور سن رسیدہ اصحاب موجود تھے آپ نے اس نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اجازت دو تو میں بقیہ پانی ان لوگوں کو دیدوں۔ وہ بولے یا رسول اللہ آپ کے جھوٹے پانی میں قدرت نے جو میرا حصہ لگا دیا ہے میں کسی کے لیے بھی اس میں سخاوت نہیں کر سکتا۔ اس پر آپ نے ناگواری سے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دے کر پانی ان کے ہاتھ پر رکھ دیا (بخاری)

رسول اگر معصوم نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ تمام روئے زمین کے حق میں ان پر کیسے اعتماد کر سکتا ہے

۱۱۶۲۔ عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ جنگ حنین کے موقعہ پر جب مال تقسیم کرنے کی نوبت آئی تو آنحضرت صلی

۱۱۶۱۔ جذبات وہ بھی نوعمری کے ایک متحمل سے متحمل انسان کو بھی بے قابو بنا دیتے ہیں یہاں قسمت سے اس نوجوان کو ایک موقعہ ہاتھ آگیا تھا کہ جس پانی سے خاتم الانبیاء علیہم السلام کا دہن مبارک لگ چکا تھا ضابطہ میں وہاں
اگر یہاں اس کے جذبات مچل گئے تو کسی حد تک قابل معذوری ہے مگر جن کی شان اخلاقیات میں سب سے
رنگی بھی وہ چاہتے تھے کہ ان کے رفقاء و اصحاب بھی ان ہی اخلاق سے رنگین ہو جائیں لیکن اس طرح کہ کسی کی
ں نہ ہو اور ایثار کی عالی خصلت کی ترغیب بھی ہو جائے۔ اگر آپ یہ پانی عمر کی رعایت سے معمر لوگوں کو عطا،
دائیں جانب بیٹھنے والے نوعمروں کا آئین میں کوئی حق ہی نہ رہتا اور اگر اظہار ناگواری کیے بغیر پانی حوالہ فرما
ں موقعہ پر ایثار کا کوئی سبق نہ ملتا۔ اس لیے پانی دیا تو مگر ذرا سی ناگواری کے ساتھ کہ اس قسم کے مقامات پر
خلاق کا ہو سکتا تھا اس کا سبق مل جائے۔ آپ کی یہ دونوں ادائیں دو حکم شرعی کی علیحدہ علیحدہ بنیادیں
پس نبی کا صرف قول و فعل ہی نہیں بلکہ اس کا نطق و سکوت بھی بلکہ اس کے نطق و سکوت کی ادائیں
یک حکم شرعی بنجاتی ہیں۔ اگر العیاذ باللہ ان کے قول و فعل میں معصیت کا کوئی ادنیٰ سا احتمال بھی ہو تو کیا ان
یت حاصل ہو سکتی ہے۔ منطقیوں کی اور باتیں جیسی بھی ہوں مگر ان کی ایک یہ بات ہم کو بھی یہاں پسند ہے
حتمال بطل الاستدلال۔ پس اگر ان کے افعال میں کوئی دوسرا احتمال ہو سکتا ہے تو پھر ان کے قول و فعل کو بھی
رجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

۱۔ روایت مذکور کے سب الفاظ کو سامنے رکھ لیجیے آپ کو واضح ہو جائیگا رسولوں کی شان کیا ہونی چاہیے۔

أَعْطَى الْأَقْرَعَ بْنَ حَابِسٍ مِائَةً مِنَ الْإِبِلِ وَأَعْطَى عُيَيْنَةَ مِثْلَ ذٰلِكَ وَأَعْطَى أُنَاسًا مِنْ أَشْرَافِ الْعَرَبِ وَآثَرَهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْقِسْمَةِ قَالَ رَجُلٌ وَاللّٰهِ إِنَّ هٰذِهِ لَقِسْمَةٌ مَا عُدِلَ فِيهَا أَوْ مَا أُرِيدَ فِيهَا وَجْهُ اللّٰهِ فَقُلْتُ وَاللّٰهِ لَأُخْبِرَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَتَيْتُهُ فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ فَمَنْ يَعْدِلُ إِذَا لَمْ يَعْدِلِ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ رَحِمَ اللّٰهُ مُوسٰى قَدْ أُوذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ. رواه البخاری فی الجہاد و فی کتاب الادب ویلک من یعدل اذا لم اعدل و فی المغازی ویلک اولست احق اھل الارض ان یتقی اللہ و فی باب علامات النبوۃ قد خبت وخسرت ان لم اکن اعدل و فی کتاب الانبیاء ص۴۷۲ فقال من یطیع اللہ اذا عصیت أیأمنی اللہ علی اھل الارض ولا تأمنوننی ۔

اللہ علیہ وسلم نے اقرع بن حابس (ایک شخص کا نام) کو سو اونٹ دیدیے اور اتنے ہی اونٹ عیینہ کو (ایک شخص کا نام ہے) اور اسی طرح عرب کے اور چند بڑے بڑے لوگوں کو عطا فرمائے، اور اس دن مال کی تقسیم میں دوسرے لوگوں پر ان کو ترجیح دی۔ اس پر ایک شخص بولا خدا کی قسم اس تقسیم میں تو انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ یا یہ کہا کہ یہ تقسیم خلوص کے ساتھ نہیں کی گئی ہیں نے کہا اچھا خدا کی قسم میں ضرور اس بات کی اطلاع آپ کو دونگا۔ میں حاضر ہوا اور اس واقعہ کی آپ کو خبر دی آپ نے فرمایا اے اگر اللہ اور اس کا رسول بھی انصاف نہ کریگا تو بتاؤ پھر اور کون انصاف کریگا۔ خدا تعالیٰ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر رحم فرمائے ان کو اس سے بھی زیادہ تکلیفیں دی گئیں مگر انہوں نے صبر ہی کیا۔ بخاری شریف میں دوسری جگہ یہ لفظ ہے "تیرا ناس ہو اگر میں انصاف نہ کروں تو اور کون کریگا"۔ کتاب المغازی کے لفظ یہ ہیں "کیا روئے زمین میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خوف کرنے کا میں حقدار نہیں"۔ علامات نبوت میں یہ لفظ ہیں "اگر میں نے انصاف نہ کیا تو میں تو بڑے ٹوٹے میں رہا اور بہت ناکام رہا" کتاب الانبیاء کے الفاظ یہ ہیں "اگر میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں تو پھر اور کون ہے جو اس کی حکم برداری کریگا۔ بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ تم تو مجھے قابل اعتماد نہ سمجھو اور اللہ تعالیٰ ساری روئے زمین کے حق میں مجھ پر اعتماد کرلے۔ (بخاری شریف)

یہاں جس شخص نے آپ کے متعلق بدگمانی کا کلمہ منہ سے نکالا تھا آپ نے اس کے حق میں "ویل" (ہلاکت) کا لفظ فرمایا ہے کیونکہ یہ شخصی توہین نہ تھی بلکہ منصب رسالت کی توہین تھی۔ پھر آپ نے اس کو اس طرح غیر معقول بھی قرار دیا کہ جس کو بندے قابل اعتماد نہ سمجھیں کیا حق تعالیٰ اپنی ساری مخلوق کے حق میں اس کو قابل اعتماد سمجھیگا۔ پھر جب رسول مال کی تقسیم میں قابل اعتماد ہو سکتا ہے تو اپنے اور افعال میں بھی قابل اعتماد کیوں نہیں ہوتا۔ ہم کو روایات سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ کرام نے کہیں آپ کے کسی عمل پر معصیت کا گمان کیا ہو اور جب کسی ناشائستہ شخص کی زبان سے ایسا کلمہ نکلا تو یاد نہیں آتا کہ کبھی آپ نے اس پر اظہار ناگواری نہ فرمایا ہو۔ پھر جب آپ کے صحابہ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنے کسی خاص عمل پر معصیت کا لفظ اطلاق نہیں کیا گیا تو محض عقلی طرز فکر سے کسی کا اس پر معصیت کا اطلاق کرنا کیسے درست ہوگا۔

لو عصی الانبیاء علیہم السلام لغوت امہم

۱۱۶۳۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ أُسْرِيَ بِي لَقِيتُ مُوسٰى قَالَ فَنَعَتَهُ فَإِذَا رَجُلٌ حَسِبْتُهُ قَالَ مُضْطَرِبٌ رَجِلُ الرَّأْسِ كَأَنَّهُ مِنْ رِجَالِ شَنُوءَةَ قَالَ وَلَقِيتُ عِيسٰى فَنَعَتَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَبْعَةٌ أَحْمَرُ كَأَنَّمَا خَرَجَ مِنْ دِيمَاسٍ يَعْنِي الْحَمَّامَ وَرَأَيْتُ إِبْرَاهِيمَ وَأَنَا أَشْبَهُ وَلَدِهِ بِهِ قَالَ وَأُتِيتُ بِإِنَاءَيْنِ أَحَدُهُمَا لَبَنٌ وَالْآخَرُ فِيهِ خَمْرٌ فَقِيلَ لِي خُذْ أَيَّهُمَا شِئْتَ فَأَخَذْتُ اللَّبَنَ فَشَرِبْتُهُ فَقِيلَ لِي هُدِيتَ الْفِطْرَةَ أَوْ أَصَبْتَ الْفِطْرَةَ أَمَا إِنَّكَ لَوْ

اگر انبیاء علیہم السلام معصیت کریں (والعیاذ باللہ) تو اُن کی اُمتیں گمراہ ہو کر رہ جائیں

۱۱۶۳۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شب میں مجھ کو معراج ہوئی تھی تو موسیٰ علیہ السلام سے بھی میری ملاقات ہوئی، اس کے بعد آپ نے اُن کا حلیہ اس طرح بیان فرمایا کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چھریرے جسم کے سر کے بال کچھ خمیدہ اور کچھ سیدھے جیسے ان میں کنگھی کی گئی ہو، بس ایسے تھے جیسے شنوءۃ قبیلہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے ان کا حلیہ بیان فرمایا، میانہ قد، سرخ رنگ کے ایسے نہائے دھوئے جیسے ابھی ابھی حمام سے نکلے ہیں اس شب میں میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی دیکھا، اگر ان کی اولاد میں ان کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ شخص کو دیکھنا ہو تو وہ مجھ کو دیکھ لو اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ میرے سامنے دو برتن لائے گئے ایک میں دودھ اور دوسرے میں شراب تھی اور امتحان کے طور پر مجھ سے کہا گیا ان میں سے کونسا جام لیتے ہو؟ میں نے اُٹھا کر دودھ کا جام لے لیا اور اس کو پی لیا۔ اُس وقت مجھ سے کہا گیا آپ نے ٹھیک فطرت کے مطابق انتخاب کیا، یا آپ نے منشاء فطرت کو پالیا۔ اور خوب سُن لو اگر کہیں تم شراب والا جام

۱۱۶۳۔ رسول کا معنوی علاقہ اپنی اُمت کے ساتھ والد اور اولاد کے ظاہری علاقہ سے کہیں قوی تر ہوتا ہے پھر جب والد کے خصائل کا اولاد میں ظاہر ہونا ضروری ہے تو رسول کی کسی فروگزاشت کا اثر اس کی امت میں کیونکر ظاہر نہ ہو۔ صحیح حدیث میں ہے فنسی آدم فنسیت ذریتہ خطأ آدم فخطأت ذریتہ یعنی آدم علیہ السلام سے نسیان ہوا تو ان کی ذریت میں بھی یہ خصلت ظاہر ہو کر رہی اور آدم علیہ السلام سے ذرا چوک ہو گئی تو یہ ذرا سا نقص ان کی اولاد میں بھی نظر آ رہا۔ اسی طرح اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں دوسرا جام اختیار فرما لیتے تو یہ معصیت کی طرف آپ کے رجحان کی دلیل ہوتی، پھر کیسے ممکن تھا کہ آپ کی اُمت کا قدم سنبھل سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی وقت اپنی امت کے تمام کمالات

أَخَذَتِ الْخَمْرَ غَوَتْ أُمَّتُكَ . رواه البخاري

الوسوسة بما يخالف عصمة الرسول العظيم صلى الله عليه وسلم مما يخشى منه الهلاك

۱۱۶۴۔ أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ أَنَّ صَفِيَّةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرَتْهُ أَنَّهَا جَاءَتْ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَزُورُهُ فِي اعْتِكَافِهِ فِي الْمَسْجِدِ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ فَتَحَدَّثَتْ عِنْدَهُ سَاعَةً ثُمَّ قَامَتْ تَنْقَلِبُ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهَا يَقْلِبُهَا حَتَّى إِذَا بَلَغَتْ بَابَ الْمَسْجِدِ عِنْدَ بَابِ أُمِّ سَلَمَةَ مَرَّ رَجُلَانِ

لے لیتے تو تمہاری ساری اُمت گمراہ ہو جاتی۔ (بخاری شریف)

آپ کی عصمت کے خلاف قلب میں وسوسہ بھی ایسی خطرناک بات ہے جس سے ہلاکت کا خطرہ ہے

۱۱۶۴۔ علی بن حسینؓ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت صفیہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبی نے اُن سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ وہ دورانِ اعتکاف میں آپ کی زیارت کے لیے مسجد میں آئیں۔ یہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا موقع تھا، تھوڑی دیر آپ سے بات چیت کی پھر رخصت ہونے کے لیے کھڑی ہوئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو رخصت فرمانے کے لیے ان کے ساتھ ساتھ تشریف لے چلے یہاں تک کہ جب وہ مسجد کے اس دروازہ کے پاس پہنچیں جو حضرت ام سلمہؓ کے دروازہ کے متصل تھا تو دو انصاری

کے لیے مصدر و مرکز ہوتا ہے، امت کے جملہ کمالات اپنے نبی کے کمال کا فیض ہوتے ہیں اسی لیے جو افضل الرسل تھے ان کی اُمت خیر الامم کہلائی۔ اب اگر نبی میں اصولی لحاظ سے کسی معصیت کا امکان ہو والعیاذ باللہ تو پھر جو بالطبع عاصی ہوں ان کی کیا گت بن کر رہ جائے۔ اسی لیے نبی کو معصوم فطرت پیدا کیا جاتا تاکہ اس کی اُمت کشاں کشاں معصیت سے معصومیت کا رنگ اختیار کرتی چلی جائے اور اس طرح پھر اس جنت کی مستحق بن جائے جس کی آبادی کے لیے معصومیت شرط اول ہے۔ آدم علیہ السلام سے ذرا سی غلطی ہوگئی تو عصمت کے باوجود جنت چھوڑنے پر مجبور ہو گئے پھر جب تک عاصی انسان اپنی معصیت کی سزا بھگت کر معصومیت کا رنگ اختیار نہ کر لے جنت میں بھلا کیسے داخل ہو سکتا ہے خدا تعالیٰ کے مقدس رسول چونکہ اسی عالم میں جنت کی مخلوق ہوتے ہیں اس لیے وہ اہل جنت کی طرح معصوم بھی ہوتے ہیں، تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ واضح رہے کہ اس امتحان کا نظارہ صرف آپ کی فطرت کی عصمت کے اظہار کے لیے تھا، اسی لیے دوسری صورت کو صرف فرضی طریقہ پر ادا کیا گیا ہے تاکہ نبی اور امتی کا باہم اندرونی جلاء معلوم ہو جائے۔ آب حیات میں حضرت مولانا نانوتویؒ نے اس کی خوب تشریح فرمائی ہے عوام کے ڈر سے اس کا نقل کرنا مناسب نہیں علماء دیکھ لیں۔

۱۱۶۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحالت اعتکاف تھے اگر یہاں شیطان کوئی وسوسہ ڈالتا تو یہی کہ یہ نقاب پوش کوئی اجنبی عورت نہ ہوں والعیاذ باللہ پھر اجنبی عورت سے تنہائی میں گفتگو اور بات چیت اگر معصیت تھی تو کس درجہ کی معصیت تھی اس کے بعد آپ کا کس اہتمام سے اس کا بھی ازالہ فرمانا وہ بھی اس لیے نہیں کہ صحابہؓ سے اس بدگمانی

مِنَ الْاَنْصَارِ فَسَلَّمَا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَھُمَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی رِسْلِکُمَا اِنَّمَا ھِیَ صَفِیَّۃُ بِنْتُ حُیَیٍّ فَقَالَا سُبْحَانَ اللّٰہِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَبُرَ عَلَیْھِمَا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّیْطَانَ یَبْلُغُ مِنَ الْاِنْسَانِ مَبْلَغَ الدَّمِ وَاِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ یَّقْذِفَ فِیْ قُلُوْبِکُمَا شَیْئًا وفی روایۃ فتھلکا. وفی روایۃ عبد الرحمن بن اسحاق ما اقول لکما ھذا ان تکونا تظنان شرا ولکن قد علمت الخ

الانبیاء علیھم الصلوۃ والسلام ومکانتھم فی التشریع

۱۱۶۵۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا اَیُّھَا

شخصوں کا اس طرف سے گزر ہوا انہوں نے آپ کو سلام کیا۔ آپ نے اُن سے فرمایا ذرا ٹھہرنا دیکھو یہ میری ساتھ صفیہ ہیں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ سبحان اللہ آپ یہ کیا فرماتے ہیں اور آپ کا یہ فرمان ان کے لیے بڑی محجوبی کا باعث بن گیا۔ اس پر آپ نے فرمایا شیطان انسان میں خون کی طرح گھوم جاتا ہے۔ مجھ کو اس کا خطرہ ہوا مبادا تمہارے دل میں کوئی وسوسہ ڈالے اور اس کی وجہ سے تم خواہ مخواہ ہلاک ہو جاؤ۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ یہ بات میں نے اس لیے نہیں کہی تھی کہ تم کوئی بدظنی کرتے بلکہ بات یہ ہے کہ میں خوب جانتا ہوں کہ کبھی شیطان دل میں غیر اختیاری وساوس ڈال دیتا ہے۔ (بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تشریع میں

۱۱۶۵۔ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خطبہ دیتے ہوئے فرمایا

کا کوئی اندیشہ تھا جیسا کہ خود آپ نے صاف فرما دیا کہ میرا یہ کہنا اس بنا پر نہیں ہے کہ تمہارے دل میں اس قسم کی کوئی بدگمانی موجود ہے بلکہ صرف اس لیے ہے کہ بعض مرتبہ شیطان غیر اختیاری طور پر دل میں بے بات بے سبب کوئی وسوسہ ڈال دیتا ہے صرف اس کی پیش بندی کے لیے میں نے تم کو خبردار کیا ہے مگر اس غیر اختیاری وسوسہ کا وہ بھی صرف ایک اجنبی عورت سے تنہائی میں ملاقات کا اثر کیا ہوتا؟ تمہاری ہلاکت اور آخرت کی بربادی۔ اب اس سے اندازہ فرمالیجیے کہ نبی کی شان عصمت کیا ہوتی ہے یہ کہ اگر اس کے خلاف ذرا سا وسوسہ بھی دل میں آئے اور جم جائے تو ایمان کی خیریت نہیں رہتی۔ کیا والعیاذ باللہ اگر رسول معصوم نہ ہوں تو ان کی شان یہی ہونی چاہیے۔

۱۱۶۵۔ اسلام میں نبی کی حیثیت ایک مقنن کی حیثیت قرار دی گئی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے جابجا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا بھی مستقل حکم دیا ہے گو رسول کا جو حکم بھی ہے وہ خدا تعالیٰ ہی کے حکم کے تحت ہوتا ہے مگر حکمت الٰہیہ کا تقاضہ یہی تھا کہ کچھ باتوں کا حکم تو وہ براہ راست خود دے اور کچھ باتیں ایسی بھی چھوڑ دے جن کا حکم وہ براہ راست

النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوا فَقَالَ رَجُلٌ أَكُلَّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللهِ فَسَكَتَ حَتّٰى قَالَهَا ثَلَاثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُوْنِي مَا تَرَكْتُكُمْ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلٰى أَنْبِيَائِهِمْ فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوْهُ۔ رواہ مسلم۔

۱۱۶۶۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّخَذَ حُجْرَةً فِي الْمَسْجِدِ مِنْ حَصِيْرٍ فَصَلّٰى فِيْهَا لَيَالِيَ حَتّٰى اجْتَمَعَ عَلَيْهِ نَاسٌ ثُمَّ فَقَدُوْا صَوْتَهٗ لَيْلَةً وَظَنُّوْا أَنَّهٗ قَدْ نَامَ

لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر حج فرض قرار دیا ہے اس لیے حج ادا کیا کرو۔ اس پر ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ کیا ہر سال۔ آپ خاموش رہے یہاں تک کہ جب اُس نے تین بار یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا اگر میں اس کا اقرار کرلیتا اور ہاں کہہ دیتا تو ہر سال تم پر حج فرض ہوجاتا۔ پھر تم ہر سال حج ادا نہ کرسکتے اس کے بعد اصولی طور پر یہ نصیحت فرمائی کہ جب تک میں خود تم سے کچھ نہ کہا کروں تم بھی مجھ سے کچھ نہ پوچھا کرو، کیونکہ تم سے پہلی اُمتیں جو ہلاک ہوئی ہیں وہ ان ہی بیجا سوالات اور اپنے انبیاء علیہم السلام کے سامنے بیجا اختلافات کی بدولت ہی ہلاک ہوئی ہیں۔ لہٰذا جب میں تم کو کسی بات کا حکم دیا کروں تو اپنے مقدور بھر اُس کو بجالایا کرو اور جس بات سے روک دیا کروں بس اس کو یک قلم چھوڑ دیا کرو (مسلم)

۱۱۶۶۔ زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ماہ رمضان میں) اپنی مسجد میں ایک بوریے کا حجرہ سا بنالیا تھا چند شب آپ نے اسی کے اندر نماز ادا کی یہاں تک کہ لوگ بھی آپ کے پیچھے آآکر نماز میں شریک ہونے شروع ہوگئے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ لوگوں نے آپ کی آواز نہ سنی اور گمان

خود نہ دے بلکہ اس کا رسول دیدے۔ ادھر حاکم علی الاطلاق کو مقصود یہی تھا کہ قطعیت کے جس مرتبہ میں تمام قرآن کی حفاظت ہو اس درجہ میں ہر حدیث کی حفاظت نہ ہو اور اس طرح حفاظت کی نوعیت کے فرق سے کہیں کہیں ان کی قطعیت میں بھی فرق پڑجائے اور اس طرح کمزور اُمت کی تقصیرات میں یہ کچھ خفت کا سبب بن جائے۔ اگر کہیں ہر ہر حکم اسی مرتبہ میں آجاتا جس میں کہ قرآن پاک کی آیات تھیں تو شاید اس اُمت کے عاصیوں کا معاملہ بہت زیادہ نازک ہوجاتا۔ آنحضرت نے صرف اتنے ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ اپنے رسول کے ساتھ زیادہ کھود کرید کرنے کی ممانعت بھی فرمادی تاکہ ابہام اور اجمال سے کمزوروں کو جتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ اور پہنچ جائے۔ نیز یہ رسول کے خود اپنے فرائض میں داخل ہے کہ جو تفصیلات ضروری ہوں ان کو وہ خود اپنی جانب سے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کردے کیونکہ اس کو مبین ہی کی حیثیت سے بھیجا جاتا ہے۔ پس جہاں اس نے سکوت اختیار کرلیا تم کو بھی چاہیے کہ وہاں سکوت اختیار کرلو اور زیادہ سوال وجواب کی چپقلش میں نہ پڑو ورنہ یہ اس پر بھی کوتاہی کے ایک الزام کے مرادف ہوگا۔ ادھر نزول وحی کے زمانہ میں تم جتنی زیادہ تفصیلات کے درپے ہوگے وہ سب کھول دی جائینگی، پھر وہ تمہارے ہی حق میں تکلیف کا سامان بن جائینگی، لہٰذا خاموشی کے ساتھ سکوت کرنے میں رسول کا احترام بھی ملحوظ رہتا ہے اور تمہاری بہتری بھی اسی میں مضمر ہے۔ ضروری بات تم سے پوشیدہ نہیں رکھی جائیگی، غیر ضروری بات کا سوال تم مت کیا کرو۔ رسول کی عظمت کا اس سے اندازہ فرمالیجیے کہ اس کی ایک جنبش لب سے

فرض وحرمت بھی پیدا ہوسکتی ہے

فَجَعَلَ بَعْضُهُمْ يَتَنَحْنَحُ لِيَخْرُجَ اِلَيْهِمْ فَقَالَ مَا زَالَ بِكُمُ الَّذِيْ رَاَيْتُ مِنْ صَنِيْعِكُمْ حَتّٰى خَشِيْتُ اَنْ يُكْتَبَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ كُتِبَ عَلَيْكُمْ مَا قُمْتُمْ بِهٖ فَصَلُّوْا اَيُّهَا النَّاسُ فِيْ بُيُوْتِكُمْ فَاِنَّ اَفْضَلَ صَلٰوةِ الْمَرْءِ فِيْ بَيْتِهٖ اِلَّا الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ. متفق علیہ

۱۱۶۷۔ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَاهُ غَنَمًا يَقْسِمُهَا عَلٰى صَحَابَتِهٖ ضَحَايَا فَبَقِيَ عَتُوْدٌ فَذَكَرَهٗ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ضَحِّ بِهٖ اَنْتَ. متفق علیہ وفی روایۃ ابی بردۃ اذبحہا ولن تجزئ عن احد بعدک۔ ونحوہ قصۃ زید بن خالد عند ابی داؤد وابی زید الانصاری عند ابن ماجۃ

یہ کیا کہ شاید آپ خواب استراحت فرما رہے ہیں تو کسی کسی نے کھانسنا بھی شروع کیا تاکہ آپ نماز کے لیے باہر تشریف لے آئیں آخر آپ نے فرمایا تمہارے ذوق وشوق کے ساتھ آ آ کر اقتداء کرنے کا یہ معاملہ میں سب دیکھتا رہا ہوں یہاں تک کہ مجھ کو یہ اندیشہ ہوگیا کہ یہ نماز کہیں تم پر فرض قرار نہ دیدی جائے پھر تم اس کو ادا نہ کرسکو۔ تو لوگو آئندہ سے تم یہ نماز اپنے اپنے گھروں میں ہی ادا کرلیا کرو۔ کیونکہ فرض نماز کو مستثنیٰ کرکے آدمی کی جتنی اور نمازیں ہیں وہ سب گھروں میں ہی افضل ہوتی ہیں۔ متفق علیہ

۱۱۶۷۔ عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ بکریاں ان کے سپرد کیں تاکہ وہ ان کو قربانی کے لیے آپ کے صحابہ میں تقسیم کردیں (چنانچہ اُنھوں نے بکریاں تقسیم کردیں) آخر میں صرف ایک بکری بچ رہی جو پورے سال کی نہ تھی آپ نے فرمایا چلو بس تم تو اس کی قربانی کر ہی لو۔ متفق علیہ۔ ابو بردہ کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ خیر تم تو اس کو ذبح کردو مگر تمہارے بعد اس عمر کی بکری آئندہ کسی شخص کے لیے بھی کافی نہ ہوگی۔ اسی قسم کا ایک واقعہ زید بن خالد کا ابوداؤد میں اور ابوزید انصاری کا ابن ماجہ میں موجود ہے۔

۱۱۶۶۔ نبی کے نطق وسکوت کا رتبہ تو بہت بلند ہے یہاں اس کی انفرادی عبادت میں اجازت کے بغیر سکوت کے ساتھ شرکت کرنا بھی معمولی بات نہیں ہوتی بعض مرتبہ وہ عبادت صرف اسی کی ذات کے لیے مناسب ہوتی ہے اس میں جاجا کر شریک ہونا چھوٹا منہ بڑی بات ہے بعض مرتبہ وہ اس کی خصوصیت تو نہیں ہوتی مگر اس میں شرکت کرنا کسی بڑی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے جیسے یہاں کہ نزول وحی کا زمانہ تھا احکام میں کمی وبیشی جاری تھی۔ اس مبارک مہینہ میں اس طرح ذوق وشوق کے ساتھ مبارک اجتماع پھر کس مبارک نبی کی اقتداء میں اس کو فرشتے بھی دیکھ کر غبطہ کرسکتے تھے بہت ممکن تھا کہ ملأ اعلیٰ میں اس کو وہ شرف قبول حاصل ہوجاتا اس کو فرض ہی قرار دیدیا جاتا پھر آئندہ ضعفاء امت کے لیے یہ مشکلات در مشکلات کا سبب بن جاتا۔ اس جگہ حجۃ اللہ ص ۹۶ ضرور ملاحظہ کرلی جائے۔

۱۱۶۷۔ یہاں قربانی کے جانور میں ایک شخص کو آپ کا استثناء فرمادینا صحیح سند کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ حسب آیت النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات چونکہ خود مومنوں کی جانوں سے زیادہ ان کی خیر خواہ تھی اس لیے جس طرح والد کو اولاد پر ولایت حاصل ہوتی ہے اسی طرح آنحضرت (باقی بر ص ۴۲۳)

۱۱۶۸- عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ وَالْمُتَنَمِّصَاتِ وَالْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ الْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ فَجَاءَتْهُ امْرَاَةٌ فَقَالَتْ اِنَّهٗ بَلَغَنِيْ اَنَّكَ لَعَنْتَ كَيْتَ وَكَيْتَ فَقَالَ مَا لِيْ لَا اَلْعَنُ مَنْ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ هُوَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ (تعالٰی) فَقَالَتْ لَقَدْ قَرَاْتُ مَا بَيْنَ اللَّوْحَيْنِ فَمَا وَجَدْتُ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ قَالَ لَئِنْ كُنْتِ قَرَاْتِيْهِ لَقَدْ وَجَدْتِيْهِ اَمَا قَرَاْتِ مَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا قَالَتْ بَلٰى قَالَ فَاِنَّهٗ قَدْ نَهٰى عَنْهُ ۔ متفق علیہ

۱۱۶۸- عبداللہ بن مسعود نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر لعنت کرے جو جسم کو گودتی ہیں یا گدواتی ہیں، یا خوبصورتی کے لیے بال نچواتی ہیں یا دانتوں کے درمیان جھری کھلواتی ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی خلقت بدلنا چاہتی ہیں اتنے میں ایک عورت آئی اور اس نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس قسم کی عورتوں پر لعنت فرماتے ہیں انہوں نے فرمایا جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اور اللہ تعالیٰ نے بھی لعنت فرمائی ہو میں ان پر کیوں لعنت نہ کروں۔ اس نے کہا کہ قرآن شریف تو میں نے بھی پڑھا ہے مگر اس میں میں نے تو وہ بات کہیں نہیں پڑھی جو آپ فرماتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا اگر تو قرآن ذرا سمجھ کر پڑھتی تو جو بات میں کہتا ہوں ضرور ضرور اس میں دیکھ لیتی کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی مَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ الخ جو بات تم کو رسول بتائے اس کو قبول کر لو اور جس بات سے روک دے اس سے رک جاؤ۔ اس نے کہا یہ آیت تو پڑھی ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان افعال کی ممانعت فرمائی ہے اس لیے ان کو کرنا قرآن ہی کا حکم کہا جائیگا) (متفق علیہ)

(بقیہ نوٹ ص۴۲۱) صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑھ کر مومنوں کی جان ومال پر ولایت حاصل تھی اور اس لیے آپ کو ان کی جان، مال میں ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل تھا۔ اگر آپ چاہیں تو کسی کا نکاح فرما دے سکتے تھے اور اگر کوئی اپنے غلام پر ظلم کرے تو آپ اس کو اپنی جانب سے آزاد بھی کر سکتے تھے بعض حدیثوں کی جوابدہی کے ضمن میں کچھ علماء کی رائے اس طرف بھی ہے۔ اس لیے ترجمان السنۃ ص۹۴ حدیث ۴۶ کے تشریحی نوٹ میں ہم نے جو یہ لکھا ہے کہ "بعض مقامات پر رسول جیسی شخصیت کو بھی آئینی دست اندازی کا کوئی حق نہیں ہوتا" اس کی بجائے اب اس کو اس طرح درست فرمالیجیے "یہاں پہنچ کر رسول جیسی شخصیت بھی آئینی دست اندازی نہیں کرتی اور صرف اتنے ہی پر اکتفا کر لیتی ہے کہ اپنی رائے کا اظہار کر دے اور بس" (تنبیہ) بعض حدیثوں میں ایک شخص کے لیے نمازوں کے متعلق بھی آپ کے استثناء فرمانے کا ایک واقعہ اور دوسرا ایک عورت کے لیے نوحہ کرنے کی اجازت دینے کا واقعہ بھی ملتا ہے بعض علماء نے ان دونوں واقعات کو بھی اسی جنس کے واقعات میں شمار کیا ہے لیکن ان کے متعلق جو رائے ناقص ہماری تھی ہم پہلے اس کا اظہار کر چکے ہیں۔ دیکھو ترجمان السنۃ ص۱۳۵ و ص۱۳۹

۱۱۶۸- احادیث سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہؓ نے احکام یا غیر احکام میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان کہیں تفریق کی ہو۔ منکرین حدیث کی یہ سخت جرأت ہے کہ تشریع احکام میں رسول کا کوئی مقام ہی تسلیم نہیں کرتے اور اس بہانہ سے در پردہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے بھی دست بردار ہونا چاہتے ہیں حالانکہ کتاب اللہ اور احادیث ہی نہیں بلکہ دین کی تاریخ از اول تا آخر اس کے خلاف ہے۔

۱۱۶۹- عَنْ سَهْلَةَ اِمْرَءَةِ اَبِیْ حُذَيْفَةَ اَنَّهَا ذَكَرَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَالِمًا مَوْلٰی اَبِیْ حُذَيْفَةَ وَدُخُوْلَهٗ عَلَيْهَا فَاَمَرَهَا اَنْ تُرْضِعَهٗ فَاَرْضَعَتْهُ وَهُوَ رَجُلٌ كَبِيْرٌ بَعْدَ مَا شَهِدَ بَدْرًا۔ اخرجہ ابن سعد والحاکم کما فی الخصائص ص۲۶۳

۱۱۷۰- عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اَبٰی سَائِرُ اَزْوَاجِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّدْخِلْنَ عَلَيْهِنَّ اَحَدًا بِهٰذَا الرَّضَاعِ وَقُلْنَ اِنَّمَا هٰذَا رُخْصَةٌ مِّنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِسَالِمٍ خَاصَّةً۔ اخرجہ الشیخان۔

۱۱۷۱- عَنْ اَبِی النُّعْمَانِ الْاَزْدِیِّ قَالَ زَوَّجَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِمْرَءَةً عَلٰی سُوْرَةٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ وَقَالَ لَا يَكُوْنُ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِكَ مَهْرًا۔ رواہ سعید بن منصور مرسلاً وفیہ من لا یعرف واخرج ابوداؤد عن مکحول قال لیس هٰذا لاحد بعد النبی صلی

۱۱۶۹- سہلہ جو ابوحذیفہؓ کی بیوی تھیں کہتی ہیں کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سالم کے متعلق تذکرہ کیا یہ ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام تھے کیا وہ ان کے گھر اب بھی آمد و شد رکھ سکتے ہیں تو آپ نے فرمایا۔ جاؤ ان کو اپنا دودھ لے کر پلا دو چنانچہ انہوں نے اپنا تھوڑا سا دودھ نکال کر ان کو پلا دیا اس وقت یہ پورے مرد تھے اور جنگ بدر میں شریک ہو چکے تھے۔ (حاکم)

۱۱۷۰- حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اس قسم کی رضاعت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ ازواج نے اختلاف رائے ظاہر کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ خاص سالم ہی کے لیے اجازت تھی۔ عام مسئلہ نہیں تھا۔ (متفق علیہ)

۱۱۷۱- ابونعمان ازدی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کا نکاح قرآن کی ایک سورت پر پڑھا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ تمہارے بعد یہ مہر کسی اور شخص کا نہیں ہو سکیگا۔ اس حدیث کی اسناد ضعیف در ضعیف ہیں لیکن ابوداؤد میں ہے کہ مکحول کی ذاتی رائے یہی تھی کہ جن واقعات میں

۱۱۷۰- یعنی مدت رضاعت کے بعد دودھ پلانا جائز نہیں اور اس کا کوئی اثر بھی نہیں ہے اور نہ ایسے آدمی کو رضاعی ولد یا رضاعی بھائی کہا جا سکتا ہے سہلہ کی روایت اگر صحیحین کی نہ ہو مگر حضرت ام سلمہؓ کی روایت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض مواضع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عام قوانین سے مستثنیٰ کرنے کا شرعی حق بھی حاصل تھا۔

۱۱۷۱- مہر کے باب میں ایک شخص کو عام قانون سے مستثنیٰ کرنے کی یہ دوسری مثال ہے گو براہ راست رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے ثبوت میں کلام ہو مگر مکحول وغیرہ کے بیانات سے کسی درجہ میں اس کی تائید ہو جاتی ہے ہماری غرض یہاں ان مسائل پر روشنی ڈالنی نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا ہے کہ عموم قاعدہ سے استثناء کرنے کا حق بھی آپ کو حاصل تھا اور یہ حقیقت صحیح احادیث سے بھی ثابت ہے ایک موقعہ پر خطبہ دیتے ہوئے جب آپ نے حرم مکہ کی گھاس کاٹنے کی ممانعت

اللہ علیہ وسلم واخرج ابن عوانہ عن اللیث بن سعد نحوہ کذا فی الخصائص ص ۲۶۳

۱۱۷۲- عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُعَلّٰی قَالَ کُنْتُ اُصَلِّیْ فِی الْمَسْجِدِ فَدَعَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ اُجِبْہُ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ کُنْتُ اُصَلِّیْ فَقَالَ اَلَمْ یَقُلِ اللّٰہُ. اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ. ثُمَّ قَالَ لِیْ لَاُعَلِّمَنَّکَ سُوْرَۃً ھِیَ اَعْظَمُ السُّوَرِ فِی الْقُرْاٰنِ قَبْلَ اَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِیْ فَلَمَّا اَرَادَ اَنْ یَّخْرُجَ قُلْتُ لَہٗ اَلَمْ تَقُلْ لَاُعَلِّمَنَّکَ سُوْرَۃً ھِیَ اَعْظَمُ سُوْرَۃٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ھِیَ السَّبْعُ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِیْمُ الَّذِیْ اُوْتِیْتُہٗ. رواہ البخاری

الرسول العظیم وعصمۃ رأیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القرآن

۱۱۷۳- عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَاہُ السَّائِلُ وَرُبَّمَا

صحتِ سند کے ساتھ قرآن کریم کا مقرر ہونا ثابت ہوتا ہے وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت پر محمول ہے۔

۱۱۷۲- ابو سعید روایت کرتے ہیں ایسا ہوا کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آواز دی تو میں نماز میں تھا اس لیے آپ کو جواب نہ دے سکا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور معذرت کی یا رسول اللہ میں نماز میں تھا اس لیے جواب نہ دے سکا۔ آپ نے فرمایا کیا فرمانِ الٰہی یہ نہیں استجیبوا للہ وللرسول الخ یعنی رسول جس وقت بھی تم کو اس بات کے لیے بلائے جو تمہاری حیات کا موجب ہو تو فوراً اللہ اور اس کے رسول کو لبیک کہا کرو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا مسجد سے باہر نکلنے سے پہلے پہلے میں تم کو وہ سورت بتاؤں گا جو قرآن کریم کی تمام سورتوں میں سب سے بڑی شان کی سورت ہو اس کے بعد آپ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب آپ مسجد سے باہر نکلنے لگے تو میں نے عرض کی آپ نے تو فرمایا تھا میں تجھ کو قرآن کریم کی سب سے افضل سورت بتاؤں گا آپ نے فرمایا (تو سن لو) وہ سورت الحمد للہ رب العالمین والی سورت ہو یہی سبع مثانی ہو اور یہی وہ قرآن عظیم ہے جو مجھ کو عطا ہوا ہو۔ (بخاری شریف)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کی عصمت

۱۱۷۳- ابو موسیٰ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی سائل یا کوئی

فرمائی تو ایک صحابی نے کھڑے ہو کر "اذخر" کے استثناء کی درخواست پیش کی کیونکہ یہ گھاس لوگوں کی بہت سی ضروریات میں مستعمل تھی۔ آپ نے اس کو منظور فرما لیا۔ اس جگہ ان سب کا استقصا کرنا منظور نہیں ہے۔

قَالَ جَاءَہُ السَّائِلُ اَوْ صَاحِبُ الْحَاجَۃِ قَالَ اِشْفَعُوْا فَلْتُؤْجَرُوْا وَیَقْضِی اللّٰہُ عَلٰی لِسَانِ رَسُوْلِہٖ مَا شَاءَ۔ رواہ البخاری قلت ومن ھذا الباب ما روی مرفوعا فی شأن عمرؓ جعل اللّٰہ الحق علٰی لسان عمرؓ۔

صاحب ضرورت آتا (راوی کو لفظوں میں شک ہے) تو آپ فرماتے۔ تم لوگ تو ضرورت مندوں کی سفارش کر دیا کرو اور اس پر ثواب کماتے جاؤ، رہا اس کے فیصلہ کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی زبان سے جو فیصلہ چاہیگا صادر فرما دیگا (بخاری شریف)

۱۱۷۳۔ دیکھیے حدیث مذکور میں یوں نہیں فرمایا گیا کہ "تم سفارش کیے جاؤ اور رسول جو چاہیگا وہ فیصلہ فرما دیگا" بلکہ یوں فرمایا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی زبان سے جو فیصلہ چاہیگا صادر فرما دیگا"۔ اس تعبیر میں یہ اشارہ ہے کہ رسول دوسرے حاکموں کی طرح صرف اپنی رائے سے فیصلے نہیں فرماتے بلکہ اُن کی زبان خداوندی احکام کے اجراء کے لیے صرف ایک آلہ ہوتی ہے حکم درحقیقت یہاں اللہ تعالیٰ ہی کا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولوں کے سب فیصلے ناطق اور ناقابل اپیل ہوتے ہیں ان سے معارضہ کرنا کفر اور ان میں ذرا تردد کرنا بھی مومن کی شان سے بعید ہوتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ رسالت کی حقیقت ہے کیا اور جو عقلاء زمانہ کہلاتے ہیں وہ اس کو سمجھے کیا ہیں۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار رکھیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

تمہارے پروردگار کی قسم جب تک یہ لوگ اپنے جھگڑوں میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور تم جو فیصلہ کر دو اس سے اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں اس وقت تک مومن نہ ہونگے۔

تیسری جگہ ارشاد ہے:۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ

ہم نے آپ پر قرآن سچائی کے ساتھ اُتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات میں اس رائے کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھائے

پہلی آیت میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کا فیصلہ ایک ہی قرار دیا گیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ یہاں قوت حاکمہ بہر کیف ایک ہی رہتی ہے اگرچہ بظاہر حاکم دو نظر آئیں اسی طرح یہاں فیصلہ بھی ایک ہی ہوتا ہے اگرچہ اس کی نسبت الگ الگ ہو۔ رسول کے فیصلوں کی اس اہمیت کے بعد جو دفعہ اس سے بھی زیادہ اہم بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے فیصلہ کے بعد سب اختیارات معطل ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اس کی آزادی رائے بھی سلب ہو جاتی ہے اور یہ اس لیے کہ خالق کے فیصلہ کے سامنے مخلوق کو ادنیٰ سی سرتابی کرنے کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا۔ رسول کا فیصلہ چونکہ بعینہٖ خالق کا فیصلہ سمجھا جاتا ہے اس لیے جو حقوق خالق کے فیصلے کے ہیں وہی رسول کے فیصلے کے سمجھے جاتے ہیں

اس بارے میں آیت بالا میں خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے مابین کوئی تفریق نہیں کی گئی۔

دوسری آیت میں اس سے زیادہ یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ مخلوق کے ذمہ یہاں اس سے پہلے ایک فرض اور عائد ہوتا ہے وہ یہ کہ اپنے ہر معاملہ کا مرافعہ خواہ وہ باہمی نزاعات ہی کا کیوں نہ ہو رسول ہی کی خدمت میں کرے۔ رسول کی موجودگی میں کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملہ کا مرافعہ اس کے سوا کسی اور شخصیت کے سامنے لیجائے اور نہ کسی دوسرے انسان کا یہ حق ہے کہ وہ رسول کی موجودگی میں کوئی فیصلہ دے سکے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی اہم مخلوق کے ذمہ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کے ہر فیصلہ پر اپنے قلب میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کرے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس منفی جزء کے بعد وہ دوسرے اثباتی جزء کا فرض بھی ادا کرے یعنی اپنے اعتراف و تسلیم کا بھی سر خم کردے۔ امام رازی آیت بالا کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ منفی جزء کا حاصل انقیاد باطن ہے اور مثبت جزء کا حاصل انقیاد ظاہر ہے اور دونوں جزء کا منشاء یہ ہے کہ رسول کے فیصلہ کا حق یہ ہے کہ وہ اپنے جسم و جان سے اس پر راضی ہو جائے۔ ایسی رضا جس میں انحراف یا کراہت قلبی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہ رہے۔

واضح رہے کہ ظاہر کے انقیاد کا ایک مرتبہ تو انقیاد باطن سے بھی پہلے ہوتا ہے اور یہ اس کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔ ایمان و اسلام ابتداء میں انسان کے صرف جوارح اور ظاہر تک محدود رہتا ہے پھر رفتہ رفتہ اس کے باطن میں سرایت کرتا ہے حتیٰ کہ جب انسان کا باطن ایمان کامل کے رنگ سے رنگین اور اس کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو پھر باطن کا اثر لوٹ کر اس کے جوارح پر بھی نظر آنے لگتا ہے۔ انقیاد ظاہر کا یہ مرتبہ کمال ایمان کے آثار میں سے ہے اور یہ صرف اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہوتا ہے۔ مثال کے طور سے یوں سمجھیے کہ ایک تواضع تو وہ ہے جو انسان کے اعضاء پر اس کے علمی و عقلی شعور کا نتیجہ ہوتی ہے یہ تواضع تو اختیاری ہے لیکن ایک تواضع وہ ہوتی ہے جو انسان کے باطنی عجز و انکسار اور اس کے ذاتی نقص و افتقار کے دائمی استحضار کا ثمرہ ہوتی ہے، یہ اضطراری ہوتی ہے یا مثلاً ایک خوف تو مصنوعی ہوتا ہے اور ایک وہ ہوتا ہے جو انسان کے باطن پر مستولی ہو جانے کی وجہ سے اس کے ظاہر پر بھی نظر آتا ہے۔ یہ خوف اتنا اضطراری ہوتا ہے کہ انسان اگر اس کو چھپانے کی سعی بھی کرے تو چھپا نہیں سکتا۔ یہ اضطراری صفت ہے۔ اسی طرح انقیاد باطن کامل ہو جانے کے بعد اس کے جو اثرات انسانی جوارح پر نظر آتے ہیں یہ بھی اضطراری ہوتے ہیں۔ یہاں بھی انسان کے تصنع اور اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا اس بناء پر آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کے فیصلہ پر انسان کا ضمیر اس طرح رضا مند ہو جانا چاہیے کہ پھر انقیاد ظاہر میں کوئی تصنع نہ رہے بلکہ وہ اس کی ایک صفت اضطراری بن جائے۔ غالباً اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العالمین میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اسلام کے کسی ایسے ہی اعلیٰ مرتبہ کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

تیسری آیت کے الفاظ بہت زیادہ قابل غور ہیں یہاں انا انزلنا الیك الکتاب کے بعد لتحکم بین الناس بما اراك الله کے لفظ فرمائیے ہیں اور یوں نہیں فرمایا کہ "لتحکم بین الناس بما رأیت" جس کا ترجمہ یہ ہوتا کہ یہ کتاب ہم نے آپ پر اس لیے نازل فرمائی ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ وہ فرمائیں جو آپ کی رائے میں آجائے بلکہ اس کی بجائے بما اراك الله کے لفظ فرمائے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ آپ کی رائے میں ڈالے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی رائے بھی ارادۃ النبی کے تابع رہتی ہے اسی لیے اس کو معصومیت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے کسی انسان کی رائے کو یہ مقام حاصل نہیں۔ اسی لیے رسول کے فیصلہ کے سوا کسی کے فیصلہ کو الٰہی فیصلہ اور قضاء الٰہی نہیں کہا جا سکتا اور نہ رسول کے فیصلہ کے علاوہ کسی اور بشر کا فیصلہ نکتہ چینی سے بالاتر ہو سکتا ہے اور اس لیے رسول کے علاوہ ہر انسان کے فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہونا لازم قرار دیا نہیں جا سکتا ہے

ہر سہ آیات بالا کے مضامین پر اگر غور کرو تو سب کی روح ایک ہی ہے، وہ یہ کہ رسول درمیان میں صرف ایک پیامبر ہوتا ہے۔ اس کا جو فیصلہ ہوتا ہے وہ حکم ربانی کے تحت ہوتا ہے حتی کہ اگر اس کی رائے بھی ہو تو وہ بھی ارادۃ الٰہیہ کے تابع ہوتی ہے کسی دوسرے انسان کی رائے کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہے حضرت عمرؓ کی رائے اور ان کے اجتہاد کا رتبہ کتنا بلند تھا، اللہ اکبر کبھی کبھی وحی الٰہی بھی اسی کی موافقت کرتی تھی لیکن اس کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ یقیناً ارادۃ الٰہی سے پیدا ہوئی ہے اور کوئی دوسرا احتمال اس میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے منشی نے ان کے ایک فیصلہ کی پیشانی پر یہ الفاظ لکھ دیئے "یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے عمر کے خیال میں ڈالا ہے" تو حضرت عمرؓ نے فرمایا یوں مت لکھو یوں لکھو "یہ فیصلہ وہ ہے جو عمر نے خود اپنی رائے اور اپنے خیال کے مطابق کیا ہے (ترجمان السنۃ ص۱۰۵ ج۱) دوسرے مقام پر اس کی وجہ بھی خود بیان فرمائی ہے "لوگو دیکھو دین کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس لیے صواب ہی صواب تھی کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تھی، ہماری رائے تو ہماری جانب سے صرف ایک اٹکل ہوتی ہے (ترجمان السنۃ ص ۱۰۵ ج ۱)

عن عمرو بن دینار قال قیل لعمر احکم بما اراك الله قال ان هذا للنبی صلی الله علیه وسلم خاصة (در منثور ص۲۱۹ ج ۲)	عمرو بن دینار بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ جو آپ کے دل میں ڈالے آپ اسی کے موافق فیصلہ فرما دیجیے۔ انہوں نے فرمایا کہ ٹھہرو یہ بات تو بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص تھی۔
عن ابن عباس قال ایاکم والرأی فان الله تعالیٰ قال لنبیه صلی الله علیه وسلم لتحکم بین الناس بما اراك الله ولم یقل بما رأیت (در منثور ص۲۱۹ ج ۲)	ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اپنی جانب سے دین میں رائے زنی کرنے سے بچو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا ہے کہ وہ اس رائے کے موافق فیصلہ فرمائیں جو ان کے دل میں منجانب اللہ ڈالی جائے اور یہ حکم نہیں دیا کہ جو خود ان کے دل میں آجائے وہ فیصلہ فرمائیں۔

یہاں حضرت عمرؓ کا فرمان محض خاکساری کے طور پر نہ تھا بلکہ اس عمیق حقیقت کی طرف اشارہ تھا جو اس تیسری آیت میں رسول اور غیر رسول کی رائے کے فرق کے متعلق کیا گیا ہے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ رسول کی رائے کے سوا قطعی طور پر صواب ہی کا حکم کسی دوسرے انسان کی رائے پر لگایا نہیں جا سکتا اور اس لیے نہیں لگایا جا سکتا کہ کسی انسان کے متعلق وحی الٰہی نے یہ تصریح نہیں کی کہ اس کی رائے ہمیشہ ارادۃ الٰہی کے تابع اور منجانب اللہ ہی ہوگی۔

ایک مرتبہ ایک جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بریدہؓ صحابی کو امیر لشکر بنا کر بھیجا مگر ان کو صاف یہ ہدایت فرما دی گئی کہ دیکھو اگر محاصرہ کے بعد صلح کی نوبت آئے تو اس صلحنامہ پر یہ نہ لکھنا کہ یہ فیصلہ خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اور اس کے حکم کے مطابق ہے بلکہ یہ لکھنا کہ یہ فیصلہ میری اور میرے رفقاء کی رائے کے مطابق لکھا جاتا ہے کیونکہ تمہارے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ تمہارا جو فیصلہ ہوگا وہ یقیناً خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی ہوگا (ترجمان السنۃ ص۱۰۶ ج۱)

اس سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ رسالت کا مقام کیا ہے اور امامت و اجتہاد کا رتبہ اس سے کتنا فروتر ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ اس تفریق کی وجہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ رسول کی فطرت اتنی مجلّی و مصفّی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ شیطانی اتصال کا کوئی احتمال ہی نہیں ہوتا دوسروں کی فطرت خواہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو مگر وہاں قطعیت کے ساتھ اس احتمال کی نفی نہیں کی جا سکتی اس لیے دوسرے انسانوں کی رائے میں بہر حال یہ احتمال ہوتا ہے کہ کسی راستہ سے اس میں شیطانی مداخلت ہو گئی ہو اگرچہ وہ عمداً نہ ہو خطأً ہو اور اس وجہ سے قابل مواخذہ بھی نہ ہو۔ حق تعالیٰ

کا ارشاد ہے:

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ — اچھا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، وہ ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں

حافظ موصوف فرماتے ہیں کہ آیت بالا میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ شیطان کا نزول صرف اُن افراد پر ہوتا ہے جو اُن کے ساتھ مزاجی مناسبت رکھتے ہیں۔ چونکہ شیاطین کا مزاج بھی خدائی نافرمانی اور افترا پردازی ہوتا ہے اس لیے جن انسانوں میں قریب یا بعید جتنی یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے اُن پر اسی تناسب سے ان کا نزول بھی ہوسکتا ہے۔ عام انسانوں کے متعلق چونکہ رسولوں کی سی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اس لیے ان کی رائے پر قطعیت کے ساتھ شیطانی مداخلت سے برأت کا حکم بھی نہیں لگایا جاسکتا اس لیے حضرت ابن مسعود نے سائل کے ایک استفسار کا جواب دے کر فرمایا۔

اقول فیه برأیی فان یکن صوابًا فمن الله وان یکن خطاءً فمنی ومن الشیطان والله ورسوله بریئان منه — اگر میرا یہ جواب درست ہو تو صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے ورنہ میری غلطی ہے اور شیطانی مداخلت کا اثر ہے اللہ اور اس کا رسول یقیناً اس سے بری ہیں۔

اس کے بعد بطور خلاصہ حافظ موصوف لکھتے ہیں:

فالرسول بریئ من تنزل الشیطان علیه فی العمد والخطاء بخلاف غیر الرسول فانه قد یخطئ ویکون خطاء من الشیطان وان کان خطاءه مغفورًا له (الجواب الصحیح ص ۳ ج ۴) — خلاصہ یہ ہے کہ رسول کی ذات خطا اور عمد کی ہر دو صورتوں میں شیطانی مداخلت کا احتمال نہیں رکھتی اس کے برخلاف ہر انسان کی رائے میں شیطانی مداخلت سے غلطی واقع ہونے کا احتمال ہوسکتا ہے اگرچہ اس کی یہ غلطی خطاء اجتہادی ہونے کی وجہ سے معاف ہو۔

اس تفصیل کے بعد یہ سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عنوان بالا کے تحت مذکورہ حدیث میں رسول کے فیصلوں کی حیثیت مستقل ہونے کے باوجود ان کو پھر قضاء اللہ یعنی خدائی فیصلہ کیوں کہا گیا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں شیطانی مداخلت کا کوئی احتمال ہی نہیں ہوتا اور فیصلہ کرنے والی گو بظاہر رسول کی ذات نظر آتی ہے مگر چونکہ درحقیقت وہ الٰہی فیصلہ ہوتا ہے اس لیے اس کو قضاء اللہ بھی کہا جاتا ہے گویا یہاں حاکم دو ہیں مگر حکم ایک ہی ہوتا ہے جیسا کہ آپ رسول کی اطاعت کے متعلق پڑھ چکے ہیں کہ یہاں بھی فعل اطاعت گو متعدد نظر آئے مگر مُطاع دراصل ایک ہی ذات پاک اللہ تعالیٰ کی رہتی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ترجمان السنہ ص جلد ۱) اس لیے رسول کے فیصلوں کی نسبت یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ یہ رسول کا فیصلہ ہے اور بہ نظر حقیقت یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ وہ خدا تعالیٰ کا فیصلہ ہے یہ دونوں نسبتیں مناسبت مقام اور مصلحت کی رعایت سے آپ کو احادیث پر نظر آئیں گی۔ حسب بیان آیت بالا جس طرح یہ معلوم ہوا کہ نزول شیاطین کن کن قسم کے انسانوں پر ہوتا ہے اس کے برعکس یہ بھی معلوم ہوا کہ نزول ملائکہ کن کن افراد پر ہوتا ہے یعنی جس طرح نزول شیاطین کے لیے مزاجی تناسب درکار ہے اسی طرح نزول ملکی کے لیے بھی مزاجی مناسبت ضروری ہوگی۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول ملکی کے لیے شرط اول اقرار ربوبیت اور اس کے بعد اس پر استقامت کے ساتھ قائم رہنا ہے

ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل علیهم الملائکة الا تخافوا ولا تحزنوا۔ — جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے کہ) نہ تو خوف کرو اور نہ غم میں پڑو

آیت بالا کے بموجب جن افراد میں ایمان باللہ اور اس پر استقامت موجود ہوگی ان کے طبائع کے ساتھ ملائکۃ اللہ کا اتصال بھی ممکن ہوگا اب جن مزاجوں پر پہلی مناسبت اتنی غالب ہوگئی ہے کہ ان میں دوسری مناسبت کا تخم ہی نہیں رہا جیسے کفار ان پر صرف شیاطین کا نزول ہوگا، ملائکۃ اللہ کے نزول کا یہاں کوئی احتمال نہیں ہوگا۔ غالباً پہلی آیت میں اسی لیے "اَفَّاكٍ اَثِيمٍ" دونوں صیغے مبالغہ کے استعمال کیے گئے ہیں اس کے برخلاف جن افراد میں اقرار ربوبیت کی صفت انتہا درجہ غالب آگئی ہے ان پر نزول ملکی ہوتا ہے مگر چونکہ دوسری صلاحیت کی قطعیت کے ساتھ اُن سے نفی نہیں کی جاسکتی اس لیے یہاں ان کی رائے میں مداخلت شیطان کا احتمال لگا رہتا ہے۔ دوسری آیت میں "ربنا اللہ" کے ساتھ استقامت کی قید غالباً اسی ملکی صلاحیت کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو قسم کی طاقتیں پیدا کی گئی ہیں ایک فرشتہ اور دوسری شیطان۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرا شیطان بھی اسلام لاچکا ہے، اس لیے وہ بھی مجھ کو خیر کے سوا بُرائی کا مشورہ نہیں دیتا۔ ہمارے نزدیک اس کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ ہر انسان چونکہ مکلف بنایا گیا ہے اس لیے اس میں کم و بیش دونوں صلاحیتیں پیدا فرمائی گئی ہیں۔ ان میں سے ملکی جانب کا خطرہ سعادت اور دوسری جانب کا غلبہ شقاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ ہدایت خلق کے لیے مبعوث ہوتے ہیں اس لیے یہاں بھی گو دوسری طاقت پیدا تو کی جاتی ہے مگر یہ طاقت بھی ان کی قوت قدسیہ کے سامنے سرنگوں رہتی ہے اور سوا خیر اور بھلائی کے ان کو دوسرا مشورہ دے نہیں سکتی پھر جس فرقہ اُمت سے اہوا اور شیطان کی نسبت جتنی بعید ہوتی چلی جائیگی اسی قدر اس کے اقوال کی نسبت اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہوتی چلی جائیگی حتیٰ کہ کوئی کوئی اس معراج کو بھی پہنچا ہے جس کا نام محدثیت ہے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ یہ اپنی فطری استعداد کی وجہ سے چونکہ محدثیت[1] کے رتبہ پہنچے اس لیے ان کی رائے کا رتبہ نبی کی رائے سے دوسرے نمبر پر آچکا تھا حتیٰ کہ بعض اوقات وحی الٰہی اُن ہی کی رائے کے مطابق اُتر آتی تھی۔ اور درحقیقت یہ اُن کے اسی مناسبت کی طرف اشارہ تھا لیکن محدثیت کا حکم نہ تو قطعیت کے ساتھ کسی خاص فرد ذات پر لگایا جاسکتا ہے اور اس لیے نہ کسی خاص فرد کے فیصلہ کو قطعیت کے ساتھ قضاء اللہ کہا جاسکتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے اپنے اپنے انداز میں اشارہ فرمایا ہے۔

تحقیق بالا سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ آیت "لتحکم بین الناس بما اراك اللہ" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول کے لیے اجتہاد کا دروازہ بند کردیا گیا ہے اور اس کے لیے فیصلہ کی صورت صرف وحی میں منحصر کردی گئی ہے بلکہ آیت بالا یہ صراحت کرتی ہے کہ رسول کو اجتہاد کی بھی گنجائش دی گئی ہے۔ کیونکہ یہاں یوں نہیں فرمایا گیا کہ انا انزلنا الیك الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بلکہ بما اراك اللہ فرمایا گیا ہے گویا اس کے لیے یہ وسعت دیدی گئی ہے کہ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں اجتہاد کر کے حکم دینے کا بھی حقدار ہے مگر چونکہ اس کی رائے کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ہمیشہ بما انزل اللہ کے مطابق ہی ہوتی ہے اور اگر کہیں ایک دو واقعہ میں اس کی رائے میں ادنیٰ سی بھی کمی سمجھی گئی ہے تو اس پر فوراً وحی کی جانب سے تنبیہ کردی گئی ہے۔ اسی لیے اس کی رائے کو بہر کیف منجانب اللہ کہا جاتا ہے کسی دوسرے انسان کی رائے کی یہ نگہداشت وحی کی طرف سے نہیں ہوتی اس لیے اس کی رائے کو الٰہی رائے نہیں کہا جاسکتا بالخصوص جبکہ اس میں شیطانی مداخلت کا احتمال بھی موجود ہو۔ حضرت عطیہ عوفی آیت بالا کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

---

[1] محدثیت کی تشریح ترجمان السنہ ص ۳۰۵ ج ۱ پر ملاحظہ فرمائیے۔

قال (معناه) الذی أداه فی کتابه (در منثور ص ۲۱۹ ج ۲)

یعنی بما اراك الله کا مطلب یہ ہے کہ جو رائے کتاب میں غور کے بعد آپ کے دل میں ڈالے۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ آیت بالا رسول کے اجتہاد کرنے کے خلاف نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کا ثبوت ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں:۔

معناه علی قوانین الشرع اما بوحی ونص اوبنظر جار علی سنن الوحی ... وهذا اصل فی القیاس وهو یدل علی ان النبی اذا رأی شیئا اصاب لان الله تعالیٰ اراه ذالك۔ (تفسیر قرطبی ص ۳۷۶ ج ۵)

آیت بالا میں بما اراك الله کا مطلب یہ ہے کہ آپ فیصلہ فرمایا کریں اس رائے کے مطابق جو یا تو کسی نص کے موافق ہو یا ایسا اجتہاد اور رائے ہو جو وحی کی منشاء اور اس کے اقتضاء کے موافق ہو اور یہ حجیت قیاس کی ایک دلیل ہے اور اس کی بھی کہ رسول جب اجتہاد کرتا ہے تو وہ صواب ہی ہوتا ہے کیونکہ وہ منجانب اللہ ہوتا ہے۔

امام ابومنصور ماتریدی فرماتے ہیں:۔

معنی الآیة بما الهمك الله بالنظر فی الاصول المنزلة وقال فیه دلیل علی جواز الاجتهاد فی حقه (مدارک التنزیل)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ نازل شدہ اصول پر غور کے بعد جو اللہ تعالیٰ آپ کے دل میں ڈالے آپ اس کے مطابق فیصلہ فرمائیں اور اس میں بات کی دلیل ہے کہ آپ کو بھی اجتہاد کرنا جائز تھا۔

ہماری اس تحقیق سے یہ بھی صاف ہو گیا کہ رسول کی رائے کے منجانب اللہ ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اب کبھی کسی اجتہاد پر اس کو ٹوکا ہی نہیں جائیگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو ٹوکا جائے بلکہ اس کی رائے کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت ہی یہ ہے کہ اس کی جو رائے بھی ہوتی ہے وہ وحی کی نگرانی میں قائم ہوتی ہے اسی لیے اگر سہواً اس میں فرق ہوتا ہے تو فوراً اس پر اس کو متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر یہ مطلب نہ ہو تو پھر حکم بما انزل اللہ اور حکم بما اراك الله دونوں صورتیں ایک ہی بن جائیگی۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی زیر تفسیر آیۂ بالا لکھتے ہیں:۔

وهذه الآیة دلیل علی ان النبی صلی الله علیه وسلم لم یکن یعمل بالمظنون لکنها لا ینفی الاجتهاد من النبی صلی الله علیه وسلم لانه اذا حصل للنبی صلی الله علیه وسلم ظن بالاجتهاد وقرره الله سبحانه ولم یطلعه علی الخطاء ظهر شده بیقین انه الحق بخلاف للمجتهد۔ (تفسیر مظہری)

یہ آیت اس کی دلیل تو ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظنی بات پر عمل نہ فرماتے تھے۔ مگر اس کی دلیل نہیں کہ آپ اجتہاد بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ جب آپ اجتہاد کرتے اور اس کے متعلق وحی کی جانب سے کوئی اصلاح نہ کی جاتی تو اس کی حقانیت کا آپ کو یقین حاصل ہو جاتا ہر مجتہد کے اجتہاد کا یہ معاملہ نہیں اس لیے وہ صرف ظن کی حد تک رہتا ہے۔

اسی طرح آیت بالا میں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں دی گئی کہ رسول کو ہمیشہ صورت واقعہ کی بھی اطلاع دیدی جائیگی بلکہ اس کے فیصلہ کے بما اراك الله ہونے کا مطلب صرف اتنا ہوگا کہ وہ اصول منزلہ اور کتاب اللہ کے موافق ہوگا۔ مثلاً فیصلہ کرنے کا آئین یہ بتایا گیا ہے کہ صورت حالات کو مکمل سن لینے کے بعد مدعی سے گواہ طلب کیے جائیں اور گواہاں نہ ہونے کی صورت میں مدعیٰ علیہ سے قسم لے کر اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے اس کے بعد خواہ خارجی واقعات کچھ بھی ہوں لیکن ایسے فیصلہ کو بما اراك الله فیصلہ ہی کہا جائیگا کیونکہ نہ واقعات کی تہ تک پہنچ جانا شریعت عامہ بنایا جا سکتا ہے نہ یہ ہمیشہ انسان کی قدرت میں ہوتا ہے اس لیے آئین بالا کے موافق یہی فیصلہ بما انزل اللہ

کے موافق فیصلہ سمجھا جائیگا۔ ابن ابی حاتم نے آیت بالا کی تفسیر حضرت مطر سے یہی نقل فرمائی ہے" قال بالبینات و الشھود (درمنثور ص ۱۹ ج ۲) ہمارے نزدیک حضرت مطر نے بینہ اور گواہ کو بطور ایک مثال کے ذکر فرمایا ہے۔ صرف اسی میں انحصار نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ فیصلہ فرما دینے کے بعد بھی اہل مقدمہ کو برابر آپ کی ہدایت یہی ہوتی تھی کہ میرے اس آئینی فیصلہ کے بعد بھی اگر اہل معاملہ نے حقیقت سے ذرا بھی عدول کیا ہو تو وہ عنداللہ اپنے آپ کو مجرم ہی سمجھیں۔ میرا فیصلہ صرف ایک نظامی آئین کے تحت ہوا ہے اس کو ہمیشہ دار آخرت سے نجات کا باعث نہ سمجھ لینا چاہیے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نبی کا اجتہاد بھی درحقیقت وحی ہی کا حکم رکھتا ہے نہ وحی میں خطاء کا احتمال ہوتا ہے اور نہ اجتہاد رسول میں خطاء پر استقرار کا احتمال ہو۔ ہماری اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اجتہاد رسول کے باب میں جو اختلاف مدون ہو درحقیقت وہ لفظی اختلاف ہو جس نے حقیقت کی طرف نظر کی اس نے اجتہاد جائز قرار دیا اور جس نے یہ دیکھا کہ وہ بہرکیف وحی ربانی ہی کی نگہداشت میں ہوتا ہے اس لیے اس کو بھی وحی کے حکم میں سمجھا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

حافظ سیوطیؒ اپنے فتاوی میں تحریر فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام فیصلے قرآن کریم ہی سے ہوا کرتے تھے مگر اس کو اجتہاد نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

والدلیل علی ذلک ان العلماء حکوا خلافا فی جواز الاجتهاد للنبی صلی الله علیه وسلم فلو کان حکمه بما یفهمه من القران یسمی اجتهادا لم تتجه حکایة الخلاف (الحاوی ص ۱۵۶ ج ۲)	اس کی دلیل یہ ہے کہ علماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اجتہاد کے جواز میں اختلاف کیا ہو اگر آپ کے ان فیصلوں کو جو آپ نظم قرآنی سے مستنبط فرما کر صادر فرماتے تھے اجتہاد کہا جا سکتا تھا تو یہ اختلاف نقل کرنا ہی صحیح نہ ہوتا ہے

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی ارشاد فرمایا ہو وہ یا تو صاف صاف قرآن میں موجود ہے ورنہ اس کی اصل ضرور موجود ہے اور اسی طرح جو فیصلے بھی آپ نے فرمائے وہ سب قرآن ہی کی روشنی میں تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ کوئی اس کو سمجھے یا نہ سمجھے پھر ابن مسعودؓ سے نقل فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں ہماری ضرورت کے سب علوم موجود ہیں۔ لیکن ہمارا علم ہی ان کے ادراک سے قاصر ہے۔ منہ ۱۶

اب ذرا غور فرمائیے کہ رسول کو معصومیت کا مقام حاصل نہ ہو تو کیا اس کی رائے کو معصومیت کا یہ مقام حاصل ہو سکتا ہو بلکہ رائے تو رائے رسول کے خطرات و عواطف قلبیہ بھی وحی ربانی کی زیر نگرانی ہوتے ہیں تفصیل کے لیے دیکھو ترجمان السنہ ص ۱۴۰ و ۱۴۱ ج ۱ و حاشیہ ص ۱۳۲ ج ۱ بحوالہ اعلام الموقعین ص ۱۹۸ ج ۱

دعوات الانبياء علیهم الصلٰوة والسلام وما یأتی علیهم انما یأتی من جهة البشریة

۱۱۷۴۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَتَّخِذُ عِنْدَكَ عَهْدًا لَا تُخْلِفْنِیْهِ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ اٰذَیْتُهٗ اَوْ سَبَبْتُهٗ اَوْ قَالَ لَعَنْتُهٗ اَوْ جَلَدْتُهٗ فَاجْعَلْهَا لَهٗ زَکٰوةً وَصَلٰوةً وَقُرْبَةً تُقَرِّبُهٗ بِهَا اِلَیْكَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ. رواه ابو یعلی قال الهیثمی واسناده حسن واخرجه الشیخان بتغییر یسیر عن ابی هریرة کما فی الخصائص ۔ص ۲۴۴ ج ۲

۱۱۷۵۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُثْمَانَ بْنِ خُثَیْمٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی اَبِی الطُّفَیْلِ عَامِرِ بْنِ وَاثِلَةَ فَوَجَدْتُهٗ طَیِّبَ النَّفْسِ فَقُلْتُ یَا اَبَا الطُّفَیْلِ اَخْبِرْنِیْ عَنِ النَّفَرِ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَهَمَّ اَنْ یُّخْبِرَنِیْ فَقَالَتْ اِمْرَاَتُهٗ سَوْدَةُ مَهْ یَا اَبَا الطُّفَیْلِ اَمَا

انبیاء علیہم السلام سے بددعائیہ کلمات کا برمحل صدور بھی صرف بشریت کی بناء پر ہوتا ہے

۱۱۷۴۔ ابو سعیدؓ اور ابو ہریرہؓ یہ دونوں صاحبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء فرمائی الٰہی میں تجھ سے ایک وعدہ لیتا ہوں اُمید ہے تو مجھ سے ہرگز اس کا خلاف نہ فرمائیگا۔ میں ایک بشر ہی ہوں۔ تو جس کسی مومن بندہ کو میں نے کوئی تکلیف دی ہو یا بُرا بھلا کہا ہو یا یہ فرمایا کہ اس پر لعنت کی ہو (راوی کو لفظ میں شک ہے) یا اس کے کوڑے لگانے کا حکم دیا ہو تو اس کے حق میں تو اس کو کفارہ، رحمت اور قیامت کے دن اپنے دربار میں باعث تقرب بنا دینا۔ (خصائص الکبریٰ)

۱۱۷۵۔ عبداللہ بن عثمانؒ بیان کرتے ہیں کہ میں ابو الطفیلؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت وہ کچھ ہشاش بشاش نظر آتے ہیں نے عرض کی ابو الطفیل! جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے آپ مجھ کو ذرا ان لوگوں کے نام بتا دیجیے۔ انھوں نے ابھی بیان فرمانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ان کی بیوی سودہؓ بولیں ابو الطفیل! ذرا ٹھہر جائیے کیا

۱۱۷۴۔ اس جگہ آپ کی زبان سے جو پہلا لفظ نکلا ہے وہ یہی ہے "الٰہی میں ایک بشر ہوں" یہی کلمہ آئندہ روایت میں بھی ہے۔ اور اسی طرح اس باب کی پانچویں روایت میں بھی موجود ہے اس سے پہلے بھی ترجمان السنہ کی مختلف روایات میں ہر معذرت کے موقع پر آپ کی زبان مبارک پر بشکل اصل کلی کے یہ کلمہ آتا رہا ہے (دیکھو حدیث ۸۰۰) پھر تعجب ہے کہ جو بات انبیاء علیہم السلام کی نظروں میں اتنی اہم ہو اسی کا انکار۔ لوگوں کی نظروں میں کیونکر اہم بن گیا ہے۔

بَلَغَكَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَيُّمَا عَبْدٍ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ دَعَوْتُ عَلَيْهِ بِدَعْوَةٍ فَاجْعَلْهَا لَهٗ زَكَاةً وَّرَحْمَةً. رواه الطبرانی فی الاوسط واللفظ لہ واحمد بنحوہ و اسنادہ حسن۔

۱۱۷۶ - عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَفَعَ اِلٰى حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ رَجُلًا وَقَالَ لَهَا اِحْتَفِظِيْ بِهٖ فَغَفَلَتْ حَفْصَةُ وَمَضَى الرَّجُلُ فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا حَفْصَةُ مَا فَعَلَ الرَّجُلُ قَالَتْ غَفَلْتُ عَنْهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَخَرَجَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطَعَ اللّٰهُ يَدَكِ فَقَالَتْ بِيَدِهَا هٰكَذَا فَدَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا شَأْنُكِ يَا حَفْصَةُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قُلْتَ قَبْلُ كَذَا وَكَذَا قَالَ ضَعِيْ يَدَكِ فَاِنِّيْ سَأَلْتُ

کیا آپ کو یہ اطلاع نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بھی تو فرمائی تھی کہ میں ایک بشر ہی ہوں تو جس کسی مومن بندہ کے متعلق میری زبان سے بد دعا کے کلمات نکل گئے ہوں تو الٰہی تو اس کے حق میں ان کو کفارہ اور رحمت بنا دینا۔ (طبرانی ۔ احمد)

۱۱۷۶ - انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو حضرت حفصہؓ کی نگرانی میں دیا اور ان سے فرمایا یہ انتظام رکھنا کہ وہ بھاگ نہ جائے۔ ایسا ہوا کہ کسی سبب سے حضرت حفصہؓ کو ذرا سی غفلت ہو گئی اور وہ آدمی چل دیا۔ آپ تشریف لائے تو آپ نے پوچھا۔ حفصہ! وہ شخص کدھر گیا؟ اُنہوں نے عرض کی یا رسول اللہ اُس کے معاملہ میں مجھ سے غفلت ہو گئی۔ آپؐ ناگواری کے ساتھ باہر تشریف لے آئے اور آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمات تھے "قطع اللہ یدک" خدا تیرے ہاتھ توڑ دے۔ بس اسی وقت ان کے ہاتھ اس طرح مڑ کر رہ گئے۔ جب آپ اندر تشریف لائے تو ان کے ہاتھ کی یہ صورت دیکھ کر پوچھا۔ حفصہ! یہ کیا ہوا۔ اُنہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ ابھی آپ نے یہ کلمات فرمائے تھے بس ایسا ہو گیا آپ نے فرمایا اپنا ہاتھ نیچے رکھ دو میں نے

۱۱۷۶ - بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جو ترجمان السنہ ص ۳۷۸ ج ۲ حدیث ۶۵۵ میں گزر چکا ہے لیکن وہ حضرت عائشہؓ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک ہی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر کسی راوی نے اس کو حضرت حفصہؓ کی طرف اور کسی نے حضرت عائشہ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ ہم نے دونوں جگہ اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے گویا آپ کے کلمات کا اثر اسی وقت حادثہ کی صورت میں ظاہر ہو چکا تھا یہ ترجمہ ہم نے حضرت استاذ قدس سرہ کے ایک بیان کی روشنی میں کیا ہے ورنہ اس کا ظاہری ترجمہ دونوں جگہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے دعائیہ کلمات کی وجہ سے میں نے اپنے ہاتھ موڑ کر دیکھنے شروع کیے کہ ان میں سے آپ کی بد دعا کا اثر کس میں ہے۔ پہلی روایت کے لفظ "انظر ایہما تقطعان" میں دیکھ رہی تھی کہ کس ہاتھ کو بد دعا

رَبِّي تَبَارَكَ وَتَعَالَى أَيُّمَا إِنْسَانٍ مِنْ أُمَّتِي دَعَوْتُ عَلَيْهِ أَنْ يَجْعَلَهَا لَهُ مَغْفِرَةً۔ رواہ احمد و رجالہ رجال الصحیح۔ واخرجہ فی الخصائص ایضاً ص ۳۴۴ ج ۲۔ وراجع فی الترجمان ش ۳۷۵ عن عائشۃ

۱۱۷۷ عَنْ أَبِي السَّوَّارِ عَنْ خَالِهِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأُنَاسٌ يَتْبَعُونَهُ فَاتَّبَعْتُهُ مَعَهُمْ قَالَ فَفَجِئَنِي الْقَوْمُ يَسْعَوْنَ قَالَ وَأَبْقَى الْقَوْمَ قَالَ فَأَتَى عَلَيَّ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَرَبَنِي ضَرْبَةً إِمَّا بِعَسِيبٍ أَوْ قَضِيبٍ أَوْ سِوَاكٍ أَوْ شَيْءٍ كَانَ مَعَهُ قَالَ فَوَاللّٰهِ فَمَا أَوْجَعَنِي قَالَ فَبِتُّ بِلَيْلَةٍ قَالَ أَوْ قُلْتُ مَا ضَرَبَنِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا لِشَيْءٍ عَلِمَهُ اللّٰهُ فِيَّ قَالَ وَحَدَّثَتْنِي نَفْسِي أَنْ آتِيَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَصْبَحْتُ قَالَ فَنَزَلَ جِبْرَئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنَّكَ رَاعٍ لَا تُكَسِّرْ قُرُونَ رَعِيَّتِكَ قَالَ فَلَمَّا صَلَّيْنَا الْغَدَاةَ أَوْ قَالَ صَبَّحْنَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ إِنَّ أُنَاسًا يَتْبَعُونِي وَلَا يُعْجِبُنِي أَنْ يَتْبَعُونِي اَللّٰهُمَّ فَمَنْ ضَرَبْتُ

اپنے رب سے یہ دعا کی ہے کہ اپنی امت میں جس کے لیے بھی میرے منہ سے بددعا کے کلمات نکل گئے ہوں الٰہی تو اس کے حق میں ان کو مغفرت و بخشش کا سبب بنا دینا۔ (احمد)

۱۱۷۷- ابوالسوار اپنے ماموں سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے لگ رہے ہیں، میں بھی اُن کے ساتھ آپ کے پیچھے پیچھے لگ گیا یہ بیان کرتے ہیں کہ اتنے میں ناگاہ طور پر لوگ بھاگتے ہوئے میرے اوپر آ پڑے۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ لوگوں کو چھوڑ کر میری طرف تشریف لائے اور کھجور کی ایک تر شاخ یا چھڑی یا مسواک یا کوئی اور ایسی ہی چیز ہوگی جو اس وقت آپ کے پاس تھی، آپ نے اس کو لے کر مجھ کو ہلکے سے مار دیا۔ بخدا مجھ کو اس سے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ کہتے ہیں کہ میں نے بڑی بے چینی سے رات کاٹی، یا میں نے یہ بات کہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تنبیہ ضرور کسی ایسی نامناسب بات کی وجہ سے ہوئی ہو جو اللہ تعالیٰ کے علم میں میرے نفس میں ہوگی۔ پھر میرے دل نے کہا کہ کسی طرح صبح ہو تو میں فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اُدھر جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آگئے اور فرمایا کہ آپ، قوم کے نگراں ہیں، اپنی رعایا پر سختی نہ فرمایا کریں۔ یہ کہتے ہیں جب ہم صبح کی نماز ادا کر چکے یا یہ کہا کہ جب صبح ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی الٰہی لوگ میرے پیچھے پیچھے لگ جاتے ہیں اور مجھ کو یہ اچھا

لگتی ہے اور اس روایت کے لفظ "ضعی یدک" اپنا ہاتھ نیچے رکھ دو۔ اس کی تائید کرتے ہیں کہ ان کلمات کا اثر اب تک ظاہر ہونے نہیں پایا تھا۔ اس جگہ حدیث سابق ۱۱۷۵ کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرما لیجیے۔ وہ حقیقت اپنی جگہ پھر مسلم ہے

أَوْ سَبَبْتُ فَاجْعَلْهَا لَهُ كَفَّارَةً وَأَجْرًا أَوْ قَالَ مَغْفِرَةً وَرَحْمَةً أَوْ كَمَا قَالَ رواه احمد ص ۲۹۵ ج ۵

۱۱۷۸ - عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ أَنَا بَشَرٌ فَأَيُّ الْمُسْلِمِينَ لَعَنْتُهُ أَوْ شَتَمْتُهُ أَوْ جَلَدْتُهُ فَاجْعَلْهَا لَهُ صَلٰوةً وَرَحْمَةً وَقُرْبَةً تُقَرِّبُهُ بِهَا إِلَيْكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَعَنْ جَابِرٍ مثله الا ان فيه زكاة ورحمة ۔ رواه الدارمی ۔

۱۱۷۹ - عَنْ مُعَاوِيَةَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ اَللّٰهُمَّ مَنْ لَعَنْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ ثُمَّ دَخَلَ فِي الْإِسْلَامِ فَاجْعَلْ ذٰلِكَ قُرْبَةً لَهُ إِلَيْكَ ۔ رواه الطبرانی کما فی الخصائص ص ۷۴ ج ۲ ۔

اچھا نہیں لگتا کہ اس طرح وہ میرے پیچھے پیچھے لگے رہیں۔ تو الٰہی جس کو میں نے مار دیا ہو یا برا بھلا بھی کہا ہو تو اس کے حق میں تو اس میری تنبیہ کو گناہوں کا کفارہ اور ثواب کا سبب بنا دینا یا یہ فرمایا کہ مغفرت اور رحمت بنا دینا، یا اسی کے قریب اور کلمات فرمائے۔ (احمد)

۱۱۷۸ - ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الٰہی میں بھی بشر ہوں تو مسلمانوں میں جس کسی پر بھی میں نے لعنت کی ہو یا اس کو برا بھلا کہا ہو یا اس کے کوڑے لگوانے کا حکم دیا ہو تو اس کے حق میں تو اس کو باعث رحمت و برکت اور قیامت کے دن اپنے دربار میں باعث تقرب بنا دینا۔ (دارمی)

۱۱۷۹ - حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے۔ الٰہی جس کسی کی جاہلیت کے دور میں میں نے اس پر لعنت کی ہو پھر وہ اسلام قبول کر چکا ہو تو اس کو تو اس کے حق میں اپنے دربار میں تقرب کا سبب بنا دینا۔ (طبرانی)

۱۱۷۸ - اس حدیث میں آپ کی دعا کا پہلا کلمہ پھر یہی ہے "میں بشر ہوں" درحقیقت آپ کے ان تمام کلمات کی روح یہی ہے کہ جب میں بشر ہوں تو بشری خصلت سے بری نہیں ہو سکتا معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ غصہ نہیں آئیگا کسی کو کوئی تنبیہ نہیں کی جائیگی اور کسی کی کوئی حرکت خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو ناگوار نہیں گزریگی نہیں نہیں یہ سب کچھ ہوگا مگر ہوائے نفس کی بنا پر نہیں، تکبر و غرور کی بنا پر نہیں، اور ظلم و تعدی کے طور پر نہیں بلکہ ضعف بشری کی بنا پر یہ معذرت اس لیے نہیں کہ معصیت کا صدور ہوا ہے بلکہ اس لیے ہے کہ جب معصومیت ہے تو یہ کلمات بھی معصوم منہ سے کیوں نکلے پھر اس کی معذرت یوں ہے کہ میں بشر ہوں۔ جو رسولوں کو بشر نہیں مانتے وہ ان کے عجز و نیاز کی روح سے بھی آشنا نہیں۔

۱۱۷۹ - ان حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کی حق تلفی کا گمان ہو تو اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ اس صاحب حق کے لیے دعا کی جائے مگر یہ اس صورت میں ہے جبکہ صاحب حق کے حق کی ادائیگی کی اور کوئی صورت نظر نہ آئے گویا آپ کے ان تواضع و نیاز کے کلمات سے امت کے لیے ایک اور اہم سنت معلوم ہوگئی۔

یہ واضح رہے کہ ہر لغت کے محاورات میں کچھ کلمات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے مثلاً بچہ کو پیار و محبت میں شریر کا لفظ کہہ دیتے ہیں بعض اوقات بدمعاش کا لفظ بھی مہذب زبانوں پر آجاتا ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

۱۱۸۰۔ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ قَالَ کَانَ فُلَانٌ یَجْلِسُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِذَا تَکَلَّمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِخْتَلَجَ بِوَجْھِہٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُنْ کَذَالِكَ فَلَمْ یَزَلْ یَخْتَلِجُ حَتّٰی مَاتَ رواہ الحاکم فی صحیحہ

۱۱۸۱۔ عَنْ سَلَمَۃَ بْنِ الْاَکْوَعِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَجُلًا اَکَلَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِشِمَالِہٖ فَقَالَ کُلْ بِیَمِیْنِكَ قَالَ لَا اَسْتَطِیْعُ قَالَ لَا اسْتَطَعْتَ مَا مَنَعَہٗ اِلَّا الْکِبْرُ فَمَا رَفَعَھَا اِلٰی فِیْہِ۔ (رواہ مسلم) ریاض الصالحین ص ۳۱۴۔

۱۱۸۲۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰی اَعْرَابِیٍّ یَعُوْدُہٗ وَکَانَ اِذَا دَخَلَ عَلٰی مَرِیْضٍ یَعُوْدُہٗ قَالَ لَا بَأْسَ طَھُوْرٌ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ فَقَالَ لَہٗ لَا بَأْسَ طَھُوْرٌ اِنْ شَاءَ

۱۱۸۰۔ عبدالرحمٰنؓ صدیق اکبرؓ کے فرزند ارجمند روایت کرتے ہیں کہ فلاں شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں آ کر بیٹھا کرتا، اور جب آپ گفتگو فرماتے تو استہزاء کے طور پر منہ بنایا کرتا۔ آپ نے فرمایا اچھا تو یونہی ہو جائے (اللہ تعالیٰ نے اس کا منہ اسی طرح بنا دیا) اور جب تک وہ جیا اسی طرح منہ بنا تا رہا (حاکم)

۱۱۸۱۔ سلمہ بن اکوعؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بائیں ہاتھ سے کھانا کھایا آپ نے فرمایا اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ اُس نے کہا دائیں ہاتھ سے تو مجھ سے کھایا نہیں جاتا۔ آپ نے فرمایا یہ بڑائی کی وجہ سے نہیں کھاتا اچھا تو پھر جیسا تو کہتا ہے ایسا ہی ہو۔ اس کے بعد وہ شخص اپنا دایاں ہاتھ منہ تک اُٹھا ہی نہ سکا۔ (مسلم)

۱۱۸۲۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بادیہ نشین شخص کے پاس اس کی عیادت فرمانے کے لیے تشریف لے گئے اور عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب کسی مریض کی عیادت کو جاتے تو یہ کلمات فرمایا کرتے تھے "لا بأس الخ" یعنی خدا کرے کوئی تکلیف نہ رہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بیماری گناہوں کا کفارہ ہے۔ چنانچہ اس سے بھی یہی کلمات فرمائے لا بأس الخ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۳۵) مگر صرف اس ماحول کے ایک محاورہ کی حد تک ہوتا ہے اسی طرح عرب میں بھی اس قسم کے کلمات رائج تھے اگر وہ کسی مناسب محل پر شاذ و نادر آپ کی زبان پر آ گئے ہوں تو بشریت کے سوا ان کو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ واقعات مذکورہ پر نظر ڈالی جائے ہر موقعہ محل تنبیہ ہی تھا اور جو تنبیہی کلمات عرب کے محاورات میں تھے وہ بڑی احتیاط کے ساتھ یہاں استعمال ہوئے ہیں مگر معصومیت کا تقاضہ ہے کہ دعائیں دے دے کر ان کی تلافی کر دی جائے۔

۱۱۸۲۔ انبیاء علیہم السلام کی حکم عدولی استہزاء سے ہو خواہ شدت جہالت سے کسی صورت میں مبارک نہیں ہوتی۔ جس کی شان یہ ہو کہ اگر ان کی آواز سے آواز بلند کی جائے تو کی کرائی نیکیاں برباد ہو جائیں۔ اُن کی بات کا مقابلہ کرنا بعض مرتبہ بہت خطرناک عواقب کا موجب بن جاتا ہے۔ استہزاء تو کفر ہے۔ کبر فسوق ہے اور گنوار پن خوفناک عیب ہے ان پر

اللہُ قَالَ کَلَّا بَلْ حُمّٰی تَفُوْرُ عَلٰی شَیْخٍ کَبِیْرٍ تُزِیْرُہُ الْقُبُوْرَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَنَعَمْ اِذًا۔ (البخاری)

مِنْهَا اِسْتِغْفَارُ النَّبِیِّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

۱۱۸۳۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاللہِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً۔ رواہ البخاری

۱۱۸۴۔ عَنِ الْاَغَرِّ الْمُزَنِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا اَیُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْا اِلَی اللہِ فَاِنِّیْ اَتُوْبُ اِلَیْہِ فِی الْیَوْمِ مِائَۃَ مَرَّۃٍ۔ رواہ مسلم

۱۱۸۵۔ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ

وہ بولا ہرگز نہیں یہ تو ایک سخت بوڑھے کو تیز بخار چڑھ رہا ہے اور اس کو قبرستان لیجاکر چھوڑیگا اس پر آپ نے ناگواری سے فرمایا اچھا تو یونہی سہی۔ (بخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ استغفار

۱۱۸۳۔ ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ بخدا میں بھی ایک ایک دن میں ستر ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے سامنے استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔ (بخاری شریف)

۱۱۸۴۔ اغر مزنی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کیا کرو۔ کیونکہ میں بھی ایک دن میں سو سو بار توبہ کرتا ہوں۔ (مسلم)

۱۱۸۵۔ اغر مزنی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے قلب پر ایک بادل سا چھا تا ہے

ہمیشہ گرفت کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ قدرت چاہتی ہے کہ جمال کے ساتھ ساتھ کہیں اس کے جلال کا بھی مظاہرہ ہو جائے تاکہ مخلوق نڈر نہ ہو جائے اور رسولوں کے سامنے اس پیرایہ سے ان کو ادب کا سبق بھی ملتا رہے۔

۱۱۸۵! بشر ایک ضعیف مخلوق ہے اور اس لیے ایک ضعیف مخلوق کے لیے بجائے استکبار کے استغفار کرنا ہی مناسب ہے۔ آفرینش عالم کے وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں تین قسم کی مخلوق تھی۔ نوری یعنی فرشتے وہ معصوم تھے اس لیے ان کا معاملہ صرف ایک تسبیح سے قابلِ اغماض بن گیا "سبحنک لا علم لنا الا ما علمتنا"۔ ناری یعنی جنات و شیاطین انہوں نے بڑائی اور استکبار کی چال چلی "استکبرت ام کنت من العالین" وہ اسی تکبر کی بدولت ملعون ہو گئے۔ خاکی یعنی آدم علیہ السلام انہوں نے عجز و نیاز کے ہاتھ پھیلا دیے، توبہ و استغفار کی زبان کھول دی اور اپنے رب کے سامنے اعتراف و تسلیم کا سر جھکا دیا۔ ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین۔

وَإِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ ۔ رواہ مسلم

اور میں بھی اللہ تعالیٰ سے دن میں سَو سَو بار استغفار کرتا ہوں ۔ (مسلم)

اس ذل وانکسار اور ندامت واستغفار کے صلہ میں تاجِ خلافت ان کو پہنا دیا گیا یہی سرگزشت پھر آئندہ مخلوق کے استکبار یا استغفار کی بنیاد بن گئی یعنی اولادِ ابلیس میں استکبار اور بنی آدم میں استغفار کی سنت قائم ہوگئی اس لیے بنی آدم میں جو مخصوص افراد فطرت پر پیدا ہوتے اور فطرت ہی پر قائم رہتے، توبہ واستغفار کرنا ان کی فطرت کی پکار رہتی اور جو اس کے برخلاف چل پڑے وہ ابلیس کے قدم پر کہلائے۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام کی استغفار فرشتوں کی تسبیح کی طرح فطری ہوتی ہے وہ ان کے ضعفِ بشری کا تقاضہ ہوتا ہے سوہ حقیقۃً کسی گناہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ معصیت کا تصور اور بشری ضعف اس کا مدعی ہوتا ہے۔ جو خود استغفار کرنا نہیں جانتے وہ دوسروں کو استغفار کی تعلیم دینا بھی نہیں جانتے۔ رحمت چاہتی ہے کہ سنتِ آدم علیہ السلام کو تازہ رکھنے کے لیے ایسے نفوسِ قدسیہ آتے رہیں جن کی زبانیں توبہ واستغفار کے لیے شب و روز کھلی ہوں اور اس طرح نظرِ رحمت میں بنی آدم کے لیے اپنے آبائی وطن کی وراثت کا استحقاق پھر قائم ہوجائے آخری حدیث میں کچھ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے بھی کبھی کبھی ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ میری استغفار بھی صرف مجازی نہیں رہتی بلکہ آدم علیہ السلام کی طرح اس میں حقیقت کی لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ استغفار کو صرف معصیت ہی میں منحصر سمجھ لینا بہت نادانی ہے۔ ورنہ یہاں لفظ غین یعنی بادل کے لفظ کی بجائے صاف معصیت کا لفظ کیوں نہ فرما دیا گیا۔ استغفار انبیاء علیہم السلام کے کمال کی معراج ہے اور اسی لیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت نزدیک آگیا تو سورۂ النصر میں آپ کو تسبیح واستغفار میں منہمک رہنے کا حکم دیا گیا "فسبح بحمد ربك واستغفره" تسبیح واستغفار کے اس طرح جمع فرمانے میں انسان کی شانِ جامعیت کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے یعنی استغفار کے ساتھ چونکہ اس میں ملکوتی صفت بھی ہے اس لیے ان کا وظیفہ تسبیح واستغفار کا مجموعہ ہے اور اس لیے صرف تسبیح کرنے والوں کی رسائی اس مقام تک نہیں ہوتی جہاں تک کہ تسبیح کے ساتھ استغفار کرنے والوں کی رسائی ہوتی ہے۔

ہمارے اس بیان سے آدم علیہ السلام کی لغزش کے تکوینی اسرار پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے اور جو بات اس خاصی مخلوق کے خلیفہ بنانے میں فرشتوں کی فہم میں نہ آسکی تھی وہ بھی کچھ نہ کچھ سمجھ میں آنے لگتی ہے اور یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ ان ہر سہ انواع میں خلافت کا استحقاق کس کو ہونا چاہیے۔ فرشتوں کی نظر صرف بنو آدم کی معصیت تک ہی محدود رہی اور اسی حد تک ان کی عصمت کا تقاضہ ہونا چاہیے، وہ معصیت سے آشنا نہ تھے اس لیے استغفار و توبہ کی حقیقت پہچانتے تو کیسے پہچانتے رحمت نے یہ کرشمہ دکھلا دیا کہ صورتِ معصیت کے ساتھ اگر استغفار و توبہ رہے تو جنت سے ہبوط، ہبوط نہیں وہ خلود کی بشارت ہے اور اس کا نقد ثمرہ خلافتِ الٰہیہ ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ زمین پر وقت کے سب سے بڑے اور آخری خلیفہ ہوں ان کی زبان سے مخلوقِ خدا ایک ایک مجلس میں سو سو بار بھی استغفار سن لے۔

خوب یاد رکھیے خطرہ معصیت سے نہیں خطرہ یہ ہے کہ معصیت کے بعد استغفار نہ ہوا اور جب استغفار نہ ہو تو پھر قہر معصیت ہی معصیت رہ جائے اور اس طرح انسان بنی آدم کی فہرست سے نکل کر اولادِ ابلیس میں شمار نہ ہو جائے اب آپ ہی اندازہ فرمائیے کہ جب آغازِ عالم ہی مخلوقِ الٰہی میں مقبول و مردود کی تقسیم کی بنیاد استغفار ٹھہری اور آئندہ بھی اس درمیانی مخلوق کی اس طرف یا اُس طرف مردم شماری کا مدار اسی استغفار پر ٹھہرا تو پھر استغفار کرنا کتنا اہم وظیفہ ہونا چاہیے اور نیز یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں یہ دلیلِ معصیت ہوئی یا برہانِ معصیت۔ واللہ یھدی من یشاء

الیٰ صراط مستقیم

منها عبادۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۱۱۸۶- عَنِ الْمُغِیْرَۃِ قَالَ قَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی تَوَرَّمَتْ قَدَمَاہُ فَقِیْلَ لَہٗ لِمَ تَصْنَعُ ھٰذَا وَقَدْ غُفِرَ لَکَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَأَخَّرَ قَالَ اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا ۔ متفق علیہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبادت

۱۱۸۶- مغیرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا طویل طویل قیام فرمایا ہے کہ پیروں پر ورم چڑھ گیا اس پر لوگوں نے عرض کی آپ کے تو اگلے پچھلے معاملات سب درگزر ہو چکے آپ کس لیے یہ مشقت اٹھاتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا تو کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ متفق علیہ

۱۱۸۶- انبیاء علیہم السلام کی نفلی عبادت کا معیار بہت بلند ہوتا ہے وہ فرائض میں امت کی خاطر تخفیف کا لحاظ رکھتے ہیں لیکن جہاں ان کا انفرادی معاملہ آیا پھر وہاں ان کی شان الگ نظر آتی ہے حقیقت یہ ہے کہ عبد کی ترقی کا سارا راز ہی جب عبادت میں پنہاں ہو تو جتنا بڑا عبد ہو اس کی شان عبادت بھی اتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو۔ یہاں قرآن کا حکم بھی یہی تھا۔ قم الیل الا قلیلا۔ آپ کی عبادت کی ایک صورت یہ ہے کہ رات بھر مصروف عبادت رہیں اور صرف تھوڑے سے حصہ میں استراحت ہو۔ تو پھر حکم ایزدی کی تعمیل میں آپ کی جدوجہد جتنی بھی وسیع ہو سب بجا تھی۔ پھر آپ کی اتباع میں آئندہ بھی بعض ائمہ نے اس سنت کو تازہ رکھا ہے۔ اس حدیث میں یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ عبادت کی کثرت صرف اسی میں منحصر نہیں کہ گناہ موجود ہوں بلکہ بندہ کی شکر گزاری کی طرح سے بڑی صورت بھی ہے اس لیے بخشش و کرم کا انعام جتنا زیادہ ہو عبادت کی شان بھی اتنی ہی اونچی ہونی چاہیے۔ یہاں آپ نے دو لفظ فرمائے ہیں عبد، شکور۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت پہلے تو تقاضۂ عبدیت ہے، پھر تقاضائے شکر گزاری بھی یہی ہے جب میں عبد بھی عبد شکور ٹھہرا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میری عبادت اسی کے مناسب نہ ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کے عبد سب ہی ہیں اس لیے اس نعمت کا شکر سب ہی کے ذمہ واجب ہے لیکن ایسے عبد نادر ہیں جو عبد بھی ہوں اور شکور بھی ہوں۔ وقلیل من عبادی الشکور میں کفران نعمت کا شکوہ ہے۔ یہ جماعت انبیاء علیہم السلام ہی کا خاصہ ہے کہ وہ پیدائشی طور پر شکر گزار ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شکور نہیں وہ گویا عبد ہی نہیں۔

اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا بے شک نوح شکر گزار بندے تھے۔

الانبياء والرسل عليهم الصلوٰة والسلام واعدادهم

۱۱۸۷- عَنْ اَبِىْ ذَرٍّ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمِ الْاَنْبِيَاءُ قَالَ مِائَةُ اَلْفِ نَبِىٍّ وَّاَرْبَعَةٌ وَّعِشْرُوْنَ اَلْفًا قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَمِ الرُّسُلُ مِنْهُمْ قَالَ ثَلٰثُ مِائَةٍ وَّثَلَاثَةَ عَشَرَ جَمٌّ غَفِيْرٌ ثُمَّ قَالَ يَا اَبَا ذَرٍّ! اَرْبَعَةٌ سُرْيَانِيُّوْنَ اٰدَمُ وَشِيْثُ وَنُوْحٌ وَّخُنُوْخُ وَهُوَ اِدْرِيْسُ وَهُوَ اَوَّلُ مَنْ خَطَّ بِقَلَمٍ وَّاَرْبَعَةٌ مِّنَ الْعَرَبِ هُوْدُ وَصَالِحُ وَّشُعَيْبُ وَنَبِيُّكَ وَاَوَّلُ نَبِىٍّ مِّنْ اَنْبِيَاءِ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ مُوْسٰى وَاٰخِرُهُمْ عِيْسٰى وَاَوَّلُ النَّبِيِّيْنَ اٰدَمُ وَاٰخِرُهُمْ نَبِيُّكَ

(اخرجه ابن حبان فى صحيحه وقال صاحب الدر المنثور والصواب انه ضعيف لا صحيح ولا موضوع) (اخرجه عبد بن حميد والحكيم الترمذى فى نوادر الاصول وابن حبان فى صحيحه والحاكم وابن عساكر) وقد تكلم الحافظ ابن كثير فى اسانيده وضعفها كما فى البداية والنهاية ملہ ۲ ومتہ ۱ دمتہ ۹۷

حضرات انبیا علیہم السلام اور اُن کی تعداد

۱۱۸۷- ابوذرؓ فرماتے ہیں ہم نے پوچھا یا رسول اللہ کل انبیا کی تعداد کتنی تھی۔ آپ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار میں نے پوچھا یا رسول اللہ اس میں رسول کتنے تھے۔ آپ نے فرمایا تین سو تیرہ کی بڑی تعداد۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا ابوذر! ان میں چار نبی تو سریانی تھے۔ آدم، شیث، نوح، خنوخ (علیہم السلام) یہ ادریس علیہ السلام کا نام ہے اور یہ پہلے وہ نبی ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا۔ اور چار ان میں عرب کے ہیں۔ ہود، صالح، شعیب (علیہم السلام) اور تمہارا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بنی اسرائیل میں جو سب سے پہلے نبی تھے وہ موسیٰ علیہ السلام تھے اور سب سے آخری عیسیٰ (علیہ السلام) تھے خلاصہ یہ کہ نبیوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تھے اور سب سے آخر میں تمہارا نبی (اللھم صل وسلم وبارک علیہم) یہ حدیث موضوع تو نہیں مگر ضعیف ہے۔

(درمنثور)

۱۱۸۷- واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی سب سے ممتاز شان یہ ہے کہ ان سب کو ماننا بھی ایمان کا ایک رکن اعظم ہے جن کا نام بیان میں آچکا ہے ان کے نام کے ساتھ اور جن کا نام بیان میں نہیں آیا ان پر اجمال کے ساتھ۔ یہاں انبیاء علیہم السلام کی ذات گو سب کے مشاہدہ میں موجود ہوتی ہے مگر ان کی نبوت کا معاملہ پھر اسی طرح عالم غیب میں داخل ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے اور جنت و دوزخ کا۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام کو خود بھی اپنی اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے کیونکہ جو چیز مشاہدہ میں ہوتی ہے وہ صرف اُن کی ذات ہے ان کی نبوت نہ مشاہد ہوتی ہے اور نہ وہ مشاہدہ کرنے کی چیز ہے۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ کا منکر کافر ہوتا ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں

کسی ایک فرد کا انکار یا اجمالاً ان کی جنس ہی کا انکار یہ سب کفر ہیں۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ)

لفظ نبی کا اشتقاق

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ نبی کا لفظ نبأ سے مشتق ہے اور لغت میں انباء گو ہر چیز کے لیے مستعمل ہو سکتا ہے لیکن اس کا عام استعمال اب صرف غیب کی خبروں میں ہونے لگا ہے۔ آیات ذیل ملاحظہ فرمائیے

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (آل عمران) — اور جو تم اپنے گھروں میں کھا کر آتے ہو اور جو رکھ کر آتے ہو وہ میں تم کو سب بتا دیتا ہوں۔

فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (التحریم) — پھر جب آپ نے اس بات کو جتلا دیا تو وہ بولیں آپ کو یہ خبر کس نے دی آپ نے فرمایا اس نے بتا دیا جو بڑا جاننے والا اور واقف کار ہے۔

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ (ص) — کہہ دو کہ ایک بڑی خبر ہے جس کو تم دھیان میں نہیں لاتے۔

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ (عم) — کس چیز کے متعلق یہ باہم گفت و شنید کر رہے ہیں ایک بہت بڑی خبر کے متعلق (یعنی قیامت)

وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْبَآئِكُمْ (الاحزاب) — اور اگر وہ فوجیں آجائیں تو یہ آرزو کریں کہ کسی طرح ہم گاؤں میں باہر نکلے ہوئے ہوں پوچھ لیا کریں تمہاری خبریں۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (ز م) — اور تھوڑے دنوں بعد اس کی خبر جان لوگے۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (انعام) — ہر خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور قریب ہے کہ تم اس کو جان لوگے

اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (البقرہ) — (فرشتوں سے فرمایا) اچھا ان چیزوں کے نام مجھ کو بتاؤ۔

يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ (البقرہ) — اے آدم تم ان کو بتا دو ان چیزوں کے نام۔

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ (التوبہ) — کہہ دو بہانہ مت بناؤ ہم ہرگز تمہاری بات نہ مانیں گے اللہ تعالیٰ ہم کو تمہارے حالات بتا چکا ہے۔

دیکھو ان تمام مواضع میں لفظ انبار کا استعمال صرف اُن خبروں میں ہوا ہے جو اپنے علم و مشاہدہ کی نہیں ہیں بلکہ لاعلمی اور عدم موجودگی کی ہیں اس لیے اس کو نبیٔ پڑھنا چاہیے تھا لیکن تخفیف کے لیے ہمزہ حذف کر دیا گیا ہے اور اب بجائے مہموز کے اس کو نبیّ (معتل) استعمال کرنے لگے ہیں۔ اس کے مہموز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی جمع انبیاء آتی ہے۔ دیکھو کتاب النبوات ص۲۲۲ و ص۲۲۳

نبی کے معنی

حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ "نبی" فعیل کے وزن پر ہے۔ لغت عرب میں یہ وزن "فاعل" اور "مفعول" دونوں معنی میں مستعمل ہوتا ہے مگر یہاں اس کو مفعول کے معنی میں لینا زیادہ موزوں ہے۔ اس لحاظ سے نبی اللہ کے معنی یہ ہوں گے "الذی نبأہ اللہ" یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہو اور اس کو غیب کی خبریں دی ہوں۔ اب یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو بھی ان کی اطلاع دے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا تو وہ دوسروں کو بھی اس کی اطلاع دے دیگا۔ ورنہ نہیں لیکن جس بات پر اس کا نبی اللہ ہونا موقوف ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو غیب کی خبریں دی جائیں۔ پس جس حرف سے نبی اور غیر نبی میں امتیاز پیدا ہوتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیب کی خبریں دینا نہ دینا ہے۔ غیب کی خبریں جس طرح انبیاء علیہم السلام بیان کرتے ہیں اسی طرح ان کے علاوہ کاہن و جوتشی وغیرہ بھی بیان کرتے ہیں مگر پھر ان کو انبیاء کیوں نہیں

کہا جاتا؟ صرف اس لیے کہ کاہن کو خبر دینے والا شیطان ہوتا ہے، رحمٰن نہیں ہوتا اس لیے وہ نبی اللہ کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ لفظ رسول کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے "رسول اللہ" بھی صرف اسی کو کہا جائیگا جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہو بس جیسے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کا رسول ہو کسی غیر کا رسول نہیں ہو سکتا اور نہ کسی دوسرے کا حکم مان سکتا ہے اسی طرح نبی اللہ بھی غیر اللہ کا نبی نہیں بن سکتا اور نہ وہ کسی اور کی خبریں دیتا قبول کر سکتا ہے۔ جب حقیقت یہ ٹھہری کہ اس کی خبریں صرف اُنھی خبروں میں منحصر ہو گئیں تو اُن پر ایمان لانا بھی لازم ہو گیا کیونکہ اُس کے متعلق یہ وہم ہی نہیں ہو سکتا کہ جو خبریں وہ دیتا ہے اس میں شیطان کی وحی کا کوئی احتمال ہو سکتا ہے۔ غیر نبی کی یہ شان نہیں۔ اولیاء اللہ بھی غیب کی خبریں دیتے ہیں مگر چونکہ وہ نبی اللہ نہیں ہوتے اس لیے اُن کی خبروں پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ اس میں شیطان کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہو سکتی، یہ صرف نبی اللہ کی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ فطرۃً غیر اللہ کی خبر قبول ہی نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ دوسروں کی خبروں میں یہ امکان موجود رہتا ہے اس لیے وہاں حق و باطل مشتبہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اُن کی خبروں پر ایمان لانا واجب نہیں ہوتا اور اسی لیے رسول کی طرح ان کی اطاعت کرنی واجب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول اور نبی نہیں بنایا تو اب اس کی کیا ضمانت ہے کہ غیر اللہ نے اس کے قلب میں کوئی بات القا نہیں کی پھر اُن کی اطاعت کو بعینہٖ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کیسے کہا جا سکتا ہے۔ رسول چونکہ اسی لیے رسول بنایا جاتا ہے کہ وہ خدائی احکامات دوسروں تک پہنچا دے اس لیے وہاں یہ احتمال نہیں ہو سکتا اور اسی لیے دوسروں کو اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (النساء)	اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لیے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمان سے۔

علماء امت بھی گو اللہ تعالیٰ ہی کی حکمبرداری اور اسی کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں اور اکثر ان کا یہ حکم درست ہی ہوتا ہے، مگر چونکہ ان کو غیر اللہ کی اطاعت پر اللہ کی اطاعت سمجھنے کی غلط فہمی ہو سکتی ہے اس لیے نادانستگی میں وہ غیر اللہ کی اطاعت کا حکم بھی دے سکتے ہیں اسی لیے علماء کی اطاعت کو بعینہٖ اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہی حال امت کے محدثین اور ملہمین کا ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہامات ہوتے ہیں وہ بھی معصوم نہیں ہوتے اس لیے ان کے الہامات میں بھی شیطانی وساوس کا احتمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے الہامات کے حق و ناحق ہونے کا معیار انبیاء علیہم السلام کی وحی سے مطابقت و مخالفت قرار دیا گیا ہے۔ شیاطین کو چونکہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پوری عداوت ہوتی ہے اس لیے وہ خوب پہچانتے ہیں کہ رحمٰن کی وحی کیا ہے اور شیطان کا فریب کیا ہے۔
کتاب النبوات ص۱۶۶ و ص۱۶۷

شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کیا عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو احکامات رسول کے واسطے سے ہمارے پاس آئیں وہ تو کسی تفصیل کے بغیر بے چون و چرا قابل تسلیم ہوں اور جو ہم خود بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے سنیں یعنی الہام کے طور پر وہ اس وقت تک قابل اعتماد نہ ہوں جب تک کہ رسول کی وحی پر اس کو تول نہ لیا جائے۔ چنانچہ رسول کی شان میں ارشاد ہے۔

مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ (الحشر)	رسول جو تم کو دے وہ لے لو اور جس بات سے روکے اُسے چھوڑ دو۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ رسول کی بات مطلقاً قبول کر لینی فرض ہے۔ اب یہ کیسی تعجب کی بات ہے کہ رسول اللہ کی ذات

خود تو مقید ہو ظاہر ہے کہ انسان ہر گوشہ میں مقید ہے اپنی ذات میں بھی اور اپنی صفات میں بھی) مگر اس کا حکم ماننا مطلقاً واجب ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات گو خود تو مطلق ہے مگر اس کے بلا واسطہ احکام کا قبول کرنا مقید ہے یعنی اس کو میزانِ شریعت پر تولنا ضروری ہے۔ پھر اس کی تفصیل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ رسول چونکہ خود معصوم ہوتا ہے اور اس کو اسی لیے بھیجا جاتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے احکام مخلوق کے سامنے بیان کرے اس لیے جب اس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے تو پھر اس کی حکمبرداری کا حکم مطلق کیوں نہ ہو۔ رسول کے علاوہ کسی کو اس لیے مقرر نہیں کیا جاتا کہ وہ احکام ربانی دوسروں تک پہنچائے، اس لیے "مبین" یعنی کھول کر بیان کرنے والا۔ ان کا منصب نہیں ہوتا اس لیے وہاں یہ احتمال موجود ہوتا ہے کہ اس میں کوئی غیبی آزمائش ہو، قدرت کو یہ امتحان منظور ہو کہ اعتماد رسول کی وحی پر ہے یا اپنے الہام پر۔ پھر اگر اپنا الہام پر اعتماد کر لیا گیا ہے تو کیوں؟ قدرت نے جب ان کو نبی نہیں بنایا تو ان پر شیطان دشمن کی طرف سے وحی کیوں نہیں آسکتی اور ان کے پاس اس کی ضمانت کیا ہو کہ جس کو انہوں نے الہام رحمٰن سمجھا ہے وہ درحقیقت الہام رحمٰن ہی ہے۔ یہ ضمانت صرف ایک رسول کے حق میں ہے ان کے علاوہ کسے باشد ان کے علوم کے لیے میزان بھی علوم نبوت ہیں۔ الیواقیت والجواہر ص ۴۴ و ۴۵ و ۴۶۔

نبی اور رسول کا فرق

حافظ ابن تیمیہؒ نبی اور رسول کا فرق لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو غیب کی خبریں دے کر نبی بنا دے تو وہ "نبی اللہ" بن جاتا ہے۔ اور جب تک کسی کا فرقوم کو خدائی پیغامات پہنچانے کا اس کو حکم نہ دے اس وقت تک وہ صرف "نبی اللہ" ہی رہتا ہے خواہ وہ کسی پہلی شریعت پر ہی عمل کرتا رہے ہاں جب اس کو کسی کافر قوم کو خدائی احکام پہنچانے کا حکم ہو جائے تو اب وہ "نبی اللہ" ہونے کے ساتھ "رسول اللہ" بھی بن جاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان جو اس کے برگزیدہ بندے گزرے ہیں وہ سب انبیاء تھے "رسول اللہ" ان میں کوئی نہ تھا۔ ان کا وظیفہ صرف یہ تھا کہ وحی ربانی پر خود عمل کریں اور مومنوں کی جو جماعتیں ان کے سامنے تھیں ان کو بھی عمل کرنے کا حکم دیں۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا اور کفر ظاہر ہوا تو اب ان کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے اور وہ رسول اللہ کہلائے۔ اسی لیے ان کو حدیثوں میں سب سے پہلا رسول کہا گیا ہے۔

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا مقصد

اس بیان سے ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تذکیر و نصیحت کا تعلق صرف مومنوں کے دائرہ تک محدود رہا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن پر احکامات آتے اور وہ ان کو مومنوں کو سُنا دیتے جیسا کہ انبیاء بنی اسرائیل تھے وہ خود تورات کی شریعت پر عامل تھے۔ اگرچہ خاص خاص معاملات میں اُن پر خدا تعالیٰ کی طرف سے خاص خاص وحی بھی آتی تھی۔ پھر وہ اس وحی کی روشنی میں بنی اسرائیل کے مقدمات کے فیصلے اسی طرح فرمایا کرتے تھے جیسا کہ آج علماء قرآن کی روشنی میں امت کے نزاعات کے فیصلے کرتے ہیں یہ بھی نکتہ تھا کہ آپ نے اپنے علماء امت کو بنی اسرائیل کے انبیاء سے تشبیہ دی ہو اور علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل فرمایا ہو اور بنی اسرائیل کے رسولوں سے تشبیہ دے کر یوں نہیں فرمایا علماء امتی کرسُل بنی اسرائیل۔

اس کے بعد حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ رسول کے لیے جدید شریعت لانا قطعاً ضروری نہیں۔ دیکھو حضرت یوسف علیہ السلام رسول اللہ تھے، باوجودیکہ وہ ملت ابراہیمی پر تھے۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی رسول اللہ تھے اور شریعت تورات پر عامل تھے۔ کتاب النبوات ص ۱۷۳، ۱۷۴۔

نبوت اور رسالت کی اس تشریح سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ صرف وحی یا ارسال یا بعثت کے لفظ سے نہ رسالت ثابت ہوتی ہے نہ نبوت یہ سب الفاظ لغت میں عام معنی میں بھی مستعمل ہوتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

وحی کا عام اطلاق

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا (نحل) — اور تمہارے پروردگار نے وحی بھیجی (یعنی حکم دیا) شہد کی مکھی پر کہ پہاڑوں میں چھتے بنالے۔

وَاَوْحَیْنَا اِلَیْہِ لَتُنَبِّئَنَّھُمْ بِاَمْرِھِمْ ھٰذَا وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ (یوسف) — اور ہم نے (یوسف علیہ السلام) کو اشارہ کیا (وحی کی) کہ تم ان کے کام ان کو جتا دو گے اور وہ کچھ کو نہ جانینگے

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی اَنْ اَرْضِعِیْہِ (القصص) اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو حکم بھیجا کہ اس کو دودھ پلاتی رہ

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ (المائدۃ) — اور جب میں نے دل میں ڈال دیا حواریوں کے کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر

وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ (انعام) اور شیطان دل میں ڈالتے ہیں اپنے دوستوں کے۔

یُرْسَلُ عَلَیْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ۔ (الرحمٰن) — چھوٹے جائیں تم پر آگ کے صاف شعلے اور دھواں ملے ہوئے۔

رسالت کے عام معنے

وَھُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِہٖ (الاعراف) — اور وہی ہے کہ ہوائیں خوشخبری لانے والی چلاتا ہے بارش سے پہلے۔

یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْكَ (ہود) — مہمانوں نے کہا اے لوط ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ یہ ہرگز آپ تک نہ پہنچ سکینگے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّھُمْ اَزًّا (مریم) — کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کافروں پر شیطان رکھ چھوڑے ہیں جو ان کو ابھار ابھار کر اچھالتے ہیں۔

بعثت کے دوسرے معنے

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ (بنی اسرائیل) — پھر جب پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے بھیجے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْھِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ یَّسُوْمُھُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (الاعراف) — اور اس وقت کو یاد کرو جب تیرے رب نے خبر کردی تھی کہ یہود پر ایسے شخص کو ضرور بھیجتا رہیگا جو ان کو بڑا عذاب دیا کرے

پہلی پانچ آیتوں میں وحی کا اطلاق وحی نبوت کے علاوہ عام معنوں میں ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نہ نبیہ تھیں نہ رسول اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام پر جس وحی کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ان کے بچپن کا واقعہ ہے اس وقت تک وہ رسول نہ تھے۔ اسی طرح حواری بھی رسول نہ تھے حتیٰ کہ اس عام معنی کے لحاظ سے اس کا استعمال شہد کی مکھی میں بھی آیا ہے اور آخری آیت میں شیطانی القا کو بھی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ لغت کے لحاظ سے ہر وہ بات جو خفیہ طور پر اور اشارات میں کہی جائے وحی کہلاتی ہے۔ وحی نبوت ایک خاص اصطلاح ہے۔ اسی طرح لفظ رسول اور ارسال بھی عام ہے۔ اس لفظ کو بھی اللہ تعالیٰ، ملائکہ، شیاطین، آتش اور ہواؤں میں بھی استعمال فرمایا گیا ہے۔ آیات بالا ملاحظہ فرمایئے لیکن اصطلاح میں اس کا اطلاق اب صرف اللہ تعالیٰ کی رسالت سے مخصوص ہے عام رسالت کا مقصد صرف کسی مقررہ خدمت کا انجام دینا ہوتا ہے۔ یہ مقصد نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مخلوق

کو کوئی پیغام پہنچایا جائے یہی حال لفظ بعث کا ہے اس کا استعمال بھی بعثت فرعی اور بعثت کونی دونوں میں آیا ہے۔
یہاں گفتگو ان کے عام معانی میں نہیں، بلکہ خاص "وحی النبوۃ" "نبی اللہ" اور "رسول اللہ" بالاضافت کے معنی
میں ہے اور جو تشریح اوپر بیان کی گئی ہے وہ ان مقید الفاظ ہی کی ہے[۱]

[۱] واضح رہے کہ نبی اور رسول کے الفاظ اسلامی تصانیف میں اللہ کے اسم مبارک کے بعد دوسرے درجہ کی شہرت رکھتے ہیں حتی کہ علمی کتابوں میں شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہوگی خواہ وہ کسی فن کی کیوں نہ ہو جس میں ان الفاظ کی تشریح نہ کی گئی ہو مگر آپ کو حیرت ہوگی کہ اصطلاحات کی ریاضت نے اس بدیہی مسئلہ کو بھی اتنا الجھا دیا ہے کہ اس جیسا صاف مسئلہ بھی ہر جگہ نظری بنا ہوا نظر آتا ہے۔ حافظ موصوف نے جس طرح یہاں اس کو سلجھا دیا ہے اتنا صاف ہماری نظر سے اور کہیں نہیں گزرا۔ حضرت استاذ قدس سرہ فرماتے تھے کہ حافظ موصوف کی پوری کتاب النبوات میں ایک یہی مسئلہ قابل قدر ہے۔
اس لیے اگر آیات قرآنیہ اور صحیح حدیثوں کی روشنی میں تحقیق درست ثابت ہوتی ہے تو کسی ضعیف روایت کی بنا پر اس کو ترک کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ آدم علیہ السلام کے متعلق اکثر حدیثوں میں "نبی مکلم" کے لفظ آتے ہیں۔ اگر کسی راوی نے یہاں رسول کا لفظ نقل کر دیا ہے تو اتنی بیش قیمت تحقیق کو صرف راوی کے ایک لفظ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس روایت کی بنا پر جن بعض اکابر نے حافظ موصوف سے یہاں اختلاف رائے فرمایا ہے ہمیں ان کے ساتھ اتفاق نہیں۔
واللہ تعالیٰ اعلم

سیدنا وسید ولد آدم الرسول الاعظم محمد النبی الامی المطلبی الھاشمی

اولھم خلقاً واٰخرھم بعثاً صلوات اللہ وسلامہ علیہ

معنوی نظر میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سروری کا کچھ اندازہ کرنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہو کہ قرآن شریف سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہو کہ نبوت کی ابتدار وانتہا بشکل دائرہ ہوئی ہو۔ اس لیے یہ بات معلوم کرنی ضروری ہو کہ ایک دائرہ کے لیے کیا کیا باتیں ضروری ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ دائرہ کی ابتدار اور اس کی انتہار بالکل یکساں ہوتی ہو، اس کے دونوں سروں میں اگر ذرا سا بھی فرق رہ جائے تو دائرہ تمام نہیں ہوسکتا، پھر ہر دائرہ کے لیے ایک مرکز کا ہونا بھی لازم ہے۔ مرکز کے بغیر کسی دائرہ کا موجود نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جب تک مرکز متعین نہ ہوجائے اس وقت تک دائرہ کا خط کھینچا ہی نہیں جاسکتا۔ پھر جب مرکز متعین ہوجائے تو دائرہ میں جتنے بھی نقطے فرض کیے جائیں ضروری ہو کہ ان سب کا رُخ اُسی مرکز کی طرف رہو اگر کوئی نقطہ اس مرکز سے ذرا علیحدہ فاصلہ پر رہیگا بس یہیں سے دائرہ ٹوٹ جائیگا۔ پھر جس طرح وجود دائرہ کے لیے مرکز کا تعین پہلے ضروری ہوتا ہے اسی طرح ظہور مرکز کے لیے دائرہ کے وجود کی ضرورت ہوتی ہے یعنی جب دائرہ کھینچا جاتا ہو تو ضرور کسی مرکز سے کھینچا جاتا ہے مگر جب تک دائرہ تمام نہیں ہولیتا اس وقت تک مرکز کا وجود معرض ظہور میں نہیں آتا۔ پھر یہ کہ کسی دائرہ میں دو مرکز نہیں ہوسکتے۔ البتہ ایک ہی مرکز پر چھوٹے بڑے بہت سے دائرے کھینچے جاسکتے ہیں۔ اب سُنیے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہو کہ نبوت کی آفرینش بشکل دائرہ ہوئی ہے اسی لیے اس کا ابتدائی نقطہ یعنی حضرت آدم علیہ السلام اور اس کا انتہائی نقطہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں کو یکساں فرمایا گیا ہے۔ یہ صفت دائرہ ہی کی ہوتی ہو کہ جو اس کا ابتدائی نقطہ ہوتا ہے وہی آخر میں اس کا انتہائی نقطہ بن جاتا ہو۔ خطِ مستقیم میں یہ صفت نہیں ہوتی اس کے ابتدار وانتہار کے دونوں نقطے بالکل علیحدہ علیحدہ ممتاز ہوتے ہیں۔ یہاں جب دائرہ کے ابتدائی نقطہ کی طرف نظر کی جاتی ہو تو وہ حضرت آدم علیہ السلام نظر آتے ہیں جن کے نہ والد تھے نہ والدہ۔ ان کے بعد حضرت حوّار کا وجود ہوا جو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے بنائی گئی تھیں اس لیے اس کو ولادت سے تعبیر کیا نہیں جاسکتا جیسے کسی شخص سے اگر اس کا ہاتھ الگ کرلیں تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ہاتھ اس سے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت حوّار کو چونکہ ضلع آدم علیہ السلام سے بنایا گیا تھا اس لیے ان کو آدم علیہ السلام کی ذریت میں شمار نہیں کیا جاسکتا لھذا

اب ان کو بھی سلسلۂ تخلیق ہیں اسی مرتبہ میں رکھنا پڑیگا جس میں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں یہ بات دوسری ہو کہ حضرت آدم علیہ السلام بہ حیثیت والد کے نہ سہی بہ حیثیت اصل ہونے کے حضرت حوا سے اشرف ہوں مگر یہ نسبت صرف ان دونوں کے درمیان رہیگی بنی آدم کے لیے دونوں ہی مبدا ہونگے۔ حضرت آدم علیہ السلام سلسلۂ خلافت کے لیے اور اجسام انسانیہ کے مبدأ اول اور حضرت حوا صرف اجسام انسانیہ کے لیے مبدء مگر مبدء ثانی ہونگی۔ اب اگر اُن پر غور کیا جائے تو حضرت حوا کے لیے والدہ کوئی نہیں ہاں حضرت آدم علیہ السلام ان کی اصل ہونے کی وجہ سے والد کی جگہ کہے جاسکتے ہیں۔ پس جب تخلیق کے ابتدائی نقطہ میں ایک مذکر اور ایک مؤنث ہیں جس میں مؤنث کے لیے ماں کوئی نہیں تو چونکہ دائرہ میں انتہائی نقطہ جو اس کے مقابلہ میں اگر دائرہ کو پورا کرسکتا ہے ایسا ہی ہونا چاہیے جس میں ایک مذکر اور ایک مونث ہو مگر یہاں والدہ ہو مگر والد کوئی نہ ہو تاکہ اطراف دائرہ میں ایک طرف کی کمی اور دوسری طرف کی زیادتی بالمقابل آجائیں یعنی اگر ابتداء میں والدہ کی کمی ہو تو انتہاء میں والدہ کی زیادتی ہو اور اگر ابتداء میں والد کی زیادتی ہے تو انتہاء میں والد کی کمی رہے اور اس طرح اطراف دائرہ کے نشیب و فراز دونوں مل کر ایک دائرہ پورا ہوسکے۔ یہاں جب تمام انبیاء علیہم السلام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس صفت کا انسان بجز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور کوئی نہیں ملتا۔ سلسلۂ تخلیق میں اگر ایک طرف حضرت حوا ہیں جن کی والدہ نہ تھیں تو دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کے والد نہ تھے۔ شاید یہ خیال گزرے کہ اس بناء پر تشبیہ ان دونوں میں ہوئی لہذا بظاہر آیت یوں ہونی چاہیے تھی کہ اِن مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل حواء تاکہ جوڑ لفظے مقابل تھے وہی معرض بیان میں آتے اس کا جواب یہ ہو کہ اس آیت سے مقصد چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا والد کے بغیر صرف اپنی قدرت کاملہ سے ظاہر کرنا منظور ہے اس لیے اس میں حضرت آدم علیہ السلام ہی کے ساتھ تشبیہ دینی زیادہ مؤثر تھی اگر کمثل حواء فرماتے تو حضرت حوا کے لیے حضرت آدم علیہ السلام والد کے قائم مقام موجود اور یہاں منظور یہ تھا کہ علاقہ والدیت کا یکسر قلع قمع کر دیا جائے لہذا ایسی ہستی کے ساتھ تشبیہ دی جن کے لیے نہ والد تھے نہ والدہ تاکہ خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا بھی پورا ثبوت ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں کسی ادنیٰ سی تشبیہ سے بھی والد کا خطرہ ذہن میں نہ گزرسکے۔ اس بیان سے ظاہر ہو کہ دائرہ نبوت جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آکر ختم ہوگیا۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں:

وقولہ اذ جعل فیکم انبیاء ای کلما ھلک نبی قام فیکم نبی من لدن ابیکم ابراھیم الیٰ	اللہ تعالیٰ کے قول اذ جعل فیکم انبیاء کی تفسیر یہ ہو کہ جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو تم میں سے ہی دوسرا نبی اس کے قائم مقام

من بعده وكذالك كانوا لا يزال فيهم الانبياء يدعون الى الله ويحذرون نقمته حتى ختموا بعيسى عليه السلام۔ (تفسیر ابن کثیر ۱/۱۳۲)	آجاتا۔ تمہارے والد (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) سے لے کر بعد تک یہی دستور رہا اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی دعوت دیتے رہے اور اس کے عذاب سے ڈراتے رہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آکر ختم کر دیا گیا۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس تقدیر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کیا ہوگی تو اس کا جواب ظاہر ہے وہ یہ کہ آپ کی حیثیت مرکزی حیثیت ہے اسی لیے آپ کو مرکز کی طرح ظاہری طور پر بھی سلسلہ نبوت سے بالکل الگ سلسلہ میں پیدا فرمایا گیا تھا اور تعجب ہے کہ یہاں بھی اس کی رعایت رکھی گئی کہ جس طرح مرکز ایک ہی ہوتا ہے اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور دوسرا رسول ہی پیدا نہ ہو۔ پھر جس طرح آپ کو دائرۂ نبوت کا مرکز بنایا گیا تھا اسی طرح آپ کی ولادت کے لیے بھی وہی مقام پسند فرمایا گیا جو زمین کا مرکز کہلاتا ہے یعنی مکہ مکرمہ۔ اور جس طرح بیت اللہ کو زمین کا مرکز قرار دے کر سب سے پہلے وجود میں لایا گیا تھا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق بھی سب سے پہلے مقدر ہوئی تاکہ تعین مرکز ہولے تو دائرۂ نبوت اسی کے ارد گرد کھینچا جا سکے لیکن مرکزیت کا ظہور چونکہ دائرہ کی تمامیت پر موقوف ہوتا ہے اس لیے مقدر یوں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حسی طور پر ظہور قدسی جملہ انبیاء علیہم السلام کی آمد کے بعد ہو اور جس طرح محیط دائرہ کی نسبت ہر طرف سے اپنے مرکز سے مساوی ہوتی ہے اسی طرح جملہ انبیاء علیہم السلام کی نسبت مرکزی حیثیت سے آپ کے ساتھ برابر رہے حتیٰ کہ اگر موسیٰ علیہ السلام جیسا بڑی شریعت والا رسول بھی آپ کے دور میں آتا تو اس کو بھی آپ کی اتباع کیے بغیر کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اسی مرکزیت کے اعلان کے لیے جملہ انبیاء علیہم السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت کا قولاً وعملاً عہد لیا گیا تھا اور اسی کے اظہار کے لیے شب معراج میں جملہ انبیاء علیہم السلام کی امامت کا شرف آپ کو ہی عنایت ہوا اور اسی حقیقت کے عالم آشکارا کرنے کے لیے محشر میں لواء حمد یعنی حمد کا جھنڈا آپ ہی کے ہاتھ میں ہوگا جس کے نیچے آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سب انبیاء علیہم السلام ہوں گے تفصیل کے لیے ترجمان السنۃ ۳۹۹/۱ حدیث ۱۲۱ کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرما لیجیے۔

اس بیان کے اہم رکن دو ہیں: تکوینی نظر میں نبوت کی تخلیق بشکل دائرہ ہونی اور آپ کی تخلیق بہ حیثیت مرکز ہونی ان دونوں کی طرف قرآنی آیات میں اشارہ موجود ہے اس لیے ہمارے اس بیان کو گو برہان کا درجہ حاصل نہ ہو مگر محض خیالی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے مذکورہ بالا بیان سے اب حدیث انا اولهم

خلقاً واٰخرھم بعثاً کی پوری تشریح بھی ہوگئی۔ اس مضمون کی تائید قرآن کریم کی ایک اور آیت سے بھی ہوتی ہے ارشاد ہے۔ کان الناس اُمۃ واحدۃ فبعث اللّٰہ النبیین مبشرین ومنذرین یعنی ابتداء آفرینش دین ایک ہی تھا پھر جو جو اختلاف رونما ہوئے وہ اُمتوں کی کجرویوں سے رونما ہوئے۔ اسی طرح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں دین پھر ایک ہی رہ جائیگا جس کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دست مبارک سے ڈال چکے ہیں۔ مذاہب سماویہ میں بنیادی لحاظ سے قبلے دو رہ چکے ہیں: بیت مقدس، بیت اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے خود بیت مقدس کا بھی استقبال فرمایا اس کے بعد پھر بیت اللہ کو قبلہ متعین فرمادیا۔ سوچیے جب آخر کار قبلہ یہی ہونا تھا تو بیت مقدس کے عارضی استقبال کی حکمت کیا تھی؟ بیشک ایک حکمت یہ بھی تھی کہ آخری رسول کے دور میں سابقہ سب اختلافات کو ختم کرکے پھر ایک دین پر جمع کردیا جائے اور اس کی صورت یہی تھی کہ آپ عملی طور پر یہ بتادیں کہ اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی تھا۔ قبلہ کے مسئلہ کو صرف ناسمجھی سے اختلافات کی بنیاد بنا لیا گیا۔ اس لیے مدینہ طیبہ میں آکر پہلے آپ نے بیت مقدس ہی کا استقبال فرمایا اور عملاً یہ ثابت فرمادیا کہ یہ مسئلہ کوئی بنیادی اختلاف کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی لیے جو رسول وحدت ادیان کا اہم مقصد لے کر آیا ہے وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کردینا چاہتا ہے کہ قبلہ کی تقسیم صرف ایک وقتی مصلحت کے پیش نظر رہی ہے ورنہ اصل مقصد توجہ الی اللہ ہے اور یہ کسی خاص سمت کے ساتھ مخصوص نہیں فاینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ۔ اس حقیقت کو آپ نے اتنا واضح فرمایا کہ استقبال قبلہ جو نماز کی صحت کی شرائط میں شمار ہوتا ہے نفل نمازوں میں بحالت سفر مسافر کی سہولت پر چھوڑ دیا۔

الغرض جب ابتدا میں دین ایک تھا تو چونکہ دائرہ کی ابتدا اور انتہا یکساں ہوتی ہے اس لیے عالم کی انتہا میں پھر دین ایک ہی ہوجانا چاہیے اس لیے اس کی صورت یہ مقدر ہوئی کہ جس طرح ایک اسماعیلی رسول نے آکر اسرائیلی قبلہ کا استقبال کیا تھا اسی طرح ایک اسرائیلی رسول آکر اسماعیلی قبلہ کا استقبال کرے اور یہ بات پورے طور پر واضح ہوجائے کہ نہ تو اصل دین میں کوئی اختلاف ہے اور نہ انبیاء علیہم السلام میں باہم کوئی اختلاف ہے۔ جو اختلافات بھی ہوئے یہ سب اُمتوں کی کجروی کے نتائج تھے۔ کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللّٰہ النبیین مبشرین ومنذرین۔ اب اگر اس مقصد کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوتی تو یہ ختم نبوت کے خلاف تھا اس لیے مقدر یوں ہوا کہ آپ سے پہلے وہ بہ حیثیت نبوت ان کا ظہور بھی ہوجائے پھر اس مقصد کی تکمیل کے لیے آپ کی دوسری آمد بہ حیثیت امامت بھی ہو ظاہر ہے کہ جو بنی اسرائیل کے لیے رسول بنا کر بھیجا

گیا تھا۔ اب بنی اسماعیل میں اس کی آمد سے اس کے نبی ہونے نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ اپنے دورِ نبوت کو پورا کر کے اب بہ حیثیت امامت امت محمدیہ تشریف لائینگے اور ہم پہلے ترجمان السنہ ص۔۔ میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ مقام وہ تھا جس کی اولوالعزم انبیاء نے بھی تمنا کی ہے اس لیے یوں مقدر ہوا کہ اس اہم مقصد کے ظہور کے لیے عالم کے خاتمہ پر وہ رسول آئے جو پہلے نبی سے مشابہ ہو تاکہ جس طرح دین پہلے ایک تھا آخر میں پھر ایک ہی رہ جائے اور جب اس طرح اتحادِ ملل کا کام مکمل ہو جائے تو پیدائش عالم کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو جانے کی وجہ سے عالم کی صف لپیٹ کر رکھ دی جائے اور قیامت آجائے۔

اللّٰھم صل وسلم علیٰ سیدنا محمد اولھم خلقاً و اٰخرھم بعثاً

۱۱۸۸۔ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ شَفِیْعٍ فِی الْجَنَّۃِ لَمْ یُصَدَّقْ نَبِیٌّ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ مَا صُدِّقْتُ وَاِنَّ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ نَبِیًّا مَا صَدَّقَہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ اِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ رواہ مسلم۔

۱۱۸۹۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَاَوَّلُ مَنْ یَنْشَقُّ عَنْہُ الْقَبْرُ وَاَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ۔ رواہ مسلم۔

۱۱۹۰۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا اَکْثَرُ الْاَنْبِیَاءِ تَبَعًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ یَقْرَعُ بَابَ الْجَنَّۃِ۔ رواہ مسلم۔

۱۱۹۱۔ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اٰتِیْ بَابَ الْجَنَّۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

۱۱۸۸۔ میں جنت کے لیے سب سے پہلا شفاعت کرنے والا ہوں۔ انبیاءِ سابقین میں اس کثرت کے ساتھ کسی کی تصدیق نہیں کی گئی جتنی کہ میری۔ بعض انبیاء تو ایسے بھی ہوئے ہیں جن کی تصدیق صرف ایک ہی شخص نے کی ہے۔ (مسلم شریف)

۱۱۸۹۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ روزِ محشر تمام اولادِ آدم کا سردار میں ہونگا۔ قبر پھٹ کر جو سب سے پہلا شخص باہر آئیگا وہ میں ہوں، جو نبی سب سے پہلے مخلوق کی شفاعت کریگا وہ میں ہوں اور جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی وہ میں ہوں۔ مسلم شریف

۱۱۹۰۔ انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت میں جس نبی کے ماننے والے سب سے زیادہ ہونگے وہ میں ہوں، اور جو سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھلوانے کے لیے دستک دیگا وہ میں ہوں

۱۱۹۱۔ انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن میں جنت کے دروازہ پر آؤنگا

فَاَسْتَفْتِحُ فَيَقُوْلُ الْخَازِنُ مَنْ اَنْتَ فَاَقُوْلُ مُحَمَّدٌ فَيَقُوْلُ بِكَ اُمِرْتُ اَنْ لَا اَفْتَحَ لِاَحَدٍ قَبْلَكَ۔

رواہ مسلم۔

۱۱۹۲۔عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَبِيَدِيْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ وَمَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ اٰدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ اِلَّا تَحْتَ لِوَائِيْ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ وَلَا فَخْرَ۔ رواہ الترمذی

۱۱۹۳۔عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَلَسَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَرَجَ حَتّٰى اِذَا دَنَا مِنْهُمْ سَمِعَهُمْ يَتَذَاكَرُوْنَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا وَقَالَ اٰخَرُ مُوْسٰى كَلَّمَهُ تَكْلِيْمًا وَقَالَ اٰخَرُ فَعِيْسٰى كَلِمَةُ اللّٰهِ وَرُوْحُهُ وَقَالَ اٰخَرُ اٰدَمُ اصْطَفَاهُ اللّٰهُ فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ قَدْ سَمِعْتُ كَلَامَكُمْ وَعَجَبَكُمْ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلُ اللّٰهِ وَهُوَ كَذٰلِكَ وَمُوْسٰى نَجِيُّ اللّٰهِ وَهُوَ كَذٰلِكَ وَعِيْسٰى رُوْحُهُ وَكَلِمَتُهُ وَهُوَ كَذٰلِكَ وَاٰدَمُ اصْطَفَاهُ اللّٰهُ وَهُوَ كَذٰلِكَ اَلَا وَاَنَا حَبِيْبُ اللّٰهِ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا حَامِلُ لِوَاءِ الْحَمْدِ يَوْمَ

اور دروازہ کھلواؤنگا۔جنت کا دربان پوچھیگا آپ کون! میں کہونگا میں ہوں محمد وہ عرض کریگا مجھ کو حکم ملا ہے کہ سب سے پہلے میں آپ ہی کے لیے دروازہ کھولوں، آپ سے پہلے کسی شخص کے لیے نہ کھولوں (مسلم)

۱۱۹۲۔ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن تمام اولادِ آدم کا سردار میں ہوں اور یہ کوئی فخر نہیں۔حمد وثنا کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور یہ بھی کوئی فخر نہیں اور اس دن آدم علیہ السلام اور ان کے سوا جتنے رسول ہیں سب میرے جھنڈے کے نیچے ہونگے اور سب سے پہلا شخص جو زمین پھٹ کر باہر آئیگا وہ میں ہوں اور یہ کوئی فخر نہیں۔ (ترمذی شریف)

۱۱۹۳۔ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ بیٹھے ہوئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے جب اُن کے قریب آئے تو آپ نے ان کی گفتگو سنی کوئی تعجب سے کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا ہے۔کوئی کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر براہ راست گفتگو کی ہے۔کوئی کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہلانے کا شرف بخشا ہے۔کوئی اور یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو صفی اللہ کے لقب سے نوازا ہے جب آپ باہر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا میں نے تمہاری تمام گفتگو اور تمہارے تعجب کا معاملہ دیکھا اور سنا۔کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ تھے جیسا کہ تم کہہ رہے تھے اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہمکلامی عطا ہوا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ

الْقِيَامَةِ تَحْتَ لِوَائِي آدَمُ فَمَنْ دُونَهُ وَلَا فَخْرَ وَأَنَا أَوَّلُ شَافِعٍ وَأَوَّلُ مُشَفَّعٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَأَنَا أَوَّلُ مَنْ يُحَرِّكُ حَلَقَ الْجَنَّةِ فَيَفْتَحُ اللّٰهُ لِي فَيُدْخِلُنِيهَا وَمَعِي فُقَرَاءُ الْمُؤْمِنِينَ وَلَا فَخْرَ وَأَنَا أَكْرَمُ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ عَلَى اللّٰهِ وَلَا فَخْرَ۔ رواہ الترمذی والدارمی۔

۱۱۹۴۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ قَيْسٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَحْنُ الْآخِرُونَ وَنَحْنُ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَإِنِّي قَائِلٌ قَوْلًا غَيْرَ فَخْرٍ إِبْرَاهِيمُ خَلِيلُ اللّٰهِ وَمُوسَى صَفِيُّ اللّٰهِ وَأَنَا حَبِيبُ اللّٰهِ وَمَعِي لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَإِنَّ اللّٰهَ وَعَدَنِي فِي أُمَّتِي وَأَجَارَهُمْ مِنْ ثَلَاثٍ لَا يَعُمُّهُمْ بِسَنَةٍ وَلَا يَسْتَأْصِلُهُمْ عَدُوٌّ وَلَا يَجْمَعُهُمْ عَلَى ضَلَالَةٍ۔ رواہ الدارمی۔

۱۱۹۵۔ وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أَنَا قَائِدُ الْمُرْسَلِينَ وَلَا فَخْرَ وَأَنَا

روح اللہ کے لقب سے نوازے گئے تھے اور اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام نظر ربوبیت میں خلافت کے لیے منتخب ہوئے لیکن تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں حبیب اللہ ہوں اور یہ فخریہ بات نہیں ہے اور قیامت میں حمد وثنا کا جھنڈا میرے ہی ہاتھ میں ہوگا۔ آدم علیہ السلام اور ان کے سوا سب مخلوق اس کے نیچے ہوگی اور یہ بھی فخریہ بات نہیں ہے اور قیامت میں سب سے پہلا مخلوق کی شفاعت کرنے والا رسول میں ہوں اور سب سے پہلے جس کی شفاعت قبول ہوگی وہ رسول بھی میں ہوں اور یہ بھی فخریہ بات نہیں ہے۔ جنت کی کنڈی جو سب سے پہلے کھٹکھٹائیگا وہ رسول میں ہوں اللہ تعالیٰ سب سے پہلے میرے لیے جنت کھولیگا اور مجھ کو اس میں داخل فرمائیگا اور اس وقت میرے ساتھ ساتھ محتاج مومنوں کی جماعت بھی ہوگی اور میں اللہ تعالیٰ کی نظر میں گزری ہوئی اور آنے والی تمام مخلوق میں سب سے زیادہ معزز ومکرم ہوں اور اس میں فخر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

۱۱۹۴۔ عمرو بن قیس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں گو ہم سب سے بعد میں آئے ہیں لیکن قیامت میں ہم سب سے آگے رہیں گے اور دیکھو میں ایک بات کہتا ہوں اور کسی فخر سے نہیں کہتا ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں اور موسیٰ علیہ السلام صفی اللہ ہیں لیکن میں حبیب اللہ ہوں۔ قیامت میں حمد وثنا کا جھنڈا میرے ساتھ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے معاملہ میں مجھ سے وعدہ فرمایا ہے اور تین باتوں سے ان کو پناہ دیدی ہے ایک یہ کہ عام قحط میں ان کو مبتلا نہیں کریگا۔ دوم یہ کہ ان کا دشمن بیخ وبن سے ان کو ہلاک نہیں کرسکیگا تیسرے یہ کہ میری پوری کی پوری اُمت گمراہی میں پڑجائے ایسا بھی نہیں ہوگا۔ (دارمی)

۱۱۹۵۔ جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام رسولوں کا قائد میں ہوں اور یہ فخریہ

خَاتَمُ النَّبِيِّينَ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَّمُشَفَّعٍ وَلَا فَخْرَ. رواه الدارمی

۱۱۹۶۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا اَوَّلُ النَّاسِ خُرُوْجًا اِذَا بُعِثُوْا وَاَنَا قَائِدُهُمْ اِذَا وَفَدُوْا وَاَنَا خَطِيْبُهُمْ اِذَا اَنْصَتُوْا وَاَنَا مُسْتَشْفِعُهُمْ اِذَا حُبِسُوْا وَاَنَا مُبَشِّرُهُمْ اِذَا اَيِسُوْا اَلْكَرَامَةُ وَالْمَفَاتِيْحُ يَوْمَئِذٍ بِيَدِيْ وَلِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَئِذٍ بِيَدِيْ وَاَنَا اَكْرَمُ وُلْدِ اٰدَمَ عَلٰی رَبِّيْ يَطُوْفُ عَلَيَّ اَلْفُ خَادِمٍ كَاَنَّهُمْ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ اَوْ لُؤْلُؤٌ مَّنْثُوْرٌ. رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی حدیث غریب۔

۱۱۹۷۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَاُكْسٰی حُلَّةً مِّنْ حُلَلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ اَقُوْمُ عَنْ يَّمِيْنِ الْعَرْشِ لَيْسَ اَحَدٌ مِّنَ الْخَلَائِقِ يَقُوْمُ ذٰلِكَ الْمَقَامَ غَيْرِيْ. رواه الترمذی وفی روایۃ جامع الاصول عنہ انا اول من تنشق عنہ الارض فاکسٰی۔

۱۱۹۸۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ قَالُوْا

بات نہیں اور میں تمام نبیوں کے آخر میں آیا ہوں اور یہ بات بھی فخریہ نہیں اور تمام مخلوق کی سب سے پہلا شفاعت کرنے والا میں ہوں اور جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی وہ رسول میں ہوں اور یہ بات بھی فخریہ نہیں ہے۔ (دارمی)

۱۱۹۶۔ انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمام لوگ قبروں سے اُٹھائے جائینگے تو سب سے پہلے باہر آنے والا میں ہونگا جب وہ جماعتیں بن کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونگے تو ان کا قائد میں ہونگا اور جب سب خاموش رہینگے تو اُن کی جانب سے بولنے والا میں ہونگا اور جب وہ میدانِ محشر میں پھنس جائینگے تو اُن کے لیے شفاعت کی اجازت طلب کرنے والا میں ہونگا اور جب وہ مایوس ہوجائینگے تو ان کو بشارت دینے والا میں ہونگا۔ بزرگی اور کنجیاں اس دن سب میرے ہاتھ میں ہونگی اور حمد وثنا کا جھنڈا بھی اُس دن میرے ہی ہاتھ میں ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں تمام اولاد آدم میں سب سے پیارا میں ہونگا میرے اردگرد ہزار خادم حاضر رہینگے جو اس طرح سفید رنگ ہونگے گویا وہ حفاظت سے رکھے ہوئے انڈے ہیں یا بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ (ترمذی۔ دارمی)

۱۱۹۷۔ ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے قبر سے میں اُٹھونگا اس کے بعد جنتی حلّوں میں سے ایک حلہ (ایک لباس کا نام ہے) لاکر مجھ کو پہنایا جائیگا پھر میں عرش کے دائیں جانب آکر کھڑا ہونگا جہاں کھڑے ہونے کا منصب میرے سوا اور کسی کا نہیں (ترمذی)

۱۱۹۸۔ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لیے اللہ تعالیٰ سے مقام وسیلہ

يَا رَسُولَ اللهِ وَمَا الْوَسِيلَةُ قَالَ أَعْلَى دَرَجَةٍ فِي الْجَنَّةِ لَا يَنَالُهَا إِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ وَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَنَا هُوَ رواه الترمذی۔

۱۱۹۹۔ عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ كُنْتُ إِمَامَ النَّبِيِّينَ وَخَطِيبَهُمْ وَصَاحِبَ شَفَاعَتِهِمْ غَيْرَ فَخْرٍ. رواه الترمذی۔

۱۲۰۰۔ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وُلَاةً مِنَ النَّبِيِّينَ وَإِنَّ وَلِيِّي أَبِي وَخَلِيلُ رَبِّي ثُمَّ قَرَأَ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ. رواه الترمذی۔

۱۲۰۱۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى فَضَّلَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ وَعَلَى أَهْلِ السَّمَاءِ فَقَالُوا يَا ابْنَ عَبَّاسٍ بِمَ فَضَّلَهُ اللهُ عَلَى أَهْلِ السَّمَاءِ قَالَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى قَالَ لِأَهْلِ السَّمَاءِ وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلٰهٌ مِنْ دُونِهِ فَذٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ وَقَالَ اللهُ تَعَالَى لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا لِيَغْفِرَ

کی دعا مانگا کرو۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ وسیلہ کیا چیز ہے؟ فرمایا وہ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام ہے جو صرف ایک شخص کو ملیگا اور مجھ کو پوری اُمید ہے کہ وہ شخص میں ہی ہوں۔ (ترمذی)

۱۱۹۹۔ اُبی بن کعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ جب قیامت آئیگی تو سب نبیوں کا امام میں ہونگا اور میں ہی اُن کا خطیب اور شفاعت کرنے والا ہونگا اور یہ بات فخر نہیں ہے۔ (ترمذی)

۱۲۰۰۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی کے لیے انبیاء میں کوئی ولی ہوتا ہے۔ میرے ولی وہ ہیں جو میرے دادا اور میرے رب کے خلیل ہوتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی بلاشبہ سب میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے حضرت ابراہیم کے ساتھ وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کی اتباع کی اور یہ نبی ہیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ ایمان والے اور اللہ تعالیٰ سب مومنوں کا ولی ہے۔ (ترمذی)

۱۲۰۱۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء پر بھی فضیلت بخشی ہے اور آسمان والے تمام فرشتوں پر بھی لوگوں نے پوچھا اے ابن عباس فرمائیے جس بات سے سب فرشتوں پر فضیلت دی ہے وہ کیا ہے؟ جواب دیا وہ بات یہ ہے کہ فرشتوں کے حق میں تو یہ فرمایا ہے کہ جو ان میں یہ کہیگا کہ میرے سوا خدا کوئی اور ہے تو اس کو ہم بس دوزخ کی جزا دینگے اور نا منصفوں کو ہم ایسی ہی جزا دیتے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کو کھلی ہوئی فتح نصیب فرمائی ہے تاکہ اللہ

لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ قَالُوْا وَمَا فَضْلُهٗ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاءُ الْاٰيَةَ وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ فَاَرْسَلَهٗ اِلَى الْجِنِّ وَالْاِنْسِ. رواه الدارمی ۔

۲۰۱۲ عَنْ مَالِكِ بْنِ صَعْصَعَةَ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَهُمْ عَنْ لَيْلَةِ اُسْرِيَ بِهٖ بَيْنَمَا اَنَا فِي الْحَطِيْمِ وَرُبَّمَا قَالَ فِي الْحِجْرِ مُضْطَجِعًا اِذْ اَتَانِيْ اٰتٍ فَشَقَّ مَا بَيْنَ هٰذِهٖ اِلٰى هٰذِهٖ يَعْنِيْ مِنْ ثُغْرَةِ نَحْرِهٖ اِلٰى شِعْرَتِهٖ فَاسْتَخْرَجَ قَلْبِيْ ثُمَّ اُتِيْتُ بِطَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ مَمْلُوٍّ اِيْمَانًا فَغُسِلَ قَلْبِيْ ثُمَّ حُشِيَ ثُمَّ اُعِيْدَ وَفِيْ رِوَايَةٍ ثُمَّ غُسِلَ الْبَطْنُ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ مُلِئَ اِيْمَانًا وَحِكْمَةً ثُمَّ اُتِيْتُ بِدَابَّةٍ دُوْنَ الْبَغْلِ وَفَوْقَ الْحِمَارِ اَبْيَضَ يُقَالُ لَهُ الْبُرَاقُ يَضَعُ خَطْوَهٗ عِنْدَ اَقْصٰى طَرْفِهٖ فَحُمِلْتُ عَلَيْهِ فَانْطَلَقَ بِيْ جِبْرَئِيْلُ حَتّٰى اَتَى السَّمَاءَ الدُّنْيَا فَاسْتَفْتَحَ قِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيْلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ

آپ کے گزشتہ اور آئندہ تمام فروگزاشتوں سے درگزر فرمائے (مخاطب دونوں جگہ معصوم مخلوق ہے مگر طرز خطاب میں فرق کتنا ہے) لوگوں نے عرض کی اچھا تو جس بات سے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت ہو وہ بات کیا ہے اُنہوں نے جواب دیا کہ سب رسولوں کے حق میں تو ارشاد یہ ہے کہ ہم نے جو رسول بھی بھیجا وہ اپنی قوم کی زبان کا بھیجا اس کے بعد پھر جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا گمراہ کیا الخ۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم کے حق میں فرمایا ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے تو آپ کو جنات و انسان سب کے لیے رسول بنایا

۲۰۱۲ مالک بن صعصعہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے اس شب کا واقعہ جس میں آپ کو بیت مقدس اور آسمانوں کی سیر کرائی گئی تھی اس طرح بیان فرمایا کہ میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا اور کبھی حجر کا لفظ کہا (مراد دونوں کی ایک ہے) کہ ایک فرشتہ آیا اور اُس نے یہاں سے لے کر یہاں تک میرا پیٹ چاک کیا یعنی کوڑی کے پاس سے لے کر زیر ناف تک پھر اُس نے میرے قلب کو نکالا اور اس کے بعد ایک سونے کا طشت ایمان و حکمت سے بھرا ہوا لایا گیا اور اس فرشتے نے میرے قلب کو دھویا۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ پھر میرے پیٹ کو آبِ زمزم سے دھویا اور اس کے بعد اس میں ایمان و حکمت بھر دیا پھر میرے سامنے ایک جانور پیش کیا گیا جو خچر سے ذرا چھوٹا اور گدھے سے ذرا بڑا سفید رنگ کا تھا اس کو براق کہا جاتا ہے اس کی رفتار کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنا قدم اس جگہ ڈالتا تھا جہاں اُس کی نظر پہنچتی تھی مجھے اُس پر سوار کیا گیا اور مجھے لے کر جبرئیل علیہ السلام اوپر چلے یہاں تک کہ جب اس دنیا کے آسمان تک پہنچے تو اُنہوں نے دروازہ کھلوایا

نَعَمْ قِيلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَاءَ فَفَتَحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا فِيهَا آدَمُ قَالَ هٰذَا أَبُوكَ آدَمُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالِابْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِي حَتّٰى أَتَى السَّمَاءَ الثَّانِيَةَ فَاسْتَفْتَحَ قِيلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرِيلُ قِيلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قَالَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَاءَ فَفَتَحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ إِذَا يَحْيٰى وَعِيسٰى وَهُمَا ابْنَا خَالَةٍ قَالَ هٰذَا يَحْيٰى وَهٰذَا عِيسٰى فَسَلِّمْ عَلَيْهِمَا فَسَلَّمْتُ فَرَدَّا ثُمَّ قَالَا مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِي إِلَى السَّمَاءِ الثَّالِثَةِ فَاسْتَفْتَحَ قِيلَ مَنْ هٰذَا قَالَ جِبْرِيلُ قِيلَ وَمَنْ مَعَكَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِيلَ وَقَدْ أُرْسِلَ إِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ قِيلَ مَرْحَبًا بِهٖ فَنِعْمَ الْمَجِيْءُ جَاءَ فَفَتَحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ إِذَا يُوسُفُ قَالَ هٰذَا يُوسُفُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ ثُمَّ

ان سے دریافت کیا گیا کون اُنہوں نے جواب دیا میں ہوں جبرئیل۔ پوچھا گیا آپ کے ہمراہ کون ہیں اُنہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا ہاں اس پر کہا گیا خوش آمدید کیا مبارک تشریف آوری ہے۔ یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا جب میں دروازہ سے نکل گیا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا یہ آپ کے والد ماجد آدم ہیں ان کو سلام کیجیے میں نے ان کو سلام کیا اُنہوں نے جواب سلام دے کر فرمایا فرزند صالح اور نبی صالح کو خوش آمدید پھر جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اوپر چلے یہاں تک کہ جب دوسرے آسمان پر پہنچے تو انہوں نے دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا کون۔ انہوں نے جواب دیا میں ہوں جبرئیل۔ پھر پوچھا گیا آپ کے ہمراہ کون ہیں انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا ہاں اس پر کہا گیا خوش آمدید کیا مبارک تشریف آوری ہے۔ یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ جب میں آگے بڑھا کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام ہیں، دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ تو حضرت یحییٰ ہیں اور یہ حضرت عیسیٰ ہیں علیہما الصلوٰۃ والسلام، ان کو سلام کیجیے۔ میں نے ان کو سلام کیا اُنہوں نے جواب سلام دیا اس کے بعد فرمایا آئیے برادر صالح اور نبی صالح آئیے خوش آمدید۔ پھر وہ مجھ کو لے کر تیسرے آسمان پر چلے یہاں پہنچ کر دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا کون۔ اُنہوں نے جواب دیا میں ہوں جبرئیل پھر پوچھا گیا آپ کے ہمراہ کون ہیں انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، فرشتوں نے پوچھا کیا اُن کو معراج ہوئی ہے جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا ہاں۔ اس پر کہا گیا خوش آمدید کیا مبارک تشریف آوری ہے۔ یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا جب میں آگے بڑھا کیا دیکھتا ہوں کہ یوسف علیہ السلام ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا یہ یوسف ہیں،

صَعِدَ بِیْ حَتّٰی اَتَی السَّمَاءَ الرَّابِعَۃَ فَاسْتَفْتَحَ قِیْلَ مَنْ ھٰذَا قَالَ جِبْرَئِیْلُ قِیْلَ وَمَنْ مَعَکَ قَالَ
مُحَمَّدٌ قِیْلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَیْہِ قَالَ نَعَمْ قِیْلَ مَرْحَبًا بِہٖ فَنِعْمَ الْمَجِیْئُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ
فَاِذَا اِدْرِیْسُ فَقَالَ ھٰذَا اِدْرِیْسُ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ فَسَلَّمْتُ عَلَیْہِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ
وَالنَّبِیِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِیْ حَتّٰی اَتَی السَّمَاءَ الْخَامِسَۃَ فَاسْتَفْتَحَ قِیْلَ مَنْ ھٰذَا قَالَ جِبْرَئِیْلُ
قِیْلَ وَمَنْ مَعَکَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِیْلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَیْہِ قَالَ نَعَمْ قِیْلَ مَرْحَبًا بِہٖ فَنِعْمَ الْمَجِیْئُ جَاءَ
فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا ھَارُوْنُ قَالَ ھٰذَا ھَارُوْنُ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ فَسَلَّمْتُ عَلَیْہِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ
مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِیِّ الصَّالِحِ ثُمَّ صَعِدَ بِیْ حَتّٰی اَتَی السَّمَاءَ السَّادِسَۃَ فَاسْتَفْتَحَ قِیْلَ
مَنْ ھٰذَا قَالَ جِبْرَئِیْلُ قِیْلَ وَمَنْ مَعَکَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِیْلَ وَقَدْ اُرْسِلَ اِلَیْہِ قَالَ نَعَمْ قِیْلَ
مَرْحَبًا بِہٖ فَنِعْمَ الْمَجِیْئُ جَاءَ فَفُتِحَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا مُوْسٰی قَالَ ھٰذَا مُوْسٰی فَسَلِّمْ عَلَیْہِ فَسَلَّمْتُ

ان کو سلام کیجیے میں نے سلام کیا اُنہوں نے جواب سلام دیا اس کے بعد فرمایا آئیے برادر صالح اور نبی صالح آئیے
خوش آمدید پھر جبرئیل علیہ السلام مجھ کو لے کر اوپر چلے یہاں تک کہ چوتھے آسمان پر پہنچے اور دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا
کون؟ اُنہوں نے فرمایا میں ہوں جبرئیل پوچھا گیا آپ کے ہمراہ کون ہیں اُنہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں
نے پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے اُنہوں نے کہا ہاں اس پر کہا گیا خوش آمدید کیا مبارک تشریف آوری ہے
یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ جب میں آگے بڑھا کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام
نے فرمایا یہ ادریس ہیں ان کو سلام کیجیے میں نے سلام کیا اُنہوں نے جواب سلام دیا اس کے بعد فرمایا آئیے برادر
صالح اور نبی صالح آئیے خوش آمدید۔ پھر مجھ کو لے کر اوپر چلے یہاں تک کہ پانچویں آسمان پر پہنچے اور دروازہ
کھلوایا۔ پوچھا گیا کون اُنہوں نے فرمایا میں ہوں جبرئیل۔ پوچھا گیا آپ کے ہمراہ کون ہیں اُنہوں نے کہا محمد صلی
اللہ علیہ وسلم فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے اُنہوں نے کہا ہاں۔ اس پر کہا گیا خوش آمدید کیا مبارک
تشریف آوری ہے یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ جب میں آگے بڑھا کیا دیکھتا ہوں کہ ہارون علیہ السلام ہیں جبرئیل
علیہ السلام نے کہا یہ ہارون ہیں ان کو سلام کیجیے۔ میں نے سلام کیا اُنہوں نے سلام کا جواب دیا اس کے
بعد فرمایا آئیے برادر صالح اور نبی صالح آئیے خوش آمدید پھر مجھ کو اوپر لے کر چلے یہاں تک کہ چھٹے آسمان
پہنچے اور دروازہ کھلوایا۔ پوچھا گیا کون۔ انہوں نے جواب دیا میں ہوں جبرئیل۔ پھر پوچھا گیا آپ کے ہمراہ
اور کون ہیں انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ فرشتوں نے پوچھا کیا ان کو معراج ہوئی ہے اُنہوں نے کہا ہاں
اس پر کہا گیا۔ خوش آمدید کیا ہی مبارک تشریف آوری ہے۔ یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا گیا جب آگے بڑھا کیا
دیکھتا ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا یہ موسیٰ ہیں ان کو سلام کیجیے میں نے ان کو

عَلَیْہِ فَرَدَّ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِیِّ الصَّالِحِ فَلَمَّا جَاوَزْتُ بَکٰی قِیْلَ لَہٗ مَا یُبْکِیْکَ قَالَ اَبْکِیْ لِاَنَّ غُلَامًا بُعِثَ بَعْدِیْ یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ مِنْ اُمَّتِہٖ اَکْثَرُ مِمَّنْ یَدْخُلُھَا مِنْ اُمَّتِیْ ثُمَّ صَعِدَ بِیْ اِلَی السَّمَاءِ السَّابِعَۃِ فَاسْتَفْتَحَ جِبْرَئِیْلُ قِیْلَ مَنْ ھٰذَا قَالَ جِبْرَئِیْلُ قِیْلَ وَ مَنْ مَعَکَ قَالَ مُحَمَّدٌ قِیْلَ وَقَدْ بُعِثَ اِلَیْہِ قَالَ نَعَمْ قِیْلَ مَرْحَبًا بِہٖ فَنِعْمَ الْمَجِیْءُ جَاءَ فَلَمَّا خَلَصْتُ فَاِذَا اِبْرَاھِیْمُ قَالَ ھٰذَا اِبْرَاھِیْمُ اَبُوْکَ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ فَسَلَّمْتُ عَلَیْہِ فَرَدَّ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْاِبْنِ الصَّالِحِ وَالنَّبِیِّ الصَّالِحِ ثُمَّ رُفِعْتُ اِلٰی سِدْرَۃُ الْمُنْتَھٰی فَاِذَا نَبِقُھَا مِثْلُ قِلَالِ ھَجَرَ وَ اِذَا وَرَقُھَا مِثْلُ اٰذَانِ الْفِیَلَۃِ قَالَ ھٰذَا سِدْرَۃُ الْمُنْتَھٰی فَاِذَا اَرْبَعَۃُ اَنْھَارٍ نَھْرَانِ بَاطِنَانِ وَنَھْرَانِ ظَاھِرَانِ قُلْتُ مَا ھٰذَانِ یَا جِبْرَئِیْلُ قَالَ اَمَّا الْبَاطِنَانِ فَنَھْرَانِ فِی الْجَنَّۃِ وَ اَمَّا

سلام کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا اس کے بعد فرمایا آئیے برادر صالح اور نبی صالح آئیے خوش آمدید جب میں آگے بڑھنے لگا تو موسیٰ علیہ السلام پر گریہ طاری ہوگیا ان سے پوچھا گیا آپ کیوں روئے فرمایا اس لیے کہ ایک نوجوان جو میرے بعد مبعوث ہوئے ہیں ان کی اُمت کے لوگ میری اُمت سے بھی زیادہ جنت میں جائیں گے۔ اس کے بعد مجھ کو ساتویں آسمان کی طرف لے کر چلے اور دروازہ کھلوایا پوچھا گیا کون۔ انہوں نے کہا میں ہوں جبرئیل۔ پوچھا گیا آپ کے ساتھ اور کون ہیں کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ فرشتوں نے پوچھا کیا آپ کو معراج ہوئی ہے انہوں نے کہا ہاں۔ کہا گیا خوش آمدید کیا مبارک تشریف آوری ہے۔ جب میں اور آگے بڑھا کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ یہ آپ کے والد ماجد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں ان کو سلام کیجیے۔ میں نے سلام کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا اس کے بعد فرمایا آؤ فرزند صالح اور نبی صالح آؤ خوش آمدید اس کے بعد مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ نظر آیا کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے پھل مقام ہجر کے مٹکوں کے برابر تھے اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کے مانند تھے۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ وہاں چار نہریں تھیں دو اندر کی جانب اور دو باہر کی جانب۔ میں نے پوچھا اے جبرئیل یہ نہریں کیسی ہیں۔ انہوں نے کہا جو اندر کی جانب

۱۲۰۲۔ معراج کے واقعہ پر اہل قلم اور علماء کبار کے اتنے مضامین مسلمانوں کے سامنے آچکے ہیں کہ ان کے بعد اب اس کی تفصیلات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے یہاں چند باتیں تحریر فرمائی ہیں جو عام طور سے ہماری نظر سے نہیں گزریں اس لیے ہم اس اہم موضوع کو صرف ان کی مختصر تنبیہات پر ختم کرتے ہیں۔ عام لوگ تو کیا خاص لوگ بھی خال خال یہ علم رکھتے ہونگے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا تذکرہ پہلے صحیفوں میں بھی آچکا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر علامات میں اس کو بھی بطور ایک علامت کے شمار کرایا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ موصوف لکھتے ہیں۔

قال دانیال النبی: ایضاً سالت اللّٰہ وتضرعت الیہ ان یبین لی ماکرون من بنی اسرائیل فذکرت ثم الی — حضرت دانیال نبی نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ بنی اسرائیل کا حال مجھ سے بیان فرمائیے تو اس نے ان کے

الظَّاهِرَانِ فَالنِّيلُ وَالْفُرَاتُ ثُمَّ رُفِعَ لِي الْبَيْتُ الْمَعْمُورُ ثُمَّ أُتِيتُ بِإِنَاءٍ مِنْ خَمْرٍ وَإِنَاءٍ مِنْ لَبَنٍ
وَإِنَاءٍ مِنْ عَسَلٍ فَأَخَذْتُ اللَّبَنَ فَقَالَ هِيَ الْفِطْرَةُ أَنْتَ عَلَيْهَا وَأُمَّتُكَ ثُمَّ فُرِضَتْ عَلَيَّ الصَّلٰوةُ
خَمْسِينَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ فَمَرَرْتُ عَلَى مُوسٰى فَقَالَ بِمَا أُمِرْتَ قُلْتُ أُمِرْتُ بِخَمْسِينَ
صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ قَالَ إِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيعُ خَمْسِينَ صَلٰوةً كُلَّ يَوْمٍ وَإِنِّي وَاللّٰهِ قَدْ جَرَّبْتُ
النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ إِلَى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيفَ لِأُمَّتِكَ
فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّي عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّي عَشْرًا
فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّي عَشْرًا فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسٰى فَقَالَ مِثْلَهُ

گئی ہیں یہ جنت کی نہریں ہیں اور جو باہر کی جانب ہیں یہ نیل وفرات ہیں۔ پھر میرے سامنے بیت معمور لایا گیا اس
کے بعد میرے سامنے ایک برتن شراب کا، ایک دودھ کا اور ایک شہد کا پیش کیا گیا میں نے دودھ والا
لیا۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا یہی فطرت ہے جس پر آپ اور آپ کی امت رہیگی اس کے بعد مجھ پر ہر دن میں
پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ جب میں لوٹا تو موسیٰ علیہ السلام پر میرا گزر ہوا انہوں نے پوچھا آپ کو کیا حکم دیا
گیا ہے۔ میں نے کہا ہر دن میں پچاس نمازوں کا۔ انہوں نے فرمایا آپ کی امت ہر روز پچاس نمازیں نہیں پڑھ
سکتی، بخدا میں نے آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر لیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ بڑی کوشش کی ہے لہذا
آپ اپنے پروردگار کے پاس پھر جائیں اور اپنی امت کے لیے اور تخفیف کی درخواست کریں۔ چنانچہ میں لوٹ
گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں معاف فرمادیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس لوٹ کر آیا تو انہوں نے پھر وہی
بات فرمائی میں پھر لوٹ کر گیا تو اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں اور معاف فرمادیں پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے
پاس لوٹ کر آیا تو انہوں نے پھر وہی بات کہی۔ چنانچہ میں پھر لوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں اور معاف
فرمادیں۔ پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس لوٹ کر آیا تو انہوں نے پھر وہی بات کہی۔ چنانچہ میں پھر لوٹ گیا

ان قال حتی ابعث نبیا من بنی اسمٰعیل الذی بشرت
به ہاجر فذکر صفاته الی ان قال اسری به الی وارقیه
من السماء الی سماء حتی یعلو فادنیه واسلم علیه واوحی
الیه ثم اردہ الی عبادی بالسرور والغبطة ثم سرد دانیال
قصة رسول الله صلی الله علیه وسلم وهذه البشارة
الی الآن عند الیهود والنصاری یقرؤنها ویقولون
لم یظهر صاحبها بعد (الجواب الصحیح ص...)

حالات بیان فرمادیے یہاں تک کہ فرمایا کہ میں بنی اسماعیل میں
ایک نبی اٹھاؤنگا جس کی بشارت میں نے ہاجرہ کو دی پھر اس
نبی کی صفات ذکر کیں یہاں تک کہ فرمایا میں شب میں اس
کو بلاؤنگا اور آسمان در آسمان سیر کراتے ہوئے اس کو اوپر
بلاؤنگا اور اس کو اپنے قریب کرکے اس پر صلوٰۃ وسلام بھیجونگا
اور اس کو وحی کے ذریعہ اسرار نہاں سے آگاہ کرونگا اس کے
بعد شادان وفرحاں اپنے بندوں کے پاس اس کو پھر واپس
کرونگا۔ اس کے بعد دانیال علیہ السلام نے آپ کا پورا قصہ
ذکر فرمایا یہ بشارت آج تک یہود کے ہاں چلی آتی ہے نصاری بھی اس کو پڑھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ اس کا مصداق ابھی نہیں آیا۔

فَرَجَعْتُ فَوَضَعَ عَنِّي عَشْرًا فَأُمِرْتُ بِعَشْرِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسَى فَقَالَ مِثْلَهُ فَرَجَعْتُ فَأُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ فَرَجَعْتُ إِلَى مُوسَى فَقَالَ بِمَا أُمِرْتَ قُلْتُ أُمِرْتُ بِخَمْسِ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ قَالَ إِنَّ أُمَّتَكَ لَا تَسْتَطِيعُ خَمْسَ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ وَإِنِّي قَدْ جَرَّبْتُ النَّاسَ قَبْلَكَ وَعَالَجْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَشَدَّ الْمُعَالَجَةِ فَارْجِعْ إِلَى رَبِّكَ فَسَلْهُ التَّخْفِيفَ

اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں اور معاف فرمادیں اور اب مجھ کو ہر دن میں دس نمازوں کا حکم رہ گیا پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس لوٹ کر آیا تو انہوں نے پھر وہی بات کہی۔ چنانچہ میں پھر لوٹ گیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ہر دن میں پانچ نمازوں کا حکم دیا۔ پھر میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس لوٹ کر آیا تو انہوں نے پوچھا اب کی بار تم کو کیا حکم دیا گیا۔ میں نے کہا ہر دن میں پانچ نمازوں کا۔ انہوں نے کہا آپ کی اُمت ہر روز پانچ نمازیں بھی نہیں پڑھ سکتی اور میں آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں اور بنی اسرائیل کے ساتھ بڑی محنت اُٹھا چکا ہوں لہٰذا آپ پھر جائیں اور اپنے رب سے ابھی اور تخفیف کی درخواست کریں۔

حافظ موصوفؒ کی اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ قصۂ اسراء و معراج صرف اسی امت میں متواتر نہیں بلکہ اس کا تذکرہ پہلے انبیاء علیہم السلام کے صحف میں بھی اسی طریقہ پر موجود ہے۔ اگر اس واقعہ کی حیثیت صرف ایک خواب کی سی ہوتی تو کیا اس کا تذکرہ اسی انداز سے کتب سماویہ میں ملنا چاہیے اور کیا اکتیس صحابہ کو تواتر کے ساتھ اس کو روایت کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ایک دوسرے موقعہ پر حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کا تذکرہ سورۂ اسراء میں مسجد اقصیٰ تک صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ جتنے حصہ کے متعلق کفار کے مقابلہ میں دلیل قائم ہو سکتی تھی وہ اتنا ہی حصہ تھا اس کے بعد آپ کی آسمانوں کی سیر پر کوئی دلیل ایسی قائم نہیں کی جا سکتی جو ان کو ساکت کر سکے۔ پھر جب بیت مقدس تک آپ کا سفر بحالت بیداری قابلِ تسلیم ہو جائے تو چونکہ یہ ایک ہی سفر تھا اس لیے اس کا دوسرا حصہ خود بخود تسلیم کرنا پڑیگا، کیونکہ اگر آپ کی صداقت اس حصہ کے متعلق ثابت ہو جاتی ہے تو دوسرے حصہ کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ یہاں کسی کا خیال یہ بھی ہے کہ اسراء صرف اتنے ہی حصہ کا نام ہے دوسرے حصہ سفر کا نام معراج ہے مگر اس بناء پر یہ سوال پھر اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ جب یہ دونوں سفر ایک ہی سلسلہ کے تھے تو جداگانہ دو سورتوں میں اس کے بیان فرمانے کا نکتہ کیا ہے۔ حافظ موصوفؒ یہ بھی لکھتے ہیں کہ سورۂ اسراء میں گو دوسرے حصہ کی تفصیل نہیں کی گئی مگر یہ اشارہ صراحت کے ساتھ کر دیا گیا ہے کہ اس سفر کا مقصد بلند کچھ اور تھا اور وہ یہ کہ ہم کو اپنی کچھ خاص نشانیاں آپ کو دکھانی مقصود تھیں جن کا تذکرہ سورۂ والنجم میں واضح فرما دیا گیا ہے۔ سورۂ اسراء میں "لنریہ من ایاتنا" فرمایا ہے اور سورۂ والنجم میں "ولقد رأی من ایات ربہ الکبریٰ" فرمایا ہے جس میں سے سدرۃ المنتہیٰ، جنت و دوزخ اور جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصلی صورت پر دیکھنا تھا

وکذلک صعودہ لیلۃ المعراج الی مافوق السموات وہذا مما تواترت بہ الاحادیث واخبر بہ القرآن اخبر بمسراہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ۔ وفی موضع آخر بصعودہ الی السموات ۔۔ واخبرانہ فعل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر جانا تواتر کے ساتھ حدیثوں سے ثابت ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ ایک سورت میں مسجد اقصیٰ تک اس کا ذکر ہے اور دوسری سورت میں آسمانوں کے سفر کا ذکر ہے۔ قرآن کریم نے خود اس کی تصریح

اِلٰى أُمَّتِكَ قَالَ سَأَلْتُ رَبِّي حَتّٰى اسْتَحْيَيْتُ وَلٰكِنِّي أَرْضٰى وَأُسَلِّمُ قَالَ فَلَمَّا جَاوَزْتُ نَادٰى مُنَادٍ أَمْضَيْتُ فَرِيْضَتِي وَخَفَّفْتُ عَنْ عِبَادِي. متفق علیہ

اعلم ان الاسراء ورد مطولا ومختصرا من حدیث انسؓ وابیؓ بن کعب وبریدۃؓ وجابرؓ بن عبد اللہ وحذیفۃؓ بن الیمان وسمرۃؓ بن جندب وسہلؓ بن سعد وشدادؓ بن اوس وصہیبؓ وابن عباسؓ وابن عمرؓ وابن عمروؓ وابن مسعودؓ وعبداللہؓ بن اسعد بن زرارۃ وعبدالرحمٰنؓ بن قرط وعلیؓ بن ابی طالب وعمرؓ بن الخطاب ومالکؓ بن صعصعۃ وابیؓ امامۃ وابیؓ ایوب الانصاری وابیؓ حبۃ وابیؓ الحمراء وابیؓ ذر وابیؓ سعید الخدری وابیؓ سفیان بن حرب وابیؓ لیلی الانصاری وابیؓ ہریرۃ وعائشۃؓ واسماءؓ بنتی ابی بکر وامؓ ہانی وامؓ سلمۃ رضی اللہ عنہم کذا فی الخصائص الکبریٰ ص۱۵۲ ج۱

وقال فی الشفا وذھب معظم السلف والمسلمین الی انہ اسراء بالجسد فی الیقظۃ وھذا ھو الحق وذھب الیہ من الصحابۃ ابن عباسؓ وجابرؓ وانسؓ وحذیفۃؓ وعمرؓ وابی ھریرۃؓ ومالکؓ بن صعصعۃ وابی حبۃ البدری وابن مسعودؓ رضی اللہ عنہم اجمعین ومن التابعین الضحاکؒ وسعیدؒ بن جبیر وقتادۃؒ وابن المسیبؒ وابن شہابؒ وابن زیدؒ والحسن البصری وابراھیم النخعی ومسروقؒ ومجاھدؒ وعکرمۃؒ وابن جریجؒ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وجماعۃ عظیمۃ من المسلمین وھو قول اکثر المتاخرین من الفقہاء والمحدثین والمتکلمین والمفسرین۔

آپ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے بار بار درخواست کی اب اور زیادہ درخواست کرتے مجھ کو شرم آتی ہے لہذا اب میں اسی پر راضی ہوں اور خوش ہوں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا جب میں آگے بڑھا تو ایک منادی نے آواز دی اب میں اپنا آخری حکم جاری کر چکا اور اپنے بندوں پر جو تخفیف کرنی تھی کر چکا۔ متفق علیہ

فلک لیریہ من آیاتہ ... وکان فی اخبارہ بالمسری لیریہ من آیاتہ بیان انہ رأی من آیاتہ مالم یرہ الناس وقد بیّن فی السورۃ الاخری وانہ رأی جبرئیل عند سدرۃ المنتھی عندھا جنۃ الماویٰ ... وانہ رأی بالبصر آیات ربہ الکبریٰ وذکرکما فی تلک السورۃ المسری۔ لانہ امکنہ ان یقیم علیہ برھانا۔ الجواب الصحیح ص۱۶۰ ج۴

کر دی ہے کہ بیت مقدس تک آپ کا سفر اس لیے تھا کہ آئندہ آپ کو اپنی خاص نشانیاں دکھانی مطلوب تھیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نشانیاں ایسی ہونی چاہئیں جن کو عام انسانوں نے نہ دیکھا ہو۔ پھر دوسری سورت میں خود ان کی تفصیل فرما دی گئی کہ ان آیات میں سدرۃ المنتہیٰ اور اس کے پاس ہی جبرئیل علیہ السلام کو اصل صورت پر دیکھنا ہے اور وہیں جنۃ الماویٰ بھی ہے اور قرآن کریم نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کو آنکھوں سے دیکھا البتہ سورہ اسریٰ میں بیت مقدس تک کا سفر صرف اس لیے ذکر کیا ہے کہ مخالفوں پر اتنے ہی حصہ کے متعلق حجت قائم کی جا سکتی تھی۔

ابو البشر سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اوّل نبی اللہ فی الارض

حضرت آدم علیہ السلام کے معاملہ میں جو اختلافات قابل ذکر ہیں ان میں سب سے پہلا یہ ہے کہ جس جنت میں ان کو سکینت کا حکم دیا گیا تھا وہ جنت خلد یعنی بہشت بریں تھی یا اسی زمین پر کوئی باغ تھا۔ اس میں جمہور کا قول پہلا ہے۔ امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے اور جنت کے کسی باغ کا مراد ہونا معتزلہ کا قول قرار دیا ہے۔ صحیح حدیثوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جنت سے خلد بریں ہی مراد ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے مناظرہ میں موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ آپ نے اپنی ذریت کو جنت سے نکلوایا۔ اور حدیث شفاعت میں خود حضرت آدم علیہ السلام کا بیان بھی ہے کہ میری ہی وجہ سے تم خلد بریں سے نکلے میں اس کے لیے کیا شفاعت کیسے کروں۔ قرآن کریم کی آیت ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان جیسے صریح اور صحیح دلائل کے باوجود یہاں حافظ ابن تیمیہ جیسے شخص کا رجحان بھی معتزلہ کے قول کی طرف ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب النبوات۔

دوسرا اختلاف ان کے موضع ہبوط کے متعلق ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ وہ دحنان تھا جو مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان کوئی مقام ہے۔ حسن سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام کا محل ہبوط ہند، حوا کا جدہ، ابلیس کا دستمیسان (بصرہ کے قریب ایک جگہ ہے) اور سانپ اصبہان تھا۔ آدم علیہ السلام کے محل ہبوط کے متعلق سُدی کی روایت بھی یہی ہے۔ ابن عمرؓ کا بیان یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہبوط کوہ صفا پر اور حضرت حوا علیہا السلام کا کوہ مروہ پر ہوا تھا۔

ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام صنعتوں کی تعلیم دے کر زمین پر لائے گئے تھے اور جنت کے پھل بھی ان کے ہمراہ کیے گئے تھے۔ حضرت انس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں آنے کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو بننا اور حضرت حوا علیہا السلام کو کاتنے کی تعلیم دی تھی۔ آدم علیہ السلام نے اپنے لیے جبہ اور حوا علیہا السلام کے لیے ایک کرتی (قمیص) اور ایک اوڑھنی تیار کی تھی اور اُن کی پہلی پوشش اُون کی تھی (البدایۃ ص ۹۲ ج ۱)

کعب احبار بیان کرتے ہیں کہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ سب بے ریش ہونگے، صرف اُن کے ڈاڑھی ہوگی، اسی طرح سب اپنے ناموں کے ساتھ پکارے جائینگے اور یہ کنیت کے ساتھ ان کی کنیت ابو محمد ہوگی۔ (البدایۃ ص ۹۴ ج ۱)

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کعبۃ اللہ کے پہلے بانی یہی تھے۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ عرش الٰہی کے محاذ

ہیں زمین پر وہ بیت اللہ کی تعمیر کریں اور جس طرح اُنھوں نے ملائکۃ اللہ کو عرش الٰہی کا طواف کرتے دیکھا ہے اسی طرح خود اس کا طواف کریں۔ (البدایۃ ص۹۲)

حضرت آدم علیہ السلام کے موضع دفن کے متعلق مشہور قول یہ ہے کہ ہند میں جس جگہ ان کا ہبوط ہوا تھا اسی جگہ کسی پہاڑ کے قریب ان کا مدفن مبارک ہے کسی کا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ میں جبل ابوقبیس مشہور پہاڑ میں آپ مدفون ہیں کوئی کہتا ہے کہ بیت مقدس میں ان ہر دو اصل انسانی کے مزارات ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں ان تمام اختلافات کو ذکر کیا ہے اُنھوں نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت حوا کے ہمیشہ ایک لڑکا اور لڑکی ایک ہی حمل سے پیدا ہوتے تھے اور ان دونوں کے درمیان شادی کی رسم ممنوع قرار دی گئی تھی۔ حکم یہ تھا کہ ایک حمل کے لڑکے کی شادی دوسرے حمل کی لڑکی کے ساتھ کی جائے۔ ہابیل و قابیل کے قتل کے قصہ میں قتل کا ایک سبب یہ بھی ہو گیا تھا۔ اہلِ تاریخ و سیر نے ہابیل کے قتل پر حضرت آدم علیہ السلام کے جو اشعار نقل کیے ہیں حافظ ابن کثیر نے اس میں کلام کیا ہے اور اس کی یہ تاویل کی ہے کہ بظاہر یہ ان کے درد و غم کی کسی اور شخص نے ترجمانی کی ہے۔

یہاں امام ترمذی نے باسناد حسن عن سمرۃ ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت حوا کے کوئی اولاد زندہ نہ رہتی تھی شیطان نے آکر ان کو بہکایا کہ اس مرتبہ جو لڑکا پیدا ہو تو اس کا نام عبدالحارث رکھ دینا وہ زندہ رہیگا۔ اُنھوں نے شیطان کے کہنے پر اس بچہ کا نام عبدالحارث ہی رکھ دیا تھا۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مرفوع ہونے میں کلام ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ موقوف ہے یعنی صحابی کا قول ہے اور صحابہ نے جس طرح بعض اور اسرائیلیات روایت فرمائی ہیں یہ بھی اسرائیلیات ہی کی روایت معلوم ہوتی ہے۔ اس پر قرینہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ اصل بشری کے اس جوڑے سے تمام نسل انسانی کو پھیلائے تو یہ کیسے قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت حوا کی کوئی اولاد ہی زندہ نہ رہتی۔ پھر یہ کہ جس آیت کی شرح میں حضرت حسن سے یہ روایت نقل کی گئی ہے خود حضرت حسن سے اس کی دوسری تفسیر موجود ہے۔ اگر حسن کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ تفسیر موجود ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس مرفوع تفسیر کے خلاف کوئی اور دوسری تفسیر اختیار فرماتے۔ البدایۃ ص ۹۹/۱

شارحین نے حدیث مذکور کی اور توجیہات بھی ذکر فرمائی ہیں وہ اپنے محل میں دیکھ لی جائیں۔

حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سلسلۂ نسب صرف شیث علیہ السلام سے چلا ہے۔ شیث کے معنی ہبۃ اللہ ہیں یعنی عطاء الٰہی۔ چونکہ ان کی ولادت ہابیل کے مقتول ہونے

کے بعد ہوئی تھی اس لیے ان کا نام شیث رکھا گیا تھا محمد بن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے قرب وفات میں حضرت شیث علیہ السلام کو چند باتوں کی تعلیم دی تھی اور شب و روز کی ساعتیں اور ہر ساعت کی خاص عبادت کی تعلیم بھی دی تھی اور بعد میں طوفان آنے کی اطلاع بھی فرمائی تھی۔ البدایۃ والنہایۃ ص۹۹

۱۲۰۳۔ سَمِعْتُ اَبَا اُمَامَۃَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَنَبِیٌّ کَانَ اٰدَمُ قَالَ نَعَمْ مُکَلَّمٌ قَالَ کَمْ کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ نُوْحٍ قَالَ عَشَرَۃُ قُرُوْنٍ. رواہ ابن حبان فی صحیحہ قال ابن کثیر فی البدایۃ والنہایۃ ص۹۴ ج۱ علی شرط مسلم ولم یخرجہ۔ ورواہ الطبرانی قال الھیثمی ورجالہ رجال الصحیح غیر احمد بن خلید وھو ثقۃ وفی الدر المنثور عشرۃ اٰباء مکان عشرۃ قرون۔ ص۵۴

۱۲۰۴۔ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَمِ الْاَنْبِیَاءُ قَالَ مِائَۃُ اَلْفٍ وَّاَرْبَعَۃٌ وَّعِشْرُوْنَ اَلْفًا قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَمِ الرُّسُلُ مِنْھُمْ قَالَ ثَلَاثُ مِائَۃٍ وَّثَلَاثَۃَ عَشَرَ

۱۲۰۳۔ راوی کہتا ہے میں نے ابو امامہ سے خود سُنا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ کیا آدم نبی تھے۔ آپ نے فرمایا جی ہاں نبی تھے اور ایسی نبی تھے جو اس کی شرف ہمکلامی سے مشرف تھے۔ پھر اس نے پوچھا اچھا اُن کے اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان کتنا زمانہ گزرا ہے۔ فرمایا دس قرن۔ (ابن حبان)

۱۲۰۴۔ ابو ذر کہتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ کل انبیاء کی تعداد کتنی تھی۔ فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار میں نے عرض کی اُن میں رسول کتنے تھے فرمایا تین سو تیرہ کا بہت بڑا گروہ تھا۔ میں عرض کی یا رسول اللہ

۱۲۰۳۔ حافظ ابن کثیر نے بروایت بخاری ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان دس قرن کی مدت گزری ہے جن میں سب لوگ اسلام ہی پر تھے ان کے بعد جب بت پرستی اور گمراہی کا ظہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہم۔ اسی لحاظ سے ان کو سب سے پہلا رسول کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے جن مورخین نے لکھا ہے کہ قابیل اور اس کی اولاد نے آتش پرستی شروع کردی تھی، یہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ابن عباس کی روایت اس کی تردید کرتی ہے۔ حدیث مذکور میں قرون کا لفظ مبہم ہے۔ لغت میں "قرن" کا اطلاق سو سال کی مدت پر بھی آتا ہے اور لوگوں کے ایک طبقہ پر بھی آتا ہے پہلے معنے کے لحاظ سے دس قرن ایک ہزار سال کے ہوتے ہیں اور دوسرے معنے کے لحاظ سے یہ مدت ہزاروں سال کی ہوگی کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں عمریں بہت طویل ہوا کرتی ہیں اس لحاظ سے ایک طبقہ کے گزرنے کے لیے ہی بہت طویل مدت درکار ہوگی پھر اسی نسبت سے دس قرن کا اندازہ کرلینا چاہیے (البدایۃ ص۱۰۱) درمنثور میں دس قرون کی بجائے دس پشتوں کا لفظ ہے۔

۱۲۰۴۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش حسب بیان قرآن شریف صرف حق تعالیٰ کے ایک تکوینی ارادہ کے ماتحت ہوئی تھی یہاں مسئلہ ارتقاء سے متأثر ہو کر قرآن کریم کی تاویل کرنی ظلم عظیم ہے اس مسئلہ کے متعلق اسلام کے

جمٌّ غفيرٌ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَنْ كَانَ اَوَّلُهُمْ قَالَ اٰدَمُ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ نَبِيٌّ مُرْسَلٌ قَالَ

ان میں سب سے پہلا رسول کون تھا فرمایا آدم علیہ السلام میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا وہ نبی مرسل

تفصیلی بیانات اور مسئلہ ارتقاء پر غائر نظر کرنے کے بعد کوئی اجتماع کی صورت باقی نہیں رہتی یہی خام صرف ان لوگوں کی ہے جنھوں نے یا تو مسئلہ ارتقاء کے اطراف وجوانب کو ملحوظ نہیں رکھا یا قرآن کریم میں بیجا تاویل کی اہمیت نہیں سمجھی فلسفۂ قدیم کے افلاک تسعہ اور عقول عشرہ کو بھلا اسلامی افلاک سبعہ اور ملائکۃ اللہ سے کیا مناسبت مگر یہاں بھی جوڑ تطبیق کی کوشش کی گئی تھی اور اب مرکز حیات یعنی اسلامی روح اور پروٹوپلازم کے مابین تطبیق کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ بھی خلاف واقع تھا اور یہ بھی خلاف واقع ہے۔ اور یہ سب کچھ مرعوبیت کے نتائج ہیں پہلے فلسفۂ قدیم سے دنیا متاثر تھی اور اب فلسفۂ جدید سے مرعوب ہے۔

عربی زبان میں آج کل اس کو "بروتوبلاسما" کہا جاتا ہے۔ ہمارے علم میں قرآنی تفسیر میں اس کو سب سے پہلے داخل کرنے والے تفسیر المنار کے مؤلف ہیں۔ دیکھو تفسیر المنار ص۳۲۲ ج ۲۔ ان کے بعد پھر ان کے اتباع میں دوسرے لوگوں نے اس لفظ کو جا بجا استعمال کیا ہے۔

ہم اس موقعہ پر صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ جو لوگ پروٹوپلازم کے قائل ہیں وہ اس حیات کو محض ایک مادی حیات قرار دیتے ہیں اُن کے نزدیک انسانی حیات وموت کی حقیقت ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح پر کہ نباتات کی حیات وموت کی، اُن میں نشوونما کی استعداد پیدا ہونے کا نام حیات ہے اور اس استعداد کے فقدان کا نام موت۔ آپ کے نزدیک حیات وموت کا تمام تعلق عالم غیب سے وابستہ ہے۔ روح ایک غیبی حقیقت ہے اس کے نفخ سے انسانی حیات پیدا ہوتی ہے، پھر اس غیبی حقیقت کے نکل جانے کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ نہیں جو کسی شاعر نے کہا ہے: زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب ، موت کیا ہے اُن اجزاء کا پریشاں ہونا۔

اب سوچیے کہ پروٹوپلازم کا صرف نام لے کر آپ ان دو راستوں میں کوئی اتحاد پیدا کر سکتے ہیں۔ خوب یاد رکھیے اگر آپ ایک لاکھ بار بھی پروٹوپلازم کا اقرار کر لیں اور افسوس یہ کہ اس کو قرآن کریم کی تفسیر بھی بنا ڈالیں جب بھی وہ قوم روح کے اس تخیل سے جو آپ کے ذہن میں ہے آپ سے برابر بکتی رہیگی۔ لن ترضیٰ عنك اليهود ولا النصاري حتي تتبع ملتهم۔ اس لیے اس خیال خام اور سعی لاحاصل میں پڑنے کی ضرورت نہیں اور بے وجہ بحث کر کر کے اسلامی بیانات اور تحقیقات عصریہ کے مابین مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت بھی نہیں اور نہ اس کا کوئی فائدہ ہے۔ بلکہ اسلامی تاریخ کی اس تحریف کا ہم کو حق بھی نہیں ہے۔

ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے چونکہ محالات کے تسلیم کرنے کا بوجھ ہم پر کہیں نہیں ڈالا، اس لیے اگر واقعہ میں کوئی بات ایسی موجود ہو جو اسلامی عقل کے نزدیک بھی محال سمجھی جائے تو اس جگہ بیشک تاویل نہ کرنا جمود ہوگا۔ ہم نہ اس آزادی کے حامی ہیں نہ اس جمود کے قائل۔ امام رازی نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تفسیر میں دو جگہ اس مذموم مسئلہ کو چھیڑا ہے اور لکھا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت عقلی لحاظ سے کسی ایک انسان پر جا کر ختم ہونی چاہیے۔ لابد من انتهاء الناس الى انسان۔ تفسیر کبیر ص۴۸۵ ج ۲ و ص۲۷۵ ج ۵

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی تعلیم کی بناء پر نسل انسانی کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی ہے اور تمام انسانوں کے لیے ان کے وجود کو ایک اساس مانا جاتا ہے اسی بنا پر ان کو ابوالبشر کا لقب عنایت ہوا ہے پھر یہ لقب اتنا مشہور کیا گیا ہے کہ اکثر مقامات میں حضرت آدم علیہ السلام کو اسی لقب کے ساتھ یاد فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس دور میں صرف ایک انسان نیست سے ہست ہوا ہو۔ ابھی قوم اور شریعت کا پتہ تک نہ ہو اس کو رسول اور نبی کے لفظ سے کیسے یاد کیا جا سکتا تھا۔

نَعَمْ خَلَقَهُ اللّٰهُ بِيَدِهٖ ثُمَّ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ثُمَّ سَوَّاهُ قُبُلًا۔ رواه ابن حبان فی صحیحہ کذا فی البدایۃ والنهایۃ ص۹۷

۱۲۰۵- عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا صَوَّرَ اللّٰهُ اٰدَمَ فِي الْجَنَّةِ تَرَكَهٗ

تھے۔ فرمایا جی ہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دست مبارک سے پیدا فرمایا تھا، پھر ان میں اپنی خاص روح پھونکی اور اپنے سامنے ان کو ہر طرح سے لیس کر دیا تھا۔ (ابن حبان)

۱۲۰۵- حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنت میں

باوجودیکہ وہ خدا تعالیٰ سے نبیوں کی طرح ہمکلام بھی تھا لیکن اس کا نقشۂ حیات جتنا کہ بحیثیت ابوۃ قابل بیان تھا اتنا بحیثیت رسالت نہ تھا۔ انسانی پیدائش کے بعد جو اہم تر مسئلہ سامنے آتا ہے وہ انسانی معاشیات کا تھا کیونکہ اسی پر اس کے بقاء و نشر کا مدار تھا۔ یہاں اصولی عقائد میں ابھی کوئی تفریق کا محل ہی نہ تھا۔ اولاد کے کانوں میں خدا اور اس کی توحید کے سوا کوئی دوسری آواز ہی نہیں پڑی تھی گویا اس وقت عقائد کا مقام وہ تھا جو فطری خصائل کا ہو سکتا ہے اس کے باوجود جب کہیں صف انبیاء علیہم السلام بھی ہے تو اس میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر ضرور آ گیا ہے اور رسولوں ہی کے ساتھ آیا ہے۔ دیکھو شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جب آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام کا اجتماع کیا گیا حالانکہ حسب بیان احادیث یہ اجتماع بہت ہی محدود پیمانہ پر تھا لیکن اس پر بھی حضرت آدم علیہ السلام وہاں موجود نظر آتے ہیں محشر میں جہاں رسولوں کے سوا کسی کو لب کشائی کی مجال نہ ہوگی اہل محشر کی نظریں جب شفاعت کے لیے رسولوں کی طرف اٹھینگی تو سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف اس طرح اٹھینگی گویا ان کی رسالت انسانی فطرت میں مرکوز تھی پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کی طرف نظر کی جاتی ہے تو ان کا جواب بھی وہاں ٹھیک اسی انداز کا نظر آتا ہے جو دوسرے انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ گویا خود وہ بھی اپنے نفس کو اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھتے ہیں، لیکن یہ حقیقت کتنی ظاہر ہے کہ جو سارے انسانوں کی بنیاد ٹھہر چکا ہو، اس کے لقب کے لیے دنیا و آخرت میں ابوالبشر سے بڑھ کر اور کونسا لقب ہو سکتا تھا۔

حیرت ہوتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت ایسے دور میں زیر بحث آ گئی ہے جس میں کرشن جی کی نبوت قرین قیاس سمجھی جا رہی ہے۔ اہل قلم چاہتے ہیں کہ بیچ بچ کر جس طرح ممکن ہو کرشن کی نبوت کا عقیدہ اس طرح دماغوں میں اُتار دیں کہ کسی خلاف کے ٹکراؤ کا اندیشہ بھی نہ ہو اور ان کی نبوت بھی ثابت ہو جائے۔ ادھر تو یہ فراخ حوصلگی ادھر یہ تنگی کہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق اس طرح شبہات سامنے لاتے ہیں کہ ان پر کوئی گرفت بھی نہ ہو سکے اور ایک نبی کی نبوت کا عقیدہ ذہنوں سے اگر نکل نہ سکے تو کم از کم اس میں شبہات تو ضرور پیدا ہو جائیں۔ ہمیں یہاں کسی فرد کی نبوت و عدم نبوت کی تحقیق کرنی منظور نہیں ہے بلکہ انسانی جدت پسندی کا نوحہ کرنا ہے اور اس پر اہمیت سے تنبیہ کرنی ہے کہ نبوت کوئی ایسا مقام نہیں جو محض حسن ظنی کی بنا پر کسی کے حق میں تجویز کر دیا جائے یہاں احتیاط کا قدم بس یہ ہے کہ جن رسولوں کے نام ہم کو بتائے جا چکے ہیں اُن پر تو خاص ایمان رکھا جائے اور ان کے سوا خصوصی اشخاص کے متعلق نہ اس جانب کسی رجحان کا اظہار کیا جائے نہ اُس جانب۔ دوم یہ بھی تنبیہ ضروری ہے کہ صرف کسی انسان کی خداترسی اس کی نبوت کا ثبوت نہیں ہے کہ اس کے حق میں نبوت کی حسن ظنی بھی پیدا کر لی جائے۔ امم سابقہ میں کتنے ہی انسان گزرے ہیں جن کے معتقدین نے بنص حدیث ان کی قبروں کو عبادت گاہیں بنا لیا ہے مگر ان کے حق میں رسالت کا بے دلیل کوئی گمان بھی (باقی بر صفحہ ۴۶۸)

مَا شَاءَ اللهُ اَنْ يَتْرُكَهٗ فَجَعَلَ اِبْلِيْسُ يَطُوْفُ بِهٖ يَنْظُرُ مَا هُوَ فَلَمَّا رَاٰهُ اَجْوَفَ عَرَفَ اَنَّهٗ خُلِقَ خَلْقًا لَا يَتَمَالَكُ رواہ مسلم

۱۲۰۶۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيَنْتَهِيَنَّ اَقْوَامٌ يَفْتَخِرُوْنَ بِاٰبَائِهِمُ الَّذِيْنَ مَاتُوْا اِنَّمَا هُمْ فَحْمٌ مِنْ جَهَنَّمَ اَوْ لَيَكُوْنَنَّ اَهْوَنَ عَلَى اللهِ مِنَ الْجُعَلِ الَّذِیْ يُدَهْدِهُ الْخِرَاءَ بِاَنْفِهٖ كُلُّهُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ رواہ الترمذی وابوداؤد

۱۲۰۷۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ فِيْهِ

حضرت آدم کا کالبد تیار کر لیا تو جب تک اس کو منظور تھا اسی صورت پر اس کو رکھا۔ اس درمیان میں ابلیس اس کے گرد چکر لگاتا اور دیکھتا کہ یہ کیسی مخلوق ہے جب اس نے دیکھا کہ وہ تو اندر سے کھوکھلی ہے ٹھوس نہیں ہے تو سمجھ لیا کہ یقیناً یہ ایسی مخلوق بنائی گئی ہے جو اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکیگی۔ مسلم شریف۔

۱۲۰۶۔ ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے تنبیہ کے لہجہ میں فرمایا یا تو یہ لوگ جو اپنے اُن مردہ باپ دادوں پر جو مر کر جہنم میں کوئلہ ہو چکے ہیں فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ پاخانہ کے اس کیڑے سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل ہونگے جو نجاست کو اپنی ناک سے ہٹا ہٹا کر کھسکتا ہے سب آدم ہی کی اولاد ہیں اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے (پھر فخر کس بات کا) ترمذی وابوداؤد۔

۱۲۰۷۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے مبارک دن جس میں آفتاب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۶۶) نہیں کیا جا سکتا۔ سوم یہ بات بھی قابل فراموشی نہیں ہے کہ اگر دین کے عام مسلمات جو متقدمین علماء حق کے نزدیک محقق اور مختار ہیں کسی بین اور بدیہی ثبوت کے بغیر غیر معتمد قرار دیدیے جائیں تو پھر شاید اسلام از اول تا آخر بدلا جا سکتا ہے۔ دین محمدی صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوا اس کے کچھ بدیہی مسلمات ہیں جو توارث سے ثابت ہیں اس مقام پر لفظی دلائل کے ساتھ توارث کا خیال رکھنا بھی لازم ہے فیصلہ صرف لفظی بحث سے کر دینا عجلت پسندی مذموم اور جدت طرازی ہے۔

۱۲۰۵۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی صورت خلد بریں میں ہی بنائی گئی تھی۔ اگر جنت سے مراد دنیا کا کوئی باغ ہوتا تو یہ کوئی اتنی اہم بات نہ تھی جس کا تذکرہ حدیثوں میں آتا پھر جب وہیں ان کی صورت بنی تو یقیناً وہیں ان کی سکونت بھی ہوگی اور اسی وقت جنت کو آدم علیہ السلام کی وراثت کہنا بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم کی کسی ایک آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کوئی دنیا کا باغ تھا۔ آدم علیہ السلام کی سرگزشت مختلف مقامات میں ذکر کی گئی ہے مگر کسی ایک مقام پر بھی اس کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔ آج بھی بہت سے انسان باغوں میں رہتے ہیں اس لیے یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں جس کا قرآن کریم بار بار اس انداز سے ذکر فرمائے گویا وہ اُن پر قدرت کی طرف سے بہت بڑا انعام تھا۔ اور معصیت کے بعد پھر اس سے نکلنا کوئی بہت بڑی محرومی تھی جو ہمیشہ قابل یادگار تھی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ
اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ

الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِيهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَفِيهِ أُخْرِجَ مِنْهَا۔ رواہ مسلم وفی الصحیح وفیہ تقوم الساعۃ۔

۱۲۰۸۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ طُولُهُ سِتُّونَ ذِرَاعًا فَلَمَّا خَلَقَهُ قَالَ اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلَى أُولٰئِكَ النَّفَرِ وَهُمْ نَفَرٌ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ جُلُوسٌ فَاسْتَمِعْ مَا يُحَيُّونَكَ فَإِنَّهَا تَحِيَّتُكَ وَتَحِيَّةُ ذُرِّيَّتِكَ فَذَهَبَ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ

طلوع کرتا ہے جمعہ کا دن ہے اسی دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے، اسی دن جنت میں داخل ہوئے اور اسی دن جنت سے نکلے اور قیامت بھی اسی دن آئیگی۔ (مسلم)

۱۲۰۸۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی خاص صفات پر پیدا فرمایا، ان کا قد ساٹھ گز لمبا تھا۔ جب ان کو پیدا فرما چکا تو اس نے کہا جاؤ یہ جو فرشتوں کی جماعت بیٹھی ہے اس کو سلام کرو اور جو جواب وہ تم کو دیں اس کو غور کے ساتھ سُننا کیونکہ تمہاری اور تمہاری اولاد کی آئندہ سلام کی وہی سنت ہوگی۔ یہ گئے اور انہوں نے فرمایا "السلام علیکم"

۱۲۰۷۔ قرآنِ کریم میں جا بجا چھ دن میں عالم کی تخلیق کا تذکرہ آیا ہے اس کے بعد پھر استواء علی العرش کا ذکر ہے اسلامی نقول کے لحاظ سے عالم کی پیدائش ہفتہ سے شروع ہو کر جمعرات پر ختم ہوگئی ہے اور اس جمعہ میں کچھ اور پیدا نہیں کیا گیا۔ اسی لحاظ سے ہمارے یہاں جمعہ کا دن تعطیل کا دن شمار ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ کتنی مدت کے بعد کسی اور جمعہ میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے ہیں۔ لہٰذا یہاں جمعہ سے مراد عالم کی تخلیق کے بعد متصل جمعہ مراد نہ لینا چاہیے جس دن میں قدرت کے اتنے اہم افعال جمع ہوں ظاہر ہے کہ وہ کتنا عظیم الشان دن ہوگا۔

۱۲۰۸۔ نسل انسانی کو جو جو اہم اسباق قدرت کو سکھانے تھے وہ ابتداء سے ہی اصل انسانی میں ودیعت فرما دیئے تھے تاکہ وہ انسانی فطرت کا جزو بن جائیں۔ پھر جب اس کو اپنی خلافت خاصہ سے نواز کر کرۂ ارضی پر اپنا نائب بنایا تو یہ بھی ضروری ہوا کہ خلیفہ اپنے اصل مالک کے کمالات کا مظہر ہو اور اس لیے یہ بھی مناسب ہوا کہ تاج پوشی کی رسم کے لیے ایک بار خلیفہ کے حق میں بھی انقیاد و تسلیم کا وہ نقشہ دکھا دیا جائے جو اصل مالک کے لیے مخصوص تھا یعنی "سجدہ تحیہ" نیز جب آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا تو ضروری ہوا کہ ان کی ماتحت مخلوق کی فطرت میں جذبۂ انقیاد کا تخم بھی ڈال دیا جائے۔ اس لیے سب سے قوی مخلوق کو جو بقیہ تمام مخلوق پر نگراں بنائی گئی تھی سجدہ کا حکم دیا گیا تاکہ بقیہ تمام مخلوق میں آدم علیہ السلام کی اطاعت شعاری ان کی سرشت بن جائے اور کسی کو سرتابی کا حوصلہ نہ رہے، اسی عام تسخیر کو جو آسمانوں سے لے کر ارضی مخلوق تک نظر آتی ہے۔ قرآن کریم میں جا بجا بطریق امتنان ذکر فرمایا گیا ہے جدید فلسفہ کہتا ہے کہ یہ قوی کے ضعیف پر غیر محدود زمانہ کے تسلط کا اثر ہے، مگر مذہب یہ بتاتا ہے کہ یہ قدرت کی پوشیدہ کارفرمائیاں ہیں۔ پھر جب یہ عام تسخیر مقدر ہوئی تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اس خلیفہ کو اصل کے خاص کمالات کا مظہر بنایا جائے اور اس کے خاص صفات میں سے صفت علم میں سب سے ممتاز بنایا جائے حتیٰ کہ ملائکۃ اللہ سے بھی اسی نکتہ سے فرشتوں کی نظر چوک گئی اور انہوں نے اپنی تسبیح و تقدیس اور عبودیت کو پیش کیا حالانکہ یہ اگر کمال تھا تو مخلوق کا

فَقَالُوا السَّلَامُ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ قَالَ فَزَادُوْهُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ الحديث. (متفق عليه) و
فتح رواه الترمذی ابسط منه وفیه قصة اعطاء آدم ابنه داؤد علیه السلام من عمرہ

۱۲۰۹- عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَفَعَهٗ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَطَسَ (ای لما دخل الروح فی رأسه) فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَقَالَ لَهٗ رَبُّهٗ رَحِمَكَ رَبُّكَ یَا اٰدَمُ. رواه البزار قال الحافظ ابن کثیر فی البدایة ص۸۶ وهذا اسناد لا بأس به وقد روی ابن حبان فی صحیحه عن انس بنحوه

۱۲۱۰- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَوَّلَ

انہوں نے جواب میں "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا یعنی "رحمۃ اللہ" کا لفظ اور زیادہ کر دیا۔ (متفق علیہ)

۱۲۰۹- ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا (اور روح اُن کی ناک تک پہنچی) تو اُن کو چھینک آئی اُنہوں نے کہا "الحمد للہ" اُن کے پروردگار نے اس کے جواب میں فرمایا "یا آدم یرحمک ربک" اے آدم تمہارا رب تم پر رحم فرمائے۔ (البدایہ والنہایہ ص۸۶)

۱۲۱۰- ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے سب سے پہلے انکا

عبد کا کمال تھا، حاکم اور خالق کا تو نہ تھا۔ آدم علیہ السلام اگر کسی دوسری مخلوق کے خلیفہ ہوتے تو ان کی یہ بحث شاید برمحل ہوتی مگر یہاں خلافت الٰہیہ کا منصب عطا ہو رہا تھا، یہاں عبودیت کی خاص صفت کی بجائے اصل مالک کی خاص صفات کا مظہر ہونا لازم تھا۔ حیات، قدرت، سمع و بصر، مشیت و ارادہ، کلام کے آثار تو دوسری مخلوق میں بھی کم و بیش موجود تھے ان سب میں نمایاں اور خاص صفت علم کی صفت تھی اس لیے اسی کو معیار مقرر کیا گیا اور اسی پر خلافت کی بحث ختم کر دی گئی اور اس وقت یہ راز مخلوق پر روشن ہو گیا کہ جو اصل خالق کے کمالات کا سب سے بڑا مظہر ہو وہی اس کی خلافت کا سب سے زیادہ مستحق ہونا چاہیے۔

اب رہی یہ بحث کہ ساٹھ ذراع شرعی جو ہمارے تیس ذراع ہوتے ہیں اس طول کے انسان کا دنیا کے کسی دور میں ہونا عصری تحقیقات کے خلاف ہے تو یہ صرف ایک قیاسی بحث ہے اور اس پر عقلی طور پر گفتگو کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ اب جس پر اپنی تحقیق کا غلبہ ہوگا وہ اسی طرف جھکتا رہیگا اور جس پر اخبار شریعت کا غلبہ ہوگا وہ اسی پر اعتماد و وثوق کریگا۔ صرف عقلی میدان میں کسی کو بازی لے جانا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ ایک روایت میں "ستون ذراعًا فی السماء" کی تصریح ہے۔ حضرت شیخؒ اس کی مراد یہ بیان فرماتے تھے کہ آدم علیہ السلام کے قد کی یہ درازی جنت میں تھی، جب ان کو زمین پر اتارا گیا تو اس میں مناسب تخفیف کر دی گئی۔

۱۲۰۹- اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ چھینک آثار حیات میں سے ہے اس لیے آج تک اس پر الحمد للہ کہنا سنت آدم شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہنا اسی قدیم سنت کے مطابق ہے۔ ان احادیث سے تحیۃ و تحمید کے الفاظ کی اہمیت سمجھنی چاہیے اسی لیے محدثوں میں اس پر ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے جو اپنے محل میں آئیگا۔ افسوس کہ مسلمانوں نے آج ان دونوں مقامات پر سنت آدم کو فراموش کر کے نئے نئے الفاظ اپنی جانب سے تراش لیے ہیں اور کسی نے تو چھینک کو برکت کی بجائے اس کو اور آثار نحوست تک سمجھ لیا ہے۔

۱۲۱۰- حضرت آدم علیہ السلام جس طرح تخلیق انسانی کی اساس تھے اسی طرح قدرت کے بہت سے اسرار تکوینیہ کا

مَنْ جَحَدَ آدَمُ قَالَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمَّا خَلَقَهُ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَأَخْرَجَ
ذُرِّيَّتَهُ فَعَرَضَهُمْ عَلَيْهِ فَرَأَى فِيهِمْ رَجُلًا يَزْهَرُ فَقَالَ أَيْ رَبِّ زِدْهُ فِي عُمُرِهِ قَالَ لَا إِلَّا
أَنْ تَزِيدَهُ أَنْتَ مِنْ عُمُرِكَ فَزَادَهُ أَرْبَعِينَ سَنَةً مِنْ عُمُرِهِ فَكَتَبَ اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِ كِتَابًا
وَأَشْهَدَ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةَ فَلَمَّا أَرَادَ أَنْ يَقْبِضَ رُوحَهُ قَالَ إِنَّهُ بَقِيَ مِنْ أَجَلِي أَرْبَعُونَ

کیا وہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ آپ نے یہ جملہ تین بار فرمایا۔ بات یوں ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کر لیا اور ان کی پشت سے ان کی ذریت نکال کر ان کے سامنے کی تو انہوں نے ان میں ایک شخص دیکھا جو چمک رہا تھا۔ انہوں نے عرض کی پروردگار اس کی عمر کچھ اور بڑھا دے ارشاد ہوا یہ نہیں ہو سکتا مگر اس صورت سے کہ تم اپنی عمر سے کچھ ان کو دے دو۔ آدم علیہ السلام نے اپنی عمر کے چالیس سال اس کو دیدیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس معاملہ کی نوشت وخواند کے بعد اس پر فرشتوں کی گواہی لے لی پھر جب ان کی قبض روح کا وقت آیا تو آدم علیہ السلام نے فرمایا ابھی تو میری عمر کے چالیس سال باقی ہیں

ایک مرکب نسخہ بھی تھے۔ ان کا کالبد مختلف رنگ و بو کی مٹی سے بنایا گیا تو ان کی ذریت میں ہر رنگ کا انسان اور اس میں نرمی و گرمی ہر قسم کی خو پیدا ہو گئی۔ اسی طرح جب سہو و نسیان اور جحود و خطا کا تخم بھی کو کسی حیثیت کا ہو ان میں بو دیا گیا۔ تو وہی تخم بڑھ کر خدا تعالیٰ کے قہر و مہر کا سامان بن گیا یعنی سہو و نسیان بڑھا تو غفلت کی شکل بن گئی خطا نے ترقی کی تو عمد کی صورت ظاہر ہو گئی اور جب جحود کی خصلت بڑھی تو کفر رونما ہو گیا۔ والعیاذ باللہ اگر طینت آدم علیہ السلام میں مختلف رنگوں کی مٹی شامل نہ ہوتی تو نہ تو نسل انسانی کے رنگوں میں اختلاف نظر آتا اور نہ ان کے خصائل و طبائع میں سب ایک ہی باپ کی اولاد تھے اور اس لیے اپنے رنگ و بو میں بھی سب یکساں ہوتے اسی طرح اگر ان میں بنیادی طور پر انسانی ضعف نہ رکھا جاتا تو نسل انسانی میں بھی کمزوری کا اثر نظر نہ آتا۔

واضح رہے کہ صاحب مشکوٰۃ نے مذکورۂ بالا واقعہ کو اپنی تالیف میں دو جگہ ذکر فرمایا ہے کتاب القدر میں اور باب السلام میں اور دوسری جگہ اس میں اربعین کی جگہ ستین سنۃ کا لفظ نقل فرمایا ہے یعنی آدم علیہ السلام نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی عمر میں سے ساٹھ سال عطا فرمائے تھے مگر اس روایت میں داؤد علیہ السلام کی عمر چالیس سال مذکور ہوئی ہے اور پہلی روایت میں جہاں آدم علیہ السلام کا چالیس اپنی عمر میں سے عطا فرمانا مذکور ہے۔ وہاں داؤد علیہ السلام کی عمر ساٹھ سال بیان کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک دونوں روایتوں کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی درخواست ان کی عمر پوری سو سال ہونے کے متعلق تھی۔ پس اگر ان کی عمر ساٹھ سال تھی تو اس میں چالیس کی کسر تھی اور اگر چالیس سال تھی تو ساٹھ سال کی کسر تھی۔ دونوں صورتوں میں ان کی عمر پورے سو سال ہو جاتی ہے۔ راویوں کو یہاں اس میں اختلاف ہے کہ آپ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی اصل عمر کیا بیان فرمائی تھی اس لیے سو سال کی تکمیل میں بھی اسی حساب سے ان کو مختلف رہنا چاہیے تھا۔ یہاں حدیث کی جو توجیہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نقل فرمائی ہے وہ مشکوٰۃ کے حواشی میں دیکھ لی جائے۔ اس کے حساب سے ان کی عمر ۱۲۰ سال بن جاتی ہے۔ اپنی رائے ناقص ہم بیان کر چکے ہیں۔ شارحین کی نظر یہاں صرف آخر حصہ پر گئی ہے یعنی یہ کہ آدم علیہ السلام نے ان کو چالیس سال بخشے تھے یا ساٹھ اور اسی پر بحث شروع کر دی ہے۔ اگر اس طرف بھی ان کی نظر

سَنَۃً فَقِیْلَ لَہٗ اِنَّکَ قَدْ جَعَلْتَھَا لِابْنِکَ دَاوٗدَ قَالَ فَجَحَدَ قَالَ فَاَخْرَجَ اللّٰہُ الْکِتَابَ وَ اَقَامَ عَلَیْہِ الْبَیِّنَۃَ فَاَتَمَّھَا لِدَاوٗدَ مِائَۃَ سَنَۃٍ وَ اَتَمَّ لِاٰدَمَ عُمُرَہٗ اَلْفَ سَنَۃٍ (رواہ الامام احمد)

۱۲۱۱- عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْمَرْاَۃَ خُلِقَتْ مِنْ

ان سے کہا گیا آپ تو وہ اپنے فرزند داؤد کو بخش چکے ہیں۔ آدم علیہ السلام کو وہ بات یاد نہ رہی اس لیے اُنھوں نے انکار فرمادیا۔ اللہ تعالیٰ نے اقرار نامہ نکال کر اُن کے سامنے کیا اور اس کا ثبوت دے دیا (بس اصل انسانی کے اس انکار کا اثر نسل انسانی میں بھی چلتا رہا اور نسیان کی طرح انکار بھی انسان کی سرشت بن گئی) اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی عمر بھی سو سال پوری کردی اور آدم علیہ السلام کی عمر بھی بدستور ہزار سال رہنے دی۔ (مسند احمد)

۱۲۱۱- ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عورت (بائیں) پسلی سے بنائی گئی ہے

چلی جاتی کہ یہاں دوسرا اختلاف اس سے پہلے داؤد علیہ السلام کی اصل عمر میں بھی موجود ہے تو بات صاف ہو جاتی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

ترمذی شریف کی اس دوسری روایت میں یہ لفظ اور ہیں قال فمن یومئذ امر بالکتاب والشھود۔

تقدیر کے بیان میں اس روایت کے اہم اجزا پر کلام کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمالیا جائے۔ یہاں مسند احمد کی یہ روایت خاص اس لیے نقل کی گئی ہے کہ اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی عمریں پوری کی پوری ہی عطا فرمادیں اور حساب سے جو کمی بیشی ہوئی تھی اس کی رعایت نہیں کی۔

اس سے یہ اندازہ کرلینا چاہیے کہ سہو و نسیان جحود و عصیان کی نسبت گو انبیاء علیہم السلام کی جانب بھی آگئی ہے مگر ان میں اس کی حقیقت کیا ہوگی کہ ان کے سہو و نسیان اور جحود پر بھی رحمت کی اتنی بارشیں ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ قرآن کریم کے فوائد میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی ذریت کے لیے نمونۂ تقدیر تھے۔ سہو و نسیان اور جحود و عصیان کی جو جو خصلتیں ان کی ذریت میں مقدر تھیں وہ سب ان کے آئینہ میں پہلے سے نظر آگئیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ شدت و خفت کے لحاظ سے اس کی نوعیت میں وہ اختلاف پیدا ہو گیا جو صورت و حقیقت میں ہوتا ہے۔ یہاں صرف ان کی صورت ہی صورت تھی اور آگے چل کر وہ صورت ترقی کرکے حقیقت کا رنگ اختیار کرگئی یہ بھی ایک ارتقائی حرکت سمجھنی چاہیے۔

۱۲۱۱- حضرت حوا کی تخلیق کے متعلق قرآنی اور حدیثی بیان ہمارے پاس صرف ایک ہی ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا بیان موجود نہیں۔ حضرت حوا کی پسلی سے پیدائش گو فہم سے بالاتر بات ہو لیکن اگر حدیث کے الفاظ پر ذرا غور کرلیا جائے تو پھر اس میں کوئی اُلجھن باقی نہیں رہتی۔ حدیث میں حضرت حوا کے متعلق "ولد" کا لفظ نہیں بلکہ "خلق" کا لفظ ہے۔ چونکہ اُردو زبان میں دونوں کا ترجمہ یکساں ہے اس لیے یہاں بے وجہ کی اُلجھن پیدا ہوگئی ہے حدیث یہ نہیں کہتی کہ حضرت حوا کی ولادت پسلی سے ہوئی تھی بلکہ یہ کہتی ہے کہ ان کی خلقت پسلی سے ہوتی ہے یعنی جس طرح آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے تھے حضرت حوا ضلع آدم یعنی ان کی پسلی سے بنائی گئی تھیں۔ ہمارے نزدیک تو انسان کی ایک

ضِلَعٍ لَنْ يَّسْتَقِيْمَ لَكَ عَلٰى طَرِيْقَةٍ فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اسْتَمْتَعْتَ وَبِهَا عِوَجٌ وَاِنْ ذَهَبْتَ

وہ کبھی ایک سیدھے طریقہ پر تمہارے ساتھ بسر نہیں کر سکتی اب اگر اس سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسی کجی کے ساتھ نفع حاصل کرتے رہو، اگر کہیں تم نے

انسان سے تخلیق اتنی بعید نہیں جتنی کہ انسان کی مٹی سے بعید ہے اب اگر ہمارے روزمرہ کے مشاہدے نے اس کو بدیہی بنا دیا ہے تو اس سے اصل حقیقت کا معمہ پھر حل نہیں ہوتا۔ حدیث کے اس بیان کو اگر سورۂ نساء کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً

اے لوگو ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے اُن دونوں سے بہت مرد اور عورتیں۔

آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت نہ تو براہ راست ابتداءً پیدا کی گئی ہے اور نہ صرف ایک وحدت سے پیدا کی گئی ہے بلکہ اس میں ایک تدریج ملحوظ رکھی گئی ہے اور اس کی شکل یہ ہوئی کہ پہلے ایک ہی نفس کو پیدا فرمایا گیا۔ پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا گیا پھر اس جوڑے سے انسانوں کی یہ کثرت پیدا کی گئی اب اگر فرض کرو کہ حضرت حوار کی تخلیق بھی حضرت آدم علیہ السلام کی طرح مستقل ہوتی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مادہ تخلیق کیا تھا قرآن کریم اور حدیث میں مذکورہ بالا صورت کے علاوہ اس باب میں کوئی بیان موجود نہیں، نیز اگر حضرت حوار کی تخلیق بھی مستقل مانی جائے تو پھر انسانوں کی کثرت کے ظہور کے لیے جو نسق بیان اختیار فرمایا گیا ہے اس کی بجائے سیدھی بات یہ تھی کہ ہم نے اس کثرت کو آدم و حوار سے پیدا کیا ہے جیسا کہ حضرت حوار کے بعد یہی نسق بیان اختیار فرمایا گیا۔ "وبث منهما" یعنی پھر ہم نے اس جوڑے سے کثرت پیدا کی۔ سورۂ بقرہ میں امام قرطبی نے صرف اسی تفسیر کو ذکر فرمایا ہے، بلکہ اس میں ایک لفظی نکتہ بھی لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں عورت کو "امرأة" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ "المرء" سے بنی ہے جس کے معنی مرد کے ہیں اور ان کا نام حوار بھی اسی لیے رکھا گیا تھا، کیونکہ وہ ایک "حی" یعنی زندہ ہستی سے بنائی گئی تھیں۔ گویا یہ حقیقت حضرت حوار کی تخلیق سے لے کر ان کے نام تک سرایت کر گئی ہے بلکہ احکام میں بھی اس کا اثر یہاں تک ظاہر ہوا کہ امام شافعیؒ کے مذہب میں شیر خوار لڑکے کا پیشاب بہ نسبت شیر خوار لڑکی کے نجاست میں خفیف سمجھا گیا ہے۔ پھر جب خود امام شافعیؒ سے اس تفریق کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے ایک علمی نکتہ کے طور پر فرمایا کہ نوع انسانی میں مذکر کی پیدائش آب و گل سے ہوئی ہے اور وہ پاک ہے اور مونث کی گوشت و خون سے اور وہ ناپاک ہے اس لیے نسل انسانی میں بھی اپنی اصل کے آثار باقی رہ گئے ہیں۔ امام موصوف کا یہ بیان صرف ایک علمی نکتہ ہے اس کی اصل بنا صحیح حدیثوں پر ہے فروعی تفصیلات کا محل نہیں ہے علاوہ ازیں عقلی طور پر تخلیق کی چار صورتیں ہیں، اور وہ چاروں انسانی تخلیق میں پوری کر دی گئی ہیں۔ والدین کے بغیر پیدائش جیسے آدم علیہ السلام والدین سے پیدائش۔ جیسا کہ معمول ہے۔ صرف والدہ سے پیدائش جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اب صرف ایک یہی صورت باقی رہتی ہے جس میں صرف مذکر سے تخلیق ہو۔ اب اگر حدیث مذکور میں تاویل نہ کی جائے تو حضرت حوار اس چوتھی صورت کا مصداق ہوں گی ورنہ دائرۂ تخلیق میں صرف یہی ایک قسم ہوگی جس کی مثال نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ عقل کے نزدیک دوسری قسم کے سوا سب صورتیں ناقابل فہم ہیں چنانچہ نصاریٰ نے گو صرف والدہ سے پیدائش کا اعتراف تو کر لیا مگر وہ بھی پورے طور پر اس کے سمجھنے سے قاصر رہے حتیٰ کہ اسی کو عیسیٰ علیہ السلام کی ابنیت کی دلیل بنا بیٹھے دوسری

نُقِيْمُهَا كَسَرْتَهَا وَكَسْرُهَا طَلَاقُهَا. رواه مسلم وفي البخاري نحوه۔

۱۲۱۲۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْلَا بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ

اس کے سیدھا کرنے کا ارادہ کیا تو یاد رکھو کہ تم اس کو توڑ دو گے یعنی اس کو طلاق دینی ہوگی۔ (مسلم شریف)

۱۲۱۲۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو

طرف یہود نے اس خلقت کو غیر معقول سمجھا تو عالم کی ایک پاکباز ترین عورت کو متہم کرنے سے باز نہ رہ سکے اب رہ گئی حضرت حوا کی شخصیت تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کے اہم واقعات میں اس طرح گم ہے کہ یہاں نئے نئے محققین نے صاف طور پر سامنے آکر کوئی بات تو نہیں کہی مگر ان کے دلوں کے اندر ہی اندر تخلیق کی اس نوع میں بہت سی شبہات کھٹک رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک مذکورہ بالا حدیث قرآن کریم کی آیت خلق منہا زوجہا کا بیان ہے اور اس طرح تخلیق کا نکتہ بھی خود قرآن کریم ہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ — وہی تمہارا پروردگار ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (اعراف) — اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے تسکین حاصل کرے

سورۂ نساء اور سورہ اعراف میں دونوں جگہ حضرت حوا کے حق میں ایک ہی لفظ یعنی خلق منہا زوجہا ارشاد فرمایا گیا ہے۔ مگر یہاں اس کی حکمت بھی بیان فرمادی گئی ہے یعنی یہ بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حضرت حوا حضرت آدم علیہ السلام ہی سے بنائی گئی تھیں۔ کیونکہ انسان کو جتنی کشش اپنے ہم جنس کی طرف ہوتی ہے اس سے زیادہ کشش اس کی طرف ہوتی ہے جو خود اسی سے پیدا شدہ ہو۔ اسی لیے جو محبت اپنی اولاد کے ساتھ ہوتی ہے وہ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اجنبی مرد و عورت کے درمیان عقد نکاح کے فوراً بعد جس محبت کا مشاہدہ ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ کرلینا کچھ بعید نہیں کہ ان کے اصول میں ضرور کوئی ایسا ہی رشتہ ہونا چاہیے امام قرطبی تحریر فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو حضرت حوا کی اس طرح تخلیق سے قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہوئی اگر ایسا ہوتا تو نسل انسانی میں کسی مرد کو کسی عورت کی طرف کبھی رغبت نہ ہوتی اور اصل انسانی میں تکلیف کی تاریخ نسل انسانی میں اثر دکھائے بغیر نہ رہتی۔ واللہ سبحانہ اعلم

۱۲۱۲۔ بنی اسرائیل کی فرمائش پر من وسلویٰ نازل ہوا تھا مگر ان کو یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ وہ کچھ بچا کر نہ رکھا کریں مگر انہوں نے حکم عدولی کی۔ آخر یہ رسم بد آئندہ نسلوں میں بھی چل پڑی اور اپنی حاجت سے فاضل گوشت جمع کرنا شروع کردیا گیا۔ حتیٰ کہ سڑنے کی نوبت آنے لگی۔ کیا تعجب ہے کہ انسانی اخلاق کسی زمانہ میں گوشت جیسی چیز کا ضرورت سے زیادہ جمع رکھنا مکروہ سمجھتے ہوں۔ پھر اخلاق کی پستی کی بدولت اس کا جمع کرنا شروع ہوگیا ہو اور اس کے سڑنے کی نوبت آئی ہو۔ آج بھی بخیل طبائع حاجتمندوں میں کھانا تقسیم کرنے سے اس کو سڑا دینا بہتر سمجھتی ہیں کاش اگر بنی اسرائیل اس رسم بد کی بنیاد نہ ڈالتے تو دنیا اس بخل کی عادی نہ ہوتی۔ اسی طرح جدی خصائل آئندہ نسل میں نمودار ہوا کرتے ہیں۔ حضرت حوا علیہا السلام کا جو معاملہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ پیش آیا گو اس کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو مگر اس خصلت کا ظہور بھی عورتوں میں ایک جزء لازم بن گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر عورت کی اپنی فطرت کی بلندی و پستی کے لحاظ سے اس کی نوعیت میں فرق ضرور پڑتا رہا۔ مگر شوہر کے ساتھ ناعاقبت اندیشی

لَوْ لَا بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ لَمْ یَخْنِزِ اللَّحْمُ وَلَوْلَا حَوَّاءُ لَمْ تَخُنْ اُنْثٰی زَوْجَهَا الدَّهْرَ۔ متفق علیہ

(گوشت جمع کرکے رکھنے کی بُری رسم نہ پڑتی) اور گوشت (گھروں میں پڑا پڑا) نہ سڑا کرتا۔ اور اگر حضرت حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت زمانہ بھر میں کبھی اپنے شوہر کے ساتھ خیانت نہ کرتی۔ متفق علیہ

کی جو بنیاد ایک مرتبہ قائم ہوچکی تھی وہ بدل نہیں سکی۔ ابوہریرہؓ کی ان ہر دُو حدیثوں سے صنف رجال کی برتری اور صنف نساء کی فطری کمزوری یعنی مرد کے مقابلہ میں ان کی کمتری بھی ثابت ہوتی ہے۔ خدا کی مخلوق میں ضعف و قوت کا یہ اختلاف سماوی مخلوق سے لے کر ارضی مخلوق تک موجود ہے آسمان پر جب نظر کی جاتی ہے تو اس میں بھی شمس و قمر تمام ستاروں میں سب سے روشن اور بڑے نظر آتے ہیں، پھر ستاروں میں بھی ان کی جسامت اور نورانیت میں بھی بڑا اختلاف موجود ہے۔ زمین میں بھی حیوانات میں بڑا اختلاف ہے اور اس جنس میں بھی مذکر و مؤنث میں طاقت و جسامت کے اندر کھلا اختلاف موجود ہے۔ یہی اختلاف انسانوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہاں مذکر و مؤنث یعنی مرد و عورت کی صنف میں قوت و ضعف کا بڑا اختلاف ہے۔ اس فطری اختلاف کو اگر جدید تحقیقات کی روشنی میں دیکھنا ہو تو "المرأة المسلمة" کا مطالعہ کیا جائے، اس کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے جس کا نام "مسلمان عورت" ہے۔ ان اختلافات کے علاوہ خود ایک ہی شخص کے دائیں بائیں اعضاء میں فرق ہوتا ہے مگر ان تمام اختلافات کو قدرت کے کمال کے سوا کہیں کسی کی حق تلفی نہیں سمجھا گیا، نہ کبھی کسی نے ان بدیہی اختلافات کے انکار کی ہمت کی ہے، مگر ہمارے دور میں صرف یورپ کے اعتراضات کی بناء پر عورت کے شرعی اور فطری نقصان کے انکار کی سعی جاری ہے حالانکہ قرآن و حدیث میں اس دعویٰ کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن کریم میں اگر دو جگہ عورتوں کا تذکرہ آیا ہے تو سو جگہ نہیں آیا۔ ہمارے نزدیک صنف نازک کو مرد قوی کے بالکل برابر لا کھڑا کرنے کی سعی ایسی ہی ہے جیسی کہ بائیں اعضاء کی دائیں اعضاء کے بالکل برابر بنانے کی۔ فطرت کے ان اختلافات کا انکار کرنا بداہت کا انکار کرنا ہے۔

بعض اہل قلم کو اس مسئلہ سے اتنا شغف ہے کہ انہوں نے سورۂ یوسف کی آیت اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ عالم کے واقعات پر جہاں کہیں نظر ڈالی جائے تو ہر جگہ عورت ہی معصوم نظر آتی ہے اور ہر جگہ در پردہ مرد ہی کی کارفرمائی ثابت ہوتی ہے۔ اور اتنا نہیں سوچا کہ کیا اس فقرہ کا محل سورۂ یوسف ہی رہ گئی تھی جس میں صرف مرد کی عصمت اور عورت کے فریب کی سرگزشت بیان کرنی مقصود ہے۔ لیکن یہ انسان کا فطری ضعف ہے کہ جب وہ کسی جانب مائل ہوتا ہے تو آنکھ میچ کر اس طرح ڈھلتا چلا جاتا ہے کہ محل و بے محل کی طرف اس کو کوئی توجہ نہیں رہتی۔ اس لیے ہمیں اس کی وضاحت کرنی ضروری ہے کہ احادیث بالا کی روشنی میں صنفِ نازک بے شبہ مرد کی نسبت سے ضعیف اور ناقص بنائی گئی ہے مگر اس کے باوجود وہ مرد کے ایک اہم گوشۂ حیات کے لیے باعث تکمیل بھی ہے۔ اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر مذکورہ حدیث کی روشنی میں ہمیں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف یہ دو حرف لکھ کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی اتنی بڑی تعداد میں کسی عورت کو منصب نبوت سے نوازا نہیں گیا۔ اور اس طرح دنیا کے ملوک و سلاطین کی تاریخوں میں بھی عورتوں کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ مذہب و دنیا کی تاریخوں کے اس توافق کے بعد اب واقعات کی دنیا میں تو آپ کے اس فیصلہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے لیے آپ کو کوئی دوسرا جہان تلاش کرنا ہوگا۔

ہمارے نزدیک اعتدال کی راہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت میں جداگانہ جداگانہ قسموں کی صلاحیتیں پیدا فرمائی ہیں اور ہر [illegible] دوسری نوع کی خاص صلاحیتوں سے خالی ہے عالمِ انسانیت کی تکمیل (باقی بصفحہ ۴۷۵)

سیدنا ادریس علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق مؤرخین کو اختلاف ہے کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام سے پیشتر ہوئے ہیں یا بعد میں۔ اس تاریخی بحث کی اہمیت اس لیے ہے کہ اگر وہ پہلے ہیں تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں ان کا ہونا یقینی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی کو جمہور کا قول قرار دیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت شیث علیہ السلام کے بعد یہ پہلے وہ شخص تھے جو نبوت سے سرفراز ہوئے۔

درمنثور میں حاکم کی روایت سے ان کا حلیہ مبارک یہ نقل کیا ہے، گورا رنگ، دراز قامت، بھاری پیٹ چوڑا سینہ، جسم پر بال کم، سر کے بال گھنے، ایک آنکھ زیادہ فراخ اور سینہ پر ذرا سا سفید دھبہ۔

سلف میں صرف دو نبیوں کے متعلق آسمان پر اٹھائے جانے کی شہرت تھی ایک یہ دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ ان دونوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع تو تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور ادریس علیہ السلام کے رفع کے متعلق کوئی مرفوع روایت صحت کو نہیں پہنچی۔ البتہ صحابہ اور تابعین میں اس کا تذکرہ ضرور رہا ہے اور چونکہ حضرت ابن عباسؓ اور ابو سعید خدریؓ وغیرہما سے ان کا رفع آیت ”وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا“ کی تفسیر میں منقول ہے اس لیے اس کو بے اصل اسرائیلیات میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے یہاں جن روایات پر منکر ہونے کا حکم لگایا ہے وہ اس جزء کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان روایات میں اور بہت سی بے تحقیق باتیں موجود ہیں جو بے اصل ہیں۔ چنانچہ ان کے قول وفی بعضہ نکارۃ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ عجلت پسندوں نے یہاں یہ سمجھ لیا ہے کہ انہوں نے پوری روایت پر منکر ہونے کا حکم لگا دیا ہے۔ اسی لیے صحابہ کے ان آثار کو انہوں نے ضعیف قرار نہیں دیا اور ان کو منکر کہا ہے بلکہ اپنی تاریخ میں خود ان کو نقل فرمایا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا اور اس لیے نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کی طرح اس کو عقائد کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو بے اصل کہا جا سکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اسرائیلیات کو مطلقاً بے اصل سمجھنا بھی صحیح

کے لیے ان دونوں کا وجود ضروری ہے پس انسانی عالم کو عالم نساء کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ کسی ناقص کو اپنے کمال کے لیے ضرورت ہوتی ہے پس ایک لحاظ سے عورتوں کے [illegible]ال اور ضرورت کا انکار نہیں۔ مگر یہ بات صاف ہے کہ جو صلاحیتیں مرد میں رکھی گئی ہیں وہ ان سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہیں جو عورتوں میں پیدا کی گئی ہیں۔ نبوت اور رسالت تو بڑی مقامات ہیں عورت میں روزمرہ کی نماز کی امامت کی صلاحیت بھی نہیں بلکہ مقتدیوں کی صف اول میں شامل ہونے کی صلاحیت بھی نہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کا موقف تمام صفوف رجال کے پیچھے ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے عورتوں کے مردوں کے ساتھ جمیع حقوق میں مساوات کی ہیں تو کوئی اصل معلوم نہیں ہو سکی۔ پھر معلوم نہیں مسلمان اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں یہ بے جا واویلا کس لیے ہے۔

نہیں ہے۔ اسرائیلیات کا جو حصہ "دین محمدی" علیٰ صاحبہا الف الف صلوات وتحیات کے خلاف نہ ہو اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے کہ اس کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی مشہور تصنیف "التوسل والوسیلہ" میں اس پر مبسوط بحث کی ہے۔

۱۲۱۳- عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ السُّلَمِيِّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ أُمُوْرًا كُنَّا نَصْنَعُهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ كُنَّا نَأْتِي الْكُهَّانَ قَالَ فَلَا تَأْتُوا الْكُهَّانَ قَالَ كُنَّا نَتَطَيَّرُ قَالَ ذَاكَ شَيْءٌ يَجِدُهُ أَحَدُكُمْ فِي نَفْسِهِ فَلَا يَصُدَّنَّكُمْ قَالَ قُلْتُ مِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّوْنَ خَطًّا قَالَ كَانَ نَبِيٌّ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ فَذَاكَ۔ رواہ مسلم۔

۱۲۱۴- عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا عُرِجَ بِي رَأَيْتُ إِدْرِيْسَ فِي السَّمَاءِ الرَّابِعَةِ۔ اخرجہ الترمذی وصححہ فی الصحیحین فی حدیث المعراج نحوہ وعن ابن عباسؓ فی قولہ تعالیٰ وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا قال رُفِعَ إِلَى السَّمَاءِ السَّادِسَةِ وعن العوفی کما فی البدایۃ

۱۲۱۳- معاویہ بن حکم سلمی کہتے ہیں میں نے پوچھا یا رسول اللہ ہم زمانۂ جاہلیت میں بہت سے افعال کرتے تھے، اُن کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ ہم کاہنوں کے پاس بھی جاتے تھے۔ آپ نے فرمایا ان کے پاس جا کر خبریں دریافت نہ کیا کرو (یہ بے اصل بات ہے) انہوں نے عرض کی۔ ہم بدفالی کے بھی قائل تھے۔ آپ نے فرمایا قدیم عادت کی بنا پر تمہارے دل میں اس کا احساس تو ضرور ہوتا ہوگا مگر عملاً اس کی تردید کا طریقہ یہ ہے کہ جو کام کرنا ہو وہ کر لو اور اس احساس کی وجہ سے اس کے کرنے سے باز نہ رہو پھر انہوں نے عرض کی۔ ہم رمل کا حساب بھی کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو یہ علم عطا فرمایا تھا تو تم میں جس شخص کا حساب حسب اتفاق ان کے ساتھ مطابق ہو جاتا ہے تو وہ درست بھی نکل آتا ہے۔ (مسلم)

۱۲۱۴- انس بن مالکؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مجھ کو معراج نصیب ہوئی تو میں نے ادریس علیہ السلام کو چوتھے آسمان پر دیکھا تھا۔ (ترمذی شریف)

ورفعناہ مکانا علیا کی تفسیر میں ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو چوتھے آسمان پر اٹھا لیا

۱۲۱۳- حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ نبی حضرت ادریس علیہ السلام ہی تھے۔ پھر جس طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرف بہت سے غلط افسانے منسوب کر دیئے گئے ہیں، ان کی طرف بھی بہت سی غلط باتیں منسوب کر دی گئی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اس روایت میں اس خط کی پوری تفصیلات مذکور نہیں ہیں لہٰذا صرف اس اجمالی بیان سے رمل کے متعلق جتنی باتیں مشہور ہیں وہ سب اس حدیث کے تحت درج نہیں کی جا سکتیں

۱۲۱۴- سلف میں کسی بشر کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے امکان و عدم امکان کی بحث کبھی نہیں ہوئی وہ یہ بات کسی تردد کے بغیر جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ ان میں جب کبھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کا تذکرہ آیا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے نزدیک دین کے دوسرے بدیہی مسلمات

فمات بها وعن ابی سعید الخدریؓ فی السماء الرابعۃ وعن مجاھد رفع ادریس کما رفع عیسیٰ ولم یمت۔ کذا فی الدر المنثور و فی البدایۃ عن ابن عباس انہ مات بہا ونحوہ عن کعب۔

تھا۔ ابن عباسؓ نے چوتھے کے بجائے چھٹے آسمان کا لفظ کہا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُٹھائے گئے اسی طرح حضرت ادریس علیہ السلام بھی اُٹھائے گئے تھے۔ پھر ان کی وفات نہیں ہوئی لیکن حافظ ابن کثیرؒ نے ابن عباسؓ سے نقل فرمایا ہے کہ آسمان پر ہی ان کی وفات ہوگئی۔ کعب احبار بھی آسمان پر ان کی وفات کے قائل تھے۔

کی طرح ایک مسلم بات تھی۔ نیز ان کے نزدیک اس میں بھی کوئی اشکال نہ تھا کہ کوئی انسان اگر آسمان میں وفات پاجائے تو اس کی تجہیز و تکفین اور دفن کی صورت کیا ہوگی۔ موت روح اور جسم کی صرف علیحدگی کا نام ہے۔ اتنی بات اگر آسمانوں پر ہوجائے تو اس میں عقل کے نزدیک بھی کیا دشواری ہے۔ پھر جب انبیاء علیہم السلام کے جسم اس مٹی میں دفن ہونے کے بعد بھی کون و فساد سے محفوظ رہتے ہیں تو آسمانوں پر ان کے رہنے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ انسان جب کسی بات کا انکار کرنا چاہے تو بے وجہ ہر بات کو اپنی عقل نارسا کے لیے ناقابل تحمل بوجھ بنالے۔ ہم یہاں یہ فیصلہ کرنا نہیں چاہتے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق راجح کیا ہے کیونکہ براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس کا کوئی واضح اور مستند سامان ہمارے علم میں نہیں ہے۔

سیدنا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام اول رسول اللہ الی الارض

حضرت نوح علیہ السلام کو انبیاء علیہم السلام کی صف میں ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے اور اسی خصوصیت کی بناء پر حدیثوں میں ان کو "اول رسول" کہا گیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں جو سب دین حق پر قائم تھے۔ اس روایت کی وجہ سے انہوں نے مورخین کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ قابیل کی نسل میں آتش پرستی شروع ہوگئی تھی ان کی تحقیق یہ ہے کہ کفر و شرک کی بنیاد حضرت نوح علیہ السلام کے عہد ہی کے قریب میں پڑی تھی اور اس کے ابطال و تردید کے لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا جو رسول بھیجا وہ حضرت نوح علیہ السلام تھے۔ اس لیے جس رسول کو کفر و شرک کے مقابلہ سے سب سے پہلے واسطہ پڑا ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور اسی لیے ان کو حدیثوں میں "اول رسول" کہا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اصولی مباحث کے بیان و ایضاح میں انہوں نے بہت بڑی جد و جہد فرمائی تھی۔ حتیٰ کہ دجال کا فتنہ جو دنیا کے آخر میں نمودار ہونے والا تھا اس سے بھی اپنی امت کو پوری طرح خبردار کر دیا تھا۔ حافظ ابن تیمیہؒ کی گزشتہ تحقیق کے مطابق ان کے اول رسول ہونے کا مطلب کسی توجیہ کے بغیر واضح ہوجاتا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے ابن جبیر وغیرہ کے حوالہ سے ان کی قوم کا نام بنوراسب نقل فرمایا ہے۔ حافظ سیوطیؒ نے درمنثور میں حضرت نوح علیہ السلام کا شجرۂ نسب اس طرح تحریر فرمایا ہے۔

نوح بن لامک بن متوشلخ بن ادریس وہوا خنوخ بن یرد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ ان کا اسم مبارک "نوح السکن" تھا۔ اور چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد دنیا کی آبادی نے ان ہی کے زیر سایہ اطمینان وسکون کا سانس لیا تھا اس لیے ان کو نوح سکن کہتے تھے۔ اور ان کے نوح کہلانے کی وجہ یہ تھی کہ ساڑھے نوسو سال تک اپنی امت کو تبلیغ وارشاد فرماتے رہے اور جب وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی تو ان پر ہمیشہ غم کے آنسو بہاتے رہے (درمنثور ج۳)

حضرت نوح علیہ السلام کی حیات کا سب سے مشہور تاریخی واقعہ طوفان کا ہے جو بعد میں ہمیشہ نظم و نثر میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس کے متعلق اہل کتاب اور مؤرخین کا اختلاف ہے۔ فارس اور اہل ہند تو سرے سے اس کا انکار کر رہے ہیں۔ ہم ذیل میں صرف حافظ ابن کثیر کے الفاظ نقل کرتے ہیں جو بالاتفاق مسلم محدث بھی ہیں اور معتبر مؤرخ بھی۔

وقد اجمع اہل الادیان الناقلون عن رسل الرحمن مع تواتر عند الناس فی سائر الازمان علی وقوع الطوفان وانہ عمّ جمیع البلاد ولم یبق اللہ احدا من کفرۃ العباد استجابۃ لدعوۃ نبیہ المؤید المعصوم وتنفیذا لما سبق فی القدر المحتوم۔ البدایۃ ج۱ ص۱۱۱

تمام ادیان سماویہ کا اور ہر دور میں تواتر کے ساتھ لوگوں کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ طوفان نوح علیہ السلام پوری زمین کو محیط تھا اور حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سب کافروں کو ہلاک کر دیا تھا۔

حافظ ابن تیمیہؒ بھی اسی کی تصحیح فرماتے ہیں کہ طوفان نوح علیہ السلام پورے کرۂ ارضی کو محیط تھا۔

فنوح ابو الآدمیین الذین حدثوا بعد الطوفان فان اللہ اغرق ولد آدم الا اہل السفینۃ و قال فی نوح وجعلنا ذریتہ ہم الباقین
الجواب الصحیح ص۱۹۳-۱۹۵ ج۱

اس لیے نوح علیہ السلام ان سب انسانوں کے والد قرار پائے جو طوفان کے بعد پیدا ہوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کشتی والوں کے سوائے تمام اولاد آدم علیہ السلام کو غرق کر دیا تھا چنانچہ ارشاد ہے وجعلنا ذریتہ الخ یعنی ہم نے صرف ان ہی کی نسل کو باقی رہنے والا رکھا۔

محقق ابن خلدون کی رائے بھی اسی طرف ہے۔ دیکھو مقدمہ ص۱۱ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کی تحقیق بھی یہی ہے۔ دیکھو اظہار الحق ص۱۰۱ ج۲ اس کے علاوہ اکثر محدثین ومفسرین کا مختار بھی یہی ہے۔ ہاں نصاریٰ ضرور اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور بعض علماء بھی بظاہر اس خیال سے کہ اس سے ان کی بعثت کا عموم ثابت ہوتا ہے دوسری طرف چلے گئے ہیں، ورنہ قرآنی عموم واطلاقات کا ظاہر یہی ہے کہ طوفان تمام کرۂ ارضی کو محیط تھا واللہ تعالیٰ اعلم

اس تحقیق کی بنا پر چونکہ دنیا کی نشأۃ ثانیہ ان ہی کی ذات سے ہوئی اس لیے ان کو آدم ثانی کہا جاتا ہے حافظ موصوف نے ان کی قبر کے متعلق زیادہ صحیح یہی قرار دیا ہے کہ وہ مسجد حرام میں ہے اور اکثر متاخرین کے اس خیال کو مرجوح کہا ہے کہ وہ مشہور مقام کرک نوح میں ہے۔ جہاں لوگوں نے ایک بڑی مسجد بھی تعمیر کر دی ہے شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے ایک روایت پیش کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چار نبیوں کی قبریں زمزم اور رکن یعنی حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان ہیں۔ حضرت نوح، ہود، شعیب و صالح علیہم السلام۔ (درمنثور ج۳)

شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اس سلسلہ میں ایک مرفوع روایت بھی پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب کسی نبی کی امت ہلاک ہو جاتی تھی تو وہ مکہ مکرمہ آکر اپنا وقت عبادت میں پورا کیا کرتا تھا اور نوح، ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام کی قبریں زمزم اور حجر اسود کے درمیان ہیں ص ۱۳۶ اور ایک ضعیف روایت میں ستر قبروں کا لفظ بھی ہے۔ مگر یہ مرفوع نہیں ہے۔

۱۲۱۵۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَجِیْئُ نُوْحٌ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَاُمَّتُہٗ فَیَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ ھَلْ بَلَّغْتَ فَیَقُوْلُ نَعَمْ اَیْ رَبِّ فَیَقُوْلُ لِاُمَّتِہٖ ھَلْ بَلَّغَکُمْ فَیَقُوْلُوْنَ لَا مَا جَاءَنَا مِنْ نَّبِیٍّ فَیَقُوْلُ لِنُوْحٍ مَنْ یَّشْھَدُ لَکَ فَیَقُوْلُ مُحَمَّدٌ وَّاُمَّتُہٗ فَنَشْھَدُ اَنَّہٗ قَدْ بَلَّغَ وَھُوَ قَوْلُہٗ تَعَالٰی وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا۔ رواہ البخاری

۱۲۱۶۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلَا اُحَدِّثُکُمْ عَنِ الدَّجَّالِ

۱۲۱۵۔ ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت میں جب حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی امت آئیگی تو اللہ تعالیٰ نوح علیہ السلام سے سوال فرمائیگا تم نے پیغام رسالت پہنچا دیا تھا وہ عرض کرینگے میرے پروردگار! جی ہاں۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے سوال کریگا۔ اچھا تم بتاؤ تم کو پیغام پہنچایا تھا۔ وہ کہینگے نہیں، ہمارے پاس تو کوئی نبی نہیں آیا اس پر نوح علیہ السلام سے پوچھا جائیگا آپ کے پاس کوئی گواہ ہے جو آپ کی گواہی دے وہ کہینگے میری گواہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور ان کی امت ہے۔ یہ امت گواہی دیگی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے پیغام رسالت پہنچا دیا تھا قرآن کریم کی حسب ذیل آیت کا مطلب یہی ہے۔ وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا الخ

۱۲۱۶۔ ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا دجال کے متعلق میں

۱۲۱۶۔ حدیث مذکور میں آپ نے دجال کے فتنہ کا بڑی خصوصیت کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے اور اس کی اہمیت کا اظہار اس طرح فرمایا ہے کہ اس عظیم فتنہ کی ہولناکی کی اطلاع ہر نبی نے دی ہے۔ پھر ان انبیاء میں آپ نے حضرت نوح علیہ السلام کا نام خاص طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ خدا کی زمین پر یہی سب سے پہلے رسول تھے بے شبہ

حَدِیْثًا مَا حَدَّثَ بِہٖ نَبِیٌّ قَوْمَہٗ، اِنَّہٗ اَعْوَرُ وَاِنَّہٗ یَجِیْءُ مَعَہٗ بِمِثَالِ الْجَنَّۃِ وَالنَّارِ وَالَّتِیْ یَقُوْلُ عَلَیْہَا الْجَنَّۃَ ہِیَ النَّارُ وَاِنِّیْ اُنْذِرُکُمْ کَمَا اَنْذَرَ بِہٖ نُوْحٌ قَوْمَہٗ. رواہ البخاری

۱۲۱۷۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو یَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ صَامَ نُوْحٌ الدَّہْرَ اِلَّا یَوْمَ الْفِطْرِ وَالْاَضْحٰی وَصَامَ دَاوٗدُ نِصْفَ الدَّہْرِ وَصَامَ اِبْرَاہِیْمُ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ مِنْ کُلِّ شَہْرٍ صَامَ الدَّہْرَ وَاَفْطَرَ الدَّہْرَ۔ رواہ الطبرانی وابن ماجۃ نحوہ وفی اسنادیھما ابن لھیعۃ۔ کذا فی البدایۃ

۱۲۱۸۔ عَنْ سَمُرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ سَامُ اَبُو الْعَرَبِ وَحَامُ

تم کو ایسی صاف بات نہ بتادوں جو کسی نبی نے اپنی قوم کو نہ بتائی ہو۔ دیکھو وہ کانا ہوگا اور اس کے ساتھ دو چیزیں ہونگی جو دیکھنے میں جنت اور دوزخ کے مشابہ ہونگی۔ مگر جس کو وہ جنت کہیگا وہ دراصل دوزخ ہوگی (لہذا جس کو وہ جنت میں داخل کریگا وہ دوزخ میں جائیگا) دیکھو میں تم کو دجال کے فتنہ سے اسی اہمیت کے ساتھ ڈراتا ہوں جیسا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی اُمت کو ڈرایا تھا۔ (بخاری شریف)

۱۲۱۷۔ عبداللہ بن عمروؓ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سُنا ہے کہ نوح علیہ السلام بجز عید و بقرعید کے صوم دہر رکھا کرتے تھے (یعنی ان ایام کے سوا ہمیشہ روزہ رکھتے تھے) اور داؤد علیہ السلام نصف دہر روزہ رکھتے تھے یعنی ایک دن روزہ رکھتے ایک دن افطار کرتے تھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر ماہ میں تین دن روزہ رکھتے تھے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں صوم دہر کے برابر شمار تھا اگرچہ تین دن کے علاوہ ہمیشہ افطار کرتے تھے۔

۱۲۱۸۔ سمرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نوح علیہ السلام کی اولاد میں عرب

ہر شفیق و حریص نبی کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ مستقبل کے فتنوں سے اپنی امتوں کو ڈرایا کرتا ہے خواہ ان کے ظہور کا وقت کچھ بھی ہو آخر قیامت کے تذکرہ سے بھی ہر نبی و رسول نے اپنی اپنی امتوں کو ڈرایا ہے اس کا منشا ان اہم واقعات کے ظہور سے پہلے استعداد عمل ہے۔ لیکن یہ عظیم فتنہ چونکہ آپ ہی کی امت میں ظاہر ہونے والا تھا اس لیے یہ حق آپ ہی کا تھا کہ آپ اس کے متعلق ایسی ایسی واضح علامات بیان فرمادیں جس کے بعد اس کے پہچاننے میں ذرا سا بھی کوئی شبہ نہ رہے۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ اس کے متعلق میں تم سے وہ بات کہتا ہوں جو حضرت نوح علیہ السلام نے بھی نہ فرمائی تھی۔ اس واقعہ کی سیر حاصل تفصیلات آئندہ اوراق میں آپ کے ملاحظہ سے گزرینگی۔ ان شاء اللہ۔

۱۲۱۷۔ آخرت میں ایک نیکی دس کے برابر شمار ہوگی اس لیے تین روزے تیس کے برابر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخشی وہ اس ملت حنیف کے سب سے اولوالعزم رسول کی امت کو بھی بخش دی اس لیے صوم دہر کی فضیلت حاصل کرنے کی ایک صورت حدیثا میں ہر ماہ میں تین روزے رکھنا بھی آئی ہے۔

۱۲۱۸۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں روم سے مراد روم اول ہے جس کو یونان کہتے ہیں ان کا نسب نامہ یہ ہے۔

أَبُو الْحَبَشِ وَيَافِثُ أَبُو الرُّومِ ۔ رواہ امام احمد و الترمذی نحوہ

سام کی اور حبش حام کی اور روم یافث کی نسل سے ہیں۔ (ترمذی)

رومی بن لیطی بن یونان بن یافث بن نوح علیہ السلام۔ اس کے بعد حضرت ابوہریرۃؓ سے ایک مرفوع روایت پیش کی ہے کہ عرب، فارس اور روم یہ سام کی اولاد ہیں اور ان میں خیر رہیگی۔ اور یاجوج ماجوج ترک اور سقالبہ یافث کی اولاد ہیں اور ان میں خیر کا نام نہ ہوگا اور قبط و بربر اور سودان یہ حام کی اولاد ہیں۔ مگر حافظ موصوف نے اس روایت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول تسلیم نہیں کیا اور فرمایا ہے کہ سعید بن المسیب کا قول ہے۔ حام و سام و یافث کے متعلق بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ تینوں طوفان کے بعد کی پیدائش ہیں مگر حافظ موصوف نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور طوفان سے قبل کی پیدائش قرار دیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ تورات کی تصریح کے مطابق ان تینوں کا کشتی میں موجود ہونا ثابت ہے۔ حافظ موصوف فرماتے ہیں کہ موجودہ بسیط ارض کی تمام آبادی صرف ان تین ہی کی نسل سے ہے (ص ۱۱۵ البدایۃ) جو لوگ یہاں اختلاف رکھتے ہیں وہ طوفان نوح علیہ السلام کے عام ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن حافظ ابن کثیر اس نظریہ سے متفق نہیں ہیں۔

سیدنا ھود علیہ الصلوٰۃ والسلام

حسب بیانِ حافظ ابن کثیر ان کا نسب نامہ یہ ہے۔ ہود بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح علیہ السلام۔ ان کے نسب میں اس کے علاوہ بھی اور چند اقوال ہیں۔ حضرت ابوذر کی روایات کی بناء پر چار عربی انبیاء میں سے یہ پہلے عربی نبی ہیں۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے عربی بولنے والے نبی یہی تھے۔ مگر حافظ ابن کثیرؒ کا میلان اس طرف ہے کہ وہ حضرتِ آدم علیہ السلام تھے۔ ان کا قبیلہ عاد بن عوص بن سام بن نوح علیہ السلام تھا۔ تاریخ میں ان کو عاد اولیٰ کہا جاتا ہے۔ عاد ثانیہ ان کے بعد ہوئے ہیں۔ اور آیۃ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ میں انہی کا تذکرہ ہے۔ طوفانِ نوح کے بعد سب سے پہلے انہوں نے ہی بت پرستی شروع کی تھی۔ ان کے بتوں کے نام صدا و صمود اور ھرا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور جب انہوں نے سرکشی کی راہ نہ چھوڑی تو عذاب الٰہی سے نیست و نابود کر دیے گئے۔

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ان کی قبر بلاد یمن میں ہے کوئی کہتا ہے کہ دمشق میں ہے اور دمشق کی کی جامع مسجد کی قبلہ کی دیوار کی طرف ایک قبر ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہی ہود علیہ السلام کی قبر ہے۔

البدایۃ ص ۱۳۰ ج ۱

۱۲۱۹۔ عَنْ اَبِیْ وَائِلٍ عَنِ الْحَارِثِ وَھُوَ ابْنُ حسان ویقال ابن یزید البکری قَالَ خَرَجْتُ اَشْکُو الْعَلَاءَ بْنَ الْحَضْرَمِیِّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَمَرَرْتُ بِالرَّبَذَۃِ فَاِذَا عَجُوْزٌ مِنْ بَنِیْ تَمِیْمٍ مُنْقَطِعٌ بِھَا فَقَالَتْ یَا عَبْدَ اللّٰہِ اِنَّ لِیْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَاجَۃً فَھَلْ اَنْتَ مُبْلِغِیْ اِلَیْہِ قَالَ فَحَمَلْتُھَا فَاَتَیْتُ الْمَدِیْنَۃَ فَاِذَا الْمَسْجِدُ غَاصٌّ بِاَھْلِہٖ وَاِذَا رَایَاتٌ سُوْدٌ تَخْفِقُ وَاِذَا بِلَالٌ مُتَقَلِّدُ السَّیْفِ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ مَا شَاْنُ النَّاسِ قَالُوْا یُرِیْدُ اَنْ یَبْعَثَ عَمْرَو بْنَ الْعَاصِ وَجْھًا قَالَ فَجَلَسْتُ قَالَ فَدَخَلَ مَنْزِلَہٗ اَوْ قَالَ رَحْلَہٗ فَاسْتَاْذَنْتُ عَلَیْہِ فَاَذِنَ لِیْ فَدَخَلْتُ فَسَلَّمْتُ فَقَالَ فَھَلْ کَانَ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَ بَنِیْ تَمِیْمٍ شَیْءٌ فَقُلْتُ نَعَمْ وَکَانَتْ لَنَا الدَّبَرَۃُ عَلَیْھِمْ وَمَرَرْتُ بِعَجُوْزٍ مِنْ بَنِیْ تَمِیْمٍ مُنْقَطِعٍ بِھَا فَسَاَلَتْنِیْ اَنْ اَحْمِلَھَا اِلَیْکَ وَھَا ھِیَ بِالْبَابِ فَاَذِنَ لَھَا فَدَخَلَتْ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنْ رَاَیْتَ اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَبَیْنَ بَنِیْ تَمِیْمٍ حَاجِزًا فَاجْعَلِ الدھنا فَاِنَّھَا

۱۲۱۹۔ حارث روایت کرتے ہیں کہ میں علاء بن حضرمی کی شکایت لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرا گزر جب مقام ربذہ سے ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں بنی تمیم قبیلہ کی ایک بوڑھی عورت ہے جو سواری نہ ہونے کی وجہ سے سفر سے رہ گئی ہے۔ اُس نے کہا اے اللہ کے بندے! مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ کام ہے۔ کیا تم اتنا کرو گے کہ مجھ کو ان تک پہنچا دو۔ یہ کہتے ہیں میں نے اس کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ جب مدینہ میں داخل ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ مسجد شریف لوگوں سے بھری ہوئی ہے اور سیاہ جھنڈے ہوا میں لہرا رہے ہیں ادھر حضرت بلالؓ تلوار لگائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہیں میں نے پوچھا یہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ عمرو بن العاص صحابی کو کسی مہم پر روانہ کرنا ہے۔ یہ کہتے ہیں میں بیٹھ گیا اتنی دیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تشریف لے گئے۔ میں نے حاضری کے لیے اجازت طلب کی۔ آپ نے اجازت دیدی، میں اندر حاضر ہوا اور سلام بجا لایا۔ آپ نے فرمایا کہو تمہارے اور بنی تمیم کے درمیان کوئی قصہ پیش آگیا ہے۔ میں نے عرض کی جی ہاں۔ ہمارا ایک نشیبی زمین کے بارے میں ان پر دعویٰ ہے نیز راستہ میں مجھ کو ایک بوڑھی عورت ملی جس کے پاس سواری نہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کو آپ کی بارگاہ تک پہنچا دوں۔ تو وہ دروازہ پر حاضر ہے۔ آپ نے اس کو بھی اجازت دیدی اور وہ بھی اندر آگئی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مہربانی فرما کر ہمارے اور بنی تمیم کے درمیان ایک حد فاصل مقرر فرما دیں اور اگر مناسب خیال فرمائیں تو مقام "دہنا" مقرر فرما دیں کیونکہ یہ مقام

كَانَتْ لَنَا قَالَ فَحَمِيَتِ الْعَجُوزُ وَاسْتَوْفَزَتْ وَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ فَإِلَى أَيْنَ تَضْطَرُّ مُضَرُكَ فَقُلْتُ إِنَّ مَثَلِي مَا قَالَ الْأَوَّلُ (مِعْزَى حَمَلَتْ حَتْفَهَا) حَمَلْتُ هٰذِهِ الْأَمَةَ وَلَا أَشْعُرُ أَنَّهَا كَانَتْ لِي خَصْمًا أَعُوذُ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ أَنْ أَكُونَ كَوَافِدِ عَادٍ قَالَ هِيهِ وَمَا وَافِدُ عَادٍ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْحَدِيثِ مِنْهُ وَلٰكِنْ يَسْتَطْعِمُهُ قُلْتُ إِنَّ عَادًا قُحِطُوا فَبَعَثُوا وَفْدَ الَهُمْ يُقَالُ لَهُمْ قَيْلٌ فَمَرَّ بِمُعَاوِيَةَ بْنِ بَكْرٍ فَأَقَامَ عِنْدَهُ شَهْرًا يَسْقِيهِ الْخَمْرَ وَيُغَنِّيهِ جَارِيَتَانِ يُقَالُ لَهُمَا الْجَرَادَتَانِ فَلَمَّا مَضَى الشَّهْرُ خَرَجَ إِلَى جِبَالِ تِهَامَةَ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَعْلَمُ إِنِّي لَمْ أَجِيءْ إِلَى مَرِيضٍ فَأُدَاوِيَهُ وَلَا إِلَى أَسِيرٍ فَأُفَادِيَهُ اَللّٰهُمَّ اسْقِ عَادًا مَا كُنْتَ تَسْقِيهِ فَمَرَّتْ بِهِ سَحَابَاتٌ سُودٌ فَنُودِيَ مِنْهَا اخْتَرْ فَأَوْمَأَ إِلَى سَحَابَةٍ مِنْهَا سَوْدَاءَ فَنُودِيَ خُذْهَا رَمَادًا رِمْدِدًا لَا تُبْقِي مِنْ عَادٍ أَحَدًا قَالَ فَمَا بَلَغَنِي أَنَّهُ بُعِثَ عَلَيْهِمْ مِنَ الرِّيحِ إِلَّا كَقَدْرِ مَا يَجْرِي

ہمارا ہی تھا۔ یہ سُن کر عورت گرم ہوگئی اور جلدی سے بولی یا رسول اللہ تو پھر یہ آپ کا قبیلہ مضر کدھر جائیگا۔ اس کی گفتگو سُن کر میں نے کہا میری مثال تو وہی ہوگئی جو پہلوں نے کہا تھا کہ "بکری اپنی موت خود اپنے ساتھ لائی" میں اس عورت کو خود ساتھ لے کر آیا تھا، مجھ کو یہ کیا خبر تھی کہ یہی میرے مخالف بولیگی۔ میں اللہ اور اس کے رسول کی پناہ لیتا ہوں کہ میرا حشر وہ نہ ہو جو "وافد عاد" کا ہوا تھا۔ یہ جملہ سُن کر آپ نے فرمایا۔ خوب! جانتے بھی ہو وافد عاد کا قصہ کیا تھا۔ گو اس قصہ کو آپ اُن سے زیادہ خود جانتے تھے مگر آپ نے چاہا کہ ان سے بھی سنیں۔ یہ کہتے ہیں میں نے عرض کی کہ ایک بار قوم عاد قحط میں مبتلا ہوئی تو انھوں نے اپنے دستور کے مطابق "قیل" کو اپنی جانب سے وفد کا سردار مقرر کرکے مکہ مکرمہ دعا کے لیے بھیجا۔ اس شخص کا گزر اپنے دوست معاویہ بن بکر کے پاس ہوا یہ اس کے پاس ایک ماہ ٹھہرا رہا، وہ اس کو شراب پلاتا اور اس کے یہاں دو گانے والی لونڈیاں تھیں جن کو "جرادتان" کہا جاتا تھا، ان کا گانا سنواتا (جب اس کے قیام کی مدت دراز ہوتی گئی تو اس کو اپنی قوم کے حال زار پر ترس آیا مگر زبان سے بھلا کیا کہہ سکتا تھا اس لیے ان گانے والیوں سے کہا کہ آج گانے میں اپنی قوم کے قحط کا نقشہ گائیں یہ سُن کر) ایک ماہ بعد اس کو اپنی قوم کا خیال آیا اور وہ تہامہ کی پہاڑوں کی طرف دعا کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ اور یہ دعا کی۔ الٰہی تو جانتا ہے کہ میں نہ تو کسی بیمار کی دوا دارو کے لیے آیا ہوں اور نہ فدیہ دے کر کسی قیدی کو چھڑانے کے لیے آیا ہوں، میں تو اپنی قوم عاد کے لیے بارش مانگنے آیا ہوں تو جو کچھ تجھ کو ان کو پلانا ہے وہ پلا دے۔ اس دعا کے بعد ہی اس کے سامنے سے سیاہ سیاہ بادل گزرے اور آواز آئی کہ ان میں سے جس کو دل چاہے پسند کرلے اُس نے کالے کالے ایک بادل کی طرف اشارہ کیا

إِنِّي خَائِفٌ هٰذَا مِنَ الرِّيحِ حَتّٰى هَلَكُوا قَالَ اَبُوْ وَائِلٍ وَصَدَقَ وَكَانَتِ الْمَرْأَةُ وَالرَّجُلُ إِذَا بَعَثُوا وَفْدًا لَهُمْ قَالُوا لَا تَكُنْ كَوَافِدِ عَادٍ. هكذا رواه الترمذی عن عبد بن حميد عن زيد بن الحباب به ورواه النسائی من حديث سلام ابی المنذر عن عاصم بن بهدلة ومن طريقه رواه ابن ماجة وهكذا اورد هذا الحديث وهذه القصة عند تفسير هذه القصة غير واحد من المفسرين كابن جرير وغيره وقد يكون هذا السياق لاهلاك عاد الآخرة.

(اور یہ سمجھا کہ اس میں بہت پانی ہوگا) آواز آئی لیجا جلی بھونکی راکھ جو قوم میں سب کا خاتمہ کردے۔ یہ کہتے ہیں کہ جو بات مجھ کو پہنچی یہ ہے کہ اُن پر ہوا کا عذاب آیا جس سے وہ سب ہلاک و برباد ہو کر رہ گئے حالانکہ وہ عذاب کی ہوا ان پر صرف اتنی سی چھوڑی گئی تھی اور اشارہ کرکے بتایا کہ جتنی میری اس انگوٹھی کے حلقہ سے نکل سکے۔ ابو وائل کہتے ہیں انہوں نے یہ درست کہا۔ اس کے بعد یہ مثل بن گئی کہ جب کوئی مرد یا عورت کسی کو اپنا وفد بنا کر بھیجتے تو یہ کہہ دیتے، دیکھنا کہیں وافد عاد کی طرح نہ ہو جانا جو گیا تو تھا بارش کے لیے اور لایا عذاب۔ ترمذی شریف و ابن ماجہ

۱۲۱۹- ابن کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اس روایت کو بہت سے مفسرین نے عاد اولیٰ کی ہلاکت کے سلسلہ میں بیان کیا ہے حالانکہ یہ واقعہ بظاہر عاد ثانیہ کا ہے۔ کیونکہ اول تو اس واقعہ میں مکہ مکرمہ کا ذکر ہے اور عاد اولیٰ کے زمانہ میں اس کی بنا ہی نہیں ہوئی تھی اس کو بعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا ہے اور عاد اولیٰ ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ نیز اس میں معاویہ بن بکر اور اس کے اشعار کا ذکر بھی موجود ہے یہ اشعار عاد اولیٰ کے ذوق سے ملتے جلتے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ ذوق بعد کے لوگوں کا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس قصہ کے الفاظ میں یہ بھی منقول ہے کہ اس بادل میں آگ اور چنگاریاں نظر آئی تھیں، حالانکہ عاد اولیٰ ہوا کے عذاب سے ہلاک کیے گئے تھے اور ابن مسعودؓ اور عباسؓ اور بہت سے تابعین سے منقول ہے کہ یہ ہوا نہایت سرد تھی۔ ان وجوہات کی بنا پر عاد اولیٰ کی تفسیر میں اس روایت کا تذکرہ چسپاں نہیں ہے۔ البدایہ ص۱۲۵ ج۱ اس سلسلہ کی حدیث ترجمان السنۃ ص۲۲ میں گزر چکی ہے۔

سَیِّدُنَا صَالِحٌ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

ان کا نسب نامہ یہ ہے صالح بن عبد بن ماسح بن عبید بن حاجر بن ثمود بن عابر بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام اس نسب نامہ کے لحاظ سے حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود میں سے تھے ان کی قوم کو ثمود اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کے جد اعلیٰ ثمود تھے۔ ان کا مقام سکونت "حجر" تھا جو حجاز و تبوک کے درمیان واقع ہے۔ قوم ثمود کی عمریں بہت طویل ہوتی تھیں۔ جب یہ رہائش کے لیے کوئی مکان بناتے تو وہ ایک شخص کی عمر کو بھی کافی نہ ہوتا اور اسی کی حیات میں ڈھیر ہو کر گر جاتا۔ اس لیے پہاڑوں کو کھود کر انہوں

نے مکانات بنانے شروع کردیے تھے۔

ایک دن حضرت صالح علیہ السلام ان کو وعظ و نصیحت فرما رہے تھے تو ان کی قوم نے یہ فرمائش کی کہ اگر آپ اس پتھر سے ان ان صفات کی ایک ناقہ نکال دیں تو ہم آپ کو مان لینگے۔ ان کی دعا سے پتھر پھٹا اور اس میں سے ان ہی کی مطلوبہ صفات کی ایک ناقہ برآمد ہوگئی۔ اس پر ایک جماعت تو ایمان لے آئی مگر اکثر افراد بدستور اپنے کفر پر قائم رہے۔ ایمان قبول کرنے والی جماعت کے سردار کا نام جندع بن عمر بن لبید تھا۔ چونکہ یہ فیصلہ پہلے ہو چکا تھا کہ جس دن یہ ناقہ پانی پیئیگی اس دن قوم کا کوئی فرد کنوئے سے پانی نہیں لے سکیگا۔ اس لیے اس دستور کے مطابق ایک مدت تک یہی عمل چلتا رہا آخر اس میں ان کو تنگی محسوس ہونے لگی اور ان کے رئیس قدار بن سالف نے اپنی قوم کے مشورہ سے اس ناقہ کو زخمی کرکے مار دیا۔ اور اسی کی پاداش میں عذاب الٰہی سے ہلاک کردی گئی۔ دیکھو البدایۃ والنہایۃ۔

اب رہا یہ سوال کہ ناقہ پتھر سے کیسے پیدا ہوئی تو ہرچند کہ یہاں کوئی قرآنی بیان نہیں ہے تاہم کتب محدثین سے جو صورت یہاں منقول ہے اس کی تکذیب کی بھی کوئی وجہ ہمارے سامنے نہیں ہے بالخصوص جبکہ قرآن کریم نے اس کو معجزہ کہا ہے اور معجزات کا اپنی حقیقت کے لحاظ سے اس قسم کے عجائبات پر مشتمل ہونا کوئی جدید بات نہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ جن تفصیلات کی تصدیق کے لیے اجمالی سامان موجود ہو اور ان کی تکذیب کے لیے کوئی دلیل نہ ہو تو اس کو صرف اپنی عقل کی بناء پر ہر جگہ ساقط الاعتبار قرار نہیں دینا چاہیے۔ موسیٰ علیہ السلام کے عصا کی ایک ضرب سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلنا اور پتھر پھٹ کر ناقہ کا نکل آنا دونوں باتیں خلاف عادت ہیں اور قدرت کے سامنے دونوں یکساں ممکن ہیں، اس لیے ان کے انکار و تردد کی یہاں کوئی وجہ نہیں ہے۔

۱۲۲۰۔ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ زَمْعَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَ النَّاقَۃَ وَ ذَکَرَ الَّذِیْ عَقَرَھَا فَقَالَ (اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰھَا) اِنْبَعَثَ لَھَا رَجُلٌ مِنْ عَارِمٍ عَزِیْزٍ مَنِیْعٍ فِیْ رَھْطِہٖ مِثْلُ اَبِیْ زَمْعَۃَ (رواہ الامام احمد) اخرجاہ من حدیث ھشام کذا فی البدایۃ ص۱۳۵

۱۲۲۰۔ عبداللہ بن زمعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ذکر فرمایا اور جس نے اس کو زخمی کرکے ہلاک کیا تھا اس کا بھی ذکر فرمایا جس کا تذکرہ قرآن شریف کی اس آیت میں کیا گیا ہے "اذ انبعث اشقاھا" فرمایا یہ شخص اپنی قوم میں بڑا معززاور سردار تھا۔ جیسا مکہ مکرمہ میں یہ ابو زمعہ ہے۔ احمد

۱۲۲۱- عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ لَمَّا مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْحِجْرِ قَالَ لَا تَسْئَلُوا الْاٰيَاتِ فَقَدْ سَأَلَهَا قَوْمُ صَالِحٍ فَكَانَتْ يَعْنِي هٰذِهِ النَّاقَةَ تَرِدُ مِنْ هٰذَا الْفَجِّ وَتَصْدُرُ مِنْ هٰذَا الْفَجِّ (فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَعَقَرُوْهَا) وَكَانَتْ تَشْرَبُ مَاءَهُمْ يَوْمًا وَيَشْرَبُوْنَ لَبَنَهَا يَوْمًا فَعَقَرُوْهَا فَاَخَذَتْهُمْ صَيْحَةٌ اَهْمَدَ اللّٰهُ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ مِنْهُمْ اِلَّا رَجُلًا وَاحِدًا كَانَ فِيْ حَرَمِ اللّٰهِ فَقَالُوْا مَنْ هُوَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ هُوَ اَبُوْ رِغَالٍ فَلَمَّا خَرَجَ

۱۲۲۱- جابر بیان فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام حجر سے گزرے تو فرمایا معجزات کی فرمائش نہ کرنا۔ صالح علیہ السلام کی قوم نے معجزہ کی فرمائش کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی فرمائش کے مطابق ان کو اونٹنی دیدی گئی جو ایک راستہ سے گھاٹ پر پانی پینے آتی اور پانی پی کر دوسرے راستہ سے لوٹ جاتی تھی۔ مگر انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم کا مقابلہ کیا اور اس کو زخمی کر ڈالا طریقہ یہ تھا کہ ایک دن اونٹنی ان کے حصہ کا پانی پیا کرتی (اس دن پانی میں ان کا کوئی حق نہ تھا) اور ایک دن وہ اس کا دودھ پیتے۔ آخر ایک چنگھاڑ کے عذاب نے ان کو پکڑ لیا اور آسمان کے نیچے ان کا جو فرد بھی تھا اللہ تعالیٰ نے سب کو فنا کر دیا۔ صرف ایک شخص بچ رہا جو اس وقت حرم کی زمین میں موجود تھا۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ وہ کون شخص تھا۔ آپ نے فرمایا وہ ابورغال تھا پھر جب

۱۲۲۱- اس صورت سے ارض حرم کا احترام بھی اپنی جگہ باقی رہا اور عذاب مقدر سے پھر جان چھوٹ نہ سکی۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ پاداش عمل کسی باعث سے گو موخر ہو جائے مگر آخر کار بھگتنی ہی پڑتی ہے اس لیے تھوڑی تاخیر سے مغرور نہ ہونا چاہیے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر قدرت کے متعارض قوانین میں تطبیق کی صورت خود قدرت ہی کے علم میں ہوتی ہے۔ یہاں عقلی گھوڑے دوڑانے غلط ہیں۔ اب دیکھیے "من دخلہ کان آمنا" کا اقتضاء یہ تھا کہ ابورغال امن میں رہتا لو قومی عذاب کا تقاضا یہ تھا کہ وہ عذاب اس پر بھی آتا مگر علم الٰہی میں ان دونوں میں توافق کی صورت کیا تھی یہ پہلے سے کس کو معلوم تھا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ رزق کی طرح رحمت وعذاب کا بھی ایک حصہ رسد ہوتا ہے جو مل کر رہتا ہے پھر اس کے ملنے کے لیے قدرت کیا پیرایہ اختیار کرتی ہے یہ ہمارے علم سے باہر بات ہے۔ لہٰذا نہ تو بداعمالی پر مواخذہ نہ ہونے سے بے خوف ہونا چاہیے اور نہ نیک چلنی پر انعامات نہ ملنے سے مایوس ہونا چاہیے۔ ہر عمل کے بدلے کے لیے ایک وقت ہے بس اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ اسی لیے قرآن میں فرمایا ہے: فانتظر انھم منتظرون!

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون   اور ظالم عنقریب جان لیں گے کہ کس کروٹ الٹتے ہیں۔

لکل نبا مستقر فسوف تعلمون   ہر ایک خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہو جائیگا۔

حدیث مذکور کی روشنی میں اب اس پر غور کر لینا چاہیے کہ جس طرح معذب مقامات میں آثار عذاب مسلسل رہتے ہیں اسی طرح متبرک مقامات میں آثار برکت و رحمت بھی مسلسل رہنے چاہئیں اور جس طرح کہ معذب مقامات میں عذاب الٰہی کی گرفت کا خطرہ ہوتا ہے اسی طرح مقامات برکت و رحمت میں قیام سے رحمت کا امیدوار بھی رہنا چاہیے اور جس طرح کہ معذب

مِنَ الْحَرَمِ اَصَابَہٗ مَا اَصَابَ قَوْمَہٗ. قال ابن کثیر ھذا الحدیث علی شرط مسلم ولیس ھو فی شیٔ من الکتب الستۃ. البدایۃ ص ۱۳۷

۱۲۲۲۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ لَمَّا نَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالنَّاسِ عَلٰی تَبُوْکَ نَزَلَ بِہِمُ الْحِجْرَ عِنْدَ بُیُوْتِ ثَمُوْدَ فَاسْتَقَی النَّاسُ مِنَ الْاٰبَارِ الَّتِیْ کَانَتْ تَشْرَبُ مِنْہَا ثَمُوْدُ فَعَجَنُوْا مِنْہَا وَنَصَبُوا الْقُدُوْرَ فَاَمَرَھُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَھْرَاقُوا الْقُدُوْرَ وَعَلَفُوا الْعَجِیْنَ لِلْاِبِلِ ثُمَّ ارْتَحَلَ بِہِمْ حَتّٰی نَزَلَ بِہِمْ عَلَی الْبِئْرِ الَّتِیْ کَانَتْ تَشْرَبُ مِنْہَا النَّاقَۃُ وَنَہَاھُمْ اَنْ یَدْخُلُوْا عَلَی الْقَوْمِ الَّذِیْ عُذِّبُوْا اِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ یُصِیْبَکُمْ مِثْلُ مَا اَصَابَہُمْ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَیْہِمْ. (رواہ الامام احمد)

۱۲۲۳۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ بِالْحِجْرِ

وہ حرم کی زمین سے نکلا تو جو عذاب اس کی قوم پر آیا تھا وہی اس پر ٹوٹ پڑا۔ (مسند احمد)

۱۲۲۲۔ ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کو جاتے ہوئے جب وادی حجر سے گزرے جہاں ثمود کی (ویران شدہ) بستیاں تھیں تو لوگوں نے جن کنوؤں سے کہ قوم ثمود پانی پیا کرتی تھی ان ہی سے پانی پینا شروع کیا، اسی کے پانی سے آٹے گوندھ لیے اور ہانڈیاں چڑھا دیں جب آپ کو یہ خبر ہوئی تو آپ نے حکم دیا سب ہانڈیاں اُلٹ دی جائیں۔ آپ کے حکم پر فوراً ہانڈیاں گرا دی گئیں اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد آگے چلے اور جب اس کنوئے سے گزرے جس سے کہ خاص صالح علیہ السلام کی ناقہ پانی پیا کرتی تھی تو آپ نے صحابہ کرام کو عذاب شدہ قوموں کی بستیوں کے اندر داخل ہونے سے منع فرمایا، اور ارشاد فرمایا مجھ کو اندیشہ ہے کہ جو عذاب ان پر آیا ہے کہیں اس کی لپیٹ میں تم بھی نہ آجاؤ، لہٰذا ایسی بستیوں میں داخل ہی نہ ہو۔ (احمد)

۱۲۲۳۔ ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ وادی حجر سے گزرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مقامات کی آب وہوا اور غذا مسموم ہوتی ہے اسی طرح رحمت کے مقامات کی آب وغذا بھی متبرک ہونی چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں سے اور آپ کے جھوٹے پانی سے اُمت ہمیشہ برکت حاصل کرتی رہی ہے یہ بات معلوم ہے کہ عوام کے عقیدہ کے فساد کے خطرہ سے کوئی عمل مصلحۃً اختیار نہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے دو دروازے بنانے کا ارادہ فرمایا تھا مگر مصلحۃً اس کو ترک فرما دیا پس مسئلہ اور مصلحت دونوں کی رعایت لازم ہے اور یہی وہ دقیق مقام ہے جہاں اکثر لغزش ہو جاتی ہے یعنی ان دونوں کے درمیان پورا توازن قائم نہیں رہتا اور کبھی مصلحت کی رعایت اتنی ہو جاتی ہے کہ مسئلہ کے خلاف ہو جاتا ہے اور کبھی مسئلہ کی جانب اتنی نظر ہوتی ہے کہ مصلحت بالکل نظرانداز ہو جاتی ہے۔ صحیح راہ اعتدال ہی کی ہے۔

۱۲۲۲۔ یہ عالم غیب کی ایک بڑی حقیقت کی طرف اشارہ تھا۔ عام آنکھیں صرف ان بستیوں کو دیکھتی تھیں اور خیال یہی

لَا تَدْخُلُوْا عَلٰى هٰؤُلَاءِ الْمُعَذَّبِيْنَ اِلَّا اَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ فَاِنْ لَمْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَيْهِمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِثْلُ مَا اَصَابَهُمْ. (رواه الامام احمد) اخرجاه فی الصحیحین من غیر وجه وفی بعض الروایات انه علیه السلام لَمَّا مَرَّ بِمَنَازِلِهِمْ قَنَّعَ رَأْسَهُ وَاَسْرَعَ رَاحِلَتَهُ وَنَهٰى عَنْ دُخُوْلِ مَنَازِلِهِمْ اِلَّا اَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ وَفِیْ رِوَايَةٍ فَاِنْ لَمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكُوْا خَشْيَةَ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِثْلُ مَا اَصَابَهُمْ.

۱۲۲۴ - قَالَ مَعْمَرٌ اَخْبَرَنِیْ اِسْمٰعِيْلُ بْنُ اُمَيَّةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِقَبْرِ

دیکھو ان عذاب شدہ بستیوں میں داخل نہ ہونا۔ مگر گریہ وزاری کرتے ہوئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر ان میں داخل نہ ہونا کہیں تم بھی اسی عذاب کے لپیٹ میں نہ آجاؤ جوان کو ہو رہا ہے۔ احمد شیخین

بعض روایات میں اس طرح ہے کہ جب آپ ان کی بستیوں سے گزرے تو اپنا سر مبارک جھکا لیا اپنی اونٹنی تیز کردی اور صحابہ کرام کو منع فرمایا کہ ان بستیوں کے اندر نہ جائیں، مگر گریہ وزاری کے ساتھ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم گریہ وزاری کی صورت ہی بنالیں۔ مبادا جو عذاب ان کو ہے کہیں تم بھی اس کے لپیٹ میں آجاؤ۔

۱۲۲۴ - اسماعیل بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابو رغال کی قبر سے گزر ہوا

ہوتا تھا کان بستیوں پر کبھی عذاب آیا تھا اور اب ختم ہو گیا مگر صاحب نبوت نے تنبیہ فرمائی کہ معذب مقامات ہمیشہ معذب ہی رہتے ہیں اور جس طرح وبائی آب وہوا میں تندرست آدمی بھی جاتے ہوئے خوف کھاتا ہے اسی طرح معذب بستیوں میں سیر و تفریح کے لیے جانا بڑی غلطی ہے یہ تفریح کے مقامات نہیں۔ یہ بڑے خوف اور بڑی عبرت کے مقامات ہیں۔ ان فضاؤں میں عذاب الٰہی کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہے اس لیے سیر و تفریح کے بجائے یہاں صورت عجز وانکسار اور خوف وخشیت کی بنانی چاہیے اور اس ماحول کی اشیاء بھی استعمال میں لانی نہیں چاہئیں اور ان سے اسی طرح پرہیز کرنا چاہیے جس طرح کہ وبائی علاقوں کی اشیاء سے دنیا آج پرہیز کرتی ہے۔ وبائی امراض سے حفاظت میں آج تو اتنا مبالغہ ہے کہ خارجی ممالک کے سفر کے لیے بھی مختلف قسم کے انجکشن اور ذرا سی بات پر قرنطینہ لازم قرار دیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہی محتاط دماغ جب ان معذب مقامات سے گزرتے ہیں تو یہاں احتیاط کرنا مذہبی وہم پرستی سمجھتے ہیں۔

اسی طرح مسرت وسرور کے حالات ہیں جن میں کہ شیطان نخوت وغرور کا نشہ پیدا کر سکتا ہے تواضع وانکسار میں ڈوب جانا چاہیے، کہیں ہوا کا رُخ پھر نہ پلٹ جائے اسی لیے بنی اسرائیل کو یہ حکم ہوا تھا کہ بیت المقدس میں جب داخل ہوں تو تواضع وعاجزی کی شکل بنا کر سر جھکائے ہوئے داخل ہوں مگر اس متمرد قوم نے اس کے برعکس ہی کیا۔ اسی سنت کے مطابق جب مکہ فتح ہوا اور جس مقام سے مسلمان کبھی بڑی کس مپرسی سے نکالے گئے تھے آج پھر بڑی شان سے فاتحانہ داخل ہو رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تواضع کا عالم یہ تھا کہ اونٹنی پر سوار تھے اور مارے تواضع کے سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ ریش مبارک کے بال کجاوہ کی لکڑی سے جا جا لگتے تھے۔ دیکھو البدایۃ والنہایۃ ص۲۹۳

أَبِي رِغَالٍ فَقَالَ أَتَدْرُونَ مَنْ هٰذَا؟ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ هٰذَا قَبْرُ أَبِي رِغَالٍ رَجُلٌ مِنْ ثَمُودَ كَانَ فِي حَرَمِ اللّٰهِ فَمَنَعَهُ حَرَمُ اللّٰهِ عَذَابَ اللّٰهِ فَلَمَّا خَرَجَ أَصَابَهُ مَا أَصَابَ قَوْمَهُ فَدُفِنَ هٰهُنَا وَدُفِنَ مَعَهُ غُصْنٌ مِنْ ذَهَبٍ فَنَزَلَ الْقَوْمُ فَابْتَدَرُوهُ بِأَسْيَافِهِمْ فَبَحَثُوا عَنْهُ فَاسْتَخْرَجُوا الْغُصْنَ. رواه عبد الرزاق. قال ابن كثير هذا مرسل من هذا الوجه وقد جاء من وجه آخر متصلا كما رواه ابوداؤد ويحتمل ان يكون رفعه وهم لكن فی هذا المرسل وفی حدیث جابر شاهد له. كذا فی البداية ص ۱۳۷ ج ۱

توآپ نے فرمایا۔ جانتے ہو یہ کس کی قبر ہے؟ لوگوں نے عرض کی اللہ اور اس کے رسول ہی کو اس کا علم ہے۔ فرمایا یہ قبر ابو رغال کی ہے۔ یہ شخص بھی قوم ثمود کا ایک فرد تھا۔ جب ثمود پر اللہ کا عذاب آیا تھا تو یہ اس وقت حرم کی زمین میں موجود تھا۔ خدائی حرم کی وجہ سے اس وقت تو عذابِ الٰہی سے محفوظ رہا۔ بس حرم الٰہی سے اس کا نکلنا تھا کہ جو عذاب اس کی قوم پر آیا تھا اسی نے اس کو آ پکڑا اور وہ بھی ہلاک ہوگیا۔ اور جب دفن کیا گیا تھا تو اس کے ساتھ سونے کی ایک شاخ بھی دفن ہوگئی تھی۔ یہ سن کر لوگ لپکے اور اپنی تلواروں سے اس کی قبر کھود ڈالی دیکھا تو سونے کی وہ شاخ موجود تھی چنانچہ اس کو نکال لیا۔ عبدالرزاق

سَیِّدُنَا اِبْرَاهِیْمُ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ خَلِیْلُ اللّٰہِ وَجَدُّ سَیِّدِنَا حَبِیْبِ اللّٰہِ عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت تمام انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بہت سی حیثیات سے نمایاں ہے اور اس عالم سے لے کر عالم آخرت تک اپنی گوناگوں خصوصیات سے معمور ہے ان کے بعد نبوت کا ان کی ذریت میں منحصر ہوجانا خود قرآن کریم کا بیان ہے۔ انبیاء علیہم السلام گو سب حنیف تھے مگر یہاں بھی ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ان کی ملت کا نام ہی حنیفیہ ہے۔ اس جگہ ترجمان السنۃ ص ۵۲۶ ج ۱ حدیث ۱۳۱۳ اور اس کا تشریحی نوٹ ضرور ملاحظہ فرمالیں۔ شریعت محمدیہ کی زمین ملت حنیفیہ ہی ہے ہم نے پہلے چالیس وہ احکام نقل کردیے ہیں جو دونوں شریعتوں میں مشترک ہیں۔ اس کے بعد ابن قتیبہ کی مشہور کتاب تاویل مختلف الحدیث ہماری نظر سے گزری اس میں چند اور مشترک احکام کی فہرست سامنے آئی مثلاً قرابت وصہر کے رشتہ سے محرمات ایک اور دو طلاق کے بعد شوہر کو رجعت کا حق رہنا نفس کی دیت سو اونٹ ہونا۔ جنابت سے غسل کرنا اور خنثیٰ میں مذکر و مونث کی غالب علامت کا اعتبار کرنا۔ دیکھو تاویل مختلف

الاحادیث ص۱۳۵ اس لحاظ سے اب مشترک احکام کی تعداد چالیس کی بجائے پینتالیس ہو جائیگی۔

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں عبادت اصنام یعنی بت پرستی اور کواکب پرستی کی عام وبا پھیلی ہوئی تھی اور کفر کا اس درجہ غلبہ ہو چکا تھا کہ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام، ان کی بیوی اور ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی کلمہ گو موجود نہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ کے لیے ان کو مبعوث فرمایا۔ اس سلسلہ میں بادشاہوں کے ساتھ ان کے مناظرے قوموں کی تفہیم اور جابجا اثبات توحید اور ابطال شرک کے قاہرانہ براہین کا تذکرہ خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ اسی لیے ہم نے آپ کے حالات زندگی کے تفصیلی تذکرہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ آفتاب عالمتاب کی طرح سب ادیان سماویہ کی نظروں میں ہمیشہ درخشاں رہی ہے۔

آپ کا مولد بابل یا غوطہ تھا، آپ کی والدہ ماجدہ کا نام "امیلہ" یا "بلونا" تھا۔ والد ماجد کا نام حسب ترجیح حافظ ابن کثیر آزر تھا۔ جمہور نساب تارح اور اہل کتاب تارخ لکھتے ہیں اور زبانوں کے اختلاف سے ناموں کی نقل میں اختلاف ہو جانا کوئی بعید بات نہیں ہے۔ پھر علم اور لقب کا فرق بھی اگر ملحوظ رکھا جائے تو بہت سی الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح اگر صفاتی نام بھی اسماء کی فہرست میں آسکتے ہیں تو پھر پیشگوئیوں میں جو بے وجہ مباحث پیدا کی گئی ہیں وہ سب آسانی سے حل ہو سکتی ہیں۔ آپ کی کنیت ابو الضیفان تھی، اور آپ کی ایک اہم ضیافت کا تذکرہ بھی قرآن کریم میں موجود ہے۔ آپ کی حیات طیبہ میں بنائے کعبہ اور آزمائشی میدانوں میں آپ کا صبر و استقامت اس کا سب سے نمایاں حصہ ہے ذبح عظیم اور آپ پر آتش کے برد و سلام جیسے عظیم الشان واقعات تو زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں اس سلسلہ میں جبرئیل علیہ السلام کے اصرار پر آپ کا فرمان "اما الیک فلا" حسب بیان حافظ ابن کثیر صرف بعض سلف کا مقولہ ہے۔

آپ کی بیوی حضرت سارہ شاہ حران کی بیٹی تھیں۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ جس کسی نے یہ کہا کہ وہ آپ کی بھتیجی تھیں یہ بالکل بے تکی بات ہے اس پر یہ دعویٰ کرنا اور زیادہ بے اصل ہے کہ پہلے بھتیجی سے نکاح کرنا درست تھا۔ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ ان جائزات میں سے ہوگا جس کا انبیاء علیہم السلام کبھی ارتکاب نہیں فرماتے حضرت سارہ کا مشہور واقعہ جس ظالم بادشاہ کے ساتھ پیش آیا تھا حسب بیان بعض اہل تاریخ وہ ضحاک ظالم کا بھائی تھا اور اس کا نام سنان بن علوان تھا۔ ابن ہشام نے اپنی کتاب التیجان میں اس کا نام عمرو بن امرء القیس بن مایلون یا مایلیون لکھا ہے۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی قبور مبارک شہر حبرون میں موجود

ہیں جس کو آج کل الخلیل کہا جاتا ہے لیکن ان کی علیحدہ علیحدہ تعیین یقینی طور پر معلوم نہیں۔ البدایہ ص۱۷۵ ج۱

۱۲۲۵۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَأَیْتُ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ وَ مُوْسٰی وَ اِبْرَاھِیْمَ فَاَمَّا عِیْسٰی فَاَحْمَرُ جَعْدٌ عَرِیْضُ الصَّدْرِ وَاَمَّا مُوْسٰی فَاٰدَمُ جَسِیْمٌ قَالُوْا لَہٗ فَاِبْرَاھِیْمُ قَالَ اُنْظُرُوْا اِلٰی صَاحِبِکُمْ یَعْنِیْ نَفْسَہٗ۔ رواہ الامام احمد وروی البخاری و مسلم نحوہ فی الحج وفی اللباس ایضا۔

۱۲۲۶۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِی الْجَنَّۃِ قَصْرًا اَحْسِبُہٗ قَالَ مِنْ لُؤْلُؤَۃٍ لَیْسَ فِیْہِ فَصْمٌ وَلَا وَھْیٌ اَعَدَّہُ اللّٰہُ لِخَلِیْلِہٖ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ نُزُلًا۔ رواہ البزار وفیہ علۃ مع کونہ علی شرط مسلم

۱۲۲۷۔ عَنْ جُنْدُبِ الْبَجَلِیِّ وَعَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو وَابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰہَ اتَّخَذَنِیْ خَلِیْلًا کَمَا اتَّخَذَ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًا۔ رواہ الشیخان

۱۲۲۸۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ مَیْمُوْنٍ قَالَ اِنَّ مُعَاذًا لَمَّا قَدِمَ الْیَمَنَ صَلّٰی بِھِمُ الصُّبْحَ فَقَرَأَ وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًا فَقَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ قَرَّتْ عَیْنُ اُمِّ اِبْرَاھِیْمَ۔ رواہ البخاری

۱۲۲۵۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عیسیٰ بن مریم، موسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کو دیکھا تو عیسیٰ علیہ السلام سُرخ رنگ، گھونگروالے بال اور چوڑے سینہ کے تھے۔ اور موسیٰ علیہ السلام گندم گوں رنگ اور لانبے چوڑے جسم کے آدمی تھے۔ رہ گئے ابراہیم علیہ السلام تو وہ مجھ کو دیکھ لو۔ احمد، بخاری، مسلم۔

۱۲۲۶۔ ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جنت میں ایک محل ہے میرا گمان ہے کہ آپ نے فرمایا تھا وہ ایسے موتی کا ہے جس میں کہیں ذرا بال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے خلیل کی میہمانی کے لیے تیار فرمایا ہے۔ (بزار)

۱۲۲۷۔ جندب بجلی، عبداللہ بن عمرو اور ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو! سن لو اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا تھا مجھ کو بھی اپنا خلیل بنایا ہے۔ (متفق علیہ)

۱۲۲۸۔ عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ معاذ جب یمن آئے اور لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی تو اس میں یہ آیۃ پڑھی واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تو ان لوگوں میں سے ایک شخص بولا ابراہیم علیہ السلام کی والدہ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں کہ اتنی بڑی فضیلت ان کے فرزند کو نصیب ہوگی۔ (بخاری شریف)

۱۲۲۹۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قِيْلَ لَهٗ مَا الْمَقَامُ الْمَحْمُوْدُ قَالَ ذٰلِكَ يَوْمٌ يَنْزِلُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى كُرْسِيِّهٖ فَيَئِطُّ كَمَا يَئِطُّ الرَّحْلُ الْجَدِيْدُ مِنْ تَضَايُقِهٖ وَهُوَ كَسَعَةِ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَيُجَاءُ بِكُمْ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا فَيَكُوْنُ اَوَّلُ مَنْ يُّكْسٰى اِبْرَاهِيْمُ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اُكْسُوْا خَلِيْلِيْ فَيُؤْتٰى بِرَيْطَتَيْنِ بَيْضَاوَيْنِ مِنْ رِيَاطِ الْجَنَّةِ ثُمَّ اُكْسٰى عَلٰى اَثَرِهٖ ثُمَّ اَقُوْمُ عَنْ يَمِيْنِ اللّٰهِ مَقَامًا يَغْبِطُنِي الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ رواہ الدارمی واخرج الحافظ بروایۃ البیہقی من کتاب الاسماء والصفات نحوہ کما فی الفتح ص۲۴۱ ج۶ والحافظ العینی فی عمدۃ القاری ص۲۴۶ ج۷

۱۲۳۰۔ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ كَلِمَاتِ اِبْرَاهِيْمَ الثَّلَاثِ

۱۲۲۹۔ ابن مسعودؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ مقام محمود کیا چیز ہے۔ فرمایا یہ ایک مقام ہے جو مجھ کو اس دن نصیب ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ عرش عظیم سے اپنی کرسی پر تجلی فرمائیگا تو وہ اس طرح آواز کریگی جیسا نیا کجاوہ کسی بڑی چیز کے وزن سے آواز کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ اس کرسی کی وسعت آسمان و زمین کے درمیان فاصلہ کی برابر ہے اس کے بعد پھر تم سب مخلوق کو حاضر کیا جائیگا اور سب پابرہنہ، برہنہ جسم اور غیرمختون ہونگے۔ پھر جن کو سب سے پہلے جنت کا لباس پہنایا جائیگا وہ ابراہیم علیہ السلام ہونگے۔ ارشاد ہوگا۔ میرے خلیل کو پوشش پہناؤ۔ فوراً جنت کی چادروں میں سے دو سفید رنگ کی چادریں لاکران کو پہنائی جائینگی اس کے بعد ہی پھر مجھ کو پوشش پہنائی جائیگی اور میں اللہ تعالیٰ کے دائیں آکر ایسے مقام پر کھڑا ہونگا جہاں سب اگلے اور پچھلے مجھ پر غبطہ کرینگے۔ (دارمی)

۱۲۳۰۔ ابوسعید روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کے متعلق جو حضرت ابراہیم

۱۲۳۰۔ ان تین باتوں کا تفصیلی تذکرہ آپ ترجمان السنۃ ص۲۷۹ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کا ذکر فرماکر یہ بات پورے طور پر صاف فرمادی ہے کہ وہ تینوں باتیں ہر طرح پر صحیح تھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ خدائی دین کی حفاظت کی خاطر اختیار کی گئی تھیں۔ یہ خدا تعالیٰ کے خلیل کی بلند فطرت تھی کہ مخاطبوں کو چونکہ ان کی مراد سمجھنے میں غلط فہمی پیدا ہوگئی اس لیے انہوں نے اس کذب نما صدق کو بھی کذب کی برابر شمار کیا اور اس کو صوری کذب قرار دے کر اس پر ہمیشہ اتنے نادم رہے کہ قیامت تک اس کا انفعال ان کی فطرت سے محو نہ ہو سکا۔ جن لوگوں کو انبیاء علیہم السلام کے بلند مقام کا اندازہ نہیں ہے انہوں نے بے وجہ یہاں بخاری شریف کی اس حدیث میں بھی تاویلیں شروع کردی ہیں۔ حالانکہ جب ان کی حقیقت خود روایت میں واضح ہو چکی تو اب سوال اس کے سوا اور کیا رہتا ہے کہ اس حقیقت پر کذب کا اطلاق کیوں کیا گیا لیکن اگر ذرا اس طرف بھی نظر اٹھ جاتی کہ یہاں صرف ایک ابراہیم علیہ السلام ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ انبیاء علیہم السلام کی پوری کی پوری جماعت کے حالات زندگی اسی قسم کی سخت گیریوں اور مؤاخذات لفظیہ کا مرقع ہیں تو یہاں کوئی اشکال نہ رہتا۔ آخر آدم علیہ السلام کی جو سرگزشت کہ خود

الَّتِیْ قَالَ مَا مِنْهَا كَلِمَةٌ اِلَّا مَاحَلَ بِهَا عَنْ دِیْنِ اللّٰهِ. رواہ ابن ابی حاتم۔

علیہ السلام کی زبان سے نکلی تھیں فرمایا کہ اُن تینوں میں ایک بات بھی ایسی نہ تھی جس سے ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کے دین کی تائید کرنی نہ ہو۔ (ابن ابی حاتم)

قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اس کے بعد پھر جو لغزش اُن سے ہوئی اس کی اہمیت کتنی رہ جاتی ہو لیکن اس کے باوجود قرآن نے اس صوری فروگزاشت کو ارادی فروگزاشت کے انداز میں ذکر کیا ہے، اور حضرت آدم علیہ السلام کی جانب معصیت کی نسبت فرما دی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی پوری جماعت پر نظر ڈال جائیے۔ آپ کو یہی ثابت ہوتا چلا جائیگا کہ انبیاء علیہم السلام کی شان میں الفاظ گو وہی استعمال ہوتے ہیں جو عرف عام میں مستعمل ہوتے ہیں مگر ان کے مصداق میں ذرا سا بھی اشتراک نہیں ہوتا۔ ترجمان السنۃ ص میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ بس حدیث میں توریہ پر کذب کا اطلاق اسی نوع کا ہے جیسا قرآن کریم میں ایک زلت پر معصیت کا۔ انکشاف حقیقت کے بعد ان اطلاق سے انبیاء علیہم السلام کی کسر شان نہیں نکلتی بلکہ اور ان کی عظمت کا ثبوت ملتا ہے۔

ہم اس وقت یہ بات اور بتا دینی چاہتے ہیں کہ کذب کا اطلاق صرف اس معنی میں منحصر سمجھ لینا جس کو عام طور پر جھوٹ کہا جاتا ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس جگہ حافظ ابن تیمیہؒ نے جو تحقیق فرمائی ہے چونکہ وہ بہت جگہ کار آمد ہے اس لیے اس کو پیش کیا جاتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ کذب کا اطلاق ہمیشہ ارادی کذب پر نہیں ہوتا بلکہ ایسی خلاف واقع بات پر بھی ہوتا ہے جس کے کہنے کا انسان کو شرعی طور پر حق نہ ہو، خواہ اس میں دروغ گوئی کا ارادہ نہ ہو۔

(۱) جیسا ایک بار ایک حاملہ عورت کے شوہر کے انتقال پر مسئلہ دریافت کیا گیا کہ اس کا وضع حمل ہو چکا ہے تو کیا اب وہ جدید نکاح کر سکتی ہے۔ اس پر ابو السنابل صحابی نے جواب دیا "ما انت بناكحة حتى يمر عليك اربعة اشهر وعشر" یعنی جب تک تو چار ماہ دس دن کی عدت نہ گزار لے تجھ کو نکاح کا کوئی حق نہیں۔ جب اس بات کی آپ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا "كذب ابو السنابل"۔ ابو السنابل نے جھوٹ کہا۔

۱۔ اسی طرح عامر صحابی کی اپنی تلوار اتفاقی طور پر لگ جانے کی وجہ سے جب ان کی موت واقع ہوئی تو لوگوں نے کہا: عامر کا جہاد تو برباد ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: "كذب من قالها" جس نے بھی یہ کہا جھوٹ کہا۔

(ب) فتح مکہ کے موقع پر سعد بن عبادہ کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا "اليوم يوم الملحمة"۔ آج ہے جنگ کا دن تو آپ نے فرمایا "كذب سعد" سعد نے جھوٹ کہا۔

(ج) عبادہ بن صامت کے سامنے کسی نے بیان کیا کہ ابو محمد کہتے ہیں کہ وتر واجب ہے تو انہوں نے فرمایا "كذب ابو محمد" ابو محمد نے جھوٹ کہا۔

(د) حضرت ابن عباس سے کسی نے کہا کہ نوف کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کے ساتھ جس موسیٰ کا واقعہ پیش آیا تھا وہ موسیٰ بنی اسرائیل نہ تھے کوئی اور موسیٰ تھے تو فرمایا "كذب نوف" نوف نے جھوٹ کہا۔

(۲) اسی طرح جو شخص ایسی خبر بیان کرے جس کی تصدیق شرعی طور پر شہادت کے بغیر ممنوع ہو تو وہ بھی جھوٹ کہلاتی ہے چنانچہ کسی پر تہمت لگانے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لولا جاءوا عليه باربعة شهداء فاذ لم يأتوا بالشهداء فاولئك عند الله هم الكاذبون

چونکہ یہ لوگ چار گواہ نہیں لائے اس لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی لوگ ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں۔

۱۲۳۱۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِخْتَتَنَ اِبْرَاهِیْمُ النَّبِیُّ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَهُوَ ابْنُ ثَمَانِیْنَ سَنَةً بِالْقَدُوْمِ۔ رواہ البخاری ومسلم۔

۱۲۳۲۔ عَنْ عَلِیِّ بْنِ رَبَاحٍ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ اُمِرَ اَنْ یَّخْتَتِنَ وَهُوَ حِیْنَئِذٍ ابْنُ ثَمَانِیْنَ سَنَةً فَعَجَّلَ وَاخْتَتَنَ بِالْقَدُوْمِ فَاشْتَدَّ عَلَیْهِ الْوَجَعُ فَدَعَا رَبَّهٗ فَاَوْحٰی اِلَیْهِ اَنَّکَ عَجَّلْتَ قَبْلَ اَنْ نَّاْمُرَکَ بِاٰلَتِهٖ قَالَ یَا رَبِّ کَرِهْتُ اَنْ اُؤَخِّرَ اَمْرَکَ (درمنثور ص۱۱۵ ج۱)

۱۲۳۱۔ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابراہیم علیہ السلام نے اسی سال کی عمر میں کسلہ سے ختنہ کی تھی۔ (مسلم)

۱۲۳۲۔ علی بن رباح روایت کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب ختنہ کرنے کا حکم ہوا تو ان کی عمر اس وقت اسی سال کی تھی انہوں نے خدائی حکم بجا لانے میں جلدی کی اور فوراً کسلے کر اپنی ختنہ کرلی جب تکلیف زیادہ محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی ادھر سے وحی آئی ہمارے ختنہ کا طریقہ بتانے سے پہلے ختنہ کرنے میں تم نے خود جلدی کی۔ انہوں نے عرض کی پروردگار مجھ سے یہ گوارا نہ ہوسکا کہ میں تیرے حکم میں ذرا سی تاخیر بھی کروں۔ (درمنثور)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۹۳) (۳) جو شخص بے علمی سے غلط باتیں بنائے وہ بھی جھوٹ کی فہرست میں داخل ہے خواہ اس کے اپنے علم میں وہ حق ہی کیوں نہ ہوں۔ جیسا کاہنوں پر شیطان یہی ظاہر کرتا ہے کہ جو خبریں وہ بیان کرتے ہیں یہ سب درست ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی خبروں کے بیان کرنے والوں کو کاذب قرار دیا ہے۔

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَکْثَرُهُمْ کٰذِبُوْنَ۔ — ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں جو سنی ہوئی بات (اس کے کان میں) لا ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہیں۔

اس کے علاوہ امام خطابی شرح ابو داؤد میں فرماتے ہیں کہ کذب کا اطلاق عربی زبان میں خطاء کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے کہتے ہیں "کذب سمعی" "کذب بصری" ای زل ولم یدرک۔ میری چشم و گوش نے جھوٹ بولا یعنی سننے اور دیکھنے میں غلطی کھائی۔ اور جس شخص نے اپنے مریض کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر شہد پلایا تھا اس کو شروع میں افاقہ نہ ہوا تو جب اس نے آپ سے آکر پھر شکایت کی تو آپ نے فرمایا صدق اللہ وکذب بطن اخیک۔ تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے اور اللہ تعالیٰ سچا ہے یعنی شہد میں تو شفا یقینی ہے مگر تیرے بھائی کو ناموافق رہا یہ بات دوسری ہے۔ معالم السنن ص۱۳۲ ج۴

۱۲۳۱۔ صحیح بخاری کی روایت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سن کی تصریح ہوتے بھی بعض مصنفین نے یہ کیسے لکھ دیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال کی ہوئی اور حضرت اسماعیل کی تیرہ سال تو اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ختنہ کرو۔ یہاں البدایۃ والنہایۃ میں گو صحیح ابن حبان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت ۱۲۰ سال بھی نقل کی ہے۔ مگر پھر ترجیح بخاری شریف کو ہی رہیگی۔

۱۲۳۲۔ اب اس ایک ہی واقعہ سے اندازہ فرمایئے کہ انبیاء علیہم السلام سے مؤاخذات کا معیار کیا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے "انا اعلم" ایک کلمہ نکل گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا اور آدم علیہ السلام نے (باقی برصفحہ ۴۹۵)

۱۲۳۳ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ اَوَّلُ مَنْ اَضَافَ الضَّیْفَ وَاَوَّلُ مَنْ قَصَّ الشَّارِبَ وَاَوَّلُ مَنْ رَأَی الشَّیْبَ وَاَوَّلُ مَنْ قَصَّ الْاَظَافِیْرَ وَاَوَّلُ مَنِ اخْتَتَنَ بِقَدُوْمٍ. رواہ ابن عدی والبیھقی کذا فی الدر المنثور ص۱۱۵ واخرج البیھقی عن سفیان بن عیینۃ انہ اول من تسرول واول من فرق واول من استحد ایضاً. وعند ابن ابی شیبۃ والبزار انہ اول من خطب علی المنبر وعند ابن عساکر انہ اول من رتب العسکر فی الحرب میمنۃ ومیسرۃ وقلباً وعند ابن ابی شیبۃ انہ اول من عقد الالویۃ وعند ابن ابی الدنیا انہ اول من عمل القسی وعندہ فی کتاب الاخوان والخطیب فی تاریخہ والدیلمی فی مسند الفردوس انہ اول من عانق وعند ابن سعد انہ اول من ثرد الثرید وعند الدیلمی انہ اول من اتخذ الخبز المبلقس وعند الشیخین وغیرھما انہ اول من یکسی یوم القیامۃ کلہ من الدر المنثور۔ وروی بعضہ مالک فی مؤطاہ۔

۱۲۳۳۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (چند باتیں وہ ہیں جو سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوئیں) سب سے پہلے مہمانی کی سنت انہوں نے شروع کی۔ سب سے پہلے انہوں نے مونچھیں تراشیں، سب سے پہلے سر میں بڑھاپے کے آثار انہوں نے دیکھے۔ سب سے پہلے ناخن انہوں نے تراشے۔ سب سے پہلے کسولہ لے کر اپنی ختنہ انہوں نے کی سب سے پہلے پاجامہ انہوں نے پہنا۔ سب سے پہلے مانگ انہوں نے نکالی۔ سب سے پہلے استرہ سے زیر ناف بال انہوں نے لیے۔ سب سے پہلے منبر پر انہوں نے خطبہ دیا لشکر کے میمنہ، میسرہ اور قلب کی سب سے پہلے تقسیم انہوں نے ایجاد کی۔ سب سے پہلے جھنڈے پر پرچم انہوں نے لگایا۔ سب سے پہلے کمان انہوں نے بنائی۔ سب سے پہلے معانقہ انہوں نے کیا۔ سب سے پہلے ثرید کھانا انہوں نے تیار کیا۔ وہ روٹی جو قریہ بلقس کی طرف منسوب ہے[۱] سب سے پہلے انہوں نے تیار کی۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۹۴) اللہ تعالیٰ کی قرب کی خاطر بھول سے ایک قدم اٹھایا تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مستحسن توریہ کے کلمات منہ سے نکلے تو اس کا انفعال کہاں تک باقی رہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نادان قوم نے ان کو خدا کا شریک بنایا تو اس کا اثر بھی ان کی مقدس فطرت پر کتنا شدید رہا۔ الی غیر ذلک۔

۱۲۳۳۔ یہ جزا امور اولیات ابراہیم علیہ السلام کے عنوان سے مشہور ہیں ہم نے ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ یہ سب اشیاء ممکن ہے کہ سب سے پہلے ان سے ہی شروع ہوئی ہوں یا ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی خصوصیت ایسی ہو جس کی بنا پر ان کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب اولیٰ سمجھی گئی ہو۔

[۱] تاج العروس شرح قاموس میں ہے کہ اس روٹی کا وزن چار رطل ہوتا تھا

۱۲۳۴۔ عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَۃِ قَصُّ الشَّارِبِ وَاِعْفَاءُ اللِّحْیَۃِ وَالسِّوَاکُ وَاسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَقَصُّ الْاَظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَنَتْفُ الْاِبِطِ وَحَلْقُ الْعَانَۃِ وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ یَعْنِی الْاِسْتِنْجَاءَ۔ رواہ مسلم واھل السنن و فی الصحیحین ذکر الختان والاستحداد ایضا۔

۱۲۳۵۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا رَأَی الصُّوَرَ فِی الْبَیْتِ لَمْ یَدْخُلْ حَتّٰی اَمَرَ بِھَا فَمُحِیَتْ وَرَاٰی اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ بِاَیْدِیْھِمَا الْاَزْلَامُ فَقَالَ قَاتَلَھُمُ اللّٰہُ۔ وَاللّٰہِ اِنْ یَّسْتَقْسِمَا بِالْاَزْلَامِ قَطُّ۔ رواہ البخاری ولم یخرجہ مسلم۔

۱۲۳۶۔ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ اِمْرَاَۃً دَخَلَتْ عَلٰی عَائِشَۃَ فَاِذَا رُمْحٌ مَنْصُوْبٌ فَقَالَتْ مَا ھٰذَا

۱۲۳۴۔ حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دس باتیں فطرت میں داخل ہیں۔ مونچھ تراشنا، ریش بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی دینا، ناخن تراشنا، انگلی کے جوڑوں کو صاف کرنا، زیر بغل بالوں کو اکھاڑنا، زیر ناف بالوں کا مونڈنا اور استنجا کرنا، ختنہ کرنا۔

۱۲۳۵۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ بیت اللہ کے اندر تصویریں ہیں تو آپ اس وقت تک اندر تشریف نہیں لے گئے جب تک کہ ان کے مٹانے کا حکم نہ دیدیا اور وہ مٹا نہ دی گئیں۔ آپ نے دیکھا کہ کفار نے ان تصویروں میں حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کے ہاتھوں میں فال وبدفالی کے تیر دے رکھے تھے۔ یہ کریہہ منظر دیکھ کر آپ نے فرمایا خدا ان کو برباد کرے بخدا یہ خوب جانتے ہیں کہ انہوں نے پانسے کے تیر کبھی نہیں ڈالے۔ (بخاری شریف)

۱۲۳۶۔ نافع بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں کیا دیکھتی ہیں ایک نیزہ

۱۲۳۴۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس حدیث کی تشریح نہایت پرمغز اور مختصر الفاظ میں حسب ذیل فرمائی ہے۔

والمقصود انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کان لا یشغلہ القیام بالاخلاص للہ عزوجل وخشوع العبادۃ العظیمۃ عن مراعاۃ مصلحۃ بدنہ واعطاء کل عضو ما یستحقہ من الاصلاح والتحسین وازالۃ ما یشین من زیادۃ شعر او ظفر او وجود قلح او وسخ فھذا من جملۃ قولہ تعالٰی وابراھیم الذی وفّی۔ البدایۃ والنہایۃ ص۱۷۶

اصل مقصد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا بڑا کمال یہ تھا کہ ایک طرف وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی پورے خشوع وخضوع سے ادا فرماتے تھے اور دوسری طرف اپنی بدنی مصالح کی بھی پوری رعایت رکھتے تھے کہیں جسم پر قابل نفرت بال یا ناخن یا میل کچیل باقی نہ رکھتے تھے جو موجب نفرت ہو ان ہی مجموعۂ حقوق کی اس طرح ادائیگی کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وابراھیم الذی وفّی یعنی ابراہیم وہ تھے کہ جنہوں نے پورے طور پر حقوق کی ادائیگی فرمائی تھی۔

۱۲۳۶۔ واضح رہے کہ جہاں آتش نمرود کے سرد ہو جانے کا ذکر ہو وہاں بعض حیوانات کی حمایت اور بعض کی عداوت سے بھلا کیا تعجب ہونا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ طبیعت کی سلامتی اور خباثت یہ دونوں خواص انسان اور حیوانات میں فطری

الزُّحمُ فَقَالَتْ نَقْتُلُ بِهِ الْاَوْزَاغَ ثُمَّ حَدَّثَتْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَمَّا اُلْقِيَ فِي النَّارِ جَعَلَتِ الدَّوَابُّ كُلُّهَا تُطْفِئُ عَنْهُ النَّارَ اِلَّا الْوَزَغ فَاِنَّهٗ جَعَلَ يَنْفُخُهَا عَلَيْهِ رواه احمد من وجه اٰخر ايضا قال ابن كثير تفرد به احمد من هذين الوجهين وقد رواه ابن ماجة ايضا وقد اخرجه احمد باسناده ايضا

کھڑا ہوا ہے۔ انہوں نے پوچھا یہ نیزہ کیسا ہے اُنہوں نے فرمایا ہم اس سے چھپکلیاں مارتے ہیں۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ میں ڈالے گئے تو تمام جانور آگ بجھانے کے لیے کوشاں تھے بجز چھپکلی کے کہ یہ اور پھونک مارنے لگی۔ احمد

طور پر موجود ہوتے ہیں ان کے ظہور کے لیے صرف فطرت کافی ہوتی ہے۔ دیکھیے شیر اور بھیڑیا دونوں ہی خونخوار جانور ہیں مگر پھر دونوں کی شرافت اور دنائت میں زمین و آسمان کا فرق ہے یہاں ارادہ و شعور کی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ جس قسم کی فطرت ہوتی ہے اسی قسم کے افعال کا ظہور غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے مشہور ہے ؎ نیش عقرب نہ از پئے کینست ؛ مقتضائے طبیعتش اینست۔ پس جس طرح بچھو کا کاٹنا اس پر موقوف نہیں کہ پہلے سے دشمنی یا عداوت کا شعور اس میں موجود ہو۔ پھر ایسا ہوتا کیوں ہے اس لیے کہ اس کی فطرت یہی ہے۔ اسی طرح چھپکلی کی یہ حرکت صرف اس کی ایک فطرت تھی۔ یہاں تمام مقدمات اس کے پیش نظر ہونے ضروری نہیں۔ بندر، چوہا، کوّا وغیرہ جیسے موذی جانوروں کی ایذا دہی کی عجیب وغریب حکایات سب کو معلوم ہیں۔ حتی کہ بہت سے حیوانات ہیں جن کو حدیث میں موذیات کا لقب دیا ہے اور ان کا مارنا ہر حالت میں درست قرار دیا ہے چھپکلی میں انسانی ایذا رسانی کی یہ خصلت آج تک موجود ہے کہ نمک پر پیشاب کرتی ہے۔ اگر اس نمک کو استعمال کر لیا جائے تو اس کے سمی اثر سے جسم پر برص کے داغ پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح خواص حیوانات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض حیوانات میں فطری طور پر ایذا رسانی کی خصوصیات موجود ہیں۔ پس اگر قدرت کے کسی خاص مظاہرہ کے وقت حیوانات میں بھی وقتی طور پر کوئی شعوری یا غیر شعوری حرکت پیدا ہو جائے تو اس کا انکار یا تاویل دونوں صریح طریق نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حیوانات کا کلام کرنا جلد ثانی کی شروع حدیثوں میں آپ پڑھ چکے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں شیر و بکری کی باہم معاشرت کا ذکر آپ کے سامنے آنے والا ہے پس عجائبات قدرت صرف چند قطرات نہیں ہیں بلکہ ان کا بھی ایک سمندر ہے جس کی طوفان خیز موجوں کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سَیِّدُنَا اسمٰعِیل عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ ذَبِیْحُ اللّٰہِ

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حسب بیان اہل کتاب جب حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت ہوئی تو اس وقت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر مبارک چھیاسی سال کی تھی۔ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے تیرہ سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بطن سارہ سے

حضرت اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ سُن کر سجدہ میں گر گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ بشارت ہوئی کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حق میں جو دعا تم نے کی وہ قبول ہوگئی اور اللہ تعالیٰ ان کی نسل میں بڑی برکت دیگا اور بارہ بڑی بڑی ہستیاں ان میں پیدا فرمائیگا۔ ٹھیک اسی نوع کی بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی امت میں بارہ خلفاء کے متعلق دی ہے۔ حافظ سہیلی لکھتے ہیں کہ عورتوں میں ختنہ کی رسم سب سے پہلے حضرت ہاجرہ سے شروع ہوئی ہے اور کان بندھوانے اور دامن دراز رکھنے کی سنت کی ابتدا بھی ان ہی سے ہوئی ہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جس بیوی کے طلاق دینے کا حکم دیا تھا اس کا نام عمارہ بنت سعد تھا اور جس کے ساتھ نباہ کا حکم دیا تھا اس کا نام السیدہ بنت مضاض تھا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زندگی میں بناء کعبہ کی شرکت اور خود ان کے ذبیح ہونے کے واقعات سب سے زیادہ مشہور اور نمایاں ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے میں اہل اسلام اور اہل کتاب کے درمیان مناقشات و مباحثات کی پوری تفصیلات اپنے مقام میں مدوّن ہیں اس کا یہ محل نہیں۔ حافظ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ظاہری نظم میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ پہلے قرآن کریم نے ذبیح کا قصہ ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے "وبشرناہ باسحٰق نبیاً من الصالحین" گویا ذبیح کا قصہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت سے بھی پہلا ہے۔ پھر حضرت اسحاق علیہ السلام ذبیح کیسے ہوسکتے ہیں۔ حافظ موصوف نے یہاں محمد بن کعب قرظی کا ایک دوسرا عجیب استدلال او نقل کیا ہے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے

فبشرنٰھا باسحٰق ومن وراء اسحٰق یعقوب تو ہم نے اس کو اسحٰق کی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی

آیت بالا میں جب حضرت اسحٰق کو حضرت یعقوب علیہ السلام کے عطا ہونے کی بشارت دی گئی تھی تو اب یہ کیسے مناسب تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت سے قبل صغر سنی ہی میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم دیدیا جاتا۔ اندازہ فرمائیے کہ ایک طرف ان کے ذبح کا حکم دوسری طرف ان کے فرزند کی بشارت کیا یہ دونوں باتیں جوڑ کھاتی ہیں۔ البدایہ ص ۱۵۹

واضح رہے کہ ہم نے صرف وقتی لحاظ سے یہاں حافظ موصوف کی تاریخ کے یہ دو جملے نقل کردیے ہیں ان سے مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ حافظ ابن قیم اور دیگر علماء اسلام نے ہر پہلو سے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحثیں

کردی ہیں وہ دیکھ لی جائیں۔

۱۲۳۷۔ عَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ اَخْبَرَتْنِي اِمْرَءَةٌ مِنْ بَنِي سُلَيْمٍ قَالَتْ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى عُثْمَانَ بْنِ طَلْحَةَ وَقَالَ مَرَّةً اِنَّهَا سَأَلَتْ عُثْمَانَ لِمَ دَعَاكَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّي كُنْتُ رَأَيْتُ قَرْنَيِ الْكَبْشِ حِيْنَ دَخَلْتُ الْبَيْتَ فَنَسِيْتُ اَنْ اٰمُرَكَ اَنْ تُخَمِّرَهُمَا فَخَمِّرْهُمَا فَاِنَّهُ لَا يَنْبَغِيْ اَنْ يَكُوْنَ فِي الْبَيْتِ شَيْءٌ يُشْغِلُ الْمُصَلِّيَ قَالَ سُفْيَانُ لَمْ تَزَلْ قَرْنَا الْكَبْشِ فِي الْبَيْتِ حَتّٰى اِحْتَرَقَ الْبَيْتُ فَاحْتَرَقَا۔ رواہ احمد قَالَ فِي الْبِدَايَةِ وَهٰذَا رُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَأْسَ الْكَبْشِ لَمْ يَزَلْ مُعَلَّقًا عِنْدَ مِيْزَابِ الْكَعْبَةِ قَدْ يَبِسَ ص ۱۵۸

۱۲۳۸۔ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَوَّلُ مَا اتَّخَذَ النِّسَاءُ الْمِنْطَقَ مِنْ قِبَلِ اُمِّ اِسْمٰعِيْلَ اِتَّخَذَتْ مِنْطَقًا لِتُعَفِّيَ اَثَرَهَا عَلٰى سَارَةَ ثُمَّ جَاءَ بِهَا اِبْرَاهِيْمُ وَبِابْنِهَا اِسْمٰعِيْلَ وَهِيَ تُرْضِعُهُ حَتّٰى وَضَعَهُمَا عِنْدَ الْبَيْتِ عِنْدَ دَوْحَةٍ فَوْقَ زَمْزَمَ فِيْ اَعْلَى الْمَسْجِدِ وَ

۱۲۳۷۔ صفیہ بنت شیبہ روایت کرتی ہیں کہ بنو سُلیم قبیلہ کی ایک عورت نے مجھ سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ سے کہلا بھیجا یا خود اُنھوں نے عثمان سے پوچھا تھا (راوی کو شک ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو کیوں بلایا تھا۔ اُنھوں نے کہا یہ کہنے کے لیے بلایا تھا کہ جب میں بیت اللہ میں داخل ہوا تھا تو میں نے اس میں ذبح عظیم والے مینڈھے کے دو سینگ رکھے دیکھے تھے۔ مجھے ان کے متعلق تم سے یہ کہنا یاد نہ رہا کہ ان کو ڈھانک دینا۔ تو اب جا کر ان کو ڈھانک دو کیونکہ بیت اللہ کے اندر ایسی کسی چیز کا کھلا رہنا مناسب نہیں جسے دیکھ کر نماز پڑھنے والے آدمی کا دل بٹے۔ سفیان راوی حدیث کہتے ہیں کہ وہ دونوں سینگ بیت اللہ میں ہمیشہ موجود رہے یہاں تک کہ جب بیت اللہ کے جلنے کا حادثہ پیش آیا تو وہ بھی اس میں جل گئے تھے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ کعبہ کے پرنالے کے پاس اس مینڈھے کا سر لٹکا ہوا تھا حتیٰ کہ لٹکے لٹکے وہ سوکھ گیا تھا۔

۱۲۳۸۔ سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ ابن عباس فرماتے تھے۔ سب سے پہلے جس نے منطق کا لباس بنایا تھا وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ تھیں اُنھوں نے یہ لباس اس لیے بنایا تھا تاکہ زمین پر اس کے گھسٹنے سے ان کے نشانات قدم محو ہو جائیں جو حضرت سارہ کو ان کا پتہ نہ لگ سکے حضرت

۱۲۳۷۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ صرف یہی ایک روایت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کے لیے کافی ہے کیونکہ دور طفولیت میں یہی مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اور ہمارے علم میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی صغر سنی میں یہاں آمد کہیں ثابت نہیں۔

لَيْسَ بِمَكَّةَ يَوْمَئِذٍ أَحَدٌ وَلَيْسَ بِهَا مَاءٌ فَوَضَعَهُمَا هُنَالِكَ وَوَضَعَ عِنْدَهُمَا جِرَابًا فِيهِ تَمْرٌ وَسِقَاءً فِيهِ مَاءٌ ثُمَّ قَفَّى إِبْرَاهِيمُ مُنْطَلِقًا فَتَبِعَتْهُ أُمُّ إِسْمٰعِيلَ فَقَالَتْ يَا إِبْرَاهِيمُ أَيْنَ تَذْهَبُ وَتَتْرُكُنَا فِي هٰذَا الْوَادِي الَّذِي لَيْسَ فِيهِ أَنِيسٌ وَلَا شَيْءٌ فَقَالَتْ لَهُ ذٰلِكَ مِرَارًا وَجَعَلَ لَا يَلْتَفِتُ إِلَيْهَا فَقَالَتْ لَهُ آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَتْ إِذَنْ لَا يُضَيِّعُنَا ثُمَّ رَجَعَتْ فَانْطَلَقَ إِبْرَاهِيمُ حَتّٰى إِذَا كَانَ عِنْدَ الثَّنِيَّةِ حَيْثُ لَا يَرَوْنَهُ اسْتَقْبَلَ بِوَجْهِهِ الْبَيْتَ ثُمَّ دَعَا بِهٰؤُلَاءِ الدَّعَوَاتِ وَرَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ حَتّٰى بَلَغَ يَشْكُرُونَ جَعَلَتْ أُمُّ إِسْمٰعِيلَ وَتَشْرَبُ مِنْ ذٰلِكَ الْمَاءِ حَتّٰى إِذَا نَفِدَ مَا فِي السِّقَاءِ عَطِشَتْ وَعَطِشَ ابْنُهَا وَجَعَلَتْ تَنْظُرُ إِلَيْهِ يَتَلَوّٰى وَقَالَ يَتَلَبَّطُ فَانْطَلَقَتْ كَرَاهِيَةَ أَنْ تَنْظُرَ إِلَيْهِ فَوَجَدَتِ الصَّفَا أَقْرَبَ جَبَلٍ فِي

ابراہیم علیہ السلام ان کو اور ان کے بچہ کو جو اس وقت تک دودھ پیتے تھے لے کر چلے یہاں تک کہ ایک بڑے درخت کے نیچے زمزم کے پاس مسجد کے بالائی حصہ میں لاکر ان دونوں کو چھوڑ دیا۔ اس وقت مکہ مکرمہ میں نہ کوئی آبادی تھی اور نہ وہاں کہیں پانی تھا۔ حضرت ابراہیم نے ان دونوں کو وہاں چھوڑا اور ان کے پاس کھجور کا ایک تھیلا اور پانی کا ایک مشکیزہ رکھ دیا اور پھر رُخ پھیر کر روانہ ہو گئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ ان کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلیں ابراہیم! ہم کو ایسی وادی میں چھوڑ کر کدھر جا رہے ہو جہاں نہ کوئی چیز ہے اور نہ کوئی غمخوار۔ بار بار وہ یہ فرما رہی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے کہ ان کی طرف ذرا التفات نہ فرماتے تھے آخر انہوں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے انہوں نے (گردن کے اشارہ سے فرمایا) ہاں۔ اس پر انہوں نے کہا تو پھر وہ ہم کو پریشان ہونے نہیں دیگا۔ یہ کہہ کر واپس لوٹ گئیں۔ ابراہیم علیہ السلام جب گھاٹی سے اتنی دور نکل گئے جہاں سے ان کے اہل وعیال ان کو دیکھ نہ سکیں تو قبلہ رو ہو کر اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ ہمارے پروردگار! میں نے تو اپنی کچھ اولاد تیرے محترم گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں لاکر بسادی ہے جس میں کہیں کھیتی کا نام ونشان نہیں اے ہمارے رب یہ اس لیے کہ وہ نماز قائم کریں (آخر آیت تک) ادھر ہاجرہ تھیلہ کی کھجوریں کھاتی رہیں اور مشک کا پانی پیتی رہیں یہاں تک کہ جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو وہ اور ان کا بچہ تشنگی سے پریشان ہوئے وہ دیکھ رہی تھیں کہ بچہ شدتِ تشنگی سے ملیٹیاں کھا رہا ہے۔ یہ حالت دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا اور اس کو چھوڑ کر وہ چل دیں تاکہ اس کی حالت زار اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں سب سے زیادہ قریب ان کو صفا کی

الْأَرْضِ يَلِيهَا فَقَامَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ اسْتَقْبَلَتِ الْوَادِيَ تَنْظُرُ هَلْ تَرَى أَحَدًا فَلَمْ تَرَ أَحَدًا فَهَبَطَتْ مِنَ الصَّفَا حَتَّى إِذَا بَلَغَتِ الْوَادِيَ رَفَعَتْ طَرَفَ دِرْعِهَا ثُمَّ سَعَتْ سَعْيَ الْإِنْسَانِ الْمَجْهُودِ حَتَّى جَاوَزَتِ الْوَادِيَ ثُمَّ أَتَتِ الْمَرْوَةَ فَقَامَتْ عَلَيْهَا فَنَظَرَتْ هَلْ تَرَى أَحَدًا فَفَعَلَتْ ذَلِكَ سَبْعَ مَرَّاتٍ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلِذَلِكَ سَعَى النَّاسُ بَيْنَهُمَا فَلَمَّا أَشْرَفَتْ عَلَى الْمَرْوَةِ سَمِعَتْ صَوْتًا فَقَالَتْ صَهٍ تُرِيدُ نَفْسَهَا ثُمَّ تَسَمَّعَتْ فَسَمِعَتْ أَيْضًا فَقَالَتْ قَدْ أَسْمَعْتَ إِنْ كَانَ عِنْدَكَ غِوَاثٌ فَإِذَا هِيَ بِالْمَلَكِ عِنْدَ مَوْضِعِ زَمْزَمَ فَبَحَثَ بِعَقِبِهِ أَوْ قَالَ بِجَنَاحِهِ حَتَّى ظَهَرَ الْمَاءُ فَجَعَلَتْ تُحَوِّضُهُ وَتَقُولُ بِيَدِهَا هَكَذَا وَجَعَلَتْ تَغْرِفُ مِنَ الْمَاءِ فِي سِقَائِهَا وَهُوَ يَفُورُ بَعْدَ مَا تَغْرِفُ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْحَمُ اللَّهُ أُمَّ إِسْمَاعِيلَ لَوْ تَرَكَتْ زَمْزَمَ أَوْ قَالَ لَوْ لَمْ تَغْرِفْ مِنَ الْمَاءِ لَكَانَتْ زَمْزَمُ عَيْنًا مَعِينًا قَالَ فَشَرِبَتْ وَأَرْضَعَتْ وَلَدَهَا فَقَالَ لَهَا الْمَلَكُ لَا تَخَافِي الضَّيْعَةَ فَإِنَّ هَهُنَا بَيْتَ اللَّهِ

پہاڑی نظر آئی وہ اس پر کھڑے ہو کر وادی کی طرف منہ کر کے دیکھنے لگیں، کوئی نظر آتا ہے۔ مگر کوئی نظر نہ آیا آخر صفا سے اُتریں اور جب وادی (کے نشیب میں) پہنچیں تو اپنے پیراہن کا کنارہ اُٹھا کر اس طرح دوڑیں جیسے کہ ایک پریشان حال انسان دوڑا کرتا ہے یہاں تک کہ وادی کے نشیب سے نکل گئیں پھر مروہ پہاڑی پر آئیں، اور یہاں بھی کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں کوئی شخص نظر آتا ہے، مگر کوئی نظر نہ آیا سات مرتبہ اسی طرح چکر لگاتی رہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان ہی کی اتباع میں لوگ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ آخر میں جب مروہ پر چڑھیں تو ایک آواز سُنی۔ اُنھوں نے اپنے دل میں کہا خاموش رہ (تاکہ اس آواز کو بغور سُن لیں) پھر کان لگائے تو پھر آواز آئی اُنھوں نے فرمایا تم نے اپنی آواز تو سنا دی اب اگر کچھ مدد بھی کر سکتے ہو تو کرو۔ دیکھتی کیا ہیں کہ جہاں اب چاہ زمزم ہے یہاں ایک فرشتہ ہے اس نے اپنی ایڑی یا اپنے بازو سے اشارہ کیا تو پانی نکلنے لگا۔ ہاجرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کو گھیرنے لگیں اور پانی لے لے کر اپنی مشک میں بھرنے لگیں مگر پانی ان کے بھرنے کے بعد بھی اُبل رہا تھا۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحمت نازل فرمائے اگر کہیں وہ زمزم کو بہنے دیتیں یا یہ فرمایا کہ اس کو ہاتھوں سے اُٹھا اُٹھا کر مشک میں نہ بھرتیں تو یہ آج بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔ پھر اُنھوں نے پانی پیا اور اپنے بچہ کو دودھ پلایا۔ فرشتے نے اُن سے کہا اس بچہ کی ہلاکت کا خوف نہ کرو یہاں بیت اللہ

يَبْنِي هٰذَا الْغُلَامُ وَأَبُوهُ وَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَهْلَهُ وَكَانَ الْبَيْتُ مُرْتَفِعًا مِنَ الْأَرْضِ كَالرَّابِيَةِ تَأْتِيهِ السُّيُولُ فَتَأْخُذُ عَنْ يَمِينِهِ وَشِمَالِهِ فَكَانَتْ كَذٰلِكَ حَتّٰى مَرَّتْ بِهِمْ رُفْقَةٌ مِنْ جُرْهُمَ أَوْ أَهْلُ بَيْتٍ مِنْ جُرْهُمَ مُقْبِلِينَ مِنْ طَرِيقِ كَدَاءٍ فَنَزَلُوا فِي أَسْفَلِ مَكَّةَ فَرَأَوْا طَائِرًا عَائِفًا فَقَالُوا إِنَّ هٰذَا الطَّائِرَ لَيَدُورُ عَلَى الْمَاءِ لَعَهْدُنَا بِهٰذَا الْوَادِي وَمَا فِيهِ مَاءٌ فَأَرْسَلُوا جَرِيًّا أَوْ جَرِيَّيْنِ فَإِذَا هُمْ بِالْمَاءِ فَرَجَعُوا فَأَخْبَرُوهُمْ بِالْمَاءِ فَأَقْبَلُوا قَالَ وَأُمُّ إِسْمٰعِيلَ عِنْدَ الْمَاءِ فَقَالُوا أَتَأْذَنِينَ لَنَا أَنْ نَنْزِلَ عِنْدَكِ قَالَتْ نَعَمْ وَلٰكِنْ لَا حَقَّ لَكُمْ فِي الْمَاءِ قَالُوا نَعَمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَلْفَى ذٰلِكَ أُمَّ إِسْمٰعِيلَ وَهِيَ تُحِبُّ الْأُنْسَ فَنَزَلُوا وَأَرْسَلُوا إِلٰى أَهْلِيهِمْ فَنَزَلُوا مَعَهُمْ حَتّٰى إِذَا كَانَ بِهَا أَهْلُ أَبْيَاتٍ مِنْهُمْ وَشَبَّ الْغُلَامُ وَتَعَلَّمَ الْعَرَبِيَّةَ مِنْهُمْ وَأَنْفَسَهُمْ وَأَعْجَبَهُمْ حِينَ شَبَّ فَلَمَّا أَدْرَكَ زَوَّجُوهُ امْرَأَةً مِنْهُمْ وَمَاتَتْ أُمُّ إِسْمٰعِيلَ فَجَاءَ إِبْرَاهِيمُ بَعْدَ

ہی یہ بچہ اور اس کا والد اس کی تعمیر کرینگے اور اللہ تعالیٰ ان کو پریشان نہیں کریگا۔ اس وقت بیت کی جگہ ایک ٹیلہ کی طرح ابھری ہوئی تھی جب سیل آتی تو اس کے دائیں بائیں سے بہہ کر نکل جاتی تھی اسی طرح وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ جرہم کا ایک قافلہ یا ایک خاندان اس طرف سے گزرا جو سامنے سے کدار کی طرف سے آ رہا تھا، وہ آکر مکہ مکرمہ کی بائیں جانب اُترا۔ اُنہوں نے پرندہ منڈلاتا ہوا دیکھا تو کہا یہ پرندہ تو پانی ہی پر منڈلایا کرتا ہے ہم اس وادی میں پہلے بھی گزرے ہیں مگر یہاں تو پانی نہ تھا۔ انہوں نے ایک یا دو مستعد شخص بھیجے اُنہوں نے لوٹ کر پانی کا حال بیان کیا۔ وہ اس طرف آئے تو اس وقت اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ پانی کے پاس بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کہا اجازت ہو تو ہم بھی آپ کے پڑوس میں آبسیں انہوں نے فرمایا شوق سے مگر پانی میں تمہارا کوئی حق نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا بہت اچھا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ نے یہ اس لیے منظور فرمالیا کہ وہ تنہا تھیں اور اُنس کا کوئی سامان خود چاہتی تھیں۔ چنانچہ وہ قافلہ وہاں آگیا اور انہوں نے بقیہ لوگوں کو بھی کہلا بھیجا وہ بھی وہیں آکر آباد ہو گئے یہاں تک کہ جب یہاں ان کے کئی گھر آباد ہو گئے، ادھر اسمٰعیل علیہ السلام جوان ہو گئے تھے اور ان میں رہ کر عربی زبان بھی سیکھ چکے تھے، ان کے طور طریق اور حسن و جمال کی وجہ سے ان کی نظروں میں کھب گئے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے خاندان کی ایک خاتون سے ان کی شادی کر دی۔ اب اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ کی وفات ہو گئی تھی جب ابراہیم علیہ السلام اس بے آب و گیاہ میدان میں اپنے چھوڑے ہوئے بچہ کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے

مَا تَزَوَّجَ إِسْمٰعِيلُ يُطَالِعُ تَرِكَتَهُ، فَلَمْ يَجِدْ إِسْمٰعِيلَ فَسَأَلَ امْرَأَتَهُ عَنْهُ فَقَالَتْ خَرَجَ
يَبْتَغِي لَنَا ثُمَّ سَأَلَهَا عَنْ عَيْشِهِمْ وَهَيْئَتِهِمْ فَقَالَتْ نَحْنُ بِشَرٍّ نَحْنُ فِي ضِيقٍ وَشِدَّةٍ
فَشَكَتْ إِلَيْهِ قَالَ فَإِذَا جَاءَ زَوْجُكِ اقْرَئِي عَلَيْهِ السَّلَامَ وَقُولِي لَهُ يُغَيِّرْ عَتَبَةَ بَابِهِ
فَلَمَّا جَاءَ إِسْمٰعِيلُ كَأَنَّهُ آنَسَ شَيْئًا فَقَالَ هَلْ جَاءَكُمْ مِنْ أَحَدٍ قَالَتْ نَعَمْ جَاءَنَا
الشَّيْخُ كَذَا وَكَذَا فَسَأَلَنَا عَنْكَ فَأَخْبَرْتُهُ وَسَأَلَنِي كَيْفَ عَيْشُنَا فَأَخْبَرْتُهُ أَنَّا فِي جَهْدٍ وَ
شِدَّةٍ قَالَ أَوْصَاكِ بِشَيْءٍ قَالَتْ نَعَمْ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ السَّلَامَ وَيَقُولُ غَيِّرْ
عَتَبَةَ بَابِكَ قَالَ ذَاكِ أَبِي وَقَدْ أَمَرَنِي أَنْ أُفَارِقَكِ الْحَقِي بِأَهْلِكِ فَطَلَّقَهَا وَتَزَوَّجَ
مِنْهُمْ أُخْرَى فَلَبِثَ عَنْهُمْ إِبْرَاهِيمُ مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ أَتَاهُمْ بَعْدُ فَلَمْ يَجِدْهُ وَدَخَلَ عَلَى امْرَأَتِهِ
فَسَأَلَهَا عَنْهُ فَقَالَتْ خَرَجَ يَبْتَغِي لَنَا قَالَ كَيْفَ أَنْتُمْ وَسَأَلَهَا عَنْ عَيْشِهِمْ وَهَيْئَتِهِمْ
فَقَالَتْ نَحْنُ بِخَيْرٍ

تو اس وقت ان کی شادی ہو چکی تھی۔ گھر پر اسمٰعیل علیہ السلام موجود نہ تھے تو ان کی بیوی سے پوچھا
اسمٰعیل کہاں گئے ہیں؟ اس نے کہا ہمارے لیے رزق تلاش کرنے کی فکر میں گئے ہوئے ہیں۔ اس کے
بعد انہوں نے ان کے گزران کا حال پوچھا تو بیوی نے کہا بہت خراب اور تنگی اور مصیبت سے گزر ہوتی
ہے۔ غرض کہ اس نے شکایت ہی کے الفاظ کہے انہوں نے فرمایا کہ جب اسمٰعیل علیہ السلام آئیں تو
اُن سے ہمارا سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کر دیں جب اسمٰعیل علیہ السلام واپس
ہوئے تو ان کو اپنے والد کی آمد کا کچھ احساس ہوا اس لیے انہوں نے پوچھا۔ ہمارے پاس کوئی صاحب
آئے تھے اس نے جواب دیا جی ہاں ایک بوڑھے شخص آئے تھے انہوں نے پہلے تو آپ کو پوچھا میں
نے بتا دیا پھر ہمارے گزران کا حال پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ تکلیف اور سختی میں گزرتی ہے انہوں نے
پوچھا اچھا انہوں نے کوئی اور بات تم سے کہی ہے۔ اس نے کہا جی ہاں یہ کہ میں آپ کو ان کا سلام
کہہ دوں اور یہ بھی فرماتے تھے کہ آپ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دیں۔ یہ سُن کر انہوں نے فرمایا۔ یہ
میرے والد تھے اور مجھ کو حکم دے گئے ہیں کہ میں تم کو طلاق دیدوں لہٰذا تم کو طلاق ہے اپنے خاندان میں چلی
جاؤ۔ اس کے بعد انہوں نے اسی خاندان کی دوسری لڑکی سے شادی کر لی اس مدت میں جب تک
اللہ تعالیٰ کو منظور تھا ابراہیم علیہ السلام کا اس طرف آنا نہ ہو سکا۔ پھر جب بعد میں آئے تو اسمٰعیل علیہ
السلام ان کو پھر نہ ملے۔ ان کی بیوی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں تاکہ ہمارے
رزق کا سامان کریں انہوں نے کچھ اور حالات دریافت کرنے کے بعد ان سے بھی گزران کا حال پوچھا

وَسَعَةٍ وَاَثْنَتْ عَلَى اللّٰهِ قَالَ مَا طَعَامُكُمْ قَالَتِ اللَّحْمُ قَالَ فَمَا شَرَابُكُمْ قَالَتِ الْمَاءُ قَالَ اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِي اللَّحْمِ وَالْمَاءِ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ يَوْمَئِذٍ حَبٌّ وَلَوْ كَانَ لَهُمْ دَعَا لَهُمْ فِيْهِ قَالَ فَهُمَا لَا يَخْلُوْ عَلَيْهِمَا اَحَدٌ بِغَيْرِ مَكَّةَ اِلَّا لَمْ يُوَافِقَاهُ قَالَ فَاِذَا جَاءَ زَوْجُكِ فَاقْرَئِيْ عَلَيْهِ السَّلَامَ وَمُرِيْهِ يُثَبِّتُ عَتَبَةَ بَابِهٖ فَلَمَّا جَاءَ اِسْمٰعِيْلُ قَالَ هَلْ اَتَاكُمْ مِنْ اَحَدٍ قَالَتْ نَعَمْ اَتَانَا شَيْخٌ حَسَنُ الْهَيْئَةِ وَاَثْنَتْ عَلَيْهِ فَسَأَلَنِيْ عَنْكَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَسَأَلَنِيْ كَيْفَ عَيْشُنَا فَاَخْبَرْتُهٗ اَنَّا بِخَيْرٍ قَالَ فَاَوْصَاكِ بِشَيْءٍ قَالَتْ نَعَمْ هُوَ يَقْرَءُ عَلَيْكَ السَّلَامَ وَيَاْمُرُكَ اَنْ تُثَبِّتَ عَتَبَةَ بَابِكَ قَالَ ذَاكِ اَبِيْ وَاَنْتِ الْعَتَبَةُ اَمَرَنِيْ اَنْ اُمْسِكَكِ ثُمَّ لَبِثَ عَنْهُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ جَاءَ بَعْدَ ذٰلِكَ وَاِسْمٰعِيْلُ يَبْرِيْ نَبْلًا لَهٗ تَحْتَ دَوْحَةٍ قَرِيْبًا مِنْ زَمْزَمَ فَلَمَّا رَاٰهُ قَامَ اِلَيْهِ فَصَنَعَا كَمَا يَصْنَعُ الْوَالِدُ بِالْوَلَدِ وَالْوَلَدُ بِالْوَالِدِ ثُمَّ قَالَ

تو بیوی نے جواب دیا بہت راحت سے بسر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بڑی مدح سرائی کی اُنہوں نے دریافت کیا اچھا تمہاری خوراک کیا ہے؟ اس نے کہا گوشت۔ انہوں نے پوچھا پینے کے لیے کیا ملتا ہے؟ انہوں نے کہا پانی۔ یہ سُن کر ابراہیم علیہ السلام نے ان کو دعا دی الٰہی ان کے گوشت اور پانی میں اور برکت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اس زمانہ تک ان کے ہاں غلہ تھا ہی نہیں اس لیے اُنہوں نے صرف گوشت کا ہی ذکر کیا اگر وہاں غلہ ہوتا تو اس کے لیے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ضرور دعا فرماتے اور ان کی اس دعا ہی کی برکت کا نتیجہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے علاوہ صرف گوشت اور پانی کی غذا کہیں موافق نہیں آتی اُنہوں نے فرمایا اچھا تو جب تمہارے شوہر آئیں تو اُن سے ہمارا سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ قائم رکھیں۔ جب اسمٰعیل علیہ السلام آئے تو اُنہوں نے پوچھا کوئی شخص تمہارے پاس آئے تھے؟ اُس نے کہا ہمارے پاس ایک بڑے باوقار شخص تشریف لائے تھے اور ان کی بڑی تعریف کی۔ انہوں نے پہلے تو آپ کے متعلق پوچھا تھا میں نے تبلا دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے گزران کا حال پوچھا تو میں نے کہہ دیا ہم بہت راحت میں ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا اچھا انہوں نے تم سے کچھ اور بھی کہا ہے؟ اس نے جواب دیا جی ہاں آپ کو سلام کہنے کے لیے کہا اور کہا ہے کہ آپ اپنے دروازہ کی چوکھٹ برقرار رکھیں اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا یہ میرے والد تھے اور یہ فرما گئے ہیں کہ میں تم کو کبھی جدا نہ کروں۔ اس کے بعد پھر ایک مدت تک ابراہیم علیہ السلام کا آنا نہ ہو سکا پھر جب آئے تو اس وقت اسمٰعیل علیہ السلام زمزم کے قریب درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تیر تیار کر رہے تھے۔ جب اُن کی نظر والد پر پڑی تو بے اختیار کھڑے ہو گئے اور دونوں نے باپ بیٹے کے محبت و تکریم کے جو

يَا إِسْمٰعِيْلُ اِنَّ اللهَ اَمَرَنِيْ بِاَمْرٍ قَالَ فَاصْنَعْ كَمَا اَمَرَكَ رَبُّكَ قَالَ وَتُعِيْنُنِيْ قَالَ وَاُعِيْنُكَ قَالَ فَاِنَّ اللهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اَبْنِيَ هٰهُنَا بَيْتًا وَاَشَارَ اِلٰى اَكَمَةٍ مُّرْتَفِعَةٍ عَلٰى مَا حَوْلَهَا قَالَ فَعِنْدَ ذٰلِكَ رَفَعَا الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ فَجَعَلَ اِسْمٰعِيْلُ يَاْتِيْ بِالْحِجَارَةِ وَاِبْرَاهِيْمُ يَبْنِيْ حَتّٰى اِذَا ارْتَفَعَ الْبِنَاءُ جَاءَ بِهٰذَا الْحَجَرِ فَوَضَعَهٗ فَقَامَ عَلَيْهِ وَهُوَ يَبْنِيْ وَاِسْمٰعِيْلُ يُنَاوِلُهُ الْحِجَارَةَ وَهُمَا يَقُوْلَانِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ قَالَ فَجَعَلَا يَبْنِيَانِ حَتّٰى يَدُوْرَا حَوْلَ الْبَيْتِ وَهُمَا يَقُوْلَانِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. رواه البخاری

سَیِّدُنَا مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ کَلِیْمُ اللہ

۱۲۳۹۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ ذَكَرَ لَيْلَةَ اُسْرِيَ بِهٖ فَقَالَ مُوْسٰى اٰدَمُ طُوَالٌ كَاَنَّهٗ مِنْ رِّجَالِ شَنُوْءَةَ وَقَالَ عِيْسٰى جَعْدٌ مَّرْبُوْعٌ وَذَكَرَ مَالِكًا خَازِنَ

فرائض ہوتے ہیں وہ باہم ادا کیے اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ اسمٰعیل! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ایک بات کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا تو جس طرح آپ کے رب نے آپ کو حکم دیا ہے کیجیے انہوں نے فرمایا تم بھی میری کچھ مدد کرو گے انہوں نے عرض کی ضرور مدد کرونگا۔ انہوں نے فرمایا اچھا تو مجھ کو اس کا حکم دیا ہے کہ میں یہاں اس ابھرے ہوئے ٹیلہ کے ارد گرد ایک گھر بناؤں اور اس کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر بیت اللہ کی بنیادیں بلند کیں۔ اسمٰعیل علیہ السلام پتھر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام ان کو لگاتے جاتے یہاں تک کہ جب تعمیر اونچی ہوگئی تو یہ مقام ابراہیم والا پتھر لائے انہوں نے اس کو لاکر رکھ دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہوئے وہ بیت اللہ کی تعمیر کرتے جاتے اور اسمٰعیل علیہ السلام ان کو پتھر دیتے جاتے اور دونوں کی زبان پر یہ کلمات جاری تھے رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا الخ ہمارے پروردگار ہماری خدمت قبول فرمالے تو سننے والا اور جاننے والا ہے راوی کہتا ہے کہ وہ دونوں تعمیر کرتے جاتے تھے اور بیت کے ارد گرد گھوم گھوم کر یہ دعا مانگتے جاتے تھے۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔ (بخاری شریف)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ

۱۲۳۹۔ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ موسیٰ گندم گوں رنگ اور دراز قامت تھے جیسا قبیلہ شنوءۃ کے لوگ ہوتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام گھونگر والے

النَّارِ وَذَكَرَ الدَّجَّالَ . رواه البخاری۔

۱۲۴۰۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقَالَ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْاُمَمُ وَرَأَيْتُ سَوَادًا كَثِيْرًا سَدَّ الْاُفُقَ فَقِيْلَ هٰذَا مُوْسٰى فِيْ قَوْمِهٖ. رواه البخاری۔

۱۲۴۱۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ لَمَّا قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ وَجَدَهُمْ يَصُوْمُوْنَ يَوْمًا يَعْنِيْ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ فَقَالُوْا هٰذَا يَوْمٌ عَظِيْمٌ وَهُوَ يَوْمٌ نَجَّى اللّٰهُ فِيْهِ مُوْسٰى وَاَغْرَقَ اٰلَ فِرْعَوْنَ فَصَامَ مُوْسٰى شُكْرًا لِلّٰهِ فَقَالَ اَنَا اَوْلٰى بِمُوْسٰى مِنْهُمْ فَصَامَهٗ وَاَمَرَ بِصِيَامِهٖ رواه البخاری

۱۲۴۲۔ عَنْ عَلِيِّ بْنِ رَبَاحٍ قَالَ سَمِعْتُ عُتْبَةَ بْنَ النُّدَّرِ يَقُوْلُ كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَرَأَ طٰسٓ حَتّٰى اِذَا بَلَغَ قِصَّةَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ اِنَّ مُوْسٰى اٰجَرَ نَفْسَهٗ ثَمَانِيَ سِنِيْنَ اَوْ عَشْرَةً عَلٰى عِفَّةِ فَرْجِهٖ وَطَعَامِ بَطْنِهٖ. رواه ابن ماجة فی باب استیجار الاجیر قال ابن کثیر وهذا من هذا الوجه لا يصح لان مسلمة بن علی الحسنی

بال اور میانہ قد کے تھے اور اس شب کے عجائبات میں آپ نے مالک داروغہ دوزخ اور دجال کے دیکھنے کا بھی ذکر فرمایا۔ بخاری شریف۔

۱۲۴۰۔ ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور آپ نے فرمایا میرے سامنے تمام اُمتیں پیش کی گئیں تو میں نے ایک اُمت اتنی کثیر تعداد میں دیکھی کہ تمام افق اُس نے گھیر رکھا تھا۔ اس وقت مجھ کو بتایا گیا یہ موسیٰ علیہ السلام اپنی اُمت میں ہیں۔ (بخاری شریف)

۱۲۴۱۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہاں لوگ عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ بہت عظیم الشان دن ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نجات عطا فرمائی تھی اور فرعون کو غرق فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام نے شکر کے طور پر اس دن روزہ رکھا تھا۔ آپ نے فرمایا ان سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام سے قریب تر میں ہوں پھر آپ نے خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (بخاری شریف)

۱۲۴۲۔ علی بن رباح کہتے ہیں کہ میں نے عتبہ بن الندر سے خود سُنا ہے وہ بیان کرتے تھے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، ایسا ہوا کہ آپ نے اس وقت سورۂ "طٰسٓ" تلاوت فرمائی جب آپ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر پہنچے تو فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی پاکدامنی اور اپنی معاش کی خاطر آٹھ یا دس سال کے لیے اپنی خدمات سپرد کردی تھیں۔ ابن ماجہ

الدمشقی البلاطی ضعیف عند الائمۃ لا یحتج بتفردہ ولکن قد روی من وجہ آخر فذکرہ البدایۃ ص۲۷۳ فذکرہ بروایۃ البزار وابن ابی حاتم۔

۱۲۴۳۔ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَرَأَ (فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا) قَالَ ھٰکَذَا بِاِصْبَعِہٖ وَوَضَعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْاِبْھَامَ عَلَی الْمِفْصَلِ الْاَعْلٰی مِنَ الْخِنْصَرِ فَسَاخَ الْجَبَلُ۔ رواہ ابن جریر ورواہ احمد والترمذی وصححہ والحاکم ایضاً

۱۲۴۴۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ قَالُوْا لِمُوْسٰی ھَلْ یَنَامُ رَبُّکَ قَالَ اتَّقُوا اللّٰہَ فَنَادَاہُ رَبُّہٗ یَا مُوْسٰی سَأَلُوْکَ ھَلْ یَنَامُ رَبُّکَ فَخُذْ زُجَاجَتَیْنِ فِیْ یَدَیْکَ فَقُمِ اللَّیْلَ فَفَعَلَ مُوْسٰی فَلَمَّا ذَھَبَ مِنَ اللَّیْلِ ثُلُثٌ نَعَسَ فَوَقَعَ لِرُکْبَتَیْہِ ثُمَّ انْتَعَشَ فَضَبَطَھُمَا حَتّٰی اِذَا کَانَ اٰخِرُ اللَّیْلِ نَعَسَ فَسَقَطَتِ الزُّجَاجَتَانِ فَانْکَسَرَتَا فَقَالَ یَا مُوْسٰی لَوْ کُنْتُ اَنَامُ لَسَقَطَتِ السَّمٰوَاتُ وَالْاَرْضُ فَھَلَکْنَ کَمَا ھَلَکَتِ الزُّجَاجَتَانِ فِیْ یَدَیْکَ۔ قال فانزل اللّٰہ علی رسولہ اٰیۃ الکرسی۔ رواہ ابن ابی حاتم کما فی البدایۃ والنھایۃ۔

۱۲۴۵۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مُوْسٰی کَانَ رَجُلًا حَیِیًّا سِتِّیْرًا لَا یُرٰی مِنْ جِلْدِہٖ شَیْءٌ اِسْتِحْیَاءً مِنْہُ فَاٰذَاہُ مَنْ اٰذَاہُ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ

۱۲۴۳۔ انس روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ الخ اور آپ نے اپنا انگوٹھا انگلی کے اوپر کے پورے پر رکھ کر بتایا کہ بس اتنی سی تجلی ہوئی تھی کہ طور پہاڑ زمین میں دھنس گیا تھا۔ احمد، ترمذی۔

۱۲۴۴۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا۔ فرمایئے آپ کا پروردگار کیا سوتا بھی ہے؟ انہوں نے فرمایا ذرا اللہ سے ڈرو۔ اس پر ان کے پروردگار کی طرف سے آواز آئی اے موسیٰ یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ کا پروردگار سوتا ہے؟ تو تم اپنے دونوں ہاتھوں میں دو شیشے لے لو اور رات بھر کھڑے رہنا۔ موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب تہائی شب گزری تو ان کو اونگھ آئی اور وہ گھٹنوں کے بل گر گئے پھر اٹھ کر سنبھلے یہاں تک کہ جب آخر شب ہوئی تو پھر اونگھے اور دونوں شیشے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ گئے۔ ارشاد ہوا اے موسیٰ اگر کہیں ہم سوتے تو زمین و آسمان گر کر اسی طرح پاش پاش ہو جاتے جیسے تمہارے ہاتھوں میں یہ دونوں شیشے ہو گئے۔

۱۲۴۵۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام بڑے شرمیلے اور بڑے پردہ والے شخص تھے سارے شرم کے ان کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نظر نہ آتا تھا اس پر جن لوگوں

فَقَالُوْا مَا يَسْتَتِرُ هٰذَا التَّسَتُّرَ اِلَّا مِنْ عَيْبٍ بِجِلْدِهٖ اِمَّا بَرَصٌ وَاِمَّا اُدْرَةٌ وَاِمَّا اٰفَةٌ وَاَنَّ اللّٰهَ اَرَادَ اَنْ يُبَرِّاَهٗ مِمَّا قَالُوْا لِمُوْسٰى فَخَلَا يَوْمًا وَحْدَهٗ فَوَضَعَ ثِيَابَهٗ عَلَى الْحَجَرِ ثُمَّ اغْتَسَلَ فَلَمَّا فَرَغَ اَقْبَلَ اِلٰى ثِيَابِهٖ لِيَاْخُذَهَا وَاَنَّ الْحَجَرَ عَدَا بِثَوْبِهٖ فَاَخَذَ مُوْسٰى عَصَاهُ وَطَلَبَ الْحَجَرَ فَجَعَلَ يَقُوْلُ ثَوْبِيْ حَجَرُ ثَوْبِيْ حَجَرُ حَتّٰى انْتَهٰى اِلٰى مَلَاٍ مِّنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ فَرَاَوْهُ عُرْيَانًا اَحْسَنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ وَاَبْرَاَهٗ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ وَقَامَ الْحَجَرُ فَاَخَذَ ثَوْبَهٗ فَلَبِسَهٗ وَطَفِقَ بِالْحَجَرِ ضَرْبًا بِعَصَاهُ فَوَاللّٰهِ اِنَّ بِالْحَجَرِ لَنَدَبًا مِنْ اَثَرِ ضَرْبِهٖ ثَلٰثًا اَوْ اَرْبَعًا اَوْ خَمْسًا فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا. رواہ البخاری

کو ایذا دینی تھی آخر اُنہوں نے ان کو ایذا دی اور کہا کہ ہو نہ ہو اپنے جسم کو چھپانے میں اتنا مبالغہ کرنا ضرور یا تو اس لیے ہوگا کہ ان کے جسم میں کوئی عیب ہے اب وہ برص ہو یا ورم خصیہ یا ایسی ہی کوئی اور بیماری ہو اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس طعن سے بری فرمادے تو یوں ہوا کہ انہوں نے ایک دن تنہائی میں اپنے کپڑے اُتار کر پتھر پر رکھ دیے پھر غسل کرنے لگے جب غسل سے فارغ ہوگئے تو کپڑے لینے کے لیے پتھر کی طرف بڑھے پتھر ان کے کپڑے سمیت بھاگ پڑا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنا ڈنڈا لے کر اس کے پیچھے یہ کہتے ہوئے لپکے "او پتھر میرے کپڑے، او پتھر میرے کپڑے" یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے ایک جتھے میں جا پہنچے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو جو ننگا دیکھا تو وہ اسی طرح بے عیب اور خوبصورت تھے جیسا بہتر سے بہتر کوئی خوبصورت اور بے عیب ہو سکتا ہے، یہاں آکر پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے لے کر پہنے اور اپنا ڈنڈا لے کر پتھر پر کئی ضرب لگائیں۔ بخدا عصائے موسیٰ علیہ السلام کی ضرب کے اثر سے اس پر تین یا چار یا پانچ لکیریں پڑ گئی تھیں حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا واقعہ یہی ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا لا تکونوا الخ بخاری شریف

(۱۲۴۵) پتھر میں تکوینی طور پر شعوری یا غیر شعوری حرکت پیدا ہو جانی بالکل ممکن ہے۔ پھر جس پتھر سے شعوری حرکات سرزد ہوں اس کو ذی شعور کی طرح تنبیہ کرنا بھی بالکل معقول ہے اور اس پر نشانات پڑنے میں تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ جو معاملات تکوینی ہیں یعنی براہ راست قدرت کے افعال ہیں ان کو بواسطہ اسباب افعال پر قیاس کرنا سخت غلطی ہے۔ آسمان یا زمین اتنے بڑے کرات متحرک ہیں مگر اس میں کسی کو مجال شبہ نہیں۔ یہ قدرت کے بلا واسطہ افعال ہیں۔ پس اگر زمین جیسے بڑے کرہ کو حرکت کرنا ممکن ہے تو صرف ایک پتھر کی حرکت پر تعجب کیوں ہے۔ اصل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام قدرت کے براہ راست ترجمان ہوتے ہیں اس لیے ان کے ماحول میں قدرت کے بہت سے براہ راست افعال کا ظہور ہونا یہ بھی ایک عادۃ اللہ ہے اس لیے یہاں ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا کی آیت پڑھنا بے محل ہے۔

۱۲۴۶۔ اَخْبَرَنِي سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ قَالَ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ نَوْفًا الْبِكَالِيَّ يَزْعُمُ اَنَّ مُوسٰى لَيْسَ بِمُوسٰى بَنِي اِسْرَائِيلَ اِنَّمَا هُوَ مُوسٰى اٰخَرُ فَقَالَ كَذَبَ عَدُوُّ اللّٰهِ حَدَّثَنَا اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَامَ مُوسَى النَّبِيُّ (علیہ السلام) خَطِيبًا فِي بَنِي اِسْرَائِيلَ فَسُئِلَ اَيُّ النَّاسِ اَعْلَمُ فَقَالَ اَنَا اَعْلَمُ فَعَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ اِذْ لَمْ يَرُدَّ الْعِلْمَ اِلَيْهِ فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ اَنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِي بِمَجْمَعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ اَعْلَمُ مِنْكَ قَالَ يَا رَبِّ وَكَيْفَ بِهِ فَقِيلَ لَهُ اِحْمِلْ حُوتًا فِي مِكْتَلٍ فَاِذَا فَقَدْتَهُ فَهُوَ ثَمَّ فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقَ بِفَتَاهُ يُوشَعَ بْنِ نُونٍ وَحَمَلَا حُوتًا فِي مِكْتَلٍ حَتّٰى كَانَا عِنْدَ الصَّخْرَةِ وَضَعَا رُءُوسَهُمَا وَنَامَا فَانْسَلَّ الْحُوتُ مِنَ الْمِكْتَلِ فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا وَكَانَ لِمُوسٰى وَفَتَاهُ عَجَبًا فَانْطَلَقَا بَقِيَّةَ

۱۲۴۶۔ سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ نوف بکالی تو یہ کہتے ہیں کہ جن موسیٰ کی سرگزشت خضر علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم میں مذکور ہے وہ بنی اسرائیل والے موسیٰ علیہ السلام نہیں تھے بلکہ کوئی دوسرے موسیٰ ان کے ہمنام شخص تھے اس پر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نوف خدا کے دشمن نے غلط کہا۔ ہم سے ابی بن کعب نے خود بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سامنے کھڑے ہوئے وعظ فرما رہے تھے، تو ان سے سوال ہوا فرمایئے انسانوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا سب سے بڑا عالم میں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب ہوا کہ اُنہوں نے اس بات کا علم خدا تعالیٰ کے حوالے کیوں نہ کیا اس لیے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی (اے موسیٰ) مجمع بحرین میں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی پروردگار پھر اس کی ملاقات کیسے اور کہاں ہو ارشاد ہوا تو یوں کرو کہ ایک زنبیل میں مچھلی اپنے ہمراہ لے لو اور جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے بس وہیں وہ ملیگا۔ موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ہمراہ ان کے رفیق یوشع بن نون روانہ ہو گئے اور (حسب ہدایت) اپنے ہمراہ زنبیل میں ایک مچھلی بھی لے لی۔ چلتے چلتے جب ایک بڑے پتھر کے پاس پہنچے تو اپنا سر رکھ کر وہاں دونوں سو گئے، ادھر مچھلی زنبیل سے نکل گئی اور اس طرح سمندر میں داخل ہوئی کہ اس کے داخل ہونے کی جگہ پر سرنگ کی شکل بن گئی اس پر موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفیق کو بعد میں بڑا تعجب ہوا۔ وہ آگے چل پڑے اور جب بقیہ ایک دن رات کی مسافت

۱۲۴۶۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی اس سرگزشت کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کا تفصیلی تذکرہ خود قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اور جب اس پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام سرگزشت کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دہن مبارک سے نکلا ہوا ایک ذرا سا کلمہ تھا جس کو اگر مخلوق کے دائرہ میں رکھ کر دیکھا جائے

لَيْلَتِهِمَا وَيَوْمِهِمَا فَلَمَّا أَصْبَحَ قَالَ مُوسَى لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَٰذَا
نَصَبًا وَلَمْ يَجِدْ مُوسَى مَسًّا مِنَ النَّصَبِ حَتَّىٰ جَاوَزَ الْمَكَانَ الَّذِي أُمِرَ بِهِ فَقَالَ لَهُ
فَتَاهُ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ قَالَ مُوسَى ذَٰلِكَ مَا كُنَّا
نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا فَلَمَّا انْتَهَيَا إِلَى الصَّخْرَةِ إِذَا رَجُلٌ مُسَجًّى بِثَوْبٍ
أَوْ قَالَ تَسَجَّى بِثَوْبِهِ فَسَلَّمَ مُوسَى فَقَالَ الْخَضِرُ وَأَنَّىٰ بِأَرْضِكَ السَّلَامُ فَقَالَ أَنَا
مُوسَى فَقَالَ مُوسَى بَنِي إِسْرَائِيلَ قَالَ نَعَمْ قَالَ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا

طے کر چکے اور صبح ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سے کہا لاؤ بھئی ذرا ہمارا ناشتہ تو نکالو آج کے سفر میں تو ہم کو کچھ تکان ہو گیا اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو سفر میں تکان محسوس نہیں ہوا تھا اور آج بھی تکان اس وقت محسوس ہوا جبکہ وہ اس جگہ سے آگے نکل چکے تھے جس کا ان کو پتہ دیا گیا تھا ان کے رفیق سفر نے عرض کی جی ہاں جہاں ہم نے پتھر کے پاس آرام کیا تھا مچھلی تو اس جگہ گم ہو گئی تھی مگر مجھ کو آپ سے اس کا ذکر کرنا یاد نہیں رہا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اسی جگہ کی تو ہم کو تلاش تھی آخر پھر اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اسی راستہ پر واپس ہوئے جب اس پتھر کے پاس پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ہے جو چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو سلام کیا۔ اس پر خضر علیہ السلام نے کہا اس ملک میں سلام کہنے والا کہاں۔ انہوں نے فرمایا میں موسیٰ ہوں! انہوں نے کہا کیا وہ موسیٰ جو بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا جی ہاں میں وہی موسیٰ ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کیا میں آپ کے ہمراہ رہ سکتا ہوں تاکہ جو علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے وہ آپ مجھ کو بھی تعلیم

تو سرتاسر صدق ہی صدق نظر آتا ہے یعنی سائل بنی اسرائیل ہیں اور مخاطب نبی وقت موسیٰ علیہ السلام ہیں ادھر محاورات میں صیغۂ تفضیل کا مطلب کثرت اور زیادتی کے سوا، اور کچھ نہیں ہوتا اب اس میں کیا شبہ تھا کہ نبی وقت پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا نبی ان سے بڑھ کر علم میں اور کون شخص ہو سکتا تھا لیکن جب یہی معاملہ رسول اور خالق کے درمیان آیا تو اس صدق در صدق میں بھی خامی کا ایک پہلو نکل آیا اور وہ یہ کہ صیغۂ تفضیل عرف عام میں خواہ کسی معنی میں مستعمل ہو لیکن بلحاظ لغت اس میں اتنی وسعت ہے کہ اتنی وسعت اور اطلاق کا لفظ استعمال کرنا ایک نبی کی شان کے مناسب نہ تھا اس لیے جب سوال یہ ہو کہ سب سے بڑا عالم کون ہے تو نبی کی شان کے مطابق جواب یہ ہونا چاہیے کہ اس عموم و اطلاق کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو ہے چونکہ جواب میں ذرا سی خامی رہ گئی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے "انا اعلم" (میں سب سے عالم ہوں) کا لفظ نکل گیا اس لیے فوراً گرفت ہو گئی، اور ارشاد ہوا کیوں نہیں ہمارا ایک بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ اس پر جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کا پتہ دریافت کیا تو ان کے علمی نقصان کا ظہور تو یہیں سے شروع ہو گیا اور اس پہلے قدم پر ہی علم کا اتنا قصور واضح ہوا کہ جب ایسے بڑے علم والے شخص کے مقام کا بھی تم کو علم نہیں تو سوچو تمہارے علم کا مقام کیا ہے؟ پھر جب پتہ بتایا گیا ہو تو

عُلِّمْتَ رُشْدًا قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا يَا مُوسَى إِنِّي عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَنِيهِ لَا تَعْلَمُهُ أَنْتَ وَأَنْتَ عَلَى عِلْمٍ عَلَّمَكَهُ اللّٰهُ لَا أَعْلَمُهُ قَالَ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا فَانْطَلَقَا يَمْشِيَانِ عَلَى سَاحِلِ الْبَحْرِ لَيْسَ لَهُمَا سَفِينَةٌ فَمَرَّتْ بِهِمَا سَفِينَةٌ فَكَلَّمُوهُمْ أَنْ يَحْمِلُوهَا فَعُرِفَ الْخَضِرُ فَحَمَلُوهَا بِغَيْرِ نَوْلٍ فَجَاءَ عُصْفُورٌ فَوَقَعَ عَلَى حَرْفِ السَّفِينَةِ فَنَقَرَ نَقْرَةً أَوْ نَقْرَتَيْنِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ الْخَضِرُ يَا مُوسَى مَا نَقَصَ عِلْمِي وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ إِلَّا كَنَقْرَةِ

فرمائیں۔ انہوں نے کہا آپ ہرگز صبر کے ساتھ اس کو حاصل نہیں کر سکتے اے موسیٰ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں سے جو علم مجھ کو عطا فرمایا ہے وہ آپ نہیں جانتے اور جو علم آپ کو بخشا ہے وہ میں نہیں جانتا انہوں نے فرمایا ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو صابر دیکھینگے اور کسی معاملہ میں آپ کے خلاف نہیں کرونگا۔ اس کے بعد وہ دونوں سمندر کے کنارہ کنارہ روانہ ہو گئے کشتی ان کے پاس نہ تھی کہ دریا عبور کر سکتے۔ آخر ادھر سے ایک کشتی گزری تو انہوں نے اس کے ملاح سے گفتگو کی کہ ان کو بھی سوار کر لے اتفاق سے کسی نے خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور کسی اجرت کے بغیر ان کو کشتی میں بٹھا لیا اتنے میں ایک چڑیا اڑتی ہوئی آئی اور آکر کشتی کے کنارہ بیٹھ گئی اور سمندر میں ایک دو چونچیں ماریں۔ اس پر خضر علیہ السلام نے فرمایا اے موسیٰ میرا اور تمہارا علم مل کر بھی اللہ تعالیٰ کے علم سے اتنی نسبت بھی نہیں رکھتا جتنی کہ اس چڑیا کی چونچ کے

وہ بھی ایک ابہام کے ساتھ یعنی یہ کہ جہاں مچھلی گم ہو جائے اب کہاں؟ یہ معلوم نہیں۔ پھر جب سفر شروع ہوتا ہے تو موقعہ کی تلاش ہے، مگر جب موقع سامنے آجاتا ہے تو ذہول ہوتا ہے اور سفر کا قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔ آخر پھر واپس ہونا پڑتا ہے آخر جب خود کشش ربانی ہی کھینچ کر ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے تو معاہدہ کے وقت جو پہلی بات وہ سنتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو علم مجھ کو ہے وہ تم کو نہیں اور جو تم کو ہے وہ مجھ کو حاصل نہیں مقصد یہ ہے کہ علمی دنیا میں ہم دونوں ناقص در ناقص ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علمی قصور کی منزل ختم ہوئی تو اب خضر علیہ السلام کے علمی وفور کی منزل شروع ہوئی اور اس کا آغاز بھی ایک پرندہ کی آمد سے اس طرح ہوا کہ اے موسیٰ ہمارا اور تمہارا دونوں کا علم مل کر بھی کچھ نہیں ہے۔ آخر بڑے عہد و پیمان کے بعد سفر شروع ہوا اور قدم قدم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاعلمی اور حضرت خضر علیہ السلام کے علم کی برتری کا ظہور ہوتا چلا گیا۔ آخر جب واقعات سفر اور ان کے حکم سب بیان ہو گئے تو کچھ اور عجائبات قدرت کے سننے کی تمنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل ہی میں رہ گئی اور آپ نے بڑی حسرت کے انداز میں فرمایا کاش کہ موسیٰ علیہ السلام ذرا اور صبر سے کام لیتے۔

اس ایک واقعہ ہی سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت کا معاملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کتنا نازک ہوتا ہے۔ یہاں صغائر و کبائر درکار ہیں یا حسنات میں کسی باریکی کی فروگزاشت بھی کافی ہے۔ ابھی آپ پڑھ چکے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ صلوات اللہ وسلامہ کو جب ختنے کا حکم ہوا اور امتثالِ امر کی عجلت میں انہوں نے فوراً کدال لے کر ختنہ کر ڈالیں۔ تو کیا اس سے بڑھ کر بھی وفاداری اور اطاعت شعاری کا مظاہرہ کچھ ہو سکتا تھا۔ مگر جب ہونے

هٰذَا الْعُصْفُوْرُ فِي الْبَحْرِ فَعَمِدَ الْخَضِرُ إِلٰى لَوْحٍ مِنْ أَلْوَاحِ السَّفِيْنَةِ فَنَزَعَهُ فَقَالَ مُوْسٰى قَوْمٌ حَمَلُوْنَا بِغَيْرِ نَوْلٍ عَمَدْتَ إِلٰى سَفِيْنَتِهِمْ فَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيْتُ فَكَانَتِ الْأُوْلٰى مِنْ مُوْسٰى نِسْيَانًا فَانْطَلَقَا فَإِذَا غُلَامٌ يَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ فَأَخَذَ الْخَضِرُ بِرَأْسِهِ مِنْ أَعْلَاهُ فَاقْتَلَعَ رَأْسَهُ بِيَدِهِ فَقَالَ مُوْسٰى أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ وَهٰذَا أَوْكَدُ فَانْطَلَقَا حَتّٰى

پانی کی اس سمندر کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد خضر اُٹھے اور کشتی کا ایک تختہ اُکھاڑ پھینکا موسیٰ علیہ السلام فوراً بولے۔ یہ وہ شریف لوگ تھے جنھوں نے اُجرت لیے بغیر ہم کو کشتی میں بٹھالیا تھا۔ آپ نے یہ کیا کیا کہ لگے تو ان ہی کی کشتی کو توڑ ڈالا تاکہ سارے کشتی والوں کو ڈبو دیں۔ اُنھوں نے کہا میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ صبر کے ساتھ میرے ہمراہ نہیں رہ سکتے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں بھول گیا، اور آپ بھولی بات پر مجھ سے گرفت نہ فرمائیں۔ یہ پہلی بے صبری موسیٰ علیہ السلام سے از راہِ نسیان سرزد ہوئی۔ آگے چلے تو ایک بچہ جو بچوں میں کھیل رہا تھا، خضر علیہ السلام نے اس کا سر پکڑ کر گردن سے اُکھاڑ ڈالا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ آپ نے یہ کیا کیا ایک معصوم بچہ کو بے گناہ مار ڈالا۔ خضر علیہ السلام نے کہا میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا آپ صبر کے ساتھ میرے ہمراہ نہیں رہ سکتے۔ ابن عیینہ راوی حدیث کہتے ہیں یہاں لفظ "لک" (آپ سے) زیادہ تاکید کے لیے اضافہ

اپنی تکلیف کا اظہار فرمایا تو جواب یہ ملا کہ فتنہ کس طرح کرنی چاہیے یہ ہم سے پوچھا کیوں نہیں گویا اب اگر تکلیف ہوئی تو یہ تمہارا قصور ہے۔ سبحان اللہ! جو لوگ گرفت کی اس شدت کو نہیں جانتے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ "رب السجن احب الی" پر گرفت کا راز بھلا کیا سمجھ سکتے ہیں۔ ادھر ہمارے متکلمین ہیں کہ وہ صرف تعبیرات کی شدت سے انبیاء علیہم السلام کی علی الاطلاق عصمت میں اختلاف کر رہے ہیں۔ اگر ان لغزشوں پر پھر اس کے نتائج پر غور سے نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لغزشیں حِکم و اسرار کا ایک بحر بیکراں تھیں حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش سب سے پہلے ہے مگر عالم کی آبادی کا سارا راز اسی ایک لغزش میں پنہاں تھا پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دہن مبارک سے لغزش کا یہ کلمہ ضرور نکلا اور ان کو اس طویل سفر کی مشقت بھی جھیلنی پڑی مگر اس سفر میں کتنے اسرارِ حکمت کے دریا بہ نکلے اس کا اندازہ کچھ اسی سے فرمالیجیے کہ اس پورے سفر کو قرآن کریم نے کس تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا مزے لے لے کر اس کو سُنا آخر جب یہ طویل سفر ختم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں یہی اس کی حسرت رہ گئی کاش کہ یہ سفر کچھ اور دراز ہو جاتا تو عجائباتِ قدرت کچھ اور کھلتے۔

اس سرگزشت میں نہ معلوم کتنے درسِ عبرت ہوں گے۔ ہم اپنے قصورِ علم اور وقت کی فرصت کے لحاظ سے چند اہم اسباق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ واقعات کی سطح اور اندرونی حکمِ ربانی کے درمیان مناسبتوں کا ادراک

اِذَا اَتَيَا اَهْلَ قَرْيَةِ ۣاسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ قَالَ الْخَضِرُ بِيَدِهٖ فَاَقَامَهٗ فَقَالَ لَهٗ مُوْسٰى لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ قَالَ النَّبِيُّ

فرمایا۔ آگے چلے تو ایک بستی سے گزرے اور ان سے میہمانی کی درخواست کی۔ انہوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ وہاں ایک دیوار تھی جو بالکل ٹوٹنے والی تھی خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے اس کو سیدھا کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر آپ چاہتے تو اس کی اجرت ان سے لے سکتے تھے۔ خضر علیہ السلام نے کہا اچھا بس اس کے بعد اب ہماری آپ کی جدائی ہے آنحضرت

انسانی عقول کے احاطے سے باہر ہے اور اسی لیے ان حکمتوں کے ادراک کے درپے ہوئے بغیر صبر کے ساتھ واقعات کا مطالعہ کرنا چاہیے مگر یہی صبر عقول انسانیہ کے لیے بڑی امتحان گاہ ہے۔ اسی کی طرف قرآن کریم کی اس آیہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے: عسیٰ ان تحبوا شیئًا وھو شر لکم وعسیٰ ان تکرھوا شیئًا وھو خیر لکم اور یہ کہ خضر علیہ السلام کو جب واقعات و حکم کے اس غیر مدرک بالعقول ربط کا علم بخشا گیا تھا تو اسی کے ساتھ ان کو وہ قوت بھی عنایت فرمادی گئی تھی جس کی وجہ سے ایک گرنے والی دیوار صرف ان کے ایک اشارہ سے سیدھی ہو گئی بلکہ اتنی مستحکم ہو گئی تھی کہ جب تک اس کے نیچے دفینہ کا مالک جوان نہ ہولے وہ دیوار نہ گر سکے۔ اور یہ کہ جب تک مصالح ربانیہ کا کسی کو قطعی علم حاصل نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ خود قطعی طور پر ان کا مامور بھی نہ ہو اس وقت تک شریعت میں وہ افعال جرم اور معصیت ہی کی فہرست میں شمار ہونگے اور یہ کہ تکوینی امور کا راستہ تشریعی احکام سے الگ ہے اور ان کی تنفیذ کے لیے بھی تشریعی احکام کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بندے مقرر ہیں مگر وہ اتنے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی ان کا علم ضروری نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ ایسے افراد کو قدرت اس لیے عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھتی ہے کہ ان کے اس قسم کے افعال شریعت کی زد میں آکر اختلال نظم کا باعث نہ بنیں اور یہ کہ علم تشریعی کا درجہ علم تکوینی سے بلند ہے اور یہ کہ افضل کو اگر اس قسم کے جزئیات کا علم نہ ہو تو اس سے اس کے فضل و کمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور یہ کہ جن کو ان علوم کا حامل نہیں بنایا گیا ان کے لیے ان علوم کے حاملین کی نہ تلاش چاہیے اور نہ ان کی رفاقت اپنے لیے موجب کمال۔ اور اگر کہیں حسب الاتفاق ملاقات ہو جائے تو ان پر زبان طعن کھولنا بھی غلط ہے۔

اس روایت کے چند الفاظ کتاب التفسیر میں بھی دیکھ لیے جائیں۔

فاتخذ سبیله فی البحر سربا وامسك اللّٰه عن الحوت جریة الماء فصار علیه مثل الطاق۔	(دریا میں سرنگ پیدا ہونے کی صورت یہ ہوئی) کہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے داخل ہونے کی جگہ سے پانی کا سیلان روک دیا تو وہاں ایک طاق کی سی شکل پیدا ہو گئی۔
خذ نونًا میتًا حتی ینفخ فیه الروح	اے موسیٰ ایک مردہ مچھلی ساتھ لے لو یہاں تک کہ اس میں روح پڑ جائے۔
قال اما یکفیك ان التورات	(خضر علیہ السلام نے کہا اے موسیٰ کیا تم کو یہ تورات کافی نہیں

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْحَمُ اللهُ مُوسٰى لَوَدِدْنَا لَوْ صَبَرَ حَتّٰى يَقُصَّ عَلَيْنَا مِنْ اَمْرِهِمَا رواه البخاری۔

۱۲۴۷۔ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ نَوْفَلٍ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ يُؤْذِيْ مُوسٰى وَكَانَ ابْنَ عَمِّهٖ فَبَلَغَ مِنْ اَذَاهُ اِيَّاهُ اَنْ قَالَ لِامْرَاَةٍ بَغِيٍّ اِذَا اجْتَمَعَ النَّاسُ عِنْدِيْ غَدًا فَتَعَالِيْ وَقُوْلِيْ اِنَّ مُوسٰى رَاوَدَنِيْ عَنْ نَفْسِيْ فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ وَاجْتَمَعَ النَّاسُ جَاءَتْ فَسَارَّتْ قَارُوْنَ ثُمَّ قَالَتْ لِلنَّاسِ اِنَّ قَارُوْنَ قَالَ لِيْ كَذَا وَكَذَا وَاِنَّ مُوسٰى لَمْ يَقُلْ لِيْ شَيْئًا مِنْ هٰذَا فَبَلَغَ ذٰلِكَ مُوسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے ہماری تمنا تھی کاش کہ موسیٰ علیہ السلام ذرا اور صبر کر لیتے تاکہ ان کے کچھ واقعات ہم کو اور معلوم ہو جاتے۔ بخاری شریف

۱۲۴۷۔ عبداللہ بن الحارث سے روایت ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا اور ہمیشہ ان کے درپے آزار رہا کرتا تھا اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے ایک زانیہ عورت کو فہمائش کی کہ لوگ جب کل میرے پاس جمع ہوں تو تو یہ کہنا کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے مائل کرنا چاہا میرے قلب کو چنانچہ جب کل ہوئی اور لوگ جمع ہو گئے تو وہ آئی اور قارون سے چپکے سے اُس نے کوئی بات کہی۔ پھر لوگوں کو مخاطب کر کے بولی۔ اس قارون نے ہی مجھ کو موسیٰ علیہ السلام کے سر ایسی ایسی بات لگانے کے لیے کہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان باتوں میں سے کوئی حرف مجھ سے نہیں فرمایا۔ یہ خبر موسیٰ علیہ السلام کو بھی ہو گئی وہ اس وقت محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ سُن کر سجدہ

بیدیک وان الوحی یاتیک یا موسٰی ان لی علما لا ینبغی لک ان تعلمہ وان لک علما لا ینبغی لی ان اعلمہ	جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اور کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ وحی الٰہی تم پر آتی ہے۔ اے موسیٰ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا علم بخشا ہے جو آپ کے لیے مناسب نہیں اور آپ کو وہ علم دیا ہے جو میرے لیے مناسب نہیں۔
وفی اصل الصخرۃ عین یقال لہ الحیاۃ لا یصیب من مائھا شیٔ الا حیی فاصاب الحوت من ماء تلک العین قال فتحرک وانسل من المکتل فدخل البحر	درخت کی جڑ میں ایک چشمہ تھا جس کو آب حیات کہتے ہیں۔ اس کا پانی جس چیز کو لگ جاتا وہ زندہ ہو جاتی تھی۔ وہ پانی کسی طرح اس مچھلی پر بھی پڑ گیا تو وہ زندہ ہو گئی تھی

واقعہ مذکورہ کے بعض مجمل الفاظ کی شرح اس تشریح کی روشنی میں سمجھ لینی چاہیے۔

فَخَرَّ سَاجِدًا فَقَالَ اَیْ رَبِّ اَنَّ قَارُوْنَ قَدْ اٰذَانِیْ وَفَعَلَ وَفَعَلَ وَبَلَغَ مِنْ اَذَاهُ اِیَّایَ اَنْ قَالَ مَا قَالَ فَاَوْحَی اللّٰهُ اِلٰی مُوْسٰی اَنْ یَا مُوْسٰی اِنِّیْ قَدْ اَمَرْتُ الْاَرْضَ اَنْ تُطِیْعَكَ وَكَانَ لِقَارُوْنَ غُرْفَةٌ قَدْ ضَرَبَ عَلَیْهَا صَفَائِحَ الذَّهَبِ فَاَتَاهُ مُوْسٰی وَجُلَسَاؤُهُ فَقَالَ لِقَارُوْنَ قَدْ بَلَغَ مِنْ اَذَاكَ اَنْ قُلْتَ كَذَا وَكَذَا یَا اَرْضُ خُذِیْهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الْاَرْضُ اِلٰی كَعْبِهِمْ فَهَتَفُوْا یَا مُوْسٰی اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ اَنْ یُنْجِیَنَا مِمَّا نَحْنُ فِیْهِ فَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَّبِعُكَ وَنُطِیْعُكَ فَقَالَ خُذِیْهِمْ فَاَخَذَتْهُمْ اِلٰی اَنْصَافِ سُوْقِهِمْ فَهَتَفُوْا وَقَالُوْا یَا مُوْسٰی اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ اَنْ یُنْجِیَنَا مِمَّا نَحْنُ فِیْهِ فَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَّبِعُكَ وَنُطِیْعُكَ فَقَالَ یَا اَرْضُ خُذِیْهِمْ اِلٰی رُكَبِهِمْ فَلَمْ یَزَلْ یَقُوْلُ یَا اَرْضُ خُذِیْهِمْ حَتّٰی تَطَابَقَتْ عَلَیْهِمْ وَهُمْ یَهْتِفُوْنَ فَاَوْحَی اللّٰهُ اِلَیْهِ یَا مُوْسٰی مَا اَفْظَكَ اَمَا اَنَّهُمْ لَوْ كَانُوْا اِیَّایَ دَعَوْا لَخَلَّصْتُهُمْ. رواه عبد الرزاق کما فی الصارم المسلول ص ۲۱ واخرج ابن ابی شیبۃ فی المصنف وابن المنذر وابن ابی حاتم والحاکم نحوہ وصححہ

میں گر گئے اور فرمایا پروردگار قارون نے مجھ کو بڑی تکلیفیں دیں اور جو کچھ اس نے کیا وہ کیا یہاں تک کہ اب اس نے تہمت لگانے کی نوبت بھی آگئی۔ اسی وقت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی میں نے زمین کو حکم دے دیا ہے تم اُس سے جو کہوگے وہ تمہاری تابعداری کریگی۔ قارون ایک بالاخانہ میں رہتا تھا جس میں اس نے سونے کے پتر چڑھا رکھے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت قارون کے احباب بھی وہاں موجود تھے اور فرمایا کہ تیری ایذاؤں کی اب یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ تو نے اس قسم کے کلمات بھی کہے۔ اے زمین تو ان کو پکڑلے زمین نے فوراً ٹخنوں تک ان کو ہضم کر لیا۔ اس پر وہ چیخ پڑے۔ موسیٰ! اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ وہ ہم کو اس عذاب سے نجات بخش دے تو ہم آپ پر ایمان لے آئینگے، آپ کے ساتھ ہو جائینگے اور آپ کے تابعدار بن جائینگے مگر موسیٰ علیہ السلام نے زمین سے پھر یہی فرمایا ان کو اور گھٹنوں تک پکڑلے موسیٰ علیہ السلام زمین سے برابر یونہی فرماتے رہے حتیٰ کہ زمین اوپر سے مل گئی اور وہ اس کے اندر چیختے کے چیختے ہی دھنستے چلے گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی آئی۔ موسیٰ! تم کتنے تیز مزاج ہو، خوب سُن لو اگر وہ مجھ کو وہ ایک بار بھی پکارتے تو میں

کما فی الدر المنثور من قصۃ قارون ۱۳۶/۵

۱۲۴۸۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یُوْنُسُ رفع هذا الحدیث اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ کَانَ مَلَكُ الْمَوْتِ یَأْتِی النَّاسَ عِیَانًا قَالَ فَاَتٰی مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ فَلَطَمَهٗ فَفَقَأَ عَیْنَهٗ وَفِیْ اٰخره فَرَدَّ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَیْنَهٗ وَکَانَ یَاْتِی النَّاسَ خُفْیَةً رواه احمد ورفعه ابن جریر ایضا کما فی البدایۃ والنهایۃ

سَیِّدُنَا دَاوٗدُ عَلَیْهِ السَّلَام

۱۲۴۹۔ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ کَانَ لِدَاوٗدَ عَلَیْهِ السَّلَامُ مِنَ اللَّیْلِ سَاعَةٌ یُوْقِظُ فِیْهَا اَهْلَهَا یَقُوْلُ یَا اٰلَ دَاوٗدَ قُوْمُوْا فَصَلُّوْا فَاِنَّ هٰذِهٖ سَاعَةٌ یَسْتَجِیْبُ اللّٰهُ

ان کو نجات دیدیا۔ درمنثور۔ الصارم المسلول۔

۱۲۴۸۔ ابوہریرۃؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ پہلے ملک الموت وفات کے وقت آمنے سامنے آیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ جب وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو انہوں نے ان کے تھپڑ مارا اور ان کی آنکھ پھوٹ گئی۔ پھر پورا واقعہ ذکر فرمایا۔ اس کے بعد دستور یہ ہو گیا کہ وہ پوشیدہ طور پر آنے لگے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

۱۲۴۹۔ عثمان بن ابی العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ شب میں ایک وقت تھا جبکہ داؤد علیہ السلام اس وقت پر اپنے اہل کو بیدار کر دیتے اور یہ فرماتے جاتے تھے اے آل داؤد اٹھو اور نماز پڑھو کیونکہ یہ ایسا مقبول وقت ہے جس میں اللہ تعالیٰ سب کی دعائیں

۱۲۴۹۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع شریعت میں انبیاء سابقین کے درخشاں عمل چن چن کر جمع کر دیے گئے ہیں۔ آپ نے رات کی اس ساعت میں جو تہجد کے وقت اپنی ساری امت کو نماز کی تاکید فرمائی ہے پس جس امت کو انبیاء علیہم السلام کے اعمال حسنہ کی تعلیم دی گئی ہو اس کے کمالات کا اندازہ کر لینا چاہیے۔

عَزَّوَجَلَّ فِيْهَا الدُّعَاءَ إِلَّا لِسَاحِرٍ اَوْ عَشَّارٍ. رواه احمد

۱۲۵۰۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الصَّلٰوةِ اِلَى اللّٰهِ صَلٰوةُ دَاوٗدَ وَاَحَبُّ الصِّيَامِ اِلَى اللّٰهِ صِيَامُ دَاوٗدَ كَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَيَقُوْمُ ثُلُثَهٗ وَيَنَامُ سُدُسَهٗ وَيَصُوْمُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا متفق عليه وقد ذكره البخاری اطول من ھذا فی کتاب الانبياء۔

۱۲۵۱۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُفِّفَ عَلٰى دَاوٗدَ الْقُرْاٰنُ فَكَانَ يَاْمُرُ بِدَوَابِّهٖ فَتُسْرَجُ فَيَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ قَبْلَ اَنْ تُسْرَجَ دَوَابُّهٗ

قبول فرماتا ہے سوائے جادوگر اور عشر وصول کرنے والے شخص کے۔ (احمد)

۱۲۵۰۔ عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نمازوں میں سب سے پیاری نماز اور روزوں میں سب سے پیارے روزے اللہ کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز اور ان کے روزے تھے۔ نماز کے معاملہ میں ان کا دستور یہ تھا کہ نصف شب سوتے پھر تہائی شب خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے اور آخر کے چھٹے حصہ میں پھر آرام فرماتے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ (متفق علیہ)

۱۲۵۱۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کے لیے زبور کے ترانے اتنے ہلکے اور خفیف کر دیے گئے تھے کہ وہ اپنی سواری تیار کرنے کا حکم دیتے ادھر اس پر زین کسی جاتی ادھر زین کسنے سے پہلے پہلے یہ زبور پڑھ کر فارغ ہو جاتے۔ ان میں

خدائی محاسبہ بھی کیسا خوفناک مرحلہ ہے کہ جس ساعت میں دعا کی قبولیت کا عام اعلان ہو وہاں بھی ان اشخاص کے لیے نااُمیدی ہی نظر آتی ہے جن کی بداعمالی خلق اللہ کے لیے موجب اذیت ہو ایک ساحر اور دوسرا سرکاری عشر وصول کرنے والا۔

۱۲۵۰۔ اس صورت سے تمام حقوق کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ خالق کے حقوق تو کون ادا کر سکتا ہے مگر یہ اس کی رحمت ہے کہ بندہ کے تھوڑے سے عمل کو قبول فرما لیتا ہے جبکہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی بھی ہوتی رہے۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم و جان بھی خدائی امانت ہیں اور ان کے بھی ہمارے ذمہ کچھ حقوق ہیں کمال یہ ہے کہ جملہ اہل حقوق کے حقوق علیحدہ علیحدہ ادا ہوں۔

۱۲۵۱۔ قدرت کے یہاں ایک باب طیِّ زمان کا بھی ہے یعنی بہت سا عمل تھوڑے سے وقت میں ہو جاتا

وَلَا يَأْكُلُ إِلَّا مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ. رواه البخاری

سَيِّدُنَا سُلَيْمَانُ عَلَيْهِ السَّلَام

۱۲۵۲۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَتِ امْرَأَتَانِ مَعَهُمَا ابْنَاهُمَا جَاءَ الذِّئْبُ فَذَهَبَ بِابْنِ إِحْدٰهُمَا فَقَالَتْ صَاحِبَتُهَا إِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ وَقَالَتِ الْأُخْرٰى إِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ فَتَحَاكَمَتَا إِلٰى دَاوُدَ فَقَضٰى بِهِ لِلْكُبْرٰى فَخَرَجَتَا عَلٰى سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ فَأَخْبَرَتَاهُ فَقَالَ ائْتُونِي بِالسِّكِّينِ أَشُقُّهُ بَيْنَكُمَا فَقَالَتِ الصُّغْرٰى لَا تَفْعَلْ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ

بڑی خاص بات یہ تھی کہ صرف اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

۱۲۵۲۔ ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے بیان فرمایا کہ دو عورتیں تھیں ان کے ساتھ ان کے دو بچے تھے۔ بھیڑیا آیا اور ان میں سے ایک کا بچہ لے گیا۔ اس پر اس کی ساتھی بولی کہ تیرے بچہ کو لے گیا ہے، دوسری نے کہا نہیں تیرے کو لے گیا ہے۔ یہ دونوں اپنا معاملہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس لے کر آئیں انہوں نے روئداد مقدمہ سن کر بڑی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس کے بعد پھر وہ دونوں سلیمان بن داؤد کی طرف چلیں اور ان دونوں نے پھر یہاں اپنا معاملہ بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا اچھا لاؤ چھری لاؤ میں اس لڑکے کو کاٹ کر آدھا آدھا تم دونوں کو دیے دیتا ہوں۔ یہ سن کر چھوٹی بول پڑی۔ خدا تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، دیکھیے ایسا نہ کیجیے چلیے یہ لڑکا

سلف اُمت کے اعمال پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو اس حقیقت کا لاچار اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اگر قدرت کی طاقت کی ترازو لگانے والے ذرا غور کریں تو ان کو اس کے سمجھنے میں نہ کوئی دشواری ہو اور نہ شب معراج کے طویل سفر کے سمجھنے میں کوئی دقت ہے۔

۱۲۵۲۔ اس روایت میں اس کی کوئی تفصیل نہیں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا فیصلہ کس بنیاد پر تھا۔ لہٰذا اس پر بحث کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت سلیمان کے فیصلے کی تفصیلات بھی یہاں بیان میں نہیں آئیں۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ مبہم ہونے کی وجہ سے انہوں نے یہ شکل اس لیے اختیار کی تھی کہ

هُوَ ابْنُهَا فَقَضَى بِهِ لِلصُّغْرٰى. متفق علیہ

اسی کا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر انہوں نے یہ فیصلہ دے دیا کہ لڑکا چھوٹی کو دے دیا جائے۔ (متفق علیہ)

کسی تدبیر سے اصل واقعہ کا انکشاف ہو جائے۔ ان کی اس غیر معمولی فہم کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے: ففہمناها سلیمان وکلا آتینا حکماً وعلماً (الانبیاء)

نوٹ: صفحہ ۵۲۰ خالی تھا۔ اس لئے وہ موجودہ ایڈیشن میں حذف کر دیا گیا ہے۔ قارئین پریشان نہ ہوں۔

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیبہ کی ایک اہم سرگذشت کے متعلق

چند جدید علمی اور منصفانہ نکات قرآن وحدیث اور تاریخ کی روشنی میں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول قیامت کی بڑی علامت ہے اس لئے اس کو عالم کے تعمیری نظم و نسق کی بجائے تخریبِ عالم کے نظم ونسق پر قیاس کرنا چاہیئے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حیاتِ طیبہ میں رفع و نزول کی سرگذشت بیشک عجیب تر ہے لیکن اس پر غور کرنے سے قبل سب سے پہلے یہ سوال سامنے رکھنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ کس دور اور کس شخصیت کے ساتھ متعلق ہے کیونکہ دنیا کے روزمرہ معمولی واقعات بھی زمانہ اور شخصیتوں کے اختلاف سے بہت مختلف ہوجاتے ہیں اور اُن کی تصدیق و تکذیب میں بڑا فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی زمین پر ایک خطۂ زمین ایسا بھی ہے جہاں مہینوں کی رات اور مہینوں کا دن ہوتا ہے اور ان ہی سمندروں میں ایک سمندر ایسا بھی ہے جس پر مسافر موسم سرما میں خشکی کی طرح سواریوں پر چلتے ہیں اسی طرح انسانوں کا اختلاف بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ شجاعت و طاقت اور دانائی و فرزانگی کے وہ بعید سے بعید کارنامے جو رستم و اسفندیار، اور بلے اور ہٹلر، اسٹالن اور لینن وغیرہ کے حق میں بے تامل قابل تصدیق سمجھے جاتے ہیں وہ عام انسانوں کے حق میں بڑے تامل کے بعد بھی مشکل قابل تصدیق ہوسکتے ہیں۔ پس صرف عام انسانوں کے حالات کے لحاظ سے یا صرف اپنے دور اور اپنے زمانہ کے حالات پر قیاس کر کے کسی صحیح واقعہ کا انکار کردینا کوئی معقول طریقہ نہیں ہے۔

لہٰذا مسئلہ نزول پر بحث کرنے کے وقت بھی سب سے پہلے اس پر غور کرلینا ضروری ہے کہ یہ واقعہ کس دور اور کس زمانہ سے پھر کس شخصیت سے متعلق ہے۔

جب آپ ان دو سوالوں پر محققانہ نظر ڈالیں گے تو پوری وضاحت سے ثابت ہوگا کہ یہ واقعہ تخریب عالم یعنی قیامت کے واقعات کی ایک کڑی ہے اور تخریب عالم کا ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو عالم کے تعمیری دور کے واقعات سے ملتا جلتا ہو۔ پس اگر تخریب عالم کے وہ سب واقعات جو تعمیری دُنیا کے بعد کے واقعات سے مختلف ہونے کے باوجود قابل تصدیق ہیں تو پھر اس ایک واقعہ کی تصدیق میں آپ کو تامل کیوں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عالم کی تخلیق اور اُس کی تخریب کے دونوں واقعات اتنے عجائبات پر مشتمل ہیں کہ جو انسان ان دونوں جانبوں سے غائب ہے وہ بیچارہ اپنے موجودہ حالات کی دنیا دیکھ کر ان کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ آپ عالم کی تخلیق کے واقعات پر ذرا نظر ڈالیں، زمین کس طرح بنائی گئی، پھر کس طرح بچھائی گئی، آسمان کس طرح بنائے گئے آدم کس طرح پیدا ہوئے اُن کا جوڑا کس طرح پیدا ہوا پھر کس طرح خلافت ارضی قائم ہوئی اسی طرح بہت سے واقعات ہیں جو ایک سے ایک عجیب تر ہیں اور ان سب ہی کے بیان کی ذمہ داری خود قرآن کریم نے اپنے سر رکھی ہے اگر آپ

ان میں سے ایک واقعہ بھی عالم کے تعمیری دور کے نظم و نسق سے ملا کر دیکھیں تو آپ کو ان میں سے ایک واقعہ کے فہم میں بھی سخت الجھن پیش آئے گی اور اسی بنا پر ایک جماعت نے تو سرے سے تخلیق عالم ہی کا انکار کر کے قدم عالم کا راستہ لے لیا ہے مگر آپ کے نزدیک کیا اس کا یہ طریقہ کار صحیح ہے ؟

اسی طرح جب آپ تخریب عالم کے واقعات پر نظر ڈالیں گے تو وہ بھی عجیب در عجیب ہی نظر آتے ہیں یعنی کبھی نہ پھٹنے والے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے آفتاب و ماہتاب اور یہ تمام روشن ستارے بے نور ہو کر گر پڑیں گے اور کبھی جنبش نہ کرنے والے یہ بڑے بڑے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے نظر آئیں گے اور یہ سارا کا سارا عالم ہستی عدم محض اور صرف نیستی کے تحت آجائے گا. یہ اور ان جیسے اور بہت سے عقل سے بالاتر واقعات کے بیان کی ذمہ داری بھی خود قرآن کریم ہی نے اٹھائی ہے اب اگر آپ ان کی تصدیق کا فیصلہ موجودہ عالم کے واقعات کے پیش نظر کرنے بیٹھ جائیں تو کیا آپ کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں گے لیکن ہاں جب آپ عالم کی تخلیق اور اس کی تخریب کے دونوں سرے ملا کر دیکھیں گے تو دونوں آپ کو بالکل یکساں صورت میں نظر آئیں گے.

پس چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول کا مسئلہ بھی عالم کے درمیانی واقعات کا مسئلہ نہیں بلکہ تخریب عالم کے واقعات کی ایک اہم کڑی ہے اس لئے اپنی جگہ وہ بھی معقول ہے ظاہر ہے کہ جب تمام مردوں کے زندہ ہو ہو کر ایک میدان میں جمع ہونے کا زمانہ قریب آرہا ہو تو اس سے ذرا قبل صرف ایک زندہ انسان کا آسمانوں سے زمین پر آنا کونسی بڑی بات ہے. بلکہ اس طویل گمشدگی کے بعد یہ جسمانی نزول مجموعۂ عالم انسانی کے جسمانی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک بدیہی اور محکم برہان ہے اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی شان میں ارشاد ہے وانہ لعلمٌ للساعۃ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام قیامت کی ایک مجسّم علامت ہیں درمنثور میں حضرت ابن عباس رضؓ اور حسن رضؓ اور قتادہ رضؓ سے منقول ہے کہ اس آیت کا مصداق قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی تشریف آوری ہے

اس کے بعد جب آپ اس پر غور کریں گے کہ یہ پیشگوئی ہے کسی شخصیت کے متعلق، وہ شخصیت کسی عام بشری سنت کے تحت کوئی بشر ہے یا ان سے کچھ الگ ہے تو آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ وہ صرف عام انسانوں ہی سے نہیں بلکہ جملہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں بھی سب سے الگ اور سب سے ممتاز خلقت کا بشر ہے جتنے انسان ہیں جن کی تخلیق صرف ایک صنف انسانی سے وجود میں آئی ہے پھر اس میں تمثل جبرئیلی اور نفخۂ ملکی اور تکلم فی المہد کے واقعات اور بھی عجیب تر ہیں. ان کے معجزات دیکھئے تو وہ بھی کچھ نرالی شان رکھتے ہیں ان میں سے ہر ہر معجزہ ایسا ہے جس میں "باذن اللہ" کی قید لگانی پڑتی ہے، ان کے گذشتہ دورِ حیات میں ملکیت کا اتنا غلبہ ہے کہ کھانے پینے رہنے سہنے، شادی و نکاح کا کوئی نظم و نسق ہی نہیں ملتا، یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ ان سب ضروریات سے منزّہ و مبرّا سچ مچ کے ایک فرشتہ ہیں پھر جب ان کی ہجرت کا مرحلہ سامنے آتا ہے تو یہاں بھی ان کی شان سب سے نرالی نظر آتی ہے یعنی

* وہ سب مذکر و مؤنث کی دو صنفوں سے پیدا ہوئے ہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے انسان ہیں الخ

اُن کی ہجرت کسی خطۂ ارضی کی بجائے اُس عالم کی طرف ہوتی ہے جو ملکوت اور ارواح کا مستقر ہے غرض اُن کی حیات
کے جس گوشہ پر نظر ڈالئے وہ ملکوتیت کا ایک مرقعہ نظر آتا ہے۔ یہاں قرآن کریم نے جو لقب اُن کو عطا فرمایا ہے وہ بھی
سب سے ممتاز ہے اور اس نوع کا لقب ہے جس سے کہ اُن کی زندگی کی یہ سب خصوصیات اجمالی طور پر بیک نظر
سامنے آجاتی ہیں یعنی "روح اللہ" اور "کلمۃ اللہ" گو بنی آدم جتنے بھی ہیں اُن سب کی روحیں اللہ تعالےٰ ہی کی طرف
اور اُسی کے حکم کُن سے آئی ہیں مگر یہاں اس روح کی آمد میں کوئی ظاہری واسطہ بھی نہ تھا اور جو واسطہ تھا وہ ایسا
ہی تھا جس کے موجود ہونے سے عالم قدس کی طرف اُن کی نسبت میں کوئی فرق نہیں پڑتا یہ تمام کا تمام وہ تذکرہ حیات
ہے جو اُن کے آسمانوں پر جانے سے قبل سے متعلق ہے اب آپ نازل ہونے کے بعد اُن کے حالات پر نظر ڈالئے تو وہ
پہلی زندگی کے بالکل برعکس ہیں یہاں اُن کے تمام معاملات میں دنیا کا مرتب نظم و نسق ملتا ہے حتیٰ کہ نکاح و ولادت
کا بھی اور اس سے بھی بڑھ کر اُن کی حیثیت ایک امام و امیر کی ثابت ہوتی ہے گویا وہ انسانوں میں بھی کوئی معمولی طبقہ
کے انسان نہیں بلکہ اس اعلیٰ طبقہ کے انسان ہیں جن کی قیادت میں اسفل طبقہ کے انسان ترقی کرکے اعلیٰ طبقہ کے
انسان بن سکتے ہیں۔ غرض اُن کی حیات کے یہ دو دور تمام تر قدرت کے ان عجائبات سے مشابہ ہیں جو عالم میں دست
قدرت کے براہِ راست پیدا کردہ ہیں وہ بیک وقت بن باپ پیدا ہو کر آغاز عالم کے واقعات میں حضرت آدم علیہ السلام
کے مشابہ ہیں ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم اور اتنی طویل غیبت کے بعد عالم کے خاتمہ پر جسمانی نزول فرما کر علامات قیامت
میں بھی شمار ہیں وانہ لعلم للساعۃ فلا تمترن بہا اگر ایک طرف اپنی پہلی حیات میں آسمانوں پر جاکر وہ فرشتوں سے مشابہ
ہیں تو دوسری طرف نزول کے بعد موت اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں مدفون ہو کر عام انسانوں کی صف میں
بھی داخل ہیں۔ اگر پہلی زندگی میں اُن کا معجزہ احیا ہوتی ہے تو نزول کے بعد دوسرے دورِ حیات میں اماتۂ دجال یعنی
قتل دجال ہے۔ ان کی یہ تمام سوانح حیات قرآن کی بیان کردہ ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء آیت وان من اہل الکتاب الا
لیؤمنن بہ الخ آئندہ اُن کی وفات اُن کے نزول کی شاہد ہے جیسا کہ آئندہ اس کی تشریح آئے گی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک انسان کا آسمانوں پر زندہ جانا اور زندہ رہنا اور آخر زمانہ میں پھر اسی جسم عنصری
کے ساتھ اُتر آنا نہ عام انسانوں کی سنت ہے اور نہ زمانہ کے عام واقعات کے موافق ہے لیکن اگر آپ یہ دو باتیں ملحوظ رکھیں
کہ یہ مسئلہ تخریب عالم کا ایک مقدمہ ہے اور ہے بھی اس شخصیت کے متعلق جس کے دیگر حالات زندگی بھی عالم کے عام
دستور کے موافق نہیں تو پھر بنظر انصاف اس میں آپ کو کوئی تردد نہ ہونا چاہیئے۔ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کو حضرت آدم علیہ السلام سے تشبیہ دیکر یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کی ہستی کو عالم کے درمیانی سلسلہ پر قیاس کرنا صحیح نہیں اگر
اُن کے حالات کو قیاس کرنا ہی ہے تو تخلیق عالم کے حالات پر قیاس کرکے دیکھو تمہارا سب تعجب جاتا رہے گا۔

اصل یہ ہے کہ مادی عقول کے نزدیک کچھ یہی ایک مسئلہ نہیں ہے جو زیر انکار آرہا ہو بلکہ عالم غیب کے تمام حقائق

ہی زیر انکار ہیں۔ اور درحقیقت یہ عقل و نقل کی اصولی جنگ کا ثمرہ ہے ارباب عقل یہ سمجھتے ہیں کہ اخبار انبیاء علیہم السّلام سب خلافِ عقل ہوتے ہیں اور اصحاب نقل یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات بھی عقلی ہو وہ سب شریعت کے خلاف ہوتی ہے۔ یہ نزاع و جدل درحقیقت عقل و شرع کا صحیح مفہوم متعین نہ کرنے سے پیدا ہو رہا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:۔ کون نہیں جانتا کہ قرآن و سنّت نے جا بجا عقل کی تعریف فرمائی ہے بلکہ اپنی دعوت کا مخاطب ہی صرف اہل فہم اور اہل عقل کو قرار دیا ہے۔ مجنون اور بچے اس کی دعوت کے احاطہ سے ہی باہر ہیں لیکن جب بعض اہل بدعت نے بعض کلامی مسائل کو جو دراصل قرآن و سنت کے بھی خلاف تھے اصول دین میں داخل کر دیا اور اس کا نام عقلیات رکھا تو اب اہل شرع کو عقلیات کے نام ہی سے ایسی نفرت پیدا ہوگئی کہ جو شخص بھی عقلی استدلال کرتا نظر آتا اُن کے نزدیک بدعتی اور باطل پرست سمجھا جاتا دوسری طرف جب عقلائے اہل شرع سے وہ مسائل سُنے جو صریح عقل اور یقینی تاریخ کے خلاف تھے اُس پر ان کا یہ دعویٰ سُنا کہ وہ قرآن وحدیث کے بیان کردہ ہیں تو ان کے دلوں میں نفس قرآن و سنّت ہی کے متعلق خلاف عقل ہونے کی بدگمانی جٹھ گئی حتیٰ کہ اب جو قرآن و سنّت سے استدلال کرتا اُن کے نزدیک قانون فطرت اور تقاضۂ عقل کا مخالف ہوتا۔ یہاں غلطی دونوں فریق کی ہے۔ عقلاء کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق کئے بغیر ہر خلاف عقل بات کا نام شرع کیوں رکھدیا اور علماء کی کوتاہی یہ ہے کہ انھوں نے جو عقل صحیح کا تقاضہ نہ تھا اس کو شرع کے مفہوم میں کیسے داخل کر دیا حالانکہ شریعت کا ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جو عقل سلیم کے نزدیک قابل انکار ہو یا محالات کی تعریف میں آتا ہو لیکن جب کسی ابتدائی غلطی پر کچھ مدّت گذر جاتی ہے تو وہ غلطی راسخ ہوتے ہوتے عقائد کا رنگ پیدا کر لیتی ہے اور جو کسی صحیح حقیقت پر نتائج و آثار مرتب ہوتے ہیں وہی اس غلطی پر مرتب ہونے لگتے ہیں اس لئے اگر مسائل پر گفتگو کرنے سے قبل عقل و شرع کا صحیح صحیح مفہوم متعین کر لیا جائے تو عقلاء اور علماء کے درمیان بحث و جدل کا یہ وسیع میدان بہت تنگ ہو سکتا ہے۔

علماء ہر خلاف عقل بات کو شرع کے مفہوم میں داخل کرنے کی سعی کرنا ترک کر دیں اور عقلا شرع کی ہر بات پر خلاف عقل ہونے کی بدگمانی دل سے نکال ڈالیں اور عقل و فکر کا کوئی صحیح معیار مقرر کرلیں (کتاب النبوت ص۱۰۲)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ قابل تسلیم نہیں ہے تو پھر آپ کو بھی ایک فیصلہ کرنا ہوگا کہ عالم کے تخلیق و تخریب کے دوسرے تمام واقعات بھی قابل تسلیم نہیں ہیں اور اگر وہ سب قابل تصدیق ہیں تو پھر یہ مسئلہ بھی قابل تصدیق ماننا ہوگا۔ صرف اس لئے آغاز عالم کے تعمیری واقعات سے آپکی زندگی کا اب کوئی تعلق باقی نہیں رہا یہ مستقبل بعید کے تخریبی واقعات کے موجودہ دور کے انسانوں کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے ان سب سے صرف نظر کرکے بحث کا رخ صرف مسئلہ نزول میں منحصر کر لینا اپنے نفس کو بھی مغالطہ میں رکھنا ہے اور دوسروں کو بھی مغالطہ میں ڈالنا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جزئی معاملات کی اہمیت

واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اس لحاظ سے بھی سب میں ممتاز ہے کہ اُن کے جزئی جزئی واقعات کو بھی قرآن کریم نے اصولی معاملات کی سی اہمیت دی ہے مثلاً ان کی ولادت کا معاملہ یہ ایک جزئی معاملہ ہے مگر اُن کی ولادت کو بھی قرآن کریم نے بڑی اہمیت سے ذکر کیا ہے یعنی فرشتہ کا بصورت بشری آنا اور اپنی آمد کی غرض وغایت بتانا اس پر حضرت مریم کا ناکتخدائی کی حالت میں تعجب فرمانا پھر فرشتہ کا جواب اور اس کے بعد ان کے گریبان میں پھونک مارنا یہ سب تفصیلی ذکر ہیں حتیٰ کہ اُن کی والدہ کا دردِ زہ بھی پھر ولادت اور اُس پر لوگوں کی چہ میگوئیاں بھی۔ ظاہر ہے کہ ان سب معاملات میں سے کس معاملہ کو اصولی اور بنیادی کہا جا سکتا ہے ؟ مگر کیا ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی ہے جس کو آپ صرف ایک جزئی معاملہ کہہ کر ٹال سکتے ہوں اور جس پر عقیدہ رکھنا کوئی ضروری بات نہ ہو پھر عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے اہم واقعہ کو صرف ایک جزئی معاملہ کہہ کر آپ کیونکر عقائد کی فہرست سے خارج کر سکتے ہیں۔

مسئلہ نزول کی حیثیت کتب عقائد میں

یہی وجہ ہے کہ شروع سے لے کر آج تک کتب عقائد میں اس مسئلہ کو بھی دیگر عقائد کے ساتھ ساتھ ایک عقیدہ ہی شمار کیا ہے حتیٰ کہ محدثین نے جو مؤلفات ترتیب دی ہیں گو اُن کو عقائد کی شکل پر مرتب نہیں فرمایا اُن کے مقاصد دوسرے ہیں لیکن اس کے باوجود امام مسلم نے جن کی کتاب کو بلحاظ ترتیب بخاری شریف پر بھی فوقیت دی گئی ہے نزول عیسیٰ علیہ السلام کو ابواب ایمان کا ایک جزء قرار دیا ہے پھر یہ کہنا کتنی کوتاہ نظری ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ چونکہ ایک جزئی مسئلہ ہے اس لئے اس کو عقائد اور ایمانیات کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ معجزات کی بحث میں ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس پر اور مبسوط بحث کریں گے کہ رسولوں کی اخبار پر ایمان رکھنا یہ جزئی مسئلہ نہیں بلکہ ایک بنیادی مسئلہ ہے رہا خاص نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ تو اس کو اس حیثیت کے علاوہ رسالت اور قیامت کے مسئلہ سے بھی براہ راست تعلق ہے جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آنے والی ہے۔ یہاں ایک عجیب بات یہ ہے کہ ذات وصفات، قضاء وقدر، حشر ونشر اور رؤیۃ باری تعالیٰ وغیرہ جن مسائل کو بے چون وچرا عقائد میں داخل سمجھا گیا ہے۔ اُن میں تو کافی اختلافات بھی ملتے ہیں چنانچہ معتزلہ ان سب مسائل میں اہلسنت والجماعت سے اپنا علیحدہ خیال رکھتے ہیں حتیٰ کہ اشاعرہ وماتریدیہ کے مابین بھی بعض مسائل میں ضرب المثل اختلاف موجود ہے لیکن اس کے باوجود ان مسائل کو کسی نے عقائد کی فہرست سے خارج نہیں کیا اس کے برخلاف نزول عیسیٰ علیہ السلام کا مسئلہ ہے جس میں سلف سے لے کر آج تک ائمہ دین میں سے کسی کا اختلاف ثابت نہیں پھر اس کو عقائد کی فہرست سے کس طرح خارج کیا جا سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ معتزلہ جو مذکورہ بالا مسائل میں اہلسنت سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں وہ بھی اس مسئلہ میں جمہور اُمت کے ساتھ متفق ہیں جیسا کہ زمخشری نے کشاف میں اس کی تصریح کی ہے۔ ابن عطیہ لکھتے ہیں کہ تمام اُمت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قرب قیامت میں بجسم عنصری پھر

تشریف لانے والے ہیں جیسا کہ متواتر حدیثوں سے ثابت ہے۔ دیکھو (بحر محیط ص ۴۷۳ ج ۲)

مسئلہ نزول کی حیثیت احادیث میں

اس بارے میں اگر حدیثوں پر نظر ڈالئے تو تیس صحابہ سے تقریباً سو حدیثوں میں باسالیب مختلفہ اس مسئلہ کو تکرار قسمیں کھا کھا کر دہرایا گیا ہے۔ اس بڑے ذخیرہ میں سے چالیس حدیثیں تو ایسی ہیں جن کی تصحیح و تحسین محدثین نے صراحت کے ساتھ ثبت فرما دی ہے اور بقیہ کے متعلق گو صراحۃً ان سے تحسین منقول نہو لیکن کوئی صاف جرح بھی ثابت نہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس پیشگوئی کا رتبہ کیا ہے دعوی سے کہا جاسکتا ہے کہ متواتر حدیث کی جو بڑی سے بڑی مثال پیش کی گئی ہے اس پیشگوئی کا پلہ کسی طرح بھی اس سے ہلکا نہیں ہے۔ پھر جب کتب سابقہ پر نظر ڈالی جائے تو یہاں انجیل بھی احادیث نبویہ کے ساتھ اس درجہ مطابق ملتی ہے کہ اس کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے اور یہ یقین بدیہی بن جاتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام کا نزول صرف اسی شریعت کا مسئلہ نہیں بلکہ جملہ ادیان سماویہ کا ایک ایسا متفقہ عقیدہ ہے جس میں اصل دین کی طرح کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا

مسئلہ نزول کی حیثیت انجیل میں

پھر اس مسئلہ کی حقیقت ایک عام اور مجمل پیشگوئی کے سمجھ لینے میں کتنی بڑی فروگذاشت ہوگی انجیل متی باب ۲۴ آیت ۳ میں ہے:- اور جب وہ زیتون کے پہاڑ پر بیٹھا تھا اس کے شاگردوں نے خلوت میں اس کے پاس آکر کہا' ہم سے یہ کہہ کہ یہ کب ہوگا اور تیرے آنے کا اور زمانہ کے آخر ہونے کا نشان کیا ہے؟ تب یسوع نے جواب میں اُن سے کہا۔ خبردار کوئی تمہیں گمراہ نہ کرے کیونکہ بہتیرے میرے نام پر آئیں گے اور کہیں گے کہ میں مسیح ہوں اور بہتوں کو گمراہ کریں گے۔ اور تم لڑائیوں اور لڑائیوں کی افواہوں کی خبر سنو گے خبردار مت گھبرائیو کیونکہ ان سب باتوں کا ہونا ضرور ہے پر اب تک آخر نہیں ہے کہ قوم قوم پر اور بادشاہت بادشاہت پر چڑھ آوے گی اور کال اور مری پڑیگی اور جگہ جگہ بھونچال آئیں گے یہ سب کچھ مصیبتوں کا شروع ہے۔

انجیل متی باب ۲۴۔ ۲۳۔ ۲۸۔ اس وقت اگر کوئی تم سے کہے کہ دیکھو مسیح یہاں ہے یا وہاں ہے تو یقین نہ کرنا کیونکہ جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اُٹھ کھڑے ہونگے اور ایسے بڑے نشان اور عجیب کام دکھائیں گے کہ اگر ممکن ہو تو برگزیدوں کو بھی گمراہ کرلیں۔ دیکھو میں نے پہلے ہی تم سے کہدیا ہے پس اگر وہ تم سے کہیں کہ دیکھو وہ بیابان میں ہے تو باہر نہ جاؤ دیکھو وہ کوٹھریوں میں ہے تو یقین نہ کرنا کیونکہ جیسے بجلی پورب سے کوندکر پچھم تک دکھائی دیتی ہے ویسے ہی ابن آدم کا آنا

ان صحابہ کے اسماء مبارکہ یہ ہیں جن کی تفصیلی روایات دیکھنی ہوں تو رسالہ "التصریح بما تواتر من الاحادیث فی نزول المسیح" مؤلفہ محترم جناب مولانا محمد شفیع صاحب مفتی پاکستان' ملاحظہ فرمائیں۔

ابو ہریرۃ[۱]۔ جابر بن عبداللہ[۲]۔ نواس بن سمعان[۳]۔ ابن عمر[۴]۔ حذیفۃ بن اسید[۵]۔ ثوبان[۶]۔ مجمع[۷]۔ ابو امامۃ[۸]۔ ابن مسعود[۹]۔ ابو نضرۃ[۱۰]۔ سمرۃ[۱۱]۔ عبدالرحمن بن جبیر[۱۲]۔ ابو الطفیل[۱۳]۔ انس[۱۴]۔ واثلہ[۱۵]۔ عبداللہ بن سلام[۱۶]۔ ابن عباس[۱۷]۔ اوس[۱۸]۔ عمران بن حصین[۱۹]۔ عائشۃ[۲۰]۔ سفینۃ[۲۱]۔ حذیفۃ[۲۲]۔ عبداللہ بن مغفل[۲۳]۔ عبدالرحمن بن سمرۃ[۲۴]۔ ابو سعید الخدری[۲۵]۔ عمار[۲۶]۔ ربیع[۲۷]۔ الحسن[۲۸]۔ عروہ بن رویم[۲۹]۔ کعب[۳۰]۔ الامام جعفر[۳۱]

رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ہوگا جہاں مردار ہے وہاں گدھ جمع ہو جائیں گے

اور فوراً ان دنوں کی مصیبت کے بعد سورج تاریک ہو جائے گا اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور ستارے آسمان سے گریں گے اور آسمانوں کی قوتیں ہلائی جائیں گی اور اس وقت ابن آدم کا نشان آسمان پر دکھائی دیگا اور اسوقت زمین کی ساری قومیں چھاتی پیٹیں گی اور ابن آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھیں گی

انجیل لوقا ۲۱-۲۶ میں اتنی زیادتی اور ہے ۔ اور ڈر کے مارے اور زمین پر آنے والی بلاؤں کی راہ دیکھتے دیکھتے لوگوں کی جان میں جان نہ رہے گی ۔۔۔ اور جب یہ باتیں ہونے لگیں تو سیدھے ہو کر سر اوپر اٹھانا اس لئے کہ تمہاری مخلصی نزدیک ہوگی انجیل مرقس و لوقا میں

انجیل متی باب ۲۴-۳۲ : اب انجیر کے درخت کی ایک تمثیل سیکھو جونہی اس کی ڈالی نرم ہوتی ہے اور پتے نکلتے ہیں تم جان لیتے ہو کہ گرمی نزدیک ہے اسی طرح جب تم ان سب باتوں کو دیکھو تو جان لو کہ وہ نزدیک ہے بلکہ دروازہ پر ہے۔

اعمال باب ۱ آیت ۹ - اور وہ یہ کہہ کے ان کے دیکھتے ہوئے اوپر اٹھایا گیا اور بدلی نے اسے ان کی نظروں سے چھپا لیا اور اس کے جاتے ہوئے جب وے آسمان کی طرف تک رہے تھے دیکھو دو مرد سفید پوشاک پہنے ان کے پاس کھڑے تھے اور کہنے لگے اے جلیلی مردو تم کیوں کھڑے آسمان کی طرف دیکھتے ہو۔ یہی یسوع جو تمہارے پاس سے آسمان پر اٹھایا گیا ہے اسی طرح جس طرح تم نے اسے آسمان کو جاتے دیکھا ہے پھر آوے گا۔

مسئلہ نزول کی حیثیت قرآن کریم میں

خدا تعالیٰ کی سب سے آخری کتاب قرآن کریم ہے جب اس پر نظر ڈالئے تو اس میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی یہی حیثیت ثابت ہوتی ہے رہا ان کے رفع جسمانی کا مسئلہ تو اس کو تو قرآن کریم نے اہل کتاب کے مقابلہ میں اپنی جانب سے ایک فیصلہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آتی ہے وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۔ یعنی اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لے آئے ۔ آیت بالا میں اس کی تصریح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ابھی فوت نہیں ہوئے نیز یہ کہ آئندہ زمانہ میں کسی شبہ کے بغیر اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا ہے یہی وجہ ہے کہ ابو ہریرہ رض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی صحیح حدیث روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر اس پیشگوئی کو تم قرآن کریم کی روشنی میں دیکھنا چاہو تو آیت بالا کو پڑھ لو۔ اس کی مزید تشریح آئندہ آئے گی اور اس مغالطہ کو بھی دور کر دیا جائیگا کہ نزول کا لفظ قرآن کریم میں کیوں نہیں آیا۔ پس اگر یہ مسئلہ جو کتب سابقہ سے لے کر احادیث نبویہ اور خود کتاب اللہ میں اس تواتر کے ساتھ ثابت ہے عقائد کی فہرست میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہے تو پھر اور کس مسئلہ کو عقائد میں شمار کیا جا سکتا ہے تعجب ہے کہ یہاں کتب سماویہ کو اس پر جتنا اصرار ہے ہماری مادی عقول کو اس سے اتنا ہی انکار ہے۔ فالی اللہ المشتکی

مسئلہ نزول کی اہمیت اور اصول دین سے اس کا تعلق

موجودہ دور کے مبصرین کی نظر یہاں ایک اور واضح حقیقت سے بھی چوک گئی ہے وہ صرف اس بحث میں اُلجھ کر رہ گئی ہے کہ نزول عیسیٰ علیہ السّلام کی خبر صرف ایک پیشگوئی ہے اور جس طرح دیگر پیشگوئیاں نہ صرف صداقت رسول کا ایک معیار ہوتی ہیں یہ بھی اسی نوع کی ایک پیشگوئی ہے لہذا جو اُمّت اس رسول کی تصدیق پہلے سے کر چکی ہے اس کے حق میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ اور اسی غلط فہمی میں اُنھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اصل دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اُن کو یہ علم ہی نہیں کہ اس پیشگوئی کو ایک اصولی اہمیت بھی حاصل ہے کیونکہ اہل کتاب کی دو مرکزی جماعتوں کا نقطۂ ضلالت یہی پیشگوئی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رح لکھتے ہیں کہ کتب سابقہ میں دو مسیح کی آمد کی پیشگوئی کی گئی تھی ایک مسیح ہدایت کی جس کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تھے اور دوسری مسیح ضلالت کی جس کا مصداق دجّال ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی ولادت ہوئی تو یہود بے بہبود نے اُن کو تو مسیح ضلالت کا مصداق ٹھہرا لیا اور اس لئے اُن کی ایذا رسانی اور قتل کے در پے رہے اور جب مسیح ضلالت ظاہر ہو گا یعنی دجّال تو اُس کو مسیح ہدایت کا مصداق ٹھہرائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام یہود دجّال کی اتباع کر لیں گے۔ اس کے برعکس نصاریٰ ہیں کہ اُنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو گو مسیح ہدایت کا مصداق تو مانا مگر حد سے بڑھا کر ان کو اقانیم ثلاثہ کا ایک جز بنا لیا اب یہاں ان دونوں بڑی بڑی جماعتوں کو جو بسیط ارض پر پھیلی پڑی ہیں ایک مسیح کی آمد کا انتظار لگ رہا ہے یہود کو تو اس لئے کہ اُن کے نزدیک مسیح ہدایت کی جو پیشگوئی کی گئی تھی اُس کا ظہور ابھی باقی ہے۔ لہذا مسیح ہدایت کو آنا چاہیئے اور نصاریٰ کو اس لئے کہ اُن کے زعم میں وہی مسیح دوبارہ آکر مخلوق کا حساب لیں گے اور یہی دن قیامت کا دن ہوگا (دیکھو الجواب الصحیح صفحہ ۱۳۴ و ص ۱۸۱)

اس مسئلہ پر بحث کے وقت اگر اس اہم تاریخ کو بھی سامنے رکھ لیا جاتا تو یہ واضح ہو جاتا کہ اس پیشگوئی کی حقیقت نہ صرف ایک پیشگوئی کی ہے اور نہ ایک جزئی واقعہ کی بلکہ اس کا تمام تر تعلق اصول دین کے ساتھ ہے کیونکہ رسالت اور قیامت کے دونوں مسئلے اصولی مسئلے ہیں اور اس مسئلہ کو ان دونوں سے گہرا تعلق ہے۔ یہاں یہودیوں کی یہ گمراہی کتنی اصولی گمراہی تھی کہ اُنھوں نے مسیح ہدایت یعنی خدا تعالیٰ کے ایک سچّے رسول کو مسیح ضلالت یعنی دجّال ٹھہرا لیا تھا اور نصاریٰ کی یہ گمراہی بھی کتنی اصولی تھی کہ اُنھوں نے خدا تعالیٰ کے ایک رسول کی آمد کو خدائی آمد اور اُس کی آمد کے دن کو قیامت کا دن سمجھ رکھا تھا۔ ان دو اصولی غلطیوں کی اصلاح پر دنیا کی ان دو بڑی بڑی اُمّتوں کے ایمان کا دار و مدار ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی آمد کی پیشگوئی کی وہی اہمیت محسوس فرمائی ہے جو کسی اصولی معاملہ کی ہو سکتی ہے اور مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کی تفصیلات بیان فرما دی ہیں کہ پھر آئندہ ان دونوں کے ظہور کے وقت ان کی شناخت میں دونوں قوموں کو کوئی مغالطہ نہیں لگ سکتا یہود آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جس کو انھوں نے "مسیح ضلالت" سمجھا تھا (والعیاذ باللہ) درحقیقت وہ مسیح ہدایت تھے اور نصاریٰ کو یہ خوب ثابت ہو جائے گا کہ جسکو انھوں نے

خدائے تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا تھا۔ درحقیقت وہ اس کا ایک بندہ اور اس کی مخلوق تھا اور اُن کی آمد قیامت کا دن نہیں بلکہ اس کی ایک بڑی علامت تھی اور ساری غلطیاں خود عیسیٰ علیہ السّلام ہی کی زبان سے دور کردی جائینگی تاکہ اختتام عالم سے قبل اتحاد ملل کے راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہوسکتی تھیں وہ ایک ایک کرکے سب دور کردی جائیں اور ملل سماویہ کی وحدت کا وعدہ پوری صفائی اور صداقت سے پورا ہوجائے وتمت کلمت ربك صدقا وعدلا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی اہمیت تاریخی نظر میں

یہ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام ان انبیاء علیہم السّلام میں سے نہیں ہیں جن کا تذکرہ تاریخ نے محو کرڈالا ہو بلکہ اُن اولو العزم رسولوں میں سے ہیں جن کا تذکرہ ہر دور میں بڑی اہمیت کے ساتھ ہوتا رہا ہے اہل کتاب کے وہ بڑے بڑے گروہ اُن کی ایک ایک علیحدہ تاریخ رکھتے ہیں اور خود اہل اسلام کے پاس بھی اُن کی ایک منقح تاریخ موجود ہے۔ یہود کی تاریخ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو انھوں نے قتل کرڈالا ہے اس لئے اُن کے نزدیک تو اُن کی حیات اور دوبارہ تشریف آوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا رہ گئے نصاریٰ تو وہ اُن کے دوبارہ تشریف آوری کے قائل ہیں مگر وہ اُس دن کو قیامت کا دن سمجھتے ہیں اور مجمل طور پر اُن کے سولی چڑھائے جانے اور زندہ ہوکر آسمانوں پر اُٹھائے جانے کے بھی قائل ہیں۔ اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ نہ وہ قتل ہوئے اور نہ سولی دیئے گئے بلکہ زندہ اسی جسم عنصری کے ساتھ آسمانوں پر اُٹھائے گئے اور قیامت سے پہلے پھر اسی جسم عنصری کے ساتھ تشریف لائیں گے اور مدینہ طیبہ میں جوار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں وفات کے بعد مدفون ہونگے۔ اب ایسا اولو العزم رسول کے متعلق یہ حق کس کو پہنچتا ہے کہ وہ کوئی ایسی جدید تاریخ بنالے جو دنیا میں کسی جماعت کو بھی مسلم نہ ہو۔ مثلاً یہ کہنا ہے کہ وہ سولی پر چڑھائے گئے پھر نیم مردنی کی حالت میں اتار لئے گئے تھے پھر کہیں جاکر اپنی طبعی موت سے مرگئے اور آخر کشمیر یا کسی اور شہر میں جاکر ایسی گمنامی کی حالت میں مدفون ہوگئے جس کی اطلاع کسی کو نہیں ہوسکی اس جلیل القدر رسول کی اس جدید تاریخ کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسا آج کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرے کہ آپکی وفات اور دفن کا سب افسانہ غلط ہے۔ بلکہ جب کفار نے آپ کو زیادہ ستایا تو آپ اپنے جسم عنصری کے ساتھ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور آئندہ پھر تشریف لانے والے ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی عاقل ایسا ہے جو اس رسول اعظم کی اس جدید تاریخ پر غور کرے اور اس کے دلائل سننے کے لئے تیار ہو۔ ہمارے نزدیک ایک مسلم فوت شدہ رسول کے زندہ آسمانوں پر جانے کی تاریخ میں اور ایک مسلم زندہ آسمانوں پر موجود رسول کے متعلق اُن کی موت اور دفن کی جدید تاریخ میں کوئی فرق نہیں نہ وہ عقلاء کے نزدیک قابل توجہ ہے نہ یہ قابل التفات ہوسکتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی وفات کی اہمیت تاریخ کی نظر میں

یہ بات کتنی عجیب ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام خود بھی اولو العزم ہیں اُن کی اُمت بھی تسلسل کے ساتھ کسی انقطاع کے بغیر اب تک چلی آرہی ہے پھر ان کی موت اور اُن

کی قبر کا صحیح صحیح حال آجتک ان سب پر کیسے مخفی رہ گیا۔ بالخصوص یہود جو ان کے قتل کے مدعی تھے وہ اس اہم واقعہ سے کیسے غفلت اختیار کر سکتے تھے۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول ہونے کے لئے ان کی قبر کی نشاندہی اُن کے لئے سب سے کھلا ہوا ثبوت تھی مگر یہاں نہ تو یہود اُن کی قبر کا پتہ نشان بتا سکتے ہیں اور نہ اس بارے میں نصاریٰ کے پاس ہی کوئی صحیح علم ہے ادہر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان جو مدت ہے وہ تقریباً چھ سو سال کی مُدت ہے یہ اتنی طویل مدت نہیں کہ اس میں کسی ایسی اولوالعزم تاریخی شخصیت کی قبر اتنی لاپتہ ہو جائے کہ نہ اس کے ماننے والوں بلکہ پوجنے والوں کو معلوم ہو اور نہ اُس کے دشمنوں کو اس اُمت میں نہ معلوم کتنے اولیاء اللہ گذر چکے ہیں جن کی وفات پر اس سے کہیں زیادہ کی مدت گذر چکی ہے مگر اُن کی قبریں آجتک تازہ یادگاریں معلوم ہوتی ہیں پھر عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور ان کی قبر کی ایسی گمنامی یہ کیسے قرین قیاس ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لاکر اُن کے حق میں کبھی موت کا ایک حرف نہیں فرمایا اور نہ اُن کی قبر کا کہیں نشان بتایا۔ درانحالیکہ یہ مسائل آپ کی آنکھوں کے سامنے زیر بحث چل رہے تھے اس کے برعکس فرمایا تو یہ کہ وہ دوبارہ تشریف لائیں گے اور ابھی ان کی وفات نہیں ہوئی اور قبر بتائی تو مستقبل بعید میں اپنے پہلو کے قریب مدینہ طیبہ میں۔ اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے تردید الوہیت کے موقعہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معمولی سے معمولی حالات کا تذکرہ فرمایا ہے مثلاً ان کا کھانا کھانا کانا یاکلان الطعام۔ مگر ان کی الوہیت کے خلاف جو سب سے واضح ثبوت تھا یعنی یہ کہ وہ مر چکے ہیں اس کو ایک جگہ بھی عیسائیوں کے مقابلہ میں ذکر نہیں فرمایا۔ اور نہ کبھی آپکی زبان مبارک سے یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تو مدت ہوئی وفات ہو چکی ہے۔ پھر وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ بارہا عیسائیوں کے ساتھ آپ کے مکالمات ہوئے ہیں۔ پھر اس تحقیقاتی دور میں جہاں جبل ایورسٹ (EVAREST) پر رسائی ہو چکی ہو' فرعون کی لاش دستیاب ہو چکی ہو اور سفینہ نوح علیہ السلام کے نشانات معلوم کئے جا چکے ہوں وہاں کیا اس مقدس رسول کی قبر مخفی رہ سکتی تھی۔ ان حالات میں بھی اگر اپنی جانب سے ہم ان کی موت اور قبر کی نشاندہی کے مدعی بنتے ہیں تو تاریخی دنیا میں اُس کی کیا قدر و منزلت سمجھی جا سکتی ہے:-

اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی تھی تو نصاریٰ اور اہل اسلام کا عام طور پر ان ہی کی حیات کے قائل کیوں ہیں

یہاں تھوڑا سا غور اس پر بھی کر لینا چاہیئے کہ اگر بالفرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت واقع ہو چکی تھی تو پھر تمام انبیاء علیہم السلام میں سے ایک ان ہی کی خصوصیت کیا تھی کہ ان ہی کے معاملہ میں نصاریٰ سے لے کر اہل اسلام تک اُن کی حیات اور اُن کے نزول کے تسلسل کے ساتھ قائل چلے آ رہے ہیں۔ چلیئے نصاریٰ اگر اپنی فرط عقیدت سے کسی بے اصل بات کا دعویٰ کر ڈالیں تو جائے تعجب نہیں مگر یہاں ان علماء اسلام کے لئے اس کا کیا محل ہو سکتا تھا جو ہمیشہ تردید الوہیت میں سرگرم رہے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں کسی کے قلم سے ایسے کلمات بھی نکل گئے ہیں کہ اگر کہیں اتنی بڑی تہمت

اُن کے سر نہ رکھی جاتی تو وہ کلمات ہرگز ان کے زیر قلم نہ آسکتے تھے پھر کسی غلطی کا اگر امکان تھا تو چلئے کسی خاص عنوں میں ہو سکتا تھا لیکن جمہور اُمت اور صحابہ و تابعین پھر ائمہ دین اور مفسرین و شارحین سب ہی کا ایک بدیہی البطلان غلطی پر متفق ہو جانا یہ کیونکر قرین قیاس مانا جا سکتا ہے۔ چلئے اگر یہ مسئلہ الہیات کے دقیق مسائل یا حیات برزخی کے بالاتر از فہم کیفیات کی طرح کوئی باریک مسئلہ ہوتا تو بھی کسی غلط فہمی کا امکان تھا مگر ایک شخص کی موت وحیات کا مسئلہ تو کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ نہ تھا جس کے فہم میں کوئی دشواری تھی یا اس میں اختلاف رائے کی کوئی گنجائش تھی یہ تو عام انسانوں سے لے کر انبیاء علیہم السلام کی جماعت تک کی ایک عام سنت بشری تھی پھر انبیاء علیہم السلام کی تمام جماعت میں سے ان ہی کی موت میں غلط فہمی کیوں پیدا ہوگئی اور حیرت در حیرت یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی صاف نہ ہو سکی بلکہ اور مستحکم ہوتی رہی۔ پس اگر حقیقت حال یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے تو پھر کسی تاریخ سے یہ ثبوت پیش کرنا لازم ہوگا کہ کم از کم مسلمانوں میں اس کے خلاف ان کی حیات کے عقیدہ کی بنیاد کب سے پڑی لیکن یہاں تو ہم جتنا صحابہ و تابعین اور اُن سے اوپر احادیث مرفوعہ کی طرف نظر کرتے چلے جاتے ہیں اتنا ہی ہم کو رفع و نزول کا ثبوت اور مبہم پہونچتا چلا جاتا ہے اور اس کے برعکس آخر میں موت کے عقیدہ کی بدعت سیئہ جس کسی فرقے ایجاد کی ہے تاریخ انگلی رکھ کر اس کا نام ونشان بتاتی ہے اور ہمیشہ اس کو مسلمانوں کے خلاف عقیدہ کا شخص شمار کرتی ہے حتیٰ کہ اس مدت میں جو مدعی مسیحیت گذرے ہیں وہ بھی اپنے دعویٰ سے قبل تمام عمر اس بارے میں عام اُمت کے ساتھ ہی نظر آتے ہیں یہ بات دوسری ہے کہ جب زمین ہموار ہوگئی اور اُنھوں نے خود مسیح ہونے کا دعویٰ شروع کیا تو پھر جس عقیدہ پر اُن کی ساری عمر گذری تھی اسی کو انھوں نے مشرکانہ عقیدہ ٹھرا دیا بلکہ اس سے بڑھ کر اس مضمون کی صحیح سے صحیح حدیثوں کے متعلق ردّی کی ٹوکری میں پھینکدینے کے مکروہ ترین الفاظ بھی لکھ مارے ہوں کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر وفات پاچکے ہیں تو اُن کے متعلق حدیث وقرآن میں کہیں موت کا صاف لفظ کیوں نہیں

اس مقام پر یہ دقیقہ بھی قابل فروگذاشت نہیں ہے کہ ایک انسان کی موت کا واقعہ کو نسا پیچیدہ واقعہ ہے جس کے بیان کرنے میں ایک معمولی سے معمولی انسان کو بھی کوئی دشواری ہو سکتی ہے اگر قرآن کریم کسی ایک جگہ بھی صراحت کے ساتھ یہ لفظ فرما دیتا کہ "ان عیسیٰ مات" یعنی عیسیٰ علیہ السلام مرچکے ہیں تو بس اسی ایک لفظ سے ساری بحثیں ختم ہو جاتیں اور بے وجہ لفظ توفی پر دفتر کے دفتر خرچ کر کے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہ رہتی کہ توفی لغت عرب میں موت کے ہم معنی ہے۔ افسوس ہے کہ لفظ توفی کے موت کے معنے میں ثابت کرنے کے لئے تو عمریں صرف کی گئیں مگر اس پر کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہ کیا گیا کہ جب عربی زبان میں موت کے لئے دوسرا صاف لفظ موجود تھا تو پھر یہاں موضع اختلاف میں اس صاف اور سیدھے لفظ کو چھوڑ کر ایسے مشتبہ لفظ کو کیوں اختیار کیا گیا ہے جو بڑی کاوشوں کے بعد بھی موت میں

منحصر نہیں ہو سکتا بالخصوص جبکہ عیسائی یہ ڈنکے بجا رہے ہوں کہ وہ اللہ تھے والعیاذ باللہ تو کیا یہ بات سیدھی اور صاف نہ تھی کہ اللہ کا سب سے پہلا نام "الحی" ہے اور عیسیٰ علیہ السلام مرچکے ہیں۔ سورۂ آل عمران میں جو نصاریٰ ہی کی تردید کے لئے اُتری اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کو "الحی القیوم" کہہ کران کی تردید کی گئی مگر ساری سورت میں ایک بار بھی عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں موت کا لفظ نہ بولا گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا مسئلہ عام انسانوں کی موت پر قیاس کرنا صحیح نہیں

یہ اچھی طرح واضح رہنا چاہیئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کا مسئلہ صرف عام انسانوں کی موت پر قیاس کر کے طے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عام انسانوں کی حیات و موت سے قومی تاریخ یا مذہبی عقیدہ کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے یہاں طویل گمشدگی کو بھی موت کا قرینہ بنا لیا جاتا ہے لیکن ایک ایسے اولو العزم نبی کی وفات کا مسئلہ جس کی حیات و موت کی بحث دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ سے چل رہی ہو پھر جس کی حیات کے واضح اور مستحکم دلائل بھی موجود ہوں اس کو صرف عام انسانوں پر قیاس کر کے کیسے طے کیا جا سکتا ہے یہ بالکل اتنا ہی غیر معقول ہے جتنا کہ کسی ایسے زندہ شخص کی طویل گمشدگی سے اس کی موت کا حکم لگا دینا جس کی حیات کی شہادت معتمد اخبارات کے ذریعہ بھی اور خود اُس کے بیانات سے بھی مسلسل موصول ہو رہی ہو یہاں کوئی عاقل ایسا نہیں ہوگا جو ان حالات میں صرف اس کی مدت سفر کے غیر معمولی طوالت کی وجہ سے اس کے ترکہ تقسیم کا دعویٰ کسی عدالت میں دائر کر سکے اور نہ کوئی عدالت یہاں اُس کی وراثت کی تقسیم کا حکم دے سکتی ہے۔

خوب یاد رکھو جہاں کوئی معاملہ خاص دلائل کی روشنی میں پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے وہاں صرف عام قیاسات سے کوئی حکم لگانا کھلی ہوئی غلطی ہے۔ مثلاً آج جبکہ فرعون کی لاش پختہ ثبوت کے ساتھ دریافت ہو چکی ہے تو اب محض اس بنا پر اس کا انکار کرنا کہ ایک غرق شدہ لاش کا وہ بھی سیکڑوں سال کے بعد صحیح و سالم برآمد ہونا چونکہ عام دستور کے خلاف ہے اس لئے فرعون کی لاش کا برآمد ہونا بھی قابل تسلیم نہیں یا قابل یقین نہیں ہے ظاہر ہے کہ اس قیاس کی عقل و تاریخ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا مسئلہ بھی ہے یہاں صرف عام قیاسات اور عام دلائل پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اُن کا معاملہ قرآن و حدیث کے واضح سے واضح اور مستقل طور پر علیحدہ بیان میں آچکا ہے۔

حیات و موت کا مسئلہ دنیا کے عام واقعات میں شامل ہے پھر قرآن و حدیث میں اس کی اہمیت کیوں ہے

اس امر پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ حیات و موت دنیا کے تمام واقعات میں شامل ہیں بہت سے انبیاء علیہم السلام فوت ہوئے اور بہت سے نااہل اُمتوں کے ہاتھوں شہید بھی ہوئے اسی طرح مستقبل میں بہت سے مبارک اور نامبارک افراد و اشخاص کے ظہور کی پیشگوئیاں کی گئی ہیں مگر آخر ان سب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد اور اُن کی حیات کے مسئلہ کی اہمیت کیا تھی کہ کتب سابقہ سے لے کر قرآن کریم تک نے اس کے بیان و ایضاح کا اہتمام کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے بھی بار بار اُن کے متعلق نزول کی پیشگوئی فرمائی اور اس کی اتنی تفصیلات بیان فرمائی ہیں جتنی کہ کسی اور دوسرے شخص کے متعلق نہیں فرمائیں۔ یقیناً اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کا تعلق آئندہ زمانہ سے ابھی باقی ہے اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح فوت ہو چکے ہوتے تو جس طرح اُن کی موت اور سوانح موت کی تفصیلات سے سکوت اختیار کر لیا گیا تھا۔ یہاں بھی سکوت اختیار کر لیا جاتا مگر چونکہ اُن کو ابھی دوبارہ تشریف لانا باقی تھا اس لئے آپ نے اُن کی آمد کی تفصیلات کا خاص اہتمام فرمایا ہے تاکہ جن کے متعلق پہلی بار دو بڑی قومیں گمراہ ہو چکی تھیں دوسری بار اب وہ اپنی اپنی غلطیوں کو صاف طور پر سمجھ جائیں اور اجتماعی حیثیت سے جس طرح وہ پہلی بار کفر پر جمع ہو گئی تھیں اس مرتبہ ایمان پر جمع ہو سکیں اور وان من اہل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ کی پیشگوئی پوری آب و تاب سے پوری ہو جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح اور شافی بیان جس طرح کہ اس اُمت پر ایک احسان عظیم ہے اسی طرح دوسری اُمتوں پر بھی ہے کہ اُن کو صرف آپ کے طفیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح معرفت اور ان پر صحیح ایمان کا سامان میسر آ گیا اسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل و برتری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مسائل جو آج تک اُلجھے ہوئے چلے آ رہے تھے وہ آپ کے دور میں کس طرح سلجھتے چلے جا رہے ہیں۔

نافہم لوگ یہ کہتے ہیں کہ جن کی پہلی آمد اُمتوں کے فتنے کا موجب بنی اُن کی دوسری آمد سے ہدایت کی کیا توقع ہو سکتی ہے اور اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اس کی ذمہ داری اگر تمام تر اُمتوں پر عائد ہوتی ہے تو اُن کی دوبارہ آمد میں خطرہ کیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ذمہ داری خود اُن ہی پر عائد ہے والعیاذ باللہ تو یہ براہ راست خدا کے ایک معصوم رسول پر حملہ ہے اور صحیح معنی میں یہود کی اتباع ہے ہمارے بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ اُن کی دوبارہ تشریف آوری درحقیقت اسی عمیق حکمت کے اظہار کے لئے ہے کہ یہ بات عالم آشکارا کر دی جائے کہ جن کو جماعتوں نے مرکز ضلالت ٹھہرایا تھا یہ ان کی شقاوت تھی درحقیقت وہ مرکز ہدایت تھے اور اس طرح جہاں ایک طرف اُن کی بزرگی ثابت ہو دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان بھی ظاہر ہو۔ کہ اب جو جہان بھر کے نافہم تھے وہ آپ کے دور میں کتنے بافہم بن چکے ہیں

خاص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں لفظ نزول کی اہمیت

یہ امر بھی خاص طور پر قابل غور ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے اور اب وہ دوبارہ تشریف نہیں لائیں گے تو حدیثوں میں نزول کی پیشگوئی خاص اسی نام و نسبت کے شخص کے متعلق کیوں کی گئی ہے اور کیوں صاف طور پر دنیا کے دستور کے موافق اُس کا وہی نام ذکر نہیں کیا گیا جو اس کا اصل نام تھا نیز یہ سوال بھی اہم ہے کہ کسی ایک حدیث میں ان کے متعلق ولادت کا سیدھا لفظ کیوں نہیں فرما دیا گیا تاکہ یہ بات صاف ہو جاتی کہ جو شخص آئندہ آنے والا ہے وہ عام انسانوں کی طرح کسی وقت پیدا ہوگا اور وہ مسیح اسرائیل نہیں بلکہ کوئی اور دوسرا انسان ہے بالخصوص جبکہ امام مہدی اور دجال جو بھی مبارک و نامبارک انسان آئندہ ظاہر ہونے والے تھے اُن کے حق میں ولادت ہی کا صاف لفظ بولا گیا ہے اور اُن کی وہی نام و نسبتیں ذکر فرمائی گئی ہیں جو اُن کی

اصل نام ونسبتیں تھیں۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگر مسیح ابن مریم درحقیقت فوت ہو چکے تھے اور ان کی بجائے کوئی اور شخص
ان کا ہمرنگ اس اُمت میں پیدا ہونے والا تھا تو اس کے حق میں کہیں ولادت کا لفظ بولا نہ جاتا اور کسی ایک حدیث میں
اس کے اصل نام ونسبت کی تصریح نہ کی جاتی اور کہیں اس کے اصل شہر اور محل پیدائش کا پتہ بتایا نہ جاتا بلکہ ہر ہر مقام پر وہی
نام ونسبت وہی شہر وہی تمام صفات اور وہی حلیہ ذکر کیا جاتا جو درحقیقت مسیح اسرائیل کا تھا۔ کیا جس نام ونسبت والے
شخص کے متعلق عیسائی قوم دوبارہ آمد کا انتظار کر رہی تھی اسی نام ونسبت والے شخص کی دوبارہ آمد کی پیشگوئی کر کے
عیسائیوں کی کھلے طور پر تائید کرنی نہیں ہے اس انداز بیان کا مطلب ایک سیدھی بات کو اُلجھا دینا اور ہدایت کی بجائے
اور گمراہی میں مبتلا کرنا ہے والعیاذ باللہ۔ پس اگر صرف اسی ایک بات پر غور کر لیا جاتا کہ حدیثوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے بارے میں بار بار کیوں نزول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور کیوں ایک مرتبہ بھی ولادت کا لفظ نہیں بولا گیا اور کیوں تمام
مقامات پر اسی اسرائیلی رسول بزرگ کے نام نسبت اور شکل وشمائل کو ذکر کیا گیا ہے اور کیوں اس کا اصل نام ونسبت ذکر
نہیں کیا گیا تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی کہ یقیناً وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آنے والے ہیں جو ایک بار پہلے آ چکے
ہیں اور وہ زندہ ہیں اور آئندہ زمانہ میں اُن کو نازل ہونا ہے۔ حدیثوں کے اس واضح بیان کے باوجود حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کی شان میں حدیثوں کی تاویل کرنا اور اُن کو بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک پیدا ہونے والا انسان شمار
کرنا ٹھیک اسی طرح تحریف ہوگا جیسا امام مہدی علیہ السلام یا دجال کے بارے میں ولادت کے صاف لفظ مذکور ہو جانے
کے باوجود یہ دعویٰ کرنا کہ امام مہدی علیہ السلام اور دجال بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان سے نازل ہونگے
پس جس طرح امام مہدی علیہ السلام کے حق میں اُن کے نزول کی بجائے اُمت کو اُن کی ولادت ہی کا انتظار ہے اسی
طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ان کی پیدائش کے بجائے اُن کے اُترنے ہی کا انتظار ہونا چاہیئے۔ ہم کو اس کا کوئی
حق نہیں کہ حدیثوں میں جہاں صاف طور پر نزول کا صاف لفظ آچکا ہے وہاں اس کے معنے ولادت کے اور جہاں
ولادت کا صاف لفظ وارد ہے اس کے معنے نزول کے کر ڈالیں۔

غیر موقت پیشگوئیوں کا انکار یا تاویل دونوں خطرناک اقدام ہیں

جو پیشگوئیاں موقت نہیں ہیں اُن کے متعلق قبل از وقت تھک کر یہ کہنا کہ مسلمانوں کا مسیح
و مہدی جب آج بھی نہ آیا تو آخر کب آئے گا بالکل کفار کے اس قول کے مشابہ ہے جو
اُنھوں نے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں قیامت کے بارے میں کہا تھا ویقولون متی ھو قل عسی ان یکون قریبا
حقیقت یہ ہے کہ اسلام چونکہ قیامت تک باقی رہنے والا مذہب ہے اس لئے اس کی پیشگوئی کا دامن بھی قیامت
تک وسیع رہنا چاہیئے بہت سی پیشگوئیاں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پوری ہو چکیں پھر کچھ حصہ ہے
صحابہ کے زمانہ میں پورا ہوا اس کے بعد اسی طرح ہر دور میں اُن کا ایک ایک حصہ پیدا ہوتا رہا حتی کہ پورے وثوق کے
ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ کا کوئی دور خالی نہیں گذرا جس میں آپ کی پیشگوئی کا کوئی نہ کوئی حصہ آنکھوں کے سامنے نہ

آتا رہا ہو۔ ۴۷ء میں ہنگاموں کی سرگذشت بہت مختصر اور جامع الفاظ ہیں اگر آپکو پڑھنی ہو تو آپ ان الفاظ میں پڑھ لیجئے جو صحیح مسلم میں موجود ہیں "ایک زمانہ آئے گا جس میں ایسی جنگ ہوگی کہ قاتل کو یہ بحث نہ ہوگی کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے اور مقتول کو یہ علم نہ ہوگا کہ وہ کس جرم میں قتل کیا جا رہا ہے۔ ہم نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان ہنگاموں میں قتل کا یہی نقشہ تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان اور ایک جماعت دوسری جماعت کے قتل کے درپے تھی اور کسی کو اس تحقیق کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ اُس کا موافق ہے یا مخالف۔ قتل کرنے والا کس گناہ میں دوسرے کو قتل کر رہا ہے اور مقتول کیوں مفت مارا جا رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آپکی پیشگوئیوں کو صرف گذشتہ زمانہ میں ختم کر دینا اور مستقبل میں پوری ہونیوالی پیشگوئیوں کا قبل از وقت انتظار کر کر کے تھک جانا اور اُن کے انکار پر آمادہ ہو جانا درحقیقت یہ آپکی عموم بعثت کا انکار ہے کیونکہ اگر آپکی بعثت قیامت تک کے لئے ہے تو پھر اس کی صداقت کے نشانات بھی دُنیا کے ہر دور کے انسان کے سامنے آتے جائیں اسی لئے قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ آپکی سب پیشگوئیاں آپ ہی کی حیات طیبہ میں پوری ہونگی۔ بلکہ بعض یعنی کچھ کا لفظ فرمایا ہے۔

فاما نرینك بعض الذی نعدھم او نتوفینك فالینا مرجعھم (یونس۔ ۱۱)

وان یك کاذبا فعلیه کذبه وان یك صادقا یصبکم بعض الذی یعدکم (غافر۔ ۲۴)

اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے متعلق بھی آپ قبل از وقت انتظار کر کے خود بخود تھک جائیں اور پھر صریح حدیثوں کی ایسی ایسی تاویلیں کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں جو دُنیائے عالم میں قابل مضحکہ اور سارے دین میں شبہ کا باعث بن جائیں کیونکہ جب دین کے ان واضح الفاظ کی یہ حقیقت ثابت ہو تو پھر کیا اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ ذات وصفات اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے واضح الفاظ کی صحیح حقیقتیں کیا ہونگی اور اس طرح پورے کے پورے دین پر کیا اطمینان باقی رہ سکتا ہے۔

قرآن کریم میں نزول کا مسئلہ بھی رفع جسمانی کی طرح صاف طور پر کیوں ذکر میں نہیں آیا۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے آسمان پر جانے اور مقتول نہ ہونے کا تذکرہ صرف یہود کے اسباب لعنت کے بیان کے ضمن میں آ گیا ہے اس ضمن میں قرآن شریف نے یہ نقل کیا ہے کہ یہود واقعہ کے خلاف اُن کے قتل کرنے کے مدعی ہیں اور نصاریٰ گو بہت سی بے تحقیق باتیں بناتے ہیں مگر اجمالاً اُن کے رفع کے قائل ہیں اس لئے یہاں قابل توجہ صرف یہی مسئلہ تھا کہ وہ مقتول ہوئے یا نہیں اور اگر مقتول نہیں ہوئے تو آسمان پر اُٹھائے گئے یا نہیں رہا اُن کے نزول کا مسئلہ تو وہ کسی مقام پر بھی زیر بحث نہیں آیا۔ پھر ہم کو کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا کہ نزول یا عدم نزول کا مسئلہ کبھی اہل کتاب نے آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ لہٰذا جب یہ مسئلہ کہیں آپکے سامنے زیر بحث ہی نہیں آیا اور نہ قرآن کریم ہی کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو اب صراحت کے ساتھ نزول کا لفظ ذکر ہوتا تو کیسے ہوتا ہاں اگر نزول کا مسئلہ بھی اس وقت کہیں زیر بحث آ جاتا تو جس طرح یہاں رفع کا لفظ صراحت کے ساتھ مذکور ہوا تھا نزول کا لفظ بھی یقیناً اسی طرح صراحتہً

ساتھ ذکر ہو جاتا لیکن جب یہ مسئلہ کہیں زیر بحث آیا ہی نہیں تو اب قرآن کریم میں صراحۃً لفظ نزول کا مطالبہ کرنا کتنی بڑی بے انصافی ہے اور اگر بالفرض یہ لفظ مذکور ہو بھی جاتا جب بھی حیلہ جو طبیعتوں کو فائدہ کیا تھا؟ آخر صحیح سے صحیح حدیثوں میں یہ لفظ بار بار آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے قسموں کے ساتھ آیا مگر پھر اُن کو کیا فائدہ ہوا۔

پس حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے نزول یعنی آمد ثانی کا مسئلہ خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو مگر اس وقت وہ زیر بحث ہی نہ تھا۔ ہاں قومی تاریخ کے لحاظ سے جو فرقہ اُن کے رفع جسمانی کا قائل تھا وہ اُن کی آمد ثانی کا بھی منتظر تھا اور اب تک ہے اور جو اُن کے قتل کا مدعی تھا اُن کے نزدیک اُن کی آمد ثانی محل بحث ہی کیا ہو سکتی تھی پس اگر یہاں قرآنی فیصلہ اُن کے رفع کا ہو جاتا ہے تو اُن کے نزول کا مسئلہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے اور اگر تحقیق یہ ہو کہ وہ مقتول ہو گئے (والعیاذ باللہ) تو پھر ایک شخص کے دوبارہ آمد کی بحث ہی پیدا نہیں ہو سکتی لہذا اگر قرآن کریم کی کسی آیت میں رفع کے صاف لفظ کی طرح نزول کا لفظ مذکور نہیں تو اس سے مسئلہ نزول کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا پھر خاص نزول کا لفظ مذکور ہونا ہی کیوں ضروری ہے جبکہ قرآن کریم یہ تصریح کرتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے ابھی وفات نہیں پائی اور قیامت سے پہلے تمام اہل کتاب کو اُن پر ایمان لانا باقی ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہو اور ابھی تک اُس کو موت نہیں آئی ضرور ہے کہ وہ زمین پر نازل ہو تاکہ اہل کتاب اُن کو اپنی آنکھوں سے دیکھکر اُن پر ایمان لے آئیں اور وہ اپنی مقررہ مدّت عمر پوری کر کے دنیا کی آنکھوں کے سامنے وفات پا کر مدفون ہو۔ اسی لئے حضرت ابو ہریرۃ رضہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے نزول کی حدیث روایت کر کے فرماتے ہیں کہ اگر اس پیشگوئی کو تم قرآن کریم کے الفاظ میں دیکھنا چاہو تو سورہ نساء کی یہ آیت پڑھ لو۔ وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ۔

آیت بالا میں حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی حیات کے لئے جو سب سے زیادہ صاف اور واضح لفظ ہو سکتا تھا وہ قبل موتہ کا لفظ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جس زندہ شخص کی اب تک وفات ثابت نہیں ہوئی اُس کی حیات کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت کیا ہے۔ یہاں جو شخص اُن کی موت کا مدعی ہو یہ فرض اُس کا ہے کہ وہ اُن کی موت ثابت کرے۔ پھر آیتِ بالا میں خاص اہل کتاب کے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام کو اُن پر اس وقت بھی صحیح ایمان حاصل ہے لہذا جن کا ایمان لانا قابل ذکر ہو سکتا تھا وہ صرف اہل کتاب کا ایمان ہے اب اگر فرض کر لو کہ اہل اسلام بھی نصاریٰ کی طرح اُن کے سولی پر چڑھنے کو تسلیم کرتے ہوں یا یہود کی طرح اُن کے مردہ ہونے کے قائل ہوں تو پھر اہل اسلام کا ایمان بھی اُن پر صحیح ایمان نہیں رہتا۔ اہل کتاب اگر اس بارے میں ایک غلطی پر ہیں تو اہل اسلام بھی دوسرے اعتبار سے غلطی میں مبتلا ہیں پھر اس تخصیص کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

قرآن کریم نے جہاں اُن کی موت کی صاف نفی فرما کر یہ بتایا ہے کہ ابھی آئندہ زمانہ میں اہل کتاب کو اُن پر ایمان لانا باقی ہے اسی طرح دوسری طرف یہ بھی تصریح کی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو اُن پر شہادت دینا باقی ہے ان دونوں باتوں

کے لئے اُن کی تشریف آوری لازم ہے کیونکہ شہادت شہود سے مشتق ہے لہذا عیسیٰ علیہ السلام جب تک کہ پھر تشریف لاکر اُن میں موجود نہوں اُن پر گواہی کیسے دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے وکنت علیھم شھیدًا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم۔ یعنی میں اُن پر گواہ تھا جب تک کہ میں ان میں موجود رہا اور جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی اُن کا نگراں حال تھا۔

آیت بالا سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر دو زمانے گذرے ہیں ان میں سے آپکی شہادت کا زمانہ صرف وہ ہے جس میں کہ آپ اُن کے اندر موجود تھے اور دوسرا زمانہ جس میں کہ آپ اُن میں موجود نہ تھے وہ آپکی شہادت سے خارج ہے پس آئندہ اہل کتاب پر آپکی شہادت کے لئے دوبارہ آپکی تشریف آوری ضروری ٹھہری۔ اسی لئے حضرت ابوہریرۃ رضہ اس آیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی دلیل فرماتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ صحابی جلیل القدر تو نزول کی پیشگوئی کو قرآنی پیشگوئی کہتا ہے ایک بدنصیب جماعت وہ ہے جو اس کو حدیثی پیشگوئی بھی کہنے کو تیار نہیں۔

ومن لم یجعل اللہ لہ نورًا فمالہ من نور

قرآن کریم کے رفع جسمانی اور حدیث کے نزول جسمانی کے اہتمام فرمانے کی حکمت

حجیت حدیث کے مضمون میں ہم یہ بات پوری وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ حدیث و قرآن کے مابین متن و شرح کی سی نسبت ہے۔ آیات قرآنیہ اور تشریحات حدیثیہ پر آپ جتنا غور کرتے چلے جائیں گے یہ حقیقت آپ کو اتنی ہی روشن ہوتی چلی جائے گی اسی لئے آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ جہاں کہیں قرآن کریم کسی مصلحت کے پیش نظر کسی مسئلہ کا ایک پہلو اپنے بیان میں لے لیتا ہے تو فورًا اُس کا دوسرا پہلو حدیث لے لیتی ہے اور اس طرح مسئلہ کے دونوں پہلو صاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور درحقیقت حدیث کے بیان کہلانے کا منشا بھی یہی ہے۔ مثلاً جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے صنف رجال میں ایک تباہ کن فاحشہ کی بنیاد ڈالی تو قرآن کریم نے اس عمل کی حرمت کا تذکرہ بھی صرف رجال یعنی مردوں ہی میں فرمایا اور صنف نساء میں بے وجہ اس عمل کی حرمت پر زور دینا اپنے انداز بلاغت کے خلاف سمجھا۔ ظاہر ہے کہ جب اس ماحول میں اس فتنہ کا وجود ہی نہ ہو تو پھر اُس کا تذکرہ کر کے خواہ مخواہ ذہنوں کو اس طرف متوجہ کیوں کیا جائے لیکن چونکہ شرعی نظر میں ان دونوں عملوں کی حرمت یکساں تھی اس لئے حدیث نے صنف نساء میں اس کی حرمت کا اسی شد و مد سے اعلان کیا جس طرح کہ قرآن کریم نے صنف رجال میں اس کی حرمت کا اعلان کیا تھا اور اس طرح دونوں صنفوں کے احکام وضاحت سے ہمارے سامنے آگئے۔ ہمارے اس بیان سے یہ سوال بھی حل ہو گیا کہ اس عمل کے حرمت کی قرآن کریم میں صنف رجال کی تخصیص اور حدیث میں صنف نساء کی تخصیص کا سبب کیا ہے اسی طرح سماوی غدد کے ایام میں صنف نساء کے ساتھ حدود اعتزال اور اختلاط کا مسئلہ ہے یعنی اس زمانہ میں عورتوں سے کس حد تک الگ رہنا چاہیئے اور کہاں تک اُن سے اختلاط رکھا جا سکتا ہے۔ یہاں یہود نے تو اجتناب نجاسات کے باب میں اتنا مبالغہ کر رکھا تھا کہ

ان ایام میں وہ اپنے گھروں میں بھی داخل نہ ہوتے تھے اور نصاریٰ نے اتنی لاپرواہی اختیار کرلی تھی کہ نجاسات سے اجتناب کرنے کا ان کے ہاں باب ہی مندارد تھا (دیکھو الجواب الصحیح صفحہ ۲۳۲) جب اس مسئلہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا تو چونکہ یہاں قرآن کریم نے اپنے بیان میں اعتزال کا پہلو لے لیا تھا اور یہی ضعف بشری کے مناسب بھی تھا اور صاف فرمادیا تھا کہ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيضِ ۔ ان ایام میں عورتوں سے الگ رہو۔ تو اس کے جواب میں آپ نے اپنے قول وعمل سے فوراً حدود اختلاط بیان فرمادئے ۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جب آیت فاعتزلوا النساء فی المحیض نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اصنعوا کل شئ الا النکاح ۔ یعنی ان ایام میں ہم بستری کے علاوہ سب کچھ جائز ہے ۔ اب اندازہ فرمائیے کہ قرآن کریم نے تو لفظ اعتزال کا فرمایا تھا پھر آپ نے اُس کی تشریح میں حدود اختلاط کیوں بیان فرمائیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ حدود اعتزال اس وقت تک معین ہی نہیں ہوسکتی تھیں جب تک کہ حدود اختلاط بیان میں نہ آجائیں ۔ وبضدھا تتبین الاشیاء لہذا یہاں وہ حدیثیں جو ان ایام میں اُمہات المومنین کے ساتھ آپ کے اختلاط کے متعلق روایت کی گئی ہیں اسی روشنی میں پڑھنی چاہئیں تاکہ یہ بات پورے طور پر حل ہوجائے کہ ان میں آپ نے اس تاکید کے ساتھ اُس کی عملی وضاحت کی کیا ضرورت بھی تھی ۔ غرض جہاں بھی قرآن کریم نے مسئلہ کے عموم کے باوجود کسی وقتی مصلحت سے اس کا ایک پہلو بیان میں لے لیا ہے وہاں اس کا دوسرا پہلو فوراً حدیث نے لے لیا ہے اور درحقیقت حدیث کے بیان ہونے کا یہی منشا بھی ہے ۔ اسی مقام سے حدیث کی اہمیت اور اُس کی ضرورت کا اندازہ کرلینا چاہیئے ۔

اس مقدمہ کے ذہن نشین کرلینے کے بعد جب آپ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے اس معاملہ پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جب قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے رفع کا مسئلہ وضاحت سے آچکا تھا تو یہاں حدیث کا فرض بھی ہونا چاہیئے کہ وہ اسی ضابطہ کے ماتحت رفع کے بعد نزول کا مسئلہ جو اُس کا دوسرا پہلو ہے پورے طور پر روشن کردے اسی لئے نزول کا دوسرا پہلو حدیثوں میں اتنی تفصیل و تاکید سے قسمیں کھا کھا کر بیان کیا اور اس کو مختلف صحابہ اور مختلف مجلسوں میں پیرایہ بہ پیرایہ اتنا واضح فرمادیا کہ ایک طرف تو عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول میں کسی شبہ کا محل باقی نہیں رہا۔ دوسری طرف قرآن کریم کے لفظ رفع کی ایسی تشریح ہوگئی کہ اب اس میں ادنیٰ سا ابہام بھی باقی نہ رہا ۔ اب آپ قرآنی لفظ رفع اور حدیث کے لفظ نزول کو جتنا ملا ملا کر پڑھیں گے اتنا ہی اُن کے رفع جسمانی اور نزول جسمانی کا مسئلہ آپ کے سامنے کھلتا چلا جائے گا ۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص جسم کے ساتھ اُترے گا وہ یقیناً جسم ہی کے ساتھ اُٹھایا گیا ہے اور جو جسم کے ساتھ اُٹھایا گیا ہے اُس کو یقیناً دوبارہ اپنے جسم ہی کے ساتھ اُترنا چاہیئے ۔

اب یہ عقیدہ بھی حل ہوگیا کہ حدیثوں میں جس کثرت کے ساتھ نزول کا تذکرہ ملتا ہے اُس کثرت کے ساتھ رفع جسمانی کا تذکرہ کیوں نہیں ملتا ، اور اسی طرح قرآن کریم میں جس صراحت کے ساتھ رفع جسمانی کا تذکرہ ملتا ہے اُس صراحت کے

ساتھ نزول کا تذکرہ کیوں نہیں ملتا حقیقت یہ ہے کہ جب قرآن کریم اُن کے رفع کی تصریح فرما چکا تھا تو اب حدیث کی نظر میں یہ مسئلہ تو ایک طے شدہ مسئلہ تھا اس کے تکرار کی ضرورت کیا تھی اس لئے حدیثوں میں اس کے دوسرے پہلو یعنی نزول پر زور دیا گیا ہے اور اسی پہلو پر زور دینا مناسب بھی تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے متعلق جتنی تفصیلات ثابت ہو چکیں کیا اس کے بعد بھی یہاں تاویل کرنا معقول ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول کا مسئلہ ہر ممکن تشریح کے ساتھ معرض بیان میں آچکا ہے یعنی آپ کا اسم مبارک آپ کا نام ونسب اور اس خاص نسب نامہ کی خصوصیت یعنی صرف ماں سے آپکی پیدائش آپ کا حلیۂ مبارک، اس شہر کا نام جہاں آپ کا نزول ہوگا، پھر خاص اُس جگہ کا نام بھی جہاں آپ کا نزول ہوگا' نزول کا وقت اور اس وقت آپ کا مکمل نقشہ' نزول کے بعد پہلی نماز میں آپ کا امام یا مقتدی ہونا' آپ کا منصب' آپکی خدمات مفوضہ' آپکی مدت قیام' آپکے دور کی محیر العقول فراوانی اور عدل وانصاف' آپ کی زندگی کے اہم کارنامے' آپ کی شادی کرنا اور اولاد ہونا حتی کہ آپ کا وفات پانا اور آپ کے مدفن کی مکمل تحقیق۔ اب انصاف سے فرمائیے کہ اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے آپ کو اور کن تفصیلات کا انتظار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی واقعہ کی تعیین وتشریح کے لئے اس سے زیادہ آخر اور کیا طریق اختیار کیا جائے۔ آج دنیوی مقدمات میں صرف مدعی اور مدعی علیہ اور اُن کے باپ دادوں کے نام انکی تعیین کے لئے کافی سمجھے جاتے ہیں اور آئندہ مقدمہ کی تمام کارروائی اسی معین شدہ شخص سے متعلق سمجھی جاتی ہے اسی طرح خطوط' بیمے' منی آرڈر اور رجسٹریاں وغیرہ صرف شہر اور اس شخص کے نام لکھ دینے سے اس کو تقسیم کردی جاتی ہیں حیرت ہے کہ جب دُنیا کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ میں معمولی درجہ کی تعیین کافی سمجھی جاتی ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السّلام کے معاملہ میں اتنی مفصل تاریخ کیوں ناکافی ہے۔ اچھا فرض کرلیجئے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول کا مسئلہ آپ خود اپنی عبارت میں ادا کرنا چاہیں تو آخر آپ وہ اور کس طرح ادا کریں گے کہ اس کے بعد اس میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ اگر درحقیقت اس پیشگوئی کا مصداق رسول اسرائیل کی بجائے خود اسی اُمت کا کوئی فرد ہو جو اسی اُمت میں پیدا ہونے والا ہو جس کا نہ یہ نام ہو نہ یہ نسب ہو نہ یہ حلیہ نہ یہ جائے نزول نہ یہ منصب اور نہ یہ کارنامے تو کیا اس بیان کو ایسے شخص کے حق میں ایک گمراہ کن بیان نہ کہا جائے گا۔ کیا آج کسی شخص کی پیدائش کا معمولی مسئلہ کوئی ادنیٰ زبان داں شخص بیان کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اسی طرح اس کو مجاز واستعارہ کی بھول بھلیاں میں ادا کرے گا چہ جائے کہ ایک رسول اور رسول بھی وہ جو افصح العرب والعجم ہو پس اگر دنیوی معاملات میں بادشاہوں سے لیکر فقراء اور اولیاء سے لے کر رسولوں تک کی پیدائش کے لئے یہ لفظ استعمال نہیں کئے جاتے تو پھر مجاز واستعارہ کی یہ ساری رام کہانی خاص حضرت عیسیٰ علیہ السّلام ہی کے بارے میں کیوں گائی جاتی ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے معاملہ میں سب سے زیادہ اہم لفظ رفع کا ہے توفی کا لفظ قرآن کریم کی نظر میں اتنا اہم نہیں

حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے معاملہ میں سورۂ آل عمران میں تین لفظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ توفی۔ رفع الی اللہ اور تطہیر اور سورۂ نساء میں جہاں اُن کے مقدمہ پر خاص طور پر بحث کی گئی ہے وہاں صرف رفع الی اللہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ان تینوں الفاظ میں تطہیر کا لفظ توفی و رفع کے تابع ہے کیونکہ کفار سے اُن کی تطہیر کا مقصد اُن سے اُن کی علیحدگی تھی اب وہ خواہ کسی صورت سے بھی ہو اس لئے قابل بحث دو ہی لفظ ہیں۔ توفی۔ رفع الی اللہ۔ ان دو میں سے جس لفظ کو اُن کے مقدمہ میں بصیغہ ماضی ذکر کیا گیا ہے وہ صرف لفظ رفع کا ہے جس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ توفی اور رفع کے دو وعدوں میں سے رفع کا وعدہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے پہلے پہلے پورا ہو چکا تھا اور اسی لئے اس کو بصیغہ ماضی ادا فرمایا گیا ہے اور کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ توفی بمعنے موت کا وعدہ بھی اس وقت پورا ہو چکا تھا اس لئے اس کو بصیغہ ماضی ذکر نہیں فرمایا گیا۔ ہاں سورۂ مائدہ میں حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی اپنی زبان سے توفی کا لفظ کو بصیغہ ماضی استعمال کیا گیا ہے۔ مگر حسب تصریح قرآن کریم وہ ان کے مقدمہ کے ذیل میں نہیں ہے بلکہ اس سوال کے جواب میں ہے جو محشر میں اُن سے ہوگا اور ظاہر ہے کہ قیامت سے قبل اُن کی موت واقع ہونا سب کو مسلّم ہے لیکن جہاں قرآن کریم نے اُن کے مقدمہ پر بحث کی ہے اور اُن کے معاملہ کے انکشاف کی طرف توجہ فرمائی ہے وہاں صرف لفظ رفع ہی استعمال فرمایا ہے اور توفی کا لفظ ذکر نہیں فرمایا جیسا کہ سورۂ نساء میں ہے۔ وماقتلوہ یقیناً بل رفعہ اللہ الیہ۔ یہ بات یقینی ہے کہ انھوں نے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالےٰ نے اُن کو اپنی طرف اٹھالیا۔ اگر توفی کے معنے موت ہوتے اور اُن کی موت واقع ہو چکی ہوتی تو ضروری تھا کہ یہاں بل توفاہ الیہ فرمایا جاتا۔

خلاصہ یہ کہ اس معاملہ میں اصل فیصلہ کن لفظ رفع کا ہے اسی لئے مقدمہ کے فیصلہ میں خاص طور پر اسی لفظ پر زور دیا گیا ہے اور توفی کے لفظ کو اہمیت نہیں دی گئی۔ اس لئے یہاں جنھوں نے لفظ توفی کی لغوی تحقیق پر اپنا وقت خرچ کیا ہے وہ بالکل ضائع کیا ہے کیونکہ توفی خواہ کسی معنی میں بھی مستعمل ہو مگر قرآن کریم نے اپنے فیصلہ میں اُسکو کوئی اہمیت نہیں دی۔ کیا یہ امر قابل غور نہیں ہے کہ اگر عیسٰی علیہ السّلام کی موت واقع ہو چکی تھی تو آخر ہر مقام پر اس حقیقت کا اخفاء کیوں کیا گیا ہے اور کیوں صاف الفاظ میں یہ نہیں فرما دیا گیا۔ وماقتلوہ یقیناً بل مات۔

حضرت عیسٰی علیہ السّلام کا مسئلہ پوری تفصیلات کے ساتھ زیر بحث آچکا ہے یہاں اُن کے معاملہ میں ایک ایک لفظ پر علیحدہ بحث کرنا معقول نہیں

یہ بات بھی بڑی اہمیت کے ساتھ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کا یہ معاملہ قدرے مشترک طور پر ایک قومی تواتر رکھتا ہے۔ کتب سابقہ سے لیکر قرآن کریم اور احادیث نبویہ تک اُس کے جزئی جزئی واقعات کی تفصیل آچکی ہے۔ یہاں کتب لغت اٹھا کر صرف نزول یا صرف لفظ رفع یا صرف توفی کے الفاظ پر علیحدہ علیحدہ بحث کرنی صرف ایک بے معنی بحث ہے بلکہ ایک حقیقت کے مسخ کرنے کے مرادف ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ ان کے بارے میں

جتنے تفصیلی واقعات معرض بیان میں آچکے ہیں اُن کی روشنی میں ان الفاظ کے معنی متعین کئے جائیں کیونکہ الفاظ صورت واقعہ کے بغیر ایک وسیلہ ہوتے ہیں بیاں و تتمہ سے قطع نظر کر کے الفاظ میں مجاز و استعارہ کی بے وجہ بحث کھڑی کر دینی حد درجہ غیر معقول ہے۔ پس کسی لفظ کے معنے حقیقی یا مجازی متعین کرنے کے لئے صرف لغت کی عام بحث شروع کر دینی صحیح طریقہ نہیں بلکہ پہلے اُس کے استعمال کا محل اور دوسرے قرائن اور خارجی حالات پر نظر ڈالنی بھی ضروری ہے۔ مثلاً لفظ "اسد" عربی زبان میں اُس کے معنے "شیر" ہیں۔ اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ عربی اُردو محاورات میں ایک بہادر شخص کو بھی مجازاً شیر کہہ دیتے ہیں اب کسی سے صرف ھذا اسد کا جملہ سنکر یہی رٹ لگائے جانا کہ اس جملہ کا مقصد صرف کسی بہادر شخص کی طرف اشارہ کرنا ہے اور اس محاورہ کے لئے دیوان عرب اور شعراء کے کلام سے استدلال کرتے چلے جانا کتنی بڑی غلطی ہے۔ بسا اوقات اس کے متکلم کے لئے باعث ہلاکت بھی بن سکتی ہے، یہاں اس بحث سے پہلے یہ تحقیق کرنی ضروری ہوگی کہ یہ جملہ کس مقام پر کہا گیا ہے بستی میں یا جنگل میں کسی عام مجمع میں یا کسی بیابان میں سیاق کلام کسی کی مدح و ثنا کا ہے یا خوف و ہراس کا۔ اب اگر یہ جملہ جنگل میں کسی شخص کی زبان سے نکلتا ہے جس کے سامنے شیر کھڑا ہے اس کی آواز کانپ رہی ہے اور جسم لرز رہا ہے تو اس وقت انصاف فرمائیے کہ لفظ "اسد" کے مجازی معنے یعنی بہادر انسان مراد لینا اور اس کے لئے ہزاروں اشعار پڑھ ڈالنا اور یہی کہے چلے جانا کہ اس شخص کی مراد شیر نہیں بلکہ ایک بہادر انسان کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ کیا ایک صحیح العقل انسان کا کام ہو سکتا ہے اسی طرح عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے زیر بحث معاملہ میں بھی ان تمام تفصیلات کو پیش نظر رکھنا لازم ہے جو صحیح طریقوں سے ثابت ہیں پھر جب اس طرف بھی نظر کی جائے گی کہ قرآن و حدیث میں جو جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ الفاظ کسی دوسرے شخص کے حق میں بیک وقت آج تک استعمال نہیں کئے گئے تو یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ ان کا معاملہ بھی سب سے جُداگانہ معاملہ ہے چنانچہ لفظ توفی اور رفع کا علیحدہ علیحدہ استعمال قرآن کریم میں آپکو بہت جگہ نظر آئے گا لیکن ایک ہی شخصیت کے بارے میں یہ دونوں لفظ ایک ہی سیاق میں کسی دوسری شخصیت کے متعلق آپکو کہیں نظر نہیں آئیں گے۔ سورۂ آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی شان میں یہ ہر دو لفظ اس طرح سے فرمادیئے گئے ہیں یعیسیٰ انی متوفیك و رافعك الی۔ ان کے علاوہ کسی کے حق میں ان دونوں لفظوں کو جمع نہیں کیا گیا۔ اسی طرح نزول کا لفظ بھی محاورات میں بہت جگہ آپکی نظروں سے گذر یگا لیکن نزول کے ساتھ رفع اور رفع کے ساتھ نزول پھر نزول کی اتنی تفصیلات کسی ایک مقام پر بھی کسی کے حق میں آپکی نظروں سے نہیں گذریں گی نہ کسی لغت میں نہ شعراء کے کلام میں نہ کسی آیت میں اور نہ کسی حدیث میں پس جب آپ ان جملہ امور پر غور کریں گے کہ حدیث و قرآن میں جو الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی شان میں ایک جگہ جمع کر دیئے گئے ہیں وہ کسی بشر کے لئے بیک وقت ایک جگہ جمع نہیں کئے گئے تو پھر صرف ایک ہی نتیجہ بدیہی ہو کر آپ کے سامنے آجائے گا کہ ان کا معاملہ بھی یقیناً سب سے الگ معاملہ ہے۔ یہاں ایک ایک لفظ کو علیحدہ علیحدہ لیکر بحث کرنا یا اس

میں مجاز و استعارہ کی آڑ لینا کتنا بیجا ہے سوال سیدھا یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں قرآن وحدیث میں بیک وقت یہ سب الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اسی کے ساتھ اس کے یہ تفصیلی سوانح حیات بھی موجود ہیں کیا اس کے بعد بھی ان میں لغوی موشگافیوں اور مجاز و استعارہ کی تاویلات کی گنجائش نکل سکتی ہے

اسلام صرف علمی مذہب نہیں بلکہ سلف صالحین سے اسکی عملی صورت بھی منقول چلی آتی ہے۔ لہذا محض کتب لغت کی مدد سے اس کی کوئی اور شکل بنا لینا درست نہیں۔

یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسلام صرف ایک علمی مذہب نہیں ہے جس کو صرف دماغی کاوشوں نے پیدا کیا ہو بلکہ وہ ایک مجموعی شکل وصورت کے ساتھ عملاً بھی منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ ہمارے دین کا تمام تر تعلق اوپر سے ہے ہم نیچے سے کسی نئے دین تراشنے کے مجاز نہیں اس کے بانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے ان سے صحابہ نے اس کے شعبہ اعمال اور اس کے بنیادی عقائد بھی سیکھے آپ نے ان پر خود بھی ایمان رکھا اور ان ہی پر بعد کی امت کو ایمان رکھنے کی وصیت فرمائی اور پھر کسی درمیانی انقطاع کے بغیر اسی طرح دین سپرد ہوتا رہا ہے۔ ادھر حفاظت الہیہ کا یہ عجیب کرشمہ تھا کہ بحث وتمحیص کا جو مرحلہ تھا وہ سب تبع تابعین کے ماحول ہی میں ختم ہو چکا تھا یہ وہ قرن ہے جس کے متعلق خیریت کی شہادت خود لسان نبوت سے نکل چکی ہے اس لئے جب کسی دین کے مسئلہ پر بحث کی جائے تو اس کو محض دماغی کاوش اور لغت کی مدد سے سر نو شروع کر دینا ایک بنیادی غلطی ہے یہاں ریسرچ کے اصول کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ کام خود انبیاء علیہم السلام کا بھی نہیں اس کو قدرت نے براہ راست خود اپنے ہی دست قدرت میں رکھا ہے۔ ان کی بھی مجال نہیں کہ حکم ایزدی کے بغیر وہ ایک نقطہ کا اضافہ یا ایک نقطہ کی ترمیم کر سکیں چنانچہ ارشاد ہے۔

واذا تتلی علیهم آیاتنا بینات قال الذین لا یرجون لقاءنا ائت بقرآن غیر هذا او بدله قل ما یکون لی ان ابدله من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی الخ

جب ہمارے کھلے کھلے احکام ان لوگوں کو پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تو جن لوگوں کو ہماری ملاقات کی امید نہیں وہ تم سے یہ فرمائش کرتے ہیں کہ اسکے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا کم از کم اسی میں کچھ رد و بدل کر دو ان سے کہدو کہ میرا تو ایسا مقدور نہیں کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی ردّ و بدل کر سکوں میں تو اسی پر چلتا ہوں جو میرے پاس وحی آتی ہے

اس ترمیم وتبدیل کا انحصار کچھ الفاظ ہی پر نہیں ہے بلکہ اس کے معانی کو بھی شامل ہے اور وہ لفظی ترمیم سے زیادہ شدید ہے۔ یہود بے بہبود نے دونوں قسموں کی تحریفیں کی تھیں تورات کے الفاظ میں بھی اور انکے معانی میں بھی قرآن کریم چونکہ آخری کتاب تھی اس لئے وہ دونوں قسموں کی تحریفوں سے محفوظ ہے لفظی ترمیم کا تو یہاں کوئی امکان ہی نہیں رہی معنوی ترمیم وتحریف تو امت کے بعض ملحد فرقوں نے گو اس میں یہود کو بھی مات دیدی ہے مگر اس کی معنوی حفاظت کی وجہ سے وہ اصل دین پر کچھ اثر انداز نہیں ہو سکی اور ہر دور میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کیا جاتا

رہا ہے پس اگر کوئی شخص آج یہ دعویٰ کرنے لگے کہ نمازیں پانچ نہیں صرف دو ہیں اور اسی کے لئے دماغی تراشیدہ دلائل کا ڈھیر لگا دے تو بالکل بے سود سعی ہے اس کو یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ اُمت اوپر سے بھی صرف دو ہی نمازیں پڑھا کرتی تھی۔ بلکہ اس کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ پانچ نمازوں کی فرضیت اگر غلط ہے تو پھر اُس کی بنیاد کس دن سے قائم ہوئی اسی طرح مسئلہ جنت و دوزخ، فرشتے اور جنات وغیرہا کی حقیقتیں صرف لفظی بحثوں سے نئی نئی بنا کر پیش کرنی بھی غلط ہے کیونکہ یہ الفاظ جس طرح اوپر سے منقول ہوتے چلے آئے ہیں اسی طرح اُن کے معانی بھی اوپر ہی سے مفہوم اور معلوم ہوتے چلے آئے ہیں اسی طرح ختم نبوت اور نزول مسیح علیہ السّلام کے الفاظ کا حال ہے یہ بھی اُمت میں ہمیشہ سے مستعمل ہوتے چلے آئے ہیں اور ہر دور میں اُس کے صرف یہی ایک معنی سمجھے گئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں بنیگا اور اسی کے ساتھ یہ بھی منقول ہوتا چلا آیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام دوبارہ آنے والے ہیں اب ذرا اس پر غور فرمائیے کہ ایک طرف نبی کی آمد کی ممانعت بھی منقول ہے اور اسی کے ساتھ اسرائیلی رسول کی آمد بھی منقول ہے۔ اب اگر کوئی صرف اپنی دماغی کاوش سے یہ کہنے بیٹھ جائے کہ جب آپکے بعد کوئی نبی نہیں تو عیسیٰ علیہ السّلام بھی نہیں یا اگر عیسیٰ علیہ السّلام آئینگے تو وہ نبی بھی آئیگی تو اس کا حاصل صرف اپنی دماغی کاوش سے ایک علمی دین بنانا ہوگا اس کو منقول شدہ دین نہیں کہا جاسکتا اور اگر فرض کرلو کہ ہمارا کہنا صحیح نہیں تو پھر آپ کو کسی تاریخ سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ فلاں تاریخ سے اس غلط عقیدہ کی بنیاد قائم ہوئی ہے مگر یہاں اسلامی تاریخ تو درکنار اگر اس بارے میں دوسرے اہل مذاہب سے آپ اس اُمت کا عقیدہ پوچھیں تو وہ بھی کسی تردد کے بغیر آپکو یہی بتائیں گے کہ اُن کے نزدیک کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا ہاں وہی عیسیٰ علیہ السّلام اسرائیلی رسول آئیں گے اس وقت یہ بحث نہیں ہے کہ یہ عقیدہ خلاف قیاس ہے یا نہیں اور نزول کے اور خاتم کے لغت میں معنے کیا ہیں اور ختم نبوت اور نزول میں حروف تطبیق کیا ہے۔ بلکہ بحث صرف یہ ہے کہ اُمت میں ان الفاظ کے معنیٰ کیا سمجھے جاتے رہے ہیں تو آپ صرف اسی ایک مذکورہ بالا نتیجہ پر پہنچیں گے یہی وجہ ہے کہ تفسیروں میں اور شروح حدیث میں کتب عقائد میں اور دین کے تمام معتبر لٹریچر میں اسی حقیقت کو دوہرایا گیا ہے اور اسی حقیقت کے ماتحت ہر مدعی نبوۃ اور ہر مدعی مسیحیت کی تکفیر و تردید کی گئی ہے لہٰذا یہاں صرف مجاز و استعارہ یا ناتمام نقول یا مبہم یا محرف الفاظ سے کوئی ایسی حقیقت تراش لینی جو آج تک اُمت کے بیان کردہ حقیقت کے برعکس ہو دین محمدی کہلانے کے قابل نہیں اس کو نیا دین کہنا بجا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے متعلقہ آیات پر غور کرنے سے قبل یہاں اُنکے مقدمہ کی پوری روداد جو قرآن کریم نے نقل فرمائی ہے اور فریقین کے بیانات پیش نظر رکھنا ضروری ہیں۔

قرآن کریم پر غور کرنے سے قبل یہاں یہ غور کرلینا بھی ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے معاملہ میں جو مسئلہ زیر بحث آیا ہے وہ کیا مسئلہ ہے اور وہ کیوں زیر بحث آیا ہے۔ جب آپ اس طرف توجہ فرمائینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سورۂ فاطر میں جس امر کی اہمیت محسوس کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جو قوم کل تک خدائے تعالیٰ کی نعمتوں کا

گہوارہ بنی ہوئی تھی آخر کیوں یک لخت وہ اُن تمام نعمتوں سے محروم کر دی گئی اور کیوں نعمتوں کی بجائے لعنت کا مورد بن گئی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے اُن کے اُن پے در پے جرائم کا ذکر کیا ہے جو ایک بد تر تھے اور جس کی کہ یہ قوم عادی بن چکی تھی۔ جو جرم ان کے یہاں شمار کئے گئے ہیں اُن میں کچھ تو اُن کے حیا ناک اقوال ہیں اور کچھ زشت افعال۔ اُن کے زشت افعال میں خدا تعالیٰ کے مقدس انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا ہے اور اُن کے لحیا ناک اقوال میں معصومہ حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان طرازی اور اُن کے ملکی صفت فرزند مطہر کے متعلق قتل کرنے کا دعویٰ کا دب ہے۔ اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ یہاں یہود ملعون کا بیان کیا ہے اور پھر ان بیانات ہی کی روشنی میں قرآنی فیصلہ پر غور کرنا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کی حیثیت چونکہ ایک حکم اور فیصل کی ہے اس لئے ہم کو یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ جس معاملہ کے متعلق قرآن کریم نے فیصلہ فرمایا ہے اس میں فریقین کے بیانات کیا نقل کئے ہیں یہاں کسی ایک حرف کا اپنی جانب سے اضافہ کرنا جو مقدمہ کی جان ہو قرآن پر خیانت یا عجز کا بڑا اتہام ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہر عدالت کے لئے یہ کتنا ضروری ہے کہ وہ فریقین کے بیانات نہایت احتیاط کے ساتھ ضبط کرے اور بالخصوص جو اجزاء کسی فریق کے مقدمہ کی اصلی روح ہوں اُن کو پُورے طور پر واضح کر دے آج بھی اگر کوئی عدالت فریقین کے بیانات قلمبند کرنے میں ایسی تقصیر کر جائے تو اُس کے حق میں یہ کتنا بڑا سنگین جُرم شمار ہوتا ہے پس ہمارے نزدیک جو بات یہاں صورت واقعہ کو آسانی سے حل کر دے سکتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے ہم فریقین کے بیانات کو حاشیہ آرائی کے بغیر دیکھیں اُن کے بعد کسی تاویل کے بغیر قرآنی فیصلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس قاعدہ کے موافق جب ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ سامنے رکھتے ہیں تو جو بیان ہم کو یہاں یہود کا ملتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم نے ان کو قتل کر ڈالا ہے رہا یہ کہ کس غرض سے اُن کو قتل کیا ہے اور کس آلہ سے قتل کیا ہے اس کو انھوں نے نہ یہاں بیان کیا ہے اور نہ یہ باتیں اُن کے نزدیک کچھ اہم معلوم ہوتی ہیں جس بات پر اُنھوں نے اپنے بیان دعویٰ میں زور دیا ہے وہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کی تشخیص و تعیین ہے دوم اُن کے قتل کرنے کا پُورا جزم و یقین ہے اسی لئے مقتول کے صرف نام یا لقب ہی پر اُنھوں نے کفایت نہیں کی بلکہ خاص طور پر اُن کی خاص مادری نسبت کا بھی ذکر کیا ہے یعنی والد کے بغیر پیدائش اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ بلاشبہ یہ شخص وہی ہے جو "رسول اللہ" کہلاتا ہے اُس کے بعد اُنھوں نے اپنی جس جرأت کا بیباکانہ ذکر کیا ہے وہ قتل کا جُرم ہے چنانچہ اُس کو بھی اُنھوں نے لفظ "اِنَّ" سے ذکر کیا ہے جو عربی زبان میں جزم و یقین کے لئے مستعمل ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ اُن کو نہ تو اپنے فعل قتل میں کوئی شبہ ہے اور نہ اس مقتول کی ذات میں کوئی شبہ ہے جس کے قتل کا اُن کو دعویٰ تھا۔ اس سے زیادہ کوئی اور بات یہاں نقل نہیں کی گئی۔ اس لئے قرآنی فیصلہ بھی ہم کو صرف اسی بیان کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے

نصاریٰ کے متعلق یہاں قرآن کریم نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ وہ یقینی طور پر کوئی بات نہیں کہتے مختلف باتیں بناتے

ہیں اور چند وجوہات کی بنا پر حقیقت کا اُن کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے اس لئے صرف اٹکل کے تیر چلانے کے سوا اُن کے لئے چارہ کار ہی کیا ہے ہاں اجمالی طور پر اُن کا یہ خیال ضرور تھا کہ وہ اپنے جسم ناسوتی یا لاہوتی کے ساتھ آسمانوں پر اٹھائے گئے۔ اب ظاہر بات ہے کہ قرآنی الفاظ کے مطابق جو بات یہاں متنازع فیہ نظر آتی ہے وہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی صرف زندہ شخصیت ہے۔ یہود کہتے تھے کہ ہم نے ان کو قتل کر ڈالا ہے اور نصاریٰ اس خیال میں تھے کہ وہ آسمان پر اُٹھائے گئے ہیں۔ اُن کی روح کے متعلق نہ یہاں کوئی تذکرہ ہے اور نہ روح کا تذکرہ معرض بحث میں لایا جا سکتا ہے کیونکہ روح کا معاملہ ایک غیبی معاملہ ہے وہ انسان کے ادراک سے بالاتریات ہے۔ اس پر نہ یہود کوئی حجت قائم کر سکتے ہیں اور نہ قرآنی بیان کو وہ تسلیم کرتے ہیں اس لئے حسب تصریح قرآن کریم اُن کے دعوی ہی میں روح زیر بحث نہ تھی تو فیصلہ میں اُس کا ذکر کیسے آ سکتا ہے ظاہر ہے کہ قتل کا فعل جسم پر وارد ہوتا ہے روح پر وارد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اُن کے مقابلہ میں جب قرآنی فیصلہ یہ ہو کہ وہ مقتول نہیں ہونے بلکہ مرفوع ہوئے ہیں تو یہاں رفع سے جسم ہی کا رفع مراد ہوگا نہ کہ روح کا۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مصلوب ہونے اور ان کے عزت سے مرجانے کی جدید اختراع

یہاں ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو سولی پر چڑھا دیا تھا اُن کے سر پر کانٹوں کا تاج بھی رکھا، منہ پر تھوکا بھی اور جو کچھ نہ کرنا تھا وہ سب کچھ بھی کر لیا تھا والعیاذ باللہ حتیٰ کہ جب اُن کو پورا یقین ہو گیا کہ انھوں نے اُن کو درحقیقت مار ڈالا ہے تو اُن کو سولی سے اُتارا مگر اُن میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی آخر وہ چھپ کر کشمیر یا دنیا کے کسی اور غیر معروف شہر میں آکر اپنی موت سے مر گئے تھے۔ اس جماعت کے نزدیک یہود کا یہ گمان تھا کہ جو شخص بھی صلیب کے ذریعہ مارا جاتا ہے وہ لعنتی موت مرتا ہے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے رسول ہونے کی بجائے اُن کا ملعون ہونا ثابت کریں اس لئے اُن کے نزدیک یہ از بس ضروری تھا کہ اُن کی موت صلیبی موت ہو تاکہ وہ اُن کے لعنتی ہونے کا ثبوت بن سکے۔ اس جماعت کو یہود کے یہ سب جرائم مسلّم ہیں یعنی اُن کا سولی دینا اور تمام اہانت کے اسباب کا ارتکاب کرنا حتیٰ کہ ان کو اس نوبت میں پہونچا دینا کہ اُن کے حق میں زندگی کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہے اور یہاں قرآنی تردید کا حاصل صرف یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے معاملہ میں گو اسباب موت سب پورے ہو چکے تھے مگر ان میں کچھ جان باقی رہ گئی تھی اس لئے وہ صلیبی موت سے نہیں مرے بلکہ کہیں جا کر خود اپنی موت سے مرے ہیں اس لئے اُن کی موت لعنتی موت نہیں ہوئی بلکہ اُن کو بڑی عزت کی موت نصیب ہوئی ہے اور ان کے بڑے درجے بلند ہوئے اُن کے نزدیک بل رفعہ اللہ الیہ کی تفسیر یہی ہے۔

اب اگر واقعہ درحقیقت یہی تھا جو اس جماعت کا خیال ہے تو یہاں حسب ذیل اُمور قابل غور ہیں

(الف) اگر درحقیقت یہود کا دعویٰ یہاں اُن کی صلیبی موت کا تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اُن کے

بیان میں صلیب کا دعویٰ نقل نہیں کیا اور کیوں قتل کا ایک عام لفظ نقل کیا ہے

(ب) اور کیا وجہ ہے کہ جبکہ اُن کا تمام زور صلیبی موت کے متعلق تھا تو تردید میں صرف نفی قتل پر زور دیا گیا ہی اور کیوں ایک ایسے غیر متعلق جرم کی نفی پر زور دیا گیا ہے جس کی نفی سے اُن کے دعوی کی تردید کا کوئی تعلق نہیں تھا یعنی نفس قتل ظاہر ہے کہ یہ ایک عام جرم ہے جو صلیب اور غیر صلیب ہر آلہ سے حاصل ہو سکتا ہے قتل کی نفی پر تو زور نہ دینا اور ایک عام جرم کی نفی پر زور دینا یہ کہاں تک مناسب ہے۔

(ج) پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے اگر ایک بار صلیب کا انکار بھی کیا تو وہ بھی ایسے محل پر کیا ہے جو اس کا صحیح محل نہ تھا یعنی جب قرآن کریم ان کی لعنتی موت تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کی بجائے اُن کی موت کو عزت کی موت قرار دیتا ہے تو پھر بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کو مقابل بنا کر ذکر کرنا چاہیئے تھا اور یوں کہنا تھا کہ وماصلبوہ یقیناً بل رفعہ اللہ الیہ مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہاں بھی قرآن کریم نے خاص صلیب کی بجائے صرف ایک عام فعل قتل کی نفی فرمائی ہے اور یوں فرمایا ہے کہ وماقتلوہ یقیناً بل رفعہ اللہ الیہ۔

(د) اس تفسیر کی بنا پر یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ جو چیز موقعہ واردات پر واقع ہوئی وہ یہی تھی کہ وہ کشمیر یا اور کسی طرف چلے گئے تھے رہا اُن کی موت کا مسئلہ تو اگر اُن کی موت کہیں جا کر واقع ہوئی تو یہ سالوں یا مدتوں بعد کا معاملہ ہے پس جو بات یہاں صورتِ حال بتانے کے لئے ضروری تھی اُس کو کیوں حذف کر دیا گیا ہے اور صاف طور پر یہ کیوں نہیں فرما دیا گیا کہ یہود نے اُن کو سولی نہیں دی بلکہ وہ زندہ کشمیر وغیرہ کہیں چلے گئے تھے تاکہ یہ بات واضح ہو جاتی کہ صلیبی موت سے بچنے کی اُن کی شکل کیا ہوئی پس اصل حقیقت کا تو اخفاء کرنا اور موت کی ایک عام سنت کا بیان کرنا یہ کس درجہ بے محل اور غیر متعلق بات ہے۔

(ﮦ) اس سے بڑھ کر یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اصل بات اُن کی طبعی موت تھی تو یہاں بل رفعہ اللہ الیہ کی بجائے بل توفاہ اللہ کہنا زیادہ مناسب تھا تاکہ ثابت ہو جاتا کہ وہ صلیبی موت سے نہیں مرے بلکہ طبعی موت سے مرے ہیں اور جب اپنی طبعی موت سے مرے ہیں تو رفع درجات کا مسئلہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے پس اگر صورت حال کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ اسی صورت سے ہوتا ہے کہ یہاں ان کی طبعی موت کا ذکر کیا جائے۔

لیکن آیت بالا میں یہاں ان تینوں الفاظ میں سے کوئی لفظ نہیں ہے۔

نہ یہ (۱) وماصلبوہ یقیناً بل رفعہ اللہ الیہ

نہ یہ (۲) وماقتلوہ یقینا بل اذھبہ اللہ الی الکشمیر

اور نہ یہ (۳) وماقتلوہ یقینا بل توفاہ اللہ

اب اگر ہم اس جماعت کے خیالات کو صحیح تسلیم کرتے ہیں تو ہم کو یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ سرے سے یہود کا اصل دعویٰ ہی یہاں

مذکور نہیں یعنی خاص صلیب دینا کیونکہ اُن کے بیان کے مطابق اُن کی لعنتی موت ہونا اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ اُن کی موت صلیب کے ذریعہ واقع ہوئی ہے اس لئے یہاں اُن کے دعوے میں قتل کے عام جُرم کا نقل کرنا مدعیین کے دعوی کی بھی اور اُن کے مقاصد کے بھی بالکل خلاف ہیں۔ اسی طرح جب ہم قرآن کریم کے فیصلہ پر نظر کرتے ہیں تو یہاں بھی واقعہ کی اصل صورت بالکل مبہم نظر آتی اور صورت حال کا کچھ انکشاف نہیں ہوتا کیونکہ نہ یہاں اُن کے کشمیر جانے کا ذکر ہے نہ اُن کے طبعی وفات پانے کا کوئی تذکرہ ہے اس لئے اس کا کوئی انکشاف نہیں ہوتا کہ ملزمین جس کے قتل کے اس شد و مد کے ساتھ مدعی تھے اگر وہ شخص مقتول نہیں ہوا تو آخر پھر کدھر گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے متعلق جو نہ صرف اُن کے زیر حراست آچکا تھا بلکہ اُن کی آنکھوں کے سامنے مر بھی چکا تھا صرف یہ کہدینا کہ وہ سولی پر نہیں مرا تھا بلکہ عزت کی موت مرا تھا کیا تشفی بخش تھا ہاں اگر یہ کہدیا جاتا ہے کہ ہم نے اس کو فلاں مقام پر بھیجدیا تھا اور اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا جاتا کہ مدعیین کے لئے اس مغالطہ لگنے کا باعث کیا تھا تو بیشک صورت حال پر روشنی پڑ سکتی تھی لیکن صرف یہ کہدینا کہ اُن کی عزت کی موت واقع ہوئی ہے بے معنی فیصلہ ہے اور بالکل بعید از قیاس بھی ہے کیونکہ جو لوگ اُن کے قتل کے مدعی تھے وہ یہود تھے اور اس بارے میں اُن کو اتنا یقین تھا کہ اپنے بیان میں اس کے متعلق تاکید او یقین کے جتنے طریقے وہ استعمال کر سکتے تھے سب استعمال کر چکے تھے۔ اب اگر قرآن کریم یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ تم نے اُن کو سولی پر چڑھا دیا تھا مگر جب وہ سولی سے مردہ سمجھ کر اُتارے گئے تھے تو وہ پُورے طور سے نہیں مرے تھے۔ اگرچہ تم کو مردہ معلوم ہوتے تھے پھر بعد میں اُن کو کسی غیر جگہ لیجا کر خود ہم نے ان کو موت دی تھی یہ بیان جتنا خلاف قیاس ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ خاصکر جب کہ اُن کی موت تسلیم کر لی جائے جو لوگ یقینی اسباب قتل کا ارتکاب کر چکے تھے اُن سے یہ کہنا کہ وہ ان اسباب سے نہیں مرے بالکل اتنی ہی مضحکہ خیز بات ہوگی جیسے کوئی قاتل اپنی صفائی کے بیان میں یہ کہے کہ مقتول کے پیٹ میں چھرا تو میں نے ہی گھونپا تھا مگر مقتول اس کی وجہ سے نہیں مرا بلکہ وہ اپنی طبعی موت سے مرا ہے یہ سب جانتے ہیں کہ قاتل کے یقینی آلہ قتل کے استعمال کرنے کے بعد ان حالات میں جبکہ موت کا ظاہری سبب وہی ہو کوئی عدالت اس کے اس عذر کو معقول نہیں سمجھے گی بلکہ اس کی سماعت مقتول کے حق میں ایک ظلم تصور کریگی پھر یہاں سولی کا جُرم تسلیم کر لینے کے بعد اور وہ بھی اس حد تک کہ ملزمین کے نزدیک اس کی موت یقینی ہو چکی ہو خالق کائنات کا یہ فیصلہ دینا کہ وہ تمہارے مارنے سے نہیں مرے بلکہ ہمارے مارنے سے مرے ہیں اُن کے مقابلہ میں کیا اثر انداز ہو سکتا ہے بالخصوص جبکہ اس بعید از قیاس دعوے کے لئے کوئی قرینہ بھی یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں اگر اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہی نکلے گا کہ اپنے دشمن کی ہلاکت جو ہر شخص کا مقصد ہوتا ہے یہاں اس کو اللہ تعالےٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے پُورا کر دیا تھا۔ دشمنوں کے مقابلہ میں اب یہ بحث کھڑی کرنی کہ اُن کی یہ موت بڑی عزت کی موت تھی ہمارے نزدیک زخموں پر نمک پاشی سے کم نہیں۔

یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے کہ حسب بیان قرآن کریم یہود کے جرم کی جو نوعیت عیسیٰ علیہ السّلام کے معاملہ میں تھی وہی نوعیت دوسرے انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ بھی تھی یعنی قتل دونوں مقامات پر قرآن کریم نے ایک ہی لفظ قتل کو استعمال فرمایا ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ عیسیٰ علیہ السّلام کے قتل ہونے کو اس نے تسلیم نہیں کیا اور دیگر انبیاء علیہم السّلام کے حق میں تسلیم کر لیا ہے تو اب سوال یہ ہے کہ جب یہاں مدعیین بھی ایک ہی قوم تھی اور دعویٰ بھی ایک تھا تو پھر صرف ایک عیسیٰ علیہ السّلام کی خصوصیت کیا تھی کہ اُن کے حق میں اُن کے رفع روحانی یا عزت کی موت کی تصریح ضروری سمجھی گئی ہے اور دیگر انبیاء علیہم السّلام کے حق میں اُن کی موت کے متعلق ایک کلمہ تک نہیں فرمایا گیا حالانکہ یہود کا مقصد اُن کے قتل کرنے سے بھی اس کے سوا اور کیا تھا کہ اُن کے نزدیک یہ سب مقدس گروہ بھی لعنتی تھا۔ والعیاذ باللہ کیا اس سکوت کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ اُن کے معاملہ میں رفع روحانی یا رفع درجات تسلیم نہیں کیا گیا۔ والعیاذ باللہ۔ حقیقت یہ ہے کہ روح کے رفع یا عدم رفع کا مسئلہ نہ یہاں زیر بحث تھا اور نہ یہ مسئلہ کسی کے حق میں خواہ عیسیٰ علیہ السّلام ہوں یا دیگر انبیاء علیہم السّلام زیر بحث آنے کے قابل ہے۔

پھر اگر یہاں رفع سے رفع روحانی مراد ہوتا تو کیا اس کے لئے صرف بل رفعہ اللہ کا لفظ کافی نہ تھا۔ یہاں لفظ الیہ کا بے ضرورت کیوں اضافہ کیا گیا ہے۔

صلیبی موت کا لعنتی ہونا اور اس کے مقابلہ میں عزت کی موت کا افسانہ اسلام میں بالکل بے اصل بلکہ غیر معقول ہے

رفع روحانی اور عزت کی موت کا یہ سارا افسانہ اس پر مبنی ہے کہ صلیبی موت کے لعنتی موت ہونے کی شریعت کی نظر میں کوئی اصلیت بھی ہو لیکن اگر یہ تخیل ہی بے بنیاد ہے تو پھر نہ قرآن کریم کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہو سکتی ہے اور نہ کسی غلط بنیاد پر وہ اپنے صحیح فیصلہ کو مبنی کر سکتا ہے۔ جب اس پر نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ لعنتی موت کا اسلام میں کوئی تصور ہی نہیں ہے یہاں کفار جتنے ہیں وہ سب کے سب ملعون ہیں خواہ زندہ ہوں یا مردہ سولی پا کر مریں یا گولی کھا کر آخر جب ملعون قرار دیئے گئے تو کیا یہ لعنت اُن کے دم کے ساتھ ساتھ نہ رہی۔ یقیناً حیات سے لے کر موت اور موت سے لیکر قیامت اور قیامت سے جہنم تک اُن کے دم کے ساتھ لگی رہے گی۔ جملہ ادیان سماویہ میں موت کے اچھے اور بُرے ہونے کا تعلق انسانوں کے اعمال پر رکھا گیا ہے نہ کہ کسی خاص آلۂ قتل پر اور یہی بات معقول بھی ہے یہ بات بالکل غیر معقول ہے کہ ایک پاکباز انسان اگر سولی پر مارا جائے تو وہ صرف اس خاص آلۂ قتل کی وجہ سے لعنتی بن جائے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے دیگر انبیاء علیہم السّلام کے متعلق یہود کے جرم قتل کا اعتراف کر لینے کے باوجود اُن کی عزت کی موت ہونے کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی اور نہ اس بدیہی بات کی طرف توجہ کی ضرورت تھی بلکہ جس بات کی اہمیت محسوس فرمائی وہ یہ ہے کہ یہ وہ مقدس جماعت ہے جس کے قتل کا وبال یہ ہے کہ جو جماعت کل تک لعنت کا گہوارہ بنی ہوئی تھی اب وہ موردِ لعنت بن گئی ہے تعجب ہے کہ یہاں سیاقِ کلام تو یہود کے ملعون ہونے کے

اسباب بیان کرنے کا تھا اور اس میں بے بنیاد اور اُلٹا عیسیٰ علیہ السلام کے ملعون ہونے نہ ہونے کی بحث کھڑی کردی گئی

رفع کا لفظ قرآن کریم میں ایک جگہ بھی لعنتی موت کی تردید کے لئے مستعمل نہیں

بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ لفظ رفع کے معنے پر بھی غور کر لینا چاہیئے کہ یہ لفظ عزت قرآنی میں کہیں عزت کی موت کے لئے استعمال ہوا ہے؟ جہاں تک ہم نے قرآن کریم اور کتب لغت پر نظر کی ہے ہم کو اس لفظ کے معنی کہیں لعنتی موت کے بالمقابل عزت کی موت دینے کے ثابت نہیں ہوئے بلکہ اس لفظ کا استعمال غیر ذی روح میں بھی ہوتا ہے جہاں موت کا احتمال ہی نہیں ارشاد ہوتا ہے رفع السموات بغیر عمد ترونہا۔

رفع کے معنے قرآن و لغت میں

یہاں لفظ "رفع" آسمانوں کے متعلق استعمال ہوا ہے اسی طرح اس کا استعمال زندوں اور مردوں میں یکساں نظر آتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب آیات ذیل پر نظر فرمائیے:-

(۱) ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات

(۲) يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ

(۳) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ

(۴) وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا

(۵) وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

(۶) وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ

ان تمام آیتوں میں رفع کا لفظ انسانوں ہی میں استعمال ہوا ہے مگر کسی ایک جگہ بھی اس کے معنی عزت کی موت کے مراد نہیں ہیں بلکہ مُردوں میں اس کا استعمال ہی نہیں ہوا۔ یہاں ایک بڑا مغالطہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی کا مسئلہ گویا صرف لفظ رفع سے پیدا ہو گیا ہے اور اس لئے ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ رفع کا لفظ رفع جسمانی کے لئے کہیں آیا ہے یا نہیں۔ درحقیقت یہ بحث کا رُخ پلٹنے کے لئے صرف ایک چال ہے اصل سوال یہ تھا کہ یہ لفظ عزت کی موت کے لئے کہیں استعمال ہوا ہے یا نہیں اور چونکہ یہ معنے کہیں ثابت نہیں اس لئے بحث کا رُخ بدلنے کے لئے ذہنوں کو ایک دوسرے سوال کی طرف متوجہ کر دیا گیا ہے تاکہ اصل سوال کی طرف کسی کا ذہن متوجہ ہی نہ ہو سکے اصل بات یہ ہے کہ رفع کا لفظ صرف بلند کرنے اور اُٹھانے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اس میں نہ جسم کی خصوصیت ہے نہ روح کی بلکہ وہ غیر ذی روح میں بھی مستعمل ہوتا ہے جب عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں جسم کا رفع اس لئے مراد لیا گیا کہ یہاں زیر بحث جسم ہی کا معاملہ تھا یہود اُس کے قتل کے مدعی تھے اور نصاریٰ اس کے رفع کے۔ پس جب یہاں روح زیر بحث ہی نہ تھی تو رفع سے روح کا رفع مراد ہو کیسے سکتا تھا۔ اس مقام کے علاوہ قرآن کریم میں کسی جگہ اور کسی شخص کے

متعلق یہ بحث نہیں ملتی کہ وہ قتل کیا گیا ہے یا اپنے جسم کے ساتھ اٹھایا گیا ہے اس لئے کسی اور جگہ خاص جسم کے رفع کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے پس انسانوں میں جن کے جسم مشاہدہ میں ہوتے ہیں جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو چونکہ وہاں اُن کے جسم کے رفع کا احتمال ہی نہیں ہوتا اس لئے وہاں معنوی رفع یعنی درجات کی بلندی مراد ہوتی ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ اس لفظ کا استعمال ہر قسم کی بلندی کے لئے ہوتا ہے جسم کی ہو یا معنوی جیسا موقع اور محل ہوگا اُس کے مطابق اس کے معنے مراد لئے جائیں گے یہی حال لفظ توفی کا ہے وہ بھی زندوں اور مردوں دونوں میں یکساں مستعمل ہے عیسیٰ علیہ السّلام کے معاملہ میں لفظ توفی۔ رفع۔ نزول اور اُس کی پوری تفصیلات موجود ہیں اس کے ساتھ یہاں قومی تاریخیں بھی موجود ہیں پس یہ مسئلہ قومی تاریخ اور آیات واحادیث کی روشنی سے ثابت ہوا ہی یہ سمجھنا بڑی نافہمی ہے کہ یہ مسئلہ صرف لفظ رفع کی پیداوار ہے جیسا کہ آیت ملا میں حضرت یوسف علیہ السّلام کے والدین کے جسمانی رفع کا معاملہ صرف لفظ رفع سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اُس کے لئے دوسرے خارجی قرائن بھی تھے اور یہاں تو قرائن نہیں بلکہ دلائل موجود ہیں اور وہ بھی واضح سے واضح اور مستحکم سے مستحکم۔ خلاصہ یہ کہ جب ایک طرف لعنتی موت کا افسانہ بے بنیاد ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف رفع کا استعمال بھی عزت کی موت یعنی لعنتی موت کی تردید کے لئے نہیں ملتا تو پھر آیت بالا کی یہ تفسیر کیسے قبول کی جا سکتی ہے

عیسیٰ علیہ السّلام کا مصلوب ہونا قرآن کریم سے اور اس کی تردید

اب ذرا اس پر بھی نظر ڈالتے چلئے کہ خاص عیسیٰ علیہ السّلام کے حق میں اُن کا سولی دیا جانا، اُن کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھنا، اُن کے مُنہ پر تھوکا جانا اور طرح طرح سے اُن کی توہین وتذلیل کرنا کیا یہ تاریخ قرآن کریم کو مسلّم ہے؟

یہاں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم نے جب یہود کے ملعون ہونے کے اسباب کا تذکرہ کیا ہے تو خاص عیسیٰ علیہ السّلام کے مسئلہ میں کس سبب کا ذکر کیا ہے آیت وقولھم انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام کے معاملہ میں صرف اُن کا یہ کہنا کہ ہم نے اُن کو قتل کر ڈالا ہے ان کے لعنت در لعنت کا سبب بن گیا تھا اب سوال یہ ہے کہ اگر اس معاملہ میں اُن کی جانب سے وہ تمام بدترین اور توہین وتذلیل کی حرکات ناگفتہ سرزد ہو چکی تھیں جو ابھی ذکر ہو چکیں تو ان تمام مکروہ افعال کا ذکر نہ کرنا اور صرف ایک دعویٰ قتل کو نقل کرنا کیا یہ معقول ہو سکتا ہے عقل ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتی کہ اگر اس سلسلہ میں ان مکروہ افعال کا ان سے صدور ہوا تھا اور ان تمام مظالم اور جرائم پر پردہ ڈال دیا جاتا اور صرف ایک دعویٰ قتل کو اُن کے اسباب لعنت میں ذکر کیا جاتا اور اس سے کہیں بڑھ کر اسباب لعنت کے ذکر سے سکوت کر لیا جاتا ہمارے نزدیک دشمنوں اور مجرموں کے حق میں اس سے بڑھ کر فیاضی کی مثال ملنا ناممکن ہے۔

اس کے علاوہ سورہ مائدہ میں جب اللہ تعالےٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر اپنے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے تو اُن میں ایک بڑا انعام یہ بھی شمار کیا ہے واذ کففت بنی اسرائیل عنک اور یہ انعام بھی قابل یاد ہے

جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تم سے دور روکے رکھا اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا تھا اور سب ناروا سلوک اُن کے ساتھ کر لئے تھے تو کیا بنی اسرائیل کی اس دست رس کے بعد عربی ادب و لغت کے لحاظ سے مذکورہ بالا جملہ استعمال کرنا صحیح ہے دوم پھر کیا یہ دردناک مظالم اور تذلیل و توہین کا سلوک اس قابل ہے کہ اُن کے عجیب و غریب معجزات اور نزول مائدہ جیسے انعامات کے پہلو بہ پہلو ایک انعام بنا کر اس کو ذکر کیا جائے۔ تیسرے سورۂ آلِ عمران میں یہ ارشاد ہے

ومکروا ومکر الله والله خیر الماکرین۔ — یہود نے بھی خفیہ سازش کی اور ہم نے اُن کے مقابلہ میں خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر و برتر ہے۔

آیت بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ جب یہود بے بہبود نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے قتل کی تدبیریں کیں تو ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی تدبیر فرمائی اور یہ ظاہر ہے کہ جب قدرت خود ضعیف انسان کی تدبیر کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو جائے تو پھر کسی کی ضعیف یا قوی تدبیر کیا چل سکتی ہے یہ بات الگ ہے کہ جب قدرت تدریج و امہال کے قانون کے ماتحت کسی گرفت کا ارادہ ہی نہ فرمائے تو کچھ مدت کے لئے انسان اپنی سب تدبیروں میں کامیاب نظر آئے لیکن اگر قدرت الٰہیہ ان تدابیر کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو جائے تو کیا پھر اس رسوائی و ذلت کی کوئی مثال مل سکتی ہے جو یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے معاملہ میں ناسمجھوں نے اپنی جانب سے تراش لی ہے اور کیا اب دشمنوں کے مقابلہ میں قرآن کریم کا یہ دعویٰ کرنا کہ واللہ خیر الماکرین۔ اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بڑھ کر تدبیر کرنے والا ہے۔ قابل مضحکہ نہیں ہے

لفظ مکر کے معنے عربی لغت میں خفیہ تدبیر کے ہیں۔

یہ خوب واضح رہنا چاہیئے کہ یہاں قرآن کریم نے یہود کے مقابلہ میں جو لفظ استعمال کیا ہے وہ لفظ مکر ہے جس کے معنے لغت میں خفیہ تدبیر کے ہیں پس اس لفظ کا تقاضہ یہ ہے کہ یہاں کوئی تدبیر ایسی ہونی چاہیئے جس کا دشمنوں کو علم بھی نہ ہو سکے اور نتیجہ کے لحاظ سے وہ اس درجہ ناکام بھی رہیں کہ پھر اُن کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا خیر الماکرین ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے واقعہ میں لفظ مکر کا استعمال بھی ہوا ہے ہر دو مقامات پر تدبیر الٰہی اور اسکا موازنہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بزرگی کا بیں ظہور

اس قسم کا ایک جملہ قرآن کریم میں ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے متعلق بھی ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے و یمکرون و یمکر الله والله خیر الماکرین۔ اِدھر تو وہ خفیہ سازش کر رہے تھے اُدھر خدا خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور خدا

یہاں بھی قریش کی سازش کا ذکر ہے پھر اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے خفیہ تدبیر فرمانے کا تذکرہ ہے اور آخر میں پھر وہی کلمہ دہرایا گیا ہے جو عیسیٰ علیہ السّلام کے مقابلہ میں کہا گیا تھا یعنی واللہ خیر الماکرین۔
عجیب بات ہے کہ ہجرت کے لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے تو یہاں بھی کفار محاصرہ کر چکے تھے اور یہاں بھی آپ حضرت علی رضہ کو اپنی بجائے چھوڑ گئے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام جب آسمانوں پر ہجرت کرنے لگے

تو یہاں بھی دشمن گھیرا ڈال چکے تھے اور یہاں بھی ایک شخص اُن کی بجائے دشمنوں کے ہاتھوں میں موجود تھا قرآن کریم نے دونوں مقامات پر اپنی تدبیر اور کفار کی غلط فہمی کو اسی لفظ مکر سے ادا فرمایا ہے۔ ان دونوں ہجرتوں میں جب خدائی تدبیر کا موازنہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو تدبیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ظاہر ہوئی وہ دشمنوں پر ایک بڑی کاری ضرب تھی۔ ان دونوں مقامات پر خدا تعالے کے یہ دونوں رسول گو دشمنوں کے نرغے میں سے صاف نکل گئے اور کسی کا بال بیکا نہ ہوسکا مگر غور فرمایئے تو آپکو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دشمنوں کے علم میں اسی سرزمین پر صحیح و سالم موجود رہنا اور ہر معرکہ میں اُن کو شکست دیتے رہنا آخر ۸ھ میں اپنے آبائی وطن کو فتح کر لینا جتنا قریش کے لئے سوہان روح ہوسکتا تھا آخر حضرت عیسٰی علیہ السلام کا آسمانوں پر چلے جانا یہود پر شاق نہیں ہوسکتا۔ ادھر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے معاملہ میں ایک مقتول کی لاش بھی موجود تھی مگر اس کے حضرت عیسٰی علیہ السلام ہونے نہ ہونے میں بہت سے شبہات پیدا ہوگئے تھے۔ اس لئے یہ مسئلہ زیر بحث آگیا تھا کہ مقتول وہی حضرت مسیح علیہ السلام ہیں یا کوئی دوسرا شخص۔ مگر یہاں حضرت علیؓ تو سب کے جانے پہچانے شخص تھے۔ یہاں قریش کو پورا یقین ہوگیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی شبہ کے بغیر اُن کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں اور پھر طرفہ یہ کہ اُن سے ذرا فاصلہ پر اُن کا سر کچلنے کے لئے موجود بھی ہیں۔ پھر حضرت عیسٰی علیہ السلام باایں ہمہ رأفت و رحمت جب دوبارہ اپنے وطن لوٹ کر تشریف لائیں گے تو یہاں اُن کے دشمنوں کے حق میں قتل مقدر ہو چکا ہے کہ یہودی ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوٹ کر اپنے وطن مکہ مکرمہ پہونچے تو آپ کے دشمنوں کے حق میں یہ مقدر ہوا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں اور پھر وہی آپکے ساتھ غزوات میں شریک ہو ہو کر آپ پر اپنی جانیں قربان کریں۔ ذرا اس پر بھی غور فرمایئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی فتح و نصرت کے لئے ایک بار آپ کی ہجرت اور ہجرت کے بعد پھر اُسی مقام پر فاتحانہ واپسی مقدر ہوئی تو عیسٰی علیہ السلام کے معاملہ میں بھی اگر پہلے اُن کی ہجرت پھر اپنے وطن اصلی کی طرف واپسی مقدر ہو تو اس میں تعجب کیا ہے۔ یہاں اگر فرق ہے تو صرف دار الہجرت ہی کا تو ہے یعنی وہاں دار الہجرت آسمان مقرر ہوا۔ اور یہاں مدینہ طیبہ مگر اللہ تعالے کی قدرت کے سامنے یہ دونوں مقامات برابر تھے ہاں اگر فرق تھا تو خود روح اللہ اور عبداللہ کی جانب سے تھا۔ روح اللہ اور کلمۃ اللہ کی طبعی کشش آسمانوں کی طرف تھی آخر جو نفخۂ جبرئیلی سے ظاہر ہوئے وہ جاتے تو اور کہاں جاتے۔ عبداللہ کی طبعی کشش زمین کی جانب تھی اس لئے اگر وہ کسی خطۂ ارض کی طرف نہ جاتے تو اور کہاں جاتے بے شک خدا تعالے قادر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آسمانوں پر اٹھا لیتا لیکن کیا یہ اس آخری رسول کی شان کے مناسب ہوتا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام اگر آسمانوں پر تشریف لے گئے تو اُن کے بعد دوسرا رسول اعظم دنیا کو نصیب ہوگیا لیکن اگر آپ تشریف لیجاتے

تو اُمت کا نگہبان کون ہوتا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر دوبارہ تشریف لائیں گے تو ان کو اس اُمت میں شامل ہونے کا دوسرا وہ شرف حاصل ہوگا جس کی اولوالعزم انبیاء علیہم السلام تمنائیں رکھتے تھے۔ لیکن اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ تشریف لاتے تو آپ کو کونسا دوسرا شرف حاصل ہوتا پھر روح اللہ اگر آسمانوں پر گئے تو دشمنوں سے حفاظت کے لئے بلائے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب آسمانوں پر بلائے گئے تو صرف تشریف و تکریم کے لئے بلائے گئے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر گئے تو چوتھے آسمان تک گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو ساتوں آسمان طے کرکے وہاں تک پہونچ گئے جہاں جاتے جبرئیل علیہ السلام کے بھی پر جلتے تھے۔ ان دونوں ہجرتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مقام پر امام رازی کے قلم سے کیا اچھا جملہ نکل گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں جو شرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو میسر ہوا وہ عروج تھا اور جس شرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نوازے گئے اس کا نام معراج ہے۔ میں کہتا ہوں جی ہاں وہ روح اللہ تھے اور یہ عبداللہ ہیں۔

اللھم صل وسلم وبارک علی عبدک ورسولک سیدنا محمد صاحب المعراج والبراق والقلم وعلی اٰلہ واصحابہ تسلیماً کثیراً کثیراً۔

گو ان دونوں ہجرتوں میں اللہ تعالیٰ کی شان خیر الماکرین دونوں جگہ عیاں تھی اور دونوں مقامات میں اس کا جو ظہور ہوا وہ کامل ہی تھا مگر کیا جو تدبیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے جلوہ گر ہوئی وہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مناسب تھی۔

ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ اگر ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مصلوب ہونا اور آخر کار کشمیر وغیرہ میں جا کر کہیں اپنی طبعی موت سے مرجانا تسلیم کرلیں تو اس کے لئے نہ تو قرآنی الفاظ میں کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی دنیا کی تاریخ اس کی شہادت دے سکتی ہے اور نہ اس میں خدائی تدبیر کا کچھ ظہور ہوتا ہے اور نہ اس تقدیر پر یہود کے دعوی کی کوئی معقول تردید ہوسکتی ہے کیونکہ جب سولی کے ساتھ جملہ موت کے مقدمات تسلیم کر لئے جائیں اور گفتگو صرف اتنی رہ جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تم نے مارا یا کہیں گمنام مقام میں لیجا کر خود ہم نے مارا تو اب یہ گفتگو ایک عبث گفتگو ہے۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ جو بات دشمن چاہتے تھے وہ خدا تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے خود پوری فرمادی۔ والعیاذ باللہ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب و رفع کی تحقیق قرآنی روشنی میں

اسی طرح صلیب کے تسلیم کرلینے کے بعد یہاں نصاریٰ کی بھی کوئی تردید نہیں نکلتی کیونکہ جب اصولی طور پر عیسیٰ علیہ السلام کا سولی چڑھنا تسلیم کرلیا جائے اور رفع جسمانی کا قرآن کریم خود اعلان فرمادے تو اب اُن کے ساتھ بھی جو اختلاف رہے گا وہ صرف نظریات ہی کا رہے گا اور صلیب پرستی کی یہ ایک بنیاد قائم ہوجائے گی اس لئے ضروری ہے کہ آیت کے اصل مفہوم پر غور کیا جائے

اور جو مطلب کسی تاویل کے بغیر اس سے ظاہر ہوتا ہو اس کا اعتقاد رکھا جائے۔ پہلے ایک بار پُوری آیت پڑھ لیجئے

و قولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم وان الذين اختلفوا فيه لفي شك منه ما لهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه يقينا بل رفعه الله اليه وكان الله عزيزاً حكيما۔	اور ہم نے ان کو سزا میں مبتلا کیا، اُن کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا ہے حالانکہ نہ انھوں نے قتل کیا اور نہ ہی ان کو سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا اور جو لوگ ان کے بارہ میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں اُن کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں۔ بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور اُنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اُن کو اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور اللہ تعالےٰ زبردست حکمت والے ہیں۔

آیت بالا کے مطالعہ کے بعد جو بات پہلی بار سمجھ میں آجاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے مدعی تھے اور اس بارے میں وہ اپنے پُورے جزم و یقین کا اظہار کرتے تھے لیکن نصاریٰ چونکہ باہم خود مختلف تھے اس لئے مختلف باتیں کہتے تھے ان ہر دو فریق کے مقابلہ میں قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ دونوں کے دونوں غلطی پر ہیں یہود کا دعویٰ قتل تو سرتاسر غلط ہے اس لئے اس کو دوبارہ رد کیا گیا ہے تاکہ جتنا زور اُنھوں نے اپنے قتل کرنے پر صرف کیا تھا اتنا ہی اس کے انکار پر صرف کیا جائے رہ گئے نصاریٰ تو وہ قدرے مشترک طور پر اُن کے مصلوب ہونے کے آجتک قائل ہیں اس لئے ضروری تھا کہ گو وہ کسی بات کے مدعی نہ ہوں مگر اُن کے اس غلط خیال کی تردید بھی کردی جائے اس لئے یہود کے دعویٰ قتل کے ساتھ ساتھ صلیب کی بھی نفی کر دی گئی اور اُس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا گیا کہ اُن کو خود کچھ علم نہیں ہے وہ صرف اٹکل کے تیر چلاتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو قوم اپنے یقین کا دعویٰ رکھتی ہو صرف اُس کی تردید کر دینا اس کے لئے کچھ تشفی بخش نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کی غلط فہمی کے اسباب بھی بیان نہ کر دیئے جائیں۔ اس کو ولکن شبه لهم سے بیان کیا گیا ہے یعنی یہاں قدرت کی طرف سے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے تھے جس کی رو سے حقیقت حال اُن پر مشتبہ ہو گئی تھی۔ ایک طرف چونکہ سبت کا دن آرہا تھا اس لئے اس ارادہ بد کی تکمیل میں اُن کو خود عجلت تھی دوسری طرف اس قسم کے ہنگاموں میں جو ایک طبعی دہشت ہوا کرتی ہے وہ بھی اُن پر سوار تھی اس لئے اپنی دانست میں گو اُنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کے قتل کا قصد کیا تھا مگر ان مشتبہ کن حالات کی وجہ سے وہ اس ارادہ بد میں ناکام رہے اور اُن کی توجہ اس طرف قائم نہ رہ سکی کہ وہ کس کو قتل کر رہے ہیں اور اُس کی کھلی شہادت یہود و نصاریٰ کا باہم اختلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حالات ضرور کچھ ایسی پیچیدہ بن گئی تھی کہ حس و مشاہدہ کا یہ صاف واقعہ بھی مبہم ہو کر رہ گیا تھا اور پیچیدگی کی وجہ سے قرآن کریم نے واقعہ کے انکشاف کی طرف توجہ فرمائی ہے ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل

دوسرے انبیاء علیہم السّلام کے متعلق بھی یہود اسی جرم کے ارتکاب کا دعویٰ کرتے تھے لیکن چونکہ دیگر انبیاء علیہم السّلام کے معاملہ میں وہ اپنے دعوے میں صادق تھے اس لئے قرآن کریم نے نہ اُن کی کوئی تردید کی ہے اور نہ اُن کے معاملہ میں کسی شبہ واشتباہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے زیادہ تفصیلات میں پڑنا قرآن کریم نے پسند نہیں فرمایا۔ اور نہ یہ احکم الحاکمین کی شان کے مناسب تھا اور غالباً لفظ مکر اللہ کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ خفیہ تدبیر کو کچھ خفیہ ہی رہنے دیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر درحقیقت مقتول کی لاش اُن کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نہ تھے بلکہ کوئی دوسرا اُن کا شبیہ شخص تھا جو عجلت میں غلطی سے قتل کردیا گیا تھا۔ تو یہ بتانا چاہئے کہ پھر عیسیٰ علیہ السّلام جو یقیناً اُن کی زیر حراست آچکے تھے آخر وہ کدھر نکل گئے اگر اُن کا کوئی سُراغ نہیں ملتا تو ماننا پڑتا ہے کہ پھر مقتول کی جو لاش موجود تھی وہ عیسیٰ علیہ السّلام ہی تھے اس لئے قرآن کریم نے اپنے فیصلہ میں قتل کی نفی کے بعد یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کو اٹھا لیا تھا اس لئے زمین پر اُن کی تلاش کرنا عبث ہے لیکن ایک ضعیف انسان چونکہ نہ اس قدرت کا تصور کرسکتا ہے اور نہ اس عظیم حکمت کو پا سکتا ہے اس لئے یہاں خاص طور پر اپنی ایسی دو صفتوں کا تذکرہ فرما کر بحث کو ختم کردیا ہے جن کے اقرار کے بعد کوئی استبعاد باقی نہیں رہتا یعنی۔ وکان اللہ عزیزاً حکیماً۔

یعنی اللہ کی ذات بڑی توانا اور بڑی حکمت والی ہے اس کے سامنے یہ سب باتیں آسان ہیں۔ اس واضح فیصلہ سے جس طرح یہود کی کھلی ہوئی تردید ہوگئی اسی طرح نصاریٰ کے مذہب کی تمام بنیاد بھی منہدم ہوجاتی ہے کیونکہ جب صلیب کا سارا افسانہ ہی بے سروپا ثابت ہوا تو اب کفارہ کا اصولی عقیدہ بھی خود بخود باطل ہوگیا۔ اب اگر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا مسئلہ اسی حد پر ختم ہوچکا تھا اور مستقبل زمانہ کے ساتھ اُس کا کچھ تعلق باقی نہ رہا تھا تو آئندہ آیت میں اس کی دوسری تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی لیکن چونکہ یہاں ایک اور مشکل تر سوال سامنے آگیا تھا اور وہ یہ کہ اگر وہ آسمانوں پر اٹھائے گئے ہیں تو پھر کیا وہ آسمانوں ہی پر وفات پائیں گے اس لئے اس کی بھی وضاحت کردی گئی اور پوری قوت کے ساتھ اس کا اعلان کردیا گیا کہ ابھی ان کو طبعی موت نہیں آئی بلکہ موت سے قبل اہل کتاب کو اُن پر ایمان لانا مقدر ہوچکا ہے اس لئے یقیناً وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور اب خدا تعالےٰ کی وہ خفیہ تدبیر بھی عالم آشکارا ہوجائے گی اور یہ ثابت ہوجائے گا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السّلام جب اپنے جسم کے ساتھ تشریف لائے ہیں تو یقیناً جسم کے ساتھ ہی اُٹھائے گئے تھے۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۔	اور کوئی اہل کتاب نہیں ہوگا مگر ان کی موت سے پہلے ایمان لے آئیگا اور قیامت کے دن وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ہونگے ان پر گواہ۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو ہریرۃ رضؓ جب حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول کی حدیث بیان فرماتے تو یہ بھی فرماتے کہ یہ پیشگوئی صرف حدیثی نہیں قرآنی ہے اور بھی آیات بالا پڑھ کر سنا دیتے۔ اب یہ مسئلہ بالکل سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حدیثوں میں نزول عیسیٰ علیہ السّلام کے بار بار بیان فرمانے کی اہمیت کیوں محسوس کی گئی ہے یہ ظاہر ہے کہ رفع جسمانی چونکہ عام انسانوں کی سنت نہیں تھا اس لئے اس کی تفہیم کے لئے اس حقیقت کے ذہن نشین کرنے کی بڑی اہمیت تھی کہ عیسیٰ علیہ السّلام کی ابھی وفات نہیں ہوئی اور ابھی اُن کو آسمان سے اُترنا ہے اور بہت سی خدمات مفوضہ ادا کرنی ہیں اہل کتاب کو اُن پر ایمان لانا ہے اور دجّال جیسے ایمان کے غارت گر کو قتل کرنا ہے اور بالآخر خدا تعالیٰ کی زمین کو شر و فساد سے پاک کر کے عام انسانوں کی سنت کے مطابق وفات پانا ہے اور خاتم الانبیاءؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہونا ہے یہ ہے قرآنی بیان اور قرآنی بے لاگ فیصلہ۔ اب یہاں ان کی موت کا دعویٰ کرنا ٹھیک ٹھیک یہودیوں کی اتباع ہے اور اُن کو مصلوب مان لینا یہ نصاریٰ کی کھلی موافقت ہے۔ کیونکہ اگر ہم عیسیٰ علیہ السّلام کا مصلوب ہونا تسلیم کر لیتے ہیں اور پھر کسی غیر معلوم مقام پر جا کر اُن کی موت مان لیتے ہیں تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ یہود و نصاریٰ کی وہ غلط باتیں جن کی قرآن کریم نے پوری تردید فرمائی تھی ہم نے دونوں کو مان لیا ہے اور اس کے بعد اُن کے ساتھ ہمارا اختلاف صرف نظریات کا اختلاف رہ جاتا ہے یہود کے ساتھ تو اس لئے کہ اُن کی موت کے وہ بھی قائل تھے فرق صرف یہ رہے گا کہ یہ موت لعنتی تھی یا عزت کی اور نصاریٰ کے ساتھ اس لئے کہ جب وہ سولی دیدیئے گئے تو اب اس کی حقیقت اُمت کی تطہیر اور کفارہ تھی یا کچھ اور۔ ظاہر ہے کہ ان امور کے اصولاً تسلیم کر لینے کے بعد یہ نظریاتی اختلافات بالکل بے نتیجہ ہیں۔ ہماری مذکورہ بالا تفسیر کی بنا پر دونوں قوموں کے عقائد کی بیخ و بنیاد ہی اکھڑ جاتی ہے اور قرآن کریم پر اپنی جانب سے کسی حاشیہ آرائی کی کوئی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تشریف لانے کے بعد ہی اہل اسلام کے نزدیک بھی وفات پائیں گے۔ زیر اختلاف اُن کی گذشتہ موت ہے

حضرت عیسےٰ علیہ السّلام کے معاملہ میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ اہل اسلام جہاں اُن کے رفع کے قائل ہیں اسی کے ساتھ نزول کے بعد اُن کی موت کے بھی قائل ہیں اس بارے میں ہمارے علم میں ایک متنفس کا اختلاف بھی نہیں یوں تو اُن کی ولادت بلکہ اُن کی زندگی کا ہر ہر گوشہ ان کی تردید الوہیت پر برہان قاطع ہے لیکن صرف ان کی موت کا عقیدہ مستقل اس کی ایک ایسی واضح دلیل ہے جس کے بعد اُن کی الوہیت کی تردید کے لئے کسی اور دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ لہٰذا اُن کی ولادت اور موت تسلیم کرنے کے بعد اگر ایک ہزار بار بھی ان کے رفع الی السّماء کا اقرار کر لیا جائے تو اس میں عیسائیوں کے مسئلہ الوہیت کی کوئی تائید نہیں ہوتی، اس لئے اگر بالفرض یہاں ابن عباسؓ یا کسی اور شخص سے اُن کی موت منقول ہوتی ہے تو اس کو اجماع اُمت کے خلاف سمجھنا بہت بڑی

غلطی ہے۔

حضرت ابن عباس رضہ کی تفسیر کی تحقیق

پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ابن عباس رضہ سے انی متوفیک کی تفسیر انی ممیتک مروی ہے تو زیادہ سے زیادہ اس سے یہی ثابت ہوگا کہ عیسٰی علیہ السّلام کو بھی موت آنی ہے مگر اس کا انکار کس کو ہے۔ زیر بحث تو یہ ہے کہ وہ موت اُن کو آچکی اور کیا وہ فی الحال مردوں میں شامل ہیں۔ اور اب دوبارہ نہیں آئیں گے دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ نہ یہ حضرت ابن عباس رضہ سے منقول ہے اور نہ امت مسلمہ میں کسی اور معتمد عالم سے بلکہ ابن عباس رضہ سے باسناد قوی یہ ثابت ہے کہ عیسٰی علیہ السّلام اٹھائے گئے اور نزول کے بعد پھر وفات پائیں گے اور ٹھیک یہی تمام اُمت کا عقیدہ ہے۔

امام بخاری کی کتاب التفسیر میں حل لغات کا حصہ خود اُن کا تصنیف کردہ نہیں بلکہ امام ابوعبید کا ترتیب دادہ ہے

یہاں بے علموں کو ایک مغالطہ یہ بھی لگ گیا ہے کہ ابن عباس رضہ کی مذکورہ بالا تفسیر چونکہ امام بخاری کی کتاب میں موجود ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ امام بخاری کا مختار بھی یہی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جب امام بخاری ہی کی کتاب میں عیسٰی علیہ السّلام کے نزول کی حدیث بھی موجود ہے تو پھر کس دلیل سے یہ سمجھ لیا گیا کہ اس موت سے گذشتہ موت مراد ہے بلکہ جب خود حضرت ابن عباس رضہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ یہ موت نزول کے بعد والی موت ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک بھی اس موت سے وہی مراد ہے اور اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ اُن ہی کی کتاب میں عیسٰی علیہ السّلام کے نزول کا اقرار بھی موجود ہے۔

پھر ان مسکینوں کو اتنا علم بھی نہیں کہ امام بخاری نے کتاب التفسیر میں جو لغات اور تراکیب نحویہ نقل فرمائی ہیں یہ خود اُن کی جانب سے نہیں ہیں بلکہ اُن کی جانب سے صرف وہی حصہ ہے جو انھوں نے اپنی اسناد کے ساتھ روایت فرمایا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام بخاری کے پاس ابو عبید کی کتاب التفسیر موجود تھی۔ امام موصوف نے اس پوری کتاب التفسیر کو کسی تنقید وانتخاب کے بغیر بجنسہ اُٹھا کر اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے۔ لہٰذا جتنے اقوال مرجوحہ اصل کتاب میں موجود تھے وہ بھی سب کے سب یہاں نقل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا بالکل بے اصل ہے کہ امام بخاری نے خاص طور پر ابن عباس رضہ کی اس تفسیر کو اختیار فرمایا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابو عبید کی کتاب التفسیر میں چونکہ ابن عباس کا یہ قول مروی تھا اور جب امام بخاری نے اُن کی پوری کتاب التفسیر ہی کو اپنی کتاب میں کسی انتخاب کے بغیر نقل کر دیا تھا تو یہ جزء بھی چونکہ ابو عبید کی کتاب میں موجود تھا اس لئے وہ بھی یہاں نقل ہوگیا ہے۔ اہل علم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کتاب التفسیر میں بہت سے مقامات پر حل لغات میں تسامح بھی ہوا ہے اقوال مرجوحہ بھی نقل ہو گئے ہیں اور اُن کی ترتیب میں بھی اچھا خاصہ اختلال واقع ہوگیا ہے۔ لیکن امام بخاری خود ان جملہ نقائص سے بَری ہیں اس کی ذمہ داری اگر عائد ہوتی ہے تو ابو عبید پر عائد ہوتی ہے۔ امام بخاری کی

کتاب کی علو صحت کے متعلق جو دعویٰ ہے وہ ان احادیث مرفوع کے متعلق ہے جو اس میں اسناد کے ساتھ امام نے از خود روایت فرمائی ہیں نہ کہ ان اقوال کے متعلق جو اسناد کے بغیر کسی جانب سے کتاب میں نقل ہوئے ہیں۔ لہذا اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ ان کے نزدیک مذکورہ بالا تفسیر میں حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی موت سے وہ موت مراد ہے جو آخر زمانہ میں تشریف لانے کے بعد ہوگی اور اس موت میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے اسی طرح ابن حزم کی طرف بھی موت کی نسبت کی گئی ہے اگرچہ کسی شاذ فرد کے اختلاف سے جمہور اُمت کی رائے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے وہ بھی ابن حزم جیسے شخص کے اختلاف سے جس کے تفردات اُمت میں ضرب المثل ہیں لیکن وہ بھی متعدد مقامات پر اس کی تصریح کر چکے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام آخری دور میں تشریف لائیں گے لہذا زیر اختلاف مسئلہ پر ان شاذ نقول کا بھی کوئی اثر نہیں۔ چنانچہ ابن حزم نے اپنی کتاب المحلی ص۳۹۱ میں عیسٰی علیہ السّلام کے نزول کو اُمت کا عقیدہ شمار کیا ہے دیکھو ص۲۴۹ کتاب الفصل میں بھی اس کی تصریح کی ہے اس کے علاوہ اور متعدد مقامات میں بھی اسی عقیدہ کو اُمت کا عقیدہ لکھا ہے۔

وقد صح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنقل الکواف التی نقلت نبوتہ واعلامہ وکتابہ انہ اخبرہ انہ لا نبی بعدہ الا ما جاءت الاخبار الصحاح من نزول عیسٰی علیہ السّلام الذی بعث الی بنی اسرائیل وادعی الیھود قتلہ وصلبہ فوجب الاقرار بھذہ الجملۃ وصح ان وجود النبوۃ بعدہ علیہ السّلام لا یکون البتہ ص۱ الفصل وص۲۳ وص۵ وص۳ وص۳ کتاب مذکور

جس جمہور اُمت نے آپکی نبوت اور اس کی علامات اور قرآن شریف کو نقل کیا ہے اسی اُمت نے صحیح طریقوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ نے یہ خبر دی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا سوائے ایک عیسٰی علیہ السّلام کے کہ اُن کے نزول کی خبر صحیح حدیثوں سے ثابت ہے یہ وہی ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور جن کے قتل وصلب کا یہود نے دعویٰ کیا تھا۔ لہذا ان باتوں کا اقرار کرنا ہم پر لازم ہے۔ اور یہ بطریق صحیح ثابت ہے کہ نبوۃ کا وجود آپ کے بعد ہرگز نہیں ہوگا۔

قرآن کریم میں مشرکانہ عقائد کی تردید کا جتنا اہتمام کیا گیا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ نصاریٰ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے لیکن جب اس نسبت کی نامعقولیت ان کے سامنے ظاہر کی جاتی ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ولدیت از ابنیت سے اُن کی مراد حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ اتحاد کی وہ خاص نسبت ہے جو ما بین خالق اور عیسٰی علیہ السّلام موجود ہے اور اسی کو مجازاً اس لفظ سے ادا کیا گیا ہے لیکن اس لفظ کے استعمال سے چونکہ عیسائیت کی لفظی تائید ہوتی تھی اس لئے قرآن کریم نے یہاں

مجاز و استعارہ کی بھی اجازت نہیں دی بلکہ اس عنوان ہی کو خواہ وہ کسی معنے سے ہو اپنے سخت غیظ و غضب کا باعث قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۔

ابھی اس افتراء سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین ٹکڑے ہو جائے اور پہاڑ ڈھے کر گر پڑیں اس پر کہ پکارتے ہیں رحمان کے نام پر اولاد۔

پس اگر قرآن کریم لفظ ابن اور ولد کا مجازی استعمال بھی حرام قرار دیتا ہے کیونکہ اس میں عیسائیت کی تقویت اور اس کی ترویج ہوتی ہے تو اگر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے رفع یعنی آسمان پر اٹھائے جانے کا عقیدہ بھی صرف عیسائیوں کا عقیدہ تھا اور اس میں مشرکانہ عقیدہ کی ذرا بھی غلط تائید ہوتی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ٹھیک اسی لفظ کو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے معاملہ میں خود استعمال فرماتا جو عیسائی استعمال کرتے تھے۔ یہ کیسی عجیب در عجیب منطق ہے کہ یہود نے جب انا قتلنا کہا تو اُن کی تردید میں تو قرآن کریم نے دو بار "وَمَا قَتَلُوْهُ" فرمایا مگر جب عیسائیوں نے "رُفِعَ" کہا تو قرآن کریم نے ایک بار بھی "وَمَا رُفِعَ" نہیں فرمایا بلکہ "رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" میں لفظ "اِلَيْهِ" کا اور اضافہ فرما کر رفع کے عقیدہ کو اور مضبوط بنا دیا۔ کیا اس سے یہی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السّلام کے رفع الی السماء کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ بالکل درست تھا البتہ اُن کے مصلوب ہونے کا خیال چونکہ بالکل بے اصل تھا اس لئے جس طرح کہ یہود کی تردید میں وما قتلوہ فرمایا گیا تھا اسی طرح عیسائیوں کی تردید میں "وما صلبوہ" کا لفظ فرما دیا گیا اور اس طرح اہل کتاب کی ہر دو جماعتوں کی تردید علیحدہ علیحدہ دو لفظوں سے صراحۃً کر دی گئی اور اسی کے ساتھ عیسائیوں کے بنیادی عقیدہ کا بُطلان بھی واضح ہو گیا کیونکہ اُن کے مذہب میں کفارہ کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور کفارہ کا عقیدہ تمام تر صلیب پر مبنی ہے لہذا جب قرآن کریم نے صراحۃً "وما صلبوہ" فرما کر صلیب کی صاف تردید فرما دی تو پھر اس پر جتنی بے اصل تعمیر قائم کی گئی وہ خود بخود سب منہدم ہو گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی خدمات میں صلیب شکنی کا نکتہ

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صلیب چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام ہی کے نام سے پوجی گئی تھی اس لئے ضروری ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام ہی دوبارہ تشریف لا کر خود اُس کے توڑنے کا حکم دیں تاکہ جن کے نام پر یہ شرک ایجاد ہوا تھا اُن ہی کے حکم سے اس کا استیصال بھی ہو جیسا کہ عرب نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے سر بت پرستی کی جھوٹی تہمت لگائی تو خود آپ کے سب سے عظیم اور جلیل القدر فرزند یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر اس کی تردید فرمائی اور فتح مکہ میں اپنے دست مبارک سے ان تمام بتوں کی تصاویر محو کر دیں جو ملت ابراہیمی کے نام پر خانہ کعبہ کے اندر بنائی گئی تھیں یہ خیال کتنا

احمقانہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اگر صلیب توڑدیں گے تو عیسائی اور بہت سی صلیبیں بنالیں گے۔ اگر یہی اعتراض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بُت شکنی پر کیا جائے تو کیا یہ قابل مضحکہ نہ ہوگا اصل بات یہ ہے کہ فاتح کی بُت شکنی اور صلیب شکنی کا اندازہ غلامانہ ذہنیت کا محکوم ہوکر ہو ہی نہیں سکتا جو صلیب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک سے توڑی جائے گی وہ پھر کبھی بنائی نہیں جاسکتی جیسا کہ جو بُت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے توڑے گئے وہ جزیرہ عرب میں آج تیرہ سو سال کے بعد بھی دوبارہ معبود نہیں بن سکے۔

قرآن کریم کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے سیاق تردید میں صرف دشمنوں کے خوف سے کسی حقیقت پر بھی پانی پھیردے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اگر "رفع" کے لفظ سے ان کی الوہیت کے بارے میں کوئی بے سبب اشتباہ پیدا ہوسکتا تھا تو اس سے کئی درجہ زیادہ اشتباہ لفظ "روح اللہ" اور "کلمۃ اللہ" سے پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ آج تک عیسائی ان ہی الفاظ کو لے کر اہل اسلام کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں اسی طرح اُن کے معجزات کا حال بھی ہے مگر کیا ایک ایسے بشر پر جس میں جملہ بشری خواص کھلے ہوئے نظر آرہے ہوں بے دلیل الوہیت کی تہمت رکھ دینے والوں کی قرآن کریم نے کوئی رعایت کی ہے کیا اُس نے "روح اللہ" اور کلمۃ اللہ کا لقب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود ہی نہیں دیا کیا بے عقلوں کے خوف سے ان سے احیاء موتی کا معجزہ عطا کرنے میں کوئی پس و پیش کیا گیا ہے اگر نامعقول جماعت نے دلائل بشریۃ ہی کو برعکس دلائل ربوبیت بناڈالا ہو تو اس میں سرتا سرجرم اُن ہی کا ہے۔ لہٰذا یہاں قرآن کریم پر یہ زور ڈالنا کہ اس نے "رفعہ اللہ الیہ" کا لفظ کیوں استعمال فرمایا ہے ایسا ہی ہے جیسا یہ کہنا کہ اُس نے کلمۃ اللہ اور روح اللہ کا لفظ کیوں استعمال فرمایا۔

(حاشیہ: قرآن کریم کی شان اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے کہ وہ دشمنان اسلام کے خوف سے حقائق کے بیان کرنے میں ادنیٰ پس و پیش بھی اختیار کرے)

خوب یاد رکھو اگر ہم اپنی مزعوم خیرخواہی میں قرآن کریم کے صریح الفاظ کی تاویل کریں گے تو اُس کا نتیجہ صرف قرآن کریم کے الفاظ کی تحریف نہیں ہوگا بلکہ بہت سے حقائق کا انکار بھی ہوگا اگر رب العزۃ کے ان کے بن باپ پیدا فرمانے میں نامعقولوں کی رعایت کا حق کسی کو نہیں ہے تو اس سے اُن کے زندہ آسمانوں پر اُٹھانے میں نامعقولوں کی رعایت کے مطالبہ کا حق کس کو ہے قدرت و حکمت والا ہمیشہ اپنی قدرت و حکمت کے مظاہر کرتا رہیگا من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

یہ بات قاعدہ کلیہ کی طرح یاد رکھنی چاہیئے کہ دین کا کوئی مسئلہ جب اپنے دلائل کے ساتھ روشنی میں آجائے تو اُس پر بے تامل جزم و یقین کرلینا چاہیئے اب اگر اس میں کچھ شبہات اور اعتراضات دل میں گذرتے ہوں تو عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ ان شبہات ہی کا جواب تلاش کرنا چاہیئے اور اُن کو حل کرلینا چاہیئے نہ یہ کہ اُس ثابت شدہ

(حاشیہ: شبہات اور وساوس کا اثر عقائد کی تخریب ہے کسی صحیح حقیقت کی تعبیر نہیں پس صرف شبہات سے عقائد کی ترمیم کرنا غلط ہے خود ان کا جواب دینا چاہیئے)

حقیقت ہی کا انکار کر دیا جائے کیونکہ شبہات زیادہ سے زیادہ دلائل کی روشنی مدہم تو کر سکتے ہیں مگر کوئی دوسری روشنی پیدا نہیں کر سکتے اس لئے جب کبھی آپ اپنا رُخ خود اُن شبہات ہی کی طرف پھیر دیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ اور تاریکی در تاریکی میں جا گرے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شبہ کی بنیاد پر ختم نبوۃ کا اجماعی عقیدہ بدل دیا جاتے تو آپکو معلوم ہوگا کہ جتنے اشکالات اس عقیدہ میں پیدا ہو سکتے تھے اس سے کہیں بڑھ کر شبہات دوسری صورت میں پیدا ہونے لگے درحقیقت یہ شیطان کا ایک بڑا علمی فریب ہے کہ جب وہ کسی گمراہی کی دعوت دیتا ہے تو پہلے ایک حق بات میں شبہات ڈالنا شروع کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ ان شبہات کو بڑھا کر اُن کو ایک حقیقت کی صورت پہنا دیتا ہے پھر اس کے دلائل کی تلاش لگاتا ہے اور اس تمام تدریجی سلسلہ میں ایک بار بھی انسان کا ذہن اصل عقیدہ کے دلائل کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا حتیٰ کہ وہ عقیدہ جو پہلے ان شبہات کے وجود سے مجروح ہو چکا تھا اب ان وہمی دلائل سے باطل نظر آنے لگتا ہے اور ان دلائل پر دماغ میں کسی ادنیٰ شبہ کا گذر ہونے نہیں دیتا اس کے بعد پھر انسان کو ایسا دلیر بنا دیتا ہے کہ اس کے نوساختہ عقیدہ کے خلاف انسان واضح سے واضح دلائل کی تاویل بلکہ تحریف میں ذرا نہیں شرماتا اور اس طرح وہ انسان کو دین سے منحرف کر دیتا ہے اور اس کے ایمان بالغیب کی ساری دنیا برباد کر ڈالتا ہے۔ اسی کی مثال حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول کا مسئلہ ہے یہاں بھی صرف شبہات پیدا کر کے پہلے وہ اس یقین کو متزلزل کرنے کی سعی کرتا ہے اور جب اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر انسان کو بیسیوں حدیثوں کی تاویل بلکہ انکار پر آمادہ کر دیتا ہے۔ مثلاً یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ دجال کو قتل کرنے کے لئے خاص حضرت عیسیٰ علیہ السّلام ہی کے تشریف لانے کی ضرورت کیا پڑی ہے پھر اتنے دن ان کا زندہ رہنا کیوں تسلیم کیا جائے اور اس کے لئے جتنے مقدمات ہو سکتے ہیں ان کو خوب مبرہن کرتا چلا جاتا ہے لیکن ایک مومن ان شبہات کی بنا پر قرآن و حدیث کی تاویل کرنے کی بجائے خود ان شبہات ہی کے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور صرف وساوس واوہام سے اپنے قیمتی ایمان کو زخمی نہیں کرتا۔ اگر یہاں کتب سابقہ اور اہل کتاب کی تاریخ پر ذرا نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ کتب سابقہ میں دو مسیح کے آمد کی پیشگوئی کی گئی تھی ایک۔ مسیح ہدایت اور دوسرا مسیح ضلالت چونکہ یہود نے مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت کا مصداق قرار دیدیا تھا اور مسیح ضلالت کو اس کے برعکس مسیح ہدایت ٹھہرا یا گیا اس لئے کیا یہ مناسب نہ تھا کہ مسیح ضلالت کے ظہور کے وقت خود مسیح ہدایت ہی تشریف لا کر اس کے مقابلہ پر یہ ثابت کر دیں کہ مسیح ہدایت کون ہے اور مسیح ضلالت کون تاکہ ایک طرف جو پہلے مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت ٹہرانے والے تھے وہ جھوٹے ثابت ہوں اور دوسری طرف مسیح ضلالت کی اتباع کرنے والے بھی نامراد ہو جائیں اور اس طرح جو مغالطے پہلے لگ چکے تھے اب وہ خود ان ہی زبان سے دور ہو جائیں صلیب ان کے نام سے پوجی گئی تھی وہی آکر اس کو توڑیں اور سور بھی اُن ہی کے نام سے حلال کیا گیا تھا اب وہی آکر اس کے

قتل کا حکم دیں اور اس طرح قرب قیامت میں یہود و نصاریٰ پر خدا کی حجت پوری ہو اور اتحاد عمل کے سلسلہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی تھیں وہ ایک ایک کرکے سب اٹھ جائیں اور آخر میں پھر دین اسی طرح ایک ہی باقی رہ جائے جیسا کہ آغاز عالم میں ایک ہی دین تھا۔ وتمت کلمۃ ربك صدقا وعدلا۔

نیز چونکہ دجال آخر میں مدعی الوہیت ہوگا اور احیاء موتیٰ کا مدعی ہوگا اس لئے گیا یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے قتل کے لئے ایک ایسا ہی رسول آتا جس پر دعوئ الوہیت کی تہمت لگائی گئی ہو تاکہ ایک طرف تو قتل ہوکر جھوٹے مدعی الوہیت کا جھوٹ ثابت ہو جائے دوسری طرف اس قوم کا جھوٹ بھی ثابت ہو جائے جنھوں نے خدا کے مقدس رسول پر دعوی الوہیت کی بے بنیاد تہمت لگائی تھی اور روز روشن کی طرح یہ واضح ہو جائے کہ جو مدعی الوہیت کا قاتل ہو وہ خود مدعی الوہیت کیسے ہو سکتا ہے۔

ان امور کے علاوہ جب یہود کے دعوے کو دیکھا جاتا ہے تو وہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کے بھی قتل کا دعوے رکھتے تھے مگر قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ قتل نہیں ہوئے بلکہ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور اس میں خدا تعالیٰ توانا و حکیم کی بڑی حکمت مضمر تھی کیا اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کچھ اور تھا کہ جس کو مقتول ٹھہرایا گیا تھا وہی آکر پہلے خود ان کے سرغنہ کو قتل کرے یعنی دجال کو پھر ان کے قتل کا حکم دے۔ اور گویا اس طرح خود ایک نبی پہلے اپنی قوم انبیاء علیہم السلام کے قاتلین سے ان کا قصاص لے اور دوسری طرف اپنے متعلق دعویٰ قتل کا مزہ بھی چکھا دے۔

پھر جب ختم نبوت پر زیادہ گہرائی سے نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ ضرورت کے وقت امت میں کسی نبی کی پیدائش کی بجائے کوئی گذشتہ نبی آئے کیونکہ دجال اکبر کی آمد کی پیشگوئی نوح علیہ السلام سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کرتے چلے آئے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ اتنی بڑی گمراہی دنیا کی پیدائش سے لے کر آج تک کبھی ظاہر نہیں ہوئی اس لئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ دجال ایک مرکزی طاقت ہے اور ایک مرکزی طاقت کے مقابلہ کے لئے ضرور کوئی مرکزی طاقت ہی آنی مناسب ہے۔ اب اگر اس کے مقابلہ میں کسی امتی کو کھڑا کر دیا جاتا تو وہ اس کا صحیح مقابل ہی نہیں ہو سکتا تھا دنیا میں بھی کشتی میں پہلوانوں کا جوڑ دیکھا جاتا ہے اور اسی طرح حکومتوں کے مقابلہ کے وقت بھی ان کی طاقتوں کا توازن ضروری ہوتا ہے جس کو آجکل (Ballance of Power) کہا جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ابن صیاد کے متعلق جب حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ حکم دیجئے تو میں اس کی گردن اڑا دوں تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا "ان یکن ھو فلن تسلط علیہ" اگر یہی دجال اکبر ہے تو تم اس کے قتل پر مسلط نہیں ہو سکتے پس جب امت میں حضرت عمرؓ جیسا بھی اس کو قتل نہ کر سکے تو اب دوسرا کون اس کا قاتل ہو سکتا ہے اس لئے ضروری ٹھہرا کہ اس کا قاتل کوئی نبی ہو پس جب نبی کی ضرورت کے وقت بھی اس امت میں سے کسی کو نبی نہیں بنایا گیا بلکہ ان ہی گذشتہ انبیاء علیہم السلام ہی میں سے ایک نبی کو لاکر کھڑا کیا گیا تو فرمایئے کہ ختم نبوت کا

مسئلہ اب کتنا واضح ہوگیا گویا آج تک ختم نبوت کا ثبوت صرف علمی تھا اور اس وقت تاریخ اور مشاہدہ سے بھی اس
اس کا ثبوت ہوگیا کیونکہ جب ضرورت کے وقت پھر انبیاء سابقین ہی میں کا ایک رسول آیا تو یہ اُس کا بدیہی ثبوت
ہے کہ درحقیقت رسولوں میں سے کوئی فرد بھی باقی نہیں رہا تھا اس لئے یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سب سے
آخری رسول تھے لہذا اب یہ شبہ نہیں رہا کہ جب آپ خاتم النبیین ہیں تو آپ کے بعد عیسیٰ علیہ السّلام کیسے آئیں گے
بلکہ اُن کا نزول ہی ختم نبوۃ کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا اگر وہ دوبارہ تشریف نہ لائیں تو مشاہدہ میں یہ کیسے ثابت ہوتا
کہ سب رسول آچکے ہیں اور آپ ہی سب سے آخری رسول ہیں۔

جلد اول میں ختم نبوۃ کی پہلی حدیث میں ہم یہ بھی بتفصیل لکھ چکے ہیں کہ حسب تصریح قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جملہ انبیاء علیہم السّلام سے ایمان اور بوقت ضرورت نصرت کا عہد بھی لیا جاچکا ہے اس لئے یوں مقدر ہوا کہ عیسیٰ علیہ السّلام تشریف لاکر اپنی طرف سے اصالۃً اور دوسرے انبیاء علیہم السّلام کی طرف سے وکالۃً اس عہد کو پورا فرمائیں۔ کیا ان چند وجوہات سے جو فوری طور پر زیر قلم آگئے ہیں گذشتہ شبہات کا جواب نہیں ہوجاتا۔

کتاب اللہ میں اور حدیثوں میں بہ نسبت موجودہ کتب سماویہ کے مقابلہ میں مجازات اور استعارہ کا استعمال بہت کم ہے اور یہ اسلام کا ایک طغرۂ امتیاز بھی ہے

جہاں تک ہم نے غور کیا ہے ہم کو یہی ثابت ہوا ہے کہ دیگر کتب سماویہ کی نسبت ہماری شریعت میں استعارات و مجازات کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ کتب سابقہ کی موجودہ صورت پر گو کوئی اعتماد نہیں کیا جاسکتا تاہم ہمارے موازنہ کے لئے ان کے موجودہ نسخوں کے علاوہ ہمارے سامنے کوئی اور سامان بھی نہیں ہے۔ جب ہم حدیث و قرآن کریم کی پیشگوئیوں اور اُس کے دیگر بیانات کی کتب سابقہ کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو ہم کو آفتاب درخشاں کی طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ ہماری شریعت نے اس بارے میں استعارات و مجازات کا دائرہ بجز اُن مجازات کے جو حقیقت سے زیادہ متعارف ہوں بہت تنگ رکھا ہے اور عقائد کے باب سے تو اس کا کوئی تعلق ہی نہ رکھا۔ اس کے برخلاف موجودہ انجیل کا حال یہ ہے کہ اس میں الوہیت و رسالت کے بنیادی مسائل بھی مجازات و استعارہ کے پیرایہ میں ادا کئے گئے ہیں حتیٰ کہ منصف عیسائی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کے مذہب میں توحید کا مسئلہ بھی تقدیر کے مسئلہ کی طرح مذہب کا ایک راز اور ناقابل فہم مسئلہ ہے اس کے برعکس قرآن کریم کا بیان ہے۔ یہاں عقائد و احکام کا تو ذکر ہی کیا ہے پیشگوئیوں کا عام باب بھی اس طرح کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی صحیح فہم والے شخص کے لئے ان میں کوئی تردد نہیں رہتا۔ فارس و روم کی جنگ میں فتح کی پیشگوئی، فتح مکہ کی پیشگوئی، اعضاء انسانی کا کلام کرنا، دجال کی پیدائش، اُس کا اور اُس کے والدین کا نقشہ، سر کے بل انسانوں کا محشر میں چلنا، برہنہ قبروں سے نکلنا اور مردوں اور عورتوں کا ایک میدان میں اسی طرح جمع ہونا، غرض حشر و نشر اور جنت و دوزخ کی وہ تفصیلات جو مادی عقلوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول سے کہیں بعید تر ہیں ان سب کے متعلق صاحب شریعت

کی طرف سے ہم پر بھی زور دیا گیا ہے کہ وہ سب کی سب حقیقت ہی حقیقت ہیں اور کسی تاویل کے بغیر ہمیں ان کو حقیقت ہی پر محمول کرنا چاہیئے چنانچہ اگر جنت کے تذکرہ میں حسب الاتفاق اس کا ذکر آ گیا ہے کہ وہاں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی تو سامعین نے کبھی اس کو مبالغہ پر حمل نہیں کیا بلکہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق وہی سوالات کئے ہیں جو ان الفاظ کے حقیقی معنے میں پیدا ہو سکتے تھے۔ مثلاً کسی نے یہ سوال کیا کہ کیا جنت میں کاشت اور کھیتی بھی ہوگی اور جب کبھی جنت میں صنفی تعلقات کا ذکر آ گیا ہے تو سامعین میں سے اس پر کسی نے ولادت کے مسئلہ کا حل بھی دریافت کیا ہے اسی طرح بقیہ مسائل کے متعلق بھی ایسے سوالات کئے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے مخاطب صحابہ ہمیشہ آپکے کلام کو حقیقت ہی پر محمول کرنے کے عادی تھے پھر اُن کے جو جوابات آپ سے منقول ہیں وہ بھی اسی کی دلیل ہیں کہ خود آپ نے بھی ان الفاظ سے حقیقی معنوں ہی کا ارادہ فرمایا ہے مثلاً پہلے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اگر کسی زراعت منش آدمی کے دل میں وہاں بھی یہ جذبہ پیدا ہوگا تو زراعت، اس کی بالیدگی و پختگی سب آن کی آن میں ہو جائے گی اور ذرا سی دیر نہ ہوگی کہ کھیتی کٹ کٹا کر اس کے گھر میں آ جائے گی اور قدرت کی طرف سے ارشاد ہوگا۔ ابن آدم! لے تو یہ بھی لے تیری ہوس آخر کسی طرح پوری بھی ہوگی اگر یہاں مجازی معنے استعمال ہوتے تو جواب صاف تھا کہ جنت میں کھیتی کہاں اس کا مطلب تو صرف ایک معنی مجازی اور مبالغہ تھا اسی طرح دوسرے سوال کے جواب میں بھی آپ یہی فرما سکتے تھے کہ اگر کوئی شخص ولادت کی تمنا کرے گا تو فوراً حمل و ولادت اور وضع حمل کا سلسلہ آناً فاناً پورا ہو کر کھیلتا ہوا بچہ اس کو مل جائے گا مگر جو دنیا میں میزان ستوفی ملانے کے لئے نہیں آئے بلکہ حقیقت ہی حقیقت بتانے آئے تھے اُنھوں نے یہاں بھی وہی جواب نہیں دیا جو صرف قیاس سے دیا جا سکتا تھا بلکہ وہ جواب عنایت فرمایا جو حقیقت میں اس کا جواب تھا۔ ارشاد ہے کہ اگر جنت میں کسی کے دل میں یہ تمنا ہوتی تو ایسا ہی ہوتا مگر وہاں کسی کے دل میں یہ تمنا ہی نہ ہوگی۔

غرض شریعت اسلام کی تاریخ میں متکلم و مخاطب دونوں کے حالات سے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جانبوں سے شرعی الفاظ کے ہمیشہ حقیقی معنےٰ ہی مراد لئے گئے ہیں بجز اس کے کہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے وہاں استعارہ و مجاز اتنا واضح ہو کہ حقیقی معنے کی طرف عام طور پر ذہن کا انتقال ہی مشکل ہو۔ مثلاً صبح کے لئے الخیط الابیض کا لفظ اور شب کی تاریکی کے لئے الخیط الاسود کا لفظ فصیح لغت میں ایک ایسا مجاز ہے کہ اس مجاز کو چھوڑ کر یہاں حقیقت کا استعمال کرنا گویا انداز بلاغت ہی کو چھوڑ دینا ہے اس کے باوجود جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود تو کسی دماغ نے اس کھلے ہوئے مجاز کو بھی حقیقت ہی پر محمول کیا اور سیاہ و سفید رنگ کے دو دھاگے لے کر اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لئے اور رات کو اس وقت تک کھاتا پیتا رہا جب تک کہ یہ دو دھاگے علیحدہ علیحدہ صاف صاف نظر نہ آنے لگے

جب صبح کو اس واقعہ کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچی تو آپ نے بلیغانہ انداز میں فرمایا تمہارا تکیہ بھی کتنا لمبا چوڑا ہے جس کے نیچے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں سماگئیں یعنی ان الفاظ سے مراد معنے مجازی تھے اور یہاں مجاز ایسا متعین ہے کہ حقیقت کی طرف ذہن جانا ہی مشکل ہے تم نے اس کو حقیقت پر کیسے محمول کرلیا۔ لیکن اس انفرادی غلطی کے باوجود اس کی اتنی اہمیت محسوس کی گئی کہ کلمہ "من الفجر" اور نازل ہوگیا تاکہ پھر یہ مجاز متعارف بھی حقیقت کے اتنا قریب آجائے کہ یہاں کسی ایک فرد کو بھی احکام کے باب میں اس غلط فہمی کا امکان نہ رہے[1]۔

خلاصہ یہ کہ دیگر کتب سماویہ کے مقابلہ میں قرآن کریم اور احادیث نبویہ کا یہ بھی ایک طغرائے امتیاز ہے کہ یہاں جملہ بیانات اتنے واضح ہیں جتنا کہ وہ ہوسکتے ہیں پھر اگر اُن میں کوئی ابہام رہ گیا ہے تو وہ بھی اسی حد تک ہے جو ناگزیر ہے بلکہ وہاں یہ ابہام ہی مناسب ہے۔ بعض مرتبہ مصداق کے ظہور سے قبل وہ ابہام اس لئے بھی ناگزیر ہوتا ہے کہ اُس کی تشریح کے لئے عقل انسانی متحمل نہیں ہوسکتی جیسے برزخی کیفیات ظاہر ہے کہ عالم برزخ جب عالم مادیات سے جُدا عالم ہے تو جب تک ایک انسان اسی عالم مادہ میں موجود ہے وہ عالم برزخ کے دوسرے عالم کی پُوری تفصیلات کا پُورا احاطہ کیسے کرسکتا ہے۔

اور درحقیقت آخری شریعت کی یہی صفت ہونی بھی چاہئیے کیونکہ پہلی کتب میں اگر کوئی ابہام رہ گیا تو آئندہ نبی نے آکر اُس کو واضح کردیا ہے لیکن اگر ضروری امور میں اس شریعت میں بھی ابہام رہ جائے تو اب یہاں کون ہے جو آئندہ آکر اُس کی ذمہ دارانہ تشریح کرسکے مجتہدین کا بیان اس جگہ ناکافی ہے ان کو یہاں دو طرفہ عمل کے لئے وسعت ہوتی ہے اس کے باوجود ان کے بیان کی وہ حیثیت نہیں جو رسول کے سرکاری بیان کی ہوسکتی ہے۔

---

(۱) اس سے اندازہ کرلینا چاہیئے کہ یہاں ایسے مجازات کا تو بھلا کیا امکان ہوگا جن کی طرف کسی اہل زبان کا ذہن ہی منتقل نہ ہوسکے حتیٰ کہ اُن کے زبردستی منوانے کے لئے جدید وحی کی ضرورت محسوس ہو اور کسی نبی مزعوم کو آکر پہلے خود بھی سالہا سال مغالطہ لگا ہے اور وہ بھی ان کو حقیقی معنی پر ہی حمل کرتا ہے پھر جب وہ مدعی مسیحیت بنے تو ان کے مجازی معنیٰ مراد لے اور اس کے سمجھانے میں اس کو اس کو اُمت کے ساتھ مدتوں جنگ کرنی پڑے۔ مثلاً یہ کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی عیسیٰ ابن مریم سے مجازاً فلاں شخص (جس کا باپ بھی موجود ہے اور ماں کا نام بھی مریم نہیں ہے) مراد ہے اور نزول سے مجازاً ولادت اور حاکم سے مجازاً محکوم اور دمشق سے فلاں شہر اور دو زرد چادروں سے مجازاً دو مرض مراد ہیں غرض کہ اس پیشگوئی کے جملہ الفاظ میں مجازی معنیٰ مراد لے لئے بجز ایک منارہ کے کہ اس کے معنی حقیقی مراد لے اور یہ حقیقی معنے بھی وہ خود اپنے نزول یعنی ولادت بلکہ دعوی مسیحیت کے بعد اپنے چندہ سے منارہ بناکر پیدا کرے بیشک مجاز و استعارہ فصاحت و بلاغت کا ایک اہم باب ہے اور ہر زبان میں پایا جاتا ہے مگر کیا ایسے استعارہ و مجاز کی مثال بھی کسی زبان میں ملتی ہے اگر اس قسم کے استعارہ و مجاز کے لئے بھی کوئی وجہ جواز نکل سکتی ہے تو پھر دنیا میں جھوٹ اور کذب کی کوئی مثال نہیں مل سکتی ہر جھوٹ استعارہ و مجاز کے پردے میں چل سکتا ہے

صریح حدیثوں میں تاویل کا خطرناک نتیجہ

صریح الفاظ اور صریح بیانات کو پیچیدہ بنانے اور اُن کی تاویلات کرنے کا نتیجہ کبھی اچھا برآمد نہیں ہوا یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی آمد کی پیشگوئی میں تاویل کی آخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو انھوں نے دجّال کا مصداق سمجھا اور جب دجّال ظاہر ہوگا تو اس کو مسیح ہدایت سمجھ کر اس کی اتباع کریں گے اسی طرح نصاریٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی صاف صاف پیشگوئیوں کی تاویلات کیں آخر اس کا بھی جو نتیجہ ظاہر ہونا تھا وہ ہوا اور اُنھوں نے بھی اسی غلطی کی بدولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا انکار کیا۔ لہٰذا صاف اور واضح بیانات میں تاویلات کرنا نہایت خطرناک قدم ہے اور اس کا ثمرہ بھی یہی ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السّلام کی جگہ غلط مسیح، مسیحِ حق مان لئے جائیں اور جب حضرتِ عیسیٰ علیہ السّلام نازل ہوں تو یہودیوں کی طرح اُن کا انکار کردیا جائے۔ اگر نزول عیسیٰ علیہ السّلام کے متعلق اتنے واضح اور صریح الفاظ میں بھی تاویلات یا مجازات واستعارات جاری کردینا صحیح ہے تو پھر یہود و نصاریٰ کو بھی قصوروار ٹھہرانا غلط ہوگا جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق پیشگوئیوں میں تاویلیں کرکے اپنا ایمان برباد کیا ہے۔

والعیاذ باللہ من الزیغ والالحاد

سَیِّدُنَا رُوحُ اللّٰہِ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ وَقِطْعَۃٌ مُّھِمَّۃٌ مِّنْ حَیَاتِہِ الطَّیِّبَۃِ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ

سیدنا روح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپکی حیات طیبہ کی ایک اہم سرگزشت

نُزُوْلُ عِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ حَقٌّ جَزَمَ بِہِ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی حَلَفَ عَلَیْہِ

۱۲۵۳- عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَیُوْشِکَنَّ اَنْ یَّنْزِلَ فِیْکُمُ ابْنُ مَرْیَمَ حَکَمًا عَدْلًا فَیَکْسِرُ الصَّلِیْبَ وَیَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَ وَیَضَعُ الْحَرْبَ وَیَفِیْضُ الْمَالُ حَتّٰی لَا یَقْبَلَہٗ اَحَدٌ حَتّٰی تَکُوْنَ السَّجْدَۃُ الْوَاحِدَۃُ خَیْرًا مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا

حضرت عیسٰے علیہ السلام کا نزول یقینی مسئلہ ہی حتٰی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قسم کھا کر ذکر فرمایا ہے!

۱۲۵۳- ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہو کہ یقیناً وہ زمانہ قریب ہی جبکہ ابن مریم تمہارے درمیان اترینگے وہ ایک منصف فیصلہ کرنے والے کی حیثیت سے آئیں گے، صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور سور کو قتل کرینگے، اور جنگ ختم کر دینگے اور ان کے دور میں مال اس طرح بہا پڑے گا کہ کوئی شخص اسکو قبول کرنیوالا نہ ملیگا اور لوگوں کی نظروں میں ایک سجدہ کی قدر و قیمت

۱۲۵۳- حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نزول میں اگر علم عادت کے خلاف کوئی بات نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو قسم کھا کھا کر کیوں بیان فرماتے ہیں معلوم ہوا کہ یہاں عیسٰی علیہ السلام کے نزول سے کسی انسان کی ولادت مراد نہیں کیونکہ اس میں کوئی ایسی جدید بات نہیں جس پر قسم کھانے کی ضرورت ہو پھر اس پیشینگوئی کی اہمیت راوی حدیث کی نظر میں اتنی ہو کہ وہ اسکو قرآنی پیشینگوئی کہتا ہے اب اس سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ جو پیشین گوئی قسم کے ساتھ حدیثوں میں بیان کی گئی ہو بلکہ قرآن کریم میں موجود ہو وہ جزم و یقین کے کس درجہ میں ہوگی۔ حدیث مذکور میں ان کے زمانہ کی چند ایسی برکات کا تذکرہ بھی آگیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شخصیت ایک غیر معمولی شخصیت ہوگی وہ کوئی معمولی محکوم انسان نہیں ہونگے بلکہ حاکم بھی وہ حاکم ہونگے جو وقت کی بڑی طاقت یعنی نصرانیت کا صرف روحانی طور پر ہی نہیں بلکہ مادی طور پر بھی استیصال فرمائینگے اور شعائر نصرانیت میں سب سے بڑا شعار یعنی صلیب اسکو نیست و نابود کر دینگے اخروی برکات کے ساتھ ساتھ دنیوی برکات بھی ان کے قدموں سے لگی ہوئی ہونگی اور یہ سب برکات اتنی ظاہر و باہر ہونگی کہ اس وقت کے انسانوں کے لئے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ذکی آسرائیلی" رسول ہونے کا بدیہی ثبوت مینگا۔

ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْهُرَيْرَةَ ؓ وَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ؁ (رواہ البخاری ومسلم ص۸ ج۱)

وَفِي لَفْظٍ مِنْ رِوَايَةِ عَطَاءٍ وَلَتَذْهَبَنَّ الشَّحْنَاءُ وَالتَّبَاغُضُ وَالتَّحَاسُدُ. رواہ ابوداؤد وابن ماجہ واحمد فی مسندہ ص۲۹۰ ج۲ وص۳۹۴ ج۲ وبطریق اخری فی ص۱۱۲ ج۲۔

وَلفظہ یوشك من عاش منكم ان یلقی عیسی بن مریم وعزاہ السیوطی فی الدر المنثور ص۲۴۲ ج۲ لابن ابی شیبۃ وعبد بن حمید واخرجہ ابن مردویہ وفی لفظہ وتكون السجدة واحدة لله رب العلمين واقرءوا ان شئتم وان من اهل الكتب الا ليؤمنن به قبل موته موت عيسى بن مريم ثم يعيدها ابوهريرة ثلث مرات ؁

۴۱۲۵۔ وَاَخْرَجَ اَبُوْيَعْلٰى مَرْفُوْعًا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَيَنْزِلَنَّ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ ثُمَّ لَئِنْ قَامَ عَلٰى قَبْرِيْ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ لَاُجِيْبَنَّهٗ كذا فی روح المعانی من الاحزاب ص۔ ؁

دنیا و مافیہا سے بھی زیادہ بڑھ جائے گی یہ مضمون روایت فرما کر ابوہریرہ ؓ کہتے تھے کہ اگر تم اس مضمون کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہو تو سورۃ النساء کی یہ آیت پڑھ لو: وان من اهل الكتب الا ليؤمنن به قبل موته. (بخاری شریف مسلم شریف) میں عطاء کی روایت میں یہ الفاظ اور ہیں کہ ان کے زمانہ کی برکات میں سے یہ بھی ہوگا کہ لوگوں میں کینہ، بغض اور حسد کا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔

۴۱۲۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذات کی قسم کھا کر فرمایا جس کے قبضہ میں آپکی جان ہے کہ عیسیٰ بن مریمؑ ضرور اتر کر رہیں گے اور اگر وہ میری قبر پر آکر کھڑے ہونگے اور مجھ کو یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہکر آواز دینگے تو میں ان کو ضرور جواب دونگا۔ (روح المعانی)

یہ بھی واضح رہے کہ حدیث مذکور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "حَکَم" فرمایا گیا ہے اور حَکَم وہی ہو سکتا ہے جو فریقین کے نزدیک مسلّم ہو اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ نازل ہونیوالے وہی اسرائیلی عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ ان کی شخصیت ہی اہل کتاب اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کے نزدیک مسلّم ہوسکتی ہے اگر بالفرض اس پیشینگوئی کا مصداق کسی ایسے شخص کو قرار دیا جائے جو خود اسی امت میں پیدا ہو تو اسکو حکم نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اہل کتاب کے نزدیک وہ مسلّم نہیں ہوگا۔ یہاں حکم یعنی ثالث کی ضرورت اس لئے ہے کہ دنیا کے خاتمہ پر جملہ ادیان کا پھر ملت واحدہ بنجانا ضروری ہے اور اس کے لئے اہل کتاب اور اہل قرآن کا باہم اختلاف ختم ہو جانا لازم ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سب فیصلے دلائل و براہین کی روشنی میں ہوتے ہیں اس لئے اس کی مصلحت نے تقاضا کیا کہ اس مقصد کے لئے ایک ایسی شخصیت آئے جو فریقین کے نزدیک مسلّم ہو تاکہ خدائے تعالیٰ کی حجت دونوں فریق پر پوری ہو جائے اس لئے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کا تشریف لانا مقدر ہوا۔ وتمت كلمت ربك صدقا وعدلا ؁

۱۲۵۵۔عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْرَكَ مِنْكُمْ عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ فَلْیُقْرِئْہُ مِنِّی السَّلَامَ ۔ کذا فی الدر المنثور ص۲۴۵ ج۲ وقد رواہ احمد فی مسندہ عن ابی ہریرۃؓ مرفوعًا ایضًا بسند رجالہ رجال البخاری۔

۱۲۵۶۔عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ مَوْقُوْفًا عَلَیْہِ اِنِّیْ لَاَرْجُوْ اِنْ طَالَتْ بِیْ حَیٰوۃٌ اَنْ اُدْرِكَ عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ فَاِنْ عَجِلَ بِیْ مَوْتٌ فَمَنْ اَدْرَكَہٗ فَلْیُقْرِئْہُ مِنِّی السَّلَامَ ۔ (مسند احمد ص۲۹۸ ج۲) ورجالہ رجال البخاری وقد اخرج البخاری بھذا الاسناد احادیث فراجع ص۲۲ و ص۹۹۹۔

ان عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام لم یمت الی الاٰن وانہ راجع الینا ثم یاتی علیہ الفناء

۱۲۵۷۔عَنِ الْحَسَنِ مَرْفُوْعًا وَمَوْقُوْفًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِلْیَھُوْدِ اِنَّ عِیْسٰی لَمْ یَمُتْ وَاِنَّہٗ رَاجِعٌ اِلَیْکُمْ قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ

۱۲۵۵۔ انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں سے جس شخص کی بھی عیسٰیؑ بن مریمؑ سے ملاقات ہو وہ ان کو میری جانب سے ضرور سلام کہدے۔ (احمد)

۱۲۵۶۔ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اگر میری زندگی دراز ہوگئی تو مجھ کو امید ہے کہ عیسٰیؑ بن مریمؑ سے خود میری ملاقات ہو جائیگی اور اگر اس سے پہلے میری موت آجائے تو جو شخص ان کا زمانہ پائے وہ میری جانب سے انکی خدمت میں سلام عرض کردے۔ (مسند احمد)

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ابتک وفات نہیں ہوئی ان کو تشریف لانا ہے اسکے بعد انکی وفات ہونی ہے

۱۲۵۷۔ حضرت حسنؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے ارشاد فرمایا۔ عیسٰیؑ

۱۲۵۶۔ ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کا نزول یقینی امر ہے اور ایسا یقینی ہے کہ اس پیشین گوئی کے راویوں کی نظروں میں اسکا انتظار لگ رہا تھا۔ نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انکی شخصیت غیر معمولی شخصیت ہے۔ امت کا فرض ہے کہ وہ پیشینگوئی کو یاد رکھے اور جس خوش نصیب کو وہ زمانہ ہاتھ آجائے اسپر لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پہنچا کر آپ کی وصیت کو پورا کرنیکی سعادت حاصل کرے۔

۱۲۵۷۔ عجیب بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے معاملہ میں یہود و نصاری کو علیحدہ علیحدہ خطاب فرمایا ہے چونکہ یہود عیسٰی علیہ السلام کو مردہ تصور کرتے ہیں اور ان کی دوبارہ آمد کے منکر ہیں اسلئے جب آپ نے خاص یہود کو خطاب فرمایا تو ان کے مقابلہ میں خاص طور پر انکی دوبارہ تشریف آوری پر زور دیا ہے اور صراحت کے ساتھ ان کی

اخرجه ابن جریر مرفوعاً عنه واخرج ابن کثیر من ال عمران وذکره فی النساء من طریق اخر موقوفاً علیه واخرجه ابن ابی حاتم مرفوعاً۔

۱۲۵۸۔ عَنِ الرَّبِیْعِ مُرْسَلاً قَالَ اِنَّ نَصَارٰی اَتَوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَخَاصَمُوْہُ فِیْ عِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ وَقَالُوْا لَہٗ مَنْ اَبُوْہُ وَقَالُوْا عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَالْبُھْتَانَ فَقَالَ لَھُمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّہٗ لَا یَکُوْنُ وَلَدٌ اِلَّا وَھُوَ یُشْبِہُ اَبَاہُ قَالُوْا بَلٰی قَالَ اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ رَبَّنَا حَیٌّ لَا یَمُوْتُ وَاَنَّ عِیْسٰی یَاْتِیْ عَلَیْہِ الْفَنَاءُ قَالُوْا بَلٰی۔ الحدیث کذا فی الدر المنثور من اول سورۃ ص۳

۱۲۵۹۔ عَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ عَنْ حُذَیْفَۃَ بْنِ اُسَیْدِ الْغِفَارِیِّ قَالَ اِطَّلَعَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

ابھی مرے نہیں ہیں اور قیامت سے پہلے ان کو لوٹ کر تمہارے پاس آنا ہے۔ (ابن کثیر)

۱۲۵۸۔ ربیع مرسلاً بیان کرتے ہیں کہ نصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسٰی ابن مریم کے معاملہ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے جھگڑنے لگے اور کہنے لگے (کہ اگر وہ خدا تعالٰی کے بیٹے نہ تھے) تو بتلایئے انکا والد کون تھا اور حق تعالٰی شانہٗ پر طرح طرح کے جھوٹ اور بہتان لگانے لگے آپ نے ان سے فرمایا کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہر بیٹا اپنے باپ کے مشابہ ہوا کرتا ہے انھوں نے کہا کیوں نہیں پھر آپ نے فرمایا کیا تم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ تعالٰی کی ذات ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے اسکو موت کبھی نہ آئیگی اور عیسٰی (علیہ السلام) کو موت آنی ہے انھوں نے اسکا اقرار کیا اور کہا بیشک انکو موت آنی ہے (تو پھر وہ حقتعالٰی کے مشابہ کہاں رہے) (درمنثور)

۱۲۵۹۔ ابوالطفیل حذیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس باہر سے

موت کی نفی فرمادی ہے جس سے ثابت ہوا کہ جب عیسٰی علیہ السلام کی وفات ہی نہیں ہوئی تو پھر انکا دوبارہ تشریف لانا خود بخود ضروری ہے اور اس حقیقت کی مزید تاکید کے لئے جو شخص آسمانوں پر گیا ہے وہی شخص دوبارہ آئیگا لفظ "رجوع" یعنی لوٹنے کا استعمال فرمایا ہے۔ اسکے برعکس نصارٰی ہیں وہ ان کو خدا مانتے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک وہ فنا کے تحت آہی نہیں سکتے لہٰذا آپ نے جب خاص انسے خطاب فرمایا تو ان کو یہ کہکر قائل کیا ہے کہ خدا وہ ہے جسکو کبھی فنا نہو اور عیسٰی علیہ السلام کو تم نے کے بعد موت آنی ہے پھر وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔

۱۲۵۸۔ اگر بالفرض حضرت عیسٰی علیہ السلام کو موت آچکی تھی تو کیا اس حقیقت کے انکشاف کیلئے اس سے زیادہ بڑھکر کوئی اور موقعہ تھا آپ یہاں صاف فرمادیتے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام تو کبھی کے مرچکے ہیں مگر قرآن و حدیث میں عیسائیوں کے سامنے ایک جگہ بھی ہمکو اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔

۱۲۵۹۔ حدیث مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کا آنا یقینی ہے مگر اس سے پہلے حضرت عیسٰی علیہ السلام کا نزول بھی اور علامات کے ساتھ بھی اتنا ہی یقینی ہے حتی کہ انکی تشریف آوری سے قبل قیامت کا تصور کرنا گویا بے حقیقت بات کا

عَلَيْنَا وَنَحْنُ نَتَذَاكَرُ فَقَالَ مَا تَذَاكَرُوْنَ قَالُوْا نَذْكُرُ السَّاعَةَ قَالَ إِنَّهَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰى تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ اٰيَاتٍ فَذَكَرَ الدُّخَانَ وَالدَّجَّالَ وَالدَّابَّةَ وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُوْلَ عِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ وَ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ وَثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ وَخَسْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَاٰخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ إِلٰى مَحْشَرِهِمْ۔ اخرجه مسلم ص۳۹۳ وعن واثلة نحوه اخرجه الطبرانی والحاکم ووافقه الذهبی علی تصحیحه۔

۱۲۶۰۔ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ

تشریف لائے اسوقت ہم قیامت کے متعلق گفتگو میں مشغول تھے آپ نے فرمایا کیا گفتگو کر رہے ہو؟ ہم نے عرض کی قیامت کے متعلق باتیں کر رہے ہیں آپنے فرمایا قیامت اسوقت تک ہرگز نہیں آسکتی جبتک کہ اس سے پہلے تم دس نشانیاں دیکھ نہ لو۔ دھواں۔ دجال۔ دابۃ الارض۔ مغرب کی جانب سے آفتاب کا طلوع عیسیٰ بن مریم کا اترنا۔ یاجوج وماجوج کا ظہور۔ تین خسف۔ ایک مشرق میں۔ ایک مغرب میں اور تیسرا جزیرہ عرب میں اور سب سے آخر میں وہ آگ جو یمن سے ظاہر ہوگی اور سب کو دھکا دیکر محشر تک لیجائیگی۔ (مسلم شریف)

۱۲۶۰۔ عمران بن حصین روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری امت

نیز حدیث مذکور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول جن دیگر علامات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہر علامت اپنی اپنی نوعیت میں عجیب ہی ہے اور ظاہر ہے کہ انقلاب عالم کے عجیب تر حادثہ کی علامات ایسے ہی عجیب در عجیب ہونی چاہئیں انکو نا دلیل کر کے دنیا کے عام حوادث کی صف میں کھینچنا قیامت کی حقیقت سے ناواقفی کی دلیل ہے بلکہ ایک طرح پر قیامت ہی کا انکار ہے کیونکہ قیامت کا وجود ان علامات کے وجود سے کہیں عجیب تر ہے پس اگر یہ علامات ملحد عقول کے نزدیک خلاف عقل ہونیکی بنا پر قابل تاویل ہیں تو پھر قیامت کا وجود بدرجہ اولیٰ قابل تاویل ہونا چاہیئے والعیاذ باللہ۔ اہل عقل وانصاف کو ذرا ٹھنڈے دل سے اسپر غور کرنا چاہیئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول حدیثوں میں قیامت کے قریب تر متعلقات میں شمار کیا گیا ہے پھر اگر اسکو قیاس کرنا ہی ہے تو قیامت پر قیاس کرنا چاہیئے۔ عالم کے عام نظم ونسق میں اسکو شامل کر لینا کتنی بڑی نادانی ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ علامات قیامت میں قیامت کی علامات کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ صغریٰ (چھوٹی) اور کبریٰ (بڑی) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول علامات کبریٰ میں شامل فرمایا ہے جسکا حاصل حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ اسکے بعد قیامت کا اسطرح انتظار کرنا چاہیئے جیسے جانور کے حمل کی مدت پوری ہو جانیکے بعد اسکا مالک بچہ کی پیدائش کا انتظار کیا کرتا ہے جیسا کہ اس باب کے آخر کی حدیثوں میں عنقریب آپ کے ملاحظہ سے گذریگا۔

۱۲۶۰۔ حدیث مذکور اگرچہ ایک دوسرے مضمون کی حدیث ہے مگر چونکہ قیامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری قیامت کی طرح یقینی مسئلہ ہے اس لئے جب کہیں قیامت کا تذکرہ آتا ہے تو اگر وہاں سیاق کلام

مِنْ اُمَّتِیْ عَلَی الْحَقِّ ظَاهِرِیْنَ عَلٰی مَنْ نَاوَاهُمْ حَتّٰی یَأْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی وَیَنْزِلُ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ ۔ مسند احمد ج ۴ ص ۴۲۹ ورجاله کلهم ثقات

۱۲۶۱۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ مَرْفُوْعًا قَالَ اِنَّ الْمَسِیْحَ بْنَ مَرْیَمَ خَارِجٌ قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَ یَسْتَغْنِیْ بِهِ النَّاسُ عَمَّنْ سِوَاهُ ۔ (کنز العمال ص ۲۶۸)

۱۲۶۲۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعًا کَیْفَ تَهْلِكُ اُمَّةٌ اَنَا فِیْ اَوَّلِهَا وَعِیْسٰی فِیْ آخِرِهَا ۔ کنز ج ۷ وصححه فی الدر المنثور فی ضمن اثر کعب وحسنه فی الفتح من فضائل اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم وذکره فی المشکوٰة فی ثواب هذه الامة عن رزین بسلسلة الذهب قال فی التیسیر ص ۳۰ رواه النسائی وغیره ۔

۱۲۶۳۔ عَنْ جُبَیْرِ بْنِ نُفَیْرٍ الْحَضْرَمِیِّ مَرْفُوْعًا مُرْسَلًا لَنْ یُخْزِیَ اللّٰهُ اُمَّةً اَنَا فِیْ اَوَّلِهَا

میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہیگی جو اپنے دشمنوں کے مقابلہ پر غالب رہینگی یہانتک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا اور حضرت عیسیٰ بن مریم اتریں ۔ مسند احمد ۔

۱۲۶۱ - ابن مسعود رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت سے پہلے عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) یقیناً تشریف لاکر رہینگے اور انکی آمد کے بعد لوگ ان کے سوا سب سے بے نیاز ہو جائینگے ۔ (کنز العمال)

۱۲۶۲ - ابن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں بھلا وہ امت کیسے ہلاک ہو سکتی ہے جسکے اول میں تو میں ہوں اور آخر میں عیسیٰ (علیہ السلام) ہوں ۔

۱۲۶۳ - جبیر بن نفیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس امت

میں ذرا کوئی مناسبت نکل آتی ہے تو مسلمات کی طرح فوراً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا تذکرہ بھی آجاتا ہے ۔

۱۲۶۳ - حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول یقینی ہے اور اس نزول میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے لئے ایک بڑی رحمت بھی پنہاں ہے ۔ یوں تو ہر گذشتہ امت دو رسولوں کے درمیان ہی ہوتی چلی آئی ہے مگر چونکہ پہلے ہر رسول کی امت مستقل ہوتی تھی اسلئے اسکو پہلی امت کے آخر میں شمار کرنا بے معنی بات تھی وہاں ہر رسول کا اصل مقام اپنی امت کے اول ہی میں تھا جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گو نصاریٰ کے بعد تشریف لائے مگر چونکہ آپ مستقل رسول تھے اور آپکی امت علیحدہ امت تھی اسلئے آپکو امت عیسیٰ علیہ السلام کے آخر میں شمار کرنا اور یہ کہنا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی امت بھی دو رسولوں کے درمیان ہے اس کے اول میں عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور آخر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بالکل بے معنی بات ہے لیکن اس امت کا معاملہ بالکل مختلف ہے یہاں اس امت کے رسول تو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری اس امت میں بہ حیثیت رسالت نہ ہوگی اسلئے انکی امت بھی کوئی جدید امت

وعیسٰی فی اٰخرِھَا۔ کذا فی الدر المنثور ص۲۴۵ج۲ وقال الذھبی فی التلخیص ھو خبر منکر ولم یذکر له وجھا وجیھا بل الصحیح انّهٗ ان لم یکن صحیحا فلا ینحط عن درجة الحسن کما صرح به الحافظ فی الفتح ص۳۵ج۷ وعن عروة بن رویم مثله کما فی الکنز ص۲۰۲ج۷ وعن کعب مثله مرفوعًا فی ضمن اثرہ الموقوف علیه کذا فی الدر المنثور وعن جعفرؒ الصادق عن ابیه عن جدہ مرفوعًا فی حدیث نحوہ رواہ رزین کما فی المشکوٰة من باب ثواب ھذہ الامة۔

اِنَّ عِیْسٰی عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ یَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَلَا یُوْلَدُ فِی الْاَرْضِ

۱۲۶۴ - عَنِ الحَاطِبِ بنِ اَبِیْ بَلْتَعَةَ قَالَ بَعَثَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَی الْمُقَوْقِسِ مَلِكِ الْاِسْکَنْدَرِیَّةِ قَالَ فَجِئْتُهٗ بِکِتَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

کو ہرگز ناکام نہیں کریگا جسکے اول میں تو میں ہوں اور آخر میں عیسیٰ (علیہ السلام) ہوں۔ (در منثور)

حضرت عیسےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام آسمان سے اترینگے اور زمین کے کسی خطہ میں پیدا نہیں ہونگے

۱۲۶۴ - حاطب بن ابی بلتعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھکو مقوقس شاہ اسکندریہ کے پاس بھیجا یہ کہتے ہیں کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر اُن کے پاس پہنچا تو انہوں نے مجھکو اپنی جگہ پر بٹھایا اور میں ان کے ہاں مقیم رہا پھر کسی فرصت میں انھوں نے مجھکو یاد فرمایا اور بلاپنے منتہی

نہوگی اس لئے انکو اس امت کے آخر میں شمار کرنا بالکل درست ہے اور اس امت کے حق میں بڑی رحمت کا باعث ہے۔
حدیث مذکور سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ آخر میں آنیوالے رسول وہی اسرائیلی رسول ہونگے اور خود اس امت میں پیدا نہیں ہونگے کیونکہ اگر وہ خود اس امت میں پیدا ہوں تو پھر ان کو امت کے آخر میں کہنا مناسب نہیں پس یہاں جس طرح امت کے اول میں آنیوالے رسول کو اس امت میں شمار کرنا صحیح نہیں اسی طرح اسکے آخر میں آنیوالے رسول کو اس امت میں پیدا شدہ کہنا صحیح نہیں بلکہ وہ ایسا رسول ہونا چاہئے جو خود رسول ہو مگر آئندہ اسکی کوئی علیحدہ امت نہو تاکہ اسکو اس امت کے آخر میں کہنا صحیح اور بامعنی بات ہو یہ بات دوسری ہے کہ چونکہ وہ آنحضرت صلعم کے بعد میں آئے گا اسلئے دورۂ نبوت کے لحاظ سے اسکو آپکی امت میں بھی شمار کرنا درست رہے تو پھر اس میں ایک عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص نہیں تمام انبیاء علیہم السلام بھی آپکی نبوت کے تحت ہیں اور اسلئے صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ محشر میں آدم علیہ السلام سے لیکر عیسیٰ تک سب آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہونگے مگر چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی یہ شان ایکبار دنیا میں بھی ظاہر ہوگی اسلئے تمام انبیاء علیہم السلام میں سے خاص انکے اندر یہ رشتہ زیادہ نمایاں رہیگا اسلئے علماء حقائق نے لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں اس خصوصیت کا ظہور قیامت کے دن بھی سب میں ممتاز رہیگا عجب نہیں کہ انا اولی الناس بابن مریم کی صحیح حدیث میں اسطرف بھی کچھ اشارہ ہو ۱۲۔
۱۲۶۴ - اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حاطبؓ اور شاہ مقوقس کے درمیان ایک مربوط گفتگو

فَأَنْزَلَنِي فِي مَنْزِلِهِ وَأَقَمْتُ عِنْدَهُ ثُمَّ بَعَثَ إِلَيَّ وَقَدْ جَمَعَ بَطَارِقَتَهُ وَقَالَ إِنِّي سَائِلُكَ بِكَلَامٍ وَأُحِبُّ أَنْ تَفْهَمَهُ مِنِّي قَالَ قُلْتُ هَلُمَّ قَالَ أَخْبِرْنِي عَنْ صَاحِبِكَ أَلَيْسَ هُوَ نَبِيًّا قُلْتُ بَلَى هُوَ رَسُولُ اللّٰهِ قَالَ فَمَا لَهُ حَيْثُ كَانَ هٰكَذَا لَمْ يَدْعُ عَلَى قَوْمِهِ حَيْثُ أَخْرَجُوهُ مِنْ بَلَدِهِ إِلَى غَيْرِهَا قَالَ فَقُلْتُ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ أَلَيْسَ تَشْهَدُ أَنَّهُ رَسُولُ اللّٰهِ فَمَا لَهُ حَيْثُ أَخَذَهُ قَوْمُهُ فَأَرَادُوا أَنْ يَصْلُبُوهُ أَنْ لَا يَكُونَ دَعَا عَلَيْهِمْ بِأَنْ يُهْلِكَهُمُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ حَتَّى رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ فِي السَّمَاءِ الدُّنْيَا قَالَ أَنْتَ الْحَكِيمُ الَّذِي جَاءَ مِنْ عِنْدِ الْحَكِيمِ۔ اخرجه البیهقی زکما فی الخصائص ص ۱۳/۲) قلت ولم یذکرہ الشیخ قدس سرہ فی رسالتہ فی نزول المسیح علیہ السلام۔

۱۲۶۵- عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ

بزرگوں کو بھی دعوت دی اور کہا مجھکو تم سے ایک بات کہنی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اسکو خوب سمجھ لو یہ کہتے ہیں میں نے عرض کی فرمائیے فرمائیے! انھوں نے فرمایا اچھا اپنے پیشوا کے متعلق بتاؤ کیا وہ نبی ہیں؟ میں نے عرض کی یقیناً وہ اللہ کے رسول ہیں اس پر انھوں نے کہا تو پھر انکی قوم نے انکو اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا تو انھوں نے کیوں اُن پر بددعا نہ کی۔ یہ کہتے ہی میں نے اسکے جواب میں شاہ مقوقس سے کہا کیا آپ عیسےٰ علیہ السلام کے متعلق یہ گواہی نہیں دیتے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں تو پھر جب انکی قوم نے انکو پکڑ کر سولی دینے کا ارادہ کیا تھا تو انھوں نے اسوقت انکے حق میں یہ بددعا کیوں نہ کی کہ اللہ تعالیٰ انکو ہلاک کر دے یہانتک کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اس آسمان پر انکو اٹھالیا۔ یہ سنکر شاہ مقوقس نے کہا تو خود بھی دانا شخص ہے اور جس ہستی کا فیضیافتہ

۱۲۶۵- ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بھلا اسوقت تمہاری کیا حالت

کا تذکرہ ہے جسکو پڑھکر بیساختہ دل اسکی تصدیق پر مجبور ہو جاتا ہے اس گفتگو میں صحابی کو مقوقس کے جواب میں گو صرف اتنا کہدینا کافی تھا کہ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنوں پر بددعا کیوں نہیں کی" مگر انھوں نے شاہ مقوقس پر اور زیادہ زور ڈالنے کیلئے یہ حقیقت بھی واضح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہجرت فرمائی تھی وہ تو صرف ایک شہر سے دوسرے شہر کیطرف تھی مگر عیسیٰ علیہ السلام کی ہجرت تو ایک عالم سے دوسرے عالم کیطرف تھی ظاہر ہے کہ آپ نے وطن چھوڑا مگر پھر بھی رہے وطن ہی کے قریب بعید میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو ایسی جگہ ہجرت فرمائی جہاں نہ وطن کی خبر رہی نہ اہل وطن کی بس بددعا کا سوال وہاں زیادہ چسپاں ہوتا ہے جہاں مظلومیت زیادہ ہو اس پر شاہ مقوقس نے یہ نہیں کہا کہ تم یہ کیا نا معقول بات کہتے ہو حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر کہاں گئے انکی تو مدت ہوئی وفات ہو چکی ہے بلکہ وہ لاجواب ہو کر چپ رہگیا اور اسکو خود انکی بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی غائبانہ داد دینی پڑی۔ معلوم ہوا کہ شاہ مقوقس کے نزدیک بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہو وفات نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ زندہ آسمان پر تشریف لے گئے ہیں اسلئے آسمان ہی سے اترینگے ان کے علاوہ کسی دوسرے انسان کا دنیا میں پیدا ہونیکا خیال یہ صرف جدید تراشیدہ افسانہ ہے جسکے نہ اہل کتاب ہی قائل تھے نہ علماء اسلام۔

۱۲۶۵- حدیث مذکور میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اترینگے ہر چند کہ آسمان کے لفظ کے

ابنُ مریم من السماء فیکم و امامکم منکم۔ ذکرہ البیہقی فی کتاب الاسماء والصفات ص۳۰۱ و عزاہ للبخاری ومسلم علی عادۃ المحدثین فی کون مرادھم بہ اصل الحدیث۔

وعن ابن عباس فی تفسیر قولہ تعالیٰ ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفرلھم ای من ترکت منھم ومُدّت فی عمرہ حتی اھبط من السماء الی الارض یقتل الدجال فنزلوا عن مقالتھم ووحدوک واقروا انا عبید۔

وعنہ قال لمّا اراد اللہ ان یرفع عیسیٰ الی السماء خرج الی اصحابہ وفی البیت اثنا عشر رجلا من الحواریین فخرج علیھم من عین البیت وراسہ یقطر ماء۔ در منثور، ص۲۳

۱۲۶۶- عن ابن عباس مرفوعا قال الدجال اول من یتبعہ سبعون الفا من الیھود علیھم

ہوگی جبکہ عیسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان آسمان سے اتریںگے اور تمہارا امام خود تم میں کا ہوگا۔ (الاسماء والصفات)

ابن عباس اس آیۃ فان تعذبھم الخ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اگر تو انکو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انکو بخشدے یعنی ان لوگوں کو جنکو تو باقی رکھے۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی عمر دراز کردیگئی ہے یہاں تک کہ جب وہ آسمان سے زمین پر اتریں اور دجال کو قتل کردیں تو جو باقیماندہ اپنے مشرکانہ عقیدے سے باز آکر تیری وحدت کے قائل ہوجائیں اور یہ اقرار بھی کریں کہ میں تیرا ایک بندہ ہی ہوں تو تو قادر اور حکمت والا ہے۔ نیز ابن عباس بل رفعہ اللہ الیہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھانیکا ارادہ فرمایا تو وہ اپنے صحابہ کے پاس تشریف لائے اسوقت گھر میں صرف بارہ شخص موجود تھے اور وہ گھر کے دروازہ کی بجائے روشندان سے تشریف لیگئے اور اسوقت انکے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

۱۲۶۶- ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے سب پہلے جو لوگ دجال

ان تفصیلات کے بعد جو عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں بیانیں آچکی ہیں کوئی ضرورت نہ تھی مگر اسکے باوجود چونکہ وہ ایک حقیقت تھی اسلئے اگر بضرورت نہ سہی تو ایک حقیقت کے اظہار کے طور پر سہی اسکا بجا تذکرہ ملتا ہی حتی کہ حضرت ابن عباسؓ بھی جنکے متعلق یہ داستان گائی جاتی ہی کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے قائل تھے مختلف مقامات میں ان کے آسمان پر اٹھائے جانیکی تصریح فرماتے ہیں پھر آسیں شبہ کیا ہی کہ ایکدن حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بھی مرنا ہی کلام صرف اسمیں ہے کہ یہ مقرر موت واقع ہوچکی ہے یا آیندہ واقع ہونیوالی ہی کتنی نافہمی ہے کہ بالفرض اگر ان کے بارے میں کسی سے موت کا لفظ منقول بھی ہے تو اسکو فوراً اپنے تخیل گذشتہ موت پر حمل کرلیا جائے حالانکہ وہ اسکا صاف اقرار بھی کر رہا ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے جاچکے ہیں اور آئندہ تشریف لاکر عام انسانوں کی طرح وفات پائینگے۔

۱۲۶۶- اس حدیث میں بھی صراحت کے ساتھ آسمان کا لفظ موجود ہے اور اُن کے دور کے امن و امان اور اصلاح و امان عام کا ایسا نقشہ موجود ہے جس سے بداہتہ ثابت ہوتا ہے کہ یقیناً وہ کوئی غیر معمولی انسان ہونگے اب اگر کسی کے

الشیطان (الی قولہ) قال ابن عباس قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعند ذلک ینزل عیسی بن مریم من السماء علی جبل افیق اماما ھادیا وحکما عادلا علیہ برنس لہ مربوع الخلق املت سبط الشعر بیدہ حربۃ یقتل الدجال فاذا قتل الدجال تضع الحرب اوزارھا فکان السلم فیلقی الرجل الاسد فلا یھیجہ ویاخذ الحیۃ فلا تضرہ وتنبت الارض کنباتہا علی عھد آدم ویؤمن بہ اھل الارض ویکون الناس اھل ملۃ واحدۃ۔ (اسحق بن بشر کنز)

جزم النبی صلی اللہ علیہ وسلم بان النازل ھو عیسی بن مریم الذی ولد بغیر اب ولا بد وشید بما مر علیہ من ذکر اسمہ و نسبہ و حلیتہ والاعمال المھمۃ التی ینزل لھا و منصبہ الذی ینزل بہ و کیفیۃ الامن الشامل وسعۃ الرزق وفیضان المال وغیرھا فی عھدہ علیہ الصلوۃ والسلام

۱۲۶۷ - عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الانبیاء اخوۃ العلات ابوھم واحد

کی اتباع کرینگے وہ ستر ہزار یہود ہونگے انکے سر پر طیلسان ہونگے اس سلسلہ میں ابن عباسؓ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اسوقت عیسی علیہ السلام کوہ افیق پر آسمان سے اترینگے اور وہ امام ہادی اور منصف حاکم ہونگے برنس (باران کوٹ کیطرح ہوتا ہے) پہنے ہوئے ہونگے وہ میانہ جسم کے گٹھے ہوئے رخسار اور سیدھے بالوں والے ہیں انکے ہاتھ میں نیزہ ہوگا دجال کو قتل کرینگے اور جب اسکے قتل سے فارغ ہوجائینگے تو جنگ ختم ہوجائیگی اور امن و سلامتی کا یہ عالم ہوگا کہ آدمی اور شیر کا آمنا سامنا ہوگا مگر اسپر حملہ کرنیکا اسکے دلمیں ذرا خیال نہ آئیگا آدمی سانپ کو اپنے ہاتھ میں لیگا اور وہ اسکو ذرا بھی نقصان نہ پہونچائیگا اور زمین کی پیداوار میں وہ برکت ہوگی جو کبھی آدم علیہ السلام کے زمانہ میں تھی اور زمین کے بسنے والے انپر ایمان لے آئینگے اور سب مخلوق ایک ہی ملت و مذہب کی ہوجائیگی۔ (کنز)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے یقین کے ساتھ فرمایا ہے کہ آیندہ تشریف لانیوالے وہی عیسی ہونگے جنکی پیدائش بغیر والد کے ہوئی ہے چنانچہ آپکی وضاحت کیلئے آپنے انکے نام انکے نسب اور انکی شکل و صورت بیان فرمانیکا خاص اہتمام فرمایا ہے اسکے ساتھ آپکی خدمات مفوضہ ان کا منصب انکے زمانہ امن عام کی کیفیت رزق کی فراوانی اور دیگر امور کی تفصیلات بھی بیان فرما دی ہیں!

۱۲۶۷ - ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جتنے انبیاء ہیں سب باپ شریک بھائیوں

دلمیں ہر حقیقت کو مجاز بنا بنا کر اس پیشینگوئی کو اپنے نفس پر صادق کرنیکا جذبہ ہو تو اسکا علاج کس کے پاس ہے ہاں جو شخص کسی ہوائے نفسانی کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان بصیرت افروز ارشادات کی بیجا تاویلات پر یقین لانیکو ترجیح دے وہ اپنا ٹھکانا خود سوچ لے ومن لم یجعل اللہ لہ نورا فما لہ من نور۔

۱۲۶۷ - اس حدیث پر پہلی نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں اسی مسیح (اسرائیلی علیہ الصلوۃ والسلام) کا تذکرہ ہے

أُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَأَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى بْنِ مَرْيَمَ لِأَنَّهُ لَمْ يَكُنْ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ وَإِنَّهُ نَازِلٌ فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَاعْرِفُوهُ فَإِنَّهُ رَجُلٌ مَرْبُوعٌ إِلَى الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ سَبْطٌ كَأَنَّ رَأْسَهُ يَقْطُرُ وَإِنْ لَمْ يُصِبْهُ بَلَلٌ بَيْنَ مُمَصَّرَتَيْنِ فَيَكْسِرُ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيُعَطِّلُ الْمِلَلَ حَتّٰى يُهْلِكَ اللّٰهُ فِي زَمَانِهِ الْمِلَلَ كُلَّهَا غَيْرَ الْإِسْلَامِ وَيُهْلِكُ اللّٰهُ فِي زَمَانِهِ الْمَسِيحَ الدَّجَّالَ الْكَذَّابَ وَتَقَعُ الْأَمَنَةُ فِي الْأَرْضِ حَتّٰى تَرْتَعَ الْإِبِلُ مَعَ الْأُسْدِ جَمِيعًا وَالنُّمُورُ مَعَ الْبَقَرِ وَالذِّئَابُ مَعَ الْغَنَمِ وَيَلْعَبُ الصِّبْيَانُ وَالْغِلْمَانُ بِالْحَيَّاتِ لَا يَضُرُّ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فَيَمْكُثُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَمْكُثَ ثُمَّ يُتَوَفّٰى فَيُصَلِّي عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ وَيَدْفِنُونَهُ۔ مسند احمد ج ۲

کی طرح ہیں والد ایک اور مائیں علیحدہ علیحدہ ہوں عیسٰی علیہ السلام سے سب سے زیادہ نزدیک میں ہوں میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں دیکھو وہ ضرور اتریںگے اور جب تم انکو دیکھو تو فوراً پہچان لینا کیونکہ انکا قد میانہ ہوگا رنگ سرخ وسفید، کنگھی کئے ہوئے سیدھے سیدھے بال یوں معلوم ہوگا کہ سر سے پانی ٹپکنے والا ہے اگرچہ اس پر کہیں تری کا نام نہ ہوگا، دو گیروے رنگ کی چادریں اوڑھے ہونگے وہ اتر کر صلیب کو توڑ ڈالینگے سور کو قتل کرینگے جزیہ ختم کردینگے اور تمام مذاہب ان کے زمانہ میں ختم ہوکر صرف ایک مذہب اسلام باقی رہجائیگا اور ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ جھوٹے مسیح دجال کو ہلاک کریگا، اور زمین پر امن وامان کا وہ نقشہ قائم ہوگا کہ اونٹ شیروں کے ساتھ اور چیتے بیلوں کے ساتھ اور بھیڑیئے بکریوں کے ساتھ چرینگے اور لڑکے بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے اور ایک دوسرے کو ذرا کوئی تکلیف نہ دیگا اسی حالت پر جب تک اللہ تعالےٰ کو منظور ہوگا وہ رہینگے پھر انکی وفات ہوگی اور مسلمان ان پر نماز جنازہ ادا کرینگے اور انکو دفن کردینگے۔ (مسند احمد)

جو ایک بار حیثیت نبوت کے پہلے آچکے ہیں اور وہی اس امت پر ایک بڑی مصیبت کے وقت دوبارہ پھر تشریف لانیوالے ہیں کیونکہ زمانہ کے لحاظ سے آپ سے وہی اتنے قریب ہیں کہ انکے اور آپ کے درمیان کوئی نبی نہیں اسلئے بھی اس مصیبت کے وقت آپ کی امت کی ہمدردی کا فرض سب سے پہلے ان ہی پر عائد ہوتا ہے نیز آپ نے اسکی مزید توضیح کے لئے انکا دہی نام و نسب انکی اسی ملکی نظافت وطہارت اور ان کے اسی حلیہ مبارک کا تذکرہ فرمایا ہے جسکے بعد کسی مجنون کے لئے بھی اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی پھر آپ نے صرف انکے ماضی سوانح کے بیان پر ہی کفایت نہیں فرمائی بلکہ ان کے مستقبل کے ایسے کارنامے اور ایسی روشن برکات کا بھی تذکرہ فرمادیا ہے جسکے بعد انکی شناخت میں کوئی ادنیٰ تردد نہیں ہوسکتا اب اگر آپ کے فرمودہ پر ایمان لانا ہو تو وہ واضح سے واضح انداز میں یہ آپکے سامنے موجود ہیں اور اگر اپنے خیالات پر ایمان لانا ہے تو یہود اس سے پہلے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں یہی راستہ اختیار کرچکے ہیں۔ کتب سماویہ صاف سے صاف انداز میں آپ کے نام ونسب، آپکی شکل وشمائل اور آپکے کارناموں کو کھول کھول کر بیان کرتی رہیں اور یہ بدنصیب ان سب کی تاویلیں کرکرکے آپ کا انکار کرتے رہے فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ فلعنۃ اللہ علی الکافرین +

البلد الذی ینزل فیہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام وموضع النزول منہ بعینہٖ وھیئۃ عند نزولہ والبرکۃ العامۃ فی الاشیاء فی عھدہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

١٢٦٨ - عن النواس بن سمعان قال ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الدجال ذات غداۃ فخفض فیہ ورفع حتی ظنناہ فی طائفۃ النخل فلما رحنا الیہ عرف ذالک فینا فقال ما شانکم قلنا یا رسول اللہ ذکرت الدجال غداۃ فخفضت فیہ ورفعت حتی ظنناہ فی طائفۃ النخل فقال غیر الدجال أخوفنی علیکم إن یخرج وانا فیکم فانا حجیجہ دونکم وان یخرج ولست فیکم فامرؤ حجیج نفسہ واللہ خلیفتی علی کل مسلم. انہ شاب قطط عینہ طافئۃ کانی أشبھہ بعبد العزی بن قطن فمن أدرک منکم فلیقرأ علیہ فواتح سورۃ الکھف. انہ خارج خلۃ بین الشام والعراق فعاث یمینا وعاث شمالا یا عباد اللہ فاثبتوا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شہر کا نام اور اُس شہر میں خاص محل نزول کا نام اور نزول کے وقت اُن کا مکمل نقشہ اور انکے زمانہ کی برکات

١٢٦٨ - نواس بن سمعان روایت کرتے ہیں کہ ایکدن صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی اہمیت سے دجال کا تذکرہ فرمایا کہ مارے دہشت کے ہم کو یوں معلوم ہونے لگا گویا وہ یہیں کسی باغ میں موجود ہے جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ہمارے اس دہشت وخوف کو محسوس کرلیا اور پوچھا تم ایسے پریشان کیوں نظر آتے ہو ہمنے عرض کی یارسول اللہ صلعم آپ نے صبح دجال کا ذکر اتنی اہمیت کے ساتھ فرمایا کہ ہمکو یوں معلوم ہونے لگا گویا وہ یہیں کسی باغ میں ہے آپ نے فرمایا مجھکو تم پر دجال سے بڑھکر دوسری باتوں کا زیادہ اندیشہ ہے دجال کا کیا ہے اگر وہ میری موجودگی میں نکلا تو تمہارے بجائے میں خود اس سے نمٹ لونگا اور تو ہر شخص خود اسکا مقابلہ کرے اور میں نے تم سب کو خدا کے سپرد کیا۔ دیکھو وہ جوان ہوگا اس کے بال

١٢٦٨ - اس حدیث میں دجال کا تذکرہ قدرے محل غور ہے اسکے مباحث اپنے محل میں آئینگے ان میں سے صرف ایک بات کی تشریح یہاں کرنی مناسب ہے، حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کے زمانہ میں ایک دن ایک سال کی برابر ہوگا حتی کہ اس ایک دن میں ایک سال کی نمازیں ادا کرنی ہونگی۔ دن کی اس طوالت کی صورت کیا ہوگی؟ اسکا حدیث میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جب دنیا میں ان عجائبات کے ظہور کا زمانہ شروع ہوجائیگا تو عالم کے موجودہ نظم ونسق کے تحت ان واقعات کے حل کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی بھی صفت کی دوسری ہے تاہم حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسالہ علامات قیامت میں شیخ محی الدین ابن عربی سے نقل کیا ہے

قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا لَبْثُهٗ فِي الْاَرْضِ قَالَ اَرْبَعُوْنَ يَوْمًا يَوْمٌ كَسَنَةٍ وَيَوْمٌ كَشَهْرٍ وَيَوْمٌ كَجُمُعَةٍ وَسَائِرُ اَيَّامِهٖ كَاَيَّامِكُمْ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَسَنَةٍ اَتَكْفِيْنَا فِيْهِ صَلٰوةُ يَوْمٍ قَالَ لَا اُقْدُرُوْا لَهٗ قَدْرَهٗ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا اِسْرَاعُهٗ فِي الْاَرْضِ قَالَ كَالْغَيْثِ اسْتَدْبَرَتْهُ الرِّيْحُ فَيَاْتِيْ عَلَى الْقَوْمِ فَيَدْعُوْهُمْ فَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَجِيْبُوْنَ لَهٗ فَيَاْمُرُ السَّمَاءَ فَتُمْطِرُ وَالْاَرْضَ فَتُنْبِتُ فَتَرُوْحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَتُهُمْ اَطْوَلَ مَا كَانَتْ ذُرًى وَاَسْبَغَهٗ

سخت گھونگر والے اور اسکی آنکھ انگور کی طرح باہر کو ابھری ہوئی ہوگی بالکل اس شباہت کا شخص جیسا یہ عبدالعزی بن قطن ہے تو تم میں جو شخص بھی اسکا زمانہ پائے اسکو چاہیے کہ وہ سورہ کہف کی اول کی آیتیں پڑھ لے۔ وہ شام اور عراق کی درمیانی گھاٹیوں سے ظاہر ہوگا اور اپنے داہنے بائیں ہر سمت بڑا اُدھم مچائیگا تو اے اللہ کے بندو! دیکھو اسوقت ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! صلعم وہ کتنے عرصہ تک زمین پر رہیگا فرمایا چالیس دن لیکن پہلا دن ایک سال کی برابر ہوگا اور پھر دوسرا ایکماہ اور تیسرا ایک جمعہ کی برابر ہوگا اسکے بعد بقیہ دن تمہارے عام دنوں کے برابر ہونگے ہمنے پوچھا جو دن ایک سال کے برابر ہوگا کیا اسدن میں ہمکو ایک ہی دن کی نمازیں ادا کرنی کافی ہوگی فرمایا نہیں بلکہ ایکدن کی برابر نمازوں کا اندازہ کر کر کے نمازیں ادا کرتے رہنا۔ ہمنے پوچھا وہ کس رفتار سے زمین پر گھومیگا فرمایا اس تیز رفتار بادل کی طرح جسکو پیچھے سے ہوا اڑائے لا رہی ہو وہ کچھ لوگوں کے پاس آکر انکو اپنی خدائی پر ایمان لانے کی دعوت دیگا وہ اس پر ایمان لے آئینگے وہ خوش ہوکر آسمان کو بارش کا حکم دیگا فوراً بارش آجائیگی اور زمین کو حکم دیگا اسی وقت وہ سبزہ زار ہوجائیگی اور شام کو جب ان کے حیوانات چراگاہوں سے چر کر

کہ مصائب و آلام کے ان ہنگاموں میں اگر عام گرد و غبار اور غلیظ ابر کی وجہ سے رات و دن متمیز نہوں سکیں تو کچھ بعید نہیں ہے آج بھی معمولی بارشوں میں عصر و مغرب، و عشاء کی نمازوں میں تقدیم و تاخیر ہوجانا معمولی بات ہے ذرا زیادہ گرہن لگ جائے تو ظہر کا پتہ ملنا بھی مشکل ہے صبح کی نماز کا تو کہنا ہی کیا ہے پس بہت ممکن ہے کہ اس سبب سے بڑے فتنے کے ظہور کے وقت جسطرح روحانیت کا عالم تاریک و تار ہوگا اسی طرح عالم عنصریات بھی گرد و غبار اور ابر و باراں کی وجہ سے اتنا مکدر اور تاریک ہوجائے کہ صحیح طور پر یہ اندازہ ہی ممکن نہ رہے کہ رات کب ختم ہوئی اور دن کب آیا اور تھوڑے بہت فرق کے ساتھ فضاء عالم یکساں نظر آنے لگے ان حالات میں اسکے سوا، اور کیا صورت ہوگی کہ اوقات نماز کا صرف ایک اندازہ رکھا جائے۔ رہا گھڑیوں کا سوال تو گو گھڑیاں موجود ہیں مگر سب جانتے ہیں کہ خاصکر عرب میں نمازوں کا تعلق اب بھی آفتاب کے طلوع و غروب ہی کے ساتھ ہے یعنی غروب آفتاب پر یہاں سب گھڑیوں میں ۱۲ بجا دیئے جاتے ہیں اس وجہ سے تمام سال میں یہاں مغرب و عشاء کا وقت کبھی نہیں بدلتا یعنی مغرب ہمیشہ بارہ بجے اور اسکے بعد عشا ہمیشہ ڈیڑھ بجے کے قریب ہوتی ہے اور اس لئے روزمرہ غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ گھڑی کو بھی موسموں کے لحاظ سے آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے شہروں میں تاریخ کی تبدیلی نصف شب کے بعد ہوتی ہے۔ یہاں ہمیں اس پر گفتگو کرنی نہیں ہے کہ ان دونوں نظاموں میں کونسا نظام معقول ہے

ضُرُوعًا وَاَمَدَّهٗ خَوَاصِرَ ثُمَّ يَاْتِي الْقَوْمَ فَيَدْعُوْهُمْ فَيَرُدُّوْنَ عَلَيْهِ قَوْلَهٗ فَيَنْصَرِفُ عَنْهُمْ فَيُصْبِحُوْنَ مُمْحِلِيْنَ لَيْسَ بِاَيْدِيْهِمْ مِنْ شَيْئٍ مِنْ اَمْوَالِهِمْ وَيَمُرُّ بِالْخَرِبَةِ فَيَقُوْلُ لَهَا اَخْرِجِيْ كُنُوْزَكِ فَتَتْبَعُهٗ كُنُوْزُهَا كَيَعَاسِيْبِ النَّحْلِ ثُمَّ يَدْعُوْ رَجُلًا مُمْتَلِئًا شَبَابًا فَيَضْرِبُهٗ بِالسَّيْفِ فَيَقْطَعُهٗ جَزْلَتَيْنِ رَمْيَةَ الْغَرَضِ ثُمَّ يَدْعُوْهُ فَيُقْبِلُ وَيَتَهَلَّلُ وَجْهُهٗ وَ يَضْحَكُ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ اِذْ بَعَثَ اللّٰهُ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ فَيَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيَّ

واپس ہونگے تو ان کے اونٹوں کے کوہان پہلے سے زیادہ لمبے لمبے ان کے تھن پہلے سے زیادہ دودھ سے لبریز اور انکی کوکھیں پہلے سے زیادہ تنی ہوئی ہونگی اس کے بعد وہ کچھ اور لوگوں کے پاس جائیگا اور انکو بھی اپنی خدائی کی دعوت دیگا مگر وہ اسکو نہ مانیں گے جب وہ ان کے پاس سے واپس ہوگا تو یہ بیچارے سب قحط میں مبتلا ہو جائینگے اور انکے قبضہ میں کوئی مال نہ رہیگا سب دجال کے ساتھ چلا جائیگا پھر وہ ایک شور زمین سے گذریگا اور اسکو یہ حکم دیگا "اپنے تمام خزانے باہر اُگل دے"۔ وہ سب کے سب اس کے پیچھے پیچھے اسطرح ہو لینگے جیسے مکھیوں کے سردار کے پیچھے پیچھے سب مکھیاں ہوتی ہیں اسکے بعد ایک شخص کو بلائیگا جو اپنے پورے شباب پر ہوگا اور تلوار سے اسکے دو ٹکڑے کرکے اتنی دور پھینکدیگا جتنا تیر انداز اور اسکے نشانہ لگانیکی جگہ کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے پھر اُس کو آواز دے کر بلائیگا وہ ہنستا کھلکھلاتا چلا جائیگا ادھر وہ یہ شعبدہ بازیاں دکھلا رہا ہوگا ادھر اللہ تعالٰے عیسیٰ بن مریم کو بھیجیگا وہ دمشق کے مشرقی سفید منارہ پر اترینگے اور دو زرد زعفرانی رنگ کی چادریں اوڑھے ہوئے دو فرشتوں کے بازوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے ہونگے سر جھکائیں گے تو پانی کے قطرے ٹپکتے معلوم ہونگے

بہتر ہے کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ موجودہ عقول کے سامنے مادی ہر شکل مشکل ہے لیکن اس کے مقابلہ میں صحیح صریح حدیثوں کا انکار یا تاویل کوئی مشکل نہیں اس لئے دماغوں میں یہ سوال گذر سکتا ہے کہ گھڑیوں کے بعد نمازوں کے اوقات میں اب کوئی مشکل نہیں ہو سکتی[1]۔

اس کے علاوہ حدیث مذکور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی بھی کچھ تفصیلات مذکور ہیں انکو آپ خالی الذہن ہوکر بار بار پڑھیں پھر یہ سوچیں کہ عربی زبان کے مطابق کیا ان تفصیلات میں کسی مجاز و استعارہ کا ارادہ کیا گیا ہے ہمکو مجاز و استعارہ سے انکار نہیں مگر آپ کو بھی حقیقت سے انکار نہونا چاہئے اگر سیاق کلام سے یہ واضح ہو رہا ہو کہ یہاں متکلم نے

[1] اس تفصیل میں اسوقت ہم جانا پسند نہیں کرتے کہ جس زمانے میں ان مصنوعات کا تصور بھی دماغوں میں موجود نہو اسمیں ایک اُمی قوم کے سامنے ان جدید آلات کا تذکرہ کرنا ایک سیدھی بات کے سمجھنے میں کتنی مشکلات کا باعث بن سکتا تھا غالبًا اسی مصلحت سے یاجوج ماجوج کے خاص آلات حرب کے نام بھی تذکرہ میں نہ آئے ہوں پھر یہ کسکو خبر ہے کہ ایٹمی طاقتوں کے استعمال کے نتیجہ میں آئندہ قوانین جنگ میں آلات حرب کی اجازت کس حد تک رہجائیگی۔ بہرحال جب تک مستقبل حوادث کے متعلق یہ تفصیلات حدیث میں نہیں آئیں تو صرف اپنے ذہنی سوال و جواب سے ان ثابت شدہ تفصیلات کا انکار کرنا کسی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا جو صحیح طریقوں سے صرف بیان میں آچکی ہیں ۱۲ +

دَمِشْقَ بَيْنَ مَهْرُوذَتَيْنِ وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلَى اَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ اِذَا طَاْطَاَ رَاْسَهُ قَطَرَ وَاِذَا رَفَعَ تَحَدَّرَ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّؤْلُؤِ فَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ رِيْحَ نَفَسِهِ اِلَّا مَاتَ وَنَفَسُهُ يَنْتَهِيْ اِلَى حَيْثُ يَنْتَهِيْ طَرْفُهُ فَيَطْلُبُهُ حَتّٰى يُدْرِكَهُ بِبَابِ لُدٍّ فَيَقْتُلُهُ ثُمَّ يَاْتِيْ عِيْسٰى قَوْمًا قَدْ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ فَيَمْسَحُ عَنْ وُجُوْهِهِمْ وَيُحَدِّثُهُمْ بِدَرَجَاتِهِمْ فِي الْجَنَّةِ فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ اِذْ اَوْحَى اللّٰهُ اِلٰى عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ اِنِّيْ قَدْ اَخْرَجْتُ عِبَادًا لِّيْ لَا يَدَانِ لِاَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ فَحَرِّزْ عِبَادِيْ اِلَى الطُّوْرِ وَيَبْعَثُ اللّٰهُ يَاْجُوْجَ مَاْجُوْجَ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ فَيَمُرُّ اَوَائِلُهُمْ عَلٰى بُحَيْرَةِ طَبَرِيَّةَ فَيَشْرَبُوْنَ مَا فِيْهَا وَيَمُرُّ اٰخِرُهُمْ فَيَقُوْلُوْنَ لَقَدْ كَانَ بِهٰذِهٖ مَرَّةً مَّاءٌ وَيَحْصُرُ

اور جب سر اٹھائینگے تو بالوں میں چاندی کے سے موتی گرتے محسوس ہونگے جس کافر کو ان کے سانس لگ جائیں گے وہ زندہ نہ رہ سکے گا اور ان کے سانس کا اثر اتنے فاصلہ تک پڑیگا جہاں تک کہ انکی نظر جائیگی وہ دجال کا پیچھا کرینگے اور باب لد (بیت مقدس میں ایک مقام ہے) پر اسکو پکڑ لینگے اور یہاں اس کو قتل کر دینگے اسکے قتل سے فارغ ہو کر عیسی علیہ السلام پھر ان لوگوں کے پاس آئینگے جو اس کے فتنہ سے بچ رہے ہونگے اور انکو تسلی وتشفی دینگے اور جنت میں ان کے مراتب کا حال بیان فرمائینگے پھر عیسی علیہ السلام پر وحی آئیگی کہ اب میری ایک ایسی مخلوق نکلنے والی ہے جس کے مقابلہ کی کسی میں طاقت نہیں لہذا میرے بندوں کو کوہ طور کیطرف لیجاکر جمع کر دو۔ پھر یاجوج و ماجوج ہر پست زمین سے نکل پڑینگے پہلے انکا گذر طبریہ کے (مقام کا نام ہے) پانی پر ہوگا وہ اسکو پی کر اس طرح ختم کر دینگے کہ جب انکا آخری گروہ ادھر سے گذریگا تو یوں کہیگا "کبھی یہاں پانی تھا" پھر بیت مقدس کے خمس پہاڑ پر پہونچینگے اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں کہینگے ہم زمین والوں کو تو ختم کر چکے لو آؤ اب آسمان والونکا بھی کام تمام

یقیناً استعارہ ومجاز سے کام نہیں لیا تو پھر بے وجہ کھینچ کھینچ کر ایک حقیقت کو استعارہ ومجاز کا لباس پہنانا لاحاصل ہے
ابھی آپ حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت پڑھ چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان پر اٹھائے گئے تھے تو اسوقت ان کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے یہ کرشمہ قدرت ہے کہ جب وہ نازل ہونگے تو اس وقت بھی یونہی نظر آئیگا کہ ان کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے ہیں گویا وہ غسل کر کے ایک دروازہ سے نکلے تھے اور پانی خشک ہونے سے پہلے اب دوسرے دروازہ سے داخل ہو رہے ہیں جس عالم میں نہ دن ہو نہ رات نہ سردی ہو نہ گرمی اور نہ صحت ہو نہ مرض پھر اس عالم میں اگر پانی کے یہ قطرے بھی کسی تغیر سے محفوظ رہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔
پھر جس خدا تعالیٰ میں یہ قدرت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کو پرندوں کی زندگی کا سبب بنا دے اسمیں یہ طاقت کیوں نہیں کہ اسی سانس کو وہ دجال کے حق میں سم قاتل قرار دیدے۔ اسی طرح یہ بھی اسکی حکمت ہے کہ دجال جیسی قوت کو وہ ان کے صرف ایک اشارہ سے ہلاک کر دے اور دوسری طرف یاجوج و ماجوج کے مقابلہ سے عاجز بنا کر طور کی گوشہ نشینی پر مجبور کر دے تاکہ ایک طرف دنیا کو یہ واضح ہو جائے جسپر دعوی الوہیت کی تہمت لگائی گئی تھی وہ تو بھی

نبی اللہ عیسیٰ علیہ السلام واصحابہ حتی یکون رأس الثور لاحدھم خیرا من مائۃ دینار لاحدکم الیوم فیرغب نبی اللہ عیسیٰ علیہ السلام واصحابہ فیرسل علیھم النغف فی رقابھم فیصبحون فرسی کموت نفس واحدۃ ثم یھبط نبی اللہ عیسیٰ علیہ السلام واصحابہ الی الارض فلا یجدون فی الارض موضع شبر الا ملأہ زھمھم ونتنھم فیرغب نبی اللہ عیسیٰ علیہ السلام واصحابہ الی اللہ فیرسل اللہ طیرا کاعناق البخت فتحملھم فتطرحھم حیث شاء اللہ ثم یرسل اللہ مطرا لا یکن منہ بیت مدر ولا وبر فیغسل الارض حتی یترکھا کالزلفۃ ثم یقال

کردیں اور اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکینگے قدرت اُن کے تیروں کو خون آلود کرکے واپس کردیگی ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی جماعت کوہ طور میں محصور رہوگی یہاں تک کہ بیل کا ایک سر اتنا قیمتی ہوجائیگا جیسا آج تمہارے نزدیک سو دینار ہیں اس تنگی کی حالت میں عیسیٰ علیہ السلام اور انکی جماعت ملکر اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوگی ان کی دعا سے ان کی گردنوں میں پھوڑے نکل آئینگے اور وہ سب کے سب ایکدم میں اسطرح پھول پھٹ کر مرجائینگے جیسا ایک آدمی مرتا ہے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے اُتر کر آئینگے تو زمین پر کہیں بالشت بھر جگہ نہوگی جہاں ان کے سڑے ہوئے گوشت کی بدبو اور چربی کا اثر نہو۔ عیسیٰ علیہ السلام اور انکی جماعت پھر اللہ تعالےٰ کے سامنے آہ و زاری کریگی۔ اس پر اللہ تعالیٰ ایک قسم کا پرندہ بھیجیگا جنکی گردنیں بختی اونٹوں کی طرح لمبی لمبی ہونگی وہ انکو اٹھا اٹھا کر جہاں اللہ تعالےٰ کو منظور ہوگا ڈالدینگے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ مقام نہبل میں پھینکدینگے پھر مسلمان انکے تیر و کمان اور ترکشوں سے سات سال تک آگ جلاتے رہینگے اور آسمان سے اس زور کی بارش برسیگی کہ کوئی بستی نہ رہیگی اور جنگل میں کوئی خیمہ نہ بچیگا جسمیں بارش نہو یہانتک کہ تمام زمین پانی کی نالیوں کی طرح پانی ہی پانی ہوگا پھر زمین کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا کہ اپنے پھل اور اپنی سب برکت ظاہر کردے تو وہ برکت ظاہر ہوگی کہ ایک انار سے

الوہیت کا قائل ہے اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہوجائے کہ جسنے ایک مدعی الوہیت کو قتل کیا ہے وہ خود خدا نہیں بلکہ وہ تو ایک بیچارہ بشر ہی او۔ اسطرح طاقت و ضعف کے ان دونوں مظاہروں میں اصل خدائے قہار ہی کی طاقت کا جلوہ نظر آئے

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر و طغیان کی طاقتوں کو قدرت نے پہلے ہی قدم پر سزا نہیں دیدی ہے بلکہ استدراج و امہال کا قانون برابر ان کے ساتھ جاری رہا ہے فرعون و نمرود شداد و ہامان کی داستانیں پڑھو تو تمکو ثابت ہوگا کہ جب کفر و طغیان اپنی پوری طاقت کو پہونچ چکا ہے تو اسکے بعد پاداش عمل کے قانون نے انکو پکڑا ہے پھر وہی سنت یہاں یاجوج ماجوج کیساتھ بھی جاری ہوگی جب وہ آسمان والونکے قتل سے مطمئن ہو جائینگے تو پھر ایسے ہی طریقے سے ان کو ہلاک کیا جائیگا جو آسمان والے کیطرف سے ہوگا تاکہ عالم علوی کی شکست کا جواب سب غلط ہو کر رہجائے۔

پھر دنیا کے خاتمہ پر وہی ایک دین رہجائیگا جو حضرت آدم علیہ السلام کے دور۔۔۔ شروع ہوا تھا اور آسمان و زمین کی

لِلْاَرْضِ اَنْبِتِي ثَمَرَتَكِ وَرُدِّي بَرَكَتَكِ فَيَوْمَئِذٍ تَاْكُلُ الْعِصَابَةُ مِنَ الرُّمَّانَةِ وَيَسْتَظِلُّوْنَ بِقِحْفِهَا وَيُبَارَكُ فِي الرِّسْلِ حَتّٰى اَنَّ اللِّقْحَةَ مِنَ الْغَنَمِ لَتَكْفِي الْفَخِذَ مِنَ النَّاسِ فَبَيْنَمَا هُمْ كَذٰلِكَ اِذْ بَعَثَ اللّٰهُ رِيْحًا طَيِّبَةً فَتَاْخُذُهُمْ تَحْتَ اٰبَاطِهِمْ فَتَقْبِضُ رُوْحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَكُلِّ مُسْلِمٍ وَيَبْقٰى شِرَارُ النَّاسِ يَتَهَارَجُوْنَ فِيْهَا تَهَارُجَ الْحُمُرِ فَعَلَيْهِمْ تَقُوْمُ السَّاعَةُ۔ رواہ مسلم صفحہ ۴۰۲ ج ۲ - وابوداؤد صفحہ ۲۳۸ ج ۲ ولفظہ ثم ینزل عیسی بن مریم عند المنارۃ البیضاء شرقی دمشق الحدیث والترمذی ص ۴۷ ج ۲ وعزاہ فی الکنز ص ۲۶۸ ج ۷ لابن عساکر وفی لفظہ اھبط عیسی ابن مریم احمد فی مسندہ صفحہ ۱۸۱ و ص ۱۸۲ ج ۱۔

ایک جماعت کا پیٹ بھر جائیگا اور اسکا چھلکا ان کے سایہ کے لئے کافی ہوگا اور اونٹنی کے ایک مرتبہ کے دودھ میں اتنی برکت ہوگی کہ ایک دودھ والی اونٹنی کئی کئی جماعتوں کے لئے کافی ہوگی اور ایک دودھ کی گائے ایک قبیلہ کو اور ایک دودھ کی بکری ایک چھوٹے خاندان کو کافی ہوگی مخلوق خدا اسی فراغت وعیش کی حالت میں ہوگی کہ ایک اچھی ہوا چلیگی اور اس سے مسلمانوں کی بغلوں میں پھوڑے نکل آوینگے اور ان سب کو موت آجائے گی اور صرف بدترین قسم کے کافر بچ رہینگے جو گدھوں کی طرح منظر عام پر زنا کرتے پھرینگے ان ہی پر قیامت قائم ہوگی۔ (مسلم شریف)

اس روایت میں جو حصہ مقام نہبل کے بعد سے سات سال تک تیر وکمان چلانے کا ہے وہ امام ترمذیؒ کا روایت کردہ ہے۔

وہی برکتیں ظاہر ہونگی جو ان کے دور میں ظاہر ہو چکی ہیں اور اسطرح سے اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ کا دوسرا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے کن حکمتوں سے عالم کو بچھایا، کن حکمتوں سے اس کو پھیلایا، پھر کن حکمتوں سے اس کو سمیٹے گا یہ خود ہی جانتا ہے۔ ہم بے وجہ ہر جگہ ان کے سمجھنے کے لئے اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں ؎

دریا بمحیط خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش بادیست

ذِكرُ عيسىٰ عليه الصلوٰة والسلام في محاورته مع النبي صلى الله عليه وسلم ليلة المعراج انه نازل قبل قيام الساعة وانه قاتل الدجال ولم يذكر فيه انه ينزل لاصلاح هذه الامة صبيحاً وانما يكون هذا من وظائف امامها

۱۲۶۹۔ عَنِ ابنِ مَسعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَقِيتُ لَيلَةَ اُسرِيَ بِي اِبرَاهِيمَ وَمُوسىٰ وَعِيسىٰ قَالَ فَتَذَاكَرُوا اَمرَ السَّاعَةِ فَرَدُّوا اَمرَهُم اِلىٰ اِبرَاهِيمَ فَقَالَ لَا عِلمَ لِي بِهَا فَرَدُّوا الاَمرَ اِلىٰ مُوسىٰ فَقَالَ لَا عِلمَ لِي بِهَا فَرَدُّوا الاَمرَ اِلىٰ عِيسىٰ. فَقَالَ اَمَّا وَجبَتُهَا فَلَا يَعلَمُ بِهَا اَحَدٌ اِلَّا اللّٰهُ تَعَالىٰ. ذَالِكَ وَفِيمَا عَهِدَ اِلَيَّ رَبِّي عَزَّ وَجَلَّ اَنَّ الدَّجَّالَ خَارِجٌ قَالَ وَمَعِيَ قَضِيبَانِ فَاِذَا رَآنِي ذَابَ كَمَا يَذُوبُ الرَّصَاصُ قَالَ فَيُهلِكُهُمُ اللّٰهُ تَعَالىٰ حَتّىٰ اَنَّ الحَجَرَ وَالشَّجَرَ لَيَقُولُ يَا

شب معراج میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تذکرہ کرنا کہ قیامت کی آمد کا صحیح وقت انکو بھی معلوم نہیں مگر صرف یہ معلوم ہے کہ اس سے پہلے انکو دجال کو قتل کرنا ہے اس ضمن میں انھوں نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح کا ایک حرف بھی ذکر نہیں فرمایا کیونکہ یہ خدمت دراصل خود اس امت ہی کے ایک شخص کے متعلق ہوگی اسکے بعد پھر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منتقل ہو جائے گی!

۱۲۶۹۔ ابن مسعودؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے شب معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ و موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی انھوں نے باہم قیامت کا ذکر چھیڑا آخر فیصلہ کے لئے انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے معاملہ پیش کیا انھوں نے فرمایا مجھکو تو صحیح وقت کی کچھ معلومات نہیں پھر معاملہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آیا انھوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار فرمایا جب عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے معاملہ آیا تو انھوں نے فرمایا قیامت کے آنیکا ٹھیک وقت تو بجز ایک ذات اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو بھی نہیں ہے ہاں صرف اتنی بات میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے

۱۲۶۹۔ دیکھئے یہاں جب قیامت کا تذکرہ آیا اور جواب کی نوبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آئی تو انھوں نے اپنی لاعلمی کے ساتھ ساتھ فوراً اسی بات کا تذکرہ فرمایا جو قیامت کے ساتھ یقین کے اسی درجہ میں ہے۔ یعنی انکا پھر تشریف لانا اور دجال کو قتل کرنا۔ احادیث میں کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انکے تشریف لانیکا اصل مقصد اس امت کی اصلاح ہوگی تاکہ یہ سوال پیدا ہو کہ اس امت کی اصلاح کے لئے اسرائیلی رسول کی آمد میں اس امت کی کسرشان ہے۔ حالانکہ یہ سوال بھی جاہلانہ سوال ہے ہم آج بھی خدا تعالیٰ کے سب رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے لئے نہ صرف یہ کہ یہ موجب شرف

مُسْلِمُ اِنَّ تَحْتِیْ كَافِرًا فَتَعَالَ فَاقْتُلْهُ قَالَ فَيُهْلِكُهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى ثُمَّ يَرْجِعُ النَّاسُ اِلٰى بِلَادِهِمْ
وَاَوْطَانِهِمْ قَالَ فَعِنْدَ ذٰلِكَ يَخْرُجُ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ فَيَطَئُوْنَ بِلَادَهُمْ
لَا يَاْتُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ اِلَّا اَهْلَكُوْهُ وَلَا يَمُرُّوْنَ عَلٰى مَاءٍ اِلَّا شَرِبُوْهُ ثُمَّ يَرْجِعُ النَّاسُ اِلَيَّ فَيَشْكُوْنَهُمْ فَاَدْعُوْ
عَلَيْهِمْ فَيُهْلِكُهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَيُمِيْتُهُمْ حَتّٰى تَجْوَى الْاَرْضُ مِنْ نَتْنِ رِيْحِهِمْ قَالَ فَيُنْزِلُ اللّٰهُ عَزَّ وَ
جَلَّ الْمَطَرَ فَيَجْرُفُ اَجْسَادَهُمْ حَتّٰى يَقْذِفَهُمْ فِي الْبَحْرِ قَالَ اَبِيْ ذَهَبَ عَلَيَّ هٰهُنَا شَيْءٌ لَمْ اَفْهَمْهُ كَالْاَدِيْمِ
وَقَالَ يَزِيْدُ يَعْنِي ابْنَ هَارُوْنَ ثُمَّ تُنْسَفُ الْجِبَالُ وَتُمَدُّ الْاَرْضُ مَدَّ الْاَدِيْمِ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰى حَدِيْثِ
هُشَيْمٍ. قَالَ فَفِيْمَا عَهِدَ اِلَيَّ رَبِّيْ عَزَّ وَجَلَّ اَنَّ ذٰلِكَ اِذَا كَانَ كَذٰلِكَ فَاِنَّ السَّاعَةَ كَالْحَامِلِ
الْمُتِمِّ الَّتِيْ لَا يَدْرِيْ اَهْلُهَا مَتٰى تَفْجَؤُهُمْ بِوِلَادِهَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا رواه احمد فی مسنده
ص۳۷۵ ج۱ وَالحاكم فی المستدرك وقال صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه ووافقه الذهبی
على ذالك فی التلخيص واقره الحافظ فی الفتح من نزول عيسى عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاخرجه ابن ماجه
وابن ابی شيبه وابن جرير وابن المنذر وابن مردويه والبيهقی كذا فی الدر المنثور ج۴ ص۳۳۶

یہ فرمایا ہے کہ دجال نکلیگا اور میرے ساتھ دو شاخیں ہوں گی اور جب اسکی نظر مجھپر پڑیگی تو وہ اسطرح پگھل جائیگا
جیسا سیسہ (آگ میں) پگھل جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اسکو ہلاک کردیگا پھر یہ نوبت آجائیگی کہ درخت و پتھر آوازیں
دے دیکر کہینگے او مسلمان! دیکھ یہ میرے پیچھے کافر چھپا ہوا ہے لپک کر آ اور اسکو بھی قتل کر آخر کافر سب ہلاک
ہو جائینگے پھر لوگ اپنے اپنے شہر اور وطن کو واپس ہونگے تو اسوقت یاجوج و ماجوج کی قوم کا حملہ ہوگا اور وہ ہر پست
زمین سے نکل نکلکر بکھر پڑینگے بستیوں میں گھس پڑینگے جس جس چیز پر بھی انکا گذر ہوگا اسکو برباد کر ڈالینگے اور جس پانی پر سے گذرینگے وہ
سب پیکر ختم کر دینگے آخر لوگ شکایت لیکر میرے پاس آئینگے میں انپر بد دعا کرونگا اللہ تعالیٰ میری بد دعا سے ان سبکو ہلاک کردیگا اور
وہ سب مرجائینگے تمام زمین انکی بدبو سے سڑ جائیگی پھر اللہ تعالیٰ بارش نازل فرمائیگا جو انکی نعشوں کو بہا کر سمندر میں ڈالدیگی
راوی کہتا ہے کہ اس مقام پر میرے والد نے کچھ فرمایا تھا وہ لفظ میری سمجھ میں نہ آیا صرف "کادیم" کا لفظ سننے میں آیا
یزید بن ہارون راوی کہتا ہے پوری بات یہی کہ پھر پہاڑ دُھن دئے جائینگے اور زمین جانور کے چمڑے کیطرح پھیلا کر سیدھی کردیجائیگی
اس کے بعد پھر اصل حدیث بیان فرمائی کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اور منجملہ ان باتوں کے جو اللہ تعالیٰ نے مجھسے فرمائی ہیں یہ ہے کہ
جب ایسا ہو تو پھر قیامت اتنی نزدیک سمجھنا چاہئے جیسا وہ گابھن جانور جسکے بچہ کی پیدائش کی مدت پوری ہوچکی ہو اور اسکے مالک ہر وقت اس
انتظار میں ہوں کہ دن رات میں نہ معلوم کب بچہ پیدا ہو جائے۔

ہے بلکہ مدار نجات ہے تو پھر اگر کوئی رسول آکر ہماری اصلاح کرتا ہے تو ہمارے لئے اسمیں کسر شان کی بات کیا ہے ہاں اگر کسی رسول کی آمد سے ہماری
گذشتہ امت پر زد پڑتی ہے اور وہ ہمکو دوسری امت بنانا چاہتا ہے تو اسمیں صرف ہماری کسر شان نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی کسر شان بھی ہے والعیاذ باللہ۔

مِنْ اَهَمِّ وَظَائِفِ عِیْسٰی عَلَیْہِ الصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ قَتْلُ الدَّجَّالِ

۱۲۷- عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ الْبَاھِلِیِّ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ مِنْ ذِکْرِ الدَّجَّالِ فَقَالَتْ اُمُّ شَرِیْکٍ بِنْتُ اَبِیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَاَیْنَ الْعَرَبُ یَوْمَئِذٍ قَالَ الْعَرَبُ یَوْمَئِذٍ قَلِیْلٌ وَجُلُّھُمْ بِبَیْتِ الْمُقَدَّسِ وَاِمَامُھُمْ رَجُلٌ صَالِحٌ فَبَیْنَمَا اِمَامُھُمْ قَدْ تَقَدَّمَ یُصَلِّیْ بِھِمُ الصُّبْحَ اِذْ نَزَلَ عَلَیْھِمْ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ الصُّبْحَ فَرَجَعَ ذَالِکَ الْاِمَامُ یَنْکُصُ یَمْشِیْ قَھْقَرٰی لِیَتَقَدَّمَ عِیْسٰی یُصَلِّیْ فَیَضَعُ عِیْسٰی یَدَہٗ بَیْنَ کَتِفَیْہِ ثُمَّ یَقُوْلُ لَہٗ تَقَدَّمْ فَصَلِّ فَاِنَّھَا لَکَ اُقِیْمَتْ فَیُصَلِّیْ بِھِمْ اِمَامُھُمْ فَاِذَا انْصَرَفَ قَالَ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ افْتَحُوا الْبَابَ فَیُفْتَحُ وَوَرَاءَہُ الدَّجَّالُ وَمَعَہٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ یَھُوْدِیٍّ کُلُّھُمْ ذُوْ سَیْفٍ مُحَلًّی وَتَاجٍ فَاِذَا نَظَرَ اِلَیْہِ الدَّجَّالُ ذَابَ کَمَا یَذُوْبُ الْمِلْحُ فِی الْمَاءِ وَیَنْطَلِقُ ھَارِبًا وَیَقُوْلُ عِیْسٰی اِنَّ لِیْ فِیْکَ ضَرْبَۃً لَنْ تَسْبِقَنِیْ

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی خدمات میں سب سے نمایاں تر خدمت دجال کو قتل کرنا ہے

۱۲۷- ابوامامہ باہلی دجال کی ایک طویل حدیث میں نقل کرتے ہیں کہ اُم شریک نے کہا یا رسول اللہ اُس دن (یعنی دجال کے زمانہ میں) عرب کہاں چلے جائیں گے (کہ مسلمانوں کا یہ ابتر حال ہوجائیگا) فرمایا اسوقت عرب بہت کم رہجائیں گے اور اکثر وہ بیت مقدس میں ہونگے اور اسوقت انکا امام ایک نیک شخص ہوگا۔ اس اثناء میں کہ یہ امام صبح کی نماز پڑھانے آگے بڑھ چکا ہوگا کہ دفعتاً عیسیٰ علیہ السلام اتر آئینگے یہ انکو دیکھکر مصلی سے پچھلے پیروں لوٹے ہٹ آئینگے تاکہ عیسیٰ علیہ السّلام کو نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھائیں تو عیسیٰ علیہ السلام شفقت کے انداز میں اسکے کاندھوں پر ہاتھ رکھکر فرمائینگے آگے بڑھو اور تم ہی نماز پڑھاؤ کیونکہ اس نماز کی اقامت تو تمہارے ہی نام سے کہی گئی ہے چنانچہ یہ نماز تو یہی امام پڑھائیں گے۔ نماز سے فراغت کے بعد عیسیٰ علیہ السّلام فرمائینگے دروازہ کھولو دروازہ کھولا جائیگا اُدہر دجال نکل چکا ہوگا اس کے ہمراہ ستر ہزار یہودی ہونگے ہر ایک کے پاس مزین تلوار اور

۱۲۷- سبحان اللہ! جس شخصیت عظمیٰ کی یہ برکات ہوں وہ یقیناً کوئی معمولی انسان نہیں ہوسکتا ضرور وہ کوئی خدا تعالیٰ کا قدرتی نبی ہونا چاہیے اور یقیناً وہ کوئی ایسا ہی رسول ہونا چاہیے جس کے سب سے بڑے دشمن یہود ٹھہر چکے ہوں اور جسکے چھوٹے قتل کے گھمنڈ میں ایکبار وہ ملعون ٹھہر چکے ہوں دوسری بار اسی کے ہاتھ سب موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں۔ انبیاء علیہم السلام سے عداوت اور بغاوت کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکل سکتا اس بد خصلت کی بدولت پہلے وہ نبوت سے محروم کردیئے گئے تھے اور آخر میں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیئے جائیں گے بے شک جو قوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رافت و رحمت والے رسول کے ساتھ بھی اپنا طریق کار نہ بدلے، ان کی وجہ سے دنیا کو پاک کرنے ہی میں انسانیت کی فلاح ہے ذٰلِکَ اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا شاید موجودہ زمانہ میں اطراف عالم سے سمٹ سمٹ کر انکا ایک جگہ

بِهَا فَيُدْرِكُهُ عِنْدَ بَابِ اللهِ الشَّرْقِي فَيَقْتُلُهُ فَيَهْزِمُ اللهُ الْيَهُوْدَ (الی قوله) وَيَتْرُكَ الصَّدَقَةَ فَلَا يُسْعٰى عَلٰى شَاةٍ وَلَا عَلٰى بَعِيْرٍ وَتُرْفَعُ الشَّحْنَاءُ وَالتَّبَاغُضُ وَتُنْزَعُ حُمَةُ كُلِّ ذَاتِ حُمَةٍ حَتّٰى يُدْخِلَ الْوَلِيْدُ يَدَهُ فِي الْحَيَّةِ فَلَا تَضُرَّهُ وَتَفِرُّ الْوَلِيْدَةُ الْاَسَدَ فَلَا يَضُرُّهَا وَيَكُوْنَ الذِّئْبُ فِي الْغَنَمِ كَاَنَّهُ كَلْبُهَا وَتُمْلَأُ الْاَرْضُ مِنَ الْمُسْلِمِ كَمَا يُمْلَأُ الْاِنَاءُ مِنَ الْمَاءِ وَتَكُوْنُ الْكَلِمَةُ وَاحِدَةً فَلَا يُعْبَدُ اِلَّا اللهُ تَعَالٰى۔ الحدیث اخرجه ابوداؤد وابن ماجه ص۳۰ واللفظ له ورواه ابن حبان وابن خزیمة فی صحیحهما والضیاء فی المختارة نقله کذا فی شرح المواهب للزرقانی ص۵۳ من ذکر المعراج۔

سر پر طیلسان ہوگا جب دجال کی نظر عیسٰی علیہ السلام پر پڑے گی تو وہ نمک کی طرح پگھل جائیگا اور بھاگنے لگے گا عیسٰی علیہ السلام فرمائینگے (میرے لئے تیرے نام کی ایک ضرب مقدر ہوچکی ہے اس سے بچ کر تو مجھ سے کہاں نکل سکتا ہے آخر اس کو باب لد ( ) پر پکڑلینگے اور اس کو قتل کردینگے اور اللہ تعالیٰ سب یہودیوں کو شکست دے دیگا۔ اس وقت مال کی اتنی کثرت ہوجائیگی کہ صدقہ دینے کے لئے کوئی فقیر نہ ملیگا لہٰذا بیت المال کی طرف سے کوئی شخص نہ بکری وصول کرنیوالا رہیگا اور نہ اونٹ وصول کرنے والا اور بغض وکینہ سب دلوں سے نکل جائیگا اور تمام زہریلے جانوروں کے ڈنک بیکار ہوجائینگے یہاں تک کہ ایک چھوٹی سی لڑکی سانپ کے سوراخ میں ہاتھ ڈالیگی تو وہ اسکو نہ کاٹے گا اور شیر کو دوڑائیں گے تو وہ اسکو کچھ نہ کہیگا اور بکریوں کے ریوڑ میں بھیڑیا اس طرح ساتھ ساتھ پھریگا جیسے ریوڑ کا کتا اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائیگی جیسے برتن پانی سے۔ اور صرف ایک خدا کی توحید باقی رہ جائیگی اور ایک اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی عبادت نہوگی۔

جمع ہونا اسی قومی استیصال کے لئے پیش خیمہ ہو۔ حدیث مذکور سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تشریف آوری کا اہم مقصد دجال کا قتل کرنا ہے اور چونکہ اسکا مقابلہ براہ راست انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہے اسی لئے ہر نبی نے اس کی آمد سے اپنی امت کو ڈرایا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اس کے قتل کے لئے خدا تعالیٰ کے رسولوں ہی میں سے کوئی رسول آئے۔ جو چھوٹے چھوٹے دجال اس سے قبل بھی ظاہر ہوتے رہے وہ اسی امت کے ہاتھوں ہلاک ہوتے رہے لیکن جو دجال کہ خاتم الدجاجلہ یعنی سب دجالوں کے آخر میں آئیگا اور خدائی افعال کے شعبدہ بازیاں ظاہر کریگا اس کے قتل کے لئے ایک نبی ہی کی تشریف آوری ضروری تھی اس صورت میں کس امت کے لئے یہ کتنی بڑی کرامت اور شرافت ہوگی کہ جب اس پر کوئی خارجی حملہ ہو تو ان کی ہمدردی کے لئے خدا تعالیٰ کے رسول پیش قدمی فرمائیں۔ اور وہ بھی بڑی تمناؤں اور بڑے فخر کے ساتھ کیسے تعجب کی بات ہے کہ جس بات میں اس امت کی شرافت تھی اسی کو برعکس اہانت سمجھا جائے۔ ومن لم یجعل اللہ له نوراً فماله من نور۔

نُزُولُ عِیسٰی عَلَیہِ الصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ وَظُهُورُ کَرَامَةِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَشَرَفِهَا فِی ذَالِكَ

۱۲۷۱ - عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلَی الْحَقِّ ظَاهِرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ قَالَ فَیَنْزِلُ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَیَقُوْلُ اَمِیْرُهُمْ تَعَالَ فَصَلِّ فَیَقُوْلُ لَا اِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰی

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تشریف آوری اور اسمیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کی ظہور برتری

۱۲۷۱ - جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق کے مقابلہ پر جنگ کرتی رہیگی اور وہ تا قیامت اپنے دشمنوں پر غالب

۱۲۷۱ - اس امت کی شرافت اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی کہ اسکے رسول کی وفات پر اتنی طویل مدت گذر جانے پر بھی اس میں ایسے افراد موجود رہیں کہ اسرائیلی سلسلہ کا ایک مقدس رسول آکر بھی انکی امامت کو برقرار رکھے اور اسکے پیچھے آکر نماز میں اس کی اقتداء کرلے اور اسکا اعلان بھی کرے کہ جس کرامت و شرافت کے تم پہلے مستحق تھے اتنی مدت دراز کے بعد آج بھی اسی شرافت و کرامت کے مستحق ہو سوچئے اور ذرا انصاف فرمائیے کہ اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام تشریف لاکر اسطرح اس امت کے پیچھے اقتداء نہ فرماتے تو کیا یہ ثابت ہوسکتا تھا کہ جو امت کل تک خیر امت کہی جاتی تھی، آج بھی وہ اپنی اسی شرافت پر باقی ہے یوں تو پہلے نبیوں کے دور میں بھی امت کے افراد لائق سے لائق تر گذرے ہیں مگر آخر کچھ مدت کے بعد ہی انکا حشر کیا کچھ نہیں ہوگیا جو نبوتوں کے مستحق تھے وہ لعنت کے تحت آگئے یا نہیں لیکن ایک یہ امت بھی ہے جسکی شرافت میں اتنی طویل مدت گذرنے پر بھی ذرا فرق نہیں آیا۔

یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے جب ہم اسطرف بھی نظر کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر آخرت کے وقت بھی ایک نماز کا نقشہ یہی تھا کہ مرض الموت میں آپ نے منصب امامت کو سب سے بزرگ صدیق اکبرؓ کے سپرد کردیا تھا اس درمیان میں ایک ایسا وقت آیا کہ ان کی امامت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لاکر انکے پیچھے نماز ادا فرمائی اور درحقیقت یہ اسکا اعلان تھا کہ یہ امت اب اس کمال کو پہنچ چکی ہے کہ ایک رسول کی نماز اسکے پیچھے ادا ہوسکتی ہو لہٰذا اب سمجھ لینا چاہئے کہ رسول کی آمد کا جو مقصد اعظم ہوتا ہے وہ پورا ہوچکا ہے اس لئے رسولوں کے دستور کے مطابق اس کی وفات کا وقت بھی آجائے تو تعجب کی بات نہیں۔ ایک طرف امامت و اقتداء کا یہ نقشہ آپ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھئے اس کے ہزار سال سے کہیں زیادہ مدتوں کے بعد امامت و اقتداء کا یہ دوسرا نقشہ بھی سامنے رکھئے جو یہاں حدیث میں آپ کے سامنے موجود ہے تو آپکو بلا اشتباہ ثابت ہوجائیگا کہ جس مدت میں پہلی امتیں ہلاک ہو ہو کر دنیا سے نیست و نابود ہوچکی ہیں یہ امت اس سے زیادہ مدت گذرنے پر بھی اپنی اسی شرافت و کرامت پر باقی ہے جو کبھی اسکو اپنے عہد کمال میں حاصل تھی۔ اس سے جہاں ایکطرف اس امت کی بزرگی کا ثبوت ملتا ہے اس سے بڑھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت عظمیٰ اور آپکے کمالات کا ثبوت ملتا ہے اور یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ آپ حقیقی معنی میں خاتم النبیین ہیں

بَعْضٍ اُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ عَلٰی هٰذِهِ الْاُمَّةِ ۔ رواہ مسلم ص۸۸ و احمد فی مسندہ ص۳۴۵ و ص۳۸۴

۱۲۷۲ ۔ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ (فذکر الحدیث وفیہ) وَيَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عِنْدَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ

بیگی اس کے بعد آپ نے فرمایا آخر عیسیٰ بن مریم اتریں گے (نماز کا وقت ہوگا) مسلمانوں کا امیر ان سے عرض کریگا تشریف لائیے اور نماز پڑھا دیجئے وہ فرمائینگے یہ نہیں ہوسکتا۔ اس امت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اکرام و اعزاز ہے کہ تم خود ہی ایک دوسرے کے امام و امیر ہو۔ (مسلم شریف)

۱۲۷۲ ۔ عثمان بن ابی العاص روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود

آپ کے بعد کوئی نبی نہیں بن سکتا کیونکہ جب قیامت تک آپکی امت میں اس صفت کے لوگ موجود رہیں کہ اگر کوئی قدیم رسول آئے تو بے تکلف وہ ان کے پیچھے آکر نماز ادا کرلے تو اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ آخری رسول ہیں اور آپکے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اصل وظائف رسالت و نبوت خدائی دین کی تاسیس و اشاعت ہے کسی خاص شخص کا قتل کرنا اصل وظائف رسالت میں داخل نہیں ہے خدا تعالے کے بہت سے رسول وہ ہیں جو قتل کرنے کی بجائے خود دشمنوں کے ہاتھوں مقتول ہوگئے ہیں مگر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے وظیفۂ نبوت کے ادائیگی میں ذرا سا بھی قصور کیا تھا والعیاذ باللہ۔ بس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دجال کو قتل کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ جدید رسالت کی حیثیت میں تشریف لائینگے بلکہ یہ خدمت کسی حکمت سے ان کے سپرد کی گئی ہے جیسا کہ بہت سے امور حضرت خضر علیہ السلام کے سپرد ہوئے مگر ان عجائبات سے انکی رسالت کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا چنانچہ آج تک امت میں اختلاف ہے کہ وہ رسول تھے یا نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کے لئے صاحب شریعت رسول ہونا، قرآن کریم سے ثابت ہے اور ان پر ہر امت کو ایمان لانا یا انکی رسالت کا حق ہے جو پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ شریعت صرف آپکی شریعت ہے اسلئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اگر آپ ہی کی اتباع فرمائینگے بلکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام صاحب تورات بھی آجائیں تو ان کے لئے بھی شریعت یہی شریعت ہوگی اگر کوئی کامل سے کامل رسول کسی بڑی شریعت کا اتباع کرتا ہے تو اس سے اسکی نبوت و رسالت میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا بہت سے انبیاء علیہم السلام گذرے ہیں جنکی اپنی کوئی شریعت ہی نہ تھی لیکن پھر وہ خدا تعالیٰ کے نبی کہلائے پھر جو شریعت کہ سب شرائع کی جامع ہو اگر کوئی رسول اگر اس کی اتباع کرتا ہے تو اسمیں اسکی رسالت کے خلاف بات کیا ہے لہٰذا یہ سوال کتنا نامعقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائینگے تو کیا رسالت کی صفت ان سے سلب کرلیجائیگی جی نہیں وہ رسول ہی ہونگے اور جسطرح اس وقت ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں اسی طرح اس وقت بھی ایمان رکھینگے صرف اتباع شریعت کا مسئلہ ہے تو جب ہر رسول کی اپنی شریعت میں نسخ و منسوخ ہونے سے اسمیں کوئی فرق نہیں آتا اسی طرح اگر ایک شریعت منسوخ ہوکر دوسری شریعت آجائے تو اس سے بھی اسمیں کوئی فرق نہیں آتا اسکے کمالات وہی ہیں اس پر ایمان رکھنا اسی طرح ضروری ہے اور جس شریعت کی وہ دعوت دے اس کی اتباع ہر وقت لازم ہے بس پہلے زمانہ میں ان کی شریعت انجیل تھی اور نزول کے بعد اب ان کے لئے قرآن کریم شریعت ہوگا پہلے جب وہ شریعت انجیل کے داعی تھے اس وقت قرآن کریم نہ تھا اور جب وہ تشریف لائینگے تو ان سے پہلے انجیل منسوخ ہوچکی ہوگی اور ان کے سامنے قرآنی شریعت ہوگی لہٰذا اب وہ خود بھی اسی کا اتباع فرمائینگے کسی شریعت کے خاص خاص احکام یا شریعت کے منسوخ ہوجانے سے رسالت کے مسلوب ہونے نہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوال نہ یہاں پیدا ہوتا ہے اور نہ اس حدیث میں پیدا ہوتا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ اگر بالفرض وہ آکر آپ کی شریعت کی اتباع کریں تو کیا اپنی رسالت سے معزول ہوجائینگے والعیاذ باللہ۔

فَيَقُوْلُ لَهٗ اَمِيْرُهُمْ يَا رُوْحَ اللّٰهِ تَقَدَّمْ صَلِّ فَيَقُوْلُ هٰذِهِ الْاُمَّةُ اُمَرَاءُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ فَيَقُوْمُ اَمِيْرُهُمْ فَيُصَلِّيْ فَاِذَا قَضٰى صَلٰوتَهٗ اَخَذَ عِيْسٰى حَرْبَتَهٗ فَيَذْهَبُ نَحْوَ الدَّجَّالِ فَاِذَا يَرَاهُ الدَّجَّالُ ذَابَ كَمَا يَذُوْبُ الرَّصَاصُ فَيَضَعُ حَرْبَتَهٗ بَيْنَ ثَنْدُوَتِهٖ فَيَقْتُلُهٗ وَيَنْهَزِمُ اَصْحَابُهٗ لَيْسَ يَوْمَئِذٍ شَيْئٌ يُوَارِيْ مِنْهُمْ اَحَدًا حَتّٰى اَنَّ الشَّجَرَةَ لَتَقُوْلُ يَا مُؤْمِنُ هٰذَا كَافِرٌ وَيَقُوْلُ الْحَجَرُ يَا مُؤْمِنُ هٰذَا كَافِرٌ۔ اخرجه احمد في مسنده ص۲۱۶ و ص۲۱۷ ج۳ بطريقين واخرجه ابن ابي شيبه والطبراني والحاكم وصححه كذا في الدر المنثور ص۲۴۲ ج۲۔ وعن جابر نحوه۔ و هكذا عند ابي يعلى عنه وفيه انت احق بعضكم امراء على بعض اكرم الله به هذه الامة كذا في الحاوي للسيوطي ص۱۲۷ وليست هذه الرواية في رسالة الشيخ قدس سره۔ وفي رواية فيقول له عيسى انما اقيمت الصلوٰة لك فيصلي خلفه كذا في البداية والنهاية ص۹۶

اِنَّمَا يَنْزِلُ عِيْسٰى عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ مِنْ بَيْنِ سَائِرِ الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ خَاصَّةً لِاَنَّهٗ اَوْلَى النَّاسِ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

۱۲۷۳۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهٗ نَبِيٌّ يَعْنِيْ عِيْسٰى۔ وَاِنَّهٗ نَازِلٌ فَاِذَا رَاَيْتُمُوْهُ فَاعْرِفُوْهُ رَجُلٌ مَرْبُوْعٌ اِلَى الْحُمْرَةِ

سنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فجر کی نماز میں اتریں گے تو اسوقت مسلمانوں کا جو امیر ہوگا وہ ان سے عرض کریگا اے روح اللہ آگے تشریف لاکر نماز پڑھائیے۔ وہ فرمائیں گے یہ امت اپنی فضیلت کیوجہ سے خود ہی ایک دوسرے کی امیر ہے اس پر وہ امیر آگے بڑھکر نماز پڑھائینگے جب نماز ختم ہو جائیگی تو اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اپنا نیزہ لیکر دجال کی طرف جائینگے وہ جب ان کو دیکھیگا تو اسطرح پگھل جائیگا جیسا آگ پر سیسہ پگھل جاتا ہے وہ اپنا نیزہ اس کے سینہ کے درمیان لگائینگے اور اسکو ختم کردینگے اور اسکا سب گروہ منتشر ہو جائیگا اور کوئی چیز ان کو پناہ نہ دیگی یہاں تک کہ درخت اور پتھر بھی یہ کہیگا اے مومن (میری آڑ میں) یہ کافر موجود ہے (اسکو بھی قتل کردے)

دوسری روایت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب اسطرح منقول ہے کہ اس نماز کی اقامت آپ ہی کے نام کی ہوئی ہے یہ کہکر وہ ان ہی کے پیچھے نماز ادا کرینگے۔

۱۲۷۳۔ ابوہریرہ رض روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرے اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے وہ ضرور اتریں گے جب تم ان کو دیکھنا تو پہچان لینا کہ وہ میانہ قد سرخ وسفید رنگ کے اور دو زعفرانی چادریں اوڑھے ہوئے ہونگے ان پر وہ شگفتگی و تازگی ہوگی یوں معلوم ہوگا

وَالبِيَاضِ بَيْنَ مُمَصَّرَتَيْنِ كَأَنَّ رَأْسَهُ يَقْطُرُ وَإِنْ لَمْ يُصِبْهُ بَلَلٌ فَيُقَاتِلُ النَّاسَ عَلَى الْإِسْلَامِ فَيَدُقُّ الصَّلِيبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيُهْلِكُ اللهُ فِي زَمَانِهِ الْمِلَلَ كُلَّهَا إِلَّا الْإِسْلَامَ وَيُهْلِكُ الْمَسِيحَ الدَّجَّالَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ أَرْبَعِينَ سَنَةً ثُمَّ يَتَوَفَّى فَيُصَلِّي عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ۔ رواه ابوداؤد ص ۲/۱۳۵ واخرجه ابن ابی شیبة واحمد فی مسنده ص ۲/۴۳۷ وابن حبان فی صحیحه وابن جریر کذا فی الدر المنثور ص ۲/۲۴۲ وصححه الحافظ فی الفتح من نزول عیسٰی علیه السلام۔

حجه واتيانه على قبر النبى صلى الله عليه وسلم وسلامه ورده عليه عليهما الصلوة والسلام

۱۲۷۴۔ وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَيُهِلَّنَّ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ بِفَجِّ الرَّوْحَاءِ بِالْحَجِّ أَوْ بِالْعُمْرَةِ أَوْ لَيُثَنِّيَنَّهُمَا جَمِيعًا (رواه مسلم فی الحج) واخرجه احمد فی مسنده ولفظه ينزل عيسى بن مريم فيقتل الخنزير ويمحو الصليب وتجمع له الصلوة ويعطى المال حتى لا يقبل ويضع الخراج وينزل الروحاء فيحج منها أو يعتمر أو يجمعهما وتلا أبو هريرة وإن من أهل الكتب إلا ليؤمنن به قبل موته ويوم القيمة يكون عليهم شهيدا فزعم حنظلة أن أبا هريرة قال يؤمن به قبل موت عيسى فلا أدرى هذا كله حديث النبى صلى الله عليه وسلم أو شيء قاله أبو هريرة

کہ ان کے سر مبارک سے پانی کے قطرے اب ٹپکے اگرچہ ان پر پانی کی نمی بھی نہ ہوگی۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کرینگے صلیب کو چور اچور اکر ڈالینگے سور کو قتل کرینگے جزیہ کی رسم اٹھا دینگے۔ ان کے دور میں اللہ تعالیٰ تمام مذاہب ختم کردیگا اور صرف ایک مذہب اسلام باقی رہجائیگا اور ان کے دست مبارک پر اللہ تعالیٰ دجال کو قتل کریگا چالیس سال تک وہ زمین پر زندہ رہینگے اسکے بعد آپکی وفات ہوگی اور مسلمان ان پر نماز جنازہ ادا کرینگے۔

(ابوداؤد)

۱۲۷۴۔ ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام ضرور مقام فج روحاء پر حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھینگے (مسلم شریف) مسند احمد میں حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوۃ والسلام اترینگے سور کو قتل کرینگے، صلیب کا نام و نشان باقی نہ چھوڑینگے اور مال اتنا تقسیم کرینگے کہ اسکو قبول کرنیوالا نہ ملیگا اور جزیہ و خراج اٹھا دینگے اور مقام فج روحاء میں حج یا عمرہ یا دونوں کا احرام باندھینگے اسکی شہادت میں ابوہریرہؓ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ

مسند احمد ص۲۹۰ ج ۲ واخرجه ابن جریر مثله والحاکم وصححه ولفظه لیهبطن ابن مریم حکما عدلا واماما مقسطا ولیسلکن فجا حاجا او معتمرا ولیاتین قبری حتی یسلم علی ولاردن علیه یقول ابو هریرة رض ای بنی اخی ان رأیتموہ فقولوا ابو هریرة یقرئك السلام۔

(در منثور ص۲۴۵ ج ۲)

یتزوج علیه الصلوٰة والسلام ویولد له ثم یتوفی ویدفن بیا موضع دفنه

۱۲۷۵۔ عن عبد الله بن عمرو مرفوعا ینزل عیسی بن مریم الی الارض فیتزوج ویولد له الحدیث۔ وعزاہ الکتاب الوفاء واخرجه ابن المراغی فی المدینة وابن الجوزی فی المنتظم کذا فی الکنز۔ وهکذا فی المشکوٰة۔

۱۲۷۶۔ عن ابی هریرة رض مرفوعا طوبی لعیش بعد المسیح یوذن للسماء فی القطر ...... ویوذن الارض فی النبات حتی لو تذر حبك فی الصفا لنبت وحتی یمر الرجل علی الاسد فلا یضرہ ویطاء علی الحیة فلا تضرہ ولا تشاحن ولا تباغض۔ اخرجه ابو سعید النقاش فی فوائد العراقیین کذا فی الکنز ص۲۰۲ ج ۷ ابو سعید عنه

الا لیومنن به قبل موته ویوم القیامة یکون علیهم شهیدا یعنی اہل کتاب میں کوئی شخص ایسا نہ رہیگا جو انکی وفات سے پہلے یقیناً ان پر ایمان نہ لے آئے اور قیامت میں عیسیٰ علیہ السلام ان پر گواہ ہوں گے حنظلہ (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں ابو ہریرۃ رض نے کہا "قبل موتہ" سے مراد عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی موت سے پیشتر ہے اب یہ مجھکو معلوم نہیں کہ یہ تفسیر بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہے یا یہ خود ابو ہریرۃ رض نے بیان فرمائی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول کے بعد شادی کرنا پھر اولاد ہونی اسکے بعد آپکی وفات اور مقام دفن کا ذکر

۱۲۷۵۔ عبد اللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ بن مریم زمین پر اتریںگے اور نکاح کرینگے اور ان کے اولاد ہوگی۔

۱۲۷۶۔ ابو ہریرۃ رض سے ...... ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد زندگی اور فارغ البالی کے کیا کہنے آسمان کو بارش کا حکم ملجائیگا اور زمین کو پیدائش کا حتی کہ اگر تم پتھر پر دانہ ڈالدوگے تو بھی وہ جم جائیگا اور اتنا امن ہوگا کہ آدمی شیر کے قریب گذریگا اور وہ اسکو ذرا نقصان نہ پہونچائیگا اور بغض و کینہ کہیں نام و نشان نہ رہیگا۔

۱۲۷۷۔ عن محمد بن یوسف بن عبد اللہ بن سلام عن ابیہ عن جدہ قال مکتوب فی التوراۃ صفۃ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعیسی بن مریم یدفن معہ اخرجہ الترمذی وحسنہ۔ رکذا فی الدر المنثور ص۲۴۵ ج ۲) قلت وقد تکلم فی اسنادہ الحافظ ابن کثیر فی البدایۃ والنہایۃ ص۹۹ ج ۲۔ وقال فی اسناد روایۃ الترمذی ہذہ عثمان بن الضحاک والصواب الضحاک بن عثمان المدنی۔

۱۲۷۸۔ عن عبد اللہ بن سلام قال یدفن عیسی مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصاحبیہ فیکون قبرہ رابعا اخرجہ البخاری فی تاریخہ والطبرانی۔ (در منثور ص۲۴۵ ج ۲)

۱۲۷۹۔ عَنْ عَائِشَۃَ رض قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّیْ اَرَی اَنِّی اعیش مِنْ بَعْدِكَ فَتَأْذَنْ لِیْ اَنْ ادفن اِلٰی جَنْبِكَ فَقَالَ وَاَنّٰی لِیْ بِذٰلِكَ مِنْ مَوْضِعٍ مَا فِیْہِ اِلَّا مَوْضِعُ قَبْرِیْ وَقَبْرِ اَبِیْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعِیْسٰی بْنِ مَرْیَمَ (اخرجہ ابن عساکر کذا فی الکنز ص۵۲ ج ۷) وفی فصل الخطاب باسناد المستغفری فی دلائل نبوۃ الخ۔

۱۲۷۷۔ عبد اللہ بن سلامؓ کہتے تھے کہ تورات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی لکھی ہے کہ عیسی علیہ السلام آپ کے پاس دفن ہونگے۔

۱۲۷۸۔ عبد اللہ بن سلامؓ بیان کرتے تھے کہ عیسی علیہ السلام آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دو یاران غار یعنی ابو بکرؓ او عمرؓ کے پاس دفن ہونگے اور اس لحاظ سے انکی قبر چوتھی ہوگی۔

۱۲۷۹۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ میرا خیال ہوتا ہے شاید میں آپ کے بعد تک زندہ رہوں گی تو آپ مجھکو اسکی اجازت دیں کہ میں آپکے پہلو میں دفن ہوں۔ آپ نے فرمایا میں اسکی بھلا کیسے اجازت دے سکتا ہوں یہاں تو صرف میری قبر اور ابو بکرؓ و عمرؓ کی قبریں اور عیسی علیہ السلام کی قبر مقدر ہے۔

۱۲۷۷۔ عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسی علیہ السلام کے حق میں "اولی الناس" کا لفظ فرمایا تھا اسکا ظہور یوں ہوا کہ اول تو آپ کے اور ان کے درمیان کوئی اور نبی نہیں گذرا گویا دونوں کے زمانے متصل رہے پھر اسی مناسبت کیوجہ سے وہی آپ کی امت میں تشریف لائینگے اور یوں بھی ہوا کہ دفن بھی آپ کے پاس ہی آکر ہوں گے۔ زمانی اور مکانی اور موت کی یہ خصوصیات ان کے سوا کسی اور نبی کو میسر نہیں آئیں +

الرسول الاعظم النبی الامی الھاشمی المطلبی سیدنا محمد بن عبد اللہ آخرھم بعثا واولھم خلقا صلوات اللہ وسلامہ علیہ

نبی امی و مطلبی الہاشمی سیدنا محمد بن عبد اللہ جو سب سے برتر رسول ہیں بلحاظ بعثت سب سے آخر اور بلحاظ پیدائش سب سے اول اُن پر خدا کے بیشمار درود و سلام

دلمیں آرزوئیں تھیں اور نہ معلوم کتنی آرزوئیں تھیں کہ رسالت کے ابواب ترتیب دینے میں اپنی پوری ہمت صرف کیجاتی اگرچہ ایک بے بضاعت کی ہمت ہی کیا تھی لیکن جہد المقل و موعہا ایک آرزو یہی تھی کہ ہر نبی و رسول کے تذکرہ سے قبل اسکے کچھ ایسے جامع اور مختصر حالات آجاتے جنکے مطالعہ سے اسکی زندگی کی چیدہ چیدہ خصوصیات کچھ نہ کچھ بیک نظر سامنے آجاتیں مگر جب اپنی محرومی اور بد نصیبی سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے تذکروں ہی میں یہ تمنا پوری نہ ہو سکی تو آج جبکہ میں اس رسول اعظم کے متعلق حدیثیں جمع کرنیکا فخر حاصل کر رہا ہوں جنکے تذکروں سے عالم تکوین و تشریع گونج رہا ہے، کتب سماویہ ان کے ذکر سے لبریز ہیں انبیاء علیہم السلام ان کے مدح و توصیف میں رطب اللسان ہیں حتیٰ کہ عرش عظیم پر انکی عظمت و برتری کا چرچا ہے تو پھر قلم میں کیا طاقت ہے کہ اس موضوع میں کچھ جنبش کر سکے سبحان اللہ میدان تو کتنا وسیع ہے کہ اسکا قصد کرنا بھی مشکل مگر عقل و فہم یہاں اتنی درماندہ ہے کہ ایک قدم اسکو حرکت کرنا بھی مشکل ہے اسلئے آپکی صرف ایک مجمل سی سیرت پر کفایت کرتا ہوں جس کو صاحب حیوۃ الحیوان نے لفظ براق کے تحت عجیب اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اس رسول اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کے کچھ تذکرے تو ایکبار آپ انبیاء علیہم السلام کے تذکروں کے شروع میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور لیجئے ایک بار پھر آخر میں بھی ملاحظہ فرمالیجئے وہ تذکرہ آپ کی خلقت کی اولیت کے اعتبار سے تھا اور یہ آپ کی بعثت کی آخریت کے لحاظ سے ہے اللھم صل علے سیدنا محمد عبدک ونبیک ورسولک النبی الامی۔

اہل تاریخ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اسی سال ہوئی تھی جس سال کہ واقعہ

فیل پیش آیا تھا ولادت کے بعد ۵ سال کی عمر تک آپ قبیلہ بنی سعد میں پرورش پاتے رہے ۶ سال کی
عمر میں آپؐ کی والدہ ماجدہ کی مقام ابوا میں وفات ہوئی پھر آپ اپنے دادا عبد المطلب کی پرورش میں
رہے ۱۰ ابھی آپؐ کی عمر مبارک ۸ سال کی ہوگی کہ آپ کے دادا کا بھی انتقال ہوگیا اس کے بعد آپ اپنے
شفیق چچا جناب ابوطالبؑ کی پرورش میں رہے اور ان کے ہمراہ بارہ سال کی عمر میں شام جانیوالے قافلہ میں تشریف
لے گئے پھر ۲۵ سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ کے تجارتی کاروبار کے لئے باہر تشریف لیجاتے رہے اور اسی سال اُن کے
ساتھ آپکا عقد بھی ہوا۔ قریش نے بنا کعبہ کا ارادہ کیا تو اسوقت آپکا سن مبارک ۳۵ سال کا تھا اس سلسلہ میں جب
باہم انمیں اختلاف ہونے لگا تو انھوں نے آپکو اپنا حکم بنایا چالیس سال کی عمر میں آپؐ نبوت سے سرفراز ہوئے
اور جس وقت ابوطالب کی وفات ہوئی تو اسوقت آپکا سن مبارک ۴۹ سال ۸ ماہ اور گیارہ دن تھا ابوطالب کے ۳ دن
بعد حضرت خدیجہؓ کا بھی وصال ہوگیا اسکے تین ماہ کے بعد آپؐ زید بن حارثہؓ کو ساتھ لیکر بغرض تبلیغ طائف تشریف لیگئے
اور ایک ماہ قیام فرمایا اسکے بعد مطعم بن عدی کی پناہ میں آپ مکہ مکرمہ واپس تشریف لے آئے جب آپکا سن مبارک ۵۰
سال کا ہوا تو نصیبین کے جن آپکی خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقہ بگوش اسلام ہوگئے جب آپکا سن مبارک ۵۱ سال ۹
ماہ کا ہوا تو آپکو معراج نصیب ہوئی اور ۵۳ سال کی عمر میں آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی آپکی بعثت کو اب یہ تیرھواں
سال تھا اور کوئی چودھواں کہتا ہے، اس سفر میں صدیق اکبرؓ آپ کے رفیق سفر رہے ان کا غلام عامر
بن فہیرہ بھی ہمراہ تھا اور عبد اللہ بن ارلیقط راستہ بتلاتے جاتے تھے۔ اسلامی تاریخ کی ابتداء اسی
سال سے ہوتی ہے اور تاریخ اسلامی میں یہ پہلا سال شمار ہوتا ہے اسی سال آپ نے صحابہؓ کے درمیان
عقد مواخاۃ فرمایا تھا اور حضرت علیؓ کی اخوت کا اعلان بھی اسی سال ہوا تھا مقیم کو چار رکعتیں اور مسافر
کے لئے دو رکعتیں پڑھنا یعنی اتمام وقصر کی سنت اسی سال شروع ہوئی تھی اور اسی سال حضرت
علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کا عقد نکاح بھی ہوا ہے۔ دوسرے سال غزوہ ودان ہوا ہے، ودان ایک مقام
کا نام ہے غزوہ بواط، غزوہ عشیرہ اور بدر اولیٰ کے غزوات سب اسی سال کے واقعات ہیں بواط مقام
رضوی کی جانب واقع ہے غزوہ بدر اولی ماہ جمادی الاخرہ میں ہوا ہے اور غزوہ بدر کبریٰ ۱۷ رمضان المبارک
جمعہ کے دن ہوا ہے کفار کے بڑے بڑے سردار اسی غزوہ میں قتل ہوئے اور غزوہ بنی سلیم ذی الحجہ میں ہوا
ہے صورت یہ ہوئی کہ آپ ابوسفیان کی خبر سنکر نکلے تھے مگر اس سے ملاقات نہو سکی تھی ہجرت کے تیسرے
سال غزوہ بنی غطفان، غزوہ نجران، غزوہ قینقاع، غزوہ احد غزوہ حمراء الاسد ہوئے ہیں پھر چوتھے
سال غزوہ بنو نضیر، غزوہ ذات الرقاع ہوئے ہیں۔ پانچویں سال غزوہ دومۃ الجندل، غزوہ الخندق
غزوہ بنی قریظہ ہوئے ہیں۔ چھٹے سال غزوہ بنی لحیان، غزوہ مصطلق ہوئے ہیں ساتویں سال آپؐ نے

اپنا ممبر بنوایا ہے اور غزوہ خیبر اور قصہ فدک سب اسی سال ہوئے ہیں۔ باغ فدک صرف آپکے تصرف میں تھا۔ آٹھویں سال غزوہ موتہ۔ فتح مکہ، غزوہ حنین، غزوہ طائف اور قبیلہ ہوازن سے حاصل کردہ مال تقسیم فرمایا ہے۔ نویں سال غزوہ تبوک ہوا ہے اور دسویں سال حجۃ الوداع ہوا ہے اس حج میں آپ نے اپنے دست مبارک سے ۶۳ قربانیاں ذبح کی اور ۶۳ غلام آزاد فرمائے اور آپکی عمر مبارک بھی یہی ہوئی ہے گیارہویں سال آپ کا وصال ہوگیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ شروع ربیع الاول میں آپ کی علالت کی ابتدا ہوئی اور بارہویں ربیع الاول کو وفات ہوگئی آپ کی کل عمر مبارک ۶۳ سال کی تھی جس میں مدینہ میں آپ دس سال رہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ آپ کی سب اولاد حضرت خدیجہؓ سے تھی حضرت ابراہیمؑ حضرت ماریہ قبطیہ سے تھے ان کے اسماء مبارک یہ ہیں طیبؓ، طاہرؓ، قاسمؓ، فاطمہؓ، زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی سب پسری اولاد عہد طفولیت ہی میں انتقال کرچکی تھی۔

حضرت خدیجہؓ کی حیات میں آپؐ نے کسی اور سے عقد نہیں فرمایا، پھر ان کے بعد حضرت سودہؓ بنت زمعہ اور حضرت عائشہؓ آپ کی زوجیت میں آئیں۔ حضرت عائشہؓ کے علاوہ آپ کی ازواج میں اور کوئی کنواری نہ تھیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کے عہد ۵۸ھ میں ۶۷ کے سن میں انکا وصال ہوا۔ ۳ھ میں حضرت حفصہؓ کے ساتھ آپ کا عقد ہوا اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں انکا وصال ہوا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بی بی صاحبہ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ تھیں صرف انکا انتقال آپ کی حیات طیبہ ہی میں ہوا ہے۔ ان کے بعد حضرت خدیجہؓ کے علاوہ سب کا انتقال آپ کے بعد ہوا ہے ۴ھ میں حضرت ام سلمہ سے آپکا عقد ہوا ان کی والدہ عاتکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی صاحبہ تھیں انکا انتقال ۵۹ھ حضرت امیر معاویہ کے عہد میں ہوا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ۶۱ھ میں عاشورہ کے دن انتقال ہوا اور اسی دن حضرت امام حسینؓ کی شہادت ہوئی تھی ۵ھ میں حضرت زینب بنت جحش سے آپکا عقد ہوا اور ۲۰ھ میں حضرت عمرؓ کے عہد میں انکا انتقال ہوا آپکی ازواج میں آپکے بعد سب سے پہلے ان ہی کی وفات ہوئی ہے حضرت ام حبیبہؓ بھی اسی سال آپکی زوجیت میں آئیں انکا نام رملہ بنت ابی سفیان تھا ۴۴ھ میں حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں وفات ہوئی حضرت جویریہؓ بنت الحارث ہیں بھی اسی سال آپکے عقد میں آئیں اور ۵۶ھ میں حضرت معاویہؓ کے عہد میں انکا انتقال ہوا اور ۷ھ میں حضرت میمونہؓ آپکے نکاح میں آئیں انکا وصال ۵۱ھ میں ہوا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اسوقت آپکے عقد میں ۹ بیبیاں تھیں +

۱۲۸۰۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بُعِثْتُ مِنْ خَیْرِ قُرُوْنِ بَنِیْ اٰدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰی كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِیْ كُنْتُ مِنْهُ۔ رواه البخاری۔

۱۲۸۱۔ عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی كِنَانَةَ مِنْ وُّلْدِ اِسْمٰعِیْلَ وَاصْطَفٰی قُرَیْشًا مِنْ كِنَانَةَ وَاصْطَفٰی مِنْ قُرَیْشٍ بَنِیْ هَاشِمٍ وَاصْطَفَانِیْ مِنْ بَنِیْ هَاشِمٍ رواه مسلم وفی روایة للترمذی اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی مِنْ وُّلْدِ اِبْرَاهِیْمَ اِسْمٰعِیْلَ وَاصْطَفٰی مِنْ ولد اسمعیل بنی كنانة۔

۱۲۸۲۔ عَنِ الْعَبَّاسِ اَنَّهٗ جَاءَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وسلم فَكَاَنَّهٗ سَمِعَ شَیْئًا فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَقَالَ مَنْ اَنَا فَقَالُوْا اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْخَلْقَ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ ثُمَّ جَعَلَهُمْ فِرْقَتَیْنِ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ فِرْقَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ قَبَائِلَ فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ قَبِیْلَةً ثُمَّ جَعَلَهُمْ بُیُوْتًا فَجَعَلَنِیْ فِیْ خَیْرِهِمْ بَیْتًا فَاَنَا خَیْرُهُمْ نَفْسًا وَخَیْرُهُمْ بَیْتًا۔ رواه الترمذی۔

۱۲۸۰۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کہ شروع سے لیکر ہمیشہ انسانوں کے بہتر سے بہتر طبقوں میں گذرتا رہا ہوں یہاں تک کہ جس طبقہ میں میں پیدا ہوا ہوں وہ سب سے بہتر طبقہ ہے۔ (بخاری شریف)

۱۲۸۱۔ واثلہ بن اسقع روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے میں نے خود سنا ہے کہ اللہ تعالٰے نے اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد میں سے قبیلہ کنانہ کو انتخاب فرمایا پھر کنانہ میں سے قریش کو انتخاب فرمایا اور قریش میں سے قبیلہ بنو ہاشم کو پھر بنو ہاشم میں سے مجھکو منتخب فرمالیا۔ (مسلم)

۱۲۸۲۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالٰے عنہ روایت فرماتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے گویا انھوں نے اسوقت مشرکین عرب کی جانب سے کچھ طعن کا کلمہ سنا تھا اس پر آپ نے ممبر پر تشریف لاکر خطبہ دیا اور فرمایا بتاؤ میں کون ہوں لوگوں نے کہا آپ رسول اللہ ہیں فرمایا میں بلحاظ نسب محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہوں اللہ تعالٰے نے اپنی مخلوق بنائی تو مجھکو اپنی سب سے بہتر مخلوق میں پیدا فرمایا اس کے بعد ان کے دو فرقے بنائے تو جو ان میں بہتر تھا مجھکو انمیں پیدا فرمایا اسی طرح پھر انکے خاندان بنائے اور ان کے خاندانوں میں جو بہتر تھا اسمیں مجھکو پیدا فرمایا حتی کہ پھر انمیں مختلف گھرانے بنائے اور ان گھرانوں میں جو سب سے بہتر تھا مجھکو اسمیں پیدا فرمایا تو میں تم سب میں اپنی نسب اور اپنے گھرانے کے لحاظ سے بہتر ہوں۔ (ترمذی شریف)

۱۲۸۳- عَنْ قَيْسِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ وُلِدْتُ أَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفِيْلِ كُنَّا لِدَيْنِ قَالَ وَسَأَلَ عُثْمَانُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قُبَاثَ بْنَ أَشْيَمَ أَخَا بَنِيْ يَعْمَرَ بْنِ لَيْثٍ أَنْتَ أَكْبَرُ أَوْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رسول الله صلى الله عليه وسلم أكبر مِنِّيْ وَأَنَا أَقْدَمُ مِنْهُ فِي الْمِيْلَادِ وَرَأَيْتُ خَزْقَ الْفِيْلِ أَخْضَرَ مُحِيْلًا۔ (رواه الترمذی)

۱۲۸۴- عَنْ عُثْمَانَ بْنِ أَبِي الْعَاصِ حَدَّثَتْنِيْ أُمِّيْ أَنَّهَا شَهِدَتْ وِلَادَةَ آمِنَةَ بِنْتِ وَهْبٍ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةَ وَلَدَتْهُ قَالَتْ فَمَا شَيْءٌ أَنْظُرُ فِيْ بَيْتٍ إِلَّا نُوْرٌ وَإِنِّيْ أَنْظُرُ إِلَى النُّجُوْمِ تَدْنُوْ حَتّٰى إِنِّيْ لَأَقُوْلُ لَيَقَعْنَ عَلَى الْأَرْضِ۔ رواه البیهقی۔

۱۲۸۵- هُوَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ هَاشِمِ بْنِ عَبْدِ مُنَافِ بْنِ قُصَيِّ بْنِ كِلَابِ بْنِ مُرَّةَ بْنِ كَعْبِ ابْنِ لُؤَيِّ بْنِ غالب بن فهر بن مَالِكِ بْنِ نَضْرِ بْنِ كنانة بن خزيمة بن

۱۲۸۳- قیس بن مخرمہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں اسی سال پیدا ہوئے تھے جس سال میں کہ اصحاب الفیل کا قصہ پیش آیا تھا ہم دونوں ہم عمر تھے عثمانؓ نے قباث بن اشیم سے پوچھا جو یعمر کے بھائی تھے کہ تم بڑے ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ بولے کہ بڑے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں ہاں پیدائش میں میں آپ سے پہلے ہوں (سبحان اللہ کیا ادب کا جواب ہے) اور میں نے ہاتھیوں کا گوبر دیکھا ہے جو سبز رنگ کا تھا اور متغیر ہو چکا تھا (یعنی میری پیدائش اصحاب الفیل کے قصہ سے بہت ہی قریب تھی) (ترمذی)

۱۲۸۴- عثمانؓ بن ابی العاص روایت کرتے ہیں کہ میری والدہ بیان فرماتی تھیں کہ جس شب میں حضرت آمنہؓ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تھی تو اسوقت وہ وہاں خود موجود تھیں وہ بیان کرتی تھیں کہ گھر میں جس چیز پر بھی میری نظر پڑتی تھی میں دیکھتی تھی کہ وہ منور ہے اور میں دیکھتی تھی کہ ستارے اس طرح جھکے پڑتے تھے یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب زمین پر آ گرینگے۔ (بیہقی)

۱۲۸۵- محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب (آپکا نام شیبۃ الحمد تھا) بن ہاشم (عمرو) بن عبد مناف (المغیرۃ) بن قصی (زید) بن کلاب (المهذب یا حکیم) بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر (قریش) بن مالک

۱۲۸۳- حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک آپ کی ولادت باسعادت اصحاب الفیل ہی کے سال میں ہوئی ہے البتہ اسمیں اختلاف ہے کہ اس واقعہ کے کتنی مدت بعد ہوئی، ابو جعفر باقر کہتے ہیں کہ اصحاب فیل کی آمد نصف محرم میں ہوئی تھی اور اس کے پچپن دن.... کے بعد آپکی ولادت ہوئی ہو اسکے علاوہ اور بھی متعدد اقوال ہیں۔

۱۲۸۵- عرب میں نسب کی حفاظت کا بڑا اہتمام تھا اور شریعت نے بھی ایک حد تک اسکا اہتمام فرمایا ہے آج بھی عدالت میں مدعی اور مدعا علیہ کے کم از کم باپ کا نام لکھنا ضروری ہوتا ہے اس لئے حافظ عینی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا نسب بھی

مُدْرِكَةَ بْنِ إِلْيَاسِ بْنِ مُضَرَ بْنِ نِزَارِ ابْنِ مَعَدِّ بْنِ عَدْنَانَ ـ رواه البخاری فی ترجمة الباب فی باب مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ـ

۱۲۸۶ ـ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِسْتَأْذَنَ حَسَّانُ بْنُ ثَابِتٍ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هِجَاءِ الْمُشْرِكِيْنَ قَالَ كَيْفَ بِنَسَبِيْ فِيْهِمْ فَقَالَ حَسَّانُ لَأَسُلَّنَّكَ مِنْهُمْ كَمَا تُسَلُّ الشَّعْرَةُ مِنَ الْعَجِيْنِ

بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ (عمرو یا عامر) بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان ـ

۱۲۸۶ ـ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حسان بن ثابت نے مشرکین کی ہجو کرنے کی آپ سے اجازت طلب کی آپؐ نے فرمایا کہ قریش کے ساتھ میرا نسب بھی جا ملتا ہے پھر اسکا کیا کروگے (کیونکہ اس وقت انکی ہجو کرنے سے خود میری بھی ہجو ہو جائیگی اس پر حسان نے عرض کی میں آپکو

ایک دو پشت تک یاد رکھنا فرض ہے دیکھو منیۃ ص۲۰۔ اگر کاش آپ کی امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی الفت و محبت میں اپکا پورا مذکورہ بالا نسب نامہ یاد کرلے تو یہ اسکے جذبہ محبت کا تقاضہ ہونا چاہیئے راقم الحروف بھی قارئین کرام کی خدمت میں اسی امید کے ساتھ یہ درخواست پیش کرتا ہے۔ علماء انساب اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ عدنان تک بلا اختلاف صحیح ہی اس کے بعد اسمیں اختلاف ہی قاضی سید سلیمان صاحبؒ نے اپنی سیرت رحمۃ للعالمین میں اس پر بہت مفصل اور بہت محقق بحث فرمائی ہی اور چونکہ حضرت ہاجرہ کے نسب پر اہل کتاب نے اعتراض کیا ہی اسلئے اسکا بھی بہت دندان شکن جواب دیا ہی جو قابل مراجعت ہی قاضی صاحب نے محنت اٹھا کر اس آبائی سلسلہ کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امہات مکرمات کا بھی ذکر فرمایا ہی جسکو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں فجزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء عن جمیع المسلمین ـ

نمبر شمار	آباء کرام	امہات عظام	نمبر شمار	آباء کرام	امہات عظام
۱	عبداللہ	آمنہ	۱۲	مالک	جندلہ
۲	عبدالمطلب	فاطمہ	۱۳	نضر	عکرشہ
۳	ہاشم	سلمیٰ	۱۴	کنانہ	برہ
۴	عبدمناف	عاتکہ	۱۵	خزیمہ	عوانہ (ہندہ)
۵	قصی	حبّی	۱۶	مدرکہ	سلمیٰ
۶	کلاب	فاطمہ			
۷	مرہ	ہند	۱۷	الیاس	لیلیٰ (خندف)
۸	کعب	مخشیہ	۱۸	مضر	رباب
۹	لوی	ماویہ	۱۹	نزار	سودہ
۱۰	غالب	عاتکہ	۲۰	معد	معانہ
۱۱	فہر ملقب بقریش	لیلیٰ	۲۱	عدنان	مہدد

۱۲۸۶ ـ عرب میں ہجو و مدح کا عام دستور تھا اور اپنے دشمن کے ہجو کرنی ان کے نزدیک اس کے قتل کرنے سے بھی زیادہ شدید سمجھا جاتی تھی کیونکہ قتل سے تو اسکو صرف ایکبار ہی تکلیف پہونچتی تھی اور ہجو کے اشعار چونکہ گلی کوچوں میں بچے پڑھتے پھرتے تھے اس لئے اس کی تکلیف انکو تلوار اور برچھے سے بھی زیادہ ہوتی تھی اسی لئے آپؐ نے فرمایا لهو اشد علیهم

رواہ البخاری فی باب من احب ان لا یسب نسبہ۔

۱۲۸۷۔ عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ قَالَ وُلِدَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَخْتُوْنًا مَسْرُوْرًا قَالَ فَاَعْجَبَ جَدَّہٗ وَحَظِیَ عِنْدَہٗ وَقَالَ لَیَکُوْنَنَّ لِابْنِیْ ھٰذَا شَاْنٌ فَکَانَ لَہٗ شَاْنٌ۔ رواہ البیہقی قال الحافظ ابن کثیر وھذا الحدیث فی صحتہ نظر۔

۱۲۸۸۔ عَنْ زَیْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ کَانَ اَحْبَارُ یَھُوْدَ بَنِیْ قُرَیْظَۃَ وَالنَّضِیْرِ یَذْکُرُوْنَ صِفَۃَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا طَلَعَ الْکَوْکَبُ الْاَحْمَرُ اَخْبَرُوْا اَنَّہٗ نَبِیٌّ وَاَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ وَاِسْمُہٗ اَحْمَدُ وَمُھَاجَرُہٗ اِلٰی یَثْرِبَ فَلَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمَدِیْنَۃَ اَنْکَرُوْا وَحَسَدُوْا وَکَفَرُوْا۔ (رواہ ابونعیم من طرق متعددۃ)

۱۲۸۹۔ عَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ عَنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّھُمْ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَخْبِرْنَا عَنْ نَفْسِکَ قَالَ دَعْوَۃُ اِبْرَاھِیْمَ وَبُشْرٰی عِیْسٰی وَرَاَتْ اُمِّیْ حِیْنَ حَمَلَتْ

ان میں سے اسطرح صاف نکال لونگا جیسا بال آٹے میں سے صاف نکال لیا جاتا (یعنی ان کے افعال کمال پر ان کی ہجو کرونگا) (بخاری شریف)

۱۲۸۷۔ حضرت عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب پیدا ہوئے تو آپ ختنہ شدہ تھے اور آپکا اونال بھی علیحدہ تھا۔ (بیہقی)

۱۲۸۸۔ زید بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ بنو نضیر اور بنو قریظہ کے علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے قبل آپ کا حلیہ مبارکہ اور آپ کے سب علامات بیان کرتے تھے حتی کہ جب سرخ رنگ کا ستارہ طلوع ہوا تو انھوں نے خبر دی کہ یہ (اسی رسول کے ظہور کی علامت ہے) یقیناً آپ نبیؐ ہیں اور آپ کے بعد اور کوئی نبی نہیں ہوگا۔ آپ کا اسم مبارک احمد اور آپ کی ہجرت کے شہر کا نام یثرب ہے مگر جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو ان ہی یہود نے پھر آپ پر حسد کیا اور آپ کا انکار کیا اور کافر بنگئے۔ ابونعیم

۱۲۸۹۔ خالد بن معدان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا آپ اپنے متعلق کچھ ہم سے ارشاد فرمائیں آپ نے فرمایا کہ میرے

من رشق النبل او کما قال یہ ان کے نزدیک تیروں کی بوچھاڑ سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اسلام میں جہاد کی ایک قسم جہاد باللسان بھی ہے۔

۱۲۸۹۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس مختصر تذکرہ سے آپکا مقصد یہ تھا کہ میری بعثت اور ظہور کا تذکرہ سب انبیاء علیہم السلام میں رہا ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جنکی طرف عرب اپنی نسبت کرتے ہیں سب سے پہلے بڑی الحاح و الحاح کے ساتھ میرے لئے دعاء فرمائی اس کے بعد بنی اسرائیل کے سب سے آخری نبی یعنی حضرت عیسی علیہ السلام نے میری

كَأَنَّهُ خَرَجَ مِنْهَا نُوْرٌ أَضَاءَتْ لَهُ بُصْرٰى مِنْ أَرْضِ الشَّامِ۔ رواه الامام احمد قال ابن کثیر اسناد جید۔

۱۲۹۰۔ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا اعْتَرَفَ آدَمُ الْخَطِيْئَةَ قَالَ يَا رَبِّ أَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ إِلَّا غَفَرْتَ لِيْ فَقَالَ اللّٰهُ يَا آدَمُ وَكَيْفَ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا وَلَمْ أَخْلُقْهُ بَعْدُ فَقَالَ يَا رَبِّ لِأَنَّكَ لَمَّا خَلَقْتَنِيْ بِيَدِكَ وَنَفَخْتَ فِيَّ مِنْ رُوْحِكَ رَفَعْتُ رَأْسِيْ فَرَأَيْتُ عَلٰى قَوَائِمِ الْعَرْشِ مَكْتُوْبًا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَعَلِمْتُ أَنَّكَ لَمْ تُضِفْ إِلٰى اسْمِكَ إِلَّا أَحَبَّ الْخَلْقِ إِلَيْكَ فَقَالَ اللّٰهُ صَدَقْتَ يَا آدَمُ إِنَّهُ لَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَيَّ وَإِذْ قَدْ سَأَلْتَنِيْ بِحَقِّهِ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُكَ۔ رواه الحاكم

لئے حضرت ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے دعا فرمائی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی اور حالت حمل میں میری والدہ نے دیکھا گویا اُن سے ایک نور ظاہر ہوا جس سے کہ بصری جو ملک شام کا ایک شہر ہے سب روشن ہوگیا۔ (مسند احمد)

۱۲۹۰۔ عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آدم علیہ السلام سے خطا سرزد ہوگئی تو انھوں نے یوں دعا کی اے رب اس حق کے طفیل میں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تونے رکھا ہے مجھکو بخشدے اللہ تعالیٰ نے فرمایا آدم! تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسے پہچانا میں نے تو انکو اب تک پیدا بھی نہیں کیا انھوں نے عرض کی اے رب! جب تونے مجھکو اپنے دست قدرت سے بنایا اور اپنی جانب سے اسمیں روح ڈالی تو میں نے جب سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عرش کے پایوں پر یہ لکھا ہوا تھا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں سمجھ گیا کہ جس کے نام کو تونے اپنے اسم مبارک کے ساتھ

بشارت دی جس سے ظاہر ہے کہ درمیانی سب انبیاء علیہم السلام نے بھی میری بشارت دی تھی بس جسکی آمد آمد کی خبریں اسطرح انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعتوں میں مسلسل چلی آرہی ہوں اس کی شرافت و نبوت کے لئے اس سے بڑھکر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے اس کے بعد حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں وفیہ بشارۃ لاھل محلتنا ارض بصری الخ کہ اسمیں ہمارے شہر بصری کے لئے ایک بڑی بشارت ثابت ہوتی ہے کیونکہ شام کی زمین میں سب سے پہلا شہر یہی ہے جسمیں نور نبوت پہنچا چنانچہ صدیق اکبرؓ کی خلافت میں کسی جنگ کے بغیر یہ شہر صلحاً فتح ہوا اور اس شہر میں نبوت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو بار تشریف بھی لاچکے ہیں ایکبار بارہ سال کی عمر میں جسمیں کہ بحیرا راہب کا قصہ پیش آیا تھا دوسری بار میسرہ غلام کے ساتھ اور اس شہر میں آپکے ناقہ کے بیٹھنے کی جگہ بھی موجود ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں آپ کی ناقہ بیٹھی تھی اور اوس کا نشان پڑگیا تھا اور یہ وہی شہر ہے کہ جہاں کے اونٹوں کی گردنیں اس آگ کی وجہ سے جو ایکبار ۶۵۴ھ میں حجاز میں لگی تھی چمکتی نظر آتی تھیں اور جس کے متعلق آپ پہلے پیش گوئی فرماچکے تھے۔

قَالَ البیھقی تفرد بہ عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم وھو ضعیف واللہ اَعلم۔

۱۲۹۱۔ عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ بنو اَبِی طَالِبٍ یُصْبِحُوْنَ رُمُصًا عُمْصًا وَیُصبِحُ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَقِیلًا دَھِیْنًا وَکَانَ اَبُوْطَالِبٍ یُقَرِّبُ اِلَی الصِّبْیَانِ صَفْحَتَھُمْ اَوَّلَ الْبُکْرَۃِ فَیَجْلِسُوْنَ وَیَنْتَھِبُوْنَ وَیَکُفُّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَدَہٗ فَلَا یَنْتَھِبُ مَعَھُمْ فَلَمَّا رَاٰی ذٰلِکَ عَمُّہٗ عَزَلَ لَہٗ طَعَامَہٗ عَلٰی حِدَۃٍ۔ کذا فی البدایۃ والنھایۃ ص۲۸۳ ج۲

رکھا ہے یہ وہی شخص ہو سکتا ہے جو تجھکو اپنی مخلوق بھر میں سب سے پیارا ہو۔ اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا اے آدم تمنے درست کہا بیشک وہ مجھکو تمام مخلوق میں سب سے پیارے ہیں اور جب تمنے ان کے حق کے وسیلہ سے مجھ سے سوال کیا ہے تو جاؤ میں نے تم کو بخشدیا اگر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہوتے تو میں تمکو بھی پیدا نہ کرتا۔ (حاکم) بیہقی کہتے ہیں کہ اسمیں ایک راوی عبد الرحمان بن زید بن اسلم ہیں اور وہ ضعیف ہیں۔

۱۲۹۱۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ابو طالب کی اولاد جب صبح کو اٹھتی تو عام دستور کے مطابق انکی آنکھوں میں میل ہوتا اور پراگندہ بال ہوتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاف ستھرے اٹھتے یوں معلوم ہوتا کہ جیسے آپ کے بالوں میں تیل لگا ہوا ہے ابو طالب کا طریقہ یہ تھا کہ اپنے بچوں کو سویرے ناشتہ دیدیتے بچے بیٹھ جاتے اور بچوں کی عادت کی طرح چھینا جھپٹی شروع کر دیتے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہاتھ کھینچے رکھتے اور دوسرے بچوں کے ساتھ اس چھینا جھپٹی میں شریک نہ ہوتے جب ابو طالب نے آپ کی یہ کیفیت دیکھی تو پھر آپ کو علیحدہ ناشتہ دینے لگے تاکہ آپ پیٹ بھر کر کھا سکیں۔

۱۲۹۱۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور تاریخ البدایہ والنہایہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے آپ کے نسب شریف کا تذکرہ کیا ہے اور تاریخ واحادیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ آپ عرب میں سب کے نزدیک مسلم شریف النسب تھے جیسا کہ ہرقل کی حدیث میں ابو سفیان کی شہادت پہلے گذر چکی ہے اسکے بعد آپ کی ولادت باسعادت کی تاریخ پر بحث کی ہے پھر آپ کے والد ماجد حضرت عبد اللہ کی پیشانی پر آپکا نور چمکنا اور حضرت آمنہ کے حاملہ ہوجانیکے بعد اس نور کا محسوس نہونا اور اس سلسلہ میں عرب کی عورتوں کے اشتیاق کے سب واقعات بھی ذکر فرمائے ہیں اس کے بعد جس شب میں آپکی ولادت باسعادت ہوئی ہے اس کے عجائبات کا مفصل تذکرہ لکھا ہے اور اسکے بعد ایوان کسریٰ کے کنگروں کا گرنا اور آتشکدہ فارس کی آگ گل ہوجانے وغیرہ پر بھی مستقل ایک باب باندھا ہے اسی طرح آپ کے عہد طفولیت اور شباب کے ایک ایک واقعہ کو علیحدہ علیحدہ لکھکر آپ کی بعثت کا ذکر شروع کیا ہے اور اس سلسلہ میں تورات وانجیل کی بشارات اور علماء یہود ونصاریٰ کی بشارتیں اور شہادتیں بھی پوری تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائی ہیں حتیٰ کہ سیف بن ذی یزن کی بشارت پر ایک مستقل فصل قائم کی ہے۔ اور آخر میں جنات کے مختلف آوازوں، کاہنوں کی خبروں اور بتوں سے آپ کے ظہور کی جو شہادتیں سنی گئیں تھیں انکو بھی ایک مستقل باب میں ذکر فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں احادیث وتاریخ کے علاوہ شعراء عرب کے اشعار کا بھی ایک اچھا خاصہ حصہ نقل فرمایا ہے جسکے مطالعہ سے

(باقی ص۶۰۳ پر)

نبذۃ من حلیتہ الشریفۃ تنبئک عن نبوتہ وتبانتہ صلوات اللہ وسلامہ علیہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختصر حلیہ شریفہ جسکو پڑھکر آپکی نبوت اور آپکی شان کی یکتائی کا کچھ اندازہ ہوتا ہے

شمائل نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے والوں سے ایک ضروری خطاب

واضح رہے کہ آج یہ عام دستور ہے کہ ہر کتاب کے شروع میں اس کے مؤلف کا فوٹو بھی لگایا جاتا ہے جسکی بڑی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ علم قیافہ کی رو سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ اس کتاب کا مؤلف کس خلوص نیت، کس علو ہمت، کس علم و فراست اور کن اخلاق و ملکات کا مالک ہے تاکہ اس کے کلام کے مطالعہ سے قبل اس کے طالع انور کا مطالعہ کرلینا کتاب کے دیباچہ کا کام دے گزشتہ اوراق میں آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و شمائل اور آپکی پاکیزہ و بلند تعلیمات اور آپکی محیر العقول تربیت کا کچھ نقشہ ملاحظہ فرما چکے ہیں اب آپ کا مختصر حلیہ شریفہ بھی ملاحظہ کر لیجئے تاکہ آپ کے کمالات علمیہ کو دیکھکر آپ کے مقدس حلیہ کی کچھ تصویر آپ کے سامنے آسکے اور آپکی مبارک صورت کو پڑھکر آپکے علمی کمالات کا کچھ اندازہ کیا جاسکے۔ ہرچند کہ حسن لامحدود کا محدود الفاظ و حروف سے کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے تاہم اس بارے میں آپ کے مقدس صحابہؓ آپ کے حلیہ شریفہ کے متعلق جو کچھ بیان میں لاسکتے تھے وہ لے آئے ہیں یہ انکا بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس غائب امت کے لئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے محروم تھی کم از کم یہی سامان تسلی چھوڑ دیا ہے۔ ع

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

لہٰذا اب آپ اسی کو پورے ذوق و شوق اور پورے ایمان و ایقان کے ساتھ پڑھیں اور بار بار پڑھیں شاید کہ اسی راستہ سے آپ کے قلب میں حسن نبوت کا عشق سما جائے اور اسطرح پروردگار کے حسن حقیقی کا کوئی جلوہ نصیب ہونے کی راہ کھل جائے ؎

دادیم ترا ز گنج مقصود نشاں ! گر ما نرسیدیم تو شاید برسی !

(بقیہ ص۶۰۲) معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جب دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں تو اسوقت عالم میں انقلاب کا عالم کیا ہوتا ہے انکے سچائی کے نشانات انسے پہلے اور انکے ساتھ کسدرجہ کثرت اور صفائی کے ساتھ عالم کے ذرہ ذرہ اور اسکے گوشہ گوشہ سے ہویدا ہوتے ہیں۔ پھر جب نبی امی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو کس طرح یہ سارے نشانات آسمان و زمین پر چمک رہے تھے کتب سماویہ اور اہل کتاب کے علماء ہی نہیں بلکہ جن و انس کا سارا عالم کس طرح آپ کے لئے چشم براہ تھے اور اس سے گذر کر عالم جمادات بھی آپ کی آمد آمد کی خبریں دے رہا تھا لیکن اس مادی دنیا میں کون ہے جو ان حقائق کی دنیا کا اقرار کرکے اپنی مادی دنیا کو ٹھیس لگانا برداشت کرسکے اس لئے بیزار حیلہ کرکے اسکے انکار کے درپے ہے۔

یہاں بڑی اہمیت کے ساتھ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ صحابہ کرام نے شمائل نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نقل کرنے میں ذرا سی رنگ آمیزی سے بھی کام نہیں لیا ہے یہی وجہ ہے کہ احادیث میں یہ باب آپکو سب سے مختصر ملیگا ورنہ ادب کی لغت کی وسعت پھر محبت کا میدان صرف محبت کا نہیں بلکہ ایمان کا بھی نہ معلوم یہاں ایک ایک صحابی کتنے دفتر کے دفتر کھولکر رکھدیتا مگر نبوت کے یہ تربیت یافتہ جب اپنی عام بات چیت میں بھی مبالغہ آمیزی اور شاعرانہ خیال بندیوں کو چھوڑ چکے ہوں تو حسن نبوت کے بیان کرنے میں بھلا وہ ان تعبیرات سے کیا کام لیتے اسلئے آپ اب ان احادیث کو اس جزم ویقین کے ساتھ پڑھئے کہ راوی نے جو بھی کہا ہے وہ کسی مبالغہ کے بغیر حرف بحرف وہی کہا ہے جو اسکی آنکھوں نے دیکھا۔ حسرت ہے کہ اس اہم باب کو پڑھنے والے عام طور پر ادب کی کتب کی طرح عبارت کا حل کر کے آگے چلدیتے ہیں اور یہ غور نہیں کرتے کہ صرف شمائل ہی کے آئینہ میں حسن نبوت کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے۔

۱۲۹۲- عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ شَمِطَ مُقَدَّمُ رَأْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ وَكَانَ إِذَا ادَّهَنَ لَمْ يَتَبَيَّنْ وَإِذَا شَعِثَ رَأْسُهٗ تَبَيَّنَ وَكَانَ كَثِيْرَ شَعْرِ اللِّحْيَةِ فَقَالَ رَجُلٌ وَجْهُهٗ مِثْلُ السَّيْفِ قَالَ لَا بَلْ كَانَ مِثْلَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَكَانَ مُسْتَدِيْرًا وَرَأَيْتُ الْخَاتَمَ عِنْدَ كَتِفِهٖ مِثْلَ بَيْضَةِ الْحَمَامَةِ يُشْبِهُ جَسَدَهٗ۔ رواہ مسلم۔

۱۲۹۳- عَنْ أَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ الْبَائِنِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ وَلَيْسَ بِالْأَبْيَضِ الْأَمْهَقِ وَلَا بِالْآدَمِ وَلَيْسَ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبْطِ بَعَثَهُ اللّٰهُ عَلٰى

۱۲۹۲- جابر بن سمرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر کے اگلے حصہ کے بالوں میں اور داڑھی میں کچھ سفیدی آگئی تھی مگر وہ اتنی قلیل تھی کہ جب تیل لگاتے تو تیل کی چمک کی وجہ سے وہ سفیدی ظاہر نہ ہوتی اور جب سر میں تیل نہ ہوتا تو چمکتی آپکی ریش مبارک گنجان تھی۔ ایک شخص نے پوچھا کیا آپ کا روئے انور تلوار کی طرح روشن تھا؟ تو دوسروں نے کہا نہیں بلکہ آفتاب و ماہتاب کی طرح چمکدار اور گولائی لئے ہوئے تھا تلوار لمبی ہوتی ہے، میں نے مہر نبوت کو دیکھا ہے وہ بائیں ہڈی کے پاس تھی جیسے کبوتر کا انڈا اور اسکا رنگ وہی تھا جو آپ کے جسم مبارک کا رنگ تھا۔ (مسلم)

۱۲۹۳- انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت دراز قامت تھے اور نہ پست قد اور نہ بالکل چونے کی طرح سفید اور نہ گندم گوں (بلکہ سرخی مائل گورے) آپ کے بال کچھ خمیدہ نہ بہت زیادہ گھونگر والے اور نہ بالکل سیدھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپکو چالیس سال کی عمر میں منصب نبوت سے نوازا اس کے بعد دس سال آپ مکہ مکرمہ میں رہے پھر دس سال مدینہ طیبہ میں اسطرح جب آپ کی وفات ہوئی تو اسوقت آپکی

رَأْسِ أَرْبَعِينَ سَنَةً فَأَقَامَ بِمَكَّةَ عَشْرَ سِنِينَ وَبِالْمَدِينَةِ عَشْرَ سِنِينَ وَتَوَفَّاهُ اللّٰهُ عَلٰى رَأْسِ سِتِّيْنَ سَنَةً وَلَيْسَ فِي رَأْسِهٖ وَلِحْيَتِهٖ عِشْرُونَ شَعْرَةً بَيْضَاءَ (وفي رواية) يَصِفُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ رَبْعَةً مِنَ الْقَوْمِ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ أَزْهَرَ اللَّوْنِ وَقَالَ كَانَ شَعْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى أَنْصَافِ أُذُنَيْهِ وَعَاتِقِهٖ متفق عليه وفي رواية البخاري قَالَ كَانَ ضَخْمَ الرَّأْسِ وَالْقَدَمَيْنِ لَمْ أَرَ بَعْدَهٗ وَلَا قَبْلَهٗ مِثْلَهٗ وَكَانَ بَسْطَ الْكَفَّيْنِ وَفِي أُخْرٰى لَهٗ قَالَ كَانَ شَثْنَ الْقَدَمَيْنِ وَالْكَفَّيْنِ۔

۱۲۹۴۔ عَنْ أَبِي عُبَيْدَةَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ قُلْتُ لِلرُّبَيِّعِ بِنْتِ مُعَوِّذِ بْنِ عَفْرَاءَ صِفِي لَنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ يَا بُنَيَّ لَوْ رَأَيْتَهٗ رَأَيْتَ الشَّمْسَ طَالِعَةً۔ رواه الدارمي۔

۱۲۹۵۔ وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي لَيْلَةٍ إِضْحِيَانٍ فَجَعَلْتُ أَنْظُرُ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَإِلَى الْقَمَرِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ حَمْرَاءُ فَإِذَا هُوَ أَحْسَنُ عِنْدِي مِنَ الْقَمَرِ رواه الترمذي والدارمي۔

عمر مبارک ساٹھ برس کی تھی (راوی نے کسر شمار نہیں کی ہے) اسوقت تک آپ کی ریش مبارک اور سر میں بیس بال بھی سفید نہوئے تھے۔ دوسری روایت میں اسطرح ہے کہ وہ آپکا حلیہ مبارک یوں بیان فرماتے تھے کہ آپ میانہ قد تھے نہ بہت لانبے نہ ٹھنگنے آپکا رنگ روشن اور چمکدار تھا اور آپ کے بالوں کے متعلق یہ بیان کرتے تھے کہ بعض اوقات وہ نصف کانوں تک بھی ہوتے تھے۔ بخاری کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ کا سر مبارک بڑا تھا اور پیر بھی کسی قدر بڑے تھے میں نے آپ جیسا حسین وخوبصورت نہ آپسے پہلے کوئی دیکھا اور نہ آپکے بعد اور آپکی ہتھیلیاں کشادہ تھیں۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ کے پیر اور ہتھیلیاں پُر گوشت اور گداز تھیں۔

۱۲۹۴۔ ابو عبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر روایت کرتے ہیں کہ میں نے ربیع بنت معوذ سے عرض کی آپ ہم سے کچھ رسول اللہ صلعم کا حلیہ مبارک بیان فرمائیں انھوں نے فرمایا عزیز من! اگر تم آپکو دیکھتے تو یہ دیکھتے کہ آفتاب نکل آیا ہے۔ (دارمی)

۱۲۹۵۔ جابر بن سمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چاندنی رات میں دیکھا تو میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور کبھی چاند کو دیکھنے لگا اسوقت آپ سرخ حلہ پہنے ہوئے تھے مجھے تو آپ چاند سے زیادہ حسین نظر آتے تھے۔ (ترمذی شریف۔ دارمی)

۱۲۹۶۔ عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرْبُوعًا بَعِيْدَ مَا بَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ لَهُ شَعْرٌ بَلَغَ شَحْمَةَ اُذُنَيْهِ رَأَيْتُهُ فِي حُلَّةٍ حَمْرَاءَ لَمْ اَرَ شَيْئًا قَطُّ اَحْسَنَ مِنْهُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ مِنْ ذِي لِمَّةٍ اَحْسَنَ فِي حُلَّةٍ حَمْرَاءَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَعْرُهُ يَضْرِبُ مَنْكِبَيْهِ بَعِيْدَ مَا بَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ۔

۱۲۹۷۔ عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَلِيْعَ الْفَمِ اَشْكَلَ الْعَيْنِ مَنْهُوْشَ الْعَقِبَيْنِ قِيْلَ لِسِمَاكٍ مَا ضَلِيْعُ الْفَمِ قَالَ عَظِيْمُ الْفَمِ قِيْلَ مَا اَشْكَلُ الْعَيْنِ قَالَ طَوِيْلُ شِقِّ الْعَيْنِ قِيْلَ مَا مَنْهُوْشُ الْعَقِبَيْنِ قَالَ قَلِيْلُ لَحْمِ الْعَقِبِ۔ رواه مسلم

۱۲۹۸۔ عَنْ اَبِي الطُّفَيْلِ قَالَ رَاَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اَبْيَضَ مَلِيْحًا مُقَصَّدًا رواه مسلم۔

۱۲۹۹۔ عَنْ ثَابِتٍ قَالَ سُئِلَ اَنَسٌ عَنْ خِضَابِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّهُ لَمْ يَبْلُغْ مَا يَخْضِبُ لَوْ شِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتِهِ فِي لِحْيَتِهِ وَفِي رِوَايَةٍ لَوْ شِئْتُ اَنْ اَعُدَّ شَمَطَاتٍ كُنَّ فِي رَاْسِهِ فَعَلْتُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّمَا كَانَ الْبَيَاضُ

۱۲۹۶۔ براءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میانہ قد تھے آپ کے دونوں شانوں کے درمیان ذرا فاصلہ تھا آپ کے بال تھے جو کبھی کانوں کی لوتک ہوتے تھے میں نے ایک مرتبہ آپ کو سرخ لباس میں دیکھا تو آپ سے بڑھکر میں نے کسی کو خوبصورت نہیں دیکھا متفق علیہ۔ مسلم کی روایت میں اس طرح ہے کہ میں نے سرخ لباس میں کسی گیسو والے شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھکر خوبصورت نہیں دیکھا۔ آپ کے بال کبھی شانوں تک بھی آجاتے تھے آپ کے دونوں شانوں کے درمیان کچھ فاصلہ تھا آپ نہ بہت دراز قامت نہ زیادہ پست قد تھے۔

۱۲۹۷۔ جابر بن سمرةؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کشادہ دہن والے تھے آپکی آنکھیں لمبی آپکی ایڑیاں باریک تھیں۔ سماک راوی سے سوال کیا گیا کہ ضلیع الفم کا مطلب کیا ہے انھوں نے کہا کہ منہ کا دہانہ بڑا ہونا پھر ان سے پوچھا گیا کہ اشکل العین کے معنی کیا ہیں انھوں نے کہا کہ آنکھوں کا خانہ لمبا ہونا پھر پوچھا گیا کہ منہوش العقبین کے معنی کیا ہیں انھوں نے کہا کہ ایڑیوں کا پر گوشت نہ ہونا۔ مسلم

۱۲۹۸۔ ابو الطفیل بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا گورے رنگ اور میانہ قد کے تھے۔ (مسلم)

۱۲۹۹۔ ثابت روایت کرتے ہیں کہ انسؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے متعلق دریافت

فِي عَنفَقَتِهِ وَفِي الصُّدغَينِ وَفِي الرَّأسِ نَبْذٌ ۔

۱۳۰۰۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ مَا رَأَيْتُ شَيْئًا أَحْسَنَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَنَّ الشَّمْسَ تَجْرِي فِي وَجْهِهِ وَمَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَسْرَعَ فِي مَشْيِهِ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَنَّمَا الْأَرْضُ تُطْوَى لَهُ إِنَّا لَنُجْهِدُ أَنْفُسَنَا وَإِنَّهُ لَغَيْرُ مُكْتَرِثٍ ۔ (رواہ الترمذی)

۱۳۰۱۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ فِي سَاقَيْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُمُوشَةٌ وَكَانَ لَا يَضْحَكُ إِلَّا تَبَسُّمًا وَكُنْتُ إِذَا نَظَرْتُ إِلَيْهِ قُلْتُ أَكْحَلُ الْعَيْنَيْنِ وَلَيْسَ بِأَكْحَلَ ۔ رواہ الترمذی

۱۳۰۲۔ عَنْ إِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفْلَجَ الثَّنِيَّتَيْنِ إِذَا تَكَلَّمَ رُئِيَ كَالنُّورِ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ ثَنَايَاهُ ۔ رواہ الدارمی ۔

۱۳۰۳۔ عَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سُرَّ اسْتَنَارَ وَجْهُهُ حَتّٰى كَأَنَّ وَجْهَهُ قِطْعَةُ قَمَرٍ وَكُنَّا نَعْرِفُ ذٰلِكَ ۔ متفق علیہ ۔

کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ کے بال اتنے سفید ہی کہاں تھے کہ ان کے خضاب لگانے کی نوبت آتی آپکی ریش مبارک میں کل اتنے بال سفید تھے کہ اگر میں انکو شمار کرنیکا ارادہ کرتا تو شمار کرلیتا ۔ مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ صرف چند بال آپ کے ریش بچہ کے سفید ہوئے تھے اور کچھ کنپٹیوں میں اور کچھ آپ کے سر میں ۔

۱۳۰۰۔ ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے زیادہ حسین کسی کو نہیں دیکھا یوں معلوم ہوتا تھا گویا کہ اسمیں آفتاب چمک رہا ہے اور آپ سے زیادہ تیز رفتار بھی میں نے کسی کو نہیں دیکھا جب آپ چلتے تو یوں معلوم ہوتا گویا زمین آپ کے لئے لپٹی جا رہی ہے آپ اپنی معمولی رفتار سے چلتے تھے اور ہم مشکل سے آپ کے ساتھ چل سکتے تھے ۔ (ترمذی)

۱۳۰۱۔ جابر بن سمرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پنڈلیاں پر گوشت نہ تھیں ہلکی ہلکی سی ہوئی تھیں اور آپ کھل کھلا کر نہ ہنستے صرف مسکراتے تھے جب میں آپ پر نظر کرتا تو اپنے دلمیں کہتا کہ آپ سُرمہ لگائے ہوئے ہیں مگر آپ سرمہ لگائے ہوئے نہوتے تھے ۔ (قدرتی سرگیں چشم تھے) ترمذی شریف

۱۳۰۲۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے دو دانتوں کے درمیان کشادگی تھی جب آپ گفتگو فرماتے تو یوں معلوم ہوتا کہ آپکے دانتوں کے درمیان سے نور پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے ۔ (دارمی)

۱۳۰۳۔ کعب بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خوش ہوتے تو آپ کا چہرہ انور ایسا چمکنے لگتا جیسا چودھویں رات کے چاند کا ٹکڑا ہے اور اسی سے ہم آپ کی خوشی کو پہچان لیتے ۔

(متفق علیہ)

۱۳۰۴۔ عَنْ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ ضَخْمَ الرَّأْسِ وَاللِّحْيَةِ شَثْنَ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ مُشْرَبًا حُمْرَةً ضَخْمَ الْكَرَادِيْسِ طَوِيْلَ الْمَسْرُبَةِ اِذَا مَشٰى تَكَفَّأَ تَكَفُّؤًا كَاَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ لَمْ اَرَ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح۔

۱۳۰۵۔ عَنْ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ كَانَ اِذَا وَصَفَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمْ يَكُنْ بِالطَّوِيْلِ الْمُمَّغِطِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ الْمُتَرَدِّدِ وَكَانَ رَبْعَةً مِنَ الْقَوْمِ وَلَمْ يَكُنْ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبِطِ كَانَ جَعْدًا رَجِلًا وَلَمْ يَكُنْ بِالْمُطَهَّمِ وَلَا بِالْمُكَلْثَمِ وَكَانَ فِي الْوَجْهِ تَدْوِيْرٌ اَبْيَضُ مُشْرَبٌ اَدْعَجُ الْعَيْنَيْنِ اَهْدَبُ الْاَشْفَارِ جَلِيْلُ الْمُشَاشِ وَالْكَتَدِ اَجْرَدُ ذُوْ مَسْرُبَةٍ شَثْنُ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ اِذَا مَشٰى يَتَقَلَّعُ كَاَنَّمَا يَمْشِيْ فِيْ صَبَبٍ وَاِذَا الْتَفَتَ اِلْتَفَتَ مَعًا بَيْنَ كَتِفَيْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ وَهُوَ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ اَجْوَدُ النَّاسِ مِنْهُ

۱۳۰۴۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت دراز قامت تھے نہ پست قد آپ کا سر بڑا ریشِ مبارک گنجان ہتھیلیاں اور پیر گداز اور پُر گوشت رنگ میں سُرخی جسم کے جوڑ بڑے پیٹ پر بالوں کی دھاری لمبی جب چلتے تو سامنے کو جھک کر یوں معلوم ہوتا گویا پستی میں اتر رہے ہیں آپ جیسا حسین نہ میں نے آپ سے پہلے دیکھا نہ بعد میں۔ (ترمذی شریف)

۱۳۰۵۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب حضور کا حلیہ مبارک بیان فرماتے تو کہا کرتے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نہ لانبے تھے نہ زیادہ پستہ قد بلکہ میانہ قد لوگوں میں سے حضورؐ کے بال نہ بالکل خمیدہ تھے نہ بالکل سیدھے بلکہ کچھ خمیدگی لئے ہوئے تھے نہ آپ موٹے بدن کے تھے نہ گول چہرہ کے البتہ تھوڑی سی گولائی آپ کے چہرہ میں تھی (یعنی چہرۂ انور نہ بالکل گول تھا نہ بالکل لانبا بلکہ دونوں کے درمیان تھا) حضور کا رنگ سفید سرخی مائل تھا آپ کی آنکھیں نہایت سیاہ تھیں اور مژگاں دراز بدن کے جوڑ موٹے تھے (مثلاً کہنیاں اور گھٹنے) ایسے ہی دونوں شانوں کے درمیان کی جگہ بھی موٹی اور پُر گوشت تھی آپکے بدن مبارک پر (معمولی طور سے زائد) بال نہیں تھے (یعنی بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بدن پر بال ہی بال ہوجاتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن پر خاص خاص حصوں کے علاوہ جیسے بازو وپنڈلیں وغیرہ ان کے علاوہ اور کہیں بال نہیں تھے) آپ کے سینہ سے ناف تک بالوں کی لکیر تھی آپ کے ہاتھ اور قدم مبارک پر گوشت تھے جب آپ تشریف لے چلتے تو قدموں کو قوت سے اٹھاتے گویا کہ پستی میں اتر رہے ہیں اور ہلکے سے رکھتے جب آپ کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن کے ساتھ توجہ فرماتے (یعنی صرف گردن پھیر کر متکبرانہ متوجہ نہ ہوتے تھے) آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوت

وَاَصْدَقُ النَّاسِ لَهْجَةً وَاَلْيَنُهُمْ عَرِيْكَةً وَاَكْرَمُهُمْ عَشِيْرَةً مَنْ رَآهُ بَدِيْهَةً هَابَهُ وَمَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةً اَحَبَّهُ يَقُوْلُ نَاعِتُهُ لَمْ اَرَ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ مِثْلَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رواه الترمذی۔

۱۳۰۶۔ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلْتُ خَالِيْ هِنْدَ بْنَ اَبِيْ هَالَةَ وَكَانَ وَصَّافًا عَنْ حِلْيَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا اَشْتَهِيْ اَنْ يَصِفَ لِيْ مِنْهَا شَيْئًا اَتَعَلَّقُ بِهٖ فَقَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخْمًا مُفَخَّمًا يَتَلَأْلَأُ وَجْهُهُ تَلَأْلُؤَ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ اَطْوَلَ مِنَ الْمَرْبُوْعِ وَاَقْصَرَ مِنَ الْمُشَذَّبِ عَظِيْمَ الْهَامَةِ رَجِلَ الشَّعْرِ اِنِ انْفَرَقَتْ عَقِيْقَتُهُ فَرَقَ وَاِلَّا فَلَا يُجَاوِزُ شَعْرُهُ شَحْمَةَ اُذُنَيْهِ اِذَا هُوَ وَفَّرَهُ اَزْهَرَ اللَّوْنِ وَاسِعَ الْجَبِيْنِ اَزَجَّ الْحَوَاجِبِ سَوَابِغَ مِنْ غَيْرِ قَرَنٍ بَيْنَهُمَا عِرْقٌ يُدِرُّهُ الْغَضَبُ اَقْنَى الْعِرْنِيْنِ لَهُ نُوْرٌ يَعْلُوْهُ يَحْسَبُهُ مَنْ لَمْ يَتَاَمَّلْهُ اَشَمَّ كَثَّ اللِّحْيَةِ سَهْلَ الْخَدَّيْنِ ضَلِيْعَ الْفَمِ۔

تھی اور تھے بھی آپ خاتم النبیین یعنی یہ اس کی علامت تھی کہ آپ سب نبیوں کے آخر میں تھے۔ آپ سب سے زیادہ سخی دل والے تھے اور سب سے زیادہ سچی زبان والے سب سے زیادہ نرم طبیعت والے تھے اور سب سے زیادہ شریف گھرانے والے تھے غرض آپ دل زبان طبیعت خاندان اوصاف ذاتی اور نسبی ہر چیز میں سب سے زیادہ افضل تھے آپکو یکایک جو شخص دیکھتا مرعوب ہو جاتا تھا یعنی آپ کا وقار ودبدبہ دیکھنے والا رعب کی وجہ سے ہیبت میں آجاتا تھا البتہ جو شخص پہچان کر آپ کے ساتھ رہنے لگتا وہ دل وجان سے آپکا فریفتہ ہو جاتا تھا آپ کا حلیہ مبارک بیان کرنیوالا صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا باجمال وباکمال نہ حضور سے پہلے دیکھا نہ بعد میں دیکھا۔ (ترمذی)

۱۳۰۶۔ حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک دریافت کیا اور وہ آپکا حلیہ بیان کرنیکا بڑا شغف رکھتے تھے میں نے چاہا کہ وہ آپ کے اوصاف جمیلہ کا میرے سامنے بھی کچھ ذکر فرمائیں تاکہ میں ان کو اپنے اندر پیدا کرنیکی کوشش کروں (حضرت امام حسنؓ آپ کے وصال کے وقت بہت کم سن تھے اس لئے اسوقت تک ان امور پر غور کرنیکا ان کو موقعہ نہ ملا تھا) چنانچہ انکی فرمائش پر انھوں نے آپکا حلیہ اسطرح بیان فرمایا کہ آپ خود بڑے بھاری بھرکم تھے اور لوگوں کی نظروں میں بھی بزرگ وبرتر تھے، آپ کا روئے انور اسطرح چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند پورے میانہ قد والے سے ذرا دراز قامت اور بالکل لمبے بے ڈول سے پست قامت۔ سر مبارک بڑا۔ بال اتنے خمیدہ جیسے گھونگر والے بالوں میں کنگھی کی ہو۔ اگر سہولت سے مانگ نکل آتی تو نکال لیتے ورنہ زیادہ تکلف

مُفَلَّجَ الْأَسْنَانِ۔ دَقِيقَ الْمَسْرُبَةِ كَأَنَّ عُنُقَهٗ جِيدُ دُمْيَةٍ فِي صَفَاءِ الْفِضَّةِ مُعْتَدِلَ الْخَلْقِ
بَادِنٌ مُتَمَاسِكٌ۔ سَوَاءُ الْبَطْنِ وَالصَّدْرِ۔ بَعِيدُ مَا بَيْنَ مَنْكِبَيْنِ۔ ضَخْمُ الْكَرَادِيسِ
اَنْوَرُ الْمُتَجَرَّدِ۔ مَوْصُولُ مَا بَيْنَ اللَّبَّةِ وَالسُّرَّةِ بِشَعْرٍ يَجْرِي كَالْخَطِّ۔ عَارِي الثَّدْيَيْنِ
وَالْبَطْنِ مِمَّا سِوَى ذٰلِكَ أَشْعَرُ الذِّرَاعَيْنِ وَالْمَنْكِبَيْنِ وَاَعَالِي الصَّدْرِ۔ طَوِيلُ الزَّنْدَيْنِ
رَحْبُ الرَّاحَةِ۔ شَثْنُ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ سَائِلُ الْأَطْرَافِ اَوْقَالَ شَائِلُ الْأَطْرَافِ خُمْصَانُ
الْأَخْمَصَيْنِ۔ مَسِيحُ الْقَدَمَيْنِ يَنْبُو عَنْهُمَا الْمَاءُ۔ إِذَا زَالَ زَالَ قَلْعًا يَخْطُو تَكَفِّيًا وَيَمْشِي
هَوْنًا۔ ذَرِيعُ الْمِشْيَةِ إِذَا مَشٰى كَأَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ۔ وَإِذَا الْتَفَتَ الْتَفَتَ جَمِيعًا
خَافِضُ الطَّرْفِ نَظَرُهٗ إِلَى الْأَرْضِ أَكْثَرُ مِنْ نَظَرِهٖ إِلَى السَّمَاءِ جُلُّ نَظَرِهِ الْمُلَاحَظَةُ يَسُوقُ
أَصْحَابَهٗ يَبْدَأُ مَنْ لَقِيَ بِالسَّلَامِ۔ رواہ الترمذی

تو فرماتے جب آپکے گیسو دراز ہو جاتے تو کانوں کی لو سے ذرا نیچے آجاتے۔ رنگ بڑا رونق دار اور روشن،
پیشانی کشادہ۔ ابرو خمدار باریک اور گنجان اور دونوں ابرو جدا جدا درمیان میں ایک رگ جو غصہ میں اُبھر
جاتی۔ بلند بینی اسپر چمکتا ہوا نور سرسری طور پر دیکھنے والالوں سمجھے کہ شاید آپکی ناک ہی بلند ہے (حالانکہ وہ نور کی چمک
ہوتی) ریش مبارک گنجان۔ تنے ہوئے رخسار (لٹکے ہوئے پر گوشت نہیں) فراخ دھن۔ دندانِ مبارک کے درمیان
ذرا ذرا سا فاصلہ۔ سینہ سے لیکر ناف تک بالوں کی ایک باریک سی دھاری۔ گردن موتی کی سی تراشی ہوئی
اور چاندی کی طرح سفید اور چمکدار۔ نہایت معتدل پُر گوشت جسم۔ گٹھے ہوئے سینہ اور شکم ہموار (یعنی پیٹ
بڑا نہ تھا) دونوں مونڈھوں کے درمیان ذرا فاصلہ اور کشادگی۔ مضبوط جوڑ و بند۔ کپڑوں سے باہر جسم کا حصہ گورا تو
ڈھکے ہوئے کا کیا کہنا) حلق اور ناف کے درمیان بالوں کی ایک لکیر اس کے علاوہ چھاتیاں اور پیٹ بالوں سے
خالی البتہ دونوں بازو اور کندھوں اور سینہ کے بالائی حصے پر بال تھے۔ آپ کی کلائیاں دراز ہتھیلیاں فراخ
دونوں ہاتھ اور پیر پُر گوشت اور گداز اور انگلیاں درازی مائل پیروں کے تلوے ذرا گہرے۔ قدم ایسے چکنے
کہ پانی اسپر نہ ٹھہر سکے جب قدم اٹھاتے تو زمین سے اٹھاکر (یعنی گھسیٹ کر نہ چلتے) اور آگے کو جھککر جب زمین
پر قدم رکھتے تو آہستہ (متکبرانہ نہیں) نیز رفتاریوں معلوم ہوتا گویا پستی میں اتر رہے ہیں جب کسی کی طرف متوجہ
ہوتے تو پورے جسم کے ساتھ (متکبروں کی طرح نہیں) نظریں نیچی بہ نسبت آسمان کے آپکی نظر اکثر زمین
کی طرف رہتی ہاں اگر وحی کا انتظار ہوتا تو آسمان کی طرف دیکھتے) اکثر گوشہ چشم سے دیکھتے (حیا کی وجہ
سے) چلنے میں اپنے صحابہ کو آگے رکھتے اور جس شخص سے بھی ملتے پہلے اس کو خود سلام کرتے (سبحان اللہ کیا حسن
سیرت اور کیسا جمال صورت تھا) (ترمذی شریف)

۱۳۰۷ - عَنِ الْحَسَنِ فِي حَدِيْثِهِ عَنْ خَالِهِ قَالَ الْحَسَنُ فَكَتَمْتُهَا الْحُسَيْنَ زَمَانًا ثُمَّ حَدَّثْتُهُ فَوَجَدْتُهُ قَدْ سَبَقَنِي إِلَيْهِ فَسَأَلَهُ عَمَّا سَأَلْتُهُ عَنْهُ وَوَجَدْتُهُ قَدْ سَأَلَ أَبَاهُ عَنْ مَدْخَلِهِ وَعَنْ مَخْرَجِهِ وَشَكْلِهِ فَلَمْ يَدَعْ مِنْهُ شَيْئًا قَالَ الْحُسَيْنُ فَسَأَلْتُ أَبِي عَنْ دُخُولِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كَانَ إِذَا أَوَى إِلَى مَنْزِلِهِ جَزَّأَ دُخُولَهُ ثَلَاثَةَ أَجْزَاءٍ جُزْءًا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَجُزْءًا لِأَهْلِهِ وَجُزْءًا لِنَفْسِهِ ثُمَّ جَزَّأَ جُزْءَهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّاسِ فَيَرُدُّ ذٰلِكَ بِالْخَاصَّةِ عَلَى الْعَامَّةِ وَلَا يَدَّخِرُ عَنْهُمْ شَيْئًا وَكَانَ مِنْ سِيْرَتِهِ فِي جُزْءِ الْأُمَّةِ إِيْثَارُ أَهْلِ الْفَضْلِ بِإِذْنِهِ وَقَسْمِهِ عَلَى قَدْرِ فَضْلِهِمْ فِي الدِّيْنِ فَمِنْهُمْ ذُو الْحَاجَةِ وَمِنْهُمْ ذُو الْحَاجَتَيْنِ وَمِنْهُمْ ذُو الْحَوَائِجِ فَيَتَشَاغَلُ بِهِمْ وَيَشْغَلُهُمْ فِيْمَا يُصْلِحُهُمْ وَالْأُمَّةَ مِنْ مَسْأَلَتِهِمْ عَنْهُ وَإِخْبَارِهِمْ بِالَّذِي يَنْبَغِي لَهُمْ وَيَقُوْلُ لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ وَأَبْلِغُوْنِي حَاجَةَ مَنْ لَا يَسْتَطِيْعُ إِبْلَاغَهَا فَإِنَّهُ مَنْ أَبْلَغَ سُلْطَانًا حَاجَةَ مَنْ لَا يَسْتَطِيْعُ إِبْلَاغَهَا ثَبَّتَ اللّٰهُ قَدَمَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

۱۳۰۷ | حضرت امام حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ گذشتہ روایت فرما کر کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تک اس حدیث کو میں نے اپنے بھائی حسینؓ سے ..... ذکر نہیں کیا پھر اس کے ذکر کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ تو مجھ سے پہلے وہ حدیث پوچھکر سن چکے تھے بلکہ جو میں نے پوچھا تھا وہ بھی میرے ماموں سے پوچھ چکے تھے اور اسکے علاوہ اپنے والد ماجد سے آپؐ کے اندر تشریف لانے اور باہر آنے اور صحابہؓ کے درمیان آپ کے طور وطریق کا حال بھی پوچھ چکے تھے حتیٰ کہ کوئی بات انھوں نے نہ چھوڑی تھی (اب سنو) امام حسینؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر تشریف لانے کے حالات دریافت کئے تو انھوں نے بیان کیا جب آپؐ اپنے گھر میں تشریف لاتے تو اسوقت کے تین حصے کرتے ایک حصہ اپنے رب کیلئے ایک اپنے گھر والوں کے لئے اور ایک اپنی راحت کے لئے پھر جو حصہ اپنے لئے رکھتے اسکو بھی خاص لوگوں کے ذریعے عام لوگوں تک پہونچا دیتے اور ان سے کسی بات کا اخفا نہ فرماتے تھے آپکی عادت مبارکہ اس جزء میں جو آپ کی امت کے لئے ہوتا یہ تھی کہ جو صاحبِ فضیلت لوگ ہوتے ان کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور ان کے درمیان بھی دینداری کا لحاظ مقدم رکھتے پس لوگوں میں کوئی شخص ایک ضرورت والا کوئی دو ضرورت والا ہوتا اور کسی کی ضرورتیں اور زیادہ ہوتیں تو آپ انکی ضروریات پورا فرمانے میں مشغول ہوجاتے اور انکو ایسی باتوں میں مشغول کر دیتے جو انکے بعد تمام امت کی اصلاح اور کار آمد کا سبب ہوں اس طرح پر کہ وہ اپنی ضرورت کی باتیں آپ سے پوچھتے رہتے اور آپ انکو جو ان کے مناسب ہوتا بتاتے جاتے اور یہ فرماتے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ان مضامین کو ان لوگوں کو بھی پہنچا

وَلَا يُذْكَرُ عِنْدَهُ إِلَّا ذٰلِكَ وَلَا يَقْبَلُ مِنْ أَحَدٍ غَيْرَهُ يَدْخُلُوْنَ رُوَّادًا وَلَا يَفْتَرِقُوْنَ إِلَّا عَنْ ذَوَاقٍ وَيَخْرُجُوْنَ أَدِلَّةً يَعْنِيْ عَلَى الْخَيْرِ قَالَ فَسَأَلْتُهُ عَنْ مَخْرَجِهٖ كَيْفَ كَانَ يَصْنَعُ فِيْهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْزُنُ لِسَانَهٗ إِلَّا فِيْمَا يَعْنِيْهِ وَيُؤَلِّفُهُمْ وَلَا يُنَفِّرُهُمْ وَيُكْرِمُ كَرِيْمَ كُلِّ قَوْمٍ وَيُوَلِّيْهِ عَلَيْهِمْ وَيُحَذِّرُ النَّاسَ وَيَحْتَرِسُ مِنْهُمْ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَطْوِيَ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ بِشْرَهٗ وَلَا خُلُقَهٗ وَيَتَفَقَّدُ أَصْحَابَهٗ وَيَسْأَلُ النَّاسَ عَمَّا فِي النَّاسِ وَيُحَسِّنُ الْحَسَنَ وَيُقَوِّيْهِ وَيُقَبِّحُ الْقَبِيْحَ وَيُوَهِّيْهِ. مُعْتَدِلُ الْأَمْرِ غَيْرُ مُخْتَلِفٍ وَلَا يَغْفُلُ مَخَافَةَ أَنْ يَغْفُلُوْا وَيَمَلُّوْا. لِكُلِّ حَالٍ عِنْدَهٗ عَتَادٌ لَا يُقَصِّرُ عَنِ الْحَقِّ وَلَا يُجَاوِزُهٗ. اَلَّذِيْنَ يَلُوْنَهٗ خِيَارُهُمْ أَفْضَلُهُمْ عِنْدَهٗ أَعَمُّهُمْ نَصِيْحَةً وَأَعْظَمُهُمْ عِنْدَهٗ مَنْزِلَةً أَحْسَنُهُمْ مُوَاسَاةً وَمُؤَازَرَةً قَالَ فَسَأَلْتُهُ عَنْ مَجْلِسِهٖ فَقَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُوْمُ وَلَا يَجْلِسُ إِلَّا عَلٰى ذِكْرٍ وَإِذَا انْتَهٰى إِلٰى قَوْمٍ جَلَسَ حَيْثُ يَنْتَهِيْ

جو یہاں موجود نہیں نیز دیکھو یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اپنی ضرورت کی خبر مجھکو نہیں دیسکتا تم اسکی خبر مجھکو دیدیا کرو کیونکہ جو شخص کسی اہل ضرورت کی ضرورت کسی با اختیار شخص کو پہونچادے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے قدم ڈگمگانے سے محفوظ رکھیگا بس آپ کے پاس ان ہی باتوں کا ذکر ہوتا تھا اور ان باتوں کے علاوہ آپ کسی سے اور کوئی بات نہ سنتے تھے آپ کی محفل میں جب لوگ آتے تو سائل اور محتاج کی حیثیت میں آتے اور جب واپس ہوتے تو دین کے ہادی بنکر واپس ہوتے اور جب اٹھتے تو ضرور کچھ نہ کچھ کھا پی کر اٹھتے (اگر اسوقت آپ کے گھر کچھ ہوتا) اور یہ بھی بیان فرمایا کہ میں نے آپکے باہر تشریف لانیکے حالات بھی پوچھے کہ آپ اسمیں کیا کیا کرتے تھے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان سوائے مفید اور ضروری باتوں کے ہر قسم کی باتوں سے محفوظ رکھتے تھے اور لوگوں کے ساتھ اسطرح پیش آتے کہ انکو اور محبت پیدا ہو اور نفرت نہ پیدا ہو ہر قبیلہ کے شریف شخص کی عزت کرتے اور اسکو ان پر والی اور افسر بناتے اور لوگوں کو بھی غیر ضروری باتوں سے بچنے کی ہدایت فرماتے اور خود بھی غیر ضروری اختلاط سے بچتے لیکن اس طرح کہ آپ کی خندہ پیشانی اور خوش خلقی میں ذرا فرق نہ آسکے اور اپنے رفقا کا حال دریافت کرتے رہتے اور لوگوں سے عام لوگوں کے حالات بھی پوچھتے اور اچھی بات کو اچھا کہتے اور اس کی تائید فرماتے اور بری بات کو برا کہتے اور اسکی تردید فرماتے ہر معاملہ میں اعتدال ہوتا افراط و تفریط کچھ نہیں لوگوں سے غافل نہو جاتے اس خطرہ سے کہ کہیں وہ غافل نہو جائیں یا اکتا جائیں۔ آپ کے یہاں ہر بات کا ایک انتظام تھا حق بات میں نہ ذرا سی کوتاہی کرتے اور نہ ذرا اس سے آگے تجاوز فرماتے۔ جو لوگ آپ کے خاص ہم نشین

بِهِ الْمَجْلِسُ وَيَأْمُرُ بِذٰلِكَ يُعْطِي كُلَّ جُلَسَائِهِ بِنَصِيبِهِ وَلَا يَحْسَبُ جَلِيسُهُ أَنَّ أَحَدًا أَكْرَمُ عَلَيْهِ مِنْهُ مَنْ جَالَسَهُ أَوْ فَاوَضَهُ فِي حَاجَةٍ صَابَرَهُ حَتّٰى يَكُونَ هُوَ الْمُنْصَرِفَ وَمَنْ سَأَلَهُ حَاجَةً لَمْ يَرُدَّهُ إِلَّا بِهَا أَوْ بِمَيْسُورٍ مِنَ الْقَوْلِ قَدْ وَسِعَ النَّاسَ بَسْطُهُ وَخُلُقُهُ وَمَنْ سَأَلَهُ حَاجَةً لَمْ يَرُدَّهُ إِلَّا بِهَا أَوْ بِمَيْسُورٍ مِنَ الْقَوْلِ قَدْ وَسِعَ النَّاسَ بَسْطُهُ وَخُلُقُهُ فَصَارَ لَهُمْ أَبًا وَصَارُوا عِنْدَهُ فِي الْحَقِّ سَوَاءً مَجْلِسُهُ مَجْلِسُ عِلْمٍ وَحَيَاءٍ وَصَبْرٍ وَأَمَانَةٍ لَا تُرْفَعُ فِيهِ الْأَصْوَاتُ وَلَا تُؤْبَنُ فِيهِ الْحُرَمُ وَلَا تُنْثٰى فَلَتَاتُهُ مُتَعَادِلِينَ يَتَفَاضَلُونَ فِيهِ بِالتَّقْوٰى مُتَوَاضِعِينَ يُوَقِّرُونَ فِيهِ الْكَبِيرَ وَيَرْحَمُونَ فِيهِ الصَّغِيرَ وَيُؤْثِرُونَ ذَا الْحَاجَةِ وَيَحْفَظُونَ الْغَرِيبَ۔

(رواہ الترمذی)

ہوتے وہ وہی ہوتے جوان میں بہتر سمجھے جاتے کہ آپ کے نزدیک افضل وہ ہوتا جو سب میں زیادہ مسلمانوں کا خیرخواہ ہوتا اور سب سے بڑا مرتبہ والا وہ ہوتا جو سب میں بڑھکر لوگوں کا خیرخواہ اور ان کا مددگار ہوتا وہ کہتے ہیں اس کے بعد میں نے آپ کی محفل کا حال پوچھا تو میرے والد نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست وبرخاست سب خدا تعالےٰ کے ذکر کے ساتھ ہوتی تھی۔ جب آپ خود کسی مجلس میں تشریف لیجاتے تو جہاں مجلس ختم ہوتی وہیں بیٹھ جاتے (اور آگے جانے کی سعی نہ کرتے) اور اسی بات کا دوسرونکو بھی حکم دیتے۔ اہل مجلس میں ہر ہر شخص کی طرف التفات فرماتے حتیٰ کہ مجلس میں ہر شخص کو یہی خیال ہوتا تھا کہ آپ کے نزدیک اس سے بڑھکر اور کوئی شخص قابل التفات نہیں ہے جو آپ کے ساتھ بیٹھتا یا کسی معاملہ میں بات چیت شروع کر دیتا تو آپ کو روکے رکھتا یہاں تک کہ وہی خود واپس ہوتا اور جو شخص بھی آپ سے کچھ مانگتا آپ اسکو واپس نہیں کرتے مگر یا تو اسکی حاجت پوری فرماکر ورنہ کوئی مناسب بات فرمادیتے۔ آپکی خندہ پیشانی اور آپ کے اخلاق اسطرح عام تھے کہ آپ ان کے والد کی جگہ تھے اور حق کے معاملہ میں تمام لوگ آپ کے نزدیک بالکل برابر اور ایک حیثیت رکھتے تھے آپ کی مجلس علم کی مجلس تھی شرم وصبر کی مجلس تھی اسمیں کسی کی آواز اونچی نہ ہوتی اور کسیکی آبروریزی نہ کی جاتی اور اگر کسی سے کوئی لغزش ہوجاتی تو اس کو شہرت نہ دیجاتی۔ آپس میں سب برابر شمار ہوتے۔ ایک دوسرے پر فضیلت کا معیار تھا تو صرف تقویٰ تھا وہ سب باہم ایکدوسرے کے ساتھ تواضع سے پیش آتے۔ بڑے کی تعظیم کرتے اور چھوٹے سے محبت کرتے اور حاجت والے کو آگے کر دیتے اور مسافر شخص کی پوری نگرانی کرتے۔ (ترمذی شریف)

۱۳۰۸ - عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہما قال قَالَ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ سَأَلْتُ أَبِي عَنْ سِيْرَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جُلَسَائِهِ فَقَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَائِمَ الْبِشْرِ سَهْلَ الْخُلُقِ لَيِّنَ الْجَانِبِ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ وَلَا صَخَّابٍ وَلَا فَحَّاشٍ وَلَا عَتَّابٍ وَلَا مَشَّاحٍ يَتَغَافَلُ عَمَّا لَا يَشْتَهِيْ وَلَا يُوْئِسُ مِنْهُ وَلَا يُجِيْبُ فِيْهِ قَدْ تَرَكَ نَفْسَهُ مِنْ ثَلَاثٍ الْمِرَاءِ وَالْإِكْبَارِ وَمَا لَا يَعْنِيْهِ وَتَرَكَ النَّاسَ مِنْ

۱۳۰۸ - امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام حسینؓ نے کہا کہ میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضور کا اپنے اہل مجلس کے ساتھ طرز پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ ہمیشہ خندہ پیشانی خوش خلقی کے ساتھ متصف رہتے تھے کسی بات میں آپ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تھی تو سہولت سے موافق ہو جاتے تھے، نہ آپ بدخو تھے نہ سخت گو اور نہ سخت دل نہ آپ چلاکر بولتے تھے نہ بدکلامی فرماتے تھے نہ عیب گیر تھے ناپسند بات سے اعراض فرماتے، دوسرے کی کوئی خواہش آپ کو پسند نہ آتی تو اس کو مایوس بھی نہ فرماتے اور صاف جواب بھی نہ دیتے تھے۔ آپ نے تین باتوں سے اپنے آپ کو مبرا فرمار کھا تھا جھگڑے سے اور تکبر سے اور بیکار بات سے اور تین باتوں سے لوگوں کو بچا رکھا تھا نہ کسی کی مذمت فرماتے نہ کسی کو عیب لگاتے نہ کسی کے عیوب تلاش فرماتے آپ صرف وہی کلام فرماتے جو باعث اجر ہوتا جب آپ گفتگو فرماتے تو آپ کے صحابہؓ اس طرح گردن جھکا کر بیٹھتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں جب آپ چپ ہو جاتے تب وہ حضرات کلام کرتے آپ کے سامنے کسی بات میں نزاع نہ کرتے آپ سے جب کوئی شخص بات کرتا تو اس کے خاموش ہونے تک سب ساکت رہتے ہر شخص کی بات (توجہ سے سننے میں) ایسی ہوتی جیسے پہلے شخص کی گفتگو (یعنی بے قدری سے کسی کی بات نہ سنی جاتی تھی) جس

۱۳۰۸ - حضرت امام حسنؓ اور امام حسین رضی اللہ عنہم کی ان دو حدیثوں میں حیات انسانی کے کتنے اہم اسباق آپکو عملاً سکھائے گئے ہیں اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات صرف علمی اور درسی رنگ میں نہیں ہوتیں بلکہ عملی طور پر بھی ہوتی ہیں اسی لئے شروع میں ہمنے تنبیہ کی تھی کہ شمائل کی حدیثوں کو صرف سرسری طور پر پڑھنا نہیں چاہیے بلکہ اسکو تکمیل انسانیت کا ایک اہم جز سمجھکر پڑھنا چاہیے افسوس ہے کہ اسوقت اسکی تفصیل کے لئے وقت میں گنجائش نہیں ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَسَيِّدِنَا اٰدَمَ وَسَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ وَسَيِّدِنَا مُوْسٰى وَسَيِّدِنَا عِيْسٰى وَمَا بَيْنَهُمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ ٥

يَا رَحْمَةَ اللّٰهِ اِنِّيْ خَائِفٌ وَجِلٌ — يَا نِعْمَةَ اللّٰهِ اِنِّيْ مُفْلِسٌ عَانِيْ

وَلَيْسَ لِيْ عَمَلٌ اَلْقَى الْعَلِيْمَ بِهٖ — سِوٰى مَحَبَّتِكَ الْعُظْمٰى وَاِيْمَانِيْ

ثَلَاثٍ كَانَ لَا يَذُمُّ اَحَدًا وَلَا يُعَيِّبُهٗ وَلَا يَطْلُبُ عَوْرَتَهٗ وَلَا يَتَكَلَّمُ اِلَّا فِيْمَا رَجَا ثَوَابَهٗ وَاِذَا تَكَلَّمَ اَطْرَقَ جُلَسَائُهٗ كَاَنَّمَا عَلٰى رُؤُسِهِمُ الطَّيْرُ فَاِذَا سَكَتَ تَكَلَّمُوْا لَا يَتَنَازَعُوْنَ عِنْدَهُ الْحَدِيْثَ وَمَنْ تَكَلَّمَ عِنْدَهٗ اَنْصَتُوْا لَهٗ حَتّٰى يَفْرُغَ حَدِيْثُهُمْ عِنْدَهٗ حَدِيْثُ اَوَّلِهِمْ يَضْحَكُ مِمَّا يَضْحَكُوْنَ مِنْهُ وَيَتَعَجَّبُ مِمَّا يَتَعَجَّبُوْنَ وَيَصْبِرُ لِلْغَرِيْبِ عَلَى الْجَفْوَةِ فِيْ مَنْطِقِهٖ وَمَسْأَلَتِهٖ حَتّٰى اِنْ كَانَ اَصْحَابُهٗ يَسْتَجْلِبُوْنَهُمْ وَيَقُوْلُ اِذَا رَاَيْتُمْ طَالِبَ حَاجَةٍ يَطْلُبُهَا فَاَرْفِدُوْهُ وَلَا يَقْبَلُ الثَّنَاءَ اِلَّا مِنْ مُكَافِئٍ وَلَا يَقْطَعُ عَلٰى اَحَدٍ حَدِيْثَهٗ حَتّٰى يَجُوْزَ فَيَقْطَعُهٗ بِنَهْيٍ اَوْ قِيَامٍ ۔ رواہ الترمذی

بات سے سب ہنستے آپ بھی تبسم فرماتے اور جس سے سب لوگ تعجب کرتے تو آپ بھی تعجب میں شریک رہتے یہ نہیں کہ سب سے الگ چپ چاپ بیٹھے رہیں مسافر آدمی کی سخت گفتگو اور بے تمیزی کے ہر سوال پر صبر فرماتے اسی لئے بعض صحابہؓ آپکی مجلس اقدس تک مسافروں کو لے کر آیا کرتے تھے (تاکہ انکے جابجا ہر قسم کے سوالات سے خود بھی منتفع ہوں اور وہ امور جو ادب کی وجہ سے یہ حضرات خود نہ پوچھ سکتے تھے وہ بھی معلوم ہو جاویں) آپ یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی طالب حاجت کو دیکھو تو اسکی امداد کیا کرو (اگر آپکی کوئی تعریف کرتا تو آپ اسکو گوارا نہ فرماتے) البتہ بطور شکریہ اور اداء احسان کے ذیل میں کوئی آپ کی تعریف کرتا تو آپ اس پر سکوت فرمالیتے کسی کی گفتگو کو قطع نہ فرماتے البتہ اگر کوئی حد سے تجاوز کرنے لگتا تو اس کو روک دیتے یا کھڑے ہو جاتے تاکہ وہ خود رُک جائے ۔

فکن امانی من شر الحیوۃ ومن شر المماۃ ومن احراق جثمانی

تحیۃ الصمد المولی ورحمتہ ما غنت الورق فی اوراق اغصانی

اللھم صل علی سیدنا محمد وعلی اٰل سیدنا محمد صلوۃ تکون لک رضا ولہ جزاء ولحقہ اداء واعطہ الوسیلۃ والفضیلۃ والمقام المحمود الذی وعدتہ واجزہ عنا ما ھو اھلہ واجزہ افضل ما جازیت نبیا عن قومہ ورسولا عن امتہ وصل علی جمیع اخوانہ من النبیین والصالحین یا ارحم الراحمین ۰

آمین

تمت

حررہ حکیم محمد نثار احمد راشد شیرکوٹی ۱۰ ربیع